اسوۃ الرسول

جلد اول

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

اسوۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اول

سوانح حیات مقدسہ حضرت سید المرسلین خاتم النبیین رسول اکرم محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

از آغاز ولادت باسعادت تا واقعات پنجم سال ہجرت آنحضرت صلعم

مرتبہ و مؤلفہ

عالیجناب خان بہادر سید اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی رئیس اکواٹھ ضلع آرا

حسب فرمائش

عالیجناب فخر الحاج والزوار حاجی خواجہ شریف حسین صاحب کربلائی و مشہدی

رئیس کرانہ ضلع مظفر نگر

تعداد طبع بار اول یکہزار (۱۰۰۰)

باہتمام منیجر کاظم بک ڈپو چتلی قبر دہلی

سراج المبین ہر دو حصہ

حضرت امیر المومنین، یعسوب الدین۔ قاتل المشرکین، امام المسلمین، اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی مکمل و مفصل معتبر و مستند سوانح عمری ہے۔ اور اس کتاب میں یہ امور دکھلائے گئے ہیں۔

اصول مساوات۔ رعایا پروری، انصاف و عدالت، حقوق کی حفاظت، مستحقین کی اعانت۔ عوام کی تعلیم و ہدایت، تلقین تربیت وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتاب نایاب قیمتی اور بے مثال کتب تواریخ و سیر و مناقب و حدیث و تفاسیر و کتب رجال و کلام و دواوین اور تواریخ انگریزی وغیرہ سے ترتیب دی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس، کاغذ عمدہ ولائتی لگایا گیا ہے (ضخامت جلد اول ۵۰۰ صفحات جلد دوم ۲۸۰ صفحات) قیمت اتنی کم ہے کہ ہر شخص خرید سکے۔ یعنی حصہ اول ہے ہر جلد دوم عگاہ درخواستیں جلد از جلد بھیجئے۔ کیونکہ اس نادر تاریخ کا ایڈیشن قریب اختتام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔

تحفہ رضویہ

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی مبسوط سوانح عمری اول سے آخر تک کے مفصل سوانح اور مکمل واقعات آپ کے پاکیزہ فضائل و عادات خلفائے عباسیہ کے عہد کا اصلی فوٹو معتبر اور مستند تاریخوں کا لب لباب عجیب و غریب سازشیں اور انکا انکشاف بنی فاطمہ کی حالت کا بالکل سچا اور صحیح مرقع۔ یہ مقدس کتاب بھی فی الحقیقت بے مثل ہے۔ کاغذ ولائتی اعلیٰ قسم کا۔ لکھائی چھپائی اتنی بہترین کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ نایاب زمانہ۔ قیمت صرف دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصولڈاک

شہادت حسینؑ کے اسباب وقوع

اور

قاتلان حسینؑ کی روبکاری

الحمد اللہ کہ یہ کتاب بھی چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ مؤلف ممدوح نے اپنی اس عمر میں بھی یہ تمام واقعات اس خوبی کے ساتھ نئے طریقہ اور اعلیٰ پیمانہ پر تحریر فرمائے ہیں۔ کہ بیان تحریر سے باہر ہیں۔ فہرست مضامین کتاب مذکور حسب ذیل ہیں۔

مخالفین کی خلافتیں، اور واقعات کربلا کے اسباب وقوع۔ واقعات کربلا کے روحانی اسباب قاتلان امام حسین علیہ السلام کی روبکاری۔ شہادت امام حسین علیہ السلام پر رونا۔ مختار علیہ الرحمۃ کے محاسن خدمات یہ بالکل سچے تاریخی واقعات ہیں۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ، کاغذ ولائتی سفید۔ قیمت صرف دس آنے (۱۰/)

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اوّل

کاظمی بکڈپو رجسٹرڈ

فہرست مضامین اسوۃ الرسول حصہ اوّل

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ	۱۳
۲	وجہ تاخیر تالیف	״
	تبصرہ دیباچہ سیرۃ النبیؐ	״
۳	استخفاف و استیصال حقوق بنی ہاشم۔	۱۵
۴	بے ضرورت کوتہ قلمی	״
۵	بے ضرورت تنقید	״
۶	تاریخ قدیمہ عرب کے متواترات سے انکار	״
۷	معیار مقررہ سے انکار	״
۸	ترجیح حدیث علی التاریخ	۱۶
۹	حدیث صحیحہ کے شروط مقررہ سے انکار	״
۱۰	شروط استنباط و استخراج سے انحراف	״
۱۱	کتب نامعتبرہ سے استنباط	۱۷
۱۲	زبانی دعاوی	״
۱۳	کتب صحاح اور صحیحین کی جانبداری میں غلو	۱۸
۱۴	رسالت اور علوم لدنیہ اور خلافت و شوریٰ کا اجتماع	״
۱۵	اقوال و آرائے صحابہ سے نصوص الٰہی کی تصویب	״
	اور احکام رسالت پناہی کی تصحیح	״
۱۶	قول صحابی منفرد سے نصوص الٰہی کی تنسیخ	۱۹
۱۷	رسالت مقدمہ خلافت	״
۱۸	اسقاط حقیقت رسالت	״
۱۹	استخفاف انوار رسالت	״
۲۰	رسالت بمقدار سلطنت	״
۲۱	رسالت محتاج مشورت	۲۰
۲۲	ذبیح اسماعیلؑ کی غلط تاویل	״
۲۳	خود غرضانہ طریقہ استنباط	״

نمبر	مضمون	صفحہ
۲۴ تتمہ	اسقاط واقعات بنی ہاشم	۲۰
۲۵	استخفاف حالات ہاشم، مطلب و عبد المطلب	۲۲
۲۶	عبد بن قصیٰ کی غلط ترکیب	۲۴
۲۷	اسقاط احوال انبیائے سابقین وغیرہ	״
۲۸	تقلید اسلاف پر اصرار	۲۵
۲۹	اسقاط معارف روحانیہ نبوت	۲۶
۳۰	مخالفین اسلام سے مرعوبیت	״
۳۱	یوروپین معترضین کے جواب میں سپر اندازی	۲۷
۳۲	اسقاط واقعہ معراج	״
۳۳	اسقاط ثبوت حریت حضرت ہاجرہ	۲۸
۳۴	خصائص رسالت کا قطعی اسقاط	״
۳۵	فصاحت و بلاغت رسالت کسبی تھی نہ وہبی	۲۹
۳۶	مارگیولوس کے اعتراض کا ناقص جواب	۳۰
	صحت بخاری پر نقادانہ نظر	״
۳۷	صحت بخاری پر عدم اجماع	״
۳۸	علما قادحین بخاری	۳۲
۳۹	رواۃ بخاری کی مجہولیت	۳۳
۴۰	حریز ابن سفیان ناصبی	״
۴۱	عمران ابن حطان خارجی	۳۴
۴۲	ابو قلابہ	۳۵
۴۳	خالد ابن مہران	״
۴۴	عبد الاعلیٰ	۳۶
۴۵	ابو اسحاق سبیعی	״
۴۶	عمر ابن سعد (قاتل حسینؑ)	״
۴۷	شمر ذی الجوشن (ایضاً)	۳۷

٤٨	عباس ابن حسین قنطری	٣٧
٤٩	اسرائیل ابن یونس	"
٥٠	محمد ابن بشار المعروف بہ بندار	٣٨
٥١	مؤلف سیرۃ النبیؐ خود بخاری کے قادح ہیں	"
٥٢	علم تاریخ سے بخاری کی جہالت	٣٩
٥٣	مرویات بخاری میں استبعاد باقرار مؤلف سیرۃ النبیؐ	٤١
٥٤	شبلی صاحب کی ذو الجہتی اور تلون مزاجی	٤٣
٥٥	خدمت رسولؐ میں بخاری کی بے ادبی	"
٥٦	بے ادبی کی دوسری مثال	٤٦
٥٧	کتاب بخاری کی اصلیت	٤٧
٥٨	بخاری نے اپنی مجتمعہ حدیثوں کی صحیح تعداد نہیں بتلائی	٤٨
٥٩	اسقاط بخاری مرویات آئمہ اہلبیتؑ	٥٠
٦٠	مرویات ائمہ اہلبیتؑ کو ترک کر دیئے جانیکا خاص سبب	٥١
٦١	علامہ ذو النبین اندلسی کا صحیح بخاری کی نسبت اعتقاد	٥٥
	بحث تنقید مرویات	
٦٢	موضوع تالیف میں مساوات و تعمیم کا غلط اصول	"
٦٣	تعمیم مساوات فی المدارج بین الصحابہ سے بالآخر بازگشت	٥٦
٦٤	مؤلف سیرۃ النبیؐ کی شرمناک فروگذاشت	٦٢
٦٥	اقوال صحابہ میں تعارض باقرار مؤلف سیرۃ النبیؐ	٦٤
	بحث ترجیح حدیث علی السیرت	
٦٦	ترجیح کتب حدیث کا غلط دعویٰ	٦٦
٦٧	اختلاف عن الاعتراف	٦٧
٦٨	حدیث و سیرت کی کوئی تفریقی تفصیل نہیں کی گئی	٦٩
٦٩	سیرت اور فقہ کی مثال متقابل ناقص ہے	٧١
٧٠	تسامح فی المثال کا باعث	٧٢
٧١	تعریف حدیث کی جگہ صحت حدیث سے استدلال غلط ہے	٧٣
٧٢	اصحاب حدیث و ارباب سیرت دو گروہ متقابل ہیں	"
٧٣	خلاف جمہور و غیر اسناد فیصلہ	٧٤
٧٤	پہلی مثال (غزوہ ذی قرد میں اہل سیرت کا اختلاف)	٧٥
٧٥	اصل حقیقت کا انکشاف	٧٦
٧٦	حدیث و سیرت کا اصولی فرق	٧٨
٧٧	دوسری غلط مثال	٧٩
٧٨	علامہ ابن حجر کا ایک مضحکہ خیز فیصلہ	٨٠
٧٩	اصل حقیقت کا انکشاف	٨١
٨٠	حدیث کی اصولی تعریف	٨٣
٨١	محدثین اور تکذیب سیرت میں انکے اصل اقوال	٨٤
٨٢	دوسرے اعتراض کی حقیقت	٨٦
٨٣	محدثین کے اقوال میں بے شمار اختلاف	٩٠
٨٤	نزول حکم صلوٰۃ خوف میں اختلاف	٩٢
٨٥	علمائے حدیث کا مرویات سیرت پر عمل	٩٣
٨٦	مؤلف سیرت النبیؐ کے علمی استحقاقات کا انکشاف	٩٤
٨٧	صحت۔ تمام علوم و فنون میں قدر مشترک ہے	٩٥
٨٨	صحت حدیث کے معیار مقررہ پر تنقیدی نظر	٩٦
٨٩	صحت سیرت و تاریخ کے مقررہ معیار	"
٩٠	کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں۔ اسکی تنقید	١٠٠
٩١	مؤلف سیرۃ النبیؐ اور نقل و تحریر کی نئی ترکیبیں	١٠٤
٩٢	حدیث و سیرت کے جداگانہ ماخذ	١٠٦
٩٣	سیرت سے خاص اسلامی سیرت یا صرف سیرۃ النبیؐ سمجھنا غلطی ہے	١٠٨
٩٤	حدیث و سیرۃ کی باہم تخلیط۔	١٠٩
٩٥	اکثر علمائے حدیث اصحاب سیرت تھے۔	١١٠
٩٦	ترجیح حدیث سے مؤلف سیرۃ النبیؐ کا خاص مدعا	١١١
٩٧	تنقیص و کسر شان رسالت	١١٢
٩٨	تنقیص و کسر شان اہل بیتؑ	١١٣
٩٩	مؤلف سیرۃ النبیؐ کا عالم فریب دعویٰ۔	١١٤
	محدثین و فقہا علی الاکثر وظیفہ خوار سلطنت	
١٠٠	زہری اور تعلقات شاہی۔	١١٧
١٠١	دیگر علماء اور تعلقات شاہی۔	١١٨

۱۰۲	سلین قرن اولیٰ اور سلاطین کی غلامی کا اقرار۔	۱۱۹
۱۰۳	فتویٰ غلامی کے مفتی حضرت عبداللہ ابن عمر ہیں	۱۲۰
۱۰۴	ابن عمر کا سکوت بے سبب نہیں تھا۔	۱۲۱
۱۰۵	ابن عمر کی حیلۃ الوقتی	۱۲۳
۱۰۶	ابن عمر کی پہلے پر چوتھی پیر روپوشی	۱۲۴
۱۰۷	زور شمشیر سے حدیثیں بنوائی گئیں	؍؍
۱۰۸	ابوہریرہ معمولی آدمی تھے	۱۲۷
۱۰۹	ابوہریرہ کا تذبذب اور ذو جہتی۔	؍؍
۱۱۰	بیت المال میں خیانت کر چکے تھے۔	۱۲۸
۱۱۱	جھوٹی حدیثیں بناتے تھے	؍؍
۱۱۲	وضع حدیث کیلئے حضرت عمر ان کی تادیب فرما چکے تھے	۱۲۹
۱۱۳	حدیث سازی بعد رسول صلعم	؍؍
۱۱۴	معاویہ کے حکم سے حضرت علی کی توہین شان میں جھوٹی حدیثیں بنائیں	؍؍
۱۱۵	حضرت عائشہ کے ساتھ گستاخانہ تعریض	؍؍
۱۱۶	ابوہریرہ کی کثرت حدیث	؍؍
۱۱۷	ان کی کثرت حدیث پر شاہ ولی اللہ صاحب کا تعجب	۱۳۰
۱۱۸	وضع حدیث کا آخری نتیجہ	۱۳۱
۱۱۹	تابعین میں واضعین حدیث	۱۳۲
۱۲۰	جدول اسمائے صحابہ و تابعین واضعین احادیث	؍؍
۱۲۱	دورہ عباسیہ میں محدثین و فقہا پر سلطنت کا اثر	۱۳۷
۱۲۲	قاضی ابویوسف	؍؍
۱۲۳	ہارون الرشید کے دربار میں قاضی ابویوسف کا فتویٰ	؍؍
۱۲۴	سلطنت پرستی کی دوسری مثال	۱۳۸
۱۲۵	قاضی ابویوسف اور سلطنت سے تعلق	۱۳۹
۱۲۶	قاضی صاحب قاضی القضاۃ بغداد کیونکر بنے	؍؍

۱۲۷	علماء و محدثین کو ان طواری قرآن و احادیث کو [illegible]	۱۴۲
۱۲۸	ہارون الرشید اور قرآن کی عظمت	۱۴۴
۱۲۹	ہارون الرشید اور عظمت قرآن کی دوسری مثال	۱۴۵
۱۳۰	صحابہ محتاطین نقل حدیث سے احتیاط کرتے تھے	۱۴۶
۱۳۱	رسولؐ کے بعد جہاد و اجتہاد دونوں تباہ ہوگئے	۱۵۰
۱۳۲	کیا عہد رسولؐ میں صحابہ کبار مجتہد نہیں تھے	۱۵۲
۱۳۳	خالص جہاد کی عملی مثال	؍؍
۱۳۴	جہاد کے ایسا اجتہاد بھی غارت ہوا	۱۵۳
۱۳۵	چند محدثین احادیث کی مثالیں۔	۱۵۴
۱۳۶	محدث صاحب کی حدِ تعلق	۱۵۵
۱۳۷	غندر کی وجہ تسمیہ	؍؍
۱۳۸	موضوعات احادیث پر علماء و محدثین کی ندامت	۱۵۶
۱۳۹	کتب موضوعات کی تالیف کا زمانہ	۱۵۸
۱۴۰	یہ زمانہ بھی سلطنت کے اثر سے خالی نہیں تھا	۱۵۹
۱۴۱	**احادیث توہین بنی فاطمہ ؑ**	
۱۴۲	بنی فاطمہ کو آل فاطمہ لکھنا یہ بھی توہین آمیز غلطی ہے	۱۶۰
۱۴۳	اہانت کی پہلی مثال	۱۶۲
۱۴۴	دوسری مثال	؍؍
۱۴۵	تیسری مثال	؍؍
۱۴۶	چوتھی مثال	؍؍
۱۴۷	پانچویں مثال	۱۶۳
۱۴۸	دینیات میں آئمۂ اہلبیت کی بے اعتباری	۱۶۴
۱۴۹	بنی فاطمہ آئمۂ طاہرین اور اُن کی ذریات و تابعین کے تفصیلی مصائب	۱۶۶
۱۵۰	**یوروپین تصنیفات پر تاکامل تبصرہ**	

151	تنہا نقل حدیث کی مغالطہ و ہدایت	189
152	تمام یوروپین تعریفات کے ماخذ کتب صحاح وسنن ہیں	״
153	موضوعات فی الحدیث کا دوسرا ثمر ناک نتیجہ	199
154	صفات رسالت کا اسوۂ حسنہ صرف اہلبیت رسالت	229
155	کتب قدیمہ یہود و نصاریٰ میں مخرب اخلاق اور خلاف آداب واقعات۔	230
156	**اسوۃ الرسول کی ضرورت تالیف**	״
157	اسوۃ الرسول کی تالیف میں اصول تحقیق واحتیاط	
158	اسوۃ الرسول کی مجلدات خمسہ اور انکے مضامین	
	مقدمہ کتاب اسوۃ الرسول حصہ اول	
1	تمہید	251
2	فصحتان عرب	״
3	وجہ تسمیہ عرب	״
4	جغرافی تعلقات سے عرب کی وجہ تسمیہ	252
5	تاریخی شواہد سے عرب کی وجہ تسمیہ	״
6	کتب قدیمہ یہود و نصاریٰ سے عرب کی وجہ تسمیہ	253
7	قرآن مجید اور لفظ عرب	״
	ملک عرب کا جغرافیہ	״
8	عرب کے حدود اربعہ	״
9	سواحل اور بندرگاہیں	254
10	رقبہ ملک	255
11	آبادی	״
12	علاقہ شام کے بدوی سرحدی اقوام	256
13	عرب مستوطن	״
14	سطح زمین عرب	257
15	عرب کے پہاڑ	258
16	عرب کے دریا	״
17	عرب کا صحرائے عظیم	״
18	عرب کی آب و ہوا	״
19	عرب کی باد خمسین یا سموم	259
20	عرب کے اثمار	260
21	عرب کے حیوانات	״
22	معدنیات	״
23	تجارت	261
	ملک عرب کی قدیم تقسیم	״
24	عرب آبادان	262
25	عرب سنگستان	״
26	عرب ریگستان	״
27	عرب کے قدیم شہر	264
28	توریت میں بعض مقامات عرب کے نام	267
	ملک عرب کی جدید تقسیم	268
29	اقطاع عرب۔ حجاز	״
30	علاقہ عروض	269
31	یمامہ	״
32	بحرین	270
33	عمان	271
34	نجد	״
35	یمن	272
36	حضر موت	274

نمبر	مضمون	صفحہ
٣٧	بلادِ احقاف	٢٧٤
٣٨	صنعائے یمن	"
٣٩	نجران	٢٧٥
٤٠	عسیر	"
٤١	حجاز کے مشہور مقامات	"
٤٢	مکہ معظمہ	٢٧٦
٤٣	مدینہ منورہ	٢٧٧
٤٤	طائف	٢٧٨
٤٥	جوف۔ ثمود۔ تبوک۔ خیبر اور مدین	"
٤٦	عرب شام	٢٧٩
٤٧	عرب عراق	"
٤٨	جغرافیہ حال کے مطابق عرب کے مشہور مقامات	٢٨٠
	حالاتِ عرب اور اُنکے ماخذ	
٤٩	ادبیات اسلامیہ	٢٨٥
٥٠	علم النحو کی تدوین	"
٥١	اشعار قبل اسلام	٢٨٦
٥٢	عرب کے قدیم جغرافیہ نویس	"
٥٣	عرب کا علم حفظ الانساب	٢٩١
٥٤	عرب کے مصنفین و مؤلفین (حاشیہ)	
٥٥	ادبیات اسرائیلیہ	٢٩٤
٥٦	ادبیات یونانیہ و رومانیہ	٢٩٦
٥٧	بطلیموس کے جغرافیہ عرب کی بے اعتباری	٢٩٧
٥٨	عربوں کے انکشافات اثریہ	٢٩٨
	عرب میں یورپ کے اکتشافات اثریہ	
٥٩	علاقہ حضرموت میں اکتشافات اثریہ	٣٠٢
٦٠	علاقہ عمان میں آثار قدیمہ	٣٠٣
٦١	علاقہ حجاز میں آثار قدیمہ	"
٦٢	علاقہ نجد میں آثار قدیمہ	٣٠٤
٦٣	علاقہ عرب شمالی میں آثار قدیمہ	"
٦٤	سدّ مارب	٣٠٥
٦٥	آثار حجریہ و نحاسیہ	٣٠٦
٦٦	ایک انگریزی سیاح اور محقق (حاشیہ)	٣٠٧
	ملک عرب کے اقوام و قبائل اُنکے مساکن و مواطن اُنکے تمدنی اور سیاسی حالات	٣٠٨
٦٧	عرب کے اقوام قدیمہ	"
٦٨	عرب البائدہ	"
٦٩	محققین عرب اور عرب البائدہ کے مختصر حالات	"
٧٠	عرب البائدہ کے قدیم سات قبیلے	٣٠٩
٧١	بنی کوش	٣٠٢
٧٢	بنی عیلام	٣١٦
٧٣	بنی لود	"
٧٤	بنی عوض	"
٧٥	بنی عول	"
٧٦	عاد اولیٰ یا سامیۂ اولیٰ	٣١٦
٧٧	بیرون عاد کے فتوحات	٣١٨
٧٨	ضحاک تازی عرب تھا	٣١٩
٧٩	توریت میں کوش کی اولاد کا شمار	٣٢٠
٨٠	دو سو تیئیس برس تک ارض بابل میں سامیوں کی حکومت۔	"

	سنہ ۴۰۰۰ ق م اور سنہ ۲۲۰۰ ق م	۳۲۲
۸۱	علم القدامت (ارکیالوجی) کے اسناد سے	″
	سامیہ اولیٰ یا عاد اولیٰ (عرب) کی تاریخ	″
۸۲	مسیح سے چار ہزار برس قبل عاد اولیٰ کی حکومت	″
۸۳	ملوک سامیہ اولیٰ کی فہرست	۳۲۳
۸۴	ملک مصر میں سامیہ اولیٰ کی حکومت	۳۲۵
۸۵	مختلف ممالک میں سامیوں کی حکومت	۳۳۷
۸۶	عرب بائدہ عاد اولیٰ یا سامیہ اولیٰ کا زوال	۳۳۹
۸۷	حضرت ہود کی بعثت اور قوم عاد کی ہدایت	۳۴۰
۸۸	(آفرینش عالم سے سنہ ۱۸۰۰ بعد اور حضرت مسیح سے سنہ ۲۲۰۰ قبل) حضرت ہود کی آخری موعظت	″
	قوم ثمود یا عاد ثانیہ	۳۵۱
۸۹	حکیم لقمان مابین سنہ ۱۸۰۰ و سنہ ۱۶۰۰ ق م	″
۹۰	قوم ثمود کے تمدنی او سیاسی حالات	۳۵۴
۹۱	وجہ تسمیہ ثمود	″
۹۲	ثمود کی سکونت	″
۹۳	ثمود کا دار الحکومت	۳۵۵
۹۴	ثمود کی بربادی	۳۵۸
۹۵	ثمود کے آثار قدیمہ	″
۹۶	حضرت صالح کی رسالت	″
	(سنہ ۲۱۰۰ دنیوی یا سنہ ۱۹۰۰ قبل مسیح)	″
۹۷	ثمود ثانیہ کے تاریخی حالات	۳۶۶
۹۸	طسم و جدیس کے حالات	۳۶۸
۹۹	عرب البائدہ کے قبائل کا شجرہ نسب	۳۷۰

۱۰۰	عرب العاربہ یا عرب متوطن	۳۷۱
۱۰۱	عرب العاربہ کے جد اعلیٰ قحطان کی اولاد	۳۷۲
۱۰۲	یعرب یا جرھم پسر قحطان کی تاریخی حالات	۳۷۳
۱۰۳	یعرب یا جرھم یا جرہم پسر قحطان کی حکومت	۳۷۶
۱۰۴	قحطانی سلسلہ کے سلاطین	۳۷۸
۱۰۵	حکومت سبا اور سلاطین معین	۳۸۰
۱۰۶	سلاطین معین کی فہرست	۳۸۹
۱۰۷	بنی لحیان کی حکومت	۳۹۱
۱۰۸	حضرموت کی حکومت	″
۱۰۹	جدید تحقیقات اور حکومت سبا کے حالات	۳۹۴
۱۱۰	سبا اور اس کی شاخوں میں امتیاز	۳۹۶
۱۱۱	سلاطین سبا کی فہرست	۳۹۸
۱۱۲	مکارب سبا	۴۰۰
۱۱۳	مکارب سبا کے نام انکا شجرہ	۴۰۲
۱۱۴	ملوک سبا	۴۰۳
۱۱۵	ملک سبا کی تقسیم و تنظیم	″
۱۱۶	سبا کے تمدنی اور تجارتی حالات	۴۰۴
۱۱۷	سبا کی عمارتیں	۴۰۷
۱۱۸	سد مآرب یا بند ارم	۴۰۸
	ملکہ سبا بلقیس	۴۱۱
	سنہ ۳۰۰۰ دنیوی (سنہ ۱۰۰۰ ق م)	″
۱۱۹	ملکہ سبا بلقیس	″
۱۲۰	قرآن مجید اور ملکہ سبا	۴۱۲
۱۲۱	توریت اور ملکہ سبا	۴۱۵
۱۲۲	ملکہ سبا کے حالات میں توریت اور قرآن کے ادبیات کا مقابلہ	۴۱۶

۱۲۳	قصۂ بلقیس کے متعلق بعض شکوک کا ازالہ	۴۱۷
۱۲۴	سبا کا مذہب	۴۲۰
۱۲۵	سبا کا ادبار و زوال	۴۲۱
	حمیر یا سبا کا طبقہ ثالثہ و رابعہ قوم تبع و اصحاب الاخدود	〃
	(۳۴۳۳ سنہ دنیوی یا ۱۰۶۰ سنہ قبل حضرت مسیح)	
۱۲۶	حمیر کا زمانہ اور صفات	۴۲۵
۱۲۷	سلاطین حمیر کی فہرست	۴۲۷
۱۲۸	سلاطین حمیر کے طبقۂ اوّل کے صحیح نام	〃
۱۲۹	طبقۂ ثانیہ یا تبابعہ کے حالات	۴۲۸
۱۳۰	قرآن اور تبع کے حالات۔ تبابعہ کے حالات	۴۲۹
۱۳۱	افسانہائے حمیر	۴۳۱
۱۳۲	کیا حمیر کے افسانہ حدود تاریخی میں نہیں آسکتے۔ (حاشیہ)	۴۳۲
۱۳۳	تبابعہ کا تمدن۔ سیاست اور مذہب	۴۳۳
۱۳۴	ذوالقرنین۔ صعب ابن الرائش	۴۳۵
〃	یہی تھا یا سکندر ابن فیلقوس رومی	〃
〃	المقدونی (حاشیہ)	〃
۱۳۵	یاجوج ماجوج کی قدیم قومیں (حاشیہ)	۴۳۷
۱۳۶	اصحاب الاخدود	۴۴۳
۱۳۷	ذوالقرنین کے فتوحات افریقہ و چین پر صاحب ارض القرآن کے اعتراض اُن کی تحقیق و تنقید (حاشیہ)	۴۴۴
۱۳۸	سبائے حبش یا اصحاب الفیل	۴۵۰
	لفظ سمرقند کی توضیح (حاشیہ)	
۱۳۹	فتح تبت (حاشیہ)	۴۵۴
۱۴۰	کیکاؤس اور سودابہ ملکۂ یمن (حاشیہ)	۴۵۶
۱۴۱	سلاطین بنی قحطان (یمن۔ سبا۔ سبائے حمیر۔ اور سبائے حبش) کا اعلیٰ تمدن	۴۵۷
۱۴۲	مؤلف سیرۃ النبیؐ کی کوتہ قلمی پر ایک نظر	۴۶۰
۱۴۳	حمیر کی اولاد اور عرب کے مختلف حصوں میں اُن کی حکومت	۴۶۵
۱۴۴	حیرہ کے ملوک حمیر	۴۶۶
۱۴۵	غسان کے ملوک حمیر	۴۶۹
۱۴۶	ملوک کندہ	۴۷۰
۱۴۷	ملوک حجاز	۴۷۲
۱۴۸	عرب العاربہ (بنی قحطان) کے مشہور قبائل	۴۷۳
۱۴۹	**عرب المستعربہ یا عرب المستوطنہ**	۴۷۵
۱۵۰	(اَدُوم یا عیسو بن اسحاق حاشیہ)	۴۷۶
۱۵۱	بنی قطورہ	۴۷۹
۱۵۲	**حضرت شعیب کی رسالت**	〃
	(۲۰۰۰ سنہ تا ۱۰۰۰ سنہ ق م)	
۱۵۳	حضرت شعیبؑ کی نسبت قرآن و توریت کی مطابقت۔	۴۹۱
۱۵۴	شہر مدین کی تاریخ قدیم	۴۹۳
۱۵۵	بنی ودان یا اصحاب الایکہ	۴۹۴
۱۵۶	اصحاب الایکہ جنگل والے ضرور تھے	۴۹۵
۱۵۷	بنو سارہ یا بنو ادوم	۴۹۸
۱۵۸	بیس برسوں کے بعد بھائی بھائی ملتے ہیں۔	۴۹۹
۱۵۹	ادوم کی حکومت۔ ادوم کی تاریخ	۵۰۲

۱۶۰	**حضرت ایوبؑ کی رسالت** (سنہ ۱۹۰۰ قم)	۵۰۳
۱۶۱	حضرت ایوبؑ کی رسالت	؍؍
۱۶۲	حضرت ایوبؑ امیر یا شیخ قوم تھے	۵۰۵
۱۶۳	حضرت ایوب کا زمانہ رسالت۔ آپ کا وطن آپ کے واقعات	۵۰۶
۱۶۴	قرآن میں حضرت ایوبؑ کا واقعہ	۵۰۸
۱۶۵	حضرت رحمہ زوجۂ جناب ایوبؑ	۵۱۰
۱۶۶	**بنو ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ** (اصحاب الرس۔ اصحاب الحجر۔ اصحاب الایکہ۔ انصار قریش۔)	۵۱۳
۱۶۷	**حضرت ابراہیم علیہ السلام** (سنہ ۲۰۰۹ دنیوی یا ۱۹۹۶ قم)	۵۱۴
۱۶۸	حضرت ابراہیم کی فطرت صالح	۵۱۵
۱۶۹	حضرت ابراہیم اور گھر کی گلہ بانی	۵۱۸
۱۷۰	شاہد معرفت کی پہلی جلوہ آرائی۔	۵۲۱
۱۷۱	آذر سے احتجاج	؍؍
۱۷۲	کافرین ومشرکین سے احتجاج	۵۲۳
۱۷۳	انوار حقیقت کی دوسری جلوہ آرائی۔	۵۲۴
۱۷۴	ماں سے احتجاج	۵۲۶
۱۷۵	جناب رسولؐ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی تبلیغ رسالتؐ میں مماثلت	۵۲۷
۱۷۶	کافرین قوم سے بار دیگر احتجاج	۵۳۰
۱۷۷	عید کافرین کے دن بت شکنی	۵۳۴
۱۷۸	نمرود کے دربار شاہی میں حضرت ابراہیمؑ کی طلبی	۵۳۸
۱۷۹	نمرود سے احتجاج۔ آتش نمرود اور خلیل معبود معرفت الٰہی میں حضرت ابراہیم کا کمال استقلال	۵۳۹
۱۸۰	خطاب خلیل الٰہی سے سرفراز ہوئے۔	۵۴۰
۱۸۱	واقعہ احراق سے بعد کے حالات۔ حضرت لوطؑ کا ایمان لانا	۵۴۲
۱۸۲	حضرت سارہ کا ایمان لانا۔ ارض بابل سے ہجرت۔ آنحضرت کی ہجرت سے مماثلت	۵۴۳
۱۸۳	بابل سے شہر باران کی طرف ہجرت۔ مقام	۵۴۴
	کنعان میں قیام۔ مصر کی طرف روانگی۔	؍؍
۱۸۴	شہر جبرون میں قیام	۵۴۶
۱۸۵	حاران میں **حضرت لوطؑ** کی رسالت	۵۴۷
۱۸۶	حضرت ہاجرہ کے ساتھ مزاوجت اور حضرت اسماعیلؑ کی ولادت	؍؍
۱۸۷	ولادت اسماعیلؑ کے متعلق آسمانی بشارتیں	۵۴۹
۱۸۸	سارہؑ اور ہاجرہ میں مشاجرت	۵۵۰
۱۸۹	حکم خدا سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کی دشت فاران میں ہجرت۔	۵۵۲
۱۹۰	حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو دشت فاران میں خود پہونچا گئے۔	۵۵۵
۱۹۱	حضرت ہاجرہؑ کے نکالدیئے جانے کا غلط الزام	؍؍
۱۹۲	دشت فاران سے ارض حجاز اور حوالیٔ مکہ مراد ہے	۵۵۸
۱۹۳	ہجرت کے وقت حضرت اسمٰعیل کا سن	۵۷۰
۱۹۴	حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کا قریب زمزم	۵۷۶

	آباد ہونا۔ اور بنی جرہم کو بھی سکونت کی اجازت دینا	
۱۹۵	حضرت ابراہیمؑ اہل وعیال کو مکّہ میں آکر دیکھ جاتے تھے۔	۵۱۷
۱۹۶	حضرت اسمٰعیلؑ کی جرہم اور مصری بی بی	۵۱۸
۱۹۷	تعمیر خانہ کعبہ	۵۸۱
۱۹۸	ارکان حج کی تعلیم و اعلان	۵۸۳
۱۹۹	حضرت اسماعیلؑ کی قربانی	۵۸۴
۲۰۰	مکّہ سے مراجعت اور حضرت ابراہیمؑ کی رحلت	۵۸۵
۲۰۱	سب سے پہلے دین ابراہیم اسلام کے نام سے موسوم ہوا۔	۵۸۶
۲۰۲	شبلی صاحب کے غلط تسمیہ اسلام کی تصحیح و ترمیم۔	۵۸۷
۲۰۳	صرف شریعت اسلامی میں ملت ابراہیمیؑ کے مراسم اب تک محفوظ ہیں۔	۵۸۸
۲۰۴	حضرت ابراہیمؑ تمدن اور تہذیب کے موجد تھے۔ عہد ابراہیمی میں عرب کا تمدن۔	۵۹۰
۲۰۵	ملکی زبان میں الفاظ کی کمی۔ ملک و قوم کے غیر متمدن ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی	۵۹۲
۲۰۶	کعبہ بالتحقیق بیت العتیق ہے۔	۵۹۶
۲۰۷	**حضرت اسماعیل علیہ السلام** (سنہ ۱۸۶۲ قبل مسیح یا سنہ ۲۱۳۰ دنیوی)	۵۹۹
۲۰۸	حضرت اسماعیلؑ وجہ تسمیہ اسماعیل۔ اسماعیلؑ کی متعلق بشارتیں	۶۰۰
۲۰۹	اسماعیلؑ پر اسحاقؑ کی ترجیح کا غلط مسئلہ	؍؍

۲۱۰	حضرت اسماعیلؑ کی پرورش	۶۰۴
۲۱۱	ذبیح اسماعیلؑ کا واقعہ	۶۰۵
۲۱۲	ذبیح کون ہے۔	۶۰۶
۲۱۳	قربانی کی حقیقت	۶۱۳
۲۱۴	اس حدیث کی تنقید جس کو سرسید نے ذبیح اسحاقؑ کی تائید میں لکھا ہے۔	۶۱۴
۲۱۵	حدیث مسعودی کی تنقید	۶۱۹
۲۱۶	قربانی کی حقیقت اور شبلی صاحب کی غلط تاویل	۶۳۰
۲۱۷	فدیناہ بذبح عظیم کا حقیقی مقصود	۶۴۷
۲۱۸	توریت کے نقبائے اثنا عشر	۶۶۰
۲۱۹	شہادت حسینؑ ذبح عظیم ہے	۶۶۸
۲۲۰	عرب میں حضرت اسماعیلؑ کی رسالت	۶۷۰
۲۲۱	اسوقت عرب کے کیا عقائد تھے۔	۶۷۱
۲۲۲	حضرت اسمٰعیل کی معاشرت	۶۷۲
۲۲۳	بنی جرہم میں شادی	۶۷۷
۲۲۴	وفات حضرت اسمٰعیلؑ	۶۷۹
۲۲۵	**اُمّ اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہؑ**	۶۸۰
۲۲۶	فرعون اور ناموس رسولؐ کی توہین	۶۸۱
۲۲۷	حضرت ہاجرہ پر کنیزی کا غلط الزام	۶۸۷
۲۲۸	لفظ عبری امۃ کی تحقیق	۶۸۹
۲۲۹	لفظ عبری سفحۃ کی تحقیق	۶۹۳
۲۳۰	ہاجرہ اور قطورہ کا ایک ہونا غلط ہے	۶۹۵
۲۳۱	لفظ سارا سین کی تحقیق	۶۹۸
	خانہ کعبہ معظمہ	
۲۳۲	قدامت کعبہ۔ معترضین کے تعریفات کی تردید	۷۰۰

٢٣٣	غلاف کعبہ وسقف کعبہ	٧٠۵
٢٣۴	سقف کعبہ بعد ابراہیم	٧٠٩
٢٣۵	تولیت خانۂ کعبہ	٧١٢
٢٣٦	حضرت اسماعیلؑ کے ابنائے اثنا عشر	٧١٧
٢٣٧	اولاد اسمٰعیلؑ کے مختصر حالات	٧١٨
٢٣٨	انباط عرب	٧٢٢
٢٣٩	انباط بنیا لوط۔ اور نابت ابن اسمٰعیل۔ الفاظ مرادف ہیں۔	٧٢٣
٢۴٠	انباط کی حکومت۔ رقبہ حکومت۔ دار الحکومت	٧٢۵
٢۴١	ملوک انباط	٧٢٦
٢۴٢	انباط کا تمدن	٧٢٧
٢۴٣	انباط کی سیاست	٧٢٩
٢۴۴	اصحاب الحجر	٧٣۵
٢۴۵	قیدار ابن اسماعیلؑ سنہ ١٨٠٠ ق م	٧٣٧
٢۴٦	کتب قدیمہ سماویہ میں بنی قیدار کے اخبار	٧٣٨
٢۴٧	معد ابن عدنان اور حضرت یرمیاہ (سنہ ٦٠٠ ق م)	٧٣٩
٢۴٨	قبیلہ قریش، سلسلہ نسب وجہ تسمیہ	٧۴١
	قریش۔ قریش کی شاخیں۔ شجرہ۔	٧۴٣
٢۴٩	سب سے پہلے قریش کون کہلایا۔	٧۴۴
٢۵٠	قصی ابن کلاب سنہ ٣٣٩ء سنہ ۴٨٠ء	٧۴٦
٢۵١	قصی سے پہلے تولیت کعبہ اور امارت مکہ کے حالات	؍؍
٢۵٢	قصی کے ابتدائی حالات	٧۴٨
٢۵٣	قصی کو اپنی حقیقت نسبی کیسے معلوم ہوئی	٧۵٠
٢۵۴	مکہ میں قصی کی بازگشت۔ دو بچھڑے بھائیوں کی مدت پر ملاقات۔ مکہ میں سکونت۔	٧۵١
	بنی خزاعہ سے شادی	٧۵٢
٢۵۵	خانہ کعبہ کی کلید برداری۔ مکہ کی امارت	؍؍
	کعبہ کی تولیت	؍؍
٢۵٦	بنی خزاعہ اور بکر سے اپنے حقوق کا مطالبہ مقابلہ۔ فتح مکہ	؍؍
٢۵٧	قصی نے زور شمشیر سے مکہ فتح کیا۔ نہ کسی حیلہ وتدبیر سے	٧۵۴
٢۵٨	قومی اصلاح اور دار الندوہ کی افتتاح	٧۵۵
٢۵٩	دار الندوہ میں قصی کے خاص حقوق	؍؍
٢٦٠	عبد مناف کی امارت	٧۵٧
٢٦١	ہاشم ابن عبد مناف کی امارت	؍؍
٢٦٢	ہاشم کے خدمات مکہ۔ ملکی اور قومی اصلاح	٨۵٨
٢٦٣	ہاشم اور قومی تجارت	٧٦٠
٢٦۴	ہاشم مرحوم اور قیصر روم	٧٦١
٢٦۵	شاہ حبشہ کے نام ہاشم کا خط	٧٦٢
٢٦٦	ہاشم کی ملکی اور قومی خدمتیں	٣٦٣
٢٦٧	مکہ میں متواتر سہ سالہ قحط اور ہاشم کی فیاضی	٧۵٧
٢٦٨	ہاشم کے ساتھ امیہ کی مخاصمت	٧۵٨
٢٦٩	ہاشم کے ساتھ امیہ کی منافرت	؍؍
٢٧٠	واقعات صحیحہ سے مؤلف سیرۃ النبیؐ کی	٧۵٩

	صریح چشم پوشی۔	
۲۷۱	اہل البیت	۷۶۰
۲۷۲	سلمیٰ بنت عمر سے عقد	۷۷۵
۲۷۳	ہاشم کی وفات	״
۲۷	مطلب ابن عبد مناف کی امارت سنہ ۵۲۰ء	۷۷۷
۲۷۵	حضرت عبد المطلب ابن ہاشم کی امارت سنہ ۵۷۹ء	۷۷۸
۲۷۶	مطلب کو عبد المطلب کے حالات کی کیسے اطلاع ہوئی	۷۷۹
۲۷۷	شبلی صاحب اور حالات عبد المطلب کا استخفاف	۷۸۲
۲۷۸	تعمیر چاہ زمزم	۷۸۳
۲۷۹	تعمیر زمزم میں قریش کی مخالفت	۷۸۵
۲۸۰	مخالفت قریش اور عبد المطلب کے استحقاق	״
۲۸۱	مخالفت عبد المطلب میں قریش کی آخری	۷۹۲

	حرکت مذبوحی۔	۷۹۳
۲۸۲	حضرت عبد المطلب کی نذر	۷۹۴
۲۸۳	حضرت عبد اللہ ذبیح ثانی کی قربانی	۷۹۵
	ابرہہ ابن الصباح کی خانہ کعبہ پر چڑھائی ۔ ا رجولائی سنہ ۵۷۰ء	۸۰۲
۲۸۴	فوج ابرہہ کی چڑھائی	״
۲۸۵	انہدام کعبہ کے متعلق اصحاب فیل کی ناکامی	۸۰۶
۲۸۶	سید صاحب وغیرہم کی غلط فہمی	۸۱۱
۲۸۷	ابابیل کو آبلہ کی جمع بتلانا ابلہ فریبی ہے۔	۸۱۷
۲۸۸	آبلہ عربی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔	۸۱۸
۲۸۹	نزول ابابیل عذاب الٰہی تھا	۸۲۰
۲۹۰	حضرت عبد اللہ ابن عبد المطلب علیہ السلام	۸۲۱

تمام شد

المؤلف

(خان بہادر) سید اولاد حیدر فوق بلگرامی - عفاہ اللہ الحامی -

اللہ اکبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین وصلے اللہ علی محمد سید المرسلین وخاتم النبیین وآلہ الطیبین الطاھرین الی یوم الدین

میرے سلسلہ سوانحات حضرات چہاردہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین کی یہ آخر کتاب ہے اور ایسی آخر ہے جو ظاہر میں آخر اور حقیقت میں اوّل ہے اسلیئے کہ یہ سیرۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی جو سابق اجزائے سیزدگانہ کی اصل الاصول۔ آخر اس لئے کہ سب سے آخر میں لکھی گئی اور نیز اس رعایت خاص سے کہ ختم الرسل اور نبی آخر الزمان کے حالات ہیں صلوا علیہ وآلہ جنکی ذات قدسی صفات منازل رسالت کی مکمل اور مناصب نبوت کی متمم ثابت ہوچکی ہے۔

وجہ تاخیر ایسے متمم رسالت کے حالات وواقعات کی تحقیق تفصیل اور تشریح کیلئے مؤلف کو کلی جمعیت اور انتہائی ہمت سے کام لینا ہے۔ میری سابق تالیفات اسی کل کی جزئیات تھیں۔ اور اسی اصل کی فروعات جنمیں سوائے اندرونی پیچیدگیوں کے بیرونی مشکلات کی تنقید وتفصیل اور جرح وتعدیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اسلیئے اُن کی تدوین وترتیب کے منازل ومراحل بالتدریج وترتیب پہلے طے کرلیئے گئے۔ اور اُن سے کلی فراغت اور خاطر خواہ جمعیت حاصل کرکے اسوۃ الرسول کی مبارک تدوین سے سعادت اندوز ہونے کی کوشش کی گئی۔

ترتیب تالیف میں تقدیم وتاخیر کا الزام تنہا مجھ پر عاید نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مجھ سے اکثر اصحاب سیرو تاریخ اور ارباب تحقیق نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ میری اس کتاب میں میرے مخاطب اصلی شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ میرا فرض اولیں یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا۔ مگر یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔" دیباچہ ص ۴۔

یہ عبارت لکھکر گویا شبلی صاحب نے میرے مونہہ کی بات چھین لی۔ بلفظ اور بجنسہ میری تاخیر اور عدم تحریر سیرۃ نبویؐ کے لیے بھی یہی مجبوریاں سمجھی جائیں ممکن تھا کہ ابھی اور تاخیر ہوتی۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ تمام سیرتیں علے الترتیب تمام ہوچکی تھیں۔ اور ایک یہی باقی تھی۔ دوسری یہ کہ شبلی صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی اشاعت۔ اُس کی مبہم۔ مجمل۔ غیر مفصل اور نہ مکمل صورت نے۔ میری کتاب کی تالیف میں ایسی عجلت پیدا کردی کہ پھر میں اپنے اس قصد و ارادے کو ذرا بھی نہ روک سکا۔

مجھکو خوب یاد ہے کہ میں اُن دنوں اپنی کتاب الزہرا سلام اللہ علیہا تمام کرکے اُسکا دیباچہ لکھ رہا تھا جس کو میں نے فوراً متروک و موقوف کردیا۔ اور بالآخر میری وہ کتاب بغیر کسی دیباچہ اور مقدمہ ہی کے چھپی یہ میں نے گوارا کرلیا۔ مگر جناب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرۃ کی تالیف و ترتیب سے پھر ایک دم کے لیے بھی غافل نہ ہوا۔

عجلت کی ضرورت اُس عجلت کی کیا ضرورت ہوئی حقیقت یہ ہے کہ اس بالکل اچھوتی طرز کی سیرت نے شایع ہوکر عموماً قوم و ملت میں اور خصوصاً فرقہ شیعہ کی جمعیت میں وہی کیفیت پیدا کردی جو سر ولیم میور صاحب کی لائف آف محمد کی اشاعت نے آج سے پچاس برس پہلے پیدا کردی تھی جسکو سر سید احمد خاں نے مفصلہ ذیل عبارت میں قلمبند فرمایا ہے۔

جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہونچی تو لوگوں نے نہایت ذوق و شوق سے پڑھا۔ مگر جب اُنکو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرتؐ کے حالات کی نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے ہی سے اسطرح اس کتاب کا لکھنا مقصود اور مرکوز خاطر تھا تو اُن کا وہ شوق و ذوق بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر جو نوجوان طالب علم۔ علم انگریزی کی تحصیل کرتے تھے اور اپنے دینیات و الہیات سے محض ناواقف تھے۔ اُنہیں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگرچہ سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی بڑے پہلو پر لیجاکر لکھا ہے تو فی الواقع اُنکی اصلیت کیا ہے۔ خطبات احمدیہ۔ دیباچہ ص ۸ ۔ مطبوعہ لاہور۔

شبلی صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی بھی بجنسہ یہی کیفیت ہوئی۔ یہ کتاب والیان ملک کی فیاضانہ استمداد سے بڑی آب و تاب کیساتھ شایع ہوئی۔ لوگوں نے بڑے اشتیاق سے خریدا۔ مگر جب کتاب پڑھی تو معلوم ہوا سہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

پھر تو قوم و ملت کے ہر ہر فرقے اور ملک و وطن کے ہر ہر گوشے سے یہ صدا بلند ہونے لگی۔ کہ شبلی صاحب نے (۱) اگر راہب بحیرہ کی بشارت آنحضرتؐ کو جھٹلایا (۲) آنحضرتؐ کا اہل مکہ کی بکریاں اُجرت و مزدوری پر چرانا قبول کرلیا۔ (۳) آنحضرت صلعم کا قبل بعثت ہی سہی عرب کی قدیم داستان گویوں کی فضول صحبت میں

رات بھر بیٹھنا۔ (۴) ایک بار انہیں صحبتوں میں جاتے ہوئے راہ میں ایک شادی کے جلسہ کا تماشا دیکھنے کھڑے ہو جانا اور پھر وہیں سو کر شام سے صبح کر دینا (۵) حضرت علی مرتضیٰؑ کا شراب پینا تسلیم کر لیا ہے اور انکی ایسی کثیر التعداد مثالیں جن سے سیرۃ النبیؐ کی متعدد جلدیں سیاہ کی گئی ہیں ایسی ہیں تو فی الواقع انکی اصلیت کیا ہے؟

میری موجودہ کتاب **اسوۃ الرسولؐ** انھیں مستفسرات کا جواب ہے۔ اور شبلی صاحب کی غلط بیانیوں کی حقیقت کا دفتر انکشاف۔ مگر میں اپنی موجودہ تالیف کی اُسوقت تک کوئی تفصیل کرنا پسند نہیں کرتا جبتک کہ شبلی صاحب کے دیباچہ پر کامل تبصرہ نہ کر لوں اور اُس کی حقیقت اور اصلیت کا بھی اُسی طرح صاف صاف وانکشاف نہ کروں جس طرح آپ کی اصل کتاب کے تمام غلط۔ مشکوک اور مبہم واقعات وحالات کے متعلق تحقیق و تنقید سے کام لیا گیا ہے۔

دیباچہ سیرۃ النبیؐ پر تبصرہ (۱) سیرۃ النبیؐ کے مجلدات دیکھکر مفصلہ ذیل رائے قائم کی گئی ہے۔

(۱) حقوق بنی ہاشم کے استخفاف واستیصال کے علاوہ جو مدت سے آپکا شعار تالیف قرار پایا ہے۔ جسکے لیئے اب سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ اس لیئے کہ بنی اُمیہ کی جانب داری کے لیئے آپ فطرتاً مجبور ہیں۔ بہت سے واقعات قدیمہ اور مشاہدات عظیمہ۔ جو تاریخ عرب۔ آثار اسلام اور اخبار جناب سید الانام علیہ وآلہ السلام سے پورا تعلق رکھتے تھے۔ قطعاً مرفوع القلم اور کالعدم فرما دیئے گئے۔

استخفاف واستیصال حقوق بنی ہاشم

(۲) اُنہیں سے بعض لکھے بھی گئے۔ تو اُنکی تفصیل وبیان میں بے ضرورت اور بے موقع اسقدر کوتہ قلمی اختیار کی گئی۔ کہ اُن مختصرات کو اشارات واستعارات شاعرانہ نہیں تو بیجا۔ اور عموماً پہیلی اور چیستان سمجھیں۔ تو نازیبا نہ ہو گا۔

بے ضرورت کوتہ قلمی

(۳) بہت سے واقعات کی تحقیق میں اپنی نقدانہ مخترعات ومصنوعات کا بے ضرورت اضافہ کیا گیا ہے جو حقیقت اور واقعیت سے بمراحل دُور ہے۔

بے ضرورت تنقید

(۴) اکثر ایسے واقعات بھی جو تاریخ ومرویات عرب میں متواترات کے درجہ پر پہونچے ہوئے تھے اور مشاہدات کہے جا سکتے تھے صرف اس وہمہ وقیاس کی بنا پر کہ آپ کے نوایجاد فلسفہ تاریخی کے حدود میں ظاہری طور پر نہیں آ سکتے تھے انکار کر دیا گیا۔ اور قدمائے عرب کے اُن اخبار واقوال متفقہ اور آثار مسلّمہ پر تکذیب وتغلیط کا حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

تاریخ قدیمہ عرب کے متواترات سے انکار

(۵) جس طمطراق اور تکلفات مالایطاق سے تنقید وتحقیق واقعات کثیر التعداد معیار ایجاد کیے گئے۔ اُن میں سے کسی کی بھی پابندی نہیں فرمائی گئی۔

مقررہ معیار سے انکار

(۶) اسناد کی تفصیل اور تعیین میں سیرت پر تاریخ تاریخ پر حدیث کو ترجیح دی گئی ہے اور پھر حدیثوں میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو۔ اور صحاح ستہ کی حدیثوں میں صحیحین بخاری و مسلم کی حدیثوں کو ترجیح بالمرجع عنایت کیگئی ہے۔ مگر افسوس کہ آغاز کتاب ہی میں امام بخاری پر حدیث کے غلط معنی لگانے کا الزام ثابت کر دیا گیا ہے (دیکھو لفظ قراریط۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲۹) اور اُن کے شارح حافظ ابن حجر پر رواۃ پرستی کا جُرم لگایا گیا (راہب بحیرہ کے حالات ص ۱۳۱) ان بنا پر ان محدثین اور اُن کی حدیثوں کی کیا وقعت باقی رہتی ہے اور کیا اعتبار۔ اس لیے آپ کا قائم کردہ معیار بالکل طُومار بیکار ثابت ہوا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

ترجیح حدیث علی التاریخ

(۷) اسناد حدیث کی تصدیق و توثیق کے علاوہ معمولی واقعات تاریخی کی تحقیق و اثبات کی نسبت بھی اگرچہ وہ متواترات ہی کیوں نہوں۔ اسقدر شدت احتیاط کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ غیر مقید اور غیر مستند کوئی واقعہ قلمبند کیا جائے۔ مگر اپنی ہی کتاب میں۔ اپنے ہی دست و قلم سے اپنے دلائل کے اسناد و اثبات میں صرف اس لکھدینے پر اکتفا فرمائی گئی کہ اکابر صُوفیہ نے لکھا ہے (ذکر ذبیح اسمٰعیل ص ۱۰۶)

حدیث صحیحہ کی شرط مقرر کردہ سے انحراف

افسوس ہے کہ بزرگ صُوفیہ اور اُنکی کتاب کے صرف نام لکھدینے کی بھی تکلیف گوارہ نفرمائی گئی۔ اگرچہ اُنکے قول کی تحقیق رجال نہیں ہوسکتی تو روایت احاد کے اُصول تنقید کے مطابق صرف اُن بزرگ صُوفیہ کی اعلمیت اور ثقیبت پر اعتبار کیا جاتا۔

(۸) اسلاف کی غیر محققانہ اور محض کورانہ تقلید کو غلط اُصول پر قطعی انکار کیا گیا ہے۔ مگر اپنے مفید مطلب مضامین کی تصدیق و تحقیق میں آنکھیں بند کر کے قول سلف کی تقلید کی قدیم لکیر پیٹی گئی ہے۔ اور پھر اس سختی اور مضبوطی سے کہ اگرچہ اس کے خلاف میں کیسی ہی معتبر اور مستند اقوال و اسناد آپ کے پیش نظر نہ ہوں۔

استنباط کتب معتبرہ کی شرط تقریر کردہ سے انحراف

مگر آپ ایک کو بھی نہیں مانتے۔ منافرہ بنی امیہ یا بنی عبد المطلب اور منافرہ بنی ثقیف یا بنی عبد المطلب کے متواتر اسقاط واقعات باب الاجارہ بخاری کے خلاف طبقات ابن سعد کے قوی الاسناد روایات سے قطعی انکار وغیرہ کثیر التعداد واقعات جو اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر پوری تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ موجود ہیں۔

(۹) جن کتب حدیث تاریخ و سیر کو دیباچۂ کتب میں ساقط الاعتبار ٹھہرایا گیا ہے۔ اصل کتاب اُنھیں کے اسناد و حوالوں سے کثیر التعداد مقامات پر کام لیا گیا ہے۔ مواہب لدنیہ قسطلانی کے متعلق تحریر ہے۔

کتاب پسترده اور نا اعتبار کرده سے استنباط

مشہور کتاب ہے۔ اس کے مصنف قسطلانی ہیں۔ جو بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ حافظ ابن حجر کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے۔ اور متاخرین کا بھی ماخذ ہے۔ لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔ سیرۃ النبیؐ۔ دیباچہ ص ۲۷

لیکن تمام کتاب آپکی مواہب لدنیہ کے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ مثال کے لیئے ملاحظہ ہوں۔ صفحات ۱۷۸ و ۱۸۲ و ۱۸۴ وغیرہ وغیرہ۔ طرفہ تو یہ ہے۔ کہ غرانیق العلیٰ والی موضوع روایت کی تنقید میں۔ ابن حجر شارح بخاری کی تردید تکذیب میں مواہب لدنیہ ہی کی عبارت پیش کیگئی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۷۹

(الف) اس طرح کتب احادیث کے متعلق۔ ہر واقعہ کی صداقت کم سے کم صحاح ستہ تک کے اندراج تک مشروط کر دی گئی۔ مگر اپنی کتاب میں اپنے حصول مطلب کیلیئے یہ تمام قیود و حدود توڑ کر تمام چھوٹی بڑی۔ عام وخاص اور معتبر و غیر معتبر کتب احادیث سے استخذ و استخراج فرمایا گیا۔ کما لا یخفی علیٰ ناظر کتابہ۔

(ب) یہی کتب تاریخ کی بھی کیفیت ہے۔ لکھنے کو تو تاریخ قدیمہ عرب کی ایک جدول مفصل اور فہرست مکمل دیباچہ کتاب میں لکھی گئی ہے۔ اور انہیں سے ابن ہشام۔ ابن اسحاق۔ طبری۔ اور ابن سعد کے منقولات و مرویات پر اعتبار کیا گیا ہے مگر اپنی کتاب میں۔ مفید مطلب واقعات تاریخی کے نقل کے وقت۔ ابو الفدا۔ ابن اثیر۔ ابن شحنہ۔ مسعودی۔ ابن الوردی۔ غرض کوئی متاخرین نہیں چھوڑا گیا۔ اور سب کے اقوال و ارشادہ۔ بلا تحقیق و تنقید۔ داخل اسناد کر لیئے گئے۔ پھر سابق معیاد کے تعیین اور دعاوی دونوں بیکار ہوئے۔

(ت) سیرت کی بھی یہی صورت ہے۔ دیباچہ میں عرب کے تمام قدیم سیرت نگاروں کی بڑی لمبی چوڑی فہرست داخل ہے (ملاحظہ ہو از صفحہ ۲۰ تا ۲۶) انہیں سے سیرت ابن اسحاق۔ روض الانف۔ سیرت ابن سید الناس۔ سیرت ابن عبد البر وغیرہم کی ایسی معدودے چند سیرتوں کو قابل الاسناد بتلایا گیا ہے۔ مگر اصلی کتاب میں حصول مطلب کے لیئے وہی معمولی بھرتی ہے اور جلد دوم تک تو پہونچتے پہونچتے ملفوظات حضرت اشرف جہانگیر تک کے حوالوں کی نوبت پہونچائی گئی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ جب ان معیار پر کام کرنا ہی نہیں تھا۔ تو پھر ان کا یہ طومار اور انبار کیوں تیار کیا گیا۔

زبانی لفّاظی

(۱۰) دیباچہ کتاب کے پڑھنے سے۔ بطور ظاہر۔ تو آمد طبع۔ شوکت الفاظ۔ منقدانہ طرز تحریر۔ محققانہ اور مستدیانہ روش و انداز۔ سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا کہ محدود تحصیل و تحقیق کے افراد قوم و ملت آپ کی ظاہری عبارت آرائیوں اور نمائشی قلم کاریوں سے مرعوب ہو جائیں۔ مگر حقیقت کی دوربین نگاہیں جب اصلیت پر غور کرتی ہیں۔ تو سوائے بڑے بڑے عربی کے الفاظ۔ بڑی بڑی عربی کی قدیم کتابوں کے نام اور اُن کے بڑے بڑے مصنفین و مولفین کے ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اُن کے علاوہ اگر کچھ ہے بھی

تو اپنی تحقیق جدید کی انانیت اور ایک فرقہ خاص اور قوم خاص سے حد درجہ کی نفسانیت۔

(۱۱) صحاح کی اُن خاص مرویات میں عموماً اور صحیحین بخاری و مسلم کی اُن احادیث کی تفصیل و بیان میں خصوصاً جو مؤلف کے مدّعائے خاص کی مؤیّد تھیں۔ اس لغویانہ اور مغویانہ انداز سے غلو کیا گیا ہے۔ اور اس درجہ افراط و تفریط اختیار کی گئی ہے۔ جس سے اسلاف کی کورانہ تقلید عقائد کی قدیم غلطیوں کی تائید۔ اپنے فرقہ خاص کی جنبہ داری۔ ہر ممکن و ناممکن طریقہ سے اپنے مدّعا و مطلب کی تصدیق۔ اپنے اُصول خاص کی توثیق۔ جو جواز قیاس کی بنا پر۔ اگرچہ۔ منافی احکام الٰہیہ اور مخالف احادیث نبویہ ثابت ہوتے ہیں صاف صاف نمایاں اور آشکار ہیں۔ حالانکہ دیباچہ کی عبارت میں تمام تر حقیقت نویسی۔ واقعہ نگاری کے پکے وعدے اور سچے وعدے فرمائے گئے ہیں۔ اور ہر واقعہ کی غایت تحقیق اور کامل تنقید کئے جانے کے لیے شرح و بیان کے دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ مگر

ع شکل آئینہ اِدھر سب ہے اُدھر کچھ بھی نہیں۔

(صفید مطلب مقامات پر صحاح و صحیحین کی جانبداری میں غلو۔)

(۱۲) اس مہمل موضوع تالیف کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسلاف کی غلط تائید و تقلید میں **اصل رسالت** کی شان **خاص نبوّت** کے حقیقی اقتدار پامال ہوگئے۔ مخصوصات نبوت اور مخصوصات رسالت عام کر دیئے گئے۔ تخصیص کی جگہ تعمیم قائم کر دی گئی۔ شرف صحابیت میں جو حقیقتاً رسالت کی فیضان صحبت کا ایک ادنیٰ اثر ثابت ہوتا ہے۔ اتنی اہمیت پیدا کر دی گئی۔ کہ صحابیت رسالت کی مماثل اور ایک صحابی پیغمبرؐ کا مقابل قرار دیدیا گیا۔

(شانِ رسالت کی پامالی)

(۱۳) احکام **شوریٰ** اور **خلافت راشدہ** کی وہ عظمت بڑھائی گئی کہ **رسالت** اور اُسکے **علوم لدنیہ** اُنکے تبع بنا دیئے گئے اور وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ کی نصّ صریح کے مقابلہ میں اَنْتُمْ اَعْلَمُوْنَ بِمِهنَتِیْ فِیْ اُمُوْرِ الدُّنْیَا کی حدیث موضوع سے استدلال کیا گیا۔ گویا رسالت دو جداگانہ حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ اُمور عقبیٰ پیغمبرؐ سے متعلق رہے اور اُمور دُنیا صحابہ سے۔ اور اس بنا پر رسالت **نظام قومی** اور **سیاسی** کیلئے ناقابل اور بیکار قرار دیدی گئی۔ اور **کمال رسالت** ناقص کر دیا گیا۔ تو پھر سیرۃ النبیؐ میں رہا کیا۔

(رسالت اور علوم لدنیہ احکام شوریٰ و خلافت کے تبع بنائے گئے۔)

(۱۴) انہیں اُصول موضوعہ کے ثبوت میں بلا تنقید و تحقیق تمام کتاب کی کتاب ایسے کثیر التعداد واقعات سے بھر دی گئی۔ جو عملی اور نظری دونوں طریقوں کے دلائل سے آراستہ کر کے قلمبند کئے گئے ہیں۔ جنکی تفصیل میں یہ ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ **تجویز و تدبیر رسالت** صحابہ کی رائے اور **حکم شوریٰ** سے منسوخ ہو جاتی ہے اور سب پر طرّہ یہ کہ **نصوص الٰہیہ**

(اقوال و آرائے صحابہ سے احکام رسالت کی تصحیح اور نصوص الٰہیہ سے قول صحابہ کی تصویب)

سے بھی شوریٰ کے فیصلہ کی تصویب اور (نعوذ باللہ) احکام نبویہ کی تغلیط ثابت کی جاتی ہے۔

(۱۵) جیسے جیسے تحقیق بڑھائی جاتی ہے۔ ویسے ویسے اِس اُصول موضوعہ کی اہمیت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ص ۵ پر آسمان نیرپرداختی۔ کا نظارہ پیش ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث منفردہ نحن معاشر الانبیاء لا نورث سے دو نصوص الٰہیہ (للذکر مثل حظ الانثیین اور ورث سلیمٰن داؤد) منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

> قول صحابی منفردہ سے دو نصوص الٰہی کی تنسیخ

(۱۶) ان تمام موضوعات و مصنوعات کا نتیجہ کیا نکلا؟ رسالت و نبوت خلافت راشدہ کا ایک مقدمہ ثابت ہو کر رہ گئی۔ اور اس سے زائد نہیں۔ اور اس کی مقدار حیثیت من حیث الوقوع ایک قومی حکومت تحت نظام الشوریٰ نے دکھلا دی گئی۔ جس میں مراتب رسالت اور مدارج نبوت کی تخصیص و تنصیص قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں پائی گئی۔

> رسالت خلافت کا ایک مقدمہ تھی

(۱۷) حقیقت رسالت نہ خود سمجھی گئی۔ اور نہ کہیں کتاب میں تفصیل سے سمجھائی گئی۔ اُتنی بھی نہیں۔ جتنی الکلام جلد دوم مطبوعہ حیدرآباد ص ۲۷۹ میں۔ امام فخر الدین رازی۔ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی۔ حکمائے اسلام (بقول شبلی صاحب) کی صرف عقلی دلیلوں سے بتلائی اور سمجھائی گئی تھی۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہاں اُسکے بیان کی ضرورت آپ کے مدعائے تالیفی کے خلاف واقع ہوتی تھی۔ اگر رسالت و نبوت کے اعلائے مقاصد و مطالب کی تفصیل و توضیح۔ الکلام کی طرح۔ سیرۃ النبیؐ کے مضامین میں بھی داخل کر دی جاتی۔ تو شوریٰ اور خلافت صحابہ اور صحابیت کی اہمیت میں تنقیص لازم آتی اور رسالت و نبوت کے مقابلہ میں شوریٰ اور خلافت کی نظام سیاسی و قومی کی اصابت و قوت میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا۔

> رسالت کی حقیقت کہیں نہیں بتلائی گئی۔

(۱۸) رسالت کی حقیقت پر روحانی انکشافات کے طریقہ استدلال سے ساری کتاب میں کسی ایک موقع پر بھی روشنی نہیں ڈالی گئی اور آیت واتبعوا النور الذی انزل معہ کے (جو سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ ص ۲۸ میں لکھکر معرفت صحابیت کی شرط قرار دی گئی ہے) مطالب و مقاصد سے۔ کہیں بھی بحث نہیں کی گئی۔ حالانکہ الکلام میں مسبوق الذکر علما و حکمائے اسلام کے مختلف آرا و اقوال سے ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ رسالت سراپا روحانیت ہے۔ ملاحظہ ہو الکلام (۱) جلد دوم از صفحہ ۲۴۴ تا ۲۵۹ و (۲) ۲۵۹ تا ۲۷۸۔

> رسالت کے انوار حقیقت سے کہیں نہیں بحث کی گئی۔

(۱۹) سیرۃ النبیؐ کے دفاتر ثلاثہ۔ ورق ورق کر کے لوٹ جائیے۔ تاجدار رسالت کی نظری شکل ایک شاندار دنیاوی اور قومی حاکم سے زائد ثابت نہیں ہوتی۔ جس کے زائد از ہزار سالہ گذرکر

> رسالت بمقدار سلطنت

ہوئے احکام و قوانین انتہا درجہ کی کوشش و سعی کے بعد۔ توڑ مروڑ اور اینچ تان کر موجودہ زمانہ کے جدید اور غیر محفوظ نظام حکومت کے مطابق عموماً۔ اور دول یورپ کے آئین سیاست کے موافق خصوصاً ثابت کیے گئے ہیں۔

رسالت محتاج شورت

(۲۰) کتاب کی تینوں جلدیں (مطبوعہ موجودہ) پڑھ ڈالیے۔ اور رسالت کے علم و نظم پر غور کیجیے تو وہ تمام تر اور علی الاکثر خلفائے راشدین اور صحابہ اکابرین کی اصابت رائے اور حسن مشورت کے نتیجے ثابت ہوتے ہیں۔ پھر سیرۃ النبیؐ کے تسمیہ کی ضرورت۔

ذبح اسماعیل میں غلط تاویل

(۲۱) تفصیل واقعات میں علی الاکثر جمہور محققین۔ علم الحدیث۔ علم التفسیر۔ علم السیرت اور علم التاریخ کی مرویات کے بالکل خلاف۔ صرف اپنے قیاسی مختار اور تاویل دور از کار کا انبار لگا کر اپنی قوت اجتہادی کا اشتہار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قیاسات و تاویلات۔ علماء و محققین متقدمین و متاخرین کے اقوال و مختار کے مخالف ہونے کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ و معنی کے بھی صریح مخالف و منافی ثابت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ **ذبح حضرت اسمٰعیل** علیہ السلام کے متعلق آپکی غلط فہمی کی پوری تصحیح کر دی گئی ہے۔

خودغرضانہ طریقہ استنباط

(۲۲) اکثر مقامات میں ماخذ اصلی سے انہیں مرویات کی نقل و تحریر پر اکتفا کی گئی ہے۔ جو آپ کے مدعائے تالیف کے لیے مفید تھیں۔ اور اُن سے مؤلف کی غرض خاص کی تائید ہوتی تھی۔ اور اُن مرویات کو بالکل مرفوع القلم فرما دیا گیا۔ جو مفید مطلب نہیں تھیں۔ حالانکہ اصلیت اور واقعیت انہیں میں تھی۔ جیسا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گلہ بانی کی بحث میں۔ ابن سعد کے دونوں اقسام کی مرویات سے مؤلف کا صرف ایک کی نقل کرنا۔ اور دوسری کو غیر مفید مطلب پاکر قلم انداز کرنا پورے طور سے اپنے مقام پر دکھلا دیا گیا ہے۔

اسقاط واقعات مفاخرت بنی ہاشم اور مسلسل طریقہ

(۲۳) سلسلہ ابراہیمیؑ اور خانوادہ اسماعیلیؑ میں۔ بنی قیدار کے وہ مخصوص امتیاز و اقتدار۔ جو انکو اپنے زمانہ میں دیگر بنو اسمٰعیل۔ بنو قطورہ اور بنو ادوم۔ ساکنین حجاز پر حاصل تھا۔ اور جن سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبائے کرام کی عظمت اور قدامت بتفصیل سے ثابت ہوتی تھی۔ قطعاً متروک فرما دیے گئے۔ اگر اُن کی نسبت یہ عذر تھا۔ کہ یہ بہت قبل کے حالات تھے۔ اور اُن کو موجودہ تالیف سے زندہ تعلق نہیں تھا۔ تو جواب یہ ہے۔ کہ ایک شخص خاص کی سیرت ہو۔ یا کسی قوم کے حالات و واقعات لکھنے ہوں۔ تو ایک سیرت نگار کا فرض اوّلیں ہے کہ اُس کے سلسلہ انساب کی شرافت و نجابت و قدامت و عظمت کو مفصل و مسلسل بیان کر دے۔ کہ آیندہ

اُن کے علیات اور خصائل و شمائل کے واقعات و حالات کو اُن کے محاسن اصلی کے خاص جوہر تسلیم کرنے میں کسی کو عذر و کلام باقی نہ رہے۔

عرب کے تمام قدیم سیر و تاریخ کے دفاتر ملاحظہ کیے جاویں۔ قریب قریب تمام اسلامی سیرتوں اور تاریخوں کا عنوان بیان تفصیل انساب ہی سے آغاز کیا گیا ہے۔ سب کو جانیدیجئے۔ تاریخ طبری ہی کو اُٹھا لیجئے۔ جو آپ کا مستند ترین ماخذ ہے۔ اُس کے عنوان بیان کا آغاز بھی سلسلہ انساب ہی کی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اسلامی مورخین و محققین پر موقوف نہیں۔ غیر اسلامی مولفین و مصنفین و متقدمین کا بھی یہی معیار تالیف اور شعار تصنیف ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے لیے انجیل متیٰ کا صفحہ اوّل ملاحظہ ہو۔ حالانکہ انجیل متیٰ حقیقتاً نہ تاریخ کی اصل کتاب ہے۔ اور نہ سیرت کے موضوع خاص پر لکھی گئی ہے۔ مگر بالآخر ایک شخص خاص کے حالات و واقعات کا مجموعہ تو ضرور ہے۔ متیٰ کی انجیل کے علاوہ لوقا کی انجیل میں بھی حضرت عیسٰے علے نبینا و آلہ السلام کے حالات و واقعات کا جہاں سے آغاز کیا گیا ہے۔ پہلے سلسلہ انساب کی تفصیل ہی شروع کی گئی ہے۔ اور اُسمیں کوئی کلام نہیں۔ کہ اِن کتابوں کی تالیف قرآن مجید کی تنزیل سے کہیں قبل کی ہے۔ اس بنا پر آسانی سے ثابت ہوجاتا ہے کہ کسی شخص خاص کے حالات و واقعات کے بیان میں۔ اُس کے سلسلہ نسبی کی تفصیل و تشریح کا طبند کر دیا جانا تصنیف کا کتنا قدیم دستور ہے۔

بفرض محال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاوے۔ کہ حالات قیدار بعلت قدامت اور بخوف طوالت متروک کر دیئے گئے۔ تو قیدار کے بعد اس سلسلہ کے اور نمودار بزرگواروں کے تفصیل حالات سے کیوں قطعی چشم پوشی اختیار فرمائی گئی۔ یا نقل حالات میں کیوں صریحاً کوتہ قلمی سے کام لیا گیا۔ ان کے لیئے کیا عذر دکھلایا جائے گا۔

سیرۃ النبیؐ میں ان حضرات کے حالات پڑھنے سے حقیقت کا پورا انکشاف ہوجاتا ہے قُصَیّ کے زمانہ سے اس سلسلہ مقدسہ کی عظمت و وجاہت کا تمام ملک و قوم عرب پر عہد و تسلّط قایم ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر من حیثت السیرت۔ اس سلسلہ مُبارکہ کے نامبُردہ اور سر برآوردہ بزرگوار تفصیل و بیان سے قابل الذکر تھے۔ اور ان ممتاز آل خاندان میں حالات قُصَیّ سے آغاز تفصیل کرنا ضروری تھا۔ مگر شبلی صاحب نے اپنے اُصول تعمیم کی بنا پر ایسے نمودار قوم و قبیلہ کے حالات خاص میں بھی کسی تفصیل و تصریح کو مناسب و مصلحت نہ سمجھا۔

اس نمودار قبیلہ کے حالات و واقعات کی فہرست مختصر۔ ساڑھے چودہ ۱۴½ سطروں میں تیار بھی کی۔

تو قصّی سے تین پشت پہلے۔ تفصیل سلسلہ نسب میں ایک نام ہی چھوڑ دیا۔ شبلی صاحب کی عبارت یہ ہے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد **قصی ابن کلاب**۔" سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۱۸۔ حالانکہ سلسلہ نسب کی صحیح ترتیب و تفصیل یہ ہے **نضر کے بعد مالک**۔ مالک کے بعد فہر اور فہر کے بعد **قصی ابن کلاب** ملاحظہ ہو۔ طبری ص ۳-۱۱ج ۱ مطبوعہ جرمن۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۸ مطبوعہ جرمن۔ ابو الفدا ابن وردی۔

طرفہ تر یوں ہے۔ کہ غلطنامہ میں بھی اس غلطی کی صحت نہیں کی گئی۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو کاتب یا مصلح سنگ کی خطا و فروگذاشت سمجھی جاتی۔ جب ایسا نہیں۔ تو اب شبلی صاحب کی عجلت رقمی اور کوتہ قلمی کے سوا اور کیا یقین کیا جائیگا۔ افسوس اتنا بڑا محقق اور معمولی سلسلہ نسب کی بھی صحیح نقل نہ کر سکا۔

استخفاف و حالات ہاشم۔ مطلب اور عبد المطلب

(نمبر ۲) اسی طرح **ہاشم، مطلب اور عبد المطلب**۔ ممتازین بنی ہاشم کے متعلق مشہور و معروف واقعات تاریخی یا تو قطعاً قلم انداز کر دیئے گئے۔ یا ایسے اختصار سے بیان کئے گئے۔ کہ بیرے بودہ بسیرے داشت۔ گم شد۔ بازیافت کے صرف چار جملوں میں۔ ساری یوسف زلیخا تمام کر دی گئی۔ اب انہیں واقعات کو عربی کی اصل کتابوں میں ملاحظہ کیا جاوے۔ تو معلوم ہو جاویگا کہ ان حالات میں کتنی وضاحت اور صراحت سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کیلئے ملاحظہ ہو قصی کے حالات میں واقعات منافرت۔ ہاشم کے زمانہ میں منافرۃ امیہ و عبد الشمس اور عبد المطلب کے ایام میں منافرۃ حرب اور بنی ثقیف کے واقعات قطعاً مرفوع القلم فرما دیئے گئے۔ اور عبد المطلب کے بعد حضرت ابیطالبؑ کے وقت سے تو بنی ہاشم سے ولایت کعبہ اور امارت مکہ بالکلیہ منتزع کر کے حرب ابن عبد الشمس کے سپرد فرما دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو سیرۃ النبیؐ ص ۱۱۸۔

منافرۃ کے واقعات خاصکر کیوں قلم انداز کر دیئے گئے؟ صرف اس لیئے کہ بزرگان بنی ہاشم کی ذاتی عظمت و وجاہت اور خاندانی شرافت و نجابت سائر قریش و اقوام اور قبائل عرب پر ان واقعات سے ظاہر ہوتی تھی۔ اور یہ آپ کے اصول تعمیم کے بالکل خلاف تھا۔ جو آپ کا اصل مقصود و موضوع تالیف ہے۔

انہیں وجوہات کے سبب سے حضرت ہاشم کے کارنامجات ملی و قومی کو کل ½۲۰ ساڑھے بیس سطروں میں۔ حضرت عبد المطلب کے جرائد خدمات کو کل ۶ چھ سطروں میں حضرت عبد اللہ ابن عبد المطلب کے حالات قربانی کو کل ½۷ ساڑھے سات سطروں میں۔ اور علیا مکرمہ حضرت آمنہ خاتون سلام اللہ علیہا کے حالات کو کل ½۵ ساڑھے پانچ سطروں میں لکھکر تمام کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ از صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲۔

کیا ایک سیرت نویس اور تاریخ نگار کا طریقہ تحریر ایسا ہی ہونا چاہیئے؟ کیا سیرۃ النبیؐ سے پہلے بھی تاریخ سیرت یا

تذکرہ کی کوئی کتاب لکھی گئی ہے؟ اگر لکھی گئی ہے تو کیا اُس میں بھی اختصار پسندی اور کوتہ قلمی۔ اسقاط واقعات اور استخفاف حالات کے ایسے ہی غیر مستدین اور مہمل طریقہ تالیف اختیار کئے گئے ہیں۔ کیا سیرۃ النبیؐ کے فاضل مولف نے ان حالات کی تدوین وتالیف کے وقت عربی ماخذوں میں یہ واقعات وحالات نہیں دیکھے تھے؟ کیا تاریخ کبیر امام طبری میں جسکا مطبوعہ جرمن نسخہ مولف کے پیش نظر تھا۔ ان واقعات وحالات کی پوری تفصیل مندرج نہیں ہے؟ پھر شمس العلماء صاحب نے اُنکی حقیقت پر تحقیق کی کافی روشنی کیوں نڈالی۔ اُنہیں جیسد واقعات لکھے بھی۔ تو اُنکی تفصیل وبیان میں بالتخصیص کوتہ قلمی اور مختصر رقمی کیوں اختیار فرمائی؟

ان تمام سوالات کا جواب ایک ہے۔ اور وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حقیقتاً شمس العلماء صاحب اپنے اصول اختیار کردہ کی وجہ سے قطعی مجبور ہیں۔ آپ سلسلہ ابراہیمیؑ میں۔ نبوتاً ثابت یا غیر نبوتاً ثابت۔ بنی عدنان یا غیر بنی عدنان۔ بنی سعد یا غیر بنی سعد۔ بنی قیدار یا غیر بنی قیدار۔ قریش یا غیر قریش۔ و بنی ہاشم یا غیر بنی ہاشم اُمیہ یا غیر بنی اُمیہ۔ غرضکہ تمام قبائل وعشائر مکہ جو بعد از شیوع ووقوع اسلام صحابیت کے عالم خاص کے پیدا کرنیوالے۔ اور کچھ اور آگے چلکر خلافت کے کُل پُرزے (دیکھو سیرت الفاروق) ثابت ہونیوالے تھے۔ سبکو ذاتی عظمت ووجاہت میں برابر اور مساوی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آپکی حد درجہ کی دور اندیشی اور کمال حفظ المقدم ہے اسلیئے کہ آگے چلکر قریش کے کسی قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر ترجیح کا دعوے نہو سکے۔ اور تمام قبائل وعشائر صرف اصلیت کی ظاہری بنا پر مساوی المراتب سمجھے جاویں۔ علے الخصوص قوم بنی اُمیہ کو بنی ہاشم سے وقت مقابلہ جو شکستوں پر شکستیں پہونچیں۔ اور ناکامیوں پر ناکامیاں حاصل ہوئیں۔ اُنکا بیان کرنا شبلی صاحب کی مدعائے تالیف کیلیئے بیحد مُضر تھا۔ اسی اُصول کی بنا پر آپنے بنی ہاشم کی بنی اُمیہ پر ترجیح حاصل شدہ کے واقعات کو شروع ہی سے اُصول تعمیم کی ایجاد کرکے بالکل مخفی کردیا ہے۔ اور اُنکے استخفاف کی کوششوں میں اُنتی پُرجوشیوں کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ بالآخر بعد حضرت عبد المطلب۔ حضرت ابی طالبؑ کو ولایت کعبہ اور امارت مکہ کے قدیم آبائی اختیارات سے معزول کرکے مسند امارت حرب ابوسفیان کے باپ کو حوالہ کردی۔ اور اس سے شبلی صاحب کا نفس مطلب یہ تھا۔ کہ اُسی وقت اور اُسی زمانے سے بنی اُمیہ کو بمقابلہ بنی ہاشم سردار قریش ور امیر مکہ تسلیم کرادیں۔ ہم اس مضمون کو پوری تحقیق وتنقید کے ساتھ اسکے اصلی مقام پر لکھیں گے بہر حال مرقومہ بالا تفصیل تنقید کا ماحصل یہ ہے۔ کہ سیرۃ النبیؐ کے مولف کی یہ سخت قابل اعتراض اور ناقابل معافی فروگذاشت ہے۔ کہ وہ جس عالی مرتبہ بزرگوار کی سیرت نویسی کا دعوے کرتے ہیں۔ اُسی کی عظمت خاندانی کے چھپانے۔ گھٹانے اور مٹانے میں اتنے کوشاں اور سرگرم ثابت ہوتے ہیں۔

(۲۵) اس خانوادۂ مقدس کے حالات وواقعات کی ضروری تفصیل وتشریح سے آپ کی ناتوجہی اور

جو ربن قصی کی غلط ترتیب پر صحت کی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

بے التفاتی کی ایک دوسری مثال جلد اول ص ۱۱۹ میں موجود ہے۔ وہ حسب ذیل ہے قصی کے حالات میں تحریر ہے۔ قصی کی چھ اولاد تھی۔ عبد الدار۔ عبد مناف۔ عبد العزی۔ عبد بن قصی۔ تخمر۔ برہ (یہ دو لڑکیاں تھیں) ہمکو ان میں صرف عبد بن قصی کی تحقیق درکار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان چھ ناموں میں صرف عبدیت کا اظہار ہے۔ ابنیت کا نہیں۔ ابنیت کی تخصیص صرف ایک اسی نام کے ساتھ مخصوص پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ہونی چاہیئے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اصل میں "ابن" کا لفظ۔ اصلی نام میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ عوام بن ایسا ہی مشہور ہوگیا۔ اور غلط العام کی حیثیت سے کتب سیرۃ وتاریخ میں نقل ہونیلگا۔ شبلی صاحب کو اگر اس سلسلہ کی تحقیق حال سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی ہوتی۔ تو وہ تفصیل حقیقت کی تکلیف گوارا فرماتے۔ میرے خیال میں زیادہ تفحص وتجسس کی ضرورت نہیں تھی۔ طبقات ابن سعد۔ تو تالیف سیرۃ النبیؐ کے زمانہ میں ہر وقت پیش نظر تھی۔ اُسکی مفصلہ ذیل عبارت نقل کردی گئی ہوتی۔ تو حقیقت حال معلوم ہوجاتی۔

عن ابن عباس قال کان قصی یقول وُلِد لی اربعۃ رجال فسمیت اثنین بالٰھی وواحدا بداری وواحدًا بنفسی فکان یقال لعبد بن قُصی عبد قُصی والذین سمّٰھما بالٰھہ عبد مناف وعبد العُزّی وبداره عبد الدار (جلد اول ص ۳۹ مطبوعہ برلن)	ابن عباس سے مروی ہے۔ کہ قُصی کہا کرتے تھے۔ کہ میرے چار بیٹے ہوئے اُنمیں دو کے نام تو میں نے اپنے معبودوں کے نام پر رکھے۔ اور ایک کا نام اپنے گھر پر رکھا۔ اور ایک نام اپنی خاص ذات سے منسوب کیا۔ اس بنا پر جسم عبد بن قُصی کہتے ہیں۔ وہ عبد قُصی ہے۔ اور جنکے نام معبودوں پر رکھے گئے وہ عبد مناف اور عبد العُزی ہیں۔ اور عبد الدار اُنکے گھر پر نام رکھا گیا ہے

ابن سعد کی عبارت سے حقیقت کا پُورا انکشاف اور لفظ ابن کی بے موقع اور بے ضرورت مداخلت کا اصلی باعث صاف ہوگیا۔ شبلی صاحب اور اُنکے مؤیدین اسکو تو زوائد اور غیر ضروری اُمور میں شمار کریں گے۔ مگر ایک محقق اُسکو آپکی تحقیق کی خامی قبیلہ بنی ہاشم کے استخفاف واسقاط کی بنا پر مبنی بتلائیگا۔ جسکی تفصیل اوپر مندرج ہو چکی ہے۔

(۲۶) نبی عربی (فداہ باقی وابی) کی خاص سیرت لکھی گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ عالم اسلام کا کیا۔ بلکہ عموماً

اسلاف سابقین عرب کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔

تمام غیر اسلامی عوالم کا بھی مسلمہ ہے۔ کہ پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حالات وواقعات کو تاریخ عرب سے پورا تعلق ہے۔ اس بنا پر آپکے سیرت نگار کو عرب کے تمام اخبار وآثار قدیمہ کے سلسلے سے اپنے تفصیل وبیان تالیف کو ترتیب دیکر آپکے زمانہ حیات کے حالات وواقعات کو مسلسل اور مکمل کرنا ضروری اور لازمی ہوگا۔ اس ترتیب میں جو اخبار وحالات آپکے حالات کے مقابل یا مماثل پائے جائینگے۔ وہ خصوصیت کیساتھ قلمبند کیے جائینگے۔ اور جو حالات وواقعات آپکے حالات سے کوئی نسبت خاص نہیں رکھتے۔ وہ قابل الذکر نہیں سمجھے جائینگے۔ آپنے سیرۃ النبیؐ میں۔ جو حقیقتاً عرب کی تاریخی کلیات کا ایک جزو ہے

دو عربی پیغمبروں کے حالات و واقعات کو قطعاً مرفوع القلم فرما دیا۔ قوم عاد کا مختصر سا ذکر کیا۔ مگر اُنکے نبی مرسل حضرت ہود علیٰ نبینا و آلہ وعلیہ السلام کا مختصر ذکر بھی نہ لکھا گیا۔ اسی طرح قوم ثمود کے حالات اور اُنکے قدیم صنعات بیان کیے گئے۔ مگر اُنکے پیغمبر عصر جناب صالح علیٰ نبینا و آلہ علیہ السلام کو کسی حال و واقعہ سے مسلمانوں کو کوئی خبر نہیں دی گئی قدامت عرب کے معتقدین و مویدین اور علم سیرت و تاریخ کے مولفین و مصنفین آپکی اس فروگذاشت اور کمی نظر پر سخت حرف گیری کریں گے۔

شبلی صاحب کو ان اولین مرسلین عرب سلام اللہ علیہما کے حالات و واقعات کے مرفوع القلم فرمانے کے وقت عیسائیوں اور یہودیوں کے اُن مغویانہ اعتراضات کے اثبات کی طرف سے بھی کوئی خوف آیا۔ اور نہ کوئی حیا جو توریت و انجیل کی فہرست انبیا و مرسلین میں اُنکے نام نامی نہ درج ہونیکے باعث قرآن مجید کے اُن اخبار و قصص حسنہ کو (نعوذ باللہ) غلط مانتے ہیں۔ جو ان دونوں بزرگواروں کے متعلق مرقوم ہیں۔ حسرت پر حسرت اور عبرت پر عبرت ہے۔ کہ آجتک ہر خواندہ اور ناخواندہ مسلمان کو اس کا دعوٰے ہے۔ کہ اُن کے اصلی اور حقیقی ملک و وطن کی خاک پاک قدیم الایام سے احکام رسالت اور الہام نبوت کا قدیمی مرکز ہے۔ اور اسی بنا پر وہ اس ارض پاک کی تقدیس کو ارض بابل و شام کی تکریم و عظمت سے قدیم یقین کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہو کہ اُنکی قدامت کی مفاخرت اُنھیں دونوں قدیم پیغمبران عرب وجود ذی جود پر مبنی ہے۔ تو پھر اُنہیں مقدسین کے حالات کو مرفوع القلم کرنا کسی ہمدرد اسلام اور خیر خواہ عرب کا کام ہو سکتا ہے۔

(۲۷) اکثر مباحث کی تنقیدی تفصیل میں استدلال کے ایسے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ جو یا خود یا متعارض اور متناقض ہیں۔ اکثر تنقیدی مضامین بحث میں نہایت شدت سے تقلیدی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور اسلاف کی تحریر کو اصلی معیار تحقیق تلایا گیا ہے۔ بخلاف اسکے اکثر مضامین مباحث میں اسلاف کے اقوال و ارشاد کی کامل تردید و تنقید قلم بند فرمائی گئی ہے۔ اور اُنپر کھلے کھلے الفاظ میں غلط نویسی۔ کمی تحقیق اور غلط فہمی کے الزام قایم کیے گئے ہیں۔ بہت سے واقعات میں نقل کالاصل کے اصول تحریر سے کام لیا گیا ہے۔ اور بہت سے سند جات کی بحث منقول میں استدلال معقولی کی نامعقول مداخلت کی گئی ہے۔ آپکے اکثر طریقہ استدلال تنقیدی میں آپکا قدم بقدم اپنے علمائے کرام کا مقلد ہونا مترشح ہوتا ہے۔ اور بعض مباحث و مسائل کے انداز تحریر سے آپکی شان ایک کامل غیر مقلد کی ثابت ہوتی ہے۔ اکثر واقعات و مضامین کی نقل و تفصیل میں آپکی شدت احتیاط استخراج و استنباط ماخذ اصلی تک محدود پائی جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ اسلام کے کسی مذہبی مسائل میں فکر و عقل سے کام لینا نہیں چاہتے۔ اور اکثر مسائل کی تحقیق میں آپ واقعات کے ایک ایک لفظ کو مسائل عقلی کے

تقلید اسلاف پر اصرار

مطابق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر اوقات تو اس سے بھی ترقی کی گئی۔ اور اپنے کمال تحقیق کے اظہار میں سیرت وتاریخ کے ہر مسئلہ کو ہیئت وفلسفہ کی معیار ومقدار پر صحیح اتارنے کی بیجد سعی فرمائی گئی۔ اس غلط مبحث کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا۔ کہ واقعات سیر وتاریخ کے اصلی مقاصد تو فوت ہوگئے۔ بحث ہی بحث رہ گئی۔ اور انہیں حقیقت کے متلاشی۔ اصلیت کے متمنی منقولات کے فکر مطالعہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ کہ حل معقولات کی پیچیدگیوں میں پھنس کر رہ گئے۔

(۲۸) تاریخ وسیرت کے مضامین کو ہیئت وطبعیات سے مطابق کرنیکے شوق وتمنا میں معارف رسالت اور مشارف نبوت کے ان مخصوصات کو جو طبقات انسانی کی تعمیم سے علیحدہ ہو کر ان مقدس ہستیوں اور نورانی پیکروں کو روحانیت اور ملکوتیت کے حدود تک پہونچا ہوا بتلاتے ہیں۔ بالکل قلم انداز فرمادیا۔ صرف اس خیال سے کہ وہ ہیئت وفلسفہ کے اصول کے مطابق نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ دماغ میں یہ تحریک نہ پیدا ہوئی۔ کہ انبیاء مرسلین سلام اللہ علیہم کی روحانیت اور نورانیت قرآن مجید کے کثیر التعداد آیات میں داخل ہے۔ اور آنحضرت صلعم کے اوصاف روحانی ونورانی تو آیہ واتبعوا النور الذی انزل معہ سے قطعاً ثابت ہے۔ اور جس سے آپ خود مشرف صحابیت کی بحث میں استدلال فرما چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو دیباچہ ۲ لم ص۔

> رسالت کے معارف روحانی سے کہیں بحث نہیں کی گئی۔

مؤلف کا یہ طرز نہ عالمانہ ہے۔ نہ محققانہ ہے۔ نہ فلسفیانہ ہے بلکہ صریح متلوّن مزاجی اور مؤلف کی ناستقل طبعی کا کامل ثبوت ہے۔ حالانکہ الکلام میں ان تمام مباحث پر علماء وحکمائے اسلام کی تائیدی اقوال ارشاد نقل فرما چکے ہیں۔

(۲۹) یہ تو صرف اسلامی مؤلفین اور انکے مؤلفات سے اخذ ونقل واقعات ومختارات میں شبلی صاحب کے مختلف متغیر متلوّن اور غیر مستقل طریقہ تحریر دکھلائے گئے۔ اب آپکا انداز غیر اسلامی مؤلفین اور انکے معترضانہ اقوال وآرا کی تنقید وتردید میں اس سے زیادہ لطف انگیز وحیرت خیز ہے۔ عیسائی معترضین کے جواب تنقیدی میں شبلی صاحب نے اتنی ضرورت سے زائد نرمی اور ملائمیت اختیار فرمائی ہے۔ گویا معترضین کے تمام معترضانہ مطالبات میں آپنے تسلیمی جواب اور اقبال دعوی داخل کردیا ہے۔ انکے مغویانہ اور گمراہانہ استدلال کے مقابلہ میں بعوض اسکے کہ اپنے پیش کردہ تنقیدی اور تردیدی دلائل وبراہین میں قوت مدافعت پیدا کیجائے۔ بیحد ضعف تحریر اور لاانتہا جبن تحقیق دکھلایا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر پورے مقابلہ کی جگہ صریح سپر اندازی کرکے کسی نہ کسی طرح مخالف سے جان بچائی گئی ہے۔

> مخالفین اسلام سے مرعوبیت

(۳۰) قیامت تو یہ کی گئی ہے۔ کہ انکے بے سروپا اور محض بیجا اعتراضوں کے جواب میں بھی بعض مقامات پر

معترضین کے مقابلہ میں سپر اندازی۔

تنقید و تردید سے تو ذرا بھی کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ اُلٹے اپنی ہی مرویات کی جو روایت و درایت کے تمام منازل و مراحل کو طے کر کے حدود متواترات و مشاہدات مسلّمہ کے درجوں تک پہونچی ہوئی تھیں۔ تردید و تکذیب کر دی گئی ہے۔ مثال کیلئے راہب بحیرہؒ کا واقعہ عظیم الشان موجود ہے۔ جسمیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صریح بشارت اور آپکی رسالت کی صحیح تصدیق و اجابت ثابت ہوتی ہے۔ مگر آپ صرف اپنے اُس واہمہ اور عیسائیوں سے مرعوب ہو جانیکی وجہ سے اتنے بڑے مستعد و واقعہ کا انکار کرتے ہیں۔ کہ اُس کی نقل سے عیسائیوں کا یہ مغویانہ قول کہ آنحضرت صلعم نے رسالت کی ابتدائی تعلیم ایک عیسائی عالم سے پائی تھی۔ مطابق ہو جاتا ہے۔ لاہم نے اس واقعہ کی حقیقت اور اس متواتر روایت کی صحت اپنے مقام پر پوری تفصیل سے قلم بند کر دی ہے۔

(۱۳) اس طرح معراج کے عظیم الشان واقعہ کو اصل کتاب میں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ اسلیئے کہ موجودہ

اسقاط واقعہ معراج

طریقۂ فلسفۂ تاریخ نویسی کے خلاف ہے۔ اور مستشرقین یورپ ان اقسام کے اندراج واقعات کو مضحکہ انگیز خیال کرتے ہیں۔ استغفر اللہ شبلی صاحب نے یہ نہ سوچ لیا کہ یعقوب کا آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھنا۔ اور اس طریق سے معارج معراج کا حاصل کرنا اُنکے عہد نامہ قدیم میں موجود ہے۔ جسپر تمام فلسفی اور غیر فلسفی یوروپین افراد قوم کا ایمان ہے۔ اس سے زیادہ تعجب خیز یعقوب کا خدا سے رات بھر کشتی لڑنا۔ اور اُسی ہاتھا پائی میں یعقوب کا چوٹ کھا جانا۔ اُنکی ران کا پھٹ جانا۔ اور اسی بنا پر اُس موضع خاص کے گوشت کا اُن کی اُمت پر حرام ہو جانا۔ اور اس سے زیادہ مضحکہ خیز و کفر انگیز یروشلم (شہر بیت المقدس) کی دو مشہور عورتوں اہلہ اور اہالیہ سے (نعوذ باللہ) خدا کا مبتلا ہو جانا۔ وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے کثیر التعداد لغویات و مہملات بھرے پڑے ہیں۔ جس سے دنیائے عیسائیت میں کسی فرد بشر کو انکار کی مجال نہیں۔

افسوس کہ ان لغویات و مہملات کے قائلین و معتقدین سے آپ اتنا مرعوب ہوگئے۔ کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کو جس کی خبر صریحًا داخل قرآن ہے۔ مرفوع القلم فرما دیا۔ اگر آپ سے اتنی جرأت بھی نہیں ممکن تھی۔ تو کم سے کم آپنے اس کی تفصیل و بیان میں اپنے مربی اور محسن ڈاکٹر سر سید احمد خاں کا طریقہ تحریر اختیار کر لیا ہوتا۔ اور اس واقعہ کی تشریح و توضیح کو۔ رویائے صادقہ تک۔ جو تمام انبیائے کرام کی مقدس سیرت اور مقدمہ رسالت و نبوت میں داخل ہیں۔ محدود کر دیا ہوتا۔ تاہم اہل اسلام کے اطمینان و دلجوئی کیلیئے کافی ہو جاتا۔ آپکے قطعًا قلم زد فرمانے نے تو نبوت اور دین اسلام کے اس قدیم اور بالکل سچے دعوے کو جو اُس کے مشاہدہ عینی میں داخل ہے بالکل تکذیب کر دی۔ نعوذ باللہ آپ کو اس شرمناک تکذیب کی کسنے جرأت دلائی۔ وہی مستشرقین یورپ کی فلسفیانہ تحقیق کی ظاہری ہیبت اور لفظی شوکت نے۔ یا خود آپکی اس آرزو و حسرت نے کہ آپ کا شمار بھی کسی نہ کسی طرح

فلفی مورخین و محققین یورپ میں داخل اور آپکی کتاب سیرۃ النبیؐ بھی فلسفہ کی جدید نصاب تالیف میں شامل ہوجائے

حضرت ہاجرہ کی تحریر مشتبہ چھوڑ دی گئی۔

(۳۲) جناب ہاجرہ سلام اللہ علیہا کو تمام عیسائی مولفین و مصنفین حضرت سارہ کی کنیز بتلاتے ہیں۔ اسلئے گو توراۃ میں انکو کنیز لکھا ہے۔ شبلی صاحب۔ سیرۃ النبیؐ میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے جستہ جستہ تمام واقعات لکھے۔ اور قدامت کعبہ اور ذبیح اسمٰعیل کی خصوصیت کی نسبت اور اصلی قربان گاہ اسمٰعیلؑ کی حقیقت کے متعلق عیسائی مولفین کی غلط فہمیوں کی تنقید و تصحیح بھی کی۔ مگر افسوس ہے۔ کہ اس مسئلہ واجب التنقید اور لازم التحقیق کی نسبت اتنا بھی نہیں لکھا گیا۔ جتنا سر سید احمد خاں صاحب خطبات میں آپکے سامنے لکھ چکے تھے۔

خصائص رسالت کا قطعی اسقاط

(۳۳) مآثر مخصوصہ رسالت اور مظاہرہ منصوصہ نبوت۔ جو طبقہ کرام انبیاء علیہم السّلام میں آغاز عمر سے وقت وفات تک۔ طبقہ عوام سے انکے امور ذاتی و صفاتی کو ممتاز بتلاتے ہیں۔ اشارۃً و کنایۃً بھی کہیں مذکور نہیں کئے گئے۔ اسی خوف سے کہ موجودہ فلسفہ تاریخ نویسی کے اصول کے خلاف ہوگا۔ حالانکہ مولفین یورپ کے عہدنامہ ہائے قدیم و جدید کی دونوں جلدیں اٹھا کر دیکھی جائیں۔ تو تمام انبیا علیہم السّلام کے ان مآثر روحانیہ اور مظاہر نورانیہ کے کثیر التعداد واقعات و مشاہدات مندرج پائے جائینگے۔ جن کے ایجاب و قبول سے کسی عیسائی کو انکار نہ ہوگا۔ مگر شبلی صاحب ہیں۔ کہ بلا وجہ و بغیر سبب۔ اپنے نبیؐ اور اپنے رسولؐ (روحی لہ الفدا) کے مآثر و مکاشف روحانیہ کو ناقابل اندراج سمجھ کر قلم انداز فرمائے جاتے ہیں ؎

ایک ہم ہیں ہمیں مٹنا بھی نہیں آتا ہے ٭ ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

سیرۃ النبیؐ کے ورق اور صفحے کے صفحے الٹ جایئے۔ پیغمبر عربی۔ نبی مطلبی۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ابتدائے عمر سے آخر ایام حیات تک کہیں ان مشاہدات و مکاشفات کا ذکر و مذکور نہیں۔

بچپن کے حالات اور ایام طفولیت کے واقعات کل سوا چھ (۶¼) سطروں میں لکھ کر ختم کر دیے ہیں۔ اور محض سرسری اور سطحی طور پر۔ حلیمہ سعدیہ کے ہاں آپکے پرورش پانے کی کیفیت لکھی گئی ہے۔ مگر حلیمہ کے گھر میں آپکے فیوض قدم سے یمن و برکت کے جو آثار نمایاں ہوئے۔ اور جو قریب قریب تمام عربی کے قدیم ماخذوں میں درج ہیں۔ ایک بھی قابل ذکر نہیں سمجھے گئے۔ ان حالات کے متعلق لکھا بھی گیا۔ تو یہ کہ اسیران طائف کے تذکرے میں خدافہ المعروف بہ شیما کا آپ سے اپنی پشت کا داغ دکھلا کر اپنی معرفت کرانا اور یاد دلانا۔ کہ ایام طفولیت میں ایک بار آپ نے اس کی پشت میں کاٹ کھایا تھا۔ جس کا داغ ابتک موجود ہے۔

افسوس کہ شبلی صاحب کو ایام قیام دار حلیمہ میں صرف یہی واقعہ قابل ذکر ملا جو سراسر منافی اخلاق نبوت اور آداب و تہذیب رسالت ہے۔ نہ معلوم کہ عیسائی متعصبین آپ کے اس واقعہ مندرجہ کو دیکھکر کیسے کیسے حاشیے چڑھائیں گے۔ اور اسلام اور نبی اسلام کے ساتھ آپکی عقیدتمندانہ ارادت و خلوص کی تعریف فرمائیں گے

یا آپکے اس آزادانہ غیر جانبدارانہ اور فلسفانہ طریقہ تحریر کو قدر کی آنکھوں سے لگائیں گے۔
یہ سب کچھ تو ہوتا رہے گا۔ مگر یہاں تو اخلاق رسالت کی شان میں وہبہ لگ گیا۔ شبلی صاحب نے اپنے مجدود محقق ہونیکی آرزو و اشتیاق میں یہ بھی نہ دیکھا کہ ؎ این راہ کہ میروم بترکان است ؛ ان اقسام کے افعال عادات کے اظہار سے۔ بچوں کی فطرت کا کس قدر نقص ثابت ہوتا ہے۔ اور پھر آپ کس بچے کی فطرت کا نقص بتلا رہے ہیں۔ جس کی مبارک فطرت کو آپ الکلام میں اپنے علمائے کرام اور حکمائے اسلام کے اقوال ومختار سے بن اُولیائے آخر با فطرت کاملہ اور صالحہ ثابت کرائے ہیں۔ افسوس آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ بچپن میں جس بچے کی مغلوب الغیظی اور زود رنجی کی یہ کیفیت دکھلائی جاتی ہے۔ پھر آئندہ اوقات حیات میں اُسکے اعلےٰ ترین اخلاق اشفاق عدیم المثال صبر و رضا اور جواب عفو لاخطا کی مثالیں کیسے قایم کرسکتے ہیں۔ ہم آپ کے اس غلط واقعہ کی حقیقت کا اسکے خاص مقام پر کامل انکشاف کریں گے۔

(نمبر ۳) آنحضرت صلعم کی ابتدائے عمر کے احوال میں۔ بذیل ذکر رضاعت حلیمہ سعدیہ۔ یہ حدیث نقل فرمائی گئی ہے کہ میں تم سب سے زیادہ فصیح تر ہوں۔ کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں۔ اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔ سیرۃ النبیؐ بحوالہ ابن سعد ج ا ص ا ۷۔

فصاحت و بلاغت نبویؐ کیسی تھی۔ رہی نہیں نعوذ باللہ۔

آپ کا مدعائے تحریر یہ ہے۔ کہ زبان رسالت کی فصاحت و بلاغت کا کمال قبیلہ بنی سعد ہی کی پرورش۔ رضاعت۔ اور رفاقت کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر یہ حدیث۔ ایام رضاعت بنی سعد کے حالات میں لکھی گئی۔ افسوس ہے۔ کہ تعمیم اور سافت عام کا خیال کسی وقت شبلی صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ آپ زبان رسالت کی فصاحت و بلاغت کو اگر کمالات لدنیہ اور خصائص نبویہ میں داخل کرینگے خوف کھاتے ہیں کہ عیسائی اعتراض کر دینگے۔ فلسفانہ تاریخ نویسی کے خلاف ہوگا۔ اور اس بنا پر لکھتے ہیں۔ کہ آپکے یہ کمالات قبیلہ ہوازن و بنی سعد کی تعلیم و تربیت کے نتائج تھے۔ تو اس قیاسی تجویز کے ساتھ آپکو یہ صحیح خیال نہیں آتا کہ خاندان قریش عموماً اور خاندان قریش میں قبیلہ بنی ہاشم خصوصاً زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے۔ تمام اہل عرب کا سرمایہ ناز تسلیم کیا جاتا تھا عربی کی تمام تاریخوں میں قصی سے لیکر عبدالمطلب اور ابی طالب تک کے خطبات مذکور ہیں جن کے لفظ لفظ سے زبان عرب کی اعلیٰ ترین فصاحت و بلاغت ثابت ہوتی ہے۔ اور جنکو آپنے تو نہیں۔ مگر میں نے اپنی اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر پوری تفصیل سے نقل کر دیا ہے ان شواہد کے مقابلہ اور موجودگی میں قبیلہ بنی سعد یا ہوازن کی تعلیم و صحبت کو زبان رسالت کے کمالات کا تنہا باعث تجویز کرنا صریح بے عقلی ہے۔ اگر شبلی صاحب ذرا بھی غور و تعمق سے کام لیتے۔ تو انہیں کی نقل کردہ حدیث سے حقیقت کا انکشاف کامل ہو جاتا۔ کیونکہ زبان رسالت نے اپنی فصاحت و بلاغت

کی اعلےٰ ترین زبان ہونیکا جو دعوےٰ فرمایا ہے اُسکے الفاظ یہ ہیں انا اعربکم انا من قریش میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ ترفصیح ہوں. اسلیئے کہ میں قریش سے ہوں۔ اس سے ثابت ہوگیا. کہ آپ اپنی فصاحت وبلاغت کو سب سے پہلے اپنا کمال خاندانی بتلاتے ہیں۔ ان الفاظ کے بعد ارشاد فرمایا ہے ولسانی لسان بنی سعد بنی بکر میری زبان بنی سعد بنی بکر کی زبان ہے یعنی میری زبان بنی سعد بنی بکر کی زبان کے متقابل اور مماثل ہے۔

اس حقیقت کے مقابلہ میں بنی سعد کی تعلیم وصحبت کو آنحضرت صلعم کی فصاحت وبلاغت کا تنہا اور اصلی باعث خیال کرنا. اور اُنکی زباندانی کو قریش اور بنی ہاشم کے اعلےٰ ترین ادبیات پر ترجیح وتفضیل دینا. گویا قول رسول صلعم کی تکذیب کرنا ہے. (نعوذ باللہ) حقیقت یہ ہے کہ شبلی صاحب نے شان رسالت ہی کو نہ خود سمجھا ہے اور نہ اپنی زبان تمام کتاب میں اُسکی اصلیت اور حقیقت کسی کو سمجھائی ہے. اس بنا پر اُنسے ایسی لغزشوں کا واقع ہونا لازمی ہے

(۳۵) اسی طرح مارگیولوس مستشرق جرمن کے اس مغویانہ تعریض کا جواب کہ ابی طالب آپکے بچپن میں اُجرت پر مکہ والوں کی بکریاں چروایا کرتے تھے. ایسے ضعیف لفظوں اور نامستحکم طریقوں میں دیاگیا. جس سے گویا تسلیم وایجاب کے پہلو نکلتے ہیں. اگرچہ اس اعتراض کا اصلی سبب آپ خود. ابن ماجہ کے ایک شیخ کی غلط فہمی تبلاتے ہیں. اور اُن کے بعد بخاری کا اُنسے غلط استخراج واستنباط ثابت کرتے ہیں. مگر تاہم اصل حقیقت کا انکشاف نہیں فرماتے. طریقہ استدلال جو قایم فرماتے ہیں. وہ ایسا ضعیف اور خلاف اُصول ہے. جو غیر مسلم معترضین کیلئے کبھی مُسکت. اطمینان دہ اور تشفی بخش نہیں ہوسکتا. کیونکہ وہ نہ بخاری کی قصیر النظری اور زود اعتباری کے جوابدہ ہیں. اور نہ ابن ماجہ کے شیخ سوید ابن سعید کی غلط فہمی کے ذمہ وار ہیں. میں نے اسواقعہ کو پوری حقیقت کیساتھ اپنے مقام پر بالتفصیل بیان کردیا ہے. یہ تمام آفتیں ارباب صحاح کی عموماً اور بخاری صاحب کی خصوصاً عقیدتمندانہ تقلید کیوجہ سے پیش آئی ہیں. اور اس حقیقت کی انکشاف نے ہمکو صحیح الکتاب بعد الکتاب البخاری کی مختصری تنقید پر مجبور کردیا ہے

> مارگیولوس کے اعتراض کا ناقص جواب

صحت صحیح بخاری پر منتقدانہ نظر

(۳۶) صحیح بخاری کو معیار تحقیق بنایا. پھر اس شدت وعصبیت کیساتھ کہ وہ کتب تفاسیر. احادیث. تواریخ اور سیر پر خواہ مخواہ مرجح معتبر اور مستند تسلیم کیگئی. اسلاف کی تقلید کورانہ کا یہی اصلی طریقہ ہے. جو ایک محقق اور حقیقت کے متلاشی کا نہ کبھی شعار تحقیق ہوسکتا ہے. نہ معیار تالیف یہی اصل غلطی ہے اور تمام مفاسد اور معارض کی اصل وغایت. افسوس ہے کہ شبلی صاحب نے صرف اپنی خود غرضی کی بنا پر صحت بخاری کی

> صحت بخاری پر اجماع ثابت نہیں

ایک رُخی صورت قائم کی ہے۔ اور اُسکے دوسرے داغدار رُخ کو بالکل زیر نقاب رکھا ہے۔ اوّل تو اسکتاب کی صحت پر اجماع عام کا غلط قیاس کیا گیا ہے۔ اور نہایت شہرت کیساتھ یہ غلط اعتقاد سواد اعظم اہلسنت میں عالمگیر ہو رہا ہے۔ اسکی اصلی حقیقت شرح سلم الثبوت بحر العلوم مولوی عبد العلی صاحب کی اصل عبارت سے جن کی تصدیق و توثیق آپ سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ ص ۷۱ میں اُنکا مختار نقل کرکے فرما چکے ہیں۔ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

نزع ابن الصّلاح وطائفة من المتلقّين اهل الحديث زعموا انّ رواية الشيخين محمّد ابن اسمٰعيل البخاری ومسلم ابن الحجّاج صاحبی الصحيحين يفيد العلم النّظری للاجماع علی انّ الصحيحين مزيّة علی غيرهما وتلقت الامّة بقبول لهما والاجماع قطعی وهذا بهت فانّ راجع الی وجدانه يعلم بالضّرورة انّ مجرّد روايتهما علم لزم تحقّق النّقيضين فی الواقع وهذا الّذی ذهب اليه ابن الصّلاح واتباعه بخلاف ما قاله الجمهور من الفقهاء والمحدّثين لانّ انعقاد الاجماع علی المزيّة علی غيرهما من مرويّات الثقات الأخرين ممنوع والاجماع علی مزيّتهما فی نفسه لا يفيد لانّ جلالة شانهما وتلقی الامّة بكتابيهما لو سلّم لا يستلزم ذلك القطع العلم فانّ القدر المسلّم المتلقی بين الامّة ليس الا انّ رجال مروياتها جامعة الشروط التی شرطها الجمهور لقبول روايتهم وهذا لا يفيد الا الظن واما انّ مرويا ثابتة من رسول الله صلعم فلا اجماع علی صحّته جميع ما فی كتابيهما لانّ رواتهما منهم قدريّون وغيرهم من اهل البدع مختلف فيه فاين الاجماع علی صحّة مرويات القدريّة فاما يلزم انّ احاديثهما اصحّ الصحيح يعنی انها مشتملة علی شروط المعتبرة

یعنی ابن الصلاح وغیرہ متلقّین اہلحدیث نے یہ گمان کیا ہے کہ روایات صحیح بخاری و صحیح مسلم مفید علم نظری ہے (یعنی یقینی) کیونکہ اسپر اجماع ہو چکا ہے۔ کہ صحیحین کو دوسری کتابوں پر فضیلت ہے اور امت نے اسکو قبول کر لیا ہے۔ اور علم اجماعی یقینی ہے۔ حالانکہ یہ قول بالکل زبردستی ہے کیونکہ جو شخص اپنے وجدان کی طرف رجوع کریگا اُسکو بداہتًا معلوم ہو جائیگا۔ کہ شیخین کی مجرّد روایت سے تو کسی طرح علم یقینی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اُن میں یقینًا ایسی روایتیں ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ پس اگر یہ روایتیں مفید یقین ہوں تو لازم آتا ہے کہ نقیضین فی الواقع جمع ہوں (جو محال ہے) ابن الصلاح کا یہ مذہب اقوال جمہور فقہا و محدثین کے خلاف ہے۔ کیونکہ انعقاد اجماع اسپر کہ اُنکی روایات دوسرے محدثین کی روایتوں سے افضل ہیں ممنوع ہے اور اگر خود بخاری اور مسلم کی فضیلت پر اجماع ہے۔ تو اس سے کوئی فائدہ نہیں رہی جلالت شان۔ اور یہ کہ اُمت نے اُسے قبول کیا ہے۔ پس اگر مان بھی جائے۔ تو اس سے اُنکی روایتوں کی نسبت علم یقینی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کیونکہ قدر مسلّم بین الامت اسی قدر ہے کہ ان حدیثوں کے راوی جامع ہیں اُن شرائط کے جنہیں جمہور نے قبول روایت کیلئے مقرر کیا ہے اور جامعیت شرائط سے صرف ظن حاصل ہوتا ہے نہ یقین۔ رہا یہ کہ حدیثیں رسول صلعم سے ثابت ہیں۔ تو ہرگز اسپر اجماع نہیں ہوا۔ اور کیونکر اسپر اجماع ہو سکتا ہے کہ کل روایتیں اُنکی صحیح ہیں کیونکہ بہت سے راوی انکے قدری ہیں اور قبول روایت اہل بدعت مختلف فیہ ہے پھر کیونکر اجماع ہو سکتا ہے صحت روایات قدریہ پر خلاصہ یہ کہ اگر لازم آتا ہے تو صرف یہ کہ روایتیں اُنکی صحیح ہیں،

عند الجمہور وعلی الکمال وہذا لا یفید الا الظن القوی۔ ہذا ہو الحق المتبع ولنعم قال الشیخ ابن ہمام ان قولہم بتقدیم مروّیاتہما علی المرویات لائمۃ الاخرین قول لا یعتد بہ ولا یقتدی بل ہو من تحکماتہم الصرفۃ کیف لا وان الاصحیۃ من تلقاء عدالۃ الرواۃ وقوۃ ضبطہم واذا کان رواۃ غیرہم عادلین ضابطین لہما وغیرہما علی السواء ولا سبیل للحکم بمزیتہما علی غیرہما الا تحکما والتحکم لا یلتفت الیہ فافہم ص ۱۱۲

یعنی شتمل ہیں اُن شروط پر جو معتبر ہیں جمہور میں بوجہ کمال تو اسی قدر حاصل ہوگا۔ مگر صرف ظنّ قوی۔ یہی مذہب قوی ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔ شیخ ابن ہمام نے کہ اہلحدیث کا یہ دعوے ہے کہ ان کتاب کی روایت کو دوسرے محدثین کی روایات پر فوقیت حاصل ہے۔ ایسا قول ہے جو کسی طرح قابل شمار نہیں۔ بلکہ یہ اُنکا تحکم محض ہے۔ کیونکہ صحت کا مدار عدالت تو عدالت رواۃ اور قوت ضبط پر ہے۔ جب دوسرے محدثین کے راوی ایسے ہی عادل اور ضابط ہونگے۔ تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ ان کو نہ فوق دیا جائے۔ لہذا اُنکا حکم صحت کے متعلق محض تحکم کی شان میں ہے۔ جو کسی نوع وصورت سے التفات کے قابل نہیں ہے۔ پس سمجھ لیا جاوے۔

بحر العلوم کی مندرجہ بالا عبارت سے صحت صحیح بخاری ومسلم پر اجماع عام کا غلط خیال عوام میں جو پھیلا دیا گیا ہے۔ اُس کی مقدار حقیقت بخوبی معلوم ہوگئی۔ اس تنقید وتحقیق سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ محققین علمائے سواد اعظم ابتدا ہی سے حکم لگا رہے ہیں۔ کہ صحیحین میں روایات متناقضہ جمع ہیں۔ جو ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اور جو باوجود ان عیوب کے اُنکی صحت اور دوسری کتابوں پر اُنکی ترجیح وفضیلت کا قائل ہے۔ وہ محض زبردستی سے ایسا حکم لگاتا ہے جو ہرگز قابل التفات نہیں ہوسکتا۔

علمائے قادحین بخاری اتنا لکھ کر ہم ذیل میں اُن علمائے کرام کے صرف نام لکھدینے پر اکتفا کرتے ہیں جنہوں نے صحیح بخاری پر تعریضات اور جرحیں قایم کی ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ ہم اُن کی علیحدہ علیحدہ اقوال لکھ کر اس مبحث کو اپنی ضرورت سے زیادہ طول دینا پسند نہیں کرتے۔ اور اُس کی تفصیل کو کتاب المسمّی۔ یہ کتاب الجرح علی البخاری۔ مطبوعہ الفقیہہ امرتسر کے مطالعہ اور حوالہ پر محوّل کرتے ہیں۔

حسب ذیل اکابر محدثین ومحققین نے صحیح بخاری پر جرحیں وارد کی ہیں۔

امام دارقطنی[1]۔ ابن جوزی[2]۔ ابن بطال[3]۔ ابن عبدالبر[4]۔ علامہ عینی[5]۔ باجی[6]۔ ابن ہمام[7]۔ ذوالنبین اندلسی[8] شیخ عبدالحق دہلوی[9]۔ ملا علی قاری[10]۔ سخاوی[11]۔ محب اللہ بہاری[12]۔ بحر العلوم[13]۔ داودی[14]۔ حافظ ابو مسعود[15] علامہ غسانی[16]۔ ابن مندہ[17]۔ ابن سعد[18]۔ علامہ ذہبی[19]۔ حافظ شرف الدین[20]۔ علامہ دمیاطی[21]۔ جار اللہ زمخشری[22] قاضی ابوبکر باقلانی[23]۔ امام غزالی[24] اور علامہ کرمانی[25] وغیرہم

ہم نے محض سرسری طور سے پچیس[25] علمائے معتبرین قادحین بخاری کے نام لکھ دیے۔ ان بزرگوں کے

علاوہ۔ یہ نکتہ بھی ضرور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ الفقیہ امرتسر نے لکھ کر بتلایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام مسلم۔ نسائیؒ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اپنی اپنی صحیح و مسانید و سنن میں امام بخاری سے کوئی روایت نہیں کی۔ اگر کوئی روایت کی ہے۔ تو وہ کس مقام پہ ہے۔ اور اگر نہیں کی۔ تو کیوں نہیں کی؟ کیا یہ لوگ بخاری کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُنسے روایت لیں

صحت بخاری کی مجہولیت

صحت بخاری کا غلط اور عامیانہ خیال جیسا کہ عالمگیر ہو رہا ہے۔ وہ حقیقت ایک افواہ غلط سے زیادہ ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ بخلاف اسکے۔ اُس کی صحت پہ اُسکے آغاز تالیف ہی سے جرح و قدح ہوتی چلی آتی ہے یہانتک کہ علمائے معتبرین کی ایک تعداد کثیر نے اُسکی صحت سے انکار کر دیا۔ امام ابن ہمام کے مختار ہو اور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کہ قدری اور اہل بدعت رواۃ بخاری میں داخل ہیں۔ اب ہم ذیل میں چند راویان بخاری کی حقیقت اور دکھلاتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجانین اور شیاطین اُمت ہر قسم کے لوگ اسمیں علی الاکثر شامل ہیں۔

(۱) حریز ابن عثمان سفیانی ناصبی ہے۔ جسکی نسبت تہذیب التہذیب جلد دوم ص ۲۴۰ میں مرقوم ہے:-

قال العجلی شامی وکان یحمل علی علی وقال عمر ابن علی کان ینتقص علیا وقال یزید بن ھارون کان حریز یقول لا احب علیا قتل ابی وقال الحسن ابن علی الخلال عن یزید نحو ذالک وقال الضحاک ابن عبد الوھاب ھو متروک حدثنا اسمعیل بن عیاش سمعت حریز ابن عثمان تقول ھذا الذی یرویہ الناس عن النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انہ قال لعلی انت بمنزلۃ ھارون من موسیٰ حق ولکن اخطاء السامع قلت ما ھو فقال انما ھو انت منی بمنزلۃ قارون (نعوذ باللہ) من موسیٰ قلت عمن تروِیہ قال سمعت الولید بن عبد الملک یقولہ وھو علی منبر وحکی الازدی فی الضعفاء ان النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اراد ان یرکب بغلۃ جاء علی فحل حزام البغلۃ لیقع النبی صلعم قال الازدی من کانت ھذہ حالہ لا یروی عنہ قلت لعلہ سمع ھذہ القصۃ ایضا من الولید قال یحییٰ بن صالح وخاطی ابی حریز ابن عثمان عن عبد الرحمن ابن میسرۃ عن النبی صلعم حدیثا فی

عجلی کا بیان ہے۔ کہ وہ شامی تھا۔ اور حضرت علیؑ پر برابر تان کیا کرتا تھا عمر ابن علی کہتے ہیں۔ کہ وہ تنقیص علیؑ کرتا تھا۔ اور اُنکو گالی دیتا تھا۔ اور حسین ابن علی الخلال دوسرے موقع پر ایسا ہی قول لکھتے ہیں۔ ضحاک ابن عبد الوہاب کہتے ہیں کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ اور متہم ہے۔ اسمٰعیل ابن عیاش کہتے ہیں کہ وہ (حریز) کہتا تھا۔ کہ یہ حدیث جو مشہور ہے انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ۔ تو آنحضرت صلعم نے یوں فرمایا تھا۔ (نعوذ باللہ) انت منی بمنزلہ قارون من موسیٰ۔ مگر سامع نے غلطی کی۔ میں نے پوچھا تم نے کس سے سُنا۔ جواب دیا کہ ولید ابن عبد الملک نے منبر پر ایسا ہی بیان کیا۔ علامہ ازدی نے حریز کو ضعفا میں لکھا ہے اور بیان کیا ہے۔ کہ حریز نے کہا۔ کہ رسول صلعم نے جب چاہا۔ کہ اپنے خچر پر سوار ہوں۔ تو علیؑ نے آگے سے آکر اسکی لگام ڈھیلی کر دی کہ حضرت گر پڑیں۔ ابن حجر کہتے ہیں۔ کہ شاید اسکو بھی ولید ابن عبد الملک سے سنا ہوگا۔ یحییٰ ابن صالح وحاظی بیان کرتا ہے۔ کہ حریز نے تنقیص جناب امیرؑ میں ایک ایسی حدیث بیان کی۔ کہ اُسکا ذکر بھی مناسب نہیں اور حدیث مستقل بحد درجہ قابل انکار ہے۔ کہ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہوگا کبھی ایسی باتوں کو نہ بیان کریگا۔ یحییٰ ابن صالح سے عنجار نے

تنقیص علی ابن ابیطالبؓ لا یصلح ذکرہ وحدیث معقل منکر جدا لا یروی مثلہ من یتق اللہ وقال البخار یحیی ابن صالح لم نکتب عن حریز فقال کیف اکتب عن رجل صلیت معہ صلوۃ الفجر سبع سنین فکان لا یخرج من المسجد حتی یلعن علیا سبعین مرۃ مرۃ و قال ابن حبان کان یلعن علیا بالغداۃ اللہ سبعین مرۃ وبالعشی سبعین مرۃ فقیل لہ فی ذلک فقال ھو القاطع رؤس آبائی واجدادی وکان داعیۃ الی مذھبہ یتنکب حدیثہ وقال ابن حجر عسقلانی وعند البخاری حدیثان۔

پوچھا۔ کہ حریز ابن عثمان سے تم نے کوئی حدیث کیوں نہ لکھی یحییٰ نے جواب دیا۔ کہ ہم کیونکر ایسے شخص سے روایت کر سکتے ہیں۔ کہ جس کے ساتھ ہم نے سات برس تک کال نماز صبح پڑھی۔ اور وہ روزانہ مسجد سے اسوقت تک نہیں نکلتا تھا جب تک کہ علی ابن ابی طالب پر ستر بار لعنت نہ کر لیتا تھا۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ کہ وہ ہر روز صبح کو حضرت علیؑ پر ستر مرتبہ اور شام کو ستر بار لعنت کیا کرتا تھا۔ کسی نے اُس سے وجہ پوچھی۔ تو اُس نے کہا۔ کہ علیؑ نے میرے سر آور دہ آباؤ اجداد کے سر کاٹے ہیں۔ یہ حریز ایک اپنے مذہب خاص کا داعی تھا۔ پھر ایسے شخص سے کیونکر روایت لی جا سکتی ہے۔ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں۔ کہ بخاری نے اس (حریز) کی دو حدیثیں لی ہیں۔

(۲) عمران ابن حطان خارجی ہے۔ تاریخ ابو الفدا میں حسب ذیل اُنکے حالات تحریر ہیں۔

عمر ابن حطان خارجی یرثی ابن ملجم ؎

یا ضربۃ من ولی ما اراد بھا
الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا
انی لاذکرہ یوما فاحسبہ
اوفی البریۃ عند اللہ میزانا

عمران ابن حطان خارجی نے ابن ملجم کے مرثیہ میں یہ اشعار موزوں کئے ہیں

کیا اچھی ضرب تھی اس ولی (ابن ملجم) کی جس سے
محض خوشنودی خدا کے ارادے سے وہ ضرب لگائی
میں جب ابن ملجم کو یاد کرتا ہوں۔ تو گمان کرتا ہوں کہ
اُسکا میزان عمل خدا کے آگے تمام مخلوق کو زیادہ پورا ہے۔

وقال العسقلانی فی الاصابہ عمران ابن حطان یکنی اباشھا تابعی مشھور وکان من رؤس الخوارج لم یذکرہ احد فی الصحابہ الا ما وقع فی تعلیقات القاضی حسین بن محمد الشافعی فانہ ذکر ابیات عمران ابن حطان التی رثی بھا عبد الرحمن ابن ملجم قاتل علیؓ فعارضہ الامام ابو الطیب الطبری فقال ؎

انی ابرء مما انت تذکرہ
عن ابن ملجم الملعون بھتانا
انی لاذکرہ یوما فالعنہ

ابن حجر عسقلانی کتاب اصابہ میں لکھتے ہیں۔ کہ عمران خطان سرگروہ خوارج مشہور تابعی ہے اسکا ذکر طبقہ صحابہ میں کسی نے نہیں کیا۔ مگر قاضی حسین محمد ابن شافعی نے تعلیقات میں عمران کو صحابی بیان کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جب عمران کے شعر ابو الطیب الطبری نے سُنے۔ تو اُسکے جواب میں یہ شعر منظوم کئے

میں عمران ابن حطان کے اشعار سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں
جو اُس نے ابن ملجم کی مدح میں بطور بہتان۔ کہے ہیں
میں ابن ملجم کو یاد کرتا ہوں۔ تو لعنت کرتا ہوں۔ اور اُسکے
دین پر اور عمران ابن حطان پر بھی لعنت کرتا ہوں

یہ لکھکر قاضی حسین ابن محمد شافعی لکھتے ہیں۔ کہ ابو الطیب طبری نے غلطی کی

دینا والعن عمران ابن حطانا
قال القاضی حسین ابن محمد ھذا الذی قالہ ابو
الطیب الطبری خطاء فان عمران صحابی لا تجیز
لعنه قال ابن حجر العسقلانی وقد اخرج البخاری
وابوداؤد لعمران ابن حطان (الی ان قال) و
عن عثمان البتی قال کان عمران ابن حطان من اھل
السنة فی تلخیص الجبیر لابن الحجر العسقلانی
قال وبالغ ابن حزم فقال لا خلاف بین احد
من الائمة فی ان ابن ملجم قتل علیا
متاؤلا مجتهدا مقدرا انه علی الصواب

جو عمران ابن حطان کی نسبت لعنت کے الفاظ استعمال کئے کیونکہ عمران
ابن حطان صحابی ہے۔ اور اُس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز ابن حجر
موصوف کتاب مذکور (اصابہ) میں لکھتے ہیں۔ کہ بخاری اور ابوداؤد
نے عمران ابن حطان کو روایت کی ہیں۔ اور محدث عثمان البتی
نے عمران ابن حطان کو اہلسنت والجماعت میں شمار کیا ہے۔ کتاب
تلخیص الجبیر میں ابن حجر عسقلانی میں ہے۔ کہ ابن حزم الظاہری نے
مبالغہ کیا تھا کہا ہے۔ کہ ائمہ مجتہدین میں اس امر کے متعلق کچھ
اختلاف نہیں ہے۔ کہ ابن ملجم نے علیؓ ابن ابیطالبؓ کو تاویل و اجتہاد
کی بنا پر قتل کیا۔ کیونکہ ابن ملجم مذکور سمجھا تھا۔ کہ اس باب میں
اُس کی رائے خطا پر نہیں ہے۔ بلکہ صواب پر ہے سلہ

(۳۳) ابو قلابہ ہے۔ جسکا پورا نام عبداللہ ابن زید ہے۔ تہذیب التہذیب میں اُنکی نسبت مرقوم ہے:۔

کان یحمل علی علیؓ ولم یروعنه شیئا

علیؓ ابن ابیطالبؓ پر حملہ کیا کرتا تھا۔ اور اُس سے آپسے ایک روایت
نہ لی۔ ص ۲۲۵ ج ۵ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں الا انه مدلس وہ مدلس حدیث تھا۔ اور کتاب المدلسین

میں ہے ابو قلابہ عبداللہ ابن زید ذکر الذھبی
انه کان مدلس عمن لحقهم وعمن لم یلحقهم وکان
له صحف یحدث منها یدلس۔

ابو قلابہ عبداللہ ابن زید۔ ذہبی اسکے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ حدیثوں
میں جن سے ملا تھا اُنکی حدیثوں میں بھی اور جن سے نہیں ملا تھا اُنکی حدیثوں میں
بھی تدلیس کرتا تھا۔ اسکے پاس حدیث کی کتابیں تھیں جنہیں سے تدلیس کرتا تھا۔

تہذیب التہذیب جلد پنجم میں مرقوم ہے۔

قال ابو الحسن علی بن محمد القابسی المالکی فیما نقله
ابن التین شارح البخاری فی الکلام علی القسامة
بعد ان نقل قصة ابی قلابة مع عمر ابن العزیز
علی مکانه فی العلم کیف لم یعارض ابا قلابة فی
قوله ولیس ابو قلابة من فقهاء التابعین وهو معدود
عند الناس فی البله کذا قال تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۲۶

ابن التین شارح بخاری ناقل ہیں۔ کہ ابی قلابہ نے عمر ابن عبدالعزیز
سے مسئلہ قسامہ کے متعلق بیان کیا۔ جسکے مطابق عمر ابن عبدالعزیز
نے فیصلہ کیا۔ اس پر ابوالحسن ابن علی ابن محمد قابسی المالکی
کہتے ہیں کہ تعجب ہے۔ عمر ابن عبدالعزیز سے کہ باوصفیکہ
وہ کیسے عالم جید تھے۔ انہوں نے ابو قلابہ سے یہ کیوں نہ
کہا۔ کہ تیرا شمار تو بلہ یعنی احمقوں میں ہے۔

(۳۴) خالد ابن مہران ہے۔ تہذیب التہذیب میں ہے قال ابو حاتم یکتب حدیثه ولا یحتج

سلہ نہیں معلوم قاتلان صحابہ یا تابعین حضرت عمرؓ و عثمانؓ کی نسبت تاویل و اجتہاد ثابت نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ تاریخوں سے قتل عثمانؓ پر صحابہ کا اتفاق ثابت ہوتا ہے۔ مؤلف عفی عنہ

ص ۲۰۰ جلد ۳۔ اسکی حدیث لکھو۔ مگر اُس سے احتجاج نہ کرو۔ پر اسی کتاب میں یہ عبارت مندرج ہی۔

والظاہر ان کلام ھؤلاء فیہ من اجل اشار الیہ حماد ابن زید من تغیر حفظہ باخرہ او من اجل دخولہ فی عمل السلطان۔

یہ سب اعتراضات خالد پر اسوجہ سے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ حماد بن زید نے اشارہ کیا ہے۔ کہ آخر عمر میں اُسکا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ اور اسوجہ سے کہ وہ سلطنت کے امور میں داخل ہو گیا تھا

(۵) عبد الاعلیٰ ہے۔ میزان الاعتدال میں مرقوم ہے۔

قال محمد ابن سعد لم یکن بالقوی فات سنۃ تسع وثمانین ومائۃ وقال احمد کان یری القدر وقال بندار واللہ ما کان یدری ای رجلیہ اطول۔ ص ۲۰ جلد ۲

محمد ابن سعید کہتے ہیں کہ وہ قوی الحدیث نہ تھا۔ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ احمد کہتے ہیں۔ کہ وہ قدری طریق و ارادے کا آدمی تھا۔ بندار کہتے ہیں کہ قسم بخدا وہ یہ بھی نہ جانتا تھا۔ کہ کون سا پیر اُسکا بڑا ہے

(۶) ابو اسحٰق سبیعی ہے۔ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں۔

روی جریر عن مغیرہ فقال ما افسد حدیث اھل الکوفہ غیر ابی اسحاق والاعمش۔

جریر مغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ کہ حدیث اہل کوفہ کو ایسا فاسد نہیں کیا۔ جیسا ابی اسحٰق اور اعمش نے۔

تہذیب التہذیب میں اُنکی نسبت مذکور ہے۔

قال ابن حیان فی کتاب الثقات کان مدلسا وا کذا ذکرہ فی المدلسین حسین الکرابیسی وطبری۔

ابن حیان کتاب ثقات میں لکھتے ہیں۔ کہ وہ مدلس تھا۔ اور ایسا ہی حسین کرابیسی۔ اور امام طبری نے ابی اسحاق سبیعی کو مدلسین میں شمار کیا ہے۔ تہذیب جلد ۸ ص ۶۷۔

(۷) عمر ابن سعد (قاتل امام حسین علیہ السلام ہے۔ طرّہ تو یہ ہے۔ کہ یہ ابو اسحٰق ایسا شخص ہے۔ جو عمر ابن سعد سے روایت کرتا ہے۔ جو قاتل امام حسین علیہ السلام ہے۔ میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ میں مرقوم ہے۔

عمر ابن سعد الزھری ھو فی نفسہ غیر متھم لکنہ باشر قتل الحسینؑ وفعل الافاعیل روی شعبہ عن ابی اسحاق عن العیزار ابن حریث عن عمر ابن سعد فقام الیہ رجل فقال اما تخاف اللہ تروی عن عمر ابن سعد فبکی وقال لا اعود وقال العجلی روی عنہ الناس تابعی ثقہ وقال احمد بن زھیر سألت عن ابن معین ابن سعد ثقۃ فقال کیف یکون من قتل الحسین ثقۃ۔

عمر ابن سعد زہری اگرچہ فی نفسہ غیر متہم ہے۔ مگر مباشرۃ قتل امام حسین علیہ السلام کیوجہ سے وہ متہم ہے۔ اور بہت سے افعال اُس کے ایسے ہی سرزد ہوئے۔ شعبہ ابن اسحٰق سے وہ عیزار ابن حریث سے۔ وہ ابن سعد سے روایت کرتا تھا۔ تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔ کہ تجھ کو خوف خدا نہیں آتا کہ تو عمر ابن سعد سے روایت کرتا ہے۔ یہ سنکر وہ رونے لگا اور کہنے لگا کہ اب ایسا نہ کرونگا۔ عجلی کہتے ہیں۔ کہ بہت لوگوں نے عمر سعد سے روایت کی ہے اور وہ تابعی ثقہ تھا۔ احمد ابن زہیر کہتے ہیں کہ میں نے ابن معین سے پوچھا کہ عمر سعد ثقہ تھا۔ وہ بولے کہ جو شخص قاتل امام حسین علیہ السلام ہو وہ کیونکر ثقہ ہو سکتا ہے

کچھ ابو اسحاق اور عمر سعدی کی حدیثوں سے صحیحین بخاری اور مسلم بھری نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے بیٹے ابراہیم۔ اُس کے پوتے ابوحفص بھی راویان صحاح ستہ میں داخل ہیں۔ اور اُنھیں کے ساتھ عزازین حریث۔ یزید ابن ابی مریم قتادہ۔ یزید ابن حبیب۔ سب رواۃ صحاح ستہ سے ہیں۔

(۸) شمر ذی الجوشن سے۔ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں۔

شمر ابن ذو الجوشن ابو السابغة الضبابي عن ابيه وعن ابو اسحق السبيعي ليس باهل للرواية فانه حل قتله الحسين رضي الله عنه وقد قتله اعوان المختار روى ابو بكر بن عياش عن ابي اسحاق قال كان شمر يصلي معنا ثم يقول اللهم انك تعلم اني شريف فاغفر لي قلت كيف يغفر الله لك وقد اعنت على قتل ابن رسول الله قال ويحك فكيف نصنع ان امراءنا هولاء امرونا بامر فلم نخالفهم ولو خالفناهم كنا شرا من هذه الحمر المسقاة قلت ان هذا العذر قبيح فانما الطاعة في المعروف۔ ص ۴۴۰ جلد ۱

شمر ابن ذی الجوشن۔ ابو السابغہ ضبابی اپنے باپ سے روایت کرتا ہے اور ابو اسحاق سبیعی اُس سے روایت کرتا ہے۔ مگر وہ اس قابل نہیں ہے کہ اُس سے روایت کی جائے یہ قاتلان امام حسین علیہ السلام سے ہے جسکو اعوان مختار نے قتل کیا۔ ابوبکر بن عیاش ابو اسحق سے روایت کرتے ہیں۔ کہ شمر ہم لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ خدایا۔ ہم شریف ہیں۔ تو ہم کو بخشدے۔ مجھے کہا۔ تو کیونکر بخشا جا سکتا ہے۔ حالانکہ تو نے قتل فرزند رسول اللہ صلعم میں اعانت کی ہے اُس نے کہا کہ ہمارے حاکموں نے ہمیں اسی کا حکم دیا۔ پھر اگر اس حکم کو انجام نہ دیتے۔ تو ان کمبخت گدھوں سے بھی بدتر ہوتے۔ ذہبی کہتے ہیں۔ کہ یہ عذر تو اور بھی قبیح ہے۔ اس لیے کہ اطاعت تو امر معروف میں ہوتی ہے۔

(۹) عباس ابن حسین قنطری سے۔ تہذیب التہذیب میں مرقوم ہے۔

قال ابن ابي حاتم عن ابيه مجهول

ابن ابی حاتم اپنے باپ سے لکھتے ہیں کہ وہ مجہول الحدیث ہے ص ۱۱۸ ج ۵

(۱۰) اسرائیل ابن یونس سے۔ میزان الاعتدال میں ہے۔

اسرائيل بن يونس بن ابي اسحق سبيعي الكوفي وروى محمد ابن البراء ابن المديني اسرائيل ضعيف واما يحيى القطان يحمل عليه في حال ابي يحيى القتات وكان لا يرضاه واما يحيى القطان فكان لا يحدث عنه ولا عن شريك۔

اسرائیل ابن یونس ابن ابی اسحاق سبیعی الکوفی یعنی ابو اسحاق سبیعی کے پوتے ہیں۔ ابن مدینی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ یحییٰ قطان اُسکی مذمت کرتے تھے۔ اور اُس سے ناراض تھے۔ اور وہ تو نہ اُس سے نہ اُس کے کسی شریک سے روایت قبول کرتے تھے۔

تہذیب التہذیب میں اُن کی نسبت یہ مندرج ہے:۔

واطلق ابن حزم ضعف اسرائيل ورد به احاديث عن حديثه بما صنع سنداً وقال عثمان ابن ابي شيبة

ابن حزم نے اُسکو مطلقاً ضعیف کہا ہے اور اُن حدیثوں کو رد کر دیا ہے جسکا راوی وہ تھا عثمان ابن ابی شیبہ عبد الرحمٰن ابن مہدی کا یہ قول

عن عبد الرحمان ابن مھدی اسرائیل سارق سرق الحدیث

لکھتے ہیں۔ کہ اسرائیل چور تھا حدیثیں چراتا تھا ص ۶۲ جلد اوّل

(۱۱) محمد ابن بشار المعروف بہ بندار میزان الاعتدال ذہبی میں اُن کی نسبت تحریر ہے۔

کذبہ الفلاس فلاس نے اُس کی تکذیب کی ہے۔ میزان الاعتدال ۲ ۵ ۳ ج ۲۔

وقال عبد اللہ ابن الدورقی کنا عند یحیی ابن معین
یجری ذکر بندار فرأیت یحیی لا یعبأ بہ ویستضعفہ

عبد اللہ ابن الدورقی بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ ابن معین کی صحبت میں
بندار کا ذکر آیا۔ تو انہوں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ تضعیف کی

تہذیب التہذیب میں مرقوم ہے۔

قال اسحاق بن ابراھیم القرازی کنا عند بندار
فقال فی حدیث عن عائشۃ قال قالت رسول اللہ ؐ
فقال لہ رجل یسخر منہ اعیذک باللہ ما افصحک
فقال کنا اذا خرجنا من عند روح دخلنا الی ابی عبیدۃ
فقال قد بان ذلک علیک وقال عبد اللہ ابن اسمٰعیل
ابن سیار سمعت عمر بن علی یحلف ان بندار یکذب
فیما یروی عن یحیی وقال علی ابن المدینی سمعت
ابی وسالہ عن حدیث رواہ بندار قال یحیی تسحروا
فان فی السحور برکۃ فقال ھذا کذب وانکرہ اشد
الانکار وقال حدثنی ابو داؤد موقوفا وقال رأیت
القواریری لا یرضاہ وقال کان صاحب حمام ص ۷۰ ج ۹

اسحاق ابن ابراہیم القرازی کا بیان ہے کہ ہم بندار کے پاس تھے۔ تو
اُسنے کہا۔ عائشہ نے کہا رسول اللہ (نعوذ باللہ) فرماتی تھیں۔ تو ایک
شخص نے ٹوک کر کہا۔ کہ تو رسولؐ سے تمسخر کرتا ہے۔ حدیث میں خدا کی پناہ
دیکھو کیا فصیحت کیا۔ تو وہ کہتا تھا۔ کہ جب ہم روح کے پاس سے
ابو عبیدہ کے پاس جاتے۔ تو وہ کہتا تھا۔ کہ تیری یہ بات فاش ہوگئی اور عبد اللہ
ابن اسمٰعیل ابن سیار کہتے ہیں کہ ہم نے عمر ابن علی کو قسمیں کھاتے سنا ہے کہ بندار جھوٹا ہے
اُن روایات میں جو یحییٰ سے روایت کرتا ہے۔ علی ابن مدینی (استاد بخاری)
لکھتے ہیں کہ ہم نے ابن ابی وسالہ سے یہ حدیث بندار کہ تسحروا فان
فی السحور برکۃ پوچھی تو اُس نے کہا کہ یہ بالکل جھوٹ اور
غلط ہے اور اس سے انکار کیا۔ عبد اللہ ابن الدورقی کہتے ہیں کہ ہم
ابن معین کی مجلس میں تھے کہ بندار کا ذکر آیا۔ یحییٰ ابن معین نے اُس کی
کوئی اعتنا نہیں کی بلکہ اُس کی تضعیف۔ اسی طرح قواریری بھی بندار کو نہیں پسند کرتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ وہ تو کبوتر باز تھا؛

> شبلی صاحب خود رواۃ بخاری کے کذاب ہیں۔

کہاں تک راویان بخاری کی ثقاہت وصداقت کے اوصاف کی تفصیل کریں۔ انھیں عشرہ کاملہ کی کمال صداقت مرقومہ بالا پر اکتفا کی جاتی ہے۔ سے روایتے ست کہ اور البشر سے پایان نیست حقیقتاً ہمکو اتنی متعددانہ تفصیل وتصریح کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ شبلی صاحب نے تو خود رواہ بخاری کی تضعیف و تکذیب فرمائی ہے۔ اور ہم انھیں کی اصل عبارت کی نقل پر اس بحث کو تمام کرتے ہیں

واقعہ راہب بحیرہ کے بیان کرنیوالوں کی تنقید فرماتے ہوئے۔ مرقوم کیا گیا ہے۔

اس حدیث کا ایک راوی عبد الرحمٰن ابن غزوان ہے۔ اسکو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی لکھا ہے مگر اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے

ہیں۔ کہ عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ جس میں راہب بحیرہ کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔ کہ عبدالرحمن ابن غزوان خطا کرتا تھا۔ اسکی طرف اسوجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اُسے ممالیک کی حدیث نقل کی ہے۔ ممالیک کی ایک روایت ہے جسکو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ ص ۱۳۰ ج ۱

آنحضرت صلعم نے (نعوذ باللہ) اپنے ایک صاحبزادے کا نام عبدالعزیٰ رکھا۔ اس روایت کی تنقید و تردید میں مرقوم کیا جاتا ہے۔

اس روایت کا سب سے زیادہ ترجیح سلسلہ وہ ہے۔ جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے۔ اسکا پہلا راوی اسمٰعیل ہے۔ جسکا پورا نام اسماعیل ابن ابی یونس ہے۔ اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

معاویہ ابن صالح	اسمٰعیل اور ادیس اسکا باپ دونوں ضعیف ہے۔
یحیٰی ابن مخلط	وہ جھوٹ بولتا ہے اور بالکل ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور ثقہ ہے۔
نضر بن سلمہ مروری	کذّاب ہے
دار قطنی	میں اسکو صحیح روایت کے لیے پسند نہیں کرتا۔
سیف ابن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں اتبا تا تھا۔
سلمہ بن شعیب	مجھ سے خود اُس نے اقرار کیا۔ کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا۔ تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا۔

مولوی صاحب خود ان رواۃ بخاری کی تکذیب فرماتے ہیں۔ اور اُن کے کذّاب۔ ضعیف۔ غیر ثقہ اور وضاع ہونیکا خود اقرار کرتے ہیں۔ اور باوجود اسکے اس کتاب پر ایسے شیفتہ و فریفتہ ہیں کہ اپنے تمام طومار تحقیق کا مقصد اقصیٰ اسی کو قرار دیتے ہیں۔ ان ھذا الشئی عجاب فاعتبروا یا اولی الالباب۔

علم تاریخ میں بخاری کی جہالت۔

علم حدیث میں جس کے خاص کر بخاری صاحب امام اولیں قرار دیے جاتے ہیں۔ اُن کے کمال کی توکیفیت ہماری مندرجہ بالا عبارت تنقیدی سے ثابت ہو گئی۔ علم تاریخ میں امام صاحب کو جیسا کچھ شعور حاصل تھا۔ وہ تو شبلی صاحب خود تاریخ صغیر بخاری کی روایت تسمیہ عبدالعزیٰ میں بخوبی ظاہر فرما چکے ہیں۔ مگر ہم بھی مزید اطمینان کیلئے بخاری صاحب کی تاریخ دانی کی ایک اعلیٰ امثال ذیل میں نقل کر دیتے ہیں صحیح بخاری مطبوعہ مطبع احمدی صفحہ ۷۰، اسطرہ ۵ ہو باب احداد المرأۃ علیٰ غیر زوجہا (یہ باب کتاب الجنائز میں ہے)

حدثنا الحمیدی قال سفیان قال حدثنا ایوب بن موسیٰ
قال اخبرنی حمید بن نافع عن زینب بنت ابی سلمۃ قالت
لما جاء نعی ابی سفیان من الشام دعت ام حبیبۃ بصفرۃ
فی الیوم الثالث فمسحت عارضیہا وذراعیہا
وقالت ان کنت عن ھذا لغنیۃ لولا انی سمعت
رسول اللہ صلعم یقول لا یحل لامراۃ تومن
باللہ والیوم الاٰخرۃ ان تحد علی میت فوق ثلاث
الا علی زوجہا فانہا تحد علیہ اربعۃ اشہر وعشرا۔

حمید حدیث کرتے ہیں۔ کہ سفیان نے کہا۔ اس سے ایوب بن موسیٰ
نے اُس سے حمید بن نافع نے اُس سے زینب بنت ابی سلمہ نے کہا
زینب نے کہا۔ کہ جب ابوسفیان کے مرنے کی خبر شام سے آئی۔ تو
اُمّ حبیبہ نے تیسرے دن صفرہ (یہ ایک قسم کی زرد رنگ کی خوشبو
ہے) منگا کر اپنے گال اور دراغ پر ملی۔ اور کہا۔ کہ مجھ کو کچھ حاجت نہ ہوتی
اگر ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ سنتے ہوتے۔ کہ مسلمان عورت
کو سوائے شوہر کے کسی کے مرنے میں تین دن سے زیادہ ترک زینت
نہیں کرنا چاہیے۔ اور شوہر کے مرنے میں چار ماہ اور دس دن۔

اس روایت میں بخاری نے جو یہ لکھا ہے۔ کہ ابوسفیان کے مرنے کی خبر شام سے آئی۔ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ابوسفیان کا انتقال مدینے میں ۳۲ھ میں ہوا۔ جیسا کہ عینی شرح بخاری مطبوعہ بیروت جلد ۲ صفحہ ۲۷ سطر ۲ میں۔ حدیث کے شروع میں مرقوم ہے۔

قولہ من الشام قال بعضہم فیہ نظر لان ابا سفیان
مات بالمدینۃ بلا خلاف بین اہل العلم بالاخبار والجمہور
علی انہ مات اثنتین وثلاثین۔

کہا بعض نے کہ اس قول میں کہ ابوسفیان کے مرنے کی خبر شام
سے آئی۔ نظر ہے۔ کیونکہ جمہور مورخین کا اس پر اتفاق ہے
کہ ابوسفیان کا انتقال مدینہ میں ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں ہوا

ابن حجر مصنف فتح الباری شرح صحیح بخاری میں۔ جو ایک اعلیٰ درجے کے ایڈوکیٹ منجانب بخاری ہیں۔ اور شرح مذکور میں بخاری کی ہر گھڑی ہوئی بات کے بنانے کا اُنہوں نے بیڑا اُٹھایا ہے۔ اُنکو بھی اُسکا اقرار کرنا پڑا۔ کہ یہ بخاری سے غلطی ہوئی۔ چنانچہ وہ عبارت فتح الباری کی جو مطبوعہ مذکورہ صفحہ مذکور میں اُس حدیث کے حاشیہ نمبر ۷ میں ہے۔ اور من الشام کے فقرے میں لکھا ہے۔ ہم بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

قولہ من الشام قال ابن حجر ھو وہم لانہ مات با
لمدینۃ بلا خلاف وانما الذی مات بالشام اخوہا
یزید ابن ابوسفیان والحدیث فی سندی ابن ابی
شیبۃ والدارمی بلفظ لما اخی ام حبیبۃ احمیم لہا
دکا حمل عزۃ مغری کونہ اخاھا۔

ابن حجر کہتے ہیں۔ کہ بخاری کا یہ کہنا کہ ابوسفیان کا انتقال شام
میں ہوا۔ بالکل غلط ہے۔ اور شام میں جو مرے وہ اُمّ حبیبہ
کے بھائی یزید ابن ابوسفیان تھے۔ اور مسند ابن ابی شیبہ دارمی
اور مسند احمد میں بھی یہی لکھا ہے۔ کہ شام سے مرنے کی خبر اُمّ حبیبہ
کے بھائی کی آئی تھی۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری۔

یہی اصح الکتاب بعد الکتاب باری ہے۔ اور اس میں اس قسم کی فاش غلطیاں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ امام المحدثین کی تاریخ دانی کا پایہ کمال ہے۔ اور حقیقت حال۔ لاحول ولا قوۃ۔

اسی حدیث اور واقفیت پر شبلی صاحب حدیث تو حدیث تاریخ کی کتابوں پر بخاری کے اقوال و مختار کو ترجیح بالمرجح کی فضیلت دیتے ہیں۔ حدیث میں مصدوق۔ غیر مصدوق۔ موثوق۔ غیر موثوق۔ اور اہل و نااہل رواۃ کا جیسا کچھ انبار لگایا گیا ہے۔ اس کی کیفیت ابھی ابھی اوپر دکھلادی گئی ہے۔ اور حقیقت کا انکشاف کردیا گیا ہے۔ کہ جن رواۃ کے اقوال پر صحت بخاری کا دار و مدار ہے۔ اُن میں قدری۔ ناصبی۔ خارجی قاتلان فرزند رسولؐ مدلس۔ خاطی فی الحدیث۔ وضاع اور کذاب کی بھرتی بھری پڑی ہے۔ پھر ان تمام معائب اور مناقص سے پُر اور مملو کتاب کو صحیح کیا صحیح الکتاب کہنا سوائے بدعقلی اور سیہ عقلی کے اور کیا کہا جائے

بخاری کے مرویات میں استبعاد و اقرار مؤلف سیرۃ النبیؐ۔

تعجب ہے شبلی صاحب کی اس دلیری پر۔ کہ وہ بخاری کی ان فروگذاشتوں کو ذرا بھی خیال میں نہیں لاتے۔ رواۃ کی تنقید کے علاوہ خود بخاری صاحب کی مرویات و اقوال میں شبلی صاحب نے جو اختلاف و تناقض دکھلائے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) بخاری میں روایت ہے۔ کہ جب خدا نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا۔ تو اُسکا قد سات گز کا تھا۔ حافظ ابن حجر اُس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ویشکل هذا ما یوجد الآن من آثار الامم السابقة کدیار ثمود فان مساکنهم تدل علی ان قامتهم لم تکن مفرطة الطول علی حسب ما یقتضیه الترتیب السابق ولم یظهر الی الآن ما یزیل هذا الاشکال۔

اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت تک موجود ہیں۔ مثلاً قوم ثمود کے آثار مکانات اُن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے۔ اور اسوقت تک مجھکو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

(۲) صحیح بخاری میں روایت ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے۔ کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ قیامت میں تو مجھے رسوا نہ کریگا۔ اس حدیث کی شرح میں ابن حجر لکھتے ہیں۔

استشکل الاسمعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته۔

اسماعیلی نے اسپر اشکال وارد کیا ہے۔ اور اُس کی صحت پر طعن کیا ہے

اسماعیلی کے اعتراض کا ابن حجر نے جواب دیا ہے۔ لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے۔ اس لیے اسماعیلی کا اعتراض غلط ہے۔ لیکن قابل لحاظ ہو سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے

سبحان اللہ۔ کیا شان فیصلہ ہے۔ اور کیا الفاظ تجویز۔ ابن حجر سے اسمعیلی کا فن حدیث میں درجہ خاصکر بڑھا بھی ہو مگر پھر بھی شبلی صاحب کے نزدیک اسمعیلی کا اعتراض غیر صحیح اور مشکوک ہے۔ اور گو غیر صحیح بھی ہو۔ مگر تاہم قابل

لحاظ ہو سکتا ہے۔ کون بتلا سکتا ہے۔ کہ ان پیچدار اور ذو المعنی الفاظ و عبارت میں ایک لفظ کو بھی حقیقت اور صفائی سے کوئی سروکار ہے سوائے اسکے کہ پڑھنے والا ان منطق معکوسی کے پرپیچ اقوال و آرا میں بغرض تفہیم و استفادہ الجھا رہے۔ اور غریب کو عمر بھر حقیقت کچھ بھی نہ معلوم ہو۔

(۲) عمر ابن میمون سے روایت ہے۔ کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا (کی، تھا دیتی) شمس العلما صاحب زنا مونث ہے" اسپر اور بندروں نے ملکر اس کو سنگسار کیا"

حافظ ابن عبد البر نے جو مشہور محدث ہیں۔ اس بنا پر اس حدیث میں تامل کیا۔ کہ جانور مکلف نہیں اس لیئے اُنکے فعل پر زنا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ نہ اس بنا پر اُن کو سزا دی جا سکتی ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں

وقد استنکر ابن عبد البر قصۃ عمر بن میمون هذه وقال فیها اضافة الزنا الی غیر مکلف واقامة الحد علی البهائم۔	ابن عبد البر نے اس قصہ عمر ابن میمون سے انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زناکی اور جانوروں پر اقامت حد جاری کرنے کی نسبت و مثال قائم کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول لکھکر لکھا ہے۔ کہ اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر سند صحیح ہے۔ تو وہ بندر غالباً جن رہے ہونگے۔

حافظ صاحب۔ ماشاء اللہ۔ بخاری پرستی اتنی تو ہو۔ آپ کی تحقیق انیق میں جنات بھی اقسام حیوانات میں داخل ہیں۔ اور شیطان بھی۔ کیونکہ وہ بھی تو قرآن مجید کی نص وکان من الجن کے روسے جنات میں شمار ہے ہاں حافظ صاحب یہ حیوانات و بہائم کرۂ ارض کے کسی اقطاع میں پائے جاتے ہیں؟ اور کس ملک و جزیرہ میں اُنکا مسکن ہے؟ زمانہ حال کے جدید یوروپین نیچرلسٹ آپ کی اس تحقیقات و انکشافات سے بڑا فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور آپ کے ان اضافات کے بیحد ممنون ہونگے۔ ہم علامہ ابن حجر کی اعلیٰ قابلیت اُن کی اس لغویت پر حیرت کریں۔ یا شمس العلمائے نعمانی کے ان لغویات کے نقل کرنے پر تعجب کریں" باوجود اس کے شبلی صاحب ان محدثین کے اقوال کو بے سر و پا اور مہمل باتوں سے مبرّہ اور معرا بتلاتے ہیں۔

(۴) صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے۔ کہ ایک دفعہ عبد اللہ ابن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت صلعم کے صحابہ میں جھگڑا ہو گیا۔ اُس پر یہ آیت اُتری۔ وان طائفتان اقتتلوا فاصلحوا بینهما اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑجائیں تو اُن میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے یہ ثابت ہے۔ کہ اس وقت تک عبد اللہ ابی سلول کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا۔ اس بنا پر ابن بطّال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے۔ کہ یہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے۔ کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں۔ اور یہاں عبد اللہ ابن ابی کا گروہ علانیہ

کا فر تھا۔ حافظ ابن حجر نے اسکا جواب دیا ہے۔ کہ تغلیباً ایسا کہا گیا ہے۔"
ایک نہ شد دو شد۔ حافظ صاحب جس طرح جنات کو حیوانات بناتے ہیں۔ اسی طرح مومن و منافق کو تغلیباً ایک بتلا کر اپنے مبالغہ آمیز بیان کی پوری شان دکھاتے ہیں۔ ان سے زیادہ عبرت آتی ہے۔ تو بخاری کے حال پر اور اُن کی بصارت فی القرآن اور مہارت فی الحدیث پر۔ جو وحی الہی کی صحیح شان نزول کی بھی خبر نہیں رکھتے اور یہ بھی نہیں جانتے۔ کہ عبد اللہ ابن ابی سلول کبھی مسلمان بھی ہوا۔ مومن کہاں تک ہوگا۔ ان ھذا امیر المومنین فی الحدیث ملخص از دیباچہ سیرۃ النبیؐ جلد اول۔ ص ۵۵-۵۶

کمال تعجب ہے۔ شبلی صاحب کی اس جرأت پر وہ بخاری کے اتنے قرآن وحدیث سے معارضات ایک ایک کرکے خود بتلاتے اور گنواتے ہیں۔ اور کبھی تو خود اور کبھی دوسرے اکابر علماء و محدثین سے اُن پر الزام لگاتے ہیں۔ مگر پھر بھی بخاری و مسلم کی تصدیق و توثیق میں بڑی سرگرمی اور پرجوشی سے مقدمہ کتاب کے پائیں حاشیہ میں یہ عبارت حوالہ قلم فرماتے ہیں:۔
حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں مثلاً بخاری اور مسلم حاشیہ ص ۵
اب مولوی شبلی صاحب سے کوئی کیونکر پوچھے۔ جب صحیح بخاری میں ایک روایت بھی ضعیف نہیں تھی۔ تو خود بدولت یہی مولوی شبلی صاحب ہیں جنہوں نے ابھی ابھی بخاری سے اتنی روایتیں جو صریحاً معانی قرآنی کے معارض اور مطالب احادیث کی مخالف ثابت ہوتی تھیں۔ دکھلا دیں۔ پھر آپ ہی ہیں۔ کہ ایک دوسرے مقام پر اپنی ہی قلم و زبان سے اپنی خود غرضی کے زیر اثر ہو کر تقلید اسلاف اور تائید بخاری میں یوں رطب اللسان ہیں۔ اس موقع پر یہ نکتہ بھی خاص کر لحاظ کے قابل ہے۔ یہ مسلم ہے۔ کہ حدیث و روایت میں امام بخاری و مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا۔ رسول اللہ کے ساتھ اُن کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی۔ اس کے لحاظ سے بھی تمام محدثین پر ممتاز تھے۔ سیرۃ النبیؐ دیباچہ ص ۲۹

شبلی صاحب کی زود رنجی اور متلون مزاجی

اوّل تو اس قسم کی تحریر سے عموماً باستثنائے بخاری و مسلم۔ دیگر تمام علماء و فضلاء اکابرین اسلام کے خلوص عقیدت اور الفت رسول صلعم پر ناحق اور محض نازیبا حملہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ابھی تک تو شبلی صاحب صرف حدیث اور صحت حدیث رسول صلعم ہی کے متعلق امام بخاری کا کمال ثابت کرنے پر اصرار فرماتے تھے۔ اب آپ محبت و الفت رسول صلعم میں بھی اُنکے خلوص و عقیدت کے کمال کی یکتائی و عدیم المثالی کے دعوے فرمانے لگے۔ اس بنا پر ضرور ہوا۔ کہ شبلی صاحب کے اس غلط دعوے کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

خدمت رسولؐ میں امام بخاری کی بے ادبی

صحیح بخاری کے آٹھویں پارے میں لیلۃ القدر کے متعلق یہ حدیث مرقوم ہے۔
باب فضل لیلۃ القدر وقول اللہ انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر وما ادرٰک ما لیلۃ القدر لیلۃ القدر خیر من الف شھر (الی آخرہ) قال ابن عیینہ ما کان فی القرآن وما

ادریک وفقد اعلمه وما قال وما یدریک فانه لم یعلم۔

اس حدیث میں اصل بحث ابن عیینہ کے قول سے ہے۔ کہ انہوں نے کہا۔ کہ قرآن میں جہاں ما ادراک آیا ہے (یعنی کس چیز نے تجھے جتایا) اس کا علم تو آنحضرت صلعم کو حاصل ہے اور جہاں خدا نے ما یدریک کہا۔ (یعنی کون چیز تجھے جتاتی ہے) اس کا علم آنحضرت صلعم کو نہیں تھا۔ ماحصل یہ ہے۔ کہ جہاں بصیغہ ماضی آیا ہے۔ اسکا علم آنحضرت صلعم کو حاصل ہے۔ اور جہاں بصیغہ مضارع ہے۔ اسکا علم حضرت کو نہیں"

بخاری کی اس حدیث تخرجہ پر حسب ذیل اعتراض قائم ہوتے ہیں

(۱) پہلا اعتراض تو یہ ہے۔ کہ آپ حدیث رسول لکھتے ہیں۔ یا قول تابعین۔ کیونکہ ابن عیینہ جنکا نام سفیان ہے نہ صحابی ہیں نہ خلیفہ بلکہ ایک معمولی درجہ کے عالم ہیں۔[1] ان کے کلام کو یہ رتبہ کہاں ملا۔ کہ حدیث رسول پر مقدم رکھا گیا۔ مگر اس کا جواب مویدین صحیح بخاری عموماً اور غیر مقلدین حضرات یہ دے سکتے ہیں کہ ہم تابعین کے اقوال کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ اور مثل قول رسول مانتے ہیں۔ تو پھر یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم صرف سنت رسول کے عامل ہیں

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ کل علمائے حدیث کا یہ اعتراض ہے۔ کہ یہ حدیث تعلیق ہے۔ یعنی سلسلہ رواۃ اس حدیث کا منقطع ہے۔ کیونکہ بخاری اور ابن عیینہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ جو یہ حدیث ان سے سنتے اور اس امر کو لکھا بھی نہیں۔ کہ ان (ابن عیینہ) سے سنا پھر یہ حدیث صحیح کہاں رہی۔ اور صحیح بخاری صحیح کیونکر ہوئی۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے۔ کہ محمد ابن یحییٰ ابن ابی عمر نے کتاب الایمان میں بروایت ابو حاتم رازی اس حدیث کو موصول طریقہ سے روایت کیا ہے۔ علامہ ابن عینی اور ابن حجر یہی جواب دیتے ہیں مگر دونوں صاحبوں نے اسپر ذرا بھی غور نہیں کیا۔ کہ کسی دوسرے کو باتصال روایت کرنیسے جو اعتراض امام بخاری پر عاید ہوتا ہے کیسے رفع ہو جائیگا

[1] سفیان ابن عیینہ بقاعدہ اہل حدیث مدلس ہیں جنکی روایت قابل قبول نہیں ہوتی جیسا کہ شرح الشرح نخبۃ الفکر ملا علی قاری میں ہے
بیانہم یسقط المدلس شیخہ الذی یسقط من عبک رجلا ضعیفا او صغیرا لسن یحسن الحدیث بذلک وکان الاعمش والثوری وابن عیینہ وابن اسحق وغیرہم یفعلون ہذا النوع - پھر یہی ملا علی قاری لکھتے ہیں۔ وہذا القسم من التدلیس مکروہ جدا فاعله مذموم عند اکثر العلماء ومن عرف به فهو مجروح عند جماعة لا یقبل روایة بین السماع اولم یبینه شرح الشرح نخبۃ الفکر ملا علی قاری شارح مشکوٰۃ

دوسرا الزام سفیان ابن عیینہ پر حاشیہ کاشف میں یہ ہے قال یحییٰ ابن سعید اشهد ان ابن عیینه اختلط فی سنة سبع وتسعین فمن سمع منه هذه السنة والتی بعدها فسماعه لا شئ۔

تعجب ہے۔ کہ جس شخص کی یہ حالت ہو۔ اس کے اقوال سے علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کیا جاوے اور پھر صحیح بخاری صحیح کہلاوے۔

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے۔ کہ اگر بفرض محال۔ یہ جواب قبول ہی کر لیا جاوے۔ تاہم کوئی فائدہ نہیں کیونکہ محمد ابن یحیٰی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ کل شئ فی القرآن وما ادریٰک فقد اخبرہ وکل شئ فیہ ما یدریک فلم یخبرہ بہ ان الفاظ اور روایت صدر کے الفاظ میں جو فرق ہے۔ وہ ظاہر ہے کما لا یخفی علی المحقق۔ ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۳۱۸ جلد دوم وعمدۃ القاری ص ۳۶۵ جلد پنجم۔

(۴) چوتھا اعتراض یہ ہے۔ کہ امام مغلطائی کا مقولہ ہے۔ کہ تفسیر ابن عینیہ میں۔ جو بروایت سعید ابن عبد الرحمان خود ابن عینیہ سے منقول ہے۔ مجھے یہ عبارت نہیں ملی۔ بلکہ جو نسخہ بخط حافظ ضیاء مقدسی ہے۔ اُس کی طرف رجوع کیا۔ تو اُس میں بھی اس عبارت کو نہ پایا فتح الباری ص ۳۱۸ ج ۲ اب فرمایئے۔ کہ جو عبارت خود ابن عینیہ کی تفسیر میں بھی نہیں ہے۔ اُس کی نسبت کرنا اُن کی طرف کس درجہ صحت صحیح بخاری کی شان کو ملبند کرتا ہے۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے۔ کہ اصل دعوےٰ ہی غلط ہے۔ فتح الباری میں ہے

قد تعقب ھذا الحصر لقولہ وما یدریک لعلہ یزکی فانھا نزلت فی ابن مکتوم وقد علم بحالہ وانہ ممن یزکی ونفعتہ الذکری۔

اس دعویٰ حصری پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے وما یدریک لعلہ یزکی۔ یہ آیہ ابن مکتوم کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلعم کو انکے حال کا علم تھا کہ وہ تو انہیں میں سے ہیں جنکا تزکیہ ہوا اور پند و نصیحت نے انکو نفع دیا

اس بنا پر بخاری کا یہ دعوےٰ کہ جس آیہ میں ما یدریک ہے۔ اُسکا علم آنحضرت صلعم کو نہیں دیا گیا۔ بالکل غلط ہو گیا کیونکہ یہاں اس لفظ سے وارد ہے۔ ثابت ہے۔ کہ آنحضرت کو اُسکا علم حاصل تھا ؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

اس چاروں اعتراضوں کو ابن حجر اور عینی دونوں صاحبوں نے لکھا ہے۔ مگر آخری دو اعتراضوں کا کوئی صاحب جواب نہ دے سکے۔ صرف عینی صاحب اتنا لکھتے ہیں۔ کہ تفسیر ابن عینیہ میں اس قول کا نہ ملنا اس کی دلیل نہیں ہے۔ کہ یہ قول ہی نہ ہو" ابن حجر تو اتنے جواب سے بھی عاجز رہے۔ اور اسکا احساس بھی اُن کو نہ ہوا۔ کہ حضرت کی شان رسالت کے کس قدر خلاف ہے۔ مگر ابن حجر صاحب تو اہلحدیث ہیں اُن کو تو صحیح بخاری کی عظمت سے کام ہے۔ نہ آنحضرت صلعم کی جلالت قدر اور عظمت مرتبہ سے۔ اسی وجہ سے صرف اُن اعتراض کو لکھ کر چھوڑ دیا۔ مگر علامہ عینی جو فرقہ حنفی کے مسلم الثبوت عالم ہیں۔ بالآخر اُن کا دل بھر آیا۔ اور اس جملہ سے اُن کا قلب کانپ گیا۔ لکھتے ہیں۔ قلت فی ھذہ العبارۃ اساءۃ الادب لا یخفی ذلک علی المنصف اس عبارت میں جس قسم کی اساءت ادب حضرت صلعم کی نسبت ہے۔ وہ صاحبان انصاف پر مخفی نہیں۔

افسوس شبلی صاحب بخاری کی ایسی سوء ادبی کو رسولؐ کے ساتھ خلوص اور خاص شیفتگی کہتے ہیں اگر ایسی ہی ہے۔ جیسا وہ سمجھتے ہیں۔ تو اس عقیدت وخلوص کی دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

(۲) بخاری میں تسمیہ سورۃ بقر کے متعلق یہ حدیث مرقوم ہے

سوء ادبی کی ایک دوسری شکل

حدثنا بشر ابن آدم قال اخبرنا علی ابن مسہر قال حدثنا ہشام عن ابیہ عن عائشۃ قالت سمع النبیؐ قاریا یقرء من اللیل فی المسجد فقال یرحمہ اللہ لقد اذکرنی کذا وکذا آیہ اسقطتہا من سورۃ کذا وکذا (بخاری جزء حادی عشرون ص۱۰)

بشر ابن آدم۔ علی ابن مسہر سے۔ وہ ہشام سے۔ وہ اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ سنا رسول اللہ صلعم نے ایک شخص کو کہ شب کے وقت مسجد میں قرآن پڑھتا تھا حضرت نے فرمایا۔ خدا رحم کرے اُس پر۔ کہ اُس نے فلاں فلاں آیہ کو مجھے یاد دلا دیا۔ جو بھول گیا تھا۔ میں فلاں سورے سے۔

بخاری کی اس مثال عقیدت سے رسالتؐ کی نزاکت طبع کا خوبصورت مضمون شبلی صاحب کو البتہ ملسکتا ہے۔ ورنہ اس کفر انگیز عبارت سے ایک محقق کیا ہر عامی العقل بھی بخوبی سمجھ جائیگا۔ کہ خود رسول اللہ صلعم قرآن کو اسطرح بھولجاتے تھے۔ کہ مطلق خیال ہی نہ رہتا تھا۔ بلکہ جب کوئی دوسرا پڑھتا تھا تو آپکو یاد پڑتا تھا نعوذ باللہ من ذالک شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ میں بخاری کے ساتھ جتنا خلوص۔ عقیدت اور اپنی شیفتگی ظاہر کی ہے۔ افسوس کہ اُنکے دعوے کے خلاف بخاری نے اتنا خلوص وعقیدت بھی رسولؐ کے ساتھ نہ دکھلائی۔ اور جس رسولؐ کو شبلی صاحب الکلام میں علماء وحکمائے اسلام کے اقوال کثیرہ سے۔ دلائل وبراہین عقلیہ کے ثبوت کے ساتھ تمام قوائے مدرکہ واحساس ظاہریہ وباطنیہ میں عام طبقہ انسانی سے اعلیٰ ترین ثابت کر چکے ہیں۔ اور حدود ادراک واحساس انسانی سے تجاوز قرار دیکر حدود ملکوتیت اور روحانیت تک پہونچا چکے ہیں۔ اسی روحانیت اور نورانیت کے پیکر مجسم (روحی لہ الفداء) کو امام بخاری صاحب ایک عامی العقل آدمی کے برابر۔ عامل سہو ونسیان وفاعل تسامح وغلطان قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے ساتھ یہی بخاری صاحب کی خلوص وشیفتگی ہے۔ اور یہی الفت۔ وفریفتگی۔ اگر اسی کا نام خلوص وعقیدت ہے تو پھر اہانت کیا ہے ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ان مرویات مخالف اصول اسلام کی نسبت اس تاویل کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ کہ امام بخاری نے سرسری طور پر ان حدیثوں کو لکھدیا ہے۔ اور ان کے نتائج پر زیادہ غور نہ فرمایا۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ رسولؐ اور رسالت کو قابل سہو ونسیان یقین کرتے تھے۔ اور اسپر وہ ثابت العقیدہ تھے۔ اسی بنا پر صحیح بخاری میں آپ نے خاص طور پر نسیان القرآن کے نام سے ایک علیحدہ باب قرار دیا ہے۔ جس میں چار حدیث اس مضمون کی لائے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن بھول گئے تھے۔ لیکن ہم ان لغویات کی نقل سے احتیاط

کرتے ہیں۔ اور ان مہملات کے نقل کو بھی معصیت سے خالی نہیں سمجھتے۔ اس لیے جتنی مثالیں اوپر لکھدی گئی ہیں۔ وہی ہمارے مدّعا کے لیئے کافی ہیں۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ حقیقت رسالت اصلاً سمجھی ہی نہیں گئی۔ نہ شبلی صاحب غایت رسالت کو سمجھ سکے اور نہ بخاری صاحب حقیقت نبوّت کو سمجھا سکے۔ اور کیونکر سمجھتے یا سمجھا سکتے۔ خلافت اور صحابیت کے اصول تیمم ان نصوص تخصیص سے بالکل مستاصل ہو جاتے۔ کمال حسرت و عبرت ہے۔ کہ ان مرویات سے اپنے عقائد کے اصول کی تو حفاظت کر لی گئی۔ مگر رسولؐ کی شان رسالت مخالفین اسلام کی توہین و تضحیک کیلیئے انکی چھوڑ دی گئی۔ اور ان مرویات بخاری وغیر اسالہ کو دیکھکر۔ عیسائی متعصبین اور آریہ سماج۔ قرآن اور حامل قرآن سلام اللہ علیہ من رب المنّان کی مقدّس زبان۔ بیان اور کمال حفظان کو مجہول السہو والنسیان ثابت کرنے میں اور جری ہو گئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

> صحیح بخاری کی اصلیت
> کیا بخاری صاحب اسکے اصل جامع ہیں جیسا کہ عام میں غلط مشہور رہے؟

نقادان فن حدیث صحیح بخاری کی اصلیت سے بھی خوب واقف ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب جیسا کہ عوام میں آجتک غلط مشہور رہے۔ امام بخاری کی تالیف بھی نہیں ثابت ہوتی۔ بلکہ تحقیق سے مال مسروقہ قرار پاتی ہے۔ اصل میں یہ کتاب امام صاحب کے استاد علی ابن المدینی کی ہے۔ جسکو امام صاحب نے استاد کی غیبت میں۔ اپنے ایک استاد زادے کو نقد دیکر حاصل کر لیا۔ اس کی حقیقت حافظ ابن حجر۔ خاص شارح بخاری کی زبانی ملاحظہ ہو۔ تہذیب التہذیب۔ امام بخاری کے خاص ذکر میں جلد نہم ص ۵۳ میں رقمطراز ہیں۔

قال مسلمه و الّف علی ابن المدینی کتاب العلل وکان مخفیا فغاب یوماً فی بعض ضیعاته فجاء البخاری الی بعض بنیه وراعنه بالمال علی ان یری الکتاب یوماً واحداً فاعطاه له فدفعه الی النسّاخ فکتبوه له وردّه الیه فلمّا حضر علیّ تکلّم بشیءٍ فاجابه البخاری نص کلامه مراراً ففهم القضیة واغتم لذلک فلم یزل مغموماً حتی مات بعد یسیر واستغنی البخاری عنه بذا الکتاب وخرج الی خراسان ووضع کتابه الصحیح فعظم شانه وعلا ذکره

مسلمہ کہتے ہیں۔ کہ علی ابن مدینی (استاد بخاری) نے ایک تالیف تیار کی تھی۔ علل احادیث میں۔ جسکی اشاعت میں وہ بخل کرتے تھے۔ ایک روز کسی ضرورت سے اپنے کھیت پر گئے۔ تو بخاری نے انکی بعض اولاد کو کچھ مال دیکر اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ ایک روز کے لیئے وہ کتاب دیدیں۔ اُسنے دیدیا۔ تو بخاری نے کاتبوں کو دیا۔ اور راتوں رات سب نے اسکو نقل کر دیا۔ جب علی ابن مدینی واپس آئے۔ اور اپنے درس پر بیٹھے۔ تو حسب معمول شاگردوں سے سوال کیا۔ تو بخاری نے وہی جواب دیا۔ جو انکی کتاب میں تھا۔ اصل قصہ کو علی ابن مدینی سمجھ گئے اور نہایت مغموم و مہموم ہو کر اٹھ گئے۔ اسی غم میں چند روز کے بعد وہ مر گئے۔ اور بخاری اس کتاب کو لیکر خراسان چلے گئے۔ اور وہاں جا کر اپنی کتاب صحیح کو تالیف کیا جس کر

وھو اول من وضع فی الاسلام کتابا صحیحا فصار الناس لہ تبعا بعد ذلک۔

بڑی ناموری حاصل کی اور وہ پہلی کتاب صحیح ہے جو اسلام میں تصنیف ہوئی۔ اور سب نے اسی کی تبعیت اختیار کی۔

ہم اس سے زیادہ اس کی حقیقت کی طول وطویل تفصیل کو بیان کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ مسئلہ زیر بحث میں بخاری کی اصل صحت کی تنقید مقصود ہے۔ نہ اس کی حقیقت و اصلیت کی تحقیق جسکو ہم ایک حد تک اپنی مندرجہ بالا عبارات تنقیدی میں درج بھی کر چکے ہیں۔ اسلیے ہم اپنے سلسلہ بیان میں اس کتاب کی غیر صحت اور ابتری کی حالتوں کو دکھلاتے ہیں

بخاری نے اپنی صحیح میں اپنی جمع حدیثوں کی خود صحیح تعداد نہیں بتائی

حفظ حدیث کے متعلق بخاری صاحب کا یہ دعوے ہے کہ ہمکو ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں۔ مقدمہ صحیح بخاری ص ۱۵۔ مگر پھر اس پر ترقی فرما کر ارشاد ہوتا ہے۔ خرجت الصحیح من ستمایۃ الف الحدیث ص ۱۶۔ صحیح بخاری کو ہم نے چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کرکے لکھا ہے۔ اب یہ دونوں متعارض اور متناقض دعاوی قابل ملاحظہ ہیں۔ پہلے دعوی میں تو اقرار ہے۔ کہ صحیح اور غیر صحیح ملا کر کل تین لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔ پھر دوسرے دعوے میں یہ چھ لاکھ حدیثیں کہاں سے آگئیں جس سے موجودہ صحیح بخاری مرتب کی گئی۔ بخاری کے ان دونوں مختلف دعوؤں کو پیش نظر رکھکر ہر شخص بآسانی فیصلہ کریگا۔ کہ آپکے ان دونوں مخالف اقوال میں ایک تو ضرور غلط ہوگا۔ مگر جب حقیقت کا استکشاف۔ اصلیت کا تجسس۔ آپ کے لاکھوں حدیث کی تلاش میں۔ آپ کی صحیح بخاری کا ورق ورق الٹ ڈالا ہے۔ تو پورے دس ہزار کی بھی تعداد پوری نہیں ہوتی۔ بلکہ تدریب الراوی میں ہے۔ کہ صحیح بخاری میں بعد حذف مکررات کل دو ہزار پانچسو تیرہ حدیثیں ہیں۔ تنقید بخاری حصہ سوم ص ۳۹ اب مضمون کی مفصل کیفیت حسب ذیل ہے۔ مقدمہ فتح الباری میں ابن حجر لکھتے ہیں:۔

سمعت البخاری یقول احفظ مائۃ الف حدیث صحیح واحفظ مائتی الف حدیث غیر صحیح وقال وراقہ سمعتہ یقول ما ضب لبارحۃ حتی عددت کم ادخلت فی تصانیفی من الحدیث فاذا ھو نحو مائتی الف حدیث ص ۵۰۰

بخاری سے منقول ہے۔ کہ ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں مجھے یاد ہیں۔ وراقہ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک روز بخاری نے مجھ سے کہا۔ کہ ہم نے ایک دن سونے سے قبل اپنی یاد کردہ حدیثوں کو شمار کیا۔ جو میری تصنیفات میں تھیں۔ تو دو لاکھ حدیثیں تھیں۔

اب ان دعاوی مذکورہ کی نسبت امام جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی میں مفصلہ ذیل انکشافات حقیقت فرماتے ہیں

قال العراقی فی ھذا الکلام نظر لقول البخاری احفظھا مائۃ الف حدیث صحیح ومائتی الف حدیث غیر صحیح قال ولعل البخاری اراد ہ

بخاری نے جو دعوی کیا ہے۔ کہ ہم ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ حدیث غیر صحیح یاد رکھتے ہیں۔ اسمیں کلام ہے۔ شاید ان سے مراد وہ حدیثیں ہیں جن کی سندیں مکرر ہیں۔ موقوفات بھی انہیں شامل ہیں۔ جن کو ایک حدیث کو

بالاحادیث المکرّرۃ الاسانید والموقوفات فربما عدّ الحدیث الواحد المروی باسنادین حدیثین زاد ابن الجماعۃ فی المنھل الرّاوی او اراد المبالغۃ فی الکثرۃ قال والاوّل اولیٰ او قیل یرید انّ ھذا ھو المراد انّ الاحادیث الصّحاح الّتی بین اظھرنا بل وغیرا لصحاح لو تتبعت من المسانید والجوامع والسّنن و الاجزآء وغیرھا لما بلغت مائۃ الف بلا تکرار بل وجد خمسین الفاً و یبعد کلّ البعد ان یکون رجل واحد حفظ ما فات الامّۃ جمیعۃ فانّما حفظہ من اصول المشائخ وھی موجودۃ تدریب الرّاوی سیوطی ص ۳۹

اُنہوں نے دو کر دیا ہے۔ ابن الجماعۃ اپنی کتاب منہل الراوی میں کہتے ہیں۔ کہ مراد بخاری کی اس کہنے سے مبالغہ بالکثرۃ ہے۔ مگر کہا گیا ہے۔ کہ قول اوّل اُولیٰ ہے۔ کیونکہ جو حدیثیں ہمارے پیش نظر وہ صحاح و غیر صحاح مسانید سنن جوامع اور اجزاء میں مجتمع ہیں۔ اگر انکا تتبع کیا جاوے۔ تو لاکھ کیا بلکہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ نہ ہونگی پھر یہ بھی نہایت مستبعد ہے۔ کہ ایک شخص واحد کو وہ تمام و کمال کل حدیثیں اکٹھا یاد ہوں۔ جو اُمت اسلامیہ میں سے کسی فرد واحد کو بھی نہ یاد ہوں۔ حالانکہ سب لوگوں نے ان حدیثوں کو تمام تر انہیں شائع احادیث سے حفظ و یاد کیا ہے۔ جو اس وقت سب کے ہمارے پیش نظر موجود ہیں۔ تدریب الرّاوی سیوطی ص ۳۹

ایسی حالت میں۔ جیسا کہ امام سیوطی تحریر کرتے ہیں۔ کہ صحاح غیر صحاح۔ مسانید۔ سُنن۔ جوامع اور اجزاء سے متفرقات سب کی حدیثیں ملا کر بھی ایک لاکھ پچاس (۱۵۰۰۰۰) ہزار حدیثوں سے زیادہ کا مجموع ثابت نہیں ہوتا۔ تو پھر بخاری صاحب کو تین لاکھ حدیثیں کہاں سے مل گئیں۔ جو اُنہوں نے یاد کر لیں جس کی نسبت وہ اتنی دلیری سے دعوے کرتے ہیں۔

اب بخاری صاحب کے خوش اعتقاد مقلدین کے محققانہ اضافات ملاحظہ ہوں۔ بُستان المحدّثین میں شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی تحریر فرماتے ہیں:۔

واز جملہ شش لک (۶۰۰۰۰۰ لاکھ) حدیث کہ نزد او موجود بود از او انتخاب شروع نمودہ و انچہ کہ بسیار صحیح بود بر آن اکتفا نمود۔ ص ۱۰۲۔

چھ لاکھ حدیثیں جو امام بخاری صاحب کے پاس موجود تھیں اُن میں سے انتخاب شروع کیا۔ اور جس قدر اُن میں سب سے زیادہ صحیح حدیثیں ثابت ہوئیں۔ اُنہیں پر اکتفا کی گئی۔

کہاں تو علمائے متقدمین تین لاکھ حدیثوں پر جرح و قدح کر رہے تھے۔ شاہ صاحب کی ترقی اعتقاد نے تین لاکھ کی تعداد کو دونی کرکے تین لاکھ کو چھ لاکھ کر دیا۔ اگر اور زیادہ تحقیق سے کام لیا جائے۔ تو معلوم ہو جائیگا کہ حقیقتاً یہ نہ شاہ صاحب کی ایجاد ہے۔ اور نہ اُن کا خاص مستزاد۔ بلکہ بخاری صاحب ہی کا دعوےٰ ہے۔ جس کو ہم اُن کے خاص الفاظ میں اس بحث کے آغاز میں لکھ آئے ہیں۔

فی الواقع بخاری کا یہ دعویٰ اس درجہ غلط تھا۔ کہ خود علمائے اہلسنّت کو اقرار کرنا پڑا۔ کہ بخاری نے اپنے اس اظہار

دعویٰ میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ سبحان اللہ۔ احادیث رسولؐ کی تفصیل و بیان اور مبالغہ بخاری کے ایسا امام المحدثین اور معمولی شاعروں کی طرح اپنے کلام و بیان میں مبالغہ آمیزی سے کام لے اور علی لسانھم و لیس فی قلوبھم کا مصداق اور فی کل واد یھیمون کا مفاد بنے۔ استغفر اللہ ربی بخاری صاحب کی ان طومار بندیوں کا آخر نتیجہ بھی۔ تدریب الراوی کی منفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے

سبعۃ الاف و مائتان و سبعون حدیثا المکررۃ و بحذف المکررۃ اربعۃ الاف ص ۳۰	صحیح بخاری میں سات ہزار دو سو پچھتر حدیثیں ہیں۔ اور مکررات نکال دی جائیں۔ تو کُل چار ہزار حدیثیں رہجاتی ہیں۔

اب فرمایئے یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ جسکو اپنے ایک دعوے کے مطابق ایک لاکھ۔ دوسرے دعوے کے مطابق تین لاکھ۔ اور تیسرے دعوے کے مطابق چھ لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔ اور اپنی ایسی مہتم بالشان تالیف میں جسکو کبھی مکہ میں کبھی مدینہ میں ہر ہر حدیث پر دو دو رکعت نماز پڑھ کر اور غسل فرما کر لکھے۔ وہ صرف چار ہزار حدیث لائے اور بقول ے چھیانوے ہزار اور بقول ے دو لاکھ چھیانوے ہزار اور بقول ے پانچ لاکھ چھیانوے ہزار غائب کر دے۔ آخر میں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اصل سرمایہ چار ہزار کا تھا۔ باقی سب آپکی لفاظیاں اور زبانی جمع خرچ ہیں سچ تو یہ ہے کہ ہم بخاری صاحب کی حدیثوں کا لیکھا لگا نہیں سکتے ؎ شمار کردم و دیدم کہ بیشمار آمد۔ امام صاحب کی قوت حافظہ۔ یادداشت اور صدق بیانی کی تصدیق و توثیق ناظرین کی منصفانہ تجویز اور محققانہ فیصلہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ شبلی صاحب کو بخاری پرستی کی کیوں مجبوری ہوئی۔ صرف اس لیے۔ جیسا کہ ہم اوپر بھی ایک مقام پر اشارۃً جتلا آئے ہیں۔ کہ بخاری صاحب اور اُن کے اصناف کے حضرات چونکہ شبلی صاحب کی مدعائے تالیف یسائل تعمیم بین الطبقات الامم۔ عدم تخصیص فی المدارج الصحابہ۔ تنقیص بنی ہاشم۔ اور ترجیح و تفضیل خلفاء و امراء بنی اُمیہ میں آپ کے بالکل ہمخیال اور ہمکلام واقع ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ان حضرات کے اخبار و آثار کو عموماً اور بخاری صاحب کے شعار و مختار کو خصوصاً اپنی تحقیق و تنقید کا معیار قرار دیا گیا۔ اور مقدمہ کتاب ہی سے بخاری کی مدح سرائی اور فن حدیث میں بے مثالی اور یکتائی آغاز فرمائی گئی۔ اور پھر کتاب کے مسائل و مباحث میں اُنھیں کے مختار کو ترجیح و تفضیل عنایت کی گئی۔ کیونکہ اصل مقصود بغیر اُن کی دستگیری کے دوسرے علماء و محدثین کی مرویات و تالیفات سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳۷) سیرۃ النبیؐ کی جلدوں میں ایک حدیث بھی آئمہ علمائے اہلبیت سے نہیں لی گئی۔ جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شبلی صاحب کے نزدیک یہ بزرگوار قطعی ساقط الاعتبار ہیں۔ اس طریق میں آپ پورے پورے اپنے شیخ الشیوخ امام بخاری کے مقلد ہیں کیونکہ اُنھوں نے بھی اپنے تمام صحیح میں ان حضرات سے استخراج و استماع حدیث نہیں کیا۔ علمائے

> اسقاط مرویات آئمہ اہلبیت
> تقلید بخاری۔

اہلبیتؑ نے بخاری کی اس عصبیت کی تو آجتک نہ کوئی پرواہ کی۔ اور نہ کبھی کوئی شکایت۔ مگر علمائے اہلسنّت میں مولانا عمر کریم صاحب فاضل معاصر نے۔ فہرست اعتراضات وجرح وقدح بخاری میں اس متعصبانہ استثنا و فروگذاشت کو خصوصیت کے ساتھ داخل کر دیا۔ اُنکی اصل عبارت حسب ذیل ہے

بخاری صاحب نے تقریبًا چار آیمۂ اہلبیتؑ کا زمانہ پایا۔ سیدنا حضرت علی بن موسیٰ الرضا۔ سیدنا امام محمد تقیؑ و سیدنا امام علی النقیؑ اور سیدنا امام حسن العسکریؑ (علیہم السلام) مگر ان میں سے کسی بزرگوار سے کسی حدیث کی سماعت نہیں کی۔ اور تحقیق وتلاش حدیث میں ساری دنیا چھان ڈالی۔ مکہ۔ مدینہ۔ عراق۔ شام اور مصر غرض کوئی جگہ نہ چھوڑی۔ یہ کیوں؟

(رسالہ الفقہ۔ امرتسر)

(۳۸) امام بخاری ہی نے ان بزرگوں کو متروک الحدیث نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ منہاج السُّنۃ میں امام ابن تیمیہ تو بکمال افتخار اس عصبیت کو جملہ اصحاب صحاح اہلسنّت کا خاص شعار قرار دیتے ہیں اُنکی اصل عبارت یہ ہے۔

فانّ العلماء المعروفین بالرّوایۃ الذین کانوا فی زمن ھذا الحسن بن علی العسکری لیس لھم عنہ روایۃ مشھورۃ فی کتاب اھل العلم وشیوخ اھل کتب السنۃ البخاری مسلم۔ ابوداؤد الترمذی والنسائی وابن ماجہ کانوا موجودین فی ذلک الزمان وقبلہ وبعدہ وقد جمع الحافظ ابو القاسم بن عساکر ذکر اسماء شیوخ الکل شیوخ ھولاء الائمۃ فلیس من ھولاء الائمۃ من روی عن الحسنؑ بن علی العسکری مع روایتھم من الوف مؤلفۃ من اھل الحدیث منہاج السنۃ ص ۱۲۱

یعنی جو علماء مشہور بہ حدیث ہیں۔ اور وہ زمانہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام میں موجود تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی اُن سے روایت نہیں کرتا۔ شیوخ کتب سُنن۔ بخاری مسلم۔ ابی داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ اور ابن ماجہ یہ سب اُسی زمانہ میں قبل وبعد۔ موجود و زندہ تھے۔ حافظ ابو القاسم بن عساکر نے۔ کتب سنّت کے تمام شیوخ الشیوخ کے نام لکھے ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے روایت نہیں کرتا حالانکہ ہزاروں راویوں سے حدیثوں کی روایت کرتے ہیں۔ منہاج السُّنۃ۔ ص ۱۲۱۔

اس کا سبب کیا؟ وہی تنقیص اہلبیتؑ۔ جس کو ہم مجمل طور پر ابھی بھی ایک حنفی فاضل کی تحریر کا حوالہ دے کر اوپر لکھ چکے ہیں۔ اور بار دیگر مفصّل طور پر حسب ذیل ہے۔

امام ابن تیمیہ نے تو اصحاب سُنن اور بخاری وغیرہم کی اس عصبیت کو بڑے افتخار سے لکھ مارا۔ مگر اُنکو یہ نہیں معلوم تھا کہ علمائے اہلسنّت ہی میں اکثر حضرت کو ان علماء کے عمومًا۔ اور بخاری کے اس شعار سے خصوصًا سخت تنبیہ ہوا ہے۔ اور بخاری کی اس اغراض کو اُنہوں نے بکمال حقارت دیکھا ہے۔ اُنھیں میں علامہ ذو النسبین ابن دحیتہ اُندلسی ہیں۔ وہ اپنی کتاب اسمار النبیؐ میں ذیل کی عبارت قلم بند فرماتے ہیں۔

ترجمة البخاری فی صحیحة فی وسط المغازی هکذا
قصة بعث علی ابن ابیطالب وخالد ابن ولید الی
الیمن قبل حجة الوداع حدثنی احمد ابن عثمان قال
حدثنا شریح بن مسلمة قال حدثنا ابراهیم ابن
یوسف ابن اسحق ابن ابی اسحاق قال حدثنی ابی
عن ابن ابی اسحق سمعت البراء بعثنا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع خالد ابن ولید الی الیمن
ثم بعث علیا بعد ذلک مکانه فقال مر اصحاب
خالد من شاء منهم ان یعقب معک فلیعقب ومن
شاء فلیقبل فکنت ممن عقب معه فقال غنمت اواقی
ذات عدد حدثنی محمد ابن بشار قال حدثنا
روح ابن عبادة قال حدثنا علی ابن سوید بن
منجوف عن عبد اللہ ابن بریدة عن ابیه قال
بعث النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیا وقد اغتسل
فقلت لخالد الا تری الی هذا فلما قدمنا الی النبی صلعم ذکرت
له ذلک فقال یا بریدة اتبغض علیا فقلت نعم قال
لا تبغضه فان له فی الخمس اکثر من ذلک
قال ذو النبیین اورده البخاری ناقصا مبترا
کما تری وهی عادته فی ایراد الاحادیث
التی من هذا القبیل وما ذاک الا لسوء رایه
فی التنکب عن هذا السبیل واورده الامام
احمد ابن حنبل کاملا محققا واتی بطریقه صحته
فیه مرفقا فقال فیما حدثنی القاضی العدل بقیة
مشایخ العراق تاج الدین ابو الفتح محمد ابن احمد
بن المندائی قراءة علیه بواسط العراق حتی

بخاری نے اپنی صحیح کے وسط مغازی میں روایت کی ہے براء ابن عازب
سے کہ حضرت صلعم نے ہمکو خالد ابن ولید کے ہمراہ حجۃ الوداع کے قبل
جانب یمن روانہ کیا، بعدہٗ جناب علیؑ ابن ابیطالبؑ کو بھیجا اور کہا کہ جو
شخص خالد کے ساتھیوں میں سے چاہے، تمہارے ساتھ رہ جاوے
تو اس کو رہنے دینا۔ اور جو شخص کہ چاہے۔ کہ واپس آئے اسکو بھیج دینا
براء کہتے ہیں۔ کہ ہم انہیں سے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے اور بہت سا مال
غنیمت ہاتھ آیا تھا بریدہ سے روایت ہے کہ حضرت نے حضرت علیؑ کو
بھیجا کہ جا کر خالد سے خمس وصول کریں۔ اور ہمکو علیؑ سے بغض تھا
ہم نے دیکھا کہ علیؑ غسل کر کے آئے ہیں۔ تو ہم نے خالد سے کہا کہ
کیا انکی طرف نہیں دیکھتے ہو۔ جب ہم جناب رسول خدا صلعم کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو حضرت سے اس بات کا تذکرہ کیا
حضرت صلعم نے فرمایا۔ کہ اے بریدہ کیا تم کو علیؑ سے عداوت
ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ حضرتؐ نے فرمایا علیؑ سے بغض نہ رکھو
کیونکہ انکا حصہ خمس میں اس سے کہیں زیادہ ہے علامہ
ذو النبیین (صاحب کتاب) کہتے ہیں۔ کہ اس حدیث کو بخاری نے
اپنی صحیح کے مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں بالکل ناقص اور
بطریق ابتر وارد کیا ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ
اُن کی عادت ہے۔ جو وہ ان اقسام کی حدیثوں کی
تفصیل و بیان میں اختیار کرتے ہیں۔ اور سبب اسکا
وہی اُن کی رائے بد ہے۔ جو وہ اس راہ سے
انحراف کرنے میں رکھتے ہیں۔ اسی روایت کو امام
احمد ابن حنبل نے کاملاً اور محققاً وارد کیا ہے۔ جس
کے طریق صحت میں وہ موافق ہوئے۔ وہ یہ ہے۔
(سلسلہ رواۃ متن میں مذکور ہے۔ بخوف طوالت قلم انداز
کرتے ہیں) عبد اللہ ابن بریدہ سے روایت

سماعة على الثقة الرئيس ابي القسم ابن الحصين
لحق سماعة على الثقة الواعظ ابن علي الحسين الواعظ
بن المذاهب لحق سماعة على الثقة ابي بكر احمد بن
جعفر بن حمدان القطيعي لحق سماعة من
الامام ابي عبد الرحمان بن عبد الله لحق سماعة
على ابيه امام السنة ابي عبد الله احمد ابن حنبل
قال حدثنا يحيى ابن سعيد حدثنا عبد الجليل قال
انتهيت الى حلقه فيها ابو مجلز وابنا بريدة فقال
عبد الله بن بريدة قال ابغضت عليا بغضا لم
يبغضه احد قط قال واحببت رجلا لم احبه
الا ببغضه عليا قال فبعث ذالك الرجل
على خيل فصحبته ما صحبته الا على بغضه عليا قال
واصبنا سبيا قال فكتب الى رسول الله صلعم
ابعث علينا من يخمسه قال فبعث الينا عليا
وفي السبي وصيفة هي افضل من السبي قال
فخمس وقسم فخرج وراسه يقطر فقلنا يا ابا الحسن
ما هذا قال لم تروا الى الوصيفة التي كانت في
السبي فاني قسمت وخمست فصارت في الخمس ثم
صارت في اهل بيت النبي صلعم ثم صارت في آل
علي ووقعت بها فكتب الرجل الى نبي الله صلعم قلت
ابعثني فبعثني مصدقا قال فجعلت اقرا الكتاب
اقول صدق صدق فامسك يدي والكتاب قال اتبغض
عليا قال قلت نعم قال فلا تبغضه وان كنت تحبه فازدد له
حبا فوالذي نفس محمد بيده لنصيب آل علي في
الخمس افضل من وصيفة قال فما كان من الناس

کرتے ہیں کہ ہمکو حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ سے اسقدر بغض تھا کہ دنیا کسی سے بھی نہیں۔ میں نے ایک شخص سے خاصکر اسوجہ سے محبت کی تھی۔ کہ وہ علیؑ سے بغض رکھتا تھا۔ یہ شخص جو دشمن علیؑ تھا۔ سردار لشکر بناکر بھیجا گیا۔ تو ہم نے صرف اسوجہ سے اسکی ہمراہی قبول کرلی۔ کہ وہ دشمن علیؑ تھا۔ اس واقعہ میں کچھ قیدی دستیاب ہوئے تھے۔ تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ تقسیم غنیمت کے لیے کسی کو بھیجدیا جاوے۔ آنحضرت صلعم نے حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کو بھیجدیا۔ ان قیدیوں میں ایک لونڈی تھی۔ جو سب سے بہتر تھی حضرت علیؑ بعد تقسیم تشریف لائے۔ اس حالت سے کہ آپ نے غسل فرمایا تھا اور پانی کے قطرے آپ کے سر سے ٹپک رہے تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا؟ حضرتؑ نے کہا کہ اس لونڈی کو کیا تمیں دیکھا۔ جو ان قیدیوں میں تھی۔ کہ بعد تقسیم وہ خمس میں پڑی۔ اور تقسیم خمس کے ذریعہ سے وہ اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ میں آئی اور پھر اُن سے خاص حصہ آل علیؑ میں آئی۔ اُس شخص نے (خالد ابن ولید) جو سردار لشکر بنایا گیا تھا۔ ان سب حالات کو لکھکر حضرتؐ کے پاس بھیجنا چاہا۔ ابو بریدہ نے کہا کہ یہ خط ہمکو دو۔ کہ ہم اس کی تصدیق کریں گے۔ یہ خط لے کر ہم رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرتؐ نے خط پڑھنا شروع کیا۔ ہم۔ سچ ہے۔ سچ ہے۔ کہتے جاتے تھے۔ پس آنحضرتؐ نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ اور خط پڑھنا بند کردیا۔ اور مجھے استفسار فرمایا۔ کہ تم علیؑ سے بغض رکھتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ حضرتؐ نے فرمایا۔ علیؑ سے بغض نہ رکھو اگر محبت رکھتے ہو۔ تو اس کو بڑھاؤ۔ قسم اُسکی جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ آل علیؑ کا حصہ خمس میں اُن

احد بعد قول رسول اللہ صلعم احبّ الیّ من علی قال عبداللہ فی الذی لا الٰہ الّا غیرہ ما بینی وبین رسول اللہ صلعم فی ھذا الحدیث غیر ابی بریدہ۔

…سے کہیں زیادہ ہے۔ اس حدیث کے بعد ہمارے نزدیک علیؑ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں۔ عبداللہ راوی حدیث کہتے ہیں کہ قسم خدا کی ہمارے اور جناب رسول خدا صلعم کے درمیان اس حدیث میں سوائے میرے باپ بریدہ کے کوئی دوسرا واسطہ نہیں ہے۔

ابن رحبہ کی مرقومہ بالا عبارت سے بخاری صاحب کا تدیّن فی نقل و الاحادیث بدیہی طور پر ثابت ہوگیا۔ باعتبار دیانت و امانت آپ کیسے متدیّن اور باعتبار محدّث و محقق تھے۔ کہ احادیث فضیلت جناب امیرؑ کو ناقص و ابتر و مقطوع لکھا کرتے۔ اور کسی طرح اُنکا دل اسکو گوارا نہ کرتا کہ فضائل و مناقب جناب امیرؑ کو پورے طور پر لکھیں کیونکہ روایت امام احمد ابن حنبل میں حضرت علیؑ کی احبیّت اور مساوات کا ذکر ہے۔ جس سے جناب امیرؑ کی فضیلت تمام عالم پر بعد رسول اللہ صلعم ثابت ہے۔ بخاری نے اس جملہ کو بالکل نکال دیا۔

بخاری کی یہ ترکیب صرف ایک روایت میں نہیں ہے۔ بلکہ بقول علامہ ذوالنبیین ابن رحبہ الاندلسی۔ دھی عادۃ کما تری بخاری کی یہی عادت تھی جیسی کہ دیکھی جاتی ہے۔ کہ جس حدیث میں حضرت علیؑ کا ذکر آتا اُسکو اسی طرح مختصر اور مقطوع کرکے روایت کرتے۔ پھر آپ کے تدیّن فی الحدیث کا کیسے اعتبار ہو۔

علّامہ ابن رحبہ کا پھر یہ فقرہ وما ذاک الاسوء رایہ فی التنکب عن ھذہ السبیل بخاری کی یہ عادت اسوجہ سے تھی۔ کہ اس سبیل سے انحراف کرتے ہیں اُنکی رائے بد تھی۔ صاف صاف بتا رہا ہے کہ بخاری کو ان حضرات (اہلبیت طاہرینؑ) سے کس قدر انحراف تھا۔ کہ آخر علمائے اہلسنّت کو بھی اس کجروی کا اقرار کرنا پڑا۔ پھر بتایا جاوے کہ ایسے محدّث کا کیا وزن اور ایسی کتاب کی کیا عزت ہوسکتی ہے۔ جو اپنے ذاتی اغراض کے لیے احادیث رسول صلعم کو اس طرح ابتر کیا کرتا ہو۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

پھر دوسرے مقام پر وہی علّامہ ابن رحبہ اندلسی لکھتے ہیں۔

بل انما اوردہ مسلم لانہ اوردہ بکمالہ وقطعہ البخاری واسقط منہ علی عادتہ کما تری وھو مما عیب علیہ فی تصنیفہ علی ما جرے ولاسیما اسقاطہ لذکر علی۔

اس روایت کو ہم نے صحیح مسلم سے پہلے اس لیے نقل کیا ہے کہ مسلم نے اس کو تمام وکمال نقل کیا ہے۔ بخلاف بخاری کے کہ انہوں نے اس حدیث میں بہت سا حذف و اسقاط کیا ہے جو اُن کی خاص عادت ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے۔ کہ اُنکی تصنیف پر اسکا عیب لگایا گیا ہے۔ خصوصاً ذکر حضرت علیؑ کا ساقط کردیا۔

تو کیا ایسا شخص۔ ان تمام معائب و مناقص کے بعد بھی محدّث۔ امام۔ اور امیر المؤمنین فی الحدیث کہا جاسکتا ہے۔ جو عمداً الفاظ و احادیث رسول صلعم کو نکالدے۔ اور خصوصاً ذکر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو

ساقط کردے۔ اور عموماً یہ اُس کی عادت قرار پائے۔
علامہ ذو النسبتین ابن رحبہ کی توثیق۔ علامہ ذو النسبتین بن رحبہ کوئی معمولی شخص نہیں تھے۔ بلکہ اکابر علمائے اہلسنّت سے تھے۔ وا خیات الاعیان ابن خلکان میں ہے۔

ابو الخطاب عمر ابن الحسن بن علی بن محمد بن الجمیل بن فرح بن خلف بن قرس بن ذلال بن ملال بن بدر بن رحیہ بن فردہ المعروف ذی النبین الاندلسی البلنسی الحافظ کان ابو الخطاب المذکو رمن اعیان العلماء ومشاھیر الفضلاء متقنا لعلم الحدیث۔

ابو الخطاب کا نام عمر ابن حسن بن علی بن محمد بن جمیل بن فرح بن خلف قرس بن ذو ولال بن ملال بن بدر بن وحبہ بن فردہ المعروف ذی النبیتن الاندلسی البلنسی۔ حافظ۔ اعیان۔ علماء اور مشاہیر فضلاء سے تھے۔ علم احادیث نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے بہت بڑے متقن تھے۔

(۳۹) بخاری اور اُنکے اصناف کے حضرات۔ اصحاب صحاح کی عموماً اس قطع و برید اور استخفاف و اخذاف احادیث سے جو غرض و غایت تھی۔ وہ پورے طور سے ظاہر ہوگئی۔ مولوی شبلی صاحب نے اپنی تالیفات و تصنیفات میں بھی اپنے اسلاف کی کامل تقلید اختیار فرمائی بلکہ ضرورت سے زائد۔ زیادہ غور و تحقیق سے دیکھا جاوے۔ تو آپ کے محتاط قلم نے اُتنی تفصیل و بیان کا بار اُٹھانا بھی گوارا نفرمایا جتنا آپکے اسلاف نے جبراً و قہراً اور طوعاً و کرہاً لکھدیا تھا۔ ہم نے شبلی صاحب کے اس طریقہ استخفاف و استقصار کو آپکی دونوں جلدوں میں غور و تحقیق سے دیکھا ہے۔ اور ایسے تمام واقعات میں جہاں جہاں آپنے احذاف و استخفاف اور اسقاط الفاظ و مضامین سے کام لیا ہے۔ اُنکی اصلیت اور حقیقت تفسیر۔ حدیث۔ تاریخ اور سیر وغیرہ کی تفصیل و بیان سے پورے طور سے قلم بند کردی ہے۔ اور کافی ثبوت و شہود سے تبلادیا ہے کہ شبلی صاحب نے اپنے ذکر و نقل میں بھی اپنی اُسی ضرورت خاص کو مدنظر رکھا ہے۔ جو بخاری اور غیر اشباہم کا قدیم سے معیار و مختار قرار پاچکا تھا۔ اور وہ اُصول مساوات اور طریقہ تعمیم تھا جس کی ابتدا قبل اسلام کے وقائع نگاری میں اُسی وقت سے اُٹھائی گئی ہے۔ جب سے بنی ہاشم قبیلہ قریش سے جُدا ہوکر اہلبیت کے خاص خطاب و القاب سے مخصوص کیے گئے۔ اور امارت مکہ اور ولایت خانہ خدا انکا اصلی اور موروثی منصب قرار پایا پھر بعد ظہور اسلام تمام واقعات اور خصوصاً اُن مقامات میں۔ جن سے اور جہاں سے اُن کے اعلیٰ خدمات اسلام اور فضائل و مناقب اور ترجیح علی کافۃ الانام اور دیگر امور شرائف و خصائص ثابت ہوئے۔ اسی اُصول

اُصول اور مساوات طریقہ تعمیم۔

النبی وما یتعلق بہ عارفا بالنحو واللغۃ وایام العرب واشعارھا اکثر یطلب الحدیث فی اکثر بلاد الاندلس الاسلامیہ ولقی بھا علماء ومشایخھا ثم رحل منھا الی بر العدوۃ ودخل مراکش واجتمع بفضلائھا ثم ارتحل الی افریقیہ ومنھا الی الدیار المصریۃ ثم الی الشام والشرق والی العراق وسمع ببغداد من بعض اصحاب ابن الحصین وسمع بواسط من ابی الفتح محمد ابن احمد المندائی ودخل الی عراق العجم وخراسان وما والاھا ومازندران کل ذلک فی طلب الحدیث والاجتماع بائمۃ الحدیث واخذ عنھم وھو فی تلک الحال یرحل عنہ ویستفاد منہ وسمع باصبھان من ابی جعفر الصیدلانی وبنیشاپور من منصور بن عبد المنعم الفراوی۔

علم نحو، علم لغت کے امام اور اشعار و ایام عرب کے عارف تھے طلب علم حدیث میں اکثر بلاد اندلس اسلامیہ کی سیاحت کی اور علماء و مشائخ سے ملاقات کی پھر علاقہ بر عدوہ کی طرف گئے۔ اور داخل مراکش ہوئے افریقیہ۔ دیار مصریہ۔ شام شرق۔ عراق کا سفر کیا۔ بغداد میں اصحاب ابن الحصین سے سماعت کی۔ اور واسط میں ابو الفتح مندائی سے عراق عجم و خراسان اور اُنکے متعلقات شہر مازندران کیطرف سفر کیا۔ یہ سب طلب حدیث کیلئے تھا۔ اور خاصکر اس غرض و مدعا سے کہ آئمہ حدیث سے ملاقات کریں۔ اور اُن سے علوم حاصل کریں ان سب کے ساتھ خود اسدرجہ اعظم تھے کہ علماء اُن سے علم حاصل کرتے۔ اور استفادہ کرتے۔ اصفہان میں ابی جعفر صیدلانی سے اور نیشاپور میں منصور بن عبد المنعم فراوی کی سماعت کی۔ وفات ۶۳۳ھ میں ہوئی۔ وفیات الاعیان ص ۳۹۱

مساوات اور طریقہ تعمیم کا ظاہری پردہ ڈالدیا گیا۔ حقیقت حال اور صورت واقعہ یا تو قطعاً مرفوع القلم اور کالعدم کردی گئی۔ یا بیان بھی کی گئی۔ تو محض اشارات یا استعارات کی صورت میں۔ اور اگر کسی خاص مقامی مجبوری سے توجہ بھی فرمائی گئی۔ تو حقیقت بیان میں اسقدر اختصار اور قطع و برید سے کام لیا گیا۔ کہ حقیقت و اصلیت واقعہ بالکل مبہم اور غیر مفہم ہو کر رہ گئی۔

ہم نے اپنی موجودہ کتاب میں ابتداہی سے شبلی صاحب کے اس طرز تحریر و تخفیف حقیقت پر پوری نظر ڈالی ہے اور ہر ہر مقام پر آپ کی اس قلم کاری کی حقیقت کھولدی ہے۔ تنہا شبلی صاحب ہی کی اس ترکیب تحریر کی تنقید نہیں کی ہے۔ بلکہ محدثین مورخین اور مغازی و سیرت کے مؤلفین کے طبقہ میں بھی جن حضرات نے ان مصنوعات سے کام لیا ہے۔ اُن کے استخفاف کا بھی پورا انکشاف کر دیا ہے۔ یہ مناسب تھا کہ ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان میں ان مصنوعات کی چند مثالیں بھی پیش کر دیتے۔ مگر ہم اس باعث سے باز رہے۔ کہ اُن تمام مضامین جو عنقریب ہماری کتاب میں پیش نظر آنیوالے ہیں۔ بلا ضرورت توارد پیدا ہو گیا۔ اور بیکار طوالت کا باعث ہوگا

اصول تعمیم اور مساوات فی المدارج بین الصحابہ کے اصول مسلمہ سے بالآخر شبلی صاحب کا انکار

(۴۰) حقیقت کسی ترکیب سے چھپ نہیں سکتی۔ کیوں؟ صرف اسلیئے کہ اُسکا نام ہی "حقیقت" ہے شبلی صاحب نے اُصول تعمیم کے مطابق الواع د

اقسام کی ترکیبوں سے حقیقت حال کے مشاہدات پر نقاب انگنی فرمائی ہے۔ مگر ایک دوسرے موقع پر اپنی ہی دست و قلم سے اسی اصول تعمیم کی کامل تنقید و تردید صاف صاف لفظوں میں مفصلہ ذیل عبارت میں قلمبند کر دی ہے روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے۔ صحابہ کے متعلق اُن سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا۔ مثلاً اصول روایت کے رُو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں۔ کوئی راوی نہایت ضابطہ۔ نہایت معنی فہم اور نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے۔ کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں۔ کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں یہ فرق مراتب جس طرح فطرتاً عام رواۃ میں پایا جاتا ہے۔ صحابہ بھی اسی سے مستثنیٰ نہیں۔ حضرت عائشہ نے حضرت عبد اللہ اور حضرت ابوہریرہ کی روایت پر اور حضرت عبد اللہ ابن عباس نے حضرت ابوہریرہ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں۔ وہ اسی بنا پر تھیں۔

اختلاف کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قایم ہے۔ مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آئے۔ تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے زیادہ عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جاوے (گو دونوں آدمی ثقہ ہیں) اور یہ اُس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔ لیکن صحابہ میں آکر یہ اُصول بیکار ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک روایت حضرت عمر سے مروی ہے۔ اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے۔ جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت صلعم کو دیکھ لیا تھا۔ تو اب دونوں راویوں کا درجہ برابر ہو جاتا ہے۔ علامہ مازری مشہور محدث ہیں۔ علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر اُن سے استناد فرماتے ہیں۔ اُنہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ صفحہ ۱۰ میں اُنکا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعنی بقولنا الصحابۃ عدول کل من راہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم اومن راہ لماما او اجتمع بہ لغرض وانصرف عن کتب وانما نعنی بہ الذین لازموہ وعزروہ و نصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون۔	یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں، ہم اُس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے۔ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت صلعم سے کسی غرض کیلئے ملا۔ اور پھر واپس چلا گیا۔ بلکہ اُن لوگوں کو مُراد لیتے ہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بہ التزام رہے۔ اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اُس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلعم پر نازل ہوا یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی۔ علامہ مازری نے بے شبہہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہ سے مخصوص کر دیا۔ اس بنا پر محدثین کی مخالفت اُن سے بیجا نہیں۔ لیکن

اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت ابوبکر و عمر و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ خصوصاً اُن روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جو فقہی مسائل یا دقیق مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۴۱ و ۴۲۔

یہ ہے حقیقت کی حقیقت! شبلی صاحب کے مرقومہ بالا اعتراف سے کہ مراتب صحابہ میں تعمیم و مساوات کا خیال صحیح نہیں۔ بلکہ بعض بعض خاص مقامات (فقہی اور دقیق مسائل) پر اس تخصیص میں ترمیم ضروری اور لابدی ہے۔ شبلی صاحب کے اس مندرجہ صدر اعتراف کے لفظ لفظ کو غور پڑھا جاوے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اُس بیان کے ایک ایک لفظ کو کس حزم و احتیاط سے تول تول کر لکھا ہے۔ اصول عقائد اور تقلید اسلاف تو ایک طرف ہاتھ پکڑ کر آپ سے تمام دلائل و مباحث کے بعد یہ لکھواتی ہے۔ کہ علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی۔ کہ عدالت کے موصف کو مطلقاً مقربین صحابہ سے مخصوص کر دیا۔ دوسری طرف حقیقت کے اثر نے اُسی دست و قلم سے یہ فیصلہ بھی ایک ہی خط و تحریر میں لکھوا دیا ہے۔ کہ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ پھر ذرا سنبھل کر اس تخصیص کی یوں تعمیم فرما دیتے ہیں۔ کہ اُن روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔ تو گویا اُن مقربین صحابہ کے اقوال و ارشاد کا اعتبار الٰہیات و فقہیات تک مخصوص کر دیا گیا۔ اور باقی مسائل میں ان حضرات کی حالت تعمیم اور مساوات فی المدارج کے اُصول پر تسلیم کرنا چاہیے۔

شبلی صاحب نے یہ فیصلہ سخت اضطراب و کشمکش کی حالت میں لکھا ہے۔ اور وہ اس دورخی تجویز کے لیے حقیقتاً مجبور تھے۔ اس لیے کہ کلہم عدول کے اُصول عقائد کو بھی سنبھالنا ہے۔ اور اپنی آزادانہ تحقیق اور فلسفانہ طریقہ سیرت نگاری کی بھی آبرو رکھنی ہے۔ مگر آپ کی اُس طرز تحریر پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجودیکہ آپ نے حد درجہ کے حزم و احتیاط سے حقیقت کے لکھنے میں کام لیا ہے۔ مگر پھر بھی تمام مصنوعات کی قلعی کھلتی گئی ہے۔ اور حقیقت کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔

دیکھیے۔ علامہ مازری نے کلہم عدول کے اُصول کی غلطی کا باعث دکھلا کر اپنی آزادانہ رائے قائم کر دی ہے اور اختلاف اسلاف کی رتی بھر بھی پرواہ نہیں کی۔ مگر آپ کے دل و دماغ میں اتنی قوت کہاں۔ آپ نے مسئلہ زیر بحث کی دورخی تصویر کھینچی۔ اور اثبات و نفی دونوں پہلوؤں کو حتی المقدور قائم رکھنا چاہا۔ اور اسی طریقہ ذوجہتی نے آپ کو حقیقت نگاری سے کوسوں دور پھینک دیا۔ اور پھر آپ ہی سے آپ کی کجروی اور غلط فہمی کی حقیقت بھی لکھوا دی۔

سلہ حضرت عثمان کے استثنا کی کوئی وجہ نہ ... حالانکہ ...

آپ علامہ مازری کی اس حقیقت نمائی کی تردید میں یہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ "علامہ نے یہ غلطی کی۔ کہ عدالت کے وصف کو مقربین صحابہ سے مخصوص کر دیا۔ اس بنا پر محدثین کی مخالفت اُنسے بجا نہیں" تو گویا باوجود علامہ مازری کی جرح و قدح کے۔ جنکو آپ اپنے ان الفاظ میں کھلکر تسلیم کر چکے ہیں کہ "اس میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ۔ عمرؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں" صحابہ کلیتاً عدول ہیں۔ آپ نے اپنے بیان پر صرف الفاظ کا ایک معنویانہ پردہ ڈالدیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں آپ کے الفاظ ثابت کر رہے ہیں۔ کہ صحابہ کے مابین آسمان زمین کا فرق ہے

دیکھیے۔ اپنے مرقومہ بالا اعتراف سے چند سطر پیشتر جو مسئلہ زیر بحث کے متعلق آپ نے تمہیدی عبارت نقل فرمائی ہے۔ اور جس کو ہم اوپر بھی لکھ چکے ہیں۔ اور صرورتاً پھر لکھتے دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ "فرض کرو۔ ایک روایت حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔ اور دوسری کسی بدوی عرب سے" کبھی تو آپ کلّھم عدول کی اُصول عقائد سے علیحدہ ہو کر طبقہ صحابہ کرام میں ترتیب فی المدارج قایم کرتے ہیں۔ اور اپنے معیار تالیف اُصول مساوات اور تعمیم کا کوئی خیال نہیں فرماتے۔ ایک صحابہ کو حضرت عمرؓ کے القاب سے یاد فرماکر اُس کا اعزاز بڑھاتے ہیں۔ اور دوسرے کو ایک بدوی عرب کے اہانت آمیز و حقارت انگیز الفاظ سے ذکر فرماکر اُس کی شان صحابیت کو خاک میں ملاتے ہیں۔ اور جب علامہ مازری اس تخصیص و تفریق کو کھلکر بتلاتے ہیں۔ تو آپ اُن کے مختار تحقیق کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ اور جملہ علما و محدثین کی شکایت و مخالفت کا باعث ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ مازری غریب نے صحابہ کی شان صحابیت کی نسبت کسی ایسے لفظ کا استعمال نہیں فرمایا جس سے اُس کی ذاتی یا صفاتی توہین ہوتی ہو۔ بخلاف اُن کے آپ نے ایک جگہ نہیں دو دو جگہ اصل شان صحابیت کی ہتک حرمت فرمائی ہے۔

اب فرمایئے تفریق فی المراتب بالتخصیص فی المدارج۔ جو کہیے۔ آپ تو خود قائم فرماتے ہیں۔ اور ایک بدوی عرب کی اصلیت و حقیقت دکھلاکر۔ صحابہ میں تخصیص و تفریق کا ثبوت خود پہونچاتے ہیں۔ تو پھر اب آپ کلّھم عدول کی تعلیم کو غلط تسلیم کرنے پر کیوں تیار نہیں ہوتے۔

شبلی صاحب پر حقیقت کا انکشاف بھی ہو گیا۔ اور مکاشفہ حقیقت کو تسلیم بھی کر چکے۔ جیسا کہ علامہ مازری کے اس قول کو نقل کر کے اُنہوں نے اس آیہ قرآنی کو الذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ہم المفلحون جو آنحضرت صلعم کی خدمت میں بالتعزر و ارلم رہے۔ اور آپ کی اعانت و مدد کی۔ اور اُس نور کی پیروی کی۔ جو اُن پر نازل ہوا۔ وہی لوگ کامیاب ہیں" کو بھی نقل فرمایا ہے۔ جس پر علامہ موصوف نے اپنا معیار قائم کیا ہے۔ اور ایک گونہ آپ نے اُنکے اس استدلال

کو تسلیم بھی کرلیا ہے۔ اور تخصیص فی المراتب کی اصل و غایت کو اس آیہ قرآنی کی عبارت سے بھی سمجھ لیا ہے، مگر تاہم آپ کا طرز تحریر اور انداز تالیف بتلا رہا ہے۔ کہ باوجود اسکے کہ آپ اپنے اس عقائد سلف کی غلطی اور خود غرضی کو خوب سمجھ چکے ہیں۔ اور یقین کر چکے ہیں کہ تنہا صحابہ ہونے کی شخصیت اور حیثیت فائدہ نہیں پہونچا سکتی۔ بلکہ اس کے ساتھ خدائے تبارک و تعالےٰ نے اور اوصاف و محامد کے شروط و قیود بھی قایم کر دیے ہیں۔ اُنکا ہونا بھی ضروری اور لازمی ہے۔ مگر افسوس کہ حقیقت کے اتنے انکشاف کے بعد بھی آپ کلھم عدول کی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ اور اسلاف کی تقلید کا دامن نہیں چھوڑتے علامہ مازری کے صحیح استدلال کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور اُسکے متعلق محدثین کے مخالفانہ حملات کو صحیح اور جائز مانتے ہیں حقیقت اپنا کام کر گئی۔ اور آپ کی اس دو رُخی نقش و نگار کی صورت میں اُسکی پوری جلوہ آرائی ہوئی یہی آیت قرآنی جس کو آپ نے خود نقل فرمایا ہے۔ صاف صاف اوصاف صحابہ کو بتلا چکی۔ مگر نہ آپ کی کوتہ نظری اس کی پوری حقیقت تک پہونچی۔ اور نہ آپ کی قصیر الفہمی اسکی پوری معرفت حاصل کر سکی۔ اسی ایک آیہ وافی ہدایا نے کلھم عدول کے غلط اصول کو غلط و باطل فرما دیا۔

۵ نہ ہر کہ سر تراشد قلندری داند۔ محض صحابیت اور صرف صحابہ ہونے سے کام نہیں نکلتا بلکہ ارشاد الٰہی کے مطابق، خدمت و اعانت۔ نصرت و حمایت اور انوار رسالت کی خالص تبعیت۔ صحابیت کے اصلی اور حقیقی معیار ہیں اگر ان اوصاف میں کوئی صحابی کامل ہے۔ تو البتہ شرف صحابیت کا اطلاق اسپر صحیح اُترے گا۔ ورنہ نہیں۔ علامہ مازری نے اسی نص الٰہیہ کی علت غایۃ پر غور کیا ہے۔ اور اُسی کے نتیجہ سے صحابہ کرام کے دائرے میں۔ باعتبار معرفت و خدمت مراتب بالمدارج قائم فرمائے ہیں۔ شبلی صاحب بھی اُن کے اس مختار کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اُسی حد تک جہاں تک کہ آپ کے مفید مطلب ہے۔ اور اُسکے آگے نہیں۔ اس سے آگے چل کر تو پھر اُسی اصول قدیم اور شعار تعمیم کلھم عدول کی تائید و تقلید فرماتے ہیں۔ اور علماء و محدثین کی طرف سے علامہ مازری پر اس معیار تخصیص کو قائم کرنیکے لیے مخالفت پر آمادہ اور تیار ہو جاتے ہیں ہمکو شبلی صاحب کے اس تشتت۔ تذبذب اور دو طرفہ طریقہ فیصلہ سے کوئی شکایت ہے۔ اور نہ کوئی علاقہ کیونکہ اُنکے اسلاف کا قدیم طریقہ ہے۔ ہمکو جو کچھ دکھلانا ہے۔ وہ صرف اپنے معتقدانہ دعاوی کی تصدیق اور وہ یہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ حقیقت کسی حال اور کسی چال سے چھپ نہیں سکتی۔ شبلی صاحب اور اُن کے ہمخیال علماء و محدثین کی تمام قلمکاریوں سے قطع نظر کرکے اس آیہ وافی ہدایہ کے صاف اور واضح الفاظ و معانی پر اگر غور کیا جاوے تو کامل طور سے معلوم ہو جائے گا۔ اور نہایت آسانی سے سمجھ لیا جائے گا۔ کہ شرف حصول صحابیت کے لیئے، خدمت اور نور رسالت کی تبعیت شرط ہے۔ صحابہ کرام کے لیئے بڑے اور وسیع

دائرے میں ان حضرات کے انھیں خدمات اسلام. نصرت و اعانت رسول انام علیہ السلام کے باہمی موازنہ و مقابلہ کی بنا پر مراتب بالمدارج قائم کیے جاتے ہیں۔ اور انھیں کے اعتبار پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر اور انکے مساوی اور مقابل درجہ کے صحابہ انکے صحابی عربی بدوی سے بدرجہا افضل ہیں. انھیں اسناد و اشہاد سے شبلی صاحب اور انکے اخلاف اور ہمخیال علما و محدثین کو سمجھ لینا چاہیئے. کہ اب وہ صحابہ اوّلین و السابقین جو خدمات. رفاقت اور ایجاب. و اتباع نور رسالت میں حضرت عمر سے بھی زیادہ افضل و اعلےٰ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ حضرت عمر اور انکے امثال سے ترجیح بالمرجح پانے کے ضرور مستحق ہیں. کما لا یخفی علی المدبر. اب کس نوع اور عنوان سے کلہم عدول اصول معیار قرانی کے مطابق کامل اُتریگا. نہیں معلوم کہ وہ مسئلہ جو قرآن کے بالکل مخالف و معارض ثابت ہوا ہو. وہ کس طرح اہل اسلام کے عقائد میں داخل ہوگا۔

مندرجہ بالا نص قرانی سے یہ مستفاد ہوتا ہے. کہ جب شرائط مذکورہ پر شرف صحابیت. مخصوص و محدود ہوگیا. تو باعتبار اعلیٰ و افضل مدارج کے جو صحابی من حیث المعرفت و الخدمت افضل و اعلےٰ ثابت ہونگے وہی قابل ترجیح و لائق تفضیل تسلیم کیئے جاوینگے. اسکے لیے شخصیات اور ذاتیات کی ضرورت نہیں. شبلی صاحب. خیریت ہے کہ یہاں تک تو ہمارے ہمخیال ثابت ہوتے ہیں. مگر انکو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے. کہ آپنے عام بدوی عرب سے صحابہ مقربین تک اس موازنہ و مقابلہ کو محدود و موقوف کر دیا ہے. حالانکہ ایسا نہیں ہے. بلکہ ان صحابہ مقربین کے دائرے میں بھی یہی معیار امتیاز قائم کیئے جاوینگے. اور انمیں بھی جن حضرات کے محاسن خدمات اور اوصاف نصاب معیار کے مطابق اُتریں گے. وہی ماسبقی بزرگواروں سے ضرور افضل اور اعلےٰ الیقین کیئے جاویں گے. اگر شبلی صاحب کی طرح یہ سلسلہ امتیاز صحابہ سابقین تک تمام کر دیا جاوے. تو نصوص الہی کے مخالف ہوگا. اور ہر وہ شے جو مخالف قرآن ہو. ہر عنوان سے غلط اور باطل ہوگی۔

اب ہم شبلی صاحب کی اس غلط تجویز کی تحقیق و تنقید کرتے ہیں. اور مفصلہ ذیل شاہدات سے ثابت کرتے ہیں. کہ صحابہ اوّلین ہی کے زمانہ میں یہ معیار امتیاز و فضیلت قایم ہو چکے تھے. اور اسی معیار سے ترجیح و تخصیص بین الصحابہ قایم کی جاتی تھی. ابو المویدا خطب خوارزمی مناقب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قال مسروق شاممت اصحاب محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم فوجدت علیهم انتھی الی عمرو عبد اللہ ابن مسعود والی الدرداء ومعاذ ابن جبل وزید ابن ثابت وعلی ابن	مسروق کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے اصحاب میں تشمیم و تمیز کمال کی تو مجھے معلوم ہوا کہ ان حضرات کا علم حضرت عمر[1]. عبد اللہ ابن[2] مسعود. ابو الدرداء[3]. معاذ ابن جبل[4]. زید ابن ثابت[5] اور حضرت علی ابن ابیطالب پر تمام ہوتا ہے. پھر ہم نے ان پانچوں (ترجمہ)[6]

ابیطالب ثم شاممت ھولاء الخمسہ فوجدت علیھم الی الرجلین علی وعبداللہ ابن مسعود ثم شاممت الاثنین فوجدت علیا بفضیل علی عبداللہ ابن مسعود

بزرگوں میں تشیم تمیز کی تو مجھے معلوم ہوا کہ ان پانچوں حضرات کا علم دو آدمیوں پر تمام ہوتا ہے۔ علی اور عبداللہ ابن مسعود پر۔ پھر میں نے ان دونوں بزرگوں میں تشیم تمیز کی تو مجھے معلوم ہوا کہ علی عبداللہ ابن مسعود پر فضیلت رکھتے ہیں

مسروق اجل تابعی ہیں حضرت عائشہ سی محدثہ کی خدمت میں جو اُن کو رسوخ و وثوق حاصل تھا۔ وہ ہرگز میرے بیان کا محتاج نہیں۔ اگر اُنکے اس مختار پر قول صحابہ نہونے کے باعث اشتباہ ہو تو (حالانکہ بخاری اور شرح بخاری دیکھی جاوے تو قول تابعی بمقابل قول صحابی ایراد حدیث کے موقع پر زیادہ معتبر اور مستند ہے۔ امام خوارزمی کی کتاب المناقب میں مفصلہ ذیل عبارت سے حضرت ابی الدرداء کا یہ قول ملاحظہ فرمایا جاوے۔

حضرت ابی الدرداء صحابہ کبار کے طبقہ اولیٰ میں بہت بڑے فقیہ اور مجتہد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ میرے زمانہ میں اسلام کے تین عالم موجود تھے۔ ایک کوفہ میں۔ ایک شام میں۔ اور ایک خاص مدینہ میں کوفہ کے عالم سے وہ عبداللہ ابن مسعود کو مراد لیتے تھے۔ شام کے عالم سے وہ اپنی طرف اشارہ فرماتے تھے۔ کیونکہ اُن دنوں یہ زیادہ تر علاقہ شام میں رہتے تھے۔ اور مدینہ کے عالم سے اُن کی مراد جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے تھی۔ یہ لکھکر محاکمہ کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

فالذی بالشام یسئل الذی بالکوفہ وھو یسئل عن الذی بالمدینہ وھو لا یسئل احد

شام کا عالم عند الضرورت کوفہ والے عالم سے پوچھ لیتا ہے اور کوفہ والا مدینہ والے عالم سے پوچھ لیتا ہے۔ مگر مدینہ والا عالم ایسا ہے جو کبھی کسی سے نہیں پوچھتا

شبلی صاحب کی خطرناک فروگذاشت

(۴۵) مسئلہ زیر بحث کے متعلق ہم اس سے زیادہ لکھنا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا لکھدینا اور بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ آیہ متذکرہ بالا میں شرائط صحابیت کی نسبت جہاں خدمت۔ نصرت رسولؐ کی شرطیں قائم کی گئی ہیں۔ اُنکے ساتھ اس نور کی تبعیت بھی لازم کی گئی ہے۔ جو رسول صلعم کی معیت میں من جانب اللہ نازل ہوا ہے۔

اکثر علمائے محدثین و مفسرین نے نور سے قرآن مجید مراد لیا ہے۔ مگر لفظ معہٗ کی تخصیصی معیت نے تصریح کردی ہے۔ کہ یہ نور۔ نور قرآن سے ایک جوہر جداگانہ ہے۔ کیونکہ روایتاً و درایتاً اور بالکل حقیقتاً قرآن مجید آپ کے ساتھ نازل نہیں ہوا جس کی تخصیص کو "معہ" کا لفظ صاف صاف ثابت کر رہا ہے۔ اور نہ کوئی شخص اسکا قائل ہے۔ کہ ایک بار آپ پر تمام قرآن نازل کیا گیا ہے۔ پھر نور سے قرآن مجید کا مراد کیا جانا لفظ قرآن کے اصل معانی سے مختلف و معارض واقع ہوتا ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ اصحاب احادیث و تفاسیر سے زیادہ ارباب کلام اور فضلائے عظام نے اسکی نسبت غور و تعمق سے کام لے کر اس نور رسالت کی حقیقت کا پورا انکشاف فرمایا ہے۔ اور لفظ نور سے رسولؐ کا

خاص نفس نورانی مراد لیا ہے۔ اور رسولؐ کے نفس خاص کو خدا خود سورۂ آل عمران کے آیہ انفسنا وانفسکم الخ میں بتلا چکا ہے مگر شبلی صاحب نے اپنی سیرت کو تاریخ فلسفہ اور یوروپین تصانیف کے اسٹائل (طرز) پر کامل اُتارنے کے شوق و تمنا میں رسولؐ کی روحانیت ہی کو بالکل مخفی کر دیا ہے۔ پھر نورانیت کی تفصیل کا کیا ذکر۔ جو اسی رُوحانیت کا ایک چمکتا جوہر ہے۔ امامی بلگرامی۔ ؎ یکے از معجزات او علیؑ بود۔

شبلی صاحب نے شمس العلماء ہو کر رسول صلعم کے رُوحانی نورانیت کو ایسا چھپا دیا ہے۔ کہ تمام کتاب میں کسی مقام پر آپ کے انوار روحانی کا عکس خارجی بھی نہیں پڑنے پایا۔ مگر بالآخر انہیں ماثر روحانی نے۔ گو علامہ مازری ہی کی زبانی سہی۔ لیکن آپ ہی کے دست قلم سے اپنا وجود و اثبات قلم بند کروا دیا۔

مگر باین ہمہ۔ یہاں بھی ہمارے شبلی صاحب اپنی ترکیب سے نہ چُوکے۔ اس آیہ ہدایہ کی نقل میں اصل لفظ نور ہی کو حذف فرما دیا۔ ملاحظہ ہو دیباچہ ص ۲ لم۔ لیکن قدرت نے فوراً آپکا ہاتھ پکڑ کر عبارت ترجمہ میں نور کا لفظ لکھوا ہی چھوڑا۔

یہ تو مولوی شبلی صاحب کی چال۔ مگر سر جائیگی غریب کاتب یا بیچارے مُصلح سنگ کے۔ مگر ہم نے اسکی بھی تحقیق کر لی ہے۔ نہ کاتب کی غلطی ہے۔ نہ مُصلح سنگ کی غفلت۔ یہ تو مولف ہی کا قدیم طریقہ استخفاف ہے۔ اس لیے کہ آخر کتاب جلد اوّل میں غلطنامہ لگایا گیا ہے۔ اور نہایت اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ صحت الفاظ کے اہتمام میں جو جو حزم و احتیاط کے سامان کئے گئے ہیں۔ وہ نہایت وضاحت سے مندرج کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے نمبر ۵ میں یہ عبارت قلم بند کی گئی ہے۔

لیتھو میں غلطیوں کا رہجانا ناگزیر امر ہے۔ کاتب سے زیادہ اُس کا ذمہ دار مُصلح سنگ ہے۔ جس کے حرف گیر کے نیچے نقطہ داغ بنکر اڑ جاتا ہے۔ اور داغ نقطہ بن جاتا ہے۔ یا حرف چھن کر اپنی جگہ سے اڑ جاتا ہے۔ ان میں (تمام کتاب کے غلطنامہ میں) تین سہو قلم ہیں۔ ص ۱۰۵ میں ھو الذی کو ھو۔ ص ۲۰۹ میں ادکا رحام کو ادلوا الارحام اور ص لم ۳۶ میں فاشھدوا کو فقولوا اشھدوا بنا دیجئے دیگر قابل اصلاح اغلاط پر ہم نے خط کھینچدیا ہے۔ بقیہ غلطیاں زیر۔ زبر یا نقطوں کی زیادہ تر ہیں۔ اور معمولی ہیں۔ تمہید غلطنامہ ص ۱ جلد اوّل سیرۃ النبیؐ۔

اس اعلان کی عبارت سے ثابت ہو گیا۔ کہ فقرات عربیہ میں احذاف الفاظ کی سہو قلم والی غلطیاں سوائے اُن تین غلطیوں کے جو اشتہاری عبارت میں درج کر دی گئی ہیں۔ اور کوئی نہیں ہے۔ اور جو ہیں بھی اُنپر خط کھینچدیا گیا ہے۔ اور وہ زیادہ تر زیر۔ زبر اور نقطوں کی معمولی غلطیاں ہیں۔

مگر ان اشتہاری دعوؤں کے برخلاف۔ احذاف لفظ النور۔ جو دیباچہ ص ۲ لم میں واقع ہیں۔ نہ نمبر ۵ کے شماری اغلاط میں دکھلایا گیا ہے۔ نہ اسمقام پر حسب الوعدہ۔ خط کھینچدیا گیا ہے۔ اور لطف مزید تو یہ ہے۔ کہ جدول

غلطنامہ میں بھی نہ اس صفحہ ۴۲ کا کہیں ذکر ہے۔ اور نہ لفظ السنور کا نشان۔ اس بنا پر اس غلطی کو یا تو مولف کی شرمناک فروگذاشت ٹھہرانا صحیح ہوگا۔ یا اُنکے بعد مہتمم انطباع کی صریح چشم پوشی کہنا مناسب اور فی الواقع ہوگا ہم اس سے زیادہ اس مسئلہ کی تنقید کرنا نہیں چاہتے۔ اس لیئے کہ اُس کی ضرورت سے زائد تفصیل میری موجودہ مدعا کے موضوع سے زائد ہوگی۔ اور بیکار طوالت کا باعث۔

اقوال صحابہ میں تعارض اور شبلی صاحب کا خود اقرار

(۲۴) شبلی صاحب اقوال صحابہ میں تناقص و تعارض دکھلا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اُن حضرات کی سماعت و عقل بھی مدعائے حدیث کے سمجھنے اور سمجھانے میں علی الاکثر غلطی کرجاتی تھی۔ اس کے ثبوت میں اُنہوں نے متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں سے چند مفصلہ ذیل مثالیں ہم اُنھیں کے الفاظ و عبارت میں نقل کرتے ہیں۔

(الف) حضرت ابوہریرہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے حدیث بیان کی۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جس چیز کو آگ چھوئے۔ اُس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا۔ کہ اس بنا پر تو لازم آتا ہے۔ کہ ہم گرم پانی سے بھی وضو نہ کیا کریں۔ حضرت ابوہریرہ نے کہا۔ کہ بھتیجے جب تم آنحضرت کی کوئی حدیث سنو۔ تو کہاوتیں نہ کہا کرو۔ (بحوالہ ابن ماجہ۔ ترمذی)

(ب) صحیح بخاری (باب الصلوٰۃ و النوافل جماعۃ) میں ہے۔ کہ محمود ابن ربیع نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ کہ جو شخص خالصتاً خدا کے لیئے لا الٰہ الا اللہ کہے گا۔ خدا اُس پر آگ حرام کردے گا۔ اس جلسہ میں ابو ایوب انصاری بھی موجود تھے۔ جن کے مکان میں آنحضرت صلعم نے (۷) مہینوں تک قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاری نے یہ حدیث سُنکر کہا۔ کہ واللہ ما اظن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قال ما قلت قط خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا۔ کہ جو تم کہتے ہو۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہوگا۔ محمود ابن ربیع صحابی تھے۔ اور حضرت ابو ایوب کو اُنکے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ حدیث اُنکے نزدیک قرآن کے خلاف تھی حضرت ابو ایوب اسپر یقین نہ لاسکے۔ اور کہا کہ آنحضرت صلعم نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ محمود ابن ربیع نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی عتبان سے کرلی۔ لیکن اس سے اس مسئلہ (عدالت صحابہ) پر اثر نہیں پڑتا۔ حضرت ابو ایوب کو جن اسباب کی بنا پر محمود ابن ربیع کی روایت میں شبہہ پیدا ہوا عتبان۔ (اصل راوی) پر بھی وہی شبہہ پیدا ہوسکتا تھا۔ حضرت ابو ایوب محمود ابن ربیع کو دروغگو نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ سمجھتے تھے۔ کہ اُنہوں نے اصل روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔ یہ احتمال بعینہٖ راوی اول کی نسبت بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ نے بعض صحابہ سے کہا تھا۔ کہ تم لوگ تو سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو۔ مگر سامعہ غلطی کرجاتا ہے۔"

(ت) حضرت عمار ابن یاسرؓ نے جب حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی حدیث بیان کی۔ تو حضرت عمرؓ کو یقین نہ آیا بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب تیمم میں ہے یہ الفاظ کہے اتق اللہ یا عمار یعنی اے عمارؓ خدا سے ڈرو۔ چنانچہ اسی بنا پر جب عبد اللہ ابن مسعودؓ کے سامنے حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ نے اس حدیث سے استدلال کیا۔ تو حضرت عبد اللہ نے کہا۔ ہاں۔ لیکن حضرت عمرؓ کو عمارؓ کی روایت سے تسکین نہ ہوئی۔

(ث) حضرت عایشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی۔ کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردے پر عذاب ہوتا ہے۔ تو انہوں نے اس بنا پر انکار کیا۔ کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے ولا تزر وازرة وزر اخری امد کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

(ج) اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی۔ آنحضرت صلعم نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں۔ یہ سنتے ہیں۔ حضرت عایشہؓ نے فرمایا۔ کہ ابن عمرؓ نے غلطی کی۔ اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ تھے۔ جو مشہور صحابی تھے۔ لیکن حضرت عایشہؓ نے اس بنا پر اس حدیث کی صحت سے انکار کیا۔ کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

(ح) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب الفئے میں روایت ہے۔ کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اقض بینی و بین ھذا الکاذب الغادر الخائن میرے اور اس جھوٹے مجرم دھوکہ باز اور خائن کے درمیان فیصلہ کیجیے" چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے۔ اور جن مسلمانوں کے فرمان اور جنگی زبان سے یہ اور اس سے بھی زائد ثقیل اور فحش الفاظ نوے برس تک نکلتے رہے جس کا خود شبلی صاحب کو اقرار ہے۔ کیا وہ اسوقت مسلمان نہ تھے اور کیا اسوقت تک مسلمان نہیں کہے جاتے۔ فاعتبروا۔ مؤلف) اس لیے بعض محدثین نے اپنے نسخہ میں سے ان الفاظ کو نکال ڈالا (بحوالہ نووی شرح صحیح مسلم بذکر حدیث مذکور) علامہ مازری اس قدر کی نسبت لکھتے ہیں اذا انسدت عن تاویلہا نسبنا الکذب الی رواتہا۔ جب اس حدیث کی تاویل کے سب راستے بند ہو جائیں گے۔ تو ہم اس کے راویوں کو جھوٹا کہیں گے [51] سیرۃ النبیؐ دیباچہ۔ ج اص ۵۳-۵۱۔

اختلاف بین الصحابہ کی اتنی مثالیں تو ہم نے شبلی صاحب ہی کے مندرجات و مسلمات سے نقل کر دیں۔

---

[51] سبحانہ ما اعظم شانہ امام المتکلمین شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی تو اس روایت کو نہایت معتبر اور مستند سمجھ کر تحفہ اثنا عشریہ میں عدم عدالت جناب امیر المومنین علی مرتضیٰؑ کے ثبوت میں پیش کریں۔ اور بقول آپکے اخلاف محدثین مثل امام نووی۔ اور مازری وغیرہم اس حدیث کی یوں دھجیاں اڑائیں۔ مؤلف

اور دیگر کتب حدیث و تفسیر میں اسکی مطلق تلاش نہیں کی جن میں سیکڑوں مثالیں ابھی اور مل سکتی تھیں۔ مگر حقیقتاً ہمکو دوسری کتابوں میں۔ ان کی دیکھنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے مخاطب اصلی ہیں مولوی شبلی صاحب اور کتاب میں تمام خطبات ہیں۔ انھیں کی طرف اس بنا پر انھیں کے معترفات سے ہمارا طریقہ استدلال اتنا قوی ہوجاتا ہے۔ کہ بیرونی اور خارجی شاہد کی ضرورت نہیں رہتی۔ آخر میں یہ مثالیں پیش کرکے ہم شبلی صاحب کے اس فیصلہ کو یاد دلاتے ہیں۔ جن میں آپ نے حدیث کی کتابوں کو سیرت کی کتابوں پر ترجیح دی ہے۔ اور انھیں اختلافات باہمانہ کی بنا پر کتب سیرت کی کتب حدیث کے مقابلے میں نااعتباری بے مقداری اور کم وقعتی ثابت کی ہے۔ اب آپ کے دونوں تحریری بیانات ایک طرف رکھے جائیں۔ اور اختلاف احادیث کے متعلق آپ کا مرقومہ بالا مقدانہ اور محققانہ کارنامہ ایک طرف۔ تو صاف صاف معلوم ہوجائے گا۔ کہ جن عیوب و نقائص کی وجہ سے سیرت کی کتابوں کی بے اعتباری اور کم وقعتی تجویز کی گئی ہے۔ وہی قبائح اور فضائح تو آپ حدیثوں اور انکے راویوں کی نسبت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور صرف تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بلکہ استدلالاً اُن کو اپنے مباحث اور دلائل تنقیدی میں پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر ترجیح حدیث علی السیرت کا مسئلہ ایک غلط اور بے اصل تجویز آپ ہی کے مختارے ثابت ہوجاتا ہے۔ جسکو ہم ایک جداگانہ نمبر میں پوری تفصیل کے ساتھ حسب ذیل بیان کرتے ہیں۔

شبلی صاحب کا دوسرا غلط دعویٰ
ترجیح کتب حدیث

(۳۴) شبلی صاحب نے کتب حدیث کو کتب سیرت پر ترجیح دیے جانیکے مسئلہ کو اپنی غرض خاص سے اتنا اہم اور ضروری سمجھ لیا ہے کہ مقدمہ کتاب کے صفحہ (لہ) ہی سے اُس کی بحث آغاز کردی۔ اس عجلت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اور اس بحث ترجیح سے آپ کی کیا غرض خاص ہے۔ وہ تو ہمارے سلسلہ بیان سے اپنے مقام پر معلوم ہوگی ہم پہلے آپکے ان اقوال مختلف کو ذیل میں لکھتے ہیں۔ جو آپ نے اس مسئلہ کی بحث میں اصولاً قلمبند فرمائے ہیں۔

(الف) حدیث صحیح (کتب صحاح) ارباب سیر کے متفقہ روایات کے مقابل میں بھی قابل ترجیح ہیں گی حاشیہ ص ۵ دیباچہ سیرۃ النبی جلد اول۔

(ب) اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا (حاشیہ ص ۵ دیباچہ)

(ت) جس طرح امام بخاری اور مسلم نے یہ التزام کیا۔ کہ کوئی ضعیف روایت بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے۔ اس طرح سیرت کی کتابوں میں کسی نے التزام نہیں رکھا۔ آج بیسیوں کتابیں قدماسے لیکر

متاخرین تک کی موجود ہیں۔ مثلاً سیرت ابن اسحٰق۔ سیرت ابن ہشام۔ سیرت ابن سید الناس۔ سیرت دمیاطی۔ کلبی۔ مواہب لدنیہ۔ کسی میں یہ التزام نہیں۔ حاشیہ ص ۷ دیباچہ۔

اب شبلی صاحب سے کیونکر پوچھا جاوے۔ کہ آپ نے جو اپنا معیار و مختار قرار دیا ہے۔ اس کے رو سے تو۔ جیسا کہ آپ معترفاً خود تحریر فرماتے ہیں۔ دونوں مضامین کی کتابوں میں وہی عیوب و مناقص موجود ہیں پھر فیصلہ ترجیح کیسا؟ اور تجویز تفضیل کیا؟ سیرت نگاروں نے بھی انہیں صحابہ و تابعین کے اقوال سے واقعات و حالات مستنبط کئے ہیں۔ جن سے حدیثوں کی مرویات کی تدوین کی گئی ہے۔ اور ان کے اقوال وارشاد میں آپ کے اقرار و اعتراف کے مطابق اختلاف و مناقص دونوں ثابت ہے۔ اس بنا پر ہر انصاف پسند شخص فوراً دونوں فنوں کی کتابوں کی وتوثیق کو مساوی اور برابر قرار دیگا۔ اور کسی عنوان سے ایک کو دوسرے پر ترجیح و تفضیل نہ دیگا۔ مگر حقیقتاً آپ کو امامین بخاری اور مسلم اور انکے ہمخیال علما کی تالیفات سے اپنے مقاصد تالیفی پورے کرتے ہیں۔ اس ضرورت اور مجبوری سے آپ نے اپنی خودغرضی کی بنا پر ترجیح کتب حدیث اور خصوصاً بخاری شریف کی تفضیل کا قیاس قایم کیا۔ مگر چونکہ آپ کے اس قیاس و گمان میں حقیقت اور اصلیت نام کو بھی نہیں تھی۔ اور یہ نمائشی قلمکاری چھپ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لئے پھر آپ ہی نے اپنے ہی دست و قلم سے ان تمام قیاس کا ستیاناس بھی کر دیا۔ اور جس طرح رواۃ سیرت و تاریخ کے اختلافات و مناقصات سے انکی بے اعتباری اور کم وقعتی ثابت کی گئی تھی۔ اس طرح حدیثوں کے رواۃ کی بھی تنقید و تکذیب فرمائی گئی۔ اور خصوصاً امام بخاری پر بھی الزام و نقائص ثابت کئے گئے۔ جسکی پوری تفصیل تصریح اوپر قلم بند کر دی گئی۔ آپ کے ان تمام طمطراق اور تمام سعی بلیغ کا نتیجہ آخر میں کیا نکلا؟ سوائے اسکے کہ دیباچہ سیرۃ النبیؐ میں جو بحثیں لکھی گئیں۔ اور تنقید واقعات کی۔ عام اس سے کہ وہ حدیث کی مرویات ہوں۔ یا سیرت و تاریخ کی۔ جو شرطیں قائم فرمائی گئیں۔ اور انکے اصول پر جو تفصیلوار بحثیں پیش کی گئیں۔ وہ ایک غلط مبحث ہو کر رہ گئیں۔ اور ان طوماروں سے نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ حدیث کی روایتیں اور محدثین کی مرویات بھی آخرکار ویسے ہی مشتبہ۔ مشکوک۔ اور ممکن الاغلاط رہیں۔ جیسے کہ سیرت و تاریخ کی روایتیں۔

اختلاف عن الاعتراف۔ اب شبلی صاحب کا اختلاف عن الاعتراف اس بحث خاص میں ملاحظہ ہو۔ آپ نے اختلاف اقوال تاریخ و سیرت دکھلا کر انکے درجہ توثیق کو گھٹا دیا ہے۔ مگر قدامت تدوین اور اولیت تالیف میں حدیثوں کی کتابوں سے تاریخ و سیرت کی کتابوں کا درجہ بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ سیرۃ النبیؐ

جلد اول ص ۱۳ میں اس سُرخی کے نیچے کہ تصنیف و تالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی یہ عبارت تحریر فرمائی گئی ہے۔

صحابہ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ فقہ وحدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی۔ بہت سے حلقہ درس قایم ہوئے۔ لیکن جو کچھ تھا۔ زیادہ تر زبانی تھا۔ لیکن بنو اُمیّہ نے علماء سے حکماً تصنیفیں لکھوائیں۔ سب سے پہلے امیر معاویہ نے عبید ابن شریہ کو یمن سے بلاکر قدما کی تاریخ مرتب کرائی۔ جس کا نام اخبار الماضین تھا۔
آپ کے ان اعترافات کو دیکھ کر ہر شخص پورے طور سے یقین کرے گا۔ کہ فن حدیث سے علم تاریخ ضرور قدیم ہے۔ کیونکہ پہلی تاریخ جو عالم اسلام میں لکھی گئی۔ وہ اخبار الماضین ہے۔ جسکا حوالہ آجتک الفہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ یہ کتاب سن چالیس اور پچاس ہجری کے درمیان معویہ کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اور اُسوقت تک علم حدیث کی کوئی کامل کتاب اسلام میں تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس بنا پر قدامت کے خاص نقطہ نظر سے دیکھنے والے کبھی آپ کے اس قیاسی مختار کے اعتبار پر حدیث کی کتابیں کو تاریخ و سیرت کی کتابوں پر ترجیح دینے کے لئے تیار نہوں گے۔ بخلاف اس کے علم تفسیر کی تدوین۔ آپ ہی کی تحقیق کے مطابق۔ ترتیب تاریخ سے دس پندرہ برس بعد ہوئی۔ اور حدیث کی تجمیع و تالیف تو آپکے قول کے مطابق پچاس ساٹھ برس بعد عمر ابن عبد العزیز کے زمانہ میں ہوئی۔ جیساکہ امام زہری کے حالات میں آپ نے لکھا ہے۔

امام زہری (زمانہ ہشام ابن عبد الملک وعمر ابن عبد العزیز) اس زمانہ کے اعلم العلما تھے۔ فقہ وحدیث میں اُنکا کوئی ہمسر نہ تھا۔ امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں۔" انہوں نے حدیث و روایت حاصل کرنے میں یہ تحقیق اُٹھائیں۔ کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان۔ بڈھے۔ عورت۔ مرد۔ جو ملجاتا۔ یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جاکر آنحضرت صلعم کے اقوال اور حالات پوچھتے۔ اور قلمبند کرتے۔ وہ نسباً قریشی تھے۔ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بہت سے صحابہ کو دیکھا تھا۔ ۸۰ھ میں عبد الملک ابن مروان کے دربار میں گئے۔ اُس نے بہت قدر و منزلت کی۔ کتاب المغازی غالباً حضرت عمر ابن عبد العزیز کی ہدایت کے موافق لکھی۔ دیباچہ سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۵
شبلی صاحب کی مرقومہ بالا عبارت سے ثابت ہوگیا۔ کہ حدیث کی تدوین مستقل طور سے عمر ابن عبد العزیز کے وقت میں ہوئی۔ عام اس سے کہ امام زہری نے کی ہو۔ یا اُن کے اُستاد ابو بکر بن محمد بن عمر بن حزم انصاری مدینہ کے قاضی نے اس کے برعکس علم تاریخ معاویہ کے زمانہ میں ایجاد ہوا۔ اور سب سے پہلے تاریخ کے موضوع پر کتاب اخبار الماضین لکھی گئی۔ جو معاویہ کے حکم و اہتمام خاص سے مرتب کی گئی۔ تو اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ کہ علم حدیث کی تالیف و ترتیب علم تاریخ کی تجمیع و تدوین سے بہت پیچھے ہوئی ہے

مگر افسوس کہ شبلی صاحب کو نہ خود اپنے تناقض فی الکلام کا خیال ہے۔ اور نہ انحراف عن الاعتراف کی پرواہ۔ آپکو تو صحاح کی عموماً۔ اور صحیح بخاری کی خصوصاً توثیق و تصدیق بر نوع منظور ہے۔ جو آپ کی مرکز تمنا ہے۔ اس لیئے باوجود ان مشاہدات و مسلمات کے بھی۔ اگرچہ۔ حدیث کی قدامت تاریخ پر ثابت نہیں۔ لیکن کتب حدیث ہی کی مرویات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور ان میں بھی بخاری کی تمام کتب حدیث پر ترجیح بالمرجح تبلائی جاتی ہے۔ حالانکہ بخاری کی مجہولیت اوپر ثابت کر دی گئی ہے۔

حدیث و سیرت کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی۔

(۱۴) حدیث و تاریخ و سیرت کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں قائم کی گئی۔ گویا یہ دونوں علوم باہم مخلوط کر دیئے گئے۔ اور۔ ان کی باہمی تفریق محض اسلئے مخفی رکھی گئی ہے۔ کہ علم تاریخ کو ایک خاص علم ہونے کی اہمیت نہ حاصل ہو۔ ورنہ وہ اور علوم کے ساتھ عموماً اور علم الحدیث کے ساتھ خصوصاً مساوات کا مستحق ہو جائے گا۔ شبلی صاحب کے اس طومار تحقیق سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اتنا ہی ہے۔ کہ علم تاریخ و سیر کے ماخذ اصلی بھی وہی حدیثیں ہیں۔ جو پہلے صحابہ کرام کے سینوں میں تھیں۔ پھر تابعین عظام کے سفینوں میں آئیں۔

شبلی صاحب کے اس تجزیہ روزگار مختار کو کون اختیار کر سکتا ہے؟ علم تاریخ کے مورخ عموماً اور حقیقت و واقعیت کے متلاشی تو خصوصاً آپ کی اس تحقیق خاص کو جو آپ کی محض خودغرضی پر مبنی ہے۔ ایک مضحکہ انگیز مطایبہ سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔

حقیقتاً اصناف فنون اور اقسام علوم میں حدیث و تاریخ دو جداگانہ علوم ہیں۔ جن کی تعریف جُدا۔ عنوان علیحدہ۔ اور تفصیل و بیان الگ الگ ہیں۔

حدیث اصلاً تو کسی شخص کے اقوال۔ اور اصطلاحاً ایک نبی مرسل کے احکام و ارشاد کو کہتے ہیں۔ **تاریخ** ممالک و اقوام کے حالات و واقعات کی تفصیل کا نام ہے **سیرت** اسی کا ایک خاص شعبہ ہے۔ جو کسی شخص خاص کے حالات و واقعات کی تفصیل تک محدود ہوتی ہے۔ عرب چونکہ قدیم الایام سے صاحب سیف اور ایک سربرآوردہ قوم تھی۔ اس بناء پر جہاں اُسنے اپنے حالات و واقعات کی جمع و تالیف کی۔ وہاں خصوصیت کے ساتھ اپنی فطرتی جرأت و شجاعت کے حدمات قومی و ملکی بھی جمع کیئے اور اُسکا نام رکھا **مغازی**۔ مگر چونکہ واقعات مغازی بھی۔ ملک و قوم کے وسیع کارناموں میں کسی قوم خاص یا اُسکے کسی فرد خاص ہی کے ذاتی حالات و واقعات ہوتے تھے اس لئے فن مغازی بھی سیرت کی ایک شاخ اور تاریخ کا ایک شعبہ قرار دیا گیا۔

افسوس ہے۔ کہ شبلی صاحب نے دیباچہ کتاب میں تاریخ۔ سیر اور مغازی کی جرح و قدح اور تکذیب و تضعیف ہی تک اکتفا فرمائی۔ اور تفریق و تخصیص و تفصیل کسی کی بھی نہ تبلائی۔ حالانکہ دیباچہ سیرۃ النبی ص ۱۳ میں تضعیف

و تالیف کی ابتدا سلطنت سے ہوئی" کے عنوان خاص سے ایک علیحدہ باب قایم کیا ہے۔ اور اُس میں تاریخ۔ حدیث۔ سیرت اور مغازی کے آغاز و ایجاد۔ تالیف و تصنیف کے علیحدہ علیحدہ زمانے لکھ کر بتلائے ہیں مزید برآں۔ آئمہ حدیث۔ تاریخ و سیرت و مغازی اور اُنکی و تالیفات کے ناموں کی مطول فہرستیں بھی منضبط کردی ہیں۔ یہ سب کچھ اہتمام کیا گیا ہے۔ مگر بحیثیت مؤلف جو آپکا ضروری اور فرض اوّلیں تھا۔ وہ کسی مقام پر بھی واقفیت عام کے لیئے نہیں لکھا گیا۔ اور ان مختلف اصناف علوم اور متفرق اقسام فنون کی جداگانہ تعریف اور اُن کے باہمی تفریق و تخصیص کو تفصیل و تشریح کے ساتھ کہیں بھی نہ بتلایا۔

یہ کیوں؟ صرف اُس غرض خاص سے کہ یہ فنون علم حدیث کے۔ تتبع۔ زیر اثر اور اُسی کے ماخوذ و مخلوط ثابت ہوں۔ اور آخر میں اُنکا معیار اصلی علم حدیث اور حدیث میں کتب صحاح اور کتب صحاح میں صحیحین اور صحیحین میں خاص الخاص امام بخاری کی صحیح ثابت ہو۔ جس سے آپ کو ایک فرقہ خاص اور قوم خاص کی حمایت اور دوسری قوم و فرقہ کے حالات و واقعات میں اپنی عیب پوشی کی غرض سے۔ اسقاط احذاف اور استخفاف کلّی اور جزوی کا پورا موقع ہاتھ آئے۔

ہم اوپر بھی لکھ آئے ہیں۔ اور پھر لکھ کر بتلائے دیتے ہیں۔ کہ آپ کا یہ مختار بالکل عجوبہ روزگار ہے اور آپ کی یہ تجویز بالکل انوکھی اور اچھوتی ہے۔ افسوس ہے۔ اگر آپ نے ابن خلدون ابن خلکان کی مقدمات کو نہیں دیکھا تھا۔ تو کم سے کم فارسی کی معمولی تاریخ روضۃ الصفا خاوند شاہی ہروی کا دیباچہ پڑھ لیا ہوتا۔ تو مجھکو یقین ہے۔ کہ آپ کو ان فنون کی باہمانہ تفریق و تمیز پوری معلوم ہو جاتی۔ مگر حقیقت تو یہ ہے۔ کہ آپ اُنکے باہمی فرق بتلا دینے سے بالکل مجبور تھے۔ اور آپکی خودغرضی آپکی مجبوری کا باعث تھی جس سے آپ کسی طرح علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں غرض و مدّعا سے آپ نے حدیث و سیرت کی فرق کو جستہ جستہ غایت مجبوری سے لکھا بھی تو حدیث اور اُسکی صحت کی بحث میں۔ چنانچہ دیباچہ ص ۵ کے زیرین حاشیہ عبارت میں حدیث و سیرت کی جو تفریق بتلائی بھی گئی۔ وہ تعریف نہیں سمجھی جا سکتی بلا تضعیف ہے۔ جو آپکے اصل مُدّعا۔ ترجیح حدیث علی السیرۃ کی اصل بحث پر مبنی ہے۔ آپکی عبارت یہ ہے۔

اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے۔ جو آج کل قلت علم اور نا آشنائی فن نے پیدا کر دی ہے۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ سیرت فن حدیث ہی کے ایک قسم کا نام ہے یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں۔ تو یہ سیرت بن گئی۔ اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں۔ جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں۔ مثلاً صحیح بخاری اور مسلم (مطلب سعدی ہمیں بود) تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ سیرت میں کوئی کتاب آجتک اس صحت و التزام کے ساتھ نہیں لکھی

گئی۔ دیباچہ ص ۵ عبارت پائین حاشیہ

مرقومہ بالا عبارت پڑھکر انصاف پسند حضرات بتلاویں۔ کہ اس عبارت کے ابتدائی فقرات کو۔ جسمیں سیرت کی تعریف کا اشارہ کیا گیا تھا عبارت کے آخری کلمات سے۔ جنکا خاتمہ بخاری مسلم کی مدح سرائی پر کیا گیا ہے۔ کیا ربط و واسطہ ہے۔ اور ان چند الفاظ میں جو سیرت کی تفریق کو حدیث سے علیحدہ بتلایا گیا ہے۔ وہ علم سیرت کی پوری تعریف ہوسکتی ہے؟ اور اُن سے علم سیرت کی اصلیت اور حقیقت کا انکشاف ممکن ہے؟

علاوہ بر این۔ بیان ہے سیرت کا۔ اور بحث کی جاتی ہے علم حدیث کی صحت سے۔ اور اُنکے مخصوص اصحاب کی صداقت سے۔ سبحان اللہ۔ من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سرآید۔ مگر ان قلمکاریوں سے آپکا مدعا کیا تھا وہی بخاری کی جنبہ داری۔ جسکا حق آپ نے کماحقہ ادا کر دیا۔ پھر اس عبارت کے آگے تحریر ہوتا ہے۔

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے۔ کہ سیرت ایک فن جداگانہ ہے۔ اور اس بنا پر اُس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسکی مثال یہ ہے۔ کہ فقیہ کا فن قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ مگر یہ نہیں کہتے۔ کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے۔ یا اُن دونوں کا ہم پلہ ہے۔

اگر شبلی صاحب اتنا ہی لکھکر کہ سیرت ایک فن جداگانہ ہے۔ ختم کر دیتے۔ اور آئندہ تفصیل کی تکلیف نہ کرتے تاہم علم سیرت کی ابتدائی تعریف ہوجاتی۔ مگر آپ اپنے مطلب کے متلاشی ہیں۔ اتنا لکھکر ختم کردینے سے تو بیان بے مدعا اور خبر بے مبتدا ہوجاتی۔ اور ترجیح حدیث علی السیرۃ کا اصل مطلب فوت ہوجاتا۔ اسلئے تفصیل کی گئی۔ اور تفصیل میں یہ ضروری اضافہ خاصکر کیا گیا۔ کہ صحیحین کے ساتھ صحاح ستہ کا مجموعہ بھی داخل کیا گیا۔ اور اُنکے صحت وصداقت کے ساتھ شدت صحت کی حذف بھی بڑھادی گئی۔ اب کون آپسے پوچھے کہ آپ تو ابھی ابھی خود لکھ چکے ہیں۔ کہ سیرت ایک فن جداگانہ ہے۔ پھر اس کے متعلق علم حدیث کی جزئیات وکلیات سے بحث کرنا۔ کس عقل والے کا کام ہوسکتا ہے۔

سیرت اور فقہ کی مثال ناقص ہے مرقومہ بالا عبارت میں سیرت کو علم فقیہ کی ساتھ ان الفاظ میں تشبیہ دی گئی ہے۔ کہ اُس کی مثال یہ ہے فقیہ کا فن قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے۔ شبلی صاحب کی یہ مثال بھی سراپا ناقص۔ اور یہ تشبیہ بھی بالکل ناکامل ہے کیوں؟ اس لیئے کہ فقہ اور سیرت کی ایک صورت نہیں ہوسکتی۔ فقہ حقیقتاً قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے سیرت کا قرآن وحدیث سے ماخوذ ومستنبط ہونا ضروری ولازمی نہیں۔ میرے خیال میں سیرت النبیؐ کی تخصیص خاص کی وجہ سے آپ کو اس تشابہ کا تسامح ہوگیا ہے۔ اگر شبلی صاحب نے خود بھی غور فرمایا ہوتا۔ تو اپنی غلط فہمی کی حقیقت معلوم ہوجاتی۔ اور آپ نے بطور خود سمجھ لیا ہوتا کہ اگر ظہور اسلام سے قبل۔ قریش میں کسی شخص

خاص کے حالات لکھنے کی آپ کو ضرورت ہوتی یا ظہور اسلام کے ایام میں یا اُسکے بعد آج بھی آپکو کسی عجم باشندہ عرب کی حالات و واقعات قلمبند فرمانے کا اتفاق ہو۔ تو آپ کہاں تک اُن اشخاص کی سیرتوں کی تالیف و تصنیف میں قرآن و احادیث سے اخذ حالات و واقعات فرما سکتے ہیں۔ جب ان سیرتوں میں قرآن و احادیث کے استخراج و استنباط کی مطلق ضرورت نہیں اور یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ بلا استمداد ان ماخذوں کے آپ اُنکی سیرتیں تیار کر سکتے ہیں۔ تو عموماً علم السیرت کو علم فقہ کا مماثل و مقابل ٹھہرانا کیسی فاش غلطی ہے" ہاں۔ آپ سیرۃ النبی صلعم، سیرۃ الصحابہ اور عام طبقہ مومنین و مسلمین کی حالات و واقعات میں علے ترتیب المراتب خاص خاص مقامات پر قرآن و احادیث کی اقتباسات کے محتاج ہونگے۔ مگر یہ ملحوظ رہے۔ کہ ان استخراج و استنباط سے اور ان اقتباسی جزئیات سے سیرت کے کلیات میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا کیونکہ ایسے جزوی تعلقات تو باہم دیگر تمام علوم و فنون میں پائے جاتے ہیں۔ جغرافیہ کو تاریخ سے تعلق ہے۔ تو تاریخ کو جغرافیہ سے۔ ریاضی اکثر مقامات میں ادب سے مدد کا طالب ہے اور ادب ریاضی سے۔ علم ہیئت فلسفہ سے استفادہ کرتا ہے۔ تو فلسفہ ہیئت سے خارجی سبق لیتا ہے۔ اسی طرح سیرت اسلامی کو مناسب مقامات پر قرآن و احادیث سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ ماہرین علوم و فنون جانتے ہیں۔ کہ ان وقتی اور جزوی تعلقات سے نہ جغرافیہ تاریخ سے ماخوذ کہا جا سکتا ہے۔ اور نہ تاریخ جغرافیہ ہو سکتی ہے۔ نہ ریاضی ادب کہلائے گا۔ نہ ادب ریاضی۔ نہ ہیئت فلسفہ ہو جائے گی۔ نہ فلسفہ ہیئت۔ مگر شبلی صاحب کی منطق خواہ مخواہ سیرت اور فقہ کو مثلاً ایک بتلاتی ہے۔ تو اسکو کیا کیا جاوے۔

شبلی صاحب کے تسامح کا اصلی باعث

آپنے علم سیرت کو اپنی سیرۃ النبیؐ کی خاص ضرورت تک محدود فرمایا ہے۔ اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات و واقعات کو قرآن و احادیث سے ماخوذ ہونا مشروط فرمایا ہے۔ تو آپکی اس تجویز میں بھی یہ کہا جاویگا۔ کہ آنحضرت صلعم کے حالات و واقعات بھی بالکل قرآن و احادیث سے ماخوذ و مستنبط نہیں ہیں۔ بلکہ انہیں حدود و قیود تک جنکا وجود و ثبوت عبارات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے استخراج و استنباط کا محتاج ہے۔ یا جنکی تفصیل و بیان میں قرآن و احادیث کے شہود کی ضرورت ہے۔ نہ عموماً حضرتؐ کے تمام جزوی اور کلی حالات میں۔ چنانچہ انہیں نصاب پر آپنے بھی اپنی کتاب مرتب فرمائی ہے۔ اور آپ سے پہلے تمام مؤلفین نے بھی یہی نصاب اور نظام تصنیف قایم فرمایا ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں بھی جن واقعات کا قرآن و احادیث سے تعلق تھا۔ اُن کی تفصیل میں قرآن و احادیث کے ماخذوں سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو تاریخ و سیرت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے لیئے گئے ہیں۔ پھر اگر بفرض محال آپ کا یہ قیاس صحیح بھی مان لیا جاوے۔ کہ آپ اُس مقام پر سیرت سے صرف سیرت اہل اسلام مراد لیتے ہیں۔ تب بھی تو اکیلے قرآن و حدیث

سے مقاصد تالیفی پورے نہیں ہوتے۔ اور تاریخ و سیر کے نقل ماخذ بغیر کام نہیں نکلتا۔ حقیقت میں شبلی صاحب نے اپنی خود غرضی سے علم سیرت کے دائرے کو بہت محدود دکھلایا ہے۔ حالانکہ وہ بہت وسیع ہے۔ اور اتنا کہ وہ تاریخ سے علیحدہ ہو کر ایک فن جداگانہ بن گیا ہے۔ اسکے دائرے کو تنگ و محدود سمجھنا خصوصًا علم و تحقیق کے موجودہ روشن زمانہ میں صریح خیرہ چشمی سمجھی جائے گی۔ علم سیرت کو خاص اسلامی مؤلفین و مصنفین کی ایجاد و طبعزاد سمجھنا، یہ بھی تحقیق کی خامی اور تلاش کی کمی ہے۔ کیونکہ جامعین اور مفسرین تورات و انجیل سے اگر قطع نظر کی جائے۔ تو بھی مؤلفین و مصنفین اسلامی سے صدیوں پیشتر رومی اور یونانی مصنفین و مؤرخین علم سیرت کے قدیم مشاق اور نقاد ثابت ہوتے ہیں۔

تعریف سیرت کی جگہ صحت حدیث سے استدلال غلط ہے۔

اس کے آگے شبلی صاحب رقمطراز ہیں۔

مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں موجود ہوتی ہیں۔ وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں ملسکتیں اس لیے ارباب سیر کو تنقید و تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

اس عبارت میں بھی وہی ترجیح حدیث کے اصول پر بحث ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ آپ کے دست و قلم سے حدیث تاریخ و سیرت کی اصلی تعریف نکلتی۔ آپ حدیث کی ترجیح والی حدیثیں سناتے ہیں۔ اور یہ نہیں بتلاتے۔ کہ حدیث کیا ہے اور تاریخ و سیرت کیا۔ اور ان میں فرق مابہ الامتیاز کیا رکھا گیا ہے۔ آپ کی اس عبارت میں صرف اتنی نوعیت ہے۔ کہ آپ کی بارسیرت کے ساتھ مغازی کا بھی نام لیا گیا ہے۔ مگر ابھی سیرۃ ہی کی اصلی صورت قائم نہیں ہوتی۔ مغازی کی صفائی کیسی۔

اصحاب سیرت اور اصحاب حدیث کا دو گروہ مقابل ہونا

اس سے آگے تحریر فرمایا جاتا ہے۔

تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً سیرت ابن ہشام۔ سیرت ابن عائذ۔ سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات کے حالات ہیں۔ البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور چیزیں بھی داخل ہوتی گئیں۔ مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس تحریر سے صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ مغازی میں آگے چلکر اور چیزیں بھی داخل ہوگئیں۔ اسکے آگے لکھا جاتا ہے:۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے الگ الگ چیز ہے۔ یہاں تک کہ بعض بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ کہ تمام ارباب سیر ایک طرف نظر آتے ہیں۔ اور امام بخاری و مسلم ایک طرف۔ ایسے موقع پر لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے۔ کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے۔ لیکن محققین لکھتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔ ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

ہم پہلے شبلی صاحب کی اس عبارت تمہیدی کا انکشاف حقیقت کریں۔ تو آپ کی مثالوں کی کیفیت دکھلائینگے۔ سیرت کی اصلی حقیقت کے چھپانے اور اس کی وقعت وصحت کے گھٹانے میں۔ اتنے قبل سے جو کوشش فرمائی جا رہی تھی۔ اسکا نتیجہ اب دکھلایا گیا ہے۔ پیام یار لطیف است گرید بر آید۔ خیر۔ دو فریق (ارباب حدیث واصحاب سیرۃ) اب تیار کر دیئے گئے۔ اور حقیقتاً تھے بھی ایسے ہی۔ جیسا اب بتلایا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر کے دعویدار ہیں۔ اصحاب حدیث ایک طرف ہیں۔ اور ارباب سیرۃ وتاریخ ایک طرف۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ کہ خاص خاص مقامات پر دعویداران حدیث بمقابلہ سیرت وتاریخ کے قابل ترجیح وتفضیل ضرور ہیں۔ اور اکثر مقامات پر واقف کاران سیر وتاریخ صاحبان حدیث پر ترجیح پانے کے مستحق ہیں۔ یہانتک صاف اور غیر جانب دارانہ فیصلہ فرمایا گیا ہے۔ سلف سے آج تک یہی مختار جمہور مؤلفین ومحققین کا عام دستور چلا آتا ہے۔ مگر برا ہو خودغرضی اور نفسانیت کا کہ اتنی حقیقت واصلیت لکھے دینے کے بعد بھی شبلی صاحب صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے محض فرضی اور لامعلوم محققین کا یہ فیصلہ جو حقیقتاً نہ کسی محدث کا ہے۔ اور محقق کا۔ بلکہ آپ کی خاص ایجاد ہے۔ اور آپ کی خاص طبعزاد۔ زیب قلم فرماتے ہیں:۔

لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کے متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے:۔

خلاف جمہور اور بغیر اسناد فیصلہ۔

یہ فیصلہ بالکل خلاف جمہور ہے۔ اگر فی الحقیقت جیسا لکھا گیا ہے۔ یہ محققین کا فیصلہ ہے۔ اور آپ سچے ہیں۔ تو ان محققین حضرات کے نام۔ ان کی کتاب۔ انکی عبارت تحریر فرما دیتے۔ تو دیکھا جاتا۔ کس پایہ کے محققین ہیں۔ کس مرتبہ کی ان کی کتابیں ہیں۔ کس مقدار کے انکے مختار ہیں۔ شبلی صاحب کی ان قلمکاریوں سے کہ محققین کا یہ فیصلہ ہے۔ یا محدثین کی یہ رائے ہے۔ نہ واقفکاران فن مرعوب ہو سکتے ہیں نہ واقفکار غریبوں کی اس سے تشفی واطمینان ہو سکتا ہے۔ اول تو کوئی محقق اس تہی مغزی اور بد دماغی کا فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اور بفرض محال اگر کوئی صاحب ایسے ہونگے بھی۔ تو وہی ابن حجر شارح صحیح بخاری یا خود آپ۔ اگر حقیقتاً آپ ہیں۔ اور یہ آپ ہی کا مختار ہے۔ تو آپ ایسے یک طرفہ مختار وفیصلہ کے ذمہ دار ہیں اور اگر ابن حجر شارح صحیح بخاری ہیں۔ (جیسا کہ بہت جلد معلوم ہوتا ہے) تو آپ خود ایسے محقق شخص کو اسی سیرۃ النبیؐ میں۔ رواۃ پرستی کا خاص خطاب دے چکے ہیں۔ اور علامہ اسماعیلی وغیرہم کے مقابلہ میں انکی عدم قابلیت اور مجہولیت ثابت کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۱۳۱ ایسے ناقابل اور مجہول شخص کو محقق کہنا۔ اور انکے محض جانبدارانہ فیصلہ کے اتباع وتقلید کے لیے تمام اہل اسلام کو مجبور کرنا آپ ہی کی جرأت وغیرت کا کام ہے

یہ تو آپکی عبارت تمہید کی تنقید تھی۔ اب جو مثالیں دی گئی ہیں۔ انکی کیفیت ذیل میں ملاحظہ ہو۔ غزوات میں ایک

پہلی مثال غزوۂ ذی قرد کے متعلق اہل سیرت کا اختلاف

غزوہ ذی قرد کے نام سے مشہور ہے۔ اسکی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ کے قبل واقع ہوا تھا۔ لیکن صحیح مسلم میں سلمہ ابن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا یہ واقعہ ہے اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔

لا یختلف اھل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیۃ فیکون ما وقع فی حدیث سلمہ من وھم بعض الرواۃ۔	اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے ہوا تھا۔ تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے۔ وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں۔ ذکر غزوہ ذی قرد میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں۔

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر۔	تو اس بنا پر صحیح مسلم میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے۔ وہ اس سے زیادہ صحیح ہے۔ جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔

اب تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی شبلی صاحب کے وہ محقق یہی ابن حجر صاحب ہیں۔ بہر حال۔ ابھی ابھی اسی کتاب میں شبلی صاحب ص ۸۰ پر علامہ عینی کے مقابلہ میں انہیں۔ ابن حجر صاحب کی فن حدیث میں مجہولیت و عدم تحقیق کو ان الفاظ میں دکھلا چکے ہیں۔ کہ

اسماعیلی کے اعتراض کا جواب حافظ ابن حجر نے دیا ہے۔ لیکن اسماعیلی کا درجہ فن حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے۔"

پھر ایسے محدود اطلاع والے شخص کے فیصلہ سے علامہ قرطبی کے ایسے معتبر محدث کی تحقیق کو غلط کرنا شبلی صاحب کے مبلغ تحقیق پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی خود غرضی ہی کی ضرورت سے ابن حجر ہی کا فیصلہ لکھ کر کام نکالنا تھا۔ تو اُن کی پوری بحث جو قرطبی کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ نقل فرما دیتے۔ جس سے تحقیق کے ہر متلاشی کو وہ توجیہات معلوم ہو جائیں۔ جن کی بنا پر ابن حجر نے اپنے فیصلہ کو قائم کیا ہے۔ مگر آپ ایسے وقتوں میں بڑے بیدار اور موقع شناس مؤلف ثابت ہو چکے ہیں۔ اور آپ کا یہ خاص انداز تحریر پایا گیا ہے۔ کہ ایسے مقامات پر آپ بلا تامل اپنے فائدہ اور مطلب کے مطابق عبارت کتاب لکھ کر باقی کو قلم زد کر دیتے ہیں۔ ہم اس بحث کو غزوہ فرد کے اصلی مقام پر لکھیں گے۔ مگر یہاں خود آپ ہی کی تحریر سے اس کی حقیقت لکھے دیتے ہیں۔ جس سے ہر شخص سمجھ جائے گا۔ کہ اصلیت کیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۳۵۱ میں زیر حاشیہ یہ عبارت مندرج کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے ان دونوں روایتوں (روایت حدیث و روایت سیرۃ) میں اس طرح تطبیق دی ہے۔ کہ

عنیبہ بن حصین نے ذی قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام ارباب سیر جسکو ذکر کرتے ہیں۔ وہ پہلا حملہ تھا۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ عام ارباب سیر کو غزوہ خیبر (بلکہ تمام غزوات) کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں۔ اس لیئے اُن کو اس کی بحث نہیں۔ کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔،،

ابن حجر کا غلط فیصلہ

اب اس تحریر سے ثابت ہو گیا۔ کہ ابن حجر کا یہ فیصلہ کسی تحقیق اور دلیل پر مبنی نہیں۔ اسلیئے فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ اُنکی ذاتی رائے ہے۔ مگر آپ اُسے خواہ مخواہ اپنی بات رکھنے اور اپنا مطلب نکالنے کیلئے قول فیصل بنا کر دکھلاتے ہیں۔ ”جب بقول آپکے ابن حجر کا یہ قول۔ قول فیصل تھا۔ تو پھر ان واقعات میں تطبیق دینے کی کیا ضرورت تھی تطبیق کی تعریف میں آپ خود لکھتے ہیں۔ کہ دو مختلف فیہ اقوال میں اسوقت تطبیق کیجاتی ہے جب دونوں میں صحت کے شرائط پائے جاتے ہیں، اور جب اقوال مختلفہ میں تطبیق کی جاتی ہے۔ اور وجہ تطبیق بھی معقول اور مناسب دکھلائی جاتی ہے۔ تو باعتبار صحت و صداقت کے پھر ایک قول کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجاتی۔ شبلی صاحب خود ان دونوں مختلف اقوال میں ابن حجر کے طرز عمل کے دو مختلف طریقہ دکھلاتے ہیں۔ ایک فیصلہ جس سے حدیث میں صحت میں سیرت کی کتابوں سے بڑھی ہوئی ثابت ہوتی ہیں۔ دوسرے تطبیق جس سے دونوں کی روایات صحت میں مساوی اور برابر معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر اس عمل تطبیق کو شبلی صاحب بالکل قرین قیاس بھی بتلاتے ہیں۔ مگر با ایں ہمہ۔ وہی شبلی صاحب ابن حجر کے اُسی فیصلہ مجہول پر۔ جو حقیقتاً اُنکی رواۃ پرستی کی بنا پر اُن کی اپنی رائے ہے۔ عمل کیئے جانے کے لیے مُصر ہیں۔

اصل حقیقت کا انکشاف واقعات

شبلی صاحب نے اگر خوش نیتی سے صحتِ روایات سیرت کی تنقید شروع کی تھی۔ تو قطع و برید اور استخفاف و احذاف کی کیا ضرورت تھی۔ فتح الباری کی پوری عبارت استدلال میں لکھدی ہوتی۔ صرف ابن حجر کا قول آخر جسے وہ قول فیصل اور حکم ناطق قرار دیتے ہیں۔ لکھ دینا کیا معنی یہ تو تدین مولفانہ کے بالکل خلاف ہے۔ آخر آپ نے اُنھیں ابن حجر کی تطبیق کی معقول توجیہ و تفصیل مندرج کی مگر بیان نہیں۔ خاصکر اس لیئے کہ یہاں اُسکی تفصیل آپ کے مفید مطلب نہیں تھی۔ بالآخر دوسرے مقام پر یہ راز سربستہ فاش کیا گیا۔ اور صورت حال کا انکشاف۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا۔ آپ کے اس طرز تحریر اور انداز تالیف کو دیکھکر کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ آپنے نقل واقعات میں پُورے تدین سے کام لیا ہے

شبلی صاحب نے تطبیق حدیث اور وجہ تطبیق کا ذکر تو کر دیا۔ مگر حقیقتاً تفصیل کسی کی بھی نہیں کی صرف ابن حجر کے اس قول سے اتنا اشارہ فرما کر رہ گئے۔ کہ عنیبہ ابن حصین نے ذی قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا۔ عام ارباب سیر جسکا ذکر کرتے ہیں۔ وہ پہلا حملہ تھا۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے۔“ ہم اس اجمال کی تفصیل میں زرقانی کی

کی عبارت پیش کرتے ہیں۔ اور زرقانی کی نسبت آپ دیباچہ سیرۃ النبیؐ ص ۲۷ میں لکھتے ہیں۔
زرقانی علے المواہب مواہب لدنیّہ کی شرح ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس تحقیق و جامعیت سے نہیں لکھی گئی۔

زرقانی کی عبارت حسب ذیل ہے۔

قال الحافظ یحتمل فی طریق الجمع ان تکون اغارۃ فی اللقاح وقعت مرتین الاولی التی ذکرھا ابن اسحاق وھی قبل الحدیبیہ والثانیہ بعدھا قبل الخروج الی خیبر وکان راس الذین اغاروعبدالرحمان بن عیینہ کما ساق سلمۃ عند مسلم ویؤیدان الحاکم ذکرفی الاکلیل ان الخروج الی ذی قردۃ تکرر ففی الاولٰی خرج الیھا زید بن حارثہ قبل احد وفی الثانیۃ خرج الیھا صلے اللہ علیہ والہ وسلم فی ربیع الاخر سنۃ خمس والثالثۃ ھذہ المختلف فیھا فاذاثبت ھذا قوی الجمع الذی ذکرتہ

حافظ (ابن حجر) کہتے ہیں۔ کہ ان مختلف روایتوں میں جمع کی یہ صورت ہے۔ کہ حقیقتاً اس مقام پر دو بار حملے کئے گئے۔ ایک تو وہی ہے۔ جسے ابن اسحاق (صاحب سیرت) نے قبل حدیبیہ بتلایا ہے اور اُسکے بعد دوسری بار خروج خیبر سے پہلے۔ اور یہ وہی ہے کہ جسکا ذکر سلمہ ابن اکوع کے طریق سے مسلم نے کیا ہے۔ اسکے سردار فوج عبدالرحمان ابن عیینہ تھے۔ اس قول کی تائید امام حاکم کے اُس قول سے ہوتی ہے۔ جسکا ذکر کتاب اکلیل میں اسطرح پر کیا ہے۔ کہ ذی قرد پر خروج بتکرار واقع ہوا۔ ایک بار قبل جنگ اُحد زید ابن حارثہ کے زیر امارت حملہ کیا گیا۔ دوسری بار ۵ھ ہجری میں بذات خاص جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے۔ اور تیسری بار یہی ہے۔ جسکا ذکر سلمہ کی زبانی مندرج ہے

زرقانی لکھتے ہیں کہ اگر حاکم کا یہ قول ثابت ہو جاوے۔ تو جو صورت جمع بین الحدیثین کے اوپر لکھی گئی ہے۔ اور قوی ہو جائیگی۔ زرقانی جلد اوّل ص ۱۷۱
اب تو زرقانی کی مرقومہ بالا عبارت سے حقیقت حال کا پورا انکشاف ہو گیا۔ اور ثابت ہو گیا۔ کہ بقول ابن حجر مقام ذی قرد پر دو بار۔ اور بقول امام حاکم تین بار حملہ کیا گیا۔ جن میں سے بقول ابن حجر صرف ابن اسحاق صاحب سیرت وربقول شبلی صاحب عام ارباب سیر جس حملہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ پہلا حملہ تھا۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے۔
ب ان انکشافات و اعترافات اکابر و عمائد محدثین کے مقابلہ میں بتلایا جاوے۔ کہ اہل سیرت نے ذی قرد کی نسبت کیا غلط لکھا ہے۔ جسپر اعتراض کی مثال قائم کی گئی ہے۔ اور جب اُنہوں نے غلط نہیں لکھا۔ تو آپ اُنکے تکذیب یا کم سے کم کل تضعیف کیسے کر سکتے ہیں۔ اور سچ لکھنے والوں سے۔ جو خود اُنکی تصدیق کرتے ہیں۔ اُن کو کم درجہ ورپے اعتبار کیسے کہہ سکتے ہیں۔
شبلی صاحب نے اتنی خامہ فرسائی فرما کر اس بحث کو خواہ مخواہ طول دیا۔ اگر اُنھیں ابن حجر کے اُس ذاتی قول و رائے کے ساتھ عقیدت تھی۔ تو خیر اُسکو لکھکر۔ اُسی کے ساتھ اُن کی تطبیق۔ اور جمع بین الحدیثین والی عبارت بھی لکھدی ہوتی۔ تو یہ بحث تمام تھی۔ اور مدعائے بحث حاصل۔ مگر آپ کیسے لکھتے۔ وہاں تو آپ کو حدیث کی ترجیح کسی نہ کسی نوع سے ثابت کرنی ہے۔ اور سیرت کی کم وقعتی۔ مگر اصل کتاب میں جہاں واقعہ ذی قرد کی تفصیل ضروری

ہوگئی۔ وہاں حقیقت پر روشنی ڈالی بھی گئی۔ تو اس کم مقداری سے کہ اصل واقعہ کی کامل جلوہ آرائی نہیں ہوئی جسقدر حقیقت حال لکھی بھی گئی وہ اصل کتاب میں داخل نہیں کی گئی۔ بلکہ عبارت حاشیہ زیرین میں قلمبند فرمائی گئی خیر۔ این ہم غنیمت است۔ اگر شبلی صاحب کو خوش نیتی ہے۔ جیسا کہ خود تحریر فرما چکے ہیں حقیقت حال کی تحقیق ہو چکی تھی۔ اور خصوصاً ابن حجر اور امام حاکم کے ایسے اکابرین محدثین کے اقوال سے ثابت ہو چکا تھا۔ کہ مقام ذی قرد پر متواتر حملے کیے گئے تھے۔ ازانجملہ سب سے پہلا وہ تھا۔ جسے اہل سیرت لکھتے ہیں۔ اور بقول ابن حجر وہ دوسرا تھا۔ اور بقول امام حاکم تیسرا حملہ وہ تھا۔ جسے اصحاب حدیث کہتے ہیں۔ تو آپ نے ان تمام عبارت محدثین کو اپنی اصل کتاب کی عبارت میں کیوں داخل نہ فرمایا۔ کہ ہر خاص و عام اسلام کی اطلاع اور اصل حقیقت معلوم کرنیکے لیئے کافی ہو جاتا حقیقت کا اخفا خصوصاً اسی کے علم ہو جانیکے بعد مولف کیلئے نہایت شرمناک الزام پیدا کرتا ہے

اصل واقعہ

اب شبلی صاحب کو کیا تمام دنیا کو معلوم ہو گیا۔ کہ اہل سیرت نے غزوہ ذی قرد کی نسبت جس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور جسکا سنہ وقوع بتلایا ہے۔ وہ اصحاب حدیث کے قرار دادہ واقعہ سے بالکل علیحدہ واقعہ ہے اور وہ انکے مختار متفقہ کے مطابق حدیبیہ سے پہلے۔ اور امام حاکم کے اسناد کے موافق واقعہ اُحد سے بھی پہلے واقع ہوا تھا۔ اور صحیح مسلم میں جس واقعہ کی کیفیت مرقوم ہے۔ اور بقول شبلی صاحب جس کے ہیرو سلمہ ابن اکوع ہیں۔ وہ غزوہ خیبر سے تین دن قبل ۵ھ ہجری میں وقوع پذیر ہوئی۔

ان تمام واقعات کی کامل تحقیق کرنیوالوں پر بخوبی ظاہر ہے۔ کہ حدیبیہ بلکہ اُسی کے اور قبل سے لیکر غزوہ خیبر تک ان تمام چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایات کا لگاتار سلسلہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جو حقیقتاً تھوڑی تھوڑی تفاوت ایام کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد برابر واقع ہوتے گئے۔ چنانچہ خود شبلی صاحب ان الفاظ میں اُس کی حقیقت حال کا اقرار کر چکے ہیں کہ لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جب یہ اعتراف و اقرار فرما لیا گیا۔ کہ یہ تمام واقعات حقیقتاً ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ تو شبلی صاحب کو ہمیں سے۔ حدیث و سیرت دونوں جدا گانہ فنون کے فرق مابہ الامتیاز کی بھی تمیز کر لینی تھی۔ اور اسی تمیز سے آپ کو دونوں کی باہمی تفریق تخصیص بھی معلوم ہو جاتی۔ اہل سیرت نے کیوں غزوہ ذی قرد کے صرف ایک حملہ اور اُسی کے وقوع کا ذکر کیا۔ اور دوسرے یا تیسرے کا نہیں؟

حدیث و سیرت کی تفریق اصول

اعتراض سے پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ اہل سیرت کی نظر اپنے اُصول کے مطابق واقعہ کی اہمیت پر ہوتی ہے۔ اور اُسکے بیان و تفصیل کی شدت ضرورت پر۔ ہر قابل و ناقابل مشہور و غیر مشہور واقعہ کو جو اُس شخص خاص کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں۔ جسکی سیرت کا قلمبند کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جمع کرنا اور لکھدینا نہ اہل سیرت کا شعار تالیف ہے۔ نہ معیار تصنیف۔ اسی باعث سے ذی قرد کے متعدد اور مکرر سہ کرر

واقعات میں دوسرے واقعہ کو (بقول ابن حجر) قابل الذکر سمجھ کے اسلیئے قلمبند کیا۔ کہ اس واقعہ میں جناب رسالتمآب صلعم کے بالنفس النفیس شریک ہونے سے۔ اُسکی شان اہمیت دوبالا ہوگئی تھی۔ اُسکی حیثیت سرایہ کی حیثیت سے مرتفع ہوکر غزوہ رسولؐ کی خاص عظمت حاصل کرچکی تھی۔ باقی اور ذی قرد کے واقعات حملات جو اس سے قبل و مابعد واقع ہوئے۔ وہ ایک ہی مقام پر۔ ایک ہی قوم و قبیلہ کے ساتھ اور ایک ہی غرض و مدعا کی بنا پر سرایا کی معمولی صورتوں میں وقوع پذیر ہوئے۔ جو اہل سیرت کے اُصول تدوین کے مطابق توارد کے حکم پر آتے تھے۔ اور جن کے بیان میں کسی نوعیت واقعہ کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔ اس بنا پر قلم انداز کردیئے گئے۔

اہل سیرت کے خلاف اصحاب حدیث قول و احکام کے متلاشی ہیں۔ جب اُن کے معیار کے مطابق کوئی قول یا کوئی حکم ملگیا۔ عام اس سے کہ ایک طریق یا متعدد۔ متواتر اور مختلف طریقوں سے ملا ہو۔ اُسکو اُنہوں نے اُن تمام طریقوں سے ایک مقام پر بھی نہیں۔ مختلف ابواب اور متفرق فصُول میں قلمبند فرما دیا۔ اور تواتر۔ توارد۔ یا تکرار کی کوئی پروا نہیں کی۔ اسی بنا پر آپ ایک حدیث کو مختلف طریقوں سے متفرق ابواب و فصُول میں کتب صحاح ستہ میں عموماً اور صحیحین بخاری و مسلم میں خصوصاً مندرج پائینگے۔ اسی سے شبلی صاحب حدیث و سیرت کی تفریق و تخصیص کو سمجھ لیئے ہوتے؟

دوسری غلط مثال

دوسری مثال یہ دی گئی ہے۔ ایک غزوہ۔ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے۔ اسکی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے۔ کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا۔ لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے۔ کہ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ اسپر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

واما شیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح — یعنی انکے شیخ دمیاطی نے حدیث صحیح (بخاری) کی نسبت غلط ہونیکا

وان جمیع اھل السیر علی خلافہ۔ — اسوجہ سے دعوےٰ کیا ہے۔ کہ تمام اہل سیر اُسکے خلاف ہیں۔

دیکھیئے۔ پھر وہی دُم بریدہ عبارت لکھدی گئی۔ اور پوری نہیں نقل کی گئی۔ لکھا گیا۔ تو صرف اپنا قول اور وہ بھی اتنا۔

حافظ ابن حجر نے اس قول (دمیاطی) کو لکھکر اُسکا رد بھی کیا ہے۔

اور بس۔ اچھا۔ وہ رد اور اُس کی عبارت کہاں ہے؟ وہ بالکل غایب! اب تحقیق طالب کا آپ کی اس عبارت سے حقیقت حال کی نسبت کیا سمجھ سکتا ہے۔ اور وہ کیونکر ابن حجر کے جواب تردیدی کی تصدیق پر تیار ہو سکتا ہے۔ جسکو نہ اُسنے دیکھا۔ اور نہ پڑھا۔ جب تردید کی اصلی عبارت موجود ہی نہیں۔ تو پھر مجبوراً فتح الباری میں ابن حجر کی وہی تعقیدی عبارت جو اُنہوں نے علامہ دمیاطی کی تعریض میں لکھی ہے۔ پیش نظر رکھنی ہوگی۔ اور اُسکو شبلی صاحب نے ان الفاظ میں زرقانی ج ۲ ص ۱۱ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے۔

ودل ھذا علی انہ کان یعتقد الرجوع عن — اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ یعنی دمیاطی قصد کرچکے تھے

کثیر مما وافیہ اھل السیر وخالف — کہ جن سوقعوں پر اُنہوں نے ارباب سیر سے اتفاق کرکے احادیث صحیحہ سے

الاحادیث الصحیحۃ وان ذلک کان قبل تضلعہ منہا والخروج لنسخ کتابہ انتشارہ یتمکن من تغییرہ۔

مخالفت کی ہے۔ اُنسے رجوع کرینگے۔ اور یہ امر اُنسے مہارت فن کے قبل واقع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اُنکی کتاب کے نسخے تمام شایع ہوچکے تھے اسلئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نکر سکے۔ سیرۃ النبی دیباچہ صفحہ ۷

حافظ ابن حجر کی اس عبارت منقولہ کا حوالہ بھی شبلی صاحب کیلئے مفید مطلب نہ نکلا۔ کیونکہ۔ جیسا آپ نقل فرماتے ہیں یہ تو ابن حجر کا مقولہ ہے۔ کہ دمیاطی نے آخر میں ایسا کیا۔ یا ایسا کرنے کا قصد کیا تھا۔ دمیاطی کا تو قول اعترافی نہیں۔ کہ ہمنے ایسا کیا۔ یا ہم ایسا کرنے کا قصد رکھتے تھے" جب تک کہ ابن حجر یا شبلی صاحب دمیاطی کا اصل قول نہ پیش کریں ثبوت کافی نہیں ہو سکتا ہے۔ خصوصًا ایسی حالت میں جب شبلی صاحب کو خود اقرار ہے۔ کہ محدثین اور اہل سیرت دو برابر اور مقابل کے گروہ ہیں۔ تو پھر ممکن نہیں کہ ایک گروہ اپنے مخالف و مقابل گروہ پر ترجیح پانے کیلئے اُسکی تضعیف کا خواہاں ہو۔ اس بنا پر ممکن ہے۔ کہ علامہ دمیاطی کی نسبت محدثین کی جسمیں ابن حجر بھی شامل ہیں۔ یہ خالی افواہ ہو۔ یا حسن ظن۔ ہم نے بھی یہ بحث زرقانی میں پوری پڑھی ہے۔ اس میں بھی حافظ ابن حجر کی زبانی علامہ دمیاطی کی نسبت لکھا ہے۔ کہ آخر میں علامہ موصوف نے صحت حدیث کی طرف رجوع کیا تھا۔ اور قصد کرتے تھے۔ کہ اپنی تصنیفات میں ترمیم کر دیں۔ مگر کتابیں دور دور تک تمام بلاد اسلام میں شایع ہوچکی تھیں۔ اس لیے اس کام کو انجام نہ فرما سکے۔ تحقیق حقیقت اسوقت تک کامل نہیں ہوتی۔ جبتک کہ دمیاطی کا اصل اعتراف اُنکے خاص الفاظ میں نہ پیش کیا جاوے۔ جس سے ایک محقق اور حقیقت حال کے متجسس کو علامہ دمیاطی کے رجوع کرنے کی کافی وجہ معلوم کرنے میں پھر کوئی عذر و تامل باقی نہ رہے۔

ممکن ہے۔ کہ گروہ محدثین کے موئیدین و معتقدین ابن حجر کی نقل قول پر اعتبار کرلیں۔ مگر اہل سیرت اور اُس کے ناظرین تو ثبوت میں علامہ دمیاطی کا اصل قول طلب کریں گے۔

ابن حجر کا ایک مضحکہ خیز فیصلہ

خوب یاد آیا۔ زرقانی میں ابن حجر کا اہل سیرت کی تردید اور اہل حدیث کی تائید میں ایک مضحکہ خیز فیصلہ لکھا ہے۔ جو ناظرین کے لطیفۂ طبع کے لیئے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:۔

اشار الیہ البیہقی علی ان اصحاب المغازی مع جزمہم بانہا کانت قبل خیبر مختلفون فی زمنہا فعند ابن اسحق انہا سنۃ اربع وعند ابن سعد وابن حبان سنۃ خمس۔

بیہقی نے اشارہ کیا ہے۔ کہ اصحاب مغازی میں اُنکے حد علم تک یہ رائے قائم ہوچکی ہے۔ کہ غزوہ ذات الرقاع قبل خیبر واقع ہوا مگر وہ اُنکے زمانہ وقوع میں اختلاف کرتے ہیں۔ ابن اسحاق ۴ھ میں بتلاتے ہیں۔ اور ابن سعد و ابن حبان ۵ھ میں۔

ابن حجر کو بیہقی کا یہ قول دکھلائی دیا۔ دیوانہ را ہوئے بس است کا مضمون تیار ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ اس دلیل کا خوشہ مقدمہ پر حسب ذیل تیار ہو گیا۔

الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح یعنی

دمیاطی نے حدیث صحیح یعنی حدیث ابوموسی کی تغلیط کا دعوے کیا؟

حدیث ابی موسیٰ وانّ جمیع اهل السیر علی خلافه وقد تقدم انهم مختلفون فی زمانها فالاولی الاعتماد علی ما ثبت فی الصحیح زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰۱

اس بنا پر کہ جمیع اہل سیر نے اس حدیث کی صحت پر خلاف کیا ہے۔ اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اہل سیر نے اُسکے زمانہ وقوع میں اختلاف کیا ہے۔ اسلیئے اعتماد اُسی پر بہتر ہے۔ جو کتب صحیح سے ثابت ہوتا ہے۔

سبحان اللہ۔ کیا فیصلہ ہے۔ اور کیا اصول فیصلہ۔ صرف سنین کے اختلاف کی وجہ سے واقعہ کا واقعہ ہی غلط اور ساقط۔ اگر اسی اصول اختلاف فی السنین کی بنا پر واقعات کی صحت کا دارومدار ہے۔ تو خاص صحیحین میں ایک کیا سینکڑوں مثالیں سنوں کے اختلاف کی ہر باب و فصل میں موجود پائی جائیں گی۔ تو پھر ان کے متعلق کیا کہا جاوے گا۔ ایسا فیصلہ کرنا تو حافظ صاحب کی گروہ محدثین کی کھلی کھلی جنبہ داری ہے۔ اور اُسپر کوئی محقق توجہ نہیں کر سکتا۔

اصل حقیقت کا انکشاف ان تمام طول وطویل بحث و تفصیل کا بھی آخر میں وہی نتیجہ نکلا۔ جو ذی تردد کا۔ اور لطف تو یہ ہے۔ کہ حافظ ابن حجر کو پھر وہی جمع بین الحدیثین کی سعی آخر پر عمل کرنا پڑا۔ فتح الباری کی عبارت ذیل میں ملاحظہ ہو۔

قد جنح البخاری الی انها کانت بعد خیبر صریحا فقال وهی بعد خیبر لان ابا موسیٰ جاء بعد خیبر اق وخیبر کانت فی المحرم سنه سبع و استدل ذلک بالوزو مع ذلک قد کرها قبل خیبر عقب بنی قریظه فلا ادری هل تعمد ذلک تسلیما لاهل المغازی انها کانت قبلها او ان ذلک من الرّواة عنه او اشارة الی احتمال ان تکون ذات الرقاع اسما لغزوتین مختلفین واحد بعد خیبر واخری قبلها کما اشار الیه البیهقی علیٰ ان اصحاب المغازی مع جزمهم بانها کانت قبل خیبر مختلفون فی زمنها فعند ابن اسحق انها سنه اربع وعند ابن سعد و ابن حبان سنة خمس۔

بخاری نے اُسکو تصریح لکھا ہے۔ کہ غزوہ ذات الرقاع غزوہ خیبر کے بعد واقع ہوا۔ اور یہ زمانہ وقوع اسکا اس لیئے صحیح ہے۔ کہ ابو موسیٰ۔ (اصل راوی حدیث) خیبر کے بعد آئے۔ اور خیبر محرم ۷ھ میں واقع ہوا۔ اور یہی امور بخاری کے ثبوت استدلال میں لیکن اسکے ساتھ ذات الرقاع کا قبل خیبر واقع ہونا بھی لکھا گیا ہے یعنی بعد معاملات بنی قریظہ۔ ابن حجر کہتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصحاب مغازی نے کس طرح اس قول (قبل خیبر) کو تسلیم کر لیا ہے۔ یا تو اُنکے رواۃ کے نزدیک ایسا ہی ہے۔ یا اشارہ اس احتمال کی طرح ہو کہ ذات الرقاع بصیغہ جمع (جمع رقع) مستعمل ہوا ہے۔ اس لیئے حقیقتاً یہ دو مختلف غزوات ہوں۔ ایک قبل خیبر اور ایک بعد خیبر جیسا کہ بیہقی نے اشارہ کیا۔ کہ اصحاب مغازی نے اپنی شرط کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ یہ قبل خیبر واقع ہوا۔ مگر زمانہ وقوع میں اختلاف ہے ابن اسحاق ۴ھ میں بتلاتے ہیں۔ اور ابن سعد و ابن حبان ۵ھ میں۔

افسوس کہ یہ تمام امور لکھکر بھی۔ حافظ صاحب صرف اہل حدیث کی جنبہ داری کے اصول پر مرقومہ بالا مضحکہ خیز فیصلہ کریں۔ اور شبلی صاحب اپنی خوش فہمی سے۔ ترجیح حدیث علی السیرت کی بحث میں اپنا معیار استدلال بنا کر نقل فرمائیں ۵ وائے گر از پس امروز بود فردا ئے۔

شبلی صاحب کی دونوں امثلہ مغلطہ کی تحقیق و تنقید پوری تفصیل سے کردی گئی۔ اور ارباب تحقیق کو آپکی غلط مثالوں کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ وہ کون ہوگا۔ جو عقل سلیم اور دماغ صحیح رکھ کر آپ کی ان غلط مثالوں سے سیرت پر ترجیح حدیث کے قیاسی استدلال کو صحیح مانے گا۔

سیرت اور حدیث کی اصول تفریق ہماری مرقومۂ بالا عبارت تنقیدی سے شبلی صاحب کی امثال قیاسی کی غلطی کے ساتھ متلاشین حقیقت کو حدیث و سیرت کا فرق مابہ الامتیاز بھی معلوم ہوگیا۔ اور اُنپر ثابت ہوگیا۔ کہ کتب حدیث و سیرت کی تالیف و تصنیف کے اصول و سیاق بالکل جُدا جُدا ہیں۔ اور دونوں اقسام فنون کے طریقہ استخراج و استنباط اور تفصیل و بیان بھی جداگانہ ہیں۔

استخراج واقعات اور استخاذ حالات میں اہل سیرت کی نظر خصوصیت کے ساتھ واقعیت اور اصلیت کی طرف غائر رہتی ہے۔ سب سے پہلے اُنکا فرض اوّلین واقعات و حالات دریافت کرنا۔ اور اُن کو بقرائن عقلی و نقلی تصدیق و توثیق کے درجہ تک پہونچانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے مختار تحقیق کو ارباب سیر کے اور اقوال سے مقابل کرکے اپنے توحّد و تفرّد کو معیار تواتر پر کامل اُتارنا ہوتا ہے۔ واقعات کے بعد تعیّن زمانہ وغیرہ کی ضروریات پیش نظر رکھی جاتی ہیں۔ اور کامل تلاش اور کافی تحقیق کے بعد۔ اقوال مختلفہ سے جس زمانہ اور جس وقت پر اتفاق دیکھا جاتا ہے۔ وہی نقل کیا جاتا ہے۔ اُن ایسے اقوال مختلفہ میں جنکے شرائط باعتبار صحت مساوی ہوتے ہیں۔ ان میں آئمہ حدیث کی طرح فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے۔ اور وہ مسئلہ اختلافی قرار دیکر۔ اُن تمام اقوال مختلفہ کو مجبوراً لکھ دینا ہوتا ہے۔ (یہ قدیم سیرتوں کے ساتھ مخصوص ہے) جیساکہ ابھی ابھی شبلی صاحب نے ذات الرقاع کے ذکر میں ابن اسحٰق۔ ابن سعد اور ابن حبان کے اقوال مختلفہ کو نقل فرمایا ہے۔ مگر یاں ہمہ ارباب سیر اس قول اختلافی کی صرف نقل پر اکتفا نہیں کرتے۔ اپنی تحقیق کے خاص اعتبار پر ایک زمانہ خاص کا تعیّن ضرور کرلیتے ہیں۔ عام اس سے کہ اُن اقوال مختلفہ میں کسی قول سے ملتا ہو۔ یا اُن سے خلاف ہوکر کوئی زمانہ خاص بتلاتا ہو۔ اپنے اس خاص مختار کے لیئے وہ کافی ثبوت و شواہد بھی نقل کردیتے ہیں۔

آئمہ سیرت کی تحقیق چونکہ واقعیت اور اصلیت پر تمام تر رہتی ہے۔ اس لیئے وہ اپنے دائرہ تحقیق کو ایک خاص صنف علم و فن یا اہل علم و اطلاع کے کسی خاص طبقہ اور فرقہ کے ساتھ محدود نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنی تحقیق و تلاش کے ذرائع اور وسائل کو علوم و فنون کے ہر اصناف اور ارباب علوم و فنون کے ہر طبقات تک وسیع کرتے ہیں۔ اور اپنے انصاب تحقیق اور معیار توثیق کے مطابق جو واقعہ اصلیت اور حقیقت کے ساتھ جس معتبر ماخذ میں مل گیا۔ اُسکو نقل و مستنبط کرلیتے ہیں۔ وہ اصول عقائد کے شہود پر اپنا مختار نہیں قایم کرتے۔ وہ اپنے شواہد میں صحابیت اور تابعیت کی خصوصیت کے پابند و محتاج نہیں ہوتے۔ وہ ایک معتبر غیر صحابی اور ایک

معتبر غیر تابعی کے قول کو بھی۔ بشرطیکہ وہ قول اُنکے نصاب تحقیق پر کامل اُترتا ہو۔ بلا ترجیح نقل کر دیتے ہیں۔ اِس لئے۔ کہ اُن کے بیان کردہ حالات کی واقعیت۔ اُنکے معیار تحقیق کے مطابق ثابت ہو چکی ہے۔ ارباب سیرت ایک ہی قسم کے متواتر واقعات کی تکرار کو۔ جو ندرت اور نوعیت سے خالی ہو۔ اور اطلاع عام کے افادہ کے لئے بھی ضروری نہو۔ اکثر قلم انداز کر دیتے ہیں۔ اور احتیاطاً ظاہر ابتدائی واقعہ کا۔ یا اُن میں سے جو زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔ جب ضرورت ذکر کر دیتے ہیں عموماً تکرار واقعہ کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ توارد اُن کے سیاق تحریر میں سخت عیب ہے۔

حدیث کی اُصولی تعریف

ہم نے مندرجہ بالا تفصیل میں علم سیرت کی بقدر ضرورت اور مناسبت مقام مختصر سی تعریف اور علم حدیث سے اُسکی تفریق قلمبند کر دی ہے۔ اب اسطرح علم حدیث کی تعریف کی جاتی ہے۔

حدیث سیرت سے محض جداگانہ ایک علم خاص ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ عموماً ایک شخص خاص یا اصطلاحاً ایک نبی مرسل کے کلام۔ احکام۔ اقوال اور ارشاد کا مجموعہ ہے۔ جو بخلاف اہل سیرت اندراج حالات و واقعات کا ذمّہ وار نہیں۔ وہ اُصولاً اپنے استخراج و استنباط کو اقوال و احکام کی نقل و تحریر تک محدود رکھتے ہیں۔ نقل احکام و اقوال میں وہ زیادہ تر احکام مذہبی۔ و مسائل فقہی۔ اور ارشاد ہدایات وغیرہ کے بمرتبہ اولے نقل و تحریر کرنیکے پابند ہیں۔ مگر اُنھیں حالات کے ساتھ وہ واقعات ملکی۔ قومی اور نظام سیاسی کا بھی جستہ جستہ ذکر کر دیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ شبلی صاحب بھی اعترافاً اسکو ان الفاظ میں لکھتے ہیں:-

یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے حالات عادات و اخلاق کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ تاہم تنہا ہم اُن سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ اُن میں تاریخی ترتیب بھی نہیں ہے۔ دیباچہ ص ۸

اس بنا پر کتب حدیث میں جو بلا ترتیب اور غیر مسلسل حالات آنحضرت صلعم کے متعلق ملینگے۔ وہ ارباب سیر و تاریخ کو صرف خارجی طور پر مدد دے سکینگے۔ حقیقی طور پر اُنکا اندراج اصل موضوع کتاب کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ من حیث الموضوع اُن سے سیرت و تاریخ کی کوئی خاص تالیف مرتب اور تیار ہو سکتی ہے۔ علم حدیث سیرۃ و تاریخ کی طرح اپنے بیان و تفصیل میں احکام و اقوال کو علے ترتیب الوقوع جمع کرنیکا پابند نہیں۔ وہ تجمیع میں نہ ترتیب کا ذمّہ دار ہے۔ نہ کسی تسلسل کا محتاج۔ نقل حدیث کے معیار۔ سیرت کے مقررہ نصاب سے علے الاکثر جدا ہیں آئمہ حدیث کو اکثر اوقات روایات احاد اور اقوال منفردہ پر بھی اعتبار کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اہل سیرت روایات احاد و منفردہ کو قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ علم حدیث اُصول عقائد کا متبع اور ممد ہے۔ سیرت کو عقائد کے اتباع و امداد کی ضرورت نہیں۔ علم حدیث کے اطلاعی ذریعے صحابی۔ تابعین اور تبع تابعین کے طبقات مختلفہ تک

محدود ہیں۔ اہل سیرت اپنے ذریعہ اطلاعات کو کسی خصوصیت کے ساتھ مخصوص کرتے۔ ہاں رواۃ کا معتبر ہونا ضروری ہے۔ مگر انکا صحابی اور تابعین میں ہونا ضرور نہیں۔

ہم علم حدیث کے بالاختصار بیان و تعریف اور سیرت سے اس کی تفریق مرقومہ بالا عبارت میں دکھلا کر۔ اور اسی نظریہ مختصرہ کو اپنے مدعا کے لیے کافی سمجھ کر مسئلہ زیر بحث کے دوسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

محدثین اور تکذیب سیرت میں انکے بے اصل اقوال و استدلال

بعض حالات میں چونکہ اہل سیرت کو اہل حدیث کی طرح کسی طبقہ خاص سے خصوصیت کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ اس بنا پر محدثین اور انکے ہمخیال و مؤیدین نے غیر قوم و غیر مذہب والوں سے استخراج و استنباط کرنیکی وجہ سے اُن پر اعتراض وارد کئے ہیں۔ اور شبلی صاحب نے بھی سیرۃ النبی میں انکو بڑی سرگرمی سے نقل فرمایا ہے۔ اور اسلاف کا پورا نقشہ دکھلایا ہے۔ دیباچہ سیرۃ النبی ص ۱۳ میں امام احمد ابن حنبل کا سیرت ابن اسحاق کی نسبت یہ قول نقل فرمایا گیا ہے۔

واما مغازی فمن اشهرها کتاب محمد ابن اسحاق وکان یاخذ من اهل کتاب۔

باقی رہے صاحبان مغازی یا مغازی کی کتابیں تو اس میں ابن اسحاق کی کتاب اس فن میں مشہور کتاب ہے۔ اور وہ یہودیوں۔ اور عیسائیوں سے روایت کرتے ہیں۔

افسوس ہے۔ کہ شبلی صاحب نے اعتراض کی نقل سے پہلے معترض کی شخصیت اور خصوصیت پر غور نہ کر لیا۔ آپ خود صفحہ ۵ دیباچہ کی حاشیہ کی عبارت زیرین میں لکھ کر اقرار کر چکے ہیں۔ کہ :۔

کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو گروہ مقابل سمجھے جاتے ہیں۔ اور بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں۔ اور امام بخاری و مسلم (آئمہ حدیث۔ ایک طرف)

تو مرقومہ بالا اقرار و مختار خاص کے مخالف۔ ایک گروہ مقابل کی تضعیف و تکذیب دوسرے گروہ مقابل کے اقوال سے کرنا اصولاً اور خصوصاً آپکے لیے کیسے صحیح الاستدلال ہو سکتا ہے۔ اور جب استدلالاً صحیح نہیں۔ تو عموماً قابل تسلیم کیسے سمجھا جائیگا۔ امام حنبل علم حدیث کے امام اول ہیں۔ اور گویا اس فن شریف کے موجد و بانی۔ پھر ایسے موجد و موسس علم الحدیث کا قول سیرت اور اہل سیرت کی تنقید و تردید میں پیش کرنا شبلی صاحب کی تقلید اسلاف کے سوا اور کیا کہا جاوے۔

امام حنبل فن حدیث میں خصوصاً امام بخاری اور عموماً آئمہ صحاح ستہ کے استاد اور شیخ الشیوخ ہیں۔ وہ فن حدیث کی مستعد اور جامعیت میں چاہے جتنے بڑے کامل نقاد اور استاد فن نہ تسلیم کئے جائیں۔ اس میں عذر نہیں مگر یہ حضرات بخاری اور آئمہ صحاح بلکہ اُن کے استاد امام حنبل بھی علم سیرت اور اُسکے اصناف فنون میں بالکل کورے ثابت ہیں۔ مثال کے لیے امام بخاری کی تاریخ موجود ہے۔ وقس علی ہذا۔

یہ بھی ضرور ملحوظ رکھنا ہوگا۔ کہ حضرات محدثین فن حدیث میں اپنی حاصل کردہ فن اور ہمائے کمال کی توسیع و تشہیر کے متعلق اپنی کوششوں میں انواع اقسام کی افراط و تفریط سے کام لیا کرتے تھے۔ اور اپنے حاصل کردہ علم خاص کے مقابلہ میں دوسرے علوم و فنون کو لاوجود اور محض بے سود سمجھتے تھے۔ اور اُن علوم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اُن پر محض بے اصل اعتراض کرتے تھے۔ یہی امام حنبل صاحب ہیں جنہوں نے حدیث کے مقابلہ میں تمام علوم و فنون کو ردّی بتلایا ہے۔ اور حیف ہے۔ کہ شبلی صاحب نے شمس العلماء ہو کر اُنکے اُن تمام لغویات کو خود نقل فرمایا ہے۔ چنانچہ اسی صفحہ میں قول مندرجہ بالا سے پہلے۔ امام حنبل کے یہ اقوال نقل فرمائے ہیں

ثلث کتاب لیس لھا اصول المغازی والملاحم والتفسیر | تین قسم کی کتابیں ہیں۔ جنکی کوئی اصل نہیں۔ مغازی۔ ملاحم۔ اور تفسیر

یعنی امام صاحب کے وقت تک جتنی کتب تفاسیر ملاحم (سیرت) اور مغازی مرتب ہوئی تھیں۔ وہ گویا بالکل بے اصل تھیں۔ وہ ردّی ہوگئیں نتیجہ یہ نکلا۔ جب یہ سب کتابیں بے اصل اور بیکار کردی گئیں۔ تو اسلامی علم کی دنیا میں سوائے کتب حدیث اور کون کتابیں بچ رہتی ہیں۔ جنکو اہل اسلام دیکھیں۔ اور پڑھیں۔ امام صاحب کی اصل مراد تو یہ ہے۔ کہ سوائے کتب حدیث کے اور کوئی کتابیں نہ پڑھی جائیں۔ اور نہ اُنپر کوئی اعتنا کی جائے اور اس ترکیب سے آپ کی اور آپ کے مجموعہ حدیث کی گرم بازاری ہو۔

آپکی اس مجنونانہ رائے کی بالآخر خطیب بغدادی کو تاویل کرنی پڑی جسکو شبلی صاحب ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں۔

خطیب بغدادی نے اس قول (امام حنبل) کو نقل کرکے لکھا ہے۔ کہ مراد امام حنبل کی اُن خاص کتابوں سے ہوگی۔ جو بے اصل ہیں۔

اب امام حنبل صاحب کتب تفاسیر کی طرف متوجہ ہو کر لکھتے ہیں

اما کتب التفسیر فمن اشھرھا کتابا الکلبی ومقاتل ابن سلیمان وفی تفسیر الکلبی من اولہ الی اخرہ کذب۔ | کتب تفسیر میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر کلبی۔ اور تفسیر مقاتل ابن سلیمان۔ تفسیر کلبی تو اول سے آخر تک سراپا جھوٹ ہے

کتب تفسیر کی یہ گت بنائی گئی۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ مغازی و سیرت کی نسبت امام صاحب کی خوش نیتی کی رائے اُوپر نقل ہوچکی۔ اب ایک تحقیق کنندہ امام حنبل کے ان اقوال ثلاثہ کو دیکھکر آسانی سے سمجھ لیگا۔ کہ اُنکا یہ فیصلہ عادلانہ ہے۔ یا تحکمانہ۔ یہ تو مسلّم ہے۔ کہ اُسوقت تک سوائے علم التفسیر علم المغازی اور علم السیرت اسلام کی علمی دُنیا میں دیگر اصناف علوم و فنون کی بہت کم تدوین و ترویج ہوئی تھی پھر جب امام صاحب کے فتوے کی رُو سے یہ تینوں علوم بیکار ہوگئے۔ تو اسلام کی علمی دُنیا میں رہ کیا گیا۔ اس بنا پر ہمارا یہ دعوےٰ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ کہ امام صاحب کا یہ فتوےٰ صرف اپنی اور اپنے مسند کی گرم بازاری اور رجوع خلائق کی ضرورت سے تھا۔ افسوس ہے۔ کہ امام صاحب نے تفسیر پر بھی حملہ کردیا۔ جو قرآن سے متعلق ہے۔ اور آپ کی حدیث بالکل اُسی سے ماخوذ

ہے۔ ہمکو اس سے زیادہ بحث نہیں۔ اب ہمکو مسئلہ زیر بحث کے متعلق اور امام صاحب کے ان اقوال یا فتاوے کی نسبت یہ دکھلانا ہے۔ کہ اُنپر اُمّت کا عمل بھی ہوا۔ یا نہیں۔ کیا اسکے بعد اسلامی مصنفین نے مغازی۔ سیرت تفسیر کی کتابیں لکھنی چھوڑ دیں۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ امام صاحب کے اس فتوے پر اُسوقت سے لیکر اسوقت تک ایک ساعت کے لیئے بھی عمل نہیں کیا گیا۔ اور تو اور خود شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ حال میں تیار کی۔

اب ان حالتوں میں شبلی صاحب کا ان اقوال سے استدلال کرنا کسی طرح صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح امام حنبل صاحب سے اس غیر عادلانہ اور محض جانبدارانہ فتوے اور حکم پر اہل اسلام نے آجتک عمل نہیں کیا۔ اُسی طرح شبلی صاحب کی اس تحریر پر بھی پُوری توجہ نہیں کی جائے گی۔

اصل اعتراض کا انکشاف اب رہا اصل اعتراض۔ وہ اہل سیرت کی نسبت اس بنا پر وارد کیا جاتا ہے۔ کہ اُنہوں نے اپنی کتاب میں اہل کتاب یعنی یہود و نصارٰی سے اخذ واقعات کئے ہیں۔ چنانچہ شبلی صاحب اُسکو کسی قدر زیادہ تفصیل سے دیباچہ ص ۱۷ میں ان الفاظ کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے۔ کہ محدثین کو محمد ابن اسحاق کی کتاب پر جو اعتراض تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ اُن یہودیوں سے دریافت کرکے داخل کتاب کرتے ہیں۔ جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہ واقعات اُنہوں نے یہودیوں ہی سے سُنے ہونگے۔ اس لیئے اُنپر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ محمد ابن اسحاق یہود و نصارٰی سے روایت کرتے تھے۔ اور اُنکو ثقہ سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

اعتراض سے پہلے شبلی صاحب اور اُنکے ہمخیال محدثین کو سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ تفریق حدیث و سیرت کی بحث میں بتلا دیا گیا ہے۔ کہ علم حدیث کی تدوین بالکل اصول عقائد پر قایم کی گئی ہے۔ اور علم سیرت کی نہیں۔ اصحاب حدیث اپنے ہی قوم و مذہب والے رُواۃ سے اخذ روایات کو کلیتاً محدود و مقید رکھتے ہیں۔ اور ارباب سیرۃ غیر اقوام و مذہب کے لوگوں سے بھی اپنے معیار تحقیق و اعتبار کے مطابق اپنے ممدوح کے واقعات و حالات کی اطلاعات حاصل کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک غیر قوم و غیر مذہب والا شخص۔ اپنے مخالف مذہب کے پیشوا کے حالات و واقعات کو نہایت خوشی اور آزادی سے جمع کر سکتا ہے۔ جس طرح کثیر التعداد عیسائی مؤلفین نے یوروپین ممالک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتیں لکھی ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر شبلی صاحب نے خود سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ میں ایک مطوّل اور مفصل جدول کے اندر نام بنام تحریر فرمایا ہے۔ اسیطرح ہندو مؤلفین نے ہندوستان میں بھی۔ آپ کی سیرتیں لکھی ہیں۔ انمیں سب سے مشہور وہ ہے۔ جو شاردے پرکاش صاحب پنجابی کی ہے۔ اور رنو لکشور پرنٹنگ ورکس لاہور سے ۱۹۱۰ء میں شایع ہوئی ہے۔ اور اس کتاب پر مولانا حالی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی دستخطی تقریظیں۔ اور سید ممتاز علی صاحب بی۔ اے۔ (علیگ) اڈیٹر رسالہ تہذیب النسواں

اور ایڈیٹر صاحب علیگڑھ انسٹیٹیوٹ۔ اور ایڈیٹر صاحب۔ ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ریویوز اور تائیدی تحریریں چھپی ہیں۔

مگر کتب سیرت کے خلاف کسی غیر مسلم شخص نے آجتک اسلامی حدیثوں کی جمع و تدوین نہیں کی۔ اس لیے کہ حدیث اسلامی کی تالیف کے لیے عقائد اسلامی کی پابندی ضروری اور لازمی تھی۔ اور وہ اُن سے ممکن نہیں تھی۔ جب سیرت کے معیار تالیف اور شعار تصنیف حدیث سے بالکل علیحدہ ثابت ہوتے ہیں۔ تو معترضین کا غیر اسلامی ذرائع سے اخذ واقعات پر اعتراض کرنا ہی فضول ہے۔

امام احمد ابن حنبل کا محمد ابن اسحاق پر اس وجہ سے خاص کر اعتراض کرنا اول تو بدرجہ دلیل سے فضول وبیکار ہے۔ اور دوسرے اس سبب سے بھی قابل التفات و اعتماد نہیں ہوسکتا۔ کہ جو سبب اعتراض بتلایا گیا ہے۔ اور جو وجہ نقص رواۃ قایم کی گئی ہے۔ وہ بھی ثابت نہیں ہوتی۔ امام صاحب لکھتے ہیں۔ کہ ابن اسحاق نے یہود و نصاریٰ سے روایت کی۔ اور یہی ایک وجہ انکار لکھی ہے۔ مگر ابن حبان نے اس اعتراض کی پوری تشریح کردی ہے۔ جیسا کہ شبلی صاحب کی عبارت سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ

ابن حبان کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ صرف خیبر وغیرہ کے واقعات کے متعلق ابن اسحٰق نے چند واقعات یہودیوں سے لیے ہیں۔

پھر ایسی حالت میں اُن کی کل کتاب کی نسبت یہی حکم لگانا امام حنبل کا نہ تحملانہ فیصلہ ہے۔ نہ منصفانہ ہے۔ نہ محققانہ پھر وہی ابن حبان اس کی توضیح بھی کیے دیتے ہیں۔ کہ خیبر وغیرہ کے حالات بھی اُنھیں یہودیوں سے لیے گئے تھے۔ جو مسلمان ہوگئے تھے۔ تو اب امام حنبل کو کیا عذر ہوسکتا ہے۔ وہ یہود۔ اب تو یہود رہے نہیں تھے۔ بلکہ آنحضرت صلعم کے دست مبارک پر شرف باسلام ہوچکے تھے۔ اس لیے اکیلے وہ مسلمان ہی نہیں تھے۔ بلکہ شرف صحابیت پر بھی فائز ہوچکے تھے۔ باعتبار اسلام لانیکے اُنکا زمانہ قبول اسلام بھی وہی ثابت ہوتا ہے۔ جو حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوموسیٰ الاشعری کے قبول اسلام کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر شرف صحابیت کے اعتبار سے۔ یہ مسلمان اور وہ دونوں صحابی مدارج اسلام میں ضرور برابر کے جائیں گے۔ اس حالت میں اب امام حنبل کے اس اعتراض کو کون شخص قابل تسلیم کہہ سکتا ہے۔ باقی رہا شبلی صاحب کا یہ مہمل اضافہ۔

کہ یہ واقعات ان مسلمان شدہ یہودیوں نے یہودیوں سے سُنے ہونگے۔ اس لیے اُنپر پورا اعتماد نہیں ہوسکتا۔

تو یہ خالی توہمات کے تسلسل میں جن کی نہ کوئی حد ہے۔ نہ انتہا۔ اور اسپر دلیل تعدد کا اطلاق ہوگا۔ اول تو اس اعتراض اضافی کی ابتدا بھی صورت احتمالی "سُنے ہونگے" سے قایم کی گئی ہے۔ اور نتیجہ بھی مشتبہ فیہ نکالا گیا ہے یعنی پورا اعتماد نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر سمجھا جاوے گا۔ کہ یہ مرویات غلط نہیں ہیں۔ کم سے کم مشتبہ فیہ ہیں۔ مگر بااین ہمہ اعتماد سے خالی نہیں۔ پھر بقول امام حنبل لیس لھا اصول بے اصل کیسے ہوئے۔

امام احمد ابن حنبل کا اصل اعتراض اور ابن حبان کی شرح حقیقت تو ہم نے پوری تفصیل سے لکھکر دکھلادی
اب ہم ذیل میں شبلی صاحب کی دوسری سند معترضانہ کی حقیقت دکھلاتے ہیں۔ ابن حبان کے
نقل و ترجمہ عبارت کے بعد تحریر ہوتا ہے۔

دوسرے اعتراض کا انکشاف حقیقت۔

علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ محمد ابن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے۔ اور انکو ثقہ سمجھتے تھے۔

شبلی صاحب کی نقل وتحریر کی عجب شان ہے۔ جب حصول مطلب کے متعلق۔ آپ کے تمام ذرائع مسدود ہوجاتے ہیں۔ تو آپ اپنی نادیدہ قابلیت سے ہر شخص کو خواہ مخواہ مرعوب کر لینا چاہتے ہیں۔ اور اس طریقہ سے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے آپ خود لکھتے ہیں۔ کہ امام حنبل کے یہ تمام اعتراض آپنے اُن کی خاص کتاب سے نہیں لکھے۔ بلکہ موضوعات ملا علی قاری سے نقل کیئے ہیں۔ پھر طرفہ تر یہ کہ ملا علی قاری کی بھی اصل عبارت نقل نہیں فرمائی۔ اسی طرح ابن حبان اور اُنکی کتاب الثقات کا صرف نام لکھ دیا ہے۔ اور نقل عبارت کی ہے ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے تو ایسے مخدوش و مشکوک نقول النقول اسناد و اشہادات پر کبھی کوئی اعتماد کر سکتا ہے؟

علامہ ذہبی کے شاید اس لکھدینے نے کہ اُن یہود و نصاریٰ کو ابن اسحاق ثقہ سمجھتے تھے شبلی صاحب کو اس شبہ پر یقین دلادیا ہے۔ تو اس تعریض کی تردید ابن حبان کے قول صریح سے آپ خود نقل فرما چکے ہیں۔ تو پھر ذہبی کے قول منفرد اور مسترد پر اعتبار کرنا آپ کے توہمات مسلسل کا طومار ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔

ہم کہتے ہیں۔ کہ اگر ذہبی کا قول منفرد تسلیم بھی کر لیا جاوے۔ تو اہل سیرت کے لیے غیر مفید نہیں۔ کیونکہ ابن حبان کے قول سے تصریح اوپر ثابت ہوچکا ہے۔ کہ وہ یہود و نصاریٰ جن سے واقعات خیبر وغیرہ اخذ کئے گئے ہیں۔ مسلمان ہوچکے تھے۔ تو پھر ایسی حالت میں اگر اُن مسلمانوں کو ابن اسحاق نے ثقہ سمجھ لیا۔ تو کیا خطا کی۔ ہم ائمہ حدیث سے اسی اعتراض کی بنا پر پوچھتے ہیں۔ کہ ابوسفیان اور اُن مولفۃ القلوب نو مسلم مسلمانوں سے کتب صحاح میں کیوں استخراج حدیث فرمایا گیا۔ جو فتح کے وقت یا اُس کے بعد ایمان لائے۔ اور مسلمان ہوئے۔ اور دو ڈھائی برس سے زیادہ صحبت رسول صلعم سے مستفاد نہ ہو سکے۔

شبلی صاحب اپنے مختار کی تائید کرتے وقت تو باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کوئی پہلو اُٹھا نہیں رکھتے۔ مگر دوسروں کی خردہ گیری کے موقعہ پر اپنی موٹی سے موٹی فروگذاشت بھی آپ کو نظر نہیں آتی۔ اہل سیرت پر جن علما کے اعتراض نقل فرمائے گئے ہیں۔ وہ ایک بھی معترضین کی کتاب کی اصل عبارت سے نہیں۔ بلکہ بوسہ بہ پیام دادن کے انداز سے۔ دوسروں کے الفاظ سے نقل در نقل کی صورت میں دکھلائے گئے ہیں۔ اوپر دکھلا چکا گیا ہی کہ امام حنبل کے اعتراض ہیں۔ اور موضوعات ملا علی قاری کے الفاظ۔ ابن حبان کی تصریح ہے۔ اور

تہذیب التہذیب ابن حجر کی عبارت۔ علامہ ذہبی کی عبارت زیر بحث کا تو خریت سے کوئی حوالہ ہی نہیں دیا گیا۔ غالباً انہیں ابن حجر سے نقل کر لی گئی ہوگی۔ یہ آپ کی شان استدلال ہے۔ اور عنوان مباحث اور پھر اسیر ساری دُنیا سے اپنے کمال تحقیق کی داد طلبی۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

اس کے علاوہ دوسرا انداز استدلال اس سے زیادہ قابل تعریف ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ امام احمد ابن حنبل ملا علی قاری۔ ابن حجر۔ علامہ ذہبی وغیر امثالہم۔ یہ سب حضرات تو محدثین کے طبقہ خاص میں داخل ہیں پھر ان بزرگوں کا قول اہل سیرت کے مقابلہ میں کیسے استدلال کے قابل ہو سکتا ہے۔ امام حنبل کی تاریخدانی اور سیرت میں بالغ نظری اسی سے ظاہر ہے۔ کہ امام صاحب نے یہود و نصاریٰ کے اخراج کی وجہ سے رواۃ سیرت کی جو تضعیف کی ہے۔ اُس میں اخراج حالات خیبر کے لیے شمول یہود تو ظاہر ہوتا ہے۔ مگر عیسائیوں کا شمول کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ تو قطعاً خلاف واقع ہے۔ کیونکہ یہود تو خیبر میں طرف مقابل ہی تھے۔ لیکن غزوہ خیبر تک عیسائیوں کے ساتھ تو کوئی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ پھر شمول کیسا۔ اُنکے معاملات تو دو برس کے بعد ۸ھ ہجری کے آخر اور ۹ھ ہجری کے آغاز سے پیدا ہوئے تھے۔ اگر امام صاحب کو علم حدیث کی طرح تاریخ و سیرت میں بھی کوئی صلاحیت ہوتی۔ تو وہ اس امر کو اہل کتاب لکھکر غیر مفصل نہ چھوڑتے۔ بلکہ اہل کتاب کی جگہ یہود کا مخصوص لفظ لکھکر اپنی تعریض کو ہر طرح سے اہل سیرت و تاریخ کے مقابلہ میں مدلل اور مکمل فرما دیتے۔ شبلی صاحب اسی سے اپنے محدثین کاملین کی فن تاریخ و سیرت سے لاعلمی بے خبری اور ناواقفیت سمجھ لیں۔ اور اسی کے ساتھ حدیث و سیرت کے فرق مابہ الامتیاز کی تمیز کر لیں اور اب بھی سمجھ لیں۔ کہ اہل سیرت کی تنقید و تردید میں اہل حدیث کے اقوال کسی عنوان سے قابل تسلیم نہیں ہو سکتے۔ پھر آپ کو اتنی خامہ فرسائی اور محدثین کی محض مدح سرائی سے کیا فائدہ ہوا۔ اب ہم ان مضامین کے خاتمہ پر آپ کے انداز تحریر اور شان استدلال کی ایک اور نیرنگی دکھلاتے ہیں۔ انھیں ابن اسحاق صاحب سیرت کی جرح و قدح میں جن کی آپ نے یہ صورت بنائی ہے۔ آپ اپنے دست و قلم سے ان الفاظ میں تصدیق و توثیق فرما چکے ہیں۔ اور علم سیرت کے علاوہ علم حدیث میں بھی اُنکے کمال کا لکھکر اقرار فرما چکے ہیں۔ دیباچہ صفحہ ۱۶ میں مرقوم ہوتا ہے

محمد ابن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں۔ شہرت عام میں اگرچہ واقدی سے کم نہیں۔ لیکن واقدی کی دروغ بیانی مسلمہ عام ہے۔ اور اس لئے اُنکی شہرت بدنامی کی شہرت ہے۔ محمد ابن اسحاق تابعی ہیں۔ متعدد صحابہ کبار کو دیکھا تھا۔ علم حدیث میں کمال تھا۔ امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا۔ کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے۔ لیکن محمد ابن اسحاق کو عام اجازت تھی۔ کہ جب چاہیں چلے آئیں۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونیکی نسبت محدثین میں اختلاف

ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ ہے۔ کہ مغازی اور سیر میں اُن کی روایتیں اسناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں اُن کی روایت نہیں لی۔ لیکن جزء القرأت میں ان سے روایت لی ہے۔ اور تاریخ (بخاری) میں تو اکثر واقعات انہیں سے لیئے ہیں"۔

آپ کی اس تحریر سے ثابت ہو گیا۔ کہ سوائے امام مالک کے اور کسی محدث کو ابن اسحاق کے قابل استناد ہونے میں تامل نہیں ہے۔ بلکہ اُنکے مستند ہونے پر اُن کا عام فیصلہ ہو چکا ہے۔ پھر مزید برآں امام بخاری تک نے جزء القراءۃ میں اُنکے مرویات لیئے ہیں۔ اور تاریخ بخاری میں تو اکثر واقعات انہیں سے مستخرج و مستنبط فرمائے گئے ہیں۔ پھر ایسے شخص کی اتنی اور ایسی تصدیق و توثیق خود لکھ کر پھر اُسکی تکذیب و تضعیف کرنا حقیقتاً اُس کی تکذیب نہیں۔ بلکہ اپنی آپ تکذیب کرنی ہے۔

محدثین کے اقوال میں بیشمار اختلاف ہونے کی صرف ایک مثال

اس بحث کے اخیر میں ہم اتنا اضافہ اور کرتے ہیں۔ کہ امام حنبل اور دیگر محدثین کے اس مختار کی بنا پر۔ کہ اہل سیرت نے تعین ایام ذات الرقاع میں اختلاف کیا ہے۔ اسوجہ سے اُن کے اقوال قابل اعتماد نہیں شبلی صاحب نے اہل سیرت کی تضعیف کو ثابت کرنا چاہا ہے۔ ہم اسی ذات الرقاع کے متعلق حضرات محدثین کے اختلاف کثیرہ کا طومار زرقانی کی تنہا عبارت سے ذیل میں پیش کر کے دکھلاتے ہیں۔ کہ ان اختلافات کے لیئے کیا عذر پیش کیا جائے گا۔

ذات الرقاع کی حدیث مندرجہ صحیح بخاری کی بنا ابو موسیٰ الاشعری سے شروع ہوتی ہے۔ جنکا بیان ہے۔ کہ ذات الرقاع میں ہم نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ نماز خوف پڑھی۔ اس لیئے علامہ عبد الباقی الزرقانی حدیث ابو موسیٰ کی پوری عبارت تحریر فرما کر۔ لکھتے ہیں۔

وقد ازداد قوۃ بحدیث ابی ھریرہ ولحدیث ابن عمر فان ابوھریرۃ فی ذلک نظیر ابی موسیٰ لانما جاؤ النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم بخیبر فاسلم وقد ذکر فی حدیثہ انہ صلی معہ صلوٰۃ الخوف فی غزوۃ نجد کذلک ابن عمر ذکر انہ صلی مع النبی صلعم صلوٰۃ الخوف بنجد وقد تقدم ان اول مشاھد بخندق فتکون ذات الرقاع بعد الخندق وقد قیل الغزوۃ التی شھدھا ابو موسیٰ سمیت ذات الرقاع غیر غزوۃ ذات الرقاع التی وقعت فیھا صلوٰۃ الخوف ان ابا موسیٰ قال انھم کان

اس حدیث (ابو موسیٰ) کو ابوہریرہ اور ابن عمر کی حدیثوں سے قوت ہو گئی کیونکہ ابوہریرہ کی مثال بالکل ابو موسیٰ کی واقع ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں اشخاص (ابوہریرہ و ابو موسیٰ) جناب رسالتمآب صلعم کی خدمت میں غزوہ خیبر میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ اور ابوہریرہ نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے کہ ہم نے آنحضرت صلعم کے ساتھ غزوہ نجد میں صلوٰۃ خوف پڑھی۔ ایسا ہی ابن عمر بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ ہم نے آنحضرتؐ کے ساتھ غزوہ نجد میں صلوٰۃ خوف پڑھی۔ اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ ابن عمر نے سب سے پہلے غزوہ خندق میں شرکت کی۔ اور تب ذات الرقاع کیونکر خندق کے بعد واقع ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس غزوہ میں ابو موسیٰ

ستة انفس في الغزوة التي وقعت فيها صلوة الخوف كان المسلمون فيها اضعاف ذلك والجواب ان العدد الذي ذكره ابا موسى محمول لعله كان مرة فعاله ولم يرد جميع من كان مع النبي صلعم قاله في الفتح ثم قال فيه بعدا وراق في شرح جابر لاعند قول البخاري و هي بعد خيبر كما ادهمه المصنف فانصه واما قول الغزالي انها غزوة ذات الرقاع اخر الغزوات فهو غلط واضح وقد بالغه ابن الصلاح في انكاره على الغزالي ذلك بقوله وقال بعض من انتصر الغزالي لعله اراد اخر غزوة صليت فيها صلوة الخوف وهو انتصار مردود بما اخرجه ابوداؤد النسائي وصححه ابن حبان من حديث ابي بكره انه صلى الله عليه وآله وسلم وانما سلم ابوبكره بعد غزوة الطائف بالاتفاق وذلك بعد غزوة ذات الرقاع قطعا هذا السقطه من كلام الفتح اه فيلزم من صلوة ابوبكره صلوة الخوف مع النبي صلعم ان لا تكون ذات الرقاع اخر صلوة الخوف   زرقانی جلد اول صفحہ ۱۰۲

نے شرکت کی، اور اسکا نام ذات الرقاع رکھا۔ وہ حقیقتاً ذات الرقاع کی جگہ دوسرا غزوہ تھا۔ جس میں صلوٰۃ خوف پڑھی گئی کیونکہ ابو موسیٰ کا بیان ہے۔ کہ ہم لوگ کل چھ آدمی تھے۔ بخلاف اسکے جس غزوہ میں صلوٰۃ خوف کا وقوع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی جتنی ابوموسیٰ نے بتلائی ہے۔ جواب اس اشکال کا یہ ہے۔ کہ ابو موسیٰ کی مراد اس تعداد سے اسپر محمول ہے۔ کہ انہوں نے صرف ایک بار ہی اسکے واقع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مگر اسکا دیگرات واقع ہونا (صحابی ہمراہیان رسول صلعم میں کسی نے بھی نہیں لکھا ہے۔ مگر ابن حجر بخاری کے قول میں تو نہیں۔ ہاں جابر کے قول کے نیچے لکھتے ہیں۔ کہ ذات الرقاع بعد خیبر واقع ہوا۔ زرقانی لکھتے ہیں۔ کہ شارح (ابن حجر) کو اس مقام پر (ذکر ذات) میں وہم ہوگیا ہے۔ اور اس قول پر کوئی نقض نہیں لائے ہیں۔ اب رہا امام غزالی کا قول کہ غزوہ ذات الرقاع غزوہ آخر تھا۔ بالکل غلط ہے اور ابن صلاح اس حدیث سے انکار کرتے ہیں۔ مبالغہ کیا ہے لیکن وہ بعض لوگ جو قول غزالی کے موئد ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ مراد قول غزالی سے یہ ہے۔ کہ آخری صلوٰۃ خوف جس غزوہ میں آنحضرت صلعم کے ساتھ پڑھی گئی۔ لیکن یہ قول تائیدی بھی مردود ہے۔ اسلئے کہ ابو داؤد اور نسائی سے منقول ہے۔ اور ابن حبان نے اسکی صحت کی ہے۔ کہ ابابکرہ نے بالاتفاق غزوہ طائف میں اسلام قبول کیا۔ اور آپ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی۔ اور یہ غزوہ حتماً غزوہ ذات الرقاع کے بعد واقع ہوا اس بنا پر حدیث غزالی کا قطعاً اسقاط ثابت ہوتا ہے۔ اور قول ابوبکرہ اور شرکت صلوٰۃ خوف سے لازم آتا ہے۔ کہ ذات الرقاع کی صلوٰۃ خوف ہرگز آخر صلوٰۃ خوف نہیں تھی۔

ہم وقوع ذات الرقاع اور نزول حکم صلوٰۃ خوف کی حقیقت توحسب الوعدہ اپنے خاص مقام پر لکھیں گے۔ ہمنے یہاں تو صرف اس ضرورت کے مطابق اس واقعہ خاص اور تعین وقت صحیح صلوٰۃ خوف کے متعلق حضرات محدثین کے اختلافات کثیرہ سے اُن کے چند اقوال مختلف بیان نقل کردیئے ہیں۔ ابھی طومار کا طومار تو باقی ہے۔ اور زرقانی جلد اول میں مفصل مرقوم ہے

اس اختلاف بین المحدثین کے دکھلانے سے میرا مقصود صرف اتنا ہی ہے۔ کہ غزوہ ذات الرقاع کے تعین اوقات کی نسبت اہل سیرت کے باہمانہ اختلاف کرنے سے انکا ضعف اعتبار ثابت کیا گیا ہے۔ اور انکے اقوال و آرا کی

قبولیت سے عموماً انکار کیا گیا ہے۔ اگر ساقط الاعتباری کی یہی وجہ با لموجہ قایم کی گئی ہے۔ تو اسی غزوہ ذات الرقاع کے اور صلواۃ خوف کے وقتِ نزول کی نسبت۔ حضرات محدثین کے اختلاف کی بھی تو وہی صورت نمایاں ہوتی ہے بلکہ اُس سے بھی بدنما اور نمارہا۔ کیونکہ اصحاب محدثین نے تو ارباب سیرت میں صرف ابن سعد وابن حبان کے مختلف اقوال دکھلا کر اُن کے مختار اقوال سے انکار کیا ہے۔ یہاں تو امام بیہقی قبل خیبر بتلا رہے ہیں۔ ابن عقبہ۔ بعد کمال تردد۔ قبل بدر الکبرےٰ۔ وقت وقوع ٹھہرا رہے ہیں۔ امام احمد ابن حنبل اور اُن کے تمام موئدین (ارباب سنن) ابی عیاش زرقی کے اسناد سے نزول حکم صلوٰۃ خوف کا باعث خالد ابن ولید کے کافرانہ حملات کو تصریحات فرما رہے ہیں۔ مگر یہ نہیں فرماتے کہ کب اور کس وقت۔ امام غزالی ذات الرقاع آخر غزوہ اور نزول حکم صلواۃ خوف کا اصل موقع دکھلا رہے ہیں۔ امام ابن الصلاح اُن کی تردید میں صحیح نسائی اور ابوداود دکھلا کر توثیق وتصدیق ابن حبان کے ساتھ مبالغہ آمیز کلام و مُناظرہ فرما رہے ہیں۔

غرض ایک عجیب عالم رستخیز ہے۔ اور اضطراب کشمکش انگیز۔ ابن عقبہ صاحب ذات الرقاع کو اتنا قدیم بتلائیں کہ بدر الکبرےٰ سے بھی قبل کھینچ لیجائیں۔ بخلاف ان کے امام غزالی صاحب اتنا نیا اور تازہ واقعہ ٹھہرائیں۔ کہ اُسکو سرے سے نیچے لاکر آخر غزوہ تک اوتار لائیں۔

نزول حکم وصلوٰت خوف میں اختلاف

یہ تو ذات الرقاع کے خاص تعین وقت کی حالت اختلاف دکھلائی گئی۔ جو حضرات محدثین کے اقوال مختلفہ کے باعث پہونچی ہوئی پائی گئی۔ اب حکم صلواۃ خوف کے نزول اور اُسکے استقرار وقت اور موقع نزول کے حالات ملاحظہ ہوں۔

ابو موسیٰ صاحب تو غزوۂ ذات الرقاع کو موقع نزول حکم صلواۃ خوف بتلا گئے۔ مگر ابو ہریرہ صاحب جو اسلام لانیکے اعتبار ایام سے ابو موسیٰ کی نظیر قرار دیئے گئے تھے۔ اور عبد اللہ ابن عمر صاحب جو اُنکے موئد ٹھہرائے گئے تھے۔ اور ان دونوں صاحبوں کی منقولہ حدیثوں سے ابو موسیٰ والی حدیث کی تقویت پہونچائی گئی ہے ان دونوں صاحبوں کی حدیثوں میں ذات الرقاع کا نام نہیں ہے۔ بلکہ نجدہ بتصریح و تواتر نام آیا ہے اس سے ابو موسےٰ کے قول کی حقیقت بالکل کھل جاتی ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ یہ کس علم و دانش کے صحابی تھے۔ اور اسی مایہ و پایہ کے اعتبار پر صحیح بخاری کے سرمایہ ناز راوی قرار دیئے گئے ہیں۔

ابن حجر کو اُنکے اقوال کے اشکال نظر آئے۔ اور جب اُنکی کوئی صورت جواب نظر نہ آئی۔ تو آخر کہنا ہوا۔ (جیسا کہ مرقومہ بالا عبارت زرقانی سے ظاہر ہوا) کہ ابو موسیٰ نے اس غزوہ کا یوہیں نام غزوہ ذات الرقاع رکھدیا ہے۔ (یعنی اصل یہ غزوہ نجد ہے۔ جہاں بنی محارب بستے تھے۔ اور اُنکی بے ادبی پر اسلام کو تنبیہہ کی ضرورت واقع ہوئی تھی۔ ذات الرقاع ابو موسیٰ کا خاص نام نہادی اور ایجادی نام ہے۔ اور نہ وہ اصلی ذات الرقاع:

تھا جس میں صلوٰۃ خوف کا حکم نازل ہوا تھا۔ عبرت تو یہ ہے۔ کہ ابو موسیٰ کی اتنی ہی تغلیط و تکذیب پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ بعض محدثین نے بعیر اس صحابی کی تکذیب اسطرح کی ہے۔ کہ ابو موسیٰ نے جس غزوہ کو غزوہ ذات الرقاع تبلایا ہے۔ اور اسکو حکم صلواۃ خوف کا مقام نزول ٹھرایا ہے۔ اُسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اس غزوہ میں کل چھ آدمی شامل تھے۔ حالانکہ وہ اصلی غزوہ ذات الرقاع (غزوہ بنی محارب) جس میں صلواۃ خوف کا حکم نازل ہوا۔ اس میں اہل اسلام کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے جتنی ابو موسیٰ اپنی حدیث میں تبلاتے ہیں۔

ابن حجر کی جان عجیب ضیق میں پڑی ہے۔ اُدھر ابو موسیٰ کی دستار صحابیت بھی سنبھالنی۔ ادھر امام بخاری کا عمامہ افضلیت بھی حافظ صاحب نے بقدر امکان جواب تو دیا۔ متکلم الکلام خود بنیاست اپنی کمی اور ضعف استدلال کو خوب سمجھتے تھے۔ بالآخر غزوہ ذی قرد کی طرح ذات الرقاع کے بھی بتواتر و تکرار واقع ہونے کا احتمال ظاہر کرنا ہی پڑا۔ غریب کرتے کیا۔ بغیر اس ترکیب کے۔ محدثین کے اس طومار اقوال مختلفہ میں نہ کوئی تطبیق ممکن ہو سکتی تھی۔ اور نہ تاویل۔

روایات سیرت پر عمل کیا گیا

مسئلہ زیر بحث کے خاتمہ پر آخر فیصلہ بھی دکھلا دینا نہایت ضروری ہے۔ اس بنا پر اب ہم اپنے موجودہ بیان میں یہ دکھلاتے ہیں۔ کہ آخر ان طومار اور انبار بیکار کے بعد حدیث و سیرت کے ارباب و اصحاب کا عمل کس کے حکم پر ہوا۔ آیا اہل سیرت نے اہل حدیث کے مختار کو تسلیم کر لیا۔ اور ذات الرقاع کے وقت وقوع کو مطابق قول بخاری بعد خیبر مان لیا۔ یا اہل حدیث نے اہل سیرت کے قول کو مان کر اُس کو قبل خیبر قرار دے لیا۔

جب ہم اُس کی تحقیق کرتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام بحثیں حدیث کی کتابوں میں اپنے اپنے مقام پر رکھی رہ گئیں۔ اور حدیث و سیرت والے اپنے اپنے اقوال و مختار پر قائم رہے۔ اور کسی نے دوسرے کے قول کو تسلیم نہیں کیا۔ سیرت والے قبل خیبر اور حدیث والے بعد خیبر لکھتے رہے۔ مگر اس قبل و بعد کے قضیہ سے علیحدہ ہوئے علامہ قسطلانی۔ صاحب مواہب لدنیہ نے۔ جو خود بھی شارح بخاری ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری کے ارشد تلامذہ میں داخل ہیں۔ ایک بالکل ہی نئی لیکن تعجب انگیز راہ نکالی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ باوجود اسکے کہ محدثین کے طبقہ میں اعتبار و اعتماد کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ مگر مواہب لدنیہ! اپنی جامع کتاب میں ذات الرقاع اور صلواۃ خوف کے نزول حکم کے تمام واقعات اور اُن تمام اختلافات محدثین کو لکھکر صحیح بخاری کی روایت کو تمام مرویات پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر تاہم اپنی کتاب میں ذات الرقاع کو اپنے سلسلہ بیان میں قبل خیبر لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو زرقانی شرح مواہب لدنیہ کی فہرست مضامین مطبوعہ حیدر آباد جلد دوم ص۱

یہ عجب طرح کی تائید ہے

محدث قسطلانی نے مضامین کتاب میں امام بخاری اور اُنکے ہمخیال محدثین کی تقلید کرکے اُن کی حدیث کو صحیح تسلیم کرلیا۔ مگر اپنی کتاب کی ترتیب و تالیف میں اہل حدیث کو قطعاً متروک فرما کر اہل سیرت کی تقلید فرمائی۔ اور ذات الرقاع کو قبل خیبر بیان کیا۔

شبلی صاحب کے علمی استخفاف کا انکشاف

قسطلانی صاحب سے زیادہ تو شبلی صاحب نعمانی نے اپنے مختار و اعتراف سے روگردانی کی ہے۔ تنبیح حدیث علی السیرت کے ثبوت میں واقعات ذات الرقاع کی اہل سیرت کو مثال بنا کر دکھلایا ہے۔ اور تمام دلائل و براہین سے آخر میں محدثین کا یہ فیصلہ پیش کیا ہے۔ قد جنح البخاری الی انھا کانت بعد خیبر قول بخاری سے بتصریح ثابت ہے۔ کہ وہ (غزوہ ذات الرقاع) بعد خیبر واقع ہو اور اسی قول کو تمام محدثین کا مسلمہ تبلایا ہے۔

باتفاق جمہور خیبر ۷ھ میں فتح ہوا۔ خود آپ نے بھی وقوع خیبر کو ۷ھ میں لکھا ہے۔ تو اب اس بنا پر ذات الرقاع حتماً ۷ھ میں خیبر کے بعد یا ۷ھ کے بعد ۸ھ وغیرہ میں واقع ہوا ہوگا۔ مگر آپ نے ان تمام طومار تحقیق و تنقید کے بعد جو صرف مرعوبیت عامّہ کے لحاظ سے لکھ کر دکھلائے گئے تھے۔ اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ جلد اول میں ذات الرقاع کو ۵ھ کا واقعہ تحریر فرمایا ہے۔ ان ھذا لشی عجاب فاعتبروا یا اولی الالباب مگر یہ اندراج بھی کس حزم و احتیاط۔ اور کس بیداری و ہوشیاری سے عمل میں لایا گیا ہے۔ کہ آپ کے تدین مولفانہ کی شان عظمت کو اُس سے بھی دوبالا کر دیتا ہے۔ جبکہ عوام الناس کو معلوم اور اُنکے پیش نظر ہے۔ اور وہ یہ کہ جدول فہرست مضامین میں۔ جو دیباچہ سے پہلے کتاب پر لگائی گئی ہے۔ ذات الرقاع کا نام ہی نہیں۔ اصل کتاب کی تفصیل و بیان میں کسی سن و سال کے واقعات میں اسکا مذکور نہیں۔ اس سے تو آپ کا یہ مضحکہ انگیز فیصلہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یا تو آپ قطعاً اُسکے وقوع کے قائل ہی نہیں۔ یا اہل سیرت و حدیث کے بے شمار و ناگوار اختلافی اقوال سے عاجز آکر آپ نے اُسکے احذاف و اسقاط ہی کو اپنا معیار تحقیق بنایا ہے۔

لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آپ اپنے اس معیار پر بھی قائم نہ رہے۔ مگر یہ امر آپ کا مافی الضمیر ضرور تھا آپ نے ذات الرقاع کا جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ اسکے بیان کے اصلی مقامات کتاب میں کہیں بھی ذکر نہیں فرمایا۔ لیکن موضوع کتاب سے علیحدہ ہو کر گویا خاتمہ حالات مغازی رسولؐ پر جو اُصول غزوات و اسرایا پر مقدمانہ تحریر لکھی ہے۔ اور اس میں مغازی و سرایا کے اسباب و قوع اور اُن میں سے ہر اک واقعہ کے لیے منجانب اسلام ایک عذر معقول دکھلایا ہے۔ اور مختصر سی کیفیت دکھلائی ہے۔ اس لیے یہاں آپ کو ذات الرقاع کے بیان کی غایت مجبوری ہو گئی ہے۔ اور اُسکا بیان ان الفاظ مختصرہ میں کیا گیا ہے۔

(حاشیہ مقابل پر) ذات الرقاع ۵ھ۔

هربت الاعراب علےٰ رؤس الجبال

اعراب پہاڑوں پر بھاگ گئے۔ جلد اوّل ص ۴۴۲۔ سبحان اللہ کیا عنوان ہے۔ اور کیا مفصّل اور مکمل بیان۔ آپکی کتاب دیکھنے والے اس واقعہ کی کہانتک تفہیم اس عبارت سے کر سکیں گے۔ اس کا جواب شبلی صاحب دینگے۔ مگر ہم تو آپ سے کہیں گے۔ کہ اسکا نہ لکھنا ہی آپکے حفظان تقدّم کیلیے سفید تھا۔ آپ نے بڑی احتیاط سے اتنی عبارت لکھکر اپنے تمام استخفاف کا انکشاف کر دیا۔ افسوس ہے کہ یہاں اسکی وقوع کا زمانہ ۶ھ لکھکر تبلایا جاتا ہے۔ مگر فہرست مضامین اور اصل کتاب میں اسکا ذکر و مذکور نام و نشان بالکل چھپایا جاتا ہے۔ کیوں۔ اس لیے کہ بخاری کی تکذیب ہوتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں۔ کہ آپکی تکذیب نہیں ہوتی ہے۔ جو خود اسکو شال بنا کر بڑی سرگرمی سے اوپر دکھلا چکے ہیں۔ اور اب پھر اسکو بخلاف بخاری و جملہ محدثین ۷ھ یعنی قبل خیبر کا واقعہ تبلاتے ہیں۔ اور اس تناقص فی الرائے و الکلام سے ذرا بھی نہیں شرماتے۔ نہیں۔ یہ حقیقت کا ہاتھ تھا جس نے آپکا قلم پکڑ کر آخرکار آپ کے تمام معیوبانہ استخفاف کا اقرار لکھوا ہی دیا۔ اور اسی کے ساتھ انہی اہل سیرت کی تقلید بھی جن کی تضعیف میں آپ اتنا پُرجوش تھے۔

صحت۔ تمام علوم و فنون میں قدر مشترک ہے

اب رہی صحت۔ اس کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ جس طرح حدیث میں ضروری ہے۔ ویسے ہی سیرت میں۔ مگر محقق کو صحت کی تعریف پہلی ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ یوں تو صحت کی بہت اقسام تبلائے گئے ہیں۔ مگر اصل دو ہی قسمیں ہیں۔ اور باقی اُنھیں کے فروعات اور شعوبات۔ صحت کی پہلی قسم یقینی ہے۔ اور دوسری ظنّی۔ موجودہ علوم متداولہ عالم میں الٰہیات (متعلق معرفت) اور ریاضیات کے سوا کسی علم کی صحت یقینی نہیں۔ صحت یقینی وہ ہے۔ جو بدیہیات و مشاہدات کے برابر ہوتی ہے اور جس شے کے وجود کا بغیر مشاہدہ اعتراف کر لیا جاوے۔ وہ علم یقین بھی بدیہیات و مشاہدات میں داخل ہے صحت ظنّی وہ ہے جسکا اعتراف یقین تسلیم و ایجاب ضروری ہے۔ مگر وہ بدیہیات و مشاہدات میں شامل ہونیکے قابل نہیں۔ اسی بنا پر۔ علمائے اسلام۔ اور حکمائے قدیم الایّام نے ریاضیات و الہیات۔ اعترافات وجود ذات وغیرہ کے علاوہ باقی تمام علوم و فنون کی صحت و اعتبار کی صحت کو ظنّی کے درجوں تک یقین کیا ہے۔ انہیں میں سیرت اور حدیث دونوں داخل ہیں۔ اور اسی بنا پر بحر العلوم کتب حدیث کی عموماً اور صحیح بخاری کی اصحّ الکتاب اور صحیح یقینی ہونے کو خصوصاً تمام طریقوں سے مجروح مقدوح اور ممنوع ثابت کیا ہے۔ جیساکہ اوپر بیان کیا گیا۔ پھر ایسی صحت سے شبلی صاحب کا مقصود ہے۔ تو وہ مشکل سے حدیث و سیرت کے لیے ممکن ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ حدیث ہو تاریخ ہو۔ سیرت ہو۔ یا مغازی۔ یہ تمام علوم تو منقولات میں داخل ہیں پھر اُنپر دلائل معقولات کا جمع کرنا تو جمع فاسد علی الفاسد کا حکم رکھتا ہے

بہرحال۔ جب اتنا تحقق ہو گیا۔ کہ عموماً علم حدیث کی صحت بھی ظنّی ہے۔ یقینی نہیں عام اس سے کہ کتب صحاح ہو

سنن ہو۔ یا مسند۔ سب ایک ہی تعریف کے اندر آتی ہیں۔ اور حدیث کی طرح سیرت اور تاریخ کی بھی صحت کا یہی حال ہے۔ تو صحت کی میزان میں تو حدیث و سیرت کی مرویات۔ اگر اپنے اپنے معیار صحت کے مطابق صحیح و معتبر طریقوں سے مستخرج کیے گئے ہیں۔ تو وہ بھی کامل العیار اور قابل اعتبار ہونگی۔ مگر اس صورت میں تو شبلی صاحب کو ترجیح حدیث علی السیرت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ ہم اس سے زیادہ مسئلہ صحت کے متعلق لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں دیکھتے۔

شبلی صاحب کے قرار دادہ معیار صحت حدیث

ہم ذیل میں شبلی صاحب کے قرار دادہ معیار صحت حدیث کو ذیل میں نقل کرکے اُن کے بعض مقامات پر بالاختصار اپنی تنقیدی عبارت لکھ دیتے ہیں۔ پہلے ہم اُن معیار کو لکھتے ہیں۔ جن کو آپ نے مرویات احادیث کا محک و معیار قرار دیا ہے۔ جس کو معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے موضوعات علامہ سیط ابن جوزی کے مقدمہ سے نقل کیا ہے۔ تحریر ہوتا ہے۔

حسب ذیل صورتوں میں روایت قابل اعتبار نہ ہوگی۔ اور اُس کی نسبت اس تحقیق کی ضرورت نہیں۔ کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اُصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدات کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن مجید۔ احادیث متواتر۔ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو۔ اور اُسمیں تاویل کی گنجائش نہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام میں بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت جو رکیک المعنی ہو۔ مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

(۸) جو روایت ایسی ہو۔ کہ تمام لوگوں کو اُس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو۔ باین ہمہ کسی اور راوی نے اُس کی روایت نہ کی ہو۔

(۹) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے۔ کہ کسی اور نے نہیں کی۔ اور یہ راوی اُس شخص سے نہ ملا ہو

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتبار واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ کہ اگر وقوع میں آتا۔ تو سیکڑوں راوی اُسکو روایت کرتے۔ باوجود اُس کے صرف ایک ہی راوی نے اُس کی روایت کی ہو۔

شبلی صاحب کے مندرجہ بالا انصاب حدیث کی مختصر تنقید

بظاہر تو مندرجہ بالا شرائط صحت حدیث کے معیار بنائے گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ نقادان فن نے صرف ان کو اپنی کتابوں میں لکھا اور صحت حدیث کے

غلط اعتقاد کا عوام میں باعث شہرت بنا کر رکھ لیا۔ مگر صحاح سے لیکر سُنن و مسانید تک کے حضرات محدثین میں ایک صاحب بھی اُن پر عمل پیرا نہ ہوئے۔ اور ہزاروں مراسیل و مقطوعات۔ مسانید و سُنن و صحاح کیا خاص صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ جن میں لیلۃ القدر والی حدیث اور دیگر چند حدیثوں کی تنقید بخاری کی بحث میں اوپر دکھلائی گئی ہے۔ اتنا تمہیداً لکھکر مفصلہ ذیل عبارت تنقیدی لکھی جاتی ہے۔

(۱) خلاف عقل روایتیں۔ اس شرط لضاب سے۔ معرفت الہیہ۔ خصوصاً ثبوت واجب الوجود کے متعلق مرویات۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کے صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کا مثل بدیہیات کے یقین و اعتقاد ہے اور نیز احکام تعبدی کی روایتوں کو مستثنیٰ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ امکان تعقل انسانی ان دقیق مطالب و معانی کے بار کا بقول آپ کے متحمل نہیں ہو سکتا۔

مثلاً خدا کی آنکھ۔ کان وغیرہ نہیں۔ مگر اُسکے اسمع السامعین اور ابصر الناظرین ہونے کا مثل شاہدات کے یقین کامل اور اعتماد واثق واجب ہے۔ جو بادی النظر میں انسان کی عقل محدود کے حدود تعقل کے باہر ہونے کی وجہ سے بظاہر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح احکام تعبدی ہیں۔ جو بمقتضائے آیہ وافی ہدایہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ سونے اور حریر کے استعمال کو مردوں کے لیے تو حرام اور عورتوں کے لیے حلال تاکیدی بتلاتے ہیں خصوصاً اوقات نماز میں۔ مردوں کی تفریق اور عورتوں کی اس تخصیص کے لیے عقل کوئی وجہ معقول نہیں قائم کر سکتی اس زمانہ کی جدید اور روشن ترعقل والے تو فروعات ستہ کے احکام واجبات صوم و صلوٰۃ کو بھی۔ اس لیئے کہ اُن کے نزدیک انسان آزاد مادر زاد پیدا ہوا ہے۔ بہت کم قابل تعمیل سمجھتے ہیں۔

(۲) مرویات خلاف اُصول مسلمہ۔ اُصول مسلمہ کی تعریف ضرور ہونی چاہیے۔ کہ سمجھا جاوے اُصول مسلمہ۔ خاص ہے۔ یا مسلمہ عام۔ اگر مسلمہ خاص مقصود ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ دوسری قوم و فرقہ والے بخیکو ادعائے اسلام ہوگا۔ وہ کیوں کر اُس کے لیئے مجبور کیے جائیں گے۔

اس کے علاوہ۔ یہ ایسی شرط ہے۔ جو شرط ہی شرط ہو کر کتابوں میں لکھی رہ گئی۔ اسپر عمل کچھ بھی نہیں ہوا اجماع اُصول مسلمات۔ اور اولین معتقدات اہلسنت والجماعت سے ہے۔ وہ آجتک ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اول مسلمہ یعنی اجماع سقیفہ بنی ساعدہ کی صحت و صداقت جواز وغیر جواز میں۔ آپس ہی میں اختلاف ہے۔ تو دوسرے مسلمات سے بحث ہی بیکار ہے۔ باقی رہا صحت حدیث کے مسلمات۔ جو موجودہ بحث کا اصل مدعا ہے۔ وہ عموماً صحاح ستہ۔ اور خصوصاً صحیح بخاری کی نسبت پیش کیا جاتا ہے۔ اُس مسلمہ یا اجماع کی تنقید و تغلیط۔ امام ابن ہمام اور بحر العلوم کے اقوال و آراء بالتفصیل اوپر قلمبند ہو چکی ہے۔ پھر کیسے کہا جائے۔ کہ اُصول مسلمہ کے خلاف آپ حضرات

کا عملدرآمد نہیں ہے۔ اگر حقیقتاً جیسا کہ لکھا جاتا ہے۔ شرط اُصول مسلمہ کے مطابق کیا بھی جاتا۔ تو پھر ابن ہمام اور بحر العلوم سے علمائے کرام کو اجماع کے اُصول مسلمہ سے انکار کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ شرائط نصاب و معیار صحت بہت پیچھے وضع کیے گئے۔ اور اُنکے خلاف عملدرآمد بہت قدیم ہے۔

(۳) مرویات خلاف شاہدات و محسوسات۔ محسوسات کی جگہ مدرکات کا لفظ زیادہ مناسب تھا۔ اس لیئے کہ محسوسات کا علے الاکثر محسوسات پر اطلاق ہوتا ہے۔ اور مدرکات تعقل کے معنیوں میں داخل ہے۔ جو اصل عبارت میں مُراد ہے۔ یہ شرط حقیقتاً شرط اوّل کا ایک ضمیمہ ہے اسلیئے اسپر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں

(۴) مرویات جو قرآن مجید۔ احادیث متواترہ۔ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو۔ اور جس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔ بظاہر یہ شرط بالکل صحیح ہے۔ اور حدیثوں کا اصلی اور حقیقی معیار صحت بھی ایک شرط ہے۔ جو جملہ شروط و قیود پر حاوی ہے۔ مگر افسوس سب سے ناگفتہ بہ اسی کی نارسائی محقق ہوتی ہے۔ اور شاہدات بتلا رہے ہیں۔ کہ اُسکے کسی شائبہ پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔ قرآن مجید کے خلاف تو نحن معاشر الانبیا کی روایت موجود ہے احادیث متواترہ فمن کنت مولاہ کے اجماع اُمت کے خلاف و نقیض (جسکے اعلان کے وقت بقول ابن اثیر ایک لاکھ مسلمانوں سے بھی زیادہ کی جمعیت موجود تھی) سقیفہ بنی ساعدہ میں خلاف سازی کے کارنامے محفوظ ہیں۔ آجتک تمام اسلامی کتب اسپر شاہد ہیں۔ اور یہ ایسے شواہد ہیں۔ جن کی تصدیق و توثیق کے لیئے دوسری تائید و تحقیق کی مطلق ضرورت نہیں۔ پھر ان شواہد کے مقابل میں کون عقل والا کہسکتا ہے۔ کہ اس شرط پر سواد اعظم میں کبھی صحیح طور پر عمل بھی کیا ہے۔

(۵) معمولی بات پر بڑا عذاب۔ بظاہر تو صحیح ہے۔ مگر حقیقتاً۔ آیہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ کے مدّعا سے دُور۔ علاوہ اس کے ایسی ہزاروں حدیثیں ابھی تک کتب حدیث میں موجود ہیں۔ اگر اس شرط پر حلم کے ساتھ عمل بھی ثابت ہے۔ تو پھر ایسی حدیثوں کی نقل و تحریر کا دروازہ ایک بارگیوں نہ مسدود کر دیا گیا۔

(۶) ذرا سی بات پر بڑے انعام کا وعدہ۔ اسکی بھی وہی مثال ہے۔ جو جآء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا کے نصاب رحمت اور ایثار قدرت کے مخالف اور سبقت غضب رحمتہ کے اصل مدّعا کے متناقص معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس شرط پر عمل ثابت ہے۔ تو پھر آجتک ان حدیثوں کا وجود کیوں باقی ہے۔

(۷) رکیک المعنی حدیثیں۔ مثلاً کدو کو بغیر ذبح کیئے نہ کھاؤ۔ اعتراض و امتناع سے پہلے۔ تو اُن رواۃ کی خوش فہمی۔ پھر اُن محدّثین کی جامعیت و قابلیت کی داد دینی چاہیئے جنھوں نے ایسے ایسے مہملات کو قول رسولؐ بتلا کر ذات رسالت پر اتہام کیا

(۸) جس روایت کا راوی۔ راوی اصل سے نہ ملا ہو۔ شرط صحیح ہے۔ مگر عمل ذرا بھی ثابت نہیں۔ تمام کتب

حدیث ایسی حدیثوں سے مملو ہیں۔ اور تو اور خاص صحیح بخاری ہیں۔ نزول لیلۃ القدر کے ذکر میں ہم تفصیل سے اس کی امثال نقل کر چکے ہیں۔ امام صاحب نے آنکھ بند کر کے عن ابن عنیۃ سے عنوان حدیث شروع کر دیا۔ پوچھیئے۔ تو کہاں آپ کا وقت۔ کہاں ابن عنیۃ کا زمانہ۔ پر لفظ عن کا فرمانا کیسا؟

(۹) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ کہ اگر وقوع میں آتا۔ تو سیکڑوں آدمی اُس کی روایت کرتے۔ یہ شرط تو حقیقت میں ابتدا ہی سے نظر انداز کر دی گئی۔ اور قطعاً ناقابل عمل سمجھی گئی۔ حدیث نحن معاشر الانبیا کا بیان کرنے والا اکیلا راوی ثابت ہوتا ہے۔ اور اُسی کی خبر احاد پر اتنا اعتماد کیا جاتا ہے۔ کہ اجماع قطعی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ اور اسی غرض و غایت سے شبلی صاحب نے خبر احاد کے قابل الاستناد ہونے کی توثیق ان الفاظ میں لکھی ہے۔ کہ

اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا۔ تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو۔ اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہو لیکن اُس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔ دیباچہ ص۔ ۱۷۔

اتنے ہی الفاظ تائیدی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ خبر احاد کے قابل الاستناد ہونے پر ایک خاص بحث کی گئی ہے۔ جس کو ہم عنقریب اپنے سلسلہ بیان میں نقل کریں گے۔

(۱۰) جو روایت ایسی ہو۔ کہ تمام لوگوں کو اُس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو۔ باایں ہمہ ایک راوی کے سوا۔ کسی اور نے اُس کی روایت نہ کی ہو۔

اس شرط صحت کی مخالفت بھی۔ حدیث نحن معاشر الانبیاء کے اشاعت اور اُس پر عملدرآمد اُمت سے کماحقہٗ ثابت ہے۔''

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ ان احکام کے اجرا و اعلان سے کیا کام نکلا۔ جب ان پر نفاذ عمل ہی ثابت نہیں ہوتا۔ تب تو ضرور یقین کیا جائیگا۔ کہ یہ شرائط محدثین نے اپنی واقف کاری فن اور گرم بازاری علم کی غرض خاص سے لکھدیئے تھے۔ کہ عوام اہل اسلام اُنکی شدت احتیاط اور کمال نقد کے قائل ہو کر مرعوب ہو جائیں اور انھیں بزرگوار ان اسلاف کی تقلید میں شبلی صاحب نے بھی اسی مدعا و منشا سے ان شرائط کو نقل فرمایا۔ کہ زمانہ کے محدود علم و تحقیق رکھنے والے افراد قوم و ملت عموماً اور جدید تعلیم مغربی کے ابجد خوان مسلمان طلبہ خصوصاً آپکی تحقیق و تنقید کی یہ طول وطویل تفصیل دیکھ کر حلقہ بگوش عقیدت بن جائیں۔

ایک غرض خاص آپ کی اور بھی اسکے ساتھ ملحق تھی۔ کہ ان حدود و قیود کو دیکھکر حدیثوں کی کتابوں کی طرف مرجوعہ عام ہو جائے گا۔ اور چونکہ کتب حدیث کی بنا اُصول عقائد پر ہے۔ اور عقائد ہی سے تعمیم۔ استخفاف۔ احداف اور اسقاط واقعات مخصوصہ کے اسناد ملیں گے۔ اس لیے اُن کے بیان و تفصیل کو اپنے

سفید مطلب پاکر اس شرح و بسط سے قلم بند کیا گیا۔

ہم نہیں کہتے۔ کہ یہ ترکیب۔ خاص شبلی صاحب کی ایجاد ہے۔ یا اُنکی طبعزاد۔ کیونکہ اُسکی ایجاد بھی آغاز خلافت ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ پھر حکومت امویہ سے گذرتی ہوئی سلطنت عباسیہ تک برابر قائم و جاری رہی، اور ابتک ہے۔ اُسوقت سلطنت کی تائید سے شدت و کثرت سے جاری تھی۔ اسوقت تعصب و نفسانیت سے برابر وہی قدیم لکیر پیٹی جارہی ہے۔ ارباب صحاح نے عموماً اور بخاری صاحب نے خصوصاً موافقت زمانہ کی وجہ سے اپنے قلمکار رنگ آمیزیوں کے مختلف رنگوں میں ان کو خوب خوب رنگا۔ اپنی تجویز و دعای مُدعا کے موافق حدیثوں پر کہیں اضافہ الفاظ و کلمات سے اُنکے اصلی رنگوں کو کبھی شوخ اور تیز کر دیا۔ اور کبھی احذاف۔ استخفاف اور اسقاط کی مصلحت و مناسبت اور ازالہ و اسقاط و کلمات بلکہ علے الاکثر سقط واقعات کلی سے۔ حدیث کے اصلی رنگ کو بالکل ہلکا اور پھیکا کر دیا ہے۔ بخاری کے اسقاط الفاظ وغیرہ کی مثال ہم علامہ ذوالنبین اندلسی کی تحریر سے اُوپر کر آئے ہیں۔

باین ہمہ مسئلہ زیر بحث کی تحقیق میں جیسا کہ ہم اُوپر بتلا آئے ہیں۔ خاتمہ بحث پر پھر اُسی کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ مرقومہ بالا دلائل و براہین سے پورے طور پر ثابت ہوگیا۔ کہ یہ حدود و شروط صحت حدیث کے نام نہادی قیود بن کر رہ گئے۔ اور اہل تحقیق کو۔ مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب کی تصدیق کا موقع دے گئے۔ چنانچہ شبلی صاحب نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ دیباچہ میں تو دنیا بھر کے معیار شرائط اور نصاب لکھدیئے۔ مگر اصل کتاب میں عمل ایک پر بھی نہیں کیا گیا جیسا کہ ہم ایک خاص نمبر میں آپکے اس انداز کو دکھلا آئے ہیں۔ اور آپ کی کتاب کے اصل مقامات پر اسکی حقیقت کا پورا انکشاف کر دیا گیا ہے

حدیث کی ایسی مرویات سیرت کی صحت کے معیار و نصاب

یہاں تک تو موضوعات ابن جوزی کے مقدمہ سے صحت حدیث کے نصاب و معیار تیار کیئے گئے۔ اب سیرت کی صحت کے لیے معیار خود ایجاد کئے گئے ہیں۔ کیونکہ انکے استنباط کا حوالہ اُسی طرح کہیں نہیں دیا گیا ہے۔ جیسا کہ صحت حدیث کے معیار کا حوالہ موضوعات ابن جوزی سے دیا گیا ہے۔ وہ معیار حسب ذیل قائم کئے گئے ہیں۔

(۱) کتب سیرت قابل تنقیح ہیں۔ اور اُن کے روایات و اسناد کی تنقید لازمی ہے۔

(۲) سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایت کو ہمیشہ ترجیح دیجائے گی۔

(۳) سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش ضروری ہے۔ دیباچہ ص ۶۱

سخت حیرت ہے کہ کیا سمجھا جاوے آیا یہ نصاب صحت سیرت تعین کیا جاوے۔ جیسا کہ دعوے اور وعدہ

فرمایا گیا ہے۔ یا آپ کا تحکمانہ فیصلہ سمجھا جاوے۔ جیسا کہ انداز تحریر سے ثابت ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جو شروط صحت حدیث کے اوپر لکھے گئے ہیں۔ گو وہ بلحاظ اصلیت جیسے بھی ہوں۔ اور ان پر عمل امت ہوا بھی ہو۔ مگر تاہم وہ اپنی تدوین تعیّن کے اعتبار سے شروط حدود با لشیٔ کی صورت ضرور رکھتے ہیں۔ اور اسی سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی عالم اور روا فقکار کے قائم اور مقرر کردہ ہیں اور یہ تنقیحات شبلی صاحب کی خاص طبعزاد ہیں۔ انکا موضوع عالمانہ ہے۔ اور انکا مقصود عامیانہ ہے اور خود غرضانہ چنانچہ ان کا انکشاف حقیقت سلسلہ وار حسب ذیل ہے۔

(۱) کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں۔ یہ تو بالکل یکطرفہ فیصلہ ہے۔ کیا حدیث کی کتابیں قابل تنقیح و تنقید نہیں۔ کیا اتنی موضوعات کی کتابیں لکھی جانے کے بعد بھی۔ شبلی صاحب اپنے اس اصرار پر قایم رہ سکینگے کہ کتب احادیث تنقیح و تنقید کی محتاج نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ تو اکیلی سیرت کی کتابوں کو قابل تنقیح و تنقید ٹھہرانا۔ اور حدیث کی کتابوں کو مستثنیٰ کر دینا کیسی زبردستی ہے۔

جب صحیح بخاری کی ایسی اصح الکتاب کی اکثر روایتوں کو سیرۃ النبیؐ میں خود آپ قابل نظر اور مشکوک الصحت ٹھہرا چکے ہیں۔ تو اور کتب احادیث کے ناقابل تنقید ہونے کا کیا ذکر۔ حقیقت یہ ہے۔ سیرت کی کتابیں اسی حد اور مقدار تک تنقید کے قابل ہیں۔ جس حد و مقدار تک حدیث کی کتابیں۔ مگر بات یہ ہے کہ دونوں اقسام کی کتابوں میں بعض کتابیں زیادہ تنقید کے قابل ہیں۔ اور بعض کم۔

(۲) سیرت کی روایتیں حدیثوں سے اعتبار میں فروتر ہیں۔ یہ تو گویا شبلی صاحب کا وظیفہ ہے۔ اور اس وظیفہ سے جو مراد ہے۔ وہ ہم عنقریب اپنے سلسلہ بیان میں بتلائے دیتے ہیں۔

ہاں اصول عقائد با مسلمات مذہبی کا بیان اگر کسی سیرت و تاریخ کے مضمون میں آگیا ہے۔ اور وہ کتب حدیث کی روایات معتبرہ کے مخالف ہے۔ تو ایسی حالت میں مرویات حدیث کو روایت سیرت پر ضرور ترجیح دی جائے گی۔ ورنہ واقعات و حالات کی عام تفصیل و بیان میں اگر سیرت و تاریخ کے مرویات اپنی شروط صحت پر کامل اتر چکی ہیں۔ تو گو وہ کسی حدیث قابل التنقید اور مشکوک الصحت سے مخالف بھی ہوں۔ قابل انکار نہیں۔

(۳) علت و معلول کی تلاش۔ علت و معلول کی بحث کو پیش کرنا محض بے ضرورت ہے۔ اس بنا پر کہ تمام علوم کے اقسام مضامین و مباحث۔ دلائل و براہین میں۔ یہاں تک کہ دو سطروں کے معمولی خطوط بھی اس کی ضرورت سے خالی نہیں۔ کون لایعقل ہوگا۔ جو کسی تحریر و مضمون کو پڑھے گا۔ اور اسکی علت و معلول کو نہ سمجھیگا۔ کون فاتر العقل اور ناقص الدماغ ہوگا جو بغیر علت و معلول کے اپنا کوئی مضمون تیار

کریگا۔ کیونکہ کوئی تحریر کوئی عبارت بغیر اسکے لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ افسوس ایسی عالمانہ اور محققانہ شان کی تصنیف و تالیف اور اُس میں ایسے عامیانہ دلائل و براہین پیش کیے جائیں۔ ہم پوچھتے ہیں۔ کہ تنہا سیر کی کتابوں میں علت و معلول کی تلاش کو کیوں منحصر اور محدود کیا جاتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں بھی اسکی جستجو کیوں نہیں کی جاتی جن میں علے الاکثر مثالیں ملتی ہیں۔ ہم امام بخاری کی صحیح سے اسقاط علت و معلول کی صرف ایک مثال ذیل میں لکھتے ہیں۔ اور وہی ہمارے مدّعا کی تصدیق کے لیئے کافی ہو گی۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس خواب کو ایک طولانی حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں آپ ایک گائے کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور اُسکے چند دنوں کے بعد حضرت حمزہؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ جو اُس کی تعبیر خیال کی گئی۔ اس واقعہ خواب کی تفصیلی عبارت اس فقرہ مہملہ پر تمام کی گئی ہے رائیت فیھا بقرا واللہ خیرا معنی یہ ہوئے میں نے ایک گائے کو دیکھا۔ اللہ خیر ہے۔ کہئے۔ اس عبارت سے واقعہ متعلقہ کی کہاں تک تفہیم و توضیح ہوتی ہے۔ بخاری صاحب نے بقرا کے ساتھ خیرا کا قافیہ تو ضرور ملا دیا۔ گر معنی تنگ کردئے اب کون پوچھے۔ کہ آپ کے تنہا۔ رائیت بقرا کے فقرہ مناقصہ کے لکھ دینے سے واقعہ کی پوری تفصیل اور شہادت حضرت حمزہؓ کے ساتھ اُس کی تطبیق کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔ اور پھر آپ کا واللہ خیرا۔ والا فقرہ مہملہ اور بیجا اُس پر مستزاد ہے۔

اب شبلی صاحب۔ اس فقرہ اور عبارت میں علت و معلول۔ مبتدا و خبر اور صلہ و موصول ٹٹول کر تلاش کریں۔ اور بخاری صاحب کے اس خبط و بے ربط فقرہ اور اُن کی ضبط تحریر کی داد دیں۔ اور اُن کی تنقید تنقیح ہم سے سنیں۔

جب شہادت حضرت حمزہؓ اسکی معلول ہوئی۔ تو اُس کی علت۔ آپ کا وہی فقرہ رائیت بقرا قرار پایا۔ اُس کی اصل واقعہ کی اصلیت جو علت کا عین معلول ہونا چاہیے۔ کہاں معلوم ہوئی۔ اور جب نہیں معلوم ہوئی۔ تو علت بے معلول کے بیکار ہوئی۔ اور اُسی کے ساتھ وہ عبارت بھی محض مہمل ثابت ہوئی جس میں علت کو معلول کے ساتھ نہ کوئی مناسبت ہے۔ اور نہ علت اپنے معلول کی حقیقت کو تبلاتی ہے۔

یہی کیفیت واللہ خیرا والے فقرہ کی ہے۔ جب واقعہ کی خبر یا معلول اپنی حقیقت کے ساتھ معلوم ہو جائے۔ تب فقرہ واللہ خیراً کی تطبیق اور مناسبت کا تصفیہ کیا جائے۔ رائیت بقراً۔ ایک گائے کو دیکھکر حلیم رسالت کی زبان صداقت سے واللہ خیراً کا فقرہ نکلنا کسی طرح اعتبار و یقین نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ خواب میں اُس نظر آنے والی گائے کی کوئی خاص کیفیت باعث استعجاب یا استبشار نہیں دکھلائی جائیگی۔ اور علاوہ بریں باتفاق جمہور جس واقعہ کی طرف استخواب کا روحانی تعلق تبلایا جاتا ہے۔ اُس کی وضاحت و صراحت بھی اس فقرہ سے نہیں ہوتی۔ تو پھر۔

واللہ خیر کے فقرے کی تطبیق کیسے کی جائے۔ اور سوائے اس کے کہ یہ عبارت کی عبارت اور نیچے بخاری کے دونوں فقرے قطعاً نامربوط سمجھے جائیں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

بڑی کوشش کے بعد ابن حجر نے اس کلیہ مہملہ کو موضوع بنانا چاہا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ بھی ناقص رہا۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں مفی روایۃ ابن اسحاق دانی رایت واللہ خیرا بقترا روایت ابن اسحاق میں یوں ہے کہ میں نے (خواب میں) دیکھا ہے۔ خدا خیر کرے ایک گائے کو۔ اول تو اس سے معلوم ہوا۔ کہ بخاری صاحب حدیث کے اصلی الفاظ کو ادھر کا اُدھر کر دیا کرتے تھے۔ اور حدیثوں کو اُلٹ پلٹ کر جمع کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اصل واقعہ کی حقیقت کا انکشاف تو حافظ صاحب کی اس عبارت معکوس سے بھی نہیں ہوا۔ اور کلام وبیان میں ابہام ویسا کا ویسا ہی رہ گیا۔ اور معلوم ہوا۔ تو صرف اتنا کہ آداب خواب یہ ہے۔ کہ جب آدمی خواب بیان کرے تو کہے خدا خیر کرے۔ چنانچہ اس ارشاد پر آج تک تمام مسلمانوں کا عمل ہے۔ بلکہ خواب پر منحصر نہیں۔ وہ ایک ہر ارادہ قصد اور فعل کے اظہار کے وقت اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ اور یہ کلمہ بسم اللہ۔ انشاء اللہ وغیرہا کا مترادف قرار پا گیا ہے۔ اور بعض لوگوں کی خصوصیات کلام میں داخل ہو کر سخن تکیہ اور تابع مہمل کا حکم رکھتا ہے۔

لیکن ابن حجر کے اس نظریہ سے بھی معلول کہیں نظر نہیں آتا جسکی تلاش شبلی صاحب کو مدنظر ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ بخاری نے ایسی خبط وبے ربط عبارت لکھکر مدعائے حدیث کو بالکل غارت کر دیا ہے۔ بخلاف اسکے انکے ہمچشم محدثین نے اس حدیث کو پوری حقیقت ومعانی کے ساتھ قلمبند فرمایا ہے۔ عبارت ذیل میں ملاحظہ ہو

وعند احمد والنسائی وابن سعد من حدیث جابر بسند صحیح فی ھذا الحدیث ورایت بقرا منحرۃ ۔ فتح الباری ص ۵۰	امام احمد۔ امام نسائی۔ اور ابن سعد بسند صحیح جابر سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حضرت صلعم نے دیکھا۔ خواب میں گائے یا بیل کو ذبح کیا ہوا۔

مندرجہ بالا محدثین کی احادیث میں سب کچھ موجود ہے۔ شبلی صاحب کا مقصود۔ علت ومعلول بھی واقعہ کی حقیقت حال بھی۔ اور پھر اُسکے واقعہ آئندہ کے ساتھ تطبیق اور کامل مناسبت اور مشابہت بھی۔

اب ہماری موجودہ بحث سے ثابت ہو گیا۔ کہ جب بخاری کی ایسی حدیث کی اصح الکتب۔ اپنی عبارت کی نقل میں علت ومعلول کی شرط نہیں رکھتی۔ اور اس عیب ونقص سے ہرگز خالی نہیں۔ تو اس سے پایہ اعتبار میں فروتر حدیثوں کی کتابوں میں یہ نقص وعیب کس حد اور مقدار تک پایا جائے گا۔

شبلی صاحب نے بڑی کاوش سے اہل سیرت کی صحت مرویات کے لیے یہ تین نصاب قایم کیے جن کو دیکھکر ہر شخص آسانی سے سمجھ لیگا۔ کہ یہ شرائط نہ نصاب میں داخل کیے جانے کے قابل ہیں۔ اور نہ حقیقی شرائط نصاب کے معنی ومفہوم میں آسکتے ہیں۔ یہ شبلی صاحب کی خاص ایجاد ہے۔ یہ تینوں شرائط یا ہدایت وسیطح حدیثوں

میں پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں۔ جس طرح نقل روایات سیرت میں۔ پھر اس قدر مشترک کو ایک ضعف خاص کے ساتھ شرط ستفرد قرار دیا گیا یعنی۔

شبلی صاحب کے انداز تحریر کی نئی نئی ترکیبیں۔

اب ہم شبلی صاحب کی شان اور انداز تحریر کی ایک نئی ترکیب کا انکشاف کرتے ہیں۔ آپ نے تحقیق روایات سیرت کے متعلق جو نصاب مقرر فرمائے۔ ان میں علت و معلول کی شرط کو اپنی حیلۂ قلمی کے ساتھ ایک معقولی بحث کے انداز میں لکھا ہے۔ جس کو ایک معمولی عقل اور سطحی علم و اطلاع والے افراد قوم سیرت کے واقعات کو عقل کے خلاف سمجھیں۔ اور ایک اشکال منطقی کی صورت میں اسکے نقص فی المرویات کو تسلیم کریں۔

افسوس کتابوں کی تالیف و تصنیف علما اور حکمائے خاص ملاحظہ کے لیے نہیں کی جاتی۔ بلکہ عوام کے مطالعہ اور استفادہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے۔ دیکھیے شبلی صاحب نے اسی نقص سیرت کو پہلے تو اس انداز سے اوپر تحریر فرمایا ہے۔ جسے سوائے علما کے دوسرے لوگ مشکل سے آپ کے مدعائے تحریر تک پہنچ سکیں پھر اسی نقص کو ایک دوسرے مقام پر ایک نئی ترکیب اور نئے انداز سے ظاہر فرماتے ہیں۔ آپ کے ان دونوں مختلف انداز تحریر کو پڑھکر تحقیق کے متلاشی پورے طور سے سمجھ جائیں گے۔ کہ پہلے مقام میں آپ نے تو اپنے مدعا کو اپنی قلمکاری اور ہوشیاری سے اشکال منطقی اور محال عقلی کا پردہ ڈالکر چھپایا۔ کیونکہ وہاں آپ کو اس ترکیب سے طبقہ عام کی صرف مرعوبیت منظور تھی۔ اور یہاں اپنے اسی مدعا کو اصلی حقیقت سے بیان کرنے کی آپ کو اسوجہ سے مجبوری ہوئی ہے۔ کہ یہاں مخالفین اسلام کی لکھی ہوئی سیرتوں سے اسلامی سیرتوں کا موازنہ کرنا ہے۔

مگر افسوس کہ آپ کو اب بھی سیرتوں کا ورد نہ آیا۔ اور مخالفین کے اعتراضوں کا باعث حدیثوں کی جگہ سیرتوں کو بتلایا ؎ کارم افتاد است از یارے کہ از عیاری: برمن بیچارہ بندد گناہ خویش را۔

اس ضرورت مجبوری سے آپ نے اپنے مرقومہ بالا اعتراض کے الفاظ مدعا کو مفصلہ ذیل عبارت میں ایک دوسری ترکیب اور نئے انداز سے بیان فرمایا۔

دیباچہ سیرۃ النبی صفحہ ۴۲ نمبر ۵ میں مرقوم ہے۔

ارباب سیر اسباب و علل سے اکثر واقعات میں بحث نہیں کرتے۔ نہ ان کی تحقیق و تلاش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں گرچہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے۔ اور ایک یوروپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے۔ اور نہایت دور از قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتا ہے۔ اس میں بہت کچھ اسکی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ اور اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے۔ تمام واقعات اسی کے گرد و پیش گھوما

کرتے رہتے ہیں۔ بخلاف ان کے اسلامی مورخ نہایت سچائی، انصاف اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے انکو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ وہ اُسپر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی نثار کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں (سیرت میں) حد سے زائد تفریط ہوگئی۔ اس بات سے بچنے کے لیے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہونے پائیں۔ وہ پاس پاس کے اسباب ظاہری پر نظر نہیں ڈالتا۔ اور واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے فلاں وقت میں فلاں قبیلہ پر فوجیں بھیجیں۔ لیکن انکے اسباب کا مطلق ذکر نہیں کرتے۔ جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور اُن کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی وجہ اور سبب کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے۔ کہ وہ کافر ہیں۔ اس سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں۔ کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں۔ وہ پہلے سے آمادہ جنگ تھیں۔ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکی تھیں۔

اب خدا خدا کرکے آپ کی علّت و معلول کا مسئلہ جسکی تلاش کی بڑی تاکید فرمائی گئی تھی۔ روشنی میں آیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ صرف عیسائی معترضین سے آپ کی مرعوبیت اُسکی علّت و غایت تھی۔ اسلام بالصمصام کے محض مغویانہ اعتراض نے آپکو حد سے زیادہ دہلا دیا ہے۔ ہم آپ کو تسکین و یقین کامل دلاتے ہیں۔ کہ وہ اپنی اس تعریض میں قیامت تک کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے اوّل تو بیوجہ و سبب کسی پر ہاتھ اُٹھایا نہیں۔ اسکا کوئی حملہ کوئی جنگ کوئی غزوہ صورت مدافعانہ چھوڑ کر مخالفانہ طریقہ سے واقع ہوا ہی نہیں۔ اگر ہماری اتنی صفائی پر بھی ہمارے مخالفین کو اپنی مغویانہ ضد پر اصرار رہے گا۔ تو پھر ہمکو کہنا پڑے گا۔ کہ اسلام کے جہاد کو بھی وہی ضرورتیں پیش نظر تھیں۔ اور اُنکے لیے بھی داعی اسلام اور مبلغ شریعت کے پاس وہی عذرات تھے۔ جو موسیٰ داؤد اور سلیمان علی نبینا و آلہ و علیہم السّلام کو اپنے زمانہ کے جہادوں کیلئے اپنی دعوت و تبلیغ کیلئے وقت واقع ہوئے تھے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی اسلام بالصمصام کے جواب اعتراض کے متعلق آپ کو اتنی ابتدا سے حفظ ماتقدم کے سامان فراہم کرنیکی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ مگر خیریت ہے کہ آپنے یہ چند الفاظ لکھکر کہ اس بات سے بچنے کیلئے کہ یہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہوجائیں۔ اور یہ کہ وہ (ارباب سیر و تاریخ) پاس پاس کے ظاہری اسباب پر نظر نہیں رکھتے۔ اہل سیرت کی طرف سے ان کے اسباب وقوع نہ لکھنے کی وجہ و تفصیل بھی قلم بند کر دی ہے اس لیے مجھکو زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن میرے نزدیک شبلی صاحب کی اس تحریر میں۔ اتنا اضافہ اور ضروری ہے۔ کہ اہل سیرت جسقدر حالات و واقعات کی شرح و بیان کے ذمہ وار ہیں۔ اُسقدر اسباب و علل کے نہیں۔ اس بنا پر ان اقسام کی فروگذاشت اگر کسی واقعہ میں اُن سے ہو جائے۔ تو قابل اعتراض نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ آئمہ سیرت نے۔ جہاں تک ان اقسام کی کتابوں پر میری نظر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں بہت کم ایسی فروگذاشتیں کی ہیں۔ مگر تاہم سیرت کی تمام کتابیں

ان سے خالی نہیں بتلائی جاسکتیں۔ مگر اب یہ اتنی بھی نہیں۔ اور ایسی بھی نہیں ہیں۔ کہ ان کو عیسائیوں کے مفتریانہ اعتراض اسلام بالسیف کا اصلی باعث سمجھا جاوے یہ شبلی صاحب کا مرعوبانہ خیال اور مجنونانہ قیاس ہے۔ اہل سیرت سے زیادہ اہل حدیث اسکے جوابدہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ غزوات کے حالات و واقعات میں اکثر عالمان و راویان حدیث نے اغارہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جسکو سنکر معترضین کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اعتراض کا حیلہ پاجاتے ہیں۔ زرقانی تذکرہ غزوہ ذی قرد میں ابن حجر کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔ یحتمل فی طریق الجمع ان تکون اغارۃ عیینہ علی اللقاح اور دوسرے مقام پر کان راس الذین اغاروا عبد الرحمان ابن عیینہ۔ زرقانی ص ۱۷۱

حدیثوں کی کتابوں میں غارہ اور اغاروا کے الفاظ دیکھ کر عیسائی مورخین پر۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ کہ وہ اس کے اصلی اور ابتدائی معنیوں تک پہونچتے نہیں۔ لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں۔ کہ ان الفاظ کے ماسوا حضرات محدثین کی غیر مفید مرویات کی نقل و تحریر نے بھی مخالفین اسلام کو مختلف قسم کے اعتراض کا پورا موقع دیدیا ہے۔ اور انھیں حدیثوں کا اثر بعض بعض تاریخ و سیرت پر بھی پڑا ہے مگر ہم اُن کی تفصیل کو یہاں بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ اسوۃ الرسول میں اپنے اصلی مقامات پر بیان کی جائینگی۔

حدیث و سیرت کے جداگانہ ماخذ ہیں۔

سیرت کی عدم صحت پر شبلی صاحب کے یہ اعتراض جیسے بیجا تھے۔ اُنکی حقیقت دکھلادی گئی یہ سب آپ کا طومار ہے۔ جو آپنے اپنے مجدد اور محقق عصر مشہور کرنے کی غرض خاص سے لکھکر آپنے دیباچہ اور عنوان کی زینت قرار دی ہے۔ اور ان تمام خامہ فرسائی کا ماحصل یہ ہے۔ جیسا کہ ہم اُوپر لکھ کر بتلائے ہیں۔ کہ صحت بیان حدیث و سیرت کی کیا تمام اقسام علوم و فنون کی جان ہے۔ اور ہر علم و فن میں اس کا لحاظ و خیال لازم ہے۔ اگر صحت کا انتظام و التزام نہیں ہے۔ تو نہ حدیث ہی کی مرویات قابل استناد ہیں۔ اور نہ سیرت ہی کے واقعات لائق اعتماد۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ چونکہ علم حدیث سے علم سیرت ایک جداگانہ علم خاص ہے۔ اسلئے دونوں کے معیار صحت بھی جدا ہیں۔ علم حدیث کی صحت کا تمام دار و مدار علم رجال پر ہے۔ اور حقیقتاً اس علم کی ایجاد کا افتخار اہل عرب کا ایسا تنہا اور خاص استحقاق ہے۔ جس میں تمام اقطاع عالم کے اقوام و قبائل۔ عام اس سے کہ قابلیت و جاہلیت میں اہل عرب سے پہلے ہوں یا پیچھے۔ کوئی حصہ نہیں پاسکتے۔ حقیقت میں سرزمین عرب ہی سے یہ کمال پیدا ہوا۔ وہیں اس نے نشوونما پائی۔ اور وہیں سے اس نے تمام دنیا کو اپنے فیوض پہونچاکر مالامال کردیا۔

اتنا لکھ کر ہم پھر اپنے سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ یہاں تک بیان ہوچکا ہے۔ کہ حدیثوں کی صحت رجال تک محدود ہے۔ اور رجال حدیث خاص طور پر صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے طبقات تک بالکل محدود ہیں

اور باعتبار تعلقات باہمانہ کے یہ طریقہ صحت صحیح اور قریب الواقع ہے۔ اس لیئے کہ کتب حدیث عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد۔ اقوال واحکام کی مجموعہ میں اس بنا پر اُن اقوال کے حصول و دستیابی کا ذریعہ پہلے وہی حضرات ہونگے۔ جو آنحضرت صلعم کی ملازمت اور مجالست کا شرف حاصل کر چکے ہونگے ان کے بعد دوسرے نمبر میں وہ لوگ بھی لیئے جائینگے۔ جن لوگوں نے اصحاب وانصار سے آنحضرتؐ کے احکام واقوال سُنے۔ یہی حضرات طبقات علم الرجال میں تابعین کے نام سے مشہور رہوئے۔ تیسرے نمبر میں وہ لوگ آتے ہیں جنہوں نے تابعین سے حدیثوں کو سُنکر نقل کیا۔ یہ تبع تابعین کہلائے۔

یہی رجال حدیث ہیں۔ اور حدیث کی صحت بالکل انہیں حضرات کی صداقت و دیانت ذاتی پر موقوف ہے۔ علم سیرت کے واقعات بھی اگرچہ کسی شخص خاص ہی کے حالات و واقعات ہوتے ہیں۔ اس لیئے یہ کہنا بالکل صحیح اور فی الواقع ہوگا۔ کہ سیرت کی صحت رجال کی صحت کی محتاج ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ سیرت کے رجال۔ حدیث کے رجال کے ایسے اُصول عقائد کی بنا پر۔ کسی خاص قوم خاص فرقہ اور خاص مذہب تک محدود نہیں ہیں۔ حدیث کے رجال۔ صحابہ۔ تابعین۔ اور تبع تابعین تک آکر تمام ہو جاتے ہیں۔ اور کیونکر نہوں؟ اس لیئے کہ حدیث میں مذہبی احکام وارشاد کے نصاب کی تفصیل و تشریح اصلاً ہوتی ہے۔ اور اس بنا پر ضرور ہے۔ کہ اُسکے رجال ورواۃ ونقلین وماہرین مذہب ہی ہو سکتے ہیں دوسرے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ حدیثوں میں بعض بعض نظام سیاسی اور اصلاح مُلکی وقومی کے احکام وحالات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب مذہب کے ماتحت اور ضمنی احکام میں۔ تاریخ وسیرت کے معیار تک نہیں پہونچتے علم سیرت اپنے رجال کو ان حضرت تک محدود نہیں رکھتا۔ اور کیوں رکھتے؟ وہ واقعات مُلکی اور حالات قومی لکھتا ہے۔ احکام مذہب لکھنا اُسکا کام نہیں۔ پھر مذہبی حضرات کا وہ کیوں محتاج ہونے لگا۔ واقعات مُلکی ہوں۔ یا قومی۔ کسی پوری قوم کے حالات ہوں۔ یا اُس قوم کے کسی شخص واحد کے واقعات۔ وہ اُس مُلک وقوم کے ہر آدمی کو۔ عام اُس سے کہ وہ مذہبی خیال واطلاع کا آدمی ہو یا نہ ہو۔ ضرور معلوم ہونگے۔ ہاں۔ مذہبی احکام آئین اور نصاب کو البتہ وہی شخص بتلائے گا۔ جو مذہب سے واقف کار ہوگا۔ اسی بنا پر اہل سیرت و تاریخ نے اپنے رجال تحقیق کو مذہبی شخص واقف کار ہونے کے حدود خاص سے محدود نہیں کیا۔ اور اپنے دائرہ تحقیقات اور حصول واقعات کو اتنا وسیع کیا۔ کہ اپنے مُلک وقوم کے حالات وواقعات بھی۔ اگر اُن کو معتبر اور صحیح ذریعہ سے غیر ملک غیر قوم اور غیر مذہب والوں سے بھی ملے۔ تو بلا تامل اُنہوں نے اپنی تالیفات و تصنیفات میں نقل کر لیئے ہاں۔ نقل کرتے وقت اُن کو احتیاط صحت پر ضرور نظر رکھنی ہوتی ہے۔ اور یہ یقین کر لینا ہوتا ہے۔ کہ وہ بیان کنندہ سچا ہے۔ اور قابل اعتبار اور اُسکا

بیان کردہ واقعہ اصلیت۔ مناسب اور فن سیرت و تاریخ کے مقرر کردہ معیار صحت کے مطابق ہوتا ہے

سیرت سے خاص سیرت اسلامی یا سیرۃ النبی سمجھنا غلطی ہے

اب ان تمام شبہات و مغالطات کا جو اصلی باعث ہے۔ اور جکی وجہ سے اکثر لوگوں کو بہت سے مقامات پر حدیث و سیرت کو جنس متحد اور قسم واحد کا ہونیکا شبہہ ہوجاتا ہے۔ اور بعض مقامات پر علم سیرت کو علم حدیث سے مستخرج و مستنبط ہونے کا دھوکا ہوجاتا ہے اور اکثر موقعوں پر سیرت کو حدیث کا متبع یا روایات سیرت کو مرویات حدیث سے فروتر سمجھنے کی جو غلطی واقع ہوتی ہے۔ اُن سب کا اصلی باعث یہ غلط فہمی ہے۔ کہ سیرت اسلامی یا سیرت النبی کی تدوین و تالیف تک علم سیرت کے وسیع دائرے کو محدود سمجھا جاتا ہے اور اس صنف خاص کی ایجاد و وضع تدوین و تالیف کے زمانہ اور ایام کو علم اسماء الرجال کی طرح ظہور اسلام کے وقت سے قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ صریح غلطی ہے۔ جو محض نظر و تحقیق کی کمی کے باعث عارض ہوئی ہے۔

ہم اُوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں کہ علم سیرت میں حیث العلم۔ عام اس سے کہ اہل عرب میں اسکا رواج اسکا مذاق جب نہ پیدا ہوا ہو۔ نہایت قدیم ہے۔ دیگر ممالک و اقوام میں اسکا رواج اور مذاق تاریخ عرب سے صدیوں پیشتر پایا جاتا ہے۔ اسکی ابتداء کا زمانہ بتحقیق توریت و انجیل کے درمیان ثابت ہوتا ہے کیونکہ سب سے قدیم کتاب سیرت کے موضوع پر یوسیفوس یہودی کی ہے۔ جس نے ولادت حضرت عیسیٰؑ سے تین سو برس پہلے لکھی ہے۔ اس بناء پر قدامت سیرت کا مسئلہ مسلمہ عالم ہے۔ پھر اس مسلمہ کے خلاف اُسکے بعد کے علوم و فنون کو اُس سے قدیم سمجھنا دلیل بے عقلی ہے۔

اسی قدامت کی بناء پر۔ جیسا کہ ہم تفریق حدیث و سیرت کے متعلق اوپر بتلا آئے ہیں۔ کہ اگر کسی غیر مسلم عرب کے حالات اسوقت لکھے جائیں۔ تو اُن میں حدیثوں کے استنباط کہاں تک مدد دے سکیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ بغیر استنباط احادیث کے اُس غیر مسلم اہل عرب کے تمام حالات تیار و مرتب ہوجا سکتے ہیں۔ تو کیا یہ تالیف اُس شخص کی سیرت نہ کہلائے گی۔ اور کیا اس کتاب پر توجہ اعتنا نہ کی جائیگی۔ اور کیا وہ ذرایع جو رجال حدیث سے نہیں فراہم کیے گئے ہیں۔ قابل اعتماد نہ سمجھے جائیں گے۔ اگر نہیں ہونگے۔ تو بتلایا جاوے کہ ایک یہود عرب اور نصارائے عراق کی سیرت لکھنے کی کیا صورت ہوگی۔

عرب کی قدیم سیرتیں اور تاریخیں دیکھئے۔ اُن کے موضوع اور نظام تالیف کو ملاحظہ کیجئے۔ حالانکہ یہ سب ظہور اسلام سے صدیوں بعد کی تصنیفات اور کوئی دوسری کوئی تیسری اور کوئی چوتھی صدی ہجرت کی تالیفیں ہیں۔ مگر سب میں عنوان بیان کم سے کم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے آغاز کیا گیا ہے۔ طبری ابن سعد۔ اور ابو الفداء۔ اور ابن اثیر۔ و اکثر اشاعہم نے تو جناب آدمؑ سے ابتداء کی ہے۔ اب غور کیجئے۔ کہ

اسلام سے اتنے پہلے کے حالات جمع کرنے میں۔ انہوں نے اسلامی حدیثوں سے کہاں تک استنباط و استخراج کیا ہوگا۔ اور جب حدیثوں سے ان حالات کا استنباط نہیں کیا گیا۔ تو ضرور ہے کہ غیر قوم وملک کے لوگوں سے جو موجود تھے۔ یا جنکے کلام واقوال اُنکی قدیم کتابوں میں محفوظ تھے۔ یہ واقعات وحالات سنے گئے۔ یا لکھے گئے۔ استماع حالات تو اتنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ موجودہ اسلامی سیرتوں کی تالیفات کے وقت غیر اقوام ومذاہب کے لوگ عرب میں بہت کم باقی رہے تھے۔ مگر ہاں نقل وتحریر کے کام کثرت سے ہوئے لطف تو یہ ہے۔ کہ وہ حدیثیں انبیائے سابقین اور اقوام قدیم۔ قبل اسلام کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر اُنھیں اور ایسے ہی۔ لوگوں سے ہیں۔

ان شاہدات مندرجہ بالا کے مقابلہ میں۔ اگر ان رواۃ غیر اسلامی یا غیر رجال حدیث سے نہ کام لیا جاتا۔ تو عرب کی تاریخ کا سلسلہ ہی نہ قایم ہوتا۔ اسلیئے سیرت وتاریخ کے اُن رواۃ ورجال کی صحت پر اتفاق جمہور ہوا۔ اور سیرت وتاریخ کے تمام بیانات قبل اسلام ویسے ہی معتبر اور قابل استناد واندراج سمجھے گئے اور آجتک یقین کیئے جاتے ہیں۔ جیسے حدیثوں کی مرویات۔

اسلام کے علمی زمانے میں حدیث وسیرت کی باہم تخلیط۔

اب رہا سیرۃ النبیؐ۔ سیرۃ الائمہ۔ سیرۃ صحابہ۔ اور دیگر اسلامی ممیزین کی سیرتیں جن کے تمام واقعات وحالات ہیں علی الترتیب المدارج مذہبی عناصر خاص طور پر شامل ہیں۔ اور ان میں سے زیادہ سیرۃ النبیؐ کی تدوین وتالیف میں۔ مگر اُن کے بھی ابواب وفصول میں مثلاً ہدایت اُمّت تعلیم وتلقین دین۔ احکام نصاب فقہیہ وغیرہ وغیرہ کے بیان وتفصیل میں کتاب حدیث سے تفحص وتجسس۔ لازمی اور ضروری ہے کیونکہ ان مضامین کے استخراج واستنباط کیلئے ان سے بہتر اور معتبر ماخذ ہو نہیں سکتے۔ نہ اس کی صلاحیت سیرت میں ہے۔ نہ اسکی جامعیت تاریخ میں۔

باقی رہے غزوات۔ نظام ملکی وسیاسی۔ اصلاح ورفاہ قومی۔ انتظام فوجی ومالی۔ مکارم اخلاق اور حسن معاشرت وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام حالات وواقعات کے معتبر ترین ماخذ سیرت کی کتابیں ہیں۔ اس لیئے کہ یہی اُمور اُن کے خاص موضوع میں اور اُنھیں کے خاص موضوع پر وہ مرتب کی گئی ہیں شبلی صاحب سیرت کی ان خصوصیات کو سارے دیباچہ میں اس عبارت والفاظ میں لکھ کر قبول فرماچکے ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں آنحضرتؐ کے حالات اور اخلاق وعادات کے متعلق کثرت سے واقعات پائے جاتے ہیں۔ جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ تاہم اُنسے تنہا ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہوسکتی۔ اسکے علاوہ اُن میں تاریخی ترتیب بھی نہیں۔

مرویات سیرت وتاریخ اسی طرح حدیث میں داخل ہوگئیں۔ جو زیادہ تر ان دونوں فنون کے باہمی تعلقات اور قربت پر مبنی ہیں۔ اسی بنا پر فن سیرت نے عالم اسلام میں ایک نئی اور علیحدہ صورت اختیار کرلی ہے۔ اور وہ یہ ہے

کہ رجال سیرت بھی قریب قریب وہی ہیں۔ جو رجال حدیث ہیں۔ اسلیئے ایک محدث نے کسی شرعیہ اور نصاب فقہیہ کے بیان کرنیکے ساتھ۔ اُنکے اسباب نزول جائے نزول، وقت نزول اور اُن تمام تعلقات وفوائد کو بھی جمع کر دیا ہے۔ جو اس علم شرعیہ کے متعلق ایک ایسے راوی نے اُس سے بیان کیا تھا جو رجال حدیث و سیرت دونوں میں مشترک تھا۔

اسی طرح تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بھی (مگر احادیث سے کم) کسی واقعہ کی تفصیل و بیان میں بھی حدیثوں سے استخراج و استدلال کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیئے تاریخ و سیرت بھی احادیث کے اقتباسات و استنباطات سے خالی نہیں رہی ہیں۔ اسکا بھی وہی سبب ہے۔ راوی حدیث و سیرت۔ دونوں کا رجال مشترک تھا۔ زیادہ تحقیق کی جاتی ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اسلام کے زمانہ تصنیفات و تالیفات میں۔ رجال و رواۃ پر منحصر نہیں۔ دونوں اصناف فنون کے مصنفین علم سیرت کے بھی ویسے ہی ماہر تھے۔ جیسے حدیث تفسیر اور فقہ کے عالم متبحر۔ اہل سیرت و تاریخ امام حدیث و تفسیر بھی اور امام حدیث و تفسیر۔ صاحب سیرت و تاریخ بھی تھے۔ چنانچہ شبلی صاحب بھی اس مسلہ کو تسلیم کرکے اکثر مقامات پر لکھتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اعتراف اُنکے خاص الفاظ کے ساتھ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

ابن ہشام۔ نہایت ثقہ اور نامور مورخ و محدث تھے۔ دیباچہ ص ۱۷۔

طبری۔ اس درجے کے شخص ہیں۔ کہ تمام محدثین انکے فضل و کمال اور تفقہ اور وسعت علم کے معترف ہیں۔ ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے۔ محدث ابن خزیمہ کا قول ہے۔ کہ دنیا میں کسی کو میں اُن سے بڑھکر نہیں جانتا ص ۱۹۔

شعبی۔ مشہور محدث ہیں۔ اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے۔ فن مغازی اور سیر میں انکو اسدرجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے تھے کہ گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا۔ مگر یہ (شعبی) مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔ ص ۲۰۔

عبداللہ ابن جعفر ابن عبدالرحمان مخزومی۔ حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبوی کے اکابر علما میں تھے ابن سعد نے اُن کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ومن رجال المدینۃ عالما بالمغازی (رجال مدینہ میں علمائے مغازی کے رکن تھے) ص ۲۱

ولید ابن مسلم القرشی شام کے مشہور محدث نہایت قوی الحافظہ تھے۔ شام میں ان کے زمانے میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔ تاریخ اور مغازی پر وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا۔ ص ۲۲۔

عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری۔ ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے۔ مزاج میں کسی قدر تشیع تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد (تشیع کا مترادف۔ معاذ اللہ) بھی ہو جائے۔ تب بھی ہم اُن سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے۔

محمد ابن عیسیٰ ترمذی۔ مشہور محدث ہیں۔ جنکی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ سیرت نبوی میں انکا خاص رسالہ ہے۔ جسکا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے۔

ابوبکر احمد ابن خثیمہ البغدادی حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد تھے۔ اور تاریخ وسیر کے جلیل القدر عالم تھے۔ تاریخ کبیر انھیں کی تصنیف ہے۔ ص ۲۵۔

انھیں رواۃ رجال کی باہم تخلیط، اور ان کے بیانات کی افراط و تفریط نے۔ اسلام کی علمی دنیا میں سیرت کے تمام انداز و صورت کو بدل دیا ہے۔ اور حدیث تفسیر۔ مغازی اور فقہ کی روایات اور بیانات میں تاریخ و سیرت کے واقعات مل جل گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بیان اور جمع کرنیوالے دونوں فنون کے جامع تھے۔ اس باہمی تخلیط اور اسپر ایک مدت تک نقل و تحریر کے عملدرآمد نے انکے امتیاز کو دشوار کر دیا ہے۔

مگر باین ہمہ۔ واقفکاران فن۔ انکے امتیاز و شناخت سے بے بہرہ نہیں۔ وہ حدیث کو حدیث کی جا پر۔ تفسیر کو تفسیر کے مقام پر۔ سیرت کو سیرت کی جگہ پر۔ اور تاریخ کو تاریخ کے موقع پر پوری تحقیق کے ساتھ جانچ اور پہچان کر کام میں لاتے ہیں۔ اور انکے استفادات و اقتباسات کو انکے جائز اور مناسب مقامات پر مستعمل کرتے ہیں۔ جو امور واقعی حدیثوں سے قابل استخراج ہیں۔ کتب حدیث سے لیے جاتے ہیں جو تفسیر سے قابل اندراج ہیں۔ وہ کتب تفسیر سے۔ جنکا تعلق سیرت سے ہے۔ وہ سیرت سے لیے جاتے ہیں۔ اور جو تاریخ سے استنباط کی ضرورت رکھتے ہیں۔ وہ کتب تاریخ سے مستنبط کئے جاتے ہیں۔

یہ شبلی صاحب کی خاص خود غرضانہ مختار و رائے ہے۔ کہ آپ صرف حدیث کے استفادات و اقتباسات کو دیگر کتب کے استخراجات و استنباطات کے مقابلہ میں کافی سمجھتے ہیں۔ اور اسی غرض و مقصود خاص سے کتب حدیث کو بلا دلیل و حجت تمام دوسری کتابوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ آپ کی تنقید و تضعیف کی نظر سیرت پر ہے۔ جسکو آپ اکثر اسماء الرجال کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ آپ ہر مقام پر بلا خیال مناسبت۔ سیرت کو حدیث کے مقابلہ میں بے اعتبار اور ناقابل استناد ٹھہراتے ہیں۔ اور بلا قید و شروط ہر واقعہ و حال میں انکی بیان و اعتبار میں حدیثوں سے فروتر قرار دیتے ہیں۔ جس کی تنقید و تردید ہمارے مندرجہ بالا استدلال میں کماحقہ ہوگئی۔ اب آگے اس غلط مختار کی صحیح توجیہ بھی ملاحظہ ہو۔

ترجیح حدیث کی توجیہ اور شبلی صاحب کے مدعا کی تائید

ہم اس طولانی بحث و استدلال کو۔ ترجیح حدیث اور اس سے شبلی صاحب کے غرض و مدعا کی توجیہ اور کامل توضیح کے بیان پر تمام کرتے ہیں۔ شبلی صاحب نے تمام دیباچہ میں انواع و اقسام کی قلمکاریوں اور عجیب و غریب عبارت آرائیوں سے اس بحث کو لکھا ہے۔ اور اپنی لفظی شان و شوکت سے عوام الناس کو مرعوب کرنے کی حتے المقدور کوشش کی ہے۔ اب ایک شخص کا حقیقی فرض یہ ہے۔ کہ وہ آپ کی اس علت کے اندرونی اور بیرونی اسباب و معلول اصلی کو تلاش کرے۔ اور بتلائے۔ کہ بالآخر آپ کی اتنی سعی و کوشش۔ اور کد و کاوش کی کوئی وجہ اور سبب بھی محقق ہوتا ہے۔

تحقیق سے ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ اسماء الرجال اور سیرت و تاریخ کی کتابوں سے آپکے خاطر خواہ مطلب نہیں نکلتے۔ اور اُن کے مضامین۔ تفاصیل اور بیانات سے آپکے اُن مدعائے تالیف کی ضرورت پوری نہیں ہوتی جنکی بنا پر اپنی سیرت موجودہ کا موضوع آپ نے قرار دیا ہے۔ اور قائم کیا ہے۔ بلکہ سیرت و تاریخ سے آپ کے بہت سے مدعا کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے۔ بخلاف کتب سیرت و تاریخ وغیرہ کے کتب احادیث سے عموماً۔ اور صحیحین شریفین سے خصوصاً قریب قریب آپ کے تمام مطالب و مقاصد تالیفی پورے ہو جاتے تھے۔ تمام سعی و کوشش اور کد و کاوش صرف اسی لئے تھی۔

اگرچہ اسوۃ الرسولؐ کی عبارت نے سیرت النبیؐ کے ہر ایسے غلط واقعہ کی اپنے مقام پر۔ پوری تحقیق سے تنقید و تردید کر دی ہے۔ جو ہمارے سلسلہ بیان سے علی الترتیب اور بالتدریج معلوم ہو جائے گی۔ مگر تاہم ذیل میں چند مثالیں لکھکر ہم اپنے تمہیدی مضمون کی تکمیل و تائید کیے دیتے ہیں۔

تنقیص و کسر شان رسالت۔ عام اہل مکہ کی اجرت پر بکریاں چرانا۔ خاصکر بخاری اور ابن ماجہ کے شیخ کی خاص مرویات ہیں۔ سیرت و تاریخ میں اُسکی تفصیل نہیں۔ ابن سعد کے طبقات میں اُسکی نقیض روایت موجود ہے۔ احکام و مختار رسالت کا صحابہ کی رائے دشوار کا ہمیشہ تتبع ہونا خصوصیات محدثین سے ہے۔ اسلامی مورخ اور اہل سیرت اسکا بہت کم ذکر کرتے ہیں۔ اور اس پر استدلال نہیں کرتے۔ اُنکی کتابوں میں جہاں کہیں ان باتوں کا ضمنی ذکر آبھی گیا ہے۔ وہ مورخ ہونے کے ساتھ اُنکے محدث ہونے کا اثر ہے شرف صحابیت کے سنگ بنیاد رکھنے کی غرض خاص سے۔ آئمہ حدیث نے صحابہ کی وہ وہ خدمات اور انواع و اقسام کے حالات لکھے ہیں۔ جو سیرت و تاریخ کے مندرجات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر کا خدمت رسالت میں اونٹ نذر کرنا یا کم قیمت (بقول شبلی صاحب) پر دینا۔ یا حضرت ابوبکر کو گھر سے بُلا کر اپنے ہمراہ لینا احادیث کے خاص استفادات ہیں۔ محدثین کے زیر اثر آئی ہوئی سیریں اور تاریخیں اول ان واقعات کو استدلالاً لکھتی بھی نہیں۔ مگر لکھتی بھی ہیں۔ تو ویسے ہی معتبر حدیثوں سے اُسکی نقیض۔ اور خلاف روایتیں بھی قلمبند کر دیتی ہیں۔ جس سے صاف ثابت ہو تا ہے کہ اہل سیرت کا نہ ایسی حدیثوں پر اعتبار ہے نہ اُنپر اُنکا انحصار۔ حضرت عائشہ کی افضلیت اور محبوبیت حضرات محدثین کا شغف خاص ہے۔ بحقیق شبلی صاحب کی بھی جلد دوم ایسے ایسے شرمناک واقعات سے بھری پڑی ہے جن سے معاشرت رسولؐ پر بدنما الزام آتا ہے۔ اور مخالفین اسلام کو حملات اور کافرانہ تعریض کے پورے موقع ملتے ہیں۔ سیرتیں۔ تاریخیں۔ عموماً انکا کہیں ذکر بھی نہیں کرتیں۔ ریحانہ کا واقعہ جس دریدہ دہنی سے بخاری نے کیا ہے۔ کیا کسی سیرت و تاریخ نے بھی اسکو لکھا ہے؟

نفس رسالت کے متعلق مثلاً ہم اتنے ہی انکشاف حقیقت کو کافی سمجھتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں بنی ہاشم۔ اور اہلبیت علیہم السلام کے متعلق عموماً۔ اور حضرت علی مرتضےٰ نفس رسولؐ علیہ السلام کی نسبت۔ استخفاف احذاف اسقاط و واقعات کی مثالیں ذیل میں لکھتے ہیں۔

مسئلہ تعمیم کی بناؤ تمہید آپ نے دیباچہ اور آغاز کتاب ہی سے خاص کر اسی لیے شروع کر دی ہے۔ کہ بنی ہاشم کی تمام موروثی عظمت اور حریت اور خاندانی سطوت و وجاہت مکہ اور عرب کے قبائل و اقوام کے ساتھ مخلوط ہو کر عام ہو جائے۔ اسی غرض و مدعا سے آپ نے ممتازین بنی ہاشم کے حالات و واقعات کو تنہا مختصر کر کے دو تین سطروں سے زیادہ میں نہ لکھا۔ حالانکہ سیرت و تاریخ میں ان حضرت متقدمین بنی ہاشم کے ملکی اور قومی خدمات کے کارنامے نہایت شرح و بسط سے مرقوم ہیں۔ مگر آپ نے انکو قابل اندراج نہ سمجھا۔ صرف محدثین کے مختصرات سے کام لیا۔ جو قدیم الایام سے آپکے ہمخیال اور ہم مذاق تھے۔

ان ممتازین بنی ہاشم کے خدمات کے ساتھ اُنکے خصوصیات اور فضائل و مناقب کے اظہار و اعلان کو بھی قطعاً مرفوع القلم فرما دیا۔ اس بنا پر کہ آئمہ حدیث نے انکو بیان نہیں کیا۔ مگر بعض محدثین نے حدیثوں کی تالیف کے بعد جب تاریخوں کی تدوین کی۔ تو قصی کے وقت سے ہاشم مرحوم کے عہد تک ہر بزرگ کے تمام خطبات اور منافرات ایک ایک کر کے نقل و قلمبند کئے ہیں۔ جن میں ان حضرات نے تمام قبائل و اقوام حجاز کے مجمع اور جلسہ میں اپنے حقیقی اور اصلی خطاب اہل بیت اور سید القریش سے مخاطب ہونے کے اظہار و اعلان فرمائے ہیں۔

حضرت علی مرتضیٰ اور اہل بیت رسولؐ علیہم السلام کی خصوصیات اور خدمات کے متعلق جسقدر اسقاط اور استخفاف سے امکان و مقدار کے مطابق سیرۃ النبیؐ کی دونوں جلدوں میں پورا کام لیا گیا ہے مثلاً سبقت اسلام کے مسئلہ کا تصفیہ "محض محدثین صحاح کے جانبدارانہ اور غیر اجماعی فیصلہ سے کیا گیا ہے۔ سیرت اور تاریخ کی تمام کتابیں اسکے خلاف فیصلہ سناتی ہیں۔ لطف تو یہ ہے۔ کہ محدثین کی ایک کثیر جماعت بھی اُنکے ہم آواز ہے۔ حضرت علیؑ کے غزواتی خدمات۔ بدر۔ اُحد۔ خندق۔ خیبر فتح مکہ حنین۔ اور طائف اور اسی طرح آپ کے تمام تبلیغی خدمات جو عرب کے مختلف اقوام و قبائل کے ہدایت پانے اور اسلام لانے کے متعلق کتب احادیث میں (ابتدا ہی سے) نہایت مختصر اور چند الفاظ میں مندرج کئے گئے۔ سیرت و تاریخ اُنکے تفصیلی دفتر ہیں۔ واقعہ غدیر خم کا صحاح میں ذکر نہیں ہے۔ سیرت و تاریخ میں پورا واقعہ تمام حقیقت اور اصلیت کے ساتھ مفصل طور پر مرقوم ہے۔ حضرت علیؑ کی شراب خواری (معاذ اللہ) کا واقعہ کسی سیرت اور تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ مگر سنن ابوداؤد میں جو آپ کے صحاح کے نمبر چھ میں شمار ہوتی ہے اور آپ

اُسی کی سند منفرد اور روایت احاد سے اس اپنی تحقیق جدید کا اعلان کرتے ہیں۔ مذکور و مسطور ہے۔ ان مثالوں سے ثابت ہوگیا۔ کہ ان واقعات و حالات کے اسقاط و استخفاف کے ماخذ وہی کتب احادیث تھیں۔ اور اُنھیں سے شبلی صاحب کا مدعا حاصل ہوتا تھا۔ بخلاف انکے۔ سیرت اور تاریخ کی کتابیں۔ ان کے مخازن نہیں تھیں۔ اسلیے سیرت النبیؐ میں ان واقعات کی تفصیل تمام تر حدیثوں کی کتابوں سے کی گئی اور اسی غرض و ضرورت سے ہر مقام پر ہر ممکن و ناممکن طریقہ سے حدیث کی ترجیح تاریخ و سیرت پر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ مرویات حدیث کی یہاں تک تائید فرمائی گئی۔ کہ اُن کی روایات احاد بھی بالکل صحیح طریقہ سے قابل الاستناد بتلائی گئی۔ چنانچہ دیباچہ سیرۃ النبیؐ ص ۱۷ میں مرقوم ہے۔

اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا۔ تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو۔ اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو۔ لیکن اس کی روایت قبول کرلیجائے گی۔ (حدیث نحن معاشر الانبیا کی تمہید ہے) دیباچہ ص ۱۷۔

روایت احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔ ص ۶۱۔

روایت احاد وہ ہے۔ جسکے سلسلہ اسناد میں۔ کہیں ایک راوی پر مدار روایت ہو۔ یعنی کوئی دوسرا راوی اسکا موید نہ ہو اس قسم کی تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے۔ معتزلہ روایات احاد کی تسلیم سے قطعی منکر ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ انکار ہدایت ہے ص ۵۹۔

شبلی صاحب کا محض غلط دعوے اور اُسکی تنقیح و تنقید۔

(۳۴) اصحاب حدیث کی مدح سرائی کے سلسلہ میں شبلی صاحب نے ایک ایسا غلط دعوے کیا ہے۔ جسکو اصلیت اور رواقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپنے اپنے اس بے اصل دعوے کا وجود پایا ہوگا۔ تو اُنھیں حدیث کی غیر مقید اور مصنوعات اور موضوعات سے۔ ورنہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں۔ تو آپ کے اس دعوے کے بالکل مخالف اور معارض مشاہد پائے جاتے ہیں۔ دیباچہ ص ۹۴ میں شبلی صاحب رقمطراز ہیں۔

فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اسپر فخر کا موقع حاصل رہے گا۔ کہ اُنکا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنو اُمیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے نوّے برس تک۔ سندھ سے ایشیائے کوچک تک مساجد جامع میں آل فاطمہؓ کی توہین کی۔ اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا۔ (کہلوائی) سیکڑوں ہزاروں حدیثوں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانے میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا عین اُسی زمانے میں (غلط ہے ایک صدی بعد) محدثین نے علانیہ منادی کرادی۔ کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔ آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے۔ (مگر تاہم عقائد نسفی۔ مرقاۃ ملا علی قاری۔ اور تاریخ الخلفاء سیوطی میں خلفاء بنی اُمیہ۔ از معاو

تا و لید۔ سب کے سب آئمہ اثنا عشر کی فہرست اور رسول اللہ کے وصی برحق کے مقدس طبقہ میں داخل ہیں۔ اور بنو امیہ بنی عباس۔ (عباسیہ) جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے۔ اسی مقام پر نظر آتے ہیں۔ جہاں انکو ہونا چاہیئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا۔ کہ امیر المومنین۔ اگر تو آنحضرت صلعم کے انتقال کے وقت ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ ہوتا۔ دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا۔ تو جھوٹ کہتا ہے۔ امیر المومنین کا باپ (حضرت عباس جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا۔ اسکو کس نے پوچھا۔ مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔ دیباچہ ص ۹۴۔

ایک محقق اصلی کا شکست جواب افسوس ہے۔ کہ شبلی صاحب کو مامون الرشید کا یہ واقعہ تو یاد رہا۔ مگر اسکے باپ ہارون الرشید کے منہ پر اور خصوصاً ایام حج میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے سامنے ایک حقیقی محق خلافت اور حق گوئی حقیقت کا یہ مقولہ کہ انا امام القلوب وانت امام الجسوم (صواعق محرقہ) ہم قلوب کے امام ہیں۔ اور تم جسوم کے امام ہو۔ (یعنی ہم اصلی امام ہیں اور تم جعلی) نہ یاد آیا۔ پورا واقعہ ابن حجر کی صواعق محرقہ میں ملاحظہ ہو۔

پھر دوسرے موقع پر۔ مامون کے باپ نے مدینہ منورہ میں زیارت رسول صلعم پڑھتے وقت یوں خطاب کیا السلام علیک یا رسول اللہ یابن عم۔ سلام ہو تم پر اے رسول۔ اے میرے ابن عم۔ تو رسول اللہ کے اسی حقدار اصلی اور قرابت دار حقیقی نے فوراً زیارت رسول صلعم ان الفاظ میں پڑھی۔ السلام علیک یا ابت اے میرے پدر بزرگوار آپ پر میرا سلام ہو۔ ابن خلکان اسکے بعد کا یہ عالم دکھلاتے ہیں فتغیر وجہ ھارون الرشید ہارون الرشید کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ حقیقت کا روحانی اثر ہے۔

مامون ہوں۔ یا حضرت عباس۔ دونوں باعتبار استحقاق حقیقی کے بیکار تھے۔ پھر اس شاعر دربار کے مبالغہ کا۔ یا اسکے معترض کی اس غلط تعریض کا تردیدی جواب کیسے دے سکتے تھے۔ کیونکہ نہ حقیقت اس شاعر کے بیان میں تھی۔ اور نہ اس معترض کی تعریض میں۔ لیکن یہاں۔ مامون کے باپ ہارون کا اصلی محق سے سامنا تھا اور مقابلہ۔ اسکی حق گوئی اور اظہار حقیقت نے ہارون کے منہ کا رنگ اڑا دیا۔ وہ اصلی محق۔ فرزند مخبر صادق حضرت امام موسیٰ الکاظم علیہ و آبائہ السلام تھے

مگر اب یہ دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ مامون نے اس معترض کی بے ادبانہ تعریض کی بقول شبلی صاحب تحسین و آفرین کی۔ مگر اس کے باپ ہارون نے اس صاف گو کی راست گوئی کا کیا صلہ دیا۔ ابن خلکان لکھتے ہیں فحملہ معہ الی البغداد فحبسہ بھا ہارون اس کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ بغداد لے گیا۔ اور وہاں جا کر قید کر دیا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون وفیات الاعیان ابن خلکان میں بذیل تذکرہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پورا واقعہ ملاحظہ ہو۔

حقیقت میں شبلی صاحب نے بیکار اس تنقیح کا نمبر قایم کیا ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں بے فائدہ اُن مضامین کا ذکر کیا ہے۔ جو اُنکے اغراض و مطالب کی توضیح و تنقیح کہاں تک کریں گے۔ اُلٹے اُنھیں کی تردید و تکذیب ثابت کرتے ہیں۔ شبلی صاحب نے چونکہ اس تنقیح میں مختلف مضامین سے اپنے مدعا کی تائید کرنی چاہی ہے اس لیے کہ ہم اُن کے ہر بیان دعوی کی علیحدہ علیحدہ ذیل میں تنقید کرتے ہیں۔

(الف) پہلا دعوی یہ ہے۔ کہ فن تاریخ و روایت میں جو خارجی اسباب اثر پیدا کرتے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا اور قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اسکا فخر حاصل رہے گا۔ کہ اُنکا قلم تلوار سے نہیں دبا۔

یہ دعوے بالکل غلط ہے۔ اور قطعاً خلاف واقع۔ مشاہدات و واقعات اسکے خلاف و نقیض بتلاتے ہیں۔ عنوان عبارت ہی سے شبلی صاحب نے اپنی قلمکاریوں کا فتح الباب فرمایا ہے۔ اور تنہا فن تاریخ و روایت ہی میں اسباب خارجی کے اثر کرنے کے متعلق سب سے بڑا قوی اثر حکومت کے اثر کو ٹھیرایا ہے۔ اور حدیث کا نام نہیں لیا ہے۔ اس لئے کہ عموماً حدیثیں اس کے اثر سے محفوظ سمجھی جائیں۔ اگر آپ کو اخفائے حقیقت شروع ہی سے مدنظر نہیں تھی۔ تو آپ نے خوش نیتی اور پوری کشادہ دلی سے فن تاریخ و روایت کی جگہ صاف صاف لفظوں میں فن تاریخ و حدیث کیوں نہ لکھدیا۔ کہ آپکا موجودہ دعوی واقعیت سے کسی قدر قریب ہوجاتا۔ مگر ہر بحث میں آپکا پہلا مدعا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص آپ کی نادیدہ قابلیت سے خواہ مخواہ مرعوب ہوجائے۔ اور آپکے تمام بے اصل استدلال و اقوال کو آمنا و صدقنا کہکر قبول کرے۔ حالانکہ آگے چلکر آپ ہی اپنے دست و قلم سے روایت کی جگہ صاف صاف حدیثوں کی خرابی کو لکھکر ان الفاظ میں دکھلانے لگے۔

حدیثوں کی تدوین بنی اُمیہ کے زمانے سے ہوئی۔ سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلفاء کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔

کیا اب بھی روایت کی حدیث اور حدیث کی روایت ہونے میں کوئی شبہ رہ گیا۔ پھر شروع ہی میں روایت لکھنا اور حدیث کو چھپانا کس کام کا ثابت ہوا۔ اور کیا فائدہ پہنچا سکا۔

مسلمانوں کو...... اُنکا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ اس کے متعلق خود آپ کے اعتراف۔ اصل روئداد اور حقیقت حال کو بالکل مخالف اور معارض ثابت کررہے ہیں۔ دیباچہ صفحہ ۱۲ میں ایک علیحدہ عنوان اس عبارت کے ساتھ قایم کیا گیا ہے۔ کہ تصنیف و تالیف کی ابتدا ر سلطنت کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے بعد مفصل ذیل عبارت حوالہ قلم فرمائی گئی ہے۔

صحابہ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی۔ بہت سے درس کے حلقے قایم ہوئے۔ لیکن جو کچھ تھا وہ زبانی تھا۔ لیکن بنو اُمیہ نے علما سے تصنیفیں لکھوائیں۔ قاضی عبد البر نے

جامع بیان العلم میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھٰؤلاء الامراء۔ ہم لوگ علم کا قلم بند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر امراء نے ہمکو مجبور کیا۔

اُنھیں امام زہری کی نسبت دیباچہ ص ۱۵ میں تحریر کیا گیا ہے۔

امام زہری اس زمانے کے اعلم العلماء تھے۔ اور حدیث و فقہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں۔

آپ کے مندرجۂ بالا دعوے کو آپ کے ان خاص تحریری اقراروں کی عبارت سے ملایا جاوے تو صرف اسی موازنہ سے آپ کے دعوے کی بے اصلی اور بے سروپائی ثابت ہو جاتی ہے۔ ان کھلے کھلے لفظوں میں آپ اقرار فرماتے ہیں۔ کہ حدیث کی تدوین بنی اُمیہ کے زمانہ ہی میں ہوئی۔ جنہوں نے سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ اور یہ وضعی حدیثوں کی مشین بنی اُمیہ کے زمانے سے لیکر بنی عباسیوں کے وقت تک کام کرتی رہی۔ اور اس کارخانے میں بڑے بڑے کاریگر۔ مشہور و معروف صناع و وضاع شب و روز کام کیا کرتے تھے۔ امام زہری حدیث و فقہ کے اعلم العلماء بخاری کے شیخ الشیوخ۔ موجد حدیث کا قول آپ خود نقل کر چکے ہیں۔ کہ ہم تو علوم کا قلم بند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ امراء نے ہمیں مجبور کیا۔ اور اس قول زہری کے قبل آپ خود معترفاً لکھ چکے ہیں۔ کہ بنو اُمیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں کرائیں۔ تو اب اتنے متواتر اقرار و اعتراف کے بعد کیسے کوئی سمجھ سکتا ہے۔ کہ صرف تاریخ ہی پر حکومت کا اثر پہونچا۔ اور حدیثیں اس سے محفوظ رہیں حالانکہ آپ کے اقرار اور امام زہری کے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ کہ سب سے پہلے احادیث ہی میں یہ مصنوعات و موضوعات داخل ہوئے۔

اگرچہ تحقیق سے ان مصنوعات و موضوعات کا زمانہ وفات رسول صلعم کے بعد ہی سے شروع ہو گیا اور نحن معاشر الانبیاء سیف من سیف اللہ۔ ہٰذہ امین الامۃ۔ وغیر امثالہا۔ کثیر التعداد احادیث دار الاشاعت خلافت سے تیار ہو گئیں۔ مگر بمصداق آنکہ۔ نزلہ بر ضعیف می ریزد۔ آپ ان مصنوعات کا زمانہ حکومت بنی اُمیہ کو قرار دیتے ہیں۔ اور اُنھیں کو ان موضوعات کا اصلی واضع تبلاتے ہیں۔ تو خیر ہم آپ ہی کے مختار کو تسلیم کیے لیتے ہیں۔ زمانہ بنی اُمیہ ہی میں علمائے حدیث کے اتباع حکومت اور اطاعت سلطنت کی چند مثالیں آپ ہی کے اعترافات سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

زہری اور تعلقات شاہی امام زہری کی نسبت آپ لکھتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے۔ کہ امام موصوف (زہری) سلاطین کے دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مقربین خاص میں

داخل تھے۔ ہشام ابن عبد الملک نے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی۔
اس عبارت سے ثابت ہوگیا۔ کہ امام زہری اعلم العلماء حدیث و فقہ کے بے نظیر عالم امام بخاری کے شیخ الشیوخ سلطنت کے درباری تھے۔ سلاطین کے مقرب خاص۔ سلطان وقت کے بچوں کی تعلیم دینے پر نوکر بھی تھے۔ کیا اتنے تعلقات۔ مصاحبت۔ مرافقت۔ اور ملازمت کے ثبوت اعترافی کے بعد بھی کوئی صحیح العقل آدمی کہہ سکتا ہے۔ کہ اُن کا قلم سلطنت کی تلوار سے نہیں بنا۔

دیگر علماء اور تعلقات شاہی امام زہری کی حالت تو معلوم ہوئی۔ اب آپ کی تحریر سے دیگر علما و محدثین کے حالات ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ بذیل ذکر حکومت عبد الملک ابن مروان مرقوم ہے۔
امیر معاویہ کے بعد عبد الملک ابن مروان ۶۵ ہجری میں تخت نشین ہوا۔ ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں۔ سعید ابن جبیرؒ (صحابی) جو عالم العلماء تھے۔ اُن کو حکم بھیجا۔ کہ قرآن کی تفسیر لکھیں۔ چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھکر بھیجی۔ جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی۔ عطاء ابن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے۔ وہ انہیں کی تفسیر ہے عطا کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آگیا۔ اور اُنہوں نے اپنے نام سے مشہور کیا۔ (بحوالہ میزان الاعتدال ذہبی)

حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کا زمانہ آیا۔ تو اُنھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں یہ حکم بھیجدیا۔ کہ احادیث نبوی مدون اور قلم بند کی جاوے۔ سعد ابن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ کے قاضی تھے۔ اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے۔ علامہ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں۔ عن سعد ابن ابراھیم قال امرنا عمر ابن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له علیھا سلطان دفترا سعد ابن ابراہیم کہتے ہیں۔ کہ ہم کو عمر ابن عبد العزیزؒ نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ تو ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ عمرؒ نے جہاں جہاں اُس کی حکومت تھی۔ ایک ایک دفتر بھیجا۔

ابو بکر بن محمد بن عمر بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور مدینہ کے قاضی تھے اور امام زہری کے اُستاد۔ اُن کو بھی خاص طور پر احادیث جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ (بحوالہ طبقات ابن سعد)

حدیث حضرت عائشہؓ کی مرویات میں ایک خاص حیثیت ہے۔ یعنی اُن سے اکثر وہ روایتیں مروی ہیں۔ جو فقہ و عقائد کے مہمات مسائل ہیں۔ اس لیے عمر ابن عبد العزیزؒ نے اُن کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ (اعتنا کی) عمرۃ بنت عبد الرحمٰن ایک خاتون تھیں۔ انکو حضرت عائشہؓ نے اپنی آغوش تربیت میں پالا تھا وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں۔ تمام علما کا اتفاق ہے۔ کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ عمر ابن عبد العزیزؒ نے ابو بکر بن محمد کو خط لکھا۔ کہ عمرۃ کے مسائل و روایات قلم بند کر کے بھیجدیں۔
(بحوالہ التہذیب ج ۲)

عاصم ابن عمر بن قتادۃ الانصاری۔ المتوفی ۱۲۱ھ کو حکم بھیجا۔ کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھکر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں (دیباچہ سیرۃ النبی از صفحہ ۱۴ تا صفحہ ۱۵)

آپ کے خاص تحریر کردہ الفاظ صاف صاف بتلا رہے ہیں۔ کہ اتنے اکابرین دین اتنے اولین علماء ومحدثین نے انھیں سلاطین وضعین احادیث یعنی خلفائے بنی اُمیہ کے حکم وخواہش کے مطابق اس کثرت سے مرویات حدیث۔ سیرت۔ اور مغازی کی تالیف وتدوین فرمائی۔ جس سے حسب الاقرار سعد ابن ابراہیم۔ دفتر کے دفتر تیار ہو کر تمام ممالک اسلام میں ذائع وشائع کئے گئے۔ اور بقول آپکے ولید ابن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث وروایات کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا۔ تو صرف امام زہری کی مرویات وتالیفات گھوڑے اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔

(بحوالہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔ دیباچہ ص ۱۱)

جب شبلی صاحب کو خود معلوم ہے۔ کہ اتنی کثرت سے احادیث ومرویات۔ وضعین بنی اُمیہ کے خاص زمانہ میں اور اُن کے خاص حکم سے بن چکی تھیں۔ تب آپ نے پھر یہ کیسے لکھنے کی جرأت کی۔ کہ علماء حدیث پر سلطنت کے خارجی اسباب کا اثر نہیں پڑا۔ یا اُن کا قلم سلطنت کی تلوار سے نہیں دبا۔

اب یہ سوال تنقیح طلب ہے۔ کہ جب شبلی صاحب کے مرقومہ بالا اتنے ثبوت وشہود سے ثابت ہو گیا۔ کہ اس کثرت سے حدیثیں بنائی گئیں۔ اور پھر اس قدرت وندرت کے ساتھ کہ (دورہ عباسیہ میں) ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں تیار کرائی گئیں۔ تو وہ حدیث بنانے والے زیادہ تر قابل الزام ثابت ہوتے ہیں۔ یا حدیث بنوانے والے" جواب بالکل آسان اور صاف ہے۔ وہی حدیث بنانے والے۔ جنہوں نے احکام رسول کو رضائے سلاطین کے مقابلے میں وقف وقربان کر دیا۔

دوسرا سوال تصفیہ طلب یہ ہے۔ کہ اُن علماء ومحدثین نے یہ فعل بدیع کیوں کیا۔ جواب وہی ہے۔ کہ محض سلطنت کے دباؤ اور لگاؤ سے۔ جن کی عمریں سلطنت کی ملازمت اور وظیفہ خواری میں کٹیں جس کو خود معترفانہ طریقہ سے لکھا بھی جاتا ہے۔ اور پھر بڑی دلیری سے یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ اُنکا قلم سلطنت کی تلوار سے نہیں دبا۔ تو یہ۔ کیسا غلط دعوئے ثابت ہوا۔ تلوار سلطنت سے اُن کے قلم کا نہ دبنا کہاں تک ثابت ہوگا۔ واقعات اور صورت حال تو بتلا رہی ہے۔ کہ اُن کے قلم تو ہمیشہ تلوار سلطنت بنتے رہے ہے۔

اولین سلیمن اور سلاطین کی غلامی کا اقرار

شبلی صاحب۔ محدثین کے قلم کو بگڑے ہیں۔ اُنکا قلم کیا چیز ہے یہاں تو صحابہ اولین اور بڑے بڑے انصار ومہاجرین مدینہ کا ایمان سلطنت کے شکنجے اور سلاطین ؏

امراء حکومت کے پنجہ میں ایسا دبایا گیا۔ کہ آخر سب کو کتاب و سنت کے عمل کو ترک کرکے سلطنت کی صاف صاف غلامی کا اقرار کرنا پڑتا۔ مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

فسار مسلم فی عشرۃ الاف فارس من اھل الشام حتے نزل المدینۃ من جھۃ الحرۃ (الی ان قال) فقتلوا فقتل الفضل بن عباس وقتل جماعۃ من الاشراف و الانصار ودام قتالھم حتے انھزم اھل المدینۃ واباح مسلم مدینۃ النبی ثلاثۃ ایام یقتلون فیھا الناس ویاخذون ما بھا من الاموال ویفسقون بالنساء قال الزھری ان قتلی الحرۃ کانوا سبع مائۃ وجوہ الناس من القریش والمھاجرین والانصار وعشرۃ الاف من وجوہ الموالی وممن لا یعرف ثم ان مسلماً بایع من بقی من الناس علی انھم خول وعبید لیزید ابن معویہ۔	مسلم نے (ابن عقبہ بحکم یزید) دسہزار سواروں کی جماعت براہ حرّہ مدینہ میں پہونچکر ہنگامۂ قتال برپا کیا۔ اس جنگ میں فضل ابن عباس مارے گئے۔ اور ایک بڑی اشراف و انصار مدینہ کی قتل ہوئی۔ بالآخر مدینہ والوں نے شکست پائی۔ اور مسلم ابن عقبہ نے تین دن تک قتل عام کرکے لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا اور عورتوں کے ساتھ حرامکاری کو حلال کر دیا۔ زہری کا قول ہے۔ کہ سات سو مہاجرین و انصار اور دسہزار عوام الناس اہل مدینہ قتل ہوئے۔ اور جو بچگئے اُنہوں نے مجبور ہوکر یزید ابن معاویہ کی غلامی اختیار کر لی۔

غلامی یزید کے خاص الفاظ اقرار محدث دہلوی شاہ عبد الحق صاحب یہ بتلاتے ہیں۔

ومردم را بہ بیعت یزید پلید بر عہد عبودیت مجبور ساختند کہ اگر یزید بخواہد بفروشد واگر خواہد آزاد کند وخواہ بطاعت خدا خواند خواہ بہ معصیت خدا	یعنی یزید پلید کی غلامی کی بیعت اس شرط سے لی گئی۔ کہ یزید چاہے۔ اُن کو بیچ ڈالے چاہے آزاد کر دے۔ چاہے اُن سے خدا کی اطاعت کرائے چاہے اُن کو خدا کی نافرمانی کا حکم کرے۔ (جذب القلوب الی دیار المحبوب)

اس فتوے کے مفتی حضرت عبد اللہ ابن عمر صحابی ہیں

اب اس بیعت و غلامی یزید کے جواز بلکہ اس کے وجوب کے۔ فتویٰ دینے والے کون مفتی صاحب ہیں۔ اور اُن کی شان و عظمت کیا ہے؟ تحقیق سے باتفاق جمہور ثابت ہوتا ہے کہ یہ۔ نور دیدہ خلافت اور رہین پور سلطنت۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر صحابی ہیں۔ جو صحابہ کبار ہونے کے علاوہ۔ اسلام کے اوّل محدث۔ اور سب سے پہلے حدیث رسول صلعم کی من حیث الکتاب تدوین و تجمیع کرنیوالے۔ آپ کی اس صحیح یاسند کا نام صادقہ تھا۔ جس کا ذکر شبلی صاحب نے بھی دیباچہ ص ۵ میں فرمایا ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر نے جس اہتمام اور حسن انتظام سے اپنے اس فتوے کا اعلان فرمایا ہے۔ اُس کی صورت اعلان صحیح بخاری کے مفصلہ ذیل الفاظ و عبارت سے ظاہر و ثابت ہے

عن نافع قال لما اخلع اھل المدینۃ یزید ابن معاویۃ جمع ابن عمر حشمہ وولدہ فقال انی سمعت النبی صلعم یقول ینصب لکل غادر لواء یوم القیامۃ وانا قد بایعنا ھذا الرجل (یزید) علی بیع اللہ و رسولہ وانی لا اعلم غدرًا اعظم من ان یبایع رجل علی بیع اللہ و رسولہ ثم ینصب لہ القتال وانی احد امنکم خلعہ ولا تابع فی ھذا الامر ان کانت الفیصل البنی وبینہ۔

نافع سے منقول ہے۔ کہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت سے علیحدگی اختیار کی۔ تو عبداللہ ابن عمر نے اپنی اولاد اور متوسلوں کو جمع کرکے یہ اسپیچ دی۔ کہ ایہا النّاس میں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے۔ کہ ہر عذر کرنیوالے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائیگا۔ اور جبکہ تمام لوگ یزید کی بیعت کر چکے ہیں۔ تو میری رائے میں اس سے بڑھ کر اور غداری کیا ہوسکتی ہے کہ بیعت کرنیکے بعد یزید سے لڑائی ٹھانیں۔ پس تم میں سے جو شخص میری اس رائے کے خلاف کریگا۔ میں اُس سے جدائی اختیار کرونگا۔

حدیث بخاری کے الفاظ سے روئداد حال جب یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ حضرت عبداللہ ابن عمر سا صحابی کبار اور محدث وفقیہ ذی اعتبار سلطنت کے دباؤ یا لگاؤ سے خالی نہ چھوٹا۔ تو عام محدثین وفقہا کا ذکر ہی بیکار ہے۔ ابن عمر میں دونوں اوصاف جمع تھے۔ صحابیت کی عظمت بھی۔ اور خلیفہ زادگی کے اعزاز بھی۔ مگر افسوس کہ ان بزرگ نے حکومت کے اقتدار کے سامنے نہ اپنے ذاتی اعزاز و وقار کی کوئی قدر کی۔ نہ اُن فدایان قوم وملت کے جانی اور مالی ایثار کی۔ اور محض بنی اُمیّہ کی تلوار کے خوف سے ایسا مرعوبانہ فتویٰ شایع فرمایا۔ جس کے مہلک اثر نے بالآخر باقی ماندہ صحابہ۔ مہاجرین و انصار مدینہ کو یزید کا غلام بنایا۔

عبداللہ ابن عمر کا غلط اجتہاد | اب حضرت عبداللہ ابن عمر کی اس بیان کردہ حدیث رسولؐ اور حقیقت خلافت یزید کو اجماع مہاجر و انصار کے مختار کے ساتھ ملاکر غور کیا جاوے۔ تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر فی الواقع یہ قولِ رسولؐ تھا۔ اور عبداللہ ابن عمر نے اُسکو آنحضرتؐ سے سُنا تھا۔ تو پھر اُن باغیان مدینہ۔ سرکشانِ کوفہ اور غداران مصر کے سامنے اس حدیث کا کیوں اعلان نہ فرمایا۔ جنہوں نے حضرت عثمان سے خالی خلع بیعت ہی نہیں کیا۔ بلکہ اُن کو قتل بھی کر ڈالا۔ ابن عمر اُسوقت مدینہ ہی میں تھے۔ اور باغیان عراق ومصر بھی مدینہ ہی میں پڑاؤ ڈالے تھے۔ کئی روزوں تک ہفتوں تک حضرت عثمان اور جماعت باغیان میں خلع خلافت کے لیئے سوال وجواب اور ردّ وکدیش رہی۔ مگر ابن عمر صاحب نے ایک دن بھی گھر سے باہر نکل کر باغیان کوفہ ومصر اور اہالیان مدینہ کو یہ حدیث سُناکر۔ اور اُن کی موجودہ حرکتوں کو بغاوت ٹھہرا کر تنبیہ نہ فرمایا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت عبداللہ ابن عمر کے نزدیک حضرت عثمان کا خلافت پر اصرار

بیجا تھا۔ اور ناحق۔ اور فرقہ ہائے باغیان و غدار کا اصرار جائز اور حق تھا۔ اسی بنا پر اس حدیث کے اعلان و اشاعت اور باغیوں کی تنبیہ و موعظت نہیں فرمائی گئی۔

اس موقع پر آپ کا سکوت اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ آپ کے مجتہدانہ مختار میں خلافت عثمان اتنی واجب الاتباع بلاتامہ نہیں تھی۔ جیسی یزید کی سلطنت۔ کیونکہ اگر خلافت حضرت عثمان میں بھی اتنی ہی اہمیت ہوتی۔ تو حضرت عبد اللہ ابن عمر اس خلافت کے ساتھ غدر و بغاوت کرنے والوں کو بھی ویسے ہی باغی اور غدار ٹھہراتے۔ اور عقاب و عذاب الٰہی سے بھی اسی طرح ڈراتے۔ جیسا اس وقت یزید کی خلافت سے خلع و بغاوت کرنے والوں کو باغی اور غدار ٹھہرایا گیا ہے۔

ابن عمر کی اس وقت کی خاموشی اور اس وقت کی پرجوشی بے معنی نہیں تھی۔

حضرت ابن عمر کی اسوقت کی خموشی اور اسوقت کی پرجوشی بیوجہ اور بلامعنی نہیں تھی۔ آپ حمایت خلافت یزید کے معاویہ کے وقت ہی سے ذمہ دار ہو چکے تھے۔

تاریخ روضۃ الصفا جلد سوم کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

معاویہ بعبد اللہ ابن عمر گفت کہ امت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم را چوں گلہ بگذارم کہ بےشبان باشد ازیں رو یزید را بولایت عہد برکشیدم و مردمان ہمہ امصار و بلدان او را پذیرفتند۔ الّا چند تن قریش کنون تو دریں مخالفت چہ اندیشۂ۔ عبد اللہ گفت ہیچ می خواہی کہ تقدیم امرے کنی کہ فتنہ انگیختہ نشود و خون مردم ریختہ نگردد و برتو عصیانے فرو نیاید معاویہ گفت چرا نخواہم چنیں امرے را دوست دارم عبد اللہ گفت سریر خود را نصب کن و بر فراز آں نشیں تا من نخستین بیایم و با تو کنم بیعت بشرط آنکہ بعد از تو نصب امامت باجماع باشد سوگند باخدا کہ بعد از تو اگر امت پیغمبر انجمن شوند و غلام حبشی را بامامت برگزینند من داخل شوم در آنکہ امت داخل شدہ اندایں

عبد اللہ ابن عمر سے معاویہ نے کہا کہ ہم امت محمدیہ کو مثل گلہ بے شبان (چرواہے) کے کیسے چھوڑتے۔ اسوجہ سے میں نے یزید کی ولیعہدی کا قصد کر لیا۔ اور تمام شہروں کے لوگوں نے تقریباً اسکی ولیعہدی کو قبول کر لیا ہے۔ سوائے چند قریش کے لوگوں کے۔ اب تم نے اُن کی (قریشیوں) مخالفت کے متعلق اپنی کیا رائے قائم کی ہے۔ عبد اللہ نے جواب دیا۔ کہ جو امر آپ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف ایسا ہونا چاہئیے کہ اس کے باعث سے آدمیوں کی خونریزی نہ ہو۔ اور ملک میں فتنہ و فساد نہ پھیلے۔ جس کی وجہ سے آپ پر ارتکاب عصیاں کا اطلاق ہو۔ معاویہ نے کہا۔ کہ میں ایسے امر کو خود پسند کرتا ہوں۔ اور کیونکر اس کے پسند کرنے کی خواہش نہ کرونگا۔ عبد اللہ ابن عمر بولے۔ تو پھر آپ اپنی مسند امارت بچھائیے۔ اور اس پر جلوس فرمائیے۔ میں پہلا شخص ہونگا۔ جو حاضر دربار ہو کر آپ کی بیعت کرونگا۔ مگر اس شرط پر۔ کہ آپ کے بعد انعقاد امامت بقاعدہ اجماع امت جاری ہو۔ خدا کی قسم اگر آپ کے بعد امت رسول کمیٹی کر کے ایک غلام حبشی کی امامت پر بھی

بگفت و داخل سرائے خویش	اتفاق کرے۔ تو میں اسی امر میں داخل ہونگا جس پر اُمت کا اجماع ہو چکا ہے
گشت و در را بروئے خویش و بیگانہ	اتنا کہہ کر عبد اللہ ابن عمر اپنے گھر رخصت ہو گئے۔ گھر کے دروازے بند کر لیئے
فروبست و ہر کس از دوستاں عزم و	اور تمام احباء و اعزہ سے ملنا جلنا موقوف کر دیا۔ اگر کوئی شخص آپ کی زیارت
زیارت وے میکرد۔ رخصت نمی داد	کو آتا بھی تھا۔ تو اسکو زیارت کی اجازت نہ دیتے تھے۔

ہم کو حقیقتاً حضرت عبد اللہ ابن عمر کے اس طرز عمل پر یہ اعتراض کرنیکا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیونکہ یہ امر نہ ہمارا موضوع بحث ہے۔ اور نہ مقصود استدلال۔ مگر ہم اتنا مختصر ضرور بتلا دینے کے مستحق اور ذمہ وار ہیں۔ کہ عبد اللہ ابن عمر کے اس سکوت نے معاویہ کے حصول مقاصد میں بڑی قوت پہونچائی۔ اگر اُن کے اس حسن خدمت کی زیادہ تحقیق کی جاوے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ عبد اللہ نے اپنے اس طریقہ عمل میں اپنے پدر بزرگوار کی تقلید اختیار فرمائی ہے۔ جنہوں نے اپنے ایام حکومت میں بنی اُمیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پھر ساحل مراد تک پہونچا دیا تھا جب اُن کے بعد اُنکے خلف الرشید نے ولیعہدی یزید کے مسئلہ خاص میں اس سرگرمی سے تائید فرمائی۔ کہ تمام ممالک اسلامیہ کی حکومت اگر ہمیشہ کے لیئے نہیں۔ تو کم از کم سو برس تک تو یقیناً دہی مروانیوں کے لیئے مستقل ہو گئی۔

> عبد اللہ ابن عمر خلافت یزید کے لیئے شرط اجماع لگا کر قطعاً پھر گئے۔

روضۃ الصفا (ابن اثیر و ابن قتیبہ کا خلاصہ ہے) کی مندرجہ بالا عبارت سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ ابن عمر صاحب نے خلافت یزید کو اجماع اُمت پر مشروط فرمایا تھا۔ مگر جب وہ وقت آیا۔ تو آپ نے بلا انتظار اجماع و اتفاق اُمت جس خلوص اور حسن عقیدت سے یزید کی بیعت فرمائی ہے۔ اُس کی کیفیت تاریخ ابو الفدا کی مفصلہ ذیل عبارت سے ثابت ہے۔

بویع یزید بخلافۃ لما مات ابوہ فی رجب سنۃ ستین ولما استقر یزید فی الخلافۃ ارسل الی عاملہ بالمدینہ بالزام الحسین وعبد اللہ ابن الزبیر و عبد اللہ ابن عمر بالبیعہ فاما ابن عمر فقال ان اجتمع الناس علی بیعۃ فبایعتہ واما الحسین وعبد اللہ ابن	معاویہ کے بعد یزید کی (شام میں) بیعت کی گئی۔ اور جب خلافت پر وہ مسلط ہو گیا۔ تو اُسنے عامل مدینہ کو لکھا۔ کہ حسینؑ عبد اللہ ابن زبیر اور عبد اللہ ابن عمر سے میری بیعت ضرور لیجائے۔ چنانچہ ابن عمر نے تو اُسی وقت بیعت کر لی۔ اور کہا کہ اگر لوگوں نے یزید کی بیعت پر اجماع کیا ہے۔ تو میں بھی اسکی بیعت کئے لیتا ہوں۔ لیکن امام حسینؑ اور عبد اللہ ابن زبیر نے بیعت سے قطعی انکار کر دیا۔ اور بیعت نہیں کی۔ جب امام حسینؑ

زبیر فلم یبایعا فقال لھما ابن عمر اتقیا اللہ ولا تفرقا جماعۃ المسلمین۔

اور ابن زبیر نے یزید کی بیعت نہ کی۔ تو ابن عمر نے ان دونوں صاحبوں سے کہا۔ کہ تم لوگ خدا سے ڈرو اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو"

عبداللہ ابن عمر کی اس وقت کی پُرجوشی اور دوسرے وقت کی رُوپوشی

بیعت یزید کے وقت تو حضرت عبداللہ ابن عمر کی خوش عقیدگی اور پُرجوشی کا یہ منظر دکھلائی دیتا ہے۔ اور بیعت حضرت علیؑ کے وقت آپ کی ناتوجہی۔ بے اتفاقی اور کنارہ کشی کی خاص کیفیت۔ مروج الذہب مسعودی۔ اسد الغابہ جزری۔ اور تاریخ کبیر طبری کی مفصلہ ذیل عبارتوں میں ملاحظہ کی جاوے۔

تعد عن بیعتہ جماعۃ عثمانیہ منھم سعد بن ابی وقاص وعبد اللہ ابن عمرو بایعا یزید بعد ذالک۔

ان کی (حضرت علی) بیعت سے ایک جماعت عثمانیہ نے کنارہ کشی اختیار کی جن میں سعد بن ابی وقاص و عبداللہ ابن عمر بھی تھے۔ حالانکہ آگے چلکر ان دونوں صاحبوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت کر لی۔ مگر حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی۔

اسد الغابہ میں ہے:

تخلف عن بیعۃ جماعۃ من الصحابۃ منھم ابن عمر۔

صحابہ کی ایک جماعت بیعت حضرت علیؑ سے باز رہی۔ اور اُن میں ابن عمر بھی تھے۔

تاریخ طبری میں ہے:۔

بایع الناس علیًا بالمدینہ وتربص سبعۃ نفر فلم یبایعوہ منھم سعد ابن ابی وقاص منھم ابن عمر (الی ان قال) ولم یتخلف احد من الانصار الا بایع فیما نعلم۔

مدینہ میں لوگوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کی۔ لیکن سات آدمیوں نے ٹال کیا۔ اور بیعت نہیں کی جن میں سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر بھی تھے۔ اور جہاں تک تحقیق ہوا ہے۔ انصار میں کسی ایک نے بھی حضرت علیؑ کی بیعت سے تخلف نہیں کیا"

نہیں معلوم کہ عبداللہ ابن عمر صاحب کے دماغ میں خلافت علیؑ کے انعقاد کے وقت۔ اجماع اُمت کا ادب اُس کی حرمت و رقدر و منزلت۔ اُس شدت اور عصبیت کے بعد جیسی کہ خلافت و امارت یزید کے وقت ثابت ہوتی ہے۔ پیدا ہوئی تھی یا نہیں۔ اگر اُس وقت بھی اجماع اُمت کی ایسی ہی اہمیت تھی۔ تو پھر عذر و بغاوت کا فتویٰ عام جو خلافت یزید سے خلع و انکار کے متعلق تمام اہل اسلام کے لیئے دیا گیا تھا۔ اور جس کی بنا پر خاص کر امام حسین علیہ السلام اور ابن زبیر خدا کے عذاب سے ڈرائے گئے اور بیعت یزید کے لیئے ذمہ دار اور جوابدہ بنائے گئے۔ وہی فتویٰ۔ وہی حکم۔ اتباع اجماع کے متعلق

خلافت حضرت علیؑ سے انکار و خاموشی اختیار کرنے کے وقت اپنی ذات پر کیوں نہ لگایا گیا۔
ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔
اور اگر یہ خیال اُس وقت تک اُن کے ذہن نشین نہیں تھا۔ اور عین خلافت یزید کے وقت پیدا ہوا تو صحابہ۔ علماء۔ محدثین۔ مفسرین اور فقہا کے لیے بھی طرز عمل۔ سلطنت کا حقیقی دباؤ اور اصلی لگاؤ ثابت ہوگا۔ اور شبلی صاحب کی اتنی بڑی مطول اور مفصل فہرست صحابہ محدثین میں کم سے کم حضرت عبداللہ ابن عمر ہی پہلے صحابی اور محدث ثابت ہوتے ہیں۔ جن کا قلم سلطنت کی تلوار سے دبا ہی نہیں بلکہ حقیقتاً اُسی نوک شمشیر سے بنایا گیا۔
مگر نہیں، تنہا عبداللہ ابن عمر ہی ایسے صاحب قلم نہیں ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ اُن کے ایسے کثیر التعداد صاحبان علم و قلم ایسے ثابت ہوتے ہیں۔ جنکا علم ہمیشہ سطوت سلطنت سے دبتا رہا۔ اور جن کا قلم کئی صدیوں تک شمشیر حکومت کی نوک سے برابر غبار رہا۔ اس کی تفصیل علامہ مدائنی کی کتاب الاحداث کی مفصلہ ذیل عبارت میں ملاحظہ ہو۔

کتب معویۃ الی عمالہ فی جمیع الافاق ان لا یجیزوا لاحد من شیعۃ علی و اھلبیتہ شھادۃ وکتب الیھم ان انظروا من قبلکم من شیعۃ عثمان ومحبیہ واھل بیتہ والذین یرون فضائلہ و مناقبہ فادنوا مجالسھم وقربوھم واکرموھم واکتبوا الی بما یروی کل رجل منھم واسمہ واسم ابیہ وعشیرتہ ففعلوا ذلک حتی اکثرت فی فضائل عثمان ومناقبہ لما کان یبعثہ الیھم معویۃ من الصلوٰت والکساء والحبات والقطائع ویفیضہ فی العرب منھم والموالی فکثر ذلک فی کل مصر وتنافسوا فی المنازل

معویہ نے اپنے ممالک محروسہ کے تمام عمّال کو یہ فرمان شاہی لکھ بھیجا۔ کہ حضرت علیؑ اور اُنکے اہلبیت کے کسی شیعہ کی گواہی نہ قبول کی جائے۔ اور یہ بھی تاکید اُنکو بھیجا۔ کہ حضرت عثمان کے شیعہ اور اُنکے اہلبیت کے ساتھ محبت رکھنے والوں کے اقوال برابر قبول کیے جائیں۔ اور ایسے جو لوگ حضرت عثمان کے فضائل و مناقب بیان کریں۔ اُنکو اپنی جلوت و خلوت میں قربت خاص کا مرتبہ دیا کرو۔ اور اُنکے اکرام کیا کرو۔ اور اُنمیں سے جو کوئی جو کچھ (فضائل عثمان وبنی اُمیہ) بیان کرے۔ اُن میں سے ہر ایک کے نام مع ولدیت اور قومیت لکھ بھیجو۔ چنانچہ ماتحتی عمّال ان ممالک نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ فضائل و مناقب حضرت عثمان میں کثرت سے حدیثیں جمع ہوگئیں۔ اور معویہ نے اُن تمام اشخاص کو انواع و اقسام کے صلہ جات، خلعات، جبہ جات اور آراضیات جاگیرات اور کنیز و غلامان دے دے کر تمام عرب میں اُن کو مالا مال کر دیا۔ پھر ایسے لوگ تمام دیار و امصار میں

والدنیا فلیس یجی احد من الناس الا قام
عاملا من عمال معویۃ ولا یروی فی
عثمان فضیلۃ او منقبۃ الا کتب اسمہ و
قربہ وشفعہ فلبث بذلک حینا ثم کتب
الی عمالہ ان الحدیث فی عثمان قد
اکثر وافشا فی کل مصر وفی کل
وجہ وناحیۃ فاذا جاءکم
کتابی ھذا فادعوا الناس الی
الروایۃ فی فضائل الصحابۃ والخلفاء
الاوّلین ولا یترکوا خبرا یرونہ احد من
المسلمین فی ابو تراب الا واتونی بمناقض لہ
فی الصحابۃ فان ھذا احب الی واقر عینی و
ادحض لحجۃ ابی تراب وشیعتہ واشد علیھم
من مناقب عثمان وفضلہ فقرئت
کتبہ علی الناس فرویت اخبار
کثیرۃ وفی مناقب الصحابۃ
والخلفاء الاوّلین مفتعلۃ
لا حقیقۃ لھا وجد الناس
فی روایۃ ما یجری
ھذا المجری حتی اشادوا بذکر
ذالک علی المنابر والقی الی
معلمی الکتاتیب فعلموا
صبیانھم وغلمانھم من
ذالک کثیر الوسع حتی رووہ
وتعلموہ کما یتعلمون القرآن

پھیل گئے اور کثرت سے ہو گئے۔ اور اُن عمّالان معاویہ میں
کوئی عامل ایسا نہیں چھوٹا۔ جس نے معاویہ کے اس فرمان شاہی
کے خلاف کسی ایسے شخص کو جس نے حضرت عثمان کے فضائل و
مناقب میں روایت کی ہو۔ اور عمّالین معویہ نے اس کو دربار
قربت نہ دیا ہو۔ یا اُس کا نام لکھکر دربار معاویہ میں اُسکی سفارش
نہ کی ہو۔ یہی حالت برابر قایم رہی۔ تا آنکہ فضائل عثمان میں ضرورت
سے زائد حدیثیں تیار ہو گئیں۔ تو معاویہ نے اپنے عمّال کو
دوسرا حکم نامہ اُس مضمون کا لکھا۔ کہ چونکہ فضائل عثمان میں
حدیثیں زیادہ ہو گئیں۔ اور ہر بلاد و اطراف و امصار میں کثرت
سے پھیل گئیں۔ اسلئے بمجرد رسید حکمنامہ ہذا تم لوگ ان لوگوں
(راویان احادیث) کو بلا کر حکم عام دیدو۔ کہ اب فضائل صحابہ اور
خلفائے سابقین کے متعلق حدیثیں مرتب کریں۔ اور مجھ کو اس امر کی
فوراً خبر کرنے سے کسی وقت غافل نہ رہو۔ کہ جب کوئی شخص اُمت اسلام
میں کوئی حدیث یا روایت ابو ترابؑ (حضرت علیؑ) کی شان میں
بیان کرے تو اُسی وقت اُس کی مناقض حدیث صحابہ کی شان
میں تیار کر لی جائے۔ کیونکہ یہ امر مجکو سب سے زیادہ محبوب ہے
اور اُس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچتی ہے۔ اُن کو
بیان ابی ترابؑ سے سخت منع کرو۔ اور مناقب عثمان کے بیان
کے لیے سخت تاکید کرو۔ الغرض یہ فرمان معاویہ پڑھ کر سب
کو سنایا گیا۔ اور لوگوں نے کثرت سے فضائل صحابہ میں ایسی ایسی
حدیثیں تیار کیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ انھیں حدیثوں
کو اُن لوگوں نے شارع عام پر اجرا و اقرار کیا۔ یہاں تک
کہ مسجدوں کے منبروں پر یہ حدیثیں بیان کی گئیں اور معلّمین
نے اُن کو کتب درسیہ میں لکھ لکھ کر لڑکوں اور جوانوں کو زبانی
اور ازبر کرائیں۔ اور پھر تو اُن کی تعلیم کو اتنی ترقی ہوئی کہ یہ قرآن مجید

حتے عملوا بنا بهم نسائهم وخدمهم وحشمهم۔

کی تعلیم کے برابر ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی تمام لڑکیوں، عورتوں اور گھر کے غلاموں اور کنیزوں تک کو پڑھائی اور یاد کرائی گئیں۔

اِن شہود کثیرہ کے بعد بھی شبلی صاحب یا کوئی اور صاحب اُن کے ہمخیال۔ ایسے دعوے کرنے پر جرأت کر سکتے ہیں۔ کہ علمار و محدثین کا قلم شمشیر سلطنت سے نہیں دبا۔ دبنا کیسا۔ ان شواہد نے تو ثابت کر دیا کہ اُن کے قلم تلوار حکومت سے دبے ہی نہیں۔ بلکہ ہمیشہ شاہی تلوار کے پھلوں اور نوکوں سے بنتے اور درست ہوتے رہے۔

علامہ مدائنی کی عبارت بالا سے اِن حضرات کی اجمالی کیفیت معلوم ہوئی۔ اس لیے ممکن ہے کہ کہا جائے۔ کہ یہ وضعین حدیث۔ محض معمولی غربا۔ فاقہ مست اور شکم پرور طبقہ کے ادنیٰ لوگ تھے اس لیے ضروری ہے۔ کہ ان میں سے چند ممتازین علمار و فقہا کی مختصر کیفیت لکھکر حقیقت حال کا انکشاف کر دیا جاوے۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر صاحب کے تعلقات شاہی اوپر مفصل بیان ہو چکے ہیں۔ ہم ذیل میں اُنکے ہمسر۔ ہموزن اور ہم پایہ صحابی و محدث حضرت ابی ہریرہ کے حالات ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی میں ہے۔

ابو ہریرہ معمولی آدمی تھے

وکان من اصحاب الصفه فقیرا ذاق جوعا وفاقة ثم بعد النبی صلی الله علیه و اله وسلم صلح حاله وکثر ماله وکان کثیر العمل والذکر ولی امرة المدینه وناب ایضا عن مروان فی امرتها وکان یمر فی السوق ویحمل الحزمة وقال ابن عبد البر فی الاستیعاب فی حاله راضیا بشبع بطنه۔

اصحاب صفہ سے تھے۔ مرد فقیر و مفلس تھے۔ فاقوں اور بھوک کی شدت کو تو نکا مزہ چکھے ہوئے تھے۔ پھر بعد جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اُن کی حالت اچھی ہو گئی۔ اور انہوں نے مال کثیر جمع کر لیا۔ یہ بہت عابد تھے۔ کثرت سے ذکر و وظائف کیا کرتے تھے۔ (زمانہ معاویہ میں) ایک مدت والی مدینہ کے نائب مقرر ہوئے۔ بار دیگر اسی طرح مروان کے وقت میں نائب بنائے گئے۔ جب بازار میں نکلتے تھے۔ تو اُن کے سر پر بوجھ ہوتا تھا۔ امام ابن عبد اللہ استیعاب میں اُنکے حال میں لکھتے ہیں کہ یہ پیٹ بھر دینے سے راضی رہتے تھے۔

ابو ہریرہ ذو وجہت تھے اور مذبذب سیرت حلبیہ میں علی ابن برہان الدین حلبی شافعی لکھتے ہیں:۔

ولما وقع القتال بین علی ومعاویه وکان ابو هریره یصلی خلف علی کرم الله وجهه

جب حضرت علیؑ اور معاویہ میں جنگ (صفین) واقع ہوئی۔ تو ابو ہریرہ کا طرز عمل یہ تھا۔ کہ نماز حضرت علیؑ کے پیچھے پڑھتے

جناب رسولخدا صلعم کے ساتھ تقریباً تین ۳ سال رہے۔ اُن سے کل ۵۱۰ احادیث مروی ہیں۔ اور ابوہریرہ سے پانچہزار (۵۰۰۰) اور بعض نے ابوہریرہ کے صرف راویوں کی تعداد پانچہزار بتلائی ہے تو احادیث کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔"

ابوہریرہ کی کثرت حدیث پر شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا سخت تعجب

کتاب قرۃ العینین میں شاہ ولی اللہ صاحب۔ ان کی کثرت حدیث پر ذیل کے کلمات تعجبانہ مندرج فرماتے ہیں۔

از عجائب آنست کہ مثل ابوہریرہ کہ صحبت او بہ آنحضرت قلیل و فتنہ بہ پا نہائے او بسیار فزوں تر است و در مذہب ما از وے پنجہزار حدیث روایت کردہ اند و ثقاۃ آنرا از و یاد گرفتہ حضرت مرتضیٰؑ باوجود محنت دائمہ و کمال فقاہت و تمام حفظ انضمام و استماع از صدیق و فاروق و بسیارے از حدیث تمام مسموعات خویش و عدم مانع از روایات کہ عبارت از قلت تجار است بعد آنحضرت صلعم کہ در صدیق بودہ است باشتغال بہ امور ناس در تمام عمر چنانچہ در فاروق بودہ است با قلت اشتغال در مسائل فقیہ چنانچہ در طلحہ و زبیر بود مدت دراز در مدینہ باشند و روایت نکنند و مردمان از وے حدیث و دیگر نداز او ہیچ سکہ۔ باز در کوفہ چوں روایت کند حدیث او تا پانصد نہ رسد و آن نیز مختل گردد و بشرط صحت نرسد الا قلیلے

قرۃ العینین ص ۲۰۹

یہ عجیب بات ہے۔ کہ بہت کم مدت تک ابوہریرہؓ آنحضرت صلعم کی خدمت میں رہے۔ اور علیؑ مرتضیٰ سے علم میں بہت کم درجہ رکھتے تھے۔ باایں ہمہ ارباب فضل وکمال نے اس سے پانچہزار احادیث نقل کیں۔ اور علی مرتضیٰؑ کہ اعلےٰ درجہ کے عالم متقی اور صاحب علم علاوہ برآں ابوبکر و عمر کی صحبت میں مدت دراز رہ چکے تھے۔ اور شیخین جیسا کہ مہمات ملکی و معاشرت رعایا و انتظام مملکت کا بھی اُن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور مدینہ منورہ میں محض بلا تعلقات بیکار رہا کرتے تھے۔

باایں ہمہ آزادی و بایں الہالی ایک حدیث کا پتہ نہیں چلتا جو اہل حدیث نے حضرت علیؑ سے نقل کی ہو۔ البتہ جب آپ کوفہ میں آئے۔ وہاں نقل حدیث میں مصروف ہوئے۔ مگر بہت کم وہ بھی پانچ سو حدیثوں تک۔ اس سے زیادہ پتا نہیں چلتا۔ پھر وہ بھی مختل اور غیر منظم و بے اعتبار محض جس سے کوئی اصولی مسئلہ ماخوذ نہیں۔

افسوس شاہ صاحب صرف تعجب ہی فرما کر رہ گئے۔ اور ابوہریرہ کی وضع حدیث کی کوئی تنبیہہ و سزا تجویز نہ فرما گئے۔ مشکل تھا۔ صحابیت کا قدم درمیان تھا۔ کلھم عدولٌ کا غلط اُصول پیش نظر تھا۔ ابوہریرہ سے کثیر التعداد حدیثیں ایسی بھی تو تھیں جن پر خلافت اور صحابیت کے ارکان عقائد قائم تھے۔ اسلیئے اُنکے قطعی انکار سے تو نظام عقائد متزلزل ہو جاتے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے صرف اظہار تعجب فرما کر طریقہ کف اللسان اختیار فرمالیا۔ اور خاموش ہو رہے۔ مگر خدا جانے کیا وجہ ہوئی۔ کہ امام اعظم

حضرت ابوحنیفہ کو ابوہریرہ کی ان حرکات پر کیوں اتنا غصہ آگیا۔ کہ اُنہوں نے بلا رعایت صحابیت و بغیر لحاظ اُصول کلہم عدول کے۔ اُن کے قطعی متروک الحدیث اور ناقابل روایت ہونے پر عام فتویٰ دیدیا چنانچہ اعلام الاخیار کفوی کی مفصلہ ذیل عبارت سے ثابت ہوتا ہے۔

قال ابوحنیفہ لاصحابہ اترکوا قولی بقول الصحابہ الا بقول الثلاثہ منہم ابوھریرہ وانس ابن مالک وسمرۃ ابن جندب۔	ابوحنیفہ نے اپنے اصحاب سے کہا۔ کہ قول صحابہ کے مقابلہ میں میرے قول کو تم لوگ ترک کر دو۔ سوائے تین صحابی کے اقوال کے مقابلہ میں۔ پہلے ابوہریرہ۔ پھر انس ابن مالک۔ اور سمرہ ابن جندب

وضع حدیث کا آخری نتیجہ

حضرت ابوہریرہ کو حدیث سازی کے صلہ میں دربار امیر معاویہ سے جو کچھ اور جتنا کچھ ملا ہو۔ وہ معاویہ صاحب جانیں۔ یا خود ابوہریرہ صاحب مگر عام اہل اسلام اور علمائے کرام نے اُنکو جو انعام و خطاب دیا۔ وہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال ص ۳۱۷ میں ان الفاظ کے ساتھ لکھا ہے۔

عن عثمان مقسم ان ابوھریرۃ کاذب علامہ عثمان مقسم وسیری کہتے ہیں۔ کہ ابوہریرہ کاذب ہے۔

نہ سلطنت کے ساتھ تعریج ہوجاتے۔ نہ اس نوبت کو پہونچتے۔ حضرت ابوحنیفہ کے فتوے کے مطابق ابوہریرہ کے ساتھ دو اور صحابیوں کی مجہولیت بھی ثابت ہوگئی۔ ایک صاحب تو سمرہ بن جندب ہیں۔ دوسرے صاحب انس ابن مالک

ہم اس سے زیادہ حضرات صحابہ کی حقیقت کا انکشاف کرنا پسند نہیں کرتے۔ سلسلہ بیان میں طوالت ہوتی جاتی ہے۔ رسالہ الآل والاصحاب دفتر اصلاح کھجوہ ضلع سارن سے چھپکر ملک و قوم کے ہر طبقہ اور گوشہ میں شائع ہوچکا ہے۔ جن حضرات کو تحقیق حالات صحابہ کرام منظور ہو۔ اور وہ کسی وجہ سے عربی کتب رجال و سیرت کے تفحص و تجسس سے مجبور ہوں۔ وہ اس رسالہ سے بہت کچھ مستفیض ہوسکتے ہیں

بحث مجہولیت کے خاتمہ پر ہم علامہ ابن الحدید معتزلی شارح نہج البلاغت کی عبارت ذیل میں نقل کر دیتے ہیں۔ جس میں علامہ موصوف نے چند صحابہ اور تابعین وضاعین حدیث کے نام بتلائے ہیں۔ عبارت یہ ہے۔

ان معویہ وضع قوما من الصحابہ و قوما من التابعین علی روایۃ اخبار قبیحۃ فی علیؑ یقتضی الطعن فیہ والبراءۃ منہ و جعل لہم علی ذٰلک جعلا یرغب فی مثلہ و	معاویہ نے صحابہ میں سے ایک قوم کو اور تابعین میں سے ایک قوم کو حضرت علیؑ کی شان میں روایات قبیحہ بنانے کے لیے مقرر کیا۔ جن روایتوں سے آپ کی شان کی تنقیص ہو۔ اور جن سے آپ کے ساتھ برات ظاہر ہوتی ہو۔ اُس کی خواہش

اختلفوا ما ارضاه منهم ابو هريرة وعمر ابن عاص والمغيرة بن شعبة ومن التابعين عروة بن الزبير۔	کے مطابق بہت سے ایسے جعل بنائے گئے۔ جو لوگ اس کام پر خاص طور پر مصروف تھے۔ وہ صحابہ میں سے ابوہریرہ، عمر عاص اور مغیرہ ابن شعبہ۔ اور تابعین میں عروہ ابن زبیر تھے

تابعین میں واضعین حدیث

مرقومۂ بالا شواہد سے ہم نے صحابہ کرام کے طبقہ میں چند بزرگوں کے حالات بالاختصار لکھدیئے۔ جن پر وضع حدیث کا الزام قطعاً ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم تابعین کے حلقے سے چند بزرگوں کے حالات ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

امام زہری

ان بزرگ کے تعلقات سلطنت کی نسبت ہم شبلی صاحب کی اعترافات سے کافی طور پر اور لکھ آئے ہیں۔ جس سے زائد تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لیئے شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی کی وہ تحریر۔ جو شاہ صاحب نے۔ شرح مشکواۃ شریف کے رجال کی نسبت قلم بند فرمائی ہے۔ اُس میں امام زہری کے متعلق مفصلہ ذیل الفاظ وعبارت درج ہیں۔

يقال انه اى الزهرى يبتلى به لصحبة الامراء اتمات الديانة لضرورات الحضرة له عطاء والزهاد يأخذون عليه وينكرون ذلك منه وكان يقول انا شريك فى خيرهم دون شرهم فيقولون الا ترى ما هم فيه وتسكت۔	زہری بوجہ قلت دیانت وضروریات امرار خلفائے بنی امیہ کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ اُنکے معصر علما و زہاد نے اُن سے ترک تعلق کیا۔ اور معترض ہوئے۔ کہ تم سلاطین و امراء غیر محتاط سے معاشرت رکھتے ہو۔ تو جوابدیا۔ کہ میں اُنکے امور خیر میں شریک ہوں۔ اور معاملات شر سے بچتا ہوں اسپر علمائے کہا کہ اُنکی صحبت میں رہ کر امور منکرات کا دیکھنا اور اسپر سکوت اختیار کرنا بڑا جرم ہے

انہیں کے ہم خیال اور ہمکلام۔ زہیر ابن عروہ۔ اسحٰق ابن راہویہ۔ شیبت ابن ربیعی۔ عمران ابن خطان وغیرہم ایک کثیر التعداد جماعت۔ وضعی حدیثوں کی صناعت میں شب و روز مشغول و مصروف تھی۔ ان کی وضعی حدیثوں کی ایک مختصر سی فہرست ہم ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔ جس سے حقیقت کا پورا انکشاف ہوجاتا ہے۔

پہلا راوی حدیث	دوسرا راوی حدیث	مضمون اصل حدیث	ترجمۂ حدیث
عروہ ابن زبیر	زہری	روى الزهرى عن عروة ابن زبير قال حدثتنى عائشة قالت كنت	زہری عروہ ابن زبیر سے بیان کرتے ہیں کہ عروہ کا بیان ہے۔ کہ ہم سے عائشہ نے

		عند رسول اللہ صلعم اذا قبل العباس و علیؑ فقال یا عائشہ انّ ھذین یموتان علے غیر ملّتی او قال دینی۔	کہا کہ ہم ایک بار رسول اللہ صلعم کے پاس تھے کہ سامنے سے عباسؓ اور علیؑ آتے ہوئے دکھائی دیئے تو آنحضرت صلعم نے مجھ سے کہا کہ اے عائشہ یہ دونوں میری ملت کے سوا دوسری ملت پر مریں گے۔ بعض کا قول ہے کہ ملت کی جگہ دین فرمایا گیا تھا۔
زہری	عبدالرزاق	روی عبدالرزاق عن معمرؓ قال کان یقول عند الزھری حدیثان عن عروا عن عائشہ فی علی فسألتہ عنھا یوماً فقال ما نصنع بھما و بحدیثھما اللہ اعلم بھما انی لاتھمھما فی بنی ھاشم قال فاما الحدیث الاوّل فقد ذکرناہ و اما الحدیث الثانی فھوان عروۃ تزعم انّ عائشۃ قالت کنت عند النبیؐ اذا قبل العباس و علی فقال یا عائشہ ان سَرّک ان تنظری الی الرّجلین من اھل النار فانظری الی ھذین قد طلعا فنظرت فاذا العباس و علیؑ ابن ابیطالب۔	عبدالرزاق معمر سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ کہتے تھے کہ زہری کے پاس عروہ کی زبانی عائشہ سے حضرت علیؑ کی نسبت دو حدیثیں ہیں۔ میں نے ایکدن زہری سے ان دونوں حدیثوں کو پوچھا تو انہوں نے کہا کہ انکو رکھنا۔ اور نہ بیان کرنا۔ انکا حال خدا کو معلوم ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں بنی ہاشم پر اتہام ہے ایک تو وہی حدیث ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور دوسری یہ ہے۔ جیسا کہ عروہ کا زعم ہے کہ عائشہ نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ میں ایک دن رسولخدا صلعم کے پاس تھی۔ کہ آپ نے مجھ سے بطور راز فرمایا کہ اگر تم اہل دوزخ کو دیکھنا چاہو تو ان دونوں کو دیکھ لو اس کے بعد فوراً ہی دو آدمی آتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ عباسؓ اور علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے
عمر ابن عاص	بخاری و مسلم	امّا عمر عاص فروی عنہ الحدیث الذی اخرجہ البخاری و مسلم فی صحیحھما مستنداً و متصلاً بعمر ابن عاص قال سمعت رسول اللہ ان ال ابی طالب لیسو لی اولیاء انّما ولی اللہ و	بخاری و مسلم نے بہ سند متصل عمر عاص سے اپنی اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ کہ عمر عاص کا بیان ہے۔ کہ میں نے جناب رسولخدا صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ کہ ابی طالبؑ کی اولاد میرے دوست نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ولی اللہ

		صالح المؤمنین۔	ہیں۔ اور مومنین صالحین۔
ابوہریرہ ایضاً زہری	زہری مسور ابن مخرمہ	واما ابوهريرة فروى الحديث الذى معناه ان عليا خطب بنت ابى جهل فى حيوة رسول الله فاسخطه فخطب على المنبر فقال لاها الله لا يجتمع ابنة ولى الله وابنة عدو الله ان فاطمة بضعة منى يؤذينى ما يؤذيها فان كان على يريد ابنة ابى جهل فليفارق ابنتى وليفعل ما يريد وكلام ما هذا معناه والحديث مشهور من رواية الكرابيسى قلت هذا الحديث ايضا مخرج فى صحيحى البخارى ومسلم عن المسور بن مخرمة عن الزهرى وذكره المرتضى فى كتابه المسمى بتنزيه الانبياء۔	ابوہریرہ سے وہ روایت مروی ہے جس کا یہ معنی ہیں کہ حضرت علیؑ نے دختر ابی جہل کی خواستگاری کی زمانہ حیات رسول صلعم میں۔ آنحضرت صلعم کو یہ امر بہت ناگوار گذرا۔ اور آپ نے منبر پر چڑھ کر خطبہ میں ارشاد کیا کہ خداوند عالم اس امر کو پسند نہیں کرتا۔ کہ ایک دوست خدا اور ایک دشمن خدا کی بیٹیاں باہم مجتمع ہوں فاطمہؑ میری بضاعت ہے۔ جس نے اس کو ایذا دی۔ اس نے مجھکو ایذا دی۔ اور اگر تمہارا ارادہ ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ہو چکا ہے۔ تو میری لڑکی سے مفارقت اختیار کرو۔ پھر جو چاہو کرو۔ ابن الحدید معتزلی اتنا لکھکر بتلاتے ہیں۔ کہ یہ روایت بالمعنی کرابیسی سے مروی ہے۔ اور شیخین بخاری و مسلم نے اسکو مسور ابن مخرمہ سے بطریق زہری نقل کیا ہے۔
ابوہریرہ	بخاری	ان النبى صلعم امر عليا بالتهجد فقال ابى الخ (ماحصل)	جناب رسولخدا صلعم نے حضرت علیؑ کو نماز تہجد پڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے قطعی انکار کر دیا۔
حریز ابن عثمان سفیانی	اسمٰعیل ابن عیاش (قادح)	عن اسمعيل بن عياش سمعت حريز ابن عثمان يقول هذا الذى يرويه الناس عن النبى صلعم انه قال لعلى انت بمنزلة هارون من موسى حق ولكن اخطاء السامع قلت ما هو فقال انما هو انت منى	اسماعیل ابن عیاش کہتے ہیں کہ حریز ابن عثمان کو ہم نے یہ کہتے ہوئے سنا۔ کہ یہ حدیث صحیح جو مشہور ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔ کہ تمہاری منزلت میرے آگے ویسی ہی ہے۔ جیسی ہارون کی موسیٰ کے آگے۔ حضرت صلعم نے اسے یوں فرمایا تھا۔ کہ (نعوذ باللہ) تمہاری

		بمنزلة قارون من موسیٰ قلت عمن ترویه قال سمعت الولید ابن عبد الملك وهو علی منبر۔	منزلت میرے آگے ویسی ہی ہے۔ جیسی قارون کی موسیٰ کے آگے۔ انہیں لکھتے ہیں۔ میں نے حریز سے پوچھا۔ کہ تم نے یہ حدیث کس سے سنی۔ تو اُس نے کہا۔ ولید ابن عبد الملک سے۔ اور ایسی حالت میں کہ مسجد کے منبر پر بیٹھا ہوا تھا۔
ایضاً	ازدی (قادحاً)	حکی الازدی فی الضعفاء ان النبی صلعم اراد ان یرکب بغلة جاء علیؑ فحل حزامه البغلة لیقع النبی صلعم۔	ازدی اپنی کتاب الضعفاء میں بیان کرتے ہیں کہ حریز نے بیان کیا۔ کہ ایک بار جناب رسول خدا صلعم نے اپنے خچر پر سوار ہونا چاہا۔ تو علیؑ نے آ کے خچر کی لگام کھولدی کہ حضرت گر پڑیں۔
خالد ابن حارث ابن حکیم ابن عاص	ہارون ابن عبد الملک ابن الماجشون	قال السید ابو الحسین یحییٰ فی کتابه اخبار المدینه حدثنا هارون ابن عبد الملك بن الماجشون قال لما قدم خالد بن الحارث بن الحكم بن العاص وهو ابن مطیرة علی منبر رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم جمعة شتم النبی صلعم وشتم علیاً وقال استعمل محمدؐ علیاً وهو یعلم ان علیاً خائن ولکن شفعت له ابنته (کما فی ینابیع المودة فی القربیٰ)	علامہ سید ابو الحسین یحییٰ۔ اپنی کتاب اخبار مدینہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون بن عبد الملک ابن ماجشون کا بیان ہے۔ کہ جب خالد ابن حارث ابن حکم ابن عاص آیا تو اُس نے منبر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر بیٹھکر جناب رسولخداؐ اور حضرت علی السلام اللہ علیہما کی شان میں کلمات ناشائستہ کہے۔ اور اثنا نجملہ یہ بھی بیان کیا کہ۔ آنحضرت صلعم نے علیؑ کو اکثر مقامات کا عامل مقرر کیا۔ حالانکہ آپ جانتے تھے۔ کہ علیؑ خائن ہے۔ لیکن اس امر میں اُن کی صاحبزادی برابر سفارش کیا کرتی تھیں۔ (ماحصل از ینابیع المودۃ فی القربیٰ)

یہ وضعی حدیثوں کی صورت حال کا نہایت مختصر سا نقشہ تھا۔ جو اُوپر لکھکر دکھلا دیا۔ ہر شخص اسی سے وضع حدیث کی کثرت۔ واضعین حدیث کی شخصی حیثیت۔ اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ عام منافرت اور اُن نفوس مقدسہ کی ذاتی عظمت۔ اور مدارج و مراتب کی ذلت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ ہم مزید اطمینان کے لئے مفصلاً ذیل

صرف دو مثالیں اور نقل کر کے یہ دکھلا دیتے ہیں۔ کہ اُن کی عظمت یا اُن کی اقتدا و متابعت کا شرف و افتخار کہاں تک اُس زمانہ کے اہل اسلام حاصل کرتے۔ وہ ان کا نام لینا تو چاہتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ انکا نام اور اُن کے ذکر تو امرار و خلفار کی صحبتوں اور مجلسوں میں بطور استھزا اور لطافت طبع پیش کیے جاتے تھے۔ اور اس وسیلہ سے امرار و خلفائے اسلام سے بڑے بڑے تحائف، اور انعام حاصل کئے جاتے تھے۔ ملاحظہ ہو ذیل کا واقعہ۔

امام الحرمین سید علی المدنی اپنی کتاب طبقات الشیعہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ان انسانا وقف للحجاج وبقال اللہ جد الاصمعی عبد الملک ابن قریب فصاح بہ ایہا الامیر ان اھلی عقونی فسمونی علیا وانی فقیر بائس وانا الی صلۃ الامیر محتاج فتضاحک لہ الحجاج وقال للطف ما توسلت بہ قد ولیتک موضع کذا۔

ایک شخص حجاج کے پاس آیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ (امام) اصمعی کا دادا عبد الملک ابن قریب نامی تھا۔ یہ شخص (از راہ تمسخر) چلاتا ہوا اور فریاد کرتا ہوا آیا۔ کہ امیر کی دھائی ہے۔ میرے گھر والوں نے مجھے عاق کر دیا۔ اور میرا علیؑ نام رکھدیا۔ اور میں بالکل مرد فقیر ہو کر اب سوائے امیر کے صلہ و بخشش کے دوسرا کوئی سہارا نہیں رکھتا حجاج اُس کے یہ کلام سُن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔ اور خاص لطف و کرم سے اُسکو پاس بلا کر کہنے لگا۔ کہ میں نے تیری امید توسل کے مطابق تجھکو فلاں مقام کا والی مقرر کیا۔

کیا اس سے بھی زائد کسی ممتاز قوم شخص کی توہین ہو سکتی ہے۔ اس سے بخوبی نتیجہ نکال لیا جا سکتا ہے کہ اہل اسلام اُسوقت اپنے واجب الاتباع خلیفہ چہارم کی اتنی اور ایسی وقعت و احترام کرتے تھے۔

تہذیب الکمال مزی میں مرقوم ہے:۔

فی تھذیب الکمال المزی وحاشیہ تذھیب التھذیب الکمال الصفی الدین الخزرجی قال قال یونس بن عبید سألت الحسن و قلت یا ابا سعید انک تقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذالک لم تدرکہ وقال یا بن اخی لقد سألتنی عن احد قبلک ولو لا منزلتک منی ما اخبرتک ان فی زمان کما تری (وکان فی عمل الحجاج)

تہذیب الکمال مزی اور اُسکے حاشیہ تذہیب التہذیب مؤلفہ صفی الدین خزرجی میں یونس ابن عبید سے منقول ہے کہ میں نے حسن بصری سے پوچھا۔ کہ اس کا کیا سبب ہے۔ کہ تم رسول اللہ صلعم سے بلا واسطہ حدیثیں روایت کرتے ہو۔ حالانکہ تم نے آنحضرت صلعم کا زمانہ نہیں دیکھا ہے۔ حسن بصری نے جواب دیا۔ کہ تم نے اُسوقت ایک ایسا سوال کیا ہے۔ جو اس سے قبل کسی نے مجھسے ایسا سوال نہیں کیا تھا۔ اور اگر تم میرے معتمدین سے نہ ہوتے تو میں تم کو کبھی نہ بتاتا۔ سُنو!

کل شئ سمعت من اقول رسول اللہ صلعم ھو عن علیؑ ابن ابی طالب غیرانی فی زمان لا استطیع ان ذکر علیا۔

میں جس قدر حدیثیں اس طرح پر بیان کرتا ہوں۔ کہ فرمایا جناب رسول خدا صلعم نے۔ حقیقتاً سب حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی مرویات سے ہیں۔ مگر جیسا کہ زمانہ ہے۔ وہ تم دیکھتے ہو۔ (یہ زمانہ حجاج کی امارت وحکومت کا تھا) اور اس زمانہ میں۔ میں علیؑ کا ذکر بھی نہیں کر سکتا۔

حسن بصری کے ایسا صاحب اثر اور مقتدر بزرگوار۔ جو منصب شریعت اور مسند ولایت دونوں کا دعویدار تھا۔ صرف سلطنت کے خوف سے اتنا مجبور تھا۔ کہ علیؑ کا نام لینے یا ذکر کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ امام جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی میں لکھتے ہیں۔

قال ابو عبد الرحمان مقری کانت بنو امیۃ اذا سمعو بمولود اسمہ علی قتلوہ۔

ابو عبد الرحمن مقری کہتے ہیں۔ کہ بنی اُمیّہ جب سنتے تھے۔ کہ کسی لڑکے کا نام علی رکھا گیا ہے۔ تو اُس کو قتل کر ڈالتے تھے۔

اس سے بڑھ کر اس نفس قدسی برکت کی اور کیا ذلت وتوہین ہو سکتی ہے۔ کہ اُسکا نام لینا۔ اُس کے نام پر نام رکھا جانا۔ قابل قتل جرم قرار دیا گیا تھا۔ اور پھر بھی اسلام۔ اسلام تھا۔ اور اہل اسلام اہل اسلام ہونے کا دعوے رکھتے تھے۔ اور تمام صحابہ وتابعین کرام اور علمائے علام انھیں کی تائید وتاکید میں اپنے فتاوے و احکام نافذ فرماتے تھے۔

دورۂ عباسیہ میں محدثین اور احادیث پر سلطنت کا اثر

دورۂ امویہ میں جو محدثین اسلامی اور احادیث نبوی کی خرابی ہوئی۔ اُسکی مختصری کیفیت اوپر دکھلائی گئی۔ اب مفصلہ ذیل مضامین عہد عباسیہ کے علماء اور احادیث کا مرقع ملاحظہ فرمایا جاوے۔

قاضی ابو یوسف

قاضی ابو یوسف صاحب جو امام ابو حنیفہ کے بعد سواد اعظم حنفیہ کے امام اول ہیں اُن کی اعلمیت وافضلیت یا معرفت کے لیے ابن خلکان کی مفصلہ ذیل عبارت کافی ہے۔

ماکان فی اصحاب ابی حنیفہ مثل ابو یوسف لولا ابو یوسف ماذکر ابی حنیفہ

ابو حنیفہ کے شاگردوں میں کوئی ابو یوسف کا مثل نہیں تھا۔ اگر ابو یوسف نہ ہوتے۔ تو کوئی ابو حنیفہ کا نام بھی نہ لیتا۔

ایسی عالم متبحر کی سلطنت پرستی تاریخ الخلفاء سیوطی کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ہارون الرشید کے دربار میں قاضی ابو یوسف کا مسئلہ

عن ابن المبارک قال لما افضت الخلافۃ الی الرشید وقعت فی نفسہ جاریۃ من جواری

ابن مبارک سے منقول ہے۔ کہ جب ہارون الرشید خلیفہ ہوا۔ تو اپنے باپ کی ایک لونڈی پر فریفتہ ہو گیا۔ اور اس سے مقاربت کی خواہش ظاہر کی۔ لونڈی نے کہا۔ کہ میں تمہارے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

المهدی فراودها علے نفسها فقالت لا اصلح لك ان اباك قد كان بي نشغف بها فارسل بها الی ابی یوسف العبد ك فی هذا شئ فقال یا امیرالمومنین اوکلما ادعت امة شیئا ینبغی ان تصدق لاتصدقها فانها لیست بما مونة قال ابن المبارك فلم ادر ممن اعجب من هذا الذی قد وضع یده فی دماء المسلمین و اموالهم یتحرج عن حرمة ابیه او من هذه الامة التی رغبت بنفسها عن امیرالمومنین او من هذا الفقیه الارض وقاضیها قال اهتك حرمة ابیك واقض شهوتك۔

کیونکہ تمہارے باپ کے پاس رہ چکی ہوں۔ مگر ہارون الرشید کا شوق ایسا شدید تھا۔ کہ اُسے اُسی وقت قاضی ابو یوسف کو بلا کر کہا۔ کہ اس لونڈی کے حلال ہونے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔ قاضی صاحب نے کہا۔ کہ یہ لونڈی جو کچھ کہے۔ اُس کو سچ باور کر لینا چاہیے ہم ہرگز نہیں۔ آپ اس کی بات کو نہ مانئے۔ کیونکہ وہ جھوٹ سے محفوظ نہیں ہے۔ ابن مُبارک کہتے ہیں۔ کہ میں نہیں جانتا کہ کس پر تعجب کروں۔ آیا اُس بادشاہ پر جس نے اپنے باپ کی حرمت کا لحاظ نہ کیا۔ یا اُس لونڈی پر جس نے بادشاہ کی خواہش سے انکار کیا۔ یا قاضی صاحب فقیہہ زمانہ پر جنہوں نے ہارون الرشید کو اجازت دیدی۔ کہ اپنے باپ کی ہتک حرمت کرے۔ اور اپنی خواہش نفسانی کو پورا کرے۔

سلطنت پرستی کی دوسری مثال — قاضی ابو یوسف کی سلطنت پرستی کی ایک اور مثال اُسی تاریخ الخلفاء سیوطی میں حسب ذیل ملاحظہ ہو۔

قال عبد الله ابن یوسف قال الرشید لابی یوسف انی اشتریت جاریة وارید ان اطاءها الآن قبل استبرا فهل عندك حیلة قال نعم تهبها ببعض ولدك ثم تزوجها۔

عبد اللہ ابن یوسف سے مروی ہے۔ کہ ہارون الرشید نے ایک لونڈی خرید کی۔ ابو یوسف سے کہا۔ کہ میں بلا انتظار استبرار اس سے اُسی وقت مقاربت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس اس کے جواز کا کوئی حیلہ ہے۔ ابو یوسف نے کہا ہاں۔ آپ وہ لونڈی اپنے کسی صاحبزادے کو ہبہ کر دیں۔ اور پھر اُس سے عقد فرمالیں۔

کیا یہ واقعات فقہاء و علماء کی زبان و قلم۔ کو شمشیرہائے سلطنت سے بالکل دبا ہوا ثابت نہیں کرتے؟ کیا شریعت اسلامی کی توہین و ذلت اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ کہ اُس کے جواز محارم کے لیے احکام شرعیہ کی جگہ حیلہ تلاش کیے جاتے ہیں۔ اور علمائے علام اجرائے فتاویٰ کی جگہ حیلہ بازی سے کام لیتے ہیں۔ کیا شبلی صاحب اگر مدعی حقیقت ہیں۔ تو سواد اعظم احناف میں قاضی ابو یوسف سے بڑھ کر کسی دوسرے فقیہہ و عالم کی اعلمیت و جامعیت کی مثال دکھلا سکتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف صاحب اور سلطنت کے ساتھ لگاؤ

یہاں تک تو سلطنت کے دباؤ کی مثالیں پیش کی گئیں۔ اب حکومت سے لگاؤ کی مثالیں بھی ذیل میں ملاحظہ کی جائیں۔ اسی تاریخ الخلفاء میں اسحاق ابن راہویہ معتبر ترین رواۃ صحیح بخاری کے اسناد سے مرقوم ہے۔

عن اسحٰق ابن راھویه قال دعا الرشید ابو یوسف لیلاً فافتاہ فامر له الف درھم فقال ابو یوسف ان رای امیر المومنین بتعجیلها قبل الصبح فقال عجلوها فقال بعض ان الخازن فی بیته والابواب مغلقة فقال ابو یوسف فقد کانت الابواب مغلقة حین دعانی ففتحت

اسحاق ابن راہویہ سے مروی ہے۔ کہ ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف کو رات کے وقت بلایا۔ اور اس سے فتویٰ پوچھا اور ان کو ایک ہزار درم دیے جانے کا حکم دیا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ امیر المومنین یہ رقم مجھے اسی وقت مل جانی چاہیے۔ کسی شخص نے کہا کہ خزانچی اپنے گھر ہے۔ اور تمام شہر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا۔ کہ جب میں بلایا گیا تھا۔ تو اسوقت بھی تمام دروازے بند ہی تھے۔ جس طرح پہلے کھولے گئے تھے اسی طرح اسوقت بھی کھل جائیں گے۔

قاضی صاحب داخل دربار کیسے ہوئے۔ اور دار الخلافت بغداد کے قاضی القضاۃ کیونکر بنے

قاضی صاحب دربار شاہی میں داخل کیسے ہوئے۔ اور بغداد کے قاضی القضاۃ کیونکر بنے۔ اس کی دلچسپ اور رنگین کیفیت ذیل میں ملاحظہ ہو جس کو ہم مولانا نعمت اللہ جزائری کی کتاب زہرۃ الربیع کے فارسی ترجمہ سے اردو میں خلاصہ کر کے لکھتے ہیں

قاضی ابو یوسف ابتدائے ایام میں نہایت تنگی اور عسرت سے بسر کرتے تھے۔ اور ہمیشہ محتاج و پریشان حال رہا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے پاس ایک یہودی کا مکان تھا۔ اس نے چاہا۔ کہ اپنی عمارت موجودہ میں کچھ اضافہ کرے۔ ابو یوسف نے اسے منع کیا۔ اس نے بطور استہزاء و تمسخر کہا۔ کہ جب تم کو وہ دن نصیب ہوگا۔ کہ تم بھی امرائے شاہی کی طرح اپنے تخت رواں پر سوار ہو کر اس طرف نکلو گے۔ اور میری عمارت کے موجودہ اضافہ کی وجہ سے تمہاری سواری کے لیے راستہ تنگ ہو جائے گا۔ تو میں اسوقت اپنے اس اضافہ کو ہٹا لونگا۔ ابو یوسف اپنی کمزوری اور مجبوری کے باعث اس یہودی کے اس طعن آمیز مکالمہ کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ خاموش ہو رہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ابو یوسف کا ستارہ ظلمت زوال سے نکلکر شرف اقبال پر آگیا۔ اس کی حقیقت یوں ہے۔ کہ ہارون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا۔ زبیدہ کی کنیزوں میں سے کسی ایک کنیز پر ہارون کی طبیعت آگئی۔ اس نے اسے بلایا۔ اس کنیز نے پہلے زبیدہ کی ملکیت خاص کا عذر معقول دکھلا کر انکار کیا۔ مگر پھر ہارون کے شاہی اقتدار سے مرعوب ہو کر اس کے قریب آگئی۔ مگر خدا جانے ہارون کو کیسی صلاحیت آگئی۔ کہ وہ اسکے ساتھ اپنے ارادہ و قصد سے باز رہا۔ مگر

حسن وہ ہے جو رہے سیکڑوں پردوں میں نہاں ٭ عشق وہ ہے جو کسی حال میں پنہاں نہ رہے

زبیدہ کو ہارون کی اس درزدیدہ نگاہی کی خبر لگ ہی گئی۔ نہایت برہم ہوئی۔ اور ہارون کو بلا کر کہنے لگی اے جہنمی۔ یہ کیا حرکت تھی۔ میرے پاس سے چلا جا۔ میں تیری صورت کو دیکھنا نہیں چاہتی۔۔ ہارون کو بھی اپنے اقتدار شاہی کا تاؤ آہی تو گیا۔ اور اپنے بےحد غصہ کی حالت میں کہنے لگا۔ کہ جا میں نے تجھے آج سے طلاق دیدی۔

غصہ کی بے لطفانہ حالتوں میں جانبین سے تو یہ خطاب وعتاب ہو گئے۔ مگر پھر تھے تو زبیدہ اور ہارون ہی سے زجانانہ کے باشد کشتہا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد رنجشوں کے پردے طرفین سے اٹھ گئے۔ تو دونوں میں سے پھر کوئی بھی ایک ساعت کی مفارقت کو گوارہ نہ کر سکا۔ اور فوراً یکجہتی اور باہم یکجائی کی کوشش کرنے لگے۔ ہارون کو اتنی احتیاط شرعی کی کہاں پرواہ۔ مگر ہاں زبیدہ کو البتہ ہارون کی قسم شرعیہ اور مسئلہ طلاق کے اجرا کا خیال دل سے لگا تھا۔ اور اس بنا پر وہ تاوقت رجوع ہارون سے یکجائی پر کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ ؎

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔ بالآخر ہارون نے ضرورت سے مجبور ہو کر یا زبیدہ کے خاص اصرار سے مامور ہو کر علما کی مجلس شوریٰ مجتمع کی۔ اور اس میں یہ مسئلہ پیش کیا۔ اور سارا قصہ بیان کر دیا اس جلسہ میں ابو یوسف بھی تھے" تمام علماء خاموش رہے۔ اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ نہیں معلوم وہ علماء کیسے تھے۔ اور ان کی جامعیت کیسی تھی۔ جو ہارون کے اس مسئلہ معمولی کا بھی جواب نہ دے سکے۔ حالانکہ صورت مسئلہ اطلاق طلاق رجعی تک کیا اجرائے حکم ظہار کے نصاب مقررہ تک بھی نہیں پہونچی تھی۔ علمائے علام کی خاموشی اور سکوت کی وجہ وہی سلطنت کا دباؤ اور سلطان کی رضا جوئی تھی۔ اور وہ حضرات اسی بنا پر اس مسئلہ شرعی میں حکم خدا اور رسول صلعم کے اجراء سے پہلے بادشاہ کے استمزاج واسترضا کا انتظار فرماتے تھے۔ اور یہ چاہتے تھے۔ کہ اس امر خاص میں بادشاہ کی طبیعت کا میلان جیسا پایا جاوے ویسا حکم لگایا جاوے۔

وہ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھے۔ کہ ابو یوسف کو وقت پر سوجھ گئی۔ اور خوب ہی سوجھی فوراً اپنے مقام سے اوٹھے۔ اور کہنے لگے یا ایہا الامیر آپ کے اس مسئلہ کا جواب میرے پاس ہے۔ آپ پہلے یہ فرمائیں کہ آپ کی نیت اس کنیز کی طرف بد ہوئی تھی یا نہیں۔ ہارون نے کہا البتہ۔ ابو یوسف نے کہا کہ تو پھر آپ جہنمی کیسے ہوئے؟

اسپر تو نص قرآنی واما من خاف مقام ربہ	جو شخص خدا کے عتاب کی وجہ سے اپنے نفس کو برائی سے

ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی | بجائے بہشت بریں اُس کی منزل ہو گی۔

صادق ہے۔ اس حکم سے تو آپ جہنمی ہونے کے عوض بہشتی ثابت ہوئے۔ اس بنا پر جب آپ کی نسبت جہنمی ہونے کا غضب امیر خطاب عائد نہوا۔ تو پھر آپ کی طرف سے اجرائے طلاق کا عتابانہ جواب کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یہ طلاق شرعاً کوئی چیز نہیں۔ اور اس حالت میں زبیدہ کے ساتھ رجوع کی تکلیف ضروری نہیں۔ ہارون یہ جواب خاطر خواہ سُنکر بہت خوش ہوا۔ اور اُسی وقت ابویوسف کو خزانہ شاہی سے اسّی ہزار دینار انعام دلوائے۔ اور دار الخلافت بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ اور حکم دیا کہ شاہی تخت رواں پر سوار کرکے ملازمین شاہی قاضی صاحب کو دربار سے اُن کے گھر تک پہونچائیں حکم کی دیر تھی۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ شاہی توشک خانہ سے ایک شاندار اور پُرتکلف تخت رواں لایا گیا۔ قاضی صاحب اُس پر سوار ہوئے۔ ملازمان شاہی نے نہایت عزت و احترام سے اپنے کاندھو پر اُٹھا کر قاضی صاحب کو گھر پہونچا دیا۔ جب قاضی صاحب کا تخت رواں اُس یہودی کے مکان تک پہونچا۔ تو اتفاق وقت سے وہ یہودی کھڑا تھا۔ قاضی صاحب نے اُسے دیکھکر فرمایا کہ بھائی۔ اب تو حسب وعدہ اپنی تعمیر کے اضافہ کو ہٹا لو۔ یہودی ان کا یہ عالم دیکھکر سناٹے میں آگیا۔ مگر تھا زبان کا پکا وعدہ کا سچا۔ اُس نے اُسی وقت اپنے مکان کا وہ حصہ توڑ ڈالا جسے اُسنے قبل میں بڑھا لیا تھا۔

زہرۃ الربیع مطبوعہ بمبئی جلد اوّل ص ۳ لم ۲۔

مرقومہ بالا واقعہ سے ثابت ہو گیا۔ کہ قاضی ابویوسف صاحب کس حد اور مقدار تک سلطنت کے زیر اثر اور دست نگر تھے۔ سلطنت کو ان سے اور اُن کو سلطنت کے ساتھ کیسے تعلق تھے۔ اور کیسے لگاؤ۔ یہ بھی مسلم ہے۔ کہ جب اُن بزرگ کے ایسے اعلم العلمار اور اعظم الفقہا و محدثین کی اتباع و منقاد حکومت کی یہ کیفیت ہو تو عموماً علمار و محدثین کی متابعت و مطابقت کی کیا حالت ہو گی۔ قیاس کُن زگلستان من بہار مرا۔

قاضی ابویوسف کی طرح ابھی اور حضرات کے حالات و واقعات بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ معتصم اور متوکل عباسی کے زمانہ حکومت میں قاضی یحیٰی ابن اکثم کے حالات و تعلقات سلطنت بھی اسی کی مثال ہیں۔ مگر ہم اُن کی تفصیل کو زائد از ضرورت سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں۔ حقیقتاً ہمکو ان اُمور کے انکشاف حقیقت کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیئے کہ شبلی صاحب تو خود اصل مدعائے بحث کا اعتراف فرما چکے ہیں۔ امام زہری کی نسبت وہ خود دلکھ کر اقرار کرتے ہیں۔ کہ امام صاحب ۸۲ھ ہجری میں عبد الملک ابن مروان کے دربار میں گئے اُس نے بہت قدر و منزلت کی۔ کتاب المغازی غالباً حضرت عمر ابن عبد العزیز کی ہدایت کے مطابق لکھی۔ یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے۔ کہ امام موصوف

سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام ابن عبد الملک نے اپنے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی۔ دیباچہ ص ۱۵ پھر دیباچہ ص ۱۶ میں بذکر محمد ابن اسحاق صاحب السیرت مرقوم ہے۔

امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا۔ کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آنے پاوے۔ لیکن محمد ابن اسحاق کو اجازت تھی۔ جب چاہیں چلے آئیں" محدث۔ فقیہہ اور محقق کا دار العلوم اور رجوع عامہ سے امتناع سخت تعجب ہے۔ مگر حقیقت حال بتلاتی ہے۔ کہ وہ محدث وفقیہہ نہیں رہے تھے۔ بلکہ اب تو سلطان وقت کے مقرب اور اطفال شاہی کے معلم تھے۔ اور اس شان کے اظہار و اعلان کے لیئے دربان۔ پاسبان اور میر سامان بغرض تمام ساز و سامان کی ضرورت تھی۔

امام زہری کے علاوہ۔ اُن کے اُستاد ابو بکر محمد بن عمر بن حزم انصاری۔ مدینہ منورہ کے قاضی سعد ابن ابراہیم مدینہ کے قاضی اور بڑے محدث۔ عاصم ابن عمر ابن قتادہ وغیر اشالہم۔ شبلی صاحب کے اقرار کے مطابق یہ تمام حضرات اتباع سلطنت کے ایک ہی رشتہ سے وابستہ تھے۔

گو شبلی صاحب نے احادیث اور علمائے احادیث کی بدعنوانیوں کا آغاز بنی اُمیہ کے وقت سے قایم کیا ہے۔ اور معاویہ سے لے کر تمام خلفائے بنی اُمیہ کو ان مفسدات کا باعث تبلایا ہے۔ اور اُنھیں کو ملزم و مجرم ٹہرایا ہے۔ اور پھر اس بدعنوانی کے سلسلہ کو خلفائے عباسیہ تک ظاہر فرمایا ہے۔ مگر ہمنے اس کی تنقید و تحقیق میں ان بدعنوانیوں کا باعث اِس سے بھی قدیم پایا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ حضرت عمر ابن عاص۔ حضرت انس ابن ملک اور سمرہ ابن جندب وغیرہم۔ بڑے بڑے صحابہ کبار اور تابعین ذی مقدار کو واضعین حدیث ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ ہماری عبارت سے پہلے ظاہر ہو چکا ہے یہانتک تو ہمنے شبلی صاحب کے اس دعوے کی تردید میں کہ۔ مسلمانوں کا قلم شمشیر سلطنت سے نہیں دبا" مرقوم بالا ثبوت و شواہد پیش کر دیئے۔ جو ضرورت سے زیادہ کافی ہیں۔ اب ہم اپنے موجودہ بیان کے ایک دوسرے اور مفید پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

علماؤ محدثین کے ان اطوار نے قرآن حدیث کو کس درجہ تک پہونچایا

اب ہم اپنے موجودہ بیان و تفصیل میں یہ دکھلاتے ہیں۔ کہ ان علمائے کرام اور فضلائے عظام نے سلطنت کے زیر اثر اور دست نگر ہو کر قرآن و حدیث کی کیا صورت قائم کی جن کے وہ اصل ترجمان تھے۔ اور ذمہ دار شرح و بیان۔ ان بزرگوں کی طرف سے معانی قرآن اور مطالب احادیث میں۔ جو غیر مجوزہ مداخلت کی گئی اور اس کو صرف قیاس و ضرورت کی بنا پر۔ تاویلات۔ تطبیقات اور تجمیعات وغیرہا کے مختلف

اقسام کے اسامی و مصطلحات سے موسوم فرمایا گیا۔ اُن سب کا بیان کرنا اور تحقیق و تنقید کے بعد اُنکی اصل حقیقت کا انکشاف کرنا۔ اوّل تو ہمارے موضوع تالیف سے زائد ہے۔ دوم یہ کہ اُن میں سے بعض بعید اُمور ضروری کی اصلیت ہمارے آئندہ سلسلۂ بیان سے معلوم ہو جائے گی۔ اس بنا پر ہم اُن کے انکشافات سے قطع نظر کرکے اپنی موجودہ تفصیل بیان میں قرآن و احادیث کی بے حرمتی اور ناقدری کی وہ کیفیت دکھلاتے ہیں۔ جو ان بزرگوں کے اتباع و خوشامد سلطنت کی وجہ سے نہایت بدنما اور بیحد نازیبا صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور اُس کی خاص وجہ سوائے اسکے دوسری ثابت نہیں ہوتی۔ کہ ان حضرات نے آغاز ہی سے۔ خلفاء و اُمراء وقت کی خوشامد و خوشنودی کی ضرورت میں آکر ان علوم مقدسہ کو ایسا عام اور بازاری کر ڈالا۔ کہ ہر کس و ناکس اُن کے احکام و ارشاد کی تعیین و تطبیق کو اُنکے خاص مقامات کے علاوہ۔ اپنی تمام ضروری اور غیر ضروری۔ قابل اور ناقابل۔ جائز اور ناجائز۔ ضرورتوں کے وقت۔ بلاتامل استعمال کرنیلگا۔ حقیقتاً اگر یہ علماء و فقہاء قرآن و احادیث تعلیم و تلقین کو اپنے مقام خاص تک شروط و محدود فرماتے اور اُن کی تخصیص کو تعمیم کے درجے تک نہ پہونچاتے۔ تو امیر معاویہ صاحب اتنی کثیر التعداد جعلی حدیثوں کے بنوانے پر قادر نہ ہوتے۔ اُن کے صاحبزادے یزید ابن معاویہ قرآن و احادیث کے احکام و ارشاد کو پس پشت رکھ کر محرمات شرعیہ کے حلال ہونے کا اس دلیری سے۔ تمام ممالک اسلامیہ میں حکم نہ فرماتے۔ ولید صاحب قرآن پر تیر بارانی نہ کرتے۔ اپنی دختر نا کتخدا کا ازالہ بکارت نہ فرماتے۔ اپنی معشوقہ حبابہ یا نورالصباح کے مردہ مجسمہ کے ساتھ مقاربت نہ کرتے۔ حالت جنب میں جامع مسجد میں اپنی کنیز خاص سے امامت نہ کرواتے۔ سقف کعبہ پر بیٹھکر مے نوشی کے جلسے جمانے کا قصد و جرارت نہ فرماتے۔

یہ اُنھیں علماء و فقہاء کی چشم پوشی تھی۔ اور خلفاء کے اِن کیفر کرداریوں کی طرف سے گراں گوشی اُن کی چشم پوشی اور بیشبہ بگوشی کا خاص سبب وہی سلطنت کے زیر اثر اور اُسکا قطعاً دست نگر ہونا تھا۔ اور زیر اثری اور دست نگری کا باعث اُن کی شکم پروری تھی۔

دورۂ بنی اُمیہ تک ان ناگفتہ واقعات کی نسبت اگر یہ عذر کیا جاوے۔ کہ قوم حضیض جہالت سے نکلکر اوج علم و تہذیب تک نہیں پہونچی تھی۔ تو یہ عذر بدتر از گناہ سمجھا جاویگا۔ اور حدیث خیر القرون کی موضوعیت کو صاف صاف ثابت کر دیگا۔ صرف اتنا ہی اشارہ کرکے ہم علمائے عہد بنی اُمیہ کے اطوار و کردار سے زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے۔ اب ہم اسلام کے خاص علمی زمانہ میں۔ جب خاص

علوم اسلامیہ کے علاوہ ہر اقسام کے علوم و فنون۔ دیگر ممالک و اقوام کی زبانوں سے ترجمہ ہو کر ملک و قوم میں نہایت سرعت و وسعت سے پھیل رہے تھے۔ جب ملک عرب کا علمی آفتاب تمام دُنیا کے ممالک پر ضو افگن تھا۔ جب اُسکے تمدن۔ تہذیب۔ ادب۔ غرض کہ تمام کمال و فضل کی شہرت اور ندرت تمام اقطاع عالم میں اپنی روشنی پھیلا رہی تھی۔ اُسوقت اور عین اُس عالم میں قرآن و حدیث کی خاص عظمت و حرمت کی کیا صورت قائم تھی۔ ہم صرف دو مفصلہ ذیل واقعات سے اس کا منظر پیش کرتے ہیں۔

ہارون الرشید اور قرآن کی عظمت ہارون الرشید کا دربار گرم ہے۔ خلیفہ کی خدمت میں دو کنیزیں لائی گئیں۔ ایک بیوہ ہے۔ ایک کنواری۔ مگر اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے اُن میں کوئی فرق یا تمیز نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور وہ بیوہ (شلیط) بھی اُس دوشیزہ سے اپنے حسن و جمال اور صورت۔ بے مثالی میں ہرگز کم نہیں تھی۔ خلیفہ عصر نے دربار اُٹھایا۔ خلوت کرلی۔ دونو شاہدان پری پیکر کو پہلو میں بٹھالیا۔ چشم زدن میں بقدر مشترک دونوں پر فریفتہ ہوگیا۔ مگر دونوں کی دلربائی و رعنائی کی یکتائی کی وجہ سے ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کی بے ادبی نہ کرسکتا تھا۔ دیر تک دونوں حسینان ماہوش کو بٹھلائے رکھکر خال خال اور موبمو دونوں کے حسن و زیبائی کے مرقع کو دیکھتا رہا۔ حُسن و عشق کے امتحان لیتا رہا۔ مگر کوئی فرق اور کوئی نتیجہ نہ پاسکا۔ وہ شاہدان آئینہ رخسار بھی خلیفہ عہد کی منظور نظر ہونے کے شوق و تمنا میں فیصلہ شاہی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ اور خلیفہ عصر کے کشمکش و پیچ کی وجہ کو بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔

جب بادشاہ کے غور و تامل کو حد سے زیادہ عرصہ گذر گیا۔ تو اُن میں سے ایک پری رو نے ہارون الرشید کو مخاطب کرکے کہا۔ کہ یا ایہا الامیر۔ اتنے طول و طویل غور و فکر فرمانے کی ضرورت کیا ہے اسمیں شک نہیں۔ کہ میں ایک زن شلیط ہوں۔ اور میری بہن باکرہ ہیں۔ مجھ میں اور اُن میں تو صرف ایک ہی شب کا پردہ حائل ہے صبح ہوئی۔ اور وہ پردہ اُٹھ گیا۔ پھر یہ بھی ہماری ہی ایسی ہو گئیں۔ یہ سُنکر اُس دوشیزہ مہوش نے جواب دیا۔ یا ایہا الامیر۔ میری بہن نے جو کچھ کہا۔ وہ بالکل سچ ہے مگر اس سچ کہنے سے پہلے اُن کو سمجھ لینا چاہتا تھا کہ۔ گو وہ ایک ہی رات سہی۔ مگر کیسی ہے۔ ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ خدائے تعالٰے فرماتا ہے۔ خیر من الف شھر قدر و قیمت میں ہزار مہینوں سے بہتر۔ (نعوذ باللہ) ہارون رشید۔ بمصداق اینکہ ۵ بساکین لطف از گفتار خیزد۔ اس کا یہ مدلل معقول اور برجستہ جواب سُنکر ہزار جان سے اُس کا فرادا پر فریفتہ ہوگیا۔ اور فوراً اُس کو

اپنے محل شاہی میں داخل کر لیا۔
یہ صحبت عیش سلطانی اور استعمال و تطبیق آیات قرآنی۔ عبرت۔ عبرت۔ عبرت۔

ہارون الرشید اور عظمت قرآن کی دوسری مثال اسکی دوسری مثال باعتبار رکاکت اور تنگی کے لطیف تر ہے۔

ہارون الرشید ایک بار ہیجان شہوت کی حالت میں سوتے سے جاگ پڑا۔ اتفاق سے کوئی کنیز اُسوقت اُس کے پہلو میں موجود نہ تھی۔ بے چین ہو کر خلوت سے باہر نکل آیا۔ اور محل شاہی کے گوشوں میں اپنے شاہد مدعا کو تلاش کرنے لگا۔ اس تجسس و تلاش میں اُس نے ایک کنیز کو ریشمی چادر اوڑھے مشغول خواب پایا۔ ہارون کے آتے ہی وہ بیدار ہو گئی۔ تو امیر المؤمنین کو سرہانے کھڑا پایا۔ ہارون نے اظہار مدعا کیا۔ اُس نے عذر نسائیہ کی معقول اور وجہ خاص دکھلا کر اپنی مجبوری بیان کی۔ مگر ہارون کی آتش نفسانی ایسی بڑھی ہوئی تھی۔ کہ وہ کسی طرح اُسپر ضبط و صبر کا پانی نہ ڈال سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اُسکے ساتھ خلاف وضع فطری مرتکب ہونا چاہا۔ اور مجامعت کو اغلام سے مبدل کرنے کی تجویز ٹھہرائی۔ اُس کنیز نے امیر المؤمنین عہد کو اس حرکت بہیمیہ سے باز رکھنے کے لیئے کہا۔ کہ یا ایہا الامیر۔ "اتوھن من حیث امرکم اللہ یعنی عورتوں سے وہی فعل کرنا چاہیئے۔ جسکا خدا نے حکم دیا ہے" یہ سنکر ہارون نے کہا۔ کہ نساء کم حرث لکم فاتو احرثکم انی شئتم عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تم جس طرح چاہو۔ اُن میں کھیتیاں کر سکتے ہو۔ کنیز بولی۔ بجا ارشاد ہوتا ہے۔ مگر یہ آیہ منسوخ ہو چکا ہے۔ اور اس کا ناسخ واتوا البیوت من ابوابھا گھروں میں دروازے سے آیا کرو۔ موجود ہے۔

زہرۃ الربیع نعمت اللہ جزائری ص ۳۴۲

کس کس کی تعریف کی جاوے۔ امیر المؤمنین کی نظر فی القرآن کی یا اُس کنیز کے تبحر فی الکلام کی مگر ہم تو تعریف کریں گے علمائے کرام کی۔ جن کی فیاضانہ تعلیم نے اصول تعمیم کی بدولت قرآن مجید کے اقتباسات کی یہ تنگی اور توہین کرائی۔

ہم نے صرف تعلیم قرآن کی تعمیم سے جو خراب نتیجہ پیدا ہوا تھا۔ دو مثالیں بیان کر دی ہیں جن الفاظ و بیان کو ہم نے اور دوسری مثالوں سے کسی قدر معتدل۔ قریب التہذیب اور قابل نقل و تحریر سمجھا ہے۔ اور باقی حقیقتاً دوسری مثالیں حیوانیت اور نفسانیت کے مفصل دفتر ہیں۔ اور جو کسی طرح ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اُن کو قطعاً مرفوع القلم کر دیا ہے۔

اہانت قرآن کے بعد۔ احادیث کے ساتھ جو استہزا و تمسخر کیا گیا ہے۔ اور واقدی۔ عروہ۔ ابن زبیر زبیر ابن بکار۔ عکرمہ۔ جاحظ عثمانی۔ آغانی۔ اور ابو النواس ملک الشعراء عباسی نے۔ جن بد عنوانیوں

اور بے ادبیوں سے اُن کا استعمال کیا ہے۔ اُنھیں کے بے ادب اور گستاخ قلموں کے سوا نہ کسی دوسرے کے قلم کو اُن کی نقل و تحریر کی قوت ہے۔ اور نہ کسی کی زبان کو اُن کی تفصیل و بیان کی قدرت اُنسے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ جب قرآن مجید کے ساتھ اُن کے ایسے آزادانہ اور بے ادبانہ عمل ثابت ہوتے ہیں۔ تو حدیثیں تو قرآن ہی کی تفسیر ہوتی ہیں۔ اور علی الاکثر انہیں سے ماخوذ و مستخرج ہوتی ہیں۔ دوسری یہ کہ اِن میں سے چیدہ چیدہ عنوانیوں کو ہم عنقریب ایک جداگانہ عنوان سے بیان کرنیوالے ہیں۔ انشاء اللہ۔

اِتنا لکھکر اور صرف قرآن مجید کے ساتھ اہل قرآن مجید کے ان عامیانہ اور گستاخانہ طرز عمل کو دکھلاکر اصل حقیقت کا انکشاف کلی کر دیتے ہیں۔ کہ تحقیق اور تنقید مرقومہ بالا سے ان تمام معائب اور نقائص اور فضائح کا الزام حضرات عالمین فی القرآن والحدیث پر آکر ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ قرآن و حدیث کے مطالب و معانی کے بتلانے والے تنہا یہی بزرگوار ثابت ہوتے ہیں۔

صحابہ محتاطین افسوس کہ اِن حضرات نے اُنکی تعلیم و تلقین میں اُس حزم و احتیاط کو ذرا بھی قائم نہ رکھا جن کی نسبت اُنھوں نے اکثر صحابہ کبار اور محتاطین ذی اعتبار سے۔ جو اُن کے اِن علوم میں معلم و اُستاد تھے۔ ہدایت خاص پائی تھی۔ اور جو عموماً تمام اسلامی کتب و اخبار میں مرقوم و مذکور ہے۔ وہ تمام تر انھیں حفظ ما تقدم پر مبنی تھیں۔ جن میں سے ایک کو خود شبلی صاحب بھی صحیح مسلم کے اسناد سے اِن الفاظ میں نقل فرماتے ہیں۔

(قال النبی صلعم) لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔

(فرمایا رسول خدا صلعم نے) مجھ سے جو سنو اسکو قلمبند نہ کرو۔ بجز قرآن کے۔ اور کسی نے قلمبند کیا ہو۔ تو اُسے مٹا ڈالو۔

یہ حکم کیوں دیا گیا تھا؟ فوراً سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ عوام الناس کی افراط تفریط بے ادبی اور بے ترتیبی کے آئندہ خطرے اور اندیشے سے۔ زبان رسالت سے اِس حکم امتناعی کو سُنکر ایک مدت خاص تک اکثر صحابہ محتاطین نقل حدیث وغیرہ سے احتیاط کرتے تھے۔ شبلی صاحب صحیح بخاری کے اسناد سے سائب ابن یزید کی مفصلہ ذیل روایت نقل فرماتے ہیں۔

صحبت عبد الرحمان ابن عوف۔ طلحہ ابن عبد اللہ والمقداد وسعداً فما سمعت احداً منهم یحدث عن النبی صلعم الا انی سمعت طلحہ یحدث عن یوم اُحد۔

میں عبد الرحمان ابن عوف۔ طلحہ ابن عبد اللہ مقداد اور سعد (ابن ابی وقاص) کی صحبت میں رہا۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی کو بھی حدیث رسول صلعم بیان کرتے نہیں سُنا بجز اسکے کہ طلحہ غزوۂ اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔ دیباچہ ص ۱۲

مگر یہ صحابہ بھی تمام تر محتاط نہ تھے۔ اکثر حضرات نے اِن میں سے آگے چلکر نقلِ حدیث کا کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اِس حکم امتناعی کے متعلق شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے۔ کیونکہ متعدد حدیثوں سے ثابت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔ کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو محفوظ نہیں تھیں البتہ عبداللہ ابن عمر مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ آنحضرت صلعم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ اور میں لکھتا نہ تھا۔ ایک روایت میں ہے۔ کہ حضرت عبداللہ ابن عمر کی عادت تھی۔ کہ آنحضرت صلعم سے جو کچھ سُنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے اِن کو منع کیا۔ کہ آنحضرت صلعم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور کبھی خوشی میں۔ اور تم سب لکھ لیا کرتے ہو۔ عبداللہ ابن عمر نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت صلعم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ تم لکھ لیا کرو۔ اس سے جو نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے۔ کہ اُس بیاض کا نام جس میں عبداللہ ابن عمر نے آنحضرت صلعم کی حدیثیں قلم بند کیا کرتے تھے۔ صادقہ تھا۔ دیباچہ ص ۱۰

شبلی صاحب کی مرقومہ بالا عبارت سے اتنا معلوم ہو گیا۔ کہ آنحضرت صلعم کی حدیثوں کی نقل کا آغاز آپ ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ مگر اکثر صحابہ اُسوقت بھی احتیاط اور تامل سے کام لیتے تھے جیسا کہ امام بخاری کے اسناد سے اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ نقل حدیث میں اس احتیاط کا اثر آنحضرت صلعم کے بعد بھی اکثر صحابہ میں باقی اور قایم رہا۔ چنانچہ شبلی صاحب بھی دیباچہ ص ۵۷ میں تحریر فرماتے ہیں۔

جو صحابہ بہت محتاط تھے۔ حدیث کی روایت کرتے وقت اُن کی حالت متغیر ہو جاتی تھی سنن ابی ماجہ کے دیباچہ میں عمر ابن میمون کا قول نقل کیا ہے۔ کہ میں عبداللہ ابن مسعود کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا۔ میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ آنحضرت صلعم نے یہ فرمایا۔ ایک دن اتفاق سے اُن کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا۔ تو دفعتاً سر جُھکا لیا۔ پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کھڑے ہیں۔ قمیص کی گھنڈیاں کُھلی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں۔ گلے کی رگیں پھول گئی ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ کہ آنحضرت صلعم نے یوں کہا۔ یا یوں کہا۔ یا اس سے کچھ زیادہ۔ یا اس سے کچھ کم۔ یا اس کے مشابہ۔

امام شعبی کہتے ہیں۔ کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی خدمت میں سال بھر رہا۔ لیکن میں نے اُن کو

کبھی حدیث روایت کرتے نہیں سُنا۔ [عـہ]

سائب ابن یزید کہتے ہیں۔ کہ میں نے سعد ابن مالک کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا۔ اس تمام راہ میں اُنھوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت صلعم سے روایت نہیں کی۔ حالانکہ وہ صحابی تھے۔

حضرت عبد اللہ ابن زبیر نے اپنے والد ماجد سے پوچھا۔ کہ میں نے آپ کو اور صحابہ کی طرح روایت کرتے نہیں دیکھا۔ اُنھوں نے کہا۔ میں جب سے اسلام لایا۔ میں نے کبھی آنحضرت صلعم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ لیکن میں نے آنحضرت صلعم سے سُنا ہے۔ کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیئے۔ کہ اپنا گھر آگ میں بنالے

ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ کہ خود آنحضرت صلعم نے منبر پر ارشاد فرمایا۔ ایاکم وکثرۃ الحدیث عنی۔ خبردار مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ بیان کرو۔"

دیباچہ ص ۷۵ میں تو بیان حدیث میں خود مخبر صادق علیہ السلام کے قول سے یہ حزم و احتیاط نقل فرمائی گئی ہے۔ اور پھر برخلاف اس حکم امتناعی۔ تنبیہ عن الکثرت اور حزم و احتیاط بیان الحدیث اُنھیں مرویات احادیث کی دیباچہ ص ۱۱ میں ان عبارت و الفاظ کے ساتھ یہ صورت قائم کی گئی ہے کہ۔

آنحضرت صلعم کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اسقدر ترقی ہوئی گئی۔ کہ بنو العباس سے پہلے۔ ولید ابن یزید کے قتل کے بعد۔ جب احادیث و روایات کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا۔ تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔ پھر صفحہ ۱۳ میں مرقوم ہے۔

سعد ابن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے۔ اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے۔ علامہ ابن عبد البر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں۔

عـہ شبلی صاحب کا عبد اللہ ابن عمر کی نسبت عدم نقل حدیث کا بیان اور شبلی صاحب کا اُس پر اعتبار اور سند اُس کا اظہار ہرگز قابل قبول نہیں۔ کیونکہ بالکل خلاف واقع ہے۔ اگر ابن عمر کا بھی طرز سکوت مانا جاوے تو پھر اتنی اُن کی مرویات کہاں سے ثابت کی جائیں گی۔ شاید بیعت یزید کے قبل اُن کا یہ طرز عمل ہو۔

المولف عفی عنہ

عن سعد ابن ابراهیم امرنا عمر ابن عبد العزیز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث الی كل ارض له علیها سلطان دفترا۔

سعد ابن ابراہیم کہتے ہیں۔ کہ عمر ابن عبد العزیز نے ہمکو احادیث کے جمع کرنیکا حکم دیا۔ ہمنے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ عمر نے جہاں جہاں انکی حکومت تھی۔ ایک ایک دفتر بھیجدیا۔

بالکل ایسے ہی اُن سے قبل کے خلفاء و امراء نے تحریر و اجرائے احادیث میں۔ گو وہ تمام تر موضوعات ہی کیوں نہ ہوں۔ اپنی سطوت سلطانی کے اثر سے۔ جیسی کوشش و تاکید کی۔ وہ ہم امام مدائنی کے الفاظ و عبارت میں اُوپر لکھ چکے ہیں۔ تو اب زمانہ ابتدائے اسلام کی امتناع و احتیاط نقل حدیث کو جیسے شبلی صاحب خود لکھ چکے ہیں۔ اس زمانہ کی کثرت حدیث اُسکا عامیانہ اور بے ادبانہ استعمال ہے جو شبلی صاحب کی اور نیز دیگر محققین کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے۔ ملایا جاوے۔ تو صاف صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ اصحاب مانعین نقل حدیث کا مدعا۔ حرمت قول رسول صلعم کا استحفاظ تھا (جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہو) برخلاف ان کے ارباب مجوزین نقل حدیث کو۔ نقل و بیان حدیث کے اکثار سے بادشاہوں کے دربار میں اپنا اقتدار اور اسلامی امصار و دیار میں اپنے محدث ہونے کا اعتبار بڑھانا تھا۔ جس کی اصل حقیقت کو شبلی صاحب نے تمام تر چھپایا ہے۔ امام زہری کے حالات میں صرف ان کے تعلق دربار اور ہشام کے معلم الاطفال کا اشارہ فرمادیا ہے۔ مگر آپ سے زیادہ۔ شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ شریف کے مقدمہ میں ان کے حالات کا انکشاف فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

واقدی کے حالات میں تو شبلی صاحب لکھ چکے ہیں۔ کہ گویا وہ سلطنت کے ہاتھ بکا ہوا تھا۔ مگر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ واقدی ہی پر موقوف نہیں۔ باستثنائے معدودے چند۔ قریب قریب تمام حضرات سلطنت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور کیونکر نہ ہوتے۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ اور اُسی کے ساتھ معاشرت۔ تمدن۔ اخلاق اور مذاق سب کچھ متغیر ہوگیا تھا۔ احکام رسالت کے ساتھ عوض۔ فرامین سلطنت اور نصاب شریعت کی جگہ قواعد سیاست واجب الاتباع تھے۔ اور انھیں کے اتباع پر گذران اوقات۔ اور ضروریات حیات منحصر تھے۔ ضرورت خودداری اور دیانتداری کو قائم نہیں رہنے دیتی تھی۔ سطوت حکومت۔ خوف سلطنت ہر دم و ہر لحظہ گلوگیر تھا۔ راست گوئی کے جوہر کو قتل و ہلاکت کا خوف زائل کرچکا تھا۔ حق جوئی اور انصاف امرا پرستی کے نظر ہوچکے تھے۔ اس بنا پر ان حضرات سے کمال تدین و اعتبار کی امید و یقین محض بیکار ہے۔ یہ وظیفہ خواران سلطنت کہاں تک استحفاظ دیانت کرسکتے تھے۔

خلافت راشدہ کے زمانہ ہی سے وظیفہ خواری کا عمل آغاز تھا۔ جو حضرت عمرؓ کی خاص ایجاد تھی۔ اور ان تمام آیندہ مواد و فساد کی مورث۔ ایک وظیفہ خوار خلافت عبد الرحمٰن بن عوف نے مرنیکے بعد اپنی اتنی دولت وافر چھوڑی تھی۔ کہ اُن کی ایک زن مطلقہ کو۔ جس کی حقیقت شانزدہ اثنا ثمنیت میں بنصاب شریعت آٹھویں حصّہ سے بھی کم تھی۔ اسی ہزار دینار ملے تھے۔ باسناد کنز العمّال ملا علی متقی صاحب موضوعات وقس علیٰ ھذا توکل قناعت خودداری اور احتیاط کو قطعًا فراموش کر دیا جس کی تعلیم وہ زمانہ رسول صلعم میں ایک مدت تک پا چکے تھے۔ اب وہ خلفائے عصر کی ان ماہانہ داد و دہش اور تمام شروع جہادوں کی غنیمت سے مالا مال اور فارغ البال ہونے کے عادی اور خوگر ہو چکے تھے۔

رسول اللہ صلعم کے بعد جہاد و اجتہاد دونوں تباہ و برباد کر دیئے گئے

اگر حقیقت بینی اور انصاف سے کام لیا جاوے۔ تو ثابت ہو جائیگا کہ اُصول تعمیم کی تقلید نے اسلام میں حکم جہاد و اجتہاد دونوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور ان دونوں عملیات اسلامی کی وہ ناگفتہ بہ حالت ہے۔ کہ آجکل مخالفین و معاندین دین کی جتنے حملات و اعتراضات اسلام پر وارد ہوتے ہیں۔ وہ انھیں دونوں اُمور کی بدعنوانی اور بے ترکیبیوں کے باعث۔ اگر زمانہ رسالت کے عمل بالجہاد اور اُس کی تعمیل و اجرا میں حزم و احتیاط۔ اُسکے قواعد و نصاب پر نظر کیجائے۔ اور اُن کو زمانہ خلافت کے جہاد کی عملی صورتوں سے ملایا جاوے۔ تو ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ عہد رسالت کا جہاد۔ غایت مجبوریوں کے وقت اپنی حفظ خود اختیاری کی ضرورت سے دشمنوں کے قاتلانہ حملات کا مدافعانہ جواب تھا۔ بخلاف اسکے زمانہ خلافت کا جہاد۔ توسیع ملک۔ ترقیٔ اقتدار، حصول دولت۔ وصول غنیمت۔ اجرائے مدعائے خود غرضی و نفسانیت کی بنا پر مبنی تھا وہ ان صورتوں میں جہاد شرعی کا حکم نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ملک گیری کے عام معارک جنگ میں شمار ہوتے تھے۔

جہاد حصول دولت کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔

زمانہ خلافت میں حصول دولت۔ وصول غنیمت کا پورا ذریعہ بنا کر اور مذاق زمانہ کے بالکل مطابق پا کر۔ فرائض اسلام میں سے ایک فرض جہاد کو بڑی اہمیت کے ساتھ واجب التعمیل سمجھ لیا گیا تھا۔ اور اُمت اسلام کے ہر خاص و عام کا اسی پر عمل درآمد قائم تھا۔ عرب کے تمام قدیم مشاغل و کاروبار متروک کر دیئے گئے۔ یہانتک کہ تجارت جو اُنکا معیار قومیت تھی۔ قطعًا بند کر دی گئی۔ حقیقتًا اسلام میں دولت کیا آئی۔ قیامت آئی۔ قناعت۔ توکل اور صبر رخصت ہو گئے۔ تلاش معاش۔ تمنائے تمول اور فکر تعیش دامن گیر ہو گئی۔ جہاد حکم خداوندی تھا۔ اور ایک

خاص حالت وصورت تک مشروط ومحدود تھا۔ اس کے اصل مقصد ومدعا کو بگاڑ کر۔ ملکی حملات اور جنگی تاخت وتاراج اور عام قتل وغارات کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کی نظیر میں۔ عہد رسالت میں بنی خزیمہ پر خالد ابن ولید کا خود غرضانہ اور ظالمانہ حملہ۔ اُس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سخت عتاب اور درگاہ رب العزت میں (انی ابراء الیك مما صنع خالد) ۔ (خدایا جو کچھ خالد نے کیا۔ میں اُس سے بالکل بری ہوں) کے ایسا معذرتانہ خطاب۔ ایک طرف رکھا جاوے۔ اسی کے مقابلہ میں اُنھیں خالد ابن ولید کا زمانہ خلافت میں مالک ابن نویرہ سے جہاد۔ اُس کے مال وآبرو کی ظالمانہ غارت۔ اُنکے طرز عمل پر حضرت عمر کی خاص گرفت۔ دوسری طرف رکھی جاوے تو جہاد شرعی وغیر شرعی اور اصلی وغیر اصلی کا پورا انکشاف ہو جاتا ہے۔ اور ثابت ہو جاتا ہے کہ نصاب جہاد کی زیادتی اور شائبہ شدت کے موقع پر اُس حقیقی داعی کلمۃ اللہ اور اصلی مجاہد فی سبیل اللہ روحی الفداہ کی تشویش، تردد۔ اور اضطراب کا کیا عالم ہو جاتا تھا۔ وہ اُس کے معذرتانہ قول اللھم ابراء الیك مما صنع خالد کے بار بار فرمانے سے ثابت ہے۔ اور پھر اُنکے مابعد کے طرز عمل سے بھی کما حقہٗ ہویدا وآشکار ہے۔ جو بنی خزیمہ کے خون ناحق کی دیت میں اُسے اپنی جگہ پر اپنے خاص نفس نفیس۔ اپنی ذات خاص کے مماثل اور راہ خدا کے مجاہد کامل کو بھیجکر اپنی مالیت خاص سے اُنکے جانوروں تک کی دیت وقیمت کوڑی کوڑی کرکے ادا فرمائی۔ رسالت کے جہاد اور اُس میں کسی بدعنوانی اور فروگذاشت پیدا ہو جانے پر ادائے دیت اور مظلومین کی دلجوئی اور تسکین میں اس احتیاط والتفات سے کام لیا جاتا تھا۔

زمانہ خلافت کے جہاد اور اُس میں بدعنوانیوں اور بے ترکیبیوں کی یہ حالت تحقیق سے ثابت ہوتی ہے۔ کہ شکایت پر شکایت ہو رہی ہے۔ استغاثہ پر استغاثہ پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر نہ کوئی شنوا ہوتا ہے۔ اور نہ کوئی اعتنا و توجہ کرنیوالا۔ اسی ایک مثال کو پیش نظر رکھو کہ جس میں حضرت عمر کے ایسے ولیعہد اور منتظر الخلافت بزرگ کی بھی کچھ نہ چلی۔ اور بالآخر مالک ابن نویرہ کا خونبہا آجتک خلافت کے ذمہ رہا۔ جہاد رسالت اور جہاد خلافت کا فرق مابہ الامتیاز ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

یہ جہاد حقیقتاً جہاد نہیں باقی رہے تھے۔ بلکہ ملکی فرمانرواؤں اور اُن کی رعایا کے ایک کاروبار تھے جس نے اتفاق سے بڑا فروغ پایا۔ یہانتک کہ ملک وقوم کا عام مذاق۔ عام مشغلہ اور گذران اوقات کا ایک ہی ذریعہ ووسیلہ قرار پا گیا۔ اُسوقت بلا امتیاز واختصاص صحابہ کبار کے طبقہ میں تمام مہاجر وانصار مجاہد ہی مجاہد نظر آتے تھے۔ بہت کم ایسے بزرگوار تھے۔ جو علمی مذاق رکھتے تھے۔ اور قوم وملت کی

قلمی خدمت کرتے تھے۔ اور جو لوگ شاذونادر ان مشاغل میں مصروف تھے۔ علی الاکثر وہی افراد قوم تھے۔ جو پیری کے ضعف و نقاہت کی وجہ سے جنگی کاموں سے بیکار ہوگئے تھے۔ یا وہ حضرات تھے جو ان جہادوں کی حقیقت کو سمجھ کر ان کی شرکت سے اعراض فرماتے تھے۔ اور متوکل بخدا ہو کر گھر بیٹھے تھے۔

کیا عہد رسول صلعم میں صحابہ کبار مجاہد نہیں تھے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ۔ کیا عہد رسول صلعم میں تمام صحابہ کبار مجاہد نہیں تھے۔ اور خدمات جہاد انجام نہیں فرماتے تھے۔ جواب یہ ہے ہاں سب جہاد کرتے تھے۔ مگر مجاہدین میں ہمیشہ انتخاب بھی ہوا کرتا تھا۔ اور یہ انتخاب جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص تجویز پر منحصر و موقوف ہوتا تھا۔ اور طریقہ انتخاب بالکل نصاب جہاد کے اصول منصوصہ پر مبنی ہوتا تھا۔ نصاب واجبات کے اعتبار سے جو شخص ان میں تکلیف جہاد کے لیئے مکلف سمجھا جاتا تھا۔ وہ مجاہدین کی فہرست میں داخل کیا جاتا تھا۔ اور خدمات جہاد کی انجام دہی کے لیئے مجوز ہوتا تھا۔ ورنہ غیر مکلف کو کبھی تکلیف جہاد نہیں دی جاتی تھی۔

اس کے علاوہ جناب رسولخدا صلعم کے عہد میں جہاد ادائے واجب کی خالص نیت اور کامل ارادے سے کیا جاتا تھا۔ اور جہاد بعد رسول اللہ صلعم توسیع ملک اور حصول دولت کے اغراض ذاتیات کے قصد سے۔

خالص جہاد کی عملی مثال

مثال کے لیئے جنگ اُحد میں۔ حضرت علیؑ اور ایک کافر کا مقابل ہونا حضرت علیؑ کا اس پر غالب آنا۔ کافر کا زخمی ہو کر گرنا۔ حضرت علیؑ کا سر کاٹنے کی نیت سے اس کے سینہ پر چڑھنا۔ کافر کا روئے مبارک پر تھوک دینا۔ آپ کا فوراً اس کو ویسا ہی چھوڑ کر اپنی صف میں اپنے مقام پر واپس چلا آنا۔ صحابہ کا باعث عفو پوچھنا۔ حضرت علیؑ کا جواب میں ارشاد فرمانا۔ کہ اسوقت تک میرا جہاد ادائے واجب کی خالص نیت کے ساتھ تھا۔ اب جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ تو ایسی حالت میں اسکے سر کاٹ لینے سے میرے خلوص جہاد میں شرکت نفس واقع ہو جاتی۔ یہ بہت مشہور واقعہ ہے۔ مولوی روم نے اپنی مثنوی میں بڑی شرح و بسط سے پورے واقعہ کو نظم کیا ہے۔ جس کا شعر اول یہ ہے۔ ؎

او خیو انداخت بر روئے علیؑ ٭٭ افتخار ہر وصی و ہر ولیؑ

کافی ہے اگر تحقیق و غور سے کام لیا جائے۔ تو ایسے خالص مجاہدین عہد رسول صلعم میں اکثر نظر آئیں گے۔ مگر افسوس کہ رسول صلعم کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ صورتیں تو باقی رہتی ہیں۔ مگر ان کے عمل جاتے رہتے ہیں

حضرت عمرؓ کی خلافت میں۔ محاصرہ روم کے موقع پر۔ جب قیصر کی کثرت فوج کی خبر نے مدینہ کے تمام اہل اسلام کو گھبرا دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے مجلس مشورت جمع کی۔ اور اُس میں بالخصوص حضرت علیؑ سے مستفسر ہوئے۔ تو اُنہوں نے مقابلہ ومقاتلہ کی مفید اور ضروری تدبیریں تبلاکر یہ فقرات بھی آخر میں اُن سے ارشاد فرمائے۔ کہ یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ عہد رسول صلعم میں ہم لوگ تعداد فوج کے اعتبار پر نہیں لڑتے تھے۔ بلکہ معارک جنگ میں ادائے واجب اور خلوص نیت ہمارا نصب العین ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو تاریخ ابن اثیر جلد ۳ و تاریخ اعثم کوفی جلد ۲ نسخہ قلمی۔

زمانہ خلافت میں ایسے خالص جہاد کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اور ایسے کامل مجاہدین کی شاذ و نادر صورتیں دکھلائی دیتی ہیں۔ اسی بنا پر مخالفین اسلام کے اُن تمام بیجا اور بے سروپا تعریفات کا جو مغزوات النبی صلعم اور عقائد جہاد کے متعلق وارد کرتے ہیں۔ نہایت آسانی سے شافی اور کافی جواب دے دیا جاتا ہے۔ لیکن جب بعد رسول صلعم۔ خلفاء و امراء کے جنگی مظالم اور ملکی مفاسد کے کشف حالات کرتے ہیں۔ تو سوائے اس کے کہ اُنکے معارک جنگ کو احکام جہاد سے بالکل بے تعلق تبلاکر۔ بادشاہوں کی معمولی ملکی لڑائی تبلائی جاوے۔ اور کوئی جواب معقول کسی سے بن نہیں پڑتا۔ نہیں معلوم کہ شبلی صاحب کا اس مسئلہ خاص میں کیا مختار تھا۔ مگر سر سید زمانہ خلافت کے تمام جنگ و جدلات کو جہاد کے معنیوں میں لینے سے قطعی انکار کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ تہذیب الاخلاق مضمون جہاد۔

جہاد کے ایسا اجتہاد بھی غارت ہوا۔

عہد رسول صلعم کے بعد۔ جیسا جہاد غارت ہوا۔ ویسا ہی اجتہاد سال جماعت (یعنی دومۃ الجندل کے بے ایمان فیصلہ کے بعد) سے تو جہاد کی اور ناگفتہ حالت ہو گئی جس کا نمونہ عہد معاویہ میں حرمین شریفین پر بُسر ابن ارطاۃ صحابی کا حملہ۔ طائف میں پسران عبد اللہ ابن عباس کا بحالت صغر سنی قتل کیا جانا۔ پھر عہد یزید ابن معاویہ میں۔ واقعہ کربلا واقعہ حرا۔ غارت مدینہ منورہ۔ احراق کعبہ معظمہ موجود ہے۔

جب بنی ہاشم کی طرف سے بنی اُمیہ کو خاطر خواہ اطمینان ہو گیا۔ اور حجاز۔ عراق۔ جزائر۔ مصر و افریقیہ تک خلافت کا تسلط ہو گیا۔ اور اختیار و اقتدار کے بعد۔ استقرار حکومت اور استمرار سلطنت کی تدبیر پیش نظر ہوئی۔ چونکہ ابتدا ہی سے مذہب حصول دُنیا کا ایک تیار آلہ قرار دے لیا گیا تھا اس لیئے اِس تدبیر میں بھی اُسی سے کام لیا گیا۔ صرف صورت بدل دی گئی۔ اور چونکہ تسلط ہو جانیکے بعد۔ جہاد اور مجاہدین کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیئے اُن کی جگہ پر اجتہاد۔ اور مجتہدین

حدیث و فقہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اِس بنا پر علمائے محدثین اور فقہائے دین طلب ہوئے، اور ان حضرات سے پہلے پہلے فضائل بنی اُمیہ میں تضع و ترصیع احادیث کی فرمائش ہوئی۔ جب ایسی حدیثیں حد و انحصار سے باہر اور ضرورت سے زائد ہو کر تمام ممالک اسلامیہ میں ذائع و شائع ہو گئیں۔ تو فضائل و مناقب خلفائے سابقین کی تجمیع و ترتیب کی ہدایت ہوئی۔ جیسا کہ علّامہ ابن مدائنی کی کتاب الاحداث سے اُوپر لکھدیا گیا ہے۔

یہ واقعات ثابت کر رہے ہیں۔ کہ خلفائے اوّلین کے عہد میں جس طرح جہاد و مجاہدین کی کثرت تھی۔ اُسی طرح خلفائے متاخرین بنی اُمیہ و عباسیہ کے زمانہ میں اجتہاد و مجتہدین سے شاہی دربار اور تمام امصار و دیار بھر گیا۔ پانچ سات برس پہلے جیسے جہاد ملکی پیشہ اور قومی کاروبار بنا لیا گیا تھا۔ بالکل اُسی طرح اُسوقت اجتہاد کبھی ذریعہ معاش اور بسر اوقات کا وسیلہ قرار دے لیا گیا۔ اور بقول امام مدائنی۔ وضعی حدیثیں بنانے کے لیے۔ خلافت کی طرف سے بڑے بڑے انعامات۔ جاگیریں اور خلعت ملا کرتے تھے۔ ہر عالم۔ فقیہہ۔ محدّث قاضی اور خطیب مال و دولت اور ثروت و تمکنت میں والیان ملکی سے کم نہیں تھا۔ ملک و قوم کی نگاہوں میں۔ اُن کی قدر و منزلت۔ حرمت و عظمت اُمراء و سلاطین سے فروتر نہیں تھی۔ اور یہ حضرات بھی اپنے اقتدار و اعتبار کے خیالوں میں اپنے آگے ملک و قوم کے معمولی طبقات کی کوئی ہستی نہیں سمجھتے تھے۔ معمولی عالم کی صحبت بڑے بڑے اُمرائے ملکی کی مجلس سے شان و شوکت میں کم نہیں تھی۔ کسی محدّث اور فقیہہ کی مجلس کی زیب و زیبائش قصر شاہی کی آرائش سے ہلکی نہیں تھی۔

مشہور بن علماء و محدثین کی نمود اریوں کا کیا ذکر۔ مرویات احادیث کے معمولی رواۃ کی خودنمائی دماغداری۔ رعونت اور خود نمائی دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں ہم ایک خود نما اور رعونت پسند رواۃ کی۔ جو صحیح بخاری۔ اور مسند امام احمد ابن حنبل کے ایسے مستند و معتبر کتب صحاح کا مشترک راوی ہے میزان الاعتدال ذہبی کی اسناد سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

عن ابن معین قال قدمنا علی غندر فقال لاحدّثکم حتی تمشوا خلفی فیہ اکمر اھل السوق فیکرمونی۔	ابن معین کہتے ہیں۔ کہ ہم غندر سے حدیث سُننے کے لیے گئے۔ جب اُس کے پاس پہونچے۔ تو اُس نے کہا کہ جب تک تم لوگ ہمارے پیچھے پیچھے بازار میں نہ چلو گے۔ کہ لوگ دیکھیں۔ اور ہماری تعظیم کریں۔ تب تک ہم تم کو حدیثیں نہ سنائیں گے۔

اب اس سے بڑھ کر اس راوی حدیث کی دُنیاداری کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ اِس غرض سے کہ لوگ

اُس کی قدر و منزلت کریں۔ شاگردوں سے اِسکی خواہش و فرمائش کرتا ہے۔ کہ وہ اُسکے پیچھے پیچھے بازاروں میں اور گلی کوچوں میں چلیں۔ اِس سے بڑھکر کم ظرفی اور دیانت طبعی کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے

محدث صاحب کا حد تعقل

اِس کے بعد اِس معلم حدیث اور محدث کی حد تعقل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فرمائش تو اتنی۔ اور عقل و دانش اتنی۔ اُسی میزان الاعتدال میں ہے۔ یحیٰی ابن معین کہتے ہیں۔ کہ غندر ایک روز بازار سے مچھلی لائے۔ گھر والوں کو دی۔ کہ اہتمام سے پکائی جائے۔ خلم دیگر سو گئے۔ گھر والوں نے مچھلی پکا کر کھا ڈالی۔ اور اُنکو سوتا کا سوتا چھوڑ دیا۔ لیکن مزاج کے قصد سے اُن کے ہاتھ میں شوربا لگا دیا۔ گہری نیند سے جب اِن کی آنکھ کھلی۔ تو فوراً مچھلی یاد آئی۔ کہنے لگے مچھلی لاؤ مچھلی لاؤ۔ گھر والوں نے کہا سبحان اللہ۔ ساری مچھلی ہضم کر گئے۔ پھر کہتے ہیں مچھلی لاؤ مچھلی لاؤ۔ ذرا ہاتھ سے تو سونگھو۔ غندر نے یقین کرنے کے لیے ہاتھ سونگھا۔ تو واقعی مچھلی کے شوربہ کی بو آتی تھی۔ تو خاموش ہو رہے۔

جب اُن کے حافظ و عقل کی یہ مقدار و کیفیت تھی۔ تو اُن کی قوت سامعہ اور استحفاظ کا کس عقل والے کو اعتبار ہو سکتا ہے۔

غندر کی وجہ تسمیہ

عقل کا اندازہ ہو چکا۔ اُسی میزان الاعتدال کی عبارت سے اِنکے مزاج کا بھی موازنہ کر لیا جاوے۔ اُن کے ملقب بہ غندر کی توجیہہ میں مرقوم ہے۔ ابن ابی جریج نے انکا یہ نام رکھا ہے اس لیے کہ بات بات پر یہ سب لڑتے اور جھگڑتے رہتے تھے۔ اہل حجاز ایسے مزاج والے آدمی کو غندر کہتے ہیں۔ اسی رعایت و مناسبت سے یہ بھی غندر ہو گئے۔

مندرجہ بالا واقعات سے کامل طور پر سمجھ لیا جاویگا۔ کہ محدثین اور علماء و فقہاء اسلام کی ان ایام میں کیا شان ہو گئی تھی۔ اور اُنکے آداب و معاشرت۔ اعمال و اشتغال اور اخلاق و مذاق میں سلطنت کے کتنے اثر پیدا ہو گئے تھے۔ وہ قیود احتیاط اور رشد و عفاف کی جگہ علائق دُنیا اور کسب معاش اور فکر تعیش میں مبتلا تھے۔ حدیثوں کا بیان و اعلان اُنکا پیشہ تھا۔ وہ اس کی تعلیم و تلقین کو خالصۃً للہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی گذران اوقات اور سامان معیشت کا ذریعہ سمجھکر عمل میں لاتے تھے حکومت کی تجویز کی تائید میں ہزاروں حدیثیں دن رات بنتی رہتی تھیں۔ اور ایک زبان سے ہو کر ہزاروں زبانوں پر چڑھکر متواتر ہونے کے خلعت پہنا کرتی تھیں۔ زمانہ کی ظلمت اور اہل زمانہ کی نکبت نے عالم اسلام میں غفلت کی وہ تاریکی پھیلا رکھی تھی۔ کہ کسی کے دل میں نہ خدا کا خوف باقی رہا تھا۔ اور نہ رسول کا درد جس نفس قدسی برکت پر رات دن اتنے اتہام باندھے جاتے تھے۔ اور کسی کو اسکا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ یہ تھا شمشیر سلطنت کا اثر۔ اور یہ تھا تدبیر حکومت کا دست مقدر۔ جس

سے شبلی صاحب اغماض فرماتے ہیں۔

احادیث موضوعات پر علماء کی ندامت۔

لیکن ان مصنوعات کے انبار احصار و شمار سے بھی زائد ہوگئے۔ اور ایتنے کہ حق و باطل کی تمیز بالکل دشوار ہوگئی۔ تو ان محدثین متقدمین کو اپنے نقل حدیث پر سخت ندامت دامنگیر ہوئی۔ اور معترفاً اقرار کرنا ہوا۔ کہ نقل و بیان حدیث کی نہ اتنی کثرت کی جاتی۔ اور نہ اقوال و ارشاد کی یہ امانت دیکھی جاتی۔ ان حضرات میں سے چند بزرگواروں کے اعترافات اور معذرتانہ کلمات ذیل میں ان کے خاص الفاظ کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں۔

کرہ الصالحون الاولون الاکثار من الحدیث ولو استقبلت من امری ما استدبرت حدیث الا ما اجمع علیہ اهل الحدیث۔

پہلے صحابہ زیادہ روایت بیان کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور واقعی روایت میں جو نقصان ہیں۔ اگر وہ پہلے سے مجھے معلوم ہوتے۔ تو میں ہرگز روایت نہ بیان کرتا۔ جن حدیثوں پر سب کا اجماع ہوتا صرف انھیں کو بیان کرتا۔

امام عبد اللہ ابن عبد الرحمن دارمی نے لکھا ہے:-

قال عاصم سألت الشعبی عن حدیث فحدثنیه فقلت انه یرفع الی النبی صلعم فقال لا علی من دون النبی صلعم احب الینا فان کان دون النبی صلعم۔

عاصم کا بیان ہے۔ کہ میں نے شعبی سے ایک حدیث پوچھی۔ انہوں نے بیان کردی۔ میں نے پوچھا۔ کیا آپ اسے جناب رسول خدا صلعم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہا نہیں۔ اس لیے کہ اگر حدیث کے لفظوں میں کمی و بیشی ہو۔ اور بغیر رسول صلعم کی طرف منسوب کی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ایضاً مسند دارمی میں مرقوم ہے:-

قال ابراهیم النخعی نهی النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم عن المحافله والمزانیه فقیل له اما تحفظ عن رسول اللہ صلعم حدیثا غیر هذا قال بلی ولکن اقول قال عبد اللہ قال علقمه احب الی۔

ابراہیم نخعی نے ایک روز محافلہ اور مزانیہ کی نہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت بیان کی۔ اس پر لوگوں نے کہا۔ کہ تمھیں کیا ایک ہی حدیث آنحضرت صلعم سے یاد ہے۔ کیونکہ آج تک کوئی اور حدیث تم سے سننے میں نہیں آئی۔ ابراہیم نے جواب دیا مجھے بہت سی حدیثیں یاد ہیں۔ مگر میں روایتیں محض عبد اللہ ابن مسعود اور علقمہ تک پہونچا دیتا ہوں۔ اور مجھکو یہی طریقہ پسند ہے۔

تذکرۃ الحفاظ ذہبی میں ہے۔ کہ امام شعبہ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ اور ان کو انس ابن مالک صحابی کی صحبت کا بھی شرف حاصل ہوا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو چار سو تابعین سے تقریباً دس ہزار حدیثوں کی روایت بھی کی ہے۔ کہ جس کے سبب سے ان کو فن رجال کا سنگ بنیاد رکھنے کا فخر حاصل ہے۔ اور نیز آپ کے

شاگردی پر امام سفیان ثوری محدث کو ناز ہے۔ پس آپ کو جس وقت حدیث کے نقصان پر اطلاع ہوئی۔ تو نہایت افسوس کے ساتھ فرمایا۔

وددت انی دقادالحمام ولم اعرف الحدیث	مجھے پسند تھا۔ کہ میں حمام میں ایندھن بنکر جلتا۔ اور کاش کہ حدیث کو جانتا

سفیان ثوری جن کا مقدس خطاب سید الحفاظ ہے۔ اور خدا جھوٹ نہ بُلوائے۔ تو بیس اور تیس ہزار کے درمیان اُنہوں نے روایت کی ہے جن کے فضل وکمال کا پایا۔ مالک اور یحیٰی ابن سعید القطان سے بھی زیادہ بلند تھا۔ جب ان پر حدیثوں کے نقصان وخرابی کا حال کھُلا۔ تو نہایت خوف وہراس اور افسوس ویاس سے فرمایا۔ کہ یہی غنیمت ہے۔ کہ قیامت میں مجھ سے میرے علم کے لیئے کوئی مواخذہ نہو۔ اور مجھے اپنے تمام اعمال میں حدیث کی روایت سے زیادہ کسی اور عمل سے اندیشہ نہیں ہے۔

تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی میں ہے۔ کہ اسحاق ابن اسمٰعیل الطالقانی جنکی کنیت ابوایوب ہے روایت حدیث سے ایسے بیزار ہوئے۔ کہ مرنے سے پانچ برس پہلے قسم کھائی کہ آج سے روایت نہ کروں گا۔

ایضاً تہذیب التہذیب میں ہے۔

ہشام دستوائی جنکا لقب الحافظ الحجۃ ہے۔ جب ان کو احادیث کی خرابیاں معلوم ہوئیں۔ تو اسقدر روئے۔ کہ آنکھیں جاتی رہیں۔ اور بار بار یہی فرماتے تھے۔ کہ اگر بازپرس سے چھوٹ جائیں۔ تو غنیمت ہے

بلی هشام الدستوائی حتی ذهبت عینه و یقول لیتنا ننجو من الحدیث۔	دستوائی کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں۔ کہتے تھے۔ کہ اگر احادیث کی بازپرس سے چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔

اُسی تہذیب التہذیب میں ہے۔ کہ حبان ابن ہلال باہلی نے روایات احادیث سے تنگ آکر اس کی کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے۔ کہ مسعر ابن کرام۔ جو کہ اعلام محدثین میں ہیں۔ ابن قطان جن کی نسبت فرماتے ہیں۔ کہ میں نے فن حدیث میں کسی کو ان کا ہمسر نہیں پایا۔ جب اُن کو واقعات روایات کے فسادات کا علم ہوا۔ تو ایسے پریشان ہوئے۔ کہ گھبرا کر فرمانے لگے۔

وددت ان الحدیث قواریر علی راسی فسقطت فتکسرت۔	مجھے یہ پسند تھا۔ کہ حدیثیں میرے سر پر سے آبگینہ بن کر گر تیں اور ٹوٹ جاتیں

حدیثوں کی کثرت اور کثرت کی بدولت اِن کی ذلت وحقارت کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ طبقہ کرام محدثین محتاطین میں اتنے حضرات نے آخر کار نقل وبیان احادیث پر اپنی طرف سے ندامت کا اظہار فرمایا۔ ندامت وحجاب ہی پر اکتفا نہ فرمائی۔ بلکہ اکثر بزرگوں نے مطلقاً اس کام ہی کو چھوڑ دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

کتب موضوعات کی تالیف کا زمانہ اِس کے بعد جب معاون سلطنت کے اقتدار میں کمی آئی۔ یا یوں سمجھا جاوے۔ کہ اب سلطنت کو اُن کی استمداد و اعانت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اور قوم وملک کے اہل علم وخبر اور صاحبان نظر واثر کو اتباع سلطنت اور خوف حکومت سے بھی کسی قدر آزادی اور فراغت حاصل ہوئی۔ تو احادیث رسول صلعم کے اِن مفاسد ومعائب کی طرف اُن کو غور وخوض کرنے کا پورا موقع ملا۔ بڑی فکر وتلاش اور سعی وکوشش کے بعد جعلی اور مصنوعی احادیث کا پتہ لگایا گیا۔ اور احادیث صحیحہ کو چن چن کر موضوعات کے انبار سے علیحدہ کیا گیا۔ اور علم اسماء الرجال کی امداد سے اِس موضوع خاص پر موضوعات فی الحدیث کے دفتر کے دفتر تیار ومرتب کئے گئے۔ موضوعات ابن جوزی۔ موضوعات شوکانی اور موضوعات ملا علی قاری وغیر اشباہم۔ اس علت کے معلول اور اس صنف خاص کے موضوع ثابت ہوتے ہیں۔

عام کتب احادیث کے علاوہ کتب صحاح کی صحت پر بھی نظر ڈالی گئی۔ اور باعتبار صحت۔ بخاری۔ مسلم ترمذی۔ علی الترتیب نمبر قایم کئے گئے۔ پھر صحیحین بخاری ومسلم کی سیادت فی الصحت کا مسئلہ پیش ہوا اور ان میں سے رطب ویابس کی تمیز وتنقیح کے بعد امام حمیدی اندلسی نے جمع بین الصحیحین تیار کی۔ مگر باایں ہمہ سعی وکوشش اور کد وکاوش کے کسی حدیث کی کتاب کی نسبت یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اسکی سب حدیثیں صحیح ہیں۔ اور اب کتاب میں کوئی غلط مشتبہ اور مخدوش روایت نہیں ہے۔ سوائے شبلی صاحب کے کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا۔ کہ صحیحین بخاری ومسلم میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں۔ شبلی صاحب اِس قیاس ورائے میں بالکل منفرد ہیں۔ مگر افسوس اُنکی دیباچہ میں آگے چلکر۔ صحیح بخاری کی روایات کو خود مخدوش۔ مشکوک اور اُنکے رواۃ کو ضعیف اور مشتبہ ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔

یہ امر بھی ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ کتب موضوعات میں اُنھیں احادیث سے انکار کیا گیا ہے جو موئید عقائد اور معین واقعات خلافت ثابت نہیں ہوتی تھیں۔ باقی وہ تمام موضوعات ومصنوعات جن سے عقائد اور خلافت کے مقاصد کی تائید وتاسیس ہوتی تھی۔ ویسی ہی کی ویسی رہنے دی گئیں

دیالمہ اور تائید علماء یہ امر بھی قابل گذارش ہے۔ کہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ موضوعات کی کتابوں کی تصنیف وتالیف کا زمانہ دولت عباسیہ کے زوال اور دولت دیالمہ اور حکومت آلِ بویہ کے اقبال سے آغاز ہوتا ہے۔ جن کا ہر ہر فرد تمام علوم وفنون کا موئید کامل تھا۔ اور تمام علماء و حکمائے اقطاع عالم کا مرکز تمنا۔

یہ زمانہ بھی اثر سلطنت سے خالی نہیں تھا۔

مگر باوجود اس کے تاریخیں ثابت کر رہی ہیں۔ کہ اسلامی تحقیق کا یہ روشن زمانہ بھی تعصب کی تاریکیوں سے خالی نہیں تھا۔ اور تسلط حکومت کی تدبیر اُسوقت بھی اگرچہ اظہار حقیقت سے کتنے ہی دور ہو۔ مدنظر رہتی تھی۔ انھیں تحقیقات اور حقیقت واقعات کی بنا پر خلیفہ معتضد باللہ نے ۲۸۳ھ میں اہل اسلام کے دلوں سے صرف خلفائے بنی اُمیہ کے خیال عظمت وحرمت کے ہٹانے اور مٹانے کے لیے۔ جو انہیں مصنوعی اور وضعی حدیثوں کی وجہ سے اُن کے ذہن نشین ہو رہے تھے۔ قصد کیا تھا۔ کہ ایک عام اعلان سلطانی کے ذریعہ سے ان اقسام کے عقائد باطلہ کی امتناع و استیصال کر دیا جاوے۔ مگر پھر وہی حضرات (علماء و فقہائے کرام) جو ان موضوعات احادیث کے ساصل کرنیوالے تھے۔ ایک دوسرے رنگ میں اسکے مانع ہوئے!! یہ پورا واقعہ تاریخ طبری کی مفصلہ ذیل عبارت میں ملاحظہ ہو۔

وفی سنة ثلاث وثمانین ومائتین عزم المعتضد باللہ بکتابة الطعن فی معویہ و ابنیه وابیه واباحة لعنهم وکان من جملة ماکتب فی ذلک بعد الحمد له والصلوۃ علی النبی انه لما بعثه اللہ رسولا کان اشد الناس فی مخالفته بنو امیة واعظمهم فی ذلک ابوسفیان وامران یقال ذلک فی البلاد ویلعن معاویة علی المنابر فقیل له ان فی ذلک استطالة العلویین وهم فی کل وقت یخرجون علی السلطان فیحصل به الفتن بین الناس فامسک عن ذلک۔

تاریخ کبیر طبری

۲۸۳ھ میں معتضد باللہ نے حکم دیا۔ کہ معاویہ یزید اور ابوسفیان کے مطاعن میں اور نیز اس باب میں کہ اُن پر لعن مباح ہے۔ ایک کتبہ (اعلان شاہی) تیار کیا جاوے۔ چنانچہ جو مطاعن اُس کتبہ میں درج کئے گئے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے۔ کہ بعد حمد خدا و نعت مصطفےٰ صلعم واضح ہو۔ کہ جب اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کو مبعوث برسالت فرمایا تو سب سے زیادہ بنی اُمیہ نے آنحضرت صلعم کی مخالفت پر کمر باندھی اور اس مخالفت میں ابوسفیان کا نمبر اول تھا۔ نیز معتضد نے حکم دیا۔ کہ کتبہ کا مضمون تمام بلاد میں شایع کیا جائے اور معاویہ کی نسبت کلمات لعن استعمال کیے جاویں۔ معتضد کا یہ ارادہ دیکھکر ارکان دولت نے سمجھایا۔ کہ ایسا کرنے سے علویوں کو دلیری ہوجائے گی۔ اور بادشاہ وقت پر خروج کریں گے۔ اور رعایا میں فساد برپا ہوجائے گا۔ یہ سن کر خلیفہ معتضد باللہ چپ ہو رہا۔ اور اس قصد سے باز رہا۔

استحفاظ سلطنت اور استمرار و استقرار حکومت کی اس تدبیر نے توحق و باطل کی تمیز اور حقیقت کا انکشاف ہونے نہ دیا۔ اسی طمع وحرص کی تاریکیوں نے حقیقت کے انوار اور اصلیت کے اسرار کو ہمیشہ مخفی کر رکھا اور ان کی جلوہ نمائیوں کو انواع اقسام کی ترکیبوں اور تدبیروں سے چھپایا پس ہر شخص حقیقت حال

کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ ان حضرات کو اصلیت اور واقعیت سے پوری اطلاع تھی۔ حق ناحق۔ صحیح غلط۔ اصلی اور مصنوعی۔ غیر مصنوعی کی کامل شناخت اور کافی اطلاع تھی۔ مگر سلطنت کا اقتدار اپنا اعتبار اور حصول دنیا کے کاروبار قایم و برقرار رکھنے کے سبب خاص سے۔ حق کو حق۔ صحیح کو صحیح۔ اور اصلی کو اصلی کہنے یا بتلانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور قصور معاف۔ اپنی اس ضرورت پوری کرنے اور مطلب نکالنے کے آگے۔ نہ ایمان کوئی شے تھی۔ اور نہ مذہب کوئی چیز۔ اب اس سے بڑھ کر سلطنت کا دباؤ۔ یا سلطنت کا لگاؤ۔ کیا کوئی اور ہو سکتا ہے۔

آل فاطمہؑ کی توہین

احادیث کی بربادی اور بد عنوانی کے انکشاف حقیقت کے متعلق ہم اتنی ہی نقل و بیان کو کافی سمجھ کر مسئلہ زیر بحث کو تمام کرتے ہیں۔ اور آئندہ سلسلہ بیان میں شبلی صاحب کے دوسری نمائشی اور محض زبانی تنقیح کی چہرہ کشائی کرتے ہیں۔

شبلی صاحب نے بیکار بے سود اور بے ضرورت ان ناگفتہ بہ اور ناپرسان امور کا ذکر نکالا۔ کہ آل فاطمہؑ کی توہین کرائی۔ اور جمعہ میں بر سر منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ (لعن کہلوائی) سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کی نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔

ان امور ناپرسان کی طرف آپ کی توجہ اس ضرورت خاص سے منعطف ہوئی ہے۔ کہ آپ اپنے محدثین اور مولفین موضوعات کی دیانت داری اور غیر جانبداری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان واقعات سے اور ان موضوعات کے انکشافات سے نہ ہم ان علما کی دیانت داری تسلیم کر سکتے ہیں اور نہ ان کی حقیقت نگاری مان سکتے ہیں۔ جن کی حقیقت ہم اوپر پوری تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ بلکہ اس تھوڑی بہت حقیقت نویسی کو ہم زمانہ کے تغیر خیالات اور ان صاحبان حقانیت کے پاک روحانیت کا غیر مرئی اثر یقین کرتے ہیں۔ جن کے فضائل و مناقب روحانی کے چھپانے۔ گھٹانے اور مٹانے کی خاص غرض سے۔ ان موضوعات و مصنوعات کا انبار بھی لگایا گیا۔ اور یہ دفتر کے دفتر۔ طومار کے طومار بھی تیار کئے گئے۔ پھر یہ بھی خدا کی شان ہے۔ اور ان نفوس مقدسہ کی حقیقت کا اعلان۔ کہ جس طبقہ اور فرقہ کے ہاتھوں سے یہ طومار تیار کئے گئے۔ انھیں ہاتھوں سے مٹائے بھی گئے۔

بنی فاطمہؑ کو آل فاطمہ لکھنا بھی توہین آمیز غلطی ہے۔

یہاں تک تو ہماری تمہیدی عبارت تھی۔ اب شبلی صاحب کی تحریر کی مفصلہ ذیل توضیح و تنقیح قلم بند کی جاتی ہے۔

تعجب ہے کہ شمس العلماء شبلی صاحب کے ایسے فاضل محقق اور کامل ادیب اور آل فاطمہؑ کی ایسی غلط ترکیب

خلاف قاعدہ و اصطلاح عرب۔ قلم بند فرمائے۔ کیا قرآن مجید میں۔ آل ابراہیم۔ آل موسیٰ۔ و آل ہارون کی جگہ اسکا استعمال مثناۃ کے ساتھ۔ مثل آلِ سارہ۔ آل صفورہ۔ یا آل فرعون کی جگہ آل آسیہ وغیرہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

اور اگر جمع مثناۃ خلاف فصاحت اور منافی قواعد نہ بھی ہوتا۔ ہم مخالف استعمال اور معارض اصطلاح عام تو ضرور ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے علاوہ آپ اپنی کتب و حدیث و سیرت و تاریخ میں بھی بنی فاطمہؑ کی جگہ آل فاطمہؑ لکھا ہوا نہیں دکھلا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان بزرگوں سے آپ کو اتنی اجنبیت اور منافرت حاصل ہے۔ کہ آپ اُن کے اصلی نام اور القاب کو بھی صحت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ ہم تو بنی فاطمہؑ کی جگہ آل فاطمہؑ لکھنے والے کو بھی۔ بمصداق دفعتکم عن مقامکم وازالتکم عن مراتبکم التی رتبکم اللّٰہ فیھا ۔ تم کو تمہارے اصل مقام سے ہٹا دیا۔ اور اُن رتبوں سے گھٹایا۔ جو خدا نے تمکو دیے سحو بے ادبی اور جواب دہی سے خالی نہ سمجھیں گے۔ جس نے ایک مشہور و معروف اور مخصوص خطاب و القاب کی جگہ غیر معروف لفظ کو مستعمل کر کے اُن حضرات کی ایک گونہ توہین کر دی ہے۔

شبلی صاحب کو کیا پڑی ہے۔ کہ وہ توہین بنی فاطمہؑ کی کوئی تفصیل کریں۔ تفصیل و تصریح کیسی یہی غنیمت ہے۔ کہ آپ نے توہین کا اقرار کر دیا۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ کہ ان حضرات کے ساتھ خلوص و عقیدت کے تقاضہ سے نہیں۔ بلکہ اپنے علمی اظہار و دیانت کی ضرورت سے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ آپ نے ان واقعات ناگفتہ بہ اور ان حالات ناشنوا کا بیکار ذکر نکالا۔ یا اپنے سلسلہ بیان میں اسکا اشارہ فرمایا۔ جن کے اظہار و اعلان سے آپ کے مسلمات عقائد میں مفاسد اور بڑے بڑے اکابر و عمائد دین کے معائب ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی حزم و احتیاط کو مدِّنظر رکھ کر صرف توہین آل فاطمہؑ کا اشارہ کر کے قطعاً سکوت اختیار فرمایا گیا ہے۔

مگر آپ کی طرح ہم حقیقت کو چھپا نہیں سکتے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ واقعات بہت کم اہل اسلام کے قلب میں جاگزیں اور اُن کے ذہن نشین ہیں۔ مگر بایں ہمہ اسقاط و احذاف و استخفاف اُن کی کثیر التعداد مثالیں شبلی صاحب ہی کی کتب احادیث و تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جن میں سے ذیل میں چند مثالیں نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے ثابت ہو جائے گا۔ کہ ان حضرات مقدسین کی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرابت اور اُنکے ذاتی فضائل و مناقب ظلمہ حکومت اور آئمہ اُمت کے ہاتھوں کیسے غارت کئے گئے تھے۔ اور اُن کی اہانت۔ ہتک۔ حرمت اور بے آبروئی کا کوئی پہلو اُٹھا نہیں رکھا گیا تھا۔

اہانت کی پہلی مثال تاریخ ابن اثیر میں ہے۔ کہ معاویہ کے حکم سے اہل شام کو یہ تبلایا گیا تھا۔ کہ یہ شخص ابو تراب جن پر تم لوگ لعنت کرتے ہو۔ وہ یمن کے قبیلہ کا ایک بیت بڑا چور ہے۔" ابن اثیر جلد پنجم۔

دوسری مثال ایام حج میں ایک مرد کہن سال باشندہ شام سے چند لوگ خانہ کعبہ میں ملے جو حضرت علیؑ کو گالیاں دے رہا تھا۔ اُس کے سمجھانے کی غرض سے ایک صاحب اُسکے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے کہ تم علیؑ کو جانتے ہو۔ اُس نے کہا کون علیؑ۔ وہی نہ جو حضرت عائشہ کے بھائی۔ حضرت ...... کے باپ تھے۔ وہ تو کسی جنگ میں مار دیے گئے۔ ابن اثیر جلد پنجم۔

تیسری مثال بنی فاطمہؑ کی انتہائی توہین طبقات ابن سعد میں ہے

عن عمیر ابن اسحاق قال کان مروان امیرا علینا وکان یسب علیا کل جمعة علی المنبر والحسنؑ علیہ السلام یسمع فلا یرد شیئا ثم ارسل الیہ رجلا یقول لہ بعلیؑ۔ بعلیؑ وبک وبک مثلک الا مثل البغلة یقال لھا ابوک فیقول امی الفرس۔

عمیر ابن اسحاق سے مروی ہے۔ کہ مروان ہم پر امیر تھا وہ ہر جمعہ کو منبر پر چڑھ کر حضرت علیؑ پر لعنت کیا کرتا تھا۔ اور جناب امام حسن علیہ السلام سُنا کرتے تھے۔ اور جواب نہ دیتے تھے (اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہلبیت) اُس نے ایک دن ایک آدمی خاص طور پر امام حسنؑ کے پاس بھیجکر یہ کہلا بھیجا کہ علیؑ پر علیؑ پر۔ تم پر۔ تم پر۔ اور تم پر لعنت۔ تمہاری مثال بالکل خچر کی ہے۔ جب اُس سے پوچھو۔ کہ تمہارا باپ کون ہے تو وہ کہتا ہے کہ میری ماں گھوڑی ہے۔!!

علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے۔ اور حافظ ابن حجر صاحب نے تو اُس کی نظیر میں ایک دوسرا واقعہ بھی اپنی کتاب صواعق محرقہ میں قلم بند فرمایا ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

قال السید ابو الحسین یحیی فی کتابہ اخبار المدینة حدثنا ھارون ابن عبد الملک بن الماجشون قال لما ترأس خالد بن الحارث بن الحکم بن العاص وھو ابن المطیرة علی منبر رسول اللہ صلعم یوم جمعة شتم النبی صلعم وشتم علیا وقال استعمل علیا وھو یعلم ان علیا خائن ولکن شفعت لہ ابنتہ۔ (الآخر الحدیث)

علامہ سید ابو الحسین یحیی اپنی کتاب اخبار المدینہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون ابن عبد الملک ابن ماجشون کا بیان ہے کہ خالد ابن حارث ابن حکم ابن عاص الملقب بہ ابن مطیرہ یوم جمعہ کو منبر رسول صلعم پر بیٹھا۔ اور جناب رسولخدا صلعم اور حضرت علیؑ پر سب وشتم کرنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ کہ محمد صلعم نے علیؑ کو بلاد اسلامیہ کا عامل مقرر کیا۔ حالانکہ آپ جانتے تھے کہ وہ خائن ہیں۔ مگر اُن کے بارے میں اُن کی لڑکی (جناب سیدہؑ) سفارش کیا کرتی تھیں۔

پانچویں مثال۔ ذریات اہل بیتؑ کی توہین محدث دہلوی شاہ عبد الحق صاحب اپنی کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب میں رقمطراز ہیں۔

چوں ولید ابن عبد الملک بحج آمد۔ و بعد از اتمام مناسک حج قدوم بمدینہ منورہ آورد۔ روزے بر منبر مسجد خطبہ میخواند درا ثنائے آں نظرش بر جمال حسن ابن حسن رضی اللہ عنہما اُفتاد کہ درخانہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نشستہ بود و آئینہ در دست داشت کہ در مے جمال جہان آرائے خود مشاہدہ می نمود چوں ولید از منبر فرود آمد عمر ابن عبد العزیز او را طلبید و زجر نمود کہ چرا ایشاں را در اینجا ہنوز گذاشتی و بیروں نہ نمودی۔ نمی خواہم کہ ایشاں را بعد ازیں اینجا بہ بینم۔ خانہ ایشاں را بہ خرو داخل مسجد کن۔ فاطمہ بنت حسینؑ و حسن ابن حسینؑ و اولاد و ایشاں سلام اللہ علیہم اجمعین درداں خانہ بودند و از آمدن ابا نمودند حکم کرد کہ اگر بیروں نیایند خانہ را بر ایشاں بمیند از پس اسباب خانہ را بے رضائے ایشاں بدر می آوردند و خانہ را ویراں می کردند۔ پس بحکم ضرورت بر آمدند و در روز روشن مخدرات اہل بیت بیروں مدینہ رفتند و موضعے برائے سکونت اختیار کردند و ہم چنیں در بیت حفصہ رضی اللہ عنہا کہ در دست اولاد عمر ابن الخطاب بود نزاع شد۔ چوں اینہا گفتند کہ ہرگز نخواہیم بر آمد و عوض خانہ ہم نخواہیم ستاند۔ حجاج ابن یوسف در آں وقت در مدینہ بود حکم کرد تا خانہ را ہم بر ایشاں بمیند ازند۔ و لیکن چوں قضیہ بولید رسید بعمر ابن عبد العزیز نوشت کہ در استرضائے خاطر عمر ابن الخطاب بہ تقصیر راضی شو ثمن خانہ را بدہ و اگر نہ

جب ولید ابن عبد الملک مناسکات حج تمام کرکے مدینہ منورہ میں آیا۔ ایک دن منبر رسولؐ پر خطبہ پڑھتے ہوئے اُسکی نظر حسنؑ بن حسنؑ پر پڑی جو خانۂ جناب سیّدہ میں بیٹھے ہوئے آئینہ میں اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد ولید نے عمر ابن عبد العزیز سے کہا۔ کہ حسنؑ ابن حسنؑ وغیرہ کیوں اب تک اِس مکان میں سکونت پذیر ہیں۔ اسوقت ان کو یہاں سے نکالدو۔ اور مکان کو خرید کرکے داخل مسجد کرلو۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ آئندہ ان لوگوں کو اِس مکان میں دیکھوں حسنؑ اور اُن کی اولادنے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ ولید نے حکم دیا۔ کہ مکان کو اِن پر گرادو۔ جب مکان مسمار ہونا شروع ہوا۔ اور اسباب مکان سے باہر کر دیا گیا۔ مجبوراً اُن حضرات نے مخدرات کو اُسی روز روشن میں گھر سے نکالکر بیرون مدینہ سکونت اختیار کی۔ کچھ دنوں بعد اسی طرح کا قضیہ حضرت حفصہ رض کے مکان کے متعلق پیش آیا۔ جو اولاد حضرت عمر ابن خطاب کے قبضہ میں تھا۔ جب اُن سے کہا گیا۔ کہ گھر سے باہر نکلو۔ تو وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اور قیمت بھی لینی منظور نہ کی۔ حجاج ابن یوسف ثقفی اُس وقت مدینہ میں تھا۔ اُس نے چاہا۔ کہ مکان کو اُن لوگوں پر گرا دیا جاوے لیکن جب اس بات کی خبر ولید ابن عبد الملک کو ہوئی۔ تو اُس نے عمر ابن عبد العزیز عامل مدینہ کو لکھ بھیجا۔ کہ اولاد عمر ابن خطاب کی رضاجوئی میں قصور نکرو اُنکا اکرام ملحوظ رکھو۔ اگر وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہ ہوں۔ تو اُن کے مکان کا ایک حصہ چھوڑدو اور اُن کی آمد و رفت کے لیے مسجد میں ایک

ستانند۔ ایشاں را اکرام کن و لقعہ از خانہ ایشاں بگذار و ایشاں را درے بجانب مسجد نیز بگذار۔

دروازہ کر جو۔

محدث دہلوی کی مرقومہ بالا عبارت سے امرائے دولت خلافت کی عدالت اور اُن کے بے لوث غیر جانبدارانہ اور عادلانہ فیصلہ و تجویز کی پوری حقیقت ثابت ہو گئی۔

اُمور مذہبی اور دینیات میں حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام کی بے اعتباری

یہ تو خاص اُمور دنیاوی میں۔ ان بزرگوں کے ساتھ محاسن سلوک کئے جاتے تھے۔ اب دینیات اور اُمور دین و مذہب میں ان حضرات مقدسین کی کیا مقدار و وقعت سمجھی گئی۔ وہ ہماری مفصلہ ذیل عبارت سے ثابت ہو گی

(۱) جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام۔ ابو الآئمۃ الطاہرین امیر المومنینؑ کی نسبت۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنے رسالہ قرۃ العینین میں تحریر فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ بعد از قرآن و احادیث مدار اسلام بر فقہ است و مہمات فقیہہ مسائل اجماعیہ فاروق است۔ اگر در اکثر اسلام نظر کنی۔ حنفیان و مالکیان و شافعیان اند۔ اما مذہب مالک۔ پس منتہائے او بر موطائے امام مالک است بجز چند اثر از مرتضیٰ در وے منقول نیست و ہمچنیں در مسند ابو حنیفہ و آثار محمدیہ کہ فقہ حنیفہ است از روایت مرتضیٰؑ بجز چند حدیث موضوع و چند اثر شمردہ زیادہ انچہ در موطا است۔ بقلیلے منقول نیست و ہمچنیں در مسند شافعی کہ منتہائے مذہب شافعیہ است از روایت مرتضیٰؑ بجز چند حدیث موضوع و چند اثر موقوف کہ نسبت مرویہ دیگراں بسیار قلیل است منقول نیست۔

قرۃ العینین

قرآن و احادیث کے بعد اسلام کا مدار فقہ پر ہے۔ اور فقہ کے تمام اہم ترین مسائل حضرت عمر کے اقوال سے ماخوذ ہیں۔ اگر تمام دنیائے اسلام کے طرز عمل پر نظر کی جاوے۔ تو کثرت سواد اسلام کا اطلاق فرقہائے حنفیان، مالکیان اور شافعیان پر تمام ہوتا ہے۔ مذہب مالک۔ وہ کتاب موطائے امام مالک پر موقوف ہے۔ اور کتاب موطائے میں سوائے چند حدیث اور مرویات مرتضیٰ سے کچھ اور منقول نہیں ہے۔ اسیطرح مسند ابی حنیفہ میں اور آثار امام محمد میں جو کہ فقہ حنفی کا دار و مدار ہے مرتضیٰ کی چند روایت وہ بھی بطریق موضوع اور چند آثار جیدہ باسناد موقوف۔ موطائے بھی کم۔ اور کچھ اُن سے ماخوذ و منقول نہیں۔ اب رہا مذہب شافعی۔ اُس کی انتہا بھی مسند شافعی پر تمام ہے۔ اُن کی مسند میں بھی مرتضیٰ سے بجز چند حدیث موضوع اللہ اقوال موقوف کے کچھ منقول نہیں ہے۔

باب العلم رسالت کی حقیقت فی علم الدین جو مذاہب ثلثہ حنفیہ۔ مالکیہ و شافعیہ کے علما و محدثین کے نزدیک جتنی تھی۔ وہ عبارت مرقومہ بالا سے ظاہر ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر امام ابن تمیہ صاحب اپنی کتاب ہے رکانہ

میں لکھتے ہیں۔

وقال فی حق علیؓ خطاء فی سبعۃ عشر شیئا ثم خلف فیہا نص الکتاب۔	حضرت علیؓ نے۔ سترہ مسائل شرعیہ میں خطا کی۔ اور وہ سب خطائیں نص قرآن کے خلاف تھیں۔

(۲) حضرت حسنین علیہما السلام و حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب قرۃ العینین میں رقمطراز ہیں:۔

از حضرات حسنینؓ و امام زین العابدین روایت بسیار کم آمدہ اند۔	حضرت حسنینؓ و امام زین العابدین علیہم السلام سے بہت کم روایت آئی ہے۔

مولوی محمد حسن صاحب بھوپالی۔ کتاب اعلام الناس ص ۶ میں بہایت جسارت سے اتنا اور اضافہ فرماتے ہیں۔ امام زین العابدین علیہ السلام بت پرستوں کی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ)

امام محمد باقر علیہ السلام کی نسبت دراسات اللبیت میں بمقام ذکر تقسیم اموال خمس لکھا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ کاذب اور مفتری تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے متعلق میزان الاعتدال ذہبی جلد اوّل ص ۶۵ میں مرقوم ہے آپ سے امام بخاری نے کوئی روایت نہیں لی۔ یحییٰ ابن سعید قطان استاد بخاری کا قول ہے کہ میں حضرت امام جعفر صادقؓ سے کھٹکتا ہوں۔ امام مالک نے کوئی روایت آپ سے نہیں لی۔ اور اگر بھولے سے کوئی روایت آپ سے نقل بھی کی۔ تو اس میں دوسرے کو ملا لیا۔ تنہا آپ کی روایت پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ ذہبی کی عبارت یہ ہے۔

قال مصعب بن عبد اللہ عن الدراوردی قال لم یروا مالک عن جعفر حتی ظہر امر من العباس کان یروی عن جعفر حتی یضمہ احد۔	مصعب ابن عبد اللہ دراوردی کی اسناد سے نقل کرتے ہیں کہ مالک نے امام جعفر صادقؓ سے کوئی روایت نہیں لی خلافت بنی عباس قایم ہونیکے بعد روایت لی بھی۔ تو ایسی حالت میں کہ ایک دوسرے کو آپ کے ساتھ ملا لیا۔

پھر وہی امام ذہبی میزان الاعتدال جلد دوم ص ۵ میں لکھتے ہیں۔

عقیلی کا اعتقاد تھا۔ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیثیں غیر محفوظ ہیں۔ یعنی قابل اعتبار نہیں غالباً اسی لحاظ سے بخاری و مسلم اور موطا میں کوئی روایت آپ سے نہیں لی گئی۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسبت لکھا ہے۔ لایستیٔ وہ کوئی شے نہیں۔

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے متعلق میزان الاعتدال میں مروی ہے تروی عن

ابیہ عجائب و مخطی۔ وہ اپنے والد بزرگوار سے عجائبات نقل کرتے تھے۔ اور اس میں بھی وہم و خطا کرتے تھے۔
حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام ایسے بے اعتبار سمجھے گئے۔ کہ راویان صحاح سے
ان کا نام ہی ساقط کر دیا گیا۔
امام دہم و امام یازدہم الملقب بہ عسکریین (حضرت امام علی النقی و حضرت امام حسن عسکری
علیہما السلام) کی نسبت امام تیمیہ منہاج السنۃ میں جلد اوّل صفحہ ۸۲ میں لکھتے ہیں۔

رمزا بن لیلی طبری و ابراہیم جرمی دارمی حضرت امام علی نقیؑ و حضرت امام حسن عسکریؑ سے زیادہ دین نبویہ کے ماہر اور جاننے والے تھے۔ ان دونوں آئمہ پر واجب تھا۔ کہ ان دونوں علما میں سے کسی ایک کو اپنا استاد بناتے۔ تاکہ اُن کو قواعد اسلام معلوم ہو جاتے۔

ہم ان علماء و محدثین مصنفین آئمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کے ان اکاذیب و افترایات کی کوئی تنقید و تردید کرنا نہیں چاہتے۔ ان لغویات کی نقل سے ہمارا مدعا صرف یہی تھا۔ کہ شبلی صاحب کے قول کے مطابق صرف بنی اُمیہ نے ان حضرات آئمہ طاہرینؑ (بنی فاطمہؑ) کی توہین نہیں کی۔ اور اُنکو دین و دُنیا دونوں کے لیے بیکار نہیں سمجھا۔ بلکہ بخلاف آپ کے مرقومۂ بالا شواہد ثابت کرتے ہیں۔ کہ بنی اُمیہ کے بعد اُنکے ساتھ آپ کے مسالک اور طرز عمل بھی تو بنی اُمیہ کی کھُلی کھُلی اور صاف صاف تقلید ثابت ہوتے ہیں۔ تو اس بنا پر شبلی صاحب کو اکیلے بنی اُمیہ کے ان معائب پر اعتراض کرنیکا کیا حق حاصل ہے۔ مگر آپ تو توہین بنی فاطمہؑ کو صرف بنی اُمیہ پر عاید کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے مظالم کو چھپاتے ہیں۔ مگر افسوس کہ آپ اپنے علمائے سلف کے اتنے اقوال و اقرار پرستی کا قلم کیسے پھیر دیکھ سکتے ہیں!!

بنی فاطمہؑ۔ آئمہ طاہرین اور اُن کی ذریات و متبعین کے تفصیلی مصائب

یہاں تک تو ہم نے آل رسول صلعم۔ بنی فاطمہؑ آئمہ طاہرین علیہم السلام اُن کی ذریات اور متبعین کی مصیبتوں کی صرف اجماعی اور اجمالی کیفیت لکھی ہے۔ اب اُس کی کامل تفصیل ہم مکاتب خوارزمی کے اسناد سے ذیل میں نقل کرتے ہیں

سواد اعظم میں ابوالموید اخطب خوارزمی کے نام نامی سے کون واقف نہیں ہے۔ اس محدث اعلم۔ اور محقق اکمل کے معارف و مشارف سے۔ رجال و احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ مکاتب خوارزمی کیا ہے۔ حقیقتاً یہ شیعیان نیشاپور کے ایک استفتا کا جواب ہے۔ جو شیعوں نے اپنے مخالف مذہب حاکم کے مظالم کے متعلق۔ امام خوارزمی کی خدمت میں حصول حکم و جواب کی ضرورت سے بھیجا تھا۔ یہ جواب ایک رسالہ کی صورت میں مصر کے مطبع بولاق مصر سے ۱۲۷۹ھ ہجری

میں طبع ہو کر شایع ہوا ہے۔ جیسا کہ عبارت خاتمہ رسالہ سے ظاہر ہوگا۔ ہم ذیل میں اُس کے اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

انتم ونحن اصلحنا الله وایاکم عصابة لم یرض الله لنا الدنیا فذخرنا الدار الاخری ورغبنا عن ثواب العاجل فاعد لنا ثواب الاجل وقسمنا قسمین قسمات شهیدا وقسما عاش شریدا فالحی یحسد المیت علی ما صار الیه ولا یرغب بنفسه عما جری علیه قال امیر المومنین ویعسوب الدین علیه السلام المحن الی شیعتنا اسرع الی الحدر وهذه مقالة اسست علی المحن وولد اهلها فی طالع الهزاهز والفتن فحیاة اهلها نغص وقلوبهم حشوها غصص والایام علیهم متحاملة والدنیا عنهم مائلة فاذا کنا شیعة ائمتنا فی الفرائض والسنن ومتبعی آثارهم فی ترک کل قبیح وفعل حسن فینبغی ان تتبع آثارهم فی المحن غصبت سیدتنا فاطمة صلواة الله علیها وعلی ابیها میراث ابیها صلواة الله علیه واٰله یوم السقیفه واُخر المؤمنین عن الخلافه وسُمّ الحسن علیه السلام سرا وقتل اخوه علیه السلام جهرا وصلب زید بن علی الکناسه وقطع راس زید بن علی فی المعرکة وقتل ابنا محمد وابراهیم علی ید عیسی بن موسی العباسی ومات موسیٰ ابن جعفرؑ فی حبس هارون وسم علی بن موسیٰ بید المامون وهزم ادریس

(اے شیعیان نیشاپور) تم لوگوں اور ہم لوگوں کو خدا تعالیٰ صلاح خیر دے اور توفیق نیک۔ ہم وہ قوم مصیبت زدگان ہیں جن کے لیے خدا نے دولت دُنیا کو نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ دار آخرت میں ہمارے لیے ذخیرہ فرمایا ہے۔ اور جلدی ثواب عطا کرنے کی جگہ۔ ایک وقت خاص پر اُن کے ثوابوں کے عطا فرمائے جانے کا اُن سے وعدہ کیا ہے ہم لوگ دو قسم کے کئے گئے ہیں۔ ہماری ایک قسم تو شہید ہو کر فائز بشہادت ہو چکی۔ اور ایک قسم سخت مصیبت و عسرت میں اپنی زندگی بسر کر گئی۔ جو ہم میں سے زندہ ہیں وہ مر جانے والوں پر اُن کے مصائب گذشتہ کے باعث رشک کرتے ہیں۔ اور اپنے نفوس میں اُنکے مصائب کی وجہ سے ذرا بھی روگردانی کا خیال نہیں کرتے۔ حضرت امیر المومنین اور یعسوب الدین علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ کہ رنج و غم ہمارے شیعوں پر اُس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جتنی تیزی سے آدمی کے جسم پر ضرب کے بعد آماس آجاتا ہے آپ کے اس کلام ہدایت التیام کی بنا اس پر ہے۔ کہ آپ کی اولاد و ذریات کی خلقت و پیدائش اُس عام پر آشوبی۔ زوال اور فتنہ و فساد کے طالع میں واقع ہوئی کہ آپکی اولاد و اعقاب کے زمانہ حیات تکلیف و شدت میں کٹے۔ اور اُن کے قلوب مختلف فکر و مکروہات میں مبتلا رہے زمانہ اُن پر حملات متواتر کرتا رہا۔ دُنیا اپنی طرف مائل کرتی رہی۔ گویا اُن کے پیچھے پڑی رہی۔ لیکن باایں ہمہ ہمارے اماموں کے شیعہ ہمیشہ اور ہر حال میں فرائض وسنن

یفر حتی وقع الی الاندلس فرید او مات
عیسی ابن زید طریدا شریدا وقتل یحیی
بن عبد الله بعد الامان والایمان وبعد تاکید
العهود والضمان هذا غیرما فعل یعقوب
بن اللیث بعلویة طبرستان وغیر قتل محمد
بن زید والحسن بن القاسم الداعی علی
ایدی آل ساسان وغیرما صنعه ابو السیاح
فی العلویة المدینه وحملهم بلا عطاء ولا وطاء
من الحجاز الی سامرا وهذا بعد قتل
قتیبه بن مسلم الباهلی لابن عمر بن علی حسین اخذه
بابویه وقتل متر نفسه ودا ری شخصه
بصائغ حیاته وبدائع وفاته ولا کما فعله
الحسین بن اسمٰعیل المصعبی بیحیی بن عمر
الزیدی خاصة وما فعله مزاحم بن خاقان
بعلویة الکوفه کافة وبحسبکم انه لیست
فی بیضة الاسلام بلدة الا وفیها لقتیل
طالبی تربة تشارک فی قتله الاموی والعباسی
واطبق علیهم العدنانی والقحطانی ؎ فلیس
حی من الاحیاء نعرفه من ذی یمان ولا بکر
ولا مضر؏ الا وهم شرکاء فی دماءهم؏
کما تشارک ایسار علی جزر قادهم الحمیة
الی المنیة وکرهوا عیش الذلة فماتوا
اموات العزة ووثقوا بما لهم فی الدار الباقیه
فسخت نفوسهم عن هذه الفانیه ثم لم یشربوا
کاسا من الموت الا شربها شیعتهم واولیاءهم

کی انجام دہی میں مصروف رہے۔ اور اپنے آئمۂ دین کے
اخبار و آثار کی پوری اتباع و انقیاد میں تمام امور قبیحہ کو
ترک فرماتے رہے۔ اُن کے اتباع آثار آئمہ کے حالات
آلام و محن سے مفصلاً ظاہر ہیں۔ جناب سیدہ سلام اللہ
علیہا و علی ابیہا کی میراث آبائی اُنکے اور اُن کی اولاد
کے مقابلہ میں۔ انعقاد سقیفہ کے دن غصب کر لی گئی۔ اور
امیر المومنینؑ کو سب سے آخر میں خلافت دی گئی۔ حضرت
امام حسنؑ کو مخفی طور پر زہر دیکر شہید کر دیا۔ اور اُن کے
بھائی کو علانیہ طور پر قتل کر ڈالا۔ زید ابن علی کے مردہ کو
کناسہ میں سولی دی۔ اور معرکہ جنگ میں اُنکا سر کاٹا اور اُنکے
دونوں بیٹوں محمد اور ابراہیم نامی کو عیسیٰ ابن موسیٰ العباسی
کے ہاتھوں قتل کرایا۔ اور حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام نے
ہارون کے قید خانہ میں انتقال فرمایا۔ اور حضرت علی رضا
علیہ السلام کو مامون نے زہر دلوایا۔ اور ادریس ابن محمد مقام
فخ سے ہزیمت پاکر اور یکہ و تنہا ہوکر ملک اندلس میں بے نام
و نشان ہوگئے۔ اور عیسیٰ ابن زید (مؤتم الاشبال) بھی یکہ و
تنہا ہوکر پریشان حال پھرتے رہے۔ اور یحییٰ ابن عبد اللہ
ابن زید کو اماں دی جانے۔ حلف شرعیہ اُٹھانے اور عہد
و پیمان جائز اور ضمانت جان کی جانے کے بعد بھی قتل کر ڈالا
یہ صرف وہ لوگ ہیں۔ جو حجاز و عراق میں شہید کئے گئے۔ ان
غریبوں اور اجل نصیبوں کے علاوہ یہ وہ لوگ تھے۔ جن کو
یعقوب ابن اللیث نے محض سادات علوی ہونے کے جرم میں
علاقہ طبرستان میں قتل کرایا۔ اور اسی طرح محمد ابن زید
اور حسن ابن القاسم الملقب بداعی کو قبیلہ آل سامان
کے ذریعہ سے قتل کرایا۔ اُن کے علاوہ ابو السیاح

ولا قاسوا لوناً من الشدائد الا قاساه
انصارهم واتباعهم داب عثمان بن عفان وبطن
عمار بن یاسر بالمدینه ونفی اباذر الغفاری الی
ربذه واشخص عامر بن عبد قیس التمیمی
وغرب الاشتر النخعی وعدی بن حاتم الطائی
وسیر عمرو بن زراره الی الشام ونفی کمیل بن
زیاد الی العراق وجفا ابی بن کعب واقصاه
وعادی محمد ابن حذیفه وناواه وعمل فی
دم محمد بن سالم ما عمل وفعل مع کعب ذی
الحطبه ما فعل واتبعه فی سیرته بنو امیه
یقتلون من حاربهم ویغدرون بمن سالمهم
لا یحفلون المهاجری ولا یصونون الانصاری
ولا یخافون الله ولا یحتشمون الناس قد اتخذوا
عباد الله خولا ومال الله دولا یهدمون
الکعبه ویستعبدون الصحابه و
یعطلون الصلوٰۃ الموقوته ویختمون
اعناق الاحرار ویسیرون فی حرم الرسول
سیرهم فی حرم الکفار واذا فسق الاموی
فلم یات بالضلاله عن کلالة
قتل معویه حجر ابن عدی الکندی وعمرو
ابن الحمق الخزاعی بعد الایمان المؤکدة
والمواثیق المغلظة وقتل زیاد ابن سمیه
الالوف من شیعة الکوفة وشیعة
البصرة صبرا واوسعهم حبسا واسرا
حتی قبض الله معاویه علی اسواء اعماله

تمام سادات علویہ کو مع اُن کی اولاد و ذریات کے بلا پردہ و
سامان راحلہ حجاز سے سامرہ لے گیا۔ اور یہ امر اُس وقت
واقع ہوا۔ جب قتیبہ ابن سلم باہلی عمر ابن علیؑ کو قتل کر چکا
واقعہ یہ ہے۔ کہ قتیبہ نے ایک دن ایک شخص کو دیکھ لیا
تھا۔ کہ وہ عمر ابن علیؑ کی حفاظت جان اور بیعت مرگ
سے اُن کی امان کی ترکیب کر رہا ہے۔ قتیبہ نے عین
اسی حالت میں مع اُن کے باپ کے پکڑوا منگایا۔ اور قید
کر دیا ایسے ہی حسین ابن اسماعیل المصعبی نے خاص طور
پر یحییٰ ابن عمر زیدی کے ساتھ ظلم و شقاوت برتی۔ اور
ایسے ہی مظالم و شدائد مزاحم بن خاقان نے کوفہ کے
سادات علویہ کے ساتھ کئے۔ یہ بھی بخوبی شمار کر کے سمجھ لو
کہ ممالک اسلامیہ میں کوئی شہر ایسا نہیں چھوٹا۔ جس میں
آل ابی طالبؑ نہ قتل کئے گئے ہوں۔ اور اُن کے قتل و خون
میں اموی اور عباسیوں نے شرکت نہ کی ہو۔ اور اُنکے
اس فعل میں کسی عدنانی اور قحطانی نے مطابقت کی ہو یہ
کوئی شخص قبائل ذی یمان۔ بنی بکر اور بنی مضر کے زندہ
لوگوں میں ایسا نہیں چھوٹا۔ جو اِن مظلوموں کے خون میں
نہ شریک ہوا۔ اُن جماعتوں کی طرح جو اونٹوں کی ذبح
پر تیار ہوتی ہیں۔ ان مظلوموں کی حیا و غیرت نے موتوں
کو پسند کیا۔ اور ذلت سے جینے کو ناپسند فرمایا۔ اور عزت
کی موت مر گئے۔ اور اُن تمام نعمات پر فائز ہوئے۔ جو دار
آخرت میں اُن کے لیے ذخیرہ تھیں۔ اپنی پاک روحوں کو
دُنیائے فانی کے علائق سے رہا کیا۔ اور اُن حضرات
میں سے کسی نے کاسہ مرگ ایسا نہیں پیا۔ جسکا ذائقہ
اُنکے بعد اُن کے شیعوں نے اور اُن کے دوستوں

وختم عمرہ بشر احواله فاتبعه ابنه يجهز جرحاه ويقتل ابناه قتلاه الى ان قتل هانى ابن عروة المرادى ومسلم ابن عقيل الهاشمى اولا وعقب بالحجر ابن زياد الرياحى وبابى موسى عمرو ابن قرطة الانصارى وحبيب بن مظاهر الاسدى وسعيد بن عبد الله الحنفى ونافع ابن هلال البجلى وحنظله بن سعد الشامى وعابس ابن ابى شبيب الشاكرى فى نيف وسبعين من جماعة شيعة الحسين عليه السلام يوم كربلا ثانيا ثم سلط عليهم الدعى ابن الدعى عبيد الله ابن زياد بصلبهم على جذوع النخل ويقتلهم الوان القتل حتى اجتث الله دابره ثقيل الظهر بما اثمهم التى سفك عظيم التبعة بجرمهم الذى انتهك فانتهت لنصرة اهل البيت طائفة اراد الله ان يخرجهم من عهدة ما صنعوا ويغسل عنهم وضر ما اجترحوا فصمدوا الفئة الباغية وطلبوا دم الشهيد من ابن الزانية لا يزيدهم قلة عددهم وكثرة سواد اهل الكوفه بازائهم الا اقداما على القتل والقتال وسخاء بالنفوس والاموال حتى قتل سليمان ابن صرد الخزاعى والمسيب بن نجبة الفزارى وعبد الله بن واصل التميمى فى

نے نہ چکھا ہو۔ اور کوئی مظالم و شدائد نہ باقی رہے۔ جو اُنہوں نے خیال کئے ہوں۔ اور اُن کے بعد اُن کے انصار و تبعین پر نہ گذرے ہوں۔ حضرت عثمان ابن عفان نے حضرت عمار ابن یاسر کے شکم پر لات ماری اور حضرت ابا ذر غفاری کو مدینہ سے ربذہ میں نکالدیا۔ اسی طرح عامر بن قیس التمیمی کو جلاوطنی پر مجبور کیا۔ اور اشتر نخعی اور عدی ابن حاتم الطائی کو اُن کے گھر سے نکالدیا اور عمر ابن زرارہ کو بھی شام کی طرف بھیجدیا۔ اور کمیل ابن زیاد نخعی کو عراق میں داخل ہونے کی ممانعت کردی اور ابی ابن کعب پر ایسے ہی ستم کیے۔ اور اُن کو خاتمہ تک پہنچادیا۔ محمد ابن حذیفہ پر ظلم کئے۔ محمد ابن سالم اور کعب ابن ذی حطبہ کے خون میں جو تحکیمیں کیں اور جو طرز عمل کئے۔ وہ اپنے مقام پر ہیں۔ یہ اُنکے بعد بنی اُمیہ نے اُنھیں کی تقلید اختیار کی۔ جو لوگ اُن سے لڑے تھے (طرفداران علیؑ جمل و صفین میں) اُن کو تو قتل کر ڈالا۔ جو بچ گئے تھے۔ اُن کے ساتھ غدر و فساد کیا نہ اُن کو مہاجرین نے پناہ دی۔ اور نہ انصار نے اُن کی اعانت کی۔ اور نہ دُنیا والوں نے اُن کی قدر و منزلت کی۔ اُن لوگوں نے بندگان خدا کو اپنی ملکیت اور مال اللہ کو اپنی خاص دولت سمجھ رکھی تھی۔ کعبہ کو منہدم کر دیا تھا۔ صحابہ کی پرستش کرتے تھے۔ نماز موقتہ کو ترک کر بیٹھے تھے۔ آزاد اور نیکوکاروں کو قتل کرتے تھے۔ اور حرم رسول صلعم کی ان لوگوں نے وہ خرابی کی اور اس طرح اُس میں داخل ہوئے۔ جیسے حرم کفار میں داخل ہوتے ہیں۔ اور بنی اُمیہ میں سے جب کوئی

رجال من خیار المومنین وعلیۃ التابعین
ومصابیح الانام وفرسان الاسلام ثم
تسلط ابن الزبیر علی الحجاز والعراق فقتل
المختار شقی الاوتار وادرك الثار وافنی
الاشرار وطلب بدم المظلوم الغریب فقتل
قاتلہ ونفی خاذلہ واتبعوہ عمر ابن کیسان
واحمر ابن شمیط ورفاعۃ ابن یزید والسائب
بن مالك وعبداللہ ابن کامل وتلقطوا
بقایا الشیعۃ یمثلون لہم بکل مثلۃ ویقتلونہم
شر قتلہ حتی طہر اللہ من عبداللہ ابن
الزبیر البلاد وراح من اخیہ
مصعب العباد فقتلہما عبد الملك ابن
مروان کذالك تولی بعض الظلمین بعضا
بما کانوا یکسبون بعدما حبس ابن الزبیر
محمد ابن حنفیہ واراد حراقہ ونفی عبداللہ
ابن عباس واکثر ارھاقہ فلما خلت البلاد
لآل مروان وکان سلطوا لحجازئین ثم
علی العراقیین فتغلب بالہا شمیین و
اخاف الفاطمیین وقتل شیعہ علی و
محا اثار اہلبیت النبی وجری ماجری
علی کمیل ابن زیاد النخعی واتصل البلاء
مدۃ ملك المروانۃ الی الایام العباسیۃ
حتی اذا اراد اللہ ان یختم مدتہم باکثر
اثامہم ویجعل اعظم ذنوبہم فی اخرایامہم
بعث علی بقیہ الحق المہمل والدین معطل

کسی ضلالت کا مرتکب ہوتا تھا۔ تو اُس کے بدلے میں اُسکو
کوئی سزا و تکلیف نہیں دی جاتی تھی۔ معاویہ نے
عمر ابن حمق خزاعی اور حجر ابن عدی الکندی کو بخلاف
قسمہائے شرعیہ اور وعدہ ہائے صحیحہ قتل کرایا۔ اور زیاد
بن سمیہ نے ہزاروں شیعیان کوفہ و بصرہ کو قتل کیا۔ اور
اِن کی کثیر تعداد کو مدتہائے دراز تک قید رکھا۔ یہانتک
کہ معاویہ اپنی بد اعمالی کی سزا پانے کے لیئے خدا کے دربار
میں بلالیا گیا۔ اور اُس کی عمر اُسکے بد ترین اعمال کے
ساتھ بالکل تمام ہوگئی۔ معویہ کی تبعیت اُس کے بیٹے
نے اختیار کی۔ جو کچھ اُس کے باپ نے چھپا چھپا کر کیا تھا
یزید نے اُسے علانیہ دکھلا دکھلا کر کیا۔ ہانی ابن عروۃ
المرادی اور مسلم ابن عقیل الہاشمی کو پہلے علانیہ طور پر
قتل کرایا۔ اور اُسکے بعد حر ابن زیاد الریاحی۔ ابو موسی
بن قرظۃ الانصاری۔ حبیب ابن مظاہر الاسدی
ابو سعید ابن عبداللہ الحنفی۔ نافع ابن ہلال البجلی۔ حنظلہ
ابن سعد الشامی۔ عابس ابن شبیب الشاکری۔ شیعان
حسین علیہ السلام بہتر نفوس کو معرکہ کربلا میں قتل کرایا۔ پھر
بار دیگر اس واقعہ عظیمہ کے بعد ولد الحرام ابن ولد الحرام
عبداللہ ابن زیاد نے شیعیان قرب و جوار کو درختوں کی
شاخوں پر سولیاں دلوائیں۔ اور انواع و اقسام کیساتھ
اُنکو قتل کرایا۔ یہاں تک کہ خداوند عالم نے اُس کی پشت
پر ان بے گناہوں کے خون ناحق اور ہتک حرمت کی
بے شمار معصیت کا بار کرایا۔ اور اس درمیان میں ایک
جماعت مخلصین کو نصرت اہل بیت کی توفیق ہوئی۔ اور
خداوند عالم نے ان لوگوں کے ذریعہ سے اِن ظلم وقت

زید بن علی فخذلوہ منافقوا اهل العراق
وقتله احزاب اهل الشام وقتل معه
من شیعته نصر بن خزیمة الاسدی
ومعویة بن اسحاق الانصاری وجماعة
من شیعه وتابعه وحتی من
زوجة واذماه وحتی من کلمه
واتاه فلما انتهکوا ذلك الحریم واقتر
فوا ذلك الاثم العظیم غضب الله علیهم
وانتزع الملك منهم فبعث علیهم ابا
مجرم لا ابا مسلم فظ لا نظر الله الیه الی
صلابة العلویة والی لین العباسیة
فترك تقاه واتبع هواه وباع اخرته
بدنیاه وافتتح عمله بقتل عبدالله بن
معویة بن عبدالله بن جعفر بن ابیطالب
وسلط طواغیت خراسان وخوارج
سجستان واکراد اصفهان علی ال ابیطالب
یقتلهم تحت کل حجر ومدر ویطلبهم
فی کل سهل وجبل حتی سلط علیه
احب الناس الیه فقتله کما قتل الناس
فی طاعته واخذه بما اخذ الناس
فی بیعته ولم ینفعه ان اسخط الله
برضاه وان رکب ما یهواه وصلت
من الدنیا فخبط فیها عسفا
ونقضی فیها جورا وحیفا الی ان
مات وقد امتلأت سجونه باهل بیت

کی سزادہی کا ارادہ فرمایا۔ اور اُس جماعت نے اِن شہیدان مظلوم کے خون ناحق کا معاوضہ اس ولد الحرام سے لینا چاہا۔ مگر اُنکی قلت تعداد آخر میں زیادہ نہ ہوسکی اور اُنکو کمک نہ پہونچنے کی اُمید منقطع ہوگئی۔ اشرار کوفہ کی جماعت کثیر اُن کے مقابلہ و مقاتلہ پر تیار ہوگئی۔ اور اپنے جان ومال سے مستعد ہوگئی۔ یہاں تک کہ سلیمان ابن صرد خزاعی۔ مسیب بن نجبۃ الفرازی۔ عبداللہ ابن واصل التیمی جو اخیار مومنین اور نیکوکار تابعین شمار ہوتے تھے۔ اور شہسواران اسلام اور انوار ہدایت تمام کہلاتے تھے۔ قتل کئے گئے۔ اس کے بعد حجاز وعراق پر ابن زبیر کا تسلط ہوگیا۔ اور مختار نے مظلوم غریب اور شہید مصیبت نصیب کا طلب خون کیا اور اُنکے تمام قاتلوں کو قتل کیا۔ اور اُن کے دشمنوں کو ویسے ہی ذلیل وخوار کیا۔ اور ابو عمرو بن کیسان۔ احمر ابن شمیط رفاعہ ابن یزید۔ سائب ابن مالک۔ اور عبداللہ ابن کامل اور تمام جماعت شیعہ نے اُنکا ساتھ دیا۔ اور قاتلان حسینؑ کو اُسی طرح قتل کیا۔ جس طرح اُنہوں نے شیعان حسینؑ کو قتل کیا تھا۔ یہاں تک کہ خدا نے عبداللہ ابن زبیر کے وجود سے تمام امصار وبلاد کو ظاہر کیا۔ اور اُس کے بھائی مصعب کی طرف سے بھی تمام دُنیا کو آرام واطمینان ہوگیا۔ اور اُن دونوں کو عبدالملک ابن مروان نے قتل کیا۔ اُسی طرح ایک ظالم کے بعد دوسرا ظالم قائم ہوتا گیا۔ اور اُن سے انواع واقسام کے مظالم عمل میں آتے گئے اس سے قبل ابن زبیر نے محمد بن حنفیہ کو قید کیا۔ اور اُن کو جلا کر مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ عبداللہ ابن عباس

الرسالة ومعدن الطيب والطهارة قد
تتبع غائبهم وتلقط حاضرهم حتى
قتل عبد الله بن محمد بن عبد الله
الحسني بالسند على يد عمر ابن هشام
بن عمر التغلبي فما ظنك بمن قرب
تناوله عليه وكان مسه على يديه
وهذا قليل في جنب ماقتله هارون
منهم وفعله موسى قبله بهم فقد عرفتم
ما توجه على الحسن بن على بفخ من موسى
وما اتفق على على بن الافطس الحسيني
من هارون وما جرى على احمد بن
على الزيدى وعلى القسم بن على الحسني
من جلسه وعلى على بن غسان الخزاعي
حين اخذ من قبله والجملة ان هارون
مات وقد قصر شجر النبوة واقتلع غرس
الامامة وانتم اصلحكم الله لستم اعظم
نصيبا في الدين من الاعمش فقد اخافوه
ومن على بن يقطين فقد اتهموه فاما
في صدر الاول فقد قتل زيد بن صوحان
العبدى وعوقب عثمان ابن حنيف
الانصارى واقصى حارثة بن قدامة
السعدى وجندب بن زهير الازدى
وشريح بن هانى المرادى ومالك ابن
كعب الارحبي ومعقل ابن قيس الرياحي
والحرث الاعور الهمداني وابو الطفيل

کے تمام فضائل و مناقب کا انکار کیا۔ اور اکثر اوقات
اُن پر سخت ظلم بھی کئے۔ اور جب تمام ملک آلِ مروان
کے لیے خالی ہو گیا۔ تو حجاج پہلے تمام حجاز پر پھر
بعد ازاں تمام عراق کا والی مقرر ہوا۔ وہ بنی ہاشم
کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلا۔ اور بنی فاطمہ کو تمام
ڈرایا۔ اور دھمکایا۔ شیعانِ علیؑ کو بلا تامل قتل کیا۔ اور
اہلبیت رسولؐ کی بنیادیں کھود ڈالیں۔ کمیل ابن زیاد نخعی
پر جو مصائب گذرے وہ گذرے۔ یہ تمام مصیبتیں اور
مظالم بنی اُمیہ کے وقت سے لے کر بنی عباس کے زمانہ
تک جاری اور قائم رہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اُنکی
مدت حکومت کو ختم کیا۔ اور اُن کے گناہوں کو دُنیا کے
تمام لوگوں کے گناہوں سے عظیم ترین قرار دیا۔ اور اُنکے
مظالم کی پاداش میں اُنکے ایام حکومت کو تمام کر دیا۔
آخر ایام بنی اُمیہ میں جب حق مہمل اور دین معطل ہو چکا
تھا۔ تو زید ابن علیؑ نے احقاق حق کے لیے سعی بلیغ کی اہل
عراق نے اُن کے ساتھ نفاق کیا۔ اور اُن کو چھوڑ دیا۔
اہل شام نے آخر کار اُن کو قتل کیا۔ اور اُن کے ساتھ
شیعوں کو۔ مثل نصر ابن خزیمہ اسدی۔ معویہ ابن اسحٰق
انصاری اور اُن کے شیعوں کی جماعت کثیر کو قتل کیا
یہاں تک کہ اُن لوگوں کو بھی مار ڈالا۔ جو اُن لوگوں سے
قرابت اور عزیز داری رکھتے تھے۔ یا وہ لوگ جو اُنکی مدح و
ثنا کرتے تھے۔ جب اِن ظلم وقت نے یہاں تک اِن
صاحبان حرمت کی ہتک و توہین کی۔ اور اُن کے گناہ
و معصیت اس شدت و عصبیت تک پہنچ گئے تو خدا نے
اُن پر اپنا غضب نازل فرمایا۔ اور اُن سے انتزاع ملک

الکنانی وما فیھم الا من خرّ علی وجھہ
قتیلا او عاش فی بیتہ ذلیلا یسمع شتمہ
الوصی فلا ینکر و یری قتلہ الاوصیاء
واولادھم فلا یغیر ولا یخفی علیکم حرج
عامتھم وحیرتھم کجابر الجعفی وکرشید
الھجری وکزرارۃ ابن اعین لیس
الا نھم رحمھم اللہ یتولون اولیاء
اللہ ویتبرون من اعداء اللہ وکفی
بہ جرمًا عظیمًا عندھم وعیبا کبیرا
بینھم وقل فی بنی العباس فانک ستجد
بحمد اللہ تعالی مقالًا وجل فی عجائبھم
فانک تری ما شئت مجالا یجبی فیھم فتفرق
علی الدیلمی والترکی و یحمل الی المغربی
والفرغانی ویموت امام من ائمۃ الھدی
وسید من السادات بیت المصطفی
فلا یتبع جنازۃ ولا تجصص مقبرتہ
ویموت ضراط لھم ولاعب او مسخرۃ
او ضارب فتحضر جنازتہ العدول
والقضاۃ ویعمر مسجد التعزیۃ عند
القواد والولاۃ ویسلم فیھم من یعرفونہ
دھریا او سوفسطائیا ولا یتعرضون
لمن یدرس کتابا فلسفیا ومانویا و
یقتلون من عرفوہ شیعیا ویسفکون دم من
سمی ابنہ علیا ولو لم یقتل من شیعۃ
اھل البیت غیر المعلی ابن خنیس

کر لیا۔ اُن پر ابو مجرم (ابو مسلم نہیں) کو مسلط کیا۔ پھر نظر قدرت علویوں کے ساتھ ابو مسلم کی سختی اور عباسیوں کے ساتھ اُس کی نرمی کو برابر دیکھتی رہی اُسنے اپنے اِس کردار و رفتار میں خوف خدا کو چھوڑ دیا۔ اور اپنی خود غرضی کی متابعت اختیار کر لی۔ اپنی آخرت کو دُنیا کے لیئے بیچ ڈالا۔ اُس کے یہ طرز عمل یوں ظاہر ہوئے۔ کہ اُس نے

عبد اللہ ابن معویہ ابن عبد اللہ ابن جعفر ابن ابی طالبؑ کو قتل کیا۔ اور کافران خراسان۔ خوارج سجستان اور اکراد اصفہان کو آل ابیطالبؑ کے قتل و غارت پر تعین کیا اور ان ستمگاروں نے آل ابیطالبؑ کو۔ پہاڑوں۔ بیدانوں۔ اور دریاؤں اور ریگستانوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کیا یہانتک کہ اسیر (ابو مسلم پر) ایک ایسے شخص کو مسلط کیا۔ جو اُس کے (ابو مسلم) نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا (السفاح) اور اُسکو اُس نے ویسے ہی قتل کیا۔ جیسے اُس نے کثیر بندگان خدا کو قتل کیا تھا۔ اور اس سے بھی اُسنے ویساہی مواخذہ کیا۔ جیسے اِس نے اپنی بیعت کے لیئے مواخذہ کیا تھا۔ اور اس شخص کو اُسکا یہ طرز عمل بھی کوئی فائدہ نہ پہونچا سکا۔ کیونکہ اسکی سوء تدبیری غضب خدا کا باعث ہوئی۔ اور حصول مدعا کے بعد وہ اپنی ہوا و حرص کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دُنیا کو اُس نے اپنے لیئے حلال کر لیا۔ دُنیا میں اُسکے اعمال حبط ہو گئے۔ اور تمام دُنیا کو اُس نے جور و ظلم سے بھر دیا۔ یہانتک کہ وہ مر گیا۔ اور تمام ملک کے قید خانے اہلبیت رسالت اور معدن طیب و طہارت سے بھر گئے۔ اُس کے بعد اُس کے ورثار اور خلفاء

نے بھی اُسی کی متابعت کی۔ عبد اللہ ابن محمد بن عبد اللہ

قتیل داؤد بن علی ولو لم یحبس فیهم غیر ابو تراب المزوری لکان ذلك جرحاً لا یبرأ و نائرة لا تطفاء و صدعا لا یلتئم و جرحاً لا یلتحم و کفاهم ان شعراء قریش قالوا فی جاهلیة اشعار الهجون بها امیر المومنین علیه السلام و دونت اخبارهم و رواها الرواة مثل الواقدی و وهب بن منیة التمیمی و مثل الکلبی والشرقی بن القطامی والهیثم ابن عدی و داب بن الکنانی و ان بعض الشعراء الشیعة یتکلم فی ذکر مناقب الوصی بل فی ذکر معجزات النبی صلی الله علیه و آله وسلم فیقطع لسانه و یمزق دیوانه کما فعل بعبد الله بن عمار البرقی و کما ارید بالکمیت بن زید الاسدی و کما نبش قبر منصور بن الزبرقان المزنی و کما دمر علی دعبل بن علی الخزاعی مع رفقتهم مروان بن ابی حفصة الیمامی و من علی بن الجهم الشامی لیس الا لغلوهما فی النصب استیجابها مقت المرتحق ان هارون بن الخزیران و جعفر المتوکل علی الشیطان لا علی الرحمان کانا لا یعطیان مالا و لا یبذلان نوالا الا لمن شتم آل ابو طالب و نصر مذاهب النواصب مثل عبد الله ابن مصعب الزبیری و وهب بن وهب البختری و

الحسنی کو علاقہ سندھ (ہندوستان) میں عمر ابن ہشام بن عمرو تغلبی کے ذریعہ سے قتل کرایا۔ اس کی وجہ صرف خلاف سلطنت کے شک وشبہ کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ واقعات ان مظالم کے مقابلہ میں۔ جو ہارون رشید نے اہلبیتؑ کے ساتھ کیے۔ یا موسیٰ عباسی کر گیا بہت ہی قلیل اور کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ حضرات (شیعیان خراسان سالاران فتوحٰی) خود واقف ہیں۔ جو موسیٰ عباسی کے ہاتھوں حسنؑ بن علیؑ (ملقب بہ نفس زکیہ) پر مقام فخ (قریب مدینہ) میں گذرا اور علی ابن افطس حسینی پر ہارون کے ہاتھوں سے جو مظالم گذرے۔ اور محمد بن زید بن علی اور قاسم ابن علی الحسنی پر قید دوام و علی ابن عسان الخزاعی پر گرفتاری اور روبکاری کے مصائب ہارون کے ہاتھوں سے جو گذرے وہ مشہور ہیں۔ یہاں تک کہ ہارون مر گیا۔ ایسی حالت میں کہ وہ شجرۂ رسالت کو قطع اور نخل امامت کو مستاصل کر چکا تھا۔ اور اے شیعیان نیشاپور خداوند عالم تمہارے امور میں صلاح و خیر دے۔ تم لوگ سنت دین میں اعمش سے زیادہ حصہ نہیں رکھتے۔ جن کو طرح طرح کی عقوبت سے خوف زدہ کیا گیا۔ اور علی بن یقطین پر اتہام لگایا گیا۔ اور ان بعض بزرگوں کی طرح زمانہ سابق میں زید ابن صوحان العبدی کو پہلے۔ پھر بعد انکے عثمان ابن حنیف انصاری اور آخر میں مالک ابن کعب ارحبی۔ سعقل ابن قیس ریاحی اور حرث بن الاعور ہمدانی اور ابو طفیل الکنانی کو بھی ایسے ہی مصیبتیں پیش آئیں۔ اور حارثہ ابن قدامۃ السعدی۔ اور حنذب بن زہیر الاسدی۔ اور شریح ابن ہانی المرادی۔ اور ان میں سے کوئی متنفس ایسا نہیں بچا۔ جو قتل نہ کیا گیا ہو۔ یا

من الشعرآء مثل مروان بن ابی حفصة الاموی ومن الادبآء مثل عبد الملک ابن قریب الاصمعی واما فی ایام جعفر فمثل بکار بن عبد اللّٰہ الزبیری وابی السمط بن ابی الجون الاموی وابن ابی شوزاب الجشمی ونحن ارشدکم اللّٰہ قد تمسکنا بالعروة الوثقی واثرنا الدین للدنیا ولیس یرید نا بصیرة زیادة من زارفینا ولن یحل لنا عقیدة نقصان من نقص منا فان الاسلام بدء غریبا وسیعود کما بدء کلمة من اللّٰہ ووصیة من رسول اللّٰہ صلعم یورث من یشآء من عبادہ والعاقبة للمتقین ومع الیوم غد وبعد السبت یوم الاحد قال عمار بن یاسر رضی اللّٰہ عنہ یوم صفین لو ضربونا حتی تبلغ سعفات هجر لعلمنا انا علی الحق و انهم علی الباطل ولقد هزم جیش رسول اللّٰہ صلوات اللّٰہ علیہ ثم حزم ولقد تاخر ام الاسلام ثم تقدم الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وهم لا یفتنون ولولا محنة المومنین وقلتهم ودولة وکثرتهم لما امتلات جهنم حتی تقول هل من مزید وکما قال اللّٰہ تعالی ولکن اکثرهم لا یعلمون ولما تبین الجزوع من من الصبور ولا عرف الشکور من الکفور ولما استحق المطیع الاجر ولا احتقب العاصی

جو بچ گیا ہو۔ اُس نے گھر بیٹھ کر حقیرانہ اور فقیرانہ زندگی نہ بسر کی ہو۔ اور برابر جناب علی مرتضیٰ پر سب وشتم نہ سُنتا ہو اور اُنکی تردید وتکذیب کی مجال رکھتا ہو۔ یا اُن کے احیا و ذریات کو قتل ہوتے ہوئے نہ دیکھتا ہو۔ لیکن بایں ہمہ اُنکے عقائد میں کوئی تغیر نہ آیا۔ اور یہ مظالم ومفاسد اُن کو کوئی حرج نہ پہونچا سکے۔ جیسا کہ جابر جعفی۔ رشید ہجری اور زرارہ ابن اعین کے حالات سے ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ سب بزرگوار اولیاء اللہ (یعنی آئمہ اطہارؑ) کے دوستدار تھے۔ اور اُن کے دشمنوں سے بیزار تھے۔ اور ظلمہ وقت کے نزدیک اُنکا یہی جرم عظیم اور عیب کبیر تھا۔ اب بنی عباس کے کردار کا ذکر کرو۔ اُن کے ذکر میں بھی ہم کو بہت سے اقوال ملیں گے۔ اور اُن کے اقوال میں عجائب وغرائب شاہدات پیش آئیں گے۔ بیت المال کی تقسیم کو گویا اُن لوگوں نے قبائل ویلم۔ اقوام ترک۔ اندلس اور فرغانہ کے لیے خاص کر وقف کر دیا تھا۔ اور جب آئمہ ہدیٰ کے طبقہ میں کوئی امام مرجاتا تھا۔ یا اہل بیت مصطفےؐ میں کوئی سید القوم انتقال فرماتا تھا۔ تو کوئی فرد واحد اُن کے جنازہ میں شریک شایعت نہیں ہوتا تھا۔ اور اُس کا کوئی مقبرہ نہیں بناتا تھا۔ بخلاف اُن کے جب کوئی مسخرہ قوال گانے والا۔ یا شاہی بجانے والا مرجاتا تھا۔ تو تمام علما وقضاۃ اُس کے جنازہ کی شایعت کرتے تھے۔ اور بزرگان ودینان کے مقبرہ ومسجد میں اُس کی قبر بناتے تھے۔ بنی عباس اُن لوگوں سے جو مذہبًا دھریہ۔ سوفسطائیہ ہوتے۔ اُن سے بمحاسن سلوک پیش آتے۔ اور یہ لوگ اگر ملک وقوم کو کتب فلسفی اور مانی کی تعلیم دیتے تھے۔ تو اُن سے مطلق

الوزر فان اصابتنا نکبة فذلك ما قد تعوّدناه وان رجعت لنا دولة فذلك ما قد انتظرناه وعندنا بحمد الله تعالیٰ لکل حالة آلة ولکل مقامة مقاله فعند المحن الصبر وعند النعم الشکر ولقد شتم امیر المومنین علیه السلام علی المنابر الف شهر وما شککنا فی وصیة وکذب بمحمد صلی الله علیه واله وسلم بضع عشرة سنة فما اتهمناه فی نبوّته وعاش ابلیس مدّة تزید علی المدد فلم ترتب فی لعنة وابتلینا بفترة الحق ونحن مستیقنون بدولة دفعنا الی قتل الامام بعد الامام والرّضا وکا مرّیه عندنا فی صحّة امامة وکان الله مفعولا وکان امر الله مقدورا کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون وسیعلم الّذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ولیعلمنّ نباه بعد حین اعلموا رحمکم الله ان بنی اُمیّه الشجرة الملعونة فی القرآن واتباع الطاغوت والشیطان جهدوا فی دفن محاسن الوصی واستاجروا من کذبا لاحادیث علی النبی صلی الله علیه واله وسلم وحوّلوا الجوار الی بیت المقدس عن المدینه والخلافة زعموا الی دمشق من الکوفه وبذلوا فی طمس هذا الامر الاموال وقلدوا علیه

اعراض نہ کرتے تھے۔ لیکن جب کسی شیعہ کو پہچان لیتے تھے۔ تو اُس کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔ اور جس شخص کا نام علی ہوتا تھا۔ اُس کی گردن مارتے تھے۔ معلی ابن خنیس کو علی ابن داوٗد نے قتل کیا۔ اور ابو تراب مروزی کو حبس دوام کی سزا دی۔ اِن لوگوں نے اپنے ذمہ وہ مظالم لیئے ہیں۔ جن سے وہ کبھی بری نہیں ہو سکتے۔ اور وہ آتش مفسدہ برپا کی ہے۔ جو کبھی بجھ نہیں سکتی۔ اور وہ صدمات و زخمہائے کاری پہونچائے ہیں۔ جو کبھی التیام نہیں پا سکتے۔ ان لوگوں نے اُن جہلار شعرار قریش کی تو معاونت کی جنہوں نے اپنے اشعار میں جناب امیر المومنین علیہ السّلام کی ہجو کی۔ لیکن اُن شعرائے اسلام کی تعریف و تنبیہ کی۔ جنہوں نے اپنے اشعار و قصائد میں حضرت علی مرتضےٰ ؑ کی مدح و ثنا کی تھی۔ بنی عباس نے خاص کر اُن کے اشعار (ہجویہ) کو طلب کیا۔ اور اُنکے تمام اخبار و مرویات کو اپنے اہتمام سے خاص طور پر ذائع و شائع کیا۔ اور اُنہیں اخبار و آثار سے۔ واقدی۔ وہب بن منبہ۔ التیمی۔ کلبی۔ شرقی بن القطامی۔ ہیثم بن عدی اور داب بن الکنانی نے دفتر کے دفتر مرتب کیئے۔ بعض شعرائے شیعہ نے علیحدہ نہیں بلکہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ذکر معجزات کے ساتھ جناب علی مرتضےٰؑ کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا۔ اُس غریب کی زبان کٹوالی گئی۔ اور اُسکا وظیفہ بند کر دیا گیا اسی طرح عبد اللہ ابن عمار البرقی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کئے گئے۔ اور کمیت ابن زید اسدی کے ساتھ بھی یہی برتاوٗ کیے گئے۔ منصور بن الزبرقان النمری کی تو قبر تک اس جرم میں کھود ڈالی گئی۔ اور ایسے ہی مصائب و

العمال واصطنعوا فيه الرجال فما قدروا
على دفن احاديث رسول صلى الله عليه واله
وسلم ولا على تحريف اية من كتاب الله تعالى
ولا على داس احد من اعداء الله فى اولياء
الله ولقد كان ينادى على رؤسهم بفضائل
العترة ويبكت بعضهم بعضاً بالدليل والحجة
لا تنفع فى ذلك هيبة ولا يمنع منه رغبة
ولا رهبة والحق عزيز وان استذل اهله
وكثير وان قل حزبه والباطل وان صبغ با
لشبه قبيح وذليل وان غطى وجهه بكل
مليح وكيف لا ينتقصون قوما يقتلون بنى
عمهم جوعا وسغبا يملئون ديار الترك والديلم
فضة وذهبا يستنصرون المغربى والفرغانى
ويجفون المهاجرى والانصارى ويولون
بانباط السواد وزراتهم وقلف العجم والطماطم قيادتهم
ويمنعون ال ابيطالب ميراث امهم وفى جدهم
يشتهى العلوى الاكلة فى حرمها وينوح على الايام
الشهوة فلا يطعمها وخراج مصر والاهواز
وصدقات الحرمين والحجاز تصرف الى ابن
ابى مريم المدينى والى ابراهيم الموصلى و
ابن جامع السهمى والى زلزل انصارب و
برصوما الزامر واقطاع بختيشوع النصرانى
قوت اهل بلد وجارى بغا التركى والافشين
الاشروسنى كفاية امة ذات عدد والمتوكل
زعموا يتسرى باثنى عشر الف سرية والسيد

تو اب دعبل خزاعی اور اُن کے رفقاء پر مروان ابن ابی حفصہ الیمامی اور علی ابن جہم الشامی کے ہاتھوں اُن کی انتہائے ناصبیت کی وجہ سے گذر گئے۔ یہاں تک کہ ہارون اور جعفر متوکل (جو متوکل بہ شیطان تھا نہ متوکل علی الرحمان) یہ دونوں ایسے ظلمہ وقت ثابت ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی دولت (دشمنان آل ابی طالبؑ) کے ایثار و عطایا کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان لوگوں نے تمام فرقہ نواصب کی بڑی بڑی مدد کی جیسا کہ علما (دشمنان آل ابی طالبؑ) میں عبد اللہ ابن مصعب ابن الزبیر وہب ابن وہب البختری کے ساتھ اور شعراء میں مروان بن ابی حفصۃ الاموی کے ساتھ اور اُدبا میں عبد الملک ابن قریب الاصمعی کے ساتھ بڑے بڑے گرانمایہ سلوک کیے۔ پھر اسی طرح جعفر کے زمانہ میں بکار ابن عبد اللہ زبیری اور ابی السمط ابن ابی الجون الاموی و ابن ابی شوراب العیشی کے ساتھ عطایائے وافر کیے۔ اور اے حضرات مخاطبان شیعان نیشاپور) خداوند عالم تم کو رشد و ہدایت عطا فرمائے۔ ہم لوگ عروۃ الوثقی کے ساتھ متمسک ہیں۔ اور ہماری دنیا کی بنا بھی ہمارے اساس دینی پر مبنی ہے۔ ہمکو جتنی بصیرت دین حاصل ہو چکی ہے۔ اُس سے گھٹنے والی نہیں۔ ہمارے عقائد محکم ہیں اُن منکران اسلام کے نقصان فی العقائد سے کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے دین میں عجیب و غریب بدعتیں پیدا کی ہیں۔ اور کلمۃ اللہ و حکم رسول اللہ سے بالکل منحرف ہو گئے ہیں۔ خداوند عالم یوں تو جس کو چاہتا ہے۔ زمین کا وارث بناتا ہے۔ مگر دار عاقبت نیکو کاروں کے لیئے ہے۔ ہر آج کے بعد کل آنے والا ہے۔ اور

من سادات اهل البيت يتعفف بزيجة او
سندية وصفوة مال الخراج مقصور على
ارزاق الصفاعنة وعلى موائد المخانثة وعلى
طعمة الكلابيين ورسوم القرادين وعلى
المخارق وعلوية المغني وعلى زرزر وعمر
بن بانة الملاهي ويخلون على الفاطمي
بالاكلة او شربة ويصارفونه على دانق وحبة
ويشترون العوادة بالبدر ويجرون لها
ما يفي برزق عسكر والقوم الذين احل
لهم الخمس وحرمت عليهم الصدقة و
فرضت لهم الكرامة والمحبة يتكففون
ضرا ويهلكون فقرا او يرهن احدهم سيفه
ويبيع ثوبه وينظر الى فيئه بعين مريضة و
يتشدد على دهره بنفس ضعيفة ليس له ذنب الا ان
جده النبي وابوه الوصي وامه فاطمة و
جدته خديجة ومذهبه الايمان و
امامه القرآن -

ہر یوم السبت کے بعد یوم الاحد کا ہونا ضروری ہے
جناب عمار یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین کے روز فرماتے
تھے۔ کہ اگر یہ لوگ ہم کو مارتے مارتے تباہی وجدائی
کے اس سرے تک بھی پہونچا دیں۔ تاہم۔ ہم یہی یقین
کرتے رہیں گے۔ کہ ہم حق پر ہیں۔ اور وہ ضرور باطل پر ہیں
یہ بھی غور کے قابل ہے۔ کہ پہلے جناب رسالتمآب صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے لشکر کو ہزیمت ہوئی۔ اور پھر آپ کے لشکر
نے مخالفین کو شکست پہونچائی۔ اسی طرح پہلے
تبلیغ و توسیع میں تاخیر واقع ہوئی۔ اور بعد ازاں تقدیم
پھر اسی کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا ہے "کیا لوگ
یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ صرف اس کہہ دینے سے کہ ہم ایمان
لائے ہیں چھوڑ دیے جائیں گے۔ اور کیا وہ لوگ فتنہ و فساد
نہیں کرتے ہیں۔ اور حقیقت میں اگر مومن کی تعداد
کم اور ان کے مصائب زیادہ نہ ہوتے۔ تو پھر دوزخ پُر
اور مملو ہو کر کیسے کہتی کہ مجھے ابھی اور زیادہ دیا جاوے اور
اگر خدا نے نہ فرمایا ہوتا۔ کہ اکثر لوگ جاننے والے نہیں ہیں
تو پھر صبر کرنے والوں کو بے صبروں سے۔ اہل شکور کو۔
صاحبان کفور سے اور اہالیان جزا کو مجرمان سزا سے کیونکر پہچانا جاتا۔ ہم لوگوں کے مصائب ایسے ہیں۔ جن کے لیئے
ہم سے اجر و توفیق کا وعدہ فرمایا گیا ہے اور تحقیق کہ رجعت دولت و نعمت کے انتظار کرنے کا ہم کو حکم ہو چکا ہے
اور ہم اُسکا انتظار کر رہے ہیں۔ اور بحمد اللہ ہمارے پاس ہماری تمام حالتوں کے لیئے ایک دلیل اور وسیلہ ہے
اور ہر مقام کے لیئے ہمارے پاس ایک حجت ہے۔ مصیبت کے وقت ہمارے پاس صبر ہے۔ اور نعمت دولت
کے وقت شکر ہے۔ اگرچہ ایک ہزار مہینوں تک جناب امیر المومنین علیہ السلام پر برسر منبر لعنت کی گئی۔ مگر ہم
لوگوں کو آپکے وصی برحق ہونے میں ذرا بھی اشکال واقع نہیں ہوا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی پندرہ برس تک تکذیب ہوتی رہی۔ اور ابلیس ملعون ان اُمور قبیحہ میں اپنی طرف سے مدد پہونچانے میں
ہمیشہ زیادتی ہی کرتا رہا۔ مگر ہم اُسپر (ابلیس پر) برابر لعنت ہی کرتے رہے۔ کیوں؟ اسلیئے کہ ہمارے مصائب

اور ہماری آزمائش فطرت حقّہ کے مطابق ہے۔ اور ہم اُس کے تمام آثار پر پورا یقین رکھنے والے ہیں۔ ہم برابر ایک امام کے قتل کے بعد دوسرے امام کے قتل پر مدافعت کرتے رہے۔ اور ایک رضائے الٰہی کے بعد دوسری پر راضی برضا رہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اُن کے یہ مصائب اُن کی صحت امامت کے لئے دلیل واضح اور حجت قاطع تھے۔ اور یہ اُمور بمصداق آیہ وافی ہدایہ وکان وعد اللہ مفعولا (خدا کا وعدہ ہو کر رہیگا) مقصد مقدر ہو چکے تھے۔ اور ضرور ہونے والے تھے۔ مخالفین کو معلوم ہو جائےگا اور پھر تاکیدًا کہا جاتا ہے اُن کو ایک دن معلوم ہو جائے گا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیے ہیں وہ معلوم کریں گے۔ کہ اُنکی کیسی بازگشت ہونیوالی ہے اور اُن کو اسوقت کے بعد اُسکی خبر ہوگی۔ اور اے حضرات مخاطبان شیعان خراسان۔ آپ لوگ یقین کرلیں۔ کہ بنی اُمیّہ وہی ہیں جنکے لئے قرآن میں شجرۂ ملعونہ کہا گیا ہے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں۔ جو طاغوت وشیطان کے مطیع وفرمانبردار مشہور ہیں۔ جنہوں نے حضرت علیؑ کے محاسن کو مخفی کرایا۔ اور جنہوں نے اُجرت دیدے کر حدیثوں میں جناب رسولخدا صلعم پر جھوٹ بنوایا۔ اور اُن تمام موضوعات سے تمام دیار وامصار بیت المقدس سے لیکر مدینہ تک پڑ اور مملو کرائے۔ خلافت کو ذے اُٹھا کر دمشق میں لیگئے۔ اور اُن اُمور قبیحہ کی تکمیل وترتیب میں دولت کثیر صرف کردی۔ اور اُنکی تعمیل ونفاذ پر اپنے عمال کو مقرر کیا۔ وہ استخفاف حدیث رسول۔ اسقاط اخبار فضائل اہلبیت پیغمبر۔ تحریف فی القرآن۔ اور رفع مظالم معاندین عن رؤس آئمہ طاہرینؑ کا کوئی تدارک نہ کرسکے۔ اگر کوئی شخص فضائل عترت طاہرین بیان کرتا تھا تو اُن میں سے بعض بعض لوگ اُن کے دلائل وحجت کو سن کر رونے لگتے تھے۔ مگر باایں ہمہ یہ اثر وہیبت نہ اُنھیں کوئی فائدہ پہونچاتی تھی۔ اور نہ وہ اپنے غلط طریقہ سے باز آتے تھے۔ حق ہمیشہ عزیز ہی رہتا ہے۔ اگرچہ صاحبان حق کتنے ہی ذلیل نہ کیے جائیں۔ اور اگرچہ اُن کے متبعین کیسے ہی قلیل اور معدودے چند ہوں۔ اور باطل کو گو ظاہری صورت میں کتنا ہی آراستہ وپیراستہ نہ کیا جاوے۔ مگر وہ ہمیشہ بدنما اور ذلیل ہی دکھلائی دیگا۔ بنی اُمیہ کے بعد پھر ایسے لوگوں کو کیوں ملزم نہ کہا جاوے۔ جنہوں نے اپنے بنی عمام کو بھوک اور پیاس سے مار ڈالا۔ اور بخلاف اُنکے دیار ترک ودیلم کے باشندوں کو سونے اور چاندی سے بھر دیا۔ جنہوں نے اقوام مغربی اور فرغانی کی پوری امداد واستعانت کی۔ اور قبائل مہاجر وانصار پر مظالم کئے۔ اقوام انباط سیاہ کو اپنا وزیر بنایا۔ اور اقوام نامختون عجم وطمطم کو اراکین واُمرائے سلطنت مقرر کیا۔ اور آل ابی طالبؑ کو نہ اُن کی ماں کی وراثت دی۔ اور نہ اُن کے جد بزرگوار کے خاص حقوق فئے اور خمس سے اُنکو کچھ حصہ دیا۔ اور جب کسی علوی نے اپنی قوت لایموت کے لیے سعی وخواہش کی۔ تو اُس کی سخت ممانعت کی۔ یہانتک کہ حالت گرسنگی میں اکل میتہ اُنپر حلال ہوگیا۔ انھیں تکالیف میں اُن کی عمریں تمام ہوگئیں۔ مگر کبھی اُنہوں نے سیر ہو کر روٹی نہ کھائی۔ بخلاف اُنکے خراج مصر واہواز۔ صدقات حرمین وحجاز۔ ابن مریم المدینی (حکیم نصرانی) ابن جامع السہمی رقاص ومغنیان سلطان اور بختیشوع نصرانی طبیب شاہی کی جاگیرات دیئے۔ اور اہل بلد کے وظیفہ پہونچانے۔ اور نبخائے ترکی اور

افشین رومی کے غلام و کنیزے کے مصارف میں اُٹھایا جاتا تھا۔ اور مزید برآں محلات شاہی کے مصارف یومیہ میں آتا تھا جن میں سے صرف متوکل کی لونڈیوں کی تعداد بارہ ہزار بتلائی گئی ہے۔ مگر سادات اہلبیت میں ایک سید غریب ایک حبشی اور سندی عورت کے ساتھ اپنی عمر کاٹ دیتا ہے۔ تمام اموال خراج۔ صدقات و زکوٰۃ جلادوں کی خواجہ سراؤں۔ کتوں۔ اور بھال۔ بندروں کی خوراک۔ تماشا کرنے والوں۔ باجہ بجانے والوں۔ شل زرد زرد اور عمر بانہ اہلبی کے مصارف میں صرف کیا جاتا تھا۔ مگر ان میں سے بنی فاطمہ کو کچھ نہ دیا جاتا تھا۔ بلکہ سخت بخل کیا جاتا تھا۔ اور یہ تمام اموال و دولت مصارف عیش اور خرید آلات غنا وغیرہ میں اُٹھائی جاتی تھی۔ اور جو بچتی تھی وہ فوج و لشکر کے مصرف میں آتی تھی۔ اور اُس قوم و فرقہ کی۔ جنکے لیے خمس حلال اور صدقہ حرام کیا گیا تھا۔ اور جن کی عظمت۔ تکریم و تعظیم محبت و مودت لازم و واجب کی گئی ہے۔ ایسی ناگفتہ بہ حالت تھی۔ کہ وہ نہایت تنگی اور شدید عسرت میں بسر کرتے تھے۔ اِن میں سے کوئی اپنی تلواریں رہن رکھتا تھا۔ کوئی کپڑے بیچ کر گذران کرتا تھا۔ اپنی آنکھوں سے گھر میں مریض پڑا ہوا دیکھتا تھا۔ جو شدت ضعف سے سسکتا تھا۔ مگر اُس کے علاج و تدارک پر قادر نہیں تھا۔ اور یہ تمام مصائب و نوائب صرف اس جرم کی وجہ سے تھے۔ کہ اُنکا جد بزرگوار نبی تھا۔ پدر نامدار وصی تھا۔ اور اُن کی ماں فاطمہؑ تھیں۔ اور دادی خدیجہؑ۔ مذہب اُنکا ایمان تھا۔ ہادی اُن کا قرآن۔

مکاتیب خوارزمی

بہت کمیاب ہے۔ ایک بار مصر کے مطبع بولاق مصر سے ۱۲۷۹ھ ہجری میں چھپکر شائع ہوا تھا۔ ہم نے کتاب عبقات الانوار۔ جلد سوم سے اُس کے مرقومہ بالا اقتباسات کو نقل کیا ہے۔ اور کتاب مذکورہ میں اس کے صفحات ۱۲۵ میں عبارت بذا مرقوم ہے۔ یہ پوری کتاب کتب خانہ فردوسیہ شمس العلماء صدر المحققین مولانا السید ناصر حسین صاحب مدظلہ میں موجود ہے فمن شاء یرجع الیہ۔

واضح ہو کہ اصل کتاب مکاتیب خوارزمی کے خاتمہ طبع میں یہ عبارت مصحح مطبع کی طرف سے مندرج کی گئی جس سے اُس کی اہمیت اور مصنف کی اعلمیت ثابت ہوتی ہے۔ وقد تناهی طبع هذه الرسائل التي لم يبلغ شأوها في الفصاحة سحبان وائل بل هو عندها ادنى من باقل ولو ظهرت في ايامه لمد اليها كف مستمد سائل ولو كانت في عصور بن ساعدة الايادي لكان لها علية جميل الابادي فلعمري انها نسخت ما تركت الاوائل كلمة لقائل واحكمت كم ترك الاول للآخر والماضي للغابر فليمكن الاديب لها ثم الاخذ وليعض عليها بالنواجذ فانه يبلغ بها في صناعة اشتد ه وتكون له في الانشاء او فرعدة وكان طبعها على هذا الوجه الحسن وتمثيلها

فی ھذہ القالب المستحسن بدار الطباعة المصرية الكائنة ببولاق
مصر المغربية تعلق المستعين نموكاه فيما يعيد ويبدى عبد الرحمان
بيك رشدی على ذمة حضرت محمد على بيك جراح باشى بالديار المصرية
وحضرت حسن افندی مترجم الكتب العسكرية لازالو ملحوظين بعين العناية
الربانية وكان تصحيحها حسب الامكان معرفته الفقير الى رحمة الرحيم الرحمان المتوسل
الى ربه بالجاه النبوی محمد قطة العدوی باشی مصحح المطبعة المذكورة يسر الله
فى الدارين اموره وقد وافق انتهاء طبعها وتمام تمثيلها ووضعها اوائل ذى الحجة
الذى هو فى هذ العام مشهور ۱۲۷۹ تسع وسبعين ومائتين الف من الهجرة ختام
فالحمد لله الذى بنعمته تتم الصالحات والشكر له على مدى الاوقات وصلى الله وسلم على سيد
الكائنات وعلى آله واصحابه ذوى الكرامات فلاح بدر تمام وفاح مسك ختام۔

ترجمہ عبارت خاتمہ ۔مکاتیب خوارزمی۔ رسالہ ہذا کا انطباع تمام ہوا۔ جس کی فصاحت کو سحبان وائل نہیں پہونچتا۔ اور اس کی انشاپردازی کے مقابلہ میں ابان ابن وائل باقل سے بھی زیادہ احمق ثابت ہوگا۔ اگر مصنف کے زمانہ میں ہوتا۔ تو اس کی قابلیت کے آگے اپنے ہاتھ پھیلاتا اور اگر قس ابن ساعدہ ہوتا۔ تو اعانت واستمداد میں مصنف کا دست بین نبتا۔ میں نے حقیقتاً اس کے متعلق اور کچھ نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ اساتذہ اولین نے جو کلمات مفیدہ یادگار چھوڑے تھے انھیں جمع کر دیا۔ اور متقدمین نے جو کچھ متاخرین کے لیئے۔ اور حاضرین نے غائبین کے لیئے سرمایہ چھوڑا تھا۔ اُسے مستقل ومستحکم کر دیا۔ جس کی عبارت کو دیکھ کر ادیب متعجب بن کر دانت پیسنے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کی تحریر میں انتہا درجہ کی فصاحت وبلاغت سے کام لیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس رسالہ مفید کا چھاپا جانا ہر طریق وقرینہ سے مناسب تھا۔ لہذا مطبع بولاق واقع مصر مغربی میں حسب الایمائے مالک مطبع عبد الرحمٰن بیگ راشدی بزیر اہتمام محمد علی بیگ جراح باشی وملاحسن آفندی مترجم کتاب العسکریہ (خدا دونوں پر نگاہ توجہ رکھے۔) اس کی طبع کا کام آغاز کیا گیا۔ اور حتی الامکان اس کی تصحیح۔ فقیر۔ امیدوار رحمت رحیم الرحمان۔ محمد قطۃ العدوی باشی مصحح مطبع مذکورہ نے انجام دی۔ اور اوائل ماہ ذالحجہ ۱۲۷۹ھ ہجری میں اس کی نقل وصحت وطبع تمام کاموں سے فراغت ہوئی

متبعین اہلبیت طاہرین کی خاص مصیبتیں یہ تو اہلبیت علیہم السّلام اور اُن کی اولاد و ذرّیات کے مصائب تھے۔ جو امام ابو المویداخطب خوارزمی کے مکاتیب کی اصل عبارت سے اوپر نقل کیے گئے۔ اور اُن کے پیروان و معتقدین اور شیعان مخلصین پر جو مصیبتیں ابتداء سے لے کر انتہا تک گذریں۔ اُن کی کیفیت امام مدائنی کی مفصلہ عبارت میں ملاحظہ ہو۔

کتب معویّہ نسخۃ واحدۃ الی عمّالہ بعد عام الجماعۃ انّ برئت الذمۃ ممّن روی شیئاً من فضل ابوتراب و اھلبیتہ وکان اشدّ النّاس بلاءً حینئذٍ اھل الکوفۃ اکثرہ من بھا من شیعۃ علی فاستعمل علیہ ابن زیاد بن سمیّۃ وضم الیہ بصرہ وکان یتبع الشیعۃ وھو بھم عارف لانّہ کان منھم ایّام علی فقتلھم تحت کل حجر و مدر واخافھم وقطع الایدی والارجل وسمل العیون و صلبھم علی جذوع النخل وطردھم وشردھم عن العراق فلم یبق لھا معروف۔

ثمّ کتب معویّہ الی عُمّالہ نسخۃ واحدۃ الی جمیع البلدان انظر وا من قامت علیہ البیّنۃ انّہ یحب علیّا واھل بیتہ فامحوہ من الدیوان واسقطوا عطاہ ورزقہ وشفع ذلک بنسخۃ اخری من اتّھمتموہ بموالاۃ ھؤلاءِ القوم فنکّلوا بہ واھدموا دارہ فلم یکن البلاءُ اشدّ ولا اکثر منہ بالعراق ولاسیّما بالکوفۃ حتی انّ الرّجل من شیعۃ علیؑ لیاتیہ

معاویہ نے سال جماعت کے بعد ایک فرمان عام اپنے تمام عمّالان ملکی کے نام اس مضمون کا لکھا۔ کہ جو شخص فضائل علیؑ و اہلبیتؑ کے متعلّق کوئی روایت بیان کرے ہم اس سے بری ہیں۔ یہ بلا و مصیبت اہل کوفہ پر جن میں زیادہ تر شیعان علیؑ تھے۔ اُس وقت سے اور زیادہ ہوگئی جب سے معاویہ نے زیاد بن سمیّہ کو کوفہ کا والی مقرّر کیا۔ اور بصرہ بھی اُسی کے متعلّق کر دیا۔ اور وہ اُن دونوں مقاموں کے شیعوں سے خوب واقف تھا۔ اسلئے کہ حضرت علیؑ کے وقت میں یہاں کا عامل رہ چکا تھا۔ بدبخت ابن زیاد نے شیعان علیؑ کو تمام آبادی۔ ویرانے پہاڑوں اور میدانوں میں جہاں پایا قتل کیا۔ اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے۔ اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائیں درختوں کی شاخوں پر سولیاں دلوائیں۔ گھروں سے نکالدیا۔ پھر ملک عراق سے خارج البلد کر دیا۔ یہانتک کہ ارض عراق پر معروفین شیعہ میں سے ایک متنفس بھی نہ بچا۔

بار دیگر اس کے بعد معاویہ نے ایک اعلان شاہی تمام عمّالان ملکی کے نام جاری کیا۔ بایں مضمون کہ جس وقت تم کو کسی شخص کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شیعان علیؑ و محب اہلبیتؑ ہے۔ تو تم اُسی وقت اُس کا نام اپنے دیوان سے کاٹ دو۔ اُس کا روزینہ بند کر دو۔ اور اِس قوم کے

من يثق به فيدخل بيته فيلقي اليه
سره و يخاف من خادمه و مملوكه
ولا تحدث حتى ياخذ عليه الايمان
الغليظة ليكتمن عليه فظهر حديث كثير
موضوع و بهتان منتشر ومضى ذلك
الفقهاء والقضاة والالوة وكان
اعظم الناس فى ذلك بلية القراء المراؤن
والمستضعفون الذين يظهرون الخشوع
والنسك فيفتعلون الاحاديث ليحظوا
بذلك عند ولاتهم ويتقربوا بمجالستهم
ويصيبوا به الاموال والضياع والمنازل
حتى انتقلت تلك الاخبار والاحاديث
الى ايدي الديانين الذين لا يستحلون
الكذب فقبلوها ورووها وهم
يظنون انها حق ولو علموا انها
باطلة لما رووها ولا تدينوا بها فلم
يزل الامر كذلك حتى مات الحسن
ابن علىؑ فازداد البلاء والفتنة
فلم يبق احد من هذا القبيل الا خائف
على دمه او طريد فى الارض ثم تفاقم
الامر بعد قتل الحسينؑ وولي عبد الملك
بن مروان فاشتد على الشيعة وولى
عليهم الحجاج بن يوسف فتقرب اليه
اهل النسك والصلاح والذين يبغض
علىؑ و موالات اعدائه و موالاة من يدعى

ساتھ موالات و موافقات قایم رکھنے کی وجہ سے
اُن کو مجرم قرار دو۔ اُس کا مکان گرا دو۔ اِس
حکم شاہی کی تعمیل کی وجہ سے یہ بلا و مصیبت ترقی
کرکے حدود انتہائی تک پہونچ گئیں۔ اور تمام ممالک
عراق سخت بلا میں مبتلا ہوا۔ خاص کر اہالیان کوفہ پر
تو ان بلاؤں کا یہاں تک اثر پہونچا۔ کہ اگر کوئی شیعہ
اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے اس کے گھر جاتا
تھا۔ تو خاص کر اس سے خلوت میں ملاقات کرتا تھا
اور اس کے ملازمین و مملوکین سے بھی خوف کرتا
تھا۔ یہاں تک کہ اُن خادمین سے حلف و قسم شرعی
لیا تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی غیر پر اُسکا شیعہ ہونا ظاہر
نہ کرے۔ اسی زمانہ ظلمت میں کثیر التعداد احادیث
موضوع و بہتان سریع تمام بلاد اسلامی میں ذایع
و شائع ہوئے۔ اور انھیں احادیث پر علماء
و فقہا اور عمالان ملکی عمل پیرا ہوئے۔ ان بلا و
مصیبت میں سب سے زیادہ بلائے عظیم قاریان
راویان اور اُن ضعفائے محدثین کی ہے جنہوں
نے اپنی ظاہری خشوع وغیرہ کو دکھلا کر اور
ناصبیت کو ضامن دے کر حدیث سازی شروع
کی اور نقل و بیان حدیث کو اس لیے اپنا پیشہ
بنا رکھا تھا۔ کہ اس کے ذریعہ سے اُن کو والیان
ملک اور امرائے دولت کا تقرب حاصل ہو۔ اُن
کے دربار میں رسائی ملے۔ اور اس طریقہ
سے وہ مال و دولت زراعت اور عمدہ و
نفیس عمارت پر قادر ہوں۔ یہاں تک کہ یہی

من الناس انهم ایضا اعداءه فاکثروا فی الروایة فی فضلهم وسوابقهم ومناقبهم واکثروا من الغض من علی ومن عیبه والطعن فیه و الشان له وقد روی ابن عرفة[عہ] المعروف وهو من اکابر المحدثین واعلامهم فی تاریخه ما یناسب هذا الخبر وقال ان اکثر الاحادیث الموضوعة فی فضائل الصحابة افتعلت فی ایام بنی امیة تقربا الیهم بما یظنون انهم ترغمون

اخبار و احادیث اُن مؤلفین و مصنفین اسلامی تک پہونچے جو اُن اکاذیب و افترایات کی حقیقت تک نہ پہونچ سکے اور اِس وجہ سے اُنہوں نے اُن کو قبول کرلیا۔ اور اپنی تالیفات میں اُن کو نقل کردیا۔ اور یہ گمان کیا۔ کہ یہ مرویات صحیح اور فی الواقع ہیں۔ اگر اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ سب جھوٹی حدیثیں ہیں۔ تو وہ کبھی ان کو نقل نہ کرتے اور نہ اُن کی تدوین فرماتے۔ ان بدعنوانیوں کی یہی حالت رہی۔ یہانتک کہ حضرت امام حسنؑ نے وفات فرمائی۔ تو یہ بلا و فتنہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگئے۔ کوئی شخص شیعانِ علیؑ میں سے ایسا نہیں تھا

عہ **توثیق ابن عرفہ المعروف بامام نفطویہ۔** ابراهیم بن محمد بن عرفة بن سلیمان بن المغیرة بن حبیب بن مهلب بن ابی صفرة العتکی الازدی الواسطی ابو عبد الله الملقب نفطویه بشبهة النفط وجعل علی مثال سیبویه لانتسابه فی النحو۔ قال یاقوت کان نفطویه عالما بالعربیة واللغة والحدیث اخذ عن ثعلب والمبرد وکان ظاهر الاخلاق حسن المجالسة صادقا فی ما یرویه حافظ القرآن فقیها علی مذهب داود الظاهری راسا فیه مسندا فی الحدیث حافظا للسیر وایام الناس والتواریخ والوفیات ذا مروة وظرف جلس للاقراء اکثر من خمسین سنة وکان یبتدی فی مجلس القرآن علی روایة عاصم مات یوم الاربعا ثانی عشر ربیع الاولی سنة ثلث وعشرین وثلثمایة

ابراہیم ابن محمد ابن عرفہ ابن سلیمان ابن مغیرہ ابن حبیب بن مہلب بن ابی صفرہ العتکی الازدی الوسطی نام تھا۔ ابو عبد اللہ کنیت تھی۔ اور نفطویہ لقب تھا لفظ (ضیا) کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے یہ لقب پڑا۔ علم نحو میں سیبویہ کے برابر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ نفطویہ علم عربی۔ لغت اور حدیث کے عالم تھے۔ علم حدیث اُنہوں نے ثعلب اور مبرد سے حاصل کیا تھا۔ بہت بڑے خوش اخلاق تھے۔ مرویات میں صدوق قرآن کے حافظ۔ طریقہ ظاہریہ داؤدی کے فقیہہ۔ نقل احادیث کے مستند۔ سیرت۔ ایام عرب اور تاریخ کے ماہر کامل صاحب مروت و مکارم تھے۔ علم قرآن کو پچاس برس میں کمال تک پہونچایا تھا۔ اور ابتدا میں مرویات قرآن طریقہ عاصم پر بیان کرتے تھے۔ ۱۲ ربیع الاول ۳۲۳ھ میں وفات پائی۔ وفیات الاعیان

المؤلف عفی عنہ

انف بنی هاشم قال المؤلف
عفا الله صاحب (کتاب الدرجات
الرفیعه فی طبقات الشیعه الامامیه
العلامه السید علی المدنی) ولم یزل
الامر علی ذلك سائر خلافة بنی امیه
لعنهم الله حتی جاءة الخلافة العباسیة
فکانت ادهی وامر واضری واضر والقیه
اهل البیت علیهم السلام وشیعتهم فی
دولتهم اعظم مما مضوا فی الخلافة
الامویة کما قیل ؎
والله ما فعلت امیه فیهم
معشار ما فعلت من العباس
ثم شب الزمان حرم والشان مضطرب
والشنان مضطرم والدهر لا یزداد الا
عبوسا ولا ایام لا یتبدی الا بوسا ولا
معقل الشیعه من هذه الخطیرة الشیعة
فی اکثر الاعصار ومعظم الامصار الانزواء
فی روایات التقیه والانطواء علی الصبر
لهذا لبلیّة انتهی ما فی الدرجات العلیّه

جس کو ہمہ دم اپنے قتل کیے جانے یا خارج البلد کیے جانے کا خوف نہ لگا تھا۔ اور شہادت امام حسینؑ کے بعد تو اس بلا و مصیبت میں اور شدت ہو گئی عبدالملک کے زمانہ خلافت میں شیعان علیؑ پر اور سختی ہوئی۔ اُن پر حجاج ابن یوسف کے ایسا ظالم عامل مقرر ہوا۔ اور اُس کے دربار میں صاحبان علم اور اہالیان صلاح و دین صرف علیؑ کے ساتھ بغض رکھنے اور اُن کے دشمنوں کے ساتھ محبت رکھنے اور سوا اختیار کرنے کے باعث مقرب بنائے گئے۔ اس لیے دشمنان علیؑ کے فضائل ومناقب اور سوابقات کے متعلق کثیر التعداد روایتیں بنائی گئیں۔ اور اسی طرح کثیر التعداد روایتیں مناقص ومطاعن حضرت علیؑ میں تیار کی گئیں۔ جیسا کہ علامہ ابن عرفہ الملقب بنفطویہ۔ جو علم تاریخ کے بہت بڑے عالم اور علم حدیث کے عظیم الشان محدث تھے۔ اپنی تاریخ میں اس خبر کو نقل کرتے ہیں۔ کہ احادیث موضوع نہایت کثرت کے ساتھ بنی اُمیّہ کے زمانہ میں اُنکے تقرب حاصل کرنے کی غرض سے فضائل صحابہ وغیرہ میں بنائی گئیں اور اس سے اُن کی خاص مراد بنی ہاشم کی توہین تھی۔ صاحب درجات الشیعہ علامہ مدنی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ یہ طریقہ اجرا و نقل احادیث موضوع حکومت بنی اُمیّہ تک اسی طرح قائم رہا۔ اور پھر زمانہ سلطنت بنی عباسیہ میں بھی اسی طرح جاری رہا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خراب اور ابتر اور باعث ضرر و فساد ثابت ہوا۔ اور اُن کے زمانہ حکومت میں اہلبیت علیہم السلام اور اُن کے تمام متبعین و مخلصین نے وہ آلام و مصائب دیکھے۔ جو اُنہوں نے عہد بنی اُمیّہ میں بھی نہیں دیکھے تھے جیسا کہ مشہور ہے۔ ؎ قسم خدا کی بنی اُمیّہ نے اُن کے حق میں وہ نہیں کیا۔ جو بنی عباس نے اُن لوگوں کے زمانہ زندگی میں مظالم کیے۔ زمانہ گذرتا گیا۔ اور اُن کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔

شعلہائے مظالم بڑھتے گئے۔ زمانہ اُن کے ساتھ بجز سرد مہری، اور بے التفاتی کے اور کچھ نہ کرسکا۔ اور روزگار ناہنجار اہل حق اور دیندار کے ساتھ سوائے سختی و عذاب کے اور کوئی سلوک نہ کرسکا۔ بالآخران ہی شدائد و مصائب کی وجہ سے کثیر التعداد شیعہ بڑے بڑے شہر اور مقامات میں شرط تقیہ اختیار کرکے زاویہ نشین ہوگئے۔ اور ان تمام بلا و مصیبت پر صبر اختیار کرکے حصول درجات رفیعہ آخرت کے لیے مستحق ہوگئے۔

شبلی صاحب نے حضرت علیؑ اور آل (نبی) فاطمہؑ کی توہین۔ اور احادیث موضوعہ کی کثرت تدوین کی متعلق اپنی عبارت دیباچہ میں جو اشارہ فرمایا تھا۔ اور حقیقتاً ان امور کو چھپایا تھا۔ ہم نے اُس کی تفصیل و تشریح کردی۔ اور جن ممکن طریقوں سے امراء و خلفاء اسلامی تعصب و نفسانیت کے اصول پر اپنے علماء و محدثین شریعت اور اراکین و معاونین سلطنت نے مختلف ذریعوں سے۔ آئمہ اہلبیت علیہم السلام کا استیصال اُن کے متبعین، اور شیعان مخلصین کی تباہی و بربادی۔ اُن کے حقوق واجبہ کی امتناع اور اُن کے فضائل و مناقب کا استخفاف جاری اور قائم رکھا۔ اُن کی حقیقت کا پورا انکشاف کردیا۔

یہ بھی ملحوظ رہے۔ کہ اس نقل و تفصیل میں شیعہ ماخذ یا اُن کے اخبار و آثار سے کچھ بھی کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ سواد اعظم اہلسنت کے علمائے متبحرین اور محدثین و محققین، مثل۔ امام سیف الدین مدائنی۔ امام ابو المؤید اخطب خوارزمی۔ علامہ سید علی المدنی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی کے اقوال و ارشادات سے اقتباسات و استنباطات قلمبند کئے گئے ہیں۔

یوروپین تصنیفات پر بیکار تبصرہ

اس طول طویل اور پُر تفصیل کو تمام کرکے اب ہم شبلی صاحب کے اُس مضمون دیباچہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو یوروپین تصنیفات (سوانح آنحضرت صلعم) کے متعلق تبصرہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

اگرچہ ہم آپ کے اس مضمون میں تبصرہ کی کوئی مناسبت نہیں پاتے۔ لیکن اس لیے کہ آپ اس تبصرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ہم بھی آپ کے ہم آواز ہوکر اس کو تبصرہ ہی لکھتے ہیں۔ شبلی صاحب نے یوروپین تصانیف میں۔ جو نقائص اُن کے تجسس و تلاش میں۔ اور جو معائب اُنکی تحقیق و تنقید میں بتلائے اور دکھلائے ہیں۔ وہ اُن کی عدم معرفت۔ کمی اطلاع۔ حقیقت سے ناواقفیت تعصب و نفسانیت کے عذر تک تو نہایت معقول ہیں۔ مگر قدیم مختار کے مطابق۔ جب ان نقائص کو اسلامی سیرتوں کے غیر مستند اور غیر مفید اقتباسات اور منقولات و مرویات کا نتیجہ بتلایا جاتا ہے۔ اور سیرت کے مطالعہ کے بعد پھر رجوع فی الحدیث کی اُن کو ہدایت کی جاتی ہے۔ تو آپ کے استدلال میں

ضعف و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث و سیرت کی فاضل و مفضول کی بحث میں پوری تفصیل سے اوپر ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ باعتبار حقیقت و اصلیت کے سیرت سے حدیث کی زیادہ حالت خراب ہے۔ کثرت موضوعات کی بنا پر شبلی صاحب یوروپین محققین کو سیرت سے جُدا ہو کر احادیث کی نقل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مگر ؎ این راہ کہ میروی بترکستان است یہ راستہ اُن کے اختیار کردہ رستہ سے بھی زیادہ مضر ثابت ہوگا۔ اسلیئے کہ موضوعات سیرت سے زیادہ حدیثوں کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ جنکے شواہدات ان غیر اسلامی مولفین کو اسلام پر انواع و اقسام کے اعتراض کرنیکے لیئے پوری قوت پہونچا سینگے۔ شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

سب سے بڑی وجہ ہے۔ کہ انکا (یوروپین مصنفین) سرمایہ استناد صرف سیر و تاریخ کی کتابیں ہیں۔ مثلاً مغازی واقدی۔ سیرت ابن ہشام۔ سیرت محمد ابن اسحٰق۔ تاریخ طبری وغیرہ۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت صلعم کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا۔ تو قیاس یہی رہبری کریگا۔ کہ تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی ایسی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو چنانچہ اس کی بحث اُوپر گذر چکی مصنفین سیرت سے قطع نظر کرکے روایتیں زیادہ ترجن لوگوں سے مروی ہیں۔ مثلاً سیف بکری۔ ابن سلمہ۔ اور ابن نجیح عموماً ضعیف الروایہ ہیں۔ اس لیئے عام اور معمولی واقعات میں اُن کی شہادت کافی ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے۔ اُن کے لیئے یہ سرمایہ بیکار ہے۔ آنحضرت صلعم کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں۔ جو حدیث کی کتابوں میں بروایت صحیح منقول ہیں۔ یوروپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ (اچھا ہے جو ہمیشہ بے خبر رہیں۔ مولف عفی عنہ) اور ایک آدھ کوئی ہے۔ (مثلاً مارگیولوس) تو اوّلاً وہ اس فن کا ماہر بھی نہیں۔ اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیئے کافی ہے۔ دیباچہ ص ۷۔

مرقومہ بالا عبارت سے ظاہر ہو گیا۔ کہ غیر اسلامی مورخین کو آنحضرت صلعم کی سوانح عمری مرتب کرنے کے وقت یقینی واقعات صرف حدیث ہی کی کتابوں سے ملیں گے۔ حالانکہ آپ خود لکھ کر اور اعتراف فرما چکے ہیں۔ کہ سیرت و تاریخ کی تدوین میں سلسلہ اور ترتیب واقعات کی بڑی ضرورت ہے۔ اور مرویات احادیث میں کوئی سلسلہ یا ترتیب واقعات کی نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ دیباچہ صفحہ ۸ عبارت زیرین حاشیہ میں آپ کی مفصلہ ذیل تحریر موجود ہے :-

یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلعم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ جو سیرت میں کافی مدد دیسکتے ہیں۔ تاہم تنہا اُن سے ایک تاریخی تصنیف نہیں تیار ہوسکتی

اس کے علاوہ اُن میں تاریخی ترتیب بھی نہیں ہے۔"

شبلی صاحب تو صرف غیر اسلامی مولفین کو اپنے اس اصول رجوع فی الحدیث کی ہدایت فرمارہے ہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں۔ کہ غیر مسلمین کے علاوہ اگر خاص مصنفین مسلمین بھی۔ آنحضرت صلعم کی سوانح عمری لکھنے کا شرف حاصل کرنا چاہیں۔ اور آپ کی ہدایت کی موافق مرویات حدیث ہی کو واقعات یقینی قرار دیکر مستنبط کریں۔ تو بالآخر وہ اپنی تصنیفات و تالیفات میں واقعات کا سلسلہ اور ترتیب قایم رکھنے کے متعلق کہاں تک کامیاب ہونگے۔ اور تنہا اِن ماخذوں سے جب کتاب تیار ہو گی۔ اور بقول آپ کے وہ سلسلہ و ترتیب سے بالکل خالی رہے گی۔ تو وہ سیرت۔ سیرت رہے گی۔ یا کیا؟ اس کا جواب شبلی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

جب صرف احادیث کے اقتباسات سے مستنبط شدہ سیرت میں نہ ترتیب سیرت قایم رہی۔ اور نہ سلسلہ تاریخ پایا گیا۔ تو آپکے اصول نو ایجاد کے مطابق صرف حدیثوں سے کام لیا جانا۔ اِن مولفین کے لیے محض تضیع اوقات اور سعی بیکار ثابت ہوئی یا نہیں۔ پھر ایسے غلط اصول قایم کرنے سے فایدہ

تنہا نقل احادیث کی ہدایت مغالطہ دہی ہے

شبلی صاحب نے بلاغور و تامل احادیث کی مرویات پر یقینیات کا حکم عام لگا کر یوروپین مصنفین کو اقتباسات و منقولات احادیث کی طرف دعوت دی ہے مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ احادیث کی نقل و تحریر اُن کے لیے نقل و سیرت و تاریخ سے زیادہ آپ ہی کو ضرر پہونچانے والی ثابت ہوئی ہے۔

یہ شبلی صاحب کی کھلی مغالطہ دہی ہے۔ جیسا کہ آپ لکھتے ہیں۔ کہ یوروپین تصنیفات کا ماخذ صرف اسلام کی سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔ اور اُنھیں غیر مستند و غیر سقید مرویات کی بنا پر اُن کو اسلام پر اتنے حملات و اعتراضات کی جرأت ہوئی۔ آپ کی یہ تحریر بالکل خلاف واقع ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی نے آگے چلکر اپنی اصل کتاب میں آنحضرت صلعم کے متعلق۔ عیسائیوں کے جتنے اعتراضات قایم کیے ہیں وہ سب کتب احادیث کے اقتباسات ہیں۔ اور آئمہ احادیث خصوصاً اصحاب صحاح کی مرویات ہیں۔ سیرت یا تاریخ کے حوالہ سے تو کوئی بھی نہیں۔

ذیل میں اُن کی چند مثالیں نمونہ کے طور پر لکھی جاتی ہیں۔

یوروپین اعتراضات کے ماخذ کتب صحاح و سنن ہیں

(۱) سیرت النبیؐ جلد اوّل ص ۱۲۷ کے زیرین حاشیہ متعلق (۲) یہ عبارت مرقوم ہے۔

عبد المطلب کا آنحضرت صلعم کو عزیز رکھنا ایک مسلّم واقعہ ہے۔ لیکن مارگیولس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان

ہونا بھی گوارا نہیں فرماتے ہیں۔ کہ یتیم لڑکے کی حالت اچھی نہیں تھی۔ آخر زندگی میں اُن کے چچا حمزہؓ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا۔ (لائف آف محمدؐ مارگیولوس ص ۵۴-۹۴)

حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال کیا ہے۔ مارگیولوس خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ وہ نشہ کی حالت تھی۔ اُس کی تفصیل جیسا کہ بخاری میں ہے۔ یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے باربرداری کے لیے اونٹ خریدے۔ اُسوقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گذرے (خیریت ہوئی کہ علیؓ نے اُسوقت حمزہؓ کے ساتھ ملکر شراب نہیں پی لی۔ بخاری صاحب کا شکریہ) اور ایک اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل و جگر کا کباب لگایا۔ آنحضرتؐ صلعم کو اس کی خبر ہوئی۔ تو آپ حمزہؓ کے پاس گئے۔ اور اُن کو ملامت کی۔ حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے ایسی حالت میں وہ الفاظ اُن کی زبان سے نکلے تھے۔ کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے"۔

کسی حالت میں یہ الفاظ کہے گئے ہوں۔ اس سے بحث نہیں۔ بحث تو واقعہ کی حقیقت سے ہے اور وہ خود امام بخاریؒ کی خاص روایت سے ثابت ہے۔ کسی تاریخ و سیرت سے بھی مستنبط نہیں اس لیے شبلی صاحب کے مقرر کردہ اُصول کے مطابق۔ وہ واقعات یقینی میں داخل ہے۔ اس بنا پر اگر مارگیولوس نے حضرت حمزہؓ کی سخت کلامی کا ذکر کیا۔ تو کیا بیجا کیا۔ اُسکے دل کی گڑھی بات تو ہے نہیں۔ اُس نے تو صحیح بخاری کی ایسی اصح الکتب کے حوالہ سے لکھی ہے۔ اور اُسی بنا پر اپنا استدلال قائم کیا ہے۔ مارگیولوس حضرت حمزہؓ کی شراب خواری اور خصوصاً اسلام لانے کے بعد بھی مبتلائے میخواری رہنے کا ذمّہ دار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جس مذہب و طریقہ کا پابند ہے۔ اُس میں حرمت خمر کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ جتنی اسلام میں۔ وہ تو حضرت حمزہؓ کی اس بدزبانی کی مثال دکھلا کر آنحضرت صلعم کے ساتھ اُن کی نامہربانی ثابت کر رہا ہے۔ یہ تو بخاریؒ کی ذمّہ داری ہے۔ کہ حضرت حمزہؓ کو شروع سے اسلام لانے تک شراب خوار ثابت کرتے ہیں۔ اور پھر اس میخواری کی مجبورانہ و مخمورانہ کیفیت کو اُن کی اس سخت کلامی کا باعث دکھلا کر معذرت بھی کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عذر بدتر از گناہ بھی واقعہ کی اصلیت پر پردہ نہ ڈال سکا۔

افسوس بخاریؒ صاحب کو ان لغویات کی تجمیع و تدوین فرماتے وقت نہ اسلام کا پاس آیا۔ نہ ایمان کا لحاظ۔ افسوس پر افسوس تو یہ ہے۔ کہ تائید بخاریؒ کی خاص پرجوشیوں میں شبلی صاحب کے ایسے محقق و نقاد نے بھی و پیش پر کچھ خیال نہ فرمایا کہ خاندان رسالتؐ اور دودمان نبوتؐ۔ ان حضرات کی تحقیق میں حقیقتاً ایسا ہی ذلیل و خوار تھا۔ کہ ابتدا ہی سے اُن میں تمام مخرب اخلاق عادات و اطوار موجود تھے اور باوجود اسلام لانے اور دولت ایمان پانے کے بھی اُنکے ذمائم عادات میں سرمو فرق نہ آیا۔

تعجب پر تعجب تو یہ ہے۔ کہ احادیث متواترہ سے یہی حضرات آئمہ شش گانہ احادیث لکھتے ہیں۔ کہ حضرت عبد المطلبؓ اُن نیکوکاران اور پرہیزگاران قریش میں سے تھے۔ جنہوں نے شرب خمر کو اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ مگر انہیں کے گھر میں۔ انہیں کے صاحبزادے حضرت حمزہؓ شراب پیا کرتے تھے۔ اور عبد المطلبؓ دیکھا کرتے تھے۔ اور کچھ نہ کہا کرتے تھے۔ حضرت عبد المطلبؓ در ذِفرزندی کے تقاضہ سے اگر صاحبزادے پر کوئی شدت نہ کر سکتے تھے۔ تو صرف اپنی مثال دکھلا کر بہت کچھ اُن پر اثر پہونچا سکتے تھے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا (نعوذ باللہ) تغافل تو اور بھی زیادہ تامّل کا باعث ہے مانا کہ حرمت خمر کا اُسوقت تک حکم ظاہری نہیں تھا۔ مگر شراب خواری کی حقیقی بدکاری تو آپ پر بخوبی ظاہر تھی۔ اور چونکہ اسلام تمام ادیان سابقہ کی تصدیق و تائید کے ساتھ اُن کے مخترعات و بدعات کی تصحیح و ترمیم کا بھی مدعی ہے۔ اِس بنا پر جس طرح تمام داعیان اُمم سابقہ اِس کی حرمت کو جانتے تھے۔ اُسی طرح یہ ضرور تھا۔ کہ بانئے اسلام علیہ السلام بھی اُس کی حرمت سے بخوبی واقف ہوں یا بوجود علم حرمت کے یہ ممکن نہیں تھا۔ کہ آنحضرت صلعم نے سابقین مسلمین کو عموماً اور اپنے اعزہ و اقارب قریب ترین کو خصوصاً اُس کی حرمت سے آگاہ نہ فرمایا ہو۔ اور اِس بدعات کے ترک کر دینے کی تاکید شدید نہ کی ہو۔

جیسا کہ قرائن تبلا رہے ہیں۔ اس قصہ کا زمانہ وقوع حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کے بعد ہے۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا حضرت حمزہؓ کے مزاج میں فطرت صالحہ کے اتنے جوہر بھی نہیں تھے۔ جو رسول صلعم کی ہدایت و موعظت کے بعد بھی بُری اور بھلی باتوں کی تمیز کر سکتے۔ قرآن مجید میں فطرت صالحہ کی بنا پر۔ جہاں انبیائے سابقین کا کامل رشد و ہدایت پانا نام بنام مذکور ہے۔ وہاں کے اُن کے تمام اعزہ و اقارب کا فائز بفطرت صالحہ و بہدایت راشدہ ہونا پوری تفصیل سے مرقوم ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ انعام جزو ۷ کی مرقومہ ذیل آیہ مبارکہ۔

ووھبنا لہ اسحٰقؑ ویعقوبؑ کلا ھدینا و نوحا ھدینا من قبل ومن ذریتہ داؤدؑ وسلیمانؑ وایوبؑ ویوسفؑ وموسٰیؑ و ھارونؑ وکذلک نجزی المحسنین وزکریاؑ ویحیٰؑ وعیسٰیؑ والیاسؑ کل من الصلحین	اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (بیٹا) اور یعقوبؑ (پوتا) دو فرزند) عطا فرمائے۔ اُن سب کو ہم نے راہ راست دکھلائی۔ اُن سے پہلے ہم نے نوحؑ کو بھی راہ راست دکھلائی۔ اور اُن ہی کی نسل میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور موسٰیؑ اور ہارونؑ (سب) کو (ہم نے

واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطا کلا فضلنا علی العالمین ومن اٰباءھم وذریاتھم واخوانھم واجتبینھم وھدینھم الیٰ صراط مستقیم۔

راہ راست دکھلائی۔) اور خلوص دل سے نیک کام کرنے والوں کو ہم ایسے ہی صلہ عطا فرمایا کرتے ہیں اور (علیٰ ہذا القیاس) زکریاؑ یحییٰؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ (ان سب کو) ہم نے راہ راست دکھلائی۔ اور اُن سب کو دُنیا جہان کے لوگوں پر برتری دی۔ اور نہ صرف انہی کو۔ بلکہ ان کے بڑوں کو اور اُن کی اولاد سے اور اُن کے بھائیوں سے ہم نے انتخاب کیا۔ اور اُن کو دین کی سیدھی راہ دکھلائی۔

اس آیت سے انبیائے سابقین کے اسلاف واخلاف اور اعزہ واقارب کا فطرۃ صالحہ پر اور ہدایت راشدہ فائز ہوکر برترین عالمیان ہونا ثابت ہوگیا۔ تو پھر اشرف المرسلین اور ختم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاف واعقاب ان مفاخر ومشارف سے کیوں محروم سمجھے جائینگے۔ عقائد اسلام کے علاوہ شرائط انصاف تو اسی کے مقتضی ہیں۔ کہ یہ حضرات ان محامد واوصاف پر بدرجہ اولیٰ شرف یقین کیے جائیں۔ چہ جائیکہ سید المرسلینؐ کے عم محترم اور ابن عم۔ اسلام لانے اور ایمان پانے کے بعد بھی ایک مدت مدید تک شراب خواری کی ایسی بدکاری میں گرفتار تبلائے جائیں۔ ان ھذا بھتان عظیم۔

یہ اُسی اصول تعمیم کا نتیجہ ہے۔ جس کو خواہ مخواہ محض اغیار کی تائید کی غرض سے مذہبی عقائد میں داخل کرکے شان رسالت اور خاندان رسالت کی صاف صاف تنقیص وتوہین کی جاتی ہے۔ حضرت حمزہؓ کی شراب خواری کا واقعہ حضرت علی مرتضیٰؑ کی میخواری کا سنگ بنیاد ہے۔ جس کو بخاری نے رکھا۔ اور ابوداؤد نے جھوٹ کا پل باندھا۔

یہ وہی شرمناک لغویات ہیں۔ جن کو یوروپین مصنفین کتب صحاح سے نقل کرکے اسلام کی معاشرت اور عادات واخلاق پر اعتراض کا پورا موقع پاتے ہیں۔ اور انبیائے سابقین کے حواری صحابی اور اعزہ واقارب میں اس ناہنجار عادات واطوار اور جواز کی مثال انہیں اخبار وآثار اسلامی سے دکھلاتے ہیں۔ جو حقیقتاً عقل ونقل دونوں ذریعوں سے سراپا لغو اور تمام وکمال افترا ہے۔ ہم اس مضمون کو حضرت علیؑ (نعوذ باللہ) کی شراب خواری والی بحث میں پوری تفصیل سے لکھیں گے۔

(۲) صفحہ ۱۲۸ میں مرقوم ہے:۔

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی۔ تو آپ نے بکریاں چرائیں۔ فرانس کے ایک مورخ نے لکھا ہے۔ کہ ابوطالبؑ چونکہ محمدؐ کو ذلیل سمجھتے تھے۔ اس لیے اُن سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔

اس کی تحقیق و تنقید میں ص ۲۹ اکے زیرین حاشیہ یہ عبارت مرقوم ہے۔
بخاری نے کتاب الاجارۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نقل کیا ہے۔ کہ میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا" قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ سوید ابن سعید کی رائے ہے۔ کہ قراریط جمع قیراط کی ہے۔ اور قیراط درہم و دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔ اس بنا پر اُن کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے۔ بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے۔ کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے۔ جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ نووی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے۔ اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے۔
آپ کے اس بیان سے اُس مورخ فرانسیسی کی تکذیب کیا ہوئی۔ بلکہ ابراہیم حربی۔ ابن جوزی۔ اور علامہ نووی۔ سب نے ملکر بخاری۔ ابن ماجہ اور اُن کے شیخ سوید ابن سعید کو جھوٹا بنایا۔ بخاری کو نقل سے پہلے تحقیق حقیقت کرنی ضرور تھی۔ آخر اُنھیں کے شارحین نے اُن کی غلطی پر تصحیح و ترمیم کی۔ لیکن معترضین کو ان تصحیحات و ترمیمات کی خبر ہو یا نہ ہو۔

وہ تواریخ الکتب کے حوالہ اپنی تعریف قائم کرتے ہیں

ہم نے اس بحث کو پوری تفصیل کے ساتھ اسکے خاص مقام پر بیان کیا ہے۔ اس لیے زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں۔
(۳) ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا رکھا۔ یہ کھانا بُتوں کے چڑھاوے کا تھا۔ جانور جو ذبح کیا گیا تھا۔ وہ کسی بُت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا۔ آپ نے کھانے سے انکار کیا۔ سیرۃ النبی جلد اوّل ص ۱۲۹۔ اس کے پائین حاشیہ یہ عبارت مرقوم ہے۔
صحیح بخاری باب مناقب ذکر زید ابن نفیل۔ یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے۔ جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے۔ مسند امام احمد ابن حنبل جلد اوّل ۱۸۹ میں ایک روایت ہے۔ جس میں بیان کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کو اس کھانے پر بلایا۔ اور زید نے انکار کیا۔ اور پھر آنحضرت صلعم نے اس تاریخ سے کبھی بُتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا۔ لیکن اس روایت کے راویوں کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔"
بخاری کی روایت قراریط اُوپر ابھی لکھی گئی ہے۔ جب وہ مخدوش روائتیں خود لکھتے ہیں۔ تو اُن سے دوسروں کی تصحیح کی کیا اُمید ہے۔ اوّل تو بخاری نے اس روایت کو ایک ہی الفاظ کے ساتھ تمام ابواب میں کیوں نہ لکھا۔ مگر جب خیال آیا۔ تو ایک دوسرے باب میں حقیقت کا انکشاف فرمایا۔ اور لطف

یہ کہ سابق والی روایتوں کے تمام الفاظ ویسے کے ویسے ہی چھوڑ دیئے۔ اب اگر معترض انھیں الفاظ سے مستنبط کر کے آنحضرت صلعم کی قبل بعثت (نعوذ باللہ) بے احتیاطی ثابت کرتے ہیں۔ تو اُسکے اسناد غیر صحیح کیسے کہے جا سکتے ہیں۔ شبلی صاحب تو اپنی سیرۃ النبی میں مرویات بخاری کے الفاظ میں اجمال باقی رہ جانے کا یقین دلا رہے ہیں۔ اس سے جو اعتراض ہو چکے ہیں۔ اُن کی تردید کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ امام بخاری کے شیخ الشیوخ حضرت امام احمد ابن حنبل کے الفاظ حدیث میں تو کوئی اجمال نہیں۔ وہ تو صاف صاف لکھ رہے ہیں۔ کہ قریش کا لایا ہوا کھانا نہیں تھا۔ مگر رسول صلعم کے گھر کا پکا ہوا کھانا تھا۔ جو مخصوص زید کی ضیافت کے لیے تیار کیا گیا تھا معترضین کو بخاری اور امام احمد ابن حنبل کے فرق مابہ الامتیاز کی کیا خبر۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ جانتے ہیں۔ کہ امام حنبل سے امام بخاری نے علی الاکثر حدیثیں لی ہیں۔ اور اُن کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے۔ پھر وہ امام حنبل پر ترجیح بخاری کا خیال کیسے قابل تسلیم کہا جا سکتا ہے؟ اس لغو اور مہمل روایت کے ذمہ دار بھی کم و بیش دو اکابر و عمائد محدثین ثابت ہوتے ہیں۔ ہم اس مسئلہ کو بھی اس کے مقام پر پوری تفصیل سے لکھیں گے۔

(۱۴) نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ آپ کے معتقدات میں جو تغیر ہوا ہے۔ وہ عہد نبوت سے ہوا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا۔ جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادے کا نام عبد العزیٰ رکھا تھا۔ یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے۔ لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو۔ تو اس سے آنحضرت صلعم کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بُت پرست تھیں۔ اُنھوں نے یہ نام رکھا ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے آپ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا۔ اور اصل واقعہ یہ ہے۔ کہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں۔ اس روایت کا سب سے زیادہ صحیح وہ سلسلہ ہے۔ جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے۔ اس سلسلہ کا راوی اول اسمٰعیل ہے۔ جس کا پورا نام اسمٰعیل ابن ادریس ہے۔ اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

معاویہ ابن صالح	اسمٰعیل اور اُس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ ابن مخلط	جھوٹ بولتا ہے۔ اور نہایت ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔

نضر بن سلمہ مزوری	وہ کذاب ہے۔
دار قطنی	میں اس کو صحیح روایت کے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	جھوٹی حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ ابن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا۔ کہ جب کبھی کسی بات میں کوئی اختلاف ہوتا تھا۔ تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا

اس عبارت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ عیسائیوں کو ایسے غلط دعوے کی جرأت آپ کے امام بخاری نے دلائی تھی۔ جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ مگر آخر میں اُن کی یہ ذلت ہو رہی ہے۔ کہ آپ خود اپنے دست وقلم سے اُن کی مرویات کی لغویات ظاہر فرما رہے ہیں۔

(۵) صفحہ ۱۴۰ کے زیرین حاشیہ یہ عبارت مرقوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی۔ لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ نہیں پیش کیا۔ بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگیولوس کی کتاب ص ۷۰-۶۸) معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے لیکن (اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے۔ ثانیاً یہ روایت) کلبی سے ہے۔ جو مشہور دروغ گو ہے۔

لیجئے اس متعصب عیسائی کی تعریض کی سند بھی ایک اسلامی عالم کے مختار سے مستنبط ہے۔ یاقوت حموی کی عالمانہ اور محققانہ آب وتاب سے کون مسلمان واقف نہیں ہے۔ شبلی صاحب نے خود علی الاکثر اسکے حوالہ اور سند سے کام لیا ہے۔ آپ اسوقت موقع کی ضرورت سے مجبور ہو کر اس عربی محقق کی تکذیب کر دیں۔ وہ دوسری بات ہے۔ لیکن مارگیولوس کی تعریض کو آپ بے سند نہیں کہہ سکتے اور نہ اُس کے نقل پر اعتراض کر سکتے۔ وہاں تک آپ کا عذر صحیح تھا۔ کہ اُس نے ولہوسن کے قول کو سند میں دیا تھا۔ لیکن جب آپ نے ایک اسلامی عالم کی سند پالی۔ تو مارگیولوس سے الزام جاتا رہا آگیا اُنھیں یاقوت حموی اور کلبی کے سر۔ جو دونوں اسلام کے مقتدر اور معتبر عالم ہیں۔

ان تمام تعریضات کے باعث۔ عام اس سے کہ یہ اعتراض فی نفسہٖ کیسے ہی ضعیف اور محض بیدلیل ہی کیوں نہ ہو۔ آپ ہی کی کتب احادیث اور آپ ہی کے علما ومحدثین کی مرویات ثابت ہوتے ہیں اگر کتب احادیث میں ان لغویات کا شروع ہی سے انبار نہ لگایا ہوتا۔ تو آج مخالفین کو تعریض کا کوئی موقع نہ ملتا۔ اگر تدوین احادیث کے وقت ہی محدثین ومدونین احادیث نے اُصول تعمیم

تائید عقائد۔ تقلید اسلاف۔ اور حمایت سلطنت کے غلط طریقہ نہ اختیار کئے ہوتے۔ تو ان تمام آلائشوں سے اُن کا دامن بھی پاک وصاف ہوتا۔ اور اُن کی تالیف وتصنیف بھی۔ مگر یہ امر بہت مشکل تھا۔ اور اُن کے امکان سے باہر اُن کے تمام اسباب وعلل ہم پوری تفصیل کے ساتھ اوپر تبلا آئے ہیں۔ بار دیگر اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ سمجھنے کے لیئے اتنا ہی کافی ہوگا۔ کہ وہ حضرات ان لغویات وحشویات کے نقل واندراج کے لیئے سلطنت کی طرف سے اگر مامور رہتے۔ تو اپنے عقائد کے اُصول موضوعہ کے اعتبار سے مجبور۔ مثلاً شراب خواری کی خراب عادت جس میں باستثنائے بنی ہاشم تمام قبائل قریش اور عموماً تمام اقوام عرب گرفتار تھی۔ بنی ہاشم کو بھی ان عادات ذمیمہ کا مرتکب نہ دکھلایا جاوے۔ اور تعمیم کا اُصول نہ جاری کیا جاوے۔ بہت سے مسلمین قریش۔ جن میں سابقین مہاجرین وغیرہ علی الاکثر مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اِس الزام سے بچ نہیں سکتے۔ اور کلہم عدول کی عدالت مسلمہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اِس لیے ضرور تھا۔ کہ اسلاف رسولؐ سے لے کر۔ جو حقیقتاً اشراف قریش تھے ظہور پیغمبر اسلام تک۔ اِس خاندان کے لوگوں کو بھی اِس عادت ذمیمہ کا عادی اور مرتکب تبلایا جاوے اِس غلط اُصول کے وضع کرنے کے وقت۔ نہ رسول صلعم کی ذاتی عصمت وعظمت کے مسلمہ کا خیال وپاس رکھا گیا۔ نہ اُنکے پہلے اُن کے آبائے متقدمین کی فطرت صالحہ پر مخلوق فرمائے جانے کا لحاظ کیا گیا۔ نہ رسول صلعم کی موجودگی میں اور نہ اُن کی وفات کے بعد۔ اُن کی ذریات واقربا کی مودّت یا عزت وحرمت کی رعایت کی گئی۔ بلکہ وہ تمام بزرگوار عام طریقہ سے عوام الناس کی طرح تمام اخلاقی۔ اور معاشرتی ضروریات میں ادنیٰ۔ گندہ عادات وخصائل اور رذائل مشاغل کے مرتکب وعامل تبلائے گئے۔

اسلاف رسولؐ ہیں تو قصیٰ کے وقت سے لیکر عبد المطلبؑ تک سب کے سب کفار ومشرکین (العوذ باللہ)

اعمام اور **بنی اعمام** رسولؐ ہیں۔ تو حمزہؓ سے لے کر علیؑ تک سب کے سب شرابخوار۔

حضرت حمزہؓ کو آنحضرت صلعم کے عم محترم ہونے کے علاوہ۔ آپ کے ساتھ اخوت بالرضاعت کا بھی شرف حاصل ہے۔ گویا حقیقی اور ظاہری دونوں طریقوں سے آپ کے ساتھ خون ملا ہوا ہے۔ مزید برآں اسلام لا چکے ہیں۔ شرف ایمان پا چکے ہیں۔ مگر اس پر بھی عادات واطوار کی دنائیت اور رزالت سے توبہ نہیں کرتے۔

حمزہؓ سے تو خراب حالت علیؑ کی ہے۔ وہ بنی عم ہونے کے علاوہ۔ بالکل صغیر سنی کے زمانہ سے لیکر ۲۵ برس کی عمر تک دامن رسولؐ میں پرورش پا چکے ہیں۔ ہر دم وہر لحظ صحبت نبوت میں حاضر رہ کر ہر قسم کی تعلیم وتربیت میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اُن کو بھی شراب خواری کی (نعوذ باللہ) ایسی

بڑی عادت پڑی ہے۔ کہ منہ سے چھٹتی ہی نہیں۔ اور مے نوشی کی اسی مدہوشی میں نہ اپنی اوقات کا خیال ہے اور نہ اپنے عملیات پر نظر۔ نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اور نماز کا وقت آ گیا۔ اُسی طرح نماز کو کھڑے ہو گئے۔ اور تلاوت سورہ قرآنی کے وقت کئی آیت زیادہ پڑھا گئے۔

رسول صلعم کے ایسے مقربین اور سابقین صحابہ کبار۔ اور ایسے خراب اور نفرت انگیز عادات و اطوار جن کو دیکھکر اہل اسلام پر کیا منحصر ہے۔ اقوام عالم کے تمام مہذب طبقہ میں اُن سے نفرت اور عام ناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے گا۔ اور اس بنا پر۔ ہر شخص (نعوذ باللہ) تعلیم رسولؐ میں اخلاق کی پاکیزگی اور عادات کی صفائی کی کمی تبلائے گا۔ جسکا سبب یا تو معلم کی تعلیم کا فی نفسہ نقص سمجھا جائیگا۔ یا اُن کی جہالت اور تعلیم و ہدایت کی طرف سے ان بزرگواروں کی غایت درجہ کی عدم توجہی اور غفلت کا اقرار کرنا پڑے گا۔ اور ان دونوں صورتوں میں نفس اسلام الزام سے بری نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ تمام الزام صریح اتہام ہیں۔ اور بالکل بہتان۔ اسلام کا دامن ان تمام آلائشوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ نہ اُس معلم اسلام کی تعلیم میں کہیں نقص و عیب کا نام ہے۔ جو تمام تعلیمات قدیمہ کا مصحح ہے اور متمم۔ اور مخصوص تہذیب و اخلاق کے متعلق مصدر قدرت سے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی سند خاص لیکر مخلوق دمبعوث فرمایا گیا ہے۔ اور نہ اُن صحابہ کرام مذکور الصدر کی تعلیم۔ خلوص متابعت۔ طرز عمل۔ نیکو کاری۔ اور پرہیزگاری میں کوئی کمی ہے۔ یہ سب حضرات علما و محدثین کی کرامات میں جنہوں نے طبقہ صحابہ میں مساوات بالمدارج۔ اور اصول تعمیم۔ کلھم عدول۔ قایم کرنے کی غرض خاص سے۔ ان لغویات و حشویات کا انبار لگایا ہے۔ ورنہ خیر۔ یہ اُمور کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ کہ اُس خاندان اعلیٰ اور دودمان والا کے سرمایۂ ناز اخلاف و اعقاب ایسے مخرب اخلاق اور منافی تہذیب عادات و اطوار کے خوگر اور عادی تبلائے جاویں۔ جو (خاندان) شریعت اسلام کے اجرا سے صدیوں پہلے شرب وخمر وغیرہ کی بری عادتوں کا تارک ہو چکا ہو۔

اس بنا پر ہم مذکور الصدر صحابہ اور اعزہ رسول صلعم کے تقدس و اتقا۔ زہد و ورع۔ خضوع و خشوع الی اللہ۔ اور تمام صفات حسنہ کے بدیہیات و یقینیات کے مقابلہ میں کبھی اُن کو ان عادات قبیحہ اور اعمال ذمیمہ کا مرتکب نہیں تسلیم کر سکتے۔ جن کے اسوہ حسنہ۔ چودہ سو برسوں کے بعد بھی۔ تہذیب۔ اخلاق حسن معاشرت اور تمام دینی و دنیاوی رفاہ و صلاح کی ضرورتوں میں۔ ہماری ہدایت کے لیے رہبر کامل ثابت ہوتے ہیں۔ اور جن کی تصدیق و توثیق سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔

مگر کیا کہا جاوے ان علما و محدثین کی قلمکاریوں کو جو اپنی ایک قلم صنعت رقم سے ان بزرگواروں کی دو رخی

تصویریں کھینچتے ہیں۔ ایک رُخ سے تو اُن کے زہد و اتقا کے پاک و صاف مرقع دکھلا کر اُن پر عمل اختیار کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ دوسری طرف سے اُن کے عادات ذمیمہ کا ایسا ناپاک نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ جس کو دیکھکر عام طبائع اُن سے خود بخود نفرت اور پرہیز اختیار کریں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان حضرات کے یہ اختیار کردہ جمع ضدین کے اصول کہاں تک قابل قبول ثابت ہونگے۔ متعصبین یورپ کو انھیں لغویات احادیث سے منتفع اور متمتع ہونے کا پورا موقع ملجاتا ہے۔ اور عیسائی مصنفین اپنے حواریوں کی بد احتیاطی اور قابل اعتراض رفتار و کردار کو صحابہ کبار اور مہاجر و انصار میں موجود و حاضر پاکر اہل اسلام کی اُن تعریضوں کی پوری تردید کر دیتے ہیں۔ جن میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی بد احتیاطیاں اور بد عنوانیاں ثابت کی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل اسلام اپنے اخبار و آثار سے حواریوں کے عادات و اطوار پر کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ یہ عیسائی ہیں اور اُنھیں کی مرویات۔ جن سے حواریوں کی بد عنوانیاں ظاہر ہوتی ہیں وہی موقع اور وہی نظیر صحابہ کبار کے متعلق بھی ان لغویات کی بدولت عیسائیوں کے ہاتھ آجاتی ہے اور وہ بھی اہل اسلام ہی کی ان مرویات سے صحابہ کبار کی ان بد احتیاطیوں کو دکھلاتے ہیں۔ تو اہل اسلام کے لیے جواب مشکل ہوجاتا ہے۔ اِس بنا پر صاف صاف کہنا پڑتا ہے۔ کہ کتب احادیث میں یہ منقولات خصوصاً اُن حضرات کے متعلق جو خدمت رسالت سے خصوصیات کا شرف رکھتے تھے۔ سراپا لغو ہیں اور اُن خود غلط متعصبین محدثین کی مصنوعات ہیں۔ جو اپنے عقاید کی غلط تائید اور صرف صحابہ کے نام کی تقلید میں اچھے برُے کی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ اور اصول تسنیم کے مطابق صحابہ کے طبقہ میں عام مساوات قایم کرتے ہیں۔ اور فضلنا بعضکم علی بعض کے ایسے کثیر التعداد نصوص پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ احادیث کے ان لغویات نے مقربین رسالت پر ارتکاب محارم کے غلط الزام تو لگائے ہی تھے۔ اُنھیں کے ساتھ شان نبوت اور فیضان رسالت کو بھی بدنام کر دیا۔ اگرچہ اُنکے خیال میں اُنکے اِن موضوعات نے طبقہ صحابہ میں مساوات فی المدارج کی صورت بھی قایم کر دی مگر پھر آگے چلکر وہ بھی قایم نہیں رہتی۔ کیونکہ امام احمد ابن حنبل نے مسئلہ افضلیت کو عقاید اہلسنت کا جزو اعظم اور اصول مسلم قرار دیدیا۔ اور اگر بفرض محال مسئلہ افضلیت اجماعی مانا بھی نہ جائے۔ حالانکہ اُس کے اجماعی ہونے پر علی الاکثر اتفاق ہوچکا ہے۔ تاہم مسئلہ اختلافی تو ضرور کہا جائیگا۔ تو باوجود اسکے کہ یہ مسئلہ اجماعی ہو۔ یا مختلف فیہ اس سے جو نتیجہ مترتب ہوا۔ وہ یہی ہے۔ کہ جس طرح صحابہ کے اطوار میں ذمایم ثابت ہوئے۔ ویسے ہی تعلیم رسالت میں مناقص۔ پھر نہیں معلوم کہ اطوار صحابہ میں ذمایم اور تعلیم رسولؐ

میں مناقص ثابت ہونے کے بعد بھی اُصول عقاید قایم رہ سکتے ہیں۔ یا نہیں؟

ان موضوعات کا ایک دوسرا شرمناک رُخ

ان لغویات نے تعلیم وصحبت رسولؐ پر جو بدنما الزام لگایا۔ وہ اسقدر افسوسناک نہیں ہے۔ جتنا ان موضوعات کا وہ حصہ ناپاک اور شرمناک ہے۔ جو حضرت عائشہ کی سائر ازواج پر فضیلت۔ آنحضرت صلعم کی ان کے ساتھ مفرط درجہ کی محبت ثابت کرنے کی سعی واہتمام میں بڑی کدوکاوش سے جمع کیا گیا ہے۔ احادیث کے اِس حصہ موضوعات ومصنوعات کی وہ ناقابل الذکر حالت ہے۔ جس کے پڑھنے اور سُننے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

عوام الناس سے کہیں زیادہ یہ ناگفتہ بہ واقعات وحالات کو دیکھکر متعصبین عیسائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک ومقدس سیرت اور صاف ومنزہ معاشرت پر ایسے ایسے گندہ اعتراضات وارد کرتے ہیں۔ اور اپنی شدّت تعصُّب میں اس دریدہ دہنی اور بدزبانی سے کام لیتے ہیں۔ کہ اہل اسلام پر کیا موقوف ہے۔ کسی قوم وفرقہ کا کوئی باغیرت اور حیادار آدمی اُن کے سُننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ اُن میں سے چند مثالیں نمونہ کے طور پر ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

مواہب لدنیہ عسقلانی اور روضۃ الاحباب محدّث شیرازی میں مرقوم ہے۔

از عائشہ منقول است کہ گفت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بر نعلین خود وصلہ میزد ومن چرخ می رشتم در روئے آں سرور نظر کردم دیدم کہ عرق از جبین وے ریزاں و ازاں عرق انوار تاباں است۔ در جمال وے حیراں گشتم۔ حضرت بجانب من نگاہ کرد وگفت چہ بودہ است۔ ترا کہ حیراں شدہ آئی۔ گفتم یارسول اللہ صلعم در بشرۂ نورانی وعرق پیشانی تو دیدم فریفتہ جمال تو گشتم۔ آنسرور نعلین از دست بنہاد و برخاست نزدم آمد ومیان ہردو چشم مرا ببوسید۔ روضۃ الاحباب جلد اوّل۔ مطبوعہ لکھنو ص ۵۷۹

عائشہ سے منقول ہے۔ کہ ایک دن جناب رسولخدا صلعم اپنی نعلین میں پیوند لگا رہے تھے۔ اور میں بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی تھی۔ اسی اثنا میں میری نظر آپ کے چہرۂ مبارک پر پڑی۔ جبین مُبارک پر قطرات عرق کی آب وتاب کچھ ایسی خوشنما معلوم ہوئی۔ کہ میں آپکے چہرۂ نورانی کی زیبائی پر بیساختہ فریفتہ ہوگئی۔ میری موجودہ دل باختگی کے عالم کو آنحضرتؐ نے بھی دیکھ لیا۔ مجھ سے استفسار فرمایا۔ کہ یہ کیا حالت ہے۔ میں نے عرض کی کہ آپ کے جمال نورانی نے مجھے اسوقت اپنا شیفتہ وفریفتہ بنا رکھا ہے۔ یہ سُنکر آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ نعلین ہاتھ سے رکھدی۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور میرے نزدیک آئے۔ اور میری دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ لیا۔

بحکم اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ آنحضرت صلعم بشر ضرور تھے۔ اِس بنا پر۔ اگر درمیان زن وشوہر اس قسم کے معاملات

پیش آئے۔ تو مستبعد نہیں۔ مگر ان نازک واقعات کو نقل و نشر کرکے سنگین و گرانبار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا یقین ہے۔ اور تمام دُنیا جانتی ہے۔ کہ ہر شخص کو ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ مگر نہ وہ شخص خود اُن کے نقل و بیان پر جرأت کرتا ہے۔ اور نہ اُس کے حالات و واقعات قلمبند کرنے والوں کی حیا اُس کی مقتضی ہو سکتی ہے۔ لطف تو یہ ہے۔ کہ حضرات محدثین ہی اس کے اکیلے ناقلین پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ مدعائے حدیث کو ان اقسام کے واقعات کی نقل سے بظاہر کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ارباب سیران اقسام کے واقعات کو نہیں لکھتے۔ خلاف تہذیب ہونیکے علاوہ منافی شان رسالت جانتے ہیں۔ آئمہ محدثین اسکو حضرت عائشہ کے ثبوت فضیلت اور آنحضرت صلعم کے ساتھ مفرط درجہ کی محبت رکھنے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اور اُصول عقاید کی ضرورت سے ایسے نقل و بیان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مدعا بھی حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے۔ کہ اور ازواج مطہرات کے ساتھ بھی ایسے معاملات پیش آتے ہوں۔ جس کی خبر حضرت عائشہ اور اُنکے متعلقین کو نہ ملی ہو۔ تو پھر فضیلت کیسی اور ترجیح کیونکر ثابت ہوگی؟

توسیع تالیف و تصنیف کے موجودہ زمانہ میں۔ باستثنائے کُتب حدیث و فقہ بیشمار کتابیں اسلامی تاریخ و سیر کی روزانہ مشاہدے اور مطالعے میں آتی ہیں۔ مگر کسی ایک میں بھی۔ کسی شخص خاص کے ناموس کی خلوت کے حالات و واقعات اِس طرح منظر عام میں نہ لائے جاتے ہیں۔ اور نہ یوں علانیہ طشت ازبام کیے جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ رسولؐ اور اُسکا ناموس۔ فاعتبروا۔ اہل اسلام تو اِن شرمناک واقعات کو دیکھ کر دیدۂ عبرت سے جتنے آنسو نہ بہائیں وہ کم ہے۔ مگر متعصبین و مخالفین اسلام کو آنحضرت صلعم کی معاشرت کے متعلق عورتوں کی صحبتوں میں آپ کی محویت اور اُن کے ساتھ آپ کا ایک شغف خاص وغیرہ وغیرہ (نعوذ باللہ) مختلف اقسام کے غلط الزام کا موقع مل جاتا ہے۔

(۲) ریاض النضرہ میں مرقوم ہے:-

عن عائشہ انها قالت اتیت رسول الله بخزیرة طبختها له فقلت لسودة والنبی صلعم بینی و بینها کلی فابت فوضعت یدی فی الخزیرة فلطخت بها وجهها فضحك النبی صلعم فوضع فخذه فقال لسودة	حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ کہ میں نے رسولخدا صلعم کے لیے حریرہ پکایا۔ اور اُسکو لیکر خدمت بابرکت میں حاضر ہوئی۔ اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ ایک طرف سودہ تھیں۔ اور ایک طرف میں۔ بیچ میں آنحضرت صلعم تھے میں نے سودہ کو کہا۔ اس میں سے کھاؤ۔ اُنہوں نے انکار کیا۔ پھر

الطخی وجہھا فلطخت وجہھی فضحک النبی صلعم فجاء عمر فنادی یا عبداللہ یا عبداللہ فظن رسول اللہ انہ سیدخل فقال قوما فاغسلا وجوھکما فقالت عائشہ فمازالت رھاب عمر لھیبۃ رسول اللہ صلعم ایاہ ص ۲۰۹

میں نے کہا۔ کھاؤ۔ نہیں تو تمہارے منہ میں بھی حریرہ ملدونگی سودہ نے اس پر بھی انکار ہی کیا۔ تو میں نے اپنے ہاتھ میں وہ حریرہ لے کر سودہ کے منہ پر ملدیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلعم ایسا ہنسے۔ کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہوگئے اور سودہ سے فرمایا۔ کہ تم بھی ان کے منہ پر ملدو۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی وہ حریرہ میرے چہرہ پر ملدیا۔ یہ دیکھکر رسول اللہ صلعم بیساختہ ہنسنے لگے۔ اِتنے میں حضرت عمر نے دروازہ پر آکر یا عبد اللہ یا عبد اللہ کہکر پکارا۔ آنحضرت صلعم سمجھے کہ اندر آنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگوں سے فرمایا۔ کہ اب تم دونوں اُٹھو۔ اور اپنے ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ (ایسا نہو کہ عمر تم کو ایسی حالت میں دیکھ لیں) عائشہ کہتی ہیں۔ کہ اُس دن سے میں ہمیشہ عمر سے ڈرتی رہی۔ کیونکہ آنحضرت صلعم کو اُن سے ڈرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

مطایبات کسی قوم و ملک میں مانع تہذیب نہیں۔ مگر خاص شکوہ رسالت میں اس قسم کی اوچھل کود قابل اعتراض ضرور ہے۔ جس طرح حضرت سودہ کی تمام ازواج مطہرات میں کبیرالسنی مسلمات سے ہے۔ اسی طرح اُم المؤمنین عائشہ کی صغیر السنی بھی یقنیات سے ہے اِس بنا پر باوجودیکہ دونوں خواتین میں زوجیت رسولؐ کے شرف مشترک نے کتنی ہی مساوات نہ پیدا کردی ہو۔ تاہم حضرت عائشہ کا یہ بے تکلفانہ مذاق باعتبار مساوات سن کے نہایت بدنما اور نازیبا ثابت ہوتا ہے۔ خصوصًا ازواج مطہرات کے آداب و اخلاق اور ابواب تہذیب کے سخت خلاف واقع ہوتا ہے۔

اِس کے علاوہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان مطایبات عامیانہ سے قطع نظر فرمانا۔ اور مزید براں اِن معمولی خوش فعلیوں پر مخدرات سراپردہ نبوت کو اشتعال دینا۔ اور بھی شرمناک صورت پیدا کرتا ہے گویا آنحضرت صلعم ان اقسام کے مزاج و مذاق کو تہذیب نسوان اور خصوصًا ازواج مطہرات کے حدود تہذیب و آداب کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔

آخر حصہ حدیث نے بالآخر ان لغویات کی حقیقت اور اسباب موضوعیت کا انکشاف کر دیا۔ اور ثابت کر دیا۔ کہ حضرت عمر کے کمال سطوت و ہیبت اور رسول اللہ صلعم کے ساتھ حضرت عائشہ کی انتہا درجہ کی شوخی اور بے تکلفی کے اظہار۔ ان تمام لغویات کے مدعا تھے۔ مگر ان مدعا کے اظہار کی پرجوشیوں میں اُس درجہ کی موضوعیت اور لغویت سے کام لیا گیا۔ کہ نتیجہ یہ ہوا کہ آداب رسالت اور آداب نبوت کو ایک طرف تو حضرت عائشہ کی محبت نے داب لیا۔ دوسری طرف حضرت عمر کی

سطوت وہیبت نے بیپر رسول صلعم کی مقدار کیسی اور کتنی باقی رہی۔ وانظر فتدبر۔

(۳) اسی کی دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ تفسیر درمنثور میں مسطور ہے:۔

عن عائشہ قالت استاذن ابوبکر علی النبی صلعم وانا معہ فی مرط واحد فاذن لہ فقضی حاجتہ وھو علی تلک الحال فی المرط ثم استاذن علیہ عثمان فاصلح ثیابہ وجلس فاذن لہ فقضی الیہ حاجتہ ثم خرج قالت عائشہ قلت یا رسول اللہ استاذن علیک ابوبکر فقضی لہ حاجتہ وانت علی حالک ثم استاذن علیک عمر فقضی الیک حاجتہ وانت علی تلک الحال ثم استاذن علیک عثمان فاصلحت ثیابک واحتفظت فقال یا عائشہ ان عثمان رجل حیی ولو اذنتہ علی تلک الحال خشیت ان لا یقضی حاجتہ۔

حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر نے نبی صلعم کے پاس آنیکی اجازت مانگی۔ اُسوقت آنحضرت صلعم کیساتھ میں ایک ہی چادر میں لیٹی ہوئی تھی۔ آپ نے اسی حالت میں اُنکو اجازت دیدی اور وہ آئے اپنا کام کیا اور چلے گئے پھر عثمان نے اذن طلب کیا۔ تو آپ (چادر پھینک کر) اوٹھ بیٹھے۔ اور اپنے کپڑے درست کرلیے۔ اور اُنکو آنیکی اجازت دی۔ پس وہ بھی آئے۔ اور اپنا کام پورا کرکے چلے گئے تب میں نے کہا۔ یا رسول اللہ صلعم ابوبکر آئے۔ اور اپنی حاجت پوری کرکے چلے گئے۔ مگر آپ اپنی حالت پر باقی رہے پھر عمر آئے اور اپنا کام کرکے چلے گئے۔ مگر آپ کی حالت میں فرق نہ آیا۔ لیکن جب عثمان نے اذن طلب کیا۔ تو آپ نے کپڑے درست کرلیے اور ٹھیک ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر اس کا سبب کیا تھا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ عثمان ایک مرد باحیا ہیں۔ اگر میں اُن کو اسی حالت میں بلالیتا۔ تو مجھے خوف تھا۔ کہ وہ بغیر حاجت پوری کیے واپس چلے جاتے۔"

اس روایت کے متعلق زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہے۔ ناظرین خود اندازہ کریں گے۔ کہ اس واقعہ کے بیان میں تہذیب و شائستگی کہاں تک محفوظ رکھی گئی ہے۔ صرف دو تین باتیں اس کے متعلق عرض کردی ہیں۔ اوّل یہ کہ اگر وہ حالت جس کو خود امّ المومنین نے بیان کیا ہے۔ قابل شرم تھی۔ اور قول وفعل رسولؐ کے مطابق ایک مرد باحیا و غیرت مند کے سامنے اُس حالت میں رہنا مناسب نہ تھا تو پہلے آنیوالے کی آمد پر بھی وہی کرنا مناسب تھا۔ جو حضرت عثمان کی تشریف آوری پر کیا گیا۔ بلکہ حضرت ابوبکر کی آمد پر اولیٰ اور انسب تھا۔ دوسری یہ کہ دو آدمیوں کے مقابلہ میں کسی تیسرے شخص کو یہ کہنا۔ کہ ان میں یہی باحیا اور غیرت مند ہے۔ جس امر کا مستلزم ہے۔ اُس کو میں اپنے زبان و قلم سے ادا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ دو باقی ماندہ بزرگواروں کی سخت توہین کا باعث ہوگا۔ ایسا سوء ادب اُن علمائے کرام ہی کو مبارک ہو۔ جنہوں نے یہ روایت درج کتاب کی ہے۔ یا اُنکے رواۃ ثقاۃ کو جنہیں

بیان فضیلت و وضع روایت کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ ایک بزرگ کی تو فضیلت بیان کی۔ اور بزرگواروں کے فضائل پر پانی پھیر دیا۔

ان موضوعات و مصنوعات کی حقیقت یہی ہے۔ کہ ان کے نقل و بیان میں جناب سرورکائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جس قدر تحقیر و توہین محض علمائے کرام اور ام المومنین حضرت عائشہ کے فضائل دکھانے کے لیے کی گئی ہے۔ اور جو نقشہ آپ کی معاشرت کا دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ وہ حد درجہ قابل افسوس ہے

(۴) کنز العمال جلد چہارم ص ۲۳۷ میں مرقوم ہے:۔

عن عائشہ قالت فقدت النبی صلعم ذات لیلۃ فظننت انہ قام الی جاریتہ ماریۃ فقمت التمس الجدر فوجدتہ قائما یصلی فادخلت یدی فی شعرہ لا نظر ھل اغتسل ام لا فقال اخذک الشیطان قلت ولی شیطان یا رسول اللہ فقال نعم قلت و بجمیع بنی آدم قال نعم قلت ولک قال نعم ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم۔

عائشہ کہتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسولخدا صلعم کو (اپنے فرش خواب پر) نہ پایا۔ خیال گذرا۔ کہ آپ اپنی کنیز ماریہ قبطیہ کے پاس اٹھ کر چلے گئے۔ پس میں (اندھیرے میں) ٹٹولتی چلی کھڑی ہوئی۔ تو آپ کو نماز میں مشغول پایا۔ تو میں نے اپنا ہاتھ انکے بالوں پر رکھا۔ تاکہ دیکھو کہ غسل فرمایا ہے۔ یا نہیں۔ پس آپ نے (میری یہ حرکت دیکھکر) فرمایا۔ کہ تمکو اس وقت تمہارے شیطان نے گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا۔ کہ کیا میرے ساتھ کوئی شیطان بھی ہے۔ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا۔ اور بنی آدم کے ساتھ؟ فرمایا۔ ہاں میں نے کہا اور آپ کے ساتھ؟ فرمایا ہاں۔ مگر خدا نے اُسکے مقابلہ میں میری مدد کی۔ جس سے اُس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اسی مضمون کو اُسی کتاب میں اس عبارت کے ساتھ بار دیگر نقل کیا ہے۔

عن عائشہ قال طلبت رسول اللہ صلعم لیلۃ فلم اجدہ فظننت انہ اتی بعض جواریہ او نسائہ فراتیہ رھو ساجد وھو یقول اللھم اغفرلی ما اعلنت وما اسررت۔

عائشہ کہتی ہیں۔ کہ میں نے ایک رات رسولخدا صلعم کو تلاش کیا۔ لیکن کہیں نہ پایا۔ خیال کیا کہ آپ کسی کنیز یا بیوی کے پاس گئے ہونگے۔ مگر یہ غلط ہوا۔ آپ سجدہ میں سر رکھے فرمارہے تھے اے پروردگار بخشدے جو کچھ مجھسے بطور ظاہر یا مخفی یا سرزد ہوا ہے۔

افسوس ہے کہ ازواج مطہرات اور غلبہ نفس کے یہ حالات و واقعات۔ گویا ان مخدرات پر تعلیم رسول صلعم کا کوئی اثر اور صحبت نبوی کا کوئی فیض ہی نہ پہونچا تھا۔ پھر یہ مناقض شان رسالت اور مخالف آداب نبوت طومار کیوں تیار کئے گئے؟ صرف اس لیے کہ حضرت عائشہ کی فضیلت ثابت ہو مگر فضیلت

کی جگہ تو اُن کی ناقص طبیعت ثابت ہوتا ہے۔

(۵) اسی کا دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اصابہ جلد ۴ ص ۲۳۲ مطبوعہ مصر میں مرقوم ہے:۔

والجوینیه مراة من الکندة احضرها ابو اسید الساعدی فتولت عائشه وحفصه امرها فقالت احدهما ان یعجبه اذا دخلت علیه امراة ان تقول اعوذ بالله منك واخرج ابن سعد عن هشام بن محمد وهو ابن کلبی عن ابن غسیل الذی اخرجه البخاری و زادفیه فقالت حفصه لعائشه اوعائشه الحفصه خفیها وانا امشطها ففعلتا ثم قالت لهما احدهما انه یعجبه من المراة اذا دخلت علیه ان تقول اعوذ بالله منك فلما دخلت علیه واغلق الباب وارخی الستر ومدیده الیها فقالت اعوذ بالله منك فقام بکمه علی وجهه وقال عذت بمعاذ ثلاث مرات ثم خرج فقال یا ابا اسید الحقها باهلها ومتعها برازقتین یعنی کرباسین فکانت تقول دعونی الشقیه۔

جونیہ۔ قبیلہ کندہ کی ایک عورت تھی۔ جسکو ابواسید ساعدی نے خدمت رسول صلعم میں حاضر کیا تھا۔ عائشہ اور حفصہ نے اُسکا امر یعنی آرائش اپنے ذمہ لی۔ اور اثنائے مشاطگی میں اُنہیں سے ایک نے اُس سے یہ کہدیا کہ جب کوئی عورت آنحضرت صلعم کے پاس لائی جاتی ہے تو آپ یہ بات بہت پسند کرتے ہیں۔ کہ وہ اعوذ باللہ منک کہے (میں آپ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں) اور ابن سعد نے ہشام بن محمد کلبی سے اور اُس نے ابن غسیل سے وہ روایت کی ہے۔ جو بخاری نے بھی لکھی ہے۔ اور اس روایت بخاری میں اتنی زیادتی ہے۔ کہ حفصہ نے عائشہ سے یا عائشہ نے حفصہ سے کہا۔ کہ تم مہندی لگاؤ میں بالوں میں کنگھی کرتی ہوں۔ وہ مشاطگی میں مصروف ہوئیں پھر دونوں میں سے کسی ایک نے کہا۔ کہ آنحضرت صلعم کے پاس جب کوئی عورت داخل کی جاتی ہے۔ تو آپکو اُسکا یہ کہنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعوذ باللہ منک (میں آپسے خدا کی پناہ مانگتی ہوں) اس کے بعد وہ حجلۂ عروسی میں لائی گئی۔ دروازے بند کردیئے گئے۔ پردے گرادیئے گئے۔ آنحضرت صلعم نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ تو وہ کہنے لگی اعوذ باللہ منک (میں آپ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں) یہ سُنتے ہی آپ آستین روئے مبارک پر رکھ کر اوٹھ کھڑے ہوئے۔ اور فرمایا کہ تو نے اُس کی طرف پناہ مانگی ہے۔ جس کی طرف پناہ مانگی جاتی ہے۔ یہی کلمہ تین بار ارشاد فرمایا اور باہر چلے آئے۔ ابواسید سے فرمایا کہ اس عورت کو اس کے گھر والوں کے پاس پہونچادو۔ اور کرباس کے دو کپڑے اسکو دیدو۔ پس وہ عورت سب سے کہا کرتی تھی۔ کہ تم لوگ مجھے بد نصیب کہکر پکارا کرو۔

اس روایت میں کس کس کی تعریف کی جائے۔ ازواج مطہرات کے آداب و اخلاق کے شان کی یا اُن علماء و محدثین کے طرز بیان کی۔ جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خلوت کے رازکو

یوں طشت از بام اور زبان زد خاص و عام کر دیتے ہیں۔ نہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ نہ رسول سے شرم کرتے ہیں۔ رسول کی یوں توہین کی۔ اور اُسکے ناموس کی یوں پردہ دری۔ زیادہ افسوس تو اسکا ہے۔ کہ اس کی نقل سے اصل مدعا بھی تو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ کی فضیلت ظاہر ہونیکی جگہ اُن کی پوری حیلہ سازی اور صریح فتنہ پردازی ثابت ہو گئی۔

(۶) تفسیر درمنثور میں۔ سورۂ تحریم کی تفسیر کے متعلق مرقوم ہے:۔

اخرج ابن جریر والمنذر عن ابن عباس قال قلت لعمر ابن خطاب عن المرئتان اللتان تظاہرنا قال عائشہ وحفصہ وکان بدء الحدیث فی شان ام ابراہیم اصابہا النبی صلعم فی بیت حفصۃ فی یومہا فوجدت حفصہ فقالت یا نبی اللہ لقد جئت الی شیئا ما جئتہ الی احد من ازواجک فی یومی وفی داری وعلی فراشی فقال الا رضین ان احرمہا فلا اقربہا قالت بلی فحرمہا وقال لا تذکری ذلک لاحد فذکرتہ للعائشہ فاظہرہ اللہ علیہ فانزل اللہ یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک الایات کلہا۔

ابن جریر ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایکدن عمر ابن خطاب سے پوچھا کہ وہ کون دو عورتیں ہیں۔ کہ جنہوں نے رسول صلعم کے برخلاف ایک دوسرے کی مدد کی۔ تو کہا کہ وہ عائشہ ہیں۔ اور حفصہ۔ اور یہ واقعہ مادر ابراہیم کی نسبت گذرا تھا۔ اور وہ یوں تھا۔ کہ ایکدن رسول خدا صلعم نے ماریہ سے حفصہ کے گھر میں مقاربت کی۔ جس سے حفصہ غضبناک ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ آپنے مجھپر تو ایسا ظلم کیا ہے جو اپنی بی بیوں میں سے کسی ایک پر بھی نہ کیا غضب ہے کہ میری ہی باری کے دن۔ میرے ہی گھر میں۔ اور میرے ہی بستر پر۔ آپنے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہ ہو گی۔ کہ میں ماریہ سے کنارہ کشی کر لوں۔ اور اب کبھی اس کے قریب نہ جاؤں۔ حفصہ نے کہا ہاں۔ آپ نے ماریہ سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا قصد کر لیا۔ اور حفصہؓ سے کہا کہ دیکھنا اس بات کو کسی سے بھی نہ کہنا۔ مگر اُنہوں نے عائشہ سے کہہ دیا۔ تو خدا نے اپنے رسول صلعم کو اس پر مطلع کیا۔ اور آیۂ یا ایہا النبی الخ کو نازل فرمایا۔

واقعی کس قدر افسوس ناک ہے کہ یہ اُس کی ازواج مطہرات کے اطوار و عادات ہیں۔ جو حقیقی غیرت و حیا کی مجسم شان ہے۔ اور الحیاء شعبۃ الایمان جس عیر ممتد کا خاص فرمان ہے۔ حالانکہ بفرض محال۔ اگر ان خواتین کے ایسے اطوار و کردار صحیح بھی ہوں۔ تاہم وہ رسالت کے خاص وقار میں کوئی کمی نہیں پیدا کر سکتے۔ مگر ظاہری طور پر ان واقعات کو پڑھ کر ہر شخص اتنا کہنے کا ضرور مجاز ہو گا۔ کہ ان خواتین نے ایک عرصہ تک شرفیاب خدمت رہ کر آداب و اخلاق رسالت سے کوئی استفادہ

حاصل نہیں کیا۔ اور ایسے اُن مخصوص وقار و اقتدار کی کوئی قدر و منزلت نہیں کی جنکی بنا پر اُن کو عام طبقہ نسوانی میں اُمہات مومنین اور ناموس جناب سید المرسلین صلعم ہونے کا شرف عنایت فرمایا گیا تھا۔ ان خواتین کے ذیل میں سب سے زیادہ قابل اعتراض حضرت عائشہ کے واقعات ہیں حالانکہ تمام علماء و محدثین جو ان کی اعلیٰ درجہ کی قابلیت۔ جامعیت۔ قوتِ اجتہاد۔ محامد تہذیب و آداب۔ مکارم اخلاق۔ اور محاسن معاشرت وغیرہ وغیرہ غرض ان کے تمام کمالات کو ایک ایک کرکے لکھتے ہیں۔ وہی حضرات ان کی نسبت ان تمام مکروہات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اور اقرار بھی وہ اپنی غایت غلط فہمی سے ان لغویات کے نقل و بیان سے حضرت عائشہ کی فضیلت اور آنحضرت صلعم کے ساتھ اُن کی مفرط درجہ کی محبت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کی اُمید کے خلاف نتیجہ بالکل برعکس معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ کی تعظیم و تکریم کی جگہ ان واقعات سے تحقیر و توہین ثابت ہوتی ہے۔

سب تو سب۔ شبلی صاحب۔ باوجود اپنی تحقیقات جدیدہ کے بھی اس مسئلہ میں اُسی قدیم غلط فہمی پر قائم ہیں۔ چنانچہ سیرۃ النبیؐ جلد دوم ص ۳۴۵ میں مرقوم ہے۔

حضرت خدیجہ کے بعد حضرت عائشہ۔ ازواج مطہرات میں سب سے محبوب ترین تھیں۔ لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے۔ جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسن و صوت میں حضرت صفیہ ان سے بڑھکر تھیں۔ اور دوشیزہ بھی تھیں۔ اور دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہیں تھیں۔ لیکن حضرت عائشہ کی قابلیت۔ ذہانت۔ قوتِ اجتہاد۔ دقتِ نظر۔ وسعتِ معلومات ایسے اوصاف تھے۔ جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے۔

پھر ص ۳۴۶ میں بھی مضمون یوں لکھا گیا ہے۔

حضرت عائشہ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں۔ اس لیے قربِ صحبت سے اسقدر فائدہ اُٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں۔ اور انصاف بالائے اطاعت امت سے اکثر مسائل میں اُن کی فہم و دقتِ نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔

خاص حضرت عائشہ کے متعلق چند واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اور چند اُمور ابھی اور نمونے کے طور پر آئندہ دکھلائے جائیں گے۔ اُن کی حقیقت حال ان تمام دعووں کے خلاف ثابت ہوتی ہے۔ جو شبلیہ کے حالات خاص امام بخاری کی مرویات ہیں۔ جن کی صحت و صداقت میں کسی کو عذر و کلام کی مجال نہیں۔ اس بدقسمت عورت کے حالات میں حضرت عائشہ کے طرز عمل قوتِ اجتہاد اور انصاف بالائے اطاعت دونوں اُصول کے مخالف و منافی ثابت ہوتے ہیں۔

پھر اسی طرح جناب رسول خدا صلعم کو فرش خواب پر نہ پاکر اپنے دل میں آپ کی طرف سے خلاف عدالت و مروت گمان بد پیدا کرنا۔ صاف صاف بتلا رہا ہے۔ کہ اُم المومنین کی نسبت ان تمام اوصاف و محامد کا ادعا صرف جوش عقیدت کے قیاسات ہیں۔ اور ان قیاسات خارجی کو جذبات داخلی سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے۔ کہ حضرت اُم المومنین دوسروں کے معاملات میں اپنی قوتِ اجتہاد۔ انصاف بالائے اطاعت۔ قابلیت اور جامعیت سب کچھ کام میں لاتی ہوں۔ مگر اپنی خاص احتیاج و ضرورت کے وقت آپ کا طرز عمل اظہار ذاتیات کے اعتبار سے۔ ایک محض معمولی اور پست خیال عورت سے زیادہ نہیں ثابت ہوتا۔ چنانچہ سیرۃ النبی ؐ کے مفصلہ ذیل اقتباسات ان بیانات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) حضرت صفیہ نہایت عمدہ کھانا پکاتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلعم کے پاس بھیجا۔ آپ اسوقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا۔ آنحضرت صلعم نے پیالہ کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کیے۔ اُن کو جوڑا۔ پھر دوسرا پیالہ منگا کر واپس کیا۔

اس واقعہ میں۔ افسوس نہ اُم المومنین نے قوت اجتہاد سے کام لیا۔ نہ اُصول عدالت بالائے اطاعت پر عمل پیرا ہوئیں۔ بلکہ عام نسوانی رشک و حسد یا خود رہا کے طریقے سے کار فرما ہوئیں۔ اگر قوت اجتہاد پر قادر ہوتیں۔ تو سمجھ لیتیں کہ ایک خاتون نے جو اُن کی ہمسر اور ہم چشم ہے۔ اُس بزرگ کی دعوت کی ہے۔ اور اُس کی خدمت میں تحفہ بھیجا ہے۔ جس کی خدمت آپ پر اور اُس بھیجنے والی خاتون پر بقدر مشترک اور بدرجہ مساوی واجب ہے۔ پھر فیصلہ مجتہدانہ کے خلاف اُس کے تحفہ بھیجنے پر آپکی آزردگی خاطر کیسی۔ یہ ناراضی اور اتنی ناراضی اور جھنجلاہٹ کر پیالہ کا پٹک دینا اور جنس غذا کو ضائع کر دینا تو اُم المومنین کی ذاتیات اور دون طبعی کا ثبوت ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں کہ رسولخدا صلعم پاس بیٹھے ہیں۔ اُنھیں کے لیے خاص تحفہ آیا ہے۔ آپ ہی کی برابر والی اُن کی ایک بی بی نے بھیجا ہے اگر آپ کو کچھ ملال خاطر بھی ہوا تھا۔ تو آپ کو آنحضرت صلعم کی رعایت سے تحمل کرنا ضروری تھا۔ اور انصاف بالائے اطاعت سے کام لینا تھا۔ اگر اُس پیالہ کو خود لینا یا چھونا گوارا نہ تھا۔ تو خود آنحضرت صلعم کو لے لینے دیا ہوتا۔ اور آپ خاموش رہ جاتیں۔ نہ توڑا ہوتا نہ پٹکا ہوتا۔ تو آنحضرت صلعم کو اُس پیالہ کے ریزہ ریزہ چننے کی نہ تکلیف ہوتی۔ اور نہ اُس کے معاوضہ دینے کی زیر باری اُم المومنین کے صرف ایک ذاتی خیال نے آپ کے تمام قیاسی محاسن کا خاتمہ کر دیا۔ جب ذرا ذرا سے اُمور خانگی میں آپ اپنی برہمی مزاج کو ضبط نہیں کر سکتی تھیں۔ تو عدالت بالائے اطاعت کے اُصول یا قوت اجتہاد

کے انصاف پر آپ کا قایم رہنا مشکل سے تسلیم کیا جائے گا۔

(۲) ایک دفعہ آنحضرت صلعم سے حضرت عائشہ بآواز بلند باتیں کر رہی تھیں۔ (لڑنے کی سختی لفظوں میں دیکھی گئی ہے) اتفاقاً حضرت ابو بکر آ گئے۔ حضرت عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا۔ کہ تو رسول اللہ صلعم سے چلا کر بولتی ہے۔ آنحضرت صلعم بیچ میں آ گئے۔ اور حضرت عائشہ کے آڑے آ گئے۔ حضرت ابو بکر غصہ میں بھرے باہر چلے گئے۔ آنحضرت صلعم نے حضرت عائشہ سے کہا کیوں۔ میں نے تم کو کس طرح بچا لیا۔ چند روز کے بعد آنحضرت صلعم کی خدمت میں حضرت ابو بکر آئے۔ تو وہ حالت بدلی ہوئی تھی۔ بولے مجھکو صلح میں بھی شریک کر لیجئے۔ جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں۔" ص ۸۴۳ بحوالہ ابو داؤد باب ماجاء فی المزاج

شبلی صاحب نے ابو داؤد کی اصل عبارت نہیں لکھی۔ ترجمہ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصل واقعہ حجت و تکرار کا پہلے استخفاف کیا گیا ہے۔ مگر آخر میں حقیقت نہ چھپ سکی۔ لکھنا پڑا کہ یہ واقعہ آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت عائشہ کی خانہ جنگی کے متعلق ہے۔ جس کو شبلی صاحب نے ابتدا میں یوں لکھا تھا۔ کہ آنحضرت صلعم سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں۔ آپ سے بڑھکر ابو داؤد صاحب محدث ہیں۔ جو اس خانہ جنگی کو مزاح تی مابین تبلاتے ہیں۔

بہرحال صورت واقعہ دونوں صاحبوں کے مختار کے خلاف ہے۔ اس روایت کے متعلق اُمور ذیل قابل نظر ہیں۔

(الف) جناب رسالت مآب صلعم کے ایسے واجب الاتباع شوہر سے لڑنا۔ اور کاشانہ نبوت میں اتنا چلا چلا کر تقریر کرنا۔ کہ باہر سننے والے سُنیں۔ اور سُن کر دوڑے چلے آئیں۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر نے کیا۔ عام اور معمولی شرفا کے گھروں میں مستورات کے لیے جایز نہیں۔ چہ جائیکہ ازواج مطہرات۔ اور دارالرسالت کے مخدرات کے یہ اطوار ثابت ہوتے ہیں۔ پھر حضرت عائشہ کی یہ کیفیت اور انکا یہ عالم ایسا ہی ناقابل عفو اور غیر متحمل تھا۔ کہ حضرت ابو بکر نے تھپیڑ مار کر اُن کو تنبیہ کا قصد و ارادہ کر لیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابو بکر کی رائے میں تمام قصور اور زیادتی حضرت عائشہ کی طرف سے تھی۔ رسول معصوم تھے۔ اور محض بے گناہ۔ فطرت عامہ اور خاصہ کا امتیاز بھی یہیں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اخلاق نبی صلعم نے ہرگز گوارا نہ فرمایا۔ کہ حضرت عائشہ عامیانہ طور پر اپنی شوخی اور گستاخی کی سزا پائیں۔ آپ اُنکے بیچ میں آ گئے۔ اور ماکان اللہ لیعذبھم وانت فیھم (ہم اُنپر عذاب نہیں کرینگے جن کے بیچ میں تو ہوگا) کی پوری شان دکھلا کر اُن کو حضرت ابو بکر کی سزا دہی سے بال بال بچا لیا۔

(ب) لطیف تر تو آخر حصہ حدیث ہے۔ حضرت ابو بکر کا بعد مرور واقعہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں

اس کی یاد دہانی کرنا اور آپ سے اِن الفاظ میں درخواست کرنا کہ مجھکو بھی صلعم میں شریک کر لیجئے جس طرح کہ اُس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ ایسا کلمہ ہے۔ جو آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت ابو بکر کے علاقہ نسبی رکھنے کے اعتبار سے کوئی غیر مستند اور مہذب شخص اپنے مُنہ سے نکالنا کیسا کانوں سے سُننا گوارا نہیں کر سکتا۔

(۳) صفحہ ۲۲۷ جلد دوم میں تحریر ہے۔

حضرت حفصہ آخر حضرت عمر کی بیٹی تھیں۔ اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی۔ صحیح بخاری میں واقعہ ایلا کے متعلق خود حضرت عمر کا بیان ہے۔ کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا۔ اتفاق سے میری بی بی نے مجھے مشورہ دیا۔ میں نے کہا۔ تمھیں ان باتوں میں کیا دخل بگڑ بولیں۔ کہ تم میری مداخلت پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ صلعم کو برابر کا جواب دیتی ہے۔ میں اُٹھا۔ اور حفصہ کے پاس آیا۔ میں نے کہا۔ بیٹی تم رسول اللہ صلعم کو جواب دیتی ہو۔ یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں۔ بولیں ہاں ہم تو ایسا کرتے ہیں۔ میں نے کہا خبردار۔ میں تمھیں عذاب الہٰی سے ڈراتا ہوں۔ تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ صلعم کو فریفتہ کر لیا ہے (یعنی عائشہ) بحوالہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۴۲۔

خدمت رسول صلعم میں حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ کی بے باکانہ درشتی مزاجی اسقدر عام ہو گئی تھی۔ کہ ہر کس و ناکس کو اس کی پوری اطلاع تھی۔ جیسا کہ حفصہ کی نسبت خود اُن کی ماں نے اقرار کیا اور عائشہ کے متعلق خود حضرت عمر نے اظہار فرمایا۔ اور خاص کر صاحبزادی کو تنبیہ فرمائی۔ کہ تم بھی عائشہ کی طرح نہ ہو جانا۔ جن کے حسن نے (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلعم کو فریفتہ کر لیا ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم کے مزاج پر وہ اسقدر حاوی ہو گئی ہیں۔ کہ رسول اللہ صلعم اُن کے حسن پر اپنی غایت فریفتگی سے اُنکی کسی جا و بیجا خواہشوں کو ذرا بھی رُوک نہیں سکتے۔

حقیقتاً یہ سب اُنھیں لغویات کے انبار اور اُنھیں وضعی احادیث کے طومار ہیں۔ جو فضائل صحابہ اور خلفاء کے اظہار و اشتہار عام کی غرض سے مرتب اور تیار کئے گئے ہیں۔ ورنہ اِن لغویات کی کوئی اصل ہے۔ اور نہ ان حشویات کی کوئی حقیقت۔ خدا کی شان۔ وہ سراپا پیکر تقدس۔ جو تمام ملکوتی اور رُوحانی عادات و خصائل۔ اخلاق و شمائل سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اخلاق الہٰیہ کا نمونہ بنایا گیا ہو وہ جمال قدرت کے علاوہ کسی فانی ہستی کی زیب و آرائش اور حسن و زیبائش پر فریفتہ و شیفتہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر اتنا اور ایسا کہ رسالت کا وقار اور نبوت کا اقتدار بھی نہ قائم رکھ سکے۔

یہ وہی لغویات ہیں۔ جو عیسائی متعصبین اور یوروپین معترضین کے تمام کافرانہ اور مغویانہ

تعریفات کے اصلی ماخذ ہیں۔ وہ نقل کے ذمہ دار ہیں۔ ان کو ان کی موضوعیت کی حقیقت کی کیا خبر، اُنکو کیا علم ہے۔ کہ یہ لغویات کس وقت میں کس ضرورت سے مرتب کیے گئے۔ یہ ظاہر ہے جیساکہ ابھی ابھی ریاض النظرہ کے حوالہ سے اوپر لکھا گیا ہے۔ کہ حضرت عائشہ نے حضرت عمر کی فضیلت میں ایک ایسی خاص حدیث بیان فرمائی ہے۔ جس سے آنحضرت صلعم بھی اُن کی سطوت وہیبت کے زیر اثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت عمر کے اخلاق کے لئے بھی ادائے احسان کی ضرورت سے ضروری تھا۔ کہ وہ بھی حضرت عائشہ کی فضیلت میں ایسی بیان فرمائیں۔ جس سے آنحضرت صلعم کا (نعوذ باللہ) حضرت عائشہ کے حسن وجمال کے زیر جذبات ہونا ثابت ہوتا ہے حضرت عمر کا شمار مردوں میں تھا۔ اس لیے ہیبت وسطوت میں اُن کا کمال دکھلایا گیا۔ حضرت عائشہ طبقہ نسواں میں شامل تھیں۔ اور عورتوں کے لیے سوائے حسن وجمال کی تسخیر وتاثیر کے کوئی دوسرا ذریعہ بہتر اور زود اثر نہیں تبلایا جا سکتا۔ لیکن شبلی صاحب حضرت عمر کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ اور اُم المومنین کے حسن وجمال کو بے مثال نہیں سمجھتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ وہ (حضرت عائشہ) حسن وجمال میں حضرت صفیہ سے زیادہ نہیں تھیں۔ شبلی صاحب کے برخلاف حضرت عمر کے آگے اُم المومنین کے حسن وصورت کی بے مثالی ثابت تھی۔ اس لئے آپنے اُس کو رسول صلعم کی شیفتگی اور فریفتگی کا باعث قرار دیا۔ مگر افسوس خود حضرت عمر بھی حقیقت کو نہ چھپا سکے۔ اگر حقیقتاً حضرت عمر حضرت عائشہ کے جذبات حسن وجمال کو صحیح اور مستحسن سمجھتے تو پھر صاحبزادی کو اس طرز عمل اختیار کرنے سے کیوں روکتے؟؟

وقت پر خوب یاد آگیا۔ شبلی صاحب نے حضرت عائشہ کے ساتھ آنحضرت صلعم کی مفرط محبت رکھنے کی توجیہہ میں لکھا۔ کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہ ازواج مطہرات میں سب سے محبوب ترین تھیں۔ لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے۔ جو عام انسانوں سے پائے جاتے ہیں۔ مگر حضرت عمر کی رائے اور ارشاد سے تو سوائے حسن کے اور کوئی دوسری وجہ محبوبیت کی پائی نہیں جاتی۔ شبلی صاحب جانیں اور حضرت عمرؓ۔

(لم) صفحہ ۸ لم ۳ جلد دوم میں تحریر ہے:۔

ایک دفعہ حضرت عائشہ سے آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ کہ مجھے جب ناراض ہوتی ہے۔ تو میں سمجھ جاتا ہوں۔ بولیں کیونکر۔ ارشاد ہوا۔ کہ جب تو مجھ سے خوش رہا کرتی ہے۔ تو یوں قسم کہاتی ہے۔ محمدؐ کے خدا کی قسم۔ اور جب ناراض ہوتی ہو ابراہیم کے خدا کی قسم۔ حضرت عائشہ نے کہا ہاں۔ یارسول اللہ صلعم میں صرف آپکا نام چھوڑ دیتی ہوں۔ بحوالہ صحیح مسلم۔

ممکن ہے کہ یہ مکالمہ صحیح ہو۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ کی تلخ مزاجی بسا اوقات میاں بیوی میں شکر رنجی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ مگر تاہم۔ الحمد للہ۔ اس سے آنحضرت صلعم کی ذات اقدس و اطہر پر۔ عدم اخلاق و آداب معاشرت کا کوئی الزام نہیں آتا۔ اس سے حضرت عائشہؓ ہی کی سوء ادبی اور تلخ مزاجی کا پورا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ موصوفہ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر اپنے مفترض الطاعۃ اور واجب الاطاعۃ شوہر سے ایسا بیزار ہو جاتی تھیں۔ کہ قسم کھانے میں بھی اُسکا نام لینا گوارا نہ فرماتی تھیں۔ لطف تو یہ ہے۔ کہ اُس عالم خاص گذر جانے کے بعد بھی عند الاستفسار نہایت بیباکی سے اپنی اس منافرت کا خود اقرار فرماتی ہیں۔

(۵) سیرۃ النبیؐ کے اُسی صفحہ میں مرقوم ہے۔

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں۔ اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں۔ حبشی بھی ایسے ہی کھیلتے ہیں۔ ایکدفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھلا رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ دوش مبارک پر رُخسارے رکھکر تماشا دیکھنے لگیں۔ اور دیر تک دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں۔ بولیں نہیں۔ آپ چپ ہو رہے۔ یہانتک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔ بحوالہ ابو داؤد۔

شبلی صاحب نے ان روایتوں کی نقل میں صرف ترجمہ سے کیوں کام لیا۔ صرف اس لئے۔ کہ واقعات کی شدت لغویت کو چھپا ئیں۔ یا کم کر دیں۔ چنانچہ اس واقعہ کے متعلق حدیث کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔ فنظرا الی لعب الحبشۃ بحرابھم فی المسجد رواہ الترمذی وغیرہ شبلی صاحب نے تماشا گاہ کو جو الفاظ حدیث سے مسجد رسولؐ ثابت ہوتی ہے۔ توہین مسجد ہونے کے باعث خاص کر ترجمہ سے نکالدیا۔ اور لعب (کھیل تماشہ) کی لغویانہ صورت کو اپنے ملک کے اکھاڑے اور پھکیتی کے دنگل وغیرہ کی مثال بتلا کر ایک معتدلانہ اور مجوزانہ حیثیت میں تبدیل کر دیا۔

اسی سے اس واقعہ کی لغویت اور موضوعیت کی ترکیبوں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ خود ناقل حدیث شبلی صاحب اس فعل کا مسجد رسولؐ کی ایسی جائے مقدس میں واقع ہونا قابل ذکر نہیں سمجھتے۔ اس لیے ذکر مسجد کو ترک کر کے صرف حضرت عائشہؓ کی غایت محبت کے مدعائے ثبوت کو نقل فرما دیتے ہیں۔ مگر افسوس خانہ خدا کی توہین کا تو خیال کیا گیا۔ مگر خانہ رسول صلعم کی تضحیک اور بے حرمتی کا کوئی لحاظ نہ فرمایا گیا۔ اور ناموس رسولؐ کو عورتوں کا بھی نہیں۔ مردوں کا بر سر عام تماشا دکھلایا گیا۔ وہ مرد بھی کون؟ غیر قوم غیر جنس اور غیر ملک کے رہنے والے۔ وہ آڑ ہی سے سہی۔ اور وہ آڑ بھی شوہر ہی کی آڑ سہی اعتراض تو اصل عمل سے ہے۔ صورت عمل سے نہیں۔ جب اصل عمل ہی عام شرفا کی حیا وغیرت اور اخلاق و آداب

معاشرت کے خلاف ہے۔ تو نعوذ باللہ اس کے ارتکاب کی نسبت اُس ذات قدسی صفات کی طرف کیسے دی جاسکتی ہے۔ جو بحکم اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ اخلاق الٰہیہ کا خاص نمونہ بناکر دُنیا کی تعلیم و ہدایت کے لیے نازل فرمایا گیا تھا۔

ایسے مانع تہذیب و آداب افعال کو (نعوذ باللہ) عمل رسولؐ سے نسبت دی جاتی ہے۔ اور مسجد رسولؐ تماشا گاہ بنائی جاتی ہے۔ مگر نہیں معلوم آگے چلکر اس عمل رسولؐ پر عمل اُمت کیوں نہ قائم ہوا۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد اُس وقت سے لیکر اسوقت تک پھر مسجد میں ایسے تماشے دکھائے جانے کا کہیں ذکر و مذکور نہیں ہے۔ اسی سے سمجھ لیا جائیگا۔ کہ اس بے سروپا اور محض کذب و افترا کی حقیقت کیا ہے حضرت عائشہ کی فضیلت کے ایک اظہار مدعا نے کتنے محرمات کے اِدعا کا خون کردیا۔ اور ان موصوفہ محترمہ کی فضیلت ثابت ہونے کی جگہ معاشرت رسولؐ پر منافی اخلاق و آداب الزام لگانے کا مخالفین اسلام کو موقع مل گیا۔

شبلی صاحب کی ادب شناسی تاہم غنیمت تھی۔ کہ اُنہوں نے نقل و حدیث میں اگر رسولؐ کی نہیں۔ تو مسجد رسول صلعم کی حرمت کا خیال کرکے ذکر مسجد سے چشم پوشی اختیار فرمائی۔ مگر صد آفرین ہے ابو داؤد صاحب۔ اور ترمذی صاحب کی جرأت و دلیری پر کہ ان صاحبوں نے بلالحاظ و پاس مسجد رسولؐ کو ان لہویات کی تماشا گاہ بنایا۔ لطف پر لطف تو یہ ہے۔ کہ ان کے لہو و لعب ہونے کا اقرار اور اُنکی عملی ترکیبوں کا اظہار بھی درج کتاب فرمادیا۔ ان لغویات سے اتنے مفاسد پیدا ہوتے ہیں جو ہرگز قابل ذکر نہیں۔ ام المومنین کی چاہے کتنی فضیلت ثابت کی جائے۔ مگر اُن کا معصوم ہونا کسی طرح ثابت نہیں اس بنا پر اگر اُنہوں نے دز دیدہ نگاہی سے ان مردانہ کھیل تماشوں کو دیکھ بھی لیا۔ تو اتنا قابل اعتراض نہیں۔ مگر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان عصمت عدالت و مروت کے ہرگز شایان نہیں ہے۔ کہ بالنفس النفیس خصوصاً مسجد میں ان لہویات کو خود بھی مشاہدہ فرمائیں اور پردگیان عصمت کو بھی اس کی سیر کرائیں۔ نعوذ باللہ من ہذہ الہفوات۔

(۶) صفحہ ۳۴۹ میں مرقوم ہے۔

"ایک دفعہ حضرت عائشہ سے آپ نے کہا۔ کہ آؤ۔ تیز قدمی میں مقابلہ کریں۔ حضرت عائشہ اُسوقت دُبلی پتلی تھیں۔ آگے نکل گئیں۔ جب سن زیادہ ہوا۔ اور بدن فربہ اندام ہوگئیں۔ تو پھر مسابقت کی نوبت آئی۔ اب کی بار وہ پیچھے رہ گئیں۔ آپ نے فرمایا یہ اُس دن کا جواب ہے۔ بحوالہ ابو داؤد۔"

سکون کیجیے۔ اس سے حضرت عائشہ کی کیا فضیلت ثابت ہوئی۔ اگر پہلی بار جیت بھی گئی تھیں۔ تو پچھلی بار

ہار گئیں۔ افسوس ایک حضرت عائشہ کے اظہار فضیلت نے کاشانہ نبوت میں ہل چل ڈالدی۔ اور شکوہ رسالت کی خاک اُڑادی۔ حضرت عائشہ کو ازواج مطہرات کے طبقہ میں ان خوش فعلیوں کے مقابلہ اور ان زندہ دلیوں کے موازنے کے لیئے۔ کوئی خاتون محترمہ ایسی نہیں ملتی تھیں۔ جنکے ساتھ وہ تیز رفتاری کا امتحان دیتیں۔ اور نہ نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو اپنے مہاجر و انصار میں کوئی شخص ایسا نظر آتا تھا۔ جس سے تیز رفتاری میں مقابلہ کیا جاتا۔ کس قدر شرمناک ہے۔ کہ ایک مرد اپنے صنف ضعیف اور جنس نازک کے ساتھ تیز رفتاری کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور ایک بار ناکام رہا مگر دوسری بار کامیاب ہو کر اُس سے اپنی تیز رفتاری پر فخر و مباہات کرتا ہے۔ کس قدر عبرتناک ہے۔ کہ عصمت سرائے نبوت کی خلوت و جلوت کی صحبتیں۔ اور اُن کے عزیز اوقات ان اقسام کے لہویات۔ دوڑ دھوپ اور اچھل کود میں ضائع کیے جائیں۔ استغفر اللہ ربی۔ یہی لغویات عیسائیوں کی تعریضات کے اصلی ماخذ ہیں۔ اور یہی حشویات اُن کے تمام مغویانہ مفاسد کے حقیقی باعث۔ حالانکہ نہ اُن کی کوئی اصل ہے۔ نہ حقیقت۔ صرف کذب و افترا کا طومار ہے۔ اور موضوعات و مصنوعات کا انبار۔

دفتر احادیث میں فضیلت حضرت عائشہ کی داستان اتنی طول طویل ہے۔ جس کی شرح و بیان خارج از امکان ہے۔ اِس بنا پر ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا نہیں پسند کرتے۔ اُم المومنین کی فضیلت اور محبت رسول صلعم کے متعلق ابتدار اور انتہا کی ایک ایک روایت کو اور لکھ کر ہم اس مضمون کو تمام کر دیتے ہیں۔

محبت رسولؐ کی ابتدا صحیح ترمذی کی مفصلۂ ذیل حدیث سے قایم کی جاتی ہے۔

(۷) قال رسول اللہ صلعم ان جبریل جاء بصورتها فی خرقة حریر خضراء وقال هذہ ازوجتك فی الدنیا والآخرة۔	فرمایا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ حضرت جبرئیلؑ حریر کے ایک پارچہ پر حضرت عائشہ کی ایک تصویر کھچی ہوئی لے آئے اور مجھ سے ارشاد کیا کہ یہ آپ کی دنیا و آخرت میں زوجہ ہے۔

اس حدیث کی موضوعیت اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے ظاہر ہے۔ اس لیئے اس کے متعلق کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔ ہاں استعجاباً اتنا لکھدینا ضروری ہے۔ کہ یہ وہ شرف ہے۔ جس سے جناب خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا بھی محروم ہیں۔ حالانکہ حضرت عائشہ نے اُن محترمہ کی سائر ازواج مطہرات پر فضیلت رکھنے کے مسئلہ کو خود خدمت رسولؐ صلعم سے رُو در رُو مقابلہ کر کے طے کر لیا تھا۔ (مشکوٰۃ باب مناقب ازواج) اور اُن کی افضلیت کے اوصاف و اسباب کو خود مخبر صادقؐ

کی زبانی سُن لیا تھا۔ مگر بایں ہمہ خدائے شرف زوجیت کا اظہار اُنھیں کی رُونمائی سے آغاز فرمایا۔ اور علیہ مکرمہ حضرت خدیجہؓ کے فضائل ومناقب کو زیر نقاب رکھا۔ حالانکہ اُن کے محترمہ کے زمانہ زوجیت رسولؐ میں حضرت عائشہ کی تصویر کیسی۔ اُن کی زوجیت کا تصور بھی قائم نہیں ہوا تھا اسی طرح آپ کی تصدیق رسالت فرمانے اور ایمان لانے کا وہ وقت تھا۔ کہ سوائے جناب خدیجہؓ کے کوئی نفس واحد اُس وقت تک نہ خدا کو خدا جانتا تھا۔ اور نہ رسولؐ کو رسولؐ۔ تعجب ہے کہ معطیان قدرت نے اِس شرف خاص کی عطا کئے جانے کے وقت حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اِتنی ناتوجہی۔ اور غفلت شعاری دکھلائی۔ اور حضرت عائشہ کے ساتھ اِتنی گرم ایثاری اور جانب داری سے کام لیا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ۔

صرف اسی رُونمائی پر اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ خداوند عالم نے آپ کا خطبہ نکاح بھی پڑھ دیا۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عمر سے اُسی صحیح ترمذی میں یہ روایت مرقوم ہے۔

عن ابن عمر قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قال جبرئیل ان اللہ قد زوجتك بابنة ابی بکر ومعه صورتها ۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جبرئیلؑ نے کہا۔ کہ خدانے آپکو حضرت ابی بکر کی صاحبزادی سے بیاہ دیا۔ اور اُس کی تصویر بھی اُن کے ہمراہ تھی۔

اب نہیں معلوم کہ یہ نکاح۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد واقع ہوا۔ یا قبل۔ اگر قبل واقع ہوا۔ تو یہ حدیث متفقہ جمہور کہ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے قبل کسی کے ساتھ نکاح نہیں فرمایا۔ غلط ہو گئی۔ اور اگر بعد اُن کے واقع ہوا۔ تو دوسری حدیث مسلمہ جس سے جناب خدیجہ کی تقدیم وتفضیل تمام اُمہات مومنین پر ثابت ہوتی ہے۔ جھوٹی ہو گئی۔ فانظر و فتدبروا۔

ابتدائے فضیلت تو یوں ہوئی۔ انتہا بھی ملاحظہ فرمالی جاوے۔ زرقانی جلد دوم صفحہ ۲۶۶ میں مرقوم ہے

روی ابو الحسن الخلعی عنها رفعته یا عائشة انه لیهون علی الموت انی قد رأیتك زوجتی فی الجنة ورواه ابن عساکر بلفظ ما ابالی بالموت منذ علمت انك زوجتی فی الجنة والسلفی بلفظ هون علی الموت انی رأیت عائشة فی الجنة و روی احمد عنها رفعته ولقد رأیت عائشة فی الجنة کانی انظر الی بیاض

ابو الحسن الخلعی نے بطریق مرفوع حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ مجھکو بہشت میں اپنی زوجہ دیکھکر مجھے اپنی موت پر رغبت ہوئی۔ اور اس مضمون کو ابن عساکر نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔ کہ مجھکو اُس وقت تک اپنی موت گوارا نہ ہوئی جب تک کہ مجھکو اس امر کا علم نہ ہو لیا کہ تو بہشت میں میری زوجہ ہوگی اور امام احمد ابن حنبل نے بطریق مرفوع روایت کی ہے۔ کہ میں نے بہشت میں عائشہ کو دیکھا۔ اور حضرت اُنکی ہتیلی کی سفیدی مجھے دکھلائی

کفیہا الیھون بذلک عند موتی۔ | گئی۔ اور یہی میری رغبت الی الموت کی باعث ہوئی۔

آخر ان لغویات کی کوئی حد بھی ہے۔ آخر وقت تک جب خدا سے لو گی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلعم کا محبت عائشہ میں یہ عالم ہے۔ کہ نہ آپ کو رجوع الی اللہ کی نسبت کسی فرحت و اطمینان کا خیال ہے اور نہ الرفیق الاعلیٰ کے ساتھ شرف وصال حاصل ہونے پر کوئی روحانی سرور لاحق ہے۔ نعوذ باللہ خدا کی قربت اور اُسکے وصال سے محض مفارقت عائشہ کے حزن وملال کی وجہ سے اُسوقت تک کراہیت کی جاتی ہے۔ جب تک یہ علم ویقین کامل طور سے نہیں ہو لیتا ہے۔ کہ وصال الٰہی کے ساتھ وصال حضرت عائشہ بھی حاصل ہوگا۔ یا احمد ابن حنبل کے الفاظ میں اُسوقت تک اپنی موت گوارا نہیں کی جاتی جبتک کہ حضرت عائشہ کی صورت اگرچہ بقدر کف دست ہی کیوں نہو۔ بہشت میں نہیں دیکھ لیجاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے۔ کہ ان لغویات احادیث نے نہ خدا کو خدا رکھا۔ اور نہ رسولؐ کو رسولؐ۔ خدا اپنے رسول کو اپنی قربت کی طرف بلاتا ہے۔ اور محبت عائشہ ہے۔ کہ وہ اپنی سمت کھینچے لیے جاتی ہے۔

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

آفرین ہے ان علماء کی قلمکاریوں پر اور محدثین کی ان کارگذاریوں پر جنہوں نے حضرت عائشہ کے فضائل ومناقب کی تدوین وتزئین میں خدا کی منزہ ذات وصفات اور اُسکے معصوم اور سچے رسول صلعم کے اخلاق وعادات پر اتہام پر اتہام باندھے اور مخالفین اسلام کو انواع اقسام کے الزام لگانے کا پورا موقع دیدیا۔ ایک حضرت عائشہ کی افضلیت ومحبت ثابت کرنے کی کوششوں میں آسمان وزمین کے قلابے ایک کردیے ؎ تو کار زمین را نکو ساختی ٭ کہ بر آسمان نیز پرداختی۔

فقہی مرویات میں ان لغویات کی ناپاک صورتیں

ان لغویات کی مرقومہ بالا مثالیں تو وہ تھیں جو احادیث وتفاسیر کی کتابوں سے لیکر لکھی گئیں۔ ان شرمناک واقعات نے عصمت وحرمت رسالت اور حیا وعزت نبوت کی جو حالت پہونچائی ہے۔ وہ عبرت للناظرین بن کر دُنیا کے پیش نگاہ ہے۔ ان سے زیادہ ان لغویات کی ناپاک صورتیں تو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن کے ذکر وبیان نے نعوذ باللہ رسول اللہ صلعم کی پاک وپاکیزہ معاشرت کو تعیش دنیاوی اور جذبات نفسانی کا مرقع بنا رکھا ہے۔ اور ان لغویات کی نسبت حضرت عائشہ کی تنہا ذات سے کی جاتی ہے۔

(۱) سطلات صوم کے ذکر میں۔ زرقانی شرح موطائے امام مالک میں لکھتے ہیں:۔

للبیھقی عنہا (عن عائشہ) انہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یقبلھا وھو صائم	امام بیہقی حضرت عائشہ سے روایت لکھتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت صوم میں بیر ابوسہ لیتے تھے

ویمصّ لسانہا وفیہ جواز الاخبار عن مثل ھذا مما یجری بین الزوجین علی الجملۃ للضرورۃ واما فی حال غیر الضرورۃ لمنہی عنہ ۔

زرقانی شرح موطا صفحہ ۹۳ جلد ۲

اور ان کی زبان چوستے تھے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ایسی باتیں جو میاں بی بی میں ہوتی ہیں۔ ان کا ظاہر کرنا ضرورت کے لیے جائز ہے۔ حالانکہ بلا ضرورت بیان نہی عنہ ہے۔ یعنی نہ بیان کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔

اب اسیر حضرت عائشہ کی ترقی دیکھیے:۔

ان عائشۃ بنت طلحۃ بن عبد اللہ احد العشرۃ القرشیۃ التیمیۃ ام عمران کانت فائقۃ الجمال ثقۃ روی لھا الستۃ اخبرتہ انہا کانت عند عائشۃ زوج النبیؐ فدخل علیہا زوجہا ھنالک وھو عبد اللہ ابن عبد الرحمان ابن ابی بکر الصدیق التیمی تابعی روی لہ شیخان وغیرھما وھو صائم فقالت عمتہ عائشۃ ما یمنعک ان تدنو تقرب من اھلک زوجتک تقبلہا وتلاعبہا تمس البشرۃ دون جماع ولعلہا قصدت افادتہ الحکم والا فمعلوم انہ لا یقبلہا بحضور عمتہ عائشۃ ام المومنین وقال ابو عبد الملک تزید ما یمنعک اذا دخلتما ویحتمل انہا شکت لعائشۃ تلک حاجۃ الی النساء وسالتہا ان تکلمہ فاقتصر بذلک او فہم عندھا لمکانہ فقال اقبلہا وانا صائم

خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ عائشہ بنت طلحہ حضرت عائشہ کی بھانجی تھیں ان کا نکاح عبد اللہ ابن عبد الرحمن ابن ابی بکر صدیق کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ثقہ تھیں اور مشہور صاحب جمال اُنسے بھی احادیث مروی ہیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ہم ایکدن حضرت عائشہ کے پاس بیٹھے تھے کہ میرا شوہر آیا اور وہ روزہ رکھے تھا۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ بیٹا تم اپنی بی بی سے حالت صوم میں بوس وکنار کیوں نہیں کرتے لائق بھتیجا جواب دیتا ہے کہ ہاں ہوتا تو ہے۔

لفظی ترجمہ بوجہ عدم تہذیب کے ترک کیا گیا۔ صرف مفہوم اور مراد روایت کے بیان سے کام کیا گیا ہے۔ (شرح موطا ص ۹۱)

اب حضرت عائشہ نے اس حدیث کو جس انداز بیان سے ادا فرمایا ہے۔ وہ بھی اسی محدث کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

عن عائشۃ ام المومنین انہا قالت ان کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم یقبل بعض ازواجہ وھو صائم فضحکت اما فی کان یقبلنی وھو صائم ام سلمہ کما فی البخاری

حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت صوم میں اپنی بعض ازواج کا بوسہ لیتے تھے یہ کہکر وہ ہنسیں اور مسلم میں حضرت عائشہ نے کہا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرا بوسہ لیا۔ اور وہ

عـ أُم المومنین حضرت اُمّ سلمہ ۔ حضرت اُمّ سلمہ کے ذکر مرقومہ بالا میں، بخلاف مسلم وغیرہ کے

و حفصۃ کما فی مسلم ایضا لکن الظاہر انہ کلا منہما انما اخبرن عن فعلہ معہا زرقانی صفحہ ۹۳

روزہ سے تھے۔ یا ام سلمہ کا اور مسلم کی دوسری حدیث میں ہے۔ کہ حفصہ کا۔ حاصل یہ ہے۔ کہ بطور ظاہر سب کا بیان ہے۔ کہ ہمارا بوسہ لیتے تھے۔

ناموس رسولؐ کی بے حرمتی اس کی پاک معاشرۃ کی غارتی یہیں تک پہونچا کر اگر ختم کر دی جاتی۔ تاہم غنیمت تھی۔ مگر یہاں تو لفظ لفظ کی تفصیل اور حرف حرف کی تصریح سے حضرت عائشہ کی فضیلت کے نکتوں پر نکتے نکالتے ہیں۔ لیکن ان تمام طومار بیکار سے سوائے توہین انگیز اور مضحکہ خیز نتیجوں کے کوئی فائدہ نہیں نکلتا۔ اب زرقانی صاحب عبارت حدیث میں لفظ "ضحکت" یعنی حضرت عائشہ کے ہنس دینے کی توجیہات ان الفاظ میں قلمبند فرماتے ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۶ - امام بخاری صاحب بالکل منفرد ثابت ہوتے ہیں۔ حالانکہ امام مسلم نے ایک روایت میں عائشہ سے اور ایک میں حفصہ سے اس عمل کو لکھا ہے۔ مگر بخاری صاحب نے یہ کوشش کی ہے۔ کہ ام سلمہ کو شامل کریں۔ اس غرض سے کہ ازواج مطہرات میں بقول جمہور حضرت ام سلمہ۔ حضرت عائشہ کی مخالف پارٹی میں شامل تھیں زرقانی نے صرف بخاری کی نقل عبارت حدیث پر اکتفا کی ہے اور سلسلہ رواۃ وغیرہ کے نقل کو بالکل چھوڑ دیا ہے اس لیے ہم اسکے رجال کی تحقیق سے بالکل مجبور رہیں۔ مگر اتنا ضرور لکھکر بتلا دیں گے۔ کہ جناب ام سلمہ کے طرز عمل کر یہ حدیث بخاری بالکل جھوٹی اور وضعی ثابت ہوتی ہے۔ اسوجہ سے کہ آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات میں یہ وہ غیور محترمہ ثابت ہوتی ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواستگاری نکاح کے وقت ہی اپنے غیور ہونے کا اظہار فرمایا تھا۔ اور اپنے غیرت داری کے تقاضہ کو آیندہ قصد مناکحت کا مانع ٹھہرایا تھا۔ اور جو شرائط نکاح کیئے تھے۔ اُن میں سب سے پہلے اپنے غیور رہونے کا اظہار تھا۔ ہم اس مقدسہ کے حالات مولوی شبلی صاحب کے خاص الفاظ میں حسب ذیل دکھلاتے ہیں۔

ان کے شوہر ابو سلمہ بڑے شہسوار تھے۔ شہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے۔ غزوات احد میں چند زخم کھائے۔ اور اُن کے صدمات سے جانبر نہ ہو سکے۔ جمادی ۴ھ میں وفات پائی۔ ان کے جنازے کی نماز بڑے اہتمام سے پڑھی گئی۔ آنحضرت صلعم نے ۹ تکبیریں کہیں۔ لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا۔ یارسول اللہ آپ کو سہو تو نہیں ہوا فرمایا ہزاروں تکبیروں کے مستحق ہیں۔ ابو سلمہ کی وفات کے وقت ام سلمہ حاملہ تھیں۔ وضع حمل کے بعد جب عدت گذر گئی۔ تو انہوں نے (مفصلہ ذیل) چند عذر پیش کئے۔ (۱) میں سخت غیور عورت ہوں۔ (۲) صاحب عیال ہوں (۳) میرا سن زیادہ ہے۔ (اللہ اللہ۔ کس قدر متانت۔ صفائی اور عدالت ہے) آنحضرت صلعم نے ان تمام زحمتوں کو گوارا

"توجیہ اول: نبیہا علی انہا صاحب القصۃ۔	یعنی ام المومنین حضرت عائشہ اس لیے ہنسیں کہ معلوم ہو جائے۔ جسکا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت صلعم جس کا

بوسہ لیتے تھے۔ وہ میں ہی ہوں"
مگر افسوس۔ اس کی کوئی وجہ نہیں دکھلائی جاتی۔ کہ اس محدث کو رسول صلعم کے اِس افشائے راز کی نسبت حضرت عائشہ ہی کا اقرار کیوں ملا۔ اور حضرت حفصہ اور حضرت اُم سلمہ کی نسبت وہ اس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۷۔ فرمالیا۔ ازواج مطہرات میں حضرات عائشہ کے بعد فضل وکمال میں اُنھیں کا درجہ ہے۔ (محض خود غرضانہ فیصلہ، اور ترجیح بلا دلیل ہے۔) ابن سعد نے طبقات میں اسکی تصریح کی ہے (ہم اُس کی تنقید وتصحیح کریں گے) روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہ کے سوا تمام بی بیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے (حضرت عائشہ کے موضوعات مشہور ہیں۔ اور اُن کی ایک حدیث بھی موضوع نہیں۔ یہی فرق مابہ الامتیاز کافی ہے) صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکے سے باہر حلق اور قربانی سے قبل تھا۔ تو حضرت ام سلمہ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی۔ اور یہ اُن کی دانشمندی اور عقل وذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل تمام درج ہے۔ سیرۃ النبیؐ جلد دوم ص ۲۳۰۔

ایسی صاحب جامعیت وقابلیت اور ایسی صاحب حیا وغیرت خاتون۔ عام فطرت نسوانی کے خلاف۔ نامحرم مردوں کے مجمع میں تبلیغ کی ضرورت ہی سے کیوں نہ ہو۔ اپنے راز خلوت کی یوں چہرہ کشائی کرے۔ اور اس صفائی سے اپنے شوہر کے اختلاطی باتوں کو دھڑا دھڑ بیان کرے۔ کبھی کوئی آدمی خیال کر سکتا ہے۔ کہ یہ خاتون باعصمت وعفت وہی ہے۔ جو اپنے غیور ہونے کی نسبت اس متانت اور استقامت سے دعوے پیش کرتی تھی۔ لا واللہ

یہ بخاری صاحب کی صریح کاذبانہ قلم کاری ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ جو صحابہ کی طرح طبقہ ازواج مطہرات میں مساوی فی المدارج کا اُصول تعمیم قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہم اِس خاتون معظمہ ومحترمہ کی غیرت وحیا داری کی ایک اور مثال ذیل میں لکھکر اس بحث کو تمام کر دیتے ہیں۔ صحیح مسلم ص ۱۴۲ میں مرقوم ہے۔ کہ سلیم انصاری نے خدمت رسولؐ میں آنے کی اجازت مانگی۔ آپ اُسوقت ام المومنین جناب ام سلمہ کے گھر میں تھے۔ اجازت ملی۔ اندر آئے۔ رسول صلعم سے سلیم نے دریافت کیا کہ کیا عورتوں کو بھی احتلام ہوتا ہے جناب ام سلمہ نے سلیم کو ڈانٹ کر کہا۔ کہ تم مسئلہ پوچھتے ہو۔ یا عورتوں کو فضیحت کرتی ہو" ایسی غیرت مند اور حیادار عفیفہ جو مسئلہ شرعیہ کے استفسار میں بھی۔ عام جنس نسوانی کے متعلق اتنے انکشاف کو بھی نہ سُننا چاہتی ہو۔ اور سائل مسئلہ کو فوراً اُس کی ایسی بے شرم حرکت پر تنبیہہ فرماتی ہو۔ وہ نعوذ باللہ اس بےحیائی سے اپنا بیان آپ کر سکتی ہے؟ ان ھذا الا اختلاق۔ مؤلف عفی عنہ

اظہار کو نہ پا سکے۔ صرف اس لیے کہ مراد ہے۔ صرف حضرت عائشہ کی افضلیت سے۔ اس لیے صرف انہیں کی نسبت اس فضیلت و افضلیت کی تفصیل کی گئی۔ مگر بفرض محال۔ اگر نعوذ باللہ بوس و کنار ہی پر فضیلت و اقتدار ازواج مطہرات کا دارومدار ہے۔ تو تاہم۔ باسناد صحیحین۔ حفصہ اور اُم سلمہ دونوں اس فضیلت میں شامل ہیں۔ پھر حضرت عائشہ کی فضیلت کیسی۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

اب دوسری اور تیسری توجیہ بھی ملاحظہ کیجیے۔

(۲) او تعجبت من انفسہا اذا حدثت بمثل ہذا مما یستحی النساء من ذکرہ للرجال الجائتہا ضرورۃ تبلیغ العلم الی ذکر ذلک۔

حضرت عائشہ کو اس وجہ سے ہنسی آئی۔ کہ انہوں نے وہ بات بیان کی۔ جس کے تذکرے سے مردوں کے سامنے قطعاً عورتیں شرماتی ہیں۔ مگر صرف تبلیغ علم کی ضرورت نے انکو مجبور کیا۔ کہ اس واقعہ کو بیان کیا۔

(۳) او سرورا بتذکر مکانہا من النبی و حالہا معہ وملاطفتہ لہا و حبّہ و للبیہقی عنہا انہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان یقبلہا وھو صائم ویمص لسانہا ص ۹۳

تیسری وجہ یہ تھی۔ کہ اس بیان سے اُن کو سرور ہوتا تھا اور یاد آتی تھی حضرت کی وہ محبت اور لطف و مدارات۔ جو انکے ساتھ تھی۔ چنانچہ بیہقی کی حدیث ہے عائشہ سے کہ آنحضرت صلعم حالت صوم میں ہمارا بوسہ لیتے تھے اور زبان چوستے تھے"

یہ فاضل شارح ان واقعات کی رکاکت کا خود ناقل بھی ہے۔ اور قائل بھی خود کہتا ہے۔ مما یستحی النساء من ذکرہ للرجال۔ قطعاً عورتیں ان اقسام کے تذکرے مردوں کے سامنے کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔ مگر بار بار یہی ذکر کیے جاتا ہے۔ اور رسول صلعم سے ذرا بھی نہیں شرماتا۔ کہ اُس کے خاص ناموس کو اتنا بے غیرت سمجھ کر اُس کے منہ سے خلاف عادات نسواں مردوں کے مجمع میں اپنے آپ بیان کراتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ پھر خلاف عادات نسوانی۔ تیسری وجہ ہنسی کی غایت محبت رسولؐ بتلاتا ہے۔ حالانکہ عورتوں کا خاص قاعدہ ہے۔ کہ اگر بسبیل تذکرہ وہ اپنے شوہر متوفی کا ذکر کرتی ہیں۔ یا اُس کے لطف و مدارات کو یاد کرتی ہیں۔ تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ اور اُس کی یاد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ مگر یہ فاضل شارح حرم رسول صلعم کے متعلق تمام خلاف فطرت اُمور جائز رکھتا ہے۔ اور خدا اور رسولؐ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ استغفر اللہ۔

ان لغویات کے نشر و اجرا کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ حالت صوم میں بوس و کنار سنّت قرار دیدیا گیا۔ حالانکہ حقیقت صرف جواز سے آگے نہیں بڑھتی۔ مگر حضرت عائشہ کے طومار مرویات جو اُن کی فضیلت۔ اور رسول اللہ کے ساتھ مفرط محبّت رکھنے کے ثبوت میں جمع کیے گئے۔ ان قابل اعتراض حرکات کو

حکم شریعت قرار دے لیا گیا۔ چنانچہ زرقانی لکھتے ہیں۔

واخذ الظاهرية بظاهر الحديث فجعلوا القبلة للصائم سنة وقربة من القرب اقتداء لفعله ۔

فرقہ ظاہریہ (جو اہل حدیث کا اُستاد فرقہ ہے) اُسکا قائل ہے۔ کہ روزہ دار کو بوسہ لینا سنت ہے۔ اور موجب قربت ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم یہ کام کرتے تھے۔

اِس مسئلہ خاص میں تمام علماء و محدثین سے زیادہ قیامت کی ہے۔ تو امام بخاری نے کہ بوسہ بازی کو حالت صوم میں صرف سنت رسول صلعم ہی قرار دینے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اُسپر اور اضافہ یہ فرمایا۔ کہ اپنی صحیح میں ایک خاص باب اس امر کا باندھا۔ کہ روزہ دار اپنی زوجہ کے ساتھ مباشرت کرے
چنانچہ حضرت عائشہ سے روایت ہے:۔

كان النبي صلعم يقبل ويباشر وهو صائم وكان املكم لاربه ۔

آنحضرت صلعم حالت صوم میں بوسہ لیتے تھے۔ اور مباشرت کرتے تھے۔ اور تھے حضرت بڑے مالک اپنے عضو خاص کے۔

محدثین سے زیادہ تو اُن کے شارحین حدیث زیادہ بے شرم ثابت ہوتے ہیں:۔
زرقانی صاحب شرح موطا اپنی شرح میں اسی حدیث بخاری سے استدلال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ذكرت انواع الشهوات مرتقية والمعانقة وارادت ان تعبّر عن المجامعة فكنت عنها بالارب اى عبارة احسن منها واخذ الظاهرية بظاهر هذا الحديث فجعلوا القبلة للصائم سنة وقربة من القرب اقتداء بفعله صلى الله عليه وآله وسلم ورد بانه كان يملك نفسه فليس كغيره وكيف ما كان لا يفطر الا بانزال المنى ولو مذى وجب القضاء عند مالك ولا شئ عند ابى حنيفة والشافعى وشذ قوم فقالوا مجرد القبلة يبطل الصوم ۔

حضرت عائشہ نے اس حدیث میں کل انواع شہوات کو درجہ بدرجہ بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ پہلے بوسہ کا ذکر کیا پھر مباشرت کا۔ جس کے معنی معانقہ۔ دست بازی وغیرہ کے ہیں۔ پھر مجامعت کو کنایہ سے بیان کیا۔ لفظ ارب سے اب اس سے بڑھ کر کیا فصاحت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے فرقہ ظاہریہ نے بوسہ بازی کو داخل سنت کر لیا ہے کہ اس سے اُمید ثواب ہے۔ اور اسکا رد یوں کیا گیا؟ کہ حضرت اپنے عضو خاص کے بڑے روکنے والے تھے۔ کہ دوسرا آپ کے ایسا ممکن نہیں تھا۔ غرض صورت مسئلہ یہ ٹھہری۔ کہ تنہا بوسہ لینے یا مباشرت کرنے سے تاوقتیکہ انزال منی نہ ہو۔ روزہ باطل نہیں ہوتا۔ ہاں اگر مذی (رطوبت قبل منی) نکلے تو امام مالک کے نزدیک روزہ کی قضا واجب ہوتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی

کے نزدیک کچھ نہیں۔ مگر باایں ہمہ۔ ایک قوم (طبقہ علماء) کہتی ہے۔ کہ محض بوسہ لینے ہی سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔

ہم ان لغویات کی تنقید و تحقیق میں اپنا عزیز وقت زیادہ صرف کرنا نہیں چاہتے۔ حقیقتاً ہم جتنا لکھ چکے۔ وہی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر آخر میں ہمارے لیے یہ لکھ کر بتلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ صوم سے مراد الٰہی کیا ہے؟ یہی نہ کہ انسان کی تمام خواہشات روزہ رکھنے سے کم ہوں۔ انسان صبر و تحمل سے اپنی تمام خواہشات نفسانی پر قابو پا سکے۔ انسان میں انکسار و تواضع۔ صبر و تحمل اور قناعت و استقامت کے جوہر پیدا ہوں۔ آدمی خدا کی یاد میں محو ہو۔ اور حالت صوم میں وہ شاغل اختیار کرے۔ جن سے صفات مذکورۂ بالا کی مشق و تعلیم حاصل ہو۔

بخلاف ان امور کے واقعات مذکورۂ بالا سے۔ جو خاص طور فقہیہ اسلامیہ کے احکام ثابت ہوتے ہیں ان شاغل کے مخالف طرز عمل اختیار کرنے کی تنبیہ و تاکید معلوم ہوتی ہے۔ صرف کھانا پینا بند ہے مگر اور سب جائز ہے۔ نعوذ باللہ۔ ہاتھ ساس کے لیے۔ منہ بوسوں کے لیے۔ تو اس بنا پر ہر شخص بنہایت آسانی سے خود تصفیہ کرے گا۔ کہ یہ احکام صیام مدعائے الٰہی کے بالکل مخالف ہیں۔

حقیقت مدعا پر اگر تحقیق کی نظر ڈالی جائے۔ تو اس طومار کی مقدار فقط اتنی معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگر کسی صائم سے محض اتفاقاً یہ فعل صادر ہو گیا۔ تو مبطل صوم نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمر کے خاص واقعے اس مسئلہ کی ابتدا ظاہر ہوتی ہے۔ اور وہ صحیح نسائی اور ابو داؤد میں حسب ذیل مرقوم ہے۔

عن عمر ابن الخطاب هششت فقبلت وانا صائم فقلت يا رسول الله صلعم صنعت اليوم امرًا عظيما قبلت وانا صائم قال ارايت مضمضت من الماء وانت صائم قلت لا باس به قال فهه۔

عمر ابن خطاب کا بیان ہے۔ کہ ایک دفعہ ہم نے بوسہ لیا۔ اور خدمت رسول اللہ صلعم میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آج مجھ سے ایک عظیم امر سرزد ہو گیا ہے۔ پوچھا کیا۔ کہا کہ ہم نے حالت صوم میں بوسہ لیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اگر صوم میں پانی سے کلی کرو تو کیا ہو۔ عرض کی کچھ بھی نہیں۔ فرمایا۔ یہ بھی ویسا ہی ہے۔"

بات تو اتنی تھی۔ مگر عقیدت مندوں نے حضرت عائشہ کی فضیلت و محبت۔ حضرت عمر کی روایت اور نیز اس حکم لطف انگیز کو شہرت دینے کی ضرورت سے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ کر دیا۔ نہ خدا کو چھوڑا۔ نہ رسول صلعم کو۔ حضرت عائشہ پر جو جو اتہام لگائے۔ وہ ایک ایک کرکے اوپر لکھ دیئے گئے۔ اب اس حکم سے حضرت عمر کے خاص ناموس کی جتنی اور جیسی پردہ دری کی گئی ہے۔ وہ زرقانی کی شرح موطا کی مفصلہ ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔

ان عاتكه ابنة وفي رواية بنت زيد ابن عمرو

عاتکہ بنت زید۔ زوجہ حضرت عمر ابن الخطاب حضرت عمر

(بفتح العین ابن نفیل بضم النون وفتح الفاء و سکون التحتانیۃ وکلام لقرشیۃ العدویۃ صحابیۃ من المھاجرات وھی اخت سعید بن

سر کا حالت صوم میں بوسہ لیتی تھیں۔ اور حضرت عمر ان کو اس فعل سے منع نہ فرماتے تھے۔ اور وہ نہایت صاحب حسن وجمال تھیں۔ (ملخصاً ترجمہ کیا گیا)

زید احد العشرۃ امراۃ عمر بن الخطاب ابن عمھا کانت تقبل راس عمر ابن خطاب وھو صائم بتقبیلا بلا لذۃ فلا ینھا وکانت حسنا جمیلۃ۔

کس قدر شرمناک ہے۔ کسی شریف گھر کی عورت کے لیے یہ کہنا اور لکھنا کہ وہ اپنے شوہر کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھی گئی۔ اور اس سے زیادہ عبرتناک ہے۔ اس عورت کا خود اور لوگوں سے اپنے اس فعل کا اقرار کرنا۔ اور اپنی خلوت کے پردوں کو خود اپنے ہاتھوں سے چاک کرنا۔ اگرچہ واقعہ کی حیثیت سے یہ واقعہ کتنا ہی صحیح اور اصلی ہو۔ مگر اخلاق انسانی اور حیائے نسوانی کے لحاظ سے اس کا ذکر و مذکور بالکل معیوب و مذموم معلوم ہوتا ہے۔

(۲) احکام صیام کی حرمت جو ان لغویات کی بدولت ہوئی۔ وہ ہمارے مندرجہ بالا بیانات سے کما حقہ ظاہر ہوگئی۔ اور وہ ہماری پہلی مثال تھی۔ اب ہم مرویات فقہیہ کے لغویات کی دوسری مثال پیش کرتے ہیں۔

دوران حیض میں جواز مباشرت کی نسبت امام بخاری لکھتے ہیں۔

حدثنا اسمعیل ابن خلیل قال اخبرنا علی بن مسھر قال ابواسحق وھو الشیبانی

(اس کا ترجمہ ہم نہیں کر سکتے۔ سخت بے ادبی ہے۔ اللہ معصیت۔) مؤلف عفی عنہ

عن عبد الرحمن ابن الاسود عن ابیہ عن عائشۃ قالت کانت احدانا اذا کانت حائضا وارادرسول اللہ ان یباشرھا امرھا ان تتزر فی فور حیضتھا ثم یباشرھا۔

جلد اول صفحہ ۴۰

خدا کی پناہ! یہ کیسا رسولؐ ہے۔ جو ایسے موقعوں پر ہم کو فلا تقربوھن حتی یتطھرن واللہ یحب المتطھرین (دوران حیض میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ تا وقتیکہ وہ اپنے ایام گذار کر پاک نہ ہولیں۔ خدا پاک آدمیوں سے محبت رکھتا ہے۔)

خدا کا حکم پہونچا کر۔ ان حالت خاص میں ہم کو مقاربت نسوانی سے منع کرتا ہے۔ اور نعوذ باللہ خلاف

عادت فطری اور برعکس حکم خداوندی خود ان افعال ذمیمہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اعوذ باللہ مما استعاذ منہ عبادہ المخلصون۔

اسی کی ایسی ایک دوسری مثال اور پیش کی جاتی ہے۔ اب منی کی حقیقت کے ذکر میں امام ذیلعی لکھتے ہیں۔

قال الشافعی لیس بنجس لما روی عن عائشۃ انہا قالت کنت افرک المنی من ثوب رسول اللہ صلعم ثم یصلی فیہ ولا یغسلہ وفی حدیث اخر قالت کنت افرک المنی من ثوب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وھو یصلی والواو للحال ولو کان نجسا لما افتتح الصلوٰۃ معہ ولا اکتفی بالفرک فیہ کسائر النجاسات ذیلعی صفحہ ۷۱

شافعی نے کہا ہے۔ کہ منی نجس نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ سے روایت کی گئی ہے۔ کہ میں منی کو رسول اللہ صلعم کے کپڑوں سے گھسا کرتی تھی۔ اور حضرت اسی لباس میں نماز پڑھتے تھے۔ اور اسکو دھوتے نہیں تھے۔ اور دوسری روایت میں ہے۔ کہ میں منی کو آپ کے کپڑوں سے چھڑایا کرتی تھی۔ اور آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ پس اگر منی نجس ہوتی۔ تو اس کے لگے رہنے پر آپ کبھی نماز شروع نہ فرماتے۔ اور نہ صرف اس کے گھس دیئے جانے یا چھڑا دیئے جانے پر اکتفا فرماتے۔ جیسا کہ سائر نجاسات کا حال ہے۔ ذیلعی ص ۷۱

ان تمام لغویات میں سب سے زیادہ شرمناک تو یہ ہے۔ کہ ان مدعیان اسلام نے اس خدمت کو بھی ہزار مفاخرت حضرت اُمّ المومنین عائشہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہ نعوذ باللہ وہ معظمہ حضرتؐ کے جامۂ اطہر سے منی چھڑایا کرتی تھیں۔ ناخنوں سے رگڑا کرتی تھیں۔ جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آخر ان کو یہ خدمت کیوں دی گئی۔ کیا ان محترمہ کے لیئے گھر میں دوسرا کام نہیں تھا۔ اگر کوئی غیر مذہب کا شخص ان روایات کو دیکھے گا۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہاں تک وہ اسلام کی طرف رغبت کرے گا۔ غرض اسلام کی بدقسمتی سے اس کے دینی اور مذہبی اخبار و آثار میں یہ لغویات اقوال۔ عام احادیث اور احکام فقہیہ وغیرہ کی مختلف صورتیں اس کثرت سے اختیار کر چکے ہیں۔ کہ ان کے لکھنے پڑھنے اور سُننے سے غیر تمندان اسلام کا ایمان لرزتا ہے۔ اور حیاداران ایمان مارے غیرت کے ڈوبے جاتی ہیں۔ خدا رحم کرے اسلامی علماء اور فقہاء پر۔ جو انواع و اقسام کے انداز و ادا کے ساتھ ان لغویات کی شرح و بیان پر مرے جاتے ہیں۔ اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ ان روایات کی بدولت اصل اسلام کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ مضامین ایسے نہیں ہیں۔ جن پر ہمارے غیروں کو اطلاع نہ ہو۔ اور وہ اپنی قوم میں ان باتوں کو شاخ در شاخ بڑھا کر نہ بیان کرتے ہوں۔ اور دیگر اقوام کو اسلام

سے نفرت نہ دلاتے ہوں۔

امام ذیلعی ہوں یا امام شافعی۔ امام بخاری ہوں یا امام مالک۔ ان حضرات سے کون پوچھے۔ کہ اگر نجاست منی میں آپ کو خلاف اور مجتہدین اسلام کے تامل تھا۔ تو آپ کو اپنے مختار پر اتنے اصرار کی کیا ضرورت تھی۔ زائد سے زائد آپ کی رائے خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی۔ تاہم آپ حضرات شاب تھے۔ آپ نے اس مسئلہ اختلافی کو اتنی اہمیت دی۔ اور اس کے شہود و ثبوت کی فراہمی میں اتنی کوشش کی۔ کہ اس کی عدم نجاست کو نعوذ باللہ خود مخبر صادق کی استرضا اور حضرت صدیقہؓ کے طرز عمل سے ثابت فرمایا۔ مگر افسوس کہ ان شہود و ثبوت کی شرح و بیان میں آپ کو نہ رسولؐ کی ہتک حرمت اور نہ ناموس رسول صلعم کی اہانت کا کوئی خیال آیا۔ ہم کہتے ہیں۔ آپ کا کہنا صحیح ہے اس کی عدم نجاست ویسی ہی ہے۔ جیسی آپ کو تحقیق ہو چکی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کہ شریف گھر کی بہو بیٹیوں کے طرز عمل سے اُسکے ثبوت بہم پہنچائے جائیں۔

آپ پر کیا موقوف ہے۔ دُنیا جانتی ہے۔ کہ خلوت میں عورت اپنے مرد کی تمام خدمتیں کرتی ہے لیکن خدا شاہد ہے۔ ایسی ان خدمتوں کا روزنامچہ دُنیا کے سامنے نہیں پیش کرتی۔ فطرت نے باہمی راز و نیاز کی باتوں کو زن و شوکے مابین محفوظ کر رکھا ہے۔ اور جانبین کی شرم و حیا نے اُن کے لب و زبان پر سکوت و خاموشی کے قفل لگا دیئے ہیں۔ یہ وہ مشاہدات ہیں۔ جو روزمرّہ کی عام اطلاع و علم میں داخل ہیں۔ اس بنا پر کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ خلاف فطرت انسانی اور برعکس غیرت و حیائے نسوانی حضرت اُم المومنین نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلوت خاص کے ان رازوں کو یوں فاش کر دیا ہو گا۔ لا واللہ۔

قیامت تو یہ ہے۔ کہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے جو عدم نجاست کی حدیث آئی ہے۔ وہ امام ذیلعی خود لکھتے ہیں۔ جس میں عقلی اور نقلی دونوں طریقوں سے ثبوت موجود ہیں۔ وہ پیش نظر ہے۔

عن ابن عباس انہ قال سئل النبی عن المنی یصیب الثوب فقال انما ھو بمنزلۃ المصاق والمخاط وانما یکفیک ان تمسحہ بخرقۃ او باذخیرہ ولانہ مبتدء خلق البشر فصار کالطین۔	ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ حضرتؐ سے پوچھا میں نے کپڑے میں منی لگ جانے کے بارے میں۔ فرمایا وہ تو مثل بلغم کے ہے جو مُنہ سے یا ناک سے آتا ہے۔ اسی قدر کافی ہے۔ کہ کسی کپڑے یا تنکے سے پونچھ دے۔ اور نیز چونکہ اسی سے خلقت بشر کی ابتداء ہے۔ لہذا وہ بھی مثل مٹی کے ہوئی۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس کی روایت موجودگی میں۔ ایک محترمہ کی زبانی جو ایک شریف خاتون ہونے کے علاوہ حرم رسول اللہ صلعم ہونے کے اعزاز پر بھی ممتاز ہیں۔ ان ناقابل الذکر امور کے بیان کرانے میں ان علماء و محدثین کے کون سے راز پوشیدہ تھے۔ اور ان حضرات نے کونسی مصلحت اس میں دیکھی تھی ؎

سر ستان منطق الطیر است جامی لب بہ بند ؛ جز سلیمانی نشاید فہم ایں گفتار را

حضرت عبد اللہ ابن عباس شرف صحابیت کے اعتبار سے معتبر اور مستند صحابہ کبار میں داخل تھے اور علمیت و جامعیت کے لحاظ سے محیط العلم بین الصحابہ کے خاص القاب سے مشہور و معروف ہیں بنابریں ان کی مرویات ازواج مطہرات کے بیانات سے کم پایہ نہیں۔ اس بنا پر امام بخاری، شافعی، مالکؒ اور دیگر کو اپنے مختار کے ثبوت میں حضرت عبد اللہ ابن عباس کی روایت کی نقل کافی تھی مگر اُن کے بیجا اصرار نے الرجال قوامون علی النساء کے حکم محکم اور اصول مسلم کو پس پشت رکھ کر ازواج مطہرات کے اُن اقوال و طرز عمل سے استدلال کیا۔ جو کسی طریقہ اور قرینہ سے مخدرات رسالت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اُن کی نقل و بیان سے ان کی تعظیم و تکریم کی جگہ اُن خواتین محترمات کی توہین و تحقیر ثابت ہوتی ہے۔ جس سے مخالفین اسلام اور متعصبین غیر اقوام کو معاشرت رسولؐ پر سخت الزام و اتہام کا موقع ملتا ہے۔

ایسی حدیث چاہے تعداد میں کتنی ہی متعدد ہوں۔ کیسی ہی متواتر اور متوارد نہ ہوں۔ جب مخالف اخلاق الٰہی اور منافی شان رسالت پناہی ثابت ہونگی۔ ذکر و نقل کے قابل نہیں ہوسکتیں۔ ہاں ازواج مطہرات کے طبقہ میں۔ جن خواتین کے واقعات کا ذکر و حوالہ قرآن مجید سے ملتا ہے وہ البتہ مسلّم ہیں۔ یا اُن مخدرات کے حالات مرویات احادیث سے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو ازواج رسولؐ ہونے کی شان و منزلت سے۔ آداب و تہذیب سے۔ عادات و اطوار سے مخالف و منافی نہیں۔ یا جن کے اظہار و ارتکاب سے اقتدار رسالت کی توہین تضحیک نہیں ہوتی البتہ قابل تسلیم یقین کئے جاسکتے ہیں۔

لیکن حاشا و کلا۔ ایسے شرمناک واقعات جن کے نمونہ اوپر دکھلائے گئے۔ جو اپنی عملی صورتوں میں لفظاً اور حرفاً منافی شان رسالت اور مناقص عادات ازواج آنحضرت صلعم ثابت ہوتے ہیں۔ اور ایسے خفیف رکیک اور باعث تضحیک ہیں۔ کہ نعوذ باللہ ازواج مطہرات تو درکنار عام پاکدامن بیبیوں اور شریف گھر والیوں کی نسبت بھی ایسی خلاف فطرت نسوانی اور

ناقص تہذیب انسانی کا ذکر کرنا کوئی بھلا آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ تمام واقعات وحالات بالکل بے سروپا ہیں۔ اور محض کذب وافترا۔ زیادہ تر اُن سادہ لوح علما ومحدثین کی خوش فہمیوں کا نتیجہ ہیں۔ جو آنحضرت صلعم اور ازواج مطہرات کے فی مابین ان خوش فعلیوں کے نقل وبیان کو ادب واخلاق رسالت سمجھتے ہیں۔ اور ازواج مطہرات کے آداب ومعاشرت۔ ان علما رتے۔ ان حالات کے نقل وبیان میں تحصیل حقیقت کی جگہ تعمیل عقیدت کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور جن خود غرضانہ مدعا ومطالب اور عقیدت مندانہ اغراض ومقاصد سے یہ واقعات جمع کئے گئے ہیں اُن کے اسباب وعلل اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

افراد مخصوصہ میں خصائص النبیہ کی اصل حقیقت کو اُصول معمول کے طریق پر سمجھنا یا سمجھانا تعقّل انسانی کا قصور ہے۔ ان لغویات کی تدوین کرنیوالوں نے قدرت کے مکاشفات تخصیص کو معاملات تعمیم سمجھا۔ اور رسالت کے تعلق اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُم کی تعمیم پر ظاہری نظر ڈالی۔ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم اور مَا یَنْطِقُ اِلَّا مَا یُوْحیٰ کے مشارف تخصیصی کے صریح چشم پوشی کی۔ حالانکہ اُصول اصطفا کو مسلّمہ نبوت اور لازمۂ رسالت یقین کرتے ہوئے یہی علمار ومحدثین۔ انبیا ومرسلین کے ہر فرد واحد کو بالنفس النفیس سائر اُمت اور عوام الناس کے افراد سے تمام قوائے جسمانی اور کمال روحانی میں افضل واکمل ثابت کرتے ہیں۔ (دیکھو سراج القدس۔ منقذ من الضلال۔ اور احیار العلوم غزالیؒ)

پھر اسی ترتیب وتدریج سے اُن کے اعزہ واقارب۔ رفقا ومصاحب اور دیگر متعلقین ومتوسلین کے آداب وتہذیب اور اخلاق وعادات کو۔ انبیائے ومرسلین کی شرف قربت وصحبت کا نتیجہ مترتبہ بتلاکر۔ عام طبقات اُمت کے خصائل وشمائل سے بہتر اور بالاتر یقین کرتے ہیں۔ مگر بخلاف ان مسلّمات کے۔ مذکورہ بالا واقعات میں خاص رسولؐ صلعم کے متعلقین اور اُن کے ہمراز وہمنشین مخدرات کی نسبت۔ جو اشرف الخواتین ہونے کے علاوہ اُمہات المومنین کے لقب سے برابر یاد کی جاتی ہیں۔ ایسے مخالف عادات و آداب عوام۔ خصوصاً رسول اللہ صلعم کی موجودگی میں اور اُس کی آنکھوں کے سامنے بیان کیے جاتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر سوائے اس کے کہ اہل اسلام حیران اور انگشت بدندان ہو کر رہ جائیں۔ اور کیا کر سکتے ہیں۔

اس بنا پر ہر تحقیق کنندہ اور ان لغویات کی اصل حقیقت اور ضرورت موضوعیت کا جاننے والا صاف صاف کہدیگا۔ کہ یہ واقعات سراپا اتہام ہیں۔ یہ حالات بالکل جھوٹے الزام ہیں۔ رسولؐ کائنات کی عبائے رسالت اور اُن کی ازواج کی ردائے حیا وغیرت اِن تمام آلائشوں سے

جو منافی آداب و تہذیب رسالت اور مخالف فطرت پردگیان عصمت ثابت ہوتی ہوں۔ بالکل پاک و منزّہ تھی۔ اُن کی پاک و مقدس معاشرت اعلیٰ ترین شرفا کے گھروں کے محاسن معاشرت سے بھی بدرجہا بہتر اور اعلیٰ تر تھی۔

لیکن جیسا ہم اُوپر بتلا آئے ہیں۔ رسول بالنفس النفیس معصوم تھا۔ عام ازواج یا سارے اصحاب معصوم نہیں تھے۔ اور نہ رسول اللہ صلعم میں اُن کے معصوم کر دیے جانے کی قدرت ودیعت کی گئی تھی۔ اِس لیے اُن کی ازواج کے طبقہ میں اور اصحاب کے دائرے میں اُنکی دو ایک خواتین یا صحابی سے مخالف فطرت عامہ اور منافی آداب و تہذیب رسالت اُمور قابل اعتراض ظاہر ہوگئے۔ تو اُن سے نہ رسولؐ کی تعلیم و ہدایت پر کوئی الزام آسکتا ہے۔ اور نہ اس کی نفس نفیس پر کوئی اعتراض قایم کیا جاسکتا ہے۔

ایسے اعتراض کرنیوالوں کی خدمت میں ہم عرض کریں گے۔ کہ حقیقتاً ازواج مطہرات ہوں۔ یا اصحاب کبار۔ باستثنار اُن نفوس کے جن کا معصوم ہونا نصوص الٰہیہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ سب کے سب جائز الخطا ہیں۔ اور مصلحت خداوندی کے انتظام بھی ایسے ہی ہیں۔ کیونکہ یہی انتظام تو ہم کو خاص و عام کی تفریق و تمیز بتلاتے ہیں۔ اور معصوم و غیر معصوم کے عادات و آداب کا فرق ثابت کرتے ہیں۔ اور اس امر کا یقین دلاتے ہیں۔ کہ قطع نظر اس کے کہ کوئی شخص کسی شخص کا کتنا ہی قریب۔ ردیف۔ عزیز۔ ہمراز اور دمساز نہ ہو۔ مگر تا وقتیکہ وہ خلقت و فطرت کے اعتبار سے برابر اور مساوی نہ مخلوق کیے گئے ہوں۔ عادات و اطوار میں ایک نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح اِن واقعات میں ازواج آنحضرتؐ کی نسبت اُن مرویات کو جن کا ذکر حوالہ قرآن مجید میں موجود ہو۔ یا احادیث صحیحہ میں اُن کا ذکر و بیان اس انداز و طریقے سے آیا ہو۔ جو منافی شان رسالت اور مخالف آداب و عادات ازواج مطہرات نہ پایا جاتا ہو۔ تو البتہ صحیح کہا جاسکتا ہے۔ اور اُن کو ازواج مطہرات کی فطرت عامّہ کی لغزشوں کا باعث بتلایا جاسکتا ہے۔ جن کی طرف اُن کے ارتکاب کی نسبت کیجاتی ہے۔ انکے سوا جتنے قصص و حکایات بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ سب لغویات ہیں جنکی باعث وہی ضعف عقاید۔ خود غرضی اور نفسانیت کے مفاسد و مقاصد ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔

متعصب عیسائیوں کو اُنھیں خرافات سے متمتع ہونیکا پورا موقع ملگیا ہے۔ اور اُنہی خس و خاشاک کو اُن کی کور قلبی نے اسلام کے جواہر پارے سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ مبصرین حقیقت اور ناظرین اصلیت کی نگاہوں میں نہ اُن کا وزن ہے۔ نہ مقدار۔ نہ اُن کی قیمت ہے نہ شمار۔ ہم عیسائیت

کے کوتاہ بین متعصبین کو علیٰ رؤس الاشہاد باور کراتے ہیں۔ اور پورا یقین دلاتے ہیں۔ کہ اسلام اور اُس کے بانی علیہ السلام کا پاک وصاف دامن اِن تمام لغزشوں اور آلائشوں سے بالکل منزہ ہے۔ اُس کی خلوت وجلوت کی تمام صحبتیں ان مخالف آداب و اخلاق حالات و واقعات سے بالکل مبرا اور مُعرا تھیں۔ اُس کی مقدس معاشرت کے تمام تعلقات دُنیا اور اہل دُنیا کیلئے اسوۂ حسنہ کے اصلی اور سچے نمونے تھے۔ اور اُن سے اُنہی اُمور کے اظہار ہوتے تھے۔ جو وقار رسالت اور اقتدار نبوت کے حدود کے اندر تھے۔ اُس کی پاک و پاکیزہ زندگی میں تعلقات دُنیاوی اور معاملات خانہ داری اُتنی ہی ضرورت تھی۔ جتنی ایک عیالدار بزرگ کے لیئے جائز اور ضروری ہوتی ہے۔ اور وہ نفس قدسی برکت اُمور دُنیاوی اور ضرورت عیالداری میں اُتنا ہی منہمک رہتا تھا۔ جتنا اہلیت اور رہبانیت کے امتیاز فیمابین قایم کرنے کے لیئے ضروری تھا۔ اِس سے زائد جو کچھ اسلامی کتابوں میں مرویات ہیں۔ وہ سب علماء کی غلط فہمیوں کے اضافات سمجھے جائیں گے۔

ہمارے لیئے نہایت ضروری اور مناسب ہے۔ کہ اِن لغویات کے مقابل میں جو ازواج مطہرات کے متعلق غلط فہم علما کے حوالہ سے اوپر لکھے گئے۔ ہم اُنہی کی زبانی اور اُنہی ازواج مطہرات کی مرویات سے آنحضرت صلعم کے وہ احکام و ارشاد اور پند و نصائح جو ازواج مطہرات کو اُنکی سادی زندگی بسر کرنے۔ علائق دُنیاوی اور حُسن و زینت ظاہری سے باز رہنے کی نسبت پہونچائے گئے ہیں۔ ذیل میں لکھ دیں۔ جس سے ثابت ہو جائیگا۔ کہ اِن احکام و ارشاد کا جاری کرنیوالا اور تعلقات دُنیاوی سے ازحد متنفر ہو کر۔ بالکل الگ رہنے والا کبھی ان اُمور تعیش اور لہو و لعب کا عامل یا مجوز نہیں ہو سکتا۔ یہ محالات سے ہے۔ جو زہد و ورع اور تقویٰ و طہارت کی ہدایت کرتا ہو۔ وہ دوسرے وقت اپنے متعلقین کو کھیل کود۔ تماشہ اور دیگر اسباب تعیش و مسرت میں مصروف رہنے کی اجازت دیتا ہو۔ یا اُن کو ایسے مخرب اخلاق و آداب اُمور میں منہمک پا کر چشم پوشی فرماتا ہو۔ مواہب لدنیہ قسطلانی کے اسناد سے محدث شیرازی۔ روضۃ الاحباب میں لکھتے ہیں۔

عائشہ گفت یا پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گفتم دُعا کنی تا خداوند تعالےٰ مرا در بہشت از ازواج تو گرداند۔ فرمود اگر این مرتبہ میخواہی از برائے	حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ خداوند عالم مجھکو بہشت میں بھی آپ کی زوجہ قرار دے آپنے فرمایا۔ کہ

فرد ا ہیچ طعام را ذخیرہ مساز ہیچ جامہ را میندازتا براو وصلہ نزنی و باید کہ زاد تو از دنیا بمقدار زاد راہ بود۔

اگر تم چاہتی ہو۔ کہ اِس مرتبہ پر فائز ہو۔ تو آج سے کل کے لیے سامان قوت میں کچھ نہ بچاؤ۔ اور اپنے کسی کپڑے کو بغیر پیوند لگائے نہ چھوڑو۔ اور مال دُنیا سے زاد سفر سے زیادہ نہ لے جاؤ

ص ۸۱ ۵ لکھنؤ

اور صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی زبانی مرقوم ہے۔

ماکان لاحدنا الا ثوب واحد جزو اوّل صفحہ ۴۴ ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا رہتا تھا۔

ہم صرف اُنھیں دو مذکورہ بالا مثالوں کو لکھکر اتنا پوچھتے ہیں۔ کہ ایسی سادہ اور سخت ترین زہد و اتقا کے ساتھ معاشرت کی تعلیم دینے والے بزرگ کے حالات میں ان اقسام کے لہو و لعب اور تعیشات کو اُس کے طرزعمل اور مشاغل تبلانا کس قدر تعجب انگیز اور حیرت خیز ہے جس نفس قدسی نے اپنی ازواج مطہرات کو اِس صبر و قناعت سے زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہو۔ معمولی کھانا کھانے اور کپڑوں میں پیوند لگانے کی خاص تاکید فرمائی ہو۔ ممکن ہے۔ کہ وہ ان مخدرات کو ان لغویات میں کسی وقت اور کسی طریقہ سے منہمک رہنے کی اجازت دیسکتا ہو لیکن بعض اوقات ان ازواج مطہرات سے بمقتضائے بشریت پایا۔ بایمائے عام فطرت اگر چند اُمور زائد از ضرورت صادر بھی ہو گئے۔ تو اُن کی ذمہ داری اُنھیں کی خاص ذات تک محدود رہے گی۔ اُن کی وجہ سے رسول صلعم کی ذات وصفات پر نہ کوئی الزام آیا ہے۔ اور نہ آسکتا ہے۔

صفات رسالت کے اُسوۂ حسنہ صرف اہل بیت رسولؐ تھے۔

اب ضرورت کلام اور مناسبت اس انکشاف حقیقت کی متقاضی ہے کہ خاندان رسالت اور دودمان نبوّت کے اخلاق و عادات نورانی تہذیب و آداب روحانی اور حیا و عفت نسوانی کی سچی اور اصلی مثالیں۔ اُس نور چشم نبوّت۔ شمع فانوس حیا و عفت۔ بضعۃ خیر المرسلین۔ سیدۃ نساء العٰلمین۔ حورآء الانسیہ۔ صدیقۃ الکبریٰ بتول العذراء۔ حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علی ابیہا و علیہا کے اسوۂ حسنہ اور صفوۂ خُلقیہ سے ذیل میں لکھ کر تبلا دیا جاوے۔ کہ خدا اور رسولؐ نے جس مخدومۂ دو عالم اور سیدۂ نسوان کو ناموس رسولؐ اور اہلبیت پیغمبر صلعم کے حقیقی معنیوں میں قرار دیا ہے۔ اور جس کو مبدء فیض سے نساءنا کا مخصوص القاب اور یطہرکم تطہیرا کا خاص خطاب عنایت فرمایا گیا ہے۔ وہ اہل اسلام اور اہل ایمان کے طبقہ نسواں میں۔ سوائے اس دُرِّ یتیم پیغمبر صلعم کے کوئی دوسری خاتون۔ عام اِس

ہے کہ ازواج رسول صلعم ہو۔ یا امّ المومنین ثابت نہیں ہوتی۔ تمام افراد مومنات میں یہی ایک مخدومۂ کائنات ایسی ثابت ہوتی ہے۔ جس کی عصمت وطہارت نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اس معصومۂ مقدسہ اور اس مخدومۂ مطہرہ کے محاسن عادات البتہ ناموس الہٰی کے اخلاق وآداب کے نمونہ اور صفات رسالت پناہی کے اسوہ حسنہ تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہی حالات وواقعات دُنیا کی تعلیم معاشرت کے لیے رہنمائی کا پورا کام دے سکتے ہیں طبقہ نسواں میں جس عصمت وعفت۔ جس شرم وغیرت سے ارشاد الہٰی کا خاص مقصد ہے۔ وہ اس مخدومۂ عالم وعالمیان کے مفصلہ ذیل ارشادوا قوال اور حالات وواقعات سے کماحقہ ثابت ہے

(۱) ایک بار جناب سرورِ کائنات نے حضرت فاطمہؑ سے دریافت فرمایا۔ کہ عورت کی سب سے اچھی صفت کونسی ہے۔ سیدۂ نے جواب میں عرض کی۔ کہ عورت کی بہترین صفت یہ ہے۔ کہ نہ کسی نامحرم کو وہ دیکھے۔ اور نہ کوئی نامحرم اُسے دیکھنے پائے۔[1] سیرۃ فاطمہؑ

اسی کے متعلق آپ کا یہ ارشاد آج تک اسلام کی تمام مذہبی اور اخلاقی کتابوں میں مذکور ومسطور ہے

(۲) کوئی عورت بلا ضرورت دوسری عورت کو بھی ننگی نہ دیکھے۔ نہ کبھی دو عورتیں ننگے بدن ایک چادر میں لیٹیں[2]۔ اور اگر کوئی عورت اتفاقی ضرورت سے کسی دوسری عورت کو ننگے بدن دیکھ لے۔ تو اُس کے اعضا اُس کی بدن کی بناوٹ (ساخت) کی نسبت اپنے خاوند سے کچھ اظہار نہ کرے۔

اسی حیا کا تقاضہ تھا کہ آپ نے مرض الموت میں وصیت فرمائی تھی۔ کہ میرا جنازہ رات کو اُٹھایا جاوے۔ اور رات کے وقت بھی جنازہ پر پردہ (تابوت) بنالیا جاوے۔ اور سوائے اسماء بنت عمیس کے کوئی عورت میری میّت کو غسل نہ دے سیرۃ فاطمہؑ

یہ متبرک اقوال صاف صاف بتلا رہے ہیں۔ کہ ناموس الہٰی اور اہلبیت پیغمبرؐ کے اخلاق وآداب کی یہ شان ہوتی ہے۔ اور جس مخدومۂ دوراں پر حیا وعفت کا خاتمہ بتایا گیا ہے۔ اُس کی شرم وغیرت اور حیا وعصمت کی یہ تصویر ہے

---

[1] حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے اس ارشاد کو اس حدیث کے مضمون سے ملایا جاوے۔ جس میں آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ کو حبشیوں کا تماشا دکھلانا مندرج ہے۔ تو جانبین کے حیا وغیرت اور شرم وعفت کے فرق مابہ الامتیاز کماحقہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

[2] اس مضمون ارشاد کو صحیح مسلم کی اس عبارت روایت سے مقابلہ کیا جاوے۔ جس میں حضرت عائشہ اور آنحضرت صلعم کا ایک ظرف آب میں ایک ہی تہ بند کے ساتھ غسل فرمانا مرقوم ہے۔ تو حقیقت حال آسمان وزمین کا فرق بتلاوے گی۔

(۳) ایک بار عبد اللہ ابن ابی مکتوم نابینا صحابی۔ کسی ضرورت سے پیغمبر صاحب کو تلاش کر رہے تھے۔ رسول کریم۔ سیدہ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ وہ یہیں آ گئے۔ اور بی بی فاطمہؓ اُن کو دیکھ کر دوڑ کر کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کر واپس ہوئے۔ تو سیدہؓ باہر تشریف لائیں۔ جناب رسول مقبول صلعم نے ارشاد فرمایا۔ بیٹی اُم مکتوم تو نابینا ہیں۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔ آپ فرمانے لگیں۔ ابا جان وہ اندھے تھے۔ میں تو اندھی نہ تھی۔ کہ غیر محرم کو دیکھتی رہتی۔[ل] سیرۃ فاطمہؓ۔

آپ کی شرم و حیا کا ایک اور واقعہ مشکواۃ شریف سے نقل کیا جاتا ہے۔

(۴) ایک دفعہ حضرت نبی کریمؐ نے ایک نابالغ غلام کے ساتھ جو آپ نے اپنی نورِ چشم حضرت فاطمہؓ کو ہبہ فرما دیا تھا۔ تشریف لائے۔ حضرت فاطمہؓ ایسا چھوٹا کپڑا اوڑھے تھیں۔ کہ اُس سے سر ڈھانکتیں تو پیر ننگا ہو جاتا۔ اور اگر پیر چھپاتیں تو سر کھلا رہتا۔ ایک نہایت اضطراب کی حالت میں تھیں۔ اور اُس کپڑے سے سراپا کے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں۔ حضرت رسول خدا صلعم نے فرمایا۔ اے فاطمہؓ۔ کچھ حرج نہیں ہے۔ جس سے تم شرماتی ہو۔ وہ تو صرف تمہارا باپ اور تمہارا نابالغ غلام ہے۔ یہ حدیث ابو داؤد نے بھی روایت کی ہے۔ سیرت فاطمہؓ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔

معاشرت اور آدائے حقوق شوہر کی نسبت مفصلہ ذیل واقعات کی شہادت کافی ہے۔

(۵) جناب سیدہؓ کی وفات کے بعد حضرت علی مرتضےٰؑ سے دریافت فرمایا گیا۔ کہ حضرت فاطمہؓ کا سلوک آپ کیساتھ کیسا تھا۔ ایک آہ سرد بھری۔ اور فرمایا کہ وہ جنت کا ایک خوشبودار پھول تھیں۔ جس کے مرجھانے پر بھی اُن کی خوشبو سے اب تک میرا دماغ معطر رہتا ہے۔

(۶) حسن بصری۔ جناب علی مرتضےٰؑ سے نقل کرتے ہیں۔ کہ حالانکہ دن رات کثرت سے عبادت کرتی تھیں۔ اس پر بھی گھر کے کام دھندوں سے مجھے کبھی اُن سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

(۷) حضرت شیرِ خدا کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ اکثر مزدوری کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ ایکدن کہیں آپ کو مزدوری نہیں ملی۔ دونوں میاں بیوی آٹھ پہر سے بھوکے تھے۔ شام کے وقت ایک تاجر کے اونٹ آئے۔ جسے اپنا اسباب اُتروانے کی ضرورت سے ایک مزدور کی تلاش تھی۔ حضرت علیؑ نے پہر رات گئے تک اُس کے اونٹوں کا اسباب اوتارا۔ سوداگر نے ایک درم اُجرت دی۔ جسے آپ نے خوشی سے لے لیا۔ اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر ایک جگہ جو کا غلہ مل گیا۔ ایک درم کے جو خرید کر کے گھر لے آئے۔ حضرت بتولؑ نے ہنسی خوشی سے آپ کا

[ل] یہ واقعہ بھی واقعہ نمبر (۱) کے منافی ہے۔ یہاں ایک نابینا سے اتنی احتیاط کی گئی۔ وہاں مجمع مبصرین میں تماشے دیکھے گئے۔ المؤلف عفی عنہ

خیر مقدم کیا۔ اور آپ کی معمولی سے وہ جوئے کر اسی وقت اُن کو پیسا۔ روٹی پکائی اور آپ کے سامنے رکھی۔ جب حضرت علیؑ سیر ہو کر کھا چکے۔ تو خود کھانے لگیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔ کہ مجھکو اُسوقت حضرت سرور کائنات صلعم کا یہ ارشاد یاد آیا۔ کہ فاطمہؑ دنیا کی بہترین عورت ہے۔ جس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سیرت فاطمہؑ ص ۱۱۲۔

(۸) حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ کہ ایک بار جناب سیّدہؑ علیل ہوئیں۔ شب بھر بستر علالت پر بیچینی سے کاٹی۔ صبح ہوئی مجھ سے پہلے فاطمہؑ اُٹھیں۔ وضو کرنے لگیں۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا۔ کہ یہ اگر اسوقت وضو نہ کریں۔ اور صرف تیمم پر اکتفا کر لیتیں۔ تو اُن کے لیئے بہتر تھا۔ اس اثنا میں اذان کی آواز آئی۔ اور میں مسجد میں نماز کے لیئے چلا گیا۔ اور فاطمہؑ اُٹھ کر اپنے مصلّے پر نماز کے لیئے کھڑی ہو گئیں۔ میں جب مسجد سے گھر واپس آیا۔ تو سیدہؑ کو معمول روزانہ کے مطابق چکّی پیسنے میں مصروف پایا۔ مگر علالت کی وجہ سے ضعف و زحمت کا روز سے زیادہ اثر نمایاں تھا۔ یہ حالت دیکھکر میں نے سیّدہؑ سے کہا۔ کہ تم اپنی جان پر رحم کرو۔ تم علیل ہو۔ رات بھر بےچین رہ چکی ہو۔ صبح کو تم نے پانی سے وضو کر لیا۔ اور اپنی علالت کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ پھر چکّی بھی پیسنے لگیں۔ اس سے تو مرض میں اور ترقی وطوالت ہو گی۔ جناب سیدہؑ نے فرمایا۔ یہ تو میری عین خواہش دلی ہے۔ کہ میری موت خدا کی عبادت اور آپ کی اطاعت میں آجاوے۔

سبحان اللہ وبحمدہ۔ یہ ہیں وہ صفات وعادات۔ یہ ہیں وہ اخلاق و آداب جو مبدء فیض سے اُن ذوات مقدسات کو خاص طور پر عنایت فرمائے جاتے ہیں۔ جو طبقہ انسانی میں ذکور و اناث کی تفریق سے مستثنیٰ ہو کر معارف رُوحانی کے درجات عُلیہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اور دائرہ بشریت میں تمام جنسیت اور حیثیت کی تعمیم سے علیحدہ ہو کر مدارج تخصیص پر مشرف کیئے جاتے ہیں۔

اس بنا پر خاندان رسالت اور دودمان نبوت کے اخلاق۔ آداب اور حسن معاشرت کی حقیقت اور اصلیت اُن مقدس بزرگواروں کے حالات و واقعات میں تلاش کرنی چاہیئے۔ جو خُدا کی طرف سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوی القربیٰ اہل البیت۔ آپ کی عترت اور ذریت قرار پا چکے ہیں۔ اور جن کی تصریح آیات قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربےٰ اور ندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم میں بالتفصیل درج ہے۔ صاحبان تعمیم۔ بزرگواران تخصیص کے ساتھ اوصاف میں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ تعلقات نسبی کا مقابلہ واسطہ سببی کر سکتے ہیں ع رشتہ دیگر رگ جگر دگر است۔

عیسائی متعصبین یا اور اسلام کے مخالف فرقے۔ اسلام کی کتابوں میں ان موضوعات مذکورہ بالا کو جنہیں وہ اپنی تعریضات کا ماخذ اصلی سمجھے ہوئے ہیں۔ دیکھ کر نہ مغرور ہوں۔ اور نہ مسرور

ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ اگر وہ اپنے اُن مغویانہ اور گمراہانہ عالم فریبیوں پر اصرار کریں گے۔ اور آنحضرت صلعم کی پاک و مقدس سیرت اور معاشرت پر اُنھیں موضوعات مرویات کے اسناد سے الزام لگائیں گے۔ تو ہم اُن کے عہد نامہ قدیم و جدید کے مستند اور متواتر مثالوں سے انبیائے سابقین سلام اللہ علیہم اجمعین کی معاشرت کے حالات میں اس سے بھی زیادہ ناپاک اور قابل اعتراض واقعات ثابت کریں گے۔ اور دکھلائیں گے۔ کہ اُنھیں کی مقدس کتابوں سے اُنھیں کی مرویات کے مطابق اور اُنھیں کے عقائد کی ذمہ داریوں پر۔ انبیائے سابقین کی پاک معاشرت میں ایسے شرمناک اور ناپاک واقعات نکلتے گئے ہیں جن کی نقل و ذکر سے کبھی کوئی شخص یقین کیسا گمان بھی نہیں کرسکتا۔ کہ یہ واقعات اور حالات اُس مقدس اور مبارک طبقہ کے ہیں۔ جو خدا کی جانب سے تمام دُنیا کو تہذیب اور شائستگی۔ پرہیزگاری اور نیکوکاری اور تقویٰ و طہارت کی تعلیم و تلقین کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔

سب سے زیادہ تعجب انگیز تو یہ امر ہے۔ کہ متعصبین عیسائی جو دو چار اِدھر اُدھر کے غیر مقید اور غیر مستند واقعات کے حوالہ سے اپنے مغویانہ اعتراض وارد کرتے ہیں۔ وہ اوّل سے لے کر آخر تک اُن احادیث سے مستخرج اور مستنبط ہیں۔ جن کی موضوعیت اور مجہولیت کی اصلی کیفیت ہم اُوپر دکھلا آئے ہیں۔ اس لیے یہ بالکل صحیح اور فی الواقع ہے۔ کہ اُنکے ماخذ بھی بالکل حدیث ہی کی کتابیں ہیں۔ مگر حدیث کی تمام کتابیں یا اُن کی تمام روایتیں مسلمانوں کے لیے۔ نصوص الٰہیہ اور شہود الہامیہ کی طرح واجب التسلیم نہیں۔ عام اس سے کہ وہ صحاح کی مرویات ہوں۔ یا مسانید و سُنن کے اقتباسات۔ ان کی شہادت قرآن مجید کی عبارت کی ایسی ناقابل تصدیق ہوتی ہے۔ نہ لائق توثیق۔ بلکہ اصول عقائد کے اعتبار سے۔ جو اُمور ان کتابوں میں مخالف اور منافی نصوص قرآنیہ پائے جاتے ہیں۔ وہ کسی مرد مسلمان کے آگے قابل قبول و وثوق نہیں ہوتے۔ اسلام کا یہ ایسا مسلمہ ہے۔ جس پر اتفاق جمہور ہے۔

بخلاف مسلمانوں کے۔ عیسائیوں کی تو خاص کتب الہامیہ میں یہ تمام مزخرفات منقول و مذکور ہیں۔ جن کی صحت و صداقت سے کسی عیسائی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ مسلمانوں کی طرح یہ کسی عالم۔ محدث۔ اور فقیہہ کے اقوال نہیں بتلائے جاتے۔ بلکہ اُن کے عقائد میں تو یہ خاص الخاص وحی کے الفاظ اور کلام ہیں۔ جو بقول اُن کے خدا کی طرف سے۔ اُمت کی اطلاع و علم کے لیے انبیائے کرام کی سرگذشت۔ یا اُن کے قصص و حالات کی تفصیل و بیان میں نازل فرمائے گئے ہیں۔ اس

بنا بریں یہ بالکل صحیح اور فی الواقع ہے۔ کہ اہل اسلام عیسائیوں کی ان مغویانہ تعریضات کے جواب میں اور منافی قرآن۔ اور مخالف احادیث صحیحہ ہونے کا۔ پورا تشفی بخش اور اطمینان دہ جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور منافی قرآن اور مخالف شان رسول صلعم نہ ہم کتب صحاح کی احادیث کی تصدیق و توثیق کے لیے مجبور کیے گئے ہیں۔ اور نہ معاندین و دشمن کی مرویات کے ایجاب و تسلیم کے لیے معذور۔ بخلاف ہمارے۔ عیسائیوں کے لیے تو انکار کا کوئی موقع اور پہلو ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ذرا سے انکار کے بعد اُن کا ایمان ہی بیکار ہوا جاتا ہے۔

تمہیداً اتنا عرض کر کے۔ عہد قدیم (مجموعہ توریت) کی مختلف کتب انبیا علیہم السلام سے چند مثالیں نمونہ کے طور پر حسب ذیل پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے مگر ان کے نقل و بیان سے پہلے ہم کو اتنا کہکر تبلا دینا نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم بمصداق نقل کفر کفر نباشد۔ صرف ان لغویات و حشویات کی نقل ہی سے کام لیتے ہیں۔ ورنہ ان لغویات کو انبیائے موصوفین سلام اللہ علی نبینا و علیہم اجمعین کے متعلق نہ ہم صحیح اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اور نہ ہم ان مفتریات کو (نعوذ باللہ) الفاظ وحی یا کلام الہام جانتے ہیں۔ ہم کیا جمہور اسلام کے عقائد میں یہ سب علمائے یہود و نصاریٰ کے افترایات و اتہامات ہیں۔ جو اُن مقدس اور مطہر بزرگواروں کی ذات بابرکات پر لگائے گئے ہیں۔ کیونکہ صرف عہد نامہ قدیم کی تدوین۔ جو نزول توریت کے تین سو برس بعد واقع ہوئی۔ صاف صاف تبلا رہی ہے۔ کہ امتداد زمانہ۔ اختلاف بیانات۔ تصرفات رسم و رواج قومی و ملکی۔ اور دیگر اسباب خارجی نے خدا کے اس مجموعہ کلام کو کہاں تک وحی و الہام کے اصلی اور حقیقی مقام تک باقی چھوڑا ہے۔ یہ تو تحریفات و تدلیسات کتب قدیمہ کے ایسے ثبوت ہیں۔ جو بدیہیات و یقینیات کے درجہ تک پہونچے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ انقطاع۔ اختلاف اور ضعف سلسلہ اسناد وغیرہ کے بیشمار شہود و ثبوت تو ابھی باقی ہیں۔ جو کتب قدیمہ کو اُن کی موجودہ صورت میں کسی طرح صحیح و اصلی نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہم ان اُمور کو تنزیل قرآن مجید اور اُس کی صحت و صداقت کی بحث میں انشاء اللہ بالتفصیل بیان کریں گے۔

حضرت لوطؑ کی صاحبزادیوں پر (نعوذ باللہ) زناکاری کا الزام۔

نزول عذاب کے بعد۔ لوطؑ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ۔ شہر صغر میں آئے۔ اور ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا۔ کہ ہمارا باپ بوڑھا ہوگیا ہے۔ اور زمین پر کوئی مرد نہیں۔ جو عام جہان کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں۔ اور اُس سے (نعوذ باللہ) ہم بستر ہوں۔ تاکہ اپنے باپ کی نسل باقی رکھیں۔ سو اُنہوں نے اُس رات کو اپنے باپ کو

مے پلائی۔ اور بیلوٹھی اندر گئی۔ اور اپنے باپ سے (نعوذ باللہ) ہم بستر ہوئی۔ پر اُس نے (لوطؑ نے) لیٹتے وقت اور اُٹھتے وقت اُسے (لڑکی کو) نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا۔ کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ تو آج رات کو بھی اُسے مے پلائیں۔ اور تو بھی جا کر اُس سے ہم بستر ہو۔ کہ اپنے باپ کی نسل قایم رکھیں۔ سو اُس رات کو بھی اُنہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی۔ اور چھوٹی اُٹھ کر (نعوذ باللہ) ہم بستر ہوئی۔ اور اُس نے (لوطؑ نے) اُسے لیٹتے اور اُٹھتے وقت نہ پہچانا۔ سو لوطؑ کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے (نعوذ باللہ) حاملہ ہوئیں۔ بڑی ایک بیٹا جنی اور اُسکا نام موآب رکھا گیا۔ وہ موابیوں کا جو اب تک ہیں۔ باپ ہوا۔ اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی اور اُسکا نام بن عمی رکھا گیا۔ وہ بنی عمون کا جو اب تک ہیں۔ باپ ہوا (تکوین باب ۱۹ درس ۳۸-۳۰)

یہ ایک پیغمبر برحق ہے۔ اُس کی ازواج بھی نہیں۔ خاص بنات ہیں۔ اور ذریات اُنکے اخلاق و آداب ایسے ناپاک اُن کے اعمال و افعال ایسے تاریک و سیاہ کہ نہ باپ کو بیٹی کی تمیز ہے اور نہ بیٹی کو باپ کی پہچان۔ العیاذ باللہ اگر یہی انسانیت ہے۔ تو پھر حیوانیت کیا ہے؟ یہ وہی پاک و مقدس رسول ہے۔ جو خدا کی طرف سے بندگان الٰہی کو دینی تعلقات اور دنیاوی ضروریات میں تہذیب و شائستگی کی تعلیم و ہدایت فرمانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ اور جس کا فرض اوّلین ہے۔ کہ ان تمام طبقات میں حلال و حرام کے نصاب و امتیاز قایم کرکے دُنیا کو محرمات کے ارتکاب سے بچائے۔ اور محللات کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائے۔ چہ جائیکہ خود اُسکے ایسے گندہ اور ناپاک اطوار ثابت ہوں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

اگر عیسائیوں کا یہ عذر ہے۔ کہ حضرت لوط علی نبینا و علیہ السلام کے زمانہ تک دُنیا کی آبادی بہت کم تھی۔ اسلیئے انسانی معاشرت اور ملکی تمدن کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس بنا پر افراد نسل انسانی اور آبادی عالم کی ضروریات اس کی مجوز تھی۔ بالکل غلط اور خلاف واقع ہے ہبوط آدمؑ اور بنائے عالم کو دو ہزار برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ دُنیا میں معاشرت۔ تمدن اخلاق۔ تہذیب اور ہر قسم کے ابتدائی علوم و فنون جاری ہو چکے تھے۔ مختلف اقوام و قبائل اور متفرق فرقے اور طریقے قایم ہو چکے تھے۔ تمام اقطاع عالم میں انسانی آبادی قایم ہو چکی تھی۔ اور حضرت نوحؑ کی اولاد نے کرۂ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہیں چھوڑا تھا۔ جہاں سکونت نہ اختیار کی ہو۔ اس بنا پر قلت نسل آدمؑ اور ضرورت آبادی عالم کا عذر بدتر از گناہ ہے اگر زمانہ آدمؑ کے بھائی بہنوں کے ازدواج کی مثال پیش کی جائے گی۔ تو اوّل تو ہم

اُس کو بھی یہ صحیح نہیں کہیں گے۔ دوسرے اگر صحیح مان بھی لیں۔ تاہم وہ بھائی بہن کا واسطہ تھا۔ اور اُس زمانہ کی غایت اور لابدی ضرورت بھی تھی۔ جب حقیقتاً مردوں کے سوائے عورتوں کا۔ عورتوں کے لیے مردوں کا ملنا ناممکن تھا۔ مگر بخلاف اُس وقت کے اِس وقت تو باپ بیٹی کا علاقہ بتلایا جاتا ہے۔ جو بھائی بہن کے تعلقات سے کہیں زیادہ شرمناک ہے۔ اور پھر اُسوقت جب دُنیا میں اِس کثرت سے عورت مرد موجود ہیں۔ کہ بھائی کو بہن کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر باپ کو بیٹی کی کب حاجت ہوسکتی ہے۔

کوتہ بین عیسائی معترضین آنکھیں کھول کر اپنی کتاب مقدس میں ان ناپاک اور حد سے زیادہ شرمناک واقعات کو ملاحظہ کریں۔ اور خود تصفیہ کرلیں۔ کہ آیا اُن کے عقایدٔ میں ایک خدا کے بھیجے ہوئے خدا کے سچے رسول صلعم کے ایسے ہی اخلاق ہوتے ہیں۔ اور اُن کی اولاد و اعقاب کے ایسے ہی آداب؟

اب رہا مسلمانوں کے نزدیک جناب لوطؑ کی بھی تنزیہ و تقدیس ویسے ہی ثابت ہے۔ جیسے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی۔ اُن کے تمام طرز عمل ویسے ہی پاک وصاف اور اُن کی ذات ویسی ہی مقدس و مطہر ہے۔ جیسی ایک نبیؑ اور رسولؐ برحق کی ہونی چاہیئے۔ یہ تمام واقعات نہ ارشاد الہامی مانے جاسکتے ہیں۔ اور نہ الفاظ وحی تسلیم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تمام لغویات یہود و نصاریٰ مولفین و مدونین کتب قدیمہ کے مفتریات و موضوعات ہیں۔ جنہوں نے اپنے افعال رذیلہ اور مراسم ذمیمہ کی قداست جواز کی ضرورت سے ان کے ارتکاب کو انبیائے سابقین کے نفوس مطہرہ کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ اس سراپا لغو و افترا کی حقیقت اتنی ہی ہے۔ جتنی قرآن مجید میں قلم بند ہے۔ اور باقی تمام مفتریات ہیں۔ اور موضوعات۔ ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں نے جو ان لغویات کی صحیح تحقیق فرمائی ہے وہ عیسائی مترجمین توریت کی غلط فہمی کا پورا انکشاف کرتی ہے۔ ذیل میں اُن کی عبارت ملاحظہ ہو۔

حضرت لوطؑ اور اُن کی دونوں بیٹیوں کی نسبت جو اس مقام پر لکھا ہے۔ عیسائی اُن سب کو قبول کرتے ہیں۔ اور یقین کرتے ہیں۔ کہ حضرت لوطؑ نے اپنی صلبی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی۔ مگر ایسا یقین کرنا درحقیقت تضحیک کے قابل ہے۔ اگر ایسا ہوا۔ تو کیا یہ ایک مقدس شخص کی تہذیب اور متانت کے منافی نہیں ہے۔ اور کیا حضرت لوطؑ جیسے پاک شخص کے خلاف شان نہیں ہے۔ مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور قرآن مجید میں اگرچہ حضرت لوطؑ کا قصہ مذکور ہے۔ مگر اس میں یہ بات کہ اُنہوں نے اپنی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی۔

مذکور نہیں ہے۔ توریت مقدس میں جو کچھ بیان ہے۔ اُس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں۔ کہ جو معنی عیسائی مصنفین نے لیئے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہیں۔ آٹھویں درس میں حضرت لوطؑ کا یہ قول لکھا ہے۔ کہ مرا دو دختر است کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکہ ایشاں را بشما بیرون آرم و با ایشاں انچہ در نظر شما پسند آید بکنید۔
قرآن مجید میں اس جگہ تثنیہ کا لفظ (صیغہ) نہیں ہے۔ بلکہ جمع کا ہے جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے
هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ اور سورۂ حجر میں ہے قَالَ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ مسلمان عالموں کا قول مختار یہ ہے۔ کہ لفظ بنات سے حضرت لوطؑ کی صُلبی بیٹیاں مراد نہیں ہیں۔ بلکہ قوم کی عورتیں مراد ہیں۔ اور یہ بات حضرت لوطؑ نے اس مراد سے کہی تھی۔ جیسی کہ وہ ہمیشہ اُن کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ کہ تم اپنی خراب عادت۔ فعل خلاف فطرت انسانی چھوڑ دو۔ اور عورتوں سے نکاح کرو اور اُن کے ساتھ رہو۔ کہ وہ تمہارے لیئے پاکیزہ زندگی ہے۔ توریت مقدس میں اس مقام پر لفظ بنوث آیا ہے۔ جو بہ معنی بنت کے ہے۔ مگر جس طرح عربی زبان میں لفظ بنت کا استعمال سوائے اصلی بیٹیوں اور عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عبرانی زبان میں بھی عام عورتوں پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم اسمتھ صاحب کی عبرانی ڈکشنری میں لفظ بث اور بنوث کے متعلق لکھا ہے۔ کہ وہ عام عورتوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب ۳۱ درس ۱۹ میں استعمال ہوا ہے۔ پس اس مقام میں بھی اس لفظ سے اصلی بیٹیاں مراد نہیں ہیں۔ عام عورتیں مراد ہیں۔ بلکہ غالباً لونڈیاں۔ کیونکہ حضرت لوطؑ کی جو بیٹیاں تھیں۔ جیسا کہ سفر تکوین باب ۱۹ درس ۱۲ میں لکھا ہے۔ اُن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اور اُن کے شوہر موجود تھے۔ اور جب حضرت لوطؑ شہر سدوم سے فرار ہوئے تو اُن کے داماد اور اُن کی بیٹیاں اُن کے ساتھ نہیں گئیں۔ صرف حضرت لوطؑ کی بیوی اور وہی عورتیں جنکا ذکر اوپر ہوا۔ اور جن کو بیٹیاں کر کے تعبیر کیا ہے۔ اور جو غالباً لونڈیاں تھیں۔ ساتھ گئیں۔ رستے میں انکی بیوی زندہ نہ رہیں۔ صرف دو چھوکریاں اُن کے ساتھ تھیں۔ قرآن مجید میں اگرچہ اس مقاربت کا جو مغارۂ کوہ میں اُن دونوں چھوکریوں نے حضرت لوطؑ کے ساتھ کی۔ کچھ ذکر نہیں ہے۔ اگر اسکو صحیح بھی تسلیم کر لیا جاوے۔ تو بھی اُن دونوں چھوکریوں کا حضرت لوطؑ کی اصلی بیٹیاں ہونا اُن وجوہات سے جو ہم نے اُوپر بیان کیں۔ قابل یقین نہیں ہے۔ اور جب وہ لونڈیاں تھیں۔ تو اُن کے ساتھ مقاربت گو کہ وہ دھوکے ہی سے ہو۔ بموجب اُس زمانہ کی شریعت کے ناجائز نہ تھی۔ سفر تکوین باب ۱۹ درس ۳۲ و ۳۴ میں لکھا ہے۔ کہ ان دونوں چھوکریوں نے حضرت لوطؑ کو باپ کہکر تعبیر کیا ہے۔ اِس کہنے سے بھی اُن چھوکریوں کا اصلی بیٹیاں ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ باپ کا لفظ بہت زیادہ عام ہے۔ اور اُس کا اطلاق مالک و بزرگ شخص پر بھی ہو سکتا ہے۔

خطبات احمدیہ ص ۸ ۱۲ امطبوعہ لاہور۔

(۲) جناب داؤدؑ اور (نعوذ باللہ) زنائے محصن۔ سموئیل نبی کی کتاب میں حضرت داؤدؑ علی نبینا وعلیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:۔

ایک دن شام کو ایسا ہوا۔ کہ داؤدؑ اپنے بچھونے پر سے اٹھا۔ اور بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور وہاں سے اُس نے ایک عورت کو دیکھا۔ جو نہا رہی تھی۔ اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے اس عورت کا حال دریافت کرنے کو آدمی بھیجے۔ انہوں نے کہا۔ وہ الغام کی بیٹی بنت سبع حِتّی ہے۔ اور اوریا کی جورو نہیں۔ اور داؤدؑ نے آدمی بھیجکر اُس عورت کو بُلا لیا۔ چنانچہ وہ داؤد کے پاس آئی۔ اور وہ اُس سے ہم بستر ہوا۔

کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی۔ اور وہ اپنے گھر کو چلی گئی۔ اور وہ عورت حاملہ ہو گئی۔ سو اُسنے داؤدؑ کے پاس خبر بھیجی۔ کہ میں حاملہ ہوں۔ تب داؤد نے یوآب کو کہلا بھیجا۔ کہ اوریاہ اور حِتّی کو میرے پاس بھیجدے۔ سو یوآب نے اوریاہ کو داؤد کے پاس بھیجدیا۔ اور جب اوریاہ آیا۔ تو داؤدؑ نے اُس سے پوچھا کہ یوآب کیسا ہے۔ اور لوگوں کا حال کیا ہے۔ اور جنگ کے کام کیسے انجام ہوتے ہیں۔ پھر داؤدؑ نے اوریاہ کو کہا کہ اپنے گھر جا اور اپنے پاؤں دھو۔ اور اوریاہ جو بادشاہ کے محل سے نکلا۔ تو بادشاہ کی طرف سے اُس کے پیچھے پیچھے ایک خوان بھیجا گیا۔ اور اوریاہ بادشاہ کے گھر کے آستانہ پر اپنے خداوند کے سب خادموں کے ساتھ سو رہا۔ اور اپنے گھر نہ گیا۔ اور جب داؤدؑ نے اوریاہ کو کہا۔ کہ کیا تو سفر سے گھر نہیں آیا۔ پس تو اپنے گھر کیوں نہ گیا۔ تب اوریاہ نے داؤد سے کہا۔ کہ صندوق اور اسرائیل اور یہوداہ خیموں میں رہتے ہیں۔ اور میرا خداوند یوآب اور میرے خداوند کے خادم کھلے میدان میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس میں کیونکر اپنے گھر جاؤں۔ اور کھاؤں پیوں۔ اور اپنی جورو کے ساتھ سورہوں۔ تیری حیات اور تیری جان کی قسم کہ میں یہ کبھی نہ کرونگا۔ صبح کو داؤد نے یوآب کے لیئے ایک خط لکھا۔ اور اوریاہ کے ہاتھ میں دے کے اُسے بھیجا۔ اُس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو سخت لڑائی کے وقت اگاڑی کیجیو۔ اور اُس کے پاس سے پھر آئیو۔ کہ وہ مارا جاوے۔ اور جان بحق ہو۔ اور ایسا ہوا۔ یوآب جو اس شہر کے گردا گرد کی حالت دیکھنے گیا۔ تو اُس نے اوریاہ کو ایسے مقام پر جہاں اُس نے جانا کہ جنگی لوگ وہاں ہیں پہونچیں گے۔ مقرر کیا۔ اُس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے لڑے۔ اور وہاں داؤد کے خادموں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے۔ اور حِتّی، اور اوریاہ مارے گئے۔ اور اوریاہ کی جورو اپنے شوہر اوریاہ کا مرنا سُنکر سوگ میں بیٹھی۔ اور جب سوگ کے دن گذر گئے۔ تو داؤد نے اُسے اپنے گھر میں بلوالیا۔ اور وہ اُس

کی جورو بنی۔ اور اُس کے لیئے بیٹا جنی۔ پر وہ کام جو داؤد نے کیا تھا۔ خداوند کی نظر میں بُرا معلوم ہوا۔
سموئیل کی کتاب درس ۲۔ ۲۷ ص ۳۲۷ مطبوعہ لاہور۔
توریت مقدس کی مرقومہ بالا عبارت نے اس مقدس پیغمبر کی نسبت (نعوذ باللہ) بدکرداری بداخلاقی اور بدافعالی سب کچھ تو لکھ کر بتلا دیا کیا اُٹھا رکھا۔ معاذ اللہ زن محصنہ پر متصرف ہونا۔ اور اُس کے حاملہ ہوجانے کے بعد اُس کے اخفائے حمل اور اپنے اخفائے جرم کے لیئے اُسکے شوہر کو میدان جنگ سے۔ صرف اس غرض کے لیئے طلب کرلینا کہ وہ حمل اُس کے ساتھ متیقن ہوجائے۔ اور پھر شوہر (اوریاہ) کو مکرر گھر جانے اور سونے کی تاکید کرنا۔ بد قسمت اوریاہ کا اپنی عقیدت وخلوص کے اعتبار سے۔ داؤد کے آستانۂ نبوّت کی حاضری کو اہل وعیال کے ساتھ رہ کر آرام پانے اور عیش اُٹھانے پر ترجیح دینا۔ اس بنا پر گھر جاکر آرام کرنے سے انکار کرنا داؤد کا مجبور ہوکر اُس کو پھر معرکہ جنگ پر واپس دینا۔ اور اپنے افسر جنگ کو اُس کے قتل کردینے کے لیئے خاص شقۂ شاہی لکھنا۔ اور اُس عمل وترکیب سے اُس غریب اور اجل نصیب اوریاہ کی جان لینا۔ وہ ناپاک اور گندہ واقعات ہیں۔ جو عام انسانوں کے عادات واطوار کے مخالف ثابت ہورہے ہیں۔ چہ جائیکہ انبیائے کرام کے افعال وکردار ثابت ہوں۔ کبھی ممکن ہے۔ کہ خدا پرستی کی تعلیم دینے والا ہوا پرستی کی ناپاکیوں میں مبتلا ہو۔ یہ تمام مفتریات ہیں۔ اور بالکل لغویات قرآن مجید ان عزخرافات کا نہ ذکر کرتا ہے۔ اور نہ اُس کی تصدیق۔ حقیقت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ اوریاہ کے مرجانے کے بعد اُس کی بیوہ سے بعد انقضائے ایام عدت۔ حکم شریعت کے مطابق نکاح کرلیا گیا۔ اور اُس کو مُشکوئے نبوّت میں داخل ہونے کا اعزاز خاص بخشا گیا۔

(۲۳) داؤدؑ کے صاحبزادے اُمنیوں اور بہن سے زنا بالجبر۔

اُسی کتاب سموئیل ہی میں۔ حضرت داؤد کے صاحبزادے اُمنیوں کے یہ حرکات لکھتے ہیں۔

داؤد کے بیٹے ابی سلوم کی ایک خوبصورت بہن تھی۔ جسکا نام تمر تھا۔ اُس پر داؤد کا بیٹا امنیوں عاشق ہوا۔ امنیوں کی ایسا بے چین ہوا۔ کہ اپنی بہن تمر کے لیئے بیمار پڑا۔ کیونکہ وہ کنواری تھی۔ سو امنیوں نے اُس سے کچھ کرنا اپنے لیئے دشوار جانا۔ اور داؤد کا بھائی سمعہ کا بیٹا یوندب امنیوں کا دوست تھا۔ یہ یوندب بڑا عاقل شخص تھا سو اُس نے کہا۔ کہ تو بادشاہ کا بیٹا ہوکے۔ کیوں دن بدن دُبلا ہوتا جاتا ہے۔ تب امنیوں نے اُس سے کہا۔ کہ میں اپنے بھائی ابوسلوم کی بہن تمر پر عاشق ہوں۔ سو یوندب نے اُس سے کہا۔ کہ تو بستر پر پڑا رہ۔ اور اپنے تئیں بیمار بنا۔ اور جب تیرا باپ تجھے دیکھنے آئے۔ تو تو اُس سے کہیو۔ میری بہن تمر کو پروانگی دیجیئے۔ کہ

آئے۔ اور مجھے کھلائے۔ اور میرے سامنے کھانا پکائے۔ تاکہ میں دیکھوں۔ اور اُس کے ہاتھ سے کھاؤں تب اُمیوں۔ پڑا رہا۔ اور اپنے تئیں بیمار بنایا۔ اور جب بادشاہ اُسے دیکھنے آیا۔ تو امنیون نے بادشاہ سے کہا۔ کہ میری بہن تمر کو آنے دیجئے۔ کہ وہ میرے سامنے دو ایک پھُلکے پکائے۔ تاکہ میں اُس کے ہاتھ سے کھاؤں۔ سو داؤد نے تمر کے گھر کہلا بھیجا۔ کہ تو ابھی اپنے بھائی اُمیوں کے گھر جا۔ اور اُس کے لیے کھانا پکا سو تمر اپنے بھائی اُمیوں کے گھر گئی۔ اور وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اُس نے آٹا لیا۔ گوندھا۔ اور اُس کے سامنے پھُلکے پکائے۔ اور اُن کو لے ایک قاب میں دھرا۔ اور اُس کے سامنے رکھدیا۔ پر اُس نے کھانے سے انکار کیا۔ تب امنیون نے کہا۔ سب مرد میرے پاس سے باہر نکل جاویں۔ سو ہر ایک شخص اُس کے پاس سے اُٹھ گیا۔ تب امیون نے تمر کو کہا۔ کہ کھانا کوٹھڑی کے اندر لاؤ۔ کہ میں تیرے ہاتھ سے کھاؤں گا۔ تب تمر نے وہ پھُلکے جو اپنے ہاتھ سے پکائے تھے۔ لیے اور کوٹھڑی میں اپنے بھائی اُمنیاں کے پاس آئی۔ اور جب وہ کھانا اُس کے سامنے لائی۔ کہ اُسے کھلائے۔ تو اُس نے اُسے پکڑا۔ اور اُس سے کہا۔ کہ اے میری بُوا آ مجھ سے ہم بستر ہو۔ وہ بولی۔ نہیں بھیّا مجھے رُسوا نہ کر۔ کہ اسرائیل میں ایسا کام کرنا اچھا نہیں ہے۔ سو تو ایسی احمق مت کر۔ اور میں کیا کروں گی۔ کہ میری رسوائی دفع ہو۔ اور تو اسرائیل کے احمقوں میں سے ایک کے مانند ہو گا۔ پس آپ بادشاہ سے کہیئے کہ۔ وہ مجھے تم سے منع نہ کریگا لیکن اُس نے اُسکی بات نہ مانی۔ کہ وہ اُس سے زور آور تھا۔ سو اُس سے زبردستی کی۔ اور اُس سے

ہمبستر ہوا۔ سموئیل ہی کی کتاب نمبر (۲) باب ۱۳ درس ۱-۱۸ ص ۳۲۸ مطبوعہ لاہور۔

آل داؤد کے متعلق یہ ایک طول وطویل داستان ہے۔ جو حقیقتاً باعتبار اخلاق وتہذیب کے نہ قابل ذکر ہے۔ نہ لائق بیان۔ نعوذ باللہ۔ پیغمبر کے ناقابل ذکر کردار تو خیر ایک شخص کی عورت کی خرابی تک محدود رہ کر ختم ہوگئے۔ مگر پیغمبر زادے کے حرکات نے تو ماں بہن کی تمیز بھی باقی نہ رکھی۔ اسی سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ منصب نبوّت کیا۔ اور درجہ رسالت کہاں۔ یہ حضرات تو عام اخلاق وتہذیب انسانی کی معمولی منزلت پر بھی فائز نہیں تھے۔ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ۔ مسلمانوں کے عقائد میں یہ سب یہود ونصاریٰ کے افترایات وموضوعات ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔

(لم) حضرت سلیمانؑ کا اظہار تعشق۔ حضرت داؤد کے بعد۔ جناب سلیمانؑ کے متعلق مفصلہ ذیل لغویات کی نسبت کی جاتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی غزل الغزلات میں ہے۔ اپنی زوجہ کی تعریف حسن۔ اور اُس کے ساتھ اظہار شوق میں فرمایا جاتا ہے۔

اے میری جانی تو شکیل۔ دیکھ تو خوبصورت ہے۔ تیرے رُخسار تیری چادر کے پیچھے آدھے انار کے مانند ہیں۔ تیری چھاتیاں آہو کے دو بچوں کے مانند ہیں۔ جو ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ اے میری بُوا میری زوجہ تو نے میرا دل غارت کیا۔ اے میری بہن۔ میری زوجہ۔ تیرا عشق کیا خوب ہے۔ تیری محبت مے سے کتنی زیادہ لذیذ ہے۔ اے میری زوجہ۔ شہد و شیر تیری زبان کے تلے ہیں۔ اے میری بُوا۔ اے میری زوجہ۔ تو ایک مقفل باغیچہ اور بند کیا ہوا ایک پانی کا سوتا ہے۔

(ب) اے مری جانی۔ تو ترصہ کے مانند خوبصورت ہے .... میرے ساتھ بیگمیں اور انگنی حرمیں (لونڈیاں) اور بے شمار کنواریاں ہیں۔ پر میری پاک و پاکیزہ کبوتری بے نظیر ہے۔

(ت) معشوق کا سراپا بیان ہوتا ہے۔

اے میری شاہزادی۔ تیرے گرگابیاں پہنے ہوئے پاؤں کیا خوب معلوم ہوتے ہیں۔ تیرے کولھوں کی گلائی جواہر کی لڑی کے مانند ہے۔ تیری ناف گول پیالہ ہے۔ تیرا پیٹ گیہوں کی ڈھیری کے مانند ہے تیری دونوں چھاتیاں دو آہو برّوں کے مانند ہیں۔ تیری گردن ہاتھی دانت کا برج ہے۔ تیری ناک لبنان کی بُرج کی مثال ہے۔ اے محبوبہ تو کیسی جمیلہ ہے۔ عیش کے لیے تو کیسی جانفزا ہے۔ تیری قامت تاڑ کی مثال ہے۔ تیری چھاتیاں انگوروں کے گچھوں کے مانند ہیں۔ میں نے کہا۔ کہ میں اُس تاڑ پر چڑھونگا اور اُس کی شاخوں کو تھام رکھونگا۔ فی الحال تیری دونوں چھاتیاں انگور کے گچھوں کے مانند ہوں۔ اور تیرے نتھنوں کا رائحہ سیب کے ایسا ہو۔ اور تیرا تالو اُس مے کے مانند ہو۔ جو بہتر سے بہتر ہو۔

غزل الغزلات سلیمانؑ باب ۵ درس ۵۔ ۹ باب ۷۔ درس ۱۔ ۹۔

نعوذ باللہ من ذالک۔ ایک مقدس پیغمبرؑ کی زبان سے ایسے نفرت انگیز کلام۔ جس کے لفظ لفظ سے دُنیاوی تعیش اور شہوت پرستی کی خبیث عادتوں کی محویت اور انہماک ثابت ہوتا ہے۔ خدا کا جاننے والا اور رسولؐ کا پہچاننے والا شخص کبھی کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے رہبر اور ہادی عالم کا ارشاد ہے۔ یا کسی متوالے کی بڑ۔

(۵) خدا کی مدخولہ عورتیں اور اُن کی زناکاریاں۔

حزقیل نبی کی کتاب باب ۲۳ میں یہ ناشنوا داستان مذکور ہے نقل کفر کفر نباشد۔ جناب حزقیل فرماتے ہیں۔

خداوند کا کلام مجھے پہونچا۔ اُس نے کہا۔ کہ اے آدم زاد۔ دو عورتیں تھیں جو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے مصر میں زناکاری کی۔ وہ اپنی جوانی میں یار باز ہوئیں۔ وہاں اُن کی چھاتیاں ملی گئیں۔ اور وہاں اُنکے بکر کے پستان چھوئے گئے۔ اِن میں بڑی کا نام اہولہ اور اُس کی بہن کا نام

اہولیبہ تھا۔ اور وہ میری جورواں ہوئیں۔ (نعوذ باللہ) اور بیٹے بیٹیاں جنیں۔ اُن کے نام اہولہ سمرون اور اہولیبہ یروشلم ہوئے۔ اہولہ جن دنوں میری تھی۔ چھنالا کرنے لگی۔ اور اپنے یاروں پر یعنی اسوریوں پر جو ہمسایہ تھے۔ عاشق ہوگئی۔ کہ وہ سردار لشکر اور حاکمان ملک تھے۔ اور سب کے سب دل پسند۔ اور جواں مرد سوار تھے۔ جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور ارغوانی پوشاک پہنے ہوئے تھے۔ اس طرح اُس نے اُن سب کے ساتھ۔ جو اسور کے برگزیدہ مرد تھے۔ چھنالا کیا۔ اور وہ اُن سب کے ساتھ جن سے وہ عشق بازی کرتی تھی۔ اور اُن کے سارے بتوں سے ناپاک ہوئی۔ اُس نے پر اُس زناکاری کو جو اُس نے مصر میں کی تھی۔ نہ چھوڑا۔ کیونکہ اُنہوں نے اُس کی جوانی میں اُس کے ساتھ خلوت کی تھی۔ اُنہوں نے اُس کے بکر کے پستانوں کو ملا تھا۔ اور اپنی زنا اُس پر اُونڈیلی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کو اُس کے یاروں کے ہاتھ میں۔ ہاں اسوریوں کے ہاتھ میں۔ جن پر وہ مرتی تھی۔ کر دیا۔ اُنہوں نے اُس کو بے ستر کیا۔ اُس کے بیٹے اور بیٹیوں کو چھین لیا۔ اور اُسے تلوار سے مار ڈالا۔ سو وہ عورتوں کے درمیان رسوا ہوئی۔ کیونکہ اُنہوں نے اُسے عدالت سے سزا دی۔

اُس کی بہن اہولیبہ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پر وہ شہوت پرستی میں اُس سے بدتر ہوئی۔ اور اُس نے اپنی بہن کی زناکاری سے زیادہ زناکاری کی۔ وہ بنی اسور یعنی اُن سردار لشکروں اور حاکموں پر جو اُن کے ہمسایہ تھے۔ جو بھڑکیلی پوشاک پہنتے تھے۔ اور گھوڑوں پر چڑھتے تھے۔ اور سب کے سب دل پسند جواں مرد تھے عاشق ہوئی۔ اور میں نے دیکھا۔ کہ وہ بھی ناپاک ہوئی۔ اُن دونوں کی ایک ہی رسم ورہ تھی۔ بلکہ اُس نے زناکاری زیادہ کی۔ .... بابل کے بیٹے اُس پاس آکے عشق کے بستر پر چڑھے اور اُنہوں نے اُس سے زنا کر کے اُسے آلودہ کیا۔ اور جب وہ اُن سے ناپاک ہوئی۔ تو اُس کا جی اُن سے پھر گیا۔ تب اُس کی زناکاری علانیہ ہوئی۔ اور اُس کی برہنگی بے ستر ہوئی۔ تب جیسا میرا جی اُسکی بہن سے ہٹ گیا تھا۔ ویسا ہی میرا دل اُس سے بھی ہٹ گیا۔ تب بھی اُس نے اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کر کے۔ جب وہ مصر میں چھنالا کرتی تھی۔ زناکاری پر زناکاری کی۔ سو وہ پھر اپنے یاروں پر مرنے لگی۔ جن کا بدن گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا

باب ۲۳ درس ۱-۲۰۔

کیا ایسے فحش اور ناپاک مضامین کی نسبت بھی کسی تصریح و تشریح کی کوئی ضرورت باقی ہے۔ مجھکو ان فضیحت خیز اسناد کی نقل سے خود غیرت آتی ہے۔ اور مجھ کو خود اِس کا اقرار ہے۔ کہ میں نے اپنے تبصرہ کے خاتمہ کو تہذیب قلمی اور آداب تحریری سے نہایت فروتر کر دیا ہے۔ لیکن المامور معذور۔ اُوپر عرض کر چکا ہوں۔ کہ استدلال کی ضرورت اور صورت

حال کی بنا سبب نے مجھ کو قطعاً مجبور کر دیا ہے۔ ورنہ کہاں میرا تبصرہ۔ اور کہاں دُنیا کا مضحکہ۔

کیا کوئی شخص سر میں دماغ اور دماغ میں فہم سلیم اور عقل مستقیم رکھ کر ان فواحشات کو الہامات سمجھ سکتا ہے۔ یا کبھی دھوکے سے بھی کسی نبی مرسل کے بیانات تسلیم کر سکتا ہے۔ عیسائی ان معتقدانہ مکاشفات اور محققانہ تحقیقات کے جواب میں ان شرح و بیانات کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ یہ واقعات نہیں ہیں۔ بلکہ قوم بنی اسرائیل اور ساکنین بیت المقدس کی بداعمالیوں کی مختلف صورتیں۔ تلمیحات خطابیہ کے پیرایہ میں بغرض عبرت پذیری دکھلائی گئی ہیں۔

ہم اس کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیتے ہیں۔ لیکن عرض کرتے ہیں۔ کہ کیا جناب باری عز اسمہ یا اس کے فرستادہ برحق حضرت حزقیل کو ہدایت قوم کے لیے خدمات تبلیغ کی ادا کاری کے موقع پر تمثیل و تلمیح کی صورت سے کوئی اور صورت و عنوان بیان نہیں ملتا تھا۔ جو ایسے ناپاک اور نفرت انگیز فحش الفاظ میں اس کی حقیقت تمثیلی اور عبارت تفصیلی قائم کی گئی۔ اگر ان دونوں فاحشہ عورتوں کی تمام داستان عنوان تمثیلی کا حکم رکھتی ہے۔ تو نعوذ باللہ۔ جناب لوط۔ حضرت داؤد۔ اور اُن کے صاحبزادے عمون کی بدکرداریوں کے متعلق۔ جو اُوپر مذکور ہو چکی ہیں۔ کیا جواب پیش کیا جاتا ہے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم لا تعلمون۔

عیسائی معترضین سے استفسار ہے۔ کہ جب آپ کی کتب مقدسہ سے انبیائے کرام کے اخلاق اُن کی تہذیب کے آداب اور اُن کی معاشرت کے حالات سے ایسے نفرت انگیز اور ناپاک عادات و اطوار ثابت ہوتے ہیں۔ تو آپ اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ السلام کی ایسی مقدس اور پاک و پاکیزہ معاشرت۔ اخلاق و آداب پر۔ اِدھر اُدھر کے محض موضوعات اور غیر معتبر و غیر مستند مرویات پر منہ آنے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ جن کی حقیقت اور اصلیت اوپر بالتفصیل و تحقیق ثابت کر دی گئی ہے۔

عیسائیوں کی آثار اسلامی سے بالکل ناواقف کاری۔ حقیقتاً عیسائی مؤلفین یا کسی مخالف فرقہ کے مصنفین سے حقیقت نویسی کی اُمید ایک خیال موہوم ہے۔ اوّل تو اُن کے لیے مخالفت آغاز ہی سے سر راہ ہوتی ہے۔ دوم اُن کی عدم واقفیت اور کمی اطلاع بھی اکثر اُن کو حقیقت سے دُور ڈال دیتی ہے۔ گاڈفری ہگنس (God Frey Hings) مارگیولوس (Margoliouth) کارلائل (Caralayal) اور گبن (Gibbon.) وغیرہم یورپ کے مشہور و

معروف فاضل اور محقق کامل ہیں۔ مگر اُن کی تصانیف و تالیف بھی ان فروگذاشتوں سے خالی نہیں۔ گاڈفری ہینگس نے اپنی دانست میں اپالوجی لکھی ہے۔ جو ۱۸۲۹ء میں چھپ کر لندن سے شایع ہوئی ہے۔ اُس کتاب میں گویا اسلام کے متعلق تمام اعتراضات کی معقول معذرت دکھلائی ہے۔ مگر حقیقت میں آپ حضرات خوب جانتے ہیں۔ کہ وہ ایک طرف تو اسلام کی جانب سے معذرت کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف سے اسلام پر خود حملے کرتے ہیں یہی حالت مارگیولوس کی ہے۔ پڑھنے کو تو یہ انگریزی فاضل۔ مسند امام احمد ابن حنبل کی چھ ضخیم جلدیں پڑھ گیا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا ۵

علوم شد کہ ہیچ معلوم نشد۔ جب اپنی کتاب لکھنے بیٹھے۔ تو اُس میں اسلام کی بدخواہی۔ بدنمائی۔ اور رسوائی کا کوئی پہلو اُٹھا نہ رکھا۔

یہ تو مخالفت۔ تعصّب اور خاص نفسانیت کی وجہ سے عیسائی مصنفین کو اسلامی تصانیف کے وقت دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے بعد حقیقت اور اصلیت سے ناواقفیت ایک دوسری آفت ہے۔ جو اُن کے سر آتی ہے۔ یورپ کے موجودہ تحقیقات کے کمال اور ترقی اور اُن کے علم و فضل کی روشنی کو کون نہیں جانتا خاص اسلام کے متعلق اُن کی ایک سے لیکر ہزار تک تصنیفات و تالیفات تیار ہیں۔ مگر ایک حقیقت کا ماہر۔ اُن کے ان لاتعداد دفاتر اور بے شمار ذخائر کو بھی اسلام کی معرفت اور اُس کی نفس حقیقت معلوم کرنے کے لئے کبھی کامل نہیں کہہ سکتا۔

عیسائی مصنفین کی ناواقفیت اور کم علمی۔ اسلام کے اہم مسائل پر۔ اپنی تحقیق کی کہاں تک روشنی ڈالے گی۔ تحقیق سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ اسلام کے محض معمولی اور عام اُمور سے بھی واقف نہیں ہیں۔ مثال کے لیے ہم مسٹر سیل (Mr Sale.) کے ترجمہ قرآن کے مقدمہ کی مفصلہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں۔

اگرچہ علمائے یورپ کا یہ خیال۔ کہ جناب رسول محمد صلعم مکہ میں۔ مدفون ہوئے ہیں۔ سترد ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اکثر مصنفین اپنی ناواقف کاری یا غفلت شعاری کے باعث سے۔ جس میں صحیح حکم نہیں لگا سکتا۔ اِس غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ میں اس مقام پر صرف دو مصنفین کی نظیریں پیش کروں گا پہلے تو ڈاکٹر اسمتھ صاحب (Doctor Smith) ہیں۔ جو ایک زمانہ تک خود ترکی میں رہ چکے ہیں۔ اس لیے اُن سے ایسی فروگذاشت ناقابل معافی ہو سکتی ہے۔ نہ لائق واگذاشت۔" یہ فاضل

اپنی کتاب کے تین متواتر مقامات پر لکھتا ہے۔ کہ مسلمان مکہ میں اپنے پیغمبرؐ کی زیارت کو جاتے ہیں۔ پھر اپنی کتاب میں دوسرے مقامات پر لکھتے ہیں۔ کہ پیغمبر اسلام مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی کتاب ایپیسل (Epicile) جلد اول ص ۲۲ وجلد دوم ص ۱۲ و ۴ و ۶ مطبوعہ لندن۔

ان سے بڑھ کر۔ سرجی۔ مینڈیول (Sir J. Manderolie) کے سفرنامہ کے مدیر صاحب ہیں۔ جنہوں نے اصل کتاب کے اس صحیح مضمون کو کہ پیغمبر اسلام کی قبر مدینہ میں ہے (اصل کتاب ص۔ ۵) غلط جان کر۔ مابین صفحہ خطوط ہلالی کے اندر مکہ بنا دیا ہے۔

انھیں کے ایسے اباٹ۔ دی ورٹاٹ (Abbot devertott) صاحب کی حرکات ہیں۔ مقدمہ ترجمۃ القرآن۔ مسٹر سیل صفحہ ۸ مطبوعہ لندن

ہماری کتاب اسوۃ الرسولؐ۔ ہم اپنے تبصرہ کے موجودہ مضامین ومباحث کو اس مقام پر بالتمام ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ مرقومۂ بالا تبصرہ میں معمول سے زیادہ طول ہو گیا ہے۔ لیکن ہماری ضرورت ہماری مجبوری افادۂ عام کی بنا پر اسی کی متقاضی تھی کہ سیرت النبیؐ کے ابہامات۔ ضعافات۔ احذافات۔ اسقاط۔ اور استخفاف واقعات کے کامل مکاشفات کر دیے جائیں۔ اور شبلی صاحب کے اُن اُصول اور موضوع تالیف کی حقیقت اور اصلیت بتلا دی جاوے۔ جن کو سیرت نگاری اور تاریخ نویسی سے کوئی مناسبت نہیں۔ وہ تو شبلی صاحب کے خاص معتقدات ہیں۔ جو نہ جمہور کے متفقات کہے جا سکتے ہیں۔ اور نہ مسلمات۔

نیز شبلی صاحب کے اُصول تعمیم کا طریقہ ظاہر کر دینا ضروری تھا۔ جو حقیقتاً اُن کے اُصول عقائد کا ایک خاص ضمیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اس اُصول کو شبلی صاحب نے جس حفظ ماتقدم اور حزم واحتیاط سے اپنی تالیف میں از اول تا آخر۔ مدنظر رکھ کر تمام واقعات کو اسی کے مطابق قلم بند فرمایا ہے۔ اُس کی حقیقت اور ماہیت ہر موقع اور ہر مقام پر کھول دی گئی ہے۔ اور اصلیت دکھلا دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کی عالم فریب انشا پردازی کی اصلی اور بے وجودی بھی ثابت کر دی گئی ہے۔ جو اپنے اپنے خاص موقع پر مذکور ہیں۔

تبصرہ میں ہر مبہم واقعہ کی صحیح تنقیح۔ ہر غلط واقعہ کی کامل تنقید وتحقیق۔ اور ہر مشکوک قصہ کی تصحیح وترمیم بطور تمثیل قلم بند کر دی گئی ہے۔ اور تفصیل اصل کتاب میں اپنے مقام پر مندرج ہے تبصرہ میں زیادہ تر اُن واقعات کی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ جن کو شبلی صاحب نے

کسی مصلحت سے مرفوع القلم فرما دیا تھا۔ یا گھٹا بڑھا دیا تھا۔ یا تاریخ و سیرت کی ہیئت و صورت سے نکال کر عقاید کے قالب میں اُتارا تھا۔ اور اس حیلۂ قلمی سے اپنے مسلمات عقاید کو تاریخ و سیر کے واقعات و مشاہدات بتلا کر عوام سے تسلیم کرانا چاہا تھا۔

اس میں کوئی عذر نہیں ہے۔ کہ ہم کو اُن کے عقاید کی تنقید کی نہ کوئی ضرورت لاحق تھی۔ اور نہ اُن کی تردید کا کوئی حق حاصل تھا۔ اس لیے میری تنقید بیکار سمجھی جائے گی۔ لیکن اتنی عرض ضروری ہے۔ کہ عقاید اسلام کے متعلق۔ وہ واقعات مندرج سیرۃ النبی صلعم۔ جو منافی شانِ رسالت ظاہر ہوتے ہیں۔ یا وہ مرویات جو مخالف قرآن اور معارض احادیث متفق علیہ ثابت ہوتے ہیں۔ اُن کو بغیر تنقید کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

جس طرح ہر ایسے واقعہ کے متعلق تنقید و تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اُسی طرح شبلی صاحب کی عبارت و مضمون میں جن جن مقامات پر۔ ضرورت خاص سے تلمیحات اور استعارات صرف استخفاف واقعات کے لیے۔ کام میں لائے گئے ہیں۔ یا انشاپردازی اور عبارت آرائی کی قلمکاریوں سے۔ سطحی الذہن اور محدود الاطلاع افراد قوم و ملت کو صرف مرعوب کر دینے کے لیے۔ کہیں منطق کے اسباب و علل۔ معانی و مطول۔ کہیں فلسفہ اور کلام کے رموز و غوامض۔ دلائل و مباحث پیش کر دیے گئے ہیں۔ اُن کی اصلی تصریح و تشریح بھی کر دی گئی ہے۔

عبارت کتاب کے اکثر مقامات میں۔ اغراق۔ انفکاک اور خلاف سیاق اور دیگر اقسام کے اغلاط و اسقام کی عام حرف گیریوں سے چشم پوشی اختیار کی گئی ہے۔ اور اُن کی حقیقت شناسی اور اصل فہمی کو ناظرین کے مطالعہ و مشاہدہ کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہی ناگزیر ضرورتیں تھیں جنہوں نے سیرۃ النبی صلعم کے بعد اسوۃ الرسولؐ کی تالیف و اشاعت کو خاص اہمیت دے رکھی تھی۔ مؤلف نے ابتدا سے لے کر انتہائے تالیف تک انھیں اُمور ضروری کو کامل شرح و بسط سے بیان کیا ہے مذہبی اور دینی واقعات کے حالات کو پہلے قرآن مجید کے ارشادات سے۔ پھر احادیث صحیحہ کی مرویات سے مقابلہ کر کے قلم بند کیا ہے۔

ملکی اور قومی وقائع اور سوانح کو تاریخ و سیر کے معتبر اور مستند ماخذوں سے مستنبط کیا ہے۔ استناد و استخراج کے طریقوں میں ہر واقعہ کی صحت اسناد میں وہ تمام اُصول تحقیق

قایم رکھے گئے ہیں۔ جو ایک روایت کی تصدیق و توثیق کے لیئے ضروری ہوتے ہیں۔
تمدنی اور **اخلاقی** حالات و مرویات میں اُنھیں واقعات کے اندراج پر اکتفا کی گئی ہے۔ جو اخلاق الہیہ آداب نبویہ اور نیز ملک و قوم کی مروجہ تہذیب و شائستگی کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔
تالیفات و تصنیفات کے ان اصول مسلمات کی تفصیل و تعمیل میں۔ شبلی صاحب کی طرح خودغرضانہ اور جانب دارانہ فیصلہ جات اور اقتباسات و استخراجات کا غلط طریقہ نہیں اختیار کیا گیا ہے اور بلا وجہ ضرورت صرف حصول مدعا کی ضرورت سے۔ ایک فن کو دوسرے فن سے فروتر اور کمپایہ نہیں قرار دیا گیا۔ یا ایک فن خاص کی مرویات و مندرجات میں دوسرے فن کے مرقومات و مذکورات ملا کر خلط مبحث کا معجون مرکب تیار نہیں کیا گیا ہے۔
سیرت نگاری کے موجودہ سباق تحریر ہیں۔ حدود تنقید و تحقیق ضرور قایم رکھے گئے ہیں اور اس ضرورت میں **استدلال کلامیہ** سے بھی کام لینا ہوا ہے۔ لیکن واقعات کی تنقید و تحقیق میں نہ اتنی جدت دکھلائی گئی ہے۔ اور نہ اتنی اصابت رائے کی قایم رکھنے کی بنا پر اتنی شدت اختیار کی گئی ہے۔ کہ تاریخ و سیرت کے مضامین کلام و مناظرے کے سنگزین بن جائیں۔ یا اتنی جدید تحقیق اور مجدد بننے کے شوق و تمنا میں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے عام فہم اور سلیس طریقہ تحریر کو جو آغاز فن سے کر اس وقت تک تمام علمائے متقدمین و متاخرین کا مختار قرار پا چکا ہے۔ فلسفہ تاریخ کی جدید اور یوروپین طریقہ تالیف کی تقلید کی موجودہ صورت و ہیئت میں بدل دیا گیا ہے۔ اور نہ **علم قدامت** کے انکشافات جدیدہ کے ہر ممکن و ناممکن قیاسات کی بنا پر واقعات تاریخی کی اتنی چھان بین اور اُن کی ایسی ہندی کی چندی کی گئی ہے۔ کہ ثبوت استدلال کے طومار و انبار میں اصل مطلب مفقود اور لاوجود ہو جاوے۔ حقیقت واقعہ اور اصلی صورت حال تو غائب ہو جائے۔ مصنف کا صرف خارجی اور سطحی استدلال باقی رہ جاوے۔
اس مسلک اور اس طریقہ تالیف کے خلاف **اسوۃ الرسولؐ** میں ہر مسئلہ۔ ہر واقعہ کی اصل حقیقت کے انکشاف کر دیے جانے کو غرض اولی قرار دیا گیا ہے۔ اور اُن کی تفصیل و بیان میں اُسی قدر وسعت دی گئی ہے۔ جس قدر سہولیت اور عام قبولیت کے لحاظ و اعتبار سے ضروری تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں کثرت رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور وہی واقعات

درج کئے گئے ہیں۔ جو مقبولیت اور معقولیت دونوں حیثیت رکھتے ہیں۔ نقل روایات میں ضعاف و احادیث سے کہیں بھی کام نہیں لیا گیا۔ اگرچہ شبلی صاحب نے اُن کے قابل الاستناد ہونے کا بھی عام فتویٰ دیدیا ہے۔ دیباچہ سیرۃ النبی ص ۱۶ و ۱۷

واقعات کی ترتیب باعتبار تخمین کی گئی ہے۔ اور ہر سال کے سلسلہ واقعات میں تقدیم و تاخیر وقوع کی ترتیب قائم رکھی گئی ہے۔ ایسے واقعات جن کے ایام وقوع کی تعیین میں اختلاف ہے۔ کثرت اقوال پر اعتبار کیا گیا ہے۔ ایسے واقعات جن کی تفصیل ضروری نہیں یا سال وقوع کے آخر میں تذکرۃً لکھ دیئے گئے ہیں۔

مرقومہ بالا ترتیب و تدوین کے مطابق اُسوۃ الرسولؐ۔ پانچ جداگانہ حصوں میں مرتب اور مدوّن ہوئی ہے۔

پہلے حصہ میں۔ ملک عرب کی قدامت۔ قدیم قبائل و عشائر کے تفصیلی حالات۔ عرب کے تمام جغرافی اور تاریخی خصوصیات۔ عرب کے تمام قدیم انبیاء و مرسلین۔ اُن کی تبلیغ رسالت۔ اُن کی قوم و اُمت کے واقعات۔ عرب کے تمام قدیم سلاطین۔ اُن کا طرز حکومت۔ نظام رعیت۔ عرب میں جناب ابراہیمؑ کا ورود۔ بنائے کعبہ حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی والدہ مقدسہ۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی اولاد و اعقاب۔ تولیت کعبہ امارت مکہ کے مسلسل اور مفصل حالات۔ نابت ابن اسمٰعیلؑ کے زمانہ سے لے کر حضرت عبد المطلبؓ کے ایام تولیت و امارت تک مندرج ہیں

دوسرے حصہ میں۔ آنحضرت کی ولادت۔ حضرت عبد المطلبؓ کی وفات۔ حضرت ابی طالبؓ کی تولیت و امارت کا زمانہ۔ آنحضرت صلعم کی بعثت۔ مکہ میں تبلیغ رسالت۔ مدینہ میں ہجرت فرمانے کے وقت سے لے کر غزوۂ خیبر سنہ ہجری تک کے تمام حالات و واقعات مرقوم ہیں۔

تیسرے حصہ میں۔ سنہ ہجری سے لے کر سلہ ہجری سال وفات تک کے تمام احوال قلم بند ہیں۔

چوتھے حصہ میں آنحضرت صلعم کی اولاد و ذرّیات۔ ازواج مطہرات اور متروکات وغیرہ کی تفصیل درج ہے۔ اور اسی تفصیل کے ساتھ آپ کے مکارم اخلاق۔ محاسن عادات اقوال و ارشادات قلم بند کئے گئے ہیں

پانچویں حصّہ میں۔ آنحضرت صلعم کی خاص رسالت اور قرآن مجید کی ہدایت سے بحث ہے رسالت کے متعلق تعلیم عقائد۔ اوامر و مناہی۔ اصلاح حال و اعمال۔ درستی اخلاق و معاشرت تمام ضروریات دینی اور دُنیاوی کی کامل تفصیل درج کی گئی ہے۔ اور اُسی کے ضمن میں شریعت اسلامی کی تعلیمی فوائد و منافع۔ محاسن و مصالح اُن کا دیگر شریعتوں کے احکام و نصاب مروّجہ سے ازروئے مقابلہ و موازنہ۔ مکمل۔ متمم اور مرجّح ہونا کامل شرح و بسط سے بتلایا اور دکھلایا گیا ہے۔ قرآن مجید کی نسبت اُس کی بے نظیر اور لاجواب فصاحت و بلاغت کے اظہار و ثبوت کے علاوہ اس کا سراپا اعجاز۔ اور حقائق معرفت کا دفتر راز ہونا قوی اور مستحکم دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ خاتمہ بحث میں مخالفین اسلام کی اُن تمام تعریضات کی تردید و تنقید قلم بند کی گئی ہے۔ جو اسلام اور بانئے اسلام علیہ وآلہ السّلام۔ پر محض غلط فہمی۔ کوتہ بینی اور تعصب دینی کی وجہ سے وارد کیئے جاتے ہیں۔

صنف تالیف اور شغف تصنیف میں۔ تحقیق و ترتیب کے بعد۔ بہت بڑا اہم اور ضروری امر نقل اسناد ہے۔ ہر واقعہ کے شہود و ثبوت میں اسناد کی اصلی عبارت کو بلفظہ لکھ دیا گیا ہے۔ متقدّمین صرف مصنف اور تصنیف کے نام کے حوالے کو کافی سمجھتے تھے۔ لیکن زمانہ حال کے محققین نے اس طریقہ اختصار کو اطمینان و اعتبار کے لیئے کافی نہ سمجھا۔ مزید اطمینان اور خاطر خواہ تشفّی کے لیئے۔ اسناد کی پوری عبارت تصنیف۔ صاحب تصنیف کا نام۔ شمار جلد۔ نشان صفحہ و سطر تک کے اندراج کو ضروری سمجھا ہے۔ یہ طریقہ چونکہ نہایت مستحسن اور مستحکم تھا۔ اس بنا پر فی زماننا عالم تصنیفات و تالیفات میں یہی دستور قایم ہو گیا۔ اُسوۃ الرسولؐ میں بھی نقل اسناد کے یہی اُصول قایم رکھے گئے ہیں۔ نہایت احتیاط سے اسناد کی اصلی عبارتیں۔ کتابوں اور اُن کے صفحات۔ سطور اور مجلّدات وغیرہ کے صحیح حوالے قلم بند کیئے گئے ہیں عربی اور فارسی ماخذوں کی اصلی عبارت ایک طرف۔ اُن کا ترجمہ دوسری جانب درج کر دیا گیا ہے۔ انگریزی حوالہ جات میں چونکہ بغیر ٹائپ کے اصلی عبارت کی نقل دشوار تھی۔ اس لیئے اُن کے صرف ترجمہ پر اکتفا کی گئی۔ لیکن اصل کتاب کے تمام حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ فمن شاء فلیرجع الیہ۔ حوالجات بعد ختم واقعات فوراً لکھدیئے گئے ہیں۔ اور عبارت زیرین حاشیہ وغیرہ کے ملاحظہ کی دوبارہ

زحمت نہیں دی گئی۔

کوانتھ ضلع آرہ	رب زدنی واھدنی الی صراط مستقیم سبحانک لا علم لنا	المؤلف الاحقر
شریف العمارت	الا ما علمتنا انک انت العزیز الحکیم وصلے اللہ علی رسولہ و	خان بہادر
عید الفطر ۱۳۴۲ھ	وآلہ الکریم	سید اولاد حیدر بلگرامی

تمت الخیر

بار دیگر کاظم بک ڈپو چسٹر دہلی
کے اہتمام سے ۱۹۳۵ء میں طبع ہوئی

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین وصلی اللہ علیٰ سیّد المرسلین وخاتم النبیینؐ وعلیٰ آلہ المیامین

تحمید الٰہی فطرت انسانی کا مقتضا ہے۔ اور نعت حضرت رسالت پناہی عقیدت ایمانی اور آداب روحانی کا مدّعا۔ صلوا علیہ وآلہ واوصیائہ المعصومین۔

اِس سے پہلے کہ موجودہ تالیف کے تمہیدی مضامین آغاز کیے جاویں۔ ہم ضرورت تالیفی اور تناسب مقامی دونوں اعتباروں سے **ملک عرب کے جغرافی اور تاریخی حالات** کو۔ جن کو ہماری کتاب کے تمام مضامین کو ابتدا سے لیکر انتہا تک پورا تعلق ہے۔ کامل اور کافی تفصیل سے لکھدینا اور بیان کردینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔

فصیحستانِ عرب

ملک عرب اگرچہ تقریبًا تمام تر ریگستان ہے۔ مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور تاریخی شاہد کو ملایا جاوے۔ تو اقطاع عالم میں یہ ہزاروں کوس کا چٹیل اور غیر آباد۔ بے آب وگیاہ میدان۔ قدیم الایّام سے **تقدیس** کا مرکز۔ **روحانیت** کا معدن۔ **معرفت** کا مخزن۔ **رسالت ونبوت** کا گلزار۔ اور **فصاحت وبلاغت** کا باغ پُربہار ثابت ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ۔ عرب کی وجہ تسمیہ میں۔ عمومًا دو قول مشہور ہیں۔ قول اوّل یہ ہے۔ کہ عرب اور "اعراب" کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں۔ چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے دُنیا کی تمام زبانوں کو ہیچ سمجھتے تھے اسلیے اُنھوں نے اپنے آپکو **عرب** (فصیح اللسان) اور دُنیا کی تمام قوموں کو **عجم** (ژولیدہ زبان) کہہ کر پکارا۔

قول دوم جو **جغرافیین** کا مختار اور **مورخین** کا معیار تحقیق ہے۔ وہ یہ ہے کہ عرب کا قدیم اور اوّل نام عَرَبَۃٌ اور عَرْبَۃٌ تھا۔ جو کثرت استعمال سے مخفف ہو کر عمومًا عرب بولا جانے لگا اور اِس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پا گیا عَرْبَۃٌ کی جمع عربات ہے۔ اور لغوی معنی صحرائے ناقابل زراعت۔ عرب کے اشعار قدیم عرب کے اصلی معنی یہی بتلاتے ہیں۔ ذیل کے

اشعار عرب سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اسد ابن جاہل کہتا ہے ؎

وعربۃ ارضٌ جد فی الشر اھلھا کما جدّ فی شرب النقاخ ظماءٗ

ملک عرب وہ قطعہ زمین ہے۔ جو اپنے باشندوں کی شرارت کے لیئے ویسا ہی مشہور ہے۔ جیسا اُسکے باشندوں کو پیاسوں کو بیابان میں ٹھنڈا پانی پلانے کے لیئے شہرت کا شرف حاصل ہے۔

حضرت ابی طالبؑ کے مشہور قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

وعربۃ دار لا یحل حرامھا من الناس الا اللوذعی الحلاحل

ملک عرب وہ قطعہ زمین ہے۔ جس کی حرام (ممنوعات) چیزوں کو سوائے دانشمندان اور بزرگان قوم کے کوئی دوسرا شخص حلال (جائز) نہیں کر سکتا۔

ابو سفیان کلبی۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں کہتا ہے:

؎ ابو نا رسول اللہ وابن خلیلہ بعربۃ بوانا فنعم المرکب

خدا کا رسولؐ اور اُسکے خلیل کا فرزند ہمارا باپ ہے۔ تمام عرب کو اُسپر فخر ہے۔ کیا اچھا سردار قوم ہے۔

وجہ تسمیہ کے متعلق قول اول اگر صحیح بھی ہو۔ لیکن تاہم اہل عرب کی خصوصیت اور ذاتی مفاخرت تک محدود سمجھا جائیگا۔ زیادہ سے زیادہ اُن کی نکتہ آفرینی اور وقت رسی کا نتیجہ یا مدعا کہلائے گا۔ عام مقبولیت اور واقعیت کے درجوں تک نہیں پہونچتا۔ کیونکہ ہر قوم اپنی زبان کی اسی طرح جوہری ہے جسطرح عرب۔

جغرافی تعلقات سے عرب کی وجہ تسمیہ کی تحقیق۔ اس قطعہ زمین کا نام عربۃ کیوں رکھا گیا حقیقت یہ ہے کہ عربۃ اصل میں سامی زبان کا لفظ ہے۔ جسکے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں عبرانی میں عربا آیا ہے۔ عربۃ کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے معنی وہی ہیں۔ بیابان اور میدان۔ ابھی تک عربی میں بھی اسکی قدیم یاد انھیں معنیوں میں باقی ہے۔ عرابۃ بدویت کے لئے اور اعراب بادیہ اور صحرانشینوں کے لیئے آجتک زبان زد خاص وعام ہے۔ چونکہ ملک عرب تمام تر صحرائے بے آب وگیاہ ہے۔ اور ریگستان کا لق ودق میدان علی الخصوص وہ ملکی حصہ جو علاقہ حجاز کے نام سے مشہور ہے۔ اور ہماری موجودہ تالیف کی تصریحات وتفصیلات کا اصلی مقصود یہ علاقہ بادیہ عرب شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی باعث سے اسکا نام عربا قرار پایا پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو بھی عرب کہنے لگے۔

تاریخی مشاہدہ سے وجہ تسمیہ عرب کی تحقیق۔ لفظ عرب سب سے پہلے ۵۰۰ قبل مسیحؑ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں مسموع ہوتا ہے۔ (کتاب الاستثناء آیت ۱۔ ۷۔ ۲۲) اور پھر اس کے بعد عام طور سے اس کا استعمال عبرانی۔ یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے اسیریا (شام)

کے کتبات یمنی میں ۸۰۰ ق م میں عرب کا نام عربی لکھا ہے۔ قبل اسلام یہ لفظ پورے ملک کو جو یمن سے شام تک وسیع ہے۔ محیط تھا۔

کتب مقدسہ سے تحقیق۔ توریت میں لفظ عربا ایک خاص قطعہ زمین عرب کے معنی میں متعدد بار آیا ہے۔ لیکن یقیناً اُس وسعت کے ساتھ اطلاق نہیں ہوا ہے۔ جس وسعت کے ساتھ اب یہ کہا جاتا ہے۔ لفظ عربا سے صرف وہ قطعہ زمین مراد لیا گیا ہے۔ جو حجاز و شام سے سینا تک وسیع ہے۔ عام ملک عرب کے لیے زیادہ تر مشرق اور مشرق کی زمین کا استعمال ہوا ہے۔ اور کبھی جنوب کا کیونکہ عرب فلسطین کے شرق و جنوب دونوں گوشوں میں ہے۔

قرآن مجید میں لفظ عرب ملک عرب کے لیے کہیں نہیں آیا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سکونت کے ذکر میں وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ یعنی ناقابل زراعت اسکو کہا گیا ہے۔ جو تحقیق وجہ تسمیہ میں جغرافیہ تاریخ اور توریت مقدس سے اُوپر لکھی گئی ہے۔ وہ قرآن مجید کی تصریح سے جب مقابل کی جاتی ہے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مجید نے اُنہی الفاظ السنہ قدیمہ کا بعینہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ چونکہ اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا۔ اس لیے خود لفظ "غیر آباد ملک" (عرب) اسکا نام پڑ گیا۔ توریت سے اس کی تصدیق و تطبیق اس طرح ثابت ہوتی ہے۔ کہ توریت میں بھی اسمٰعیل کا مسکن مدبار بتلایا گیا ہے۔ جس کے معنی بیابان اور غیر آباد قطعہ زمین کے ہیں۔ اور جو بالکل عرب کا ترجمہ۔ اور وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ کا مرادف ہے

ملک عرب کا جغرافیہ

عرب کے حدود اربعہ۔ ملک کا نام قائم ہو گیا۔ اب جغرافی حالات یہ ہیں۔ ان حالات میں اُصول جغرافیہ کے مطابق سب سے پہلے حدود اربعہ کا بیان ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔

شمال میں۔ ایشیائی ترکستان

جنوب میں۔ بحر ہند اور خلیج عدن۔

مغرب میں۔ بحر قلزم جسے بحر احمر (ڑوی) بھی کہتے ہیں۔

مشرق میں۔ بحر عمّان اور خلیج فارس۔

اہل جغرافیہ لکھتے ہیں۔ کہ عرب کے شمالی حدود اب تک مختلف فیہ ہیں۔ فی الحال یورپ کے محققین جغرافیہ نے عرب کے شمالی حدود کی جو تحقیقات کی ہے۔ وہ تمام اقطاع عالم میں مسلّم ہو چکی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ

۵ لفظ عربیہ ... ۲۰۱۴-۲۰۱۰ ص مطبوعہ لنڈن - ہسٹری اینڈ جیوگرافی آف ... ڈکشنری

نقشہ عرب میں ۳۴ درجہ ارض البلد سے ایک خط شہر سویز سے خلیج فارس کے سرے تک کھینچا جائے تو یہی خط ملک عرب کی شمالی حد مانا جائے گا[1]

حقیقت یہ ہے۔ کہ عرب کی شمالی حد اکثر اوقات مختلف فیہ رہی ہے۔ بعضوں نے علاقہ حلب سے لے کر دریائے فرات تک کے قطعہ زمین کو بھی عرب میں داخل تبلایا ہے۔ اُن کے اِس قول کی بنا فتوحات اسلامی پر قایم ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے فتوحاتی وسعت کے ساتھ اپنے ملکی حدود کو بھی بڑھا ہوا خیال کرلیا ہے اسی طرح قدیم تاریخوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جزیرہ نمائے سینا کو بھی اکثر عربی اور یورپین مورخین ملک عرب میں شامل کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا مختار۔ یونانی اور رومانی کتابوں پر مبنی ہے۔ جنہوں نے عرب کی تقسیم ملکی میں برّالطور سینا (جزیرہ نمائے طور سینا) کو بھی عرب کے حصوں میں قرار دیا ہے۔ اور نمبر اوّل شمار کیا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ اُن کا یہ قول بھی قول اول کی طرح اُسوقت کے عرب کی موجودہ حکومت کے رقبہ کے اعتبار پر قایم کیا گیا ہو۔ اور شیوع اسلام سے پہلے شاہان عرب نے اپنے حدود حکومت کو جزیرہ نمائے سینا بڑھا دیا ہو۔ مگر بخلاف ان سب قیاسی اضافات کے اصل تحقیقات وہی ہے۔ جس پر تمام علمائے جغرافیہ کا اتفاق ہو چکا ہے۔ وہ وہی خط ہے جو شہر سویز سے کھینچ کر خلیج فارس کے سرے تک پہونچتا ہے۔ اور یہی عرب کی شمالی حد مسلمہ ہے **عربی جغرافئین** کا یہ دعوٰے کہ اُن کا ملک معمورۂ عالم کے وسط میں واقع ہے۔ گو ایک مدت تک قیاس غلط اور مفاخرت خاص سمجھا گیا۔ مگر زمانہ موجودہ کی تحقیق جدید سے ثابت ہو گیا۔ کہ ملک عرب درحقیقت دُنیائے قدیم کے قلب میں واقع ہے مغرب کی جانب یہ ملک خاکنائے سویز کے ذریعہ سے ملک مصر سے ملا ہوا تھا۔ مگر ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھد جانے سے جُدا ہو گیا۔ یہ نہر ۸۷ میل لمبی اور ۵۰ سے لے کر سو گز تک چوڑی ہے۔ اور ممالک مصر۔ فرانس اور برطانیہ کی متفقہ تجویزوں اور کوششوں سے بنی ہے۔

سواحل اور مشہور بندرگاہیں۔ ملک عرب کی جو شمالی حد اوپر لکھی گئی ہے۔ اُس کے اعتبار سے یہ جزیرہ نما تقریباً طول میں ۱۳۰۰ میل ہے۔ اور شمالی خط ارض البلد کے ۳۴ درجہ پر۔ جہاں یہ سب سے زیادہ عریض پایا گیا ہے۔ اسکا عرض ۱۵۰۰ میل ہے۔ شمالی حد کے پاس جہاں سب جگہ سے کم اسکا عرض پایا جاتا ہے۔ وہاں اس کی چوڑائی کل ۹۰۰ میل ہے۔ اسکا مغربی ساحل جو بحر احمر سے ملا ہوا ہے۔ سنگین اجزا سے ملی ہوئی زمین ہے۔ اور بالکل بنجر یعنی ناقابل زراعت۔ اِس کے پیچھے

---

[1] تمدن عرب۔ تاریخ الاسلام۔ ارض القرآن۔ بینس یونیورسل ڈکشنری۔

پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ جن میں کوئی دو ہزار فیٹ سے اونچا نہیں ہے۔ اس ساحل پر کوئی بندرگاہ نہیں مگر ہاں۔ چھوٹے چھوٹے جزائر البتہ ہیں۔ جن میں آتش فشاں مادّے رکھنے والے پہاڑ واقع ہیں۔ آبنائے باب المندب کے ابتدائی حصہ میں جزیرہ یرم واقع ہے۔ جو فوج کا ایک قابل الذکر مرکزی مقام ہے۔ جنوبی شرقی ساحل کی بھی زمین کے اعتبار سے یہی حالت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس ساحل پر عدن۔ ظفار اور قیشوم کی ایسی مشہور و معروف بندرگاہیں واقع ہیں۔ مشرقی ساحل جو بحر ہنّت سے لیکر بحر عمان تک تمام ہوتا ہے۔ بہت ہی آباد ہے۔

رقبہ ملک۔ جزیرہ نمائے عرب طول میں کم سے کم ۱۳۰۰ میل اور زیادہ سے زیادہ ۱۸۰۰ میل تبلایا جاتا ہے۔ اور عرض میں ۶۰۰ میل مربع۔ کل رقبہ بارہ لاکھ تیس ہزار میل مربع ہے۔ باعتبار رقبہ کے ملک عرب جرمن اور فرانس سے چار گونہ بڑا اور ہندوستان سے ایک ثلث کم وسیع ہے۔

آبادی۔ آبادی ایک کڑور دس لاکھ ہے۔ جس میں پانچواں حصہ بدّو قوموں کا ہے۔ بدّو۔ بادیہ سے ماخذ ہے۔ باقی اور قومیں شہر۔ قصبات اور دیہات میں رہتی ہیں۔ اور عرب الحضر کہلاتی ہیں۔ بدّو قومیں یعنی عرب البادیہ ہمیشہ خانہ بدوش رہتے ہیں۔ یہ دُنبوں۔ بھیڑوں اور عموماً مویشیوں کو پالتے ہیں ہمیشہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ خیموں میں رہتے ہیں۔ اور برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتے ہیں۔ جب ایک مقام پر اُن کی مویشیوں کا چارہ۔ اور پانی پینے کا چشمہ خشک ہوجاتا ہے۔ تب انکو دوسرے مقام پر جہاں اُن کی ضرورت کی یہ دونوں چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ چلے جانے کی مجبوری ہوتی ہے۔ یہ لوگ صحرانوردی اور دشت پیمائی کی آزاد اور سادہ زندگی کو شہر اور قصبات کی مقامی سکونت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کی اس ترجیح کا دعویٰ کچھ آج سے نہیں ہے۔ بلکہ ہزارہا برس قبل سے وہ ہمیشہ سے اپنی قدامت کے والہ وشیدا ہیں۔ اور ایسے شیدائی کہ اُنہوں نے اپنے وطن کی اصلیت اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ملک وقوم کو موسوم کیا۔ جیساکہ وجہ تسمیہ عرب میں ابھی ابھی اوپر بیان ہوچکا ہے۔ قدامت اور اصلیت کے ایسے عاشق کامل کہ باوجود لاتعداد استداد ایام کے بھی نہ اُنکے ملکی رسم ورواج میں ابھی تک کوئی فرق آیا ہے۔ اور نہ قومی وضع ولباس میں جنگ وجدال۔ خون وقتال گویا اُن کی فطرت کے خاص عناصر تھے۔ مگر جب سے اسلام کی مُبارک تعلیم نے ان میں تہذیب اور شائستگی پھیلائی۔ تو قساوت۔ شجاعت۔ اور بسالت کی صورت میں آگئی۔ لوٹ۔ مار اور ایذا رسانی۔ مہمان نوازی اور آرام رسانی کی اخلاقی خوبیوں میں ظاہر ہوئی۔ شدہ شدہ وہ سلطنت اسلامی کی نگرانی میں تعلیم پاکر قوم

وطن کے بہت بڑے بہادر اور شجاع سپاہی اپنی مملکت کے فیاض اور بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے ہیں ہمسایہ اور ہموطن قوموں کے علاوہ تمام دُنیا کی غیر قوموں نے بھی اُن کی ہمت۔ شجاعت۔ فیاضی اور مسافر نوازی کو تسلیم کرکے بیحد تعریف کی ہے۔ تمدن عرب کا فرانسیسی محقق لکھتا ہے۔

خلفائے راشدین کے وقت میں اسلامی فوج کا بہت بڑا حصہ یہی بدوی تھے۔ بدوی فہم و ادراک میں حقیقتًا تمام دُنیا کی گلہ چرانے والی قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے بارہا گفتگو کی ہے کسب معیشت کے متعلق ان کے خیالات بہتیرے یوروپین تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر ہیں۔ رسوم و عادات میں نیم وحشی ہیں۔ مگر خیالات میں وحشی نہیں۔ یہ لوگ اگر وحشی کہے بھی جائیں۔ تاہم فہمیدہ اور ذہین ضرور ہیں۔

علاقہ شام کے سرحدی بدوی یہ قوم چار مختلف قبائل پر منقسم ہے۔ (۱) دروز عام بدویوں سے فطرتًا اور عادتًا بہت قریب ہیں۔ یہ حقیقت میں مسلمانوں کا ایک معزز اور خود مختار فرقہ ہے۔ یہ لوگ بڑے جری ہیں۔ ان میں اور لبنان کے سوارنہ میں سخت عداوت ہے (۲) **سوارنہ**۔ یہ نصرانیوں کا ایک معزز اور لاف زن فرقہ ہے۔ جس سے اصل موقع پر بہادری کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ (۳) **متاولہ**۔ کوہستان عرب میں آباد ہے۔ اُن کا مذہب امامیہ ہے۔ سخت متعصب ہیں۔ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ بالکل علیحدہ رہتے ہیں (۴) **نصاریہ**۔ یہ ایک بالکل جداگانہ پہاڑی قوم ہے۔ ان کا مذہب (بظاہر) اسلام کی ایک شاخ ہے۔ مگر نہایت مختلف۔ تناسخ کے بھی قائل ہیں۔ اور آفتاب و ماہتاب کی بھی پرستش کرتے ہیں۔

عرب مستوطن۔ مستوطن عرب بدوؤں کی طرح نیم وحشی نہیں کہے جاسکتے۔ وہ اپنے کمالات صفات اور معلومات کے اعتبار سے اور دُنیا کی شائستہ قوموں سے پیچھے نہیں ہیں۔ یوروپین مشہور سیاح **مسٹر پالگریو** کے اعترافات سے اہل عرب کے ان اوصاف پر ثبوت کی کافی روشنی پڑتی ہے۔ عرب ساکنان عمان کی نسبت یہ مشہور معروف سیاح رقم طراز ہے۔ کہ علاقہ نجد میں ایسے اشخاص کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جو انگریزوں کی طرح کلیں (مشینیں) بناسکتے ہیں۔ اور آسانی سے ریلوے کی پٹریاں بچھا سکتے ہیں۔ **علاقہ یمن** میں دو دارالعلوم کام کر رہے ہیں ایک شہر **زبید** میں۔ اور ایک شہر **ظفار** میں۔ اگرچہ یہ دارالعلوم جامع الازہر کی طرح مشہور تو نہیں ہیں۔ لیکن ملک کے علم دوست اور روشن خیال طبقات میں اشاعت علمی کا بہت بڑا ذریعہ ہوئے ہیں

کچھ آگے چلکر پھر یہی یوروپین فاضل لکھتا ہے۔ کہ میں نے بہت سفر کیا ہے۔ اور مختلف اقوام کے ساتھ میرے روابط وابستہ رہے ہیں۔ جن میں افریقی۔ ایشیائی اور اہل یورپ سب شامل ہیں۔ لیکن انہیں

۱؎ تمدن عرب۔ تاریخ الاسلام ج ۱

کوئی قوم ایسی نہیں ہے۔ جسے وسط عرب کے عربوں پر ترجیح دی جا سکے۔ ان مستوطنین عرب (عرب الحضر) کی بھی وہی زبان (تقریباً) ہے۔ جو بدوی عرب کی ہے۔ اور اُن کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑتا ہے۔ جو اُن کی شریانوں میں۔ لیکن تاہم شتان بینهما دونوں میں فرق عظیم ہے۔

پھر کچھ آگے چلکر یہی قابل مصنف علاقہ نجد کے وہابی فرقہ عرب کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ وہابی عرب بمقابل دوسرے عربوں کے بخیل اور مشکل مہموں میں شریک ہونے پر کم آمادہ ہوتے ہیں۔ نہ وہ شل اور عربوں کے رنگیلے ہیں۔ نہ صاف دل ہیں۔ نہ کشادہ پیشانی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ زیادہ ثابت قدم اور زیادہ عقلمند ہیں۔ اُن کی باتوں سے اُن کا دلی مُدعا بہت کم ظاہر ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنے ارادوں میں نہایت مضبوط ہیں۔ دشمنی میں سخت اور دوستی میں اُن لوگوں کے ساتھ جو اُن کے ہمقوم نہیں ہیں۔ نہایت مشتبہ اِن کی خاموشی خشن بلکہ عبوس صورتیں شمالی عربوں کے نیک اور خندہ روئی کو یاد دلاتی ہیں وہ ہرگز فوری پر جوشیو نیر کام نہیں کر بیٹھتے۔ بلکہ قبل سے سوچے ہوئے اور سمجھے ہوئے خیال پر عمل ہوتے ہیں اگرچہ اُن کے فہم و ادراک خود غرضی سے آلودہ ہیں۔ لیکن اُن کے عزم قوی ہیں۔ اور اُن کی ثابت قدمی نے اُن کو اِس لائق بنا دیا ہے۔ کہ وہ اپنی تمدنی حالت کو نہایت مضبوط کریں۔ اور اپنے ہمسایوں پر ظالمانہ حکومت کر سکیں۔ شدید اتحاد باہمی کی وجہ سے اِن کی کامیابی بمقابل ایسے دشمن کے یقینی ہے جسے آپس کی پھوٹ نے کمزور کر رکھا ہو۔ وہابیوں کے یہ خصائص اُن کے روزمرہ کے حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اُن سے گفتگو کرتے وقت انسان کو ضرور ہے۔ کہ اپنے الفاظ و اشارات کا ویسا ہی خیال رکھے۔ جیسا کہ کسی دشمن سے گفتگو کرتے وقت رکھا جاتا ہے۔

سطح زمین عرب۔ سطح زمین کے اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب تقریباً مرتفع میدانوں کا تختہ ہے۔ جو خاص کر پورب اور دکن کی طرف بہ نسبت ور جوانب کے زیادہ اُونچا ہے۔ جن میں بعض بعض نشیب کے مقامات سبز و شاداب وادیوں سے بھرے ہیں۔ عموماً سطح زمین کی اُونچائی ایک ہزار سے لیکر تین ہزار فیٹ تک ہے۔ جزیرہ نمائے سینا (اِس فاضل مغربی کے نزدیک سینا داخل عرب ہے) مثلث نما ہے جس کے پچھم خلیج سوئیز اور پورب خلیج عقبہ واقع ہے۔ اِس کی زمین بالکل سنگلاخ ہے۔ اور اِس کے وسط میں کوہ سینا واقع ہے۔ کوہ سینا کا سلسلہ شرقی ساحل سے شروع ہو کر خلیج فارس کے کنارے کنارے ہوتا ہوا جزیرہ نمائے سنڈان میں داخل ہوتا ہے۔ اِن کی اُونچائی دو ہزار سے لیکر تین ہزار فیٹ تک ہے۔ خلیج فارس کے دہانے پر جزیرہ کویت واقع ہے۔ اور وہ فی الحال بہت اچھی بندرگاہ ہے۔ اسکے جنوبی مشرقی حد وہ تیلا زمین کا حصّہ ہے۔ جس میں سب سے آگے راس مسندم

واقع ہے۔ یہ قطعہ زمین شمال و مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے فاصلہ پر بحر عمان واقع ہے۔ اور وہ بحر ہند سے جا کر ملجاتا ہے۔ خلیج عمان کے جنوبی مغربی کنارے پر سقط کی خوشنما بندرگاہ واقع ہے۔
عرب کے پہاڑ۔ پہاڑوں کے دو سلسلے۔ شمال و مشرق اور جنوب و مغرب کی طرف جبل اجا اور جبل سلمہ کے ناموں سے مشہور ہیں۔ جن کی سب سے اونچی چوٹی سمندر کی سطح سے پانچ ہزار فیٹ اونچی ہے۔ جبل الطویق جو ملک عرب کی ریڑھ (استخوان پشت) کہلاتا ہے۔ ٹھیک اُتر سے دکن کی طرف جاتا ہے۔ اس سے اور خلیج فارس سے کہیں سو میل کہیں دو سو میل کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ علاقہ عقبہ میں جبل الاخضر کی چوٹیاں چھ ہزار فیٹ اونچی ہیں۔
عرب کے دریا۔ اس ملک میں کوئی دریا کشتی چلانے کے قابل نہیں ہے۔ جو بھی چند چشمے ہیں۔ وہ گرمی کے دنوں میں تمام تر خشک ہوجاتے ہیں۔ ملک کے اکثر علاقوں میں کئی کئی مہینوں تک پانی کی ایک بوند نہیں برستی۔ لیکن عجیب قدرت خداوندی یہ ہے۔ کہ یہاں کے پہاڑوں سے ہمیشہ چشمے جاری رہتے ہیں۔ جن سے دامن کوہ اور وادیاں عموماً سرسبز و شاداب رہتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ چشمے پھیل کر تھوڑی دور تک ایک مصنوعی دریا بن جاتے ہیں۔ پھر وہ ریگستان میں جذب ہوجاتے ہیں۔ یا سمندر میں ملجاتے ہیں۔ ملوک عرب نے انہی چشموں کے روکنے کے لیے بند بنائے تھے۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ چشمے اُبل کر بصورت سیلاب پُرخطر ہوجاتے ہیں۔ بند ارم۔ بند مآرب انہی کی یادگاریں ہیں۔
عرب کا صحرائے عظیم۔ اہل عرب اس صحرائے عظیم کو۔ ارض الدہان کہتے ہیں۔ یہ صحرا ملک کے جنوب میں واقع ہے۔ ارض الدہان کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ زبان عرب میں دہان کے معنی سرخ کے ہیں۔ چونکہ اس صحرا کی ریگ سُرخ رنگ کی ہے۔ اسلیئے اس کا نام ارض الدہان قرار پایا۔ یہ لق و دق صحرا رقبہ میں تقریباً پچاس ہزار میل مربع ہے۔ اور تمام رقبہ ملک کا پانچواں حصہ ہے۔ اس صحرا کی وسیع زمین میں سوائے ریت کے بڑے بڑے تودوں اور انباروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ملک کے باشندے بھی۔ اور گرد و نواح کے متوطن قبائل و قوافل بھی اس صحرائے عظیم کو بہت کم طے کرتے ہیں۔
عرب کی آب و ہوا۔ ملک عرب بھی افریقہ کی طرح تمام اقطاع عالم میں خشک ترین قطعہ زمین ہے۔ جغرافی مناسبت اور قربت کے اعتبار سے تمام ممالک ایشیا میں جزیرہ نمائے عرب کو شمالی افریقہ سے پوری مماثلت ہے۔ کوہستانی مقامات میں آب و ہوا اعتدال کے درجہ پر رہتی ہے۔ مگر غیر محفوظ اور غیر سایہ دار علاقہ جات میں ناقابل برداشت گرمی پڑتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ مہلک باد سموم جسے باد خمسین بھی کہتے ہیں۔ چلا کرتی ہے۔ یوروپین مشہور و معروف سیاح اور مورخ مسٹر ڈوزی عرب کی باد سموم کی نسبت لکھتا ہے

بادِ خمسین۔ بادِ خمسین یا بادِ سموم کے آثار قافلوں پر آناً فاناً ظاہر ہوجاتے ہیں۔ پہلے اُفق کی طرف سے آسمان پر ایک ہلکی سی سُرخی نظر آتی ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ سُرخی سیاہی سے بدلجاتی ہے۔ پھر دفعتاً وہ سیاہی زردی سے تبدیل ہوجاتی ہے۔ آفتاب سے کرنیں مفقود ہوجاتی ہیں۔ اور وہ گویا خون کا ایک قرص ہوکر رہ جاتا ہے زمین اور آسمان کا جوف مہین مہین ریت کے ذرّوں سے بھر جاتا ہے۔ اور ہوا کی حرکت سے وہ ذرّے تمام زمین کی سطح پر اِس طرح پھیل جاتے ہیں۔ جیسے طوفان آنے کے وقت سمندر کا پھین اُڑ اُڑ کر ساحل کی سطح پر پھیل جاتا ہے۔ یہی علامات تبلادیتے ہیں۔ کہ میدان سے فوراً کسی طرف بھاگ جانے کا وقت آگیا کیونکہ چشم زدن میں بادِ خمسین کے مار ڈالنے والے جھونکے پہونچتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں۔ صحرا کی بے انتہا اور اندازہ سے باہر ریت کی مقدار اُڑ اُڑ کر سمندر کی لہروں کا عالم دکھلاتی ہیں۔ غریب اور بدنصیب مسافر کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ آنکھیں بالکل سُرخ ہوجاتی ہیں۔ ہونٹ خشک ہوکر آگ کی طرح جلنے لگتے ہیں۔ سواری کے اُونٹوں کا یہ حال ہوتا ہے۔ کہ کبھی تو وہ اِس آفت سے گھبرا گھبرا کر میدان میں دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی تھک کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اپنی لمبی لمبی گردنیں ریت کے تودوں میں چھپا دیتے ہیں۔ اور جیوں جیوں ہوا کا طوفان بڑھتا جاتا ہے۔ اپنی تھوتھنیوں کو زمین پر دھڑا دھڑ پٹکتے جاتے ہیں۔ اور اپنی جان بچانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اگر طوفان کے گرد و باد میں قافلے نے راہ گم نہیں کی۔ تو وہ کسی پتھر کے نیچے یا کسی غار کے اندر چھپ رہنے کی کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ اور طوفان کے گذر جانے تک کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے اس بادیہ لامتناہی میں قافلے نے راہ بھلادی۔ اور چھپ رہنے کی کوئی محفوظ جگہ بھی نہیں ملی۔ تو پھر انسان اور بے زُبان حیوان کے حواس گُم ہوجاتے ہیں۔ جان بچانے کی عقل جو فطرت کی طرف سے ہر ذی رُوح میں ودیعت ہوئی ہے۔ بالکل سلب ہوجاتی ہے۔ اعضاء جوارح ایک ایک کرکے جواب دے بجاتے ہیں۔ تمام جسمانی طاقتیں زائل ہوجاتی ہیں۔ بالآخر گرمی کی شدت سے انسان بالکل خستہ اور پریشان ہوکر دردِسر کے شدید دوران میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ عضو عضو کی طاقت جواب دیدیتی ہے۔ قافلہ کا قافلہ ریت کی سر بفلک موجوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور ذرا سی دیر میں مسلسل ریت کا انبار اُنکو بڑے بڑے تودوں کے نیچے ایسا دبا دیتا ہے۔ کہ اُنکا نام و نشان بھی نہیں رہتا ہے۔ تا اینکہ مدت مدید کے بعد۔ نظامِ قدرت نے اگر پھر وہاں کہیں ایسا ہی سامان پیدا کردیا۔ اور ایسا ہی طوفان آیا۔ اور اُنکی موجوں نے ریت کے انبار کو اُڑا دیا۔ تو انسانوں اور حیوانوں کی سفید سفید ہڈیوں نے نمودار ہوکر اُنکی داستانیں ہمارے سامنے کھولکر رکھدیں۔ اور تبلادیا۔ کہ اُنکو عبرت کی نگاہوں سے دیکھ لو۔ کہ یہ بادِ خمسین کے کارنامے ہیں۔

عرب کے اندرونی حصّوں میں عموماً زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ صحراؤں میں دن کے وقت آلہ مقیاس الحرارت

۹ ۱/۸-۱۰۱- اور رات کے وقت ۰۰ ۱ درجہ سے کم نہیں ہوتا۔ یمن میں آخر جولائی تک کبھی پارہ ۔ ۸۴ درجہ سے تجاوز نہیں ہوتا۔ صنعا علاقہ یمن میں تو جاڑوں میں برف پڑتی ہے۔ جس کی شدید گرمی اور خشکی کا ذکر ہوا ہے وہ عرب کے ہر حصہ میں نہیں پائی جاتی بعض حصے جو رقبہ میں یورپ کے بڑے اور مشہور ممالک سے کم نہیں ایسے موجود ہیں۔ جن کی زمین بہت اچھا محاصل دیتی ہے۔ جیسے علاقہ یمن اور نجد۔ جہاں نہایت اعلیٰ پیداوار ہوتی ہے۔ بالگریو یمن کی آب و ہوا کو تمام دُنیا کی آب و ہوا پر ترجیح دیتا ہے۔ یہاں کے گھوڑے تو ساری دُنیا میں لاجواب مانے گئے ہیں۔ علاقہ عقبہ میں جا بجا چشمے اور ندیاں (وادی) پائی جاتی ہیں۔ جہاں کہیں کھجوریں اور چارہ پیدا ہوتا ہے۔ اُن صحراؤں میں بدوی قومیں اپنی مویشیوں کیساتھ رہا کرتی ہیں۔

عرب کے اثمار۔ سواحل کے قریب سبز و شاداب علاقوں میں۔ انار۔ خوبانی۔ شفتالو۔ سیب۔ بیر۔ انجیر۔ بادام۔ پستہ۔ انگور۔ لیموں۔ خربزہ۔ سیم۔ تمباکو۔ تج۔ سیاہ مرچ۔ خوشبو مہندی۔ ادرک۔ جھاؤ۔ گلاب۔ نرگس۔ بنفشہ۔ نیل وغیرہ بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں کے کاشتکاروں کو مینہ کا پانی کنوؤں اور تالابوں میں جمع رکھنا پڑتا ہے۔ بعض حصے ملک کے ایسے بھی ہیں۔ جہاں گھانس تک نہیں اُگتی۔

عرب کے حیوانات۔ اونٹ۔ گھوڑے۔ خچر۔ گدھے۔ بیل۔ بھینس۔ نیل گائے۔ بھیڑ۔ دُنبے۔ ہرن۔ شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ چرغ۔ بھیڑیے۔ لومڑی۔ اور گیدڑ وغیرہ درندے بھی ہوتے ہیں۔ ٹڈیاں (ملخ) اگرچہ نقصان عظیم پہونچاتی ہیں۔ مگر اکثر اوقات صحراؤں میں مسافروں اور اُن کی سواری کے جانوروں کی غذا میں کام آتی ہیں۔ تمام جانوروں میں گھوڑے اور اونٹ نہایت اعلیٰ درجہ کے اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اُونٹ تو خاص الخاص عرب کا جانور تمام عالم میں مشہور ہے۔ عرب اپنے گھوڑوں کو مثل اپنے فرزندوں کے پالتے اور عزیز رکھتے ہیں۔ اور اُن کی نسل کو ہرگز ہرگز بگڑنے نہیں دیتے۔ آدمیوں کی طرح اُن کے نسب نامے تیار رکھتے ہیں۔ پرندوں میں مرغ۔ شتر مرغ۔ بٹیر۔ باز۔ شکرا۔ کبوتر۔ فاختہ گدھ۔ کوا۔ چیل۔ ہُدہُد اور آبی جانور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

عرب کے غلّے اور دیگر پیداوار۔ جوار۔ جَو۔ باجرا۔ گیہوں۔ مٹر۔ ملک کے شاداب حصّوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بن اور کھجور عرب کی خاص پیداوار ہے۔ یہ دونوں چیزیں یہاں سے بہتر دُنیا بھر میں کہیں نہیں ہوتیں۔ کھجور (رطب) ملک کی خاص خوراک ہے۔ ناریل۔ لوبان۔ تیزپات۔ سنائے کی۔ مختلف اقسام کے گوند۔ عُود۔ مُر۔ اور بلسان بھی اس ملک کے ساتھ مخصوص ہیں۔

معدنیات۔ تانبے اور لوہے کی کانیں تو جا بجا اکثر پائی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین چاندی اور سونا بھی پیدا

---

۵ بینس یونیورسل ڈکشنری ۳۰۱ جغرافیہ عرب۔ اسپرٹ آف اسلام۔ تاریخ الاسلام۔

کرتی ہے۔ علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب صفۃ جزیرۃ العرب میں ایک ایک کان کا نشان بتلایا ہے۔ اور انگریزی سیاح مسٹر برٹن نے تو مدین کی طلائی معاون پر ایک خاص کتاب لکھی ہے۔ جسکا نام گولڈ مائنس آف مدین ہے۔ ملک کا دامن اور جواہروں سے بھی بھرا پڑا نظر آتا ہے۔ یمن میں لال ہوتا ہے۔ اور بیش بہا عقیق۔ اکثر مقامات میں فیروزہ اور جزع یمانی کے معاون بھی پائے جاتے ہیں۔ بحرین کی زمین تو گویا سوتی پیدا کرتی ہے۔ اور گویا تمام دُنیا کے دامن سوال موتیوں سے بھر دیتی ہے۔

عرب کی ملکی تجارت۔ عرب قدیم الایام سے تجارت پیشہ ملک ہے۔ توریت باب القضاۃ ۲۴-۲۶ میں اس کے سونے۔ چاندی اور بخورات کا کثرت سے ذکر مرقوم ہے۔ قدیم مورخ یونان ہیروڈوٹیس کی تاریخ میں عرب کی قدیم تجارت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ زمانہ موجودہ میں اس کی تجارت۔ روم۔ افریقہ۔ ایران۔ ہندوستان اور یورپ کے ساتھ جاری ہے ۱۹۱۰ء میں صرف موتیوں کی تجارت کی لاگت ۱۲ لاکھ پونڈ کے قریب اندازی گئی ہے (ارض القرآن) عرب کی تجارت زیادہ تر قافلوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ عرب میں سڑکیں نہیں ہیں۔ کاروانوں کے راستے اکثر وادیوں سے ہوکر نکلتے ہیں۔ مگر کثرت آمد ورفت سے یہ راستے ہمارے ہاں کی سڑکوں سے زیادہ ہموار اور استوار ہوجاتے ہیں۔ اور جادے کہلاتے ہیں۔ عرب میں ابھی تک قافلوں کے وہی راستے ہیں۔ جو قدیم الایام سے چلے آتے ہیں۔ یہ اُنکی قدامت پسندی کی خاص دلیل ہے۔ ان میں زیادہ معروف وہ راستے ہیں۔ جو دمشق سے بغداد۔ ریاض سے مکہ معظمہ اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ اور مسقط سے بغداد اور دمشق کو جاتے ہیں اور اب تو حلب سے لیکر مدینہ منورہ تک ریلوے جاری ہے۔ جو حجاز ریلوے کے نام سے مشہور ہے اور برابر اطراف وجوانب میں ریلوے اور موٹر گاڑیوں کے انتظام خصوصاً عراق وشام کے علاقوں میں ہوتے جاتے ہیں۔

ملک عرب کی تقسیم قدیم

یونان وروم کے قدیم جغرافیہ دان۔ ایراستینوس۔ استرابو۔ اور بلینی نے عرب کو دو قدرتی حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ شمالی اور جنوبی۔ لیکن اس سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس کی تقسیم ہوئی۔ اور اب تک یوروپین جغرافیہ نویس اور سیاح اسی تقسیم کی تقلید کرتے ہیں۔

بطلیموس نے تمام ملک کو تین طبعی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عرب آباد ان (العرب المیمونۃ) Arabia Flex. اور عرب ریگستان (العرب الرّمالی) ArabiaDeserta. اور

---

۵ ارض القرآن۔ جیمبس یونیورسل ڈکشنری۔ تاریخ الاسلام۔

عرب سنگستان (العرب الحجر) *Arabia Petreca*

عرب آبادان۔ یا عرب المیمونہ۔ بقیہ تمام جزیرہ نمائے عرب کو جو مغرب میں بحر احمر، مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں بحر ہند۔ اور شمال میں عرب سنگستان اور عرب ریگستان سے محاط ہے۔ کہتے ہیں۔ جس میں بحر احمر کے ساحل پر، حجاز، سواحل بحر احمر و ہند پر یمن، حضر موت اور سواحل خلیج فارس پر عمان وبحرین اور وسط عرب میں۔ یمامہ اور نجد داخل ہیں۔

عرب سنگستان۔ یا عرب الحجر مغرب میں مصر کی سرحد سے جزیرہ نمائے سینا سے گذر کر مغرب میں بصرہ پر ختم ہوتا ہے۔ جو عرب کا ایک قدیم شہر ہے۔ شمال و مغرب میں تدمر تک اسکا گوشہ جاتا ہے۔ اور اس کی پشت پر شمالی و مغربی یہودیہ اور فلسطین کا ملک پڑتا ہے۔ جنوب میں عرب ریگستان اور عرب آبادان ہے۔ عرب ریگستان کی مشرقی و شمالی حد نہر فرات و الجزائر سے شروع ہو کر مغربی و شمالی حد میں عرب سنگستان یا عرب الحجر کی مغربی و شمالی پر ختم ہوتی ہے۔ جنوب میں عرب آبادان یا عرب المیمونہ واقع ہے

یونانی اور رومانی فاتحین نے عرب بیریا (عرب سنگستان) اور عرب ڈزرٹا (عرب ریگستان) کو فتح کر لیا تھا۔ اسلیئے وہ اس کے حالات سے واقف تھے۔ عرب آبادان کے صرف سواحل سے انکو آگاہی تھی۔ اور ایک آدھ غلط سلط اندرونی قبائل واقطاع کے نام بھی انہوں نے سُن لیئے تھے۔

حسب تحقیق ڈاکٹر اسپرنگر، بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں عرب آبادان کے ۱۴۵ قبائل ۱۶۴ مقامات، ۵ کوہستانی سلسلے اور ۴ دریاؤں کا ذکر کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اسطفینوس *Stephen.* اور بلینی *Pleny* نے بھی بعض نام گنائے ہیں۔ لیکن اسباب خواہ جو کچھ ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دس پانچ ناموں کے سوا۔ اب وہ سب غیر معروف ہیں۔

تحقیق بطلیموسی پر تنقیدی نظر۔ غیر معتقدین بطلیموس تو یہ کہتے ہیں۔ کہ ان ناموں کا وجود مصداق بطلیموس کے دماغ کے سوا کہیں خارج میں نہیں ہیں۔ عرب کے خالی از معلومات اوراق کو پُر کرنے کے لیئے نام اپنی طرف سے گڑھ لیے ہیں۔ ایک مصنف اِس کی ایک معقول وجہ بتلاتا ہے۔

اکثر ان اقطاع عرب میں آبادی کا کبھی کوئی باقاعدہ مقررہ اصول نہیں رہا ہے۔ جسکا بطلیموس نے نشان دیا ہے۔ اگر بطلیموس کے ناموں میں کوئی حقیقت ہے۔ تو وہ کنوئیں ہونگے۔ یا نخلستان جہاں کارواں اور قافلے اپنے خیمے ڈیرے کھڑے کر دیتے ہونگے۔ بطلیموس کے نہ صرف جغرافیہ عرب بلکہ جغرافیہ عالم کے متعلق علمائے عرب کو یہی شکایت ہے۔ اور اسکے وجوہ بھی بتاتے ہیں۔ سب سے چوتھی صدی ہجری کا میں مسعودی لکھتا ہے الا ان اسماء فی ھذا الکتاب بالیونانیۃ متعذر فھمھا جغرافیہ بطلیموس میں یونانی ناموں کو سمجھنا مشکل ہے۔ مروج الذہب ج اول ص ۱۰۳ مطبوعہ مصر وحاشیہ نفح الطیب۔

ساتویں صدی ہجری میں یاقوت کی مقدمہ معجم میں شہادت ہے:- جهلت اکثر الاماکن التی ذکرت فیها واُبهم علینا امرها وعفت سطا دل الزمان فلا نعرف میں جغرافیہ بطلیموس کے بیان کردہ مقامات سے ناواقف ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتے کہ مرور زمانہ سے وہ سب مٹ گئے اور اب مجہول ہیں۔ سب سے آخر میں دسویں صدی ہجری میں لفظ جغرافیہ کے تحت میں کاتب چلپی کا بیان ہے۔

لکن اندرس کثیر مما ذکرہ وتغیرات اسماءہ فانسد باب الانتفاع منہ بطلیموس کے بیان کردہ مقامات مٹ گئے بدل گئے اور ان کے اطلاعی منافع سے فائدہ اُٹھانے کے ابواب مسدود ہوگئے۔ لیکن معتقدین بطلیموس اس الزام سے برہم ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ یونانی الصحۃ ناموں کی عرب جغرافیہ نویسوں کے بلکہ حال کے سیاحین یورپ کے بیان سے تطبیق دیجائے۔ ریورنڈ فارسٹر نے سنہ ۱۸۴۴ء میں جغرافیہ عرب کے دوسرے حصہ میں ۱۰۹ سے ۲۷۶ تک ۱۵۷ صفحے۔ ان ناموں کی تحقیق وتصدیق وتطبیق میں صرف کئے ہیں۔ اور ہر جگہ اپنی عالمانہ جہالت کی عجیب وغریب مثال پیش کی ہے۔ غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے اور عربی میں انکا صحیح نام کیا ہے۔ وہ بطلیموس کے لکھے ہوئے قبائل کے ناموں کو حروف کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل کے ساتھ تطبیق دیتا ہے۔ اُسکو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کا علی الاکثر نشان بھی نہیں۔ وہ فاتحانہ شان کے ساتھ عہد اسلام میں کہاں سے کہاں نکلکر آباد ہوگئے۔ موجودہ قبائل کے نام بالکل نئے ہیں۔ قبائل کے ساکن کی تعیین اگر ہو سکتی ہے۔ تو صرف جغرافیین عرب کے بیانات سے۔

فارسٹر کے بعد ڈاکٹر اسپرنگر نے سنہ ۱۸۷۹ء میں جغرافیہ عرب قدیم Ancient Geog of Arab کے نام سے چھپوائی ہے۔ اس میں اسی قسم کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُن کی کامیابی کا حال نہیں معلوم ہے ان کے مرتبہ نقشہ عرب قدیم کے سوا اصل کتاب بھی نہیں ملی۔ ارض القرآن جلد اول ۱۰۰ ۔ ۷ ص۔ ارض القرآن کے فاضل معاصر کو یوروپین محققین کے ان قیاسات واہیات پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ انکو اپنی تحقیق عالم میں کمال مطلق دکھلانے کے ساتھ ساتھ تمام دُنیا کی زبانوں پر یکساں علم واطلاع رکھنے ہی کا دعویٰ نہیں ہے۔ بلکہ اُن زبانوں میں زبان دان ہونے کا بھی پورا پورا فخر حاصل ہے۔ مجھ کو چند عیسائی احباب سے ان امور میں ذاتی تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ ایک کتاب میں استُنبِیٔ (نبی مبعوث کیا گیا) کے معنی تمنّی کرنے کی بنا ڈالی گئی، ترجمہ فرماتے تھے۔ اور مجھے اپنے غلط فہمی کے اصرار پر گھنٹوں اُلجھے رہے۔ میں نے اس کتاب میں ریورنڈ فارسٹر صاحب کے ان قیاسات و مہملات کے مسلسل و مکمل انکشافات مندرج کئے ہیں۔ جن کی علمی تحقیقات نکتہ رسی اور صحیح سخن فہمی کی خوبیوں میں چار کیا آٹھ چاند لگ جاتے ہیں۔ یہی حالت ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کی تحقیق وتطبیق کی بھی ہے۔ اُن کی کتاب مدت سے میرے پیش نظر ہے۔ اُن کے قیاسات وانطباقات بھی فارسٹر صاحب کی طرح ”سوال از آسمان وجواب از ریسمان“ کا حکم رکھتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر سنجیدہ اور فہمیدہ ناظرین کتاب۔ مہذبانہ انداز سے۔ تبسم زیر لب فرما کردہ جائیں گے۔ اور بس۔ مگر ہاں۔ اتنا لکھ دینا اور بتلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ ریورنڈ فارسٹر صاحب کی عالمانہ جہالت سے اسپرنگر صاحب کی غلط فہمی کا درجہ کم ہے۔ میں نے ان صاحب کے غلط معنی اور غلط ترجموں کو اس کتاب میں اپنے اپنے مقامات پر لکھ کر بتلا دیا ہے۔ اور اکثر مقامات پر اُن کی تصحیح بھی کر دی ہے۔“

المؤلف

سیّد اولاد حیدر عفی عنہ۔

بہر حال عرب کے جن مقامات کے نام یونانیوں اور رومانیوں کی کتابوں میں آتے ہیں ہم اُن سب کا عربی صحت کے ساتھ ایک نقشہ مرتب کرکے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نمبر شمار	یونانی تلفظ	تلفظ بخط اردو	صحیح عربی نام	کیفیت
۱	Macaraba	مکارَبا	مکہ ربّہ	ربّہ کے معنی اعظم کے ہیں۔
۲	Iathreppa	اتھریپا	یثرب	زمانہ جہالت میں مدینہ منورہ کا نام۔
۳	Iambia	انبیا	ینبوع	حجاز کا ایک ساحلی نام۔
۴	Dumatha	دُومیتھا	دَوُمتہ	دومۃ الجندل۔ شمالی عرب کا ایک شہر
۵	Egra	اجرا	حجر	ثمود کا دارالحکومت حجاز کے قریب ساحل بحر احمر کا
۶	Thamia	تھیمیا	بیت ثُمار	انتہائے حجاز میں بجانب شام ایک شہر
۷	Madaun a	مدایونا	مدَیَن	حجاز کے قریب ساحل بحر احمر پر حضرت شعیب کا شہر
۸	Supphor	سفار	ظفار	یمن میں ایک قدیم شہر۔
۹	Adana	عدانا	عدن	ساحل بحر ہند پر یمن کا ایک بندر
۱۰	Minai	مینائی	مُعین	یمن میں ایک قدیم آبادی
۱۱	Mariaba	ماربایا	مآرب	یمن کا قدیم دارالحکومت
۱۲	Negrana	نجرانا	نجران	یمن میں ایک نصرانی آبادی
۱۳	Chtramoti	کٹیراچیرموتی	حضرموت	ساحل بحر جنوبی عرب میں ایک شہر یمن کے پاس
۱۴	Maccala	مکالا	مکلا	جنوب میں ساحل بحر عرب پر
۱۵	Gerrhai	گرہائی	قریہ	یمامہ میں ایک شہر
۱۶	Catabai	قتابائی	قتاب	قدیم یمن میں ایک شہر
۱۷	Karnai	قرمان	قرن	حضرت اویس قرنیؓ اسی کی طرف منسوب ہیں
۱۸	Salaee	سبائی	سبا	" " " "
۱۹	Oman um	عمانوم	عمّان	ساحل خلیج فارس پر شرقی عرب میں ایک صوبہ
۲۰	Amithoscuta	امیتھوسکوتا	مسقط	عمان کا دارالحکومت

ھ ارض القرآن ج ۱۔ ص ۷ ۔ ۱۰۷۔

عرب سنگستان وریگستان سے یونانیوں اور رومانیوں کو واقفیت تھی۔ کہ ان پر انکا قبضہ تھا۔ لیکن یہاں دوسری دقت ہے۔ عربی آبادیوں (کے ناموں کو) شاکر یونانی نام سے یونانی اور رومانی شہر قایم کریئے تھے۔ تاہم جن ناموں کے اتحاد واشتراک کا حال معلوم ہوا ہے۔ حسب ذیل ہیں۔

تدمر۔ سب سے مشہور تر مقام ان اطراف میں یہی تھا۔ یہ انتہائے شمال میں فلسطین کے پاس عرب کا آخری شہر ہے۔ اسفار یہودیہ میں ہے۔ کہ اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا تھا۔ (ملوک اوّل ۹-۱۹) بہر حال۔ یہ ایک عرب ریاست کا دار الامارت تھا۔ رومیوں نے جب ۲۰۰ء میں فتح کیا۔ تو اسکا نام پالمائر رکھدیا۔ جوزوفس جلد اوّل ص ۴۲۸۔

ربات مواب۔ یہ شہر بحر میت کے قریب عرب سنگستان میں۔ موابی عربوں کا دار الحکومت تھا۔ رومیوں نے اس کا نام ار یو پولس رکھا تھا۔ ۳۱۵ء میں زلزلہ سے تباہ ہوگیا۔ بوان۔ ص ۲۰۲

بصریٰ جسکو رومیوں نے بگاڑ کر بوسترہ بنایا ہے۔ وہ ابھی اسی شہر (بصرہ) کے قریب تھا۔ اور اب بھی اسکا نشان ہے۔ یہ اودی عربوں کا خاص مقام تھا۔ بوان۔ ص ۲۰۲

الرقیم۔ اس کو عبرانی۔ سلاع اور یونانی۔ پٹرا کہتے ہیں۔ یہ شمالی عرب میں پہلے مدیانی حکومت کے ماتحت ایک دار الامارت تھا۔ پر نبطی عربوں کا دار الحکومت ہوا۔ رومیوں کے عہد میں بھی اسکو خاص اہمیت تھی۔ (بوان ۲۰۲)

ربات عموں۔ عمونی عربوں کا عرب ریگستان کے شمالی و شرقی حصہ میں دار الحکومت تھا۔ اسکو یونانیوں نے فلاڈلفیا کا نام بخشا ہے۔ کہ تیسری صدی ق م میں اسکو شاہ بطلیموس فلاڈلفیوس نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ (جوزوفس جلد ا ص ۱۹۲-)

ان لوگوں کو بعض جزائر اور سواحل عرب سے بھی واقفیت تھی۔ تم نے سکلا کا نام اوپر پڑھا ہوگا۔ اسکا ذکر بطلیموس نے بھی کیا ہے۔ اور اس کی جگہ ۱۳-۴۵ درجہ پر مقرر کی ہے۔ لیکن صحیح مقام ۱۴-۳۰ درجہ ہے۔ (فاسٹر ج ۲ ص ۱۹۲)

بطلیموس سے سو برس پیشتر ایک یونانی مصری نے جسکا نام مجہول (غیر معلوم ہے) سے جہازرانوں کے لیئے ایک بحری جغرافیہ (چارٹ) ترتیب دیا تھا جمیں اُسنے بحر عرب کے جزائر پر۔ جو قریب ہند و اسکندریہ کے سرراہ واقع ہیں۔ روشنی ڈالی ہے۔ وہ پہلے بحر عرب میں عرب کے ایک جنوبی ساحل یودیموں *Eudaemon* کا ذکر کرتا ہے۔ جس کو عدن سمجھنا چاہیئے۔ اس کی نسبت اُسکا بیان ہے۔ کہ مصر و ہند کے درمیان یہ ایک تجارتی منڈی ہے۔ جیسی کہ اب بھی ہے۔

عرب کی تقسیم قدیم۔ جزیرہ نمائے عرب پہلے آٹھ علاقوں میں منقسم ہے۔
(١) **علاقہ سینا۔** ملکی جغرافیہ میں علاقہ طور کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقہ میں وادی تیہہ بھی شامل ہے یہ علاقہ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے درمیان خدیو مصر کے ماتحت ہے۔ اسی علاقہ میں وہ جبل مقدس ہے جو تمام آسمانی کتابوں میں کوہ طور کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسی کوہ مقدس پر جناب موسیٰؑ کو کرشمۂ قدرت نظر آیا۔ اور احکام توریت نازل فرمائے گئے۔ ڈاکٹر بک Dr. Beek کا بیان ہے۔ کہ اصل جبل سینا۔ (کوہ طور) وہ ہے۔ جو خلیج عقبہ کے عین سرے پر واقع ہے۔ اس کوہستانی سلسلہ کو جبل موسیٰ کہتے ہیں اس کی سب سے اونچی چوٹی کوہ حریب ہے
(٢) **علاقہ حجاز۔** بحر احمر کے کنارے۔ علاقہ سینا سے شروع ہو کر۔ ساحل یمن تک تمام ہوتا ہے۔ اس علاقہ کا ایک بڑا حصہ ناقابل زراعت ہے۔ اسی علاقہ میں شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ (زاد اللہ شرفہما) واقع ہیں۔ جہاں کی خوش نصیب زمین سے اسلام نے ابتدا کی نشو و نما پائی۔
(٣) **تھامہ۔** بحر قلزم کے ساحل سے کچھ فاصلہ پر ایک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے۔ اس کوہستانی سلسلہ اور ساحل بحر قلزم کے درمیانی علاقہ کو جو مکہ معظمہ سے لیکر یمن کے شہر مخا تک چلا گیا ہے۔ تہامہ کہتے ہیں اس کو اکثر قدیم جغرافیہ نویسوں نے الغور کے نام سے بھی لکھا ہے۔ اسی علاقہ میں شہر حدیدہ لوہیہ اور مخا واقع ہیں۔ اور مخا تو کافی کے لیئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔
(٤) یمن کے شمال میں حجاز۔ جنوب میں خلیج عدن۔ مغرب میں بحر قلزم۔ اور مشرق میں حضر موت واقع ہے۔ عرب کے تمام علاقوں میں یہ علاقہ سب سے زیادہ سبز و شاداب ہے۔ قدیم زمانہ میں علاقہ حضر موت مع اپنے توابعات۔ مہرہ۔ شحر اور عمان کے سب اسی میں شامل تھے۔ لیکن اب نہیں۔ شہر صنعا اس علاقہ کا دار الحکومت ہے۔ اور بہت بڑا خوبصورت شہر ہے۔ یمن کے بلند مقامات جن کو جبل الیمن کہتے ہیں۔ اُن میں بہت سی وسیع اور زرخیز آبادیاں ہیں۔ جہاں قہوہ۔ وسمہ (نیل) کھجور سب قسم کی ترکاریاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آب و ہوا یہاں کی معتدل ہے۔ خزاں اور بہار میں دو دفعہ پانی برستا ہے قدیم سے یمن کی تجارت مصر۔ ہندوستان۔ شام اور ایران وغیرہ کے ساتھ جاری ہے۔ یہاں کے اکثر باشندے زیدیہ مذہب کے ہیں۔ جن میں کچھ تو تجارت پیشہ ہیں۔ اور کچھ کاشتکار۔
(٥) **حضر موت۔** بہت وسیع علاقہ ہے۔ جو جنوب و مشرق کے سواحل سے ہوتا ہوا دور تک ملک کے اندرونی حصہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اس علاقہ میں کثیر التعداد حکومتیں واقع ہیں جن پر جداگانہ امیر قبائل حکومت کرتے ہیں۔ اس میں کوئی قابل الذکر مقام نہیں۔

(۶) علاقہ عُمان۔ اس کے شمال اور شرق میں خلیج فارس محیط ہے۔ مغرب میں حضر موت اور جنوب میں بحر ہند واقع ہے۔ یہاں ایک خارجی فرقہ کا حاکم حکمران ہے۔ جو نوعی۔ حکومت برطانیہ کا زیر فرمان ہے شہر مسقط اس کا دار الحکومت ہے۔ مسقط مشہور بندرگاہ ہے۔ اور تجارت گاہ۔ مکہ جانیوالے راستہ میں حاجی ضرورت کے اشیا یہیں سے فراہم کرتے ہیں۔

(۷) علاقہ بحرین۔ یہ علاقہ پہلے یمامہ کو ملا کر العروض کے نام سے مشہور تھا۔ اسکا قدیم دار الحکومت شہر یمامہ تھا۔ جسے پہلے جو کہتے تھے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں عروض سے صرف یمامہ ہی کو مراد لیا ہے۔ آخر میں یہ علاقہ جزیرہ بحرین کے شامل ہوجانے سے۔ اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

(۸) علاقہ نجد۔ اس علاقہ کے شمال میں صحرائے شام۔ جنوب میں الربع الخالی۔ مغرب میں حجاز اور شرق میں عراق عرب واقع ہے۔ یہ علاقہ ایک وہابی حاکم کے زیر حکومت ہے۔

اسکے شمالی حصہ میں جبل الشمر کے نام سے ایک ریاست مشہور و معروف تھی۔ جو پہلے حکومت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی۔ اب خود مختار ہے۔

(۹) الرّبع الخالی۔ حضر موت کے شمال میں ایک وسیع صحرا ہے۔ جو ربع الخالی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بالکل غیر آباد اور ناقابل زراعت قطعہ زمین ہے۔

(۱۰) دیار اثیر (آسر) وہ قطعہ زمین ہے۔ جو حجاز اور یمن کے درمیان ایک ریگستانی چٹیل میدان کی صورت میں واقع ہے۔ حجاز کے شمالی حصہ میں جو کوہستانی سلسلہ ہے۔ وہ قدیم زمانہ میں بنی ادہم اور بنی مدین کے عربی قبائل کا مسکن تھا۔

ملک عرب کے وہ مقامات جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں

فاران۔ عرب کے قدیم جغرافیہ۔ توریت کے اقتباسات اور بڑے بڑے محققین کی تحقیقات سے۔ یہ امر ثابت ہوگیا ہے۔ کہ مکہ کے پہاڑوں کا نام فاران ہے۔ حدیدہ جو حضرت اسمٰعیل کے آٹھویں بیٹے۔ حَدَد کی طرف منسوب ہے۔ اور توریت میں حدآد کے نام سے مذکور ہے۔ بکہ زبور باب آیت میں۔ جس قربان گاہ بکہ میں قربانی کرنے کی تمنا کی گئی۔ وہ وہی بکہ اور اس کا معبد ہے جو الفاظ قرآنی میں اس طرح بتلایا گیا ہے۔ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا۔ سب سے پہلا (خدا کا) گھر جو آدمیوں (کی پرستش) کے لیے بنایا گیا۔ وہ شہر مقدس بکہ میں ہے۔ اور یہ مسلّم ہے۔ کہ بکہ فی الحال مکہ معظمہ ہے۔

اسی دُعا میں حضرت داؤدؑ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ کہ مورہ کو برکتوں سے ڈھانک لیتے۔ جب سلسلہ واقعات

اور تناسب مقامات پر غور کیا جاتا ہے۔ اور بجہ سے حقیقتاً مکہ ثابت ہوتا ہے۔ تو مورہ سے مروہ تسلیم کیے جانے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر مروہ وہی ہے۔ جو زبور میں مورہ کے نام سے مذکور ہے۔ مدیان یا مدین زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک علاقہ مدین کہلاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں جو قطورا کے بطن سے ہیں۔ (ضمیمہ بائبل ص ۱۱۴) کتاب خرقیل کی ۲۷-۱۹-۲۳-۲۴ آیتوں میں۔ قانہ اور حاران وغیرہ کا عدن کے ساتھ نام آیا ہے۔ اوفر نام ایک دوسرا بندر تھا حضرت سلیمانؑ کے جہاز عیلات سے چلکر یہیں اوفر آتے تھے۔ (ملوک اوّل ۹-۲۸) اوفر کا تورات میں متعدد بار نام آیا ہے یہ ایک تجارتی منڈی تھی۔ سونا کثرت سے یہاں آتا تھا۔ عدن۔ جو اب تک موجود ہے۔ اس کی تجارت کی اُسوقت بھی دھوم تھی (۲۷-۲۲) یمن کے شہروں میں سے سبا کا نام بھی توریت میں آیا ہے۔ یہاں کی ملکہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں آئی تھی۔ (ملوک دوم ۱۰-۱-۱۲) سبا کے ساتھ یمن کے دوسرے تجارتی مقامات مثلاً اوزال کا نام بھی دولتمندی کی خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ (کتاب خرقیل ۲۷-۱۹) اوزال وہاں آباد تھا، جہاں صنعا آباد ہے۔ شمال عرب میں حجاز کے کسی قطعہ میں حویلا واقع تھا، جہاں بنی اسمٰعیلؑ کی آبادی تھی۔ (تکوین ۲۵-۱۸) عربوں کے اور مسکن کا نام حوربعل بتلایا گیا ہے۔ (تاریخ ثانی ۲۶-۷) معلوم نہیں کہاں واقع تھا۔ لیکن فلسطین کے ساتھ اسکا ذکر ہے۔ شاید شمالی عرب میں ہوگا۔

ملک عرب کی تقسیم جدید

اقطاع عرب۔ عرب کے جغرافیہ نویسوں نے ملک کو اُس کے حدود طبعی کی بنا پر تقسیم کیا ہے۔ عرب عراق و عرب شام کو چھوڑ کر حسب ذیل پانچ صوبوں پر تقسیم ہے۔ تہامہ۔ حجاز۔ نجد۔ یمن۔ اور عروض۔ اس تقسیم کا اصل معیار جبل السراۃ قرار دیا گیا ہے۔ جو عرب کا سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ ہے۔ یہ سلسلہ انتہائے شمال یعنی بر الشام سے شروع ہو کر انتہائے عرب یعنی یمن میں منتہی ہوتا ہے۔ اس سلسلے نے عرب کو شرقی و مغربی دو طبعی حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ مغربی حصہ شرقی حصہ سے چھوٹا ہے۔ وہ عرضاً دامن کوہ سے سواحل بحر احمر تک اور طولاً حدود عرب شام سے حدود یمن تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اِس حصہ کا نام حجاز ہے۔ حجاز کا جنوبی حصہ بطرف یمن جو نشیب و پست ہے۔ تہامہ اور غور بھی کہلاتا ہے۔ جسکے معنی پستی کے ہیں۔ شرقی حصہ عموماً بلند اور فراز ہے۔ اور وہ کوہ سروات سے اُتر کر وسط ملک کو طے کرتا ہوا عراق تک چلا گیا ہے۔ اِس حصہ شرقی کا نام نجد ہے۔ جس کے معنی فراز و بلند کے ہیں۔ تہامہ اور نجد کے درمیانی اور کوہستانی حصہ کو حجاز اسلیے کہتے ہیں۔ کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک حاجز (حاجب) اور پردہ

ہے۔ عراق اور جنوبی حدود نجد سے خلیج فارس تک یمامہ۔ عمّان اور بحرین وغیرہ جو قطعہ ملک ہے اُس کو عروض (ترچھا) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ترچھا اور خم واقع ہوا ہے۔ حجاز۔ نجد۔ اور عروض کے بعد جنوبی حصّہ میں سواحل بحر احمر سے سواحل بحر عمّان تک۔ سواحل بحر عرب پر وہ قطعہ ملک ہے۔ جو اپنے یمن و برکت اور زرخیزی کی بنا پر یمن کے نام سے مشہور ہے۔

فاضل معاصر صاحب ارض القرآن کو یمن کی وجہ تسمیہ میں سہو ہوا ہے۔ یمن کا یمن سے ماخوذ ہونا ظنی ہے۔ اور دیبای اصلا یمین۔ یا ایمن سے ماخوذ و مستخرج ہے جس کے معنی سیدھے طرف کے ہیں۔ چونکہ خانہ کعبہ سے اور علاقہ حجاز سے ملک یمن سیدھے ہاتھ کی طرف واقع ہے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ارض القرآن متعلقہ ص ۱۲) اس لیے اسے یمان پھر کثرت استعمال سے یمن کہنے لگے۔ خانہ کعبہ میں رکن یمانی اُس رکن مخصوص کا نام ہے۔ جس کو حجاج سیدھے کاندھے سے ملا کر طواف کے شوط بجا لاتے ہیں۔ اور اسکا ٹھیک دست یمین سے مقابل اور برابر رکھنا ارکان ضروریہ میں ہے۔ المؤلف

اب بحث سے اہل جغرافیہ کے نزدیک تہامہ کوئی مستقل صوبہ نہیں۔ بلکہ حجاز کا ایک ٹکڑا ہے اسلیے عرب کے حسب ذیل صرف چار صوبے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ عروض۔ نجد۔ یمن اور حجاز۔ ان چاروں صوبوں میں سے ہر صوبہ متفرق چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر منقسم ہے۔

قدیم اخبار و آثار سے بھی تہامہ اور حجاز کے ایک علاقہ ہونے کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اور سب سے واضح اور قوی ثبوت یہ ہے۔ کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے موطن و مسکن کے القاب و خطابات مشرفہ کتب سیر وحدیث میں برابر الابطحی التہامی اور بعض مقامات میں المکی التہامی مرقوم ہیں۔ جو ان دونوں مقامات کے اتصال و اتحاد کو قطعاً ثابت کرتے ہیں۔ المولف

علاقہ عروض عروض جیسا کہ ہم نے پہلے بتلایا ہے۔ وہ قطعہ ملک ہے۔ جو شرقی نجد اور حدود عراق سے سواحل خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس صوبہ میں یمامہ۔ بحرین۔ اور عمّان تین اقطاع ہیں۔ بحرین اور عمّان ساحل بحر فارس پر واقع ہیں۔ اور یمامہ بحرین اور عمان کے پار نجد۔ حجاز اور یمن کے وسط میں ہے۔

(۱) یمامہ۔ یمامہ کے حدود اربعہ یہ ہیں۔ مشرق میں عمّان اور بحرین۔ مغرب میں حجاز اور بعض حصہ یمن۔ مغرب میں احقاف یا الربع الخالی۔ شمال میں نجد۔ یمامہ کا وہ حصہ جو نجد سے متصل ہے۔ آباد اور سرسبز ہے یمامہ کی قدیم تاریخ یہ ہے۔ کہ وہ قبائل طسم اور جدیس کا مسکن تھا (ابو الفداء ص ۹۹) حجر یا قریہ اور

ارض القرآن ج ۱۔ ۸۷۔ ۸۸۔

جدۃ ان قبائل کے عہد میں یمامہ کے مشہور شہر تھے۔ یمامہ میں طسم اور جدیس کی بعض عمارات اور قلعوں کے آثار زمانہ اسلام تک باقی تھے۔ جن میں سب سے بڑی عمارتیں **قصر شموس۔ قصر معنق** تھیں۔ (معجم البلدان) شہر حجر جس کا نام القریہ ہے۔ ان قبائل کی حکومتوں کا صدر مقام تھا۔ زرقا جس عورت مشہورہ کی نسبت آجتک مذکور ہوتا ہے۔ کہ وہ بہت تیز نگاہ تھی۔ دشمن کی کی فوج کو تین روز کی مسافت سے دیکھتی تھی۔ اسی یمامہ کی رہنے والی تھی۔ مشہور قبیلہ ربیعہ کی بعض شاخیں عہد قدیم سے یہاں آباد تھیں۔ ابن خلدون نے لکھا ہے۔ کہ بنو عجل کی آبادی بھی نہیں تھی۔

قریب زمانہ اسلام اِس سرزمین میں عرب کا ایک مشہور قبیلہ بنو حنیفہ بستا تھا۔ جو بکر ابن وائل کی ایک شاخ تھا۔ بنو حنیفہ نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر ۹ھ ہجری میں عقیدت کیشی کا اظہار کیا اسی ملک و قبیلہ کا فرزند مسیلمہ (الکذاب) تھا جس نے آخر عہد نبوی میں ادعائے نبوت کیا۔ اور حضرت ابوبکر کے عہد میں ایک جنگ عظیم کے بعد وحشی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بنو اسد کا ایک مشہور قبیلہ اسلام سے تقریباً ایک صدی بیشتر یہاں آباد تھا۔ جو حکومت کے لحاظ سے آل کندہ کا ماتحت تھا۔

(۲) **بحرین** جس کا دوسرا نام الاحسا ہے۔ ایک ساحلی مقام ہے۔ اُس کے اُوپر عراق۔ اسکے نیچے عمان۔ اُس کے مغربی پہلو پر یمامہ اور مشرقی جانب خلیج فارس واقع ہے۔ بحرین موتیوں کے لیے مشہور ہے۔ اِس کے جزائر اور سواحل موتیوں کی کان ہیں۔ جہاں ہر سال ہزاروں کشتیاں اور ہزاروں غواص موتیوں کے نکالنے میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی محنت کا ثمرہ موتیوں کے عرب تاجر کم اور یورپ کی کمپنیاں زیادہ تر حاصل کرتی ہے

قبیلہ جدیس جو طسم کو مٹا کر یمامہ کا مالک ہو گیا تھا۔ حسان شاہ یمن کے حملوں سے گھبرا کر یہیں پناہ گزیں ہوا تھا۔ بعد کو عدنانی قبائل میں سے قبیلہ عبد القیس کا یہ مسکن ہوا۔ بعض قبائل ربیعہ بھی یہاں آباد تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں بحرین اہل فارس کے قبضہ میں تھا۔ اور ایک طرف سے مناذرہ (آل منذر) جو عراق (حیرہ) اور اُس کے آس پاس والے ملک میں ایرانیوں کے نائب تھے۔ بحرین کے حاکم تھے۔ (یعقوبی ج ا ص ۲۰۴ لنڈن) طرفہ جو عرب کا ایک مشہور شاعر تھا آل منذر کے اشارے سے یہیں قتل ہوا۔ ۸ھ ہجری میں یہاں کا حاکم منذر بن عادی تھا۔ جو پیغام اسلام پہونچنے پر اپنی تمام عرب رعایا کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ اور یہاں سے بنو عبد القیس کا ایک وفد حاضر خدمت نبوی ہوا۔

بعد اسلام اِس ملک میں سب سے بڑا واقعہ یہ ظاہر ہوا۔ کہ قرامطہ جو نیم مسلمان مجوسی تھے۔ اُن کی طاقت کا مرکز۔ فارس کے قربت کی بنا پر یہی ملک تھا۔

(۳) عُمان۔ بحرین کے بعد خلیج فارس سے ہٹ کر بحر عمان کے ساحل پر واقع ہے۔ مشرقی جانب بحر عُمان۔ مغرب کی طرف الرُبع الخالی۔ جانب جنوب بحرین جانب شمال شہر یمن۔ ساحلی مقامات نہایت آباد اور سرسبز ہیں۔ جبل اخضر یہاں کا سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ جس کی بلندی ۳۰۰۰ میٹر ہے ملک عُمان کے پہاڑ معدنیات سے اور اُس کے دریا موتیوں سے اور اُس کی وادیاں۔ غلہ۔ فواکھ اور خوشبودار لکڑیوں سے مالا مال ہیں۔ عُمان کے گھوڑے گائیں اور بکریاں بھی مشہور ہیں۔

مورخین عرب کا بیان ہے۔ کہ عُمان۔ عُمان بن قحطان کی طرف منسوب ہے۔ لیکن بروایت توریت یہ عُمان بن لوطؑ کی طرف منسوب ہونا چاہیئے۔ قبیلہ ازد جس کو بنی اسد بھی کہتے ہیں۔ قبل اسلام اسکی ایک شاخ یہاں آباد تھی۔ آجکل یہ ملک ایک مستقل ریاست ہے۔ جسکا پایۂ تخت مسقط ہے۔ اہل ملک زیادہ تر اباضی طریقے کے خارجی ہیں۔ ملک کا رقبہ کم از کم ۸۰ ہزار میل مربع اندازہ کیا جاتا ہے۔

اللہ اکبر

علاقہ نجد

نجد۔ وسط عرب میں ایک سرسبز و شاداب اور بلند و فراز قطعۂ ملک ہے۔ سطح آب سے ۲۰۰۰ میٹر بلند ہے۔ اور تین طرف سے بے آب صحراؤں سے محیط ہے۔ اور اِسی لیئے وہ اجنبی نفوذ اور بیرونی آمد و رفت سے محفوظ ہے۔ اُس کے شمال میں صحرائے شام۔ مغرب میں صحرائے حجاز۔ مشرق میں صحرائے دہنا۔ (الربع الخالی) اور جنوب میں یمامہ ہے۔

نجد عرب کے مشہور قبیلہ بکر ابن وائل کا مسکن تھا۔ **کلیب** جس سے بڑھ کر عرب جاہلیت کے نزدیک کوئی معزز نہیں ہوا۔ بکر بن وائل کا سردار تھا جس کے قتل کے بعد۔ انتقام کے لیئے بکر و تغلب میں چالیس برس تک آتش جنگ مشتعل رہی۔ یہیں کندہ کے نام سے ایک چھوٹی سی عربی حکومت قایم ہوئی۔ جو مناذرہ ملوک حیرہ کی ہمسری کا دعوٰی رکھتی تھی۔ قُباد۔ پدر نوشیرواں نے جب مزدک کا مذہب اختیار کیا۔ تو مناذرہ کے مقابلہ میں شہنشاہِ فارس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے شاہان کندہ نے بھی

اِس مذہب کو اختیار کر لیا تھا۔ اور آخر یہی امر اُن کی تباہی کا باعث ہوا۔
عربی زبان کو نجد کی آب و ہوا سے عجیب و غریب مناسبت ہے۔ مُہلہل۔ جو عربی شاعری کا آدم کہلاتا ہے۔ اسی نجد کی خاک سے پیدا ہوا تھا۔ اور کلیب مذکور کا حقیقی بھائی تھا۔ اُمرالقیس جو عرب کا ملک الشعراء تھا۔ اسی نجد کی حکومت کندہ کا آخری شہزادہ تھا۔ اور آج بھی جبکہ استداد زمانہ اور اختلاط اقوام کے سبب سے فصیح عربی زبان کا نام جزیرۂ عرب میں کہیں موجود نہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں قدیم فصیح عربی زبان بلا اختلاط موجود اور محفوظ ہے۔
نجد عہد قدیم سے قبائل عدنانیہ کا مسکن ہے۔ آخر عہد میں کہلانی قبیلہ کی مشہور و معروف شاخ طےؔ اجاؔ اور سلمیٰ کی پہاڑیوں میں آباد ہو گئی تھی۔ جن کو شعرائے طےؔ نے ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کیا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جو ظہور اسلام کا زمانہ ہے۔ نجد میں غطفان کا قبیلہ بستا تھا۔ جن کی تادیب کے لیے خود آنحضرت صلعم مع صحابہ سنہ ۴ھ میں نجد تشریف لائے تھے۔ اس مہم کا نام اہل سیرت (و المغازی) کے ہاں غزوہ ذات الرقاع ہے۔ قبیلہ ہوازن۔ اور سلیم نجد کے مغربی حصہ پر قابض تھا۔ قبیلہ حطیم کی بھی ایک شاخ نجد میں تھی۔
آجکل نجد۔ شمر۔ قصیم۔ اور عارض تین حصوں پر منقسم ہو کر۔ دو شیوخ کے زیر حکومت ہو گیا ہے۔ شمالی حصہ جو صحرائے عراق و حجاز کے متصل ہے۔ شمر کہلاتا ہے اور کبھی اپنے دارالامارۃ۔ حائل کے نام سے۔ حائل پکارا جاتا ہے۔ جبل الشمر اور جبل سلمیٰ اور کچھ وادیاں اس تقسیم میں داخل ہیں۔ شمر کی حکومت آجکل آل رشید کے قبضہ میں ہے آبادی کا تخمینہ تین لاکھ ہے۔ شمر میں قبیلہ طےؔ کی ایک شاخ شمر نامی آباد تھی۔ جس کے نام سے یہ ملک موسوم ہو گیا۔
عارض جو یمن کے صوبہ احقاف کے متصل ہے۔ نجد الیمن کہلاتا ہے۔ اور آجکل نجد سے عموماً یہی سرزمین مراد لی جاتی ہے۔ امیر نجد آل سعود ہے۔ جس کے دارالامارۃ کا نام مدینۃ الریاض ہے۔ قصیم کا جنوبی حصہ اسی حکومت کے تابع ہے۔ نجد کا یہ حصہ شمر سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے اثر سے عارض کے باشندے زیادہ تر اہل حدیث ہیں۔ سعودان کی مردم شماری بیش و کم ۵ لاکھ نجد کے جھول گھوڑے اور اونٹ مشہور ہیں۔ ہر قسم کے میوے یہاں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ وادیاں اور پہاڑوں کے دامن میں زراعت بھی ہوتی ہے۔

علاقہ یمن

یمن عرب کا سب سے زیادہ سرسبز سب سے زیادہ آباد۔ اور سب سے زیادہ وسیع۔ اور سب سے زیادہ

متمدن ملک ہے (اسی مناسبت سے اکثر عروس الملک لکھا گیا ہے) اور جو قبل اسلام اور بعد اسلام مرکز علم رہا ہے۔ اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس لیئے اکثر مجہول ہے۔ عمارات اور قلعوں کے آثار یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جو قدیم شاندار تمدن کا پتہ دیتے ہیں۔ قرب وجوار کی سلطنتوں نے مثل روم وفارس اور حبشہ نے اس پر متواتر حملے کئے ہیں۔ اور کبھی فتح بھی کیا ہے۔ یونانی اور رومی مورخین کے پاس یمن کے متعلق بعض اہم معلومات ہیں۔ اور کچھ معلومات آثار قدیمہ کی مدد سے یورپین علمائے آثار (ارکیالوجسٹ) نے حاصل کئے ہیں۔

صوبہ یمن کے حدود طبعی یہ ہیں۔ گو اُس کے حدود حکومت مختلف زمانہ وحکومت میں مختلف رہے ہیں۔ جنوب میں بحر عرب۔ مغرب میں بحر احمر۔ شمال میں حجاز نجد اور یمامہ۔ اور مشرق میں عمان وبحرین۔ اس ملک کی ابتدائی تاریخ جیسا ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ قدامت کی تاریکی میں مخفی ہے۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس سرزمین کے مختلف اقطاع میں وقتاً فوقتاً عمالیق۔ ال معین عاد۔ سبا۔ اور حمیر کی عظیم الشان سلطنتیں یہاں قائم ہوئی ہیں۔ (ان بیانات کی تفصیل قبائل عرب میں آئے گی۔) جنہوں نے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں۔ جن کی عظمت کے آثار ابتک باقی ہیں۔ ترقی زراعت کے لیئے وادیوں میں بڑے بڑے بند آب ہیں۔ جن میں سے سب سے زیادہ مشہور سد مارب ہے۔ جسکا قرآن مجید میں بھی ذکر ہوا ہے۔ ہند وعمان۔ فارس۔ حبش مصر اور عراق کی تجارتیں۔ انھیں کی وساطت سے قائم تھیں۔ پہاڑوں سے معدنیات اور جواہر نکالتے تھے۔ سامان عطریات وبخورات اُنھیں کے ملک سے تمام مہذب ممالک میں پہونچتا تھا۔ آخر عہد میں تقریباً ستر برس کے لیئے اہل حبشہ یمن پر قابض ہوگئے تھے۔ جن کو آخر کار اہل فارس نے یمن سے نکالدیا۔ اور خود قابض ہوگئے۔ ظہور اسلام کے وقت اہل فارس کی طرف سے باذان یہاں کا گورنر تھا۔ جو سنہ ہجری میں مسلمان ہوگیا۔ بقیہ اہل یمن جو یہودی تھے۔ سنہ ھ میں داعی اسلام حضرت علی علیہ السّلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ہمدان یمن کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ تمام قبیلہ صرف ایک دن میں شرف اسلام سے مشرف ہوا۔ یہ سوعظمت مرتضوی کے کمال صداقت کے اعجاز نما فیوض تھے۔

یمن کے مشہور مقامات کے نام یہ ہیں۔ معین۔ مآرب۔ ظفار۔ شیبان۔ اور زال براقش۔ نشق۔ خولان قرن۔ شیوہ۔ عمران۔ اور صنعا وغیرہ۔ ان میں اکثر مقامات ویران یا دریائے ریگ میں غرق ہیں بعض موجود ہیں۔ لیکن اُن کے قدیم نام متروک ہیں۔ ملک کی کثرت آبادی وسرسبزی کا اندازہ اس سے ہوگا۔ کہ ملک کی تقسیم پہلے جن صوبوں پر تھی۔ اور جن کو اہل عرب مخلاف کہتے ہیں۔ مورخ یعقوبی

نے اُن کی تعداد ۸۴ بتائی ہے۔ یمن کی بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں۔ (یعقوبی ص ۳۲۷ لنڈن) حضرموت۔ احقاف۔ صنعا۔ نجران۔ عسیر۔ جو علی الترتیب شرقی۔ جنوبی حدود یعنی حضرموت سے جنوبی مغربی حدود یعنی حجاز تک سواحل بحر ہند و بحر احمر پر واقع ہیں۔

(۱) **حضرموت** ساحل بحر ہند پر واقع ہے۔ شمال میں بحر ہند۔ جنوب میں الربع الخالی اور الاحقاف اور مغرب میں صنعائے یمن۔ یہ ایک نہایت قدیم آبادی ہے۔ قحطان یا یقطان جو یمن کا پدر اول تھا۔ اُس کے بارہ بیٹوں میں سے توریت[1] نے ایک کا نام حضرماوت بتایا ہے۔ اِس بنا پر اہل تاریخ یقین کرتے ہیں۔ کہ یہ قطعۂ زمین اپنے باشندۂ اول حضرماوت بن قحطان کے نام سے منسوب ہے اہل حضرموت نے ایک مستقل حکومت بھی قایم کرلی تھی۔ جس کی مختصر تاریخ مورخ ابن خلدون[3] نے بیان کی ہے۔ عاد و ثمود کے قبائل کا اصلی مسکن بھی یہی تھا۔ عاد کا قبیلہ یہاں سے ہٹ کر احقاف میں بس گیا اور ثمود کا قبیلہ حجاز کے پاس جاکر آباد ہوا۔ اور بالفعل حضرموت ایک مستقل قطعہ ملک کی حیثیت سے ایک مستقل امام کے تعلق ہے۔ شادابی اور سرسبزی میں صنعائے یمن سے کم نہیں ہے۔ اور عود قافلی وغیرہ یہاں کے نباتات مشہور ہیں۔ سال بسال حضرموت میں سوق الرابیہ کے نام سے ایک بازار لگا کرتا تھا۔ اور اسی کے متصل شہر مہرہ میں دوسرا بازار لگتا تھا[2]

(۲) **بلادُ الاَحقاف** یامہ۔ عمان۔ بحرین۔ حضرموت۔ اور مغربی یمن کے بیچ میں جو صحرائے عظیم الدہنا یا ربع الخالی کے نام سے واقع ہے۔ گو وہ قابل آبادی نہیں لیکن اُس کے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق زمین ہے۔ خصوصاً اُس حصہ میں جو حضرموت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے۔ گو اِسوقت وہ بھی آباد نہیں۔ تاہم عہد قدیم میں اِسی قطعہ مابین حضرموت و نجران میں عاد ارم کا مشہور قبیلہ آباد تھا۔ جس کو خدا نے اُنکی نافرمانی کی پاداش میں نیست و نابود کردیا

(۳) **صنعائے یمن** ملک یمن کا قلب اور یمن کے قدیم تمدن کی تماشاگاہ درحقیقت یہی ٹکڑا ہے۔ جو بحر ہند اور بحر احمر کے سواحل پر عرب کے شمالی و مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ معین۔ سبا۔ اور حمیر کی عظیم الشان سلطنتیں اِسی قطعہ زمین میں قایم ہوئی تھیں۔ سدِ مارب یا سدِ عرم اِسی کی وادیوں میں تعمیر ہوا تھا۔ ظفار۔ مارب اور اوزال یہیں کے پایہ تخت تھے۔ ملکہ سبا اِسی سرزمین کی شہزادی تھی۔ قصر غمدان۔ قصر ناعط۔ قصر ریدہ۔ قصر صرواح اور قصر مدر اِسی قطعہ ملک میں تعمیر ہوئے تھے۔ جنکے آثار چوتھی صدی ہجری میں ہمدانی نے برائے العین مشاہدہ کیے تھے۔

۱ ج ۲ ص ۲۰۔ ۲ یعقوبی ج ۱ ص ۳۱۴۔ ۳ توراۃ۔ تکوین ۱۰-۲۶۔

صنعا جو یمن کا اب پایۂ تخت ہے۔ قدیم شہر ازول کے پاس۔ اسلام سے ایک مدت پہلے آباد ہوا تھا۔ سنہ ۱۰ ہجری میں۔ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے۔ یہ ملک مشرف باسلام ہوا۔ اب یہاں زیادہ تر زیدی طریقہ کے مسلمان آباد ہیں۔ جو عقائد میں معتزلہ کی ایک شاخ اور شیعہ اور اہل سنت کے وسط میں ہے۔ یہاں کا امام بھی زیدی سادات کے خاندان سے ہے۔ یمن کے نباتات خصوصًا یمن کا قہوہ۔ (بُن) مشہور رہے۔ بعد اسلام شہر زبید یمن کا ایک مشہور شہر تھا جہاں سے متعدد علمائے اسلام پیدا ہوئے۔

(۴) **نجران** بلاد احقاف اور عسیر کے درمیان ایک مختصر سی آبادی تھی۔ عہد قدیم میں یہاں بنو اسماعیل میں سے قبیلہ ابن نزار آباد ہوا تھا۔ (یعقوبی ج ۱ ص ۲۵۵) عہد اسلام سے کچھ پہلے سے روم و حبش کی کوشش سے یہاں عیسائیت پھیل گئی تھی۔ یمن کی یہودی حکومت نے ان عیسائیوں کو بجبر یہودی بنانا چاہا۔ لیکن روم و حبش جو مسیحی ہمسایہ سلطنتیں تھیں۔ وہ برابر اُن کی حمایت کرتی تھیں۔ نجران میں ایک بہت شاندار کلیسا بھی تعمیر ہوا تھا۔ جو عربوں میں کعبہ نجران کے نام سے مشہور تھا۔ سنہ ۹ھ میں اہل نجران کا وفد آنحضرت صلعم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا تھا۔

(۵) **عسیر** بحر احمر کے ساحل پر حجاز اور صنعائے یمن کے مابین واقع ہے۔ یہاں کے باشندے عمومًا اہل حدیث ہیں۔ امام عسیر ادریسی خاندان کا ہے۔

ان ملکی تقسیمات کے علاوہ یمن میں بہت سے ساحلی مقامات اور جزائر ہیں۔ مثلًا شحر۔ مہرہ۔ بکلنج جزائر کوریا۔ موریا یا جزیرہ بریم وغیرہ۔ ان کی حکومت مختلف شیوخ کے ماتحت ہے۔ اور وہ زیادہ تر برٹش گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہے۔

زمانہ ظہور اسلام میں یمن حکومت فارس کے ماتحت تھا۔ سنہ ۹ ہجری میں یہاں کا آخری ایرانی گورنر مسلمان ہو گیا۔ اور ملک بلا جنگ و جدل علم اسلام کے زیر سایہ آ گیا۔

علاقۂ حجاز

حجاز بحر احمر کے ساحل پر ایک مستطیل صوبہ ہے۔ جس کا نام توریت میں فاران بتایا گیا ہے۔ اور جہاں سے تجلی ربانی کے ظاہر ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ اُس کے شرقی جانب نجد۔ مغربی جانب بحر احمر شمال میں عرب شام یا عرب الحجر۔ جنوب میں عسیر اور شمالًا جنوبًا کوہ سروات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جس کی بلند ترچوٹی ۸ ہزار فیٹ ہے۔ سلسلہ کوہ میں بہت سے چشمے جاری ہیں۔ جہاں گاؤں آباد ہیں

باغ لگے ہیں۔ کھیتیاں ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں جنگل ہیں۔ دامن کوہ سرسبز ہے۔ اور وہاں بھی آبادی ہے لیکن زیادہ آباد اور سرسبز حصہ وہ ہے۔ جو بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے۔ ان مقامات کے علاوہ تمام حصہ ریگستان ہے۔ جہاں کسی قسم کی زراعت نہیں ہو سکتی۔ حجاز کا سب سے بڑا ساحلی شہر جدہ ہے۔ جو مکہ کی بندرگاہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا ساحلی مقام ینبع ہے۔ جو مدینہ کی بندرگاہ ہے۔ اندرون ملک کے بڑے شہر مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور طائف ہیں۔

(۱) **مکہ یا بکہ**۔ جس کا تیسرا نام اُم القریٰ ہے۔ حجاز کا دار الحکومت ہے۔ یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر (ابراہیم علیہ السلام) کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر (اسماعیل علیہ السلام) کی قربان گاہ اور ایک یتیم پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مولد ہے۔

یہ شہر عرض البلد ۲۱ درجہ ۳۸ دقیقہ اور طول البلد ۴۰ درجہ ۹ دقیقہ پر واقع ہے۔ سطح آب سے تقریباً ۳۳۰ میٹر بلند ہے۔ اس کے چاروں طرف قدرت نے پہاڑوں کی دیواریں کھینچ دی ہیں۔ بالفعل شرقاً غرباً تقریباً ۲ کلومیٹر اور جنوباً شمالاً تقریباً ½ ۱ کلو میٹر چوڑا ہے۔ شرقی سلسلہ جبل خلیج (فلق) جبل قیقعان۔ جبل ہندی۔ جبل لعلع۔ اور جبل کدا سے مرکب ہیں۔ آخر الذکر جبل وہی ہے۔ جس کی راہ سے رسول اللہ صلعم بروز فتح مکہ میں داخل ہوئے جنوبی سلسلہ جبل ابو حدیدہ۔ جبل کُدیٰ اور جبل ابو قبیس کے بعض سلسلے سے مرکب ہے۔ مشرق میں جبل ابی قبیس اور اس کے پیچھے جبل خندمہ واقع ہے۔ مغرب میں جبل عمر واقع ہے

حجاز حضرت مسیحؑ سے ڈھائی ہزار برس پہلے کاروان تجارت کی ایک منزل گاہ تھا۔ تقریباً دو ہزار قبل مسیحؑ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو یہاں آباد کیا۔ باپ بیٹے نے خدا کے نام پر یہاں ایک قربان گاہ بنائی۔ جس کا نام کعبہ قرار پایا۔ فرزندان اسماعیلؑ کی اولاد ایک مدت تک یہاں دیگر قبائل پر بالادست رہی۔ اسکے بعد قحطانی قبائل (بروایت عام) آئے اور انہوں نے اپنا استیلا ظاہر کیا۔ بنو اسمٰعیل میں سے قصیؔ نے آخر یہاں کی ریاست حاصل کی قصی قریش کے پدر اعلیٰ تھے۔ عہد اسلام میں قریش یہاں کے مالک تھے۔ اُمور مملکت وصیغہائے حکومت ایک ایک شیخ خاندان کے زیر نگرانی تھے۔ شہر کے علاوہ اسماعیلی قبائل شہر کے آس پاس بھی آباد تھے۔ مکہ کی جنوب میں جو پہاڑیاں ہیں۔ وہ مشہور قبیلہ ہذیل کا مسکن تھیں۔ جنوب کی طرف وادی القراری ہے۔ جو قدیم قبائل کا مسکن تھا۔ اس کے اطراف میں قبائل کنانہ رہتے تھے۔ مکہ کے پاس جبل حبشی کے دامن میں قبائل احابیش رہتے تھے۔

مدینہ منورہ۔ قبل ہجرت نبوی اس شہر کا نام یثرب تھا۔ ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی صلعم یعنی رسول اللہ صلعم کا شہر ہوا۔ کثرت استعمال سے اوّل قائم مقام مضاف الیہ ہو کر المدینہ ہو گیا۔ یہ شہر سمندر کی سطح سے ۶۱۹ میٹر بلند اور طول بلند ۳۹ درجہ ۵۵ دقیقہ اور عرض ۲۴ درجہ ۱۵ دقیقہ شمال خط استوا پر واقع ہے۔ گرمی میں یہاں حرارت کا درجہ ۴۸ درجہ تک بڑھا رہتا ہے۔ اور جاڑوں میں دن کو صفر سے دس درجہ اوپر اور رات کو صفر سے ۵ درجہ نیچے ہوتا ہے۔ اس لیے جاڑوں میں اکثر صبح کو پانی یہاں یخ ہو جاتا ہے۔ پہلے یہاں عمالیق رہتے تھے۔ لیکن زمانۂ آمد اسلام میں یہاں کے عمائد اور قبائل اوس وخزرج آباد تھے۔ محققین حال کا بیان ہے۔ کہ یثرب مصری لفظ ہے۔ اور اتھریبس کی تعریب ہے ہمارے یہاں کے مؤرخین (اسلامی محققین) کا بیان ہے۔ کہ سب سے پہلے یہاں عمالیق آباد ہوئے تھے۔ اور اب[1] یہ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ عمالیق ۲۲۰۰ء ق م میں مصر کے حکمران تھے۔ اور ۱۶۰۰ء ق م میں وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اس بنا پر تعمیر شہر کا زمانہ ۱۶۰۰ء ق م اور ۲۲۰۰ء قبل مسیح کے درمیان ہے۔ عمالیق کے بعد سب سے اوّل یہود آ کر آباد ہوئے۔ ان کے بعد قبیلہ ازد[2] کی دو شاخیں اوس اور خزرج یہاں آ کر آباد ہوئیں۔ یہ اوس اور خزرج وہی قبائل ہیں۔ جن کا لقب اسلام میں **انصار** ہوا۔ اور جنہوں نے اسلام کی دعوت اوّلین قبول کی۔ اور مسافرین اسلام کو اپنے گھروں میں اُتارا جس کی مکافات میں خدائے اسلام نے انصار کے نام سے اُن کو زندگی جاوید بخشی۔ اور اُنکے شہر کو بیتیس ۳۵ کروڑ نفوس کا مرکز قرار دیا۔

بنو لام جو طے کی ایک شاخ سے مدینہ کے کوہستانی مقام میں آباد تھی۔ ہمدانی نے لکھا ہے۔ کہ بعد اسلام یہ شاخ دیار ربیعہ کو منتقل ہو گئی۔ بنو ظفر بھی حسب بیان ہمدانی مدینہ کے مقابل ہی سکونت

[1] بہر حال محققین جدید اور قدیم دونوں کے اتفاق سے یہ امر محقق ہو گیا۔ کہ یثرب کا وجود عمالیق کی آبادی کے وقت سے قائم ہوا۔ فاضل معاصر اگر زیادہ غور سے کام لیتے۔ تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ شاہان عمالیق میں سے ایک کا نام یثرب تھا جس نے اس شہر کی بنا ڈالی اور اسے آباد کیا۔ اسی لیے اُسکے نام سے یہ موسوم ہوا۔ ملاحظہ ہو اسپرٹ آف اسلام مولفہ رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی۔ ص ۱۳۲۔ مگر رائٹ آنریبل صاحب نے بھی کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسلیے علامہ سمہودی کے اخبار الوفا۔ باب اوّل اور فصل اوّل اور شرح زرقانی جلد اوّل ذکر مدینہ۔ ملاحظہ فرمائی جاوے۔

[2] قبیلہ اوس۔ اور خزرج اصلاً بنی جرہم میں جو عرب العاربہ یا قحطانی النسل ہیں۔ اور بنی جرہم کی قدیم سے بنو اسمٰعیلؑ کے ساتھ قرابت اور ہم بطنی تاریخ کا مسئلہ ہے۔ ملاحظہ ہو ابو الفدا۔ اور معارف ابن قتیبہ۔ اور خطبات احمدیہ۔ سر سید مرحوم مطبوعہ لاہور۔ ص ۹۵۔

پذیر تھے۔ بنو کلاب جو مشہور قبیلہ تھا۔ وہ مدینہ کے اطراف میں ربذہ۔ فدک۔ اور عوالی میں آباد تھا۔ بعد اسلام حسب روایات ہمدانی شام کو منتقل ہوگیا۔ جہاں اِس نے اپنی ایک ریاست بھی قائم کرلی۔

۳۔ طائف حجاز کی جنّت ہے۔ بے انتہا سر سبز و شاداب ہے۔ امرائے حجاز عموماً گرمی وہیں بسر کرتے ہیں۔ ابتداءً قبیلہ عدوان کا مسکن تھا۔ بعد کو وہ مشہور قبیلہ ثقیف کے قبضہ میں آیا۔ قبل ہجرت آنحضرت صلعم دعوت اسلام کے لیے تشریف لائے۔ لیکن جس طرح جلیل کے ایک شہر نے مسیح علیہ السلام کو قبول نہیں کیا۔ طائف نے بھی آپ کو قبول نہ کیا۔ ۸ھ ہجری میں آنحضرت صلعم نے طائف کا محاصرہ کیا۔ ۹ھ ہجری میں سردار ثقیف عروہ ابن مسعود نے اسلام قبول کیا۔ اور خود اپنی قوم کے ہاتھ سے اسلام کی راہ میں مارا گیا۔ لیکن اُس کی شہادت بے اثر نہ رہی۔ اسی سال وفد ثقیف خدمت نبوی میں حاضر ہوکر عقیدت کیش ہوا۔

(۴) جوف ثمود۔ تبوک۔ خیبر۔ اور مدین۔ اِن شہروں کے علاوہ بعض مقامات بھی قابل ذکر ہیں۔ مدینہ سے کچھ آگے بجانب شمال وہ میدان واقع ہے جہاں ثمود کا قبیلہ آباد تھا۔ جو جوف اور وادی القریٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پایۂ تخت کا نام حِجر تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ یہ شہر زیادہ تر اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کے نام سے مدائن الصالح کہلاتا ہے۔ ۹ھ ہجری میں تبوک کو جاتے ہوئے آنحضرت صلعم کا اِس شہر کی گذر ہوا تھا۔ اسی سے متصل دوسری آبادی تیما رہے۔ حجر اب ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ حجر کے بعد ایک اسٹیشن المعظم چھوڑ کر دوسرا اسٹیشن تبوک ہے۔ جہاں آنحضرت صلعم نے رومیوں کی مدافعت کے لیے اقامت فرمائی تھی۔ (اور اسی منزل کے مابین حضرت علی مرتضےٰ کی شان میں حدیث منزلت ارشاد فرمائی تھی) مدینہ کی جانب مغرب خیبر ہے۔ جو یہود کی جنگی قوّت کا مرکز تھا۔ اور جہاں یہودیوں کے بڑے بڑے قلعے تھے ۷ھ ہجری میں آنحضرت صلعم یہاں تشریف لائے۔ اُس کی تسخیر فرمائی۔ (یہی قطعہ زمین جناب علیؑ ابن ابی طالب اسد اللہ الغالب کی معرکہ آرائی اور قلعہ کشائی کی جلوہ گاہ ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں حدیث قدسی ناد علیاً اور حدیث نبویؐ لاعطین الرّایت الخ سیذول و منقول فرمائی گئی) حجر کے مقابل جانب مغرب بحر احمر کے ساحل پر شہر مدین آباد ہے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دار الہجرۃ اور اُنکے خسر و پیغمبر خدا۔ حوباب (شعیب علیہ السلام) کا وطن اور مدیانیوں کا پایۂ تخت تھا۔

عہد ظہور اسلام میں یہ تمام شہر یہودیوں کے قبضہ میں تھے۔ اور یہاں اُن کے بڑے بڑے قبیلے تھے۔ جن کو اسلام نے عہد نبوت میں یکے بادیگرے فتح کیا۔

عرب شام

یعنی وہ قطعہ عرب جسکو یونانی عرب سنگستانی کہتے ہیں۔ اور جو مابین شام۔ مصر بادیہ شام۔ حجاز اور نجد واقع ہے۔ یہ آبادی عرب کا بہت قدیم حصہ ہے۔ بلکہ اولین حصہ ہے۔ اکتشافات جدیدہ سے بھی پہلے گو اس ملک کی وقعت کم نہ تھی۔ کہ اِس کے صحرا میں بنو اسرئیل کا مسکن۔ اِسکے ایک پہاڑ پر اسرائیل کا ایک پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) خدا سے ہمکلام ہوا۔ اُس کے متصل ارض موعود واقع ہے۔ جس کو خدا نے ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام نے فرزندانِ اسرائیل کو وراثتاً بخشا۔ لیکن اکتشافات جدیدہ کے بعد اِس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ یہاں عمالقہ عرب کی آبادی تھی۔ اِنہی کھنڈروں میں اُنکی عظیم الشان حکومت قایم تھی۔ جسکا سلسلہ حجاز تک پھیلا تھا۔ اور جس میں بلقا۔ عمان۔ بصریٰ۔ تدمر وغیرہ شہر داخل تھے۔ تدمر ایک مشہور تجارتی منڈی تھی۔ زبّا یہاں کی ایک ملکہ کا نام تھا۔ جو ہمیشہ عربوں میں ضرب المثل رہی ہے۔ عہد آخر قبل اسلام میں یہ ملک بنو جفنہ ایک عرب خاندان کے زیر حکومت تھا۔ جو غسانہ (غسان) کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس کا پایہ تخت بصریٰ تھا۔ قبیلہ جہینہ کی متعدد شاخیں یہاں آباد تھیں۔ ہمدانی نے لکھا ہے۔ کہ بعد اسلام عرب شام میں تا حلب بنو عجل آباد تھے۔ ربیعہ شاخ طے کی بھی یہیں آبادی تھی۔ بنو خزیمہ کی اکثر شاخیں غزہ کے پاس سکونت پذیر تھیں۔ ظہور اسلام کے وقت یہ تمام اطراف زیر سایہ روم عرب عیسائی امرا اور یہود کے قبضہ میں تھے۔

عرب عراق

عرب عراق سے وہ وہ سرزمین مراد ہے۔ جسکو یونانی عرب ریگستانی کہتے ہیں۔ اور خلیج فارس۔ دریائے فرات بادیہ شام اور نجد کے مابین واقع ہے۔ اب عام طور سے لوگ اِسکو عراق عرب کہتے ہیں۔ اِس حصہ میں بھی عہد قدیم میں عمالقہ عرب نے ایک شاندار حکومت کی تھی۔ قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ یہاں آباد تھی۔ بعد اسلام عہد فاروقی میں اسی سرزمین میں کوفہ اور بصریٰ آباد ہوا۔ جو خالص عربی تمدن کا مظہر اور علمائے اولین کا مرکز تھا جس کی سرزمین میں متعدد علوم اسلامیہ کی بنیادیں قایم ہوئیں۔

ابن خلدون نے لکھا ہے۔ کہ اسی عرب عراق میں سنجار نام مقام میں۔ نہر فرات کے پاس قبیلہ عبید کی ایک ریاست تھی (قبل اسلام) جس کا آخری بادشاہ ضیزن بن معاویہ تھا۔ اس خاندان کے آثار عمارت اب تک میدان سنجار میں باقی ہیں۔ زبید شاخ طے بھی اسی مقام میں آباد ہوئی تھی۔ بنو عجل کی ایک شاخ

بابل سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔
ظہورِ اسلام کے وقت ایک عرب خاندان (مناذرہ) زیر سایہ حکومت فارس یہاں کا فرمانروا تھا اس کا پایۂ تخت شہر حیرہ متصل کوفہ تھا۔ (ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۲-۸۸)

جغرافیہ حال کے مطابق عرب کے مشہور و معروف مقامات

شہر مکہ معظمہ۔ (اس کے حالات اُوپر لکھے جاچکے ہیں) مزید اطلاع کے لیئے ذیل کا اضافہ کیا جانا ضروری ہے یہ شہر بطحا کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور اس کو بلد بھی کہتے ہیں۔ حضرت عبد المطلب کو سید البطحا کہتے تھے (ابن ہشام) حضرت ابو طالب کا بیضۃ البلد خطاب تھا۔ (ابن اثیر) یہ شہر بندرگاہ جدہ سے ۵۰ میل پورب کی طرف واقع ہے۔ اِس کی آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ یہ مقدس وادی اور اسکا مبارک دامن دور دُور تک انبیا و اصفیاء اللہ کی یادگار۔ اور اُنکی قابل التعظیم اخبار و آثار سے بھرا پڑا ہے۔ کوہ صفا و مروا وادی منیٰ۔ مزدلفہ۔ جبل ثبیر۔ غار ثور۔ غار حرا۔ شعب ابیطالب۔ حدود مکہ کے داخلی مقامات ہیں۔ اور یہ تمام مقدس اور متبرک مقامات اپنی عظمت اپنی قدامت کا جُدا جُدا تیار اور مرتب دفتر رکھتے ہیں جو موجودہ سلسلہ تالیف میں اپنے اپنے مقامات مناسب پر انشاء اللہ بیان کیئے جائیں گے۔
مکہ سے ایک منزل شمال کی طرف **حُدیبیہ** ہے۔ جہاں بیعت الرضوان۔ تاریخ اسلام کا بہت بڑا واقعہ جس کو حقیقتاً فتح مکہ کی کلید سمجھنا چاہیئے۔ ۶ھ میں واقع ہوا۔ **حدیدہ۔** چھوٹا سا ساحلی مقام ہے۔ حجاج احرام (حج کرنے کے کپڑے) یہیں سے باندھتے ہیں

مدینہ منورہ۔ (اسکے حالات بھی اوپر لکھے جاچکے ہیں) مزید اطلاعات کا حسب ذیل اضافہ ہے۔
مکہ معظمہ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں یمن و برکت کے اعتبار سے۔ تنزیہ و تقدیس کا یہ دوسرا مقام ہے جہاں سے دعوت اسلام کی ابتدائی آواز پر سب سے پہلے صدائے لبیک سنائی دی۔ جہاں سب سے پہلے اسلام کے قیام اسلام کے استحکام کی کوششوں میں۔ جاں نثاری۔ وفاشعاری۔ جانبازی اور سرفروشی کے عہد و میثاق مستحکم کیئے گئے۔ رفتہ رفتہ بارگاہِ نبوت میں ان کی صداقت و حمایت پر اتنا اعتبار کیا گیا۔ کہ ان بیگانوں کو یگانوں پر ترجیح دی گئی۔ اور اپنے موطن کو چھوڑکر اُن کی خوش نصیب زمین کو اپنا مسکن پھر مدفن بنایا گیا۔ یہاں کے باشندے (قبیلہ انصار) بھی اپنے قول کے ایسے پکے اور وعدے کے ایسے سچے نکلے۔ کہ جس خلوص و عقیدت سے اسلام کو اپنے گھر لائے تھے۔ اُسی جوش ہمت اور زور استقلال سے اُسکی حمایت و نصرت میں مستعد اور تیار رہے۔ یہاں تک کہ اسلام کی اصلی نشو و نما اور حقیقی فروغ اسی قطعۂ زمین کی

شروع ہوا۔ نزول اسلام کے وقت سے اس شہر کا نام مدینۃ النبیؐ۔ طیبہ۔ اور دار الہجرۃ مشہور ہوا خلاصۃ الوفا میں اس شہر کے ۹۵ نام گنائے گئے ہیں۔ مگر وہ تمام اسمائے مبارکہ توصیفی ہیں۔ جو اسلامی مؤلفین کے خامہائے عقیدت کے رشحات ہیں۔ اور مشہور نہیں ہیں۔ مکۂ معظمہ کی طرح یہ شہر بھی اہل اسلام کے نزدیک واجب الاحترام ہے۔ اور تقدیس و تقدیم کے جوہروں سے پُر اور مملو۔ جنکا بیان اپنے اپنے مقام پر معلوم ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں۔ یہ شہر علاقہ حجاز کیا تمام جزیرہ نمائے عرب کا رونق اور آبادی کے اعتبار سے سرمایۂ ناز ہے۔ تمام شہر کے چاروں طرف ۴۰ فٹ اونچی شہر پناہ ہے۔ جس میں اونچے اونچے پھاٹک لگے ہیں۔ شہر پناہ کے جنوبی دروازے کو باب المصر کہتے ہیں۔ آب وہوا لطیف اور خوشگوار ہے۔ یہاں کا پانی مکہ کے پانی سے زیادہ شیریں اور خوش ذائقہ ہے۔ اہل شہر نیک طینت۔ خوش مزاج اور مہمان دوست ہیں۔ تمام شہر میں پٹی ہوئی نہر کے ذریعہ سے آب رسانی کا کافی انتظام ہے سڑکوں اور راستوں میں جابجا پانی کی کلیں لگی ہیں۔ جب چاہے پانی لے لو۔

مدینہ کا بندرگاہ۔ ینبع ہے۔ جو ایک شب و روز کی مسافت پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس مقام کو جار بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک رات کی مسافت پر چشمہ بدر واقع ہے۔ جو غزوات اسلامی کی پہلی رزمگاہ ہے۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں حضرت علی مرتضیٰؑ نے ولید۔ عتبہ اور دیگر صنادید قریش کو قتل کر کے اسلام کی فتحیابی کا علم نصرت بلند کیا تھا۔

بدر کے جنوب و شرق میں جحفہ واقع ہے۔ جو مکہ سے ۴۔ مدینہ سے ۶۔ اور رجا سے ۳ منزل واقع ہے۔ اور قوافل کے اُترنے کا مشہور و معروف مقام ہے۔ جحفہ سے تقریباً ۳ منزل پر غدیر خم واقع ہے۔ جہاں حجۃ الوداع سے مراجعت فرماتے وقت ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ ہجری میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تکمیل و مقبولیت کے متعلق آیہ وافی ہدایہ اتممت لکم دینکم ورضیت لکم الاسلام دینا اور جناب علی مرتضیٰؑ علیہ السلام کی تاکید ولایت و وصایت کی نسبت نزول آیہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل علیک الخ کے مطابق حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ کی بشارت ایک لاکھ چوبیس ۱۲۴ ہزار مسلمانوں کے سامنے (ابن اثیر) پہونچائی تھی۔ تفصیلی ذکر اپنے مقام پر مرقوم ہوگا۔

ینبع مشہور بندرگاہ ہے۔ جو مدینہ طیبہ سے مغرب میں بحر قلزم کے کنارے سو میل کے فاصلے سے واقع ہے۔ حنین مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ فتح مکہ کے بعد ثقیف اور ہوازن کے قبائل یہیں اسلام سے لڑے۔ اور پسپا ہوئے۔ یلملم چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یمن سے دو رات کی مسافت پر قنفدہ بندرگاہ

جدہ سے جنوب کی طرف حجاز کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ جدّہ حجاز کی مشہور بندرگاہ ہے اسکی آبادی تیس ہزار ہے۔ پہلے سلطان روم کا اور اب سلطان حجاز کا ایک ماتحت افسر اور حکومت برطانیہ کا کونسل رہتا ہے۔ طائف سے ایک رات اور مکہ سے تین راتوں کی مسافت پر عکاظ واقع ہے۔ جو قدیم زمانہ میں بہت بڑے سالانہ میلہ کا مقام تھا۔ صنعا۔ جو قدیم میں اوزال کہا جاتا تھا جسکا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ مزید یہ ہے۔ تمام عرب میں باعتبار خوبی اور انتظام صفائی وغیرہ کے یہ شہر عمدہ اور نفیس مشہور ہے۔ اس کی آبادی پچاس ہزار بتلائی جاتی ہے۔ شہر عدن سے ۲۶۰ میل کے فاصلہ پر ایک سبز و شاداب وادی میں واقع ہے۔ تمام عرب میں تمدن ملکی اور سیاسی یہیں سے پھیلا۔ اسکے شمال و مغرب میں ۱۲۵ میل کے فاصلہ پر صعدہ ہے۔ جہاں کا کمایا ہوا چمڑہ بہت مشہور ہے۔ اور دُور دُور ملکوں میں جاتا ہے زبیدہ سے دو منزل پر بیت الفقیہ ہے۔ جہاں کثرت سے قہوہ کی تجارت ہوتی ہے مخا باب المندب پر واقع ہے۔ کافی یہاں کی مشہور ہے۔ جند صنعا سے ۵۸ فرسخ پر اور ذمار دو منزل جنوب کی طرف واقع ہے۔ حصن المواہب صنعا سے ۵ فرسخ پر شمال کی جانب واقع ہے۔

عدن جسکا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ بہت بڑی تجارت گاہ ہے۔ چھیالیس ہزار آبادی ہے۔ اس سے ملے ہوئے علاقہ حضرموت پر حکومت برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اور ۱۹۳۶ء سے گورنر بمبئی کے ماتحت ہے۔ یمن کی اور آبادیاں رداعہ۔ حمیر حیوان۔ لحجہ۔ توس۔ قمری۔ اور ثوران بھی قابل الذکر ہیں۔ منامہ علاقہ بحرین کا مشہور شہر ہے۔ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت ہے۔ اسمقام کے موتی۔ تمام اوصاف و اصناف کے اعتبار سے بے نظیر ہوتے ہیں۔ اور اقطاع عالم میں مشہور ہیں۔ قطیف بھی یہاں کے مشہور بندرگاہوں میں ہے۔ دیگر مقامات قویت۔ مغرین۔ ہجر۔ اور جوف بھی قابل الذکر ہیں مسقط (اوپر ذکر ہوچکا ہے) سلطان مسقط کے زیر حکومت ہے۔ جو ۵ ے جہاز تجارتی کا مالک ہے۔ موتی مچھلی۔ اور میوؤں کی بہت بڑی تجارت گاہ اور عربوں کے کمال صنعت و حرفت کا مرکز ہے۔ بحر عُمان اور عربی سواحل پر جتنے عمدہ اور خوبصورت جہاز اور کشتیاں دیکھی جاتی ہیں۔ وہ سب قریب قریب مسقط ہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ برکہ۔ رستاق۔ سوہار اور مرباط۔ یہاں کے دوسرے قابل الذکر مقامات ہیں۔ علاقہ نجد میں جبل الشمر ایک جداگانہ عربی حکومت ہے۔ دار الحکومت شہر حائل ہے جسکو بطن الرملہ بھی کہتے ہیں۔ اسی کے قریب جبل السمار ہے۔ اور یہاں حاتم طائی کی قبر ہے۔ اسی کے قریب وادی ساجوف ہے۔ یہ چھوٹی سی حکومت۔ ریاست جبل الشمر کے ماتحت ہے۔ پایۂ تخت اس کا شہر جوف ہے۔ جوف کے اوپر طرف دومۃ الجندل واقع ہے۔ جو ۱۲ھ ہجری میں۔ ابوموسی الاشعری کے

احمقانہ اور عمر عاص کے مفسدانہ محاکمہ کی فیصلہ گاہ بن چکا ہے۔ حجر کے شمال میں تیمار ہے۔ جو بہت مشہور مقام شمار ہوتا ہے۔ تیمار کے شمال میں تطبیہ ہے۔ اور تطبیہ کے شرقی شمالی جانب فید ہے۔ جو مدینہ منورہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرموت کے علاقہ میں۔ سقوط۔ طریم۔ ساوہ اور نافع وغیرہ مشہور مقامات ہیں۔

اہل عرب کی جسمانی ساخت اور تمدنی حالات

عرب کے باشندے قد و قامت میں معتدل۔ جسمی ساخت میں مضبوط اور رنگت میں عموماً گندم گوں ہوتے ہیں۔ سواحل اور خصوصاً مصر سے ملے ہوئے علاقوں کے رہنے والے عربوں کے رنگ کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ قوم و قبیلے جو وسط ملک میں رہتے ہیں۔ اُن سے زیادہ صاف اور چھریرے ہوتے ہیں۔ بادیہ نشین قبائل اپنے مویشیوں کے گلّے لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر برابر نقل و حرکت کیا کرتے ہیں۔ یہی مویشی انکے گلّے انکے گذران اوقات کے اصلی ذرائع ہیں۔ ان کے علاوہ اور قوم و قبائل کے اعراب۔ تجارت۔ زراعت۔ فلاحت اور تحصیل علوم و فنون کے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی خاص غذا روٹی اور گوشت ہے۔ گیہوں اور جَو کی روٹیاں زیادہ کہاتے ہیں۔ ویسے ہی دُنبوں اور اونٹ کا گوشت۔ ان میں قبائل بندی کے دستور اسوقت تک قائم ہیں ہر قبیلہ کا ایک شیخ ہوتا ہے۔ جو اُن کا مستلزم الاطاعت حکمران ہے۔

عرب کے قدیم اقوام و قبائل اور اُنکے مساکن

عرب کی قدیم تاریخ میں اسلامی مؤلفین نے کوئی مکمل مفصل اور مسلسل کتاب مرتب نہیں کی ہو مگر حتی المقدور وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے۔ جتنا کچھ ذخیرہ وہ جمع کر گئے ہیں۔ اور جیسا کچھ سرمایہ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ متلاشین حقیقت کے سر آنکھوں پر رکھنے جانے کے قابل ہے۔ ان کے ان واجب التعظیم اور قابل قدر تالیفات و تصنیفات کی ایک فہرست اپنے مقام پر بہت جلد لکھی جائیگی اوّل تو زمانہ ہائے دراز کی گذشتہ واقعات کا زبانی یاد رکھنا اہل عرب کی فطرت کے اصلی جوہر تھے اس فطرتی خصوصیت کے ساتھ۔ حبّ وطن۔ نسبی اور حسبی مفاخرت اور قومی عظمت کے عناصر بھی داخل تھے۔ پھر سلاطین ملکی و فرمانروایان قومی اور سردار و شیوخ قبائل کے اثر و اقتدار نے بھی بہت کچھ حوصلہ افزائی کی۔ ان ذخائر کے لیے سلاطین حیرہ کا کتب خانہ بہت مشہور و معروف تھا

ابن ہشام کو خوش قسمتی سے اِس خزانے کے چند جواہر پارے ہاتھ لگ گئے۔ اور اُنہوں نے اس ذخیرہ کو اپنی کتاب تیجان میں جمع کر دیا۔ اس کے علاوہ عرب کے **اشعار جاہلیت** یہ اُن دونوں ذریعوں سے انکشاف حالات اور حصول اطلاعات کے لیئے زیادہ حامی اور مددگار ثابت ہوئے ابن ہشام نے ازمنہ قدیمہ کے نقل حالات میں زیادہ تر انہیں اشعار سے کام لیا ہے۔ ان اشعار میں شاعری کے کمالات۔ نکات۔ اور رعایت کے علاوہ۔ قدیم سلاطین عرب۔ اقوام۔ قبائل۔ عمارات۔ تمدن اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہر قسم کے اخبار و آثار پائے جاتے ہیں۔

قریب قریب تمام اسلامی مورخین و مؤلفین نے۔ اپنی اپنی تالیفات میں قدیم حالات و واقعات کے سلسلہ ملانے کی غرض سے انھیں اشعار کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ ابن ہشام۔ ابن قتیبہ۔ طبری۔ ابو الفدا ابن خلدون۔ یعقوبی۔ یاقوت۔ سمہودی وغیرہم۔ انھیں حدائق شعرا کے گلچین ہیں۔ اور اب اسلامی تالیفات اور عربی تاریخوں میں۔ عرب کے ازمنہ سابقہ کی تاریخ کے متعلق جو کچھ جستہ جستہ اور غیر مسلسل حالات منقول ہیں۔ وہ یا تو انہی اشعار قدیمہ سے مستنبط کیئے گئے ہیں۔ یا قدیم عرب کے اُن بچے کھچے تالیفات سے ماخوذ ہیں۔ جو ابن ہشام اور کلبی وغیرہ کو ہاتھ آئے ہیں۔ مگر جیسا اُوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ سرمایہ نہ مکمل کہا جا سکتا ہے۔ نہ مسلسل۔

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ اتنی بے شمار مدت کے بعد اُن کے تفصیلی حالات معلوم ہونا نہایت دشوار ہے۔ اور اسی باعث سے شمس العلما شبلی صاحب نے اس وادی میں ہمت کا قدم نہ بڑھایا۔ اور اُن کے حالات کو قطعاً مرفوع القلم فرمایا۔ اس کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل تو وہی تحقیق کی دقت۔ مواد کی قلت اور دوسری سیرۃ النبی صلعم کے متعلق آپ نے ان حالات کو زائد از ضرورت اور باعث طوالت سمجھا۔ ممکن ہے۔ کہ کسی حد تک آپ کا یہ گمان و قیاس صحیح ہو۔ مگر میرے نزدیک **رسول عربی** پیغمبر مدنی اور خصوصاً المکی الابطحی التہامی (روحی لہ الفداء) کے سیرت نگار کو ان خصوصیات و تعلقات پر نگاہ رکھنا ضرور تھا۔ کہ جس مقدس زمین سے قدرت نے **رسول ہاشمی صلعم** کو مخلوق پر مبعوث فرمایا۔ وہ آپ سے پہلے انبیا و مرسلین علیہم السلام کی جائے ولادت مسکن نے عبادت اور مقام زیارت بن چکی ہے۔ اور ان تمام نفوس قدسیہ کو عرب کے اُنہی اقوام سابقہ اور قبائل قدیم سے پورا تعلق ہے۔ جن کو آپ نے اپنے تحریری جریدہ سے نظری کر دیا ہے۔ میں نے انہی خصوصیات کے بنا پر ان کے قدیم حالات کو کسی قدر زیادہ تحقیق و تفصیل سے لکھدیا ہے۔ اور اپنے سلسلہ بیان کو اُمم قدیمہ اور عرب کے اقوام سابقہ کے حالات و واقعات سے مرتب کر کے بالکل

مکمل کر دیا ہے۔
عرب کے اشعار جاہلیت کو یا تنہا عربی مؤلفین و مصنفین کے تالیفات و تصنیفات کو ان معلومات کا کافی ذریعہ سمجھنا بھی ناکافی ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ کتب مقدسہ قدیمہ اور دیگر مذاہب و اقوام کے اُن جدید تالیفات و تصنیفات اور تازہ انکشافات کا مطالعہ اور موازنہ بھی ضروری ہے۔ جو عرب میں قبل و بعد ظہور اسلام مدون اور مرتب ہوئی ہیں۔ میں نے اِس ترتیب اور سلسلہ کے خیال سے چار اقسام مختلفہ کے ماخذوں سے خوشہ چینی کی ہے اور اُن کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں جمع دیا ہے۔
مگر قبل اسکے کہ ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان کو عرب کے قبایل و اقوام قدیمہ کی تفصیل میں آگے بڑھائیں ہم کو اپنے مرقومہ بالا۔ ماخذوں کی حقیقت کا انکشاف بھی نہایت ضروری ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں

(۱) ادبیاتِ اسلامیہ۔ (۲) ادبیاتِ اسرائیلیہ۔
(۳) ادبیاتِ یونانیہ و رومانیہ۔ (۴) اکتشافاتِ اثریہ

ادبیاتِ اسلامیہ۔ میں قرآن مجید۔ اشعار عرب قبل اسلام۔ اسلامی کتب جغرافیہ۔ تاریخ و انساب شامل ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں عرب کے مختلف قوم و قبائل کے حالات مختصر مذکور ہیں۔ اُن سے صرف عبرت اور بصیرت فی الاحوال مقصود و منظور ہے۔ اس لیے یہ بالکل صحیح ہے۔ اور یہ واقع کہ قرآن مجید میں جغرافی۔ تاریخی اور سیاسی حالات ملک کی تلاش و جستجو بالکل بیکار ہے۔
عہد نبوت میں زیادہ تر خیالات عام تحصیل دینیات اسلام کی طرف متوجہ تھے۔ اور نیز اِس وجہ خاص سے کہ علوم دینیات کو ان تعلقات ملکی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اور صحابہ جس قدر اپنے ملک کے سیاسی اور تاریخی حالات جانتے تھے۔ وہ اِن کے نزدیک بالکل کافی تھے۔ اس لیے عہد نبوت سے لیکر چاروں خلافتوں کے زمانہ تک اِن اقسام کے تدوین و ترتیب کی کوئی فکر نہیں کی گئی۔
خلافت رابعہ ہی کے عہد سے استنباط علوم اور اسلامی تالیفات کی تدوین کی ابتدا ہوئی۔ اور سب سے پہلے ابو الاسود دوئلی نے علم النحو کے ابتدائی اُصول باب مدینۃ العلم کی خدمت سے حاصل کر کے مستنبط کئے۔ گویا عربی نحو اور ادبیات کی اُسی وقت سے بنیاد قایم ہوئی۔ امارت معویہ کے زمانہ میں سب سے پہلے عبید بن شریہ نے علم تاریخ کی تدوین کی۔ اور کتاب اخبار الملوک الماضیین لکھی۔ اس کے بعد اسی زمانہ میں ہشام کلبی اور قاضی ابو البختری نے انساب میں۔ اور ابن ہشام نے مغازی سیرت اور تاریخ کو ترتیب دیا
ہر شخص اس امر کو تعجب سے دیکھے گا۔ کہ اسلام میں حدیث و تفسیر کی کتابوں سے پہلے۔ کتب تاریخ و انساب

کی تالیف و تصنیف شروع ہوئی۔ اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ تاریخ و علم انساب کے موضوع کے لیئے عرب کی طبیعت اور فطرت قدرت کی طرف سے خاصکر موزوں پیدا کی گئی تھی۔ اسلیئے اصول فطرت کے مطابق سب سے پہلے اُنکی طبیعت کا رجحان و میلان اُسی شئے کیطرف ہوا جس سے اُنکو خاص دلچسپی تھی

اسلامی عالم تالیفات و تصنیفات۔ عبید ابن شریۃ۔ امیر معاویہ کا معاصر تھا۔ اس کی اصل کتاب اخبار الملوک الماضیین (گذشتہ بادشاہوں کے حالات) تو بالکل معدوم ہے۔ مگر اس کے اقتباسات مسعودی میں جابجا موجود ہیں۔ اس کتاب کے بعد دوسری اور تیسری صدی میں ذیل کی کتابیں لکھی گئیں۔

کتاب مغارات قیس والیمن (۲) کتاب خبر عبد القیس (۳) کتاب مناقب باہلہ (۴) کتاب بکر و الجرم (۵) کتاب بیوتات العرب (۶) کتاب ماثر العرب (۷) کتاب ماثر غطفان (۸) کتاب قصۃ الکعبہ (۹) کتاب الخمس من قریش (دربابِ حدیث نے اس تمام واقعہ کی تغلیط کی ہے۔ مؤلف) (۱۰) کتاب الاوس والخزرج (۱۱) کتاب ایام بنی یشکر (۱۲) کتاب المبرد (۱۳) کتاب ایام بنی مازن (۱۴) کتاب قحطان و عدنان۔ یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ یہ تمام کتاب ایک تنہا اسلامی مؤلف ابو عبیدہ کی ہیں۔ کیا یہ اس کے کمال کا معیار نہیں ہو سکتا۔ اسی صدی کے دوسرے مؤلف ہشام کلبی کے تالیفات یہ ہیں۔

(۱) کتاب من نقل من عاد و ثمود و العمالیق و جراہم و بنی اسرائیل من العرب (۲) کتاب ملوک کندہ (۳) کتاب طسم و جدیس۔ (۴) کتاب عاد الاولیٰ و الثانیہ (۵) کتاب تفرق عاد (۶) کتاب اصحاب الکہف (۷) کتاب الحیرۃ۔ قاضی ابو البختری کی کتاب طسم و جدیس ابن ہشام کی تالیف سیرۃ النبیؐ ہے۔ جس کے مقدمہ میں عرب قدیم کی تاریخ ہے۔ ہمیری ذکر کو ایک علیحدہ کتاب میں جمع کیا۔ اور اُسکا نام کتاب التیجان رکھا۔ ہمدانی کے تصنیفات صفۃ الجزیرۃ العرب لیڈن (یورپ) میں چھپ گئی ہے۔ اُس کی دوسری کتاب اکلیل کامل ابھی تک نہیں ملی۔ اُسکا ایک ٹکڑا پروفیسر ڈی۔ ایچ۔ مولر D.H.Muller. کی سعی و اہتمام سے شایع ہوا۔ جو ذیل کے دس بابوں پر منقسم ہے:۔ باب اول دربیان ابتدائے خلقت و تقسیم انساب و اقوام عرب و عجم و حمیر۔ باب دوم دربیان نسب فرزندان الہمیسع ابن حمیر۔ باب سوم دربیان فضائل قحطان۔ باب چہارم دربیان تاریخ یعرب ابن قحطان تا عہد تبع ابوکرب۔ باب پنجم دربیان تاریخ عہد اوسط از تبع ابوکرب تا عہد ذو نواس۔ باب ششم دربیان تاریخ عہد آخر از ذو نواس تا عہد اسلام۔ باب ہفتم دربیان قصص کاذبہ و اخبار مستحیلہ۔ باب ہشتم دربیان عمارات حمیر و شاہان حمیر و مرثیہائے حمیر و مقابر و مزارات حمیر و اشعار حمیر و نقوش و کتبات حمیر۔ باب نہم ضرب الامثال زبان حمیری و خط حمیری۔ باب دہم حالات قبیلہ ہمدانی حمیر۔ خدا کی قدرت دیکھئے ہندوستان۔ ایران۔ افغانستان اور غالباً خاص عرب اور دیگر اسلامی ممالک میں کہیں بھی اس کتاب کی جزو یا کل کا موجود

دوسری اور تیسری صدی میں تو متعدد کتابیں حدیث۔ تفسیر۔ تاریخ اور انساب میں لکھی گئیں جنکی کامل فہرست حاشیہ پائین صفحہ میں مختصر ذکر کے ساتھ قلم بند کی گئی ہے۔ چوتھی صدی سے علم جغرافیہ کی ابتدا ہوئی۔ اور سب سے پہلے ابن الحائک ہمدانی نے عرب کے جغرافیہ میں دو کتابیں صفۃ جزیرۃ العرب اور اکلیل لکھیں۔ صفۃ جزیرۃ العرب۔ جزیرہ عرب کا خاص جغرافیہ ہے۔ اکلیل یمن کی خاص تاریخ ہے۔ دونوں بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ اور مؤلف دونوں کتابوں کے استنباط و استخراج مستفید ہو چکا ہے (ان کے باقی حالات حاشیہ زیرین میں ملاحظہ ہوں)

اشعار عرب قبل اسلام کے متعلق علقمہ ابن علقم ایک شاعر نے قصیدہ نونیہ میں حمیر اقوام تبع کے حالات اور عام عمارات کے ناموں کو نظم کیا ہے۔ ۵۷۳ھ میں نشوان ابن سعید الحمیری نے قصیدہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر برٹش میوزیم۔ لندن (عجائب کدہ لندن) اور رائل لائبریری برلن (شاہی کتب خانہ برلن) میں موجود ہے۔ مستشرقین یورپ اس کتاب کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اور عرب کی تاریخ قدیم کے متعلق اس سے زیادہ مستند کوئی اور حوالہ نہیں سمجھتے۔ ہمدانی چونکہ خود حمیری سلسلہ سے تھا۔ اور زبان حمیری سے واقف بھی تھا۔ اس لئے آثار و کتبات کو وہ پڑھ سکا تھا۔ اب ہم اُن مؤلفین عرب اور اُن کی تالیفات کی ایک فہرست ذیل میں لکھے دیتے ہیں۔ جنہوں نے اقوام و قبائل عرب قدیم کا ذکر کیا ہے۔

نام مصنف	سنہ وفات	نام تصنیف	مقام طبع
ابن ہشام	سنہ ۲۱۸ھ	کتاب السیرۃ	مطبوعہ یورپ و مصر
ابوالولید ازرقی	سنہ ۲۲۳ھ	اخبار مکۃ	” ”
ابن قتیبہ	سنہ ۲۷۶ھ	کتاب المعارف	” ”
ابن واضح یعقوبی	سنہ ۲۷۷ھ	تاریخ یعقوبی	” ”
ابوجعفر طبری	سنہ ۳۱۰ھ	تاریخ الرسل والملوک	” ”
حمزۃ اصفہانی	سنہ ۳۶۰ھ	تاریخ بنی ملوک الارض	کلکتہ
مسعودی	سنہ ۳۴۶ھ	مروج الذہب	مصر
ابوالفداء	سنہ ۷۲۷ھ	المختصر فی احوال البشر	یورپ و مصر
ابن خلدون	سنہ ھ	العبر و دیوان المبتدا والخبر	” ”

حمیریہ کے نام سے۔ خاندانِ حمیر کی تاریخ نظم کی جس میں سلاطین حمیر کے کثرت سے نام گنائے گئے ہیں سیرت کا سلسلہ جیسا ہم اوپر بتلا آئے ہیں۔ دوسری صدی سے آغاز ہوا۔ عرب قدیم کا سب سے پہلا مورخ یا سیرت نگار ابن اسحاق المتوفی سنہ ۱۵۱ھ جو اس وقت ابن ہشام المتوفی سنہ ۲۱۸ھ کی روایت سے موجود اور اس کی تصنیف کتاب السیرۃ کا جزو اعظم ہے۔ اس کے بعد کے مورخین اسلام نے بھی عموماً اپنی تاریخ کی تمہید میں تاریخ عرب و بنی اسرائیل کے ضمن میں اشخاص و اقوام عرب کے حالات لکھے ہیں (ان مولفین اور ان کی تالیفات کی فہرست بھی حاشیہ میں ملاحظہ ہو)

بقیہ حاشیہ صفحہ اول عربی جغرافیہ نویس اور اُن کی کتابوں کے نام:۔

مصنف	سنہ وفات	نام تصنیف	کیفیت
ابوزیاد کلابی	اواخر سنہ ۲۰۰ھ	کتاب النوادر	کتاب کے چند ٹکڑے ہیں۔ ایک عرب کے جغرافی حالات میں ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں جغرافیہ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔
نضر بن شمیل	سنہ ۲۰۳ھ	کتاب الصفات	کتاب کا دوسرا ٹکڑا عرب کے خیمہ گاہوں گھروں، پہاڑوں اور گھاٹیوں کے بیان میں ہے۔
ہشام بن محمد کلبی	سنہ ۲۰۶ھ	کتاب البلدان کتاب الاقالیم	دو حصہ ہیں حصہ اول میں حاضرات۔ قصبات عرب۔ دوسرے میں جغرافیہ عالم
ابوسعید الاصمعی	سنہ ۲۱۳ھ	کتاب جزیرۃ العرب والمیاہ العرب	پہلی کتاب میں عام جغرافیہ عرب ہے۔ دوسری میں عرب کے تالابوں چشموں اور دیگر وادیوں کے بیان میں۔
سعدان ابن مبارک	اوائل سنہ ۳۰۰ھ	کتاب الارضین والمیاہ والجبال	عرب کی زمین پہاڑ اور تالابوں کے بیان میں۔
ابوسعید حسن سکری	اواخر سنہ ۳۰۰ھ	کتاب المناہل والقری والابیات	عرب کی گھاٹیوں آبادیوں اور گھروں کے بیان میں۔
عمر ابن رستہ	اواخر سنہ ۳۰۰ھ	الاعلاق النفیسہ	اس کتاب کی ساتویں فصل جغرافیہ عرب میں ہے۔ اصل و کامل کتاب ازحد نایاب ہے۔ ایک ٹکڑا متعلق صنعاء۔ دیمن سمیٹک اسٹڈی سیریز نمبر ۳ میں رچرڈ گوتھائیل نے چھاپا ہے۔
ابن حائک ہمدانی	سنہ ۳۲۰ھ	صفۃ الجزیرۃ العرب	جغرافیہ عرب میں محقق ترین کتاب ہے۔ عرب کے اقطاع۔ اقوام۔ قبائل حیوانات راستہ۔ پہاڑ۔ تالاب۔ چراگاہ۔ وادی۔ معدنیات۔ آثار قدیمہ مقامات قبائل بعد مسافت وغیرہ کے بیان میں۔
ابوزید بلخی	سنہ ۳۲۰ھ	کتاب المہدی والاخبار	فصل تیسری عرب کے جغرافیہ اور اُس کے مساجد راہ اور اُس کے

جغرافیہ نگاران عرب کی نسبت یہ بد اعتقادی پھیلی ہوئی ہے۔ کہ گویا وہ اس صنف علم سے بالکل کورے تھے۔ اونہوں نے بذات خود اپنے ملک یا غیر ممالک کا کوئی جغرافیہ نہیں لکھا۔ بلکہ بطور استعار دوسروں کے تحقیقی معیار اپنی تالیفات و تصنیفات میں نقل کیئے۔ اس غلط خیال کے پھیلانے والے زیادہ تر یوروپین مولفین اور زمانہ موجودہ کے خام محققین ہیں۔ جو انہیں کے خوشہ چین ہیں۔ اور اس عالم فریبی میں انکی تحریک ہیں یوروپین مؤلفین اور اُن کے معتقدین کو اگر تحقیق مسائل کا مذاق سلیم حاصل ہے۔ تو انکو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اہل اسلام یعنی مسلمانان عرب میں جغرافیہ نویسی کی ابتدا، خود عرب سے ہوئی۔ اور اُن میں اس شائبہ علم کا سلیقہ۔ اُس وقت سے پیدا ہو گیا تھا۔ کہ جب عرب میں کوئی متنفس یونانی لفظ "جغرافیہ" کے معنی کیا نام سے بھی واقف نہ تھا۔ یوروپین محققین نے اپنی غلط فہمی اور کوتہ عقلی سے یہ سمجھا ہے۔ کہ عربوں نے یونانی اور رومانی جغرافیہ عرب کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ یہ خیال قطعی غلط ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ اول

مصنف	سنہ وفات	نام تصنیف	کیفیت
			عجائب و آثار کے بیان میں۔ فرانسیسی مستشرق۔ کلمان ہوارٹ نے اسکو شائع کیا ہے
ابو سعید حسن السیرافی	سنہ ۳۶۹ھ	کتاب جزیرۃ العرب	عرب کا عام و تمام جغرافیہ۔
حسن بن محمد المعروف ابن الحائک	سنہ ۳۸۰ھ	کتاب الاودیہ والجبال	عرب کے پہاڑ اور وادیوں کے بیان میں۔
محمود بن عمر زمخشری	سنہ ۵۲۸ھ	کتاب الامکنۃ والمیاہ والجبال	عرب کے مقامات تالاب اور پہاڑوں کے بیان میں۔
البکری	سنہ ھ	معجم ما استعجم	مقامات عرب کے بیان میں۔ کوٹنجن (یورپ) میں چھپی ہے۔
جلال الدین سیوطی	سنہ ۹۱۰ھ	مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنۃ والبقاع	چھ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ عرب کے تمام مقامات کا استقصار ہے ملخص از معجم یاقوت چھپ گئی ہے۔
ابن خردازبہ	سنہ ۲۵۶ھ	کتاب المسالک والممالک	مطبوعہ یورپ۔ وسط کتاب میں۔ یمن کے نام سے عرب کا ذکر کیا ہے۔
ابن فقیہہ ہمدانی	سنہ ۲۹۰ھ	کتاب البلدان	مطبوعہ یورپ باب دوم۔ در ذکر مکہ۔ طائف۔ مدینہ۔ یمامہ اور یمن (میرے پاس موجود ہے)
ابن واضح یعقوبی	وسط سنہ ۳۰۰ھ	کتاب البلدان	مطبوعہ یورپ (میرے پیش نظر ہے)۔
اصطخری	سنہ ۳۴۰ھ	کتاب الممالک والمسالک	مطبوعہ یورپ۔ باب اول ذکر جغرافیہ عرب۔
مسعودی	سنہ ۳۴۶ھ	مروج الذہب	مطبوعہ مصر (موجود)
ابن مردویہ	سنہ ۳۵۲ھ	معجم البلدان	قلمی۔ موجودہ کتبخانہ حیدر آباد۔ دبانکی پور۔ مرتب بترتیب حروف ہجا۔

یونانی اور رومانی، اور دیگر اقوام وممالک کی کتابیں تو تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے زبان عربی میں ترجمہ ہونی شروع ہوئی ہیں۔ اور عرب کا قدیم جغرافیہ داں سنہ ۲۰۰ھ کے اواخر میں اپنی جغرافیہ کی کتاب "کتاب النوادر" کے نام سے مرتب کر چکا تھا۔

عرب قدیم سے جغرافیہ نویس تھے۔ ان کے متقدمین اور متاخرین مؤلفین نے کثیر التعداد جغرافیہ کی کتابیں لکھی ہیں۔ جو اس علم خاص میں اُنکے کمال وجامعیت کی کامل ثبوت ہیں۔ (سلسلہ عبارت حاشیہ میں ان کی فہرست علیحدہ دی گئی ہے۔) جغرافیہ کے متعلق اُنہوں نے دو قسم کی کتابیں تیار کیں۔ ایک تو وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

مصنف	سنہ وفات	نام تصنیف	کیفیت
ابن حوقل	سنہ ۳۶۲ھ	کتاب المسالک والممالک	عرب کے حسب ذیل شہروں کے حالات میں ام القریٰ۔ بحرین۔ عامر عرب۔ عمان۔ مدینہ مطبوعہ یورپ۔ باب اول میں عرب کے پہاڑ۔ ریگستان۔ اور راستوں کے بیان میں
ابوالبنا بشاری مقدسی	سنہ ۳۷۹ھ	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	مطبوعہ یورپ عرب کے صوبے قصبے گاؤں عمارات۔ معدنیات اور کھنڈروں کے بیان میں
ادریسی	سنہ ۵۴۵ھ	نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق	صرف ایک حصہ چھپا ہے۔
یاقوت حموی	سنہ ۶۲۳ھ	معجم البلدان	مطبوعہ مصر دس جلدوں میں بہ ترتیب حروف۔ عرب کے تمام مقامات پہاڑ، تالاب، وادیوں کا ذکر ہے۔ اور اکثر کا طول وعرض بلد بھی لکھا ہے۔
ذکریا قزوینی	سنہ ۶۷۴ھ	آثار البلاد	مطبوعہ یورپ۔ مختصر کتاب بہ ترتیب اقالیم
شمس الدین دمشقی	سنہ ھ	نخبۃ الدہر فی عجائب البحر والبر	مطبوعہ یورپ۔ باب فصل میں عرب کا عام جغرافیہ۔ حدود، صوبے، شہر اور قلعوں کا بیان ہے
ابوالفدا	سنہ ۷۳۲ھ	تقویم البلدان	مطبوعہ یورپ فصل اول میں عرب کے ۴۲ آبادیوں کا ذکر اور ان کا طول وعرض بلد لکھا ہے۔

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ مفسرین اور اُنکے تفاسیر کے نام یہ ہیں۔

مفسر اور اُنکی تفسیر کے نام	سن وفات	مفسر اور اُنکی تفسیر کا نام	سن وفات	مفسر اور اُس کی تفسیر کا نام	سن وفات
تفسیر مجاہد ابن جبیر	سنہ ۱۰۴ھ	تفسیر مقاتل ابن سلیمان	سنہ ۱۵۰ھ	تفسیر ابراہیم بن معقل النسفی	سنہ ۲۹۵ھ
تفسیر دیلمی	سنہ ھ	تفسیر ابن جریر طبری	سنہ ۳۱۰ھ	تفسیر ابن ابی حاتم۔	سنہ ۳۵۴ھ
تفسیر ابن حبان	سنہ ۴۱۰ھ	تفسیر ابن مردویہ	سنہ ۵۱۶ھ	تفسیر بغوی داسکے علاوہ بہت سی تفسیریں اور ہیں۔ طول سمجھکر نہیں لکھی گئیں	سنہ ھ

جس میں خاص عرب کا جغرافیہ ہے۔ دوم وہ جس میں دیگر اقالیم عالم کے ساتھ عرب کا بھی ذکر کیا گیا ہے
ادبیات اسلامیہ کے سلسلہ تفصیل میں۔ قرآن مجید۔ اشعار ایام قدیم۔ تاریخ اور جغرافیہ کے معلومات اور اُن کے ماخذوں کا ذکر ہوچکا۔ اب کتب تفسیر کی حقیقت یہ ہے۔ پہلے لکھ چکا گیا ہے۔ کہ تاریخ و انساب کے بعد عرب میں اُس کی تدوین ہوئی۔ اور سب سے پہلے مجاہد ابن جبیر صحابی نے عہد بنی امیہ میں اپنی تفسیر تیار کی۔ مجاہد کا سال وفات ۱۰۴ھ ہے۔ اسلیے یہ اندازہ صحیح ہو سکتا ہے کہ عرب کی پہلی کتاب تاریخ اخبار الملوک ماضیہ سے ۵۵ برس بعد یہ تفسیر مرتب کی گئی۔ مفسرین اور اُن کی تفاسیر بھی حاشیہ کے سلسلہ عبارت میں مرقوم ہیں۔

عرب کا علم حفظ الانساب۔ | ادبیات اسلامیہ کے ذیل میں کتب الانساب بھی ضروری عناصر میں داخل ہیں۔ خصوصاً موجودہ تفصیل اقوام و قبائل قدیمہ کے لیے ان کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ صنف تالیفی تو عرب کی سلمہ جولان گاہ ہے۔ اور قدیم سے اِس فن شریف میں اُن کو دستگاہ کامل حاصل ہے۔ اس لیے اُس کی نسبت ہم کو زیادہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں۔ ہم ظہور اسلام سے ان مؤلفین کے سلسلہ کا آغاز کرتے ہیں۔ اِس موضوع پر اہل اسلام میں سب سے پہلے دغفل بکری نے اپنی کتاب لسان الحمرہ تیار کی۔ پھر عبید بن شریہ نے قرن اولی میں۔ ابن کواء۔ قرفی۔ عوانہ بن حکم ابو الیقظان۔ ہشام کلبی۔ محمد ابن سائب کلبی۔ مدائنی۔ فاکہانی۔ مصعب بن عبد اللہ زبیری۔ زبیر ابن بکار۔ مصنف انساب قریش۔ اصمعی۔ ابو عبیدہ۔ ابن ہشام۔ مصنف انساب حمیر و ملوکہائے حمیر المبرد اور ارزقی اور اخیراً بلاذری۔ سمعانی۔ ابن حزم۔ اور قلقشندی وغیرہم محققین انساب پیدا ہوئے۔ اور تفصیل و تشریح انساب میں اِن کے تالیفات جیسے قابل قدر ہیں۔ وہ دُنیا جانتی ہے

انساب عرب کی خصوصیت کے متعلق ہم کو ایک جملہ معترضہ کی تنقیح ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ مستشرقین جدید عرب کے ان انساب کی کتب قدیم کو غلط اور بے اصل سمجھتے ہیں۔ اس کی قطعی صحت کا کثیر التعداد استداد ایام کی بنا پر ہم دعوی نہیں کرتے۔ مگر دعوے کے ساتھ اتنا ضرور کہیں گے۔ کہ مسٹر رابرٹسن اسمتھ Mr Robertson Smith. اور مسٹر نولڈیکی Mr Noldeke. نے اپنی غلط فہمیوں سے جتنا سمجھا ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ صحیح اور قوی الاصل ہیں۔ نولڈکی اِن الفاظ میں۔ عربی انساب کی کتابوں پر سنہ آتا ہے۔

اب علماء کے لیے موقع آگیا ہے۔ کہ اِن طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈالدیں۔ جو چاہتے ہیں۔ کہ عربوں کی کتب انساب کو خلو محمد کلبی اور اُس کے بیٹے ہشام کلبی نے گڑھا ہے۔ مان لیں۔ تاکہ قبائل عرب قدیمہ و جدیدہ کے تعلقات تحقیق و یقین

کے ساتھ ظاہر ہوں۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے۔ کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں۔ وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں۔ بنی قیس جو مسیحؑ سے کچھ پہلے تھا۔ اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے۔ کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اوّل سے واقف نہیں۔ جس کی طرف وہ منسوب ہے۔

رابرٹسن اسمتھ کہتا ہے

یہ محقق ہو چکا ہے۔ کہ چند قبائل زمانہ ماضی غیر قدیم میں کسی شخص کی طرف منسوب نہ تھے۔

اس اعتراض کے جواب میں سب سے سہل اور مسکت جواب تو یہ ہے۔ کہ جب نئی اور پرانی۔ دونوں دنیا کی آبادی۔ ایک آدم (علیہ السلام) کی اولاد مان لینے پر آجتک عقلاً اور نقلاً کوئی استعجاب و استبعاد نہیں پیش کیا گیا۔ تو بنی قیس کی کثرت و وسعت پر تولدکی کا استعجاب و استبعاد محققین کے نزدیک بالکل قابل مضحکہ سمجھا جائے گا۔

پھر انساب کے لاتعداد زمانہ تک استحفاظ کو بعید از عقل سمجھکر۔ اس تعریض کو پیش کرنا بھی معترضین کی غلط فہمی ہے۔ حقیقتاً وہ عرب کے قومی تمدن سے بالکل ناواقف ہیں۔ زمانۂ معلوم التعداد سے عرب کا ایک ایک قبیلہ کیا۔ ہر ہر فرد واحد کے لیے ضروری تھا۔ کہ وہ اپنے دوستوں کی مداح اور دشمنوں کی ہجو کے لیے انساب محفوظ رکھتے۔ عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ وہ عام طور سے عرب میں ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اور بطور نشان ملامت کے اُسکا نام لیا جاتا ہے۔ شعرائے عرب کیا قریب قریب عرب کے تمام قبائل و عشائر ان ضرورتوں کے لحاظ سے حفظ انساب کے لیے مجبور تھے۔ پھر اُنکی انساب کی تفصیل کیسے غیر صحیح یا ناقابل اعتبار سمجھی جاسکتی ہے۔ اور غیر قوم۔ غیر ملک والوں کو ایک لاتعداد امتداد ایام کے بعد اُنکی تردید و تنقید کا کیا حق حاصل ہے۔ بنو قیس کی کثرت و وسعت پر یہ اعتراض بھی چلنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ بنو قیس کی طرح چھ سو برسوں کی مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون وقبائل کا پیدا ہو جانا۔ نہ محال عادی ہو سکتا ہے۔ نہ محال فطری۔

مستشرقین یورپ کو کتب انساب عرب کے غلط ہونیکا گمان کیونکر پیدا ہوا؟ اس کی حقیقت سن لیجیے نئی روشنی کے زمانہ میں اوہام پرستی کی بنا پر۔ جہاں سینکڑوں کیا ہزاروں۔ "ازم" پیدا ہو گئے۔ اور پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ وہاں توتمزم (طوطمیت جسکی تعریب ہے) بھی ایجاد ہوا۔ اس وہمی مجسمہ یا قیاسی مسئلہ کی خاص تسمیہ سے وہ ازمنہ قدیمہ مقصود ہیں۔ جن میں انسان کا تمدن اور اُسکی تہذیب بالکل طفل مہد تھی۔ اسلیے ہر بڑی اور قوی چیز اُسکی ضعیف نگاہوں میں عظیم ترین معلوم ہوتی تھی اسی بنا پر اُس زمانہ کے لوگ۔ دیوتوں۔ ستاروں۔ حیوانوں اور درختوں کی طرف اپنے حسب ونسب کو

تعظیماً منسوب کرتے تھے۔ اسی کو طوطمیت اور اسی زمانہ کو طوطمیت کا دورِ خاص کہتے ہیں۔ ہندوؤں میں کثرت سے اِس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ جیسے سورج بنسی۔ چندر بنسی اور ناگ بنسی وغیرہ یہ قبائل اپنے آپکو آفتاب و ماہتاب کی نسل خاص سے سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ محالات بدیہی ہے۔ اب ہر شخص سمجھنے لگا ہے۔ کہ حقیقتاً یہ انکی مورثِ اعلیٰ کا نام نہیں۔ بلکہ اُنکے قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔ جنکی طرف وہ تعظیماً منسوب کئے گئے ہیں۔

قبیلہ عرب میں بنو شمس وغیرہ۔ اسی قسم کے نام ہیں۔ اور حیوانات کے نام بھی ہیں۔ مثلاً بنو اسد۔ بنو کلب۔ بنو ثعلب وغیرہ وغیرہ اُن کی طرف نسبت کی وجہ وہی سمجھنی چاہیئے۔ جو اوپر لکھی گئی جانوروں کی وجہ تسمیہ میں تواضع اور انکسار کا خیال و رعایت بھی شامل ہے۔

افسوس ہے۔ حقیقت ناشناس مستشرقین یورپ نے عرب کے ناموں میں جانوروں کی نسبت و رعایت کو بھی ہندوؤں کے اصول پر سمجھ لیا۔ حالانکہ اُن کا یہ خیال تاریخ عرب سے اُن کی قطعی ناواقفیت ثابت کرتا ہے یہ اُن کی کجی وہم پرستی ہے۔ عرب میں کبھی اس قسم کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ تاریخ عالم سے مذاق سلیم رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اِس خیال کا وجود ہندوستان۔ مصر۔ اور یونان کے حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ تعجب ہے۔ کہ یورپ کے محققین عرب کی میتھالوجی (علم الاصنام) کو ہندوستان و یونان کے اصول میتھالوجی سے ملاتے ہیں۔

اوّل تو اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں۔ اور جو ہیں بھی۔ اُن میں کلب (کتا) نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کونسی گرامی قدر ہستیاں ہیں۔ جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو۔ اگر اسی کو یورپین محققین کتب انساب کی غلطی کا باعث سمجھتے ہیں۔ تو وہ سمجھ لیں کہ اِس روشن خیالی کے زمانہ میں اُن کا خاص طبقہ روشن بھی اِس قسم کی رعایت و نسبت سے خالی نہیں پایا جاتا۔ یورپ کے اقطاع متفرقہ اور بلاد مختلفہ میں سینکڑوں اور ہزاروں ذی اثر اور مقتدر بزرگوں کے نام فاکس (Fox) (لومڑی) بُل (Bull) (بیل) ثابت ہوتے ہیں۔ کیا ان پر طوطمیت کا الزام نہیں لگایا جائے گا؟

مندرجہ بالا جملہ معترضہ معرضِ بیان میں خواہ مخواہ حائل ہو گیا۔ اس کی تنقید و تصحیح کر دی گئی۔ سلسلۂ بیان ادبیات اسلامیہ میں جو ازمنۂ قدیمہ اور اُمم سابقہ کے اطلاعات کے ذریعہ قائم کئے گئے ہیں۔ کتب انساب کے بعد عرب کی زبانی اور خاندانی مرویات کا نمبر ہے۔ جو نسلاً بعد نسلٍ عربوں میں محفوظ رہ کر اسلامی کتب میں مدوّن ہو گئے۔ مسلمانوں کے اُصول روایت کی رو سے گو یہ ذریعہ علم زیادہ محفوظ نہیں۔ لیکن جو خاندانی روایتیں متفقاً اور بلا انکار و بغیر اشتباہ و شک عرب میں عام طور سے مشہور تھیں۔ اور جن کا فخر ہر موقع پر ظاہر کیا گیا۔ اور کسی نے بھی اُس کے انکار و نفی کی وجہ

نہ پائی۔ تو یہ گویا درحقیقت تواتر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی تردید اُصول تاریخ کی رو سے مستحیل ہے ادبیات اسلامیہ انہی عناصر سے مرکب اور ہمارا موضوع تالیف انہی ذخائر سے مرتب ہے۔

ادبیاتِ اسرائیلیہ

ہماری موجودہ تالیفات میں۔ ادبیات اسرائیلیہ قسم دوم کا ماخذ ہے۔ اس ماخذ میں توریت کی کتب خمسہ کتیم۔ نبیم۔ ترگوم۔ مدراش اور تالمود۔ داخل ہیں۔ اور انھیں کے مجموعہ کا نام ادبیات اسرائیلیہ قرار پایا ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

توراۃ یہ لفظ عبری ہے۔ جس کے معنی قانون اور شریعت کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ کے مجموعہ کا نام توراۃ ہے۔ گویا کلیم اللہؑ کے نظم رسالت کی کلیات یہی ہے۔ اس خمسہ کلیمیہ کی پہلی کتاب کا نام سفر تکوین ہے۔ جس میں ذکر بدء (کائنات) آدمؑ و حواؑ۔ نوحؑ و ابراہیمؑ۔ اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ و یعقوبؑ و یوسفؑ قلمبند ہیں۔ دوسری کتاب کا نام سفر خروج ہے۔ جس میں ذکر حضرت موسیٰؑ۔ فرعون۔ بنی اسرائیل و بعض احکام و قانون شامل ہیں۔ تیسری کتاب کا نام سفر الاحبار ہے۔ جس میں ذکر شریعت و قوانین شریعت اور حرام و حلال اشیاء کی تفصیل مندرج ہے۔ چوتھی کتاب کا نام سفر العدد ہے۔ جس میں ذکر تعداد بنی اسرائیل وقت خروج از مصر و غزوات حضرت موسیٰؑ و بعض احکام شریعت مندرج ہیں۔ پانچویں کتاب کا نام سفر الاستثنا ہے۔ جس میں قوانین اور احکام شریعت داخل ہیں۔

نبیم۔ نبی کی جمع بقاعدہ عبرانی "ی" اور "میم" سے ہوتی ہے۔ عربی قاعدہ سے نبیین کہنا چاہیے مثلاً "خاتم النبیین" یہ دفتر اسرائیلیہ انبیائے بنی اسرائیل کے کلام۔ مواعظ و مراثی کا مجموعہ ہے۔ اور خصوصاً سفر حضرت یوشعؑ۔ سفر القضاۃ۔ سفر سموال۔ سفر الایام اور سفر الملوک کہ ان میں صرف تاریخی حالات و واقعات ہیں۔ اکثر توراۃ کا اطلاق توراۃ و نبیم دونوں پر ہوتا ہے نبیم کے بعض حصہ کو کتیم بھی کہتے ہیں۔ جو اقوال انبیائے بنی اسرائیل کے نقول و کتابت سے مراد ہے۔

ترگوم یا ترجوم یعنی ترجمہ و بیان۔ ترگوم ارامی زبان میں۔ توراۃ و نبیم کی تفسیر و توضیح کا نام ہے۔ جو ربیون (آئمہ یہود) نے انبیا کی زبانی یادداشت و روایت کی بنا پر کی۔ اس کی تصنیف کا زمانہ ۶۰۰ ق م سے سنہ ۱۰۰۰ء تک ہے۔

مدراش کا درجہ ہمارے ہاں کی احادیث کا ہے۔ لفظ مدراس اور عربی درس ایک چیز ہے۔

تمُود یا تالمود- فقہ اسرائیلی ہے۔ جس کی بنیاد کتب سابقہ پر ہے۔ اور جسکی ترتیب بترتیب الواب و فصول مسائل قائم کی گئی ہے۔ لفظ تلمود- عربی تلمیذ ہے۔ جس کے معنی تعلیم وعلم کے ہیں۔

یہ جتلا دینا بھی ضرورت سے زیادہ نہ ہوگا۔ کہ یہود کے نزدیک تو یہ تمام کتابیں مستند ہیں۔ نصاریٰ صرف توراۃ۔ بیتم کو اور کتیم کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور انہی کے مجموعہ کو عہد عتیق کہتے ہیں۔ اسلام میں اُن کے اعتبار کی کیا حقیقت ہے؟

اسلام میں وہی اُصول عامہ ان کی صداقت وصحت کا بھی معیار قرار دیئے گئے ہیں۔ یعنی اُن کی مرویات بھی جو معارض قرآن اور حدیث صحیح ہیں۔ وہ ہر گز قابل اعتبار نہیں مصطلحات فقہیہ اور الفاظ شرعیہ میں اسکو سقوط کہتے ہیں۔ یعنی وہ حالات و واقعات جو توراۃ میں ہیں۔ اور قرآن میں نہیں۔ وہ سقوط کی خاص اصطلاحی نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ وہ جزو نہ وحی ربانی ہے۔ اور نہ مقصود قرآنی۔ اسی کی طرح مضافات بھی ایک اصطلاحی نام ہے۔ اور اس سے وہ حالات مراد ہیں۔ جنکا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ مگر توراۃ میں نہیں۔ جہاں ایسے اضافہ ہیں۔ وہ اصل میں اُس واقعہ کا خاص نکتہ تھا۔ جس کو ان کتابوں سے۔ جن میں تفرقات و مداخلات انسانی معتبر ذرائع سے ثابت ہو چکے ہیں۔ بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر قرآن مجید نے جس کی تنزیل صرف کتب مقدسہ اور الہامات قدیمہ کی تکمیل تصدیق و تصحیح کی ضرورت و مدّعا سے ہوئی تھی۔ پھر ان فروگذاشتوں کو اصلیت اور حقیقت حال سے پُر کر دیا۔ سقوط و اضافات کے دونوں صورتوں کے واقعات پر طبقہ مخالفین اسلام میں ڈیڑھ ہزار برسوں سے علمائے مستشرقین اور سینکڑوں محققین کی نگاہیں پڑ چکی ہیں۔ مگر اُن میں سے کسی کو اسکی صداقت اور اصلیت میں کلام کی آجتک جرأت نہیں ہوئی۔ جیسا کہ اُن کی اکثر مثالیں ہمارے موجودہ تالیف کی سلسلہ بیان میں بھی اپنے اپنے مقام پر پائی جائیں گی۔

ہم نے اپنی تعلیم کا ماخذ ان کو کیوں بنایا۔ صرف اس ضرورت سے کہ اُمم قدیمہ اور انبیائے و مرسلین سابقین کے وہ حالات و واقعات جو ہمارے مقاصد تالیفی سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اور اُن کی تفصیل اسلامی ادبیات میں ضرورت سے زائد ہونیکی وجہ سے نہیں کیگئی ہے۔ قلمبند کرنا، اور بقدر ضرورت اُنکو تفصیل سے لکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور ظہور اسلام کے مابعد کے واقعات کثیرہ کی توضیح و تشریح اور تسلسل کا قائم رہنا بھی تا وقتیکہ ماقبل کے واقعات جو کثرت سے ان اخبار و آثار قدیمہ میں موجود ہیں۔ بیان نہ کیے جائیں ممکن نہیں تھا باوجود ضرورت موجودہ کے مولف نے ان تمام واقعات کی نقل و اندراج میں نقد واقعات کے متعلق انہی اُصول کا برابر لحاظ قائم رکھا ہے۔ جو محققین و ناقدین اسلام نے اس فن خاص کے لیے مقرر کیے ہیں۔

ادبیاتِ یونانیہ ورومانیہ

یونانی اور رومانی۔ مورخوں۔ سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی جستہ جستہ اور متفرق طور پر اُن ممالک وقبائل کا ذکر کیا ہے۔ جن پر ممالک وقبائل عرب قدیم ہونیکا کامل اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا استنباط بھی ہمارے لیے ضروری تھا۔ ہم نے اپنی موجودہ تالیف میں۔ اِس طبقہ کے جن مصنفین اور اُن کی تصنیفات سے مدد لی ہے۔ اُن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ہیروڈوٹس Herodotious. یہ یونانی مورخ اور جغرافیہ نویس حضرت مسیح سے ۴۰۰ برس قبل تھا۔ اس نے یونان وایران کی تاریخ لکھی ہے۔ اور اسی ضمن میں مصر۔ افریقہ اور عرب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تاریخ کا عربی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر اس مورخ کا علم ملک عرب کی نسبت نہایت ناکمل تھا۔ محققین قدیم وجدید نے اس کی غلطیوں کی پوری تنقید وتصحیح کر دی ہے

ہیروڈوٹس کی ایک صدی بعد سکندر اعظم ایران ومصر پر فاتحانہ قابض ہوا۔ اِس تعلق خاص سے **ارٹستھینس** Arotosthenes. المتوفی سنہ ۱۹۶ ق م۔ جو یونانیوں کے عہد میں کتب خانہ اسکندریہ کا مہتمم تھا۔ اِس نے سکندر کی مہمات سفر سے جو نتائج تازہ معلوم ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ جغرافیہ عام کی ایک کتاب لکھی۔ اُس کی اصل کتاب تو ضائع ہو گئی۔ لیکن اُسکے بعد ایک اور جغرافیہ نویس یونانی اسٹرابو Strabo نے اس کتاب کے چند ابواب اپنی کتاب میں نقل کیے۔ خوش قسمتی سے جن میں ایک عرب کا باب بھی محفوظ ہے۔ ارٹستھینس نے یمن کے قبائل سبا۔ معین۔ اور اُن کے تمدن کا اور نیز قبائل حضر موت کا اور عرب کارواں کے اُن راستوں کا جو براہ قریہ (Gerra) خلیج فارس کو اور براہ تہامہ۔ راس خلیج عقبہ کو پہنچتے ہیں۔ ذکر کیا ہے۔ ارٹستھینس کے تقریباً سو برس بعد سسلی کا مشہور مورخ۔ **ڈیوڈوریس** Dewdorious. المتوفی سنہ ق م پیدا ہوا جس نے عرب کے بعض حالات کا نشان دیا۔ نبطی حکومت کا ذکر کیا۔ اور سب سے عجیب تر یہ ہے۔ کہ کعبہ مکرمہ کی طرف بھی اُس نے اشارہ کیا ہے۔ (گبن ج ۳ باب ۵۰) افسوس ہے کہ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ تلف ہو گیا۔

اب یونان کی جگہ بساط ملک داری پر روم آگیا۔ رومی سردار **آلیس گالوس** Alieus Gallus کی ماتحتی میں جنوبی عرب پر رومیوں نے حملہ کیا۔ اور ایک حصہ فتح بھی کر لیا۔ لیکن عرب کے بے آب وگیاہ صحرا نے شکست کھا کر خود اُن کو پیچھے ہٹ آنا پڑا۔

اسٹرابو (Strabo) المتوفی ۲۴ء ق م۔ نے اپنے جغرافی تصنیف میں رومیوں کی اس مہم کا حال لکھا ہے۔ اس مہم میں نبطیوں کے علاوہ عرب کے دو شہروں کے نام آتے ہیں۔ نگرانا۔ اور ماریبیا۔ (Negrana Mariaba) جو صحیح طور سے نجران اور شہر مآرب ہیں۔

اسٹرابو کے بعد پلینی Pliny المتوفی ۷۹ء کا نام لینا چاہیے۔ جو کتاب تاریخ طبعی کا (Natural History) مصنف ہے۔ اس نے مشرقی سواحل عرب کا اور خصوصاً اس مہم کا ذکر کیا ہے۔ جو رومیوں نے مشرقی سواحل کے اکتشاف کے لیے روانہ کی تھی۔

پلینی کے سو برس بعد۔ دوسری صدی عیسوی میں اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں و جغرافیہ نویس۔ بطلیموس Ptolemy پیدا ہوا۔ اسوقت رومن طاقت اپنے عروج و کمال پر تھی۔ بطلیموس نے تمام دُنیائے معمور و معلوم کا ایک نقشہ عرب تیار کیا۔ اور پھر اسی نقشہ کی تشریح و تفصیل کے لیے جغرافیہ میں ایک کتاب لکھی۔[1]

بطلیموس کی نوعیت و ندرت یہ ہے۔ کہ سب سے پہلے اُس نے معمورۂ عالم کو طول بلد اور عرض بلد پر منقسم کیا۔ اور پھر ان خطوط کے ذریعہ سے اُس نے مقامات کی تعیین کی۔ اس لیے بطلیموس کی یہ تصنیف باعتبار جغرافیہ طبعیہ Natural Geography یا جغرافیہ وصفیہ (Descriptive Geog.) کے جغرافیہ فلکی Astrominical GeoG سے زیادہ قریب ہے۔

یہ بھی تبلادینا ضروری ہے۔ کہ بطلیموس خود سیاح عرب نہ تھا۔ اسکندریہ اُس زمانہ میں عرب تاجروں کا مرکز تھا۔ اس نے انہیں تاجروں اور کاروانوں سے دریافت کر کے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا۔ بطلیموس نے عام طور سے عرب کے مشہور قبائل۔ شہر۔ گاؤں۔ پہاڑ۔ سواحل۔ تجارتی منزل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن چند ناموں کے سوا اب ان منازل و قبائل کے نام بالکل غیر مفہوم ہیں۔

عربی محققین کے علاوہ ایک یوروپین مشہور مصنف بن بری Bunbury نے بھی اس حصہ تالیف بطلیموس سے بد اعتقادی ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ یہ صرف فرضی اور مصنوعی ناموں کا مجموعہ ہے۔ لیکن جرمن مستشرق اسپرنگر Springer نے قدیم جغرافیہ عرب "Ancient Geography" of Arabia

[1] اس کتاب کا عربی میں اول یعقوب کندی کی فرمائش سے ترجمہ ہوا۔ لیکن اچھا نہ تھا۔ پھر ثابت ابن قرہ نے تیسری صدی ہجری میں اسکا ترجمہ کیا۔ کتاب الفہرست میں ص ۲۶۸۔ طبع لیبزگ۔ ارض القرآن۔ ج ۱۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ص۔

میں جو ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ نہایت قابلیت سے بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا ہے۔ اور اُن کی صحت ثابت کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بے تکلف ہو سکتی ہے۔ اور اُس کی مثالیں ہماری کتاب میں جا بجا ملیں گی۔

بطلیموس کے جغرافیہ کے متعلق آج سے ہزار برس پہلے۔ مسلمان جغرافیہ نویس **مسعودی** اور پھر اس کے تین سو برس بعد **یاقوت حموی** خود بھی شکایت کر چکے ہیں۔ جیسا ہم ایک مقام اوپر لکھ بھی آئے ہیں مستشرق **ہوگارتھ** Hogarths اسی بنا پر لکھتا ہے۔

بطلیموس کا کاروانوں کی زبان سے اُن کی (عرب) تحقیق اور یونانی حروف و لہجہ میں اُس کی (الفاظ عرب) تغیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر۔ ناسخین (کاتبین) کتاب کی جہالت و ناشناسی۔ ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ایک لفظ اپنے مخرج سے کہاں جا پڑتا ہے۔" The penctahon of Arabia
by Hogarth P.E.9. 24.

یونانی اور رومانی مصنفین کے تذکرے میں ایک قابل الذکر یہودی مصنف بھی ہے۔ اس فاضل محقق کا نام **یوسیفوس** (Eusophious) ہے۔ یونانی۔ لاطینی۔ اور رومانی زبانوں میں اس کی متعدد تصانیف متعلق تاریخ و مذہب یہود ہیں۔ اس کی سب سے مشہور اور قابل قدر ترین کتابیں جو میرے مدعائے تالیف کے لئے بھی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ یہ ہیں۔ قدامت یہود۔ محاربات یہود۔ اور فلسفہ یہودیت

اِس مصنف کی وسیع النظری اور تصانیف کثیرہ کی تدوین کا باعث حقیقی یہ ہے۔ کہ یہ فاضل پہلی صدی عیسوی میں اسکندریہ میں مقیم تھا۔ اور وہاں کے مشہور اور قدیم کتب خانہ کا خاص مہتمم۔ جس میں بابل اور مصر کی تمام قدیم تاریخیں موجود تھیں۔ یوسیفوس کو خوش قسمتی سے یہ موقع زریں ہاتھ لگا۔ اُس نے ان بابلی و مصری تاریخوں سے بابل و مصر کی تاریخ کے اقتباسات نقل کئے۔ جن سے عرب کے قدیم قبائل و اقوام کے واقعہ نگاروں کو بھی بہت کچھ مدد ملی۔

بابل کے جس مورخ کا یوسیفوس نے حوالہ دیا ہے۔ وہ بروشوس ہے۔ اور مصر کے مورخ کا نام مانیتھون بتلایا ہے۔ ان دونوں مصنف کے اقتباسات بیحد مفید نکلے ہیں۔

اکتشافات اثریہ

ہمارے معلومات کے چہارگانہ ذرائع ہیں۔ چوتھے نمبر کا ذریعہ۔ اکتشافات اثریہ ہیں۔ جیسے الواح

کتبات اور عمارات اور نیز دیگر آثار قدیمہ مراد ہیں۔ اور فی الحال یمن۔ حصن موت۔ حوران۔ تدمر۔ بطرا۔ علا۔ مدائن۔ صالح۔ صفا۔ حجر۔ حجاز عراق اور مصر میں قدیم عربوں کے بہت سے آثار۔ عمارات اور یادگاریں ہیں۔ جن میں ہزاروں کتبے اور نقشے کھدے ہیں۔ اِن کتبات اور نقوش سے علمائے آثار قدیمہ نے عجیب وغریب نتائج استنباط کئے ہیں۔ یہ کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری (مسند) سبائی۔ ارامی اور نبطی خط میں ہیں۔ دولت بنی اُمیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانوں میں جبکہ تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا۔ ان آثار کی تحقیق کی گئی۔ اور اُن میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اُسوقت کے علماء واقف تھے۔ ذوالنوی مصری جو دوسری صدی میں تھے۔ مصر کے خط برابی (ہیرو گلفی) پڑھتے تھے۔ حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں تمام مشہور آثار کے نام گنائے ہیں۔

قلعہ ناعط جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا تھا۔ اسلام سے تقریباً پندرہ[۱۵۰۰] سو برس قبل کی تعمیر ہے۔ وہب بن منبہ نے (جنہوں نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"یہ ایوان اُسوقت تعمیر کیا گیا۔ جبکہ ہمارے لیے مصر سے غلہ آتا تھا" معجم البلدان ذکر ناعط۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان ذکر ناعط میں اِسکا ذکر کیا ہے۔ عرب جاہلیت کا ملک الشعرُا امرا القیس اس رفیع الشان ایوان کی نسبت کہتا ہے۔

هُوَالْمَنْزِلُ الْاُلَافِ مِنْ جُوِّ نَاعِطٍ بَنِي اَسَدٍ حَزْنًا مِنَ الْاَرْضِ اَوْدَعْرًا۔

یہ وہ ہے۔ جو ناعط کی بلندی سے ہزاروں آدمی زمین پر لاسکتا ہے۔

امیر معاویہ کے زمانے (سنہ ۴۷ھ تا سنہ ۵۰ھ) عبد الرحمٰن مصر کے گورنر تھے۔ اُنہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ حصن غراب پر ایک کتبہ پایا تھا۔ اُسکا عربی ترجمہ یہ ہے۔

ونصطاد صيد البر بالخيل والقنا وطورا
نصيد النون من لجح البحر يلينا ملوك
يبعدون عن الخنا شديدٌ على اهل
الخيانة والغدر تقيم لنا من دين هودٍ
شرايعًا ونؤمن بالآيات والبعث والنشر
اذا ما عدوٌ حلّ ارضنا يريدنا برزنا جميعًا
بالمثقفة السّمر۔

ہم گھوڑوں اور برچھوں سے ملک کا شکار کرتے ہیں۔ اور کبھی دریا کی تہ سے مچھلی نکال لاتے ہیں۔ ہمارے حکمران وہ سلاطین ہیں۔ جو بدکاری سے بہت دُور ہیں۔ اور غداروں اور خیانت کاروں کے حق میں بہت سخت ہیں۔ وہ ہمارے لیے ہود کے مذہب کے مطابق شریعت قائم کرتے ہیں اور ہم احکام الٰہی اور بعث ونشر پر ایمان لائے ہیں۔ جب کوئی دشمن ہماری زمین کا قصد کرتا ہے۔ تو ہم گندم گوں نیزے لیکر نکل پڑتے ہیں۔

یہ کتبہ علامہ نویری نے اپنی تاریخ مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔ لیکن تاریخ مذکور کے اکتشافات کے بعد ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن میں بھیجا تھا۔ اُس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا اصل کتبہ کا ذکر قوم عاد کے تذکرے میں بہت جلد آئے گا۔ فارسٹر صاحب forestor کی تحقیق میں یہ کتبہ قوم عاد کا ہے۔ اور عرب کے قدیم ترین کتبات سے ہے۔ جسکا زمانہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے اٹھارہ ۱۸۰۰ سو برس قبل ہے۔ فارسٹر صاحب نے اپنے تاریخی جغرافیہ میں (ص ۹۱-۹۰) اسکا جو ترجمہ کیا ہے۔ نویری کے ترجمہ سے بہت کم مختلف ہے۔

مورخ کلبی کے زمانہ میں قبیلہ ذوی الکلاغ کے ایک شخص نے یمن میں ایک تخت پایا۔ جس پر ایک مُردہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک زرین سپر تھی۔ جس پر سُرخ یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اُس سپر پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ (یہ عبارت حمیری عبارت کا ترجمہ ہو گی۔)

بسم اللہ رب حمیر انا حسان بن عمرو النفیل۔	اللہ کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔ میں عمرو نفیل کا بیٹا حسان ہوں۔ معجم البلدان۔ لفظ۔ شبعلین

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حمیری خدا کے قائل تھے۔ اور اُن کا معبود اللہ تھا۔

حماد روایہ کے بھانجے نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر قوم عاد کا ایک تیر کا پایا تھا۔ جو پتھر میں پیوست تھا۔ اُس پر یہ شعر لکھے تھے۔ (اصل شعر نہیں بلکہ عربی ترجمہ ہے) معجم البلدان۔ لفظ شیخ

اَلَاھَلْ اِلٰی اَبْیَاتِ شَیْخٍ بِذِی اللِّوٰی لِوٰی الرَّمْلِ مِنْ قَبْلِ الْمَمَاتِ مَعَاذٌ بِلَادٌ بِھَا کُنَّا وَکُنَّا نُحِبُّھَا اِذِ الْاَھْلُ اَھْلٌ وَالْبِلَادُ بِلَادٌ	مقام ذو اللویٰ میں جو مکانات ہیں۔ کیا مرنے سے پہلے پھر وہاں جانا نصیب ہوگا۔ یہ وہ شہر ہے۔ جہاں ہم رہا کرتے تھے۔ اور جن سے محبت رکھتے تھے۔ جبکہ لوگ لوگ تھے اور شہر شہر تھے۔

ابن ہشام نے لکھا ہے۔ کہ یمن میں ایک دفعہ سیلاب سے۔ ایک قبر کھل گئی تو ایک عورت کی لاش نکلی جس کے گلے میں موتیوں کے سات ہار اور اونگلیوں میں مرصع انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے سرہانے ایک لوح تھی۔ جس پر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا۔

باسمک اللھم الہ حمیر انا تاجۃ بنت ذی شقر بعثت مایرنا الی یوسف فابطا علینا فبعثت لاذتی بمد من ورق لتاتینی بمد من طحین فلم تجدہ فبعثت بمد من ذھب فلم تجدہ	تیرے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔ میں ذو شقر کی بیٹی تاجہ ہوں میں نے اپنے قاصد کو یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا اُس نے جب دیر لگائی۔ تو میں نے چاندی۔ پھر سونا بھیجا۔ لیکن کچھ حاصل نہوا۔ پھر میں نے حکم دیا۔ کہ میرے جواہرات

فبعثت بمدّ من بحر یّ فلم نجبه فامرّت به فطحن
فلم انتفع به فاقتلت فمن سمع بی فلیرحمنی وایّة
امرءة لبست حلیا من حلیتی فلا ماتت الّا میتتی

پیس کر آٹا بنایا جاوے۔ لیکن وہ بیکار تھا۔ جو شخص میرا حال
سُنے۔ اُس کو میرے حال پر رحم کرنا چاہیئے۔ جو عورت میرے
زیور پہنے گی۔ وہ میری ہی موت مرے گی۔

اس کتبہ کو فارسٹر صاحب نے بھی اپنے جغرافیہ صفحہ ۱۰۳ میں مع انگریزی ترجمہ کے نقل کیا ہے۔

یہ کتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عرب میں اسقدر زمانۂ قدیم سے تحریر کا رواج تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ حمیر اللہ کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔

حمزۂ اصفہانی المتوفی ۳۶۰ھ نے ایک حمیری کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کی عبارت یہ تھی۔

بنام خدا۔ شمر یرعش (شاہ حمیر) نے آفتاب دیبی کے لیے یہ بنایا۔　　تاریخ الملوک الارض ص ۱۱۰ کلکتہ۔

ابن حائک ہمدانی حمیری المتوفی ۳۳۴ھ علامۂ مقدسی۔ یاقوت حموی۔ علامہ نویری اور قزوینی نے اپنی اپنی تصنیفات و تالیفات میں اس قسم کے آثار و کتبات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک ادھوری کوشش تھی۔ حقیقتاً اہل یورپ نے اِس شاخ کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ اور اُس کو بجائے خاص ایک مستقل فن بنا دیا ہے علمائے خطوط قدیم نے ان کتابات و نقوش کو اسطرح حل کیا ہے۔ کہ اُن سے عرب کی تاریخ قدیم کے متعلق عجیب وغریب اکتشافات حاصل ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے۔ کہ اہل یورپ کو اولاً مقامات مذکورہ تورات کے اکتشافات وتحقیقات کا خیال پیدا ہوا۔ جو علی العموم بعینہٖ عرب کے مقامات و اقوام ہیں۔ اِس سلسلہ میں بابل۔ مصر۔ فلسطین۔ حوران اور عرب کے دیگر آثار کی طرف بھی توجہ ہوئی ہے۔ ہم کو صرف آثار عرب سے تعلق ہے۔ اور ہم نے اسی کے متعلق متکاشفین یورپ کے ان اکتشافات سے مدد لی ہے۔

عرب کے متعلق اہل یورپ کے اکتشافات اثریہ

اِن میں سب سے پہلا یوروپین سیاح اور مکتشف آثار عرب نیوبھر *Neubhar* ہے۔ یہ محقق ۱۷۶۲ء میں تہامین کی طرف عازم ہوا۔ اِس کے بعد جب محمد علی پاشا خدیو مصر اور وہابی امیر نجد کی جنگ شروع ہوئی۔ اور یورپ نے مصر کا ساتھ دیا۔ تو اُس وقت یورپ کو سیاحت عرب کا سب سے پہلا۔ اور سب سے بہتر موقع نصیب ہوا۔ اِن سیاحوں کے حالات واکتشافات وتحقیقات پر انگریزی میں ہوگارتھ *D. G. Hogarth.* نے ایک مستقل کتاب ۳۵۰ صفحوں پر لکھی ہے۔

نیوبھر ڈنمارک (*Denmark.*) کا رہنے والا تھا۔ سلطنت کی طرف سے محققین آثار

قدیمہ کے ایک وفد کے ساتھ ۱۷۶۱ء میں روانہ ہوا۔ یہ جماعت مکتشفین آثار قدیمہ ایک برس تک مصر اور جزیرہ نمائے سینا کی سیر و سیاحت کرتی رہی۔ ۱۷۶۲ء میں عرب میں داخل ہوئی۔ اور ڈیڑھ پونے دو برسوں تک ملک یمن اور اُس کے تمام توابعات و مضافات کی سیر و تلاش کر کے ہندوستان کی طرف واپس ہوئی۔ نیوبھر ہندوستان سے دوبارہ پھر عرب میں پہونچا۔ اور اب کی بار اُس نے خلیج فارس۔ بصرہ۔ شام۔ اور فلسطین کے مقامات قدیم کی سیر کی۔ پھر ڈنمارک لوٹ گیا۔ اِس وفد کے نتائج سفر ۱۷۷۲ء میں نیوبھر نے شائع کئے۔ جن کی وجہ سے پہلی بار علمی اور تحقیقی پیرایہ میں یورپ کو نہ صرف یمن سے بلکہ تمام عرب سے اطلاع ہوئی۔

نیوبھر کے بعد ہرنبرگ اور ہمپرچ C.G.Ereberg W.F.Hemprich نے تہامہ اور جزائر سواحل عرب کا سفر کیا۔ پھر ایک فرانسیسی ٹمیزیر (M.O.Tamisier) شیفارڈ Chefau اور ماری Mary نے مصری فوج کے ساتھ عرب کے علاقہ عسیر کی سیر کی۔

پھر تو مغربی محققین اور یوروپین مکتشفین کا تانتا بندھ گیا۔ ہر سال نئے نئے لوگ آنے لگے اور ریگستان عرب کی خاک چھاننے لگے۔ ان میں سے ارنارڈ L.Arnaud پہلا یوروپین ہے جس نے جنوبی جوف (عرب) اور مآرب کا سفر کیا۔ یہاں کے کتبات سنگین کو پڑھا اور سدِّ عرم کا نقشہ تیار کیا۔ ارنارڈ کے اِس کارنامہ کو دیکھکر مسٹر ہالوے J.Halway بے چین ہو گئے۔ یہ فاضل علم آثار قدیمہ کا مشہور و معروف یوروپین عالم تھا۔ ۱۸۶۹ء میں عازم ملک عرب ہوا۔ سب سے پہلے یہ دار الحکومت یمن شہر صنعا میں پہونچا۔ پھر صنعا سے شمالی مشرقی جانب المدید آیا۔ جو پانچہزار عرب باشندوں کا مسکن اور ضلع نجم کا مرکز ہے۔ اسی طرح اِس محقق نے سات برس کے مسلسل سفر میں یمن اُس کے تمام مضافات و متعلقات کی خاک چھان ڈالی۔ یہانتک کہ عرب کے صحرائے عظیم کو بھی یہ تحقیق کا سودائی طے کرتا ہوا علاقہ نجران تک پہونچ گیا۔

ہالوے کے بعد آسٹریا کا عالم آثار گلاذر (Glaser) (۱۸۵۵ء تا ۱۹۰۶ء) ہے جس نے علم آثار عرب کے سب سے زیادہ خدمت کی۔ اِس نے دولت عثمانیہ کے زیر حفاظت صنعا کے شمالی و مشرقی جوانب کا مشاہدہ کیا۔

حضرموت۔ جنوبی ساحل عرب سے اندرون ملک میں جانے کی کوشش سب سے پہلے ۱۸۳۳ء میں کی گئی۔ جب دو انگریز افسر لفٹنٹ کروٹنڈن C.Crutendon. اور ولیسٹڈ J.R.Wellsted

سواحل عرب کی پیمائش کے لیے متعین کیے گئے۔ ان دونوں نے وادی میفات میں نقب الہجر کے کھنڈروں کا معائنہ کیا۔ یہاں اور نیز مکلا کے پاس حصن غراب میں حمیری کتبات کا انکشاف کیا یہ سب سے پہلی دفعہ ہے۔ جب حضرموت میں عربی تمدن کا سراغ ملا۔

ان کے بعد اوڈلف وان وریڈے (Adolph von wrede) ۱۸۴۳ء میں مکلا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اور حضرت ہود پیغمبر کی قبر پر۔ جو حضرموت میں واقع ہے۔ زیارت کو پہونچا پھر وہاں سے شمال کی طرف مڑا۔ اور وادی ودان کے سطح مرتفع تک پہونچ گیا۔ اور جنوبی صحرائے اعظم تک اُس کی سیاحت اور مشاہدے ہوگئے۔

۱۸۹۳ء میں ہرشش L. Hirsch سلطان مکلا کی زیر حفاظت قصبہ سیون اور تریم سے جو سلطان کے مقبوضات ہیں۔ آگے بڑھا۔ پہلے یہ وادی ودان پہونچا۔ اُس نے قریہ نجران کے پاس قدیم عمارات اور کتبات کا کھنڈر پایا۔ یہاں سے وہ واپسی میں وادی ابن علی اور وادی ادیم ہوکر مکلا واپس آیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد ملکی پیمائش کی ضرورت سے گورنمنٹ آف انڈیا نے تھیوڈر بنٹ J. Theodore Bent. اور اُن کی ہمراہی جماعت کو بھیجا۔ اس سفر میں لیڈی بنٹ بھی ہمراہ تھیں۔ یہ لوگ حضرموت پہونچے۔ اور اُن دونوں میاں بیوی نے یہاں بہت سے حمیری یادگاروں اور کتبات کا معائنہ کیا۔

عمان عمان ایک مدت سے انگریزی حکومت کے زیر اقتدار ہے۔ تعجب ہے۔ کہ یوروپین سیاح سقط سے آگے نہیں بڑھے۔ برٹش دستہ فوج جو ۱۸۱۰ء میں عمان گیا تھا۔ سواحل سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ولسٹڈ جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ اور جس نے جنوبی عرب میں حضرموت کی تفتیش کی تھی ۱۸۵۳ء میں دوبارہ شمالی عرب کی تحقیق کو نکلا۔ سقط سے وہ جہاز پر راس الحد تک آیا۔ پھر جنوب کی طرف صحرا کے کناروں تک قبیلہ بنو علی تک پھرا۔ پھر وادی بشہ اور رنجد ہو کر حضرموت کے شہر نخرابا اور وہاں سے ہندوستان واپس آیا۔ ایسے ہی عمان سے ہوکر کرنل مائلس Coronel. S. B. Miles نے بھی ظہیرہ۔ طقطار وغیرہ تہامات کی سیر کی۔

حجاز۔ حجاز کا پہلا یوروپین سیاح ایک اسپینی ہے۔ جکا نام بیڈے لیلچ Badiay Leitich ہے۔ یہ شخص علی بے عباسی کے نام سے سلمان بنکر ۱۸۰۷ء میں جدہ پہونچا۔ اور حاجیوں کے قافلے کے ساتھ مکہ معظمہ پہونچا۔ یہ سب سے پہلا یوروپین ہے۔ جس کو شہر مقدس کی زیارت اور اعمال حج کے مشاہدے

کا شرف حاصل ہوا۔
حجاز کی سب سے عمدہ تصویر برکہارڈ (Burkhardt) نے کھینچی۔ اور یورپ اُس کے لیے اُسکا شکر گذار ہے۔ یہ جولائی ۱۸۱۴ء میں جدّہ آیا۔ جب محمد علی پاشا خدیو مصر وہابیوں سے برسرپیکار تھا۔ برکھارڈ پہلے طائف پہونچا۔ پھر مکہ۔ اور یہاں تین مہینے شہر کے جغرافی اور سیاسی حالات لکھتا رہا۔ جنوری ۱۸۱۵ء میں مدینہ منورہ گیا۔ اور وہاں کے حالات کا بھی جغرافی اور ریاضی نظر سے معائنہ کرتا رہا۔
اس کے بعد پروفیسر سر رچرڈ برٹن (Sir Richard Birton) بھی ایک مسلمان حاجی کے بھیس میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پہونچا۔ اور یہاں کے جغرافی اور تالوغرافی (ریاضی جغرافی) حالات کی سب سے زیادہ تحقیق کی۔ اس سفر کے پچیس برس بعد حکومت مصر کی طرف سے وہ مدین میں سونے کی کان کی تلاش میں بھیجا گیا۔ سونے کی جو کان وہاں ملی۔ اُس میں سونا نکالنے کی کوششوں کے قدیم آثار معلوم ہوتے تھے۔ برٹن کو اُسوقت سونے کی مقدار بہت کم ملی۔ تاہم سونے سے زیادہ گراں قیمت اکتشافات اثریہ اُسکے ہاتھ آئے۔

نجد۔ کپتان سیڈلیر Capt Sadleer ویلن نے (G.E.Wallien) ۱۸۴۵ء میں اور مسٹر پالگریو نے (W.G.Palgrive) ۱۸۶۲ء میں۔ مصر و نجد کے خاص تعلق سے نجد۔ ریاض۔ حائل۔ تیما۔ اور حجاز کا مشاہدہ کیا۔ اُن کے معائنات میں بجز عرب کے اجتماعی۔ زراعی اور عام سفر کے حالات کے کوئی علمی دلچسپی نہیں ہے۔ اور عجب نہیں۔ کہ یورپ کیلئے یہ خبریں بھی بالکل نئی ہوں۔ گر با اینہمہ پالگریو جیسے سطحی النظر کو بھی مجلس اکتشافات عرب میں یہاں ایک بلند درجہ دیا جاتا ہے۔

شمالی عرب۔ جنوبی عرب (یمن وحضرموت) کی طرح شمالی عرب میں بھی قدیم یادگاروں کے بڑے بڑے مخزن ہیں۔ جن میں حوران۔ بطرا۔ تدمر۔ مدین۔ مدائن الصالح۔ صفا۔ اور العلاء وغیرہ عتیق العمر اور کثیر الآثار ہیں۔ سب سے پہلا ان مقامات کی سیر کرنیوالا جس نے بطرا کے کھنڈروں کو دیکھا۔ وہی برکھارٹ (۱۸۱۲ء) ہے۔ اسکے بعد چارلس ڈولے Charles Doughly ایک انگریز ہے۔ جس نے ۱۸۷۵ء میں ان مقامات کا سفر کیا۔ اور الحجر۔ مدائن الصالح۔ اور العلاء کو مشاہدہ کر کے مفید معلومات کا ذخیرہ ساتھ لایا۔ اور اپنے تمام سرمایہ کو پیرس میں پروفیسر رینان Renan کے پاس بھیجدیا۔ اُس نے اور آگے سفر کرنے کی اجازت بھیجی۔ چنانچہ اُس نے نجد وحجاز کے تمام درمیانی مقامات کا مشاہدہ کیا۔ شہر تیما میں اس نے بہت سی قدیم یادگاریں دیکھیں اور یہاں ایک مشہور یادگاری پتھر جس پر عبارت کندہ تھی۔ اُس کو ملا۔ وہ آئندہ موسم گرما میں شہر حائل گیا۔ وہاں سے واپس ہو کر

خیبر پہونچا۔ اور یہاں چند مہینوں تک سیر و سیاحت کرکے جدّہ واپس آگیا۔

ڈوٹے کے تین برس بعد ولفریڈ Welfrid اور لیڈی اینوبلنٹ Anno Blunt نے ایک نوجوان شیخ عرب کی معیت میں جو شہر تدمر کا باشندہ تھا عرب کا سفر کیا۔ یہ لوگ پہلے دمشق آئے پھر صحرائے شام اور وادی شمران ہوتے ہوئے جوف پہونچے۔ جوف سے جبل شمر ہوکر شہر حائل میں آئے یہاں ابن رشید۔ امیر نجد نے اُنکا نہایت تپاک سے استقبال کیا۔ پھر ایک مہینہ بعد یہاں سے ایرانی قافلہ کے ساتھ یہ لوگ کربلا و بغداد ہوکر نکل آئے۔

۱۸۸۳ء میں فرانسیسوں کی سیاحت کا زمانہ آیا۔ مسٹر سی ہیوبر (C. Hubar) کی معیت میں ایک اور یورپین عالم اکتشافات یوٹنگ (J. Euting) نامی تھا۔ ان دونوں کے اکتشافات نے ڈوٹے کی ناتمام تحقیقات کامل کردی۔ ہیوبر کی تحقیقات و اکتشافات عام حالات و واقعات سے بلندتر اور زیادہ علمی ہیں۔ جس کی عرب کی ارکیالوجی (علم القدامت) اور ٹاپوگرافی (علم تخطیط البلدان) نہایت ممنون ہے۔ ہیوبر نے حائل اور تیما کے درمیان بہت سے کتبات کا سراغ لگایا۔ اور ڈوٹے کے بیان کردہ مشہور منقوش پتھر کو حاصل کیا۔ جو سوآب کی یادگار ہے اور جس کے سامی آثار میں نہایت گرانمایہ وقعت ہے۔

ہیوبر یہاں سے عنیزہ آیا۔ اور وہاں سے براہ راست نجد۔ نجد سے مکّہ اور مکّہ سے جدّہ۔ جدّہ پہونچکر خوش قسمتی سے اُس نے اپنی تحقیقات و اکتشافات کا تمام سرمایہ بیان چھوڑ دیا۔ اور خود جولائی ۱۸۸۴ء میں اندرون ملک پہونچا۔ یہاں عربوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اُس کی تحقیقات و اکتشافات کا مجموعہ اُس کے بعد شائع ہوگیا۔

حدود سفر یورپین سیّاحوں کے مقامات سفر کا نقشہ اگر ہمارے سامنے ہو۔ تو نظر آئے گا کہ نصف شمالی عرب کو حفوف سے تیما تک اُنہوں نے بالکل چھان ڈالا ہے۔ نصف جنوبی عرب میں ایک ثلث حصہ صحرائے اعظم (ربع الخالی) کا ہے۔ جس میں سفر مرادف موت ہے۔ بقیہ حصص میں استثنائے جوف۔ نجران و یمن و سواحل سے سو میل سے آگے نہیں بڑھے۔

شہر تدمر کا نشان یورپ کو بہت پہلے مل چکا تھا۔ ڈاکٹر ولیم ہالیفیکس (W. Halifax) ۱۶۹۱ء پہلا یورپین سیاح تدمر ہے۔ وہاں کے عمارات کی تحقیق وُڈ Wood اور ڈاکنس Dawkins. نے ۱۷۵۱ء میں کی۔ لیکن ایپی گرافی کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل قدر خدمات پرنس ابامالک Abumelek. نے ۱۸۶۲ء میں اور وادنگٹن Waddington.

اور ویران D. Vogue نے ۱۸۹۲ء میں انجام دی۔ اور ان پر تصنیفات و رسائل ترتیب دیئے۔

سدّ مآرب عرب کا ملک قدرتاً دریا سے محروم ہے۔ اس لیے اُس کی زراعی زندگی کا مدار زیادہ تر اُن پہاڑی چشموں پر ہے۔ جو بہہ کر وادیوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اور پھر وہ بعض ریگستانوں میں خشک ہو جاتے ہیں یا سمندر میں گر جاتے ہیں۔ نیز وہ پہاڑوں سے اس طرح یکایک اُبل پڑتے ہیں کہ دور تک آبادیوں کو بے نشان بنا دیتے ہیں۔ اِس وجہ سے عرب وادیوں میں بند آب تعمیر کیا کرتے تھے۔ جسکو عربی میں سدّ کہتے ہیں۔ عرب کا مشہور ترین سد سدّ مآرب ہے۔ جس کو سدّ عرم بھی کہتے ہیں۔ جو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے منہدم ہے۔ اور جس کی شکستہ دیواریں زائرین علاقہ کے لیے نشان عبرت ہیں۔

یورومین سیاحوں میں سدّ مآرب کا مشاہدہ سب سے پہلے ارناؔ نے کیا۔ لیکن اُس کی اصلی اہمیت گلاؔ ذر نے اپنے اکتشافات مطبوعہ ۱۸۹۶ء سے ظاہر کی۔ ان کتبات سے اس سد کے متعلق تاریخی حالات بہت روشن ہو گئے ہیں۔ یمن میں حرّان کے پاس ہیرس W.B.Haris نے ایک اور بند دیکھا۔ جسکا طول ۱۲۰ گز ہے۔ اور جس کے اُوپر تین بڑے بڑے حوض ہیں

آثار حجریہ و نحاسیہ آثار قدیمہ کی یہ صنف سب سے زیادہ کار آمد ہے۔ کہ پتھر اور پیسے کے اشیاء پر اکثر کتبات منقوش ہوتے ہیں۔ اور ان سے بڑے بڑے تاریخی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور حل مطالب کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں یورپ کے عام عجائب خانوں میں اس قسم کی چیزیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر پر معینؔ اور سباؔ کی زبان اور بعض پر حضرموتؔ اور قتابینؔ کی زبان میں۔ کتبات منقوش ہیں۔

اپنے ماخذ اکتشافات اثریہ کے متعلق ہم نے یہاں تک تو ارض القرآن کی مدد سے لکھا ہے۔ اکثر مقامات پر اُس کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔ اور بعض مقامات پر تلخیص و اختصار سے کام لیا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ صاحب ارض القرآن نے تمام سیاحانِ یورپ کا نام بنام تذکرہ کیا۔ مگر انگریزی محقق برک ہربوط .Burk Horburt کا ذکر کرنا بالکل سہو فرما دیا۔ یہ وہ مشہور و معروف انگریزی محقق ہے۔ جس نے یونانی اور رومانی جغرافیہ عرب کو موجودہ جغرافیہ عرب سے تطبیق دیکر اس موضوع پر ایک خاص کتاب مرتب کی ہے۔ یہ اُسی نے بتلا دیا ہے۔ کہ یونانیوں کا میفیا و نقطائی قوم سبا کا مشہور شہر تھا۔ اور موجودہ بندرگاہ موزہ جو خلیج عرب پر ایک موجودہ بندرگاہ ہے ایک ہی مقام ہے۔ اور سفار یا ظفار سے یمن کا وہ کوہستانی حصہ۔ جہاں جغرافیہ بطلیموسی کے مطابق

شہر صفار اور قوم صفاریہ آباد تھی۔ مراد ہے۔ اس انگریزی محقق کے عجیب وغریب احوال ہم سر سید مرحوم کے خطبات سے حاشیہ بابت پائین صفحہ میں نقل کر دیتے ہیں[1]

عربی محققین اور اسلامی مکتشفین نے اپنے امکان کے مطابق۔ ملکی آثار قدیمہ کے جتنے اکتشافات کئے تھے۔ اور اپنی تالیفات وتصنیفات میں ان کے جس قدر حالات وواقعات لکھے تھے۔ اُن کو ہم بالتفصیل اور بیان کر آئے ہیں۔ ہم نے اپنے موجودہ تالیفات کے مقدمہ میں عموماً اور اقوام وقبائل قدیمہ کے متعلق خصوصاً۔ اس قسم کے ماخذ سے اکثر مقامات پر مدد لی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سر سید مرحوم اس انگریزی سیاح کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ہم نے اُس کے نام کے آگے رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے الفاظ رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر جو مسٹر برق ہر یوط کے نام کے بعد لکھے گئے ہیں۔ بلاشک متحیر ہونگے۔ اور اس حیرت کو رفع کرنیکے واسطے میری دانست میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کہ نہایت ذی فہم اور ذی علم گاڈ فری ہگنس صاحب کی کتاب کی کسی قدر عبارت کا ترجمہ اس جگہ لکھ دیا جاوے۔ گاڈ فری ہگنس صاحب لکھتے ہیں۔

یہ مشہور ومعروف سیاح برق ہر یوط۔ جس نے دار العلوم کیمبرج میں تعلیم پائی تھی۔ ایک نہایت پر غور تحقیق کے بعد اور خوب سوچ سمجھ کر مسلمان ہو گیا۔ اور اپنے عیسائی دوستوں کے مجمع میں بحالت اسلام انتقال کیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کو دین اسلام کی تعلیم بمقام حلب ایک آفندی نے دی تھی۔ واحد وہی نے اُس کو مسلمان کیا تھا۔ اور اُس نے وہیں علانیہ اپنے اسلام کا اقرار کیا اور جبکہ بہ نیت حج روانہ ہوا۔ تو مکہ کے قریب اپنے مذہب اور مسائل اسلام کی واقفیت کے متعلق اُسکو سخت امتحان دینا پڑا جس کے باعث وہ ہمیشہ حاجی کے لقب کا دعویٰ کرتا رہا۔ اُس کی تو مسلمی بالکل سچی اور صاف باطن معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ میں خیال کرتا ہوں کہ اُسکے عیسائی دوستوں سے علی العموم پوشیدہ تھی۔ میں اس حالت کے بیان کرنے سے بہت خوش ہوں۔ کہ میں ایک شریف آدمی کو جو بالفعل یعنی [illegible] سے برٹش گورنمنٹ کے ایک معزز عہدہ پر مامور ہے۔ واقفیت رکھتا ہوں۔ مگر اس کے نام ظاہر کرنے کا مجاز نہیں۔ ان صاحب نے بیان کیا۔ مسٹر برق ہر وط کے انتقال سے تھوڑے دن پہلے وہاں موجود تھا۔ اور مسٹر برق ہر وط نے نہایت سنجیدگی سے مجھے یقین دلایا۔ کہ وہ درحقیقت مسلمان ہیں۔ اور اسی حالت میں مجھے اپنے مرنے کی آرزو ہے۔ اسکا گمنام سوانح عمری لکھنے والا اپنی کتاب جو اس کے بعد مشتہر ہوئی۔ اُس کی موت کا حال بیان کرتا ہے۔ مگر اُسکے مذہب کے بارے میں کوئی لفظ منہ سے نکالنے سے احتیاطاً پرہیز کرتا ہے۔ غالباً اُس کو معلوم ہوگا۔ کہ اگر حق بات زبان سے نکلی۔ تو پادریوں کے بدنام اور رسوا کرنے کی وجہ سے میری کتابوں کی فروخت میں ہرج واقع ہوگا۔ لیکن ایک فقرہ۔ جو میرے بیان کی تائید کے واسطے کافی ہے۔ اُس کی زبان سے نکل ہی گیا ہے۔ وہ (برق ہر وط) شب کو پونے بارہ بجے بغیر افسوس وواویلا کرنے کے مر گیا۔ تجہیز وتکفین اُس کی۔ اُس کی وصیت کے مطابق بطریق اسلام کی گئی۔ اور اس

اِن تمہیدی اور ضروری مضامین اور اپنے تمام ذرائع معلومات کو بیان کر کے اب ہم ملک عرب کے قبائل اقوام اُن کے مختلف مساکن و مواطن اور اُن کے تمدنی اور سیاسی حالات و واقعات ذیل میں قلم بند کرتے ہیں

عرب کے قدیم اقوام و قبائل۔ اُنکے مساکن و مواطن اور اُنکے تمدّنی اور سیاسی حالات

عرب کی اقوام قدیمہ۔ پہلے اقوام قدیمہ کے اقسام لکھے جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان میں قومیّت کی بنا حضرت نوح علیہ السّلام کے وقت سے معلوم ہوتی ہے۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تمدّن اور سیاست کی صلاحیت معمورۂ عالم میں طوفان حضرت نوحؑ کے بعد پیدا ہوئی۔ اِسی بناپر تمام اقطاع و اقوام عالم کی تاریخ حضرت نوحؑ کے بعد پیدا ہوئی۔ اسی بناپر تمام اقطاع و اقوام عالم کی تاریخ حضرت نوحؑ کے وقت سے آغاز کی جاتی ہے۔ اور اُن کا سلسلہ اسی بزرگ سے ملایا جاتا ہے۔

قوم و قبائل کے اعتبار سے۔ اہل عرب کی تین قسمیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) عرب البائدہ یا عرب البادیہ (بدوی) یا اُمم سامیہ۔ یا عاد اُولیٰ۔ یا موجودہ اکتشافات تحقیق کے اعتبار سے۔ ہائیکسوس (شاہان شبان)

(۲) عرب العاربہ۔ عرب القدیم۔ عرب المتوطن۔ یا عاد ثانی۔ یا جرہم اولیٰ۔ یا عیلامی بھی کہے جاتے ہیں

بقیہ عبارت صفحہ گذشتہ۔ معزز رتبہ کا جو وہ ملکی لوگوں کی نگاہوں میں رکھتا تھا۔ کماحقہ لحاظ رکھا گیا۔ اگر وہ فی الحقیقت مسلمان تھا۔ تو اُس نے ضرور اسلامی شریعت کے مطابق اپنی تجہیز و تکفین کی استدعا و وصیت کی ہوگی۔ اور یقیناً اگر عیسائی اُس کی وصیت کا لحاظ نہ کرتے تو حکّام بمجبوری اُن سے کراتے۔ یہ بعید از قیاس ہے۔ کہ وہ عیسائیوں کا مسلمانوں کو ایک ایسے نومسلم کے شرف (خدمت) سے محروم رکھنا گوارا کرتے۔ مگر یہ ظاہر ہے۔ کہ اُنہوں نے اسکو بلاتکلف قنصل انگریزی کی نگرانی میں۔ اور اُس کے ہموطنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ جن کو کہ پورا موقع اُسکی تجدید مذہب کے واسطے اپنی لیاقتیں صرف کرنیکا ملا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذہب اسلام کی بلاوجہ تقلید و تائید کرنے میں۔ اُس کو کوئی غرض ملحوظ نہ تھی۔ بلکہ برخلاف اسکے اُن عیسائیوں سے جن کی طرف سے وہ مامور تھا۔ اور جن کی وجہ سے اُسکا گذارہ ہوتا تھا۔ اُسکو مخفی رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

اگر اُس کی سوانح عمری لکھنے والے پر اعتبار کیا جاوے۔ تو وہ اعلیٰ اُصول اور بہترین چال چلن کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ منجملہ اور پسندیدہ کیفیتوں کے جو اس مرتد کافر کی بابت جس طرح اُس کو عیسائی لوگ کہیں گے۔ مرقوم ہوئی ہیں۔ ایک یہ بھی ہے۔ اُس نے اپنی موروثی جائیداد قیمتی دس ہزار روپیہ کی اپنی ماں کے نان و نفقہ کے واسطے دیکر اپنے آپ کو محض مفلس و قلاش بنا دیا تھا۔ (دہنیگز ا لوجی صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ لنڈن) اور خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور ص ۶۱۔

(۳) عرب المستعربہ۔ بنو ابراہیمؑ۔ یا عرب میں نئے آباد ہونے والے جو سکونت مدت دراز کی وجہ سے قوم عرب میں داخل ہو گئے۔

باعتبار ترتیب اقسام کے۔ عرب کے اقوام کا علیحدہ علیحدہ حال لکھا جاتا ہے۔

عرب البائدہ۔ یا عرب البادیہ کے اقوام و قبائل سات مختلف طبقات میں منقسم ہیں۔ یہ طبقات سبعہ یہ ہیں۔

(۱) کوش پسر حام پسر حضرت نوحؑ کی اولاد۔

(۲) عیلام پسر نوحؑ کی اولاد۔

(۳) لود پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد۔

(۴) عوص پسر ارم پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد۔

(۵) حول پسر ارم پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد

(۶) جدیس پسر گژ[5] پسر ارم پسر سام۔ پسر نوحؑ کی اولاد

(۷) ثمود پسر گژر پسر ارم پسر سام۔ پسر نوحؑ کی اولاد۔

انہی اقوام سبعہ کا ملک عرب گویا ہفت پیکر ہے۔ یا مندرجہ بالا طبقات عرب قدیم کا سبعہ معلقات عرب کے اسی ہفت دفتر ہیں۔ سامی۔ ارامی۔ عاد اولیٰ۔ جرہم اولیٰ وغیرہم سب داخل ہیں اور ان تمام اقوام و قبائل پر مجموعاً متحد النسل اور متصل الاصل ہونے کے اعتبار سے عرب البائدہ ہونیکا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

عالم تاریخ کی سیر سے ان سات مختلف گروہوں کے مقامات سکونت بھی سات اقطاع عرب میں ثابت ہوتے ہیں۔ عربی مورخین و محققین نے ان کے حالات اور مقامات سکونت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اُسکا انتخاب حسب ذیل ہے

بقیہ عبارت صفحہ گذشتہ۔ اِس شخص کے مندرجہ بالا حالات و اعتقادات خصوصاً جن پر خطوط کھینچدیئے گئے ہیں۔ پڑھ کر اور پھر اسکو رضی اللہ عنہ کے لقب تخصیصی سے یاد کیئے جانے کے قابل تجویز فرما کر بھی کیا سید صاحب مرحوم یا کسی اہل اسلام کو مسئلہ تقیہ کے جواز و صحت میں کوئی عذر باقی رہ جاتا ہے۔ مولف عفی عنہٗ۔

[5] گژ عبرانی لفظ ہے۔ جس کے حروف تہجی میں کاف فارسی داخل ہے۔ یہ نسبت نامہ چونکہ توراۃ سے ماخوذ ہے۔ اسلیئے گژ نقل کیا گیا ہے۔ گژ کی تعریب جاثر ہے۔ ابن سعد نے اِس نسب نامہ کی عبارت کو یوں لکھا ہے۔ جاثر ابن ارم ابن سام ابن نوحؑ۔ ص ۲۷۔ ج ۱۔ طبقات۔ مطبوعہ جرمن۔

مورخ ابوالفدا لکھتا ہے۔ قال القاضی صاعد ابن احمد الاندلسی صاحب قضاءۃ مدینہ طلیطلہ ان العرب البائدۃ فکانت امما ضخمۃ کعاد وثمود وطسم وجدیس ولتقادم انقراضہم ذھبت عنا حقائق اخبارھم وانقطعت عنا اسباب العلم بآثارھم۔

قاضی صاعد ابن احمد اندلسی جو شہر طلیطلہ (To Leda) کے قاضی تھے لکھتے ہیں۔ کہ عرب البائدہ کے لوگ بہت قوی الجسم ہوتے تھے۔ اُن کی مثال ہیں۔ اقوام۔ عاد۔ ثمود۔ طسم۔ جدیس کے حالات موجود ہیں زمانہ دراز کے باعث اُن کے اخبار و آثار کے ذریعہ معلومات مسدود و منقطع ہیں۔

پھر یہی مورخ لکھتا ہے۔ اما جرھم فہم صنعان جرھم الاولیٰ وکانوا علی عھد عاد فبادوا ودرست اخبارھم وھم من عرب البائدۃ۔ ابوالفدا

جرہم جنہیں صنعان بھی کہتے ہیں۔ یہی لوگ جرہم اولیٰ تھے۔ اور یہی لوگ زمانہ عاد میں تھے۔ پھر یہ معدوم ہو گئے۔ اور اُن کے ساتھ اُن کے حالات بھی لامعلوم۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ وہ عرب البائدہ میں داخل تھے

جرہم کے بعد بنو طسم کی حقیقت یوں ہے۔ بنو طسم۔ سکنت بنو طسم الیمامہ الی البحرین (ابی الفدا)۔ بنو طسم یمامہ (یمامہ) سے لیکر بحرین تک کے علاقوں میں آباد تھے۔

بنو عاد کی نسبت یہ عبارت ہے۔ سکنت بنو عاد الرمل الی حضرموت بنو عاد ریگستان سے لے کر علاقہ حضرموت تک ساکن تھے۔ اُن کے مختلف مقامات سکونت کی تفصیل یہ ہے

دبلاد عاد یقال لھا الاحقاف وھی بلاد متصلۃ بالیمن وبلاد عمان۔ ابوالفدا۔ قوم عاد کے شہروں کو احقاف کہتے تھے۔ اور یہ علاقہ یمن اور عمان سے ملے ہوئے تھے۔

معالم التنزیل میں مرقوم ہے۔ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا۔ وھو عاد بن عوص بن ارم بن سام و ھم عاد الاولیٰ وکانت منازل قوم عاد بالاحقاف وھی رمال بین عمان وحضرموت۔

آیہ مبارکہ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا میں جس عاد سے مراد ہے۔ وہ عاد بن عوص بن ارم بن سام ہے۔ اور اُسی کی اولاد۔ عاد اُولیٰ کہلائی۔ اِن لوگوں کے مقامات احقاف میں تھے۔ احقاف اُس ریگستان کا نام ہے۔ جو علاقہ عمان اور حضرموت کے درمیان ہے۔

قوم ثمود کے متعلق ابوالفدا اور صاحب معالم التنزیل کی تحقیق متفقہ یہ ہے۔

سکنت ثمود الحجر بین الحجاز والشام الی وادی القریٰ ثمود کی سکونت علاقہ حجر میں تھی۔ اور یہ حجاز و شام کے درمیان وادی القریٰ تک پھیلے ہوئے تھے۔

الحجر کی ماہیت یہ ہے۔ الحجر بالکسر ثم السکون والراء اسم دیار ثمود بوادی القریٰ بین

المدینہ والشام وکانت مساکن ثمود وھی بیوت منحوتہ فی الجبال مثل الغائر تسمی تلک الجبال الاثالیب کل جبل منقطع عن الآخر یطاف حولہ وقد نقر فیہ بیوت ونقر علی قدر الجبال التی تنقر فیہا وھی بیوت فی غایۃ الحسن فیہا نقوش وطیقان محکمۃ الصنعۃ وفی وسطہا بیر التی کانت تردھا الناقۃ (مراصد الاطلاع للامام سیوطی)

الحجر قوم ثمود کے اُن مقامات سکونت کا نام ہے۔ جو وادی القریٰ کے علاقے ہیں۔ مدینہ اور شام کے درمیان واقع ہے۔ یہی مقامات قوم ثمود کے مساکن تھے۔ اِن لوگوں نے پہاڑوں میں پتھر تراش کر کے غار کی صورتوں میں اپنے رہنے کے لیے گھر بنائے تھے۔ اُنہی کو جبال اثالیب کہتے ہیں۔ یہ تمام پہاڑ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ مگر سب کے سب ایک گول دائرہ کی صورت میں گھوے ہوئے ہیں۔ انہی پہاڑوں میں پتھروں کو کاٹ کر گھر بنے ہوئے ہیں۔ اِن پتھروں کو پہاڑ کی موٹائی کی مقدار کے مطابق کاٹا ہے۔ اِن میں نہایت خوبصورت گھر بنائے ہیں۔ اور اِن میں نقش و نگار بھی ہیں۔ اور خوبصورت طاق بھی مستحکم صنعت کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ اِن گھروں کے بیچ میں وہ کنواں ہے۔ جہاں ناقہ (صالحؑ) کو اِن لوگوں نے پانی پینے سے روکا تھا۔

تقویم البلدان میں الحجر کی حقیقت یوں لکھی ہے۔

قال ابن حوقل الحجر بین جبال علی یوم من وادی القریٰ اقول لعحصل ذلک فان بینھما اکثر من خمسۃ الایام قال وکانت دیار ثمود الذین قال اللہ تعالیٰ عنہم وثمود الذین جابو الصخر بالواد قال رائت تلک الجبال ونحت منہا کما اخبر اللہ تعالیٰ وتنحتون من الجبال بیوتاً فارھین وتسمی الجبال الاثالیب اقول وھی التی ینزلھا حجاج الشام وھی عن العُلی علی نصف مرحلۃ من جھۃ الشام۔ (تقویم البلدان)

ابن حوقل کا بیان ہے کہ علاقہ حجر پہاڑوں کے درمیان وادی القریٰ سے ایک دن کے راستہ پر واقع ہے۔ مگر میں نے (ابو الفدا) پانچ دنوں کے راستہ سے بھی زیادہ اُس کو پایا۔ یہی قوم ثمود کے رہنے کے مقامات ہیں۔ اور یہ وہی قوم ہے۔ جس کی نسبت خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ الذین جابو الصخر بالواد۔ ابن حوقل کا بیان ہے۔ کہ میں نے ان پہاڑوں اور اُن چیزوں کو جو اِن میں واقع ہیں دیکھا ہے۔ جیسا کہ اِن کے متعلق خداوند عالم فرماتا ہے۔ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ فَارِہِیْنَ اِن پہاڑوں کا نام الاثالیب ہے۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں شام سے آنیوالے حاجیوں کا قافلہ اُترتا ہے۔ اور یہ مقام عُلیٰ سے مابین مکہ اور شام نصف راہ پر واقع ہے۔

اب وادی القریٰ کے متعلق۔ تقویم البلدان کی یہ تحقیق ہے۔ وادی القریٰ فھی بادیۃ الجزیرۃ

وما كان من يابين الى ايلة موجها بالحجاز معارضا لارض تبوك فهى بادية الشام (تقویم البلدان)

وادی القریٰ اُس بادیہ الجزائر کا نام ہے۔ جو یابس سے لے کر ایلہ تک حجاز سے آنے والے راستہ میں تبوک کے مقابل واقع ہے۔

ہم نے اپنے مندرجہ بالا بیان میں تمہیداً صرف مورخین عرب کے اقوال سے عرب البائدہ کے جستہ جستہ حالات اور اُن کی سکونت کے مقامات لکھدیئے۔ اب ہم حسب الوعدہ۔ اِن کے ساتوں قبائل کے حالات اور اُن کی سکونت کے مقامات اور تمدنی وسیاسی واقعات وحالات محققین اور مکتشفین یورپ اور نیز کتب مقدسہ کے حوالوں سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں

عرب البائدہ کے قبائل ہفت گانہ کی تفصیل اوپر لکھی گئی ہے۔ ان ساتوں قبائل کے مورث یا مُوجد خاندان کے نام یہ ہیں۔

(۱) کوش (۲) عیلام (۳) لود (۴) عوص (۵) حول (۶) جاسیں (۷) ثمود۔ ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) بنی کوش (کوش ابن حام ابن نوحؑ) عرب کے کسی مورخ نے ان کا کوئی حال نہیں لکھا ہے۔ اِسکا سبب یہ ہے۔ کہ اِس قوم کے لوگ قربت سکونت کی وجہ سے۔ عرب کے یقطانی قبائل سے مِل جُل گئے اور ایسے۔ کہ عرب میں تدوین تاریخ کے زمانہ میں۔ ان میں کوئی باہمی تفریق باقی نہیں۔ اس لیئے ان کو بھی یقطانی قبائل میں داخل کر لیا۔ عربی مورخین میں ایک نویری نے ان کی نسبت یہ فقرہ لکھا ہے وملك شرحبيل بنى قيس و تميم (شرحیل نے بنی قیس اور تمیم پر حکومت کی) اِس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کسی زمانہ میں شرحیل عرب کے اُن دونوں قبائل قیس اور تمیم پر حکمران تھا۔ اِس سے یہ بھی ثابت ہوگیا۔ کہ شرحیل۔ جو اپنے نام کی ترکیب سے بنی کوش کی قوم کا شخص ہے۔ نویری کے نزدیک یقطان کے قبائل میں داخل تھا۔ اب ثابت ہوگیا۔ کہ حقیقتاً عربی مورخین کی خاموشی اسی سبب سے تھی کہ وہ بنی کوش کو جانتے ہی نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی تھے۔ تو بنی یقطان کی ایک شاخ۔

مگر یوروپین محققین کی تلاش وفکر کا کیا کہنا۔ جنہوں نے بڑی جانفشانی اور دماغ سوزی سے۔ اِس مسئلہ کی تاریکی پر تحقیق کی کامل روشنی ڈالی۔ اور بنی یقطان سے بنی کوش کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے ثبوت اور اُن کی آبادیوں کے مقامات کے صحیح نشان قوی دلیلوں کے ساتھ دکھلائے۔ اور بتلائے ایک زمانہ تک یوروپین محقق بھی عربی مورخین کی طرح بنی کوش کے حالات سے ناواقف بنے رہے۔ چنانچہ مسٹر جارج سیل (George Sale) اور دیگر انگریزی مورخین بھی اپنی تالیفات میں اِن کا

کوئی حال نہ لکھ سکے۔ مگر ریورنڈ فاسٹر صاحب (Reve Forester) نے سب سے پہلے اُس کی تحقیق و تفریق کی طرف اپنی ہمت کا قدم بڑھایا۔ اور رفتہ رفتہ بڑی کوشش و تلاش اور کامل صحت و قابلیت سے مسئلہ زیر بحث کا پتہ لگایا۔ اور نہایت معتبر و مستند حوالوں سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ بنی کوش در حقیقت عرب میں خلیج فارس کے کنارے برابر برابر آباد تھے۔ اور اپنے اس دعوے کو شرقی کناروں کے مختلف شہروں کے ناموں سے مقابلہ کر کے۔ جو بطلیموس نے اپنے جغرافیہ عرب میں لکھے ہیں۔ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ اور اپنے ثبوت کو تاریخی شواہد سے مضبوط کر دیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ محققین علم قدامت کی یہ رائے مسلّم ہو چکی ہے۔ کہ سبا پسر کوش نے پہلے وہ حصہ وادی القریٰ کا آباد کیا۔ جو دریائے فرات کے ملحق ہے۔ اور یہ رائے بظاہر وجوہات ذیل پر مبنی ہے۔ ضلع مذکور کا خورستان یعنی کوش کے اصلی وطن کے قریب واقع ہونا۔ شہر سبی اور قوم سبا کا سرحد خالدیہ پر موجود ہونا۔ کوشی ناموں اور خاندانوں۔ جویلا۔ سبا ہد اماہ۔ و دان کا خلیج فارس کے کنارے پر مسلسل سلسلے میں واقع ہونا۔ اور سب سے آخر یہ کہ اشعیاہ نبی کی کتاب کے دو مقاموں میں کوش اور سبا کا ساتھ ساتھ بیان ہونا جس سے پایا جاتا ہے۔ کہ سبا خورستان سے ملحق ہے۔ مروّجہ نقشہ عرب میں راس ماسندام کے قریب جسکو بطلیموس نے اپنے نقشہ عرب میں راس اسابی کے نام سے دکھلایا ہے۔ شہر کسکان جو اصل میں کوش کان سے پاتے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے۔ جو توریت مقدس میں کوشام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح بحر عمان کے اسی کنارے پر عمانان یا عمان اور تامر (تدمر) یا سیب اور سوبار شہروں کے درمیان ہم ایک شہر پاتے ہیں۔ جس کو بلینی نے سواحل حام۔ جو بالفعل باحام کہلاتا ہے۔ اس خاکنائے کے مقابل کے اطراف پر۔ جو راس سندم پر منتہی ہوتی ہے۔ اور خلیج فارس کے دہانے کے اندر شہر اور ضلع رعماہ جسکو یونانی ترجمہ توریت میں رعمہ اور بطلیموس نے رغامہ لکھا ہے۔ پایا جاتا ہے خلیج کے باہر شہر اور ضلع و دان یا دوانہ کا پتا ملتا ہے۔ اور توریت میں جو ودان کی چھوٹی سی بستی رعماہ کا ذکر ہے۔ وہ یہی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ ان تمام مقاموں کے نام۔ قبائل کوش کے مندرجہ بالا ناموں سے بالکل مل جاتے ہیں۔ ان میں سے راماہ (رعماہ) اور ودان کا توریت مقدس میں مذکور ہونا پورے طور سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ امر ثابت ہو گیا۔ کہ بنی کوش حقیقت میں ایک جداگانہ قوم تھی۔ اور وہ عرب کے اُس حصہ میں آباد تھے۔ جو خلیج فارس کے کنارے دور تک چلا گیا ہے۔

مسٹر ریورنڈ فارسٹر اپنے اس قابلانہ تحقیق و تطبیق میں اکثر حد اعتدال سے بڑھ گئے ہیں۔ اسی وجہ

سے اُنکے بعض دلائل کے ثبوت میں ضعف آگیا ہے۔ اُس کی خاص کر یہ وجہ ہوئی ہے۔ کہ بنی کوش کے ناموں یا مقاموں میں سے۔ جہاں اُن کو عرب کے موجودہ ناموں اور مقاموں میں ذرا بھی مشابہت معلوم ہوئی۔ اُنہوں نے اُس نام اور مقام عرب کو بنی کوش کی طرف سے منسوب کر لیا۔ حالانکہ اُن کے تنہا قیاسی خیال کے خلاف کثیر التعداد تاریخی شاہد اور دلائل موجود ہیں۔

اسی طرح فارسٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہ بنی کوش عرب کے تمام حصوں میں پھیل گئے۔ قابل قبول نہیں ہے۔ اُن کے اس دعوے کی بنا اِس طرح قایم ہوتی ہے۔ کہ بنی کوش کے قوم کا بادشاہ نمرود جسکا ذکر کتب مقدسہ میں بھی موجود ہے۔ اپنے ہم قوم لوگوں کے ساتھ عرب کے دوسرے حصوں میں آکر رہا تھا۔ اس لیے بنی کوش تمام اقطاع عرب میں پھیل گئے۔

اہتمام پر اِس یوروپین محقق کو بھی وہی دھوکہ ہوا ہے جو شرقی مورخین کو۔ اور یہ دونوں فریق بنی کوش کو خلیج فارس کی آبادی سے بڑھاکر بحر احمر تک پہونچادیتے ہیں۔ اسلیے نمرود کی سلطنت کو یمن تک وسیع بتلاتے ہیں۔ حالانکہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ نمرود کبھی اپنے بھائیوں کے ساتھ علاقہ یمن میں آباد نہیں ہوا تھا۔ کوش کی اولاد جنکے نام سباہ۔ حویلاہ۔ سبتاہ۔ رعماہ۔ اور سبتکا تھے اور رعماہ کے بیٹے شیبا اور ودان سب کے سب خلیج فارس کے کنارے آباد ہوئے تھے جیسا کہ ابھی ابھی ہم توریت مقدس کے حوالے سے ودان اور رعماہ کے مقام سکونت خلیج فارس کے سواحل پر ثابت کر چکے ہیں۔ اگر یہ قومیں نمرود کے ساتھ یمن یا تمام اقطاع عرب میں آکر سکونت پذیر ہوئی تھیں تو ضرور تھا۔ کہ نمرود کے ایسا اِن لوگوں کا ذکر تمام عرب کے متعلق توریت میں مندرج ہوتا۔

بات اتنی ہے۔ کہ ریورنڈ فارسٹر کا یہ دعویٰ کہ بنی کوش بہمراہی نمرود آکر تمام اقطاع عرب میں پھیل گئے کسی طرح تاریخ سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ چند اقطاع عرب میں جن کا نشان اوپر دیا گیا ہے۔ ضرور بنی کوش آباد تھے۔ مورخین عرب کو بھی اسکا اقرار ہے۔ مگر وہ بنی کوش سے قطعی ناواقف ہونے کے باعث اِن کو یقطانی سمجھے اور سمجھاتے آئے ہیں۔

توراۃ میں ودان اور رعماہ کے متعلق جو حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ وہ ریورنڈ فارسٹر صاحب کے مرقومۂ بالا مختار کے بالکل مخالف ہے۔ بنی کوش کا وجود توریت کے ایک دوسرے مقام پر بھی اُس جگہ پایا جاتا ہے جہاں جناب موسیٰ علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السّلام کی دوسری شادی کرنے کا بیان ہے۔ کتاب اعداد باب ۱۲ آیت (۱) میں لکھا ہے۔ کہ مرعام اور ہارون نے حضرت موسیٰ سے اُس اتھوپین عورت کی وجہ سے۔ جس کے ساتھ اُنہوں نے شادی کی تھی۔ گفتگو کی"

ریورنڈ فارسٹر لفظ اتھوپیا کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔ کہ توریت و انجیل کے تاریخی جغرافیہ کے انگریزی

ترجمہ میں۔ الفاظ اتھوپیا اور باشندگانِ اتھوپیا اکثر مستعمل ہوئے ہیں۔ اور اُن کی جگہ عبرانی توریت میں اسم معرفہ کوش آیا ہے۔ اور یہ لفظ کوش جہاں کہیں کتب مقدسہ میں اِسطرح ہوا ہے۔ تو اُس سے ہمیشہ ایشیائی یعنی عرب مراد لیا گیا ہے۔ نہ افریقی اتھوپیا۔

اس سے زیادہ واضح اور مستحکم ثبوت اُسی توریت میں موجود ہے۔ کتاب خروج باب ۲ آیت ۵ اور ۲۱ میں لکھتا ہے۔ کہ وہ (حضرت موسیٰ کی بی بی) ایک مدیانی عورت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد بنی قطورہ کے سلسلہ سے " اور یہ بھی محقق ہے۔ کہ مدین یا مدیان عرب میں ایک شہر تھا۔ چنانچہ بٹین یونیورسل انفارمیشن میں (Beeton's Universal Information)

اتھوپیائے عرب کے ترجمہ میں۔ اتھوپیائے عرب سے ارض مدائن مراد لیا ہے۔ جس کو جغرافیۂ قدیم کے مطابق عرب فلکس (آباد ان) میں شامل کیا ہے۔ بٹنس یونیورسل انفارمیشن۔ مطبوعہ لندن ص ۶۵۲

اِس سے ثابت ہوگیا۔ کہ حضرت موسیٰؑ کی بی بی ایک عربی خاتون تھیں۔ مگر حقیقتاً کوش کا ترجمہ اتھوپیا درست نہیں ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کے اصلی مفہوم عرب کو اُٹھا کر اتھوپیائے افریقہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ توریت مقدس کی عبارت میں لفظ مدائن نے داخل ہو کر بالکل صاف کر دیا ہے۔ اور نیز قدیم وجدید محققین نے بھی اقرار کر لیا ہے۔ کہ اتھوپیائے افریقی ہرگز مراد نہیں ہوسکتا۔

مشاہد تاریخ قدیمہ سے اس قوم وقبیلہ کے جو کچھ حال معلوم ہوسکے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

بنی کوش کی حکومت اِس حکومت کے صرف تین کاہن بادشاہوں کے نام معلوم ہیں" او کوش" کاہن غشان" لوغل زاغیسی بن او کوش۔ لوغل او کیلیسی۔ (۱) اوکوش کے متعلق اِتنا معلوم ہے۔ کہ وہ غشان کا کاہن اور سیاسی قوّت سے زیادہ مذہبی قوت رکھتا تھا۔

(۲) لوغل زاغیسی نے باپ سے زیادہ سیاسی قوت حاصل کی۔ وہ کش (کوشان) اور غشان دونوں کا بادشاہ تھا۔ تقریبًا چار ہزار ق م میں اِس نے تیسرے شہر اُرخ یا ارک (عجب نہیں کہ لفظ "عراق" کی یہی اصل ہو۔) کی بنیاد ڈالی۔ جسکو اُسنے ملک کا دار الحکومت قرار دیا

(۳) لوغل او کیلیسی اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سومری طاقت نے پھر عود کیا۔ اور اس شہر کو بیرونی قوموں سے واپس لے لیا

محققین جدید کا مختار یہ ہے۔ کہ اُمم سامیہ میں جو ہر اعتبار سے بعد طوفان۔ اوّل الامم ثابت ہوتے ہیں۔ کوش بھی داخل ہیں۔ یہ مسئلہ پیچیدہ اور طویل ہے۔ اور ہمارے موضوع سے ایسا ضروری

تعلق بھی نہیں رکھتا۔ مگر ہاں اتنا بتلا دینا ضروری ہے۔ جیساکہ مغربی اور شرقی محققین۔ دونوں کی تحقیقات سے اُوپر بتلا دیا گیا۔ اور ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ یہ قوم کوش۔ قبیلہ یقطان سے بالکل علیحدہ بھی اور ان کے بود و باش کے مقامات بھی اُنکے مقامات سکونت سے بالکل جدا تھے۔ وہ مفقود الحال اور معدوم الذکر بھی نہیں ہیں۔ بلکہ اُنکے اخبار و آثار کتب مقدسہ اور اخبار قدیمہ میں ابھی تک محفوظ اور زندہ ہیں

(۲) عیلام اُنہی کی طرف جرہم اولی منسوب ہیں۔ چونکہ یہ قوم بنی کوش کے مقابلہ میں کچھ نامور نہیں ہوئی۔ اس لیئے ان کے تفصیلی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بنی کوش کے ساتھ رہتے تھے۔ اور اُنہی کے مقامات سکونت کے قریب بستے تھے اس سے زیادہ اُن کے حالات معلوم نہیں ہوتے۔

(۳) لود۔ لود کے تین بیٹے ہوئے طسم۔ علیق۔ اور عمیم۔ یہ قبیلہ بھی باستثنائے علیق جنکا ذکر آگے آئیگا۔ بنو عیلام کے ایسا صاحب نام نہیں ہوا۔ اس لیئے اُن کے بھی تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ مگر اُن کے آثار بھی خلیج فارس کے ساحلی مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

(۴) عوص اور (۵) حول ان دونوں قبائل کے حالات اس لیئے یکجا لکھتے گئے ہیں کہ تمام تاریخوں اور کتابوں میں ان کے حالات کی ترتیب ایک ساتھ کی گئی ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوئی نوعیت پسند نہیں کرتے۔ ان دونوں قبائل کے مقامات سکونت بھی خلیج فارس کے ساحل اور اُس کے قرب و جوار کے میدانوں میں آج تک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مقام حول اور غول (موجودہ) حقیقتاً متحد الذات اور مساوی المعنی ہیں۔

عوص کے بیٹے عاد اولی نے بہت بڑی شہرت حاصل کی اور رفتہ رفتہ اُسکی اولاد ایک نامور اور مقتدر قوم ہوگئی۔ اور تمام شرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی اُنہوں نے عالیشان مکان اور بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ اور قرب وجوار کی قوم و قبائل کو بھی محکوم کر لیا۔ یہ قوم اپنی قوت۔ امارت اور شان و شوکت کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دوسری قوموں پر سبقت لیگئی تھی

عاد اُولیٰ یا سامیہ اُولیٰ کی تاریخی حالات

تمام محققین و مورخین کا مسئلہ متفقہ ہے۔ کہ قدیم اُمم سامیہ اور عاد مترادف لفظ ہیں۔ السنہ سامیہ میں زبان کے لحاظ سے عبرانی سب سے قدیم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اُس میں محفوظ ہے۔ عاد کے لغوی حیثیت سے عربی میں کوئی معنی نہیں ملتے۔

لفظ عاد | عبری میں "عاد" کی اصلیت موجود ہے ‏עד (عاد) کے معنی "بلند و مشہور" کے ہیں، اور عجیب تر ہے۔ کہ "ارم" ‏ארם اور شم (سام) کے بھی یہی معنی ہیں۔ انہی معنوں کا اثر عربی میں بھی موجود ہے۔ ارم کے معنی پہاڑی اور سنگ نشان راہ کے لغت میں مذکور ہیں۔ اور شم سے "شمم" اور "سمو" تو اب تک مستعمل ہیں۔

تحقیق توریت | توراۃ میں "عاد" مذکر کے نام کے لیئے۔ اور عادۃ عورتوں کے لیئے کئی جگہ آیا ہے تاریخ ایام اوّل ۷-۲۱۔ اور تکوین ۲۶-۲ تاریخ اوّل ۷-۲۰۔

عاد کا زمانہ | نام کے بعد دوسری بحث زمانہ کی ہے۔ عرب قبل اسلام میں کوئی باقاعدہ تاریخ رائج نہ تھی۔ اس لیئے عرب بائدہ کا کوئی زمانہ مروی نہیں۔ لیکن اس بنا پر کہ مورخین عرب نے عاد کو عوص بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لیئے ان کا زمانہ ۳۰۰۰ (تین ہزار) قبل مسیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے عاد کا جہاں ذکر کیا ہے۔ اُن کو خلفائے نوح بتلایا ہے وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ۔ ترجمہ۔ اے عاد کے لوگو۔ خدا کے اس احسان کو یاد کرو۔ کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اپنی خلافت عطا کی۔ (یعنی حکومت دی) اعراف رکوع ۹۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرزمین شام کی دوبارہ آبادی بنو سام کی پہلی ترقی عاد سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیئے اس آیت سے نہ صرف عاد کے زمانہ کی تعیین ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے مسئلہ کی بھی تصدیق کہ اُمم سامیہ اُولیٰ اعلیٰ الاغلب عاد ایک چیز ہیں۔ اور اسی لیئے قرآن مجید نے عاد اولیٰ فرمایا ہے وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ۔ اسی خدا نے عاد اولیٰ کو برباد کیا۔

لیکن آجکل عموماً تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ بنو سام کی حقیقی ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح یا ۲۰۰۰ ق م ہے۔ حملہ مصر و بابل کی بھی یہی تاریخ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاد ارم کا وجود بھی ۲۲۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ تعیین انتہائے مدت کی یہ صورت ہے۔ کہ ۱۵۰۰ ق م میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰ سے پہلے عاد کی تباہی ہو چکی تھی۔ قرآن مجید نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰ و فرعون سے پہلے کیا ہے۔ بلکہ ایک موسوی مسلم فرعون کے دربار میں کہتا ہے۔

يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُم مِّثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ (مؤمن)

بھائیو میں ڈرتا ہوں کہ جماعتوں کے دن کی طرح قوم نوح عاد۔ ثمود۔ اور جو ان کے بعد ہیں۔ ان کی طرح ایک دن تم پر بھی آئے۔ (سورہ مومن)

ان وجوہ سے عاد کے مجد سابق اور عہد ترقی و تقدم کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہو سکتا ہے۔ صالحین عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہد مسیح تک باقی رہا ہے۔ اور یونانیوں نے عادِ مُیا (Adematal) (عاد ارم) اور عادیت (Adetie) کے نام سے حضرموت اور یمن کے باشندوں میں ذکر کیا ہے۔ تمیز کے لیے عہد اوّل کو **عادِ اُولیٰ** اور عہد ثانی کو **عادِ ثانیہ** کہتے ہیں۔

عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن و حضرموت میں از سواحل خلیج فارس تا حدود عراق تھی۔

دراصل حکومت کا مرکز ملک یمن تھا۔ لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ حکومت عراق تک وسیع تھی جس سے نہایت آسانی سے وہ راہ معلوم ہو سکتی ہے۔ جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق میں اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی اور یہی جدید تحقیقات کی رو سے بھی اُمم سامیہ کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔

عاد کا دور و دراز ممالک میں جانا عربوں میں اسقدر مسلم تھا۔ کہ وہ شعرا کے ہاں تمثیلوں میں آگیا ہے۔ زمانہ جاہلیت کا ایک شاعر محرز بن مکعبر ضبی کہتا ہے۔

حتی انتهی لمیاه الجوف ظاهرة	وہ وسط صحرا کے تالاب پر آکر رُکا
سالم ترتبلهم عادو لا ارم	یہ وہ رفتار تھی۔ جو اس سے پہلے عاد اور ارم بھی نہیں چلے

عرب کا ملک ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے۔ جہاں بڑے اور حوصلہ مند قوم و قبائل کے لیے ترقی کا کوئی میدان نہیں ہے۔ ناچار پرجوش قومیں باہر نکل پڑتی ہیں۔ عرب کا جزیرہ تا جنوب و مغرب اور کسی قدر مشرق کی جانب پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے آسان اور قدرتی راستہ اُس کے لیے بعض مشرقی اور عموماً شمالی ممالک میں۔ یعنی بابل و شام و سینا۔ بابل سے ایران کا راستہ ہے۔

شام سے بحر ابیض و بحر روم ہو کر یورپ اور افریقہ کی طرف بھی رُخ کیا جا سکتا ہے ۱۸۷۵ء سے پہلے جب نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحر ابیض اور بحر احمر کے درمیان آجکل کی طرح دریائی راستہ نہ تھا۔ نہ جزیرہ سینا اور مصر کے درمیان نہر سویز تھی۔ ایک پتلی سی خشک زمین تھی۔ جو شام عرب اور جزیرہ نمائے سینا کو خشکی کی راہ سے مصر سے ملاتی تھی۔ ہندوستان کی قدیم حملہ آور قوموں کے لیے جس طرح درہ خیبر مشہور راستہ ہے۔ اسی طرح مصر کے قدیم حملہ آوروں کے لیے یہی پتلی گلی ایک پامال راہ تھی۔

قوم عاد کے فتوحات اور مقبوضات بیرون عرب

(از سن ۴ ق م تا سن ۱۹۰۰ ق م)

(۱) عرب سامیہ یا عاد۔ بابل میں۔

(۲) عرب سامیہ یا عاد۔ مصر میں۔

(۳) عرب سامیہ یا عاد۔ دیگر ممالک میں۔

کسی مقدمہ کی صحت کے صرف تین جزو ہیں۔ مدعی کا دعویٰ۔ مدعا علیہ کا اقرار۔ اور گواہوں کی شہادت اگر کسی مقدمہ کے یہ تینوں اجزا باہم پہونچ جائیں۔ تو مقدمہ کی صحت میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ اہل عرب کا دعوےٰ ہے۔ کہ اُنہوں نے عراق کے شہر بابل پر حکومت کی۔ اہل عراق قدیم اسکا اعتراف کرتے ہیں۔ اور تحقیقات جدیدہ کی شہادت انکی تصدیق کرتی ہے۔ پھر صحت دعوے میں کسکو شک ہوگا؟

اہل عرب کا دعوےٰ علامہ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

فمنهم العماليق امم تفرقوا فی البلدان و منهم فراعنة مصر والجبابرة[۱]

اُنہی (عاد) میں عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قومیں ہیں۔ جو ملکوں میں منتشر ہوگئی تھیں۔ اور اُنہی میں سے مصر اور بابل کے بادشاہ ہیں۔

مورخ ابن خلدون کی تحقیق ہے۔ جسکو اُس نے اپنی تاریخ میں کئی جگہ دُھرایا ہے۔

ان قوم عاد والعمالقة ملكوا العراق[۲]

عاد اور عمالقہ عراق کے بادشاہ ہوگئے تھے۔

يقال انهم انتقلوا الی جزيرة العرب من[۳] بابل لما زاحمهم فيها بنو حام نزلوها (الحجاز) ايام خروجهم من العراق امام النماردة من بنی حام[۴]

کہا جاتا ہے۔ کہ یہ لوگ بابل سے جزیرۃ العرب میں اُس وقت چلے آئے۔ جب بنو حام نے اِن کے ساتھ مزاحمت کی۔ یہ لوگ عراق سے نکلنے کے زمانہ میں بنو حام کے بادشاہ سے بھاگ کر حجاز میں چلے آئے۔

اہل ایران کا بیان اہل ایران کا دعویٰ بیان ہے۔ کہ عراق و بابل کی حکومت انہی (عاد) کے ہاتھ میں تھی۔ انکا اعتراف ہے۔ کہ جمشید کے بعد جو بنو سام بن نوحؑ کا معاصر تھا۔ **ضحاک تازی** (عرب) نے ملک پر قبضہ کرلیا۔ عرب بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ طبری میں ہے۔

واليمن تدعيه وتزعم انه من انفسها و هو ضحاك بن علوان - طبری ص ۲۰۳ ج ۱

اہل یمن بھی اسکے مدعی ہیں۔ اور گمان کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ انہی کے قوم کا تھا۔ اور اسکا نام ضحاک ابن علوان تھا۔

---

[۱] کتاب المعارف ص ۱۰ مصر [۲] کتاب العبر ص ۲۵۹ ج ۲ مصر [۳] کتاب العبر ص ۱۸ ج ۳ مصر۔
[۴] کتاب العبر ص ج ۲ ص ۲۷ ۔ مصر۔

وبلغنا ان الضحاك هو نمرود وان ابراهيم ولد فى زمانه وانه صاحبه الذى اراد احراقه (۲۰۵)	ہمیں یہ روایت پہونچی ہے کہ ضحاک ہی نمرود تھا۔ حضرت ابراہیم اسی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یہی تھا جس نے اُن کے جلانے کا قصد کیا تھا۔

فردوسی اہل ایران کی تاریخ کا ترجمان۔ ضحاک تازی (عرب) اور اُس کی ہزار سالہ حکومت کا مفصل بیان شاہ نامہ میں کرتا ہے۔

توراۃ کا بیان بنی اسرائیل کا قدیم خاندان عہد ابراہیمی سے اسی ملک کا باشندہ تھا۔ اور نہایت قدیم زمانہ سے (۲۵۰۰ ق م) اُن کے تعلقات یہاں سے قائم ہیں۔ اس بنا پر اس باب میں اُن کی رائے بھی قابل وقعت ہوگی۔ توریت کی روایت ہے۔ سب سے پہلے بادشاہ کوش کا بیٹا نمرود تھا۔ اصل عبارت یہ ہے۔

کوش حام کا بیٹا تھا ...... کوش کی اولاد سبا۔ حویلہ سبا تا۔ رعماہ۔ اور سبا تیکا۔ اور رعماہ کے بیٹے شبا اور ویدان کوش سے نمرود کو پیدا کیا۔ اور اُس کی حکومت کی ابتداء بابل اور ایرخ (عراق) میں ہوئی۔ (تکوین۔ آیت ۱-۶-۷-۸-۹-

یہ سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ کہ ابتدائی تقسیم اقوام۔ حسب آرائے موجودہ۔ نسلی نہیں بلکہ جغرافی ہے۔ یہ تمام اقوام جنکا نام اولاد کوش سے ذکر ہوا ہے۔ وہ سب جنوبی سمت اور سواحل خلیج فارس کے باشندے تھے۔ یعنی عرب۔ یورپ میں تاریخ قدیم کا سب سے بڑا مورخ جرمن فاضل ڈنکر Dunker ہے۔ وہ بابل کی تاریخ میں اس توریت کے فقرہ کی تفسیر یوں کرتا ہے

سفر تکوین۔ مثل متاخرین یہود کے۔ کوش کے نام کے اندر اُن اقوام کو داخل کرتا ہے۔ جو جنوبی سمت میں رہتے ہیں۔ نوبی۔ ثوبی۔ (اتھوبین) اور جنوبی عرب کے قبائل۔ یہاں پر ہم اُن فرزندان کوش کو جنھوں نے بابل کی بنیاد ڈالی۔ جنوبی قبائل کے باشندے کہہ سکتے ہیں۔ جو تقریباً خلیج فارس پر مقیم تھے[1]

اہل عراق کا بیان۔ بابل کا ایک کلدانی مورخ بروسوس نامی ہے۔ جو اصلاً بابلی اور بیل کے معبد کا ایک کاہن تھا۔ یہ حضرت مسیح سے شاید ۲۰۰ برس پہلے تھا۔ اُس نے بابل کی قدیم تاریخ لکھی تھی۔ اصل کتاب تو ضائع ہوگئی۔ لیکن یہودی اور یونانی مصنفین نے اُس کے حوالے سے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ اور سنداً اُسکو بعینہٖ عبارت بھی لکھی ہے۔ اُنہیں منقول عبارتوں میں ملوک بابل کا ایک نقشہ ہے۔ مورخ موصوف کلدانی بادشاہوں کے بعد عرب بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور اُنکی تعداد ۹ اور اُن کی مدت حکومت ۲۲۵ برس قرار دیتا ہے۔ یہ نقشہ قابل تنقید ہے۔ لیکن قابل تغلیط نہیں۔ وہ نقشہ یہ ہے

[1] تاریخ قدیم ج ا ص ۲۴۹۔

نمبر	خاندان ملوک	تعداد	سال
۱	پادشاہان قبل طوفان نوح۔	۱۰	۴۳۲۰۰۰
۲	پادشاہان بعد طوفان نوحؑ۔	۸۶	۳۴۰۰۰
۳	میڈیا کے غاصب بادشاہ	۸	۲۲۴
۴	بادشاہ	۱۱	۲۴۸
۵	کلدانی بادشاہ	۴۹	۴۵۸
۶	عرب بادشاہ	۹	۲۳۵

تحقیقات جدیدہ اہل عرب اور اہل بابل کے بیانات سے اس سے زیادہ کوئی اور علم حاصل نہیں ہوتا کہ کسی قدیم زمانہ میں عرب سامیہ کے ایک خاندان نے عراق پر حکومت کی۔ اس سے زیادہ حالات قدامت کی تاریکی میں مخفی ہیں۔[۱]

لیکن ارکیالوجی (Archialogy) علم القدامت کی اعانت اور حضریات بابل کی صراحت نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے۔ اب نے سرے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے۔ اور علم الآثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آ رہا ہے۔ کہ بابل اور اسیریا کا ہر پتھر در حقیقت اُنکی تاریخ کا ایک صفحہ ہے۔

[۱] ہر چیز مذہب سے شروع ہوتی ہے۔ توریت۔ بابل۔ و اسیریا کے سلاطین اور شہروں کے نام سے پُر ہے۔ نوع انسان کا افتراق بابل میں ہوا۔ (تکوین باب ۱۰) حضرت ابراہیمؑ بابل و کلدان سے نکلکر فلسطین آئے تھے۔ یہودیوں کی تباہی اہل بابل کے ہاتھ سے ہوئی۔ ان وجوہ سے ضروری تھا۔ کہ یورپ کے علمائے آثار ان ممالک کی تنقیب و اکتشافات کی طرف توجہ کریں۔ اس کی ابتدا سولھویں صدی سے ہوئی۔ اور اب تک جاری ہے۔ سیکڑوں کتبات۔ خطوط۔ کتابیں (نقوش بر سنگ) مجسمات اسکے عمارات کے نشانات واقعات تاریخی کی منقوش یادگاریں زمین سے نکالی گئیں۔ خط اور زبان کی مشکل حل کی گئی۔ اور باقاعدہ ان اکتشافات و تحقیقات کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ تا آنکہ بابل و اسیریا کی عظیم الشان تاریخ مدوّن ہوئی۔

سیکڑوں علمائے مشرقیات نے ان تحقیقات میں اپنی زندگیاں وقف کیں۔ ان میں سے مشاہیر کے نام حسب ذیل ہیں۔

ہربرٹ (Herbert) سنہ ۱۶۷۷ء سرجان جارڈن (Sir John Jorden) سنہ ۱۷۰۰ء کارنل ڈی براؤن (Col. D. Brown) سنہ ۱۷۰۴ء نیوبھر (Nubhar) سنہ ۱۷۰۴ء جولیس موہل (Julius Mohil) سنہ ۱۸۲۳ء جارج اسمتھ (George Smith) سنہ ۱۸۲۶ء

قدیم بابل (اہل فارس سے پہلے) کے جو کتبات و آثار ملے ہیں۔ زبان کی حیثیت سے یہ دو قسم کے ہیں سامی۔ اور غیر سامی۔ ان سے بابل کے قدیم باشندوں کی قومیت کا راز فاش ہوتا ہے۔ ان میں کی اکثر کتبات پر سلاطین کی تاریخیں ہیں۔ اور جن پر سال مرقوم نہیں ہے۔ اُن کے زمانہ کی تعین قرائن سے کی گئی ہے۔ غیر سامی کتبات و آثار عموماً قدیم ترین ہیں۔ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ غیر سامی آبادی یہاں سامیوں سے پہلے آباد تھی۔ اُن کی زبان **سومری** اور **اکادی** تھی۔ جس سے ہم اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں۔ کہ وہ غیر سامی آبادی اکادی اور سومری تھی۔ جو تشابہ نام و زبان کے لحاظ سے غالباً۔ تورانی النسل ظاہر ہوتی ہے۔

ارض بابل کے اس عہد کے تمام کتبات کو بہ ترتیب رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ۔۔۔ ۴ ق م کی ابتداء میں قدیم سومری الفاظ کے بجائے ان میں سامی الفاظ کی آمیزش شروع ہوتی ہے۔ اور یہ آمیزش و اختلاط رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ تا آنکہ۔ نام۔ خط۔ اور خیالات بالکل سامی ہوجاتے ہیں۔ جس کا خاتمہ ایک اور تورانی النسل[ا] زبان عیلام پر ہوتا ہے۔ جس کا وطن خلیج فارس کا فارسی ساحل تھا۔ پھر ایک زمانہ کے بعد ۔۔۔ ۲۵ ق م میں زبان بالکل سامی ہوجاتی ہے۔ بعد ازاں ایک مرکب و متحد زبان کی صورت نظر آتی ہے۔

ان قدیم ترین حکومتہائے بابل کے سلسلہ میں ہم نے دو جگہ عرب سامی خاندانوں کا ذکر کیا ہے ۔۔۔ ۴ ق م اور ایک ۔۔۔ ۲ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ بیان کے محتاج ہیں۔

چار ہزار ق م۔ اس خاندان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سامی تھا۔ باہر سے آیا تھا۔ اور ابتدائً نہایت وحشی تھا۔ یہ بیرونی۔ وحشی۔ سامی کون تھے؟ عرب اس خاندان کے حالات کے متعلق جدید ترین تحقیق یہ ہے۔

تقریباً چار ہزار ق م کی ابتدا میں سومری لوگوں نے جو ایک اعلیٰ تمدن حاصل کر رہے تھے۔ اپنے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۱ اور ہالوے (Holway) وغیرہم۔
اسوقت بھی ایک جرمن سوسائٹی مشغول کار ہے۔ اُسکے حیرت انگیز نتائج۔ سال بیوستہ شائع ہوچکے ہیں۔ اس سلسلہ میں عجیب بات یہ ہے کہ بابل و سیریا کی تحقیقات و اکتشافات میں دولت عثمانیہ اور بعض ترک۔ سلیمان حمدی بے اور خلیل بے کے نام بھی موجود ہیں۔

[ا] زبان عیلام کو تورانی النسل خیال کرنا۔ صاحب ارض القرآن کے ایسے وسیع النظر محقق سے بہت تعجب انگیز ہے۔ جنہوں نے خود اپنے شجرۂ اقوام ارض القرآن ص ۱۲ میں عیلام کو سام کا پسر اوّل لکھا ہے۔ پھر انہی کو تورانی النسل کیسے قرار دیسکتے ہیں۔ حالانکہ تورانی روم سے تعلق نسبی رکھتے ہیں۔ اور وہ یافث کی اولاد میں ہو سکتے ہیں۔ نہ سام کے سلسلہ میں۔ المؤلف عفی عنہ

ملک کو ایکبار (اس کے بعد) وسیع التعداد بربری قبائل سے پُر پایا۔ یہ (بربری) سامی تھے۔ جو نہایت قریبی خونی تعلق عربوں سے رکھتے تھے۔ جو ایکبار (اسکے بعد) اسپین (Spain) تک دوڑ چکے ہیں۔ اور عبرانیوں سے بھی اسی قسم کی شابہت رکھتے تھے۔ جو ایکبار نہر ارون (Aron) کو عبور کرکے کنعان پہنچے

بعضوں کا خیال ہے۔ کہ یہ (فاتحان بابل) کردستان سے آئے۔ اور بابل پہونچکر۔ ارمنیا عرب اور کنعان وغیرہ میں پہونچے۔ لیکن یہ خیال اب متروک ہے۔ دوسری رائے یہ ہے۔ کہ وہ افریقہ سے آئے۔ اور مصر ہو کر تمام پھیلے۔ اس تھیوری (Theory) (خیال) کی اثبات میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن پھر بھی اس خیال کے لیے بہت بڑی قوت اور اہمیت ہے۔ کہ ان کا اصل مسکن عرب تھا۔ جہان سے نکلکر ایک سرسبز اور وسیع قطعہ کی تلاش میں الجزایرہ۔ بابل۔ اور دیار مغرب میں کنعان تک موجیں لیتے ہوئے نکل آئے۔ یہی آخری خیال روز بروز نئے طرف داروں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے۔ کہ عموماً اب یہی علما کی مقبول رائے ہے۔ (ملخصاً از باب الکتاب ۱)

سومری حکومت کے اسی عہد کا ایک چھوٹا سا اور ٹوٹا سا کتبہ ملا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس وقت ایک جدید داخل ہونے والی قوم ہے۔ جس نے شمالی بابل کو لے لیا تھا۔ دوبارہ اس کی واپسی کے لیے کوشاں تھی۔ یہ نئی آنے والی قوم کون تھی۔ سامی۔ جسکا اصلی گھر غالباً عرب تھا۔ لیکن اب وہ کچھ دنوں سے بابل کے شمالی و مغربی حصہ میں (غالباً الجزیرہ میں) آباد تھی۔ سامیوں نے تمام ملک میں اُن حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جو آباد اور زرخیز تھے۔ اور جو سومری قوموں کے ذریعہ گذران تھے (باب الکتاب ۲)

اس زمانہ میں حکومت ایک شہر سے عبارت تھی۔ جس کے آس پاس کچھ گاؤں کچھ خیموں کی آبادی اور کچھ اِدھر اُدھر کے قبائل پر مشتمل ہوتی تھی۔ شہر میں ایک شاہی قصر ہوتا تھا۔ اور ایک پتھروں کا ہیکل۔ ہیکل کا کاہن اور قصر کا بادشاہ ایک شخص ہوتا تھا۔ ہر ہیکل کا ایک خاص دیوتا ہوتا تھا۔ جس کے قبضہ قدرت میں تمام شہروں کی جان ہوتی تھی۔

کتبات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اغاد (شاخ سامیہ) خاندان میں چار بادشاہ گذرے ہیں۔ بطی بعل (ایک دیوتا تھا) شرغنی شرعلی کرا اور بن شرعلی۔ کرزام سن کہے۔

(۱) بطی بعل کے نام کا کوئی کتبہ نہیں ملا۔ لیکن اُس کے بیٹے شرغنی کا ایک کتبہ ملا ہے۔ جس میں وہ اپنے باپ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "شرغنی شرعلی بن بطی بعل شاہ قادر اغاد۔۔۔۔۔ بانی ایکور ہیکل بعل در شہر نیور"

اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ ہونے کے علاوہ بہت سی عمارتوں کا بانی ہے۔

(۲) شر غنی شر علی کر (۳۸۰۰ قبل مسیح) اسکا پورا نام ہے۔ لیکن کبھی صرف شر غنی بھی پایا گیا ہے لیکن زیادہ مشہور یہ شر غون اول یا سرجون اول کے نام سے ہے۔ شر غون اس خاندان کا گل سر سبد ہے۔ اور حکومتہائے بابل کے بزرگ ترین بادشاہوں میں اسکا شمار ہے۔ اس کے جو کتبات اسوقت تک ملے ہیں۔ وہ متفقاً اُس کی عظمت و جلال کے بیان سے پر ہیں۔ اُس نے ایک طرف سومریوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ اور دوسری طرف فارس میں عیلاسیوں کو مغلوب کر لیا

(۳) نرام سن کبر (۳۷۵۰ ق م) بھی عظمت میں اپنے باپ سے کم نہیں۔ اسکا خطاب تھا "شاہِ چار دانگ عالم"۔ نرام سن کر کی خاص مہم۔ زمین۔ مُغان پر حملہ ہے۔ مُغان سے غالباً جزیرہ سینا مغربی و شمالی مراد ہے۔ اس کے قریب شہر مغان اب تک معلوم ہے۔

فاتح ہونے کے علاوہ یہ بادشاہ بانی عمارات بھی ہے۔ نیور اور اغاد میں ہیکل تعمیر کرائے۔ اور شہر نیناہیں نیوائیں۔ اسفار میں آفتاب دیوتا کا ہیکل تیار کرایا۔

(۴) بن غلی شر علی خاتم خاندان اور مجہول الحال ہے [1]

---

[1] اس فصل کے لکھتے وقت حسب ذیل کتابیں ہمارے پیش نظر تھیں۔ نینوے اور اُس کی یادگاریں۔
Ninevah and its remains. By A.H. Layard 1849 London.
تاریخ قدیم۔ راولنسن پروفیسر تاریخ قدیم کیمبرج A Manual of Ancient History
By G. Raulinson, Professor of History. Cambridge.
تحقیقات آثار نینوی و بابل Discoveries in the ruins of Ninevah and Byblonia By A.H. Layard 1853

لیکن راولنسن کی کتاب صرف تاریخ یونان و روم کے زیورات سے ماخوذ ہے۔ اور لیارڈ کی کتاب کے معلومات جو گو سیاحت بابل و نینوی کے نتائج ہیں۔ تاہم اُسکے معلومات پرانے ہو چکے ہیں۔ راجرس (R.W. Rogers) کی تاریخ بابل اشور جو بالکل جدید تصنیف ہے۔ اور جس کی بنا صرف تحقیقات تازہ پر ہے۔ اور جو تمام یورپ کے دار الآثار اور کتب خانوں کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس فصل کا ماخذ ہے (جلد اول۔ کتاب اول۔ باب ۱۱ (۲) اور کتاب ۲۔ باب اول) یہ تمام معلومات ملخص ہیں۔ محققین جدید یہ کی تحقیقات۔ اُنکے ذرائع معلومات۔ خصوصاً اصول علم الآثار کے مطابق انکشافات کے قیمتی قابل قدر اور مفید ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر باوجود ان قیمت و عظمت کے بھی اُنکے علمی کارناموں کے اکثر مقامات محل شبہات اور پر خدشات ہیں۔ جن کی صحت۔ اصلیت اور قطعیت پر مشکل سے اعتبار کیا جائے گا۔

المؤلف عفی عنہ

...۲۸ ق م گذشتہ صفحات میں ڈھائی ہزار برس کا مرقع پیش کیا گیا۔ جس میں بابل کے اسٹیج پر۔ سومری عیلامی اور سامی قوموں کا کبھی بصلح داشتی۔ کبھی بجنگ وجدال ظہور ہوتا رہا۔ ...۲۴ ق م میں ایک اور سامی قوم کا ظہور ہوا۔ جس نے تمام قوموں کا خاتمہ کردیا۔ اور ایک متحد سامی حکومت کی بنیاد ڈالی ہیں حکومت کی حقیقت قومیت ان الفاظ میں ایک امریکن مورخ راجرس ادا کرتا ہے۔

سومری تہذیب اب پیری کو پہنچ گئی تھی۔ موت کے جراثیم اب اس میں پیدا ہوچکے تھے۔ دوسرے طرف سامی تمدن زندگی اور جوش سے لبریز تھا۔ سامی ریگستان عرب کی آزاد ہوا سے باہر آئے تھے۔ وہ اپنی رگوں میں زندگی رکھتے تھے۔[۵۱]

اس خاندان کا شجرہ ملوک جیسا کہ کتبات سے ظاہر ہوا ہے۔ حسب ذیل ہیں[۵۲]

نمبر شمار	نام بادشاہ	سن حکومت	مدت حکومت
۱	سمو۔آبی	۲۴۵۴ - ۲۴۴۰ ق م -	۱۵ برس
۲	سمو۔لاایلی	۲۴۳۹ - ۲۳۹۱ ق م	۳۵ برس
۳	ذابو	۲۴۰۴ - ۲۳۹۱ ق م	۱۴ برس
۴	اکل سن	۲۳۹۰ - ۲۳۷۳ ق م	۱۰ برس
۵	سن مبلّط	۲۳۷۲ - ۲۳۴۳ ق م	۳۰ برس
۶	حمورآبی	۲۳۴۲ - ۲۲۸۸ ق م	۵۵ برس
۷	سمو ایلونا	۲۲۸۷ - ۲۲۳۵ ق م	۳۵ برس
۸	عمی۔شوغ	۲۲۵۲ - ۲۲۲۸ ق م	۲۵ برس
۹	عمی ستانا	۲۲۲۷ - ۲۲۰۳ ق م	۲۵ برس
۱۰	عمی صادقا	۲۲۰۲ - ۲۱۸۲ ق م	۲۱ برس
۱۱	سمو۔ستانا	۲۱۱۸ - ۲۱۵۱ ق م	۳۱ برس

اس فہرست میں پہلا نام سموآبی کا ہے۔ اس کی نسبت کوئی واقعہ نہیں معلوم۔ اسکا نام سلاطین کی فہرست میں ملا ہے۔ اس کے بعد کے جانشینوں کی نسبت بھی انکو کوئی صحیح علم نہیں ہے۔ سمو لاایلو کے متعلق اتنا

[۵۱] Rogers Vol.1. P.383.　[۵۲] Rogers Vol.1. P.338

جاتے ہیں۔ کہ اُس نے بابل میں چھ قلعے تعمیر کرائے تھے۔ تیسرا بادشاہ ذا بو صرف ایک ہیکل کے بانی کی حیثیت سے معلوم ہوا ہے۔ جو شہر کے دیوتا کے نام سے بنا تھا۔ افل سن۔ او سن مُبلط بھی مجہول الحال ہیں۔

اِس خاندان کا مشہور و ممتاز بادشاہ حمورابی ہے۔ جس کی نسبت ہماری اطلاعات کسی قدر زیادہ وسیع ہیں۔ اسکا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اِس نے ملک کو عیلامیوں سے پاک کر دیا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حمورابی سے پہلے تک ملک میں عیلامیوں کا زور باقی تھا۔ عجب نہیں کہ حمورابی کے اسلاف کا عدم اہمیت و شہرت اسی علت کا معلول ہو۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ حمورابی سے پہلے کے بادشاہوں کے ساتھ شاہی القاب نظر نہیں آتے۔

اب تک جو کتبات اس خاندان کے ملے ہیں۔ وہ عموماً حمورابی ہی کے ہیں۔ جن سے اِس بادشاہ کی عجیب و غریب عظمت ظاہر ہوتی ہے[۱]

توریت میں سب سے پہلا جو سیاسی واقعہ مذکور ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں شمالی عرب میں عراق اور شام کے بادشاہوں کی باہمی جنگ ہے۔ اس موقع پر شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل یا اُمورافیل مذکور ہوا ہے[۲]۔ الف اور ح کا اور ب اور ف کا مبادلہ السنہ سامیہ میں بہت متداول ہے۔ اس لیے عجب نہیں۔ کہ امرافیل اصلاً اموراقی ہو۔ اور اُموراقی حمورابی کا عبرانی تلفظ ہو۔ ایل کا اضافہ (بمعنی خدا) صرف عبری ناموں کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ جیسے اسرائیل۔ خرقیل وغیرہ۔ امرافیل اور حمورابی کے اتحاد کی بڑی دلیل دونوں کا تقریباً اتحاد عصر اور اتحاد ملک بھی ہے۔ بہر حال اگر یہ قیاس صحیح ہے۔ تو حمورابی اور حضرت ابراہیم کا باہم ایک ہی زمانہ ہوگا۔

حمورابی کے ایک اور کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شاید یہ دُنیا کا سب سے پہلا مقنن ہو۔ بابل کے ایک منار پر اُس کے قوانین کا خلاصہ درج ہے۔ جو توراۃ کے احکام سے بہت مشابہ ہیں۔ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا اہل ضلال کہتے ہیں۔ کہ توریت کے احکام یہیں سے ماخوذ ہیں۔ ارباب ہدیٰ کہتے ہیں۔ کہ یہ احکام ابراہیم کی شریعت کے ہیں۔ جن کو حمورابی نے سُنا اور قبول کیا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ جو اہل ایمان ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ حقیقتاً اُن کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

حمورابی کے بعد جو بادشاہ اس خاندان میں ہوئے۔ وہ اسلاف کی عظمت کو قائم نہ رکھ سکے۔

---

[۱] راجرس۔ جلد اوّل ص ۳۹۱ [۲] تکوین باب ۱۴۔

[۳] حمورابی کے قوانین انگریزی میں ایک رسالہ کی صورت میں چھپ گئے ہیں سارس اب کے تمام حوالہ راجرس تاریخ بابل و اسیریا سے ماخوذ ہیں۔ المؤلف۔

عربِ سامیہ یا عربِ عاد مصر میں

عراق کی طرح مصر میں بھی اس واقعہ کے تین اجزا ہیں۔ روایت عرب۔ بیان اہل مصر اور تصدیق تحقیقات جدیدہ۔ بلکہ اس مقدمہ میں ایک چیز اور زیادہ ہے۔ یعنی اشارات توراۃ۔

روایت عرب علامہ ابن قتیبہ کی یہ عبارت ہے۔

فمنهم العماليق امم تفرقوا فی البلدان و منهم فراعنة مصر

انہیں میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قومیں ہیں جو ملک میں پھیل گئی ہیں۔ انہی میں فراعین (شاہان) مصر ہیں۔

مورخ یعقوبی لکھتا ہے:۔

فلما ملكوا النساء طمع فيهم العمالقة ملوك الشام فغزاهم ملك العمالقة وهو يومئذ لو ليد بن دومغ ووطئ البلاد فرضوا ان يملكوا عليهم واقام دهرا طويلا ثم ملك اخر من العمالقة يقال له الريان ابن الوليد وهو فرعون يوسفؑ۔

تاریخ یعقوبی ج ۱ ص ۲۱۱ لندن

(ترجمہ)

مصریوں نے جب عورتوں کو بادشاہ بنایا، شام کے بادشاہ جو عمالیق تھے۔ انہوں نے طمع کیا۔ عمالیق کے بادشاہ نے جسکا نام ولید ابن دومغ تھا۔ ملک کو پامال کیا تھا۔ اہل مصر اُن کی بادشاہی پر راضی ہوگئے۔ ایک زمانہ تک یہ بادشاہ زندہ رہا۔ پھر عمالیق کا دوسرا بادشاہ ہوا جسکو لوگ ریان ابن ولید کہتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کا معاصر فرعون یہی ہے

تاریخ یعقوبی جلد اوّل ص ۲۱۱ لندن۔

جزئیات بیان اور نام گو صحیح نہ ہوں۔ لیکن اصل واقعہ ثابت ہے۔ اور کیا عجب کہ یہ عربی نام اصلی ناموں کے ترجمہ ہوں۔ اسی قسم کا بیان اور تاریخوں میں بھی ہے۔ معجم یاقوت میں ہے۔

وقيل ان فراعنة مصر كانوا من العماليق وكان منهم فرعون ابراهيم

کہا گیا ہے۔ کہ مصر کے فرعون عمالیق میں سے تھے۔ انہی میں حضرت ابراہیمؑ ...... اور حضرت یوسفؑ کے فرعون بھی

مورخ طبری کی روایت ہے

وانه ملك على مصر اخاه سنان بن علوان وهو اول الفراعنة وانه كان ملك مصر حين قدمها ابراهيم خليل الرحمان (ج ۱ ص ۲۰۲ یورپ)

اُس نے مصر پر اپنے بھائی علوان بن سنان کو بادشاہ بنایا یہ مصر کا پہلا فرعون تھا۔ حضرت ابراہیمؑ جب مصر گئے۔ تو یہی فرعون تھا۔

اس معاصر کی تائید دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے بیان آگے آئے گا۔

مورخ ابن خلدون کی تحقیق ہے

اِنّ بعض ملوک القبط استنصر ملک العمالقۃ لعہدہ ...... فجاء معہ وملک مصر۔

قبط (قدیم باشندگان مصر) کے بعض سلاطین نے اپنے زمانہ کے شاہ عمالیق سے مدد مانگی۔ وہ آیا۔ اور اُس نے مصر پر قبضہ کر لیا

اہل مصر کا بیان

مسیح سے دو ہزار برس پہلے ایک اجنبی قوم نے مصر پر قبضہ کیا۔ اسکا نام اہل مصر **سوس۔** (چرواہے) اور **ہیک سوس** (چرواہے بادشاہ) بتلاتے ہیں۔ یہ چرواہے بادشاہ کون تھے بجز عرب جو اکثر شتربانی سے جہانبانی تک پہونچے ہیں۔ اور اُسوقت بھی اُن کو یہی لقب دیا گیا۔ لیکن کیا کیا جاوے چرواہا ہونا نہ صرف عرب کا بلکہ اُمم سامیہ کا قومی وملکی پیشہ ہے۔ اور اُس کی تحریری شہادت آج سے دسہزار برس بیشتر کی ہمارے پاس موجود ہے۔ تا آنکہ پیشوایان اُمم سامیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا

بہر حال اہی چرواہے بادشاہوں۔ یا عرب چرواہوں کی نسبت اہل مصر کا اعتراف ہے کہ مسیح سے دو ہزار برس پہلے مصر پر حکمران تھے۔ مصر کا قدیم مورخ اسکندریہ کا مانیتو ہے۔ جس نے مسیح سے ۲۶۰ برس بیشتر یونانی میں مصر کی تاریخ لکھی تھی۔ اصل کتاب تو مفقود ہے۔ لیکن اسکی جستہ جستہ عبارتیں بعد کے یونانی اللسان مصنفین کے یہاں منقول ہیں۔ جن میں سے ایک یہودی مورخ **یوسیفوس** بھی ہے۔

یوسیفوس نے ہیک سوس کی نسبت جو کچھ لکھا ہے۔ اُس کا اقتباس یہ ہے

ہمارا ایک بادشاہ طیماؤس نامی تھا۔ اُس کے عہد میں یہ ہوا لیکن ہم نہیں جانتے کہ کیونکر ہوا۔ خدا ہم پر خفا تھا؟ ایک عجیب طریقہ سے شریر الخلقت لوگ اطراف مشرق سے چلے آئے۔ وہ اِسقدر بہادر تھے۔ کہ ہمارے ملک میں گھس آئے۔ نہایت آسانی سے بزور مسخر کر لیا۔ گو اُن سے ہماری ایک قسمت اہم جنگ ہوئی۔ جب اُنہوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کر لیا جنہوں نے اپنی طاقت سے ہم پر حکومت کی تھی۔ تو ہمارے شہروں کو جلا دیا۔ ہمارے دیوتاؤں کے ہیکلوں کو برباد کیا۔

آخر وہ حاکم بن بیٹھے۔ اور اپنا ایک بادشاہ بنایا۔ جسکا نام **سلاطیس** تھا۔ سلاطیس نے مصر بالا اور مصر زیرین دونوں سے خراج وصول کیا۔ اور مناسب مقامات پر دستے متعین کیے۔ بخصوص مشرقی حصوں کی حفاظت۔ اہل سیریا کے مقابلہ میں پیش بینی کے لیے بہت کرتے تھے۔ جو اس زمانہ میں قوی ترین قوم تھی

سلاطیس نے تیس برس حکومت کی۔ پھر ایک دوسرا بادشاہ ہوا۔ جسکا **بیون** نام تھا۔ یہ بیالیس برس زندہ رہا۔ بعد ازیں ۳۶ برس سات مہینے کیلئے **الوفیس** بادشاہ ہوا۔ پھر **حُنیاس** نے پچاس برس اور ایک مہینہ تک حکومت کی اور ان سب کے آخر میں **اسیس** بادشاہ ہوا۔ ۴۹ برس دو مہینے

اس کی بادشاہی کا زمانہ ہے ....

اس تمام قوم کا نام ہیک سوس رکھا گیا تھا۔ یعنی چرواہے بادشاہ۔ کیونکہ۔ ہائیک کے معنی مقدس زبان (توراۃ) میں "بادشاہ" کے ہیں۔ اور سوس عام زبان میں چرواہے کو کہتے ہیں۔ اور ان لفظوں سے ملکر ہائیک سوس بنا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ **عرب تھے** ....

پانچسو گیارہ ۵۱۱ برس تک مصر پر قابض رہے (Josephus Book 1 Sect. 14. Vol. IV)

ان عرب حملہ آوروں کے نام ونسب کے متعلق ایک بات یہاں قابل ذکر ہے۔ روایات صحیحہ عرب میں فاتح مصر کا نام شدّاد ظاہر کیا گیا ہے۔ مانیتھو نے سلاطؔ لکھا ہے "ے" اور "س" جو سلاطیس کے آخری اجزا ہیں۔ مذکر نام کے آخر میں یونانی اور لاطینی زبانوں میں عموماً زائد کر دیے جاتے ہیں حقیقت میں شدّاد اور سلاط معنیاً ایک ہی لفظ ہیں۔ شدّاد کے معنی "قوی" اور "جابر" کے ہیں۔ اور سلاط بھی سامی زبان میں یہی معنی رکھتا ہے۔ جس سے عربی زبان میں "سلطان" "سلطنۃ" اور "تسلط" نکلے ہیں۔

ہیک کو اگر ہم "شیخ" کا محرف نہ کہیں۔ جو امیر بدو کا خاص لقب ہے۔ تو اُسکو خاص مصری لفظ تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ مانیتھو نے بتایا ہے۔ لیکن سوس کا لفظ خاص عربی ہے۔ سوس کے اصل معنی نگرانی اور انتظام کے ہیں۔ اسی مناسبت سے چرواہے کو بھی ابتداءً سوس کہتے ہیں جس سے منتقل ہو کر گلہ بانی سے جہانبانی کے لیے عربی میں یہ لفظ مستعمل ہوا۔ اسی ماخذ سے سیاستہ کا لفظ اب عام طور سے اس معنی میں بولتے ہیں۔ سوس کے معنی اوّل۔ یعنی چرواہے اور نگہبان کا اثر اب تک ہمارے ہاں ایک لفظ میں باقی ہے۔ یعنی سئیس (خادم ومحافظ اسپ) عجب نہیں۔ کہ عبری میں یہیں سے لفظ "صوص" DVJ گھوڑے کے لیے مستعمل ہوا ہو تیسرے بادشاہ کا نام ابوفیس بھی عربی وضع کا ہے کیا عجب ہے کہ ابوقیس ہو یا ابوفیض۔ آخری نام اسیس ہے۔ جس کو ہم عزیز کہتے ہیں۔ اور اب تک اُمرائے مصر کا لقب جانتے ہیں۔ اور ایک عجیب کیا معتبر دلیل یہ ہے۔ کہ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے قصہ میں "عزیز" ہی کا لفظ پاتے ہیں۔

توریت میں حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کا جب پہلے بار ظہور ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ عراق سے مصر تک کی زمینوں میں سفر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی سارہ کو جو رشتہ کی بہن تھیں۔ اپنی بہن ظاہر کرتے ہیں[۱]۔

[۱] کیا صاحب ارض القرآن اور کسی مسلمان کو اب بھی مسئلہ تقیہ کی قباحت۔ اور جواز فی الشریعت کی نسبت کوئی کلام باقی رہجاتا ہے؟

فرعون مصر قرابت کی درخواست کرتا ہے۔ پھر جب واقعہ ظاہر ہوتا ہے۔ تو خود اپنی بیٹی کو۔ کنیزگی[1] میں پیش کرتا ہے۔ کیا اِس سے نسبی تعلق کی بو نہیں[2] آتی۔

ڈیڑھ سو برس کے بعد اتفاقاً حضرت یوسفؑ مصر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور باوجودیکہ اُن کا عبرانی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اہل مصر عبرانیوں کو ذلیل جانتے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ کھانا عار سمجھتے ہیں فرعون مصر یوسفؑ کی عزت کرتا ہے۔ اُن کو اپنا نائب السلطنت مقرر کرتا ہے[3]۔ یوسفؑ کے پدر بزرگوار حضرت یعقوبؑ اور اُن کے خاندان کے مصر آنے پر فرعون اور ارکان سلطنت خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اُن کے مرنے سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے عجیب یہ ہے۔ کہ حضرت یوسفؑ اپنے خاندان کو تاکید کرتے ہیں۔ کہ فرعون اگر پوچھے۔ کہ تم کون ہو؟ تو جواب دینا کہ ہم چرواہے ہیں اور چوپانی ہمارا پیشہ ہے[4]۔ اور پھر توریت کا خود یہ عجیب تر بیان کہ مصری ہر چوپان سے نفرت رکھتے تھے۔ اور یہ حقیقتاً سیاسی نفرت تھی۔ اِن تمام آثار سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ چرواہے بادشاہوں کا وجود تاریخی ہے۔ اور حضرت یوسفؑ اور بنی اسرائیل کا قیام اُنہی عرب سامیہ یا چرواہے بادشاہوں کے عہد میں ہوا۔ جیسا کہ مورخین عرب کا بھی بیان ہے۔ اور یہ بھی اُس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اِن عبرانی اور مصر کے خاص شاہی خاندان میں ضرور کوئی خاص قوی تعلق تھا۔ جسکا اظہار کرنا ہی حضرت یوسفؑ باوجود اِس علم کے کہ مصری ہر چوپان سے نفرت رکھتے ہیں۔ "چوپانی" کے ذریعہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ اُوپر گذر چکا۔ اہل مصر اِس بدوی حکمران خاندان کو تحقیراً "شاشو" کہتے تھے۔

چند صدیوں کے بعد بنی اسرائیل کا مصر میں مبتلائے مصائب ہونا ہمارے نزدیک اُسکی توجیہہ یہ کر

[1] کنیزگی سے کنیزی۔ استعمالاً زیادہ فصیح ہے۔ مرزا دبیر مرحوم سے سیدانی کو برائے کنیزی طلب کیا۔ المولف عفی عنہٗ۔

[2] توریت تکوین باب ۱۲۔ ۲۰۔

[3] تورات تکوین باب ۴۶۔ ۳۴۔ ایضاً باب ۴۱۔ ۴۰۔ [a] یہ واقعہ کہ ہاجرہؑ فرعون کی بیٹی تھیں۔ توراۃ میں نہیں ہے۔ مگر یہودی روایت میں موجود ہے۔ اور اُنکا مصری ہونا تو توریت میں بھی مسلم ہے۔ ارض القرآن ص ۱۵۱ ج ۱۔ ہم نے اِس بحث کو ایک علیحدہ باب میں درج کیا ہے۔ اور حضرت ہاجرہؑ کے خاص حالات میں اُسکو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ المولف عفی عنہ

[4] توراۃ تکوین باب ۴۶۔ ۳۱۔ ۳۴۔ کیا مسئلہ تقیہ کا وجود اور اُس کے جواز و عمل کا ثبوت۔ اب بھی کتب قدیمہ اور سیرت و شریعت انبیائے سابقین سے تسلیم نہیں کیا جائیگا؟ المولف عفی عنہ

[5] توریت تکوین باب ۴۵ - ۱۶ - [6] توریت تکوین باب ۵۰ - ۳ - ۱۱ [7] تکوین باب ۴۷ - ۳ -

کہ جب اہل مصر یعنی بنی حام نے سابق حکمران خاندان یعنی بنو سام کو مصر سے نکالدیا۔ اور اُن کی حکومت کا مصر میں خاتمہ کر دیا۔ تو بنو اسرائیل جو بنو سام کی ایک شاخ تھے۔ اور بعید حکومت سابقہ مصر میں طاقتور ہو گئے تھے۔ اُن کو سیاسی وجوہ سے کمزور کر دینا چاہا۔ توریت میں اس موقع پر حسب ذیل عبارت ہے۔

لیکن اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی۔ اور فراواں ہوئی۔ اور بہت زور پیدا کیا۔ اور زمین اُن سے معمور ہوئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ۔ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا۔ پیدا ہوا۔ اور اُس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ دیکھو۔ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ اور ہم اُن کے ساتھ دانشمندانہ تدبیر کریں۔ تا نہ ہوئے کہ جب وہ اور زیادہ ہوں۔ اور جنگ پڑے تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں۔ اور ہم سے لڑیں اور ہم کو نکالدیں[ف۱]

اِن الفاظ سے صاف ظاہر ہے۔ کہ مصر میں بنی اسرائیل کا معاملہ بالکل سیاسی تھا۔ قرآن مجید سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے۔ فرعون حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کی نسبت کہتا ہے۔

إِنَّ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ يُخْرِجَاكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ	یقیناً یہ دونوں (ہارونؑ و موسیٰؑ) جادوگر ہیں۔ جو چاہتے ہیں۔ کہ تم کو تمہارے ملک سے نکالدیں۔

توریت کے اِس فقرہ کا کہ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا۔ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا ہم یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ تب ایک نئی بادشاہی قایم ہوئی۔ جو بنی اسرائیل کو جو سابق سامی حکومت کی ایک شاخ تھی نفرت سے دیکھتے تھے۔

ہمارے خیال کی مزید تائید اِس سے بھی ہوتی ہے۔ کہ تاریخ عرب نے۔ سامی حکومت مصر کی جو مدّت قرار دی ہے۔ یہ تقریباً وہی ہے۔ جو ابراہیمؑ سے (جو ابتدائے حکومت کا زمانہ ہم فرض کرتے ہیں) حضرت موسیٰؑ سے کچھ پہلے تک (جو اختتام کا زمانہ ہے) توریت نے قرار دی ہے۔ یعنی تقریباً ۵۲۵ برس[ف۲]۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی حکومت مصر کا زمانہ جو حضرت یوسفؑ سے حضرت موسیٰؑ تک ممتد ہے توراۃ نے ۴۳۰ برس بتایا ہے۔ اسپر حضرت ابراہیمؑ سے حضرت یوسفؑ تک کا زمانہ اور اضافہ کیا جائے۔ تو ان چار پشتوں کے لیے سو برس فرض کیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ ۵۳۰ ہوتا ہے۔ اور مانیتھو۔ اِس حکومت کا زمانہ ۵۱۱ بتلاتا ہے۔ چند سال جو توراۃ میں فاضل ہیں۔ یہ وہ ہیں۔ کہ دوسری وطنی حکومت مصر میں قایم ہوئی۔ جن کے چند سالہ مظالم سہہ کر بنی اسرائیل مصر سے نکل آئے۔

[ف۱] سفر خروج باب اوّل ۷-۸-۹-۱۰-۱۱- [ف۲] خروج ۱۲-۴۰-

بنی اسرائیل، اور عرب سامیہ کے باہمی تعلق مصر کا نہ صرف توریت کے اِن فقروں سے ثبوت ملتا ہے۔ بلکہ مصر اور عرب دونوں کی تاریخ سے بھی۔ توریت کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُمم سامیہ میں عربوں کے تعلقات مصر کے ساتھ سب سے زیادہ تھے۔ اسماعیلی عربوں کی ماں[سلہ] ہاجرہ مصر کی تھیں۔ خود حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں کے سوا بیوی بھی مصری[سلہ] تھیں۔ عربوں کے قافلے برابر مصر کو آتے جاتے رہتے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ کو دربار مصر تک جس نے پہونچایا۔ وہ عرب ہی تھے۔ حضرت یوسفؑ کے عہد میں جب مصر اور اُس کے آس پاس کے ملکوں میں قحط پڑا۔ تو یمن سے جو عام روایت کے اعتبار عاد و عمالیق کا وطن تھا۔ یہاں کی شاہزادی نے مصر سے غلہ طلب کیا تھا۔ یہ واقعہ اُس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کو مسلمان علمائے آثار نے ابتدائی صدی میں یمن میں پایا[سلہ]

اِس کتبہ سے نہ صرف توراۃ کے اِس فقرہ کی تائید ہوتی ہے۔ کہ تمام زمین میں قحط پڑا۔ بلکہ اُن عربوں میں جو یمن میں تھے۔ اور اُن سامی عربوں میں جو اُس وقت چرواہے بادشاہوں کے نام سے مصر میں تھے۔ باہم تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

مصر کے علمائے آثار ثابت کرتے ہیں۔ کہ ہیک سوس۔ سامی عرب تھے۔ بعض اِس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خود مصری اصلاً شاید سامی عرب ہیں۔ ہائیک سوس کے عرب ہونے کی نسبت سب سے پہلے شہادت ایک مستند جرمن مورخ ہیرن (Heeren) کی پیش کی جاتی ہے۔ مورخ موصوف لکھتا ہے۔

اِس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مختلف جہات سے مصر میں یہ قبائل حملہ آور تھے۔ لیکن وہ جو مشرق سے آئے تھے۔ یعنی عرب سب سے زیادہ زبردست تھے۔ یہ مصر زیرین تک دوڑ پڑے۔ آگے چلکر لکھتا ہے۔

اُن کی لمبی ڈاڑھی۔ لمبے کپڑے۔ ہر چیز اُن کے عرب ہونے کو ظاہر کرتی ہے[سلہ]

جارج راولنسن۔ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ قدیم کا پروفیسر تھا۔ اور مصر کی تاریخ قدیم کا مصنف ہے۔ لکھتا ہے۔

مصر جو پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا تھا۔ اُس کے ضعف نے شمالی مشرق سے باہر کے حملہ آوروں کو طمع دلایا۔ دو ہزار آٹھ (۲۰۰۸) ق م میں یا اُس کے کسی قدر بعد طاقتور دشمن شمالی مشرق سے مصر زیرین میں داخل ہوگئے۔

سلہ تکوین ۲۶-۱۳-۲۱-۲۱- سلہ تکوین ۲۷-۲۶-۲۹- سلہ تکوین ۳۷-۲۹-

Against Book1. See14. Rawlinson Vol.1: PP.98.

دہ مصر کی حکومت کے برباد کرنے اور ملک کے حصۂ زیرین واقع طول البلد ۲۹-۳۰ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا
یہ حملہ آور ہائیک سوس یا چرواہے بادشاہ تھے۔ جو شام یا عرب کے صحرا نورد بدوی
لوگ تھے۔[۵۱] یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے:۔
مصریوں کے دوسرے دشمن اس جانب میں شاشوش تھے۔ جو شاید ہیک سوس ہیں۔ اور بظاہر عرب
معلوم ہوتے ہیں۔[۵۲]
ایک جرمن فاضل بروگش ہنرچ (Burogesh Heinrich) نے مصر کی تاریخ صرف کتبات
و آثار کی بنا پر لکھی ہے۔ تاریخ مذکور میں فاضل موصوف کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہائیک سوس
یقیناً سامی تھے۔ مصر کی زبان قدیم میں۔ ہائیک۔ بادشاہ۔ اور سوس چوپان اور اہل بادیہ کو
کہتے ہیں۔ اہل عرب کی اس روایت کو بھی اُس نے تائیداً نقل کر دیا ہے۔ کہ شداد ابن عاد
نے مصر پر حملہ کیا تھا۔
برٹش میوزیم۔ لندن میں جو مجموعات مصر (Egyptian Collection) ہیں۔
۱۹۰۹ء میں اُن کا دلیل نامہ (Guide) لکھا گیا ہے۔ جو معلومات تازہ کا خلاصہ ہے۔ ہائیک سوس کے متعلق اُس میں حسب ذیل تحقیق ہے:۔[۵۳]
بارہویں خاندان حکومت کے زوال کے بعد نسبتاً فوراً ہی مصر زیرین (Delta) اور شمالی اطراف
مصر پر متحدہ سامی بدوی قبائل نے آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا۔ جن کے سرداروں کا نام بروایت یوسیفوس۔
(المتوفی ۱۰۰ء) ہائیک سوس یا چرواہے بادشاہ تھے۔
لفظ ہائیک سوس۔ دو مصری لفظوں سے ماخوذ ہے۔ "ہیکو" اور "شاشو" یعنی شیخ یا حاکم قبائل
دیہہ و صحرائے مشرق و شام وغیرہ۔
ڈبلو کک ٹو آئے (W. Cook Toy) ایک انگریز مورخ صاحب جو ایک چھوٹی
سی لیکن مستند تاریخ کے مصنف ہیں۔ فاتح عربوں کی شجاعانہ قوت سے برہم ہو کر لکھتے ہیں۔
زمین عرب جہاں کے بادیہ نشین قبائل جو تاریخ کے قدیم ترین عہد سے گلہ بان اور غارت گر ہیں۔ اور اب تک
اسی زمانہ تک بھی وہ ایسے ہی ہیں۔ اُن مصر میں داخل ہونے والی قوموں کی ماں تھی۔ جنہوں نے نہایت سختی سے قدیم
مصریوں کو ستایا۔ .... اُن کا نام ہائیک سوس تھا۔ یا چرواہے بادشاہ[۵۴]

---

۵۱ ج ا ص ۱۶۶۔ ۵۲ ج ا ص ۱۱۱۔ ۵۳ ج ا ص ۲۷۳ و ۲۷۴۔ ۵۴ ج ا ص ۶۶۔

اس عصر جدید میں، مسلمان مورخین میں عمالقہ یا عرب سامیہ اور ہائیک سوس کے ایک ہونیکا خیال سب سے پہلے ایک مصری عالم علامہ رفاعہ بک طہطاوی کو پیدا ہوا۔ جس کی ذات مصر کے دور انقلاب علمی کا پہلا نتیجہ، اور معلومات مغربی و شرقی کا پہلا ثمر تھا۔ اُن کی تاریخ مصر بنام انوار توفیق الجلیل ۱۲۸۵ھ میں پچاس[۵۲] برس سے زائد ہوئے۔ شائع ہو چکی ہے۔ اس میں اس موقع کی عبارت یہ ہے۔

ودولتهم تسمى دولة الهقصوص واشتهروا بالتواريخ باسم الملوك الرعاة وفى كتب التواريخ الاسلامية يقال لهم العمالقة۔	اُن کی سلطنت کا نام ہیک سوس کی سلطنت ہے یہ بادشاہ چرواہے بادشاہوں کے نام سے مشہور ہیں اسلامی تاریخوں میں انکا نام عمالقہ ہے۔

جمہور کی اس آواز متفق ہیں کہ ہائیک سوس سامی عرب تھے۔ کبھی کبھی ایک دھیمی آواز یہ بھی سنائی دیتی ہے۔ کہ وہ تورانی یا منگولین (Mongolian) تھے۔ آج سے اسّی برس پیشتر مسٹر روسی لینی Mr. Roselini نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ اس مدعی کے پاس اس دعوے کی صرف یہی دلیل ہے۔ کہ سوآئیس ("Scios") جو ہیک سوس کا جزو ہے اور ایک تورانی قوم کے یونانی نام سیتھنس (Scythenies) میں بعض حروف کی تمسخر انگیز لفظی شباہت اور مناسبت ہے۔ جرمن عالم ہیرن نے اس کی تردید میں لکھا ہے۔

ہائیک سوس جو مصر کے ایک بڑے حصہ پر مصر کے سولہ (۱۶) اور سترہ (۱۷) خاندان حکومت میں قابض ہو گئے تھے۔ مسٹر روسی لینی کا اور میرا اس پر اتفاق ہے۔ کہ وہ بادیہ نشین تھے۔ کیونکہ آثار میں جو اُن کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ وہ گلوں اور چوپاؤں کے جھنڈ کے ساتھ ہے۔ اس سے سب نے طبعی طور پر سمجھا ہے۔ کہ وہ حدود مصر کے بدوی قبائل تھے۔

میں یقین کرتا ہوں۔ کہ ان میں عرب قوم کی اپنے مخصوص خصوصیات ہیں۔ لمبی ڈاڑھی۔ لمبے کپڑے۔ اور کھلے رنگ میں پاتا ہوں۔ اور یہ ایک ایسی رائے ہے۔ جسکی قوت کے ساتھ (خود ناقل روایت) یوسیفوس نے دی ہے۔ مسٹر روسی لینی اُن کو سیتھینس فرض کرتے ہیں۔ سیتھینس سے مقصود شاید ایشیائے وسطیٰ کے تورانی بدوی قبائل ہیں۔ لیکن اُن کے ذکر کردہ بیان سے ..... علاوہ ازیں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو یہ دکھا سکے۔ کہ ان قبائل نے اس قدر بعید زمانہ میں کوئی مہم بغرض فتح اس قدر بعید فاصلہ کے لیے اختیار کی ہو۔

---

۵۱ ص ۲۲۴۔ ۵۲ ص ۲۔۱ انوار توفیق الجلیل فی اخبار مصر ج ۱ ص ۵۸ ۱۲۸۵ھ
۵۳ جلد ۲ ص ۵ م ۵۴ سموال نے الگ ۱۷۔۱۹۔

سٹروی لینی کی دلیل صرف لفظی تشریح پر مبنی ہے۔ جس کی بنا پر ان کو نظر آتا ہے۔ کہ مصری نام (Scios) سائس (Sythes) سائتھیس ہے۔ جس کے معنی بربادکنندہ کے ہیں۔

میں اس مسئلہ کے اندر پڑنے کی جراٰت نہیں کرتا۔ لیکن میں اپنے اعتراف و بیان میں بھی ترمیم نہیں کرسکتا۔ پچاس ساٹھ برس کے عرصہ میں اس دھیمی آواز میں اور بھی ضعف آگیا ہے۔ آج سے دس بارہ برس پہلے ایک کتاب لکھی گئی ہے۔ جس میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ ہیک سوس تنہا تورانی نہیں تھے۔ بلکہ سامی عرب بھی اُس میں شامل تھے۔ اُس کتاب کی عبارت یہ ہے۔

اس میں معتدبہ حد تک شک ہے۔ کہ ہائیک سوس کس قومیت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بعض صرف کنعانی عرب اور دوسرے سامی قبائل سمجھے گئے ہیں۔ لیکن حیتی (ایک تورانی قبیلہ) بھی اُن کے ساتھ شریک معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کے لیڈر تورانی معلوم ہوتے ہیں۔ اس فیصلہ کی بنا پر کہ آخری سلاطین ہیک سوس کے جو مجسمے ابھی حال میں ملے ہیں۔ وہ بالکل تورانی شکل کے ہیں۔

بعض اشخاص کی شباہت شکل سے بغیر کسی تاریخی اور اثری دلیل کے قومیت کا فیصلہ عجیب ہے۔ اور اسی لیے یہ آواز ہمیشہ بالکل غیر مسموع رہی ہے۔ تازہ ترین خیال۔ جو برٹش میوزیم اجپشن گائیڈ (British Musieum Egyptian Guide) (دلیل نامہ آثار مصریہ) اور انسائیکلوپیڈیا (Encyclopedia) طبع یازدہم مضمون ایجپٹ (Egypt) کو پڑھ کر متفقہ تسلیم شدہ نظر آتا ہے۔ یہی ہے کہ ہیک سوس متحدہ سامی تھے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہیک سوس کے عرب ہونے پر اسقدر دلائل بہم موجود ہیں۔ جن کا استخفاف تحکم ہے۔ حسب ذیل دلائل قویہ اور قرائن عقلیہ پر نظر ڈالی جائے۔

(۱) عربوں کا بیان کہ اُنہوں نے زمانہ قدیم میں مصر پر حکومت کی۔

(۲) قدیم اہل مصر کا اعتراف کہ عرب یہاں حاکمانہ داخل ہوئے۔

(۳) ہیک سوس کے بادشاہ اوّل کے نام کا عرب کے ذکر کردہ فاتح مصر سے مطابقت معنوی و لفظی۔

(۴) سلاطین ہیک سوس کے نام کا عربی اللفظ یا سامی الماخذ ہونا۔

(۵) آثار میں اُن کے مجسمے کا عربی شکل و لباس میں ہونا۔

(۶) عرب و مصر کے قدیم تعلقات۔

(۷) ہیک سوس کے جو اوصاف بتلائے گئے ہیں۔ انکا بعینہٖ عربوں میں موجود ہونا۔

(۸) توراۃ کے قرائن و اشارات۔

(۹) علمائے آثار کی تائید۔

(۱۰) مورخین یورپ کا علی الاکثر بیانات قدیمہ سے اُن کی عربیت کی تصدیق [1]

ان تمام مباحث و مطارحات کے بعد ہم سب سے آخری قطعی۔ اور فیصلہ کُن شہادت خود اُس قوم کی نقل کرتے ہیں۔ جس نے شاشو کو اپنے ملک سے نکال کر اعتراف کیا ہے۔ کہ وہ تو "شاشو" کو کیا سمجھتے تھے۔ مصر کا قدیم بادشاہ رعمیس سوم اپنے ایک کتبہ میں اپنی ایک فتح کی نسبت لکھتا ہے:

"میں نے ساعیر کی قوم کو جو شاشو کے قبائل میں ہیں برباد کر دیا"

---

[1] لفظ مصری ہائیک سوس (جس کا معرّب ھقصوص ہے) کی تحقیق میں اتنی کد و کاوش صرف دوایک مستشرقین اور جدید محققین کے غلط تشابہ پیدا کر دینے کی وجہ سے لاحق ہوئی۔ ورنہ مسئلہ زیر بحث کا ہر پہلو صاف ہو چکا تھا مسٹر روسی لینی کے زائد از تعقل اور غیر محققانہ تفکر نے اس میں محض خفیف سا شبہ اور تامل پیدا کر دیا تھا۔ جسکو نہ اُن کے ہمعصر مستشرقین نے قابل قبول سمجھا۔ اور نہ زمانہ حال کے محققین نے اس لیئے اب اس بحث پر زائد قلم فرسائی کی ضرورت نہیں لیکن اتنا لکھ دینا ضرورت سے زائد نہ ہوگا۔ کہ مسٹر روسی لینی اور اُن کے معدودے چند ہمخیالوں کو یہ شبہ کیوں واقع ہوا؟ صرف اسلیئے کہ علم اللغات کے یوروپین محققین کا یہ مسلمہ مسئلہ قرار پا چکا ہے۔ کہ دُنیا کی تمام اقوام و قبائل کا اوّل موطن و مسکن وسط ایشیا ہے۔ یہیں سے تمام اقطاع عالم میں وہ پھیلے ہیں۔ اسی خیال کی بنا پر اُس نے ہیک سوس یا شاشو کو بھی تورانی النسل بتلایا ہے۔ مگر اُس کی رائے کا ضعف اسی سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُن کثیر التعداد ثبوتوں کی موجودگی میں کہ ہیک سوس اصلاً سامی الاصل ہیں۔ وہ اُن کے خالص تورانی بتلانے پر جراءت نہ کر سکا۔ اور اُن کو سامی اور تورانی نسلوں کا مجموعہ بتلا کر ایک مخلوط النسل قوم قرار دیتا ہے۔ حالانکہ ایسا قیاس اُس کی تاریخ قدیمہ سے بالکل عدم واقفیت بتلاتا ہے۔ کیونکہ تاریخی دُنیا میں اُسوقت تک قوموں کے اختلاط کا زمانہ قائم نہیں ہوتا۔ قوموں کی اختلاط النسلی کا زمانہ اس سے بہت مابعد ہے۔ بہر حال اگر ہم اُس کے اس خیال اور اُس کی اصل بنا کو تسلیم بھی کر لیں۔ تو اُسکو جاننا چاہیئے کہ تمام قدیم مورخین عرب کا یہ متفقہ دعویٰ ہے۔ کہ اُنکا ملک اور وطن۔ جزیرہ نمائے عرب معمورۂ عالم کا قلب ہے۔ یعنی وسط عالم میں واقع ہے۔ پہلے زمانہ میں یوروپین مورخین و محققین عربوں کے اِس دعوے کو زبانی مفاخرت سمجھتے تھے۔ اور ہنستے تھے۔ مگر اب عربی محققین کے اس مسئلہ کا خود اقرار کرتے ہیں۔ مسٹر ڈی۔ جی۔ ہوگارتھ اپنی کتاب پنیٹریشن آف اریبیا میں لکھتے ہیں۔ کہ وہ (عرب) درحقیقت دُنیائے قدیم کے قلب میں واقع ہے۔ جلد اص ۱۴ جب عرب کا وسط ایشیا ہونا ثابت ہوگیا۔ تو پھر تورانیوں کی قدیم الاقوامی کا مسئلہ اور دعوے عربوں کے مقابلہ میں قابل تسلیم نہیں ہو سکتا ہے۔ قدامت کے اعتبار سے وہ خود ہی تھے۔ جو اُس زمانہ میں شاشو یا ہیک سوس کہے جاتے تھے۔ المولف عفی عنہ

ساعیر سے مقصود اہل ساعیر ہیں۔ جو شمالی عرب میں ایک کوہستانی مقام ہے۔ اور جہاں ادومی عربوں نے ایک حکومت قایم کی تھی۔ توراۃ میں کوہ سعیر کا نہایت کثرت سے ذکر ہے۔

عرب سامیہ مختلف ممالک میں

(سیریا) (شام) ایران۔ فنیقیہ۔ قرطاجنہ۔ کریٹ۔ اور یونان میں)

عرب سامیہ اولی (عاد اُولیٰ) کا ان ممالک میں گذرنا یہاں کسی حکومت کی تاسیس۔ ایک تعجب انگیز واقعہ ہے لیکن غیر معقول نہیں۔ ۱۲۰۰ ق م میں بابل کی جگہ اسی ملک میں اسیریا کی حکومت قایم ہوئی۔ ایران اسوقت تک کوئی مستقل مملکت نہیں تھا۔ اسیریا اور بابل کا ایک جزو تھا۔ فنیقی (فنیشین) شام و فلسطین کے ساحل بحر ابیض پر آباد تھے۔ توراۃ میں اُن کو ارآمی کہا گیا ہے۔ یہ دُنیا کی سب سے پہلی تاجر اور یورپ کا سفر کرنیوالی قوم ہے۔ اور یہی وہ قوم ہے جس نے قدیم یورپ میں تہذیب کی روشنی پیدا کی۔ اس نے ایک طرف افریقہ کی زمین شور میں کارتیج تمدن کی تخم ریزی کی۔ اور دوسری طرف یورپ کے پرستان (یونان) میں تہذیب و تمدن کی آگ روشن کی۔

ان مباحث پر تفصیلی بحث تو طول کلام ہے۔ مستند چند کتابوں کے حوالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اسیریا۔ اسیریا کے متعلق سب سے آخری بحث میں ثابت ہو چکا ہے۔ کہ وہ سامی قوم تھی[1] اور یہ معلوم ہے۔ کہ وہ خلیج فارس کے سواحل عرب سے ٹھیک اُسی راستے بابل آئی تھی۔ جس راستہ سے اس سے پہلے دور میں عاد یا اُمم سامیہ اولی کا گذر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر حقیقت میں اسیرین نسلاً عرب تھے۔ اور اسیریا کی اثری تاریخوں میں اس کے دلائل ہر جگہ ملیں گے۔[2]

ایران۔ ایران کی قدیم تاریخوں میں مذکور ہے۔ کہ جمشید کے بعد ضحاک تازی ایک عرب نے (خاندان ضحاک سمجھنا چاہیئے) ہزار برس تک ان پر حکومت کی۔[3] ہمارے مورخین کہتے ہیں۔ کہ ضحاک یمن کے ایک بادشاہ کا نام تھا۔ لیکن تاریخًا اور اثرًا اس زمانۂ قدیم میں یمن کا براہ راست ایران پر حملہ آور حکومت کرنا معلوم نہیں۔ اس کی صحیح توجیہ یہ ہے۔ کہ یمن سے سواحل خلیج عرب سے

---

[1] سائینٹفک ریویو امریکہ Scientiphic Review America of 1914 Vol. I

[2] راجرس ہسٹری آف بابل Roger's History of Biyble Vol. II (Asyria)

[3] فردوسی ذکر ضحاک تازی

ہو کر اسیریا میں جو عرب خاندان حکمراں تھا۔ وہ ایران پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک مدّت تک اُس پر حکومت کی۔ ایران کا باقی واسیریا کی محکومی میں میڈیا کے عروج تک (۶۰۰ ق م تک) رہنا اب ایک مسلم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔

اسیریا کا دَور وجود ۱۸۰۰ ق م اور زمانہ عروج ۱۲۰۰ ق م سے ۶۰۰ ق م تک ہے۔

فنیقیہ۔ فنیق۔ سواحل بحر ابیض پر آباد تھے۔ تاتر ان کے دار الحکومت کا نام تھا۔ اور ایشیائے کوچک یورپ تک تجارت قدیم کے مالک تھے۔ عبرانی نام اُن کا ارامی ہے آثار کے رو سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان کی زبان۔ مذہب اور رسوم تمام تر سامی ہیں۔ اس بنا پر اہل فنیشیا کے تمام تر کارنامے اہل عرب کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

قرطاجنہ۔ جہاں اب تونس آباد ہے۔ انھیں فنیشن یا ارامی عربوں کی آبادی تھی۔ جس کو اب عام طور سے کارتھیج (Carthage) کہتے ہیں۔ ان ارامی عربوں نے یہاں ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد ڈالی جس سے روستہ الکبریٰ کی حکومت بھی لرز گئی۔ ھینبال اسی خاک کے فرزند تھے

یونان و کریٹ یورپ کا سب سے پہلا متمدن ملک یونان ہے۔ اور یونان کا تمام تر تمدّن وعلوم وخط فنیشیا سے ماخوذ ہیں۔ اور یہیں سے اُس کی ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے اس مسئلہ پر روشنی پڑسکتی ہے۔ کہ عربی اور یونانی میں کیوں لوازم تمدّن واشیائے تجارت کے بہت سے نام مشترک ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ یہ مسئلہ ہے۔ کہ عربوں کی براہ راست آبادی یورپ کے شہر یونان وکریٹ میں تھی۔ بلینی ایک یونانی جغرافیہ نویس اہل معین واقع یمن کے متعلق لکھتا ہے کہ "معین کے لوگ اپنے کو مینوس شاہ کے خاندان سے بتاتے ہیں"۔ ایک دوسرا یونانی مصنف استرابو۔ جزیرہ یوبیا (مملکت یونان کا ایک جزیرہ) کے قدیم باشندوں کی نسبت لکھتا ہے۔ کہ یہاں کی آبادی ایک "عرب" نو آبادی تھی۔ جو قیدموس کے ساتھ یونان میں تھی۔

ہم ان فقروں کا ماحصل اتنا سمجھتے ہیں۔ کہ عرب تاجر قدیم زمانہ میں یونان تک پہونچ چکے تھے۔ اور وہاں اپنی کوئی تجارتی نو آبادی بھی قایم کرلی تھی۔

لہ تاریخ طبری جلد ا ص ۹۸۔

لہ ان بیانات کے لیئے دیکھو۔ سموال نے امگ ص ۷، ۸۔

عرب البائدہ۔ اُمم سامیہ عاد اولیٰ کے آخری نتائج

(ان اللہ لایغیر بقوم حتیٰ لایغیر ما بانفسھم)

مذکورہ بالا مباحث و شاہدے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ عاد اُولیٰ۔ ارم بن سام کی اولاد سے ہیں۔ قران مجید بھی اُن کے نسبی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ (فجر)	تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اُس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا۔ جو بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے۔ جن کی نظیر دُنیا میں نہیں پائی گئی

بعض حقیقت سے ناواقف اور تاریخی شاہدے ناآشنا مفسروں نے۔ لفظ ارم" کی اصلیت اور واقعیت سے منکر۔ اس سے ایک عجیب وغریب قیاسی باغ مراد لیا ہے۔ شدّاد ابن عاد کو اس نمونۂ باغ رضوانی کا بانی بتلایا ہے۔ اور اپنی طبیعت کے مذاق اور خیال کے انداز پر اس کی زیب و زینت حسن و آرائش کے متعلق خارج از امکان اور بیرون از بیان ساز و سامان۔ ترتیب دیئے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ اُن بزرگوں کی عقیدت مندانہ غلط فہمی ہے۔ ابن خلدون نے اِس موضوع پر ایک جداگانہ اور محققانہ بحث لکھی ہے۔ اُس کی چند توجیہات ثبوت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) ہم نے (ابن خلدون نے) دعویٰ کیا ہے۔ کہ عاد۔ اُمم سامیہ کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ ایک عظیم الشان حکمران قوم تھی۔ قرآن مجید میں اسکی تائید ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ۔ (اعراف)	عاد کے لوگو یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے قوم نوحؑ کی تباہی کے بعد تمکو خلافت (حکومت) دی۔

یہ مسلّم ہے۔ کہ عرب اور اُسکے جوار و مضافات میں نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد (اُمم سامیہ) حکومت پذیر ہوئی تھی۔

(۲) عاد کی عظمت و جلالت اور سیاسی تفوق کے مفصل بیانات گذر چکے ہیں۔ ان کو دعویٰ تھا۔ کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حم سجدہ)"ہم سے بڑا (قوت والا) روئے زمین پر آج کون ہے"؟ اُن کے پیغمبر (حضرت ہودؑ) نے ان سے کہا وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (سورۂ ہود) عجب نہیں۔ کہ خدا تم سے لیکر اپنی خلافت کسی دوسری قوم کو عطا کر دے"!

گذشتہ بیانات سے اِن کی ثروت و دولت تو معلوم ہو چکی تھی۔ قرآن مجید کے موجودہ الفاظ سے اُنکے

مغرورانہ تمول و مقدرت کا اعتراف ظاہر ہے۔

(۳) عاد بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کی متعدد مقامات پر توثیق کی ہے

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۔	تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اُس عاد ارم کیساتھ کیا کیا جو بڑی بڑی عمارتوں والا تھا جس کی نظیر دُنیا میں نہیں پائی گئی

دوسری جگہ حضرت ہودؑ کی جانب ارشاد ہے:۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (شعراء)	اے عاد والو۔ تم ہر خوش قطع مقام میں بیفائدہ یادگار اور کاری گری کے مکانات بناتے ہو شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہوگے

پھر اُن کی اُن ہی فنا پذیر تعمیرات کی نسبت فرمایا گیا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودَا وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ (عنکبوت)	اور عاد و ثمود کو ہلاک کیا۔ اور اُن کے گھروں کے کچھ حصے تمہارے سامنے ہیں۔ عنکبوت۔

بار دیگر عبرت دلائی جاتی ہے:۔

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۔ (احقاف)	عاد کا یہ حال ہوا کہ صبح ہوئی تو انکے مکانوں کے سوا اب کچھ نظر نہیں آتا

روایات میں عموماً قوم عاد اولی کا خاص مقام یمن بتایا گیا ہے۔ لیکن اُمم سامیہ کے مجموعی سلسلہ بیان میں اُنکی سکونت کی تخصیص نہیں پائی جاتی ہے۔ صرف جزیرہ نمائے عرب تک اُن کی سکونت محدود کردی گئی ہے قرآن مجید نے اُن کے مقامات سکونت کو مخصوص کر دیا ہے۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ	برادر عاد کو یاد کرو۔ جب احقاف میں اُسنے اپنی قوم کو ڈرایا

جغرافی حالات عرب میں سابقاً مذکور ہو چکا ہے۔ کہ ریگستانی صحرائے احقاف جنوبی اور شمالی عرب میں دونوں طرف واقع ہے۔ یہ غلط ہے۔ کہ حضرت ہودؑ جنوبی صحرا کے رہنے والی قوم عاد کی ہدایت کے لیے مخصوص مبعوث فرمائے گئے تھے۔

حضرت ہودؑ کی بعثت اور قوم عاد کی ہدایت

(آفرینش عالم کے ۱۹۰۰ سنہ صدی اور حضرت مسیحؑ سے ۲۲۰۰ سنہ ق ۔ م)

ہئیت کا مسلمہ ہے۔ کہ ہر اشیائے عالم کے تین زمانے ہوتے ہیں۔ آغاز۔ کمال۔ اور زوال۔ قوم عاد کے آغاز اور ہر اصناف نمونہ میں اُنکے کمال عروج کی کیفیت معلوم ہو چکی۔ گویا اُن کی عمر تمدن کے دو زمانے گذر گئے۔ اب جو زمانہ آنے والا ہے۔ وہ آخری انحطاط و زوال کا عالم ہے۔ اُس کے ابتدائی اسباب

بھی ہونے چاہئیں۔ وہ آہستہ آہستہ اُن کے اخلاق و تمدن نے خود پیدا کر لیے۔ پہلے اخلاق بگڑے طبیعتوں سے بھلی باتیں ایک ایک کرکے جاتی رہیں۔ اور اُن کی جگہ سو سو برائیاں داخل ہو گئیں۔ انصاف کی جگہ ظلم رحم کی جگہ شقاوت خوش اخلاقی اور مہربانی کے عوض بد اخلاقی اور ایذا رسانی پیدا ہو گئی۔ اُنکی بدکرداریوں کے انتہائی حدود یہاں تک پہونچ گئے۔ کہ اُن کا وجود عام نفوس انسانی کے لیے سعین و ممد کیا سخت مضر ثابت ہونے لگا۔

مدبر قدرت ایسے وقت میں کیا کرتا ہے؟ ایسے عالم میں عادت الٰہیہ قدیم سے۔ جن عملی صورت میں جلوہ آرا ہوتی آئی ہے۔ وہ قرآن مجید کے ان الفاظ سے ثابت ہے سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" خدا کا قانون گذشتہ قوموں میں بھی یہی تھا۔ اور خدا کے قانون میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔" وہ قانون خداوندی کیا ہے؟ پہلے ہدایت پھر سرکشانہ ناشنوائی کے بعد عقوبت۔

اخلاق الٰہیہ کے اُصول کے مطابق ان کی ہدایت اور اصلاح حال کے لیے مدبر قدرت نے ان کی روحانی درستی و ترمیم کا ارادہ کیا۔ اور اُنہی کے قوم و قبیلہ سے انکا مُصلح اعظم پیدا کیا۔ اپنے اِس قانون اخلاق کو الفاظ الٰہیہ یوں بیان کرتے ہیں۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا۔ "اور ہم کسی قوم کو اُس وقت تک مبتلائے عذاب نہیں کرتے ہیں۔ جب تک اُنمیں پیغمبر نہ بھیج لیں۔"

حجت الٰہی کی متذکرہ بالا منزل اوّل منزل تمام ہو جانے کے بعد۔ جب کسی قوم انسانی کی شامت اعمالی اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ وہ ان اخلاق الٰہیہ کی توقیر کی جگہ تحقیر کرنے لگتی ہے۔ اور اس معلّم روحانی کی ایذادہی پر تیار ہو جاتی ہے۔ جو اُن کی تعلیم۔ تلقین اور تسکین کے لیے خاصکر مبعوث کیا جاتا ہے۔ تو ایسے وقت میں اُس کی رحمت غضب سے بدل جاتی ہے۔ اُس کی قوت جبروتی فنا و ہلاکت کی مختلف صورت میں ظاہر ہو کر اُن کی بستیوں کو خاک سیاہ اور اُن کی ہستیوں کو تباہ کر ڈالتی ہے اُسوقت اُن کی حالتوں کا یہ عالم خاص ہوتا ہے۔ وَلَا يَتَمَكَّن لَهُمْ هَرَبًا وَّلَا فِرَارًا۔ اُن کے لیے دوڑ جانا یا بھاگ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن نہ معین نہ مددگار "وَلَا مَوْلَىٰ لَهُمْ وَلَا نَصِيرًا۔

عاد اولیٰ کی بعینہ یہی کیفیت اور یہی عالم اُس زمانہ میں ہو رہا تھا۔ راحم ازلی اور منعم حقیقی نے ان کفر شعاروں کی اصلاح کی غرض سے حضرت ہودؑ کو منصب رسالت پر مبعوث فرمایا۔ اور کلمہ الٰہی کے اُس داعی نے اِن الفاظ میں حقیقت کی آواز اُن کے کانوں تک پہونچائی۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا	قوم عاد میں اُن کے بھائی حضرت ہودؑ مبعوث فرمائے گئے

اللّٰہَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ۔

اُنہوں نے تمام قوم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا۔ اے میری قوم خدا کو پوج۔ اُسکے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔ کیا تو ڈرتی نہیں

قوم عاد کا وہ کافر فرقہ۔ جو شدت کفر ونفاق میں اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا۔ (عرب البادیہ کفر ونفاق میں شدید ترین قوم تھے) کا پورا مصداق تھا۔ اپنی لاانتہا نخوت وغرور میں چور ہو کر اُس داعی کلمۃ الحق سے برسر مناظرہ ہوا۔ اور اپنے گستاخانہ مکالمہ کی جواباً اس دریدہ دہنی اور شوخ چشمی سے ابتداء کی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔

اُس کی قوم کا وہ بلند طبقہ جو کافر تھا۔ بولا۔ اے ہودؑ (معاذ اللہ) ہم تمکو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں۔ اور (نعوذ باللہ) تم کو جھوٹ بولنے والوں میں پاتے ہیں

حجت الٰہی نہایت نرمی اور سنجیدگی سے جوابدہی ہے۔ اور خدا کے احسانات وہ پیغمبر یاد دلاتا ہے

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (اعراف)

اے میری قوم مجھ میں حماقت نہیں۔ ہاں میں پروردگار عالم کی طرف سے رسول ہوں۔ اپنے پروردگار کی رسالت تم کو پہونچاتا ہوں اور درحقیقت میں تمہارا خالص خیر خواہ ہوں۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت تم میں سے ایک شخص پر اُتری۔ تاکہ تم کو تنبیہ کرے۔ یاد کرو خدا کے اُس احسان کو کہ اُس نے تم کو قوم نوحؑ کے بعد خلافت (حکومت) دی۔ اور تم کو خلق میں وسعت عطا کی۔ خدا کی نعمتوں کو یاد کرو کہ فلاح پاؤ (سورۂ اعراف)

منکرین نعمت الٰہی احسانات خداوندی کی یاددہانی کا کیا جواب دیسکتے تھے۔ اُس کو تو گول کر گئے۔ گمراہی کا فرانہ تقریر کو ایک نئی تعریض کے طریقے سے شروع کیا۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (اعراف)

کافروں نے جواب دیا کہ کیا تو اسلئے ہمارے پاس آیا ہے۔ کہ ایک ہم خدا کو پوجیں۔ اور جن کو ہمارے بزرگ پوجتے تھے۔ اُن کو چھوڑ دیں۔ جس عذاب کا تم دعوے کرتے ہو۔ اگر تم سچے ہو۔ تو لے آؤ۔

خدا کا برحق پیغمبر اُن کے مصنوعی معبودوں کی حقیقت دکھلا کر اُنپر عذاب الٰہی کے نزول کو یقینی تبلاتا ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

پیغمبر نے کہا۔ تمہارے پروردگار کا عذاب وغصہ تم پر آگیا۔ کیا تم مجھ سے اُن چند ناموں کے بیے جھگڑتے ہو۔ جن کو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے خود رکھ لیا ہے۔ خدا نے تو اُس کے لئے کوئی دلیل نہیں اُتاری۔ عذاب

فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۔ (اعراف)

کا انتظار کرو۔ اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ اعراف ۹۔

اخلاق الٰہی کا یہ مقتضا ہرگز نہیں تھا۔ کہ ایک سرکش قوم سے ایک بار اُن کی کفر شعاری کے ترک کردینے کی تاکید کردی گئی۔ وہ مانے تو مانے۔ نہیں تو اُسی وقت اُن پر نزول عذاب ہوا۔ اور چشم زدن میں اُن کی ہستیاں فنا کردی گئیں۔ بلکہ اُس ارحم الراحمین اور سید اکنندۂ عالمین کے اخلاق حسنہ کا مدعا۔ اور اُس کے اشفاق کریمہ کا عین منشا۔ ایسے مواقع پر علی الاکثر چشم پوشی ہوتی تھی۔ اور طولانی خموشی یہ اسلیئے کہ خالق کے دل میں اپنے مخلوق کا درد تھا۔ معبود کو عوام عباد سے محبت تھی۔ یہ سکوت اور وقوف علی الاکثر الاوقات اتنے طول طویل ہوتے تھے۔ کہ انبیاء و مرسلین کے پائے استقامت اور ارادۂ صبر و تحمل۔ باوجودیکہ اُن کے نفوس قدسیہ حدود بشریت کو طے کرکے مراحل روحانیت تک پہونچے ہوئے تھے۔ بالآخر متزلزل ہو جاتے تھے۔ جناب نوحؑ کے واقعہ میں اس کی کافی مثال موجود ہے جب ایک کثیر التعداد مدت تک اُس پیغمبر حق کی دعوت و موعظت اُس کی کافر کیش قوم نے نہیں سُنی اور اُلٹے اِس احسان و خیر خواہی کے عوض اُسکو طرح طرح کے آزار روحانی اور جسمانی پہونچائے۔ تو وہ گھبرا کر خدا کی جناب میں اِن الفاظ کے ساتھ اُن کی شکایت اور گلے کرنے لگے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا (نوح)

اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن رات ہدایت کی اور تیری طرف بلایا۔ مگر میرے بلانے کا یہ اثر ہوا۔ کہ میں نے جتنا بُلایا وہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے

اسی طرح رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی غرض سے۔ حضرت یونسؑ کے وقتی غیظ و طیش میں آجانے کا واقعہ ان الفاظ میں یاد دلایا جاتا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ (الحاقہ)

اے پیغمبر اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیئے بیٹھا رہ۔ اور مچھلی والے حضرت یونسؑ کی طرح نہ بن جا۔ کہ اُنہوں نے مغلوب الغیظ ہوکر ہم کو پکارا۔

یہ دونوں مثالیں صبر و تحمل الٰہی کے کمال کو پورے طور سے بتلاتی ہیں۔ بعینہٖ یہی مثال ہمارے موجودہ سلسلہ بیان میں کافرین قوم عاد اور حضرت ہودؑ کی داستان و واقعات میں سمجھنا چاہیئے۔

متواتر مقامات پر قرآن کا سلسلہ بیان۔ جناب ہودؑ۔ اور اُن کے کافر قوم کے مکالمات کا ذکر کرتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس حجت الٰہی نے ایک مدت مدید تک ان گمراہوں کے سمجھانے اور راہ پر لانے کی کوششوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

خاص سورۂ ہودؑ میں اصنام پرستی کے متعلق باہمی مکالمات کے یہ الفاظ ہیں۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

عاد کی طرف ہم نے اُنکے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اُس (ہودؑ) نے کہا میرے

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۔ يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ۔

بھائیو! خدا کو پوجو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ دوسرے خداؤں کا نام تمہارا صرف افترا ہے۔ بھائیو! اس وعظ و نصیحت کا کوئی معاوضہ میں تم سے نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ تو اُسکے متعلق ہے جس نے مجکو پیدا کیا۔ کیا تم نہیں سمجھتے ہو۔ بھائیو! خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اُس کی طرف رجوع کرو۔ تو وہ آسمان سے تم پر برستا ہوا ابر بھیجے گا۔ اور تمہاری موجودہ قوت میں اور زور و قوت عطا فرمائیگا۔ گنہگار بن کر اُس سے مُنہ نہ چراؤ"

اس سنجیدگی کے خطاب کا اس بیہودگی سے جواب دیا جاتا ہے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔

قوم کے لوگوں نے کہا۔ ہُود! تم ہمارے پاس کوئی دلیل نہ لائے۔ صرف تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے بزرگوں کے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں۔ کہ ہمارے بعض دیوتاؤں نے تمکو کچھ کر دیا ہے۔

صبر و تحمل کا سراپا پیکر۔ خدا کا سچا پیغمبر۔ اُن شوخ چشموں کو نرمی سے خیر خواہانہ جواب دیدیتا ہے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِیْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِيْظٌ۔۔ (ھود ۱۰)

ہُود نے کہا میں خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ اور تم بھی گواہ رہنا۔ میں جِسکو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں اُس سے بالکل بری ہوں۔ تم سب ملکر میرے لیے سازش کرو۔ پھر مجھے مہلت نہ دو۔ میں نے خدا پر بھروسہ کیا ہے۔ جو میرا تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ کوئی چلنے والا ایسا نہیں۔ جس کی پیشانی (چٹیا) اُس کے ہاتھ میں نہیں۔ میرا پروردگار صحیح راستہ پر ہے۔ تم اگر انکار کرو۔ تو میں جو پیغام لے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا۔ وہ تم کو پہونچا چکا۔ خدا تمہارے سوا کسی اور کو حکومت بخشے گا۔ تم اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے۔

(ہُود۔ ع ۱۰)

ایک بار نزول عذاب کے متعلق موعظت کی گئی۔ اس کی نسبت مکالمہ کی یہ عبارت ہے۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ

عاد کے بھائی ہُود کو یاد کرو۔ جب اُس نے اپنی قوم کو صحرائے ریگستان

وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔

میں متنبہ کیا۔ خدا کی عبرتناک دھمکیاں اُس کے سامنے اور اُسکے پیچھے تھیں۔ اُس نے کہا کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر کوئی بڑا عذاب نہ آئے۔

کفار استہزا نہ انداز میں جواب دیتے ہیں۔

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔

انہوں نے کہا کہ اے ہود تو کیا اسلئے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمکو اپنے دیوتاؤں سے مرتد کر دے۔ جس عذاب کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ اگر سچے ہو تو لے آؤ۔

خدا کا رسول برحق متانت سے جواب دیتا ہے۔

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ (احقاف)

قوم نے کہا۔ عذاب کب آئیگا۔ تو پیمبر نے کہا کہ اسکا علم خدا کے پاس ہے۔ کہ عذاب کب آئیگا۔ جو پیغام لیکر میں بھیجا گیا ہوں وہ صرف تمکو پہونچاتا ہوں۔ لیکن میں تم کو نادان قوم خیال کرتا ہوں۔"

تغیر نفوس کے متعلق قوم عاد کی طبیعتوں میں مختلف اقسام کے تمرد۔ تکبر اور انانیت کے خیال پیدا ہوگئے تھے۔ وہ اپنی دولت و مال کو لازوال۔ ثروت و اقتدار کو دائمی اور بالاستمرار اور اپنی عمارات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے بالاستقرار یقین کرتے تھے۔ پیغمبر برحق ان کے اس خیال فاسد کا انکشاف حال فرماتا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔

عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کہ تم پرہیزگار بنو۔ میں تمہارا پیغمبر ہوں اور امین۔ پس خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اسکے لیئے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ پروردگار عالم کو دینا ہے۔ تم ہر خوش قطع زمین میں بیفائدہ اپنی یادگار نشانی اور کاریگری کی عمارتیں بناتے ہو شاید تم ہمیشہ رہوگے۔ جب کسی کو پکڑتے ہو تو جابر بن کر۔ خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اُس خدا سے ڈرو جس نے تمہاری اُن نعمتوں سے مدد کی جنکو تم خود اچھی طرح جانتے ہو۔ چوپائے اولادیں چشمے اور باغ۔ مجھکو ڈر ہے کہ تمپر کوئی عذاب نہ آئے۔

وہ بے دین ضدی لاپرواہی سے کہتے ہیں۔

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (الشعراء)

قوم نے جواب دیا کہ خواہ تم وعظ و نصیحت کرو یا نہ کرو۔ ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اگلے زمانہ کی عادت ہے۔ ہمپر کوئی عذاب نہیں آئیگا۔ (الشعراء)

اُن کی کافرانہ ضد اور منکرانہ ہٹ کا بالآخر نتیجہ کیا ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	ان لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا۔ تو ہمنے اُن کو برباد کر دیا۔ بیواقعہ میں عبرت کی نشانی ہے۔ یہ لوگ اکثر ایماندار نہیں تھے۔

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ آیات مذکورہ بالا میں قوم عاد کی بربادی کے تین سبب بتلائے گئے۔ اور وہ ایسے ہیں۔ جو عموماً تمام اقوام عالم کی تباہی کے ہمیشہ باعث ہوتے چلے آئے ہیں۔ وہ اسباب یہ ہیں۔ غرور قوت۔ ظلم وجور اور کفر والحاد۔ ذیل کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ اُن کی تباہی سے پہلے یہ اسباب اُنمیں کثرت اور شدت سے موجود تھے۔ اپنی پہلی مفاخرت یعنی غرور وقوت کے اظہار میں وہ ہودؑ سے کہتے ہیں۔ ہمیں کس سے ڈراتے ہو۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً	اجی! قوت وزور میں ہم سے کون بڑا ہے۔

حضرت ہودؑ بمتانت وسنجیدگی سمجھاتے ہیں کہ تمہاری قوت مسلّم۔ تمہارا دعوےٰ صحیح۔ لیکن اگر خدا کی اطاعت وعقیدت اختیار کروگے۔ اور اُس کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلوگے۔ تو اُس کے صلہ میں۔

يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ	خدا تمہاری قوتوں کو اور قوت عطا فرمائے گا۔

لیکن وہ بے سمجھی سے نہ سمجھے۔ خدا اُن کی بے سمجھیوں کی حقیقت دکھلاتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً	کیا وہ نہ سمجھے کہ جس خدا نے اُن کو پیدا کیا۔ وہ اُن سے بھی زیادہ قوت والا ہے۔

غرور قوت کے شاہد یہ ہیں۔ تعداد افراد۔ تعداد افواج سے لیکر تعداد دواب۔ (مویشی) تک پر اُن کو پورا غرور اور انانیت حاصل تھی۔ حضرت ہودؑ اُنکی اس بیجا مفاخرت اور غرور ونخوت کے مشاہدے پر ارشاد کرتے ہیں۔ کہ ان دُنیاوی نعمتوں کے حصول پر اظہار تشکر کرنا چاہیئے۔ نہ استظہار تکبر۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً	اُس خدا کا خیال کرو۔ جس نے تم کو وہ چیزیں عطا کیں۔ جن کو تم خود جانتے ہو۔ مویشی۔ اولاد۔ باغ اور چشمے۔ اور تم کو خلق میں وسعت عطا فرمائی۔

ظلم وجور کے متعلق تمام ملک میں اُن کی شکایت پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ حکومت وجہانبانی کے لیے اِتنا مضر کہ اس کے مقابل میں کوئی عیب یا زیادتی مملکت کو اِتنا جلد نقصان وتباہی نہیں پہونچا سکتی۔ اُس زمانہ میں اُنکے مظالم اور مفاسد کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔ حق ناحق دیگر اقوام وقبائل کو پریشان کیا کرتے تھے اور ان تمام عیوب پر تنتے پھرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ دُنیا بھر میں ہم ہی ہم ہیں۔ اُنکی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً

لیکن عاد نے روئے زمین پر بلا استحقاق غرور کیا۔ اور کہا۔ کہ ہم سے کون زور و قوت میں بڑا ہے۔

اِن تمام قبائح اور معائب پر مستزاد اُن کا کفر و الحاد تھا۔ جس کے ترک کر دینے کی نسبت ابتدا ہی سے علی التواتر و التسلسل اُس معلم روحانی نے اُن کو موعظت فرمائی۔ اُن کے چند خطبات و مواعظات حسب ذیل ہیں۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ - (اعراف)

بھائیو خدا کو پوجو۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کیا پرہیزگار بننا نہیں چاہتے ہو۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ - (ھود)

بھائیو۔ خدا کو پوجو۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ دوسرے خدا کا نام تمہارا افترا ہے۔

اِن تمام فہمائش اور پند و نصائح کا جواب ایک ہی ملتا تھا۔ نہیں۔ وہ بھی اِس جہالت کے انداز اور شامت کے الفاظ میں۔

قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ - (ھود)

کافر بولے۔ اے ہودؑ تم تو میرے پاس کوئی حجت نہیں لائے۔ صرف تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔

اخلاقِ عظیم الہٰیہ اور الطاف عمیم قدسیہ کے اُصول و شان کے مطابق کافرین عاد کے ایسے انکار صاف پر بھی اُس منعم حقیقی نے احکام انتقام تو نہ جاری فرمائے۔ بلکہ التوا و مہلت کے اور اُن کو ایام دیئے۔ اور جناب ہودؑ کو ایک بار پھر اُن سے حجت تمام کرنے کا حکم ہوا۔ اور اُنہوں نے سمعاً و اطاعتاً کہکر ان سیہ بختوں کو آخری بار ان الفاظ میں سمجھایا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ - (احقاف و شعراء)

اگر اعراض کیا تو میں تم کو جو پیغام دیکر بھیجا گیا تھا۔ پہونچا چکا۔ خدا تمہارے سوا کسی اور کو حکومت دیگا۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب سخت آئے۔

خدا کی حجت تو تمام ہو گئی۔ مگر اُنکی سیہ بختی کی مدت نہ تمام ہوئی۔ اور وہ اپنی شامت اعمالی سے اب بھی بعض نہ آئے۔ تو اُس منتقم مطلق نے اُن کی جگہ دوسری قوم کو منتخب فرمایا۔ اور اِس ظالم اور مفسد قوم کو اُنکے املاک و مقبوضات کے اندر اور باہر تباہ و برباد کر دیا۔ بیرونی علاقہ جات میں تو قوی تر غنیم نے تلواروں سے مار گرایا۔ اور شہر احقاف اور اُس کے توابع مضافات میں ریح عقیم جھلسا دینے

والی ہوا اور جلتی ریگ کے طوفان نے مار کر دفن کر دیا۔

وَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (انتظار وقت کرتے جاؤ۔ اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں) کی مدت تمام ہوگئی۔ اُس منتقم حقیقی کے انتقام کا دن آگیا۔ بڑا غضب ہوا رحمت جلال میں آئی۔ نزول عذاب کی صورت کا مرقعہ الفاظ قرآنی نے یوں کھینچا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ - (احقاف)

جب انکو بادِ صرصر کا عذاب ایک بادل کی صورت میں جو انکی وادیوں کی طرف تھا نظر آیا۔ تو بولے یہ ہمکو سیراب کرنے والا بادل ہے۔ نہیں بلکہ یہ وہ ہے جسکی اے گنہگارو۔ تمکو جلدی تھی یہ ہوا ہے جسمیں دردناک عذاب (ممزوج) ہے جو اپنے خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے۔ پھر وہ ایسے نیست و نابود کر دیئے گئے کہ اُن کے گھروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔

بادِ عقیم یا ریح صرصر کی حقیقت اور اُسکے مہلک اثر بیان کیے گئے ہیں۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ - (الحاقۃ)

لیکن عاد وہ تو بادِ صرصر سے برباد کر دیئے گئے۔ خدا نے سات رات اور آٹھ دن تک اُن پر جڑ کاٹنے والی ہوا کو مسلط کر دیا۔ تم اُس ہوا میں اُس قوم کو اس طرح اُفتادہ دیکھتے ہو جیسے وہ کسی کھوکھلے درخت کی جڑ تھے۔ کیا اب اُنمیں کا کوئی تم کو زندہ نظر آتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ

اور عاد (کے حالات) میں عبرتیں ہیں۔ جب ہمنے بیفائدہ بخش ہوا کو بھیجا جو جیسی چیز پر اسکا گذر ہو جاتا۔ اسکو بوسیدہ ہڈی کیطرح کر چھوڑتی

احقاف وہ عظیم الشان ریگستان ہے۔ جو سینکڑوں میل تک وسیع ہے۔ اور اب اُسکو الربع الخالی کہتے ہیں۔ یہی عاد اولی کا قدیم مسکن تھا۔ اور آخر میں اُنکا مدفن بھی قرار پایا۔ نزول عذاب کا بھی یہی مقام ہے۔ صورت عذاب بھی الفاظ قرآنیہ سے معلوم ہو چکی ہے۔ وہ مہلک ہوا۔ ایک ہفتہ رات دن برابر چلکر ہزاروں کیا لاکھوں کی شمع حیات کو گُل کر گئی۔ اور صبح کو ختم عذاب پر سوائے خاک کے ڈھیروں اور خالی گھروں کے تمام علاقہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ ہولناک منظر الفاظ الٰہیہ میں یوں دکھلایا گیا ہے۔

فاصبحوا لا یری الا مساکنھم (احقاف) ترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية فهل ترى لهم من باقية (الحاقہ)	صبح کو سوائے مکانات افتادہ کے اور کچھ نظر نہ آیا ہیں۔ ہوا میں یہ قوم اس طرح افتادہ تھی جیسے کھوکھلے درخت کی جڑ ہو۔ کیا اُن میں سے کوئی زندہ نظر آتا ہے۔

نزول عذاب کے وقت احقاف کی حدتِ ہوا کی جیسی شدت بڑھ گئی ہو۔ اُسکا اندازہ تو اُسوقت امکان سے قطعی محال ہے۔ مگر ہاں اسوقت تک یہی جو بادِ سموم کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ مسٹر پالگریو۔ یوروپین سیاح و محققین کے چشم دید بیان سے ذیل میں سند درج ہے۔

دوپہر تھی۔ جنوب کی طرف سے دفعتاً ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ ہوا کی تیزی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ ...... میرے عرب رفیق نے اپنے چہرہ کو کپڑے سے لپیٹ لیا۔ اور اونٹوں کو مار مار کر تیز کرنے لگے۔ لیکن اونٹ بار بار بیٹھ جانے کی کوشش کرتے تھے میں نے رفیقوں سے واقعہ دریافت کیا۔ لیکن نہایت گھبراہٹ کے ساتھ صرف یہ جواب ملا۔ کہ اگر سامنے کے خیمہ میں پہونچ گئے۔ تو جان بچ جائے گی۔" اس اثنا میں ہوا اور زیادہ تند و تیز ہوگئی۔ گرمی کی یہ شدت ہوگئی۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دوزخ اُتر آیا ہے۔ بالآخر کوشش کرکے ہم خیمہ تک پہونچ گئے۔ وہاں ایک عورت منہ لپیٹے اوندھی پڑی تھی۔ ہمارے اونٹ ہوا کے رُخ سے منہ پھیر کر ناک کو ریت میں گاڑ کر مُردے کی طرح پڑگئے۔

ہم بھی خیمہ میں جاکر منہ لپیٹ کر اوندھے پڑگئے۔ تاریکی اتنی شدید تھی۔ کہ رات معلوم ہوتی تھی۔ دس منٹ تقریباً یہی حالت رہی۔ پھر ہوا اور گرمی میں تخفیف ہوئی۔ جب ہم اُٹھے۔ تو ہمارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

Palgnie Adventures of Arabia

اِن محقق سیاح کے چشم دید واقعات سے عذاب الٰہی کی اُس شدت عظیم کا اسوقت تک اثر خفیف باقی رہنا ثابت ہوگیا۔ سب سے پہلے سطح زمین پر اِس قوم قدیم کا آباد ہونا۔ اور قومیت کے مجموعی صورت میں قائم ہونا۔ اور مختلف اقطاع عالم پر مسلط ہوکر حکمرانی کرنا غرض اُن کے وجود۔ اُنکے عروج و اقتدار اور زوال و ادبار کے سارے حالات پوری تفصیل و تشریح سے بیان ہوچکے۔ اور اب عاد اُولیٰ یا اُمم سامیہ قدیم کے تمام احوال ختم کرکے ہم اپنے سلسلہ بیان میں جناب ہودؑ علیہ السلام کے مختصر حالات درج کرتے ہیں۔

جناب ہودؑ علیہ السلام کے مختصر حالات

جناب ہودؑ علیہ السلام ساتویں پشت میں سام ابن نوحؑ سے اسطرح ملتے ہیں۔ کہ ہودؑ[۱] بن عبد اللہ[۲] بن جلود[۳] بن عاد اُولیٰ بن عوص بن ارم بن سامؑ۔ (طبقات ابن سعد) توریت میں آپ کا نام عیبر اور بعض جگہ عابر آیا ہے۔ جو تمام عبرانی قوموں کے مورثِ اعلیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔ سفر تکوین باب ۱ درس ۱۴۔

آپ کی رسالت کے مختصر حالات یہ ہیں۔
عوص کے بیٹے عاد اولی نے بہت بڑی شہرت حاصل کی۔ اور رفتہ رفتہ اُسکی اولاد ایک نامی قوم ہو گئی۔ اور تمام مشرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی۔ انہوں نے عالیشان مکان اور بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں اور آس پاس کی قوموں کو اپنا محکوم بنا لیا۔
خداوند عالم نے اسی قوم کی ہدایت کے لیے حضرت ہوؑد کو مبعوث فرمایا۔ کہ خدائے برحق کی عبادت کی ترویج اور بت پرستی کا استیصال کریں۔ لیکن جب اُن لوگوں نے اُن کے احکام ہدایت سے سرتابی کی۔ تو خدائے تعالےٰ کا قہر جوش میں آیا۔ اور تین برس کا مسلسل قحط اُن میں پڑا۔ اور اُس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ آگاہ ہو گئے۔ کہ خدا کے پیغمبر کا حکم نہ ماننے کی یہ سزا ہے۔ اِس پریشانی کی حالت میں حضرت ہوؑد پھر تشریف لائے۔ اور بت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کے عبادت کرنے کی از سرِ نو تاکید فرمائی اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا۔ کہ اگر تم ایسا کرو گے۔ تو خدائے رحیم باران رحمت نازل کریگا۔ مگر وہ اپنی گمراہی پر ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن پر ایک سخت طوفانی آندھی نازل فرمائی۔ جو اُسکے غضب و عذاب کی نشانی تھی۔ آندھی کا طوفان سات رات اور آٹھ دن تک تمام اُس ملک میں اس زور و شور سے جاری رہا۔ کہ ہزارہا آدمی ہلاک ہو گئے۔ اور تمام قوم کا باستثنا اُن چند اشخاص کے جنہوں نے حضرت ہوؑد کا کہنا مان لیا تھا۔ قریب قریب کُل کا استیصال ہو گیا۔ اور جو لوگ بچے۔ وہ آخر میں حضرت ہوؑد پر ایمان لائے۔ اور یہی لوگ عادِ ثانی کہلائے۔ یہ واقعہ آفرینش عالم کے ۱۸۰۰ صدی میں اور ولادت عیسیٰؑ سے ۲۲۰۰ سال قبل واقع ہوا۔
اس واقعہ کے بعد حضر موت کے علاقہ میں حضرت ہوؑد مقیم ہوئے۔ اور وہیں انتقال فرما گئے۔ اور مقام ہسیق میں مدفون ہوئے۔ جہاں ایک چھوٹا سا قریہ قبر ہوؑد کے نام سے آباد ہے۔ اور سالانہ زیارت کا مقام ہے۔
عدن کے پاس عاد ثانیہ کا ایک کتبہ ملا ہے۔ اُس میں ہوؑد علیہ السلام کی اتباع شریعت کا مذکور ہے۔ اُسکے ایک سامی زبان کے شعر کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

تُقِیمُ لَنَا مِنْ دِیْنِ هُوْدٍ شَرَائِعًا ۔۔۔ وَنُؤْمِنُ بِالْآیَاتِ وَالْبَعْثِ وَالنَّشْرِ

وہ ہمارے لیے ہوؑد کی شریعت قائم کرتے ہیں :: اور ہم احکام الٰہی اور بعث و نشر پر ایمان لائے ہیں
اس کتبہ کی مرقومہ بالا عبارت نے جہاں عادِ ثانیہ یا عاد صالحین کی اہل ایمان اور ارباب مومنین ہونے کی تصدیق کر دی وہاں یہ بھی ثابت کر دیا۔ کہ شریعت اسلامی کے موجودہ اصول جن سے بعض مذاہب عالم کو اسوقت تک انکار ہے۔ وہ حقیقت میں تمام شرائع قدیم کے حقیقی اصول اور اصلی ارکان تھے۔

جدیس۔ عرب کے قومی دفتر کا یہ قبیلہ گویا سدس ہے۔ اور اُمم قدیمہ سامیہ میں اسکا چھٹا نمبر ہے۔ مگر تو بھی اِس قوم کا حال بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ بھی صحرا نشین تھے۔ اُن کی اولاد استداد ایام کے بعد اور اقوام صحرا کی مثال بالکل معدوم ہو گئی۔

قوم ثمود یا عاد ثانیہ

حضرموت سے سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک۔ عرب میں حجاز سے حدود سینا تک اس قوم و قبائل کے لوگ آباد تھے۔ اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ حضرت ہودؑ نے مع اپنے متبعین و صالحین عاد کے عذاب سے نجات پائی۔ روایات عرب میں ہے۔ کہ وہ عذاب سے پہلے عاد کی آبادی سے نکلکر حجاز میں چلے گئے تھے۔ ان میں لقمان نام ایک نیک بادشاہ ہوا۔ اُس کی عمر کئی سو برس کی بیان کی گئی ہے۔ اور یہ کچھ عجب نہیں۔ تمام قدیم قوموں کی ابتدائی تاریخ اسی قسم کے طویل العمر بادشاہوں سے شروع ہوتی ہے اب اِس قسم کی روایات مذاق زمانہ کے مطابق یہ معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کہ اُس شخص کے خاندان میں حکومت کئی سو برس تک رہی۔ اور مجازاً بجائے خاندان کے خود اُس شخص کا نام قرار دیدیا گیا۔ اس بنا پر لقمان کی عمر سے خاندان کی عمر مراد لینی چاہیے۔

لقمان کون بزرگ تھے؟ روایات عرب میں اس نام کا ایک مشہور و معروف شخص ہے۔ جسے اب عموماً حکیم لقمان کہتے ہیں۔ ان کی طرف حکایات و تمثیلات حکیمانہ کثرت سے منسوب ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اُس کے پند و نصائح کا تذکرہ ہے۔ جن میں سے ہم چند اپنے سلسلہ بیان میں آگے تحریر کریں گے۔

عرب قدیم کا مشہور شخص لقمان اور زمانہ موجودہ کا حکیم لقمان اصلاً ایک ہی ہیں۔ اِس اتحاد کا نہایت قدیم ثبوت یہ ہے۔ مشہور مورخ ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ جس کی سیرت آج آنحضرت صلعم کے حالات میں قدیم ترین تصنیف ہے۔ اور تصنیفات موجودہ کے اعتبار سے عرب قدیم کا سب سے پہلا مورخ ہے۔ کتاب التیجان میں جو مخصوص عرب قدیم کی تاریخ میں ہے۔ روایت کرتا ہے۔

قال وهب فلما مات شداد ابن عاد صار الملك الى اخيه لقمان ابن عاد و كان اعطى الله لقمان ما لم يعط غيره من الناس فى زمانه اعطاه حاسة مائة رجل وكان طويلا لا يقارنه

وہب (ایک مشہور راوی) نے کہا۔ کہ شداد ابن عاد جب مر گیا تو حکومت اُسکے بھائی لقمان ابن عاد کو ملی۔ خدا نے عاد کو وہ سب کچھ دے رکھا تھا۔ جو کسی دوسرے کو اُس زمانہ میں نہیں دیا تھا۔ اُس کو حواس سو آدمیوں کے برابر دیے گئے تھے۔ اور اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ بلند قامت

اهل زمانه قال ابن وهب قال ابن عباس كان لقمان ابن عاد ابن الملطاط ابن السلك ابن وائل ابن حمير نبيا غير مرسل۔

تھا۔ ابن وہب نے کہا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ کہ لقمان ابن عاد ابن الملطاط ابن السلک ابن وائل ابن حمیر (نسب نامہ صحیح نہیں) نبی بلا کتاب تھا۔

(ارض القرآن ص ۱۸۱ ج اول)

بعض لوگ غلطی سے لقمان عاد اور لقمان حکیم کو دو سمجھتے ہیں۔ بعض علمائے یورپ۔ جنکو عرب کی خصوصیات کے نام سے خواہ مخواہ چھینک آتی ہے۔ وہ لقمان حکیم اور ایساپ نام ایک یونانی حکیم کو ایک قرار دیتے ہیں اس اتحاد کی دلیل جو پیش وہ کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ان دونوں کی طرف جو حکایات و تمثیلات منسوب ہیں۔ وہ تقریباً ایک ہی قسم کے ہیں۔ لیکن یہ ایک تعجب انگیز استدلال ہے۔ کسی دو تصنیف کے مطالب کا اتحاد۔ اُن کے مصنفین کی اتحاد شخصیت کو اگر مستلزم ہے۔ تو افسوس ہے۔ کہ اس جرم میں ہمکو سینکڑوں تاریخی اشخاص کے مٹ جانے کا افسوس ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ قدیم عرب حکمائے یونان سے کب واقف تھے۔ عرب کے ایام جاہلیت کا ایک شاعر اسلمی ابن ربیعہ کہتا ہے

اهلكن طسما وبعده ؛ غذى بهم وذا جدون ؛ واهل جاش ومارب ؛ وحى لقمان والتقون

ترجمہ۔ حوادث زمانہ نے طسم کو اور اُس کے بعد قبیلہ ذاجدون۔ شاہ یمن اور اہل جاش و مارب اور قبیلہ لقمان کو شادیا

اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک قبیلہ کا مالک۔ یمن کا باشندہ۔ اور عظمت و شوکت میں سبا کا مقابل۔ اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔ عرب میں لقمان نہایت مشہور تھا۔ اُسکا صحیفہ حکمت۔ خود عرب میں موجود تھا۔ اور لوگ اُسکو پڑھتے تھے۔ ابن ہشام ذکر سوید و بیعت عقبہ میں تحریر کرتے ہیں۔

عاد کا ایک کتبہ جو ۱۸۳۴ء میں ملا تھا۔ اُس میں چند فقرے حسب ذیل ہیں۔

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے ہیں۔ اور ہمکو ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوئے تھے۔ اور اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں۔ یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفہ لقمان (لقمان کے اچھے فیصلے) ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔

اس نیک دل بادشاہ کا جو حضرت ہود کی شریعت کا متبع تھا۔ قرآن نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور اُس

کی نیکی اور دانائی کی شہادت دی ہے۔

لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ
فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ
وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ
لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ
وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ
اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ وَاِنْ
جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ
بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ
مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ يٰبُنَيَّ
اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ
بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ يٰبُنَيَّ
اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ
مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ
وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ
لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔

یاد کرو۔ جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ فرزندمن (میرے بیٹے) خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا شرک بڑے ظلم کی بات ہے (خدا کہتا ہے) ہم نے انسان کو حکم دیا ہے۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کریں۔ اُسکی ماں نے اُسکو پیٹ میں رکھا۔ کمزوری پر کمزوری (اٹھائی) دو برس کے اندر اُسکا دودھ چھڑایا۔

اے انسان میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر گذار رہو۔ بازگشت میری طرف ہے۔ اگر والدین تجھکو میرے شرک پر مجبور کریں۔ تو اُن کا کہنا نہ ماننا۔ لیکن دُنیا میں نیکی کے ساتھ اُن کے ساتھ رہنا۔ اور اُن لوگوں کا پیرو نہ بننا۔ جو میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر میری طرف بازگشت تمہاری ہے۔ تو تمکو بتاؤنگا۔ جو تم کیا کرتے تھے۔ اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز ہوگی۔ اور وہ کسی چٹان کے اندر یا آسمان میں یا زمین میں ہوگی۔ تو وہ بھی خدا لے آئیگا۔ خدا بیشک باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔

فرزندمن (میرے بیٹے) نماز پابندی سے پڑھا کر۔ اور نیک بات کی لوگوں کو ہدایت کیا کر اور بُری بات سے روکا کر اور تجھپر جب کوئی مصیبت آئے تو اسپر صبر کیا کر یہ بڑی ہمت کی باتیں ہیں۔ غرور سے مت لوگوں سے منہ پھیرا کر اور نہ زمین میں اترا کر چل یقین رکھ کہ خدا مغرور اور مختار کو پیار نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر۔ اپنی آواز کچھ نرم کر۔ کہ بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے

قوم ثمود کے تمدنی اور سیاسی حالات

نام و نمود کے اعتبار سے قوم ثمود قوم عاد کی کامل اور لائق جانشین ثابت ہوتی ہے۔ تاریخوں سے ان

کا پورا تقابل ثابت ہے۔ تحقیق کی ترازو میں۔ دونوں قوموں کی شہرت کے پلّے برابر ہیں۔ اکثر بایک بینوں نے ثمود کی سیاسی لیاقتوں میں کمی بتلائی ہے۔ جو کسی قدر ثابت بھی ہے۔ مگر موازنہ کی دوربین نگاہیں جب باہمی اوصاف و کمال کا موازنہ کرنے بیٹھتی ہیں۔ تو عاد سے ثمود کے تمدنی کمالات کو مضاعف پاتی ہیں اس لیے ثمود کی سیاسی کمی تمدنی اضافہ کمالات سے پوری ہو جاتی ہے۔ عاد کی حقیقی جانشینی ثمود کو حاصل تھی۔ قرآن مجید بھی اس حقیقت کا شاہد ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ ؕ ثمود! یاد کرو۔ کہ خدا نے تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا

وجہ تسمیہ ثمود ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے۔ ثمد عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ عبرانی میں ایک لفظ تامید ہے۔ جس کے معنی "دائم" اور خالد کے ہیں۔ عربی کی ث اور عبرانی کی ت ایک چیز ہے۔ عبرانی میں ث نہیں ہے۔ اس لیے وہ اکثر الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں۔ عبرانی میں ت سے ہیں۔ اسلئے ثمود کے معنی عام سامی زبان میں وہی ہونگے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں۔ اور بہت سے قبائل عرب کے بھی نام ہیں[1]

ثمود کی سکونت قوم عاد۔ شرق و جنوب کے ساحلی مقامات و علاقہ جات میں۔ جو خلیج فارس سے لیکر حدود عراق تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آباد تھی۔ اور اُن پر بطور حاکمانہ متصرف بھی تھی۔ قوم ثمود۔ اُن کے مقابل۔ مغربی و شمالی علاقوں میں سکونت پذیر تھی۔ اُن کے مواطن و ساکن کو عموماً وادی القریٰ تبلایا جاتا ہے۔ اس بنا پر کہ اُن کی سکونت کے مقامات اُس علاقہ میں مختلف اور متفرق قطعات میں واقع تھے۔ اُن کے افادہ

---

[1] فاضل معاصر۔ صاحب ارض القرآن نے ثمود کے متعلق لفظ عرب کی غیر مناسب ہونیکی وجہ سے تضعیف فرمائی ہے۔ مگر اس کے عبری ہونے کے جو وجوہات تحریر کیے ہیں۔ وہ عربی سے زیادہ غیر مناسب اور دور از فہم ہیں۔ اس لیے کہ ثمد کے لغوی معنی کمی "آب" کے ہیں۔ اور عرب کو پانی کے تعلقات و خصوصیات سے جو مناسبت ہے۔ وہ ہر شخص جانتا ہے اس بنا پر یہ قیاس صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ انکے وطن و مسکن میں پانی بہت کمیاب تھا۔ اسی خصوصیت اور رعایت خاص سے یہاں کے رہنے والوں کو ثمود کہنے لگے۔ بالعکس اس کے اگر اس کی عبری ترکیب مانی جائے تو خالد۔ لفظ عبری کا ہم معنی ہوتا ہے۔ جو ایسی کچھ مناسبت خاص عرب کے ساتھ نہیں رکھتا۔ اس سے کہیں زیادہ تو کمی آب والے اصلی معنی کو عرب کے ساتھ مناسبت خاص کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرب کے محققین تبلاتے آئے ہیں۔ فاضل معاصر کو لفظ خالد کی کثیر الاستعمالی نے دھوکہ میں ڈالا ہے۔ حالانکہ ثمود کے زمانہ میں خالد کسی کا نام نہیں معلوم ہوتا۔ اس نام کی ایجاد تو بہت بعد کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ المولف عفی عنہ

اور بے شمار آثار عہد اسلام میں بھی مشاہدہ کئے گئے تھے۔ اور آجتک بھی جا بجا بیش نظر آتے ہیں۔
قرآن مجید نے وادی القریٰ کو صرف وادی کے نام سے یاد فرمایا ہے۔
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (فجر) :- ثمود جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشا کرتے تھے۔

دار الحکومت ثمود

قوم ثمود کا دار الحکومت الحجر تھا۔ اور یہ تمام مغربی اور مشرقی مورخین و محققین کا مسلمہ اور مصدقہ ہے۔ یہ شہر حجاز سے شام کو جانے والے راستہ پر واقع ہے۔ اب اِس شہر کو عموماً مدائن صالح کہتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ قوم ثمود۔ سیاسی قوت کے اعتبار سے عاد کے مقابل نہیں پائی جاتی۔ اسلیئے کہ اُن کے سیاسی حالات تحقیق نہیں ہوتے۔ مگر اُن کو ایک زبردست اور مقتدر قوم تو سب نے تسلیم کیا ہے۔ حقیقت یہ بتلاتی ہے کہ قوم ثمود۔ ایک خاموش۔ تنہائی پسند اور صلح جو لوگ تھے۔ حکومت واقتدار کے نہ شائق تھے اور نہ حریص۔ اُصولِ فطرت کی بنا پر اُن کا خیال سیاست کے عوض صنعت اور عرب کے خاص شغلہ تجارت کی طرف زیادہ منعطف ہوا۔ اور دُنیا کے کارناموں میں۔ جن کمالات کی وجہ سے اُن کی یاد اُن کا ذکر آجتک باقی ہے۔ وہ اُن کی صنعت و دستکاری ہے۔ جو اُن کے اعلیٰ تمدن کی شاہد ہے۔ عمارت کے فن خاص میں۔ یہ قوم عاد سے بڑھی چڑھی ثابت ہوتی ہے۔ پتھروں کو خالی کرنے اور پہاڑوں کو اندر اندر کاٹ کر مکان بنانے اور اُن کو مختلف قسم کے نقش ونگار سے سجانے میں اُنکو کمال حاصل تھا۔ آج بھی بے شمار امتداد ایام کے بعد اُن کی یہ باقی ماندہ صنعتیں بڑے بڑے صناعان زمانہ کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ اور مشکل سے تسلیم کرنا ہوتا ہے۔ کہ اتنے قدیم زمانہ کے لوگ بھی ایسے نادر اور کمال صنعت پر قادر ہوتے تھے۔ اُن کی پتھروں کی عمارتیں۔ سنگین مقابر۔ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر کنوئیں اُنکی بے انتہا صنعتوں کے ایسے آئینہ ہیں۔ کہ وہ ملتے تو موجودہ زمانے والے اُنکے ہاتھ چوم لیتے۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر فن عمارت کے کمال میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا (اعراف)	(صالح نے کہا) کہ اے لوگو۔ خدا نے تمکو زمین میں جگہ دی جسکے میدانوں میں تم قصر ومحل اور پہاڑوں کو کاٹ کر بناتے ہو۔"

سورۂ شعرا میں ارشاد ہوا ہے۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فَارِهِيْنَ　　پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے ہو۔

اِن کے مالدار اور ذی اقتدار ہونیکے متعلق اُسی سورۂ شعرا میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ　　خدا نے تمہاری مویشی۔ اولاد چشمے اور باغوں سے مدد کی

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ خدا نے اُن کو۔ جانور۔ باغات۔ پانی کے چشمے۔ اور آل اولاد۔ سب کچھ افراط سے دے رکھا تھا۔ اُن کے پاس خدا کے فضل سے وہ تمام چیزیں مہیّا اور موجود تھیں۔ جو دُنیا میں ٹھول خوشحال اور دولت مند قوموں کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

قوم ثمود کے شہود آثاریہ

قوم ثمود کے حالات کا سب سے بڑا اور قدیم الکشافی دفتر وہ کتبہ ہے۔ جو ۱۸۳۴ء میں برآمد ہوا ہے۔ یہ کتبہ قریب عدن۔ حصن غراب کے مقام میں پایا گیا ہے۔ پانے والا ایک انگریزی افسر ولسٹڈ نامی "Wellsted" ہے۔ یہ پہلا کتبہ ہے۔ جو عرب کی زمین میں یورپ والوں کے ہاتھ آیا ہے۔ اِس کا ہاتھ آنا تھا۔ کہ یورپ بھر میں آثار قدیمہ عرب کے اکتشاف کی اوّلیت اور دُنیا بھر کی جامعیّت و قابلیّت کے تعظیمی سہرے ولسٹڈ کے سر بندھنے لگے۔ اور محققین یورپ عرب کے ملکی اخبار و آثار کی نسبت اپنے کمال و قابلیت کے غلُ مچانے لگے۔ حالانکہ اُن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے۔ محققین عرب خود اس کتبہ کو پڑھ کر ترجمہ کر چکے تھے۔ اور اس کی کافی اطلاع ملک عرب کی تمامی اقطاع میں مشتہر ہو چکی تھی۔ اگر زمانہ حال کے مستشرقین کو عرب کی قدیم تاریخ پر پورا علم حاصل ہوتا۔ تو وہ اسکے متعلق اپنی اوّلیت کا دعوےٰ نہ کرتے۔ ہم نے قوم عاد کے اجمالی حال لکھتے وقت اوپر بتلا دیا ہے۔ کہ یہ کتبہ امارت معاویہ کے زمانہ میں تقریباً ۴۲ھ یا ۴۳ھ میں پہلے پہل دریافت ہوا تھا۔ اسکے دو مصرعہ ترجمہ کے ساتھ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ اصل کتبہ کی زبان اور خط۔ جنوبی عربی ہے۔ جسکو غلط فہمی سے متاخرین نے حمیری بتلایا ہے۔ اور اب عموماً زبان اور خط دونوں حمیری کہے جاتے ہیں۔ اصل کتبہ اور اُسکا انگریزی ترجمہ۔ پہلے پہل ایشیاٹیک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا تھا۔ اب ہم ذیل میں اسکا عربی ترجمع مع اُردو ترجمہ کے قلم بند کرتے ہیں۔

غنینا زمانا فی عراصۃ ذا القصر
بعیش رخی غیر ذی ضنک ولا نذر
یفیض علینا البحر بالمدّ زاخراً
وانهارها بالماء مبزعۃ تجری
..... خلال النخیل باسقات .....
..... بالقسب المجزع والتمر .....
ونصطاد صید البحر بالخیل بالقنا
وطور لنصید النون من لجج البحر

ہم مدّت تک اس وسیع قصر میں رہے۔ ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی اُمنڈ آتا تھا۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعے کے دیواروں سے غضبناک ہوکر ٹکریں مارتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آیندہ آواز سے بہتے تھے۔ بلند کھجوروں کے اوپر بیٹھے باغبان خشک چھوہارے ہمارے وادیوں کے چھواروں کی زمینوں میں لگاتے تھے۔ اور خشک چاول بوتے تھے۔ ہم پہاڑی بکریوں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار زنجیروں اور جالوں سے

ونزفل فی الخز المرقم تارۃ
وفی القز احیانا وفی الحلل الخضر

یلینا ملوک یبعدون عن الخنا
شدید علی اهل الخیانۃ والغدر

یقیم لنا من دین هود شرائعا
ونومن بالآیات والبعث والنشر

اذا ما عدو حل ارضا یریدنا
بو ترنا جمیعا بالمشقۃ السمر

نحامی علی اولادنا ونسآئنا
علے الشهب والکمت المعنق والشقر

نقارح من یبغی علینا ویعتری
باسیافنا حتی یولون بالدبر

کرتے تھے۔ اور مچھلیوں کو۔

بیلا بیلا کر نکال لیتے تھے۔ اور ہم آہستہ آہستہ خراماں خراماں رنگ برنگ کے ریشمی کپڑے اور گاہی سبز مختلف الالوان جامے پہن کر چلا کرتے تھے۔

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔

ہمُود (علیہ السلام) کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے قیامت کے راز اور قبر سے اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے دشمن (رہزن) گھس آئے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے تو ہم نے گھوڑوں کو پورے دوڑایا اور ہمارے کریم سخت اور نوکدار نیزوں کو لیکر آگے بڑھے۔ ہمارے خاندان کے بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں۔ جنکی گردنیں لمبی تھیں اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے۔

ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں۔ اور چھید رہی تھیں۔ یہانتک کہ اُن کے قلب پر حملہ کرکے اُن کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا۔ جو بد ترین نوع انسان میں سے تھے۔

ہم نے اس کتبہ قوم ثمود کے تمام حالات کا دفتر اسی لئے بتلایا ہے۔ کہ اُس کی عبارت اور مضامین سے قوم ثمود کے مذہبی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ قومی۔ مالی۔ سیاسی اور فوجی سب ہی حالات تو پورے طور سے معلوم ہوجاتے ہیں۔ اور صرف اُنہی مندرجات سے ہر شخص ثمود کی قومیت اُن کی قدامت و قومیت اور اخلاق و معاشرت کا کافی طریقے سے اندازہ کر سکتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر آسانی سے سمجھ لیا جائیگا۔ کہ تمدن و اخلاق و قوت و اقتدار کے اعتبار سے قوم عاد کی لائق اور قابل جانشین اور قائم مقام عرب میں ثمود ہی کی قوم تھی۔

قوم ثمود کی ترقی کا خاتمہ حضرت موسیٰ کی بعثت سے پہلے ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کوئی تاریخ اسکا زمانہ معین نہیں کرتی۔ توریت بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔ اور اُسکا خالی ہونا اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ نزول توریت سے پہلے یہ قوم برباد ہو چکی تھی۔ مگر قرآن مجید نے ان کے زمانہ کو صاف لفظوں میں تبلادیا ہے۔ حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والا دیندار تابعین فرعون کو مخاطب کرکے تنبیہاً اور ہدایتاً موعظت کرتا ہے۔

یٰقَوْمِ اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ (مومن)	بھائیو! مجھکو ڈر ہے کہ دوسری کافران قوم نوحؑ قوم عاد اور قوم ثمود کی طرح تم پر بھی عذاب آئے۔

ان ارشاد قرآنی اور الفاظ ربانی سے صاف طور پر ظاہر ہو گیا۔ کہ قوم عاد کے بعد قوم ثمود کا زمانہ تھا۔ اور قوم ثمود بعثت کلیم اللہؑ سے پہلے اپنی بربادی اور تباہی تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا زمانہ ۱۹۰۰ء ق م کے معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر قوم ثمود کے عروج و زوال کو ۱۸۰۰ء اور ۱۶۰۰ء ق م کے تقریباً درمیان میں سمجھنا چاہیے۔

قوم ثمود کی بربادی اس قوم کی بربادی کا باعث خدا کی ناراضی تھی۔ اور خدا کی ناراضی کا سبب عام طور سے انسانی کی بد افعالی اور کیفر کرداری ہوا کرتی ہے۔ قوم ثمود دُنیا سے باہر تو بستی ہی نہیں تھی۔ کہ اُن میں اور دُنیا کے اُمم کے آثار و کردار نہ پیدا ہوتے۔ وہ عیوب و نقائص رفتہ رفتہ ان میں بھی پیدا ہو گئے۔ اور یہ بھی اپنی دُنیاوی عروج و اقتدار کے عالم میں خدا اور اُسکے عطا کردہ نعمات لامتناہی کو بھول گئے۔ اور اُس معبود حقیقی کو چھوڑ کر مختلف الاقسام غیر معبودوں کی پرستش کرنے لگے۔ اجرام فلکی کی عبادت شروع کر دی۔ قدرت الٰہی کے ذرّے۔ آسمان کے ستاروں کو اپنا معبود قرار دینے لگے۔ اور اُن کے ناموں پر مختلف ملکی مقامات میں ہیکلیں (معابد) تیار کرنے لگے۔ جن کی عمارات و انتظامات میں ملک و قوم کے بڑے بڑے مالی ذخیرے نثار کر دیے گئے۔

حضرت صالح علیہ السّلام کی رسالت

اخلاق الٰہی نے اپنی قدیم عادت و دستور کے مطابق اُنہی کی قوم و قبیلہ سے۔ صالح نامی ایک نفس مقدس کو اُن کی ہدایت و موعظت کے لیے منصب رسالت پر مبعوث فرمایا۔ محققین عرب حضرت صالحؑ کا سلسلہ نسب یہ بتلاتے ہیں۔

صالح بن عبید بن اسف ابن کماشج ابن عبید ابن جادر ابن ثمود[۱] ابن جاثر ابن ارم ابن سام بن نوح علیہ السّلام۔

علمائے یہود تو خصوصاً عرب کے تمام مشاہیر اور خصائص کو چھپاتے ہیں۔ اس لیے اُن کی کتابوں میں نہ ثمود کا کوئی ذکر ہے۔ نہ اُن کے پیغمبر حضرت صالحؑ کا۔ ظاہری طور پر یہ اُن کی عدم واقفیت کا وہ

---

[۱] قوم ثمود کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ثمود کی اولاد میں سے تھے۔ عرب میں اسکا قدیم سے دستور و رواج قائم ہے۔ جیسے قریش سے قریشی ہاشم سے ہاشمی۔ مولف عفی عنہ

یہ حیلہ بھی کرسکتے ہیں۔ کہ اُن کے زمانہ سے قبل ثمود کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لیئے وہ ان کے تحریر حالات سے مجبور کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ عذر صرف حیلہ ہے۔ وہ توریت باب تکوین کو صرف غور سے پڑھیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ جب آفرینش عالم کے وقت سے سلسلہ بیان شروع کیا گیا ہے۔ تو عرب صالحؑ تو ہزار ہا سال پیچھے آئے ہیں پھر کیوں نظر انداز کیے گئے۔ یہ یہودیوں کی فروگذاشت اُن کے اُس خاص حسد و نفسانیت کو بتلا رہی ہے۔ جو اُن کو خصوصیات عرب کے مخفی رکھنے میں حاصل تھیں۔ مگر باایں ہمہ توریت کتاب التکوین۔ آیتہ ۱۰ و ۲۴ میں لکھا ہے۔ کہ ارم کے بھائی ارفخشد کے ایک بیٹے کا نام سالحؑ ہے۔ جو تمام اولاد ابراہیمؑ اور عرب یقطانی کا باپ ہے۔

نصرانی پادری جو بزرگان توراۃ کی تاریخی ہستی کے اثبات کے لیئے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے روایات عرب اور قصص قرآن کا نام عام طور سے اُن کی زبان افسانہ ہے۔ لیکن اگر خود اُن کو ضرورت پڑے۔ تو وہ تاریخ کی بلند ترین شہادت ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ صالحؑ اور سالحؑ ایک ہی شخص تھے۔
Gold Mines P.278

بہر حال یہی نفس برگزیدہ قوم ثمود میں حجت الٰہی بنکر نمودار ہوا۔ اور اُن کی ہدایت کا ذمہ دار بنا۔ حضرت صالحؑ نے اُس کا فریضہ قوم میں خدا کی دعوت شروع کی۔ بعضوں نے لبیک کہی۔ اور اکثروں نے سختی سے انکار کیا۔ اور اُسکو جھٹلایا۔ بالآخر اُس معجز نما حجت خدا نے پہاڑ کے عین جوف[لہ] سے ایک ناقہ کو پیدا کرکے اُن کفر پرستوں سے کہا۔ کہ یہ اونٹنی آیت الٰہی ہے۔ اور میں حجت الٰہی۔ اُسکو فراغت

[لہ] سر سید مرحوم اس واقعہ کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے حضرت صالحؑ ابن عبید ابن مسف بن ماشج بن عبید بن حاذر بن ثمود کو مبعوث کیا۔ بعض لوگ اُن پر ایمان لائے۔ اور بہتوں نے اُنکا یقین نہیں کیا۔ ان لوگوں نے حضرت صالحؑ سے کہا۔ کہ اگر تو سچا ہے۔ تو کوئی نشانی بتلا۔ حضرت صالحؑ نے جواب دیا کہ اے میری قوم یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ تمہارے لیئے اُس کی نشانی ہے۔ اس کو چھٹا پھرنے دو۔ کہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے۔ اور اُسکو ایذا نہ پہنچاؤ مبادا تم پر اس کے عوض عذاب نازل ہو۔ اسی فہمائش کے سبب اُن لوگوں نے اونٹنی کو پھرنے دیا۔ اور کچھ ایذا نہ پہنچائی کچھ عرصہ کے بعد وہاں قحط واقع ہوا۔ اور اُس خشک سالی میں پانی کا بھی قحط ہو گیا۔ پانی کہیں نہیں ملتا تھا۔ اور جہاں کہیں تھوڑا سا پانی ہوتا تھا۔ تو اونٹنی اپنی خلقی طبیعت سے جو خدا نے اونٹ میں پیدا کی ہے۔ پانی کو تلاش کرلیتی تھی۔ اور پی لیتی تھی یا خراب کر دیتی تھی۔ اور لوگ اُسکو روک نہ سکتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے کہا۔ کہ ایک دن اونٹنی کو پانی پینے دیا کرو۔ اور اُس سے کوئی مزاحم نہ ہو۔ دوسرے دن تم لوگ پانی پی لیا کرو۔ اور اونٹنی کو وہاں نہ جانے دیا کرو۔ قرآن مجید سے معلوم ہوا۔ کہ ایک عرصہ کے بعد مختلف فرقے کے سرداروں نے جو اُس زمانہ کے کافروں کے فرقے تھے۔ حضرت صالحؑ کے مار ڈالنے کا منصوبہ کیا۔ مگر جب وہ

اطمینان سے زمین پر چرنے دو چشموں کا پانی آزادی سے پینے دو۔ اور کمی آب کی وجہ سے اگر اسکا روزانہ پانی پینا تمھیں گوارا نہیں ہے۔ تو یہ انتظام کر لو۔ کہ ایک دن چشمے سے یہ پانی پیئے۔ اور ایک دن تم پیا کرو۔ اس معقول اور منصفانہ انتظام کے بعد بھی اگر اُس اونٹنی کو کوئی آزار پہونچایا گیا۔ تو پھر عذاب الٰہی کو آیا ہی سمجھ لو۔

بقیہ عبارت حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اپنے منصوبہ پر کامیاب نہ ہوئے۔ تو اُنہوں نے غصہ میں آکر اُس اونٹنی کو مار ڈالا اُسوقت حضرت صالحؑ نے اُن سے کہا۔ کہ تین دن تک تم چین کر لو۔ بعد اُس کے تم ہلاک ہوگے۔ خدائے تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ جب ہمارے حکم کی تعمیل ہونے کو ہوئی۔ تو ہم نے صالحؑ اور اُن لوگوں کو جو اُن پر ایمان لائے تھے۔ اپنے رحم و مہربانی کے تقاضہ سے۔ اُس روز کی ذلت سے بچا لیا۔ آفت جو اُن پر آئی تھی۔ وہ یہ تھی۔ کہ آسمان سے ایک خوفناک آواز آئی جو غالباً رعد اور زلزلوں کی اور اُس قسم کی آفت ارضی اور سماوی کی آواز تھی۔ صبح کو وہ لوگ اپنے مکانوں میں مردہ اور سرنگون پڑے ہوئے پائے گئے۔ گویا اُن مکانوں میں رہتے ہی نہیں تھے۔

پھر کچھ آگے چلکر سید صاحب لکھتے ہیں۔ مفسرین اور محدثین کا بیان ہے۔ کہ کفار نے حضرت صالحؑ سے اُن کی رسالت کے ثبوت میں اس معجزے کی درخواست کی تھی۔ کہ اگر اس پہاڑی میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو۔ اور بمجرد پیدا ہونے کے ایک سرخ بالوں والا بچہ جنے۔ اور وہ بچہ اُسی وقت ہمارے سامنے بڑی اونٹنی کے برابر ہو کر چرتا پھرے۔ اور ہم اُس اونٹنی کا دودھ پئیں۔ تب ہم ایمان لائینگے۔ یہ روایت محض ساختہ اور مصنوعی ہے۔ اس روایت کے موضوع کہنے سے اسوقت ہمارا یہ منشا نہیں ہے۔ کہ ہم امکان معجزے سے انکار کریں۔ اور اس پر بحث شروع کریں۔ بلکہ ہم اسوقت صرف سادی طرح اس روایت کو اس لیے موضوع کہتے ہیں۔ کہ اس کی صحت پر کوئی سند نہیں ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی۔ تو ایسے عجیب واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا۔ یا کسی مستند حدیث سے اُس کا پتہ پایا جاتا۔

چونکہ سید صاحب نے آخر میں سلسلۂ وقوع معجزات کے امکان سے انکار نہیں کیا ہے۔ اس لیے ہمکو بھی زیادہ بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ مگر اُن کا یہ فرمانا کہ اس کی صحت اس لیے نہیں مانی جاتی۔ کہ قرآن و حدیث سے اس کی سند نہیں ملتی۔ قابل اعتبار نہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں اُس اونٹنی کی نسبت صاف لفظوں میں بتلا دیا گیا ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (یہ اونٹنی خدا کی تمہارے لیے نشانی ہے) (قالوا) فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ کافروں نے کہا۔ اگر تم سچے ہو۔ تو کوئی نشانی (معجزہ) لاؤ۔ صالح نے کہا یہی اونٹنی ہے۔ اس عبارت قرآنی اور الفاظ الٰہی سے تو کافروں کا طلب معجزہ اور طلب معجزہ پر اونٹنی کا نمودار ہونا صاف صاف ثابت ہے جو آپ کی مصنوعی بتلائی ہوئی روایت میں منقول ہے۔ پھر جب اُس کی تطبیق قرآن سے ہوتی ہے۔ تو اُس سے انکار کیسا اور اُس کے

قوم ثمود میں دو قسم کے لوگ تھے مومن اور غیر مومن۔ مومنین کی جماعت نے۔ جو تعداد میں کافرین سے بہت کم تھی۔ حضرت صالحؑ کے ارشاد کی تصدیق کی اور تعمیل۔ مگر کثیر الافراد گروہ کافرین نے سیہ بختی سے پھر انکار کیا۔ اور اُن میں نو آدمیوں کی شقیق القلب اور بے رحم جماعت نے یہ صلاح ٹھہرائی۔ کہ حضرت صالحؑ اور اُن کے متبعین پر شب خون مار کر خدا پرستوں کا خاتمہ کر دیں۔ اُنھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر مار ڈالا۔ خدا نے اپنے پیغمبر اور اُسکے متبعین کو کافروں کی ایذا رسانیوں سے بال بال بچا لیا۔ اور اُس کفر شعار قوم پر اپنے عذاب دردناک کو زلزلہ کی صورت میں اس شدت کے ساتھ نازل فرمایا کہ قوم ثمود میں سوائے متبعین صالحؑ کے اور کسی کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ یہ واقعہ تقریباً ۲۰۰۰ء دنیوی اور ۲۰۰۰ء قبل مسیح کے اُس زمانہ میں واقع ہوا جس زمانہ میں شہر سدوم۔ عمارہ۔ ادماب اور زماحق آسمانی آگ سے جلا دیے گئے تھے۔

بقیہ عبارت حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ غیر سند ہونے کا اظہار کیا ہے۔ باقی رہا کہ پہاڑ کے جوف سے پیدا ہوئی۔ بچہ لیے ہوئے پیدا ہوئی۔ بچہ سرخ بالوں والا تھا۔ بچہ اُسی وقت بڑا اونٹ تھا۔ وغیرہ وغیرہ ایک بھی ستبعاد کے قابل نہیں۔ جب معجزے کے امکان کا پہلے اقرار ہو چکا۔ اُصول الہیاتؔ کی پہلی چیز ہے معرفت۔ جب انسان خدا کی ایسی ستبعد ہستی کا قائل ہو چکا۔ اور اُسکی ذات میں اتنے مستبعات عقلی اور محالات عادی اور ناممکنات فطری کو تسلیم کر چکا۔ کہ وہ سامع ہے۔ مگر اُس کے کان نہیں اور کانوں سے سُننے کی اُسے ضرورت بھی نہیں۔ ناظر ہے۔ مگر آنکھیں نہیں۔ اور نہ آنکھوں سے دیکھنے کا وہ محتاج ہے وغیرہ وغیرہ تو گویا وہ اُسکے تمام صفات و جبروت کے کال ادراک سے سراپا عاجز ہو چکا ہے۔ جب ہی تو اُسکے مقابلہ میں اُنکو ناممکنات کہ اُنکا تسلیم ہی نہیں کرتا۔ بلکہ بدیہات یقینیات اور مشاہدات عینی جانتا ہے۔ تو پھر ایسی حالت میں یہ اگر آدم مٹی سے پیدا کیا گیا۔ فرشتہ اور جن نور اور نار کی تنہا ترکیب عنصری سے مخلوق کیے گئے۔ اور اُن کی ترکیب خلقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں کیا گیا۔ تو پہاڑ یا پتھر سے اونٹ۔ اونٹنی یا اونٹنی کا بچہ پیدا ہو جانے سے کیا تعجب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کہیں زیادہ ستبعد باتوں کی نسبت جنہیں بطور عقیدہ و مسلّمہ خود تحریر فرمایا گیا ہے۔ کوئی تعریض نہیں فرمائی گئی۔ مثل اسکے کہ ایک کڑک کی آواز اور زلزلے کے آثار سے۔ قوم کی قوم۔ قصبہ کے قصبہ کا فنا ہو جانا بتلایا جاتا ہے۔ اور اس کو عذاب الٰہی کی حقیقی صورت کہی جاتی ہے۔ مگر ہیئت و طبیعات کے موجودہ اُصول کے مطابق عذاب الٰہی کے عوض کوہ آتش فشاں کا مادی انشقاق یا عرب کے باد سموم کے معمولی اثر کیوں نہیں ارشاد فرمائے جاتے۔ عرب کا ملک ہی ہے۔ باد سموم کا چلنا ضرور۔ پہاڑ موجود ہی ہیں۔ اُن کے اندر مکانات بنے ہیں۔ پھر اتنے ممکنات عقلی اور عادی کے ہوتے ہوئے غضب الٰہی کے ایسے غیر مشاہدات کو قبول کر لینا۔ موجودہ زمانہ کے عقلا و محققین کی شان کے خلاف ہے۔ مگر ہم اسکے اقرار و تسلیم کی مجبوریوں کو بھی جانتے ہیں

قرآن مجید کی خاص خصوصیات میں ان امور پر ضرور خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ کتب سابقہ کا جسطرح مصدق ہے۔ اسی طرح اُن کے نظر انداز واقعات کی کمی کا پورا کرنے والا اور متمم بھی ہے اور یہی جناب خاتم الانبیاؐ کی ختم رسالت ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اس غرض سے قرآن مجید نے قوم ثمود کے حالات اور جناب صالحؑ کے ارشاد و ہدایات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہ اُس سے پہلے کی کتب مقدسہ اُن کے ذکر سے بالکل خالی تھیں۔

مفصلہ ذیل اقتباسات قرآنی میں مذکورہ بالا حالات ملاحظہ ہوں۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

ثمود کے پاس ہم نے اُن کے بھائی (ہمقوم) صالحؑ کو پیغمبر بناکر بھیجا۔ اُسنے کہا کہ بھائیو خدا کو پوجو۔ اُسکے سوا تمہارا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس خدا کی دلیل آچکی۔ یہ اونٹنی تمہارے لیے خدا کی نشانی ہے۔ اسکو خدا کی زمین میں چرنے دو۔ اسکو دق نہ کرو۔ ورنہ ایک دردناک عذاب تمپر آئے گا

بقیہ عبارت حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ جو سید صاحب مرحوم کی لاحق ہوئیں۔ وہ اسکی قرآن میں موجوگی اور ذکر ہے۔ تو ہم عرض کریں گے۔ کہ اونٹنی کا معجزہ ہونا بھی تو قرآن میں قلمبند ہے۔ جسکو ہم دو متواتر مقامات سے پہلے دکھلا آئے ہیں۔ پھر مزید احتیاط و یاد دہانی کی نظر سے تیسری آیت سے جو پہلی آیتوں سے بھی زیادہ روشن اور واضح ہے دکھلائے دیتے ہیں۔ وہ آیہ یہ ہے۔ مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ ہم نے اُن کے لیے اونٹنی کو معیار آزمائش بناکر نازل کیا خطاب تاکیدی کے ساتھ نزول ناقہ صالحؑ کا باعث خدائے تعالیٰ اپنی ذات خاص کو بتلاتا ہے۔ اور اُسکی آفرینش کو اُنکی آزمائش کی غرض خاص سے مخصوص فرماتا ہے۔ تو اب بھی کیا ناقہ صالحؑ کا بذریعہ معجزہ و بطلب معجزہ و بغرض امتحان کا فرین پیدا ہونا۔ جیسا کہ الفاظ قرآنی سے ثابت ہے۔ اور وہی پرانی کتابوں کی روایتوں میں بھی موجود ہے۔ کیسے بلا سند کہا جائے گا۔ باقی رہی صورت آفرینش ناقہ۔ چونکہ اُن الفاظ کے ساتھ داخل قرآن نہیں۔ جن لفظوں یا حالتوں کے ساتھ روایتوں میں ہے۔ تو یہ بھی اُسکی تغلیط و تکذیب کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ قرآن مجید حقیقتاً نہ تذکرے کی کتاب ہے۔ اور نہ سیرت کی۔ جس میں اخبار قدیمہ کے مفصل حالات سیرت و تاریخ کے اصول کے مطابق تلاش کیے جائیں۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ کہ امم سابقہ کے ایسے حالات پہلے تو عبرت و تنبیہ کی غرض سے ضمناً اور مختصراً بیان ہوئے ہیں دوم کتب قدیمہ کی سکوت کی وجہ خاص سے۔ کیونکہ اُن کی خموشی کو قرآن مجید نے فروگذاشت قرار دے کر ان کی کمی کو پورا اور اُن کے نقص کو کامل کر دیا ہے۔ ورنہ آج ان بزرگواروں کے محاسن خدمات اور تبلیغ رسالت کے واقعات صفحۂ ہستی سے فنا ہو جاتے دُنیا کے محققین اور شائقین اخبار و آثار کی گردنوں پر قرآن کا یہ ایسا عظیم ترین احسان ہے۔ کہ وہ اپنی احسان مندی کے سر اٹھا نہیں سکتے ایسی حالتیں قرآن مجید کو سیر و مذاکرہ کا تفصیلی دفتر خیال کرنا اُس کی عظمت کا استخفاف ہے۔ نعوذ باللہ۔ المولف عفی عنہ۔

حضرت صالحؑ نعمات الٰہی یاد دلاکر قوم کی موعظت فرماتے ہیں :-

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ -

اور یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے عاد کے بعد تم کو خلافت وحکومت بخشی ۔ اور ملک میں تم کو جگہ عنایت کی جسکے میدانوں میں تم محل تیار کراتے ہو۔ اور پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے ہو خدا کی عنایتوں کو یاد کرو۔ اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو۔

مومنین صالحؑ کے ساتھ کافر قوم کے مکالمات :-

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ

قوم کے مغرور سرداروں نے ان کمزوروں سے جو انکی قوم میں مومن تھے پوچھا کہ تم سچ یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ اپنے خدا کی طرف سے پیغمبر ہیں ۔ انہوں نے جواب دیا کہ بیشک صالحؑ جو پیغام لیکر بھیجا گیا ہے۔ اسپر ہمارا ایمان ہے۔

اس ناشنوا قوم کی سیہ قلبی اور بے رحمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا ۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّاصِحِينَ

(اعراف)

مغروروں نے کہا کہ تم جس پر ایمان لائے ہو۔ ہمکو اس سے انکار ہے۔ اسکے بعد انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خدا کے حکم کی نافرمانی کی، اور صالحؑ سے (تعریضاً) کہا کہ اے صالحؑ اگر تم واقعی پیغمبر ہو، تو جس عذاب آنے کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو۔ وہ لے آؤ۔ پس زلزلے نے آکر ان کو پکڑ لیا۔ اور وہ اپنی جگہ پر اوندھے رہ گئے۔ صالحؑ نے ان کی جانب سے منہ پھیرا۔ اور کہا۔ بھائیو۔ میں اپنے خدا کی رسالت یقیناً تم کو پہونچا چکا۔ اور تمہاری خیر خواہی کر چکا۔ لیکن تم اپنے خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔

رسالت صالحؑ اور ان کی نرم موعظت اور صاف اور ستھرے طریقہ ہدایت ۔ ناشنوا قوم اور جاہل وغافل امت کی شامت اور تباہی و بربادی کی آخیر نوبت اجمالی طور پر یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ

ثمود نے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ جب ان کے بھائی صالحؑ نے کہا کہ کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے۔ میں تمہارا رسول امین ہوں خدا سے ڈرو میری بات مانو اور میں تم سے اسکا کوئی معاوضہ بھی نہیں چاہتا میرا معاوضہ پروردگار عالم پر ہے۔ کیا جو نعمت تمکو یہاں حاصل ہے۔ اسی میں تم باطمینان تمام چھوڑ دیے جاؤگے

وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا
فَارِهِينَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ وَلَا تُطِيعُوا
أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ۔ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ
مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ
الصَّادِقِينَ قَالَ هٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ
يَوْمٍ مَعْلُومٍ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ
يَوْمٍ عَظِيمٍ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ فَأَخَذَهُمُ
الْعَذَابُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ
مُؤْمِنِينَ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ

(الشعراء ع)

ان باغوں۔ کھیتوں۔ اور چشموں میں۔ اور اُن کھجوروں کے درختوں میں جنکے خوشے نرم ہیں۔ اور پہاڑوں کو کاٹ کر تم بڑی بڑی عمارت بناتے ہو۔ پس خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور سُنو اور انکی نہ سُنو جو حد سے گذر چکے ہیں۔ جو ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ صلح نہیں۔ اُنہوں۔ (کافروں) نے کہا۔ کہ تم پر جادو کردیا گیا ہے۔ تم تو ہماری ہی طرح ایک آدمی ہو۔ کوئی نشانی لاؤ اگر سچے ہو۔ اُس نے کہا یہ اونٹنی ہے۔ اسکے لیئے پینا ہے۔ اور تمہارے لیئے ایک مقرر دن کا پینا۔ اسکو چھیڑو نہیں۔ ورنہ ایک بڑا عذاب تم پر آئے گا۔ اُنہوں نے اُسکی کونچ کاٹ ڈالی پھر نادم ہوئے۔ پس عذاب نے اُنکو آلیا۔ یقیناً اس میں عبرت کی نشانی ہے اور اُنمیں سے اکثر مومن نہ تھے۔ اور خدا تو غالب اور رحم والا ہے۔

حضرت صالحؑ اور اُن کے متبعین مومنین کے قتل کرنے کی مشورت :۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلٰى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صٰلِحًا أَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ قَالَ
يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ
لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ قَالُوا
اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَعَكَ قَالَ طَائِرُكُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ
تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُونَ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ
ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ
وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا
وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ
أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ
خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ وَ

اور البتہ ہم نے بھیجا۔ ثمود کے پاس اُنکے بھائی صالحؑ کو کہ خدا کو پوجو۔ ناگہاں وہ دو فریق ہو کر جھگڑنے لگے۔ صالحؑ نے کہا۔ کہ بھائیو نیکی سے پہلے برائی۔ اور وہ بھی بہت جلد کیوں چاہتے ہو۔ کیوں خدا سے مغفرت نہیں چاہتے۔ شاید تم پر رحم کیا جائے اُنہوں نے کہا کہ ہم نے تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے شگون لیا۔ اُس نے (صالحؑ نے) کہا کہ تمہارا شگون خدا کے پاس ہے۔ بلکہ تم لوگ آزمائش میں ڈالے جاؤگے۔ شہر میں نو آدمی تھے۔ جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے صلح نہیں۔ اُنہوں نے کہا آؤ۔ باہم خدا کی قسم کھائیں۔ کہ ہم صالحؑ اور صالحؑ کے خاندان پر شبخون ماریں۔ پھر اُس کے وارث سے کہدینگے کہ اُس کے خاندان کے قتل میں تو ہم شریک بھی نہ تھے۔

اُنہوں نے مخفی تدبیر کی۔ خدا نے بھی مخفی تدبیر کی۔ اور اُنھیں خبر نہیں پس دیکھو اُنکی مخفی تدبیروں کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے اُن کو اور اُنکی قوم سب کو برباد کر دیا۔ یہ ہیں۔ اُنکے گھر اور مسکن جو اُنکی گنہگاری

وَاَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝

(نمل)

کے باعث ویران پڑے ہیں۔ اس میں جانتے والوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ اور ایمان کو ہم نے اجازت دی کہ پرہیزگار تھے۔

قوم ثمود کی ضلالت شعاری پر عبرت و تنبیہہ فرمائی جاتی ہے۔ اور پیغمبر کے حق میں اُن کی دریدہ دہنی دکھلائی جاتی ہے۔

کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِیَ الذِّکْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ ۚ کُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ۝ فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَکَانُوْا کَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ (قمر)

ثمود نے ہماری تنبیہوں کو جھٹلایا۔ اور بولے کہ ہم سے ایک آدمی ہے اُسکی ہم پیروی کرنے جائیں تو اُسوقت ہم گمراہ اور مجنون ہونگے۔ کیا ہم لوگوں میں سے وہی اُسی پر چُن کر آئی ہے۔ نہیں وہ جھوٹا اور مغرور ہے۔ ہم اونٹنی کو اُن کے لیے استحان بنا کر بھیجتے ہیں۔ اے پیغمبر تو بھی تاک میں رہ۔ اور اُنھیں خبردار کر دے کہ پانی اُن میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ہر ایک کا پانی الگ موجود ہے اُنہوں نے اپنے ساتھی کو بُلایا۔ اُسنے پکڑا۔ اور کونچ کو کاٹا۔ پھر میرا عذاب اور میری دھمکی کیسی تھی۔ ہم نے اُن پر ایک چیخ بھیجی جس کے اثر سے وہ پامال بھُس کی طرح ہو کر رہ گئے۔

جناب ہودؑ کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ کافروں کی سیہ بخت قوم اپنے پیغمبر کے بار بار سمجھانے اور دلائل حقہ کے جھٹلانے سے عاجز آجاتی تھی۔ تو استحقاق قرابت۔ ہمقومی اور ہم وطنی پیش کر کے اُس حجت الٰہی کو تبلیغ رسالت سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسوقت اُن کی شان ملتجانہ اور عاجزانہ ہوتی ہے۔ نہ مغرورانہ نہ سرکشانہ۔ جناب صالحؑ کے ساتھ بھی ایسے ہی معاملات پیش آئے۔ مفصلہ ذیل الفاظ قرآنی سے ہمارے بیانات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝ (هود)

ثمود کے پاس ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اُس نے کہا کہ بھائیو! خدا کو پوجو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ اُسنے تمکو زمین سے پیدا کیا۔ اور زمین ہی پر تم کو آباد کیا۔ اُس سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگو۔ پھر اُسکی طرف رجوع کرو۔ میرا پروردگار (سب کے) قریب ہے۔ اور (سبکا) قبول کرنیوالا ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ صالحؑ ہمکو اس سے پہلے تمہاری ذات سے بڑی توقع تھی۔ تم ہمکو اس چیز سے روکتے ہو جسکو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے۔ تم جسطرف ہمیں بلاتے ہو۔ اُس میں تو ہم کو بڑا شک ہے۔

وہ خدا کا برحق پیغمبر کس متانت و استقلال سے اُن کی گمراہانہ تحریص و تعریض کا جواب دیتا ہے۔ اور عذاب الٰہی سے بچنے اور توبہ و انابت کرنے کی غرض سے صرف اُن کو تین دن کی مہلت ملنے کا آخر حکم خداوندی سناتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ
اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ
وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا
تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
عَذَابٌ قَرِيْبٌ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ
دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ

(ھود)

صالحؑ نے کہا بھائیو۔ تم سمجھتے ہو۔ اگر خدا کی طرف سے میں بصیرت پر ہوں، اور اُسنے اپنی رحمت سے مجھکو اُس میں سے کچھ عنایت کیا ہے۔ تو اگر میں اس کی پیغام رسانی میں اُس کی نافرمانی کروں تو خدا سے بچانے میں میری کون مدد کریگا۔ تم تو صرف میرا نقصان بڑھاؤگے اور ہاں اے بھائیو۔ یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے، اسکو زمین پر چرنے دو۔ اور اُسکے ساتھ بُرائی نہ کرو۔ ورنہ خدا کا عذاب بہت جلد تم کو آئے گا۔ اُنہوں نے (جب) اُس کی کونچ کاٹ ڈالی تو صالحؑ نے کہا کہ اپنے گھر میں تین دن اور لطف اٹھالو۔ یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے۔

قوم ثمود کے سیہ بخت کفار اس آخری تنبیہ و تہدید پر بھی باز نہ آئے۔ بالآخر قدرت کو فیصلہ کرنا ہوا۔ کافرین ایک ایک کرکے تباہ کر دیے گئے۔ جناب صالحؑ اور اُن کے مومنین تابعین بال بال بچالیے گئے۔ ذیل کے اقتباسات قرآنی سے ان حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ
رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ
كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ
اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ۔		(ھود)

جب ہمارا حکم آیا۔ تو ہم نے صالحؑ اور جو اُسکے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے اُن کو ذلّت و خواری سے نجات بخشی بیشک تیرا پروردگار زبردست اور غالب ہے۔ اور گنہگاروں کو چیخ نے آلیا۔ پس اپنے گھر میں سینہ کے بل پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی وہ ان گھروں میں آبادہی نہ تھے۔ ہاں ثمود نے اپنے پروردگار کو نہ مانا۔ ہاں ثمود کے لیے ہلاکت ہو۔

یہی باقیات الصالحات۔ جو حضرت صالحؑ پر ایمان لائے۔ اور اُن کے ساتھ تباہی و بربادی سے بالکل محفوظ رہے۔ وہی معمورۂ عالم میں ثمود ثانیہ کے تخصیصی اور امتیازی لقب سے مشہور ہوئے۔

ثمود ثانیہ کے تاریخی حالات

تاریخ کے کارناموں میں عاد ثانیہ سے ثمود ثانیہ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ اسلیئے کہ دیگر اقوام قدیمہ سے وہ قریب

بستے تھے۔ اور زمانہ تہذیب و تمدن سے بھی اُن کے زمانہ کو قربت تھی۔ اسی باعث سے انکا ذکر اسیریا (شام) اور روم کے اخبار و آثار دونوں میں پایا جاتا ہے۔

روم کی تاریخ میں۔ روی مسیح سے کچھ یونہی پہلے عرب سنگستان پر جو مقام ثمود سے متصل ہے۔ اور اسوقت انباط اور ادوم اُن اطراف کے ممتاز قبائل تھے۔ قابض تھے۔ (Bevdn P.173)

سرجون یا سرغون ثانی نے فتح عرب کا جو کتبہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اور جسکو اس تاجدار شام نے اپنی فتح مندی اور قوت سلطنت کا معیار قائم کیا ہے۔ اُس میں محض مفاخرت کے اظہار سے قوم مفتوح کا بھی نام لکھا ہے۔ اسی فہرست اقوام مغلوبہ میں۔ ثمود کا نام بھی مندرج ہے Forester Vol II P.125

روم و یونان کے مورخین ہیں۔ ڈائڈورس (Dydorius) (۸۰ سنہ ق م) پلینی Pleny (۹۷ء) اور بطلیموس (Plotomy) (سنہ ۱۴۰ء) نے ثمود کا ذکر کیا ہے۔ ڈائڈورس نے ثمود کا تلفظ تھموڈینی (Thamudani) کیا ہے۔ اور بطلیموس نے تھموڈائٹ (Thamudik) کیا ہے۔ اور ابھی تک تمام یورپین زبانوں میں اسی تلفظ کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ان غیر قومی مورخین نے جو مساکن اور مواطن ثمود ثانیہ کے اپنی کتابوں میں بتلائے ہیں۔ وہ بالکل وہی ہیں۔ جو عرب کے قدیم مورخین نے اپنی ملکی روایات کے اسناد سے لکھے ہیں۔

ایک دوسرا یونانی مورخ اوردینوس (Urdnus) ثمود کے ذکر میں لکھتا ہے۔

رومیوں نے جب عرب شمالی پر قبضہ کیا۔ تو ثمود رومیوں کی فوج سواروں میں داخل ہو گئے تھے۔ قیصر جسٹنین (Justinian) کے عہد میں (۵۲۷ء سنہ ۵۶۵ء) ثمود بھی رومی افواج میں داخل تھے۔ انکے لمبے نیزے اور سواری کے اونٹ مشہور تھے۔ Gibbons vol. I

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ثمود کے ملک کا اکثر حصہ چونکہ اہل مدین نے پہلے دبا لیا تھا۔ اور باقی حصہ پر بعد کو انباط قابض ہو گئے تھے۔ اور رومی انباط کے خلاف عرب پر فوج ارادہ رکھتے تھے۔ اور اس ارادہ کو انھوں نے پورا بھی کیا۔ اس تقریب سے عجب نہیں کہ انباط کی مخالفت میں ثمود نے رومیوں کا ساتھ دیا ہو

تاہم تعجب ہوگا۔ کہ ثمود کا ذکر توراۃ میں نہیں۔ لیکن توراۃ کی تحریر معین جاننے کے بعد یہ تعجب رفع ہو جائیگا توراۃ کی تاریخ بدء عالم سے حضرت یعقوبؑ (بنو ابراہیمؑ) تک محدود ہے۔ اس کے بعد ہجرت مصر کا واقعہ ہے۔ جو تقریباً سنہ ۱۶ ق م میں واقع ہوا ہوگا۔ اس زمانہ سے تا عہد موسیٰؑ جو تقریباً ۴۵۰ برس کا زمانہ ہے۔ جو توراۃ کی کامل خاموشی کا زمانہ ہے۔ اور از روے تاریخ ثمود کے عروج و زوال کا یہی

زمانہ ہے۔ اس کے بعد توراۃ میں صرف اُن غیر اقوام کا ذکر ہے۔ جن سے بنی اسرائیل کے سیاسی تعلقات تھے۔ اور یہ رتبہ ثمود کی جگہ اب مدین کو حاصل تھا۔ جو ثمود اولیٰ کے جانشین تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ...۹ یا .... ق م میں اہل مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیتہً برباد ہوگئے۔ تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک سنبھالا لیا۔ اور یہ وہی زمانہ ہے۔ جس میں شاہ اشور (اسیریا) نے شمالی عرب پر حملہ کرکے ثمود سے ۷۱۵ ق م میں خراج وصول کیا تھا۔ اس کے بعد ظہور مسیح سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کرلیا۔ اس کے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا۔ تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہوگئے۔ اور اسی خصوصیت سے تاریخ میں ثمود کا ذکر آیا۔

اسلام جب آیا۔ تو ثمود کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ یہاں قبائل جُہَینہ۔ ذُبی۔ اور یہود اُس وقت آباد تھے۔ عجب کیا کہ انباط نے خیانت وطنی کی سزا میں اُن کو برباد کر دیا ہو۔

طسم وجدیس۔ عرب کے دو مشہور و قدیم قبائل

یہ دونوں قبائل یمامہ میں رہتے تھے۔ یہ کلبی کی روایت ہے۔ اور زیادہ مشہور ہے۔ مورخ ابن خلدون نے ان کو بحرین میں جگہ دی ہے۔ صحیح یہ ہے۔ کہ خلیج فارس پر یمامہ۔ بحرین اور عمان کے نام سے جو شہر آباد ہیں۔ طسم وجدیس کی آبادی ان سب پر مشتمل تھی۔ حقیقتاً قوم عاد کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے سیاسی قوت اولاً طسم کے ہاتھ میں تھی۔ ایک زمانہ کے بعد عملوق نام ایک ظالم بادشاہ تخت نشین ہوا۔ جس نے اپنے شرمناک قواعد سے۔ قبائل جدیس کو برہم کردیا۔ بالآخر جدیس کی ایک خاتون عروس نے قبیلہ کو غیرت دلائی۔ یہ غیرت آگ بن کر اُٹھی۔ طسم نے شاہ یمن سے مدد مانگی۔ اُس نے جدیس کو شکست دیدی۔ آخر قبائل کی باہمی نااتفاقی نے ملک غیروں کے سپرد کردیا۔ ابوالفداء۔ طبری اور ابن ہشام واغانی وغیرہم۔

یونانیوں نے قبائل عرب میں سے ایک کا نام جولسٹی (Jolistai) لکھا ہے۔ شاید اُس سے جدیس مراد ہو۔ طسم کا نام ہلاکت وبربادی کی عبرت کے لئے اس قدر مشہور ہوگیا ہے۔ کہ عربی زبان میں۔ طسم کے معنی "ہلاکت وبربادی" ہوگئے ہیں۔ عرب جاہلیت کا ایک شاعر سلمی ابن ربیعہ کہتا ہے

اھلکن طسما و بعدہ ۔ غذی بھم وذاجدون ۔ و اھل جاش و مآرب ۔ وحی لقمان والتقون

ترجمہ۔ حوادث زمانہ نے طسم کو۔ اور اُسکے بعد ذاجدون شاہ یمن کو اور اہل جاش اور اہل مآرب کو اور قبیلہ لقمان کو........ ہلاک کیا۔

اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طسم کا زمانہ سبا (اہل مآرب) اور عاد ثانیہ (دحی لقمان) سے متقدم تھا۔ تعجب ہے۔ کہ اس تفصیل مدت اور تعین زمانہ کے بعد بھی مورخین عرب نے اُس بادشاہ یمن کا زمانہ قایم کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو جدیس کے خلاف میں طسم کی امداد کے لیے آیا تھا۔ مورخین عرب نے اس شاہ یمن کا نام تبع حسّان یا حشان (باختلاف روایت لکھا ہے۔ اور یہ یقیناً غلط ہے۔ ایک طرف یہی ارباب روایت ان قبائل کو اتنا قدیم ٹھراتے ہیں۔ کہ ان کو ارم کی طرف بدو واسطہ اولاد قرار دیتے ہیں۔ یعنی تین یا چار ہزار ق۔م۔ ان کا زمانہ بتلاتے ہیں۔ اور یا اسقدر پیچھے کرتے ہیں۔ کہ تبابعہ یمن کا معاصر قرار دیتے ہیں۔ جس کا زمانہ ۱۱۵ ق۔م سے اُوپر نہیں جاتا۔ غالباً تبع یمن سے عام شاہ یمن مراد ہے۔

یمامہ کا قدیم نام جوّ ہے۔ لیکن زیادہ تر اپنے قصبۂ حکومت کے نام سے مشہور ہے۔ جسکا نام "قریہ" اور "حجر" ہے۔ قریہ اور حجر لفظ دو ہیں۔ لیکن معنی ایک ہیں۔ ابن الحائک ہمدانی یمنی جو عرب کی قدیم زبانوں سے واقف تھا۔ کہتا ہے۔ کہ ان دونوں لفظوں کے معنی آبادی کے ہیں۔ قدیم عربی میں حجر لفظ تھا۔ بعد کی عربی زبان میں اس کے لیے قریہ کا لفظ استعمال ہوا۔ جو حجر کا بعینہ ترجمہ ہے۔

یمامہ میں۔ آثار قدیمہ کے نشان جغرافیہ نویسان اسلام کے عہد تک باقی تھے۔ اور اُنہوں نے خود اُنکو مشاہدہ کیا تھا۔ نجران اور بحرین کے درمیان ایک پہاڑی ہے۔ اُسپر مشقر نام ایک قلعہ ہے۔ جو طسم کی طرف منسوب ہے۔ ایک اور عمارت ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ جسکا نام معنق۔ وہ بھی طسم ہی کی یادگار ہے۔ تموس بھی اسی قسم کی ایک عمارت ہے۔ قریہ بنی سدوس۔ یمامہ میں ایک مقام ہے یہاں اوپر سے نیچے تک تراش کر پتھر کی ایک پوری عمارت بنائی گئی ہے۔ ایک اور عمارت قبل حجر کے نام سے ہے۔ اس عمارت کا حصہ زیرین مربع الشکل ہے۔ اور بلندی ۸۰ ہاتھ کے قریب ہے۔ جعدہ نام ایک اور قلعہ یہاں بنائے قدیم کی یادگار ہے۔ ان تمام عمارات و مقام کے نام معجم البلدان یاقوت میں موجود ہیں۔ خدا جانے ان آثار کا اب کس قدر حصہ باقی ہے۔ تاہم اگر یہ کل یا ان میں سے بعض بھی طسم و جدیس کے مصنوعات ہوں تو ان قبائل کی عظمت و تمدن کے دلائل نہایت واضح ہیں

ان مقامات پر یونانیوں یا رومیوں نے کبھی حملہ نہیں کیا۔ سکندر کے بعد جب عراق میں سلوقی (سلوکس) خاندان قایم ہوا۔ تو اس نے صرف ایک بار ۲۰۵ ق م میں اہل قریہ پر تھوڑی سی فوج کے ساتھ حملہ کی جرأت کی تھی۔ قبائل قدیمہ یمامہ و بحرین کی بربادی کے بعد ایک مدت تک یہاں ویرانی رہی۔ تا آنکہ اسمٰعیلی اور قحطانی عربوں نے اُدھر رُخ کیا۔ ربیعہ اسمٰعیلی کی ایک شاخ

عنزہ ابن اسد اور کہلان قحطانی کی بعض اولاد نے بحرین پر اور بنو حنیفہ نے یمامہ پر قبضہ کیا۔ اسلام آیا تو بحرین فارس کے قبضہ میں تھا۔ اور اُن کی طرف سے ایک عرب خاندان نائب حکومت تھا اور یمامہ بدستور بنو حنیفہ کے قبضہ میں تھا۔ اوّل نے برغبت دعوت اسلام قبول کی۔ اور ثانی خلافت اولیٰ کے زمانہ میں ایک جنگ عظیم کے بعد مطیع ہوا۔ ارض القرآن۔ ذکر طسم وجدیس ج ۱ ص ۲۰۶۔

عرب البائدہ اور اُن کے مختلف اور مشہور ترین قبائل و شعائر کے تمام و کمال حالات بیان کرکے ناظرین کے مزید اطمینان کے لیے ہم اُن کے سلسلہ کا شجرۂ نسب ذیل میں تیار کرکے دیتے ہیں۔ جس سے اُن کے اصل و فرع قبائل و اقوام آسانی سے معلوم ہو جائے گی۔

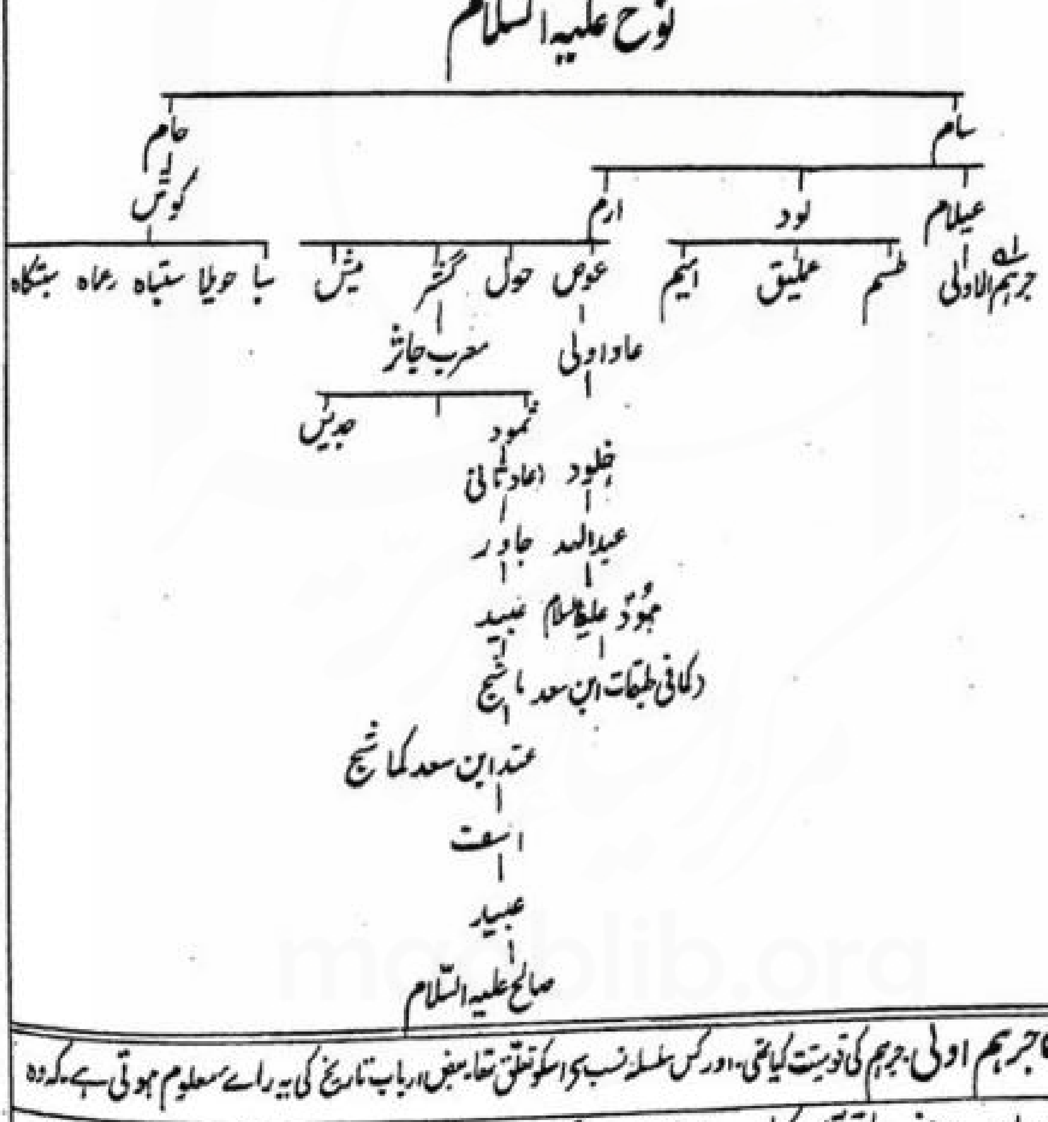

[1] جرہم اولیٰ جرہم کی قومیت کیا تھی۔ اور کس سلسلۂ نسب سے اسکو تعلق تھا۔ بعض ارباب تاریخ کی یہ رائے معلوم ہوتی ہے کہ وہ

ع صاحب ارض القرآن کی طسم وجدیس کے حالات میں تحقیق بہت ہی بیش قیمت اور قابل منت گزاری ہے۔ ورنہ آپ کے اُستاد شمس العلماء نعمانی نے تو ان اقوام و قبائل کے حالات کو سیرۃ النبیؐ میں بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کاش آپ ہی سے دریافت فرما لیتے!

عرب العاربہ (عرب متوطن)

عرب العاربہ یا عرب متوطن۔ یقطان ابن عابر بن صالحؑ بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اس لیے یہ صحیح ہے۔ کہ عرب العاربہ بھی عرب البائدہ سے علیحدہ اور غیر قوم نہیں ہیں۔ بلکہ عرب البائدہ کے اُس شجرہ میں جو ابھی اوپر قلمبند ہوا ہے۔ اُس میں سام کے تین بیٹے دکھلائے گئے۔ عیلام۔ لود اور ارم اور یہی گویا عرب البائدہ کے مورث اعلیٰ ثابت ہوئے ہیں۔ اُنہی تینوں بیٹوں کے ساتھ سام کے چوتھے بیٹے۔ ارفخشذ بھی قایم ہوتے ہیں۔ جن سے عرب العاربہ کا نسب نامہ ملتا ہے۔ اس بنا پر عرب البائدہ اور عرب العاربہ اگرچہ فرعاً جدا سمجھے بھی جائیں۔ تو اصلاً ایک ہی ہیں۔

یقطان۔ عبرانی لفظ ہے۔ عرب اسی کو قحطان کہتے ہیں۔ توریت مقدس کے کتب خمسہ میں یہ لفظ یقطان مرقوم ہے۔ اور انجیل میں۔ جو یقطان "جو" کے قلیل اضافہ کے ساتھ۔ محقق ریونڈ مسٹر فارسٹر Rev. Mr. Forestor نے نہایت مستحکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ ان تینوں نام۔ قحطان۔ یقطان اور جو یقطان سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ جسکو عرب قحطان کہتے ہیں۔ موسائی یقطان۔ اور عیسائی۔ جو یقطان۔

بعض مورخین کا یہ قول کہ عرب البائدہ اور عرب العاربہ دونوں قحطان کی نسل سے ہیں۔ اسی طرح صحت سے قطعی ساقط ہے۔ جس طرح سیرت ابن ہشام میں بعض اہل یمن کا یہ دعویٰ۔ کہ بنو قحطان بھی بنی اسمٰعیل میں داخل ہیں۔ مسٹر فارسٹر کے علاوہ یورپ کا مشہور و معروف برک ہرٹ اور سر ولیم میور بھی اس امر پر متفق ہیں۔ کہ قحطان ہی کی اولاد تمام عرب میں پھیلی۔ اس لیے تمام عرب اسی شخص کی اولاد میں داخل ہیں۔ ہمارے نزدیک یقطان کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کا نام لینا بھی ضرور ہے۔ ورنہ تحقیق میں نقص رہ جاتا ہے۔ ابن ہشام نے اس مقام پر پورے غور سے

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ۔ نبا اُمم سامیہ اولیٰ سے تھا۔ اور بعض اسکو قحطان کی نسل سے بتلاتے ہیں۔ عام مورخین نے دونوں خیالوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اور بتلایا ہے۔ کہ جرہم دو تھے۔ جرہم اوّل اور جرہم ثانیہ قحطان کا بیٹا۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا پڑوسی اور رشتہ دار تھا۔ جرہم کا دوسرا بھائی یعرب بن قحطان یمن کا مالک تھا۔ اور جرہم بن قحطان کے حصہ میں حجاز کا ملک دیا گیا تھا۔ تاریخ یعقوبی میں ہے فکان ولہ جرہم بن عابر لما صار اخوتھم من بنی قحطان بن عابر الی الیمن اس سے ظاہر ہے۔ کہ جرہم قحطان کا بیٹا نہ تھا۔ بلکہ برابر کا بھائی تھا۔

کام لیا ہے۔ اور لکھدیا ہے۔ فالعرب کلھا من قحطان و اسمٰعیلؑ تمام عرب قحطان اور اسمٰعیلؑ کی نسل ہیں۔
قحطان کی جائے سکونت۔ توریت میں میشا سے لیکر سُنفار تک بتلائی گئی ہے۔ سُنفار یا سُنفار
شرق میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔ مسٹر بروک ہرروط کی تحقیق میں۔ میشا اور سوزہ۔ جو یقطانی قوم
سبا کا خلیج عرب کے دہانے کے قریب ایک بندرگاہ ہے۔ ایک ہی مقام ہیں۔ اور سُنفار سے یمن کا وہ
کوہستانی حصہ مراد ہے۔ جہاں جغرافیہ بطلیموس کے شہر سنفار اور قوم صفار آباد تھی۔ ان حدود کے
اعتبار سے یہ قطعہ زمین رقبہ میں کل ڈیڑھ سو میل ہوتا ہے۔ اس بنا پر فارسٹر صاحب کو تامل ہے
کہ ایسے تنگ علاقہ میں قحطان کی کثیر التعداد اولاد کیسے آباد ہوئی ہوگی۔ اس لیئے وہ خواہ مخواہ
علاقہ نجد میں اور اُس کے پاس والے اندرونی حصہ میں پھیل گئے ہونگے۔ یہ حقیقتًا صرف قیاسی استدلال
ہے۔ توریت میں اُن کے مقام و سکونت کا سمت تبلا دیا گیا ہے۔ اُنکے موطن و مسکن کی اصلی حد اور
خاص رقبہ محدود کردیا گیا ہے۔ جس میں کسی قیاسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔
قحطان کے تیرہ بیٹے تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ الموداد[1]۔ شلف[2]۔ حضر ماوت[3]۔ یرج[4]۔ یدورام[5]۔
اوزال[6]۔ رقلاہ[7]۔ عوبال[8]۔ ابیمائیل[9]۔ شبا[10]۔ اوفر[11]۔ ویلاہ[12]۔ اور یوباب[13]۔ ان میں سے ہر ایک
کے حالات اور سکونت کے مقامات علیحدہ علیحدہ ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔
(۱) الموداد۔ اس شخص کا خاندان یمن میں یا عرب المعمور میں۔ اور اُس ضلع میں جو بحرین تک
چلا گیا ہے۔ آباد ہوا۔ اور اُس الموداؔئی سے مطابقت رکھتا ہے۔ جس کو بطلیموس نے یمن کی
ذرسیانی قوم لکھا ہے۔
(۲) شلف۔ یہ شخص کوہ ذراس کے مغربی حصہ میں یا اُس وسیع میدان میں جو درمیان کاظمہ اور
مدینہ کے مابین واقع ہے۔ آباد ہوا۔ یہ قوم بطلیموس کی بیان کی ہوئی سالفنی قوموں سے
مطابقت رکھتی ہے۔ عربوں میں یہ قوم بنی سالف مشہور ہے۔ جو عبرانی نام شلف کی عربی شکل ہے
(۳) حضر ماوت۔ اِس قوم نے اپنی سکونت کے لیئے دو زرخیز قطعات زمین کو جو خلیج
فارس کے برابر برابر پھیلے ہوئے ہیں۔ اختیار کیا تھا۔ اور وہ آج تک حضر موت اُن کے اصلی
نام سے یادگار ہیں۔ یہ لوگ رومیوں کے نزدیک اور یونانیوں کی کتابوں میں اپنی وسیع تجارت
فن جہازرانی اور معرکۃ الآرا جرائت و بہادری کے لیئے مشہور تھے۔
(۴) یرج۔ اس شخص کا حال ہم سب سے آخر میں لکھیں گے۔)
(۵) یدورام۔ اس کی اولاد نے مشرقی حصہ ملک میں جگہ لی۔ اور وہیں آباد ہوئے۔ قصبۂ ہدریہ

اس قوم کی یادگار ہے۔ مورخ ابو الفدا کا بیان ہے۔ کہ صوبہ دار قراسطاب کی بنا اسی قوم سے ہوئی تھی
(۶) اوزال۔ یہ خاندان۔ اوزال میں آباد ہوا۔ جسے اب صنعا کہتے ہیں۔ جو علاقہ یمن
کا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ (کتاب حزقیل باب ۲۷، درس ۱۹)
(۷) وقلاہ۔ یہ قوم بھی یمن میں آباد ہوئی۔ ذو الخلاعہ جو یمن کی ایک قوم ہے۔ اور جسکا ذکر
سٹر پوکاک (Mr Pococke) نے بھی کیا ہے۔ اسی کی اولاد میں ہے۔
(۸) عوبال۔ اسکا نشان عرب میں نہیں پایا جاتا۔ مگر فارسٹر صاحب بتلاتے ہیں۔ کہ یہ قوم افریقہ کو چلی گئی
(۹) بیمائیل۔ بہت سے مختلف آثار جو مختلف اشخاص نے اس قوم کی سکونت کے متعلق
بتلائے ہیں۔ وہ اسکے شاہد ہیں۔ کہ یہ قوم بنی سالف کے مقام سکونت اور حجاز کے قرب وجوار میں متوطن تھی
(۱۰) شبا۔ اگرچہ یہ قبیلہ بھی جنوب کی طرف جا بسا۔ اور یمن میں سکونت پذیر ہوا۔ مگر یہ شبا
وہ شبا نہیں ہے۔ جس نے یمن میں خاندان سبا کی سلطنت قایم کی۔ اکثر مورخین عرصہ دراز تک اس
غلطی میں پڑے رہے۔ اور دونوں کو ایک ہی سمجھتے رہے۔ وہ دوسرا شبا عرف عبدالشمس تھا۔ جسنے
خاندان سبا کی سلطنت قایم کی۔ اور شہر مآرب اور شہر سبا کو بنایا۔ جسکا ذکر آگے آئے گا۔
(۱۱) اوفر۔ یہ قوم عمان میں جو سبا کے پورب ہے۔ آباد ہوئی۔ چنانچہ شہر اوفر میں اُن کے نشانات
آجتک پائے جاتے ہیں۔ (توریت کتاب الملوک باب ۹ درس ۲۵)
(۱۲) حویلاہ۔ یہ شخص ٹھیک شمال میں شہر مآرب کے آباد ہوا۔
(۱۳) یوباب۔ یہ بھی مآرب کے جانب روانہ ہو کر اُسی نواح میں آباد ہوا۔ قوم جوبانی۔ جس کا
بطلیموس نے ذکر کیا ہے۔ اور جس کو بنی جوبار کہتے ہیں۔ اُسی کی اولاد ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

جرھم کے تحقیقی حالات

جرھم۔ جر توضیح بالا پسران قحطان کے ذکر غیر اسلامی مورخین کے تالیفات سے مستنبط کیے گئے ہیں۔
حقیقت میں عربی مورخین قحطان کے اِتنے بیٹوں میں سے صرف دو بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔
یعرب اور جرھم کا چند مورخین کی رائے ہے۔ کہ یعرب اور یرح سے ایک ہی شخص مراد ہے
اگرچہ یہ قاعدہ ہے۔ کہ عربی میں جیم اور ے کا تبادلہ ہوتا ہے۔ مگر تاہم جرہم کے متعلق مورخین کی
رایوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ اور کوئی کچھ۔ لیکن بالآخر جمہور کا اِسپر اتفاق ہو چکا
ہے۔ کہ یعرب اور جرہم دونوں یرح کے بیٹے تھے۔ یوروپین مورخین جان اسٹرابو۔

مشہور مترجم قرآن (John Strabo) اور مسٹر جارج سیل (George Sale) بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن مورخ ابوالفدا اپنی تاریخ میں ایک مقام پر یعرب اور جرہم کو دو مختلف اشخاص بیان کرتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر جہاں وہ مختلف اقوام عرب کے متفرق شعبوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہاں جرہم کو تنہا تمام عرب کا مورث اعلیٰ بتلاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ وہ بھی یعرب اور جرہم دو متفرق ناموں سے ایک ہی شخص مراد لیتا ہے۔ اور حقیقتاً یعرب کی بہت سی شاخیں بنی جرہم میں آکر مل جاتی ہیں۔

بہرحال شرقی مورخین نے اس مسئلہ کو بالکل غیر منفصل چھوڑ دیا ہے۔ مگر فارسٹر صاحب نے بڑی قابلیت سے اس کو ثابت کیا ہے۔ کہ جرہم اور یعرب ایک ہی شخص تھے۔ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں لکھدیا ہے۔ کہ اکثر مترجموں نے اس نام کو جرح لکھا ہے۔ سینٹ جروم St Jeroum نے جیرا۔ اور حال کے عربوں نے جرح۔ سرح۔ شرح۔ اور زہران لکھا ہے۔ پھر بقاعدہ نحبی ان ناموں کی مطابقت بیان کرکے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں:

علی العموم جو شہادت کہ خود عرب بھی اپنے جرہم کو پسر قحطان کے ساتھ دیتے ہیں۔ اس کی تصحیح و تصدیق کتاب بطلیموس میں غیر مبدل تورانی نام کے درج ہونے سے واقع ہوئی ہے۔ اور یہ ایک ایسی مثال ہے جس کا ہمکو بارہا حوالہ دینا پڑا۔ یعنی بطلیموس کے اس فقرے کا۔ انسیولاجرا۔ جیوری۔ جسکا ترجمہ ہے۔ جزیرہ بنی جرھ جو حجاز کے کنارے سے دور ایک جزیرہ ہے۔

مرقومہ بالا دلائل کی رو سے جرہ اور جرہم کی مطابقت تسلیم کرلینے میں ہمیں بھی کوئی کلام نہیں چنانچہ عرب العاربہ کے شجرہ انساب میں ہم ان دونوں کو ایک ہی شخص قرار دیکر یعنی یرح۔ یا یعرب۔ جرھ یا جرہم ان کا شجرہ لکھیں گے۔ حقیقت میں عرب العاربہ کی تاریخ اس شخص کی اولاد اور ان کے اولاد و اعقاب سے پُر اور مملو ہے۔ کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ یہ اسی شخص کی اولاد و ذریات تھے۔ جنہوں نے مختلف قوم و قبائل میں منقسم ہوکر بڑے بڑے کارنمایاں کیے۔ اور زبردست سلطنتیں اپنی اعلیٰ تدبیر اور بیش بہا انتظام ملکی کی کامل لیاقت اور پوری مہارت کے ثبوت میں قائم کیں۔ جنکو ہم بڑی تلاش و تحقیق سے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ مگر قبل اسکے کہ ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان کو شروع کریں۔ ہم کو یہ بتلادینا ضروری ہے۔ کہ ان کی سلطنتوں کا صحیح زمانہ بتلانا مشکل ہے اول تو اس وجہ سے کہ ان حالات کا استنباط اکثر زبانی اور سینہ بسینہ ماخذوں سے کیا جاتا ہے۔ جو غلطیوں سے خالی نہیں کہے جاسکتے۔ دوسرا ماخذ مورخین عرب کے اقوال ہیں۔ ان کا حال یہ ہے

کہ ان کا تمام سرمایہ توریت کے یونانی ترجمہ پر منحصر ہے۔ یونانی ترجموں کی یہ حالت ہے۔ کہ جب اصل عبرانی عبارت توریت سے ملائے جاتے ہیں۔ تو زمانوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ عیسائی ملکوں میں یونانی ترجموں پر عبرانی ترجموں کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے۔ اور عبرانی توریت کے زمانہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ اس کے زمانے بھی شبہوں سے خالی نہیں۔ تیسری دقت یہ آگئی ہے۔ کہ مورخین عرب نے عبرانی اور یونانی دونوں ترجموں کی زبانوں کو ایسا خلط ملط کر دیا ہے اور اس وجہ سے اُس زمانہ کے تاریخی سلسلہ میں ایسی گتھی ڈالدی ہے۔ کہ واقعات کا سلجھانا دشوار ہوگیا ہے۔ پھر اِسکے ساتھ ایک عجیب و غریب اضافہ یہ کرتے ہیں۔ کہ کسی واقعہ میں تو اپنی زبانی اور یادداشت کے مطابق اُسکا زمانہ قائم کرتے ہیں۔ اور کسی میں محض یونانی ترجموں کا دیا ہوا وقت بتلاتے ہیں۔ کیا کوئی تجربہ کار محقق اور واقف کار مورخ کہہ سکتا ہے۔ کہ ان تمام دشواریوں پر غالب آجانا۔ اور اِن تمام اُلجھاؤں کو سلجھانا کوئی معمولی اور آسان کام ہے۔

ہم نے اپنے سلسلہ بیان میں اِن دقتوں کے آسان کرنے کے لیے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ اوّل تو یہ ہے۔ کہ ہم نے واقعات کی تحقیق میں توریت کے عبرانی ترجمہ کو پیش رکھا ہے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے۔ کہ جن فنون و علوم اور اُن کے تمام اوصاف کے متعلق جب اخبار و آثار قدیمہ سے تعلق مطابقت اور تلاش کی ضرورت آپڑتی ہے۔ تو پھر تمام ذی لیاقت اور صاحبِ جامعیت حضرات۔ عام اِس سے کہ مغربی مولفین ہوں۔ یا شرقی مصنفین۔ اسی ترجمہ عبرانی کو آگے رکھتے ہیں۔ دوسرا طریقہ ہم نے قوم عرب العاربہ کے ہر واقعہ کو قوم بنی اسرائیل کے حالات سے مقابلہ کرنے کا اختیار کیا ہے۔ اور اِس طریقہ سے ہم کو واقعات عرب کا صحیح زمانہ قائم کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ تیسرا طریقہ جو ہم نے آخر میں اختیار کیا ہے۔ وہ اصل میں تو وہی دوسرا طریقہ ہے۔ مگر ہم نے اُسکو زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ واقعات عرب کو ہم نے دیگر ممالک اور قوم کے اُن واقعات سے بھی مقابلہ کرلیا ہے۔ جو قریب قریب ایک وقت میں واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ اگر واقعہ عرب کا سال نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اُس کے ہموقت واقعہ کا جو کسی غیر ملک اور قوم میں واقع ہوا ہے۔ صحیح زمانہ اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو اُس سے ہم کو عرب کے واقعہ کا صحیح سالِ وقوع معلوم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اِتنا تمہیداً لکھکر ہم اپنے سلسلۂ بیان کو۔ پہلے عربی ماخذوں کی نقل سے آغاز کرتے ہیں۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی مورخین کی تحقیق کا بھی اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

اول من نزل الیمن قحطان بن عابر بن شالخ

قحطان پہلا شخص ہے۔ جو یمن میں آباد ہوا۔ اسکا نام قحطان

وقحطان المذکور اول من ملک ارض الیمن ولبس التاج۔ (ابو الفدا)

ابن عابر بن شالخ ہے۔ اور یہی قحطان ہے۔ جس نے سب سے پہلے یمن میں حکومت کی اور تاج شاہی پہنا۔

تاج شاہی کی ایجاد اُسی وقت سے ہوئی محققین کے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ یہی شخص قحطان (یقطان فالغ کا بھائی تھا۔ اس لیے قحطان کی تاریخ پیدائش سے بہت دور نہ ہوگی اس بنا پر قحطان کی تاریخ ولادت قریب ۱۷۵۷ھ دنیوی یا حضرت مسیح سے دو ہزار دو سو برس قرار پاتی ہے۔ اِس زمانہ میں نمرود پسر کوش ملک بابل (اشور کا) کا بادشاہ تھا۔ اور حام ابن مصر ہم ملک مصر کا۔ اُسی وقت یعنی ۱۷۵۷ھ دنیوی یا ۲۲۰۰ء ق م میں قحطان یمن کا بادشاہ ہوا۔

قحطان کے بعد یعرب یا جرہم اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ ابو الفدا میں ہے۔

ثم مات قحطان وملک بعدہٗ ابنہ یعرب ابن قحطان

قحطان مرگیا۔ تو اُسکا بیٹا یعرب ابن قحطان بادشاہ ہوا۔

محققین کے نزدیک اسمیں کوئی شک نہیں رہا۔ کہ یعرب کے قبضہ میں یمن اور حجاز کے صوبے بھی آ گئے تھے اور یہی یعرب اُسوقت بنی جرہم کے نام سے مشہور تھے۔ فاسٹر صاحب نے اس امر کی تحقیق میں کہ جرہم پہلے یمن میں آباد تھے۔ بہت سی معقول وجہیں پیش کی ہیں۔ اور اس صوبے کے اکثر مقامات کو جرہم کے خاص نام سے موسوم ہونے کا ثبوت پہونچایا ہے۔ ان میں سب سے مستند اور معتبر ثبوت یہ ہے کہ جرہم کی کنیت ابو الیمن قرار پائی ہے۔

جرہم کے بعد۔ جرہم کا بیٹا۔ یشجب تخت پر بیٹھا۔ مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

ثم ملک بعدہٗ ابنہ یشجب بن یعرب ثم ملک بعدہٗ ابنہ عبد الشمس بن یشجب وسمی سبا وھو الذی بنا السد بارض مارب۔

اُس کے بعد یشجب ابن یعرب (جرہم) بادشاہ ہوا۔ اور اُسکے بعد اُسکا بیٹا عبد الشمس بادشاہ ہوا۔ یہی عبد الشمس سبا اکبر مشہور ہے۔ جس نے سد مارب بنوائی۔

سبا یہی شخص یمن کے مشہور و قدیم سلطنت سبا۔ اور شہر سبا۔ اور شہر مارب اور سد وغیرہ کا بانی ہے۔ مورخ ابو الفدا آگے لکھتے ہیں۔

ولما مات سبا ملک الیمن بعدہٗ ابنہ حمیر ابن سبا

جب سبا مرگیا۔ تو حمیر اُسکا بیٹا یمن کا بادشاہ ہوا۔

چونکہ حمیر قحطان سے چوتھی پشت میں تھا۔ اور ترح بھی فالغ سے چوتھی ہی پشت میں تھا۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنے کے ہم مختار ہیں۔ کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے کچھ دُور نہیں ہوگی۔ یعنی ۱۸۵۱ھ دنیوی یا ۲۲۶ھ ق م میں تقریباً اُس کی ولادت ہوگی۔

اب دیکھو۔ ترح کے تین بیٹے تھے۔ ابرام (ابراہیمؑ) ناحور اور حاران۔ حمیر کے بھی تین ہی بیٹے تھے۔ وائل

عوف[۲] اور مالک[۳]۔ اس بنا پر تبع اور حمیر کی اولادوں کو باہم ہمعصر خیال کرنا چاہیے۔ یعنی یہ ۱۹۴۹ء
دنیوی اور ۲۰۵۵ء ق م میں وہ تھے۔ وائل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔ اب اول
اسی مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً دی گئی ہے۔ لحاظ کرکے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط
بن حاران۔ پر غور کرکے سکسک اور فاران کی تاریخ ولادت قرار دیجائے۔ جو ۱۸۷۹ء دنیوی اور
۲۱۲۶ء ق م میں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سے تیس برس قبل قرار پاتی ہے۔
وائل اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اور عوف کسی جگہ حجاز اور نجد کے درمیان آباد ہوا
ابو الفدا اس سلسلہ بیان میں آگے لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعده (ای حمیر) ابنه وائل ابن حمیر ثم ملك بعده ابنه السکسك ثم وثب علی الملك الیمن ذو ریاش وهو عامر ابن باران (فاران) باران (یاران) ابن عوف ابن حمیر

حمیر کے بعد اس کا بیٹا وائل۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سکسک تخت نشین ہوا۔ پھر ملک یمن پر ذوریاش جس کا نام عامر ابن فاران ابن عوف ابن حمیر تھا قابض ہو گیا۔

ہم اوپر بتلا آئے ہیں کہ عوف حجاز اور نجد کے درمیان کسی مقام پر آباد ہوا۔ یہ امر اس سے ثابت ہے
کہ آجتک جبل عوف جو نجد کے بیچ واقع ہے۔ عوف کے نام سے مشہور ہے۔ عوف کے نام سے مشہور
ہی نہیں۔ بلکہ ماخوذ و مستخرج بھی سمجھنا چاہیے۔ قرینہ صاف صاف تبلا رہا ہے۔ کہ فاران ابن عوف
بھی اپنے باپ کے پڑوس میں آباد ہوا۔ یعنی اُس وادی۔ غیر ذی زرع میں جہاں فی الحال
مکہ معظمہ واقع ہے۔
یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ کہ فاران کا اطلاق صرف اُسی وسیع شمالی بیابان پر نہیں ہوتا ہے جو فلسطین
تک چلا گیا ہے۔ بلکہ اُن پہاڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو اُن میں واقع ہیں۔ بلکہ اُن پہاڑوں ہی کی وجہ سے
اس وسیع میدان کو فاران کا میدان کہہ سکتے ہیں۔ تمام شرقی مورخ اور وہ لوگ جو قدیم روایتوں کے
معتقد ہیں۔ اسبات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اُس کے علاوہ توریت مقدس میں بھی صاف صاف مذکور ہے
کہ یہی نواح بنام فاران مشہور ہے۔
چونکہ اس مضمون سے ہماری کتاب کے تمام مدعائے تالیفی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور گویا یہی مضمون ہمارے
بیان کا سرعنوان ہے۔ اسلیئے ہم فاران ابن عوف کا حال کسی قدر تفصیل سے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں
تاریخ ابو الفدا ۱۸۹۱ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوکر چھپی ہے۔ اُسکے صفحہ ۱۴ میں لفظ
فاران اس شکل میں (باران) چھپا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ بعض یہودی اپنی زبان میں ف کو پ کے ایسا

تلفظ کرتے ہیں۔ اور عرب جہاں پؔ کو دیکھتے ہیں۔ اُسکو بؔ سے تلفظ کرتے ہیں۔ فاران کے سر پر یہی مصیبت گذری۔ تھا اصل میں فؔ۔ یہودیوں نے پڑھا پؔ۔ اور پھر یہودیوں سے جب عربوں نے پڑھا۔ تو اس پؔ کو بؔ بنا دیا۔ عربی سے لاطینی ترجمہ چھپنے کے وقت غلطی سے بؔ کا نقطہ چھوٹ گیا۔ اور فاران کی (باران) یہ مہمل صورت ہو گئی۔

بہر حال مغربی اور مشرقی تمام مورخین کے اتفاق سے یہ امر ثابت ہے۔ کہ فاران عوف کا بیٹا تھا۔ بات یہ ہے۔ کہ عوف نے جس مقام پر سکونت اختیار کی تھی۔ وہاں ندرت اور قدرت کی خصوصیت کا کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جو اس کی شہرت کا باعث ہوتا۔ مگر چونکہ اس کے مقابلہ میں فاران کے کوہستان اور اس کے گرد کے تمام میدانوں کو ظہور قدرت کی تجلی گاہ بننا تھا۔ اور یہیں سے تمام اقطاع عالم میں انوار واحدانیت اور اخبار و آثار روحانیت پھیلاتا تھا۔ اس لیے فاران کے کوہستان اور اُسکے میدان عظمت و حرمت کے عرش الکمال تک ایسا پہونچے۔ کہ اب فاران بن عوف کا کوئی نام بھی نہیں جانتا اس تازہ تعلق اور نئی نسبت سے اسکو یہ برکت حاصل ہوئی۔ کہ اب اسکا نام کروڑوں عقیدتمندوں کی زبانوں کا وظیفہ ہے۔ اور اسکی خاک اُنکی دیدہ عقیدت اور چشم حقیقت کا سرمہ۔

اتنا لکھکر ہم پھر اپنے قدیم سلسلہ پر آجاتے ہیں۔ مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

ثم نھض من بنی وائل النعمان ابن یعفر ابن السکسک ابن وائل ابن حمیر و اجتمع علیہ الناس وطرد عامر بن باذان عن الملک و استقل النعمان المذکور بملک الیمن و لقب النعمان المذکور المعافر۔ (ابو الفدا)

بنی وائل سے ایک شخص نعمان ابن یعفر ابن سکسک ابن وائل ابن حمیر پیدا ہوا۔ اور اُسپر تمام قوم نے اجماع کیا۔ اور عامر ابن باران کو ملک سے نکالکر نعمان کو تخت شاہی پر بٹھلایا اور اسوجہ سے اُسکا لقب المعافر قرار پایا۔ ابو الفدا

اس شخص کے زمانہ سلطنت میں مغربی اور مشرقی مورخین نے بالاتفاق لکھا ہے۔ کہ جب سکسک ابن وائل کے بعد اُس کا بیٹا یعفر تخت نشین ہوا۔ تو اس کے چچازاد بھائی عامر الملقب بہ ذو ریاش ابن فاران ابن عوف نے جو حجاز میں آباد ہوا تھا۔ یعفر کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اور اُسکا ملک فتح کر لیا۔ لیکن یعفر کے بیٹے نعمان نے عامر کو اپنے ملک سے نکالدیا۔ اور اپنی سلطنت واپس لے لی۔ اس کارنمایاں کے جلدو میں اُسکو المعافر کا لقب دیا گیا۔ اُس قاعدے کے مطابق جس کی رو سے اُمم سابقہ کی تاریخہائے ولادت قایم کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یعفر ابن سکسک اور عامر ابن فاران اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی تاریخ ولادت قریب قریب ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئی۔ اور

وہ ۲۰۰۰ سنہ دُنیوی تھی۔ یا ۱۹۹۶ سنہ قبل مسیح۔ اب جو قدرتی قاعدہ پشتوں کے تعداد توالد و تناسل کا ہے۔ اُس کے مطابق ہم نعمان کے زمانہ پیدائش کو دریافت کر سکتے ہیں۔ جس کا وقوع ۱۵۳۸ سنہ دنیوی یا ۱۹۹۶ سنہ قبل مسیح قرار پاتا ہے

اس پچھلے زمانہ کے پینتالیس برس بعد۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام اُور سے جو قوم کالدی Childia سے متعلق تھا۔ حاران کو جو عراق و عرب میں واقع ہے۔ بُلائے گئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا زمانہ ہے۔ جسکے متعلق جمیع واقعات سے ہم اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں۔ کہ عامر اور نعمان کی جنگ اُسی زمانہ میں ہوئی ہوگی۔ اِس لیے یہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ کہ یہی وقت تھا۔ جب نعمان نے عامر کو نکالکر اپنے آبائی تخت کو حاصل کیا تھا۔ یعنی ۲۰۳۶ سنہ دنیوی ۱۹۲۱ سنہ ق م میں۔

اس کے آگے ابو الفدا لکھتے ہیں۔

ثم ملک بعدہ ابنہ اشمح بن المعافر الملقب بالمعافر ثم ملک بعدہ شداد بن عاد ابن الملطاط بن سبا واجتمع لہ الملک وغزا البلاد الی ان بلغ اقصی المغرب وبنی المدائن والمصانع وابقی الآثار العظیم

نعمان کے بعد اُسکا بیٹا اشمح ابن المعافر (نعمان) تخت نشین ہوا۔ اسکے بعد شداد ابن عاد ابن ملطاط ابن سبا تمام ملک پر مسلط ہوگیا۔ اُسنے اور ملکوں پر بھی چڑھائی کر دی۔ اور انتہائے مغرب تک کے تمام ممالک مفتوح کرلیے۔ شہر و اُن کو بسایا۔ اور اُسنے بہت آثار عظیم اپنی یادگار چھوڑے

مؤرخین نے اس عاد کو بھی غلطی سے عاد اُولیٰ سمجھکر اس کے واقعات کو اُنکے حالات سے ایسا خلط ملط کر دیا ہے کہ سطحی اور سرسری دیکھنے والوں کو تمیز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ شداد ابن ملطاط ابن عبد الشمس الملقب بہ سبا اکبر کی اولاد میں ہے۔ چونکہ اس سے پہلے اس نام کے دو شخص اور گذر چکے ہیں۔ اس لیے محققین نے اس شداد کو عاد ثالث کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ عربی نسابین نے غلطی سے سبا اکبر اور شداد کے فیمابین صرف دو نام لکھے ہیں۔ ایک عاد اور ملطاط۔ حالانکہ باعتبار امتداد ایام اور فاصلہ انساب کم سے کم پانچ نام اور ہونے چاہئیں۔ ان عربی نسابین کی غلطی اسوجہ سے ہے۔ کہ ان کے تمام مضامین کا اصلی ماخذ عرب کے اشعار قدیم ہیں۔ اور شعرا کا ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا ہے۔ کہ وہ کسی قبیلہ یا قوم کے سلسلہ میں خاصکر اُنہی لوگوں کے حالات و اوصاف قلم بند کرتے ہیں۔ جو کسی خاص صفت سے موصوف و مشہور ہوتے ہیں۔ اور باقی لوگوں کو قابل ذکر نہیں سمجھکر قلم انداز کر دیتے ہیں۔ ان کی فروگذاشت کی وجہ شعرائے قدیم کی یہی کوتہ قلمی سمجھنی چاہیئے۔

شداد نے کسی وقت یمن پر حملہ کیا ہو؟ مشکل سے صحیح مانا جا سکتا ہے۔ اتنا البتہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ نعمان کی تخت نشینی سے چند سال بعد یا اُس کی وفات سے تھوڑے ہی زمانہ میں۔ شام کے پانچ بادشاہوں نے

آپس میں جنگ شروع کردی۔ توریت مقدس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس جنگ کا اثر عرب پر بھی پڑا تھا چنانچہ توریت کے فارسی ترجمہ کی عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

در سال چہاردہم کدر لاعومر و ملوکے کہ ہمراہش بودند رفائیاں را در عشتروت قرنیم۔ وزوزیان را در ہام وایمیاں را در شاوہ قریاتیم شکست دادند و نیز حوریاں را در کوہ خودشان سعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحراست۔ و برگشتہ بہ عین مشپاط کہ قادش است آمدند و تمامی مرز بوم عمالیقیان و ہم اموریانی کہ در حصون تامار ساکن بودند شکست دادند۔ سفر تکوین باب ۱۴۔ درس ۵۔ ۶۔ ۷۔

یہ بالکل ظاہر ہے۔ کہ یہ حملہ آور لوگ قادش کے شمال سے آئے ہونگے۔ کیونکہ سعیر کے پہاڑ اُس جگہ سے شمال میں واقع ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ قادش کے جنوب میں دُور جاکر فاران میں چلے گئے۔ جس کو آجتک حجاز مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو اس بیان کے۔ کہ حملہ آور پاران سے قادش کو لوٹ گئے۔ کچھ بھی معنی نہ ہوتے۔ اگر یہ کہیں۔ کہ یہ لوگ مغرب کے جانب گئے ہونگے۔ تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اُس طرف صرف بنی عملیق رہتے تھے۔ جن سے کہ ان حملہ آوروں نے اپنی پہلی مہم کو قادش کو واپس آنے کے بعد جنگ کی تھی۔

اسوقت اشمح کی حکومت اور عملداری صوبہ یمن تک پھیل گئی تھی۔ چونکہ یہ زمانہ اُس کی حکومت کی ابتدا کا تھا۔ اس لیے خیال ہوسکتا ہے۔ کہ مذکورۂ بالا حملہ کی وجہ سے اُس کی طاقت میں کسی قدر ضعف آگیا ہو جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ سلطنت یمن کے اس ضعف و شکستگی کی حالت میں شداد نے جو ہمیشہ ایسے موقع کا منتظر رہا کرتا تھا۔ اشمح پر حملہ کیا ہو۔ اور اُسکو حکومت سے بیدخل کردیا ہو۔ ان وجوہ کی بنا پر اسکا یقین ہوتا ہے۔ کہ اشمح ۲۰۹۱ء دنیوی یا ۱۹۱۳ء قبل مسیح میں تخت نشین ہوا تھا۔ اور شداد نے ۲۰۹۲ء دنیوی یا ۱۹۱۲ء ق م میں اُس کی سلطنت کو چھین لیا تھا۔ اور یہ زمانہ اُس عام قاعدے سے جو علم انساب میں پشتوں کے پیدا ہونے کیلئے قرار دیا گیا ہے۔ بالکل مطابق ہوتا ہے۔

اس کے آگے مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعده اخوه لقمان ابن عاد ثم ملك بعده اخوه ذو شداد ابن عاد ثم ملك بعده ابنه الحرث بن ذو شداد و يقال له الحارث الرائش

اُسکے بعد اُسکا بھائی لقمان ابن عاد بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بھائی ذو شداد ابن عاد تخت پر بیٹھا تھا۔ اُسکے بعد ذو شداد کا بیٹا الحارث ملقب بہ الرائش تھا۔ تخت پر بیٹھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شداد کے بعد اُس کے دونوں بھائی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ذو شداد کے بعد اُسکا بیٹا الحرث بادشاہ ہوا۔ اُس زمانہ تک اور اُس کے بعد بھی بہت دنوں تک وہاں دو خود مختار سلطنتیں

قائم رہیں۔ ایک یمن میں دوسری حضر موت میں۔ بالآخر۔ ایک دوسرا شخص۔ جسکا نام بھی الحارث اور لقب بھی الرائش تھا۔ تخت پر بیٹھا۔ اس شخص نے ان دونوں سلطنتوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ اس موقع پر بھی مورخین نے دونوں حارثوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور حارث اول کی طرف حارث دوم کے جمع السلطنتین والے واقعہ کو منسوب کر دیا۔ اس غلطی کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ ان دونوں حارثوں کے مابین جتنے نام تھے۔ وہ بالکل معدوم اور لامعلوم ہو گئے۔ ان کی اس غلطی کا روشن ثبوت یہ ہے۔ کہ جو زمانہ اُن بادشاہوں کا گذرا ہے۔ اور جو تعداد بادشاہوں کی بتلائی گئی ہے۔ وہ استداد زمانہ کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے تاریخ حمزہ اصفہانی کی اس عبارت سے کہ بین الرائش و الحمیر خمس عشر ابا۔ "حمیر اور رائش کے درمیان پندرہ پشتوں کا فاصلہ ہے" ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ اس محقق (حمزہ اصفہانی) کو بھی اُن پندرہ پشتوں میں سے۔ کسی ایک کا بھی نام معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اگر ہم بیان صدر پر اعتبار کریں۔ تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا ہوتا ہے۔ کہ الحارث ابن ذو شدد اور الحارث الرائش کے درمیان سات آٹھ بادشاہ گذرے ہیں۔ حمزہ اصفہانی الحارث الرائش کے متعلق لکھتے ہیں۔

الحارث الرائش هو الحارث بن قيس بن صيفي بن سبا الاصغر الحميري وكان الرائش اول غزاهم واصاب الغنائم وادخل الارض اليمن غارتها فشت تميم في ايامه وكان هو الذي اشهم فبذلك سمي الرائش

حارث۔ الرائش کا اصل نام حارث ابن قیس ابن صیفی بن سبا الاصغر حمیری ہے۔ اور یہ رائش اول بار اہل یمن سے لڑا۔ مال غنیمت حاصل کیا۔ اور تمام ارض یمن پر قبضہ کر لیا۔ اور قوم حمیر اُسکے زمانہ میں بہت خوشحال ہو گئی۔ اس خصوصیت سے اسکا لقب رائش (یعنی دولتمند) ہوا۔

اس میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہی الرائش یمن۔ اور حضر موت۔ دونوں سلطنتوں کے ایک کرنیکا موجد ہوا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اسی شخص کو تبع الاولی بھی کہتے ہیں۔

سلسلہ بیان میں مورخ ابو الفدا آگے بیان کرتے ہیں۔

ثم ملك بعده ابنه ذو القرنين۔ الصعب ابن الرائش ثم ملك بعده ابنه ذو المنار ابرهه ابن ذو القرنين ثم ملك افريقش ابرهه ثم ملك بعده ذو الاذعار عمر بن ذو المنار ثم ملك بعده شرحبيل بن عمر بن غالب بن المنتاب بن زيد بن يعفر بن سكسك بن وائل بن حمير۔ ثم ملك بعده ابنه الهدهاد بن شرحبيل ثم ملك بعده بنته

الرائش کے بعد اسکا بیٹا صعب ابن الرائش۔ جسکا لقب ذو القرنین تھا تخت نشین ہوا۔ ذو القرنین کے بعد اسکا بیٹا ابرہہ بادشاہ ہوا جسکا لقب ذو المنار تھا۔ اس کے بعد اسکا بیٹا افریقش تخت نشین ہوا اسکے بعد عمر ابن ابرہہ بادشاہ ہوا۔ اسکا لقب ذو الاذعار تھا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا شرحبیل ابن عمر ابن غالب ابن المنتاب ابن زید ابن یعفر ابن سکسک ابن وائل بن حمیر بادشاہ ہوا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا الہدہاد بن شرحبیل بادشاہ ہوا ہدہاد کے بعد اسکی لڑکی بلقیس بنت ہدہاد ملکہ یمن ہوئی۔ اس ملکہ نے

بلقیس بنت الهدهاد وبقیت فی ملک الیمن عشرین سنة و تزوجها سلیمان ابن داؤد۔ (ابی الفدا)

یمن میں بیس برس حکومت کر کے حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کے ساتھ شادی کر لی۔

ہم حضرت سلیمان و بلقیس کے تفصیلی واقعات اور ملوک حمیر کے کامل تاریخی حالات۔ اپنے موجودہ سلسلہ بیان کے خاتمہ پر پوری تشریح سے درج کریں گے۔ ان حالات کی فوری تفصیل موجودہ سلسلۂ بیان کے نظام میں ایک ناگوار بد ترتیبی پیدا کر دی گئی۔

خلاصہ بیان یہ ہے۔ کہ الرائش یا تبع اوّل کے بعد اُس کا بیٹا صعب ملقب ذو القرنین، اُسکے بعد ابرہہ ملقب ذو المنار، اُس کے بعد افریقش، اُسکے بعد عمر ملقب بہ ذو الاذعار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ذو الاذعار کے عہد میں شرجیل نے اُس پر حملہ کر دیا۔ اور بے شمار خونریزیوں کے بعد ذو الاذعار کو شکست دی۔ اور اُس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ شرجیل کے بعد اُسکا بیٹا الہدہاد جانشین ہوا۔ اُسکے بعد ملکہ بلقیس تخت پر بیٹھی۔ اور بیس برس سلطنت کر کے اُس ملکہ نے۔ حضرت سلیمان ابن داؤدؑ بادشاہ یہود سے شادی کر لی اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے ۳۰۰۰ دنیوی یا ۱۰۰۰ ق م میں پایا جاتا ہے۔ اسلیے نسلوں کے پیدا ہونے کے قاعدہ متعینہ کے مطابق الحارث الرائش اور صعب ذو القرنین یا تو اٹھائیسویں صدی دنیوی کے آخر میں یا انتیسویں صدی دنیوی کے آغاز میں گذرے ہونگے۔ یعنی حضرت مسیحؑ سے تیرہ سو برس قبل۔

ذو القرنین کی شخصیت اور خصوصیت کے متعلق مورخ ابو الفدا کی تحقیق حسب ذیل ہے۔

وقد نقل ابن سعید المغربی ان ابن عباس یسئل عنه عن ذو القرنین الذی ذکره الله تعالی فی کتابه العزیز فقال هو من حمیر وهو صعب المذکور فیکون ذو القرنین المذکور فی الکتب العزیز هو الصعب ابن الرائش المذکور لا الاسکندر الرومی

ابن سعید مغربی کا بیان ہے۔ کہ جب حضرت ابن عباسؓ کو اُس ذو القرنین کی نسبت پوچھا گیا۔ جسکی نسبت قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ وہ صعب حمیری تھا اس دلیل سے ظاہر ہے۔ کہ جس ذو القرنین کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ وہ صعب ابن الرائش ہے۔ نہ اسکندر رومی۔ ابو الفدا۔

تاریخ یمن کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مشہور و معروف سدّ یمن کی تعمیر کا کام اسی ذو القرنین کے وقت میں اختتام کو پہونچا۔ تاریخ یمن کی عبارت یہ ہے۔

وکان اوّل من اسس لسد سبا الاکبر و اسمه عامر وقیل عبد الشمس بن یشجب بن یعرب بن قحطان ثم بناه حمیر بن سبا بعد موت ابیه ثم اتمه بعد ذلک ذو القرنین الحمیری او هو الصعب

اس سد کی بنا سبا اکبر نے شروع کی تھی۔ اُس کے بیٹے اور جانشین حمیر نے اُسکو جاری رکھا۔ اور ذو القرنین نے اُسے اختتام تک پہونچایا۔ یہ سد۔ دو پہاڑوں کے درمیان میں تھی۔ ایک کا نام مارب دوسرے کا ابلق۔ اور یہ دولاں

ابن ابی مرایل وکان السد من جبل المارب الی الجبل الابلق وھما جبلان ملیقان علی الجبال الشامخۃ المعتد من یمین السد وشمالہ (العقود اللولویۃ فی اخبار دولۃ الشولیۃ الیمنی)

پہاڑ دوسرے پہاڑوں کے مقابلہ میں باعتبار رفعت کے زیادہ بلند ہیں اور بہت دور تک سدِ مذکور کے داہنے طرف سے بائیں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

سدِ مارب کے تفصیلی حالات بھی ہم سلاطین حمیر کے احوال کے ساتھ لکھیں گے۔ اس مقام پر ہمکو تاریخی سلسلۂ بیان کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ملکہ بلقیس سے آگے اس شاہی سلسلہ کے ذکر میں مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں

ثم ملک بعدھا ابن عمھا ناشر النعم بن شرحبیل ثم ملک بعدہ شمر یرعش بن ناشر النعم ثم ملک بعدہ ابنہ ابو مالک ابن شمر ثم ملک بعدہ عمران ابن عامر الازدی ثم ملک بعدہ اخوہ مزیقیا۔

بلقیس کے بعد اسکا چچازاد بھائی ناشر النعم بن شرحبیل تخت نشین ہوا اُسکے بعد اُسکا بیٹا شمر یرعش بادشاہ ہوا اُسکے بعد اُسکا بیٹا ابو مالک ابن شمر بادشاہ ہوا اُسکی سلطنت میں عمران ابن عمر ازدی نے حمیریوں سے سلطنت چھین لی عمران کے بعد اُسکا بھائی مزیقیا بادشاہ ہوا

واقعہ یوں ہے۔ کہ حکومت یمن شمر یرعش کے زمانہ ہی سے اندرونی نقائص کی بنا پر ضعیف ہوتی چلی آرہی تھی۔ ابو مالک کے وقت میں اُسکا ضعف و اضمحلال کا یہ حال ہو چکا تھا۔ کہ قبیلہ ازد کے سردار عمران ابن عمر نے ایک خفیف حملہ کے بعد تمام مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اسی وقت سے حکومت یمن سلسلہ حمیر سے نکلکر بنی کہلان میں منتقل ہو گئی۔ عمران ابن عمر کے بعد اُسکا بھائی مزیقیا حکمراں ہوا۔ یہ بالکل ضعیف اور ناقابل حکومت شخص تھا اسکے وقت میں الاقرن ابن ابو مالک نے اپنی سلطنت آبائی کا دعوےٰ کیا۔ اور مزیقیا سے لڑکر اُسکو شکست ہو گئی۔ اور سلطنت چھین لی۔ حکومت یمن چند روز کے لیے عارضی طور پر بنی کہلان کے قبضہ میں رہکر پھر سلسلہ حمیری میں لوٹ آئی اس کے آگے تاریخ ابو الفدا کا سلسلۂ بیان یہ ہے۔

ملک الاقرن ابن ابو مالک ثم ملک بعدہ ذو حیشان بن الاقرن ثم ملک بعدہ اخوہ تبع الاکبر بن الاقرن ثم ملک بعدہ ابنہ کلیکرب بن تبع ثم ملک بعدہ ابوکرب سعد وھو تبع اوسط وقیل ثم ملک بعدہ ابنہ حسان بن تبع ثم قتلہ اخوہ عمرو ابن تبع وملک فسمی ذو الاعواد ثم ملک بعدہ عبد کلال بن ذو الاعواد ثم ملک بعدہ تبع حسان بن کلیکرب وھو تبع الاصغر ثم ملک بعدہ ابن اختہ الحارث

اقرن بن ابو مالک کے بعد اُسکا بیٹا ذو حیشان بن اقرن بادشاہ ہوا اُسکے بعد اُسکا بھائی تبع اکبر تخت نشین ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا کلیکرب۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا ابوکرب سعد۔ تبع اوسط اُسکے بعد اُسکا بیٹا حسان۔ اس کے بعد اُسکا بھائی عمر ذو الاعواد اُسکے بعد اُسکا بیٹا حسان۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا عبد کلال تخت نشین ہوا تبع ابن حسان ابن کلیکرب ملقب بہ تبع الاصغر نے عمر ذو الاعواد سے سلطنت چھین لی۔ تبع الاصغر کے بعد اُسکا بھانجہ الحارث تخت نشین ہوا حارث نے مذہب

ابن عم وتھود الحارث المذکور ثم ملک بعدہ مرثد ابن کلال ثم ملک بعدہ وکیعہ ابن مرثد

یہود اختیار کیا۔ حارث کے بعد مرثد ابن کلال اور مرثد کے بعد وکیعہ بن مرثد بادشاہ ہوا۔

تمام مورخین کا اتفاق ہے۔ کہ حارث نے مذہب یہود اختیار کر لیا تھا۔ اور اُس کی وجہ سے حارث کے بعد والے بادشاہوں نے بھی مذہب یہود قبول کیا۔ یہ واقعہ اس طرح صحیح مانا جا سکتا ہے۔ کہ بخت نصر فلسطین کو فتح کر کے اور بیت المقدس کو مسمار کر کے حضرت دانیالؑ اور اُنکے دوستوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ اُسوقت کچھ یہودی بھاگ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ اِس زمانہ میں حضرت دانیالؑ اور حضرت یرمیاہ پیغمبر تھے۔ اس لیے یہ بات نہایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان مفرور یہودیوں کی وجہ سے الحارث نے خدائے واحد کا اقرار کیا ہوگا۔ اور مذہب یہود کو قبول کر لیا ہوگا۔ اور یہ امر واقعی ہے۔ کہ الحارث اور وکیعہ اسی زمانہ میں حکمران تھے۔ اور یہ زمانہ ۳۴۴۳ دنیوی یا ۶۰۲ ق م۔ نسلوں کے پیدا ہونیکے فطرتی طریقہ حساب سے بالکل اعتبار کے قابل اور صحیح ثابت ہوتا ہے۔

اس کے آگے مورخ ابو الفدا کا مفصلۂ ذیل سلسلہ بیان قائم ہوتا ہے۔

ثم ملک ابرھہ بن الصباح ثم ملک صھبان بن محرث ثم ملک عمر بن تبع ثم ملک بعدہ ذونواس وکان من لایتھود القاہ فی اخدود مضطرم نار فقیل لہ صاحب الاخدود ثم ملک بعدہ ذو جدن واخر ملوک الحمیر۔

اس کے بعد ابرہہ بن الصباح بادشاہ ہوا۔ پھر اُسکے بعد صہبان بن محرث بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد عمر ابن تبع۔ اُسکے بعد ذونواس بادشاہ ہوا یہ بادشاہ اُن لوگوں کو جو مذہب یہود اختیار کرنے سے انکار کرتے مشتعل آگ سے بھری ہوئی خندق میں ڈلوا دیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اُسکو صاحب الاخدود کے نام سے ملقب کیا۔ اسکے بعد ذوجدن بادشاہ ہوا۔ اور یہ آخر شاہان حمیر تھا

مورخ ابو الفدا نے وکیعہ کے بعد ان مذکورہ بالا چھ بادشاہوں کو بھی سلسلہ حمیری میں شمار کیا ہے۔ مگر تحقیق سے اِن بادشاہونکا خاندانی سلسلہ صاف طور سے معلوم نہیں ہوتا۔ اور نہ اُنکی حکومتوں کا ٹھیک زمانہ دریافت ہوتا ہے۔ مگر اس واقعہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ کہ ذونواس ایک متعصب یہودی تھا۔ اور یہودیوں کے علاوہ ہر غیر مذہب والوں کو آگ میں زندہ جلوا دیا کرتا تھا۔ اس بات کے خیال کرنے کے لیئے ایک عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا۔ جبکہ ارتازر کسیز[1] وین کیخسرو (Artazer Kisious) نے چند یہودیوں کو جو مصر سے قید ہو کر آئے تھے۔ ہر قان بر (مازندران) میں بھیجدیا تھا۔ چونکہ یہ بادشاہ بھی یہودی تھا۔

[1] اس بادشاہ فارس کا زمانہ ۴۶۵ ق م میں بتلایا گیا ہے۔ اور کتاب عزرا اور نحمیاہ پیغمبر میں اس کے حالات تفصیل سے موجود ہیں یہ وہی بادشاہ ہے۔ جسکے دربار میں نحمیاہ پیغمبر نے حاضر ہو کر یروشلم (بیت المقدس) کی مرمت اور آبادی کی پھر اجازت حاصل کی تھی کیونکہ کیخسرو کے باپ نے یونان کو فتح کر کے بیت المقدس کو تباہ کر دیا تھا۔ کتاب نحمیاہ ص ۹۱ ۲ عہد عتیق ہٹنسن یونیورسل ہسٹری ج ا ص ۱۵۹۔

اس لیے اُنکی (ذو نواس کی) سلطنت کو بھی کیخسرو کے حملے سے سخت صدمہ پہونچا تھا۔ اس کے بعد حبشیوں نے ضعیف پاکر حمیری سلسلہ ملوک کو ہمیشہ کے لیے تمام کر دیا۔ یہ زمانہ ۳۶۵ء دنیوی یا ۳۵۴ء ق م تھا ہم اصحاب اخدود (ذو نواس) کا حال بھی۔ سلاطین حمیر کے تفصیلی حالات کے سلسلہ میں اُس کے خاص مقام پر لکھیں گے۔

حکومت سبا اور یمن کی دیگر سلطنتیں

سلاطین یمن میں جو اصلاً قحطانی (عرب العاربہ) تھے اور موطناً یمنی۔ سلسلہ سلاطین سبا سے اہل معین کا ذکر قدیم ہے۔ اہل معین کا ذکر تحریری حیثیت سے اسفار یہود میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے قلم بند ہوا ہے اور پھر چھ سو برس بعد یونانی مصنف ارا تستھنیس المتوفی ۱۹۲ء ق م نے بھی انکا ذکر کیا ہے۔

اہل عرب بھی اہل معین سے ناواقف نہیں تھے۔ جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔ لفظ معین کے معنی "منبع آب" اور "چشمہ" کے ہیں۔ عبری زبان میں یہ معیان ہے۔ جو فی الحال سعان سے تبدیل ہو کر شمالی عرب میں ایک آبادی کا نام ہے۔ یمن کے جوف میں ایک آبادی کا نام معین ہے۔ اس کے حدود یہ ہیں۔ مشرق میں حضرموت۔ جنوب و مغرب میں سبا (موجودہ صنعا) واقع تھا۔

ہمدانی اکلیل اور صفۃ جزیرۃ العرب میں لکھتا ہے۔

محافد الیمن براقش ومعین وھما بأسفل جوف الرحب مقابلتان فمعین بین مدینۃ نشان وبین درب شراقتہ۔

یمن کے اضلاع۔ براقش اور معین ہیں۔ اور یہ دونوں رحب کے صحرائے ریگستانی کے نیچے واقع ہیں۔ معین۔ شہر نشان اور درب شراقہ کے مابین ہے۔

یاقوت حموی نے معجم میں بھی ان دونوں مقامات کا ذکر کیا ہے۔ لفظ معین کے ذکر میں لکھتا ہے۔

معین اسم حصن بالیمن وقال الأزہری معین مدینۃ بالیمن تذکر فی براقش۔

معین یمن میں ایک قلعہ کا نام ہے۔ ازہری کا بیان ہے کہ معین ایک شہر تھا۔ جسکا براقش میں واقع ہونا کہا جاتا ہے۔

براقش کے ذکر میں لکھتا ہے۔

قال الأصمعی براقش ومعین حصنان بالیمن کان بعض التبابعۃ امر ببناء سلحین فبنی فی ثمانین عاماً وبنی براقش ومعین بغسالۃ ایدی صناع سلحین قال ولا تری لسلحین اثراً وھما قائمتان۔

براقش اور معین یمن میں دو قلعے ہیں۔ بعض شاہان یمن نے قصر سلحین کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ وہ اسّی برس میں بنکر تیار ہوا۔ اور براقش اور معین کاریگروں کے ہاتھ کے دھوون سے بنے ہیں۔ لیکن دیکھو کہ قصر سلحین کا کہیں نشان نہیں۔ اور یہ دونوں (براقش اور معین) ابتک قائم ہیں۔

عبارت متذکرہ بالا سے معلوم ہوا۔ کہ شاہان یمن کی یہ عمارتیں دوسری صدی ہجری تک موجود تھیں۔ انہیں براقش کا ذکر تو آٹھویں صدی ہجری تک نہایت کثرت سے موجود ہے۔ اور اسوقت تک یہ ایک آباد شہر تھا۔ (تاریخ یمن العقود الا۔ لوتیہ)

عرب کے شعرائے قدیم بھی اس کے ذکر کو نہیں بھولے۔ فروہ بن مسیک کہتا ہے

احل بجاجر جدی غطیف | معین الملک من بین ابینا
وملکنا براقش دون اعلیٰ | والغم اخوتی وبنی ابینا

علقمہ کا شعر ہے:۔

وقدّا اسّوا براقش حین اسّوا | ببلقعة ومبنسط اینق
وحلّوا من معین حین حلّوا | لعزھم لدی الفج العمیق

مالک ابن حریم الدلائی کا یہ شعر صرف ہمدانی نے لکھا ہے۔

وتحمی الجوف مادامت معین | باسفله مقابلة عرادا

یاقوت حموی نے یہ دو شعر صرف نقل کیے ہیں۔ قال الجعدی

ینادی من براقش او معین | فاسمع فاتلاب بنا ملیح
تستن بالقرّ ومن براقش او | ھیلان او یالع من العتم

ابو علکم مرائی حمیری کہتا ہے

براقش ومعین نحن عامرھا | ونحن ارباب مرواح ودوتا تا سمرج ۲ ص ۳۹۰

ان اشعار سے اتنا معلوم ہوا۔ کہ معین کی آبادی مقام جوف میں واقع تھی۔ دوسری صدی ہجری تک اسکے آثار باقی تھے۔ کسی زمانہ میں یہ مستقل دار الحکومت تھا۔ براقش اس سے ایک قریب آبادی کا نام تھا ان بیانات کے اصل واقعات کے ساتھ یہ مکاشفات البتہ تعجب انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ کہ ان محاضرات وعمارات کے بانی سلاطین حمیری کو بتلایا گیا ہے۔ حالانکہ اہل معین حمیریوں سے قدیم ہیں۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے۔ کہ مؤرخین عرب معین کی نہ قومیت کو جانتے تھے۔ نہ شخصیت کو۔ ان کو جو کچھ علم تھا وہ اسی قدر کہ وہ معین وبراقش کو دو علی اور مستحکم ترین عمارات جانتے تھے۔ اس لیے وہ انکے بنانے والوں کی حقیقت کو کیا بتلاتے۔ یمن کی اصلی تاریخی واقفیت ان کو چونکہ سلاطین حمیریہ کے وقت سے شروع ہوئی۔ اور اہل معین کے خاتمہ کے ساتھ ہی سلسلہ حمیریہ کی ابتدا شروع ہوگئی۔ اس بنا پر عرب کے مؤرخین اور شعرائے متقدمین نے شاہان حمیر کو ان عمارات کا بانی خیال کرلیا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ اہل عرب اگرچہ اہل معین کی قومیت اور اصلیت سے واقف نہ تھے۔ اور نہ اُنکے وجود تک کو وہ جانتے تھے۔ مگر یونانی۔ رومی۔ اور یہودی مؤلفین بھی جو ان کے وجود سے واقف تھے جنہوں نے ان کے وجود کو تبلایا۔ اور ثابت بھی کیا۔ یہ اُن کی اصلیت اور قومیت کو نہ تبلا سکے مگر اس امر خاص کا تحقیق کنندہ اُن کے مقامات سکونت کے نشان سے ان کی قومیت کو فوراً معلوم کریگا۔ اہل معین کی سکونت کے مقامات جو تحقیقات جدیدہ نے تبلائے ہیں۔ وہ بالکل عادثانیہ کے سکن و موطن پائے جاتے ہیں۔ اس لیئے یہ خیال کر لینا صحت سے قریب ہوگا۔ کہ اہل معین اصلاً عادثانیہ اور فرعاً ثمود کی ایک شاخ تھے۔ جو اپنے مرکز الحجر اور وادی القریٰ سے اُٹھ کر علاقہ یمن میں چلے آئے تھے۔

جرمن فاضل گلاذر اور ہالوے نے کئی ہزار کتبات کے مطالعہ سے اہل معین کی تمام سیاسی۔ مذہبی اور تجارتی حالتوں کا سراغ لگایا۔ اور علاقجات معین حضرموت۔ قتاب اور مارب و سبا کی حکومتوں کی تاریخ موقع وقوع۔ اسمائے ملوک۔ رسوم مذہبی۔ طرز تمدن پر کافی روشنی ڈالی۔ پھر ان تمام بیانات کے بعد یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ یمن کی ان تمام حکومتوں میں قدیم تر "معین" کی حکومت ہے۔

اہل معین کے زمانہ سلطنت قائم کرنے میں اختلاف ہے۔ مگر یہ اختلاف چنداں قابل لحاظ نہیں۔ جرمن مستشرقین ۱۴۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م تک ان کا عہد حکومت تبلاتے ہیں۔ محققین فرانس اور انگلینڈ تخمینی طور سے ۸۰۰ ق م سے ان کا زمانہ شروع کرتے ہیں۔ مگر (Volume 1. P.45. Huart Tome)

مگر مؤلف پرٹینکا طبع یازدہم نے اس اختلاف کو دور کرکے اُن کے زمانہ حکومت کو صحیح طور پر تبلادیا ہے۔ ذیل میں اُن کی انگریزی عبارت کا ترجمہ قلمبند ہے۔

آخر زمانہ کے کتبات کو چھوڑ کر زمانہ قدیم کے کتبوں میں بھی کوئی سن یا تاریخ مذکور نہونے کی وجہ سے اور نیز اسلیئے کہ کتبات کی تعداد کم ہے۔ علماء میں۔ زمانہ تاریخ عرب قدیم۔ قبل از اسلام کی نسبت بہت سے اختلاف پیدا ہوگئے ہیں لیکن تمام علماء کا اسپر اتفاق ہے۔ کہ ان کتبات کی تاریخ ۱۰۰۰ ق م تک پہونچتی ہے بعض کا قول ہے۔ کہ صرف ۱۲۰۰ ق م تک پہونچتی ہے۔ اور اُن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں عرب میں کم از کم چار متمدن حکومتیں (۱) معین (۲) سبا (۳) قتاب (۴) حضرموت قائم تھیں۔

مصنفین انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopedia of Islam) معین، کا زمانہ بظاہر اس سے بھی زیادہ قدیم قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

اسقدر قدیم کہ ۳۰۰۰ (تین ہزار) ق م میں قدیم بابل کے کتبات میں ایک شاہ معنیوم (جسکا پورا نام معنوم اور انوم ہے) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو معان یا شرقی عرب کا بادشاہ تھا۔ اس نظریہ کی نسبت بہت کچھ کہا جاسکتا ہے کہ معان۔ عربی لفظ معین کا سومری تلفظ ہے۔ اور اسی صدی سے (جسکی تاریخ لامعلوم ہے) جنوبی عربی حکومت معین یا معینان کی بنیاد پڑی۔ جس نے شاید اپنی ابتدا میں تمام جنوبی عرب کو جس میں قتاب اور حضر موت داخل ہے۔ اپنے آغوش میں لیلیا تھا۔ اور جس میں ایک اور صوبہ طوتخ (یا ملوق) بھی شامل تھا۔ جس کی نسبت بیان ہے۔ کہ وہ عرب وسطی اور عرب شمالی و مغربی کا نام تھا۔

ان معلومات پر دو واقعات کا اور اضافہ کرنا چاہیے۔ ہائیکوس عرب۔ جب سنہ ۲۰۰۰ء ق م میں مصر پر قابض تھے۔ تو ان حکمران قبائل میں سے ایک قبیلہ کا نام مین بتلاتے ہیں۔ جو معین کی نہایت صاف شکل ہے۔ نیز معین اور اشور کے کتبات باہم تعلقات واقعات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اشور کے کتبات میں جنکا زمانہ سنہ ۱۹۰۰ء ق م سے سنہ ۸۰۰ء ق م تک ہے۔ معین کا ذکر موجود ہے۔ ان وجوہ سے جیسا کہ فرنچ مورخ عرب۔ ہوارٹ (Huart) بتلاتا ہے۔ اس سے زیادہ نیچے نہیں اتر سکتے۔

بہرحال یہ امر ہر طرح سے محقق ہوگیا کہ یمن کے حکمران سلسلہ میں اہل معین سب سے زیادہ قدیم ہیں اور ہر قرینہ سے یہ بھی ثابت ہوچکا ہے۔ کہ اہل معین کا سلسلہ خاندان حمیر سے پہلے تھا۔ اب ہم ذیل میں یونانی مورخین کے اقتباسات سے ان کے سیاسی۔ تمدنی اور تجارتی حالات قلمبند کرتے ہیں۔ یونان کا قدیم مورخ ارٹسٹھینس (Eratosthenes) جسکی تاریخ وفات سنہ ۱۹۶ء ق م میں ہے وہ قبائل یمن کے ذکر میں لکھتا ہے۔

ملک عرب کے انتہائی اختتام پر سمندر کے کنارے پر اہل معین (Minainians) رہتے ہیں۔ جنکا خاص شہر قرن (Karna) ہے۔ ان کے بعد سبا آتے ہیں۔ جنکا پایہ تخت مارب ہے۔ آگے بڑھ کر بجانب مغرب خلیج عرب کے گوشہ پر۔ اہل قتاب آباد ہیں۔ جنکے بادشاہ تمنع میں رہتے ہیں۔ آخر انتہائے مشرق میں اہل حضر موت ہیں۔ جنکا شہر سباتا ہے۔ ان چاروں ممالک میں سے ہر ایک کی وسعت مصر زیرین (Lower Egypt) سے زیادہ ہے۔

ان ممالک میں ایام گرما میں بارش ہوتی ہے اور ندیاں بہتی ہیں۔ جو میدانوں اور تالابوں میں گم ہوجاتی ہیں۔ اسلیئے زمین اسقدر زرخیز ہے۔ کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے۔ حضر موت سے ملک سبا تک۔ ۷۰ روز کا راستہ ہے سوداگر معین سے عیلانہ (عقبہ) تک ۷۰ دن میں جاتے ہیں۔ حضر موت۔ قتاب۔ سبا۔ اور معین کے شہر دولتمند ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔ (Dunker's Ancient Hist. vol. II. P. 810.)

یمن کی قوموں میں معین سب سے زیادہ قدیم اور فروغ یافتہ تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک قدیم جغرافیہ نویس ان کے حال میں لکھتا ہے۔

معین سے بطرا اور فلسطین تک سڑک جاتی ہے۔ جہاں اہل قریہ اور اہل معین اور آس پاس کے تمام عرب بالائی ملک سے خوشبودار چیزوں کے بستے اور بخورات لاتے ہیں۔ Gold mines of Mediain P.179

پلینی کے بیان کے مطابق ان کی زمین کی خاص پیداوار چھوہارے اور انگور تھے۔ لیکن اُن کی دولت کا اصلی سرچشمہ جانوروں کی تجارت تھی۔ (Foreoter P. 224-26)

معین کے کھنڈر ابتک باقی ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ معین کے تمام قلعے اور شہر ایک دائرے کی صورت میں واقع تھے۔ معین خود ملک سبا کے قلب میں اُس شاہراہ کے دست راست پر جو مآرب کے شمالی جانب سے واقع تھا۔ روایات عرب میں معین کے ساتھ ساتھ براقش کا ذکر ہوتا ہے۔ براقش کا محل وقوع معین کے مغربی وجنوبی جانب اور موجودہ صنعا کے قریب جو کوہستانی سلسلہ ہے۔ اُسکے مغربی جانب تھا۔ براقش کا قدیم نام یثیل تھا۔ اہل معین کا تیسرا قلعہ یا شہر۔ جو شاید یونانیوں کا بیان کردہ قرن یا قرنا رہو۔ شمالی جوف کے وسط میں معین اور براقش کے شمال میں تھا۔

اہل معین کے شمالی آثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ صرف تجارتی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ جنگ وفتح میں حصہ لیتی تھی۔ شمالی معین کا ایک گورنر اپنے آقا کے بخیر وعافیت میدان جنگ سے واپس آنے پر ایک یادگار لوح پر لکھتا ہے۔

استار (دیوتا) کے شکرانہ میں اُس کی حفاظت پر فرمانروائے جنوب اور فرمانروائے شمال کی باہمی جنگ میں اور مدی (میڈیا) اور مصر کی لڑائی میں اور اُن کے بخیریت اپنے خاص شہر قرن واپس پہونچ جاتے ہیں۔

اس کتبہ کا نویسندہ اپنے کو ابی یدع یثع شاہ معین کا ماتحت ظاہر کرتا ہے۔ اور اپنا لقب قسار آشور وبالائی ساحل بحر کا حاکم بتلاتا ہے۔ قسار کا ذکر مصری کتبات میں بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر وعرب کی سرحد پر جہاں اب سویز ہے۔ قسار کوئی سرحدی قلعہ تھا۔ معین کو ایک دوسرے کتبہ سے حکام معین کا شہر غزہ پر بھی حکومت کرنا معلوم ہوتا ہے۔ شہر غزہ شام و فلسطین کے پاس ابتک موجود ہے۔ ان بیانات سے معلوم ہوا۔ کہ معین کی حکومت یمن سے شروع ہو کر شام ومصر اور اشور (اسیریا) تک ممتد تھی۔

خاندان معین میں کتنے بادشاہ گذرے۔ اور اُن کے کیا نام تھے؟ اس کا جواب نہ خود روایات عرب میں ہے۔ اور نہ مورخین یونان کے بیانات میں۔ اسکے لیے دُنیا کو صرف علمائے آثار کا ممنون ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے معین کے تقریبًا ۲۵ بادشاہوں کے نام دریافت کیے ہیں جن میں

ے ۲۰ باہم ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ ناموں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

ایل صادق	ابی یفع یاثع	ابی یفع یاتوش	عمی یدع نابط	خالی کریب
وقع ایل یاثع	ابی یدع یاثع	ابی یفع وقہ	ابی یفع ریام	حفن یاثع
ابی یفع یاشر	وقہ ایل ریام	وقہ ایل صادق	ہوفا عثت	تمع ایل ریام
حفتم ریام	حفتم صادق	ابی کریب یاثع	ابی یدع	تمع کریب
	ابی یدع	خفتم		

بنی لحیان کی حکومت

منجملہ عرب البادیہ کے رُواۃ عرب بنی لحیان نام ایک قبیلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بنی لحیان کی نسبت وہ صرف اسقدر جانتے ہیں۔ کہ یہ جرہم کی ایک شاخ تھی۔ ابن خلدون نے بھی اسی قدر لکھا ہے۔ آجکل شمالی عرب کے شہر العلا میں چند کتبات سبائی اور عطی قوموں کے پہلو بہ پہلو ملے ہیں۔ جن سے نہ صرف بنی لحیان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ شمالی عرب میں حدود شام میں اور خصوصاً العلا کے اطراف میں آباد تھے۔ خط الحیانی جنوبی عرب کے خطِ معینی اور سبائی سے مشابہ ہے۔ بلکہ اُنہی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۲۹۲)۔

علمائے آثار بنو لحیان کی قوت سیاسی کا زمانہ شمالی عرب میں معین وسبا کے انحطاط (۵۰۰ قم) اور انحطاط کے ارتقاد ۲۰۰ ق م) کے درمیان بتلاتے ہیں۔ بنی لحیان کا مسکن۔ حکومت فارس ومصر کے درمیان واقع تھا۔ ہیروڈٹس بیان کرتا ہے۔ کہ یہ عرب ہر سال ہزاروں وزن بخورات شاہ فارس کو نذر دیتے ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۳۷۹) لیکن یہ نذر غلامی اور عبودیت کی قیمت نہیں تھی۔ بلکہ دوستانہ ہدیہ تھا۔ کیونکہ مورخ مذکور لکھتا ہے۔ کہ اُن عربوں کو (بنی لحیان کو) ابتک کوئی فتح نہ کر سکا۔ (ہیروڈٹس باب ۳ فقرہ ۸)

۵۲۵ ق م میں قمبیز نام شاہ فارس نے جب مصر پر حملہ کرنا چاہا۔ تو صحرائے سینا کا بے آب و دشوار گذار میدان بغیر ان عربوں کی امانت کے قطع کرنا محال تھا۔ شاہ فارس نے اِن عربوں کے پاس ایک سفارت بھیجی۔ کہ وہ اُس کی مدد کریں۔ اور اس ریگستان میں اُسکی فوج کے لیئے پانی کا انتظام کریں۔ شاہ عرب نے امداد کا وعدہ کیا۔ اور پتھر سے اُونگلی پر مار کر خون نکالا۔ جو مستحکم وعدہ کی عربوں میں خاص نشانی تھی پھر اونٹوں کی کھالوں میں پانی بھر کر اس خشک ریگستان کو چشمۂ پُر آب بنا دیا۔

حصارموت یا حضرموت کی حکومت

عبری زبان میں "ض" نہیں ہے۔ اسلیئے عبری میں اسکا تلفظ حضرموت یا حصارموت۔ بزیادت الف کیا گیا ہے۔ حضرموت ابن قحطان کی اولاد نے جس قطعہ عرب کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ حضرموت کے نام سے آجتک مشہور ہے۔ حضرموت بحر عرب کے ساحل پر یمن کے مشرق میں واقع ہے۔

بنو حضرموت کی ایک مستقل حکومت تھی۔ جسکا ذکر یونانیوں نے جا بجا کیا ہے۔ مسلمان مورخین بھی اِس دور حکومت سے واقف تھے۔ عرب مورخین نے حضرموت کی گو مفصل تاریخ کہیں بیان نہیں کی ہے لیکن اتنا اُن کو معلوم تھا۔ کہ سبا کی طرح اِس خاندان میں بھی متعدد بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں۔ انکا لقب عیاہل ہوتا تھا۔ مورخین عرب کا بیان ہے کان فیھم ملوک تقارب ملوک التبابعة فی الصیت ونباھة الذکر شاہان حضرموت شہرت اور ناموری میں ملوک تبابعہ یمن کے ہم درجہ تھے ابن خلدون نے تاریخ میں اِنکے بعض بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔ نشوان بن سعید حمیری نے بھی انکا نام لیا ہے۔

وعیاھل من حضرموت من بنی اجماد ذی الاشباوال صباح والعز من جدن وابنا مرة
وبنی شنیب والاولی بناح وبنی ایھریل وال نھد منھم من کل حش مالندی علیہ ناح

فرزندان حضرموت زیادہ تر لڑائیوں میں مارے گئے۔ برباد ہو گئے۔ اور جو بچے اُنہوں نے اپنے آپکو قبیلہ کندہ میں منضم کر دیا۔ ابن خلدون کی عبارت ہے۔

قد ذھب اکثرھم واندرج باقیھم فی کندة وصار وانی اعدادھم ابن خلدون — اکثر لوگ فنا ہو گئے۔ جو بچے وہ قبیلہ کندہ میں مخلوط ہو گئے اور اُن کا شمار اُنہی میں ہو گیا۔

بنی حضرموت چونکہ بحر عرب کے ساحل پر آباد تھے۔ جو تقریباً جنوبی ہندوستان کے سامنے ہے۔ اِس لیئے ہندوستان کی بحری تجارت کے یہ عہد قدیم سے مالک تھے۔ ہندوستان کا تمام بیوپار اُنہی کے توسط سے انجام پایا تھا۔ جہاز رانی میں اِن کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ اسلام کے بعد اِن کی یہ قوت اور زیادہ ہو کر بنگی جزائر مبند۔ جاوا۔ ساطراہ اور تمام سواحل ہند میں اِن کی نوآبادیاں قایم ہیں۔ دکن کی ریاست حیدرآباد کی فوجی طاقت میں اور مرہٹوں کے زمانہ تک اُن کے عنصر کا ایک جز ثابت ہوتا ہے۔ ان سواحل و جزائر میں اشاعت اسلام کی خدمت بھی انہی حضرموتی عربوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہے۔

حضرموت اُن خوش نصیب عربی قبائل میں سے ہے۔ جنکا نام توراة میں مذکور ہے۔ لیکن افسوس ہو کہ یہ خوش نصیبی نام کی حیثیت سے صرف ایک ہی بار نصیب ہوئی ہے۔ یعنی قحطان کے بیٹوں کے سلسلہ میں

حضر موت کا نام بھی توراۃ میں داخل ہے۔ لیکن حضر موت کے بندرگاہ قانہ یا قانع کا نام تجارت کی مناسبت سے مذکور ہے۔ کتاب حزقیال ۲۷-۲۲ میں ہے۔ حاران۔ قانہ اور عدن سبا کے تاجر تیری بیوپاری تھے۔ یونان نے بھی اسی بحری تجارت اور ہندوستانی بیوپار کے تعلق سے انکا ذکر کیا ہے اراتو ستھنس Eratosthenes. المتوفی ۱۹۶ قم۔ بیان کرتا ہے۔ کہ یمن کے آخر میں مشرق کیطرف حضر موت (Chatramites) ہے اسکے دارالحکومت کا نام سباتھا Sabbatha ہے۔ سباتھا۔ کا اصلی تلفظ شبوہ۔ جو ابتک حضر موت میں ایک آبادی کا نام ہے۔ یہی مصنف آگے چلکر لکھتا ہے: حضر موت زیادہ تر بخورات پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہر قسم کے میوے بھی وہاں وافر اور جانور بھی بکثرت ہوتے ہیں حضر موت سے سبا کا ملک ۴۰ روز کی مسافت پر ہے۔ حضر موت اور سبا نہایت دولتمند شہر ہیں۔ اور مذہبی اور شاہی عمارات سے آراستہ ہیں۔

پلینی (۷۹ء) کہتا ہے۔ سبا کے ایک حصہ کا نام حضر موت ہے۔ جسکا خاص شہر شباتھا (شبوہ) ہے۔ اس شہر میں ۶۰ ہیکل (معبد) ہیں۔ یہاں سے بخورات جمع کرکے سباتھا لائے جاتے ہیں۔ اور اُسوقت تک خرید نہیں کیجا سکتی اور نہ کوئی غیر ملکی ان کو لیجا سکتا ہے۔ جبتک کاہن سباتھا کے دیوتا کیلیے ایک عُشر (دسواں حصہ) اُنسے نکال نہیں لیتا۔ (Dunker's Hist of Antiguity Vol I P.P. 310, 311, 315

ایک یونانی مورخ لکھتا ہے۔ کہ حضر موت میں بادشاہ وراثتاً نہیں ہوتا۔ بلکہ شرفائے ملک کے گھر میں بادشاہ کے انتخاب کے بعد جو پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی ولیعہد ہوتا ہے۔

حضر موت کے آثار کی تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔ ۱۹۱۳ء تک جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اوّل کے طبع کی تاریخ ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضر موت کے پایۂ تخت شبوہ میں سینکڑوں کتبات ایسے موجود تھے۔ جو پڑھے نہیں گئے تھے۔ تاہم جو آثار دریافت ہو چکے ہیں۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضر موت کا تعلق نہایت قدیم زمانہ سے معین کے ساتھ تھا۔ بلکہ حضر موت کا خاندان معین کے ساتھ تعلقات نسبتی بھی رکھتا تھا اور قانہ کا بندرگاہ اور ملک کا ایک ٹکڑا ایک حد تک اُس کے ماتحت تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد حضر موت کا نام سبا کی ماتحتی میں نظر آتا ہے (Histdela Arabee Tom. Vol P. 49)

سبا کا زمانہ ۹۰۰ یا ۱۱۵ قم تک مفروض ہے۔ اِس دور میں بھی حضر موت کی حکومت کا ذکر جنگ صلح کے تعلق سے آتا ہے۔ شاہان سبا کے خطاب شاہی کے ساتھ "شاہ حضر موت" کا لقب بھی نظر آتا ہے۔

سواحل یمن کے دوسری جانب ملک حبش ہے۔ اہل حبش بھی اصل میں سامی عرب تھے۔ اُنہوں نے اپنی نو آبادی قدیم زمانہ میں اپنے وطن کے دوسرے مقابل جانب میں قائم کی تھی۔ اِس زمانہ میں رفتہ رفتہ وہ

بنی سواحل حضرموت پر واپس آرہے تھے۔ تقریباً ۳۰۰ء میں وبالآخر حضرموت پر انہوں نے استیلا حاصل کر لیا۔ (Encye Bri Vol. H. P. 264)

حضرموت کے بادشاہوں کے نام جو کتبات و نقوش میں پڑھے گئے ہیں۔ اُن میں سے ہم کو صرف دو معلوم ہیں۔ صادوق ایل اور معدی کرب (معدی کرب) تصدوق ایل کا پوتا تھا۔ اور معین کے بادشاہ ابی یدع یاثع کا بھجا اور معاصر۔

۱۰ھ میں حجاز و نجد کے معاملات سے فارغ ہو کر آنحضرت صلعم نے حضرت علیؑ۔ معاذ ابن جبل اور ابوموسیٰ الاشعری کو جو اصل میں یمنی تھے۔ دعوت اسلام کی غرض سے یمن میں بھیجا۔ ایک ہی سال کے اندر تمام ملک مسلمان تھا۔ اسی سال زیاد ابن ولید خزرجی یہاں عامل مقرر ہو کر آئے۔ عہد اسلام میں حضرموت کا آخری بادشاہ ہمولا وائل بن حجر تھا۔ حضرموت کی زبان حجاز کی زبان سے مختلف تھی۔ شاہان عالم کے سلسلہ میں وائل کو عربی میں جو خط لکھا گیا تھا۔ وہ حضرموتی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ تھا۔ نامہ مقدس یہ تھا[۱]

[۱] صاحب ارض القرآن نے دعاۃ اسلام فی الیمن کی تفصیل بطور اجمال لکھدی ہے۔ جو مناسبت مقامی کی وجہ سے کسیقدر صحیح بھی مانی جاسکتی ہے۔ گر یہ نظریات بحلہ عام اطلاع کیلئے اکثر اوقات غلط فہمی اور فسادات کثیرہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے اس اجمال کی کسیقدر تفصیل کر دینی واقفیت عامہ کی صحت کیلئے مناسب اور ضروری ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی خدمات دعوت اسلام فی الیمن کا جو ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آپ کی عبارت سے معاذ ابن جبل اور ابوموسیٰ الاشعری کی شارکت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ گویا یہ تینوں بزرگوار علاقہ یمن میں یکوقت بھیجا اور بیک جماعت بھیجے گئے تھے۔ حالانکہ ایسا بیان واقعات کا صریح مخالف ہے۔ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام کا تعین خاص علاقہ ہمدان کی ہدایت کے لیے سنہ ۱۰ھ (حجۃ الوداع) میں ہوا تھا۔ آپکی ماتحتی میں مہاجر و انصار کی ایک معتدبہ جماعت البتہ ہمراہ تھی۔ اسی واقعہ کے متعلق بریدہ صحابی کے وہ غلط فہمی اور بدگمانی جو خالد ابن ولید کی ذہانت اور اشتعالی طبعی کا نمونہ تھی۔ اور جو بالآخر عتاب نبوی کا باعث ہوئی جس پر بریدہ عمر بھر اپنی اس نادانی پر پشیمان رہے۔ پیش آئی۔ یہ خدمات حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے صرف اعجاز بیانی اور حسن زبانی سے جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں لائے گئے۔ اس کی تصدیق و توثیق کے لیے ترجمان قدرت اور زبان رسالت کے کلمات۔ السلام علی الہمدان۔ السلام علی الہمدان (بمراتہ ثلاثہ) کافی ہیں۔ انکے بعد دربار نبوت سے انہی خدمات کے جلدو میں اقضاکم علیناً کا خطاب گرانمایہ عطا فرمایا گیا۔ کما لا یخفیٰ علی الاصحاب التحقیق واقعات کے خلاف تو یہ بیان یوں ظاہر ہوا کہ اب اصل امر کی تفہیم میں باعث فساد اس طرح ہوتا ہے۔ کہ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام کی خصوصیات کا منافی ثابت ہوتا ہے۔ اسلیے کہ آپکی تمام اسلامی خدمات بلا شارکت احدے و بے مداخلت غیرے تمام آثار معتبر اور اخبار مستند و معتمد سے ثابت ہوتے ہیں۔ قبول اسلام سے لیکر وفن رسول صلعم تک آپکی خدمات کی شان بالکل تنہا ہے۔ کسی دعوت۔ کسی سرایہ میں آپ کو کسی افسر اسلامی کی تبعیت یا شارکت کی تکلیف نہیں دی گئی۔ نزول سورۂ توبہ

من محمد رسول اللہ الی الاقیال العیاہلہ والارواع المشابیب ..... فی التبعة لا مقورتہ الباطو لاخناک وانطوا بثبجة وفی السیوب الخمس ومن زناھم بکر واصفعوا مائة واستوفقوہ عاماً ومن زناھم ثیب فضوجوہ بالاضامیم ولاتوا ..... فی الدین۔

سبا کی حکومت

امم قحطانیہ کی سب سے مشہور ترین شاخ سبا ہے ایک طرف روایات عرب۔ حکایات یونان اور آثار قدیمہ ہیں دوسری طرف قرآن مجید۔ توراۃ، زبور۔ اور انجیل میں اسکی شہرت و رفعت کی داستانیں اور واقعات موجود ہیں۔ نام۔ توراۃ میں سبا ایک جد قبیلہ کا علم ہے۔ بروایت عرب اس کے جد قبیلہ کا نام عمر یا عبد الشمس اور لقب سبا تھا۔ محققین جدید بھی زیادہ تر اسکو لقب خیال کرتے ہیں۔ لغویئین عرب کی رائے ہے کہ یہ "سبی" سے مشتق ہے جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں، چونکہ عبد الشمس بہت بڑا فاتح تھا۔ اور اُسنے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرکے غلام بنایا۔ اس لیئے اُسکا لقب سبا قرار پایا۔

تحقیق جدید یہ ہے۔ کہ سبی اور سبا۔ اُس معنی سے ماخوذ ہے۔ جس کا مفہوم تجارت ہے۔ کتبات میں عموماً سبا کا لفظ تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت اور خرید و فروخت اور اُس کے لیئے "سفر" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ سبا چونکہ تاجر قوم تھی۔ اس لیئے اس لقب سے مشہور ہوئی ہے[۵۱] (Encyclo Brita Vol 23 P. 955)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے موقع پر، احکام عشرہ کی تبلیغ کیلئے۔ بذریعہ وحی تاکیداً مقرر کیا جانا، اسکا کافی ثبوت ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کثیر کہ کے اتنے بڑے کثیر مجمع میں اسلام کی تبلیغ دعوت اس سے بڑھ کر اور کون ہو سکتی ہے۔ یہ تو دعوت تبلیغی کی مثال ہوئی۔ سرایا اور جنگی خدمات کی نسبت ذوالعشیرہ سے لیکر جیش اسامہ کے آخر واقعہ تک جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام کی تبعیت اور ماتحتی کسی سریہ میں کسی تاریخ و مغازی کی کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔ آپکے کامن خدمات کی یہ ندرت صاف صاف ثابت کر رہی ہے۔ کہ قدرت نے یہ خصوصیت آپکی ذات میں خاص طور پر ودیعت فرمائی تھی۔ پھر ایسی تخصیص کو ضرورتاً بغیر ضرورتاً شراکت کے غیر واقع اور قیاسی مداخلت کے ساتھ تعمیم کی صورت میں ظاہر کرنا تنہا، اُس تخصیص کے شرف خاص کی تخفیف کرنا ہے۔ بلکہ اصل واقعہ کی تضعیف اور اُس میں تحریف کرنا ہے۔ جو نہ اطلاع کے لیئے مفید ہو سکتی ہے اور نہ اہل تحقیق کو کوئی نفع پہونچا سکتی ہے۔ فافہم فتدبر۔ المولف الاحقر سید اولاد حیدر بلگرامی

۵۱ سبا کی وجہ تسمیہ میں فاضل ساجھ نے دو قول تحریر فرمائے ہیں ایک لغویین عرب کا سرا علمائے آثار یعنی مستشرقین یورپ کا جو ایک

زمانہ حکومت

سبا کا زمانہ عروج کب سے شروع ہوتا ہے؟ روایات عرب میں براہ راست اسکا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن تمام مورخین اور اہل نسب نے عبد الشمس سبا کو قحطان کا پوتا بتلایا ہے۔ یہ ان کی حکومت کا زمانہ ۴۸۴ برس بتلاتے ہیں۔ (مسعودی جلد ۱ صفحہ ۱۹۳ مصر)۔

اسکے بعد اسکا جانشین۔ اُنکی تصریح کے مطابق حمیر ہوتا ہے۔ بقاعدۂ عام۔ عبد شمس سے اگر عبد الشمس کا خاندان مراد لیا جائے۔ تو قحطان کی تیسری پشت سے۔ جو کم از کم ۲۵۰۰ ق م میں ہوگی۔ اسکا زمانہ شروع ہوکر ۴۸۰ برس کے بعد ۲۰۰۰ برس کے بیس و بیش میں ختم ہوجاتا ہے۔ حالانکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ (۹۵۰ ق م) کی معاصرت قرآن مجید۔ اسفار یہود اور انجیل سے اس کے ایک ہزار برس کے بعد بھی ثابت ہے۔

اسفار یہود میں سبا کا حکومت کی حیثیت سے ذکر سب سے پہلے حضرت داؤدؑ کی زبور (۱۰۲۷ء) میں نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ۱۱۰۰ ق م سے پہلے عہد عروج شروع ہوچکا تھا۔ اسیریا کے کتبات میں ۷۱۵ ق م میں اِسکا (سبا کا) ایک بادشاہ اسیریا کو خراج دیتا ہے۔ اور یہ سبا کی ترقی کا آخری زمانہ ہے۔ آخر میں ولادت مسیحؑ کے بیس و پیش یونانی تاریخوں میں بھی اسکا ذکر ہے۔ اِس سے سبا کا آخری زمانہ ظاہر ہوتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ علمائے لغت کا جو قول اور مختار نقل فرمایا گیا ہے۔ وہ علمائے آثاریین مستشرقین یورپ کے بیانات اور قیاسات سے زیادہ قریب الفہم اور آسان ہے۔ مگر ہمارے فاضل معاصر نے مستشرقین یورپ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے لائق محقق کو فیصلے سے پہلے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ جانبین نے لفظ عربی کے مادی معنیوں سے کام لیا ہے۔ مگر عرب نے لفظ کے اصلی اور پہلے معنی سے مطابقت کی ہے۔ اور اُنکی مطابقت سبا کے فتحمندانہ واقعات سے بالکل مناسبت رکھتی ہے۔ ان کے خلاف مستشرقین یورپ نے اِس لفظ کے معنی مجاز اور درجہ دوم کے معنیوں سے کام لیا ہے۔ جس کے مجازی اور اصطلاحی معنی شراب کی تجارت اور اُس کی ضرورت سفر کے عربی لغت سے ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ معنی بمرتبہ دوم لغت عرب میں پائے جاتے بھی ہوں تاہم واقعات سے مطلق تعلق نہیں رکھتے۔ کیونکہ گر سبا کو تجارت پیشہ سمجھ بھی لیا جاوے۔ تو شراب کی اصلی اور خاص تجارت کے مفہوم کہاں سے پیدا کئے جائیں گے۔ کتبات کی عبارت نہ واقعات کی صورت۔ تاریخ و سیر کی نقل و تحریر سے سبا اور اہل سبا کی تجارت شراب کی تو کوئی خصوصیت نہ مستشرقین یورپ ہی نے بتلائی۔ نہ آپ ہی نے درج فرمائی۔ تو پھر ایسی حالت میں آپکے اس دعوے بے دلیل کو کیسے صحیح کہا جاسکتا ہے۔ اور اس بنا پر مستشرقین یورپ کی وجہ تسمیہ صرف اُن کی قیاسی اور غلط فہمی سمجھی جائے گی۔ اور لغویتیں عرب کی بتلائی ہوئی آسان اور قریب الفہم وجہ تسمیہ کے مقابلہ میں آپ کے مصطلحات غیر مروجہ کو چاہ کندن و کاہ بر آوردن سے زیادہ وقعت نہیں دیجائے گی۔

المولف سید اولاد حیدر عفی عنہ

کتبات یمن اور حضرت داؤد کی زبور کے اسناد سے جس کی تدوین کا زمانہ دسویں صدی کا وسط ہے۔ سبا کے عروج کا زمانہ سنہ ۱۱۰۰ ق م سے کسی حال میں کم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دائرہ یا رقبہ حکومت

سبا کا اصلی مرکز حکومت۔ جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ اسکا دار الحکومت شہر مآرب تھا لیکن رفتہ رفتہ اسکا دائرہ مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا تھا۔ اور چونکہ یہ ایک تاجر قوم تھی۔ اس لیے بہت سے بحری اور تجارتی (برّی) راستوں پر بھی اسکو قبضہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی سلسلہ میں شمالی عرب پر سبا کی حکومت نظر آتی ہے۔ اور افریقہ میں بھی اُسکے آثار ملتے ہیں، حبشہ میں اذینیہ کا ضلع سبا کے ماتحت تھا اس ضلع پر معافر کے لقب سے ایک گورنر حکومت کرتا تھا (Encyclo Brit Vol 23 P 955) یمن سے براہ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی راستہ تھا۔ یہ بھی سبا کے قبضہ میں اُسوقت نظر آتا ہے۔ اور اُس پر جابجا اُن کی نوآبادیاں قائم معلوم ہوتی ہیں۔ غالباً ان مقامات پر سبا کا قبضہ و استیلا نویں یا آٹھویں صدی میں اہل معین کی مفتوحی کے بعد ہوا ہوگا۔ اسیریا کے بادشاہ سرجون کے ایک کتبہ میں جو ۷۱۵ ق م کا ہے۔ شمالی عرب کے چند قبائل کا ذکر ہے۔ ان میں ایک کا نام یثعمر سبائی ہے۔ یہ سرجون کو خراج دیتا تھا (Encyclo Brit) سرجون کا یمن تک جانا آثار سے ثابت نہیں۔ اس لیے لامحالہ خود سبا کا گذر وہاں تک ہوا ہوگا۔ اس واقعہ سے سبا کی حکومت کا رقبہ شمالی عرب میں عراق تک ثابت ہوتا ہے اور سبا کی حکومت کا ان اطراف میں بھی سراغ ملتا ہے۔ (سفر ایوب ۱-۱۵) میں ہے۔ کہ سبا نے اور اہل سیریا نے حضرت ایوبؑ کے غلام اور جانور لوٹ لیے۔ پھر صحیفۂ ایوب ۶-۱۹ میں ہے۔ کہ سبا کے ساتھی تیما کی سواریاں کا انتظار کرتے ہیں) تیما شام کے پاس شمالی عرب میں ایک شہر ہے۔ اس آیت سے سبا اور شام کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔ دیگر اسفار یہود میں بھی سبا کا بکثرت ذکر موجود ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ملک شام فلسطین اور مدائن کے آس پاس بھی ان کی نوآبادیاں تھیں۔

سبا اور اُس کی شاخوں میں امتیاز

تمام عرب مورخین نے حمیر کو سبا کا بلا واسطہ جانشین فرض کیا ہے۔ اور اُن تمام ملوک یمن کو جو اس سلسلہ میں اول سے آخر تک گذرے ہیں۔ اُن کو حمیر بن سبا اور ملوک حمیر بن سبا سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر مستقلاً خاص سبا کے نام سے کسی زمانہ میں بھی اُن کے اصول کے مطابق کوئی حکومت نہ تھی۔ لیکن یہ تصریح قرآن کی بالکل مخالف ہے۔ اُس نے حمیر کے بلا توسط حکومت سبا کا صاف اور صریح نام لیا ہے۔ اور تمام عبرانی یونانی اور اثری شہادات قرآن کے ساتھ ہیں۔ عبرانی صحائف جنکا زمانہ آخر ۱۱۰۰ ق م ہے۔

حکومت یمن کا ہمیشہ سبا کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ یونانی مورخین نے سنہ ۲۰ ق م سے پہلے حمیر کا نام نہیں لیا ہے۔ آثار میں سنہ ۱۱۵ ق م کے بعد خاندان حمیر کا وجود نظر آتا ہے۔

مورخین عرب نے ایک بڑی غلطی یہ کی۔ کہ حمیری بانی حکومت سے حمیر ابن سبا تک جتنے آبائی نسب تھے اُن سب کو بادشاہ قرار دیکر وہیں سے حمیری حکومت قایم کردی۔ حالانکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک فرزند قبیلہ جو اتفاق سے ایک سلطنت کا بانی ہوجائے۔ اُس سے لیکر پدر قبیلہ تک اُس کی سلطنت مسلسل ہو ابوالعباس السفاح عباسی حکومت کا بانی تھا۔ لیکن اس خاندان کے پدر اول حضرت عباس اس سے پانچ چھ پشت پہلے ہیں۔ اس بنا پر نسب عباسی کی ابتدا حضرت عباس سے بیشک کی جائے گی لیکن ظاہر ہے۔ کہ حکومت عباسی کی ابتدا حضرت عباس سے نہیں۔ بلکہ السفاح سے کیجائے گی۔ اسی طرح نسب حمیری کی ابتدا سبا ابن حمیر سے ہوئی لیکن حکومت حمیری اس کے سینکڑوں برس بعد قایم ہوئی اور نسب خاندانی کے لحاظ سے صحیح طور پر اسکو حمیری کہا گیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ حمیر ابن سبا نے خود اس کی بنیاد بھی ڈالی۔ معاویہ اور اُس کے جانشینوں کی حکومت کا نام اُموی ہے۔ لیکن کیا اسکا مفہوم یہ ہے۔ کہ خود اُمیہ اسکا بانی تھا۔

سبا کو چھوڑ کر سبا کی متفرق شاخوں میں جو بادشاہ گذرے ہیں۔ اُن کے نام و تعداد و حالات کسی قدر زیادہ روشن ہیں۔ اُن کی بنا پر اُنکا زمانہ ۵ یا ۶ سو سے زیادہ نہیں۔ جیسا کہ تاریخ حمزۂ اصفہانی کی تاریخ میں ایام ملوک آل غسان اور ملوک مناذرہ کے ازمنہ کے جمع کرنے اور حمیر کے زمانوں کی تعدیل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی انتہائی حد معلوم ہے۔ یعنی تقریباً سنہ ۶۰۰ عیسوی جو ظہور اسلام کا زمانہ ہے اس حساب سے ان کا زمانۂ تفرق سنہ ۱۱۵ ق م یا علی العموم پہلی صدی ق م ہونا چاہیے۔ اور یہ وہی زمانہ ہے جسکو گلازر وغیرہ نے ابتدا حمیر اور انتہائے سبا کے لیے ازروئے آثار مقرر کیا ہے۔ اس لیے اس زمانۂ تفرق اور تفرع سے پہلے فرزندان سبا کا جو مشترک زمانہ تھا۔ حکومت سبا سے وہی عہد مراد ہے۔

فرمانروایان سبا۔

حکومت سبا کا نام تحریری حیثیت سے سب سے پہلے سنہ ۱۰۰۰ ق م میں حضرت داؤدؑ کے عہد میں نظر آتا ہے اس زمانۂ بعید العہد میں بھی سبا کی دولت و حشمت ہمسایہ بادشاہوں کی نگاہ میں قابل رشک تھی حضرت داؤدؑ زبور میں کہتے ہیں۔

"اُلٰہی اپنے بادشاہ کو اپنا فیصلہ عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو راستی۔ ...... شبا اور سبا کے بادشاہ اُس کو دینگے۔ اور سبا کا سونا اُس کو پیش کیا جائے گا"

بادشاہ داؤد کی دعا قبول ہوئی۔ اور بادشاہ کے بیٹے سلیمانؑ کی بارگاہ میں سبا کے بادشاہ نے نذر دی اور سبا کا سونا اُسے پیش کیا۔ سنہ ۹۵۰ ق م میں جو تقریباً حضرت سلیمان کا عہد ہے۔ از روئے قرآن و توراۃ سبا پر ایک عورت حکمران تھی۔ رواۃ عرب اس عورت کا نام بلقیس بتاتے ہیں۔ لیکن بلقیس کا جو زمانہ وہ قرار دیتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ مفصل بحث آگے آئے گی۔

سرجون یا شرغون شاہ اسیریا کے عہد میں جسکا زمانہ ۷۲۱ تا ۷۰۵ ق م ہے۔ ملک سبا پر شیعم نام بادشاہ تھا۔ سرجون نے اپنے ایک یادگاری کتبہ پر لکھا ہے۔ کہ اُسکو...... ثمود...... شمسیہ ملکہ عرب (عربی) اور شیعم سبائی نے خراج دیا (Roger's Hiot of Bible Vol II 164) یہ متفق ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ سرجون یمن تک نہیں پہونچا۔ اس لیے یہ ظاہر ہے۔ کہ خود سبا حدود اسیریا تک پہونچ گئے تھے۔ اس کی تائید سفر ایوبؑ سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں کلدان۔ اسیریا اور سبا کو باہم متحد اُحدود شمالی عرب میں ظاہر کیا گیا ہے۔

شیعم سبا کی متعدد بادشاہوں کے نام ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ شیعم بھی ہے۔ جس نے دار الحکومت مآرب میں سد عرم کی بنیاد ڈالی۔

عرب مورخین نے چونکہ سبا اور حمیر میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ اس لئے سلسلہ حمیر سے الگ اُنہوں نے کسی بادشاہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ حمیر کے اُنہوں نے دو ٹکڑے کئے ہیں۔ ملوک حمیر اور تبابعہ حمیر۔ ملوک وہ ہیں۔ جو صرف ملک یمن حکمران تھے۔ تبابعہ وہ ہیں۔ جن کے ماتحت یمن و حضر موت دونوں تھے۔ ان کی تحقیق کی مطابقت سے سب سے پہلا تبع۔ حارث الرائش ہے۔ ملوک حمیر کی تعداد اُن کے ہاں بہت کم ہے۔ بلکہ بعضوں نے تو اس طبقہ کو بالکل حذف کر دیا ہے۔ وہ حمیر بن سبا کے بعد فوراً بلا واسطہ یا چند واسطہ حارث الرائش کا نام لیتے ہیں۔ حالانکہ حمیر اور رائش کے درمیان کم از کم ہزار برس کا فصل ہے جس کی رخنہ بڑی صرف مخصوص مورخین نے کی ہے۔ لیکن وہ باہم اس قدر مختلف ہیں۔ کہ نتیجتاً اُن سب کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے۔ اس بے اعتباری کی بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ بجز چند ناموں کے اِن میں سے کوئی نام سبائی اسماء کے طرز کا نہیں ہے۔ حالانکہ ناموں کے اسلوب و طرز کو قومیت کی تعیین میں قومیت بڑا دخل ہے۔ بہر حال مثالاً چند نام مختلف روایات مستندہ سے یہ درمیانی نام پیش کئے جاتے ہیں۔

نمبر	نشوان ابن سعید حمیری	قلقشندی	ابو الفدا	ابن خلدون	مسعودی
۱	سبا	سبا	سبا	سبا	سبا
۲	حمیر	حمیر	حمیر	حمیر	حمیر
۳	الیسع	المیسع	وائل	وائل	کہلان
۴	ایمن	ایمن	الکسک	الکسک	ابو مالک
۵	زہیر	زہیر	یعفر	یعفر	جبار ابن غالب
۶	عدیب	عدیب	ذُو ریاش	نعمان	حارث الرائش
۷	الغوث	قطن	نعمان	ذُو ریاش	
۸	وائل	الغوث	اشمح	اشمح	
۹	عبد الشمس	وائل	شدّاد	حارث الرائش	
۱۰	زہیر الصوار	عبد شمس	لقمان		
۱۱	ذو یقدم	زرعہ حمیر اصغر	ذو سدد		
۱۲	ذو انس	شدد	الحارث الرائش		
۱۳	عمر	الحارث الرائش			
۱۴	الملطاط				
۱۵	القلیص				
۱۶	سدد				
۱۷	الحارث الرائش				

غالباً اسی اختلاف کی وجہ سے حمزہ اصفہانی نے حمیر بن سبا اور حارث الرائش کے درمیان کے نام چھوڑ دیئے اور مجملاً لکھتا ہے۔ کہ حمیر بن سبا انتہائی عمر کو پہونچکر مر گیا۔ اُس کی نسل اُسکے بعد وراثتاً حکومت کرتی رہی۔ اور اُنکے خاندان سے نکلکر یمن کی مملکت دوسروں کو نہیں ملی۔ یہانتک کہ صدیاں گذر گئیں اور حکومت حارث الرائش کے ہاتھ میں آئی۔ یہ پہلا تبع ہے۔ حارث سے پہلے حکومت یمن اور حضر موت دو گروہوں پر منقسم تھی۔ کل اہل یمن ایک بادشاہ پر متفق نہ تھے۔ لیکن حارث الرائش جب بادشاہ ہوا۔ تو سب اُسپر متفق ہوگئے۔ اور اُسکے تابع بنے۔

ہلیئے نام اُسکا تبع پڑا۔ حارث الرائش اور حمیر ابن سبا کے درمیان پندرہ پشتیں ہوئیں۔ حمزۃ اصفہانی کلکتہ ص ۱۸۸

اِس عبارت میں آخری فقرہ کے علاوہ اور سب فقرے نہایت محتاط اور قابل قبول باتیں ہیں۔ ملوک حمیر بن سبا کی ابتدا کم از کم ۱۱۵۰ ق م سے یعنی زمانہ داؤدؑ سے ہو۔ تو تبابعہ حمیر کے پہلے ملوک حمیر یا سبا کے لیے ۹۰۰ برس رہتے ہیں۔ اگر ایک ایک بادشاہ کا اوسط زمانہ ۲۵ برس بھی فرض کیا جائے۔ تو کم از کم اِس عرصہ میں ۳۶ پشتیں ہوں گی۔ اس لیئے حمیر بن سبا کے صرف یہ لینے چاہئیں۔ کہ حمیر جو سبا کی اولاد در اولاد میں تھا۔ جو تقریباً ۱۱۵ ق م میں دولت حمیریہ کا بانی ہوا۔ اس حمیر اور حارث الرائش کے درمیان پندرہ پشتیں ہونا ممکن ہے۔

بہر حال رواۃ عرب نے تبابعہ حمیر سے پہلے کے جو نام ملوک حمیر کے نام سے بتلائے ہیں۔ وہ بہت کچھ محتاج تصحیح و تنقید ہیں۔ آثار و کتبات نے یونان و روماں کی مدد سے تاریخ یمن کا جو حصہ روشن کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ در حقیقت اشارہ قرآن کے مطابق حکومت یمن کے دو مستقل دَور۔ دو مستقل ناموں سے ہیں۔ سبا اور حمیر۔ سبا کی انتہا معلوم و متفق ہے۔ کہ وہ ۱۱۵ ق۔ م ہے۔ (Encycl. Brit II P. 254) اور یہی سال حمیر کی ابتدا کا ہے۔ سبا کی ابتدا ہم نے بوجوہ سابقۃ الذکر (سبا کا زمانہ) ۱۲۰۰ ق م سے شروع کی ہے۔ اس بنا پر حمیر سے پہلے حقیقی سبا کی تاریخ ۱۰۸۵ برس پر مشتمل ہوگی۔ جس میں کم از کم ۵۰ یا ۵۴ بادشاہوں کی پشتیں گذرنی چاہئیں۔

مکارب سبا

باعتبار کتبات دَور سبا کے دو طبقے نظر آتے ہیں۔ پہلے طبقہ میں شاہان سبا کا لقب مکارب سبا لکھا ہے۔ اُسوقت ان کا مرکزی شہر یا قلعہ صرواح تھا۔ مکارب دو لفظ سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔ "مکا" اور "رب" ہے۔ مکا کے معنی "مذہبی" کے ہیں۔ اور "رب" کے معنی بڑے اور بادشاہ کے ہیں۔ اسلیئے مکارب کے معنی "مذہبی بادشاہ" یا کاہن بادشاہ کے ہیں۔ الغرض مکارب سبا حکومت سبا کے ابتدائی کاہن بادشاہوں کا لقب تھا۔ صرواح جو اِن کاہن بادشاہوں کا دار الحکومت تھا۔ اُس کے آثار اب تک مآرب اور صنعا کے درمیان میں باقی ہیں۔ صرواح سے عرب بھی واقف تھے۔ عمر بن نعمان بن سعد بن غولان کہتا ہے۔

ابونا الذی کانت بصرواح دارہ ہمارا باپ تھا جس کا مسکن صرواح تھا	وفی جبلی نعمان عز تمکنا اور نعمان کے دو پہاڑوں میں عزت متمکن ہوئی

علقمہ۔ جاہلیت کے زمانہ کا شاعر کہتا ہے۔

من یامن الحدثان بعد	ملوک صرواح و مارب

اب کون ہے حوادث سے محفوظ رہسکتا ہے	صرواح اور معارب کے بادشاہوں کے بعد ابو علقم مرانی. قصور یمن کے ذکر میں لکھتا ہے
ونحن ارباب صرواح وردوثانا	براقش ومعین نحن عامرها
اور ہم ہیں مالک (رب) صرواح اور ردوثان کے	براقش اور معین کے آباد کرنیوالے ہم ہیں

مکارب سبا کے نام

مکارب سبا کے جو نام کتبات کے ذریعہ سے اسوقت تک دریافت ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں۔ سوائے آخر نام کے ہر ایک کو دوسرے سے نسبی تعلق ہے۔ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ تاریخ و سیر کے علاوہ کتبات کی بکھری والی لکیریں بھی ان کی یاد قائم نہ رکھ سکیں۔ اور صورت دیوار خاموش رہ گئیں۔ ان کا عروج سلطنت ۸۰۰ تا ۹۰۰ ق م میں سمجھنا چاہیے۔ مکارب سبا کے نام یہیں الفاظ کے فصل کے لئے نقطہ اصل سبائی خط مندرجہ کتبات کے مطابق ہیں۔[1]

۱	ذمرعلی۔ مکارب۔ سبا۔	متحدّ خاندان
۲	کرب ایل وتار۔ بن۔ ذمرعلی	
۳	سمہی علی۔ نیوف۔ بن ذمرعلی	
۴	یثع امر بیّن۔ بن سمہی علی۔ نیوف	
۵	یدع ایل۔ ذرّح۔ بن سمہی علی۔ نیوف	
۶	یثع امر۔ وتار۔ بن سمہی علی۔ نیوف	
۷	کرب ایل۔ بیّن۔ بن یثع امر۔ وتار۔	
۸	یدع ایل۔ بیّن بن۔ یثع امر وتار۔	〃
۹	سمہی علی۔ نیوف۔ بن یثع امر وتار۔	
۱۰	ذمرعلی۔ وتار۔ بن کرب ایل۔ بیّن۔	
۱۱	یدع ایل۔ ذبی۔ مکارب۔ سبا۔	(یہی ایک جداگانہ نام معلوم ہوتا ہے)

آسانی سے سمجھ لینے کیلئے ہم خاندان مکارب مذکورۂ بالا کا ایک شجرہ مرتب کرکے ذیل میں تحریر کیے دیتے ہیں۔

---

[1] یہ فہرست ہالیوے J. Holway کے شائع کردہ اصل کتبات سبا سے جو خط عبری جرنل ایشیاٹک Jornal Asiatique بابتہ ماہ دسمبر ۱۸۶۹ء پیرس میں چھپے ہیں۔ التقاط کی گئی ہے اور اسکی تطبیق (Huart Tome Vol I P56) سے کر لی ہے

شجرۂ خاندان مکارب

ذمر علی مکارب سبا

(۱)

- کرب ایل وتار (۲)
- سمہ علی ینوف (۳)
  - یثع امر بین (۴)
  - یثع امر وتار (۵)
    - کرب ایل بین (۷)
      - ذمر علی وتار (۱۰)
    - یدع ایل بین (۸)
    - سمہ علی ینوف (۹)
  - یدع ایل ذرح (۶)

ملوک سبا

شاہان سبا کا زمانہ ۵۵۰ ق م تک نظر آتا ہے۔ اس عہد میں ان کا لقب۔ ملک سبا منقوش ملتا ہے ان کا دار الحکومت شہر مآرب تھا۔ یہ شہر یمن کے مشرق میں واقع تھا۔ اور اسکا دوسرا نام شہر سبا تھا مآرب کے قصر شاہی کا نام سلحین تھا۔ سکوں میں۔ دار الضرب۔ "بیت سلحین وحصن مارب" منقوش ملتا ہے۔ مآرب تو مشہور مقام ہے۔ مگر سلحین بھی غیر معروف نہیں۔ عرب جاہلیت کا شاعر علقمہ لکھتا ہے۔

وقصر سلحین قد عفا ہ	ربّ الزمان الذی یریب

یہی شاعر دوسری جگہ کہتا ہے۔

ادما ترتی وکل شئ للبلی	سلحین خاویۃ کان لم تعمر

ابو علقم مُرانی کہتا ہے۔

وقصر سلحین علاہ وشیدہ	کہلان والذناع احب بکہلان

۵۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک ۴۳۵ برس ہوتے ہیں۔ جو تقریباً اس عربی روایت کے مطابق ہے کہ سبا نے ۴۸۴ برس حکومت کی۔[1] اس زمانہ مدید کیلئے، ملوک سبا کے نام ہم کو ملے ہیں۔ جو تقریباً مفروضہ مدت زمانہ کے برابر ہیں۔ اور وہ نام یہ ہیں۔

---

[1] مروج الذہب مسعودی ج ۱ ص ۱۹۳ مصر۔

۱ سمہی علی۔ ذرح۔ ملک سبا
۲ کرب ایل۔ بن سمہی علی۔ ذرح ملک سبا
۳ کرب ایل۔ بن سمہی علی۔ ذرح ملک سبا
۴ سمہی علی بن الیشرح۔ بن سمہی علی
(متحد خاندان ہے)

۵ یثع امر۔ ملک سبا۔
۶ کرب ایل۔ وتار۔ بن یثعم۔ امر
۷ یدع ایل۔ بیّن۔ یثع۔ امر
(متحد خاندان ہے)

۸ وہب ایل۔ وتار۔ یوہنعم۔ بن وہب ایل
۹ وہب ایل۔ یاخوذ۔ ملک سبا۔
۱۰ کرب ایل۔ وتار۔ یوہنعم۔ بن وہب ایل
۱۱ یوین۔ بن وہب ایل۔ ملک سبا
(متحد خاندان ہے)

۱۲ ذمر۔ علی ذرح۔ ملک سبا
۱۳ نشاکرب۔ یوہیں۔ ملک سبا
(متحد خاندان ہے)

متفرق نام

(۱۴) تبروم۔ یوہیمن۔ ملک سبا (۱۵) یکرب۔ ملک۔ وتار۔ ملک سبا۔ (۱۶) یارم۔ ایمن۔ ملک سبا (۱۷) تبع شرحبیل۔ ملک سبا (۱۸) فرع نیہب۔ ملک سبا۔

ان ناموں کے علاوہ کتبات میں اور نام بھی پڑھے گئے ہیں۔ لیکن اُن کے ساتھ کوئی لقب شاہی نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ کہ امرآئے سبا ہوں۔ فرع ہیںنب کا نام سب سے آخر اس لیئے قرار دیا گیا ہے۔ کہ ایک کتبہ میں "الیشرح ملک سبا وذوریدان...... بن فرع نیہب ملک سبا" منقوش ہے۔ اس سے ثابت ہے۔ کہ فرع نیہب۔ ملک سبا کے لقب سے آخری شخص تھا۔ اسکا بیٹا ملک سبا۔ ذُوریدان کے نام سے تیسرے طبقہ کا بانی ہے۔

سبا کی تقسیم و تنظیم

مملکت سبا کی حقیقت سمجھنے کے لیئے پہلے یہ جاننا چاہیئے۔ کہ مملکت یمن کس اصول پر منقسم تھی۔ اور امرا کی ترتیب و تنظیم کیونکر تھی۔ ایک قلعہ ہوتا تھا۔ قلعہ کے آس پاس گاؤں کی صورت میں مختلف چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہوتی

تھیں۔ انہی کے مجموعہ کو مخلاف کہتے تھے۔ قلعہ دار گاؤں کا حاکم ہوتا تھا۔ اسکا لقب اسکے قلعہ کی انتساب و اضافت سے ہوتا تھا۔ مثلاً ذو غمدان۔ ذو ثعلبان اور ذو ینین۔ ذو یمنی زبان میں کلمہ اضافت ہے جسکے معنی آقا کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے حجازی عربی میں اسکے معنی صاحب اور مالک کے ہیں۔ اور بغیر اضافت مستعمل نہیں ہوتا۔ اس "ذو" کی جمع اذواء ہے۔ زبان یمن میں بمعنی قلعدار کے مستعمل ہوتا ہے۔

یہ قلعے یا محافد ملکر ایک مخلاف کے تابع ہوتے تھے۔ جسکو صوبہ کا ہم معنی سمجھنا چاہیئے۔ حاکم مخلاف کا لقب قیل تھا۔ اسکی جمع اقیال ہے۔ عام طور سے مشہور ہے۔ کہ اقیال یمن کے بادشاہوں کو کہتے ہیں محفد اور مخلاف کی یہ تقسیم عہد اسلام میں بھی باقی رہ گئی تھی۔ دولت عباسیہ کے زمانہ میں ۸۴ مخلاف تھے یہ تمام اقیال ایک بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ جسکا نام باختلاف عہد مکارب سبا اور ملک سبا تھا۔

ان اذواء و اقیال اور ملوک میں امن و اطمینان اور نظام کی زندگی بہت کم قایم رہتی تھی۔ قوی ضعیف کے ماتحت ہوجاتے تھے۔ جو "ذو" یا "قیل" قوی ہوجاتا تھا۔ وہی بادشاہ بن بیٹھتا تھا۔ عموماً بادشاہ کسی قلعہ میں سکونت کرتا تھا۔ اس قلعہ کی طرف بھی سکونت القاب شاہی کا جزو ہوتی تھی۔ مثلاً ملک سبا قلعہ ریدان میں رہتا تھا۔ اسکا لقب شاہی۔ ملک سبا ذو ریدان تھا۔

سبا کے تمدنی اور تجارتی حالات

حکومتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ صلح پسندانہ اور فاتحانہ۔ بابل۔ اسیریا اور مصر کی حکومتیں فاتحانہ تھیں ان کے آثار و کتبات فتوحات کی یادگاروں سے پڑ ہیں۔ لیکن یمن کی حکومت بالکل صلح پسندانہ تھی۔ سبا کے جتنے کتبات دیکھے گئے ہیں۔ جن کی تعداد ۳۰۰۰ سے کم نہ ہوگی۔ وہ تمام تر یا تو مقابر کی رحلیں ہیں۔ یا عمارتوں کے پتھر ہیں۔ یا دیوتاؤں کے ہیکل ہیں۔ مدیح پرند زدوشکو کے سپاس نامے ہیں۔

ہم نے پہلے بتلادیا ہے۔ کہ سبا ایک تاجر قوم تھی جس کی صحیح مثال موجودہ تاریخ (وقت) میں حکومت برطانیہ ہے۔ عرب کے ملک میں کثرت سے سونے اور چاندی کی کانیں تھیں۔ اور اب بھی ہیں۔ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں ص ۲۵۰ مطبوعہ لنڈن میں ان کانوں کا ایک ایک کرکے نام گنوایا ہے ڈاکٹر اسپرنگر نے ان تمام بیانات کو اپنے جغرافیہ عرب قدیم میں جمع کیا ہے۔ خدیو مصر کے اشارے سے برٹن نامی ایک انگریز عرب کے شہر مدین میں صرف وہاں کے معدنیات کا پتہ لگانے کو بھیجا گیا تھا۔ حضرموت اور یمن کا ملک خوشبودار چیزوں کی پیداوار کے لیے طبعی طور سے مخصوص ہے۔ اُس زمانے میں تمام دنیا میں دیوتاؤں کی عام طور پر پرستش کی جاتی تھی۔ ان کے لیے بڑے بڑے ہیکل بنائے جاتے تھے۔ ان ہیکلوں میں شب و روز خوشبودار لکڑیاں جلائی جاتی تھیں۔ اس لیے قدیم زمانہ میں ہر ملک سے اس کی بڑی مانگ

تھی۔ عمان و بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں۔ اور یمن کے سواحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کی منڈی تھے۔ یہ تمام تجارتی اشیاء اس عہد میں سبا ہی کی وساطت سے بحر احمر کے راستہ سے یا حجاز کی راہ سے شام۔ فینشیا اور مصر کو جاتی تھیں۔ اور یہاں سے تمام یورپ میں پھیلتی تھیں [1]۔

توراۃ سبا کی دولت و عظمت سے پُر ہے۔ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کہتے ہیں:۔

سبا اور شبا کے بادشاہ اُسکو نذر دیں گے۔ ...... شبا کا سونا اُسکو پیش کیا جائے گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ملکہ سبا آتی ہے۔

وہ بہت فوج۔ تزک و احتشام کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوئی۔ بہت سے اونٹ پر خوشبو کی چیزیں۔ بہت سا سونا۔ اور بیش بہا جواہر لدے تھے۔ ...... ملکہ نے ۱۲۰ قنطار سونا اور بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر سلیمانؑ کو دیئے۔ ملکہ نے جیسی خوشبوئیں دیں۔ ویسی پھر نہ ملیں۔ توراۃ سفر ایام

اشعیاہ نبی کی پیشین گوئی ہے۔

حبش اور سبا والوں کی تجارت جو شریف ہیں۔ تیرے پاس آوے گی۔ (۴۵-۱۴)

خرقیال نبی کہتے ہیں۔

جمہور آدمیوں کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے آئے جنکے ہاتھوں میں کنگن ہیں۔ اور سروں پر خوبصورت تاج (۲۳-۴۲) سبا اور رعماہ تیرے تاجر ہیں۔ وہ عمدہ خوشبو، جواہر اور سونا تیرے بازاروں میں بیچتے ہیں۔ حران۔ قانہ اور عدن (یہ تینوں یمن کے شہر ہیں) تیرے تاجر ہیں۔ سبا اور اشور اور کلماد تیرے تاجر ہیں۔

اشعیاہ کی ثبوت ہے

اونٹوں کی قطاریں۔ (اے یروشلم) تجھ پر چھا جائیں گی، مدین اور عیفا کی اونٹنیاں تمام سبا سے سونا اور لوبان لائینگی (۶-۶۰)

یرمیاہ نبی۔ بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہیں۔ کہ خدا کہتا ہے۔ جب تمہارے اعمال صحیح نہیں تو ہیکلوں میں سبا کا لوبان میرے پاس کیوں پیش کرتے ہو۔ (۶-۲۰)

چوتھی صدی ق م سے پہلی صدی ق م تک یونانی مصر کے حکمران تھے۔ ان کے عہد میں مصر کا دار الحکومت اسکندریہ تمام مشرقی اور مغربی تاجروں کا مرکز تھا۔ سبا اس عہد میں سب سے بڑی قوم تھی۔ اس بنا پر وہ دیگر قبائل عرب کی نسبت سبا سے زیادہ واقف تھے۔ اراٹوسٹھنیس Aratosthenes.

[1] فاضل معاصر۔ ہم اس جگہ پھر یاد دلانا چاہتے ہیں۔ کہ ابھی ابھی آپ نے ملک سبا اور علاقہ یمن کے تمام اقسام کی تجارت کو نام بنام گنایا اور بتلایا ہے۔ مگر شراب کی مخصوص کیا عام تجارت کا جھوٹوں بھی نام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ سبا کے ساتھ اس کی خصوصیت کو اتنی اہمیت دی ہے۔ کہ مستشرقین یورپ کی گمراہ کن تقلید میں۔ سبا کی وجہ تسمیہ بتلائی ہے۔ فافہم فتدبر اولاد حیدر

(سنہ ۱۹۴ ق م) بیان کرتا ہے۔

عرب کے انتہائی حد پر، سمندر، (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں........ سبا کے لوگ ہیں۔ جنکا دار الحکومت مآرب (Marbla) ہے۔ یہ قطعہ ملک سمر زرین سے بڑا ہے۔ گرمیوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جاکر خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے زمین اسقدر سبز اور شاداب ہے۔ کہ تخم ریزی وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے۔

حضرموت سے سبا کے ملک تک۔ ۴۰ روز کا راستہ ہے۔ اور معین سے سوداگر، ۷۰ دن میں ایلہ (عقبہ) میں پہونچتا ہے حضرموت معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں۔ اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

یونانی مورخ اگاتھرشیدس (Agartherebides.) (سنہ ۱۴۵ ق م) جس کی تصنیف کا زمانہ دوسری صدی ق م ہے۔ بیان کرتا ہے۔

سبا عرب آبادان (Arabia Flix) میں رہتے ہیں۔ جہاں بہت اچھے اچھے بیشمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین متصل بحر میں بلسان اور نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں۔ جو دیکھنے میں نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اندرون ملک میں بخورات۔ دار چینی۔ چھوہارے وغیرہ کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں۔ اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے۔ درختوں کے اقسام کی کثرت تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں اڑتی ہے۔ وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں۔ اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ جو اشخاص اس زمین سے دور ساحل پر سے بھی گذرتے ہیں وہ بھی جب ساحل سے ہوا چلتی ہے۔ تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان ستانوں کو وہاں کاشتے نہیں۔ اور کاٹ کر ان کا انبار نہیں لگاتے۔ لیکن چونکہ شگفتہ اور تازہ رہتے ہیں۔ اس لیے جو شخص اس ساحل سے گذرتا ہے۔ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتا ہے۔ یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے لحاظ سے ناقص ہے۔

سبا میں حکومت وراثتاً منتقل ہوتی ہے۔ ان کا بڑا شہر مآرب ہے۔ جو ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کو جبل ابلق کہتے ہیں بادشاہ اسی شہر میں رہتا ہے۔ جو لوگوں میں فیصلہ دیتا ہے۔ لیکن کبھی اسکو اجازت نہیں۔ کہ وہ اپنا قصر چھوڑ کر نکل سکے۔ اگر وہ اسکے خلاف کرتا ہے۔ تو حسب حکم مذہبی سنگسار کر دیا جاتا ہے

سبا تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے۔ بُعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا۔ اس لیے خصوصاً ان کے دار الحکومت میں سونے اور چاندی کے برتن ہیں تخت اور پینگ ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ ایوان اور دروازے زر و جواہر سے منقش ہیں۔ اس قسم کی زیب و زینت پر نہایت ہنرمندی اور محنت وہ صرف کرتے ہیں۔

مشہور مورخ آرٹی میڈروس (Artimidous) (سنہ ۱۰۰ ق م) باشندہ شہر افسوس

(Ephesus) جو سبا کے عہد اخیر میں تھا، لکھتا ہے۔

سبا کا بادشاہ اور اُسکا ایوان مآرب میں ہے، جو ایک پُر اشجار پہاڑ پر زمانہ خوشحالی (عیش وعشرت ارائش ومسرت) میں واقع ہے، میوؤں کی کثرت کے سبب سے لوگ سُست اور ناکارہ ہوگئے ہیں، خوشبو دار درختوں کی جڑیں پلنے پڑے رہتے ہیں جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں، کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ اور کچھ ملکی اور غیر ملکی سامانوں کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ سامان مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں، جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں (دقق) میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔ قرب وجوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں، اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں۔ اور اسی طرح دست بدست وہ شام وجزیرے تک پہونچتے ہیں[1]

سبا کی عمارتیں

ہم نے پہلے بتا دیا ہے، کہ سبا ایک صلح پسند امن ومسرت کی حکومت تھی یہی سبب ہے، کہ اُس نے اپنی قوت کا زیادہ تر حصہ اسلحہ کے بجائے عمارتوں پر صرف کیا، یونانی مورخین کے بیان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ انیں سے بعض عمارتیں عہد اسلام تک باقی تھیں، مسلمان مورخین نے خود دیکھا، اور اپنی کتابوں میں اُنکے حالات لکھے ہیں، ہمدانی نے اکلیل کا ایک باب صرف انہیں عمارتوں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ سبا کے ابتک جو کتبات ملے ہیں، وہ زیادہ تر انہیں عمارات شاہی کی یادگاری کو حیں ہیں، نشوان ابن سعید حمیری نے قصیدہ حمیریہ میں تقریباً ۲۵ عمارات شاہی کا ذکر کیا ہے۔ یوروپین سیاح بھی ان عمارات کے کھنڈروں کے عجیب وغریب حالات بیان کرتے ہیں، قصر سلحین جو قیام گاہ شاہی تھا، اُسکے نشان ابتک موجود ہیں۔

سد مآرب یا بند عرم

اسی سلسلہ عمارت میں ایک چیز بند آب ہے، جسکو عرب حجاز "سد" اور عرب یمن "عرم" کہتے ہیں، عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں، صرف سلسلہ کوہستان ہے، پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگستانوں میں خشک ہوجاتا ہے، اور ضایع ہوجاتا ہے۔ زراعت کے مصرف میں نہیں آتا، سبا نے مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھے تھے، کہ پانی رکجائے، اور بقدر ضرورت زراعت کے مصرف میں آئے مملکت سبا میں اس قسم کے سینکڑوں بند تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سد مآرب تھا۔ جو خود دارالحکومت کے اندر واقع تھا۔

شہر مآرب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں، جنکا نام کوہ ابلق ہے۔ دونوں پہاڑوں کے بیچ میں

---

[1] یہ تمام بیانات تاریخ قدیم کے مستند ترین ماخذ ونکرس ہسٹری آف انٹیکوئٹی ج ا ص ۳۱۰ سے ۳۱۲ تک سے ماخوذ ہیں۔
Dunkers history of Antiqaity Vol I. PP 310. 312

وادی اذینہ ہے۔ پہاڑوں سے اور اِدھر اُدھر سے پانی جمع ہوکر وادی آذینہ میں ایک دریا جاری کر دیتا ہے۔ سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م میں سدّ مارب تعمیر کی تھی۔ یہ تقریباً ۱۵۰ فیٹ لمبی اور ۵۰ فیٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔ اسکا اکثر حصہ تو اب اُفتادہ ہے۔ لیکن تاہم اس کی ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔ ارناؤد (Arnoa) ایک یوروپین سیاح نے اس کے موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں لکھا ہے۔ اور اسکا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے تیار کیا ہے۔ اس دیوار پر جا بجا کتبات میں وہ بھی پڑھے گئے ہیں۔

عام مسلمان مورخین چونکہ ہر قدیم عمارت کو بنائے سلیمانی کہنے کے عادی ہیں۔ اس لیے اس سد کا بانی وہ بلقیس ملکہ یمن وحرم سلیمانی کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن سدّ مارب کے بقیہ حصہ پر جو کتبات ہیں۔ اُن میں بانیوں کے نام بھی خوش قسمتی سے باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے (۱) یثع امر بین ابن سمہی علی ینوف مکارب سبا (۲) سمہی علی ینوف بن ذمر علی مکارب سبا (۳) کرب ایل بین بن یثع امر مکارب سبا (۴) ذمر علی ذرح ملک سبا (۵) یدع ایل وتار کے نام پڑھے گئے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ سدّ ایک زمانہ ممتد میں مختلف سلاطین یمن کے عہد میں تعمیر ہوا ہے۔ اسکا پہلا بانی یثع امر تھا۔ جو آٹھویں صدی ق م میں تھا۔ اس سدّ میں اُوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں۔ اُوپر سے نیچے تک کی کھڑکیاں حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔ سدّ کے دائیں بائیں شرق ومغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے۔ جن سے پانی تقسیم ہوکر چپ وراست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ اِس سدّ کے حالات ہمارے مفسرین نے جو بیان کئے ہیں (تفاسیر طبری اور بغوی) بعینہ ارناد کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نقشہ مندرجہ آغاز کتاب کے دیکھنے سے صورت حال اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے گی۔

اِس نظام آب رسانی سے چپ وراست دونوں جانب اِس ریگستانی اور شور ملک کے اندر ۳۰۰ میل مربع میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہوگئی تھی جس میں انواع واقسام کے میوے اور خوشبودار درخت تھے۔ ان کی خوشبو دور تک پھیلی رہتی تھی۔

جنّت سبا اور قرآن مجید

قرآن مجید ان آیات میں اِنہی باغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ (السبا ۲)	سبا کے لوگوں کے لیے خود ان کے گھر میں قدرت خدا کی ایک عجیب نشانی موجود تھی، وہ باغوں کا سلسلہ داہنے بائیں۔ سبا کے لوگو! اپنے پروردگار کی (دی ہوئی) روزی کھاؤ اور شکر کرو شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا۔

ہمارے پاس اس جنت زار کے قصہ بروایت عرب واقعہ سے کئی سو سال بعد کے موجود ہیں۔ لیکن خود ہمارے دشمنوں کے سفینوں میں اس کی معاصرانہ شہادتیں جو محفوظ ہیں۔ اُن کو ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔

اراتوستھینیس (Ecratosthenes) جو ۱۹۴ قبل مسیح میں سبا کا معاصر تھا۔ تحریر کرتا ہے۔

سبا کے لوگ وہ ہیں۔ جنکا دارالحکومت شہر مآرب ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ قطعہ ملک مصر زیریں سے بڑا ہے۔ یہاں گرمیوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور دریا جاری ہوتے ہیں۔ جو میدانوں اور تالابوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ اس سبب سے زمین اس قدر سرسبز و شاداب ہے۔ کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے۔

آگاتھارشیدس (Agartharehides) جو ۱۴۵ ق م میں سبا کے زمانہ وعصر میں تھا۔ بیان کرتا ہے۔

سبا عرب کے حصہ سرسبز و آباد (ArabiaFlix) میں رہتے ہیں۔ جہاں بہت اچھے اچھے بیشمار میوے ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے جو زمین ہے۔ اس میں نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں۔ جو دیکھنے میں نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اندرون ملک میں بخورات۔ دارچینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں۔ اور ان درختوں سے نہایت تیز بو پھیلا کرتی ہے۔ درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے۔ ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے۔ جو خوشبو اس بن سے اُڑتی ہے۔ وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں۔ اور جس کی تعریف لفظوں میں نہیں ہو سکتی۔ جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گذرتے ہیں۔ وہ بھی ساحل کی طرف سے جو ہوا چلتی ہے اُس سے محفوظ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ گویا آب حیات کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ بھی اُس کی قوت و لطافت کے مقابلہ میں ناقص ہے۔

کیا ان بیانات کو دیکھکر۔ اور خصوصاً خطوط کھینچی ہوئی عبارتوں کو پڑھکر ان مقامات کو جیسا کہ وحی الٰہی نے اپنے الفاظ امتنالیہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ دُنیا کی بہشت نہ کہیں گے۔

قرآن مجید ان کے آخر نتیجہ بتلاتا ہے۔ اور وہ وہی ہے۔ جو تمام دُنیا کے اہل دولت و اقتدار قوم کو اپنی غفلت شعاری اور جفاکاری کی پاداش میں آخر کار پیش آتے ہیں۔ الفاظ قرآنی یہ ہیں۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ | پھر انہوں نے سرتابی کی تو ہم نے آب بند (توڑ کر اسکا) سیلاب بھیجا پھر سیلاب آیا۔ اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس عصر تاریکی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابل شک و انتباہ ہے۔ خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز نظام کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا۔ یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ملگیا یہ عیسائی فاتح بھی وہی شخص ہے۔ جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر (ابرہہ) کعبہ مکرمہ کو ڈھانے نکلا تھا۔ لیکن آج اسی دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبہ مشرفہ کی کتاب مقدس کی تصدیق کے لیئے بلند ہے۔

زمانہ ابرہہ کا ایک نہایت قدیم کتبہ ذیل کی عبارت میں بند عرم کے ٹوٹ جانے کی تصدیق کرتا ہے۔

اسی اثنا میں مآرب کے بند (ستد) کی دیوار حوض اور دروازوں کے ٹوٹنے کی خبر ماہ ذو المدرح ۶۵۷ یمنی مطابق ۵۴۲ عیسوی میں آئی۔

اس سلسلہ کی آئیندہ الفاظ قرآنی یہ ہیں۔

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (سبا)	اور ان کے میووں کے باغوں کے بدلے معمولی پھلوں یعنی پیلو، جھاؤ، اور کچھ بیری کے باغ دیدیئے۔ یہ ان کے کفر کی سزا ہے ہم کفران نعمت کرنے والوں ہی کو سزا دیتے ہیں (سبا)

قرآن مجید جب نازل ہورہا تھا۔ تو اس سزا کو جوان درختوں کی شکل میں نمودار ہوئی تھی۔ یمن کا ہر باشندہ بچشم خود معائنہ کر رہا تھا۔ لیکن۔۔ ۴ برس کے بعد بھی برائے العین ہر سیاح کو نظر آرہی تھی۔۔ ہمدانی المتوفی ۳۳۴ھ۔ جس کی صداقت بیانی کے نہ صرف سیاحین یورپ بلکہ اثریین (ارکیالوجسٹ) (Achrobogests) بھی معترف ہیں۔ وہ چوتھی صدی کے اوائل میں شہادت عینی پیش کرتا ہے کہ ان باغوں کی جگہ یہاں پیلو کے درخت اتنے ہیں۔ کہ کہیں اور نہیں۔

ہم نے سبا کے دائرہ حکومت کے تحت میں لکھا ہے۔ کہ یمن کے علاوہ حبشہ اور شمالی عرب میں بھی سبا کی نوآبادیاں تھیں۔ توراۃ و اسفار میں متفرق خاندانوں کے نام بتلائے گئے ہیں (۱) سبا ابن یقطان (قحطان) باشندۂ یمن (۲) سبا ابن۔۔۔۔۔ بن ابراہیم برادر زادہ مدین باشندہ عرب شمالی (۳) سبا ابن کوش بن حام باشندہ حبش (سفر تکوین)

نولڈکی کے اصول کی بنا پر توراۃ کے قبائل و اقوام کا تقسیم صرف جغرافی نسب و تعلق ہے۔ ان تینوں متفرق النسب سبا کے یہ معنی ہیں۔ کہ سبا کے تین جغرافی مرکز یا آبادیاں تھیں۔ یمن۔ حبشہ۔ اور شمالی عرب میں۔ یمن میں سبا کا وجود و قیام تو محتاج بیان نہیں۔ روایات عرب۔ تاریخ اقوام اور آثار قدیم میں ان سب کی شہادت قاطعہ موجود ہے۔ دیگر اطراف ملک میں بھی ان کا وجود اثر مخفی نہیں ہے۔ شمال عرب میں بطرف شام و عراق توراۃ کے متعدد فقروں نے ان کا نام و وجود عارضی نہایت قدیم زمانہ سے مذکور ہے۔ اور ان کا بار بار ذکر اوپر گذر چکا ہے (دیکھو سبا کا دائرہ حکومت۔ اور سبا کی دولت و عظمت) یونانی مورخین نے بھی ان اطراف میں ان کا ہونا بیان کیا ہے۔ آغا سار سیدوس (۱۴۵ھ ق م) کہتا ہے کہ سب سے پہلے نبطی (جنکا مسکن عراق و شام کے درمیان تھا) عرب سعیدہ پر قابض ہوئے ہیں[۱]۔ ایک اور یونانی مورخ بیان کرتا ہے[۲]۔

یہاں سے اس شہر تک ایک سڑک جاتی ہے۔ جسکا نام ہزار (قدیم) ہے۔ جہاں اہل قریہ۔ اہل معین، ورده تمام عرب اسکے قریب رہتے ہیں۔ جو بالائی ملک (عرب) سے بخورات لاتے ہیں۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اسیریا کے آثار میں بھی شع امر سبائی کا ساتویں صدی ق م میں اسیریا سے مغلوب ہونا مذکور ہے۔ معلوم ہے۔ کہ اہل اسیریا کبھی یمن نہیں آئے۔ اس لیئے یہ بالکل واضح ہے۔ کہ خود سبا یہاں تک پہونچ گئے تھے۔ جیسا کہ سفر ایوبؑ (۱-۱۵) و (۶-۱۹) سے بھی ثابت ہے۔

حبشہ میں اہل یمن کا وجود عہد قدیم سے تھا۔ حبشہ یمن کے مقابل سواحل پر واقع ہے۔ یہ سواحل تاریخ کی ابتدا سے اسوقت تک یمنی اور حضرموتی عرب کی جولان گاہ ہیں۔ بعض کتبات سے معلوم ہوا ہے۔ کہ سبا کا ایک گورنر معافر کے لقب سے حبشہ میں رہتا تھا۔[1] خود حبش بھی اپنے کو سبا کی اولاد کہتے ہیں۔[2] ایک یونانی مورخ کی شہادت بھی۔ جو سبا کا معاصر تھا۔ پہلے گذر چکی ہے۔ کہ سبا سواحل حبشہ میں تجارت کا مرکز رکھتے ہیں۔

ملکہ سبا (بلقیس)

توراۃ (عہد قدیم) انجیل اور قرآن میں سبا کی ایک شاہزادی کا ذکر ہے۔ جو حضرت سلیمانؑ کی بارگاہ میں آئی تھی۔ یہ سبا کی شاہزادی بزبان توراۃ میں سبا کے خاندان سے تھی؟ یا بزبان تاریخ سبا کس آبادی سے آئی تھی؟ توراۃ میں صرف سبا کی شاہزادی کا لفظ بلا تعین خاندان و جہت ہے۔[3] ترگوم (ترجمہ توراۃ بزبان عبرانی) میں ہے۔ کہ اُسکا مقام فلسطین کے شرق میں تھا۔[4] انجیل میں ہے۔ کہ وہ فلسطین کے جنوب سے آئی تھی۔[5] یوسیفوس اسرائیلی کی تاریخ میں ہے۔ کہ وہ مصر و حبشہ کی شہزادی تھی۔ اہل حبش اُسکو حبشی سمجھتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ کونسی خاندان کی سبائی خاتون تھی۔ قرآن نے بھی کوئی تعین خاندان و جہت نہیں کی ہے۔ لیکن تمام مفسرین و مورخین اسکو عرب قحطانی اور باشندۂ یمن سمجھتے ہیں۔ آجکل کے اثریات کا زمانہ ہے۔ اِس بنا پر کہ یمن کی عورت کا کوئی کتبہ نہیں ملا ہے۔ اور شمال عرب میں متصل عراق تین چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ملے ہیں۔ ملکہ سبا کا اِس حصۂ آبادی سے جانا ممکن خیال کیا جاتا ہے۔[6]

جن قدیم تحریروں میں ملکہ سبا کا ذکر ہے اُن میں سے صرف تین میں جہت تعین ہے۔ یوسیفوس۔ ترگوم۔ اور انجیل اور یوسیفوس کا بیان کہ وہ مصر کی شہزادی تھی۔ مطلقاً غلط ہے بقیہ بیانات میں کہ وہ مشرق و جنوب

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا ج ۲۳ ص ۹۵۵ و [2] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۲۲۰۔
[3] تاریخ ملوک باب ۱۰ و ایام ۲ باب ۹۔

[4] انجیل متی ۱۲-۴۲۔ ایضاً۔ انجیل لوقا ۱۱-۳۱۔ [6] جیوئش انسائیکلو پیڈیا۔ مضمون سبا۔
[5] جیوئش انسائیکلو پیڈیا۔ مضمون سبا۔ ایضاً۔ جلد اول ذکر سلیمان۔ ایضاً۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد اول ص ۳۷۳۔

یا حبشہ کی تھی۔ ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ کہ یہ سب سبا کے مقامات تھے۔ تاہم اصل مرکز کے لحاظ سے وہ یمن ہی کی کہی جائے گی۔ یعنی جنوب عرب کی۔ جیسا کہ انجیل کی شہادت اور روایات عرب کا تواتر ہے۔ اہل حبش جو ملکہ سبا کو حبشہ کی بتاتے ہیں۔ اور اب تک حبشہ کا شاہی خاندان تفاخراً اپنے کو اسی ملکہ سبا کی اولاد یقین کرتا ہے۔ اُسکا نام اُن کی زبان میں ماکدہ ہے۔ یمن کے عرب یہود میں اسکا نام بلقیس مشہور تھا۔ اور اسرائیلیات کے ذریعہ سے یہی نام مسلمان مورخین اور اہل تفسیر میں مقبول ہے لیکن لفظی دلالت کے لحاظ سے یہ عربی نہیں۔ بلکہ یونانی الاصل نام معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات میں بلقیس کو پریزاد کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی ماں (بلقمہ) ایک پری تھی۔ لیکن یہ روایتیں بالکل لغو اور موضوع ہیں۔ بلقمہ کو ممکن ہے۔ کہ یمن کی دیبی المقہ سے کوئی مناسبت ہو۔ اسی طرح اہل تاریخ کا ملکہ سبا بلقیس کو بنت شرجیل لکھنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ شرجیل حمیر کے بادشاہ اور حضرت سلیمانؑ میں ڈیڑھ ہزار برس کا فاصلہ پایا جاتا ہے

قرآن مجید اور ملکہ سبا

سبا کا نام قرآن مجید میں دو بار آیا ہے۔ اول حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ملکہ سبا کے نام سے دوسرے بار سیل عرم کے ذکر میں۔ سیل ارم کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ ملکہ سبا کا قصہ سورہ نمل میں مذکور ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ۔

قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ

سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا۔ پھر کہا۔ کیا مجھے ہے۔ کہ میں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا یا وہ موجود نہیں۔ میں اُسکو سخت سزا دونگا۔ یا ذبح کرڈالونگا۔ یا کوئی صاف دلیل لائے۔ سلیمان تھوڑی دیر ٹھہرے کہ ہُدہُد آکر گویا ہوا۔ مجھے وہ معلوم ہوا۔ جو آپکو نہیں۔ سبا کی ایک سچی خبر لیکر میں آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو سبا پر حکومت کرتی ہے۔ اُسکو ہر شے عنایت کی گئی ہے۔ اُسکا ایک بڑا تخت ہے۔ میں نے اُسکو اور اُسکی رعایا کو۔ خدا کو چھوڑکر آفتاب کو سجدہ کرتے پایا۔ شیطان نے اُنکے اعمال اُنکی نگاہ میں اچھے کرکے دکھائے ہیں۔ صحیح راستے سے اُنکو باز رکھا ہے۔ وہ راہ نہیں پاتے۔ کہ خدا کو سجدہ کریں۔ جو آسمانوں کی اور زمینوں کی چھپی ہوئی چیزوں کو باہر نکالتا ہے۔ اور جو تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو۔ سب جانتا ہے۔ خدا ہی۔ جسکے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی بڑے تخت کا مالک ہے۔

سلیمان نے کہا۔ کہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ تو سچ کہتا ہے۔ یا جھوٹا ہے۔ میرا یہ

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِىْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَىَّ وَاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِىْ فِىْۤ اَمْرِىْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِىْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۔

وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِىْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِىْ مُسْلِمِيْنَ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّىْ لَقَوِىٌّ عَلَيْهِ اَمِيْنٌ ۔

وَقَالَ الَّذِىْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّىْ لِيَبْلُوَنِىْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ

خط لیجا۔ اُن کے پاس ڈالدے۔ پھر اُن سے الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

ملکہ نے خط پاکر درباریوں سے کہا۔ میرے نام نامہ مقدس آیا ہے۔ یہ نامہ سلیمانؑ کے پاس سے آیا ہے۔ عبارت یہ ہے۔ مہربان اور رحم کرنیوالے خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔ اور مسلمان ہوکر میرے پاس چلے آؤ۔ ملکہ نے کہا۔ اے سردارو میں اس معاملہ میں کسی بات کا فیصلہ کرنیوالی نہیں ہوں۔ سرداروں نے کہا ہم زور و قوت والے ہیں۔ یوں فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھیں کیا حکم دیتی ہیں۔

ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں۔ اُسکو ویران کر ڈالتے ہیں۔ اور وہاں کے معززین باشندوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں اور (برابر) اسیطرح کیا کرتے ہیں۔ میں اُن کے پاس ہدیہ دیکر قاصد بھیجتی ہوں۔ پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتا ہے۔

قاصد جب سلیمانؑ کے پاس پہونچا۔ تو سلیمان نے کہا۔ کہ اس حقیر مال و دولت سے تم میری مدد کرتے ہو۔ خدا نے مجھکو جو کچھ دے رکھا ہے وہ اُس سے بہتر ہے جو تمکو اُس نے دیا ہے۔ تم اپنے اس تحفہ پر شاداں ہو۔ سبا کو واپس جا۔ ہم ایسا لشکر لیکے آئیں گے۔ کہ جسکا وہ مقابلہ نکر سکیں گی۔ اور ملک سبا سے ذلیل کرکے اُنکو نکال باہر کرینگے۔

سلیمانؑ نے پھر اپنے سرداروں سے کہا۔ کون اسکا تخت میرے پاس اُٹھا لائیگا۔ ایک تنومند جن نے کہا۔ میں اس سے پہلے کہ آپ دربار سے اُٹھیں وہ تخت اُٹھا لاتا ہوں۔ میں اُس تخت کے اُٹھا لانے کی قوت رکھتا ہوں۔ اور امانت کے ساتھ لاؤنگا۔

جسکو خط (کتاب) کا علم تھا۔ اُس نے کہا کہ نگاہ پلٹنے سے پہلے میں اُٹھا لاتا ہوں۔ سلیمانؑ نے جب وہ تخت اپنے سامنے رکھا دیکھا کہا کہ یہ خدا کے فضل سے ہوا۔ تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں کہ ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے۔ وہ اپنے ہی لیے کرتا

رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ۔
قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا اَتَهْتَدِیْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ
الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ فَلَمَّا جَآءَتْ قِیْلَ اَهٰكَذَا
عَرْشُكِ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ وَاُوْتِیْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا
وَكُنَّا مُسْلِمِیْنَ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ۔
قِیْلَ لَهَا ادْخُلِی الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ
لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ
مِّنْ قَوَارِیْرَ قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ
مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(نمل)

ہے۔ اور جو کوئی ناشکری کرے تو خدا بے پرواہ اور بزرگ ہے
سلیمان نے حکم دیا کہ تخت کا روپ بدل دو۔ وہ راہ پا لیگی یا نہ
راہ پانے والوں میں سے ہوتی ہے۔ جب ملکہ آئی۔ تو اس سے کہا
کہ تیرا کیا تخت اسی قسم کا ہے۔ جواب دیا کہ گویا وہ ہی ہے۔ اور
اس سے پہلے ہمکو علم دیا جا چکا تھا۔ اور مسلمان ہو چکے ملکہ کو غیر خدا
کی پرستش نے حق سے روک رکھا تھا۔ اور وہ کافر قوم سے تھی
ملکہ (بلقیس) سے کہا گیا کہ محل کے اندر چل۔ جب اس نے محل
کو دیکھا۔ تو وہ سمجھی کہ پانی سے بھرا ہے۔ تو اس نے اپنی دونوں
پنڈلیاں کھولدیں۔ سلیمان نے کہا۔ یہ تو شیشہ کا مکان ہے۔ ملکہ
نے کہا خدایا! میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی۔ سلیمان کے ساتھ میں بھی
خدا کی۔ جو تمام دنیا کا پروردگار ہے۔ اطاعت گذار ہوئی
یعنی اسلام لائی۔ (سورۂ النمل)

بعینہٖ یہی قصہ اسفار یہود میں بھی مذکور ہے۔ گو تفصیل و اجمال میں کسی قدر اختلاف ہے۔ سب سے نبتیم کے سفر ایام اور سفر ملوک میں یہ قصہ مذکور ہوا ہے۔ اور یہ دونوں اسفار بیان واقعہ میں حرف حرف متفق ہیں کہ جب سلیمان کا شہرہ سبا کی ملکہ تک پہونچا۔ تو مشکل سوالوں سے وہ اسے آزمانے آئی۔ اور بڑی فوج اور شان و شوکت سے یروشلم (بیت المقدس) میں داخل ہوئی۔ بہت سے اونٹوں پر خوشبو کی چیزیں بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہر لیے تھے۔ وہ سلیمان کے پاس آکر ٹھیری۔ اور جو کچھ اسکے دل میں تھا۔ اس کی بابت اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اسکے تمام سوالوں کا جواب دیا۔ سلیمان سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ جو جواب نہ دیتا۔ سبا کی ملکہ نے جب سلیمان کی دانشمندی اور اس کے گھر کو جو اس نے بنایا تھا۔ اور اسکے دسترخوان کے کھانوں اور اس کی نشست و برخاست کے طور کو اور ان کی پوشاک کو اور اس کے ساقیوں کو اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے مسکن پر چڑھتا تھا۔ (یہ ملوک کی آیت ہے) سفر ایام میں اسکے بجائے یہ ہے۔ اور ان قربانیوں کو جو وہ خداوند کے مسکن پر چڑھایا کرتا تھا۔ دیکھا۔ تو اسکے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے تیرے کاموں کی نسبت اپنے ملک میں جو سنا تھا۔ وہ تحقیق خبر تھی۔ لیکن جب تک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ باور نہیں آتا تھا۔ لیکن جو دیکھا۔ اس کا آدھا بھی نہیں سنا تھا۔

مبارک ہیں تیرے لوگ اور مبارک ہیں تیرے نوکر۔ جو ہمیشہ تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ اور تیری حکمت کی باتیں سنتے ہیں۔ خداوند تیرا مبارک ہو۔ جو تجھسے راضی ہے۔ اور جس نے تجھکو اسرائیل کے تخت پر بٹھلایا کیونکہ خداوند اسرائیل کو ابتک پیار

کرتا ہے۔ اور تجھکو اُس نے پادشاہ بنایا۔ کہ تو عدل و انصاف کرے۔

ملکہ نے۔ ۱۲۰ قنطار سونا اور بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر سلیمانؑ کو دیے۔ ملکہ نے جیسی خوشبوئیں پیش کیں ایسی پھر کبھی نہیں۔ سلیمان نے سبا کی ملکہ کو جو کچھ اُس نے مانگا۔ اُس سے زیادہ تحفہ دیا۔ اور ملکہ اپنے ملازموں سمیت اپنے ملک کو پھر گئی۔
(سفر ایام باب ۹ و ۲ ملوک باب ۱۰)

ترگوم (دوم برا استرا) میں جو توراۃ اور منتیم کا ارامی ترجمہ بلکہ ارامی زبان میں ان کی تفسیر ہے۔ یہ قصّہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ گو بعض نہایت لغو باتوں کی بھی اُس میں آمیزش ہے۔ ترگوم کی مندرجہ روایت کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

سلیمانؑ عرق انگور پی کر جب نشاط میں آتے تھے۔ تو تمام بادشاہوں کے سامنے اپنے غلاموں کو بٹھلاتے تھے۔ اور اسوقت تمام زندہ مخلوق کو حکم دیتے تھے۔ کہ اُن کے سامنے ناچیں۔ ایک دن سلیمانؑ نے دیکھا۔ کہ ہُدہُد غائب ہے۔ سلیمانؑ نے حکم دیا کہ وہ حاضر کیا جائے۔ جب ہُدہُد آیا۔ تو اُسنے بیان کیا۔ کہ تین مہینوں سے وہ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس لئے کہ کوئی ایسا ملک ملے۔ جو ابتک حضور کے ماتحت نہیں ہے۔ آخر مشرق میں ایک مُلک ملا جسپر سبا کی ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اس مُلک کی خاک سونے سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ وہاں چاندی کوڑے کی طرح گلیوں میں پڑی پھرتی ہے۔ درخت وہاں بدو خلقت سے ایسے ہی ہیں۔ پانی وہاں جنّت سے آتا ہے۔ اور وہیں سے بکر ہار آتے ہیں۔ جن کو لوگ پہنتے ہیں۔ اس ملک کے دار الحکومت کا نام قیطور ہے۔

پھر پرندہ نے یہ رائے دی۔ کہ وہ اُڑ کر پھر اُس ملک کو جائے گا۔ اور وہاں کی ملکہ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ سلیمانؑ نے یہ رائے پسند کی۔ اور خط لکھکر ہُدہُد کے بازو میں باندھ دیا گیا۔ ہُدہُد شام کے وقت جب وہ آفتاب کی عبادت کے لیے جا رہی تھی پہونچا۔ یہ خط ملکہ کے حوالے کیا۔ ملکہ نے خط پڑھا جس میں یہ دھمکی تھی۔ کہ فوراً میری بارگاہ میں حاضر ہو۔ ورنہ اُس کی فوج جو جانوروں۔ پرندوں۔ روحوں اور رات کے دیوؤں کی ہے۔ اُس سے لڑنے کو آئے گی۔

ملکہ یہ خط پاکر بہت خوف زدہ ہوئی۔ اور اُس نے بوڑھوں اور سرداروں کی مجلس میں شورہ کیا۔ لیکن یہ لوگ سلیمانؑ سے بالکل واقف نہ تھے۔ تاہم ملکہ نے اپنے جہازوں کو بیش قیمت لکڑیوں گراں بہا جواہرات اور موتیوں سے بار کرکے۔ اور چھ ہزار۔ ایک ہی ساعت کی پیدائش۔ ایک ہی قد و قامت۔ ایک ہی شکل و صورت اور ایک ہی حریر سرخ کے لباس میں غلام اور لونڈیاں تحفۃً بھیجیں۔ خط کے جواب میں لکھا کہ۔

اگرچہ قیطور اور یروشلم کے درمیان عموماً سات برس کا راستہ ہے۔ تاہم وہ تین برس میں پہونچے گی۔ ملکہ جب یروشلم پہونچی تو ایک شیشے کے محل میں اُس سے سلیمانؑ نے ملاقات کی۔ ملکہ نے یہ سمجھ کر کہ بادشاہ پانی میں بیٹھا ہے۔ پنڈلیوں سے کپڑا اُٹھایا سلیمانؑ نے مسکرا دیا۔ اور یہ دیکھکر کہ اُس کے پاؤں میں بال ہیں۔ بولے کہ شکل تو ایک عورت کی ہے۔ لیکن بال مردوں کے

دیتے ہیں۔ پاؤں کے بال مردوں کی زینت ہے۔ لیکن عورتوں کے لیے عیب۔ ملکہ سبا نے سلیمانؑ سے بہت سی پہیلیاں پوچھیں۔ (تفصیل چھوڑ دی گئی ہے۔) سلیمانؑ نے سب کے ٹھیک جواب دیئے۔ (ترگوم ترجمہ توراۃ ونیتیم)

اس عبارت کے جو فقرے گھیر دیئے گئے ہیں۔ وہ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا۔ کہ قرآن جو گذشتہ کتابوں کی تصحیح وتمحیص کے لیے آیا ہے۔ یہ خدمت اس نے کس حد تک انجام دی۔ علاوہ ازیں ترگوم نے اس واقعہ کو جس طرز وعبارت میں ادا کیا ہے۔ وہ بالکل ایک کم پایہ انسان کے معمولی افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ برخلاف اسکے قرآن کا طرز ادا ایک شاہانہ پیغمبری۔ ایک تبلیغ دانش وحکمت اور ایک روحانی جبروت واقتدار کے اظہار پر مبنی ہے۔

قرآن کا بیان ترگوم کی واضح غلطیوں سے۔ کہ سبا کا ملک مشرق میں ہے۔ اسکا پایۂ تخت قیطور ہے۔ وہاں سونا اور چاندی کوڑے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ دونوں ملکوں میں سات برس کی مسافت ہے۔ پاک وصاف ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ قصہ کی غرض وغایت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ترگوم کی بنا پر ملکۂ سبا کی طلب صرف شاہانہ ملک گیری کی ہوس پر مبنی ہے۔ لیکن قرآن کے لحاظ سے اس مطلب کا مقصد دعوت الی اللہ منع شرک۔ قمع کفر اور اصلاح نفوس انسانی ہے۔

ایک اور بات قابل لحاظ ہے۔ ترگوم کے مطابق حضرت سلیمانؑ سبا سے واقف نہ تھے۔ اور تعجب وحیرت زائی کا سبب سبا کی دولت وحشمت کا مبالغہ آمیز بیان تھا۔ لیکن وحی قرآنی نے اس حیرت وتعجب کا سبب اس طرح بیان کیا ہے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ (نمل)

ہُدہُد نے کہا میں سبا سے ایک تحقیق خبر لایا ہوں۔ میں نے پایا۔ کہ ایک عورت اُن پر بادشاہ ہے۔ جس کو ہر چیز دی گئی ہے۔ اُسکا ایک بڑا تخت ہے۔ میں نے اُسکو اور اُس کی قوم کو آفتاب کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا نہ خدا کو۔ شیطان اُن کے کاموں کو اُن کی نظر میں اچھا کرکے دکھاتا ہے پھر اُن کو راہ سے روک دیتا ہے (نمل)

قرآن مجید کی مذکورہ بالا عبارت سے روشن ہوگیا۔ کہ بخلاف ترگوم کے۔ سبا کی شہزادی کی طلبی اُسکے ملک پر فوج کشی یا اُس کے تمول اور خوشحالی پر استعجاب جو کچھ تھا۔ وہ صرف ایک اسی غرض ومدعا کی بنا پر کہ کیا دُنیا میں ایسی غافل اور بے بصیرت بندگان خدا بھی بستے ہیں۔ جو باوجود اتنی کثیر اور کافی نعمات الٰہی کے بھی اُسکا تشکر ونعمت نہیں کرتے۔ بلکہ کفر نعمت کرتے ہیں۔ کہ خالق کی جگہ آفتاب اُسکے مخلوق کی پرستش کرتے ہیں۔ اس واقعہ کے متعلق حضرت سلیمانؑ نے جو طریقہ اختیار کیا۔ وہ قطعی طور سے ارشاد وہدایت اور تبلیغ رسالت کے تنہا اصول پر مبنی تھا۔

اس واقعہ کے متعلق بعض شکوک کا ازالہ

زگوم اور قرآن مجید دونوں میں قصّہ کی ابتدا ہُدہُد سے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تمام مفسرین نے اِس ہُدہُد سے یہی مرغ معروف مراد لیا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے بعض فطرت پرست کہتے ہیں۔ کہ مرغ کا بولنا اور اُس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے۔ اس لیے ہُدہُد کسی انسان کا نام ہوگا۔ اور اُس زمانہ میں عموماً یہ نام رکھا جاتا تھا۔ ہم کو اس دعوے کی صداقت سے انکار نہیں۔ کہ ہُدہُد آدمی کے نام ہوتے تھے۔ خود حضرت سلیمان کے عہد میں مدین کے شہزادے کا نام ہُدہُد تھا۔

(سلاطین) اور روایات عرب میں ملکہ سبا کے باپ یا بھائی کا نام بھی ہُدہُد مرقوم ہے۔ لیکن قرآن کے لفظ تفقد الطیر (پرندہ کا جائزہ لیا) کا کیا جواب ہوگا۔ میری رائے میں اب جبکہ جانوروں کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے۔ بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی ہے۔ تو ہُدہُد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو۔ طیر کے معنی فوج کے لینا۔ جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے۔ اُسی طرح بے ثبوت ہے۔ جس طرح سرسید کا سورۂ فیل۔ کی تفسیر میں طیر سے فال بد مراد لینا۔ اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے۔ تو فرض کرلو۔ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہُدہُد ہوگا۔ اور اُس کے بولنے سے مقصود اُس مضمون کا خط اُس کے پاس پہونچانا سمجھ لو۔ جیسا کہ خود اسی موقع پر قرآن مجید میں ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے خط دیکر اُس کو ملکۂ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لیکر آیا ہوگا۔

(۱) دوسری چیز قابل انکشاف ملکۂ سبا کا تخت ہے۔ جس کی نسبت قرآن مجید میں مذکور ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ نے اُسکو اپنے دربار میں اُٹھوا منگوایا۔ اور اُس میں کچھ ردوبدل کرکے ملکہ سے پوچھا۔ کہ تم یہ تخت پہچانتی ہو؟ تمہارا ہے؟ روایات تفسیر میں ہے۔ کہ یہ تخت طلائی تھا۔ اور جواہر سے مرصع۔ یہودیوں کے اسفار مقدسہ میں ملکہ سبا کے تخت کا مطلق ذکر نہیں۔ لیکن یہ مذکور ہے۔ کہ ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں بہت سے جواہرات۔ سونا۔ اور دیگر تحائف لائی۔ جس سے حضرت سلیمانؑ نے ایک ہاتھی دانت کا تخت مرصع وجواہر نگار بنوایا (۲۔ ایام باب ۹) تاریخی شہادت سے۔ یہ امر بھی ثابت ہے۔ کہ سبا میں اس قسم کی صنعت کاری کا رواج عام تھا۔ اگاتھر شیدوس ایک یونانی مورخ جو اسلام سے ۸۰۰ برس پیشتر اور سبا کا معاصر تھا۔ شہادت دیتا ہے۔

سبا تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت لایا جاتا ہے۔ بُعد کے سبب سے کسی نے اُن کو فتح نہیں کیا ہے۔ اس لیے خصوصاً اُن کے پایۂ تخت نقرئی اور طلائی ظروف۔ تخت اور دہلیزیں ہیں۔ جن کے پائے زرنگار اور نقرئی اور طلائی نقش ونگار سے آراستہ ہیں۔ پیش گاہ اور دروازے زر و جواہر سے منقش ہیں۔ اور اس قسم کی زیب وزینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

اس بیان تحریری سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مملکت سبا میں اس قسم کی چیزوں کا خاص طور سے اہتمام تھا ممکن ہے۔ کہ اس بیان سے بارہ سو برس پہلے ملکہ سبا کا تخت اسی قسم کا ہو۔

(۳) ایک سوال یہ ہے۔ کہ یہ تخت کس غرض سے بنایا تھا۔ اور حضرت سلیمانؑ کے دربار میں کیوں لایا گیا تھا عام جواب یہ ہے۔ کہ یہ ملکہ کے بیٹھنے کا تخت شاہی تھا۔ جو یمن میں بحفاظت مقفل کمروں میں تھا۔ جہاں سے اظہار معجزہ کے لیے پل کے پل میں حضرت سلیمانؑ نے اپنے ملک یروشلم (بیت المقدس) میں اٹھا منگایا۔ ہم کو اس سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے یہ ہے۔ کہ ملکۂ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمانؑ کے لیئے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی۔ اور چونکہ یہ تحفہ تھا۔ ضرور ہے۔ کہ ملکہ اپنے ساتھ شام میں لائی ہوگی۔ تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ قرآن نے سبا کی سفارت اولیٰ میں تحفہ کا ذکر کیا۔ اور بیبل میں بھی سبا کا ذکر ہے۔

(۴) قرآن مجید میں مذکور ہے۔ کہ حضرت سلیمانؑ کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نگاہ پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھا لانے سے مقصود۔ جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ سے بھی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لیے ہیں۔ اور یہ کہنا تو درحقیقت محاورات زبان سے نادانی کا ثبوت ہے۔ کہ واقعتاً اس نے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کیا۔

(۵) اس قصہ کے متعلق چوتھی بحث یہ ہے۔ کہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں کہ وہ شخص کہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ بولا۔ کہ میں تخت کو نگاہ پلٹنے سے پہلے لا دونگا۔ کتاب کے علم (عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ) سے کیا مراد ہے۔ عام مفسرین توراۃ مراد لیتے ہیں۔ یا اسم اعظم۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ توراۃ کے علم سے تخت کا جلد اور بسرعت لے آنا کیا مناسبت رکھتا ہے۔ اسم اعظم کا تخیل بھی ایک جاہلانہ اور غیر ثابت الشرع تخیل ہے۔ اسلام کی رو سے یہ کوئی شے نہیں۔ البتہ یہودیوں میں یہ خیال اب تک موجود ہے۔

ایک مدعی علم کلام جدید نے کتاب سے رجسٹر اور دفتر مراد لیا ہے۔ یعنی بعض درباری حضرت سلیمانؑ کے سرکاری دفتر اور رجسٹر سے واقف تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ یہ تخت کہاں رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ابھی اٹھا لاتا ہوں۔ لیکن اس عہد میں انیسویں صدی کی طرح باقاعدہ دفتر اور رجسٹر کا دعوٰی ایک مضحکہ خیز امر ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ کتاب سے خط مراد ہے۔ لفظ کتاب اسی قصہ میں اس سے پہلے دوبار اسی معنی میں قرآن مجید میں آچکا ہے اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا (میری یہ کتاب (خط) لیجا۔ اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (میرے پاس ایک عظیم الشان کتاب آئی ہے)

اس کے علاوہ لفظ کتاب کا معنی خط عربی میں عام طور سے استعمال ہے۔ بلکہ فصحا اسکے سوا خط کے لیئے کوئی دوسرا

لفظ استعمال نہیں کرتے۔ میری تاویل کے مطابق آیت کا مقصود یہ ہے۔ کہ درباریوں میں سے ملکہ سبا کے مضمون خط کا جسکو علم تھا۔ کہ وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے۔ اُسنے کہا کہ میں ابھی لاتا ہوں۔

(۶) قرآن مجید میں ہے۔ کہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر ایمان لائی۔ اور پیغمبرانہ جاہ وجلال دیکھکر بے اختیار پکار اٹھی۔ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لیکن بظاہر تیمم سے اُس کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن ہیتیم میں ملکہ کے یہ فقرے خداوند۔ تیرا خدا مبارک ہو۔ جو تجھ سے راضی ہے۔ اور جس نے تجھے بنی اسرائیل کے تخت پر بٹھلایا۔ کیونکہ خداوند اسرائیل کو ابد تک پیار کرتا ہے۔ اور تجھکو بادشاہ بنایا۔ کہ عدل و انصاف کرے۔ کیا اُس کے ایمان تک کو نہیں ظاہر کرتے۔ مسیحی احباب تو قرآن کی تائید پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انجیل کا یہ درس اُنکو یاد ہے۔[۱]

جنوب کی ملکہ فیصلہ کے دن اس نسل کے ساتھ کھڑی ہو گی۔ اور ملامت کرے گی کہ وہ زمین کے انتہائی حصہ سے سلیمانؑ کی حکومت سُننے آئی۔ اور دیکھو کہ یہاں سلیمانؑ سے بڑا ہے۔ (مسیحؑ) (متی ۲-۲۲)

فاضل معاصر نے اس قصہ کے متعلق چند شکوک اور اُنکا ازالہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے۔ اُسکو ہم نے بلفظہ و بجرذ نقل کیا ہے نقل کر دینے کے بعد اتنا عرض کردینا ضروری ہے۔ کہ فاضل محقق نے اس مضمون کی ترتیب میں جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ آپ کی ایجاد نہیں۔ بلکہ فی الحال یہی سیاق تحریر و تحقیق قرار پا چکا ہے۔ اور محققین جدید کی مجتہدانہ توجہ اس کی طرف مبذول رہتی ہے۔ کہ کتب سماویہ کے تمام احکام۔ اعمال۔ اور قصص و حالات کو۔ جس طریقہ سے ہو سکے۔ قریب العقل اور ممکن الوقوع ثابت کریں۔ توراۃ و انجیل کے احکام کی مطابقت کہاں تک عقل سے ہوتی ہے۔ یا ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہم جوابدہ نہیں۔ مگر ہاں شریعت قرآن اور اُس کے احکام ممکنات عقلی کے بالکل مطابق ہیں۔ اور صرف ممکن العقل ہی نہیں۔ بلکہ ضرورت زمانہ اور اصلاح تہذیب اخلاق انسانی کے لیے بھی بیحد ضروری ہیں۔ مگر ان اُمور کی تشریح و تفصیل کے لیے ارض القرآن کا موضوع و عنوان ہرگز موزوں نہ تھا۔ لائق محقق کو اُس کی تحریر سے اسکا پہلے خیال کر لینا بہت ضروری تھا۔ اور پھر اُسی کے ساتھ یہ غور کر لینا بھی فرض تھا۔ کہ باوجودیکہ شریعت اسلامی اُصول عقلی کی بنا پر تمام تر مبنی ہے۔ مگر تاہم اُس نے بحکم انی اعلم بما لا تعلمون قدرت کے حدود کو کسی حالت میں نہ محدود کیا ہے۔ اور نہ اُسکی جبروت سے کسی وقت مقابلہ یا موازنہ کی جرأت کی ہے۔ بلکہ انسان کے تمام عقل و شعور اور قوائے مُدرکہ کو اُس کی جبروت قدرت کا مطیع و منقاد ثابت کیا ہے۔ اس بنا پر ہر مجتہد اور محقق اسلامی کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے۔ کہ وہ قدرت کے عجائبات و نوادرات کی تلاش و فکر میں اپنے انسانی تعقل سے زیادہ نہ بڑھے۔ اور جسقدر وہ تعقل کر چکا ہے۔ اُسی پر بس کرے۔ جتنا زاید تعقل کرتا جائے گا۔ اُتنا تامل بڑھتا جائے گا۔ اور پھر ان شبہات و شکوک کا سلسلہ تمام نہ ہو گا۔

ہُدہُد کی تحقیق میں اسکے مطابق تعقل کرنے کی کوششیں تمام ہو چکی تھیں۔ مگر اور زیادہ قریب عقل بنانے کی کوشش نے پہلی تاویل کو پھر مشکوک کر دیا۔ کیونکہ ہُدہُد کی تعلیم یافتہ نامہ بری کے متعلق اور نہ حضرت سلیمانؑ کے اوّل ہی بار بھیجنے کی نسبت قرآن

سبا کا مذہب

قرآن مجید نے تبلایا ہے کہ سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ | میں نے سبا کی شہزادی کو اور اُسکی قوم کو خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہوئے پایا۔

بتیم اس ذکر سے خاموش ہے۔ لیکن ترگوم سے تصدیق ہوتی ہے۔ ترگوم کا فقرہ یہ ہے۔ کہ جبکہ ملکہ آفتاب کی عبادت کو جارہی تھی۔ یونانی مورخ تھیوفراستینس (Theophraslineus) ۳۱۲ ق م۔ جو

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ میں اشارتاً وکنایتاً کوئی بیان ہے پھر یہ آپ کی یہ قیاسی تاویل بھی۔ جیسے آپ پہلے صاحبان قیاس کی لفظ طیر کی غلط فہمی دکھلاتے ہیں۔ ایک غلط تخیل ٹہرائی جائے گی۔ اسی طرح آپ کی تصریحات نمبر ۲ و ۳ یعنی تخت بلقیس اور اُسکے ہدیہ کی ضرورت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سب ممکن الوقوع ہے۔ مگر پھر آخر میں یہ لکھدیا جانا۔ کہ گویا یہ تخت خود ملکہ سے آئی تھی۔ جیسا کہ غیر مذاہب اسلامیہ شواہد سے ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اور قرآن مجید کے لفظ تحفہ کی بناپر اسکی تطبیق کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مگر تطبیق سے پہلے الفاظ قرآن کو کافی طور سے سمجھ لینا چاہیئے۔ جو ملکہ کے عرشٌ عظیمٌ اور اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ اُس کے ارسال تحفہ کو ضرور بتلارہے ہیں۔ مگر اس سے تخت کے تحفہ خاص کی نذر گذرانے جانے کی کوئی خصوصیت معلوم نہیں ہوتی جو یقینی طور پر صحیح مانی جائے۔ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ کی تاویل بھی اسی حد تک صحیح کہی جائے گی جب تک کہ جبروت قدرت سے انکار مترشح نہیں ہوتا۔ آخری بحث وَعِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کے متعلق ہے۔ اس میں اسم اعظم کے مراد و مفہوم کی جو مفسران قرآن کا متفقہ ہے۔ تنقید کی گئی ہے۔ اور علم کتاب سے محض وہ کتاب یعنی خط جو ملکہ نے سلیمانؑ کو لکھا تھا۔ مراد لیا گیا ہے۔ اور اس تخیل کی بنا لفظ کتاب کے یہ معنی خط اس قصہ میں واقع ہونے پر جو الفاظ قرآنی میں پائے جاتے ہیں۔ قایم کی گئی ہے۔ یہ بھی قیاسی معیار ہے۔ اور خیالی تخارہ۔ یہ ضرور نہیں کہ ایک لفظ کے تمام ایک ہی معنی مراد ہوں۔ اگر یہی دلیل صحیح مان لی جائے۔ تو کتاب کے یہی معنی خط دو تین مقاموں سے زائد میں نہیں آتے ہیں۔ اور کتاب اُن معنیوں میں جن معنیوں میں توراۃ اور مفسران قرآن نے تبلائے ہیں۔ وہ کثیر التعداد مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ اُن کے لیئے کیا جواب دیا جا ئیگا۔ اور اصول کثرت پر کیوں اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ مگر جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ارض القرآن کا سادہ اور آسان موضوع علم کلام کے دشوار اور سخت مسائل ومباحث کے تصفیہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اب رہا زمانہ حال کے محققین خصوصاً مغربی مستشرقین کے طریقہ تقلید کو مناسبت اور قبولیت کے اُسی درجہ تک اجازت ہوسکتی ہے۔ جہاں تک اُنکے مکاشفات اعتقادات میں فسادات پیدا نہ کریں۔ اور منافی قدرت نہ ثابت ہوں۔ کیونکہ اسلام کے عقائد میں یہ امر بڑی اہمیت سے داخل ہے۔ کہ انسان چاہے۔ اپنے تعقل کے عرش الکمال تک نہ پہونچ جائے۔ تاہم وہ قدرت کی ندرت اور جبروت الہیہ کے رموز و حکم تک ذرہ بھر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ مگر ہاں مدارج تعقل اور منازل فکر وتلاش میں جو جہاں تک پہونچا ہے۔ وہ وہیں تک رہے۔ اور اپنے

اسلام سے تقریباً ۹۰۰ برس پیشتر اور سبا کا معاصر تھا بخورات کے ذکر میں لکھتا ہے۔ یہ ملک سبا سے متعلق ہے۔ جو بخورات کی ملکیت کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کی ہیکل میں جو اس قوم میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ لایا جاتا ہے۔ Herons Hislorical Researches Vol. P351

روایات عرب سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بانی قبیلہ سبا کا لقب عبد الشمس مشہور ہے (تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۱۰۰ کلکتہ) جس کے معنی پرستار آفتاب کے ہیں

انکشافات اثریہ نے اس مسئلہ کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جس کی تفصیل "ادیان" میں آئے گی۔ مجمل یہ ہے کہ سبا کے سعد دیوتاؤں میں سے ایک شمس بھی تھا جس کی تمام جنوب عرب میں پرستش کی جاتی تھی۔

Encyclopidea of Islam Vol 1 P379 مسلمانوں نے ابتدائی صدیوں (دوسری یا تیسری صدی) میں یمن کی ایک عمارت کا کتبہ پڑھا تھا۔ جو جنوبی (حمیری) زبان میں تھا۔ اس میں عبارت منقوش تھی۔ بسم اللہ ھذا ما بناہ شمر یرعش لسیدتہ الشمس - شمر یرعش نے سورج دیوی کے لیے یہ بنایا۔ تاریخ اصفہانی صفحہ ۱۱۰ کلکتہ۔

سبا کا تفرق و انتشار اور نتیجہ زوال و ادبار۔

ہم نے کہیں اوپر بیان کیا ہے۔ کہ سبا کے مقبوضات تین حصوں پر منقسم تھے۔ حبش یمن اور شمال عرب ۱۰۵ ق م میں یہ شیرازے بکھر گئے۔ حبش پر اکسومی خاندان (اصحاب الفیل) قبضہ کر بیٹھا۔ شمالی عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے خروج کیا۔ یمن میں حمیر (شاخ قبیلہ سبا) نے ظہور کیا۔ اور بقیہ قبائل تمام تتر بتر ہو گئے۔ اصلی باعث یہ ہوا۔ کہ چوتھی صدی ق م کے آخر میں یونانیوں نے اور پہلی صدی ق م میں رومیوں نے علی الاتصال شام و مصر پر قبضہ کر لیا۔ یہ عربوں کے بار بار حملوں سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے۔ عرب اس تجارت کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے غیر قوموں کو اپنے ملک سے گذرنے نہیں دیتے تھے۔ انباط اور حمیر کے واقعات پڑھے جائیں۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ صرف اسکے لیے کتنی خونریزیاں ہوئیں۔ اور یونانی اور رومی ان

بقیہ عبارت حاشیہ زیریں صفحہ گذشتہ: تک اپنی تفہیم و اعتقاد کو محدود کرے دوسروں کو اسکی تبعیت اور تسلیم کرنے کی تکلیف نہ دے۔ کیونکہ اسکا تعلق ظنی ہے۔ اور جو اپنے تعقل و تفہیم کی تکلیف دوسروں کو پہونچاتا ہے۔ اسکا تعقل و تفہیم یقینی ہوتا ہے۔ اور اس میں روحانی تائید خصوصیت کیساتھ ضروری ہے۔ اس لیے ظنی تعقل والا ایک مصلح قوم اور ناصح مشفق سے زاید نہیں۔ اسلیے اسکی تبعیت اسکے غیر کیلئے واجب کے برابر نہیں بلکن یقینی تعقل والا منجانب اللہ نبی مرسل ہوتا ہے اور اسکی تبلیغ واجب الاتباع۔ لہذا اگر فاضل معاصر ان تفہیمات کو اپنی تک محدود کریں۔ تو کسی کو عذر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اسکے کلام واجب الاتباع ہو نہیں تامل بھی ہے اور کلام بھی اولاد حیدر

دشوار گذار پہاڑوں اور ریگستانوں کو آسانی سے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اُنہوں نے ہندوستان و افریقہ کی تجارت بری راستے سے بحری راستہ کی طرف منتقل کر دیا۔ اور تمام مال کشتیوں کے ذریعے بحر احمر کی راہ مصر و شام کے سواحل پر اُترنے لگے۔ اس طریقہ سفر نے سبا کی تجارت کو بالکل سرد و گرد کر دیا۔ اور اس نے یمن سے شام تک خاک اُڑا دی اور سبا کی تمام نو آبادیاں بے نشان کر دیں۔ چونکہ اُن کی دولت اور خوش حالی تجارت ہی کے سبب سے تھی۔ اور مفقود ہو گئی۔ ادبار موجود ہو گیا۔

رواۃ عرب اُن کے تفریق و تخریب کا باعث۔ سدِ عرم کے ٹوٹ جانے کو بھی بتلاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے اُنکی زراعت کو سخت نقصان پہونچا۔ اور اُن کی اکثر بستیاں بہ گئیں۔ مگر اس سیلاب کا باعث اتنا وسیع نہیں ہو سکتا۔ کہ تمام ملک یمن کو برباد کر دے۔ اُس نے جو کچھ نقصان پہونچایا ہوگا۔ وہ شہر مارب اور اُس کے آس پاس کے دیہات کو جہاں وہ آیا تھا۔ اور اُسکا اثر پہونچا تھا قرآن مجید ان دونوں توجیہہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۔ (سورۃ السبا)

بے شبہ سبا کے لیے خود اپنے گھر میں نشانیاں تھیں۔ دو باغ داہنے اور بائیں اپنے پروردگار کی روزی کھاؤ۔ اور اُسکا شکر کرو۔ ستھرا شہر ہے۔ اور معاف کرنے والا مالک۔ اُنہوں نے سرتابی کی تو ہم نے اُن پر بند توڑ دیا۔ اور سیلاب بھیجا۔ اور اُن کے باغوں کی بجائے بد مزہ پھلوں، جھاؤ اور کچھ جھیر بیری کے جھاڑ پیدا کر دیے یہ اُن کی ناشکری کی جزا تھی۔ اور ہم صرف ناشکروں ہی کو سزا دیتے ہیں۔ ہم نے اُنکے ملک اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں۔ اور اُن میں سفر کی منزلیں مقرر کر دی تھیں۔ چلو ان آبادیوں کی منزلوں میں دن رات بےخوف و خطر۔ اُنہوں نے کہا کہ خدا نے ہمارا بڑا سفر بنایا یا اے خدا ہمارے سفر کو دور کر دے۔ اُنہوں نے خود اپنی جان پر ظلم کیا۔ تو ہم نے اُنکو کہانی بنا دیا۔ اور پارہ پارہ کر دیا۔ حقیقتاً اس میں عبرت کی نشانیاں ہیں شکر گذار اور صابر کے لیے (السبا)

حمیر یا سبا کا طبقہ ثالثہ و رابعہ۔ قوم تبع و اصحاب الاخدود۔ ۱۱۵ ق م۔ ۶۲۵

ملک یمن دو حصوں پر منقسم ہے۔ مغربی اور شرقی۔ قطعہ مشرقی جو اندرونی ملک سے ملحق ہے۔ مملکت سبا ہے۔ قطعہ مغربی جو ایک طرف بحر عرب اور دوسری طرف بحر احمر کو چھوتا ہے۔ حمیر کی مملکت ہے

اسی سے سمجھ لیا جائیگا۔ کہ بحری تجارتوں نے سبا کو ہٹا کر حمیر کو کس حد تک چمکا دیا ہوگا۔ یہی سبب ہے۔ کہ یمن کی حکومت مشرق سے منتقل ہو کر مغرب کو چلی آئی۔ اور حمیر جو مغربی قبیلہ تھا۔ اُسے قوت مزید حاصل کرلی۔ ناچار مشرقی قبائل رزق معاش کی تلاش میں کچھ مغرب کو اُٹھ آئے۔ اور کچھ یمامہ۔ بحرین۔ حجاز۔ عراق اور شام کو چلے گئے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حمیر سبا سے کوئی الگ شے نہیں ہے۔ صرف خاندان اور موقع حکومت کا فرق ہے۔ زبان۔ مذہب اور طریق تمدن تمام چیزیں ایک ہیں۔ اس لیئے خود حمیر کے کتبات میں بھی بجائے حمیر کے سبا ہی مذکور ہے۔ البتہ مورخین یونان ۲۰۰ق م اور اہل حبشہ نے چوتھی صدی عیسوی کے اپنے کتبات میں ان کو حمیر کہا ہے

لفظ حمیر:۔ علمائے انساب کہتے ہیں۔ کہ حمیر سبا کے جانشین و فرزند کا نام تھا۔ اس لیئے سبا کی تمام تاریخ میں وہ بجائے سبا کے ہر جگہ حمیر بولتے ہیں۔ لیکن اب تک جو کتبات ملے ہیں۔ اور پڑھے گئے ہیں۔ اُس میں لفظ حمیر کہیں دکھائی نہیں دیتا[1]۔ خود حمیر سلاطین اپنے آپ کو ملک سبا ذو ریدان لکھتے ہیں۔ ہاں اہل حبش کے بعض کتبات میں حمیر اور ارض حمیر البتہ کہیں کہیں ملتا ہے۔ لفظ حمیر حبشی اور عربی میں حمر سے مشتق ہوگا۔ جسکے معنی سُرخ کے ہیں۔ اور محاورے میں گورے رنگ کو کہتے ہیں۔ اسکا مقابل اسود عرب سیاہ و سپید کی جگہ الاسود والاحمر بولتے ہیں۔ چونکہ عرب اہل حبش کو اسود اور سودان کہتے ہیں۔ اس کے مقابل میں حبش عربوں کو حمیر یعنی گورے رنگ کے آدمی کہتے ہیں۔ ابرہہ یمن کا حبشی فاتح اپنے ایک کتبہ میں لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ حبشی اور حمیر فوج لیکر آیا۔ موجودہ محاورہ ہند میں اسکے یہ معنی ہوسکتے ہیں۔ کہ کالی اور گوری پلٹنیں ہیں۔

مملکت حمیر:۔ تمہید میں معلوم ہوچکا ہے۔ کہ حمیر مغربی یمن میں بحر عرب و بحر احمر کے متصل آباد تھے۔ اسوقت اس خاندان پر "ذو" (امیر) حکومت کرتے تھے۔ قلعہ ریدان انکا مسکن تھا۔ اور اسی بنا پر خطاب امارت ذو ریدان تھا۔ یہ قلعہ شہر ظفار کے قریب تھا۔ جو شہر صنعا کے قریب واقع ہے۔ اور جدید حکومت کا پایہ تخت تھا۔ ابو علقمہ الحمیری اسی ریدان کے ذکر میں لکھتا ہے۔

وفی ظفار بنت آباؤنا غرفا ہمارے بزرگوں نے ظفار میں عمارتیں قائم کیں	فی کوکبان وقصر الملک ریدانا نیز کوکبان میں اور قصر شاہی میں ریدان تھا

سبا کی تباہی کے بعد حمیر نے مآرب تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔ اُسوقت انکا لقب شاہی۔ ملک سبا ذو ریدان نظر آتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اُن کے القاب میں "شاہ حضرموت" کا بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ پھر تمام یمن۔ نجد اور

[1] جہاں جہاں اس باب میں کتبہ کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ وہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل ۱۸۷۴ء کے مضامین مطالعہ زبان سبا سے ملتقط ہیں۔ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۷۸۔

تہامہ کی بادشاہی القاب میں نظر آتی ہے۔ اسی سے ظاہر ہے۔ کہ کس طرح رفتہ رفتہ اُن کی حکومت کا رقبہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ آخر ۵۲۵ء میں آخری حمیری بادشاہ ذونواس الکسومی۔ حبشیوں سے شکست کھاتا ہے۔ اور تقریباً چالیس برس کے لیے ملک اُن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایرانی آتے ہیں۔ اور اُن کے چند برسوں کے بعد تہامہ کی گھاٹیوں سے خورشید اسلام یمن میں طلوع ہوتا ہے۔ اور ایک دن میں تمام یمن اس نور سے منور ہو جاتا ہے۔

حمیر کا زمانہ:۔ سبائے حمیر کے پچھلے کتبات میں مبہود ابن ابہد کے نام سے ایک غیر معلوم تاریخ کے سنین کا استعمال کیا گیا ہے۔ ۳۸۵ء و ۵۷۳ء و ۵۸۲ء و ۶۴۰ء و ۶۵۷ء و ۶۵۸ء و ۶۶۹ء مختلف کتبات کے سنین ہیں۔ ان میں سے ۶۴۰ء کے کتبہ میں حبش کے حملے یمن اور ذونواس کی موت کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ عرب روایات اور رومی بیانات کے مطابق ۵۲۵ء کا ہے۔ اس بنا پر یہ بالکل بدیہی ہے۔ کہ ۵۲۵ء و ۶۴۰ء حمیری کے مطابق ہے۔ اور اس لیے سنہ حمیری کی ابتدا ۱۱۵ء ق م قرار پائے گی۔[۵۱] مگر دوسرے اور کتبات کی عبارت پڑھکر اور ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ سبائے حمیر کی تاریخ پہلی صدی ق م کے اوسط سے شروع ہوتی ہے[۵۲] اور آخر شاہ حمیر ذونواس کی موت پر ۵۲۵ء میں حکومت حمیر ختم ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے حمیر کی کل مدت حکومت تقریباً ۵۵۰ برس قرار پائے گی۔

حمیر کے طبقات:۔ حکومت حمیری کے ۵۵۰ برس حمیر کی مسلسل تاریخ نہیں ہے۔ پہلی صدی ق م سے تیسری صدی کے اواخر تک حمیر کا طبقہ اوّل۔ یا سبا کا طبقہ ثالث فرمانروائی کرتا رہا۔ دوسرا طبقہ تیسری صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ اور ابھی چند ہی بادشاہ گذرتے ہیں۔ کہ اکسومی حبشی چوتھی صدی کے اوسط میں گھس آتے ہیں۔ چند سال کے بعد حمیر ان حبشیوں کو نکالکر۔ پھر وطنی حکومت کی بنیاد ڈالتے ہیں یہ طبقہ ۵۲۵ء تک جبکہ آخری بار اہل حبش فاتحانہ داخل ہوتے ہیں۔ قائم رہتا ہے۔

سبائے حمیر کے ان دونوں طبقات میں فرق و امتیازات ہیں۔ دور اوّل کے سلاطین کا لقب "ملک سبا و ذوریدان" ہے۔ دور ثانی میں یہ سلاطین ملک سبا و ریدان و حضرموت کا لقب اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر جب کوئی نیا قطعہ ملک فتوحات میں شامل ہوتا ہے۔ تو لقب شاہی میں اُتنا ہی اضافہ اور ہو جاتا ہے۔ ان القاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دورہ اوّل میں حمیر کا رقبہ حکومت صرف یمن تک محدود تھا۔ دور ثانی میں حضرموت تک وسیع ہو جاتا ہے۔ عرب مورخین کے بیان سے بھی ان طبقات کی تصدیق ہوتی ہے۔

---

۵۱ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔ ج ۲۳ ص ۹۵۶۔
۵۲ " " "
۵۳ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۳۷۷
۵۴ تاریخ حمزۃ اصفہانی ص ۱۰۸ کلکتہ۔

و اول من ملك من اولاد قحطان حمير ابن سبا فبقى مليكا حتى مات هرما و توارث ولده الملك بعده فلم يبعدهم الملك حتى مضت قرون وصل الملك الى الحارث وهو تبع الاول من ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك بسبا وملك بحضرموت فكان لا يجتمع اليمانيون كلهم عليهم الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه وتبعوه فسمى تبعا۔

فرزندان قحطان میں سے پہلے پہلے جو بادشاہ ہوا، وہ حمیر بن سبا ہے، یہ آخر وقت تک بادشاہ رہا۔ یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا۔ پھر حکومت اوس کی نسل میں وراثتاً جاری رہی، اور انکے ہاتھ سے نہیں نکلی تا آنکہ چند صدیاں گذر گئیں، پھر حارث الرائش پہلا بادشاہ ہوا، جو تبع کہلایا، اس سے پہلے دو بادشاہ ہوتے تھے، ایک سبا میں اور ایک حضرموت میں، تمام یمنی ایک کی طاقت پر متفق نہیں ہوتے تھے، لیکن جب یہ بادشاہ ہوا، تو اوس کی بادشاہی پر سب متفق ہوگئے اور اوس کی اطاعت کرلی، اس لئے اسکا لقب تبع ہوا۔

شاہان حمیر اور اُن کے طبقات کی نسبت ہم نے جو کچھ لکھا اوس سے معلوم ہوا، کہ اینس اکسومی (سبائی) حبش کی ایک قلیل الزمانہ حکومت کی خلیج بھی حائل ہے، عرب مورخین کو گو اوس سے واقفیت نہیں، لیکن انکی فہرست سلاطین میں حبشی ترکیبوں کے نام داخل ہیں، اگرچہ مختلف صورتوں اور ترکیبوں کے نام ضرور ہیں، مگر تاہم طبقہ ثانی کے بیچ میں یعنی حارث الرائش اور ناشر نعم کے درمیان، ناموں کے رنگ و بو پہچاننے والوں کو صاف حبشی یا کم از کم غیر عربی و حمیری رنگ و اثر چند ناموں میں ضرور نظر آئے گا۔

نمبر	نام (الف)	کیفیت	نمبر	نام	(ب) کیفیت
۱	حمیر	نام	۱	الہیسع	مصنوعی نام
۲	ایمن	صحیح لیکن نام کا صرف ایک جزو ہے		ج ا ناشر ینعم	صحیح نام
۳	زہیر	مصنوعی	۲	شمر یرعش	〃
۴	عریب	〃	۳	ابو مالک	〃
۵	الغوث	〃	۴	الاقرن بن ابی مالک	مشکوک
۶	وائل	ایک خاندان شاہی کا مبہم نام ہے	۵	ذو حبشان بن الاقرن	〃
۷	عبد شمس	صحیح	۶	تبع بن الاقرن	〃
۸	زہیر الصوار	مشکوک	۷	کلیکرب بن تبع	صحیح
۹	ذو لیقدم	〃	۸	اسعد ابو کرب	〃
۱۰	ذو انس	〃	۹	حسان ابن تبع	مشکوک

۱۱	عمرو	؍؍	۱۰	عمرو بن تبع	مشکوک
۱۲	الملطاط	مصنوعی	۱۱	عبد کلال	صحیح
۱۳	انعفیص	؍؍	۱۲	تبع ابن حسان	مشکوک
۱۴	سدو	؍؍	۱۳	مرثد ابن عبید	صحیح
۱۵ (ب)	الحارث الرائش	صحیح نام	۱۴	ولیعہ ابن مرثد	؍؍
۱	ابرہہ ذو المنار	حبشی نام ابرہہ۔ ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے	۱۵	ابرہہ ابن الصباح	حبشی
۲	افریقش ابن ابرہہ	غیر عربی نام افریقش کا معنی شاید افریقی جنس ہوں	۱۶	صہبان ابن محرث	مشکوک
۳	العبد ذو الاذعار	مشکوک	۱۷	حسان ابن عمرو	؍؍
۴	ہداد بن شراحیل	ایک حبشی بادشاہ کا نام	۱۸	ذو شناتر	صحیح
۵	بلقیس بنت ہداد	غیر عربی۔ شاید یونانی۔	۱۹	ذو جدن	؍؍ ۲۰ ذو نواس صحیح

اس طویل فہرست میں قائمہ الف طبقہ اوّل حمیر ہے۔ لیکن اس کے تمام نام صحیح نہیں ہیں۔ قائمہ ب ایک مختصر حبشی دَور ہے۔ یہ نام بھی غیر صحیح ہیں۔ لیکن حبشیت کا اس میں شائبہ ضرور ہے۔ قائمہ ج طبقہ دوم حمیر ہے۔ اور قرب زمانہ کے سبب اس کے اکثر نام صحیح اور محفوظ ہیں۔

طبقہ اوّل کے صحیح نام اور زمانے۔

شاہان حمیر کے صحیح نام وہ ہیں۔ جو ابتک پتھر اور چاندی کے حرفوں میں یمن کے ویرانوں اور سکوں میں لکھے ملے ہیں۔ اور جن کو بہتوں نے پڑھا ہے۔ اور ہر شخص جاکر پڑھ سکتا ہے۔ ہم نے اُوپر بتایا ہے۔ کہ طبقہ ثانی کے بعض کتبوں پر تاریخیں بھی ثبت ہیں۔ جنکا حل بھی ہو چکا ہے۔ بعض سلاطین کے نام رومیوں کی سیاسی و تجارتی تعلق سے یونانی و رومی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اور قیاصرۂ روم کی معاصرت سے اُنکی تاریخ معلوم ہے۔

اس رومی تعلق سے طبقہ اوّل حمیر میں سے۔ جسکا لقب شاہی۔ ملک سبا و ذوریدان ہے۔ دو بادشاہوں کی تاریخ معلوم ہے۔ کرب ایل (Charibail) اور الیشرح (Elisaros) کتبہ میں الیشرح یحضب اور وتیل بین شاہان سبا و ریدان فرزندان فرع ینہب شاہ سبا۔ رومی تاریخ میں ایک حملۂ یمن کا ذکر ہے۔ جو سنہ ۲۴ ق م الیشرح شاہ مآرب پر (سبا) کیا گیا تھا۔ الیشرح اس عہد میں دو (چچا) اور (بھتیجے) کا نام تھا۔ الیشرح یحضب اور الیشرح یحمل

رومیوں میں بھی یہودیوں کی طرح سبا کی دولت و ثروت کی اسقدر شہرت ہوگئی تھی۔ کہ رومن لٹریچر میں سبا

کی دولت ضرب المثل بن گئی۔ شعراء ان کی دولت کی تمثیل دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ طمع حرص نے کام و ذہن میں لذت اور دست و پا میں حرکت پیدا کی سنہ ۲۴ ق م میں ایلیس گیلوس (Aelius Gallus) جو رومیوں کی طرف سے مصر کا گورنر تھا۔ قیصر اوغسطس (Agustus) کے حکم سے یمن پر حملہ کی تیاری کی۔ انباط (بنت بن اسمٰعیل کی اولاد) جو شمالی عرب میں اُن کے زیر اثر تھے۔ اعانت کے لیے آمادہ کئے گئے اور بظاہر وہ بھی آمادہ نظر آئے۔ شاہ انباط کا وزیر سلوس یا ثالث عرب کے بے نشان کوہ و بیابان میں رہبر بنا۔ آخر صحرا و کوہستان حجاز طے کرکے یمن میں داخل ہوا۔ الیشرح جو اسوقت یہاں کا بادشاہ تھا۔ حملہ کی تاب نہ لاسکا اور قلعہ بند ہوگیا۔ رومی کئی روز تک محاصرہ کئے پڑے رہے۔ لیکن پانی کی کمیابی سے خود حملہ آور فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اور نجران و حجاز ہوکر ۶۰ دن کے بعد بحال تباہ وزار مصر[۵۱] واپس آئی

یوروپین مورخین اس مختصر اور عاجلانہ مہم کو بہت ہی لگا کر بیان کرتے ہیں۔ کوئی فوج کے راستہ کا نشان بتاتا ہے۔ کوئی محرف ناموں کی تصحیح کرتا ہے۔ کوئی اسکا جغرافیہ تیار کرتا ہے۔ کوئی اس مہم کی ناکامیابی کا سبب انباط کی خیانت ٹھہراتا ہے۔ کوئی راستہ کی دشوار گذاری کا عذر تراشتا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور ریورنڈ فارسٹر اس کہانی کے مشہور قصہ گو ہیں۔ بہرحال رومیوں کی اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پھر انہوں نے ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا

اکسومی حبش اس بنا پر کہ حمیر تمام تر سبا پر قابض ہوگئے۔ ان سے جلتے تھے۔ حبشی کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی سے اُنہوں نے یمن پر حملہ شروع کردیا۔ اور یہ حملہ مسلسل قائم رہا۔ کبھی فاتح ہوکر آگے بڑھے کبھی مفتوح ہوکر پیچھے ہٹے۔ آخر حضرموت پر موقع پاکر جم گئے۔ شمر یرعش نے (جس کو عرب حارث الرائش اور شمر یرعش دو شخص سمجھتے ہیں) ان سے جنگ کی ہوگی۔ اور اسنے یہ مقامات چھین لیے ہونگے۔ کیونکہ وہ یمن اور حضرموت دونوں کا بادشاہ ہوا اور اپنا لقب اسلیئے اس نے تبع اختیار کیا جس کے معنی حبشی زبان میں سلطان کے ہیں۔ اور شاید اسی لیے قومی ہیرو کے لحاظ سے عرب اُسکو زیادہ وقعت دیتے ہیں۔ شمر یرعش کے بعد ایک مدت تک تاریخ کی کڑی نہیں ملتی جس سے قیاس ہوتا ہے۔ کہ نالائق جانشین ہونگے۔ اسی بنا پر اکسومیوں نے پھر دوبارہ حملہ کیا۔ اور حمیر کو شکست دی تقریباً سنہ ۳۴۰ء سے سنہ ۳۷۸ء[۵۲] تک یہ مدعی فرمانبردار رہے۔ گو وطنی رؤسا بھی اپنی جگہ پر ماتحت کی حیثیت سے قائم رہے۔ سنہ ۳۷۸ء میں ملک یکرب نے ان کو نکالکر یمن و حضرموت پر دوبارہ حقیقی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت سنہ ۵۲۵ء تک قائم رہی۔ اکسومیوں نے دوبارہ حملہ کرکے ان کو برباد کردیا۔ گویا تیس برس قبل ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔

---

۵۱ فارنس ایس گالوس کی عرب پر مہم ج ۲۔ ۵۲ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ مضمون سبا و اتھوپیا و اکسوم۔

سنہ ۳۰۰ء سے سنہ ۳۷۸ء تک جو اکسومی خاندان قایم کیا گیا ہے۔ اس کی صحت کی متعدد دلیلیں ہیں۔ اولاً
تو یہ کہ اکسوم کے کتبہ میں اس کی تفصیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاہ اذنیتہ اور اس کے جانشین جو سنہ ۳۳۰ء سے
سنہ ۳۷۸ء اکسوم میں بادشاہ تھے۔ اپنے کو ملک اکسوم وحمیر وریدان وا تھوپیا وسبا وزیلع کہتے ہیں۔ حمیری
کتبات میں اس عہد کے نام بلقب شاہی نہیں ملتے۔ عربی تاریخوں میں اس عہد کے سلاطین حمیر کے جو نام ہیں
شمر برعش اور ملک یکرب مذکور ہیں۔ وہ حبشی التلفظ ہیں۔ خود عرب مورخین بیان کرتے ہیں۔ کہ شمر برعش کے
بعد اس بنا پر حمیر طبقہ دوم یعنی ملوک سبا وریدان وحضرموت کی ترتیب یہ ہے۔ کہ اولاً حمیری بادشاہ ہیں
پھر چند حبشی ہیں پھر سلسلہ حمیری ہے۔

طبقہ ثانیہ یا تبابعہ:۔ طبقہ ثانیہ یعنی وہ سلاطین جنکا لقب ملک سبا وریدان وحضرموت ہے
عرب اُن کو تبع کہتے ہیں۔ اور اُسی کی جمع تبابعہ ہے۔

لفظ تبع کی تحقیق۔

لفظ تبع لغویین عرب کے نزدیک تبع یا تبعیت سے مشتق ہے

فصار الملك الى الحارث الرائش وهو تبع الاول
فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك لسبا و
ملك بحضرموت فكان لايجتمع اليمانيون عليهم
الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه وتبعوه
فسمى تبعًا (حمزہ اصفہانی صفحہ ۱۰۸)

حمیر کے بعد یمن کی حکومت حارث الرائش (برعش) کو ملی۔ یہی
تبع اول ہے۔ اس سے پہلے دو بادشاہ یمن میں ہوتے تھے
ایک سبا میں ایک حضرموت میں۔ تمام یمنی ایک بادشاہ پر متفق
نہیں تھے۔ جب الرائش بادشاہ ہوا۔ تو سب اُسکی بادشاہی پر
متفق ہوگئے۔ اور اُسکی تبعیت اختیار کی۔ اسلئے اُسکا لقب تبع ہوا

فاضل محقق کی لفظ تبع کے متعلق تنقید وتحقیق قابل تحسین توضرور ہے۔ مگر چاہ کندن وکاہ برآوردن کا مضمون برجستہ ہے۔ لغویین عرب کی تنقید کے جوش وشوق میں۔ صرفی نحوی تمام دلائل جو اُسکے غیر عربی ہونیکی تائید کرتے تھے۔ بیان کر دیئے۔ اور یہ نہ بیان فرمایا کہ جس قاعدہ نحو وصرف سے آپ استدلال کرتے ہیں۔ یعنی رتع ومتحدہ کا جمع ہونا۔ اور اُسکا بصورت واحد یا الف لام علامت اسم صفت عربیہ کا اسمیں نہ پایا جانا اُس زمانہ میں مدون ہو چکے تھے۔ جس زمانہ کا یہ عربی لفظ ہے۔ یعنی زمانہ حمیر کا جو صدہا سال قبل مسیح تھا۔ اور آپ کا علم النحو وصرف تو سنہ ۔۔ کے قریب مدون ہوا ہے۔ پھر ان علامات کا اُسوقت میں نہ پایا جانا کیونکر باعث تغلیط لفظ ہو سکتا ہے۔ واحد اُسوقت اکثر بجائے صیغہ جمع مستعمل ہوتا ہو۔ جیسا کہ اُسوقت تک رائج ہے۔ تو کیا اعتراض ہے۔ یا اُسوقت تک الف لام اسم صفت پر نہ لگایا جاتا ہو۔ تو کیا کلام ہے بہرحال ان قرائن ممکن کے خلاف۔ زبان حبش کا لفظ بتایا گیا معنی گھڑے گئے۔ اس کے شواہد بہم پہنچائے گئے۔ اور اسی کو اپنا مختار بالترجیح قرار دیا گیا۔ مگر پھر چشم زدن میں اُس فیصلہ کی بھی خود ہی تردید کر دی گئی۔ اور بالآخر اسکا زبان حمیری یا سبائی ہونے پر بالتمام اعتبار فرمایا گیا

زبان کا ہے۔ جسکے معنی قادر، جبّار اور صاحب قوّت کے ہیں۔[۱] اسلام میں ٹھیک اسی معنی و زور میں لفظ سلطان، قوّت و غلبہ رواج پایا ہے۔ اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی تائید علاوہ اس کے کہ حبشی زبان میں یہ لفظ موجود ہے یہ ہے کہ عربی میں اس وزن پر کوئی واحد اور بمعنی مفعول نہیں آیا۔ رتّع و تجّد وغیرہ الفاظ ہیں۔ تو وہ جمع ہیں مبالغہ کا وزن ہے۔ تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرتا۔ اور سب سے آخر اس کے غیر عربی ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ عجمی ناموں کی طرح اسپر الف لام نہیں آتا۔ اگر یہ عربی صفت کا صیغہ ہو، تو مانع الف لام کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ کہ یہ صرف حبشی لفظ ہے۔ کتبات ملوک معین وسبا کے عہد میں، یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں لفظ تُبّع نظر آتا ہے۔ ایک بادشاہ معین کا نام تبّع کرب بن تبّع ایل مذکور ہے۔ ایک سبائی کتبہ میں تبّع شرحبل ملک سبا منقوش دیکھا ہے۔ دوسرے کتبہ میں تبّع کرب بلالقب شاہی نظر سے گذرا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا ہے۔ کہ اس معنی میں یہ لفظ اصلاً سبائی و حمیری ہے۔

قرآن اور تبّع:- قرآن مجید نے قوم تبع کا دوبارہ ذکر کیا ہے۔ دونوں بار قوّت و زور اور جبروت و عظمت کی طرف اس سے اشارہ کیا ہے۔ پہلی آیت میں صرف جبّار قوموں میں انکا نام بھی ہے۔ دوسری آیت میں قریش کی طرف روئے خطاب ہے۔ کہ ان کو اپنی کس قوت پر ناز ہے۔ تبع اور ان سے پہلے کی قومیں کیا ان سے زیادہ توانا اور زورمند نہ تھیں۔ ان کا کیا انجام ہوا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ	اس سے پہلے نوحؑ کی قوم۔ اہل رس۔ ثمود۔ عاد۔ فرعون برادران لوط اور اہل ایکہ اور تبّع کی قوم نے جھٹلایا۔
أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ـ	(۲) یہ قریش بہتر ہیں۔ یا تبع کی قوم۔ اور جو قومیں ان سے پہلے گذریں ہم نے ان کو برباد کیا کہ وہ مجرم تھیں۔

تبابعہ کی تعداد:- عام مورّخین اور ان کی تبعیت میں عام مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ صرف تین تبّع گذرے ہیں۔ تبّع اکبر۔ تبّع اوسط۔ اور تبع اصغر۔ تبّع اکبر کا نام الحارث الرائش ہے۔ تبع اوسط اسعد ابو کرب کا لقب تھا۔ اور تبع اصغر تبّع بن حسان تھا

اس کے مقابلہ میں خود حمیری مصنفین کی روایت ہے۔ کہ تاریخ یمن میں ستر تبّع گذرے ہیں۔ شارح قصیدہ حمیریہ

عبارت حاشیہ صفحہ گذشتہ:- ان تحقیقات و تنقیحات کو دیکھکر تو ہر شخص یہی کہے گا کہ ڈگری اخوئین عرب کی ہوئی۔ اور آپ ہی کی بارگاہ تحقیق سے کہ خواہ زبان حمیری ہو یا زبان سبائی، سب زبان قدیم سامیہ کی شاخیں قرار دی گئی ہیں۔ اور انھیں کی ابعد شاخوں میں سے عربی بھی داخل ہے جیسے آپ بھی ام سامیہ الالسنہ لیہ کے باب میں خود لکھ چکے ہیں۔ اس بنا پر اگر خود علمائے لغت اپنی اصلیت اور قدامت کے اعتبار سے حمیری یا سبائی اپنے آباؤ اجداد کی زبان مجملاً عربی کہتے ہیں، تو کیا غلط کہتے ہیں۔ ۱۲ الاحقر حبیب

اور نشوان ابن سعید الحمیری مصنف شمس العلوم نے روایت کے علاوہ اشعار سے اسکی تائید پیش کی ہے۔ لیکن اس سے مقصود شاید عام سلاطین یمن ہونگے۔ کیونکہ لفظ تبع جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے۔ معین تبا اور حمیر ہر دور میں نظر آتا ہے۔ ورنہ تنہا اس طبقہ میں تو یہ تعداد کھینی مشکل ہے۔ جن عام مورخین نے صرف تین مخصوص تبابعہ کا ذکر کیا ہے۔ شاید انہوں نے صرف مشہور ترین تبابعہ کے نام پر کفایت کی ہے۔

تبابعہ کے نام اور زمانے:۔ تبابعین کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ کہ بروایت عرب بھی اُن میں سے اکثر کے نام محفوظ ہیں۔ اور کتبات سے بھی اُن کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہم نے (صاحب ارض القرآن) جو زمانہ ترتیب دیا ہے۔ اُس میں اکثر سنین کتبات ہیں۔ تقیہ استنباط و قیاس ہے۔ اصل سنین جن سلاطین کے منقوش ملے ہیں۔ اور جو ان کے عہد کے کسی کارنامے کی تاریخ ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

	نام	زمانہ		نام	زمانہ
۱	یاسر نیعم	سنہ ۲۷۰ء	۲	شمر یرعش	سنہ ۲۸۱ء
۳	ملک یکرب یہمین	سنہ ۳۷۸ء	۴	شرجیل یعفر	سنہ ۴۵۱ء
۵	عبد کلیل	سنہ ۴۵۵ء	۶	شرجیل	سنہ ۴۸۰ء
۷	نیوف	سنہ ۵۱۰ء	۸	ذو نواس	سنہ ۵۲۵ء

یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ عیسوی اور حمیری سنہ میں ۱۱۵ برس کا فرق ہے۔ اگر ان سنین پر جو عیسوی ہیں ۱۱۵ سال کا اضافہ کر دیں۔ تو حمیری سن نکل آئیگا۔ مثلاً عبد کلال کا سنہ جدول بالا میں ۴۵۸ء ہے اس بنا پر سنہ ۵۷۳ حمیری ہوگا۔

افسانہائے حمیر:۔ رواۃ عرب تبابعین کی نسبت بڑے بڑے عظیم الشان فتوحات اور ملک گیری و کشور کشائی کے عجیب و غریب واقعات بیان کرتے ہیں۔ ایک تبع براعظم افریقہ کا فاتح ہے۔ شمر یرعش کی تیغ کشور کشا عرب سے ترکستان تک ملتی ہو کر ایک شہر کو ویران کر دیتی ہے۔ اور اُسکا نام "سمر کند" پڑتا ہے۔ یعنی شمر نے اُس کی بیخ و بنیاد کھود ڈالی۔ ایک تبع چین تک اپنی تلوار کی کاٹ دکھاتا ہے۔ اور تبت میں اپنی بقیہ فوج چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں اب تک عرب آباد ہیں۔ ذوالقرنین جس نے مغرب و مشرق کے ڈنڈے ملا دیئے تھے۔ اور جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔ وہ یمن کا ایک بادشاہ تھا۔

افریقہ کا بیان ایک حد تک صحیح ہے۔ اہل حبشہ سے مسلسل جنگ قائم تھی۔ کبھی فاتح تھے۔ کبھی مفتوح۔ ورنہ ترکستان و چین کی فوج کشی۔ جس کی ابن خلدون نے بھی کچھ کم ہنسی نہیں اڑائی ہے۔ صرف لفظ کا کھیل ہے (سمرقند)

سمرکند کے پہلے جزکو شمر یرعش کے پہلے جزسے اتحاد تھا۔ اس لئے وہ سمرقند کا بانی یا مخرب قرار پایا۔ انہوں نے کند کو فارسی لفظ کندن سے مشتق سمجھا۔ حالانکہ قدیم ترکستانی زبان میں "کند" شہر کو کہتے ہیں۔ سمرکند۔ و تاشکند۔ خوکند۔ یہ سب ترکستانی شہروں کے نام ہیں۔ ترکستان کی زبان بزمانہ اسلام فارسی ہوگئی تھی لیکن شمر یرعش کے زمانہ میں تو فارسی نہ تھی۔ جو "کند" فارسی "کندن" سے ماخوذ ہوتا۔ چین وتبت کا نگارخانہ بھی صرف لفظوں کا تماشہ ہے۔ عرب تبت کو ثبت کہتے ہیں۔ جو تبع کے بالکل قریب قریب ہے۔ ذو القرنین کو صرف لفظ ذو نے نقد و نسیہ سے یمن پہونچا دیا۔ کہ ذو یمن میں اکثر امرائے حمیر کے لقب میں آتا ہے۔ مثلاً ذو نواس۔ ذو شناتر۔ ذو ریدان۔

لیکن زمانہ اسلام کے بعض عرب سیاحوں کے عینی مشاہدات کا کیا جواب ہے۔ ابن حوقل بغدادی سنہ ھ کا بیان ہے۔ کہ اُس کے زمانہ ورُود سمرقند تک شہر کے دروازے پر شمر یرعش کا حمیری کتبہ ایک لوہے کی تختی پر کندہ موجود تھا افسوس کہ سیاح موصوف ہی کے زمانہ قیام میں یہ نادرہ روزگار شہر میں آگ لگجانے سے جلکر بے نشان ہوگیا۔ اصل میں یہ قدیم ترکی خط (ایغوری) ہوگا۔ جو حمیری وحبشی وغیرہ خطوط کے مشابہ ہے۔ شہرت عام کی بنا پر اُس کو ہمارے سیاح نے حمیری سمجھ لیا۔

اسی طرح مورخ مسعودی کا بیان ہے۔ کہ تبت میں تبع رہ گئے تھے۔ اور چنانچہ خود اُسے عربی لباس ووضع میں اشخاص پائے۔ لیکن چوتھی صدی میں جب سلمانوں کا تمدن تمام دُنیا میں چھا رہا تھا۔ اور عرب تاجر ہر کوہ و بیابان میں گذر رہے تھے۔ تبت میں عربی لباس و وضع کے وجود سے تبع کی فتح تبت پر استدلال مسعودی کی فضل وکمال سے کس قدر فروتر ہے۔ اگر اس قسم کے انقلابات سیاسی حقیقتاً ظہور پذیر ہوتے۔ تو اِس عہد کی زندہ قومیں اُن کے ذکر سے خاموش نہ رہتیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایران کے کیانی خاندان میں ایک مشہور بادشاہ کیکاؤس گذرا ہے۔ اُس نے ایران سے ایک دریا کو (شاید خلیج فارس) عبور کرکے کشور ہاماوران پر فوج کشی کی۔ لیکن شکست کھائی۔ اور گرفتار ہوگیا۔ آخر رستم نے آکر کیکاؤس کو رہائی دلائی۔ کیکاؤس نے چھوٹ کر ہاماوران کی شہزادی سوداب سے شادی کرلی۔ یہ وہی سوداب ہے۔ جس کے مکر وفریب سے گھبراکر شہزادہ عجم سیاؤس توران چلا گیا اور وہاں مارا گیا۔ اور اُسی کے جوش وغضب وانتقام میں صدیوں تک ایران و توران باہم معرکہ آرا رہے۔

کیا حمیر کے افسانے تاریخی حیثیت کے حدود میں نہیں آسکتے؟ فاضل محقق صاحب ارض القرآن نے "بزم افسانہائے حمیر" کے عنوان سے مذکورۂ بالا مضمون تحریر فرمایا ہے۔ جس میں اُن تمام قدیم عربی روایات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو سلاطین

شاہنامہ میں یہ پوری تفصیل میں موجود ہے۔ ثعالبی نے اپنی تاریخ میں (غرر تاریخ الفرس) میں لکھا ہے کہ کشور ہاماوران اصل میں کشور حمیران۔ حمیر کی فارسی جمع ہے۔ سودابہ صحیح عربی نام سُعدیٰ کی تصحیف ہے ثعالبی کے علاوہ تمام لغات فارسی میں ہاماوران کے معنی یمن ہی کے ہیں۔ اس بنا پر ہمیں ان روایات کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں بشرطیکہ یمن کا خاندان حمیر اور ایران کا خاندان کیان تاریخاً معاصر ثابت ہوجائیں۔ اور نیز یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ حقیقتاً ایران کا کوئی بادشاہ ہوگا۔ کیکاؤس کی طرف غلطی سے نسبت ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ۔ حمیر یا سبا کے متعلق ایک لامعلوم وقت اور کثیر التعداد زمانے سے اُنکی یادداشتیں سفینوں اور سینہ در سینہ اُنکی مابعد نسلوں کے سینوں میں علی التسلسل محفوظ اور منقول چلی آتی ہیں۔ یہ تو ان روایات کے تحفظ و استقرار کی حالت زمانہ جاہلیت میں معلوم ہوتی ہے۔ جب تک وہ اپنے حالات کو کتابی صورت میں مدوّن کرنے کا علم نہیں جانتے تھے۔ اور اس امر کی حقیقت سے ہمارے فاضل معاصر کو بھی انکار نہیں ہے۔ اب جب اُن میں زیادہ علمی صلاحیت آئی۔ اور وہ تدوین کتب وصحائف کے قابل ہوگئے تو انہوں نے ان روایات کو اپنے علمی دفاتر اور علمی دخائر میں بھی جگہ دی۔ اور تمام قدیم عربی تاریخوں میں ماخوذ و مستنبط ہوئے۔ جیسا کہ فاضل معاصر کو خود اقرار ہے۔ مگر چونکہ بدقسمتی سے ان روایات پر موجودہ زمانے کے مغربی محققین کو اطلاع نہ حاصل ہوسکی۔ اور کیونکر ہوتی قدیم یونان وروم نے ان عربی ملوک سے کبھی کامیابی نہ حاصل کی۔ اور اُن سے مغلوب نہ ہوسکے۔ جیسا کہ معترف لائق محقق نے بھی اسی کتاب میں اکثر مقامات پر اظہار و اقرار فرمایا ہے (ملاحظہ ہو ارض القرآن ج ۱ ص ۲۸۹۔۲۹۰) اس لیے ان کے فتوحات اُن کی کتب قدیم میں نقل نہیں کیے گئے۔ ہمارے جدید یورپین مستشرقین عام اس سے کہ ارباب تحقیقات تاریخی ہوں۔ یا اصحاب اکتشافات اثری۔ وہ بغیر اپنی قدیم کتابوں میں دیکھے ہوئے ان روایات پر کیوں اعتبار کرنے لگے۔ اس وجہ خاص سے یہ فتوحات یورپین اخبار و تاریخ کی کتابوں میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ لائق محقق چونکہ یورپین ادبیات اثریہ کے بالکل زیر اثر ہیں۔ اس لیے وہ بھی ان روایات کو افسانہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصول تحقیق کی رو سے ان روایات کی صحت کے متعلق دونوں قسم کے ثبوت تاریخی اور اثری او جو دہما اور اُن کو آپ خود دیکھ بھی رہے ہیں۔ مگر اعتبار نہیں کرتے۔ بلکہ اُس کی تردید و انکار کرتے ہیں۔ ابن حوقل بغدادی چلا رہا ہے۔ کہ سمرقند کے دروازے پر حمیری فتوحات کا آہنی کتبہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور پڑھا بھی ہے۔ مگر سوئے اتفاق سے میرے قیام کے زمانہ ہی میں اُس میں آگ لگ گئی۔ اور وہ جل گیا۔ آپ اُس کے اس بیان پر استہزا کرتے ہیں۔ اور اسکو معاندانہ طریقہ کر دروغگو کہتے ہیں۔ اور حمیری خطوط کی نسبت اپنے قیاس سے کہتے ہیں۔ کہ وہ ترکی کا قدیم ایغوری خط ہوگا۔ جو حمیری اور یمنی خطوط سے مشابہ تھا آپ کے اس قیاس و انداز کے پاس کون عقل والا جا سکتا ہے۔ جب ابن حوقل بغدادی۔ چوتھی صدی کے عربی الاصل مورخ اور جعفر ادیبؔ الوال مولوی سید سلیمان صاحب ندوی ہندی۔ علی القلم ۱۳۲۱ھ دونوں کو جانتا ہے۔ اور اس کا یا ہی تصفیہ کر سکتا ہے۔ کہ خط حمیری کی تمیز و

تبابعہ کے تمدنی۔ سیاسی اور مذہبی حالات: پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ تبابعہ سے پہلے سبا کے تمام طبقہ ستارہ پرست تھے۔ سب سے بڑا دیوتا ان کا شمس تھا۔ اور "المقہ" حمیری چاند کو المقہ کہتے تھے۔ (سمجھنے کیلئے ہندوستان کے سورج بنسی اور چندر بنسی قبائل کافی ہیں۔) بہر حال کواکب پرستی

بقیہ عبارت حاشیہ زیریں صفحہ گذشتہ: شناخت اور اس کی شکل و ساخت کا علم ابن حوقل رکھتا تھا۔ یا مولوی سلیمان صاحب۔ جو ایک ہزار برس کے بعد اس کے مشاہدے کو اپنے قیاس سے غلط ٹھہرانا چاہتے ہیں جن کی حد سیاحت ہمارے مغربی شمالی تک ہی تمام ہے۔ طرّہ تو یہ ہے۔ کہ اس نے تو اس کو دیکھ کر بھی حمیری اور ترکی میں تفریق و تمیز نہیں کی۔ مگر آپ نے مدت ہزار سال کے بعد شہر اعظم گڈھ میں بیٹھے بیٹھے پہچان لیا۔ کہ وہ ترکی کا قدیم ایغوری خط ہے۔ جو حمیر سے مشابہ ہے۔ اور پھر اس حالت میں کہ اصل تحریر بھی ہزار برس سے معدوم و مفقود ہو گئی۔ پھر کس چیز سے آپ نے تمیز فرمایا۔ کوئی اس کی نقل محفوظ ہو۔ اور آپ کی نظر سے گذری ہو۔ اسکو بتلایئے۔ ابن حوقل کے غلط پڑھنے اور حروف کے اصلی ایغوری ہونے کو کسی قدیم و جدید مولف نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہو۔ اسکا حوالہ دیجئے۔ آپ تو کسی اصول و ثبوت سے اپنے قیاس کو صحیح و ثابت تو کرتے ہی نہیں۔ پھر دُنیا مانے تو کیسے۔ بخلاف اسکے ان واقعات کے تاریخی ثبوت عربی ماخذوں میں بھرے پڑے ہیں۔ تاریخ مسعودی۔ ابوالفدا۔ ثعالبی اور ابن حوقل وغیرہم اتنے ماخذوں کا نام تو خود آپ ہی بتلاتے ہیں نشن سعوبلی کی کتاب تاریخ یمن۔ عقود اللؤلؤیہ اور بعد۔ ابن ہشام طبری وغیرہم کے نام میری طرف سے بڑھا لیجئے۔ تاریخی ثبوت تو یہی اور شہود خود آپ کی کتاب میں ابن حوقل اور مسعودی کے اقوال و مشاہدے موجود ہیں۔ تو پھر آپ ان روایات کو تاریخی توثیق اور تصدیق سے باہر نکالکر کیسے افسانہ اور داستان سمجھینگے۔ اور اصول تحقیق سے علیحدہ ہو کر صرف یورپین محققین کے اقوال و مختار پر اعتبار کریں گے۔ اور ایشیائی مورخین اور عربی مولفین کو دروغگو اور ساقط الاعتبار سمجھیں گے۔ اور یہ سمجھنا بھی اپنے اصول کے خلاف ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسی کتاب کے صفحہ ۲۳ جلد اول میں آپ نے علامہ نویری کی کتاب مسالک الابصار سے یمن کے اس قدیم کتبہ کو نقل کیا ہے جو معاویہ کے زمانہ (سنہ ۵۰ھ) عبدالرحمٰن (ابن خالد ابن ولید) گورنر مصر کے ہاتھ لگا تھا۔ اور اس نے اسکا عربی ترجمہ تیار کرایا تھا جو تمام عربی تاریخوں میں آج تک منقول ہوتا چلا آتا ہے۔ کچھ آپ ہی نے اس عربی ماخذ پر اعتبار نہیں کیا ہے۔ بلکہ آپ خود اس کی تصدیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ تاریخ مذکور (مسالک الابصار) اسوقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ فارسٹر صاحب نے نویری کی کتاب سے اور ہم نے فارسٹر کی کتاب سے اسکو نقل کیا ہے۔ ارض القرآن ج ا ص ۲۳۔ ان کے علاوہ۔ مورخ کلبی اور معجم البلدان یا قوتی کے اسناد سے بھی جو کتبات اسی صفحہ میں خود مندرج فرمائے گئے ہیں۔ اور ابن ہشام کے بیان کردہ اس کتبہ کی نقل و ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا ثابت ہوا ہے۔ اب آپ ہی کے تلوّن طبعی اور اختلاف رائے سے آپ کے مندرجہ بالا مضامین تنقید کی تردید کامل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پہلے آپ نے ان تمام عربی اور ایشیائی ماخذوں پر اعتبار کرکے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ اور تنہا آپ ہی نے نہیں۔ بلکہ بقول آپ کے فارسٹر صاحب نے بھی علامہ نویری پر اعتبار کرکے نقل کیا ہے۔ پھر اس اصول اور طریقہ تحقیق کی بنا پر۔ آپ کو

ان کا عام مذہب تھا۔ سنہ ۳۲۰ء میں یمن کے مقابل افریقی سواحل پر مصری رومیوں کے اثر سے عیسائیت نے پر و بال نکالے۔ شامی رومیوں کے ذریعہ سے یمن کے اطراف میں شہر نجران نے بپتسمہ (اصطباغ) قبول کیا۔ ان گرد و پیش سے تبابعہ یمن بھی محفوظ نہ رہے۔ (برٹنیکا مضمون ورد ابی سینا)

بقیہ عبارت حاشیہ زیریں صفحہ گذشتہ:۔ ابن حوقل۔ مسعودی۔ ثعالبی۔ ابن ہشام۔ یاقوت حموی۔ کلبی۔ ابو الفدا کو جو علم و فضل میں علامہ نویری سے عظیم اور قدیم تر ہیں۔ اور جن کی نقل تالیفات سے آپ کی ارض قرآن بھری پڑی ہے۔ افسانہ گو اور ناقابل الاعتبار بتلانے کا کون حق حاصل ہے۔ اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ اتنے مقامات کثیرہ پر ایک مؤلف کی تصدیق کی جائے پھر ایک دوسرے مقام پر صرف اس وجہ سے کہ اس کے کسی قول کو یورپ والوں نے نقل نہیں کیا۔ اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ یہ تلوّن اور مخالف مؤلف کی شان کے خلاف ہے۔ اور ہرگز قابل قبول نہیں۔

اگر حقیقت سے دیکھا جائے۔ تو آپ کے مضمون تنقیدی کی تردید ہمارے مندرجہ بالا عبارت تمہیدی نے کر دی۔ مگر وہ بالکل اجمال ہے۔ اب ہم تفصیل سے ہر واقعہ کی نسبت جو افسانہ ٹھہرایا گیا ہے۔ ذیل میں عرض کرتے ہیں۔

ذو القرنین صعب ابن الرائش یمنی تھا۔ نہ سکندر ابن فلیقوس مقدونی الرومی۔ لائق محقق نے اپنے مضمون تنقید میں پہلے حمیری فتوحات افریقہ و ترکستان کو ایک افسانہ بتلایا ہے۔ اور پھر ذو القرنین اسکندر رومی کو ٹھہرایا ہے۔ چونکہ ذو القرنین کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور جس کا تعلق اسلامی کتب احادیث و تفسیر سے پایا جاتا ہے۔ اس لیئے پہلے ہم اسی مسئلہ کو صاف اور یکسو کر دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ صاحب ارض القرآن مستہزانہ طریقہ سے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ذو القرنین کو صرف لفظ "ذو" نے مقدونیہ سے یمن پہونچا دیا۔ اس لئے کہ "ذو" یمن میں اکثر امرائے حمیر کے لقب میں آتا ہے۔ مثلاً ذو نواس۔ ذو شناتر۔ ذو ریدان" ص ۲۹۶ ج ا یہ بھی ہمارے فاضل معاصر کا قیاس ہے۔ اور اس قیاس کی وجہ بھی وہی یوروپین مستشرقین کی غلط فہمی ہے۔ جن کی تقلید آپ نے کرلی اور باوجود عربی دانی کے اس کے اصلی معنی اور حقیقی مقصد کی طرف نہیں تلاش کی۔ پہلے تو بتقلید یوروپین مورخین ذو القرنین کو سلاطین حمیری اس فہرست میں لکھا ہی نہیں۔ جو آپ نے ارض القرآن ص ۲۰۶ میں قلم بند کی ہے۔ اسی وجہ سے کہ آپ کے اور یوروپین مستشرقین کے نزدیک تو اسکندر رومی ذو القرنین ہے۔ پھر ایک شخص حمیری کو آپ کس طرح لکھ سکتے تھے۔ اس مجبوری نے آپ سے صعب ابن الرائش الملقب بہ ذو القرنین کا نام ہی محو کرا دیا۔ حالانکہ تمام عربی تاریخوں میں سلسلہ حمیریہ کی تفصیل میں اسکا نام موجود ہے۔ اول تو یہی امر آداب تالیف کے خلاف ہے۔ اور ایک واقعہ متواترہ کا صحیح استخفاف۔ بہر حال آپ کا بطریق معمول یہ خیال کر لینا کہ سلاطین حمیر کے لقب اکثر ذو کے ساتھ شروع ہوتے ہیں اس لیے عربی مورخین نے ذو القرنین یمنی کو قرآن مجید کا مشارٌ الیہ قرار دے لیا ہے۔ نہیں یہ غلط ہے۔ اور بالکل غلط۔ ذو القرنین کی وجہ تسمیہ کی نسبت اہل عرب کثیر التعداد زمانہ سے مختلف اقوال لکھتے آئے ہیں۔ جن میں سے یہ تین اقوال مناسب اور حقیقت کے مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل یہ اس نامور بادشاہ نے کسی معرکہ میں اوّل بار اپنے سر کے سیدھی طرف ضرب

ستارہ پرستی نے تو شکست کھائی۔ گو ستاروں کے ہیکل اب بھی ویران نہ تھے۔ تاہم اب شمس۔ المقہ اور عشتار کے پہلو بہ پہلو، رحمان کا نام بھی آنے لگا۔ جو قبل اسلام یہود و نصاریٰ ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔

مورخ کلبی کے زمانہ میں قبیلہ ذوالکلاع کے ایک شخص نے یمن میں ایک تخت پایا۔ جس پر ایک مردہ کی لاش

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ہر کھائی تھی۔ پھر حسن اتفاق سے کسی دوسرے میدان جنگ میں اُلٹی طرف بھی تلوار کا زخم کھایا۔ عربی میں قرن کے معنی ضرب کے ہیں۔ اس لیئے یہ بہادر اور شجاع بادشاہ کا لقب عرب یمن نے۔ اپنے قاعدہ زبان کے مطابق بصیغہ تثنیہ ذوالقرنین قرار دیا۔ جس سے اُس کے کمال شجاعت و بہادری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی کامل تصدیق ایک ماجد کی شہادت سے اس طرح ہو جاتی ہے۔ کہ جناب امیر المومنین علی مرتضےٰ علیہ السلام کا لقب بھی ذوالقرنین آیا ہے۔ اس لیئے کہ آپ نے بھی دو ضربیں کھائی تھیں۔ اول بروز خندق۔ دوم بروز شہادت۔ عین اُسی مقام پر جہاں خندق میں عبدود کی تلوار لگ چکی تھی۔ ملاحظہ مناقب احمد ابن حنبل۔ مسند ابن ابی شیبہ۔ صحیح ترمذی۔ مستدرک حاکم۔ حلیۃ الاولیاء ابونعیم اور تذکرۃ خواص الامہ سبط ابن جوزی۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام کی یہ مماثلت اسقدر عام ہے۔ کہ اہل حدیث و تفسیر کے علاوہ علمائے لغت نے بھی اسکو نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو قاموس اللغات فیروز آبادی میں لفظ ذوالقرنین۔ دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ اس نے دو قرنوں تک سلطنت کی اور دونوں طرف بھی مشرق و مغرب پر حکومت پائی۔ عربی میں قرن کے معنی مدت اور سمت دونوں آئے ہیں۔ اور یہ دونوں اوصاف اس نیک اور نامور بادشاہ میں موجود تھے۔ قرن کی مدت تیس برس بھی بتلائی جاتی ہے۔ اور سو برس بھی۔ بعض قول سے اس کی دو قرن یعنی ساٹھ برسوں تک حکومت پائی جاتی ہے۔ اور بعض قول سے دو سو برسوں تک حکمراں رہا۔ جو بھی صحیح ہو۔ چونکہ دو قرنوں تک عربوں کے نزدیک اس کی حکومت ثابت ہے۔ اس لیئے ذوالقرنین کے خاص القاب سے اسکو ملقب کیا۔ یہ قاعدہ اور یہ رواج تو سلاطین میں اسوقت تک قائم ہے۔ تمام بادشاہوں کی رسم جوبلی (Jublee) انکے ہر پنجاہ سالہ مدت حکومت پر بڑی عقیدت اور مسرت کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ دوسرے معنی اسکے سمت ہیں۔ چونکہ اس فتحمند بادشاہ نے بلاد مغربیہ میں یمن سے لیکر حدود شام تک اقطاع عالم کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور اسی طرح ممالک مشرقیہ میں ترکستان و تبت تک اپنی فتوحات کی وسعت بڑھائی۔ اس رعایت سے اس نامدار فرماں روا کو ذوالقرنین کے خاص خطاب سے مخاطب کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا۔ کہ یہ تینوں توجیہیں ممکن الوقوع اور قرین العقل ہیں۔ جو واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً۔ دونوں طرفوں والی توجیہ تو بالکل فی الواقع ہے۔ کیونکہ اس کی تخصیص کا اشارہ خصوصاً سمت مشرق کے متعلق تو قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ گویا تاریخ و قرآن اسپر دونوں متفق ہیں۔ اور اسی سے زیادہ ذوالقرنین بھی ثابت ہوتا ہے۔ نہ اسکندر رومی جیسا کہ بہت جلد مفصل بیان ہوتا ہے۔ بہر حال اتنی کافی اور متواتر شہادتوں کے مقابلہ میں آپ نے کیسے لکھدیا۔ کہ عربوں نے ذو کا لفظ اس بادشاہ کے لقب میں بڑھا کر۔ اس کو بھی ایک یمنی فرمانروا فرض کر لیا ہے۔ ورنہ وہ شخص ایک دوسرا غیر یمنی شخص تھا۔ اب تو معلوم ہو گیا۔ کہ آپ کی طرح عربی مورخین نے اسکا فرضی اور قیاسی نام نہیں رکھ لیا ہے۔ بلکہ اُن کی وجہ تسمیہ اصلیت اور واقعیت

پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک زرین سپر تھی جس پر سرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ اس سپر پر یہ عبارت لکھی تھی۔ (یہ عبارت حمیری عبارت کا ترجمہ ہے۔) بسم اللہ رب حمیر انا حسان بن عمرو النفیل اللہ کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔ میں عمرو نفیل کا بیٹا حسان ہوں۔ ابن ہشام نے جس کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی عبارت بھی ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے باسمک اللہم الٰہ حمیر۔ اس خدا کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: مرے جوہروں سے پُر ہے۔ اتنا لکھکر اب ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ذوالقرنین سے سکندر رومی مراد لینا۔ روایت۔ درایت۔ اور درمت۔ غرض ہر اعتبار سے غلط ہے علمائے تفسیر وحدیث کا یہ بیان۔ کہ ذوالقرنین ایک نامور۔ خدا شناس وعادل ورحم فرمانروا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں ممالک یمن۔ حضرموت۔ نجد سے لیکر مضافات شام تک حکمران تھا۔ اس کے فتوحات اسقدر بڑھے۔ کہ ترکستان اور تبت کے حدود تک مل گئے (طبری۔ ابو الفدا۔ حیات القلوب) تاریخوں کے مقابلہ سے بھی صحیح پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سلسلہ میں ملکہ سبا بلقیس کا عہد حضرت سلیمانؑ میں آنا تمام منقول ہے۔ اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے ۱۰۰۰ء دنیوی یا ۱۰۵۰ء قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔ صعب ابن الرائش اس ملکہ سے چوتھا پشت اوپر ہے۔ اس لیے نسلوں کے پیدا ہونے کے قاعدے سے الحارث الرائش اور صعب ذوالقرنین یا تو اٹھائیسویں صدی دنیا کے آخر میں یا انتیسویں صدی کی ابتدا میں ہونگے یعنی ۲۰۰۰ء قبل مسیح میں۔ ذوالقرنین کے وجود اور ایام حکومت کا یہ زمانہ تاریخ اور درمت انساب۔ دونوں طریقوں سے ایسا صحیح تسلیم ہوچکا ہے۔ کہ اب اس میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں۔ اب اس صورت میں کہ ذوالقرنین کا زمانہ ۲۰۰۰ء ق م میں ثابت ہوچکا۔ اور تاریخ نے اس کے فتوحات کی وسعت کے اعتبار پر اسی کو وہ شخص بخصوص مشارٌ الیہ قرآنی قرار دیا ہے اور قرآن ودیگر کتب سماویہ نے بھی اس کی فتوحاتی وسعت کی طرف اسی زمانہ میں اشارہ کیا۔ تو پھر آپ کا سکندر رومی کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جو نو سو ۹۰۰ برس کے بعد ۳۵۶ء ق م میں پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔ کہ یہ شخص بلقیس ملکہ سبا اور حضرت سلیمان بادشاہ یہود سے دو سو برس قبل تھا۔ کیونکہ اسفار یہود سے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے عہد سلیمانؑ ایک ہزار یا نو سو برس قبل ثابت ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ شخص حضرت ابراہیمؑ کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہا السلام کے قبل موجود تھا۔ بخلاف اسکے جب ہم سکندر رومی کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے گویا مذہب یہود کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ چنانچہ بیٹسن ہسٹاریکل اور جیوگرافیکل ڈکشنری سکندر رومی کے حالات میں لکھا ہے۔

فتح غزہ کے بعد اس نے فینیشیا اور دمشق کو فتح کیا۔ اور علاقہ طیر کے محاصرے میں اسکو کامل سات مہینے گذر گئے جسکا انتقام فتح طیر کے بعد اس نے وہاں کی منتقم رعایا سے نہایت خونخواری اور سفاکی کے ساتھ لیا یہاں سے وہ جزیرۂ دلم (بیت المقدس)

یہودیت اور نصرانیت ان اطراف میں دو ہی مذہب اور صاحب الہام مذہب تھے۔ اور باہم میدان میں برابر کے حریف بھی تھے۔ گذشتہ ابواب میں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ رومیوں اور حبشیوں کے ساتھ سبائے حمیر کو کسقدر سیاسی کشمکش تھی۔ اس بنا پر تبابعہ حمیر عیسائیت سے زیادہ یہودیت کو ترجیح دیتے تھے۔ عبد کلیل کے سوا

بقیہ عبارت حاشیہ بائیں صفحہ گذشتہ: میں آیا۔ اور ایک ضعیف سند کے مطابق اس نے یہاں کے افسر کاہن سے ملاقات کی جو اسوقت اپنی مذہبی پوشاک میں تھا۔ اس مقدس شکل و شمائل والے بزرگ کو دیکھکر وہ ایکبارگی جھک گیا۔ اور شرط آداب و تعظیم بجا لاکر اس نے اُس افسر کاہن سے کہا۔ کہ میں نے مقدونیہ میں آپ ہی کے ایسے بزرگ کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور انہوں نے مجھے میری فتوحات کی نسبت بشارت دی تھی۔ جسے میں بالتدریج حاصل کرتا جاتا ہوں۔ تب اس افسر کاہن نے سکندر رومی کو حضرت دانیالؑ کی وہ پیشین گوئی سنائی۔ جس میں بتلایا گیا تھا۔ کہ ایک یونانی فرمانروا فارس کی عظیم و قدیم سلطنت کو مفتوح و مغلوب کرے گا۔ اس کے جلدوں میں سکندر نے وہاں کے کاہنوں اور خادموں کو بڑے بڑے انعام دیئے۔ اور وہاں سے مصر میں آیا اور اس کو فتح کیا Beeton's Histor & Geographical Dictionary Vol Pa

اس عبارت سے جہاں سکندر کا مذہب یہود کی طرف رجحان معلوم ہوا۔ وہاں یہ امر بھی ثابت ہوگیا۔ کہ جس بادشاہ یمن کی طرف ذو القرنین کی نسبت مورخین عرب نے کی ہے۔ وہ سکندر رومی ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ سکندر تو حضرت دانیالؑ کے کچھ زمانہ بعد اور حضرت عیسےٰؑ کے تقریباً چار سو سال قبل کا آدمی ہے حضرت دانیالؑ بخت نصر کے ہمعصر تھے۔ اور بخت نصر حکومت فارس کے عین عروج کے زمانہ کا شخص ہے پھر کیسے وہ شخص ہو سکتا ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ سے کئی صدیاں پیشتر تھا۔ تو حضرت دانیالؑ کا کیا ذکر اور پھر اگر ذو القرنین یہی تھا۔ تو بیت المقدس میں آنا۔ اور کاہنوں کی تعظیم کرنا۔ اور اپنا خواب دہرانا کیا معنی۔ کیونکہ تاریخیں اور کتب انساب تو اس ذو القرنین کا وہ زمانہ بتلا رہی ہیں۔ جب نہ حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ نہ حضرت داؤدؑ۔ نہ حضرت سلیمانؑ۔ نہ بیت المقدس بنا تھا۔ نہ ہیکل سلیمانی قائم ہوئی تھی۔ اس لیے ہمارے فاضل محقق کا۔ ذو القرنین سکندر رومی کو بتلانا۔ یورپین محققین اور مغربی متعصبین سے زیادہ تر حیرت انگیز اور مضحکہ خیز ہے۔

ان حالات و اشکال کے علاوہ اب سیرت و تاریخ کی نظر سے اس مناسبت کی ناموزونیت ملاحظہ کی جائے۔ ذو القرنین قرآنی کی نسبت اُسکے وسیع فتوحات مغربی و شمالی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ سکندر رومی کے مغربی و مشرقی فتوحات کو کتابوں میں ذو القرنین حمیری کے فتوحات مغربی و شرقی سے ملاؤ۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ مشرق میں سکندر رومی کے فتوحات ہندوستان اور ہندوستان میں بھی دریائے گھاگرا سے آگے نہیں بڑھے۔ یہاں سے وہ ارض بابل کی طرف واپس آگیا۔ اور اسی اطراف میں ایک مہلک بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ سکندر رومی کے فتوحات مشرقی ان حدود سے بڑھے ہوئے کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اس کے برعکس ذو القرنین یمنی کے مشرقی فتوحات کی وسعت ترکستان و تبت تک اگرچہ صرف عربی مورخین ہی کیوں نہ ہوں۔ کتابوں میں متواتر پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ الہامی

پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک زرین سپر تھی جس پر سرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ اُس پر یہ عبارت لکھی تھی۔ (یہ عبارت حمیری عبارت کا ترجمہ ہے۔) بسم اللہ رب حمیر انا حسان بن عمرو القیل اللہ کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔ میں عمرو قیل کا بیٹا حسان ہوں۔ ابن ہشام نے جس کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ اُس کی عبارت بھی ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے باسمک اللھم الٰہ حمیر۔ اس خدا کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زرین صفحہ گذشتہ: ۔ رکے جوہروں سے پڑ ہے۔ اتنا لکھکر اب ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ذوالقرنین سے سکندر رومی مراد لینا۔ روایت۔ درایۃ۔ اور مدت۔ غرض ہر اعتبار سے غلط ہے علمائے تفسیر وحدیث کا یہ بیان۔ کہ ذوالقرنین ایک نامور۔ خداشناس وعادل ورحم فرمانروا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں ممالک یمن۔ حضر موت۔ نجد سے لیکر مضافات شام تک حکمران تھا۔ اس کے فتوحات اسقدر بڑھے۔ کہ ترکستان اور تبت کے حدود تک مل گئے (طبری۔ ابو الفدا۔ حیات القلوب) تاریخوں کے مقابلہ سے بھی صحیح پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس سلسلہ میں ملکۂ سبا بلقیس کا عہد حضرت سلیمانؑ میں آنا تمام منقول ہے۔ اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے [illegible]ء دنیوی یا [illegible]ء قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔ صعب ابن الرائش اس ملکہ سے چھ پشت اُوپر ہے۔ اس لیے نسلوں کے پیدا ہونے کے قاعدے سے الحارث الرائش اور صعب ذوالقرنین یا تو اٹھائیسویں صدی دُنیا کے آخر میں یا انتیسویں صدی کی ابتدا میں ہونگے یعنی [illegible]ء قبل مسیح میں۔ ذوالقرنین کے وجود اور ایام حکومت کا یہ زمانہ تاریخ اور مدت انساب۔ دونوں طریقوں سے ایسا صحیح تسلیم ہوچکا ہے۔ کہ اب اس میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں۔ اب اس صورت میں کہ ذوالقرنین کا زمانہ [illegible]ء ق م میں ثابت ہوچکا۔ اور تاریخ نے اس کے فتوحات کی وسعت کے اعتبار پر اسی کو وہ شخص مخصوص مشارٌ الیہ قرآنی قرار دیا ہے۔ اور قرآن ودیگر کتب سماویہ نے بھی اس کی فتوحاتی وسعت کی طرف اسی زمانہ میں اشارہ کیا۔ تو پھر آپ کا سکندر رومی کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جو نو سو برس کے بعد ۳۵۶ء ق م میں پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اُوپر بیان ہوچکا ہے۔ کہ یہ شخص بلقیس ملکہ سبا اور حضرت سلیمان بادشاہ یہود سے دو سو برس قبل تھا۔ کیونکہ اسفار یہود سے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے عہد سلیمانؑ ایک ہزار یا نوسو برس قبل ثابت ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ شخص حضرت ابراہیمؑ کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قبل موجود تھا۔ بخلاف اسکے جب ہم سکندر رومی کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس نے گویا مذہب یہود کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ چنانچہ بیٹسن ہسٹاریکل اور جیوگرافیکل ڈکشنری سکندر رومی کے حالات میں لکھا ہے۔

فتح فارس کے بعد اُس نے۔ فینشیا اور دمشق کو فتح کیا۔ اور علاقہ طیر کے محاصرے میں اُسکو کامل سات مہینے گذر گئے جسکا انتقام فتح طیر کے بعد اُس نے وہاں کی منتبح رعایا کے ساتھ نہایت خونخواری اور سفاکی کے ساتھ لیا۔ یہاں سے وہ جزیرہ دلم (بیت المقدس)

یہودیت اور نصرانیت ان اطراف میں دو ہی مذہب اور صاحب الہام مذہب تھے۔ اور باہم میدان میں برابر کے حریف بھی تھے۔ گذشتہ ابواب میں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ رومیوں اور حبشیوں کے ساتھ تو سبائے حمیر کو کسقدر سیاسی کشمکش تھی۔ اس بنا پر تبابعہ حمیر عیسائیت سے زیادہ یہودیت کو ترجیح دیتے تھے۔ عبد کلیل کے سوا

بقیہ عبارت حاشیہ بائیں صفحہ گذشتہ: میں آیا۔ اور ایک ضعیف سند کے مطابق اس نے یہاں کے افسر کاہن سے ملاقات کی جو اسوقت اپنی مذہبی پوشاک میں تھا۔ اس مقدس تخیل وشمائل والے بزرگ کو دیکھکر وہ ایکبارگی جھک گیا۔ اور شرط آداب و تعظیم بجا لاکر اس نے اس افسر کاہن سے کہا۔ کہ میں نے مقدونیہ میں آپ ہی کے ایسے بزرگ کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور انہوں نے مجھے میری فتوحات کی نسبت بشارت دی تھی۔ جسے میں بالتدریج حاصل کرتا جاتا ہوں۔ تب اس افسر کاہن نے سکندر رومی کو حضرت دانیال کی وہ پیشین گوئی سنائی۔ جس میں تبلایا گیا تھا۔ کہ ایک یونانی فرمانروا فارس کی عظیم وقدیم سلطنت کو مفتوح ومغلوب کرے گا۔ اس کے جلدوں میں سکندر نے وہاں کے کاہنوں اور خادموں کو بڑے بڑے انعام دیئے۔ اور وہاں سے مصر میں آیا۔ اور اس کو فتح کیا۔ Beeton's Histor & Geographical Dictionary Vol Pg.

اس عبارت سے جہاں سکندر کا مذہب یہود کی طرف رجحان معلوم ہوا۔ وہاں یہ امر بھی ثابت ہو گیا۔ کہ جس بادشاہ یمن کی طرف ذوالقرنین کی نسبت مورخین عرب نے کی ہے۔ وہ سکندر رومی ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ سکندر تو حضرت دانیال کے کچھ زمانہ بعد اور حضرت عیسےٰ کے تقریباً چارسو سال قبل کا آدمی ہے۔ حضرت دانیال بخت نصر کے ہمعصر تھے۔ اور بخت نصر حکومت فارس کے عین عروج کے زمانہ کا شخص ہے۔ پھر کیسے وہ شخص ہو سکتا ہے۔ جو حضرت موسیٰ سے کئی صدیاں پیشتر تھا۔ تو حضرت دانیالؑ کا کیا ذکر اور پھر اگر ذوالقرنین بھی تھا۔ تو بیت المقدس میں آنا۔ اور کاہنوں کی تنظیم کرنا۔ اور اپنا خواب دہرانا۔ کیا معنی۔ کیونکہ تاریخیں اور کتب انساب تو اس ذوالقرنین کا وہ زمانہ تبلا رہی ہیں۔ جب نہ حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ نہ حضرت داؤدؑ۔ نہ حضرت سلیمانؑ۔ نہ بیت المقدس بنا تھا۔ نہ ہیکل سلیمانی قائم ہوئی تھی۔ اس لیے ہمارے فاضل محقق کا۔ ذوالقرنین سکندر رومی کو تبلانا۔ یورپین محققین اور مغربی متعصبین سے زیادہ تر حیرت انگیز اور مضحکہ خیز ہے۔

ان حالات واشکال کے علاوہ اب سیرت وتاریخ کی نظر سے اس مناسبت کی ناموزونیت ملاحظہ کی جائے۔ ذوالقرنین قرآنی کی نسبت اسکے وسیع فتوحات مغربی وشمالی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ سکندر رومی کے مغربی ومشرقی فتوحات کو کتابوں میں ذوالقرنین حمیری کے فتوحات غربی وشرقی سے ملاؤ۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ مشرق میں سکندر رومی کے فتوحات ہندوستان اور ہندوستان میں بھی دریائے گھاگرا سے آگے نہیں بڑھے۔ یہاں سے وہ ارض بابل کی طرف واپس آگیا۔ اور اسی اطراف میں ایک مہلک بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ سکندر رومی کے فتوحات مشرقی ان حدود سے بڑھے ہوئے کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اس کے برعکس ذوالقرنین یمنی کے مشرقی فتوحات کی وسعت ترکستان وتبت تک۔ اگرچہ صرف عربی مورخین ہی کیوں نہ ہوں۔ کتابوں میں متواتر پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ الہامی

اور کسی کا عیسائی ہونا ثابت نہیں، عبد کلیل بروایت عربی بھی عیسائی تھا۔ (حمزہ اصفہانی ص ۱۳) اور ایک کتبہ سے بھی اسکا عیسائی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (Huarts Hist of Arab) بقیہ تمام تبابعہ کم تر ستارہ پرست اور اکثر یہودی تھے۔ تاریخ طبری میں ہے۔ کہ سب سے پہلے اسعد ابو کرب نے یہودیت قبول کی مذہب

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ یہی شرقی فتوحات کی وسعت کی طرف ذوالقرنین کی معرفت کراتے ہیں۔ تب اسی ایک خصوصیت کو باہم دونوں ذوالقرنین۔ یعنی ذوالقرنین یمنی۔ اور ذوالقرنین رومی میں مقابلہ کر لی جائے۔ اور یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ باعتبار فتوحات مشرقیہ کثرت فتوحات تاریخی ذرائع واسنادسے کس ذوالقرنین کی نسبت پائی جاتی ہیں۔ مرقومہ بالا شاہد سے تو ذوالقرنین یمنی مشرق میں صاحب فتوحات کثیرہ ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو تبلانا تو تحقیق اور تاریخ دونوں کو جھٹلانا ہے۔

یہ تو تاریخی دلائل تھے۔ جن کو ہم نے فاضل معاصر کے غلط قیاس کو تنقید و تردید میں پیش کئے۔ اب سیرت و اخلاق کے شاہد بھی بحث خاص کی تائید میں ملاحظہ ہوں۔ عربی ماخذ ہم کو ذوالقرنین یمنی کی سیرت و اخلاق کی نسبت تبلاتے ہیں۔ کہ وہ خدا شناس، خدا ترس، عادل، رحیم اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ شرقی قومیں جو خدا شناس تھیں۔ اور یاجوج و ماجوج دو ظالم لٹیری قوموں کے مسلسل ظلم و ستم سے عاجز آگئیں تھیں۔ وہ بالآخر بارگاہِ احدیت میں ان ظالموں کے ہاتھ سے رہائی پانے کیلئے دست بدعا ہوئیں۔ اُن کی دعائیں مقرون بارگاہِ اجابت ہوئیں۔ اور پروردگارِ عالم کی طرف سے ذوالقرنین یمنی کو اُن کی استمداد و استحفاظ کا حکم ہوا اُس نے من احسن الوجوہ ان خدمات کو انجام دیا۔ اور اُن ظالم قوموں اور اُن مظلوم لوگوں کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی تاکہ وہ ظلم وقت پھر اُن کی طرف دسترس نہ پا سکیں۔ وہ دیوار اب تک قائم ہے۔ اور گریٹ چائینز وال (Great ChineesWall) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ذوالقرنین کی حُسنِ سیرت اور ضرورت خدمت کا مختصر ذکر ہے۔ جو الفاظ قرآنی اور عبارت تفاسیر و معانی سے ماخوذ و مستنبط ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ مذکورۂ بالا حُسنِ خدمت و حُسنِ سیرت ذوالقرنین رومی میں بھی تھے۔ یا نہیں۔ تاریخیں تو قطعی انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ جب ہندوستان سے مشرق میں آگے نہیں بڑھا۔ تو پھر چین گیا اور دیوار بنایا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ حُسنِ خدمت اُسکے نہیں تھے۔ اِس کے خلاف عربی تاریخیں تبلا رہی ہیں۔ کہ اس دیوار کا بنانے والا ذوالقرنین یمنی ہے۔ اور قرآن بھی اس شرقی دیوار کے تعمیر کنندہ کا نام ذوالقرنین تبلاتا ہے۔ جو تاریخی شاہد کے اعتبار سے سکندر رومی نہیں ہو سکتا۔ تو پھر ذوالقرنین یمنی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے کیونکہ دُنیا کے جریدۂ تاریخ میں۔ سوائے ان دونوں کے کسی اور کی طرف ذوالقرنین کی خصوصیت نہیں تبلائی جاتی۔ اور نہ کسی تیسرے ذوالقرنین کا کہیں نام پایا جاتا ہے۔

حُسنِ خدمت نے تو سکندر رومی کو ذوالقرنین قرآنی ہونے سے یوں محروم رکھا۔ اب حُسنِ سیرت دیکھنا ہے کیا تصفیہ کرتی ہے۔

نے ہی نے عام رعایا میں بھی فروغ پایا۔ اور اسی طرح عیسائیت اور یہودیت نے یمن میں ٹکر کھائی۔
رومیوں نے بحری راستوں کو پیدا کر کے سبا کے بازار سرد کر دیئے تھے۔ اور تنہا اس سے تسکین نہ ہوئی۔ تو ۵۲۵
ق م میں یمن پر حملہ آور ہوئے۔ اکسومی حبشی جو پہلے درمیانِ مصر کے ہم خاک تھے۔ اور اب ہم مذہب بھی ہوگئے

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ ذوالقرنین یمنی کی سیرت و اخلاق کی نسبت ہم عربی مورخین کا قول لکھ آئے ہیں۔ جس کے خدا ترس۔ خدا شناس۔ عادل اور رعایا پرور حکمراں ہونے پر ان کا مجموعی اتفاق ہے۔ اس بنا پر اصول مساواۃ فی التقابل کی رو سے ذوالقرنین رومی کے سیرت و اخلاق اور اعمال و خواص بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ اور قدرت الٰہی اور اس کے نظام نیت کے لیے بھی ضرور تھا۔ کہ وہ امداد مظلومین کے لیے رحم دل اور خدا ترس حکمرانوں کو متعین کرے۔ نہ کہ ظالم ہی کو مظلوموں پر مسلط کر دے۔ جو ان کی امداد و دلجوئی کیا کریں گے ان کی جانوں پر اور ظلم ڈھائیں گے۔ اور انکو اپنی جفا و ستم کا نشانہ بنائیں گے۔ یہ فعل اور یہ عادت اس عادل حقیقی کی عدالت سے قطعی محال ہے۔ اتنا لکھکر ہم ذیل میں ایک یوروپین مستشرق اور عیسائی محقق کے قول سے ذیل میں سکندر رومی کی سیرت و اخلاق کی حالتوں پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ جس کے اقوال سے ہم اس کے فتوحات کی تفصیل اوپر لکھ آئے ہیں۔

سکندر رومی طبیعتاً نہایت سخت اور بڑے خصائل کا آدمی تھا۔ خونخواری اس کے مزاج میں انتہائی درجہ پر تھی۔ اس کی شراب خواری بھی حد درجہ پر پہونچی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بہت بڑے بہی خواہ اور کارگذار افسر سالار فوج پیر آمینو نامی کو قتل کرا دیا اور اس سے کچھ ہی قبل اسکے بیٹے فلاطوس نامی کو سخت اور ناقابل برداشت سزا پہونچا چکا تھا۔ سمرقند کے نزدیک ایک یونانیوں کی نوآبادی تھی۔ اور یہ لوگ کوئی سو برس سے بشغلہ تجارت وہاں آباد تھے۔ ان لوگوں نے بدقسمتی سے خراج شاہ فارس کو دیدیا تھا۔ یہ معلوم کر کے سکندر نے ایک ایک کر کے ان اپنے تمام ہموطنوں کو قتل کروا ڈالا۔ ایکبار عالم نشہ میں اپنے قلبی دوست سلاقس کے پہلو میں خنجر مار کر مار ڈالا
(Beetons Hist & Geog Dictionary Vol I P. 80 London)

اس عادات و خصائل کا آدمی کبھی خدا ترس۔ خدا شناس۔ عاد

اس عادات و خصائل کا آدمی کبھی خدا ترس۔ خدا شناس۔ عادل اور رعایا پرور کہا جا سکتا ہے۔ اور اس شخص کے ساتھ حسن و سیرت و اخلاق میں برابر کہا جا سکتا ہے۔ جسکو قدیم مورخین عرب نے اوصاف مذکورہ کیلئے خاص طور پر موصوف بتلایا ہو۔ کیا کوئی سوئی العقل والایمی کہہ سکے گا۔ کہ وہ راحم حقیقی اور رحمان۔ آفرینندۂ انس و جان۔ اپنے بندوں کی ایک مظلوم اور قابل الرحم قوم پر ان کی استمداد و استحفاظ کے لیے ایک ایسے خونخوار اور مردم آزار دائم الخمر تاجدار کو مامور فرمائیگا۔ جسکی سفاکی اور شقاوت کے اخبار و آثار آجتک دنیا کے کارناموں میں بھرے پڑے ہیں۔ ان تمام مذکورہ بالا شواہد۔ مقاصد اور قرائن کو ملاحظہ فرما کر کیا اب بھی ہمارے فاضل معاصر ذوالقرنین قرآنی سکندر رومی ہی کو تسلیم کرینگے؟ ان کے مزید اطمینان کے لیے۔ اب ہم تبرکاً ایک حدیث

تھے۔ رومیوں کے اشتعال سے بار بار چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ حمیری بھی موقع سے چوکتے نہ تھے۔ جب موقع ملتا رومی تاجروں کو دریا میں لوٹ لیتے تھے۔ شمالی عرب میں ایرآن و روم باہم دست و گریبان تھے۔ اور یہ طبعی تھا کہ حمیر کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ رومیوں کو اس سے وحشت ہوتی۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ۔ یہ بھی لکھے دیتے ہیں۔ جس سے ذوالقرنین قرآنی کا صعب ابن الرائش کا نہایت صفاحت کے ساتھ ظاہر ہے۔

وقد نقل ابن سعید المغربی ان ابن عباس سئل عن ذی القرنین الذی ذکرہ اللہ تعالیٰ فی کتابہ العزیز فقال هو من حمیر وهو الصعب المذکور فیکون ذو القرنین المذکور فی الکتاب العزیز هو الصعب بن الرائش المذکور لا اسکندر الرومی (ابو الفدا)

ابن سعید نقل کرتے ہیں۔ کہ ابن عباسؓ سے اُس ذوالقرنین کی نسبت دریافت کیا گیا۔ جسکا ذکر خدا نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ وہ سلسلہ حمیری میں سے وہ شخص تھا جسکا نام صعب مذکور ہے۔ پس ذوالقرنین مندرجہ کتاب عزیز (قرآن مجید) صعب ابن الرائش ہے۔ نہ اسکندر رومی۔ (ابو الفدا)

نزول قرآن کے زمانہ ہی میں اس مسئلہ کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ جیسا کہ محقق و محدث ابن سعید مغربی کے بیان سے ظاہر ہوا۔ بعد ازیں کد و کاوش اور تلاش کو شش محض بیکار ہے۔ ہم نے ہر طریق سے اس بحث کے ہر پہلو پر تحقیق و تفتیش کی کافی روشنی ڈالی مگر ہم کو کسی قرینہ سے ذوالقرنین قرآنی سکندر رومی کا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور یہ میرا تنہا مختار نہیں۔ بلکہ قریب قریب تمام اہل اسلام اسپر متفق ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب و حیرت تو اس پر ہے۔ کہ فاضل معاصر نے کتاب سیرۃ النبیؐ میں اپنے استاد شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی کا مختار بھی ملاحظہ نہ فرمالیا۔ جو ان الفاظ میں تحریر ہیں۔ ذوالقرنین جسے عوام سکندر کہتے ہیں اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرمانروا تھا۔ (ج ۱ص ۸۱) یہ ظاہر ہے۔ کہ شمس العلماء کی وفات کے بعد سیرۃ النبیؐ کے جامع آپ ہی ہیں۔ اور آپ ہی کے انتظام سے وہ اور اُسکے مابعد کی جلد چھپی ہے۔ تمام کتاب پر جا بجا حواشی اور مختلف نظریات بھی آپ ہی کے لکھے ہیں۔ باوجود ان قدرت و اختیار کے بھی ہمارے فاضل محقق نے کتاب میں اس غلط افسانہ کے متعلق کوئی حاشیہ چڑھانے یا نظریہ لکھنے کے لیے جراءت نہ کی۔ یا تو اُستاد مرحوم کا پاس ادب مانع ہوا۔ یا حقیقتاً یوروپین مستشرقین کی تقلید و تاسی کا شرف اُسوقت تک حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لیے قلم نہ اُٹھ سکا۔ اب چونکہ یوروپین اثریات کا پورا اثر ہوگیا اور اس شدت اور عقیدت کے ساتھ کہ ان اخبار کے مقابلہ میں مقامی۔ وطنی۔ قومی۔ اور مذہبی اخبار و آثار بالکل بے اعتبار سمجھے گئے تو اپنی ایک جداگانہ کتاب میں جس کے موضوع کو ان مباحث سے نہ کوئی واسطہ تھا۔ نہ سروکار۔ یوروپین اثریات کے قیاسی مندرجات نقل کرکے تمام اہل اسلام کو اصلی واقعہ کی یہی صورت بتلائی۔ مگر جب حقیقت سامنے آئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ این راہ کہ میروی بترکستان است۔

رومیوں نے اس نزاع کو بصلح و آشتی طے کرنا چاہا۔ چھٹی صدی کے اوائل میں رومی قیصر جسٹینین Jastinian (Sharp's Brit Vol II P.P 352, 353) نے یمن کے دربار میں سفیر بھیجا۔ تبع نے نہایت تزک و احتشام سے اپنی سطوت کا اظہار کیا۔ خود ایک گاڑی پر سوار تھا جس میں ہاتھی جُتے تھے۔ بدن پر ایک چادر تھی۔ جو سونے کی گھنڈیوں سے اٹی تھی۔ ایک ہاتھ

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ یاجوج ماجوج کی قدیم قومیں۔ اگرچہ اس مباحث میں مندرجہ بالا مضامین تنقید سے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر چونکہ اس قوم کا ذکر اس واقعہ کے متعلق داخل قرآن ہے۔ ایک تو اس کی تفصیل و تصدیق کی ضرورت ہے۔ دوسرے اس سبب سے کہ مستشرقین یورپ کی اس غلط فہمی میں کہ ذوالقرنین سکندر رومی ہے۔ یاجوج ماجوج کے مشابہ متجانس نام بھی شامل ہیں۔ ہم کو اس کی تحقیق و تفتیش کے لیے زیادہ وسعت اور وضاحت سے کام لینا ہوا۔

یاجوج و ماجوج سے ایشیائی قومیں بمقابلہ یوروپین قوموں کے زیادہ واقف ہیں۔ اور ان میں اس قوم کے متعلق انواع و اقسام کے قصے کہانیاں مشہور رہیں۔ زمانہ دراز تک یورپ ان کے وجود ہی کا قائل نہ تھا۔ اور کیونکر ہوتا۔ اتنے دور و دراز ممالک کے تمام قوموں سے کافی اطلاع رکھنے کا کوئی ذریعہ اور تعلق اُن کے لیے موجود و ممکن نہیں تھا۔ وہ ایشیائے دور و دراز کے ان افسانوں کو گھر بیٹھے سنا کرتے تھے۔ اور ایشیا کی سادہ لوحی اور کوتہ فہمی پر قہقہے لگاتے تھے۔ یوروپین قوموں کے برخلاف۔ ایشیا کے لوگ۔ یاجوج و ماجوج کی قوموں کے ہمسائے تھے۔ ہم ملک تھے اور ہم وطن اس لیے وہ ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے۔ مگر اب تو یوروپین محققین بھی ان کے وجود کے کم سے کم ضرور قائل ہو گئے۔ اگرچہ ان کے مسکن اصلی کی نسبت وہ ابھی تک مشکوک ہیں۔ مسٹر بنٹس لفظ گاگ میگاگ Gag & Magog کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔ کہ اس قوم کے حالات عہد عتیق کے دو متفرق صحائف الہام اور صحیفہ حزقیل میں پائے جاتے ہیں۔ اس قوم کا سلسلہ یافث ابن نوح سے ملتا ہے۔ یہاں تک تحقیق ہو چکا ہے۔ کہ یاجوج قوم کا نام ہے۔ اور ماجوج اُن کے بادشاہ کا۔ لندن میں دو بڑے بڑے قد اور بھترے قدیم خونخواروں کے مجسمے رکھے ہیں۔ جن کو یاجوج ماجوج کے بت بتلائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مناسبت بالکل بے ثبوت اور مضحکہ خیز ہے (Beeton's Hist Dic F.P. 792

مسٹر بنٹس کے مذکورہ بالا بیان سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ یاجوج و ماجوج کی قدیم قوموں کا وجود دُنیا میں ضرور تھا اور یہ خیال سراسر غلط ہے۔ جیسا کہ اکثر عیسائی متعصب مؤلفین نے اہانت اسلام کی غرض سے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ قرآن مجید نے یاجوج و ماجوج محض مفروضی نام دے رکھے ہیں۔ ورنہ اس نام کی کوئی قوم دُنیا کے کسی حصہ میں نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے یہ امر معلوم ہو گیا۔ کہ وہ ایک قدیم قوم ہی نہیں تھی۔ بلکہ اُن کا نسبی سلسلہ یافث ابن نوح سے ملتا ہے۔ عربوں کا بھی یہی قول ہے۔ توراۃ۔ تکوین۔ باب ۱۰ آیت ۲ میں بھی ماجوج کو یافث کا بیٹا لکھا ہے۔ تیسری بات یہ بھی ثابت ہو گئی۔ کہ قرآن مجید اور روایات عرب کے مطابق یہ قومیں بڑی ظالم اور خونخوار و مردم آزار تسلیم کی گئی ہیں۔ اور آج تک اُن کے مجسمے اور طول و طویل

میں ڈھال دوسرے میں دو نیزے تھے۔ بازوؤں میں بیش قیمت بازو بند تھے۔ اردگرد مسلح درباری تھے جو فخریہ رجز کے اشعار پڑھتے تھے۔ اس شان وشوکت کے منظر میں سفیر نے قیصر کا خط اور اُس کی طرف سے دیگر تحائف پیش کئے۔ خط کا مفہوم یہ تھا۔ کہ ان اطراف میں ایرانی فروغ نہ پانے پائیں۔ سفیر معمولی وعدہ و ایجاب کے بعد واپس ہوا۔ (Sharpe Vol II. P. 245)

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: رنگین تصویریں لندن کے عجائب خانہ میں ان کی سنگدلی اور شقاوت کو یاد دلاتی ہیں۔ اس بنا پر جیسا کہ قرآن مجید نے بتلایا۔ اور مفسرین و مورخین عرب نے اس ظالم قوم کی نسبت سمجھایا۔ وہ اگرچہ یورپ والوں کی سمجھ میں ایک مدت تک نہ آیا۔ مگر اب وہ رفتہ رفتہ ان کے واقعات کو کامل طور سے سمجھ گئے۔ اور اس پر یقین کرنے لگے۔

یاجوج و ماجوج کی مشابہت اقوام اور مماثلت نام کی وجہ سے ایک شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے ذوالقرنین یمنی اور ذوالقرنین رومی کی اصلیت کو بہت کچھ مشتبہ کر دیا ہے۔ اگرچہ ایک سچے تحقیق کرنے والے کے لیے یہ بھی کوئی دشوار نہیں ہے۔ مگر تلاش و محنت دشوار ہے۔ بہرحال ہم اس شبہ کی بڑی پوری تنقیح کئے دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ یاجوج و ماجوج کا ذکر توراۃ میں تین مختلف مقامات پر آیا ہے۔ ایک کتاب تکوین میں۔ جسکا حوالہ ہم ابھی اُوپر دے چکے ہیں۔ دوسرے کتاب یرمیاہ میں۔ تیسرے کتاب خرقیل میں۔ ذوالقرنین رومی کے موئیدین کو۔ توراۃ کی ان دونوں مابعد والی کتابوں کے حوالے نے اور شبہ میں ڈالدیا ہے۔ وہ ان دونوں کتابوں والی یاجوج کو بھی وہی تکوین والے یاجوج سمجھے ہیں۔ چنانچہ باوجود اتنی بڑی تحقیقات کے سر شبلی نعمانی جیسے فاضل نے بھی بلا فیصلہ و تمیز حوالہ کتاب تکوین کے ساتھ مابعد کی کتابوں والے حوالے بھی یکجا نقل کر دیئے ہیں۔ گویا اُنکے نزدیک تکوین والے یاجوج و ماجوج بھی وہی تھے۔ جو یرمیاہ اور خرقیل کی کتابوں والے۔ ایسے کامل شخص سے ایسی ناقص تحقیق کس قدر تعجب انگیز ہے۔ ماجوج ابن یافث کا زمانہ کجا اور یرمیاہ و خرقیل کا وقت کجا۔ دونوں زمانوں میں میرے نزدیک ڈھائی ہزار برسوں سے کم کا فاصلہ کبھی نہ ہوگا۔ بہرحال۔ انھیں دونوں صحف انبیاء میں اُن کے حالات دیکھکر۔ سکندر رومی کو ذوالقرنین کہنے والے لوگوں نے یہ رائے قایم کرلی ہے۔ کہ چونکہ یرمیاہ اور خرقیل کے زمانے سکندر رومی کے زمانے سے قریب تھے۔ اس لیئے سکندر نے اور قوموں کے ساتھ اس قوم کے لوگوں کا بھی استیصال کیا۔ یہ اُن کی صریح غلط فہمی ہے۔ کتاب یرمیاہ اور خرقیل میں جنکا ذکر ہے۔ وہ قوم جوج ہے۔ یاجوج نہیں۔ جوج۔ ترک ی۔ یاجوج سمجھ لینا۔ اُن کی عقلوں کی خوبی کے سوا اور کیا سمجھا جاوے صحیفہ خرقیل میں قوم جوج کے مفصل حالات مندرج ہیں (باب ۳۸ سے لیکر باب ۳۹ تک) ان حالات کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ قوم بخت نصر اور غارت بیت المقدس کے بعد شہرت پذیر ہوئی۔ اس کے قبل اسکا کہیں نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ ان کا مسکن و موطن بھی بنی اسرائیل کے زیر سایہ ملے ہوئے وادی اور کوہستانی مقامات ثابت ہوتے ہیں۔ قوم جوج کے ساتھ تین متفرق قبیلے اور ملے جلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید وہ ان کے خلیف ہم عہد اور ہم اصل ہوں۔ چنانچہ کتاب خرقیل میں۔ خرقیل کا خدا فرماتا

اَصحَابُ الاُخدُود

قیصر کا یہ پیغام صلح، تعصب کی آگ کو کچھ بھی سرد نہ کر سکا۔ اُس وقت ذو نواس فرمانروا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ اُس نے یہودیت کے پرجوش تعصب کا یہ سبق یثرب کے یہودیوں سے سیکھا تھا۔ جس نے اسلام کو بھی کچھ کم دُکھ نہیں دیا رومی سوداگر تاجرانہ یمن کے سواحل تک پہونچتے تھے۔ لیکن جہاں جہاں گذرتے تھے۔ اسباب سوداگری

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ہے کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے۔ اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے۔ اپنا منہ کر۔ اور اُن کے خلاف نبوت کر۔ اور یہ کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے۔ کہ دیکھ اے جوج۔ روش مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں۔ (حزقیل باب ۳۸۔ آیت ۱-۳) پھر باب ۳۹ آیت ۱۱ میں کہا جاتا ہے۔ کہ اس دن یہ ہوگا۔ کہ میں وہاں اسرائیل میں جوج کو ایک گورستان دونگا۔ یعنی رہگذروں کی وادی۔ جو سمندر کے پورب میں۔ اُس سے رہگذروں کی راہ بند ہو گی۔ اور وہ وہاں جوج اور اُس کی جماعت کو گاڑ دینگے۔ اور وُے ہامون[عـــہ] جوج کے وادی کہہ کر پکاریں گے۔ اور اُسکا یہی نام رکھیں گے۔

ان عبارات سے سویدان سکندر کا کوئی کام نہیں نکلا۔ بلکہ بخلاف اُسید یاجوج قدیم سے اور اُن سے نام۔ مقام۔ اور حالات وواقعات میں اختلاف کثیر ثابت ہو گیا۔ یاجوج قدیم کا نام بادخال۔ ی۔ الف ہے۔ ان کا تبرک۔ ی۔ الف۔ حرف جوج لکھا ہے۔ ان کے بادشاہ کا نام ماجوج بتلایا گیا ہے۔ ان کے رہنے کا مقام یاجوج پایا جاتا ہے۔ وہ ملک مشرق اور منتہائے ممالک شرقیہ کے باشندے تھے۔ یہ منتہائے مغرب وشمال کے رہنے والے ثابت ہوتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

وہ اُمم شرقیہ اولاد یافث ابن نوحؑ کے ہمسایہ اور ہم دیار تھے۔ اور بنی اسرائیل کے پڑوسی اور قبائل روش مسک وغیرہ کے معین وحلیف۔ جن کے مسکن وموطن بیت المقدس اور اُس کے گرد ونواح کے علاقہ تھے۔ اور ان سے ارض بابل اور ریگستان نینوا البتہ قریب اور ملے ہوئے تھے۔ وہ صحیفہ حزقیلؑ کے بیانات کے مطابق بہ نیت استیصال قوم بنی اسرائیل وغارت بیت المقدس فوج گراں لیکر چڑھ آئے تھے۔ اور اس ترک ادب خانہ خدا کے باعث مغضوب ومعتوب ہوئے۔ یہ قدیم قوم نہ کسی معبد الہی کو لوٹتی تھی۔ اور نہ فوج لیکر کسی حکمران وقت یا بنی عصر پر چڑھ آتی تھی۔ ہاں وہ کافر کیش قوم قزاق تھی اجاجر کر لیکر پہاڑوں پر سے دفعتاً اُتر آتی تھی۔ اور خدا کے اُن نیک بندوں کو جن کا امن اور صلح پسندی فطرتی شعار تھا۔

[عـــہ] ہامون عبرانی لفظ ہے۔ جس کے معنی دوزخ کے ہیں۔ عربی میں بھی اس کی یہی شکل دمعنی ہے۔ یہودیوں نے اہانت وحقارت کے سبب اُنکے گورستان کو دوزخ سے مناسبت دی ہے۔　اولاد حیدر

کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی ساتھ ساتھ بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائی راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دورہ کرتے تھے۔ پہلے اترنے عدن میں۔ اور دوسری کوشش نے نجران میں جہاں پہلے تجربہ رستی ہوتی تھی۔ عیسائیت نے برگ و بار پیدا کیے۔ یورپ کے جواب ہتھکنڈے ہیں۔ وہی پہلے بھی تھے۔ مذہبی اور سیاسی اغراض پر تجارت کا پردہ ہمیشہ ڈالا گیا ہے۔ یہی پردہ اسوقت بھی ڈال رہے تھے۔ ان

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ہوئی تھی۔ اُن کو ستاتی تھی۔ اور اُنکے تمام مال و متاع کو لیجاتی تھی۔

اب ان تمام مرقومہ بالا اختلافات و واقعات کو دیکھکر اور پڑھکر بھی۔ کیا ہمارے فاضل معاصر یا اس خیال و رائے کا کوئی اور مسلمان اب بھی ذوالقرنین قرآنی سے سکندر رومی کے مراد لیے جانے پر جرأت کر سکے گا۔ میری ناقص رائے میں تو اب کوئی ایسا عقل سے محروم اور فہم سے مجبور نہ ہوگا۔ کہ ایک ساعت کے لیے بھی ایسی غلط فہمی پر اعتبار و اصرار کرے میں مزید اطمینان کے لیے مسٹر جارج سیل (Gorge Sale) مترجم قرآن کی عبارت حاشیہ کو ترجمہ کر کے ذیل میں لکھ دیتا ہوں۔ جسکو اُنہوں نے اپنے ترجمہ میں روایات عرب پر پورا اعتبار کر کے اس قصہ کے متعلق لکھا ہے۔

ذوالقرنین یا دو سینگھوں والا۔ عام طور سے مفسرین نے اُس شخص سے سکندر اعظم مراد لیا ہے۔ جسکو وہ اپنی زبان و محاورہ میں الاسکندر الرومی کہتے ہیں۔ جو فارس و یونان کا بادشاہ تھا۔ اُس کی وجہ تسمیہ ذوالقرنین میں اختلاف کثیر ہے۔ بعضوں کا قول ہے۔ کہ یہ چونکہ شرق و غرب کا بادشاہ ہوا۔ اس لیے ذوالقرنین کہلایا۔ یا (جیسا کہ بعض کہتے ہیں) چونکہ اُس نے منتہائے مغرب اور منتہائے مشرق تک فوج کشی کی۔ اس لیے ذوالقرنین کہا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ اُس کے تاج شاہی میں دو سینگھوں کے نشان تھے۔ یا اس کے سر میں پیشانی کی دونوں جانب بالوں کی بناوٹ بالکل سینگھوں سے مشابہ تھی۔ اور ان میں سب سے زیادہ قابل قبول یہ باعث بتلایا جاتا ہے۔ کہ وہ صاحب جرأت و شجاعت تھا۔ زمانہ حال کے محققین کی یہ رائے ہے۔ کہ یہ ذوالقرنین اسوجہ سے کہلایا کہ اس کے سکوں میں اس کی شبیہ کے ساتھ دو سینگ بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ ویسے ہی ہیں جیسے جوپیٹر عمون کے سکوں میں ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی بتلاتے ہیں۔ کہ حضرت دانیال نے اس کو (سکندر) بکرے سے شابہت دی تھی۔ مگر اُن کی شابہت میں صرف ایک سینگھ والا بکرا پایا جاتا ہے۔ (دیکھو صحیفہ دانیال باب ۸ آیت ۵ اُس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچ ایک سینگھ تھا۔ ان مفسرین کے علاوہ اور بہتر طبقہ کے مفسرین و مؤلفین کی یہ رائے ہے۔ کہ جس بادشاہ کی طرف اِنکا آیہ قرآنی میں اشارہ ہے۔ وہ سکندر یونانی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرا عظیم فرمانروائے کشور کشا ہے۔ جس کا یہی نام اور لقب تھا۔ اور وہ فرمانروا اسکندر رومی سے کہیں زیادہ قدیم اور مشتر تھا۔ اور وہ جناب ابراہیم کا ہم عصر تھا۔ اور کیومرث اول حکمران فارس کا بھی معاصر تھا۔ اور بعضوں نے اُسکو یمن کا بادشاہ صعب بن الرائش نامی تسلیم کیا ہے۔ اسپر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ کہ وہ خدا شناس بادشاہ تھا۔ مگر وہ نبی تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ اُن میں مشکوک ہے

تدابیر سے نجران یمن میں عیسائیت کا مرکز قرار پا گیا تھا۔ یعنی رومیوں اور حبشیوں کی مذہبی و سیاسی اُمیدوں کا وہ ماویٰ بن گیا تھا۔ حمیری یہودی اسکو دیکھتے تھے۔ اور وفورِ جوش سے بھرتے تھے۔

اتفاق وقت اشتعال طبع کے لیے ایک عجیب حیلہ پیدا ہو گیا۔ جواب بھی نہایت کثیر الوقوع ہے۔ نجران میں ایک راہب عیسائی کا مکان تھا۔ ایک لڑکا اُس راہ سے اکثر گذرتا تھا۔ راہب اُسکو راستے میں ٹھہرا کر مذہبی

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ یاجوج وماجوج یافث ابن نوح کی اولاد سے ظالم قوم تھی۔ بعض محققین جرب کا مختار ہے۔ کہ یاجوج ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اور ماجوج کی اولاد سے شہر گیلان (جیلان) کے باشندے ہیں۔ جسکو قدیم مورخین روم نے بطلیموس اور اسٹرابو نے گیلی (Geli) یا گیلیٔ (Gelea) بتلاتا ہے۔ ان کے طرز معاشرت یہ تھے۔ کہ اس قوم کے پاس رہنے کے لیے نہ گھر تھے۔ اور نہ پہننے کے لیے کپڑے۔ اُن کے اطراف میں کسی مکان کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ زمین میں جانوروں کی طرح ماند کھودتے تھے۔ اور اُسی میں رہتے تھے۔ (سکندر رومی کے وقت میں ماند کھود کر رہنے والی انسانی قوموں کا کہیں نام و نشان بھی نہ رہا تھا) اور اُن میں بھی صرف آفتاب کی تمازت سے بچنے کی غرض سے چھُپ رہتے تھے۔ صاحب تفسیر بیضاوی کے خیال میں یہ لوگ ننگے رہنے والے تھے۔ جو ملک حبش کے مغربی اور جنوبی سمت میں واقع ہے۔ میری رائے (جارج سیل) میں تراگولوڈائیٹس (Fogolodytes) قسم و قوم کے لوگ تھے۔

ان کی آزار رسانی کی کہانی یہ ہے۔ کہ یہ وحشی قوم دفعتاً اپنی ہمسایہ قوموں پر چھاپہ مارا کرتی تھیں۔ اُن کے یہ حملے موسم بہار میں مخصوص ہوا کرتے تھے۔ اور اُن کی سب پیداوار۔ مال و متاع اُٹھا کر لے جایا کرتے تھے۔ بعضوں نے تو انہیں مردم خوار بھی یقین کیا ہے۔ (بیضاوی) جن دو پہاڑوں کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ اور جن کے درمیان دیوار بنائی گئی تھی۔ اور ذوالقرنین نے اس ترکیب سے یاجوج وماجوج کے حملات کی راہ روکی تھی۔ وہ ارمینیا اور آذربائیجان کے درمیانی علاقہ میں واقع ہیں بعض کہتے ہیں۔ کہ وہ مشرقی ترکستان بے منتہائے حدود پر واقع ہیں۔ اس امر کے تصفیہ کے لیے خلیفہ ولید ابن عبدالملک نے ایک عرب سیاح اور محقق کو اس دیوار مشرقی کے مشاہدہ کرنے اور اس کے مفصل حالات لکھنے کے لیے خاص کر مامور کیا تھا۔ وہ ترکستان میں جا کر اُس کے پورے حالات لکھ لایا۔ اس سیاح کے حالات سفر ڈی ہربولٹ D.Herbolt . کی کتاب۔ بائبل اوریئنٹ آرٹ Bible orient art Gogiouge میں مرقوم ہیں۔ ذوالقرنین نے بحکم خدا پیونچ کر کیا کیا۔ قرآن مجید نے اُس ظالم قوم کی جزا و سزا کا اختیار ذوالقرنین کو عنایت کر دیا تھا۔ خواہ وہ اُن کو اُن کی کفر شعاری کی سزا میں تباہ و برباد کر دیتا۔ یا اُن کو خدا کی راہ راست پر لانے کی کوشش اور ہدایت کرتا۔ یا جیسا بعضوں کی رائے ہے۔ کہ خدا نے ذوالقرنین کے ہاتھوں میں اُن کا انجام دے رکھا تھا۔ جا ہے وہ

تعلیم کا روز کوئی نہ کوئی سبق دیا کرتا تھا۔ جب عام لوگوں کو معلوم ہوا۔ تو طبعاً برافروختہ ہوئے۔ اور ایک عظیم الشان فتنہ کے مواد فراہم ہو گئے۔

ذونواس سنکر آگ بگولا ہو گیا۔ نجران پہونچا۔ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جب شہر فتح ہوا تو گڈھوں میں آگ دھکائی۔ اور ایک ایک کرکے عیسائیوں کو گڑھے جلوایا جس نے یہودیت کے قبول سے انکار کیا۔ اُسکو نذر آتش کیا۔ قرآن میں اصحاب الاخدود کے نام سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ یہ۔ یا انھیں تلواروں سے پارہ پارہ کر دے۔ یا اُن کو قید کرکے لونڈی غلام بنائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ قرآن کے الفاظ الہامی۔ پہلے معنیوں کے موید ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی باعث سے ذوالقرنین نے ایک معتدلانہ طریقہ اختیار کیا۔ ان لوگوں کو اس نے خدا کی شریعت کی طرف بلایا۔ جو آئے۔ وہ بچے رہے۔ جنہوں نے نافرمانی کی سزا پائی۔ اور قتل ہوئے۔

سدِ ذوالقرنین کی نسبت مسٹر سل لکھتے ہیں۔ مفسرین کا بیان ہے۔ کہ یہ سد اس طرح بنائی گئی۔ کہ اس کی بنیادیں اس قدر گہری کھودی گئیں۔ کہ پانی نکل آیا۔ تب اُنہوں نے پتھر پیتل گلا گلا کر ان بنیادوں میں جوڑے۔ بنیادوں پر لوہے کے بڑے بڑے دامے مجوّے کھڑے کیے۔ اور اُس کے درمیان پتھر کوئلے کی بڑی بڑی چٹانوں اور لکڑی کے بڑے بڑے کندوں اور بوٹوں کی جڑائی کر دی۔ پھر اُس پر بہت زیادہ مقدار میں لوہے اور پیتل کا انبار لگا کر۔ نیچے سے اُس میں آگ لگا دی۔ آگ کے شعلوں کی گرمی سے وہ تمام لوہا اور پیتل پگھل کر اُوپر سے نیچے تک دیوار کی اونچائی میں۔ جو دونوں پہاڑوں کی اونچائی کے برابر تھی پھیل گیا۔ اور لکڑی کے بوٹوں اور پتھر کوئلوں کی جگہ سما سما کر جم گیا۔ اسی طرح تمام دیوار میں لوہا اور پیتل پھیل کر اور جم کر دیوار کی دیوار لوہے اور پیتل کا پہاڑ بن گئی۔ بعضوں کا قول ہے۔ کہ نہیں۔ پہلے پتھر کی پوری جڑائی کر دی گئی۔ پھر اوپر سے لوہا اور پیتل پگھلا کر تمام دیوار میں پلا دیا گیا۔ (بیضاوی ترجمہ قرآن۔ مسٹر سیل۔ طبع اول۔ سورۂ کہف۔ جلد دوم ص ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۱)

عبارت مذکورۂ بالا جو صرف روایات عرب سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ وہ ایک یوروپین محقق کے دست و قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ اس یوروپین محقق نے کچھ تو بر داشتہ اس کی نقل ہی نہیں کر دی ہے۔ بلکہ اس کے اکثر مقامات کو تحقیق حال کے معیار پر جانچا ہے۔ اور مطابقت کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ذوالقرنین کی سکندر رومی کے ساتھ خصوصیت اور اُسکے متعلق حضرت دانیال والی بکرے کی بشارت اور ایک سینگھ اور دو سینگھ والی مضحکہ خیز مماثلت و مشابہت کی پورے طور سے تنقید و تردید کر دی ہے۔ اس یوروپین مترجم کی مذکورۂ بالا عبارت سے ذوالقرنین کی تخصیص و تشخیص اسکندر رومی کے ساتھ بالکل غلط و ذلیل ثابت ہو گئی ہے۔ جس کو ہمارے فاضل معاصر نے بلا تحقیق و تفتیش حقیقت اپنا مختار قرار

قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (بروج)	مارے جائیں گڑھوں والے۔ گڑھے جن میں بھڑکتی آگ تھے۔ جب وہ اُن پر بیٹھے تھے۔ اور (دیکھتے) مومنوں کے ساتھ جو ظلم کر رہے تھے۔ اُسپر خود گواہ تھے۔ ان مومنوں میں بجز اسکے کچھ اور قصور نہ تھا کہ وہ خدائے محبوب و محمود پر ایمان لائے تھے (سورۂ بروج)

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ۔ کر دے لیا ہے۔ اور ایسے مسلم الثبوت واقعہ کو محض افسانہ خیال کر لیا ہے۔ ہمارے مندرجہ بالا مضامین تنقیدسے پوری تفصیل سے ثابت کر دیا ہے۔ کہ اس واقعہ کو جس طرح قرآن مجید اُس کے ذی علم مفسرین اور عرب کے قابل محققین و مورخین نے بتلایا ہے۔ وہ بالکل حقیقت اور واقعیت پر مشتمل ہے۔ اور اُمم سابقہ اور ملوک ماضیہ کے احسن القصص میں داخل ہے۔ نہ قیاسی داستان ہے۔ نہ خیالی افسانہ زمانہ جدید کے متعصب مستشرقین یورپ۔ قدیم رومی اور یونانی مؤلفین کی ناقص مشتبہ اور غیر مانوس تحقیق کے شیدائی اور مقلد اوّل تو اس کو لکھتے نہیں۔ اور قرآن پر مفروضی اور غیر واقع قصص و حکایات بیان کرنے کا جھوٹا الزام قائم کرتے ہیں۔ اور اگر لکھتے بھی ہیں۔ تو خود غرضی اور تعصب مذہبی سے عرب کی خصوصیت اور قدامت کو یونان و روم کی مفاخرت کا تمغا بناتے ہیں۔ اور اپنی اس خودغرضانہ عالم فریبیوں کی تحقیق جدید کو ملمع کا تاج پہناکر۔ روایات قدیمہ و صحیحہ عرب کو مٹاتے ہیں۔ اُن کے ہم خیال ہم وطن۔ اور ہم مذہب چاہے اُن کو ان مفسدانہ اور مغویانہ مختار کی جتنی تائید نہ کریں۔ وہ اُن کے مندرجات انسانی کو الہامات ربّانی نہ سمجھیں۔ ہم کو اس سے نہ بحث ہے۔ نہ اعتراض ہے۔ افسوس ہے۔ تو اُن اہل اسلام پر جو باوجود دعوئے بصیرت اور رابطہ عقیدت کے نہایت آسانی سے مخالفین اسلام کے ان ظاہری اور نمائشی گمراہ کن تحقیقات پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس عالم وارفتگی میں اپنے محدثین و مفسرین اور مورخین پر بیساختہ کذب بیانی کا الزام و جرم لگاتے ہیں۔ ہمارے فاضل معاصر نے تو اس بحث میں مستشرقین کی غلط آرائی کی تقلید و تائید میں اپنی فریفتگی یہاں تک دکھلائی ہے۔ کہ سلسلہ حمیریہ سے صعب ابن الرائش الملقب بہ ذوالقرنین کا نام ہی نکالدیا۔ (ملاحظہ ہو فہرست سلاطین سلسلۂ حمیریہ مندرجہ ارض القرآن جلد اوّل ص ۲۸۶) حالانکہ عربی کی کوئی تاریخ ایسی نہیں ہے جس میں سلسلۂ حمیریہ کی فہرست ملوک دی ہو۔ اور اُس میں ذوالقرنین کا نام نہو۔ یہ کیوں؟ صرف مستشرقین یورپ کی تقلید۔ اس لیے کہ اُنہوں نے اپنی تالیفات میں نہیں لکھا پھر یہ کیسے لکھیں۔ مگر ہمارے فاضل محقق کو سکوت سے پہلے اُس کی علت دریافت کر لینی تھی۔ کہ یوروپین تالیفات میں عام طور سے اس واقعہ کے سقوط کا کیا باعث ہے۔ اور وہ بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ اُن کے متقدمین مؤلفین روم و یونان نے۔ جن کے وہ ذلہ ربا اور خوشہ چین ہیں۔ اس واقعہ کو نہیں لکھا ہے۔ پھر وہ کیونکر لکھیں۔ مگر اُن کے برعکس آپ کے ہاں تو بتواتر و توارد اس قضیہ کی تفصیل و تشریح موجود ہے۔ پھر آپ اسے کیونکر مفوح القلم کر سکتے ہیں۔ لیکن آپنے

قرآن میں یہ مذکور نہیں۔ کہ اُس نے کل لوگوں کو جلا دیا۔ اور شہر کو بے نشان کر دیا۔ لیکن کتب و اخبار و تفسیر کی عام روایات میں مذکور ہے۔ کہ تمام آبادی خاکستر ہو گئی۔ لیکن یہ صحیح نہیں [۱] آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجران میں عیسائی آبادی موجود تھی۔ وہاں دُعاۃ اسلام بھیجے گئے ہیں۔ نجران سے دو راہب آنحضرت صلعم سے مناظرہ

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ : مستشرقین یورپ کی مقلدانہ اور مویدانہ فریفتگی کے خاص عالم میں محو ہو کر اپنے مفسرین محدثین اور مورخین کے تمام مکاشفات کو اسقط کر دیا۔ اور فہرست سلاطین حمیریہ کو جو عربی تاریخوں میں مرقوم ہے۔ ساقط الاعتبار اور بیکار سمجھ لیا۔ اور اُس کی جگہ مستشرقین یورپ کی وہ تیار کردہ فہرست جو انہوں نے ادبیات اثریہ کے اصول پر تیار و مرتب کی ہے۔ اپنی کتاب میں۔ جسکا نام مخصوص طور پر ارض القرآن رکھا گیا ہے۔ داخل کر دیا حالانکہ ہر دیکھنے والا دیکھتے ہی فوراً حیرت میں پڑ جائے گا۔ کہ ارض القرآن کو دار الحرب یورپ اور بلاد غیر اسلامیہ کے اثریات سے اثر پذیر اور دامن گیر ہونا کیا معنی۔ ہمارے فاضل معاصر کا فہرست سے۔ اصعب بن الرائش۔ ذوالقرنین یمنی کے نام کا اسقاط تمام اہل اسلام کی آنکھوں میں ایک شرمناک فروگذاشت بن کر کھٹکتا ہے۔ اور ایک مولف و محقق کی شان پر علی الاعلان استخفاف واقفیت کا الزام لاتا ہے۔ زمانہ حال کے محققین مشاہدات کے عموماً طالب ہوتے ہیں۔ اور ہر امر کی تحقیق میں تمثیلات ظاہریہ کی متلاشی۔ اس واقعہ کے متعلق دیوار بنانے کے حالات دیکھکر انہوں نے اسکندر رومی کے سد اسکندریہ کی موجودہ تمثیل و مشاہدہ سے۔ گویا دونوں دلیلوں کو مدنظر رکھ کر۔ اُس کے ذوالقرنین ہونے کے شبہ کو اور قوی کر لیا ہے۔ حالانکہ سلسلہ ملوک سبا میں جس میں بنی حمیر ایک برومند اور نہایت شاداب شاخ ثابت ہوتی ہے۔ اور جسکا سر سید اصعب ابن

[۱] ہمارے فاضل معاصر کا سارا غصہ مورخین عرب پر ہے۔ اور مفسرین قرآن پر۔ جھوٹے ہیں تو وہ۔ ناقابل اعتبار ہیں تو وہ۔ چنانچہ اصحاب الاخدود کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ اُن کی ساری بستی بھی جلا دی گئی تھی۔ فاضل معاصر کو عتاب آ گیا۔ جس طیش انگیز عبارت سے خطاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ صحیح نہیں۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجران کی آبادی موجود تھی۔ دُعاۃ اسلام وہاں بھیجے گئے ہیں۔ نجران سے دو راہب آنحضرت صلعم سے مناظرہ کرنے آئے تھے ...... پھر دو ایک فقروں کے بعد خدا جانے دل میں کیا خیال آ گیا۔ تو لکھتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ حبشیوں کی ہفتاد سالہ سلطنت میں پھر دوبارہ آباد ہوا ہو۔ انصاف سے کہئے۔ یہ کوئی طرز تحریر ہے۔ اور یہاں تحقیق ہے۔ جرح بھی آپ ہی فرماتے ہیں۔ اور تعدیل بھی آپ ہی۔ اعتراض بھی ہوتا ہے۔ اور پھر تاویل بھی کیجاتی ہے۔ آپ تالیف و تصنیف خصوصاً تحقیق و تنقیح کا کام کرنے اُٹھے ہیں۔ تو پہلے تجمیع حواس۔ تسلیہ قلب اور تسکین دماغ تو فرما لیں۔ یہاں تو بات بات میں۔ تلون۔ ذہول۔ دور اور تعددفی الکلام آ جاتا ہے۔ آپ کے اس طریقہ تنقید سے اسلامی مورخین اور مفسرین کی تکذیب تو نہ ہو سکے گی۔ بلکہ آپ ہی کی تضحیک لازم آئے گی

المؤلف اولاد حیدر

کے لیے آئے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں یہاں کے نصاریٰ سے دوگونہ صدقات وصول ہوئے ہیں۔ یا ممکن ہے۔ کہ حبشی عیسائیوں کی ہفتاد سالہ عہد میں پھر دوبارہ آباد ہوا ہو۔

اس واقعہ کو عیسائیوں نے بھی یاد رکھا ہے۔ اسی عہد میں شام کے عیسائی اِس قصّہ کو قید تحریر میں لائے ہیں۔ اِنکے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ جس میں یقیناً بعض تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔ "جاڑے کے سبب سے اہل حبش اپنا نائب یمن میں نہ بھیج سکے۔ ذونواس نے حکومت غصب کر لی۔ اور عیسائیوں کو مذہب کی خاطر بہت دُکھ دیا۔ علاوہ ازیں نجران پر فوج کشی اور خلاف وعدہ شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد باایمان عیسائیوں کو آگ اور تلوار سے برباد کر دیا۔ (Encyclopedea of Islam)

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ہمارا نظریہ ذوالقرنین یمنی ثابت ہوتا ہے۔ ایسی دیواروں کے بنانے کا قدیم الایام سے دستور اور قاعدہ جاری تھا۔ غالباً اس صنعت تعمیر کے یہی موجد بھی ثابت ہوتے ہیں۔ سدعرم اور مآرب کے حالات خود فاضل معاصر نے نہایت تفصیل سے اسی کتاب میں ادبیات اور اثریات دونوں طریقوں کے ثبوت وشہود سے نقل فرمائے ہیں۔ اس بناء پر پہلے ذوالقرنین یمنی پر تعمیر سد کی دلیل قائم ہوئے گی۔ تب ذوالقرنین رومی پر اس کا اطلاق کیا جائے گا۔ کیونکہ ذوالقرنین یمنی روایتاً۔ اور درایتاً دونوں طریقوں سے جیسا ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ ذوالقرنین رومی سے قدیم تر ثابت ہوتا ہے۔

مشاہدہ تمثیلی کی بحث تو تمام ہو چکی۔ اب مشاہدہ واقعات کی طرف غور کیا جائے۔ تو سد اسکندریہ کے قریب موجودہ زمانہ میں کسی قوم و قبائل کے باشندوں میں اُن قدیم الایام کے طریقہ عبادت۔ تمدن و معاشرت کے کوئی اخبار و آثار۔ جن کے حالات و علامات ہمارے عربی مفسرین اور مورخین نے بتلائے ہیں۔ نہیں پائے جاتے۔ ان کے برخلاف اِس سد شرقیہ کے اس پار رہنے والی قوموں میں۔ جن کو موجودہ زمانہ کی زبان و محاورہ میں لاتمہ کہتے ہیں۔ قدامت کے تمام آثار و نشانات آجتک موجود ہیں۔ اُن کے لباس۔ وضع و قماش۔ تمدن و معاشرت۔ مذہب۔ طریقہ عبادت۔ غرض تمام انداز اور طریقے سے قدامت۔ سابقیت۔ اور اصلیت ٹپکتی ہے۔ وہ ابھی تک نہایت صلح پسند۔ آزاد روش۔ اور بے آزار و غیر سروکار قوم تسلیم کی جاتی ہے۔ اور اُسکے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اُسی قدیم شریعت اور طریقہ عبادت پر۔ خواہ وہ کیسا ہی بے اصل اور باطل طریقہ نہ ثابت ہوتا ہو۔ آجتک اُسی استحکام و استقلال سے قایم و برقرار پائے جاتے ہیں۔ تو ان مشاہدات حاضرہ اور تمثیلات موجودہ کے مقابلہ میں بھی روایات عرب کے جھُوٹے افسانے کہے جانے پر اصرار کیا جائے گا۔ اور کیا اب بھی ان قوموں کو ظالم قوموں کے پنجے سے چھُڑانیوالا اور اُن کے گرد و نواح میں اس قدیم دیوار کا بنانے والا اسکندر رومی کو بتلایا جاوے گا۔ جو شرقی ممالک میں اور اُن کے علاقوں میں کہاں تک۔ ہندوستان میں دریائے گھاگرا سے اپنے قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ فافہم فتدبر۔

سبائے حبش

یا

اصحاب الفیل

ذو نواس جس کی طرف قرآن کے الہامی الفاظ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اور جس کا مفصل احوال اور بیان ہوچکا ہے۔ ایک متعصب یہودی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ ارتارزکسیز اوکس نے Artoxorocius ہم چند یہودیوں کو قید کرکے شہر ہر قانیہ (مازندران) میں بھیجدیا تھا۔ چونکہ ذونواس یہودی تھا۔ اس لیئے اسکے

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ ذوالقرنین کی داستان اور افسانہ کی حقیقت بیان اور واقعیت کی اصلی شان ثابت کرکے اب ہم فاضل معاصر کے دوسرے افسانوں کی حقیقت کا پورا انکشاف کرتے ہیں۔

فتح افریقہ۔ ہمارے لائق محقق کے طرز تحریر میں یہ ادا نہایت ہی قابل تعریف ثابت ہوتی ہے۔ کہ جس پرجوشی اور سرگرمی سے اعتراض وتردید کی شمشیر قلم علم کی جاتی ہے۔ اسی تمکنت اور شان سے ایک دوسری فوری خیال ہوجانے پر سپر اندازی بھی کردی جاتی ہے۔ یہ طریقہ تحریر جہاں تک خوشنما اور لائق تعریف نہ سمجھا جائے۔ وہ دوسری بات ہے۔ مگر اس سے آپ کے تلون اور ضعف ثمار کے بھی کامل ثبوت وآثار ظاہر وآشکار ہوتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ اعتراض کرنے کو اعتراض تو کردیتے ہیں۔ مگر نفس اعتراض کا ضعف اور اصل واقعہ کی حقیقت آپ کے دل میں ضرور چھپی رہتی ہے۔ اور اسی طرز خاص سے آپ کے یہ پتا بھی پورا مل جاتا ہے کہ حقیقت میں عربی روایات پر آپ کے یہ اعتراض خاص آپ کے پیدا اور وارد کیئے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ اصلاً مخالفین اسلام کے بتلائے۔ اور اُن کی کتابوں سے نقل فرمائے ہوئے ہیں۔ اور حقیقت میں وہ صداقت وصحت سے اسقدر خالی ہیں۔ کہ بالآخر آپ کو سپر انداز ہونا پڑتا ہے۔ تمثیل کے لیئے ملاحظہ ہو۔ کس شدومد سے لکھا جاتا ہے۔ ایک تبّع بر اعظم افریقہ کا فاتح ہے۔ پھر اُسی ص ۲۹۷ میں کل پانچ سطروں کے بعد تحریر فرمایا جاتا ہے۔ افریقہ کا بیان ایک حد تک صحیح ہے۔ اب اپنی دونوں تحریر کردہ عبارتوں کو ملایا جاوے۔ اور بتلایا جاوے۔ کہ جب ایک حد تک اس کی صحت کا علم آپ کو موجود تھا۔ تو ناحق اعتراض کرنے کی ضرورت اسی سے معلوم ہوگیا۔ کہ وہ نقل کی مجبوری تھی۔ اور یہ عقل کا حکم۔ جب آپ نے اسکی صحت کو خود تسلیم کرلیا۔ تو اب ہم کو اس کی تفصیل وتنقیح کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

فتح چین وترکستان کے متعلق آپ کا مذاق یا ابن خلدون کی ہنسی بھی توبے سبب ہے۔ کیوں ہمارے فاضل محقق صاحب۔ ابن خلدون ایک عربی مورخ ہے۔ اُسکے قول پر اعتبار کرنا تو آپ کے موجودہ معیار تحقیق اور شعار تالیف کے بالکل منافی اور مخالف ہے۔ مگر بات یہ

حملات سے ذونواس کی سلطنت کو بھی سخت صدمہ پہونچا۔ ایک تو ذونواس کی ظالمانہ حرکت۔ دوسرے اُسکے زوال قوت عیسائی حبشی ملوک مصر کو اُس پر غلبہ پاجانے کا پورا موقع دیدیا۔ حبشی چڑھ آئے۔ اور اُس کو ملک سے نکالدیا۔ یہ واقعہ ۳۵۲؁ ق م میں واقع ہوا۔ اس زمانہ سے جناب ختمی مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت تک نو سو برس ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں افریقہ کی قوموں کی جو ارباط حبشہ کہلاتے تھے۔ اور نیز بعض عرب المستعربہ کی اور ایرانیوں کی سلطنت رہی۔ ابوالفدا ابی سعید مغربی کی کتاب تاریخ یمن سے ان سلاطین کے متعلق لکھتا ہے۔

بقیہ حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: ۔ نہ آپ کے تون کی ادا و تکلّا نہ کوئی شمار ہے۔ نہ کوئی حد جسوقت جسپر نگاہ لطف ہوگئی ہے وہی دلپسند ہوگیا۔ اور وہی دلنشین۔ بہرحال فتح ترکستان وچین پر آپ کے ابن خلدون صاحب ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور آپ بھی اُنکے ساتھ قہقہے لگاتے ہیں۔ بہتر۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے۔ مگر فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا پر بھی نظر رہے۔ ہاں ابن خلدون سے زیادہ قدیم اور وسیع النظر عربی مورخ مسعودی صاحب اور ان سے بیشتر ابن حوقل صاحب بغدادی کیا فرما گئے ہیں۔ اور ان فتوحات کے متعلق اپنے چشم دید واقعات ومشاہدات سے کیا بتلا گئے ہیں۔ کیا وہ ایک ابن خلدون کے جو متاخرین مورخین میں ہے۔ قول احادسے ناقابل اعتماد ہوجائیں گے؟ اور چونکہ وہ آپ کی غلط فہمیوں کے موئد ہیں۔ اس لیئے آپ تنہا انکے قول پر استدلال فرمائیں گے۔ یہ آپ کا استدلال کہ انچہ من بگویم ہماں محاورہ است۔ اُصولاً استدلال نہیں کہلائے گا۔ اور کوئی عقل والا اسکو ایک ساعت کے لیئے بھی قبول نہ کریگا۔ اب اس امر میں اپنی غلط فہمی کی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایا جاوے۔ ذوالقرنین کی روی کا بلاد شرقیہ میں ہندوستان سے آگے بڑھنا تو کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ پھر یہ گریٹ چینا وال (Great China wall) کس نے بنائی یوروپین مورخین بھی اسکو سکندر کی تعمیر نہیں بتلاتے۔ بلکہ اُسکے ڈیڑھ سو برس بعد کی عمارت ۲۲۳؁ ق م کی ساختہ بتلاتے ہیں (Beeton's 1 Gesgr Dict. P. 454) مگر بخلاف ان کے عرب کے قدیم وجدید مورخین ومحققین یک زبان ہوکر برابر لکھتے اور بتلاتے آتے ہیں۔ کہ یہ دیوار ذوالقرنین یمنی کی بنا کردہ ہے جسکا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور جو حضرت مسیح سے ہزار بارہ سو برس بیشتر تھا۔ ہم کو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم روات عرب اور ان کی روایات کو ناقابل اعتبار سمجھیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ان کی مخالف پارٹی مستشرقین یورپ کو اُس زمانہ قدیم میں نہ اُس فرمانروا کے حالات کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا۔ نہ اُس کی ملک گیری کے واقعات اور اُس کی تعمیرات کا۔ پھر ایک سنجیدہ اور عقل سلیم رکھنے والا شخص کیسے اُن کے اقوال کو مورخین ومحققین عرب کے مختار پر ترجیح دیسکتا ہے۔ جو اُس ملک کے قدیم رہنے والے۔ اُس فرمانروا کے ہم اصل اور ہم نسل ہونے کا پورا حق رکھتے تھے۔ ملک چین کی دیوار عظیم الشان علی الاعلان آجتک زبان حال سے شہادت دے رہی ہے۔ کہ عربی مورخین ومحققین کے قول کے مطابق ذوالقرنین یمنی اصعب الرائش بلاد شرقیہ کے ان انتہائی حدود

ان الحبشۃ استولوا علی الیمن بعد ذی جدن الحمیری المذکور وکان اول من ملک الیمن من الحبشۃ ارباط ثم ملک بعدہ ابرہ الاشرم صاحب الفیل الذی قصد مکۃ ثم ملک بعدہ یکسوم ثم ملک بعدہ مسروق ابن ابرھہ وھو اخر من ملک الیمن الی حمیر وملکھا سیف بن ذی یزن الحمیری (ابو الفدا)

ذی جدن حمیری کے بعد قوم حبشہ نے یمن پر قبضہ کر لیا جس شخص نے ملک یمن پر سب سے پہلے قبضہ کیا وہ ارباط تھا۔ اس کے بعد ابرہۃ الاشرم جو صاحب فیل مشہور ہے۔ اور جسنے کعبے کے انہدام کا قصد کیا تھا بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد یکسوم بادشاہ ہوا۔ یکسوم کے بعد مسروق بادشاہ ہوا۔ اور یہی مسروق یمن حبشیوں کا آخری بادشاہ ہوا پھر اُسکے بعد یمن کی سلطنت خاندان حمیری کی طرف عود کر آئی اور سیف بن ذی یزن الحمیری یمن کا بادشاہ ہوا۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ ۔ تک آیا۔ اور اُس نے خطۂ ترکستان۔ چین و تبت کے مغلوب اور اُن کے ممالک کو مفتوح فرمایا۔ اور پھر اُن کے آئندہ استحفاظ و اطمنان کے لیئے یہ سد قایم کر دی۔ ان شاہد متواترہ اور شواہد متکاثرہ کے مقابلہ میں تنہا آپ یا ابن خلدون کا انکار کبھی مفید کار اور قابل اعتبار نہ ہوگا۔

لفظ سمرقند کی توضیح۔ فاضل معاصر اس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں۔ شمر یرعش کی تیغ کشورکشا عرب سے ترکستان تک بلند ہو کر ایک شہر کو ویران کر دیتی ہے۔ اور اُسکا نام سمرکند پڑتا ہے۔ یعنی شمر نے اُس کی بیخ و بنیاد کھود ڈالی۔ صرف لفظ کا کھیل ہے "کند" کو فارسی لفظ (مصدر) کندن سے مشتق سمجھا۔ حالانکہ قدیم ترکستانی زبان میں "کند" شہر کو کہتے ہیں۔ سمرکند۔ تاشکند۔ خوکند ترکستان کی زبان بزمانۂ اسلام فارسی ہو گئی تھی۔ لیکن شمر یرعش کے زمانہ میں تو فارسی نہ تھی۔ جو کند فارسی کندن سے ماخوذ ہوتا۔ ہم کو رہ رہ کے تعجب ہوتا ہے۔ کہ ہمارے اِس فاضل کے ان نظریات کو کیا کہا جاوے۔ آیا یہ تنقید ہے۔ یا نزاع لفظی۔ اگر اسی نزاع لفظی اور بات کی پکڑ کا نام محققانہ تنقید اور مورخانہ تنقیح ہے۔ تو کٹھ حجتی اور ہٹ دھرمی کس کو کہیں گے۔ استغفر اللہ۔ آپکی تحقیق کا خاص مدعا تو ان تمام خارج از بحث خامہ فرسائی سے وہی مستشرقین یورپ کی تقلید اور عربی مورخین و مفسرین کی تغلیط و تردید ہے۔ مگر افسوس آپ کو اپنے اس غلط فہمانہ ارادے میں سر مو کامیابی حاصل ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے مندرجہ مضامین تنقید عربی مورخین کی صحت بیانات کو تمام دلائل و قرائن سے ثابت کرتے آئے ہیں۔ اور آپ کے قیاسی اور خیالی مندرجات کو باطل جیسا کہ اُوپر کی عبارت سے ظاہر ہے۔ نہایت عبرت اور حسرت کا مقام ہے۔ کہ اس لفظ کے متعلق بھی آپ کے انکار کی وہی صورت ہے۔ یہاں آتش در کاس۔ کند تھا۔ یا حقیقت میں گند تھا۔ جیسا آپ تجویز فرماتے ہیں۔ اُسی مرکزی اختلاف کے سبب کو ابھی تھوڑی دیر کے لیئے پتہ کر دیجئے۔ اصل لفظ سمر پر نگاہ ڈالیئے۔ غور کیجئے۔ اور بتلایئے۔ کہ اگر قول عرب کے مطابق یہ لفظ شمر نہیں ہے۔ تو پھر ترکی زبان میں یہ کون لفظ تھا۔ اور اسکے کیا معنی تھے۔ قرینہ بتلا رہا ہے۔ کہ شمر کے ایسا یہ بھی ترکستانی زبان میں کسی شخص خاص کا نام ضرور ہوگا۔ جس کی مناسبت سے آپ کا شہر "گند" مشہور کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ آپ نے اسکی نسبت کچھ نکھا

مشرقی مورخین نے یہاں بھی ارباط اور ابرہہ کو دو جداگانہ شخص خیال کرکے لکھدیا ہے۔ کہ اتنے زمانے میں صرف دو ہی شخص بادشاہ ہوئے۔ حالانکہ ارباط و ابرہہ اُن کے قوم و قبائل کے امتیازی القاب ہیں۔ اور اُن بادشاہوں کے نام کے ساتھ امتیاز خاندانی کی ضرورت سے ضم کئے جاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی محققین کا اتفاق ہے۔ کہ سلاطین ابرہہ میں سے ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا۔ جو زیادہ تر صاحب الفیل کے نام سے لکھا جاتا ہے اِس نے مکہ معظمہ پر ۵۷۰ء میں چڑھائی کی تھی۔ یہ بہت سے ہاتھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ کہ خانۂ کعبہ کو منہدم کرادے۔ اس کے پوتے مسروق کو سیف بن ذی یزن حمیری نے تخت سے بے دخل کردیا۔ اِس کے بعد ابرہہ کا خاندان شاہی ختم ہوگیا۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: اس لئے تا وقتیکہ آپ شاہدہ تاریخی سے اس لفظ کے خاص ترکستانی ہونیکا کامل ثبوت نہ دیںگے۔ آپ کی اس ہندی کی چندی کو کوئی نہیں مان سکتا۔ بلکہ بخلاف آپ کے عربی مورخین کے بتلائے ہوئے سمرقند کو جو اُن کے متواتر روایات سے ثابت ہے۔ نہایت آسانی سے قبول کریگا۔ اب کند اور کنڈ کی بحث کی طرف آیئے۔ بات یہ ہے۔ کہ جب تک شمر اور سمر کا تصفیہ نہ فرمائیں گے۔ جیسا اوپر آپ سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسوقت تک کند اور کنڈ کی تنقیح آپ کے مدعا کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی ہم کہتے ہیں۔ کہ عربوں کا بتلایا ہوا کند ٹھیک تھا۔ بعد میں ترکوں نے اس کو اپنی زبان کے تلفظ میں کنڈ بنا لیا۔ آپ میری اس تعدیل کی کیونکر تردید کرسکتے ہیں۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین اگر آپ سچے ہیں۔ تو کوئی دلیل لایئے۔ زبانی قیاسی اور خیالی اندازوں کا نہ کوئی وزن و اعتبار ہوا ہے۔ اور نہ ہوسکتا ہے ہمارے فاضل معاصر کا یہ کہنا۔ کہ اُسوقت تک فارسی ترکستان کی زبان ہوئی ہی نہیں تھی یہ کند آیا تو کہاں سے۔ یہ ہی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان۔ ایران اور انگلستان۔ تین مختلف ممالک ہیں۔ اور اُن میں ہزاروں میل کا فیمابین فاصلہ ہے۔ اُن کے تمام اُمور تمدن۔ تہذیب۔ معاشرت۔ قومیت وغیر اشتالہا۔ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مگر باوجود اتنے اختلاف کثیرہ کے بھی سنسکرت۔ فارسی اور انگریزی میں الفاظ پدر۔ مادر۔ اور دختر کی قریب قریب ایک صورت ہے۔ یہ کیوں صرف اس لئے کہ عام اس سے ان ممالک میں کتنے ہی اختلاف نہ ہوں۔ مگر اصلیت فی النسل اور وحدت فی الاصل کے یہ اثر ہیں۔ جو نہایت قلت کے ساتھ اب تک اُن میں پائے جاتے ہیں اسی اُصول مشاہدہ کی بنا پر ہمارے فاضل محقق کو ترکستان میں اُن دنوں لفظ کند کا استعمال یقین کرلینا چاہیئے۔ اور سمجھ لینا چاہیے کہ باوجودیکہ کہ ترکستان میں اُسوقت فارسی زبان نہ مروج ہو۔ ایران و ترکستان کی اصلیت قربت اور باہمی تعلقات کیا کم تھے۔ جو ترکوں کو کسی فارسی لفظ کے بولنے یا مستعمل کرنے سے روک سکتے۔ اس بنا پر بقول مورخین عرب سمرقند کو فارسی ترکیب کا لفظ تسلیم کرلینا نہایت صحیح اور بجا واقع ہوگا۔

ابن حوقل بغدادی کے مشاہدہ کتبہ حمیری واقع دروازہ سمرقند کی نسبت آپ کی یہ مطایبہ آمیز تعریض کہ۔ لیکن افسوس کہ سیاح موصوف سنہ مر

سیف ابن ذی یزن حمیری کو اپنی آبائی سلطنت کیسے ملی۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ ہمیشہ سے سیف بن ذی یزن کے دل میں اپنی خاندانی سلطنت واپس لینے کی غیر متحمل اور مستقل خواہش و تمنا تھی۔ اِس ارادہ سے وہ بادشاہ روم کے پاس گیا۔ اور اُس سے امداد کا طالب ہوا۔ انتظار استمداد میں اُس کے دس برس کامل صرف ہوگئے اور کچھ کشود کار نہوا۔ آخر مایوس ہو کر کسرے نوشیرواں کے دربار میں پہونچا۔ اور کمک کی درخواست کی کسریٰ نے اُس کی استدعا منظور کی۔ ایک جرار لشکر تیار کرکے اُس کے ہمراہ کر دیا۔ اسی لشکر کی قوت سے سیف ابن ذی یزن نے اپنے حریف ابرہہ کو شکست دی۔ اور اُس سے اپنا آبائی مُلک خالی کرالیا۔ یمن کے مشہور و معروف محل سلطانی

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ:۔ قیام ہی میں یہ نادرہ روزگار شہر میں آگ لگ جانے سے جلکر بے نشان ہوگیا صاف صاف بتلا رہا ہے۔ کہ آپ عربی سیاح کو محض جھوٹا اور اُسکے مشاہدات کو اُس کے دل کی گڑھی ہوئی بات سمجھ رہے ہیں۔ اِس سے بڑھ کر ایک مؤلف خصوصًا ایک مسلم مورخ و محقق کے لیے اور کون شرمناک طریقہ ہوگا۔ جھوٹا کہنا ہے۔ تو صاف لفظوں میں کہیے۔ مگر کہنے سے پہلے یاد رکھیے۔ کہ ارض القرآن کے کثیر التعداد مقامات پر اسی ابن حوقل کے حوالے دیدے کہ اُس کی راست بیانی اور صداقت زبانی کا آپ سب کو یقین دلاچکے ہیں۔ اب وہی ابن حوقل ہے۔ اور وہی آپ ہیں۔ مگر چونکہ اُسکا مختار مستشرقین یورپ کے خلاف پایا جاتا ہے۔ تو اس ضرورت و مجبوری سے وہ بے اعتبار بھی ہوگیا۔ اور ناقص العیار بھی۔ یہی ایک متدین مؤلف اور محقق کا شعار تالیفی کہا جائے گا۔ بہتر وہ غریب جھوٹا سہی۔ آپ سچے ہو کر اُس کی تردید میں کیسی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ بھی دیکھی جائے۔ ہاں آپ کی دلیل یہ ہے۔ کہ ابن حوقل نے حمیری خط سمجھنے میں غلطی کی۔ وہ قدیم ترکی کا ایغوری خط ہوگا۔ جو حمیری اور یمنی خطوط سے مشابہ ہے۔ آپ کے تنقیدی الفاظ یہ ہیں۔ قدیم ترکی کا ایغوری خط ہوگا۔ ان الفاظ سے آپ کی دلیل کی خیالی اور احتمالی صورت قایم ہوتی ہے۔ نہ یقینی اور واقعی۔ اور اصول تنقید کی رو سے۔ دلائل تردیدی کے لیے مشہود یقینی اور قطعی ہونی چاہئیں۔ اب آپ اپنے ضعف استدلال کو خود انصاف کی نظر سے ملاحظہ فرمالیں۔ کہ آپ ابن حوقل کے مشاہدات کو اپنے احتمالات سے باطل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بالکل محال ہے اور خلاف استدلال اس کے علاوہ جیسا میں ان مباحث کی تمہید و عنوان میں بیان کرچکا ہوں۔ آپ چودہ سو برسوں کے بعد ایغوری خط اور حمیری خط کی تمیز و معرفت کے لیے قابل اعتماد تسلیم کیے جائیں گے۔ یا ابن حوقل بغدادی جو کل تیسری صدی کا محقق ہے۔ اس رو سے بھی آپ کا ادعا بیجا ہے۔ اور سراسر نا رسا۔

تبت کی فتح۔ اسپر بھی وہی خیالی اور قیاسی تعریض کی گئی ہے۔ اور ابن حوقل کے ایسی علامہ مسعودی صاحب تاریخ مروج الذہب کی خبر لی گئی ہے۔ کیونکہ اُس نے بھی اپنے سیاحت کے زمانہ میں جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا زمانہ تھا تبت میں عربی النسل والاصل آدمیوں کو دیکھا۔ اور بالکل عرب کی حقیقی اور اصلی لباس و پوشاک میں ان کو باستقلال و استمرار وہاں کا باشندہ پایا۔ آپ اس محقق کے مشاہدات پر اپنے قیاس کا یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں۔ کہ تیسری اور چوتھی صدی میں عرب کی تجارت تمام اقطاع عالم میں پورے فروغ اور

غمدان میں اپنی سکونت اختیار کی۔ اور مشرقی سلاطین کے اصول معاشرت کے مطابق عیش و عشرت میں مصروف ہوگیا۔ اُس زمانہ کے شعرائے عرب نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کے اشعار مدحیہ سے۔ چونکہ اکثر تاریخی واقعات کا پتا ملتا ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اُن کی نقل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

لا تحسب الناس الا کابن ذی یزن	کسی شخص نے ابن ذی یزن کے ایسا قصد و ارادے والا نہیں دیکھا
اذخیم البحر للاعداء حولا	جس نے مخالف کے خیموں کا دریا کے کنارے پر محاصرہ کرلیا۔
واتی هرقل وقد سالت نعماتہ	ہرقل بادشاہ روم سے اسکی دولت و قوت کی مدد مانگی۔ مگر جو مدد
فلم تجد عندہ النصر الذی سالا	کہ اس سے طلب کی تھی۔ نہ پاسکا۔
ثم انتهی نحو کسری بعد عاشرۃ	اسی طرح دس برسوں کے بعد کسریٰ نے اپنے جان و مال سے اسکی
من السنین اهین النفس والمالا	مدد فرمائی۔
حتی اتی ببنی الاحرار یقدمهم	یہاں تک کہ تمام آزادی پسند قبائل اُسکا خیر مقدم بجا لائے۔ اور
تخالهم فوق المتن الارض اجیالا	اُن کے لیے تمام زمین اور کوہستانی مقام خالی کر آئے۔ خدا کی

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ یہ کمال عروج پر تھی۔ اس لیے مسعودی نے جن عربوں کو حبش میں دیکھا۔ وہ اپنے تجارتی اغراض سے وہاں کے تازہ وارد ہونگے۔ نہ وہاں کے مستقل باشندے۔ فاضل معاصر کا موجودہ طریقہ استدلال عجب طرح کا ہے۔ آپ ایک محقق قدیم کے مشاہدات کو اپنے احتمالات و قیاسات سے باطل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کبھی ممکن ہے۔ اور کوئی اسے قبول کریگا۔ آپکی اس تعریض کا بھی وہی جواب ہے جو ہم ابن حوقل کی تکذیب کی نسبت اُوپر لکھ آئے ہیں۔ مگر فاضل محقق کے مزید اطمینان کے لیے کسی قدر وضاحت و تفصیل سے پھر لکھے دیتے ہیں۔ کہ علامہ مسعودی۔ تین سو صدی کا عالم محقق۔ مورخ۔ اور سیاح جو عربی النسل تھا۔ وہ ایک ہندی نژاد مدعی علم و تحقیق سے جو اُس سے ایک ہزار برس بعد پیدا ہوا ہے۔ اپنے ہموطن اور ہم قوم۔ اور ہم نسب عربوں کی معرفت کو بدرجہا بہتر جانتا تھا۔ اُن کے وضع و لباس۔ گفتگو اور دیگر طریقہائے معاشرت اُن کے قیامی اور عارضی بود و باش کی کامل تمیز رکھتا تھا۔ اگر وہ آپ ہی کے قول کے مطابق شغل تجارت کے سبب اُن اطراف میں حال فی الحال آئے ہوئے تھے۔ تو ہم نہیں سمجھتے۔ کہ مسعودی کو اصل حال کے صاف صاف لکھ دینے کے لیے کونسی مجبوری لاحق تھی۔ ہر امر کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور ہر مقصد کا ایک خاص سبب۔ مگر یہاں مسعودی کے استخفاف واقعہ کے لیے نہ کوئی مدعا معلوم ہوتا ہے۔ اور نہ سبب پایا جاتا ہے۔ اُس وقت تو حمیری سلطنت کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس سے ہم سمجھ لیں کہ حاکم وقت کے اثر سے اُس نے اُس کے آبائی سلسلہ کے فتوحات کو اس قدر بڑھا کر اور چمکا کر لکھ دیا ہے۔ مدعا بے سبب نہ کبھی قابل سماعت ہوا ہے۔ نہ لائق قبولیت۔ اس لیے تا وقتیکہ آپ مسعودی کی ناقابلیت اور اُس کی خود غرضانہ بیان کی غرض و غایت صحیح طور سے نہ ثابت کر لیں۔ آپ کی تعریض محض بیکار ہے

لله درهم من فتية صبر
ما ان رائت لهم في الناس امثالا
بيض مرازبة غلب اساورة
اسد تربب في الغيظات اشبالا
فاشرب هنيئاً عليك التاج مرتفقا
براس غمدان دارا منك محلالا

قسم۔ ایسے صبر اور متحمل شجاع کی مثال اُنہوں نے اور لوگوں میں بہت کم پائی۔

تمام وادی اور میدان چمک گئے۔ اور شہروں پر وہ شیر جس نے بچپن سے بچہ شیر کی طرح تربیت پائی تھی تمام شہروں پر غالب آگیا۔

تیرے سر پر تاج شاہی مبارک ہو۔ اور تجھکو تیرا محل شاہی۔ جو غمدان میں بنا ہے۔ خوش آئند ہو۔ اور سزاوار ہو۔

سیف ابن ذی یزن کی نامور زندگی کا خاتمہ اُس کے دربار کے ایک حبشی مصاحب کے ہاتھوں ہوگیا۔ جو اُسکا ہمدم اور ہمنشین تھا۔ مورخ ابو الفدا کی تحقیق میں بھی اسکا خاتمہ ایسا ہی ہوا۔ مگر وہ اسکے قتل کو کسی شخص کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ بلکہ اُس حبشی جماعت کی مجموعی محسن کُشی کے متعلق کرتے ہیں۔ جسکو سیف نے اپنا مقرب اور معتمد بنا رکھا تھا۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے۔

وكان سيف بن ذي يزن المذكور قد اصطفى جماعة من الحبشان وجعلهم من خاصته فاغتالوه وقتلوه

سیف بن ذی یزن مذکور نے اپنے ملازمین میں سے ایک حبشی جماعت کو منتخب کرکے اپنا مقرب بنالیا تھا۔ انہی لوگوں نے اُس کے ساتھ بدی کی اور اُسکو قتل کر ڈالا (ابو الفدا)

کیکاؤس اور سوادابہ ملکہ یمن کے تعلقات:۔ اس تحریر کی نسبت بھی ہم اپنے تمہیدی مضامین میں بالاجمال لکھ چکے ہیں۔ آپ نے بڑے جوش و شوق سے۔ اپنے تنقیدی مضامین کیکاؤس و سوادابہ کی پوری داستان لکھنے کو تو لکھ ڈالی۔ اور حتی الامکان اس کی غیر امکانی ثابت کرنے کی بھی کوشش کی۔ مگر اسکے متعلق اس کثرت سے شاہد تاریخی اور صحیح و صریح قرائن وقوع موجود تھے۔ کہ بالآخر آپ کو گھبرا کر لکھنا ہی پڑا۔ کہ اس بنا پر ہمیں ان روایات کے قبول میں کوئی عذر نہیں ہے بشرطیکہ یمن کا خاندان حمیر اور ایران کا خاندان کیانی تاریخاً معاصر ثابت ہوجائے۔ ورنہ یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ حقیقتاً ایران کا کوئی اور بادشاہ ہوگا۔ کیکاؤس کی طرف غلطی سے نسبت ہے۔ آپ کی یہ تحریر بالکل تسلیمی ہے۔ بالفرض محال کیکاؤس نہ تھا جیسا آپ کہتے ہیں۔ دوسرا تاجدار فارس تھا۔ ناموں کے فرق سے نفس واقعہ کو آپ کیونکر افسانہ کہہ سکتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے۔ کہ ان تمام واقعات کو اعتراقاً گو بالاختصار آپ کے اُستاد و شفیق شمس العلما نعمانی نے سیرۃ النبیؐ جلد اوّل میں قلمبند فرمایا ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ آپ ہی نے اُن کے بعد اُسے چھپوایا۔ اور جا بجا اُس پر حاشیہ اور نظریہ لکھے۔ مگر افسوس کہ ان واقعات غیر معتبرہ پر۔ جن کو آپ محض افسانہ سمجھتے تھے۔ آپ نے کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اور تمام دُنیا کو غلط فہمی میں ڈالا اگر اُستاد پر قلم ایراد اٹھانا سوء ادب تھا۔ تو کم سے کم نظریہ لکھ دیئے ہوتے۔ کہ دُنیا حقیقت حال سے واقف ہوجاتی۔

المؤلف سیّد اولاد حیدر عفی عنہ

سیف ابن ذی یزن کے بعد اِس خاندان میں حکمرانی کے قابل کوئی شخص موجود نہ تھا۔ کسریٰ نے اس موقع کو غنیمت جان کر ملک یمن پر قبضہ کر لیا۔ مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

فارسل کسریٰ عاملہ الی الیمن واستقرت عمال کسریٰ علی الیمن الی ان کان اخرھم باذان الذی کان علی عھد النبی صلعم اسلم۔

کسریٰ نے موقع پا کر یمن کو اپنی سلطنت میں ملالیا۔ اپنی جانب سے یمن پر عامل مقرر کر دیا۔ انھیں عاملوں میں سے آخر عامل باذان نامی تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اسلام سے مشرف ہوا

ہم سلسلہ عمالان کسریٰ کے مفصل حالات و واقعات اُن کے مقام پر قلم بند کریں گے۔

عرب العاربہ یا بنی قحطان کے سلسلہ میں۔ یعقن۔ سبا۔ سبائے حمیر اور سبائے حبش وغیرہم فرعاً فرعاً۔ ہر ایک کے حالات و واقعات ہم پوری تفصیل و تشریح سے لکھ چکے۔ یہ سلسلہ یقطان۔ یا قحطان سے شروع ہو کر سیف بن ذی یزن پر بالکلیہ تمام ہو جاتا ہے۔ اسی سلسلہ خاندان میں عرب کے اُس زرخیز اور سبز و شاداب حصہ ملک کی حکمرانی ہزاروں برس تک قایم رہی۔ جو اُس زمانہ میں اپنے تمدن، معاشرت اور تجارت کے لیے تمام اقطاع عالم میں خاص طور پر مشہور تھا واقعات مندرجہ بالا یہ بھی بتلا رہے ہیں۔ کہ حمیریوں کی حکمرانی حدود یمن اور مضافات عرب ہی تک محدود نہیں۔ تھی۔ بلکہ اُن کی کشورستانی کے ہاتھ دوسرے ممالک دور دور تک پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح اُن کے تمدن کے اصول۔ تجارت کے تجارت۔ تہذیب و معاشرت کے محاسن۔ صنعت و حرفت کے کمال۔ تدبّر ملکی کے شہرے دُور دُور ملکوں میں مشہور ہو رہے تھے۔ اور اُن سے غیر ممالک کے مختلف اقوام مستفید ہو رہی تھیں۔ اُن کا اقتدار اُن کی نمود اری اُنھیں کے لیے خاص نفع بخش نہیں تھی۔ اور نہ ایسی عارضی اور غیر مستقل تھی۔ جو اُن کی جسمانی ہستیوں کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی۔ وہ اپنے لاتعداد زمانہ کے بعد بھی آجتک یادگار ہے۔ اور زمانہ موجودہ کے منتہی الکمال اور ترقی یافتہ قوموں کو اپنی قدامت۔ عظمت کے کمال دکھلا دکھلا کر حیرت اور تعجب میں ڈالتی ہے۔ جرمنی کا مشہور مستشرق مشہور پروفیسر نولڈکی Noldeke سلاطین سبا و حمیر کے اعلیٰ تمدن کے ذکر میں لکھتا ہے۔

ولادت مسیح سے ہزار سال قبل۔ جنوبی اور غربی عرب۔ یعنی صوبۂ یمن جو سبا و حمیر کا ملک تھا۔ اور جو اپنی بارش کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا۔ تمدن کے اُس رتبہ تک پہونچا ہوا تھا کہ اُس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آجتک ہماری مدح و ستائش کے جذبات میں تحریک ہوتی ہے۔ اور اہل روم و یونان نے اسکو دولت مند عرب کا لقب دیدیا تھا۔ وہ ہرگز بیجا نہ تھا۔ توریت مقدس میں متعدد عبارتیں ہیں۔ جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان علیہ السّلام سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے (سلاطین۔ ایت۔ ۱۔ ۱۰) قوم ثمود جن کی عمارات سے ڈاؤتی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے۔ نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملی جُلتی ہے۔ اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انھیں سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال کی جانب سے لیا تھا۔ اب اُسکو خود انہوں

نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک طرف دمشق۔ دوسری جانب ابی سینا تک اسکو پھیلا دیا۔ (Noldeke's Hist of the world R 5)

اسی سلسلہ ملوک سبا میں شمر یرعش بڑا فاتح تھا۔ ۳۰۰۰ق م میں اس نے چار لاکھ فوج جمع کر کے عراق اور خراسان پر قبضہ کر لیا۔ صُغدار جو بعد کو سمرقند کہلایا۔ اسی فاتح بادشاہ کے عہد میں مفتوح ہوا۔ افریقش ابن ابرہہ اسی سلسلہ کی حبشی فرع میں گذرا ہے۔ جس نے ۱۰۹۰ق م میں بہت سی عربی قوموں کو لیجا کر ملک افریقہ میں بہت سی بستیاں بسائیں۔ اور اُس اطراف میں یہاں تک اُسکا اقتدار بڑھا۔ اور اثر قایم ہوا۔ کہ وہ ملک کا ملک اُسکے نام سے (افریقیہ) مشہور ہوا۔

محققین یورپ کے اُن اعترافات کے علاوہ۔ جو اُنہوں نے یمن کے قدیم تمدن کے تسلیم کرنے کی نسبت لکھے ہیں اور جن کے ثبوت اُن کو یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات سے حاصل ہوئے ہیں۔ اسلامی مورخین اور عربی محققین کے تصنیفات و تالیفات بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ یاقوت حموی نے معجم میں یمن کے مشہور و معروف شہر صنعا و قلیس کے خاص آثارات عجیبہ کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اُن کی تفصیل ترکیب مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم اس کے اجزا میں اصلیت کے عناصر موجود ہیں۔ علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔ صفۃ الجزیرۃ العرب میں یہ عبارت لکھی ہے۔

المشهور من محافد الیمن وقصورہ القدیمۃ التی ذکرتها العرب فی الشعر والمثل .... کثیرۃ التی فیها من الشعر باب واسع وقد جمع ذلک کلہ فی الکتاب الثامن من الاکلیل۔

یمن کے مشہور اور قدیم قصر و ایوان جن کا ذکر اہل عرب کے اشعار و امثال میں لکھا ہے۔ کثرت سے ہیں۔ اور اُن کے متعلق اشعار عرب کا ایک دفتر تیار و مرتب ہے۔ کتاب اکلیل کے آٹھویں باب میں۔ ہم نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس عبارت کے بعد مؤلف نے لکھا ہے۔ کہ اس موقع پر صرف اُن کے نام گنا دیتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں۔ غمدان[1] نعم[2]۔ ناعط[3]۔ صرواح[4]۔ سلحین[5]۔ ظفار[6]۔ ہکر[7]۔ ضہر[8]۔ شبام[9]۔ غیمان[10]۔ بینون[11]۔ ریام[12]۔ براقش[13]۔ معین[14]۔ روثان[15]۔ ارباب[16]۔ منہد[17]۔ ہنیدہ[18]۔ عمران[19]۔ اور بحیر[20]۔

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں بالتفصیل مذکور ہے۔ اور اُس کی رفعت و عظمت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں۔ جن پر انتہائی مبالغہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ سلحین کی نسبت لکھا ہے۔ کہ ستر برس میں تعمیر ہوا ہے۔ شبام کے حال میں لکھا ہے۔ لهم فیه حصون عجیبۃ هائلۃ اس میں ان کے متعدد حیرت انگیز قلعے ہیں۔ قلعہ ناعط عرب میں ابن مُنَبِّہ کے زمانہ تک موجود تھا۔ اُس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے

تھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے ۔ آجکل یورپ کے محققین نے اِن مقامات پر پہونچکر جو تحقیقات کی ہے۔ اُس سے بھی اُن کے حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے۔ تھیاچر صاحب اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں۔

جنوبی عربستان میں (یمن) جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اور اُن کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے۔.... یمن اور حضر موت میں یہ آثار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور اکثروں پر کتبات ابھی تک موجود ہیں۔ صنعا کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دُنیا کے عجائبات ہفتگانہ میں ایک قرار دیا ہے۔ دگر قلعوں اور عمارتوں کے لیۓ دیکھو

Journel German oriental society Vo 10 P 20.

مآرب۔ جو قدیم سبائی دار الحکومت تھا۔ اس کے آثار قدیمہ کو۔ ارنو۔ ہالوے اور گلاذری نے دیکھا ہے۔ مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار پائے ہیں۔ اُن کو دیکھکر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں۔ ان کی اہمیت اُسوقت ظاہر ہوئی۔ جب گلاذری نے دو طویل الذکر کتبے شایع کیے۔ جن میں ان کا عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یمن میں بمقام حُرّان ایک اور خندق ہے۔ جس کا طول تقریبًا چارسو پچاس فٹ اُونچا ہے۔ (سیرۃ النبی شبلی نعمانی)

بند عرم یا سد مآرب۔ اسکے اثری حالات ارض القرآن کی عبارت سے بالتفصیل اوپر نقل کر دیۓ گۓ ہیں۔ اسکے متعلق تاریخی حالات مناسبت مقام اور رفع ابہام کی غرض سے حسب ذیل لکھے جاتے ہیں۔

اس بند کو عبد الشمس الملقب بہ سبا نے بنانا شروع کیا۔ اُس کے بعد اُس کی اولاد میں حمیر نے اُسکی عمارت کو خاتمہ تک پہونچایا۔ وقتًا فوقتًا سلسلہ حمیری کے اور بادشاہ بھی بقدر ضرورت اپنے اپنے وقت میں اسمیں اضافہ کرتے گۓ۔ حقیقت یہ ہے۔ یہ بند دو پہاڑوں کے درمیان جسکا نام ابو الفداء نے مآرب اور ابلق بتلایا ہے۔ اس غرض سے ایک مرتفع دیوار کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ جس سے چشموں اور تمام بارش کا پانی سمٹ کر ایک خاص مقام پر رکا رہتا ہے۔ اس بند کے ضروری مقام و موضع پر چھوٹے چھوٹے روزن بنے ہوۓ تھے۔ اور انہی روزنوں سے اہل شہر اپنی روزانہ ضروریات اور سیرابی زراعت کے لیۓ پانی لیا کرتے تھے۔ اس بند کے بنانے میں اُسوقت کے لوگوں نے اپنی طباعی اور صناعی کے کمال دکھلاۓ تھے۔ یہ بند شہر مآرب کے دونوں پہاڑوں کے درمیان اتنا اُونچا بنا ہوا تھا۔ کہ اُس کی رفعت اور شوکت اُس کے ایک علیحدہ پہاڑ ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ عمارت اس کی ایسی استوار اور محکم تھی۔ کہ اُس کے ٹوٹنے کا کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کی دیوار اتنی چوڑی تھی۔ کہ اکثر شہر کے لوگوں نے اُس پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ اس کے عمق میں ہمیشہ چالیس گز اونچا پانی رہا کرتا تھا۔ عرم میں پانی تمام دُنیا کی نعمت اور دولت سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا ہے۔ آجتک بھی اُس کی قدر و قیمت کی وہی کیفیت ہے

اسی پانی کی قدر و عزت اور اسی کی بدولت اُن کی خوشحالی۔ دولتمندی پر اُن کے غرور و نخوت نے اُن کے سلاطین کو خدا کی راہ سے پھیر دیا۔ اور آخرکار زوال و ادبار کی خندق میں گرا دیا۔ فاعرضوا فارسلنا علیھم سیل العرم اُنہوں نے میرے احکام سے اعراض کیا۔ تو ہم نے اُنہی کا بند توڑ کر اُن پر سیلاب جاری کر دیا۔ قرآن مجید کے الفاظ لیامی اُن کی تباہی و بربادی کی تصدیق کر رہے ہیں۔

سلاطین حمیر پانی کی ایسی کثرت سے نعمت غیر مترقبہ کو اپنے قبضہ اختیار میں پا کر خداوند عالم کی احسان مندی اور سپاس گذاری کو تو بھول گئے۔ جس نے اُن کو پانی کے ایسے بیش قیمت دولت دی۔ اور پھر ایسے مستحکم بند بنانے اور اُس دولت بیش بہا کو ہمیشہ جمع رکھنے اور اُس کے ذریعہ سے اپنی زراعت کو بڑھانے اور اپنے تمام علاقہ کو سبز و شاداب بنانے کی عقل و حکمت عطا فرمائی۔ اُنہوں نے پانی کے اس کثیر ذخیرے کو ابدی اور لازوال دولت یقین کر لیا۔ اور اس کی وجہ سے اپنے ذاتی عظمت و اقتدار پر اعتبار کر کے ایسا کبر و افتخار کرنے لگے۔ کہ گویا اُن کو اپنے غرور و نخوت سے زمین پر پاؤں رکھنا دشوار ہو گیا۔ مدبرین قدرت نے اِن مغرورین دُنیا کو متواضع بنانے اور سرکشان زمانہ کے سر جھکوانے کی غرض سے یہ تدبیر نکالی۔ کہ اِن کا جمع کردہ ذخیرہ آب میں۔ جو اصل مار فساد تھا۔ ایسا سیلاب پیدا کر دیا۔ کہ ان کی قوم کی قوم۔ قبیلہ کا قبیلہ۔ رات کو سوتا کا سوتا ہی رہ گیا۔ اور وہ بند ٹوٹ کر تمام شہر و قرب و جوار کے علاقے بہا لے گیا۔

مولوی شبلی کی کوتاہ قلمی پر ایک نظر سلاطین حمیر کے مشہور سلسلہ شاہی اور اُن کے اعلیٰ نظام و تمدن عظمت و اقتدار اور اخبار و آثار کی تفصیل میں ہم نے مندرجہ حالات و واقعات مغربی اور مشرقی محققین و مورخین کے مختلف تصنیفات و تالیفات سے قلم بند کر دیئے۔ مگر افسوس ہے۔ کہ شبلی صاحب نے عرب البائدہ کے ایسا عرب العاربہ کے حالات کو بھی مرفوع القلم فرما دیا۔ حالانکہ اُنہی کے حوالوں سے جو اوپر نقل کیئے گئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ضرور قابل الذکر تھے۔ اور اُنکا تمدن۔ اُنکا تدبر۔ اُن کی صنعت و حرفت اور اُن کی عظمت و شوکت سب کچھ قابل بیان تھی۔ جستہ جستہ اُن کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مگر ایسے اختصار کے ساتھ کہ اُنکا بیان صرف انگلیوں کا اشارہ بنکر رہ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے ان کے تفصیل و بیان حالات کو اپنے مدعائے تالیفی کی ضرورت سے زائد سمجھ کر آگے سے ہٹا دیا ہے۔ مگر کسی ملک و قوم کی تاریخ کا سلسلہ اُسوقت تک مکمل اور مسلسل نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک کہ اُسکے تمام قدیم اخبار و آثار سے اُس کے موجودہ حالات و واقعات کا زنجیرہ نہ ملا دیا جائے۔

مولوی شبلی صاحب نے عرب البائدہ اور عرب العاربہ کے حالات و واقعات کو قلم زد فرما کر اپنی کتاب کے ناظرین سے عظیم الشان اور مقدس انبیاء و سلاطین عرب کے حالات کو بالکل مخفی اور پوشیدہ رکھا۔ عرب البائدہ

کے سلسلہ میں۔ قوم عاد کے حالات اُن کے عروج و ادبار کے تاریخی واقعات۔ حضرت ہُودؑ کی بعثت۔ اُنکی تبلیغ رسالت۔ قوم ثمود یا (عاد ثانیہ) کے واقعات۔ اُن کا تمدن اور اعلیٰ صنعت و حرفت۔ سنگتراشی کے کمال جناب صالحؑ کی رسالت۔ وغیر اشالیم اور عرب کے اس قدیم دعوے پر کہ اُسکی مقدس سرزمین پر چار پیغمبران الٰہی مبعوث فرمائے گئے۔ ایک تاریک پردہ ڈالدیا ہے۔ اسی طرح ملکہ بلقیس اور اُسکی شاہی سطوت کے کارناموں کو خارج از بیان قرار دیکر خاک پاک عرب کی اُس تقدیس و عظمت کو جو اُسے فلسطین و بیت المقدس کے ساتھ مراتب جلال و اقتدار میں بحصّہ مساوی حاصل تھی چھپا دیا۔ اور گھٹا دیا۔

کمال عبرت اور انتہائے حسرت تو یہ ہے۔ کہ شمس العلمائے نعمانی ایک اسلامی فاضل اور محقق ہو کر عرب کی ان اخبار تقدیس اور آثار عظمت و تکریم کو دیدہ و دانستہ قلمزد فرمائیں۔ اور اگر کچھ قلمی زحمت اور قمی مصیبت اوٹھا کر لکھیں بھی۔ تو ایسا مختصر کہ بیرے بود۔ بیرے داشت گم شد۔ بازیافت کا لطف آئے۔

آپ کے خلاف غیر اسلامی مؤلفین و مؤرخین۔ جنکو عرب اور اہل عرب کے حالات و واقعات کے ساتھ اتنی ہمدردی اور دلچسپی اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ اپنی دولت۔ اپنا دماغ اور اپنا وقت صرف کر کے اُن کے تمام حالات و واقعات اور اخبار و آثار۔ ہزاروں ایکڑ زمینیں کھود کھود کر باہر نکالیں۔ اور اُنکے صحیح نشانات۔ علامات۔ اور مقامات بتائیں۔ اور طرّہ یہ ہے۔ کہ آپ بھی اُنہی کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور جابجا اپنی کتاب میں اُنہی سے حاشیہ و متن چڑھائیں۔ مگر جب اپنے لیے اُن کے لکھنے اور بیان کرنے کا وقت اور مقام آئے۔ تو آپ اپنا قلم روک لیں۔ اور کچھ نہ لکھیں۔

مؤلف کے لیے اپنے مدعائے تالیفی پر زود رسی کی کوشش بہت سی ضروری فروگذاشتوں کا باعث ہوتی ہے مولوی شبلی صاحب بھی اسکے الزام سے نہیں بچے۔ بلکہ ایک شرمناک مغالطہ میں پڑگئے۔ عرب کی قدیم حکومتوں کے باب میں آپ لکھتے ہیں۔ کہ سبائی دور جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے۔ اسی سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا۔

جب ہم آپ کے اس بیان کو دوسرے محققین و مؤرخین کے بیانات سے ملاتے ہیں۔ تو استداد ایام کے حساب میں زمین و آسمان کا فرق پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ مؤلف نے صرف مولر (Muller) کی روایت احاد پر اعتبار کر لیا۔ حالانکہ مقدمہ کتاب میں تنقید و تحقیق روایات کی نسبت آسمان زمین کے قلابے ایک کردیئے گئے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کے رشحات تحقیق توثیق و تصدیق وحی آسمانی کا پہلو دابے ہیں۔ مگر بایں ہمہ جب آپکے ان ظاہری طمطراق کے بعد سیاق تالیف پر نظر کی جاتی ہے۔ تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیان کو عمل سے اور عمل کو بیان سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی تعین زمانہ سبا کے متعلق مولر کے تنہا مختار تو اعتبار کر لیا گیا

مگر گلاذری کے قول پر جیسے مولّر کے روایات سے قبل خود لکھ چکے ہیں۔ کوئی اعتنا نہ فرمائی۔ اور اُسکے قول کو انکا خاص خیال ٹہرایا۔ باوجودیکہ وہ سبائی حکومت کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ ۱۵ سو برس قبل بتلا چکا تھا مگر آپ کو تو جلد سے جلد عرب المستعربہ (بنو اسماعیلؑ) کے حالات پر پہونچکر اپنے مدعائے تالیف کو آغاز کرنا منظور تھا۔ اور بنو اسماعیل ہی کے حالات و واقعات کو۔ آپ عرب قدیم اور عرب اوسط تمام قوم وقبائل کے احوال کو قلم دزنگار عرب کی اصلی تاریخ سمجھے ہیں۔ اس بنا پر آپ نے گلاذری کے بتلائے ہوئے زمانہ پر بھی اعتبار نہ کیا۔ چونکہ وہ اپکے مدعا کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے صرف ایک ہی شخص کے قول پر اعتماد کر۔ اور اپنی کتاب میں لکھدیا۔ کیا اسی نگاہ سرسری کا نام تحقیق ہے۔ اور یہی زود نویسی تنقید کامل کہی جائے گی؟

ہم مولوی شبلی صاحب کی اِس غلط فہمی کی اصلاح و تصحیح اُن کے شفیق محسن ڈاکٹر سر سید احمد صاحب کی اُس تحریر ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔ جو زمانۂ ملوک سبا کے متعلق خطبات احمدیہ میں درج ہے۔

اب چونکہ حمیر (ابن سبا جیسا کہ آگے بیان ہوتا ہے) یقطان سے چوتھی پشت میں تھا۔ اور ترح بھی فالغ سے چوتھی پشت میں تھا۔ اس لیے ہم اس نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں۔ کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے بہت دُور ہو گی یعنی ۲۱۲۶ ق م خطبہ احمدیہ لاہور ص ۷۔ شبلی صاحب مؤلّر کے قول کی بنا پر سات سو برس کا کل زمانہ حضرت عیسیٰؑ کے قبل بتلاتے ہیں۔ اور سر سید کی تحقیق میں۔ جس کو انہوں نے کتب مقدسہ توریت۔ یونانی اور رومی تالیفات قدیمہ سے مستنبط و محقق کیا ہے۔ دو ہزار برس سے بھی اوپر کا زمانہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں۔ اسکے کے دور (حکومت سبائی) کے بعد حمیر کا زمانہ ہے۔ حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اُسکو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ پھر اسکے نیچے یوں رقمطراز ہیں۔ قریباً ۱۱۵۰ ق م کے حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا"۔ ایک نشد دو شد۔ آپکی تحقیق میں سبا اور حمیر دو جداگانہ حکومتیں تھیں۔ اگر صرف ابو الفدا کی عربی یا اردو ترجمہ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی کو (باوجودیکہ اپنے مقدمۂ کتاب میں تاریخ ابو الفدا عربی اور اُسکے حاشیہ لاطینی ترجمہ کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے) ملاحظہ کیا گیا ہوتا۔ تو یہ مسئلہ اُسی وقت صاف ہو گیا ہوتا۔ اور پھر اس امر کے مان لینے میں کہ سبا کا بیٹا حمیر تھا۔ آپ کو کوئی کلام نہ رہتا۔

ابو الفدا کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

ثم ملک بعدہ ابنہ عبد شمس بن یشجب وسمی سبا وھو الذی بنا السد بارض مارب وبنی مدینۃ مارب وعرفت مدینۃ سبا وخلف سبا المذکور عدۃ اولادھم منھم حمیر وعمرو کھلان واشعر وغیرھم

یشجب ابن قحطان کے مرنے کے بعد اسکا بیٹا عبد شمس جسکا لقب سبا تھا بادشاہ ہوا۔ اور یہ وہی بادشاہ ہے۔ جس نے ارض مآرب میں سد تعمیر کرائی۔ اور شہر مآرب بسایا۔ اور شہر مآرب بھی اُسی کے نام سے شہر سبا مشہور ہوا۔ سبا مذکور کی متعدد اولادیں ہوئیں۔ جن میں

ولما مات سبا ملک الیمن بعدہ ابنہ حمیر ابن سبا بن یشجب ۔

حمیر۔ عمر۔ کہلان اور اشعر وغیرہ شامل ہیں۔ جب سبا مرگیا۔ تو اسکا بیٹا حمیر ابن سبا بادشاہ یمن قرار پایا۔

اب اس عبارت کو پڑھکر کوئی شخص سبائی اور حمیری سلطنتوں کو کیسے دو جداگانہ حکومتیں قائم کرے گا۔ اور آپکے اس فقرے کے۔ کہ حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ کیا معنی لگائے گا۔ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ سبا باپ تھا۔ اور حمیر بیٹا۔ یا بقول علمائے اثریات۔ سبا مورث خاندان تھا۔ اور حمیر اُسکی اولاد اعقاب۔ باپ یا مورث مرگیا۔ اولاد یا اُس کے ورثاء نے اُسی وقت یا اُسکے بعد حکومت آبائی پائی۔ تو ایسی حالت میں واقعہ کی اصلیت کو یوں تبدیل کرکے بتلانا کہ حکومت سبا پر حمیر نے قبضہ کرلیا۔ تاریخ کے صحیح اور اصلی واقعہ پر صریح غلطی اور سوء فہمی کا حاشیہ چڑھانا ہے۔

اگر ان حوالوں سے اِس سلسلہ شاہی میں آپ کا مابعد کے واقعات سے مدعا ہے۔ تو وہ بھی آپ کے قرارداد زمانہ اور مدت کے اعتبار سے بھی کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آپ لکھتے ہیں۔ کہ قریباً سنہ ۱۱۵ قبل مسیحؑ میں حمیر نے سبا کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ آپ نے شاید غلطی سے ابرہہ کی حکومت پر سیف بن یزن کا قبضہ کرلینا جو واقعہ اصحاب الفیل سے بھی پیچھے واقع ہوا ہے۔ تو مراد نہیں لیا ہے۔ مگر وہ تو سنہ ۵۵ء میں واقعہ ہوا ہے اور آپ سنہ ۱۱۵ ق م بتلاتے ہیں۔ غالباً آپ کا مطلب اُس انتقال حکومت اور تبدیل سلطنت سے ہوگا جو قبیلہ ازد کے لوگوں نے عارضی طور پر چند دنوں کے لیے حمیریوں سے لی تھی۔ جیسا کہ ابوالفدا نے لکھا ہے

ثم ملک بعدھا (بلقیس) عمھا ناشر النعم بن شرحیل ثم ملک بعدہ شمر یرعش بن ناشر النعم ثم ملک بعدہ ابنہ ابو مالک بن شمر ثم ملک بعدہ عمران ابن عامر الازدی ثم ملک اخو مزیقیا ثم ملک الاقرن ابن ابی مالک

(ابوالفدا)

ملکہ بلقیس کے بعد اُسکے چچازاد بھائی ناشر النعم ابن شرحبیل بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد شمر یرعش ناشر النعم کا بیٹا حاکم ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا ابو مالک ابن شمر تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ کی سلطنت میں عمران ابن عامر ازدی نے جو خاندان ازد سے تھا۔ یمن پر حملہ کیا اور حمیر سے حکومت لیلی۔ حمیر سے سلطنت بنی کہلان میں چلی آئی عمران کے بعد اُسکا بیٹا مزیقیا تخت نشین ہوا۔ اسکے زمانہ میں قرن ابن ابو مالک نے اپنے باپ کی سلطنت کا دعوےٰ کیا۔ مزیقیا سے لڑکر اُسکو شکست دی اور سلطنت چھین لی۔ اور اس طرح حکومت پھر سلسلہ حمیریہ میں چلی آئی۔ خطبات معہ ترجمہ ابوالفداء مطبوعہ لاہور ص ۸۰۔

اگر ان واقعات سے آپکا انقلاب سلطنت مجوزہ مراد ہے۔ تو بھی ان واقعات و انقلابات کا زمانہ سنہ ۹۰ ق م سے کسی حال میں کم ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ توراۃ کے روسے ملکہ بلقیس کا زمانہ سنہ ۱۰۰۵ ق م ثابت ہوچکا ہے اگر یہ بھی نہیں۔ اگر اس کے قبل الحارث الرائش قیس ابن صیفی ابن سبا الاصغر کے واقعات سے۔ جس نے اپنے

زمانہ حکومت میں یمن و حضرموت دونوں سلطنتوں کو ملا لیا ہے۔ آپ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں۔ تاہم آپکا خیال صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ شخص چھ پشت قبل ملکہ بلقیس سے تھا۔ چنانچہ ابو الفدا میں مرقوم ہے۔

ثم ملك بعده ابنه ذو القرنين الصعب بن الرائش ثم ملك بعده ابنه ذو المنار ابرهه ابن ذی القرنين ثم ملك بعده ابنه افريقش ابن ابرهه ثم ملك بعده ذو الاذعار عمر ابن ذو المنار ثم ملك بعده شرحبيل بن عمر بن غالب بن المنتان بن زيد بن يعفر السكسك بن وائل بن حمير۔

حارث الرائش جو سبا اصغر کے سلسلہ سے تھا۔ اور جو تبع اول کے نام سے ملقب ہے۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا صعب الملقب بہ ذو القرنین بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا۔ جسکا نام ابرہہ اور لقب ذو المنار ابن ذو القرنین تھا تخت نشیں ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا جسکا نام افریقش تھا حکمران ہوا۔ اُسکے بعد اُس کا بیٹا ذو الاذعار جسکا نام عمر ابن ذو المنار تھا بادشاہ ہوا عمر ذو العار کی سلطنت کے زمانہ میں شرحبیل ابن عمر ابن غالب ابن منتان ابن زید ابن یعفر ابن سکسک ابن وائل ابن حمیر نے اُسپر حملہ کیا۔ اور بے شمار خونریزیوں کے بعد عمر ذو الاذعار کو شکست دی۔ اور اُس کی سلطنت پر قابض ہو گیا شرحبیل کے بعد اُسکا بیٹا الہدہاد تخت نشین ہوا۔ اور اُسکے بعد اُس کی لڑکی بلقیس حکمران ہوئی۔ (ابو الفدا مع عبارت مندرجہ خطبات سرسید ۱۲)

اگر آپ نے الحارث والے واقعہ اجتماع الریاستین سے سبائی حکومت اور حمیری قبضہ مراد لیا ہے۔ تو باعتبار استداد ایام کے یہ واقعہ حضرت بلقیس سے چھ پشت قبل کا ثابت ہوتا ہے۔ جسکا زمانہ وقوع سنہ ۱۲۰ ق م سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر آپ کا سنہ ۱۱۵ ق م تبلانا کس زائچہ سے تخرج سمجھا جائے گا۔ اور کونسا واقعہ تاریخی کارنامہ عرب اور شاہ نامہ حمیر میں مراد لیا جائے گا۔

اسکو بھی جانے دیجئے۔ اگر آپ اس سے ذو الاذعار اور شرحبیل والا واقعہ سمجھے ہیں۔ تو ہمارے مندرجہ شجرہ حمیریہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ حقیقتاً یہ دونوں شاخیں ایک ہی اصل سے پیوستہ ہیں۔ شرحبیل کا سلسلہ بھی حمیر تک تمام ہوتا ہے۔ اور ذو الاذعار کا سلسلۂ نسب بھی حمیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اس لیئے ان دونوں خاندانوں کو دو جداگانہ اور علیحدہ خاندان سمجھنا حقیقت سے غفلت ہے۔ اس لیئے آپکا یہ کہنا۔ کہ حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اصلیت کے اعتبار سے قابل اعتماد ہے۔ اور نہ استداد زمانہ کے حساب سے لائق اعتبار۔ کیونکہ شرحبیل ملکہ بلقیس کا دادا تھا اس لیئے یہ واقعہ بھی سنہ ۱۱۰ ق م میں واقعہ ہوا۔ نہ سنہ ۱۱۵ ق م میں۔

سب سے آخر میں اگر مولوی شبلی صاحب سبائی حکومت پر حمیریوں کا قبضہ ہونے سے۔ ذو نواس صاحب الاخدود کی شکست اور ذی جدن حمیری کی فتح مراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ تو یہ بھی نہ واقعات کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اور نہ استداد ایام کے شمار سے۔ کیونکہ عموماً تحقیق سے یہ واقعہ سنہ ۵۲۵ء میں واقعہ ہوا تھا۔

یہ ۱۱۵ء ق م میں۔ تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ سلسلہ حمیری کا آخر علیہ سیف بن ذی یزن کے وقت ہوا تھا۔ مگر وہ قبائل حبشہ تک محدود تھا۔ اور وہ ظہور اسلام سے قریب تھا۔ اس لیئے اُسیر بھی ۱۱۵ء ق م میں وقوع پذیر ہونے کا گمان یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر آپ کا تحریر فرمانا۔ کہ سبائی حکومت پر حمیر کا قبضہ ہوگیا۔ اور پھر اُسکے وقوع کو ۱۱۵ء ق م میں تبلانا کسی طریقہ اور قرینہ سے تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر آپ اس عبارت تفریقی کے بجائے۔ مناسبت تخصیصی کے پیرایہ میں اس طرح تحریر فرماتے۔ کہ پھر سبا کی دوسری شاخ جو حمیر کے نام سے مشہور ہے۔ سبا کی جگہ حکومت یمن پر قابض ہوئی۔ تو صحیح بھی تھا۔ اور فی الواقع تھی۔ مگر تاہم ۱۱۵ء ق م کا تعین مدت غلط کا غلط ہی رہتا۔ اُس کی صحت و قرنیت کیلئے تاریخوں سے وہی زمانہ قائم کرنا ہوتا۔ جو اس کے وقوع پذیر ہونے کے لیئے صحیح طور پر قلم بند کیا گیا ہے۔

حمیر کی اولاد عرب کی مختلف حصوں میں اُنکی حکومت

مولوی شبلی صاحب کو تصحیح و ترمیم کے بعد ہم پھر اپنے سابق سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ عبد الشمس ملقب سبا الاکبر کے دس بیٹے تھے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ مذحج۔ کندہ۔ ازد۔ اشعر۔ حمیر۔ کہلان۔ لخم۔ جذام۔ عاملہ۔ اور غسان۔ انہیں سے مذحج۔ کندہ۔ ازد۔ اشعر۔ حمیر اور کہلان۔ اُسکے چھ بیٹوں نے تو علاقہ یمن میں سکونت اختیار کی۔ اور بقیہ چار بیٹے۔ لخم۔ جذام۔ عاملہ اور غسان ملک شام میں نکل گئے۔ اور وہیں آباد ہوئے۔ غسانی سلسلہ شاہی اس کے آخر بیٹے غسان ابن حمیر سے منسوب ہے۔ جنکا ذکر آئندہ اپنے مقام پر آئیگا۔

تاریخوں سے ثابت ہے۔ کہ بند عرم کے ٹوٹ جانے کے بعد یمن سے آٹھ بڑے قبیلے تباہ ہو کر نکل گئے۔ جن میں سے ایک قبیلہ نے دریائے فرات کے کنارے بمقام حیرہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ قبیلہ غسان بھی انہی ایام میں شام میں جاکر آباد ہوا۔ اسی طرح تین قبیلے اور جن کے سردار قبائل کے نام۔ بکر۔ مضر اور ربیعہ تھے ایسے ہی پریشان ہو کر عراق کی طرف نکل گئے۔ اور وہیں آباد ہوگئے۔ اور اُن کے نام سے تین علاقے۔ دیار بکر۔ دیار مضر۔ اور دیار ربیعہ آجتک یادگار ہیں۔ (ابو الفدا۔ طبری۔ اور ابن ہشام)

اس بیان سے معلوم ہوا۔ کہ بند عرم کو ٹوٹ جانے سے خاندان سبا یا حمیر کو متفرق مقامات اور دور دراز علاقہ جات میں جاجا کر آباد ہونے کی مجبوری پیش آئی۔ چنانچہ ایک مقام حیرہ میں۔ دوسرا علاقہ شام میں سکونت پذیر ہوا رفتہ رفتہ ان دونوں سبا الاصل اور حمیری النسل نے اپنے اپنے اطراف سکونت میں اتنی ترقی کی اور ایسی قوت پکڑی۔ کہ ان دونوں علاقوں پر اپنا پورا تسلط حاصل کر لیا۔ اور وہاں کی عنان حکومت اپنے قبضہ اختیار میں کرلی۔ اور مدت مدید تک علاقہ جات حیرہ اور شام میں بڑی نام و نمود سے سلطنت کرتے رہے۔

حمیری ملوک حیرہ۔

مورخ ابو الفدا کے حوالہ عبارت سے ہم ملوک حیرہ کا سلسلہ اور اُن کے حالات ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

اوّل من ملك على العرب بارض الحيرة مالك ابن فهم ثم ملك بعده اخوه عمرا بن فهم ثم ملك بعده ابن اخيه خذيمه ابن مالك بن فهم وكانت له اخت تسمى رقاش لما قتل خذيمه ملك بعده ابن اخته عمرو ابن عدى ابن نصر ابن ربيعه ثم مات وملك بعده ابنه امرء القيس وكان يقال له امرأ القيس البدء اى الاوّل - ثم ملك بعده امرء القيس ابنه عمرا بن امرء القيس ثم ملك بعده اوس بن قلام العمليقى ثم ملك اخر من العماليق ثم رجع الملك الى عمرو ابن عدى ابن نصر ابن ربيعة اللخميين المذكورين وملك منهم امرء القيس من ولد عمرا بن امرء القيس المذكور ويعرف هذا امرء القيس الثانى بالاعراف لانه اول عاقب بالنار ثم ملك بعده ابنه النعمان الاعور ابن امرء القيس ثم تزهد وخرج من الملك وملك بعده ابنه المنذر بن النعمان ثم ملك بعده ابنه الاسود بن المنذر (ابو الفدا)

ثم ملك بعده اخوه المنذر ابن المنذر ابن النعمان الاعور ثم ملك بعده علقمة الذميلى (ذوميل بطن من لخم) ثم ملك بعده امرء القيس بن النعمان بن امرء القيس المحرق ثم ملك بعده ابنه المنذر ابن امرء القيس

علاقہ حیرہ میں جس شخص نے سب سے پہلے حکمرانی کی، وہ مالک ابن فہم تھا۔ اُسکے بعد اُسکا بھائی عمر ابن فہم۔ اُسکے بعد اُسکا بھتیجا خذیمہ ابن مالک ابن فہم حکمراں ہوا۔ اُسکی ایک بہن تھی، رقاش نام۔ خذیمہ کے قتل ہو جانیکے بعد، اُسکا بھانجا عمر ابن عدی ابن نصر ابن ربیعہ حکمراں ہوا۔ جب وہ مرگیا، تو اُسکا بیٹا امرء القیس تخت نشین ہوا۔ اسکو امرء القیس البدء یعنی امرء القیس اول بھی کہتے ہیں۔ امرء القیس اول کے بعد اُسکا بیٹا عمر ابن امرء القیس بادشاہ ہوا۔ عمر ابن امرء القیس کے بعد اوس ابن قلام العلیقی بادشاہ ہوا۔ پھر آخر ملوک عمالیق تک پہنچے۔ اُسکے بعد سلطنت عمر ابن عدی ابن نصر ابن ربیعہ لخمیین مذکورین کی طرف عود کر آئی۔ اور اُن میں سے امرء القیس نے جو عمر ابن امرء القیس کی اولاد میں تھا، حکومت کی۔ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ یہ امرء القیس ثانی مشہور ہے۔ اور محرق اسکا لقب ہے۔ اور عقوبت بالنار کی ایجاد عرب میں اُسی کے وقت سے ہے۔ اسکے بعد اسکا بیٹا النعمان اعور ابن امرء القیس تھا۔ تخت نشین ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ تارک الدنیا ہو گیا۔ اور ترک شاہی کر کے ملک سے چلا گیا۔ اس کے بعد اُسکا بیٹا المنذر بن نعمان بادشاہ ہوا اُسکے بعد اُسکا بیٹا الاسود ابن منذر حکمراں ہوا۔ اُسکے بعد اُسکا بھائی منذر ابن منذر ابن نعمان الاعور بادشاہ ہوا۔ اُسکے بعد علقمۃ الذمیلی جو دونوں جانب سے بنی لخم تھا۔ بادشاہ ہوا اُسکے بعد امرء القیس ابن نعمان ابن امرء القیس المحرق بادشاہ ہوا۔ اسکے بعد اُسکا بیٹا المنذر ابن امرء القیس جس کا لقب ماء السماء تھا، بادشاہ ہوا۔ لیکن قباد کسریٰ نے منذر کو تخت سلطنت سے اُتار کر الحارث ابن عمر ابن حجر الکندی کو اس کی جگہ پر حکمراں مقرر کیا۔

ملقب بماء السّمآء وطرد کسری القباد المنذر المذکور عن ملك الحيرة وملك مرضعه الحرث ابن عمرو بن حجر الكندى ثم لا تمكن كسرىٰ نوشروان من قباد المذكور فى الملك وطرد الحارث واعاد المنذر بن ماء السمآء الى ملك الحيرة (ابو الفدا)

ثم ملك بعد المنذر عمرو مفرط الحجارة ثم ملك بعده ابنه ثم ملك بعده اخوة قابوس ثم ملك بعده اخوهما المنذر ثم ملك بعده ابنه النعمان بن منذر بن المنذر بن ماء السمآء وكنية ابو قابوس وهو الذى تنصر ثم انتقل الى اياس ابن قبيصه الطائى ثم ملك بعده زاويه بن باهان الحمدانى ثم عاد الملك الى اللخميئين فملك بعد زاويه المنذر ابن النعمان بن المنذر بن ماء السمآء سمية العرب المغرور واستمر مالكا الى الحيرة الى ان قدم لها خالد ابن الوليد واستولى على الحيرة۔

لیکن قباد کے بعد کسریٰ و نوشیرواں نے الحارث کو تخت حکومت پر نہ رہنے دیا۔ اور اُسکو ہٹا کر ملک المنذر ابن ماء السمار کو حوالہ کر دیا۔

المنذر کے بعد اُس کا بیٹا عمر الملقب بہ مفرط الحجارۃ تخت نشیں ہوگیا۔

اُس کے بعد اُسکا بھائی قابوس بادشاہ ہوا۔ قابوس کے بعد اُسکا بھائی منذر ابن منذر حکمران ہوا۔ اُسکے بعد اُس کا بیٹا نعمان ابن منذر ابن منذر ماء السمار تخت نشین ہوا اسکی کنیت ابو قابوس تھی۔ اور اُس نے مذہب نصاریٰ اختیار کیا۔ اس کے بعد سلطنت ایاس ابن قبیصۃ الطائی کی طرف منتقل ہوگئی۔ ایاس کے بعد زاویہ ابن باہان الحمدانی بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد وقت میں سلطنت پھر لخمیین کی طرف منتقل ہوگئی۔ اور زاویہ کے بعد منذر ابن نعمان ابن منذر ابن ماء السمار تخت نشین ہوا۔ اہل عرب نے اس شخص کا نام مغرور رکھا تھا۔ اور یہ شخص اُسوقت تک موجود تھا۔ کہ جس وقت کے خالد ابن ولید نے اسلام کے لیئے اس سے ملک خالی کرالیا۔

اب ہم اپنے اس سلسلہ شاہی کے اجمالی بیان کی جس کو ہم نے تاریخ ابو الفدا کی عبارت سے اوپر نقل کیا ہے خطبات احمدیہ سے۔ کامل تفصیل حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں۔ جس سے بیان مندرجہ بالا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

عرب العاربہ میں خاندان قحطان نے بڑی طاقت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اور صوبہ حیرہ میں ایک عظیم الشان سلطنت قایم کی تھی۔ اسی خاندان کا پہلا بادشاہ مالک ابن فہم تھا۔ اُسکے بعد اُس کے بھائی عمر کو تخت ملا۔ اُسکے بعد خذیمہ بن مالک تخت پر بیٹھا۔ یہ جری مگر طامع بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بہت قوی اور مستحکم کرلیا تھا۔ ایک طرف تو دریائے فرات اُس کی مملکت کی حد تھی۔ دوسری جانب وہ شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شام تک سلطنت بڑھانے میں اُسکو عمالیق سے لڑنا پڑتا۔ اُس نے ایک سخت اور خونریز لڑائی کے بعد اُن کو شکست دی۔ اس بادشاہ کی بہن نے جسکا نام رقاش تھا۔ ایک شخص مسمی عدی سے جو بنی لخم میں تھا شادی کرلی۔

خذیمہ کے بعد اُسکا بھانجا عمر ابن عدی تخت نشین ہوا۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا امر القیس اور اُسکے بعد اُسکا بیٹا عمر بادشاہ ہوا۔ مگر اس کو اوس بن قلام علیقی نے تخت سے اُتار دیا۔ اُس کے بعد ایک یا دو بادشاہ اس خاندان کے حکمران ہوئے۔ جن کے نام معلوم نہیں۔ لیکن اسقدر محقق ہے۔ کہ امر القیس ثانی ابن عمر نے بہت جلد اپنے بھائی کی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لے لیا۔ یہ اوّل شخص تھا جس نے انسانوں کو زندہ جلا دینے کی وحشیانہ رسم جاری کی۔ جس کے سبب سے اُس نے محرق کا لقب حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد نعمان جانشین ہوا۔ مگر دُنیا کے جھگڑوں سے کبیدہ خاطر ہو کر تیس برس سلطنت کرکے ترک شاہی کی۔ اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا اسود تخت نشین ہوا۔ جسکو ملوک غسّان سے چند لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اُس کے بعد اُسکے بھائی المنذر الثانی کو تخت و تاج ملا۔ اُس کے بعد علقمہ ذمیلی اور اُس کے بعد امر القیس ثالث ابن نعمان نے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس کے بعد المنذر الثالث ملقب بہ ماء السماء جانشین ہوا۔ مگر اس کو کسریٰ قباد نے سلطنت سے خارج کرکے الحارث کو جو قبیلہ کندہ سے تھا۔ اور جس نے ایران کے بادشاہ کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ حاکم مقرر کیا۔ جب کسریٰ نوشیرواں تخت پر بیٹھا۔ تو اُس نے الحارث کو حکومت سے علیحدہ کر دیا۔ اور المنذر الثالث کو پھر حکومت دیدی۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا قابوس اور اُس کے بعد اُسکا بیٹا المنذر الرابع اور اُس کے بعد اُسکا بیٹا نعمان ابو قابوس تخت پر بیٹھا۔ اسی نعمان نے مذہب عیسائی اختیار کر لیا تھا۔ اور خسرو پرویز کے زمانے میں ایک مشہور لڑائی میں جو ایرانیوں کے ساتھ ہوئی تھی مارا گیا۔ اس کے بعد ایاس ابن قبیصۃ الطائی اور اُس کے بعد زاویہ اور اُس کے بعد المنذر الخامس بن نعمان بن قابوس بادشاہ ہوا۔ اسی بادشاہ کو خالد ابن ولید سردار لشکر اسلام نے (خلافت اوّل کے عہد میں) شکست دیکر سلطنت کو چھین لیا خطبات از ص ۸۴-۸۶۔

جس زمانہ میں یہ بادشاہ حکمران ہوئے۔ اُسکا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا۔ اگر غیر ممکن نہیں۔ تو مشکل بیشک ہے۔ مگر آخر بادشاہوں میں سے دو بادشاہوں کا زمانہ ٹھیک ٹھیک بدرجہ یقین معلوم ہے۔ اور اگر نسلوں کے ہونیکے معمولی قاعدے پر غور کیا جائے۔ تو بعض اور بادشاہوں کے عہد سلطنت کے زمانہ بھی کافی طور سے تحقیق ہو سکتے ہیں۔ عمر ابن المنذر ماء السماء کی حکومت کے آٹھویں سال میں جناب رسولؐ خدا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نبی آخر الزمان پیدا ہوئے۔ اس لیے یہ بادشاہ ۵۶۲ء میں تخت نشین ہوا ہوگا۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر پہلے پہل وحی ایاس کی حکومت کے چھٹے مہینے میں نازل ہوئی تھی۔ اس لیے ایاس ۶۱۰ء میں تخت نشین ہوا ہوگا۔ عمر کی تخت نشینی سے پہلے اُنیس [19] بادشاہ ہو چکے تھے۔ اور اُن کی سلطنتوں کے مجموعہ کا بلحاظ معقول پانچسو برس [500] خیال کیا جا سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ان میں کا پہلا بادشاہ مالک ابن فہم

ولادت مسیح علیہ السلام کے قریب قریب تخت پر بیٹھا ہوگا۔ خطبات ص ۸۷، لاہور

حمیری ملوک غسان۔ سلاطین شام۔

آل غسان کے شاہی سلسلہ کی تفصیل میں مورخ ابو الفدا تحریر کرتے ہیں۔

اول من ملك غسان جفنه بن عمرو بن ثعلبة بن عمرو بن مزيقيا ثم هلك وملك بعده ابنه عمرو بن جفنه ثم ملك بعده ابنه ثعلبه ابن عمرو ثم ملك ابنه بعده الحارث ابن ثعلبه ثم ملك ابنه جبله ابن الحارث ثم ملك ابنه الحرث ثم ملك بعده ابنه المنذر الاكبر ثم هلك المنذر الاكبر المذكور وملك بعده اخوه النعمان ابن الحرث ثم ملك بعده اخوه جبله بن الحارث ثم ملك بعده اخوه عمرو ابن الحارث ثم ملك جفنه الاصغر ثم ملك بعده اخوه النعمان الاصغر ثم ملك نعمان بن عمرو ابن المنذر ثم ملك بعده نعمان المذكور ابنه جبله النعمان ثم ملك بعد النعمان بن الايهم ثم ملك اخوه الحرث ابن الايهم ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث ثم ملك بعده ابنه المنذر ابن النعمان ثم ملك اخوه عمرو ابن النعمان ثم ملك اخوهما حجر ابن النعمان ثم ملك ابنه الحارث ابن حجر ثم ملك ابنه جبله ابن الحارث ابن جبله ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث وكنيته ابو كرب ولقبه قطام ثم ملك بعده الايهم ابن جبله ثم ملك بعده اخوه المنذر ابن جبله ثم ملك اخوهما سراجيل بن جبله ثم ملك اخوهم عمرو ابن جبله ثم ملك بعده ابن اخيه جبله ابن الحرث ابن جبله ثم ملك

سب سے پہلے جس شخص نے سلسلہ غسان سے حکومت کی، وہ جفنہ ابن عمرو ابن ثعلبہ ابن عمرو ابن مزیقیا تھا۔ اس کے بعد عمرو ابن جفنہ بادشاہ ہوا۔ جفنہ کے مرجانے کے بعد اسکا بیٹا عمرو ابن جفنہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اسکا بیٹا ثعلبہ ابن عمرو۔ اس کے بعد اس کا بیٹا الحارث ابن ثعلبہ اس کے بعد اس کا بیٹا جبلہ ابن الحارث اس کے بعد اسکا بیٹا الحرث اسکے بعد اسکا بیٹا المنذر الاکبر بادشاہ ہوا۔ المنذر الاکبر کے بعد اس کا بھائی نعمان ابن الحرث اس کے بعد اسکا بھائی جبلہ ابن الحارث اس کے بعد اس کا بھائی عمرو ابن الحارث اسکے بعد جفنہ الاصغر تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اسکا بھائی نعمان الاصغر۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابن عمرو ابن منذر۔ نعمان کے بعد جبلہ ابن نعمان بادشاہ ہوا جبلہ ابن نعمان کے بعد نعمان ابن الایہم تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد نعمان ابن الحرث بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اسکا بیٹا منذر ابن النعمان تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اسکا بھائی عمرو ابن نعمان اس کے بعد اسکا بھائی نعمان ابن الحرث جس کی کنیت ابوکرب تھی۔ تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس بادشاہ کا لقب قطام تھا اس کے مرجانے کے بعد ایہم کا بھائی منذر ابن جبلہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمرو ابن جبلہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اسکا بھتیجا جبلہ ابن الحرث ابن جبلہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد جبلہ ابن الایہم ابن جبلہ آخر بادشاہ آل غسان ہوا۔ اور یہ وہی شخص ہے جو خلافت عمر کے زمانہ میں اسلام لایا۔ پھر ملک روم میں

بعدہٗ جبلہ ابن الایہم بن جبلہ وھو اخر الملوک الغسان و ھو الذی اسلم فی خلافۃ عمرؓ ثم عاد الی الروم وتنصر۔ (ابو الفدا)

بھاگ گیا۔ اور نصرانی ہو گیا۔

(ابو الفدا)

اس کے آگے مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

فلما ملک حجر سدد امورھم وساسھم احسن سیاسۃ وانتزع من اللخمیین ماکان بایدیھم من ارض بکر ابن وائل۔

وملک بعد الحجر المذکور ابنہ عمرو ابن حجر ثم ملک بعدہ ابنہ الحرث ابن عمرو۔

جب حجر بادشاہ ہوا۔ تو اُس نے قوم کا نہایت خوب انتظام کیا۔ اور اُن میں نہایت خوبی سے حکمرانی کی۔ اور شاہان لخمیین کے قبضہ میں علاقہ بکر ابن وائل کے جس قدر حصہ چلا گیا تھا وہ تمام وکمال اُن سے خالی کرا لیا۔

حجر کے بعد اُسکا بیٹا عمرو اور اُس کے بعد حرث ابن عمرو یکے بادیگرے بادشاہ ہوئے۔

ملوک حجاز کا ضمنی تذکرہ (کندہ)

حرث ابن عمرو کے بعد شاہی سلسلہ میں مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں۔

وملک اخوہ (ای اخا یعرب) جرھم الحجاز ثم ملک بعد جرھم ابنہ عبد یالیل بن جرھم ثم ملک ابنہ جرشم ابن عبد یالیل ثم ابنہ عبد المدان ابن جرشم ثم ابنہ تعلبہ ابن عبد المدان ثم ابنہ عبد المسیح بن تعلبہ ثم ابنہ مضاض ابن عبد المسیح ثم ابنہ عمرو ابن مضاض ثم اخوہ الحرث بن مضاض ثم عمرو ابن الحارث ثم اخوہ بشر ابن الحارث ثم مضاض ابن عمرو ابن مضاض۔

اُس کے (حرث ابن عمرو) بعد اُس کا بھائی (یعنی یعرب) جرہم الحجاز بادشاہ ہوا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا عبد یالیل حکمران ہوا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا جرشم بادشاہ ہوا۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا عبد المدان اُسکے بعد اُسکا بیٹا تعلبہ ابن عبد المدان حکمران ہوا۔ اُسکے بعد عبد المسیح ابن تعلبہ اُس کے بعد مضاض ابن عبد المسیح تخت نشین ہوا اُس کے بعد عمرو ابن مضاض۔ اُسکے بعد اُسکا بھائی حرث ابن مضاض۔ اُسکے بعد عمرو ابن الحارث۔ اُسکے بعد اُسکا بھائی بشر ابن الحارث تخت نشین ہوا۔ اُسکے بعد مضاض ابن عمرو ابن مضاض حکمراں ہوا۔ (ابو الفدا)

مورخ ابو الفدا اسی کے متعلق یہ یادداشت بھی لکھتے ہیں۔ من ملوک العرب زھیر ابن خباب بن حبل وکان زھیر المذکور قد اجتمع با برھۃ الاشرم صاحب الفیل ملوک عرب میں سے ایک زہیر ابن خباب بن حبل نامی تھا۔ اور یہ زہیر ابرہہ الاشرم کے ساتھ واقعہ فیل میں شریک تھا۔

مرقومہ بالا آل غسان کی اجمالی فہرست کی تفصیلی حالت ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے۔

عرب العاربہ نے ایک اور سلطنت صوبہ غسان میں قایم کی تھی۔ اس سلطنت کے حکمراں عرب الشام کے نام سے مشہور تھے۔ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے۔ تو یہ حاکم قیصر روم کی طرف سے بطور عمال تھے۔ مگر لقب شاہی کے اختیار کرنے کی وجہ سے سلاطین عرب کے ذیل میں بیان ہوتے ہیں۔ چونکہ بعض اُمور ان لوگوں سے ایسے متعلق ہیں۔ جن سے ہم کو بعض اُمور کی تحقیقات اور مباحث میں آسانی ہو گی۔ اس لیئے اُن کی سلطنتوں کا ایک مختصر حال اس مقام پر لکھدینا ضروری ہے۔

اس سلطنت کی بنا چار سو برس قبل ظہور اسلام کے ہوئی۔ اور یہ زمانہ تین سو صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ جفنہ ابن عمر پہلا شخص ہے۔ جس نے اس خاندان میں لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ شخص ازد (یکے از فرع حمیرا) کی اولاد میں تھا۔ جو خاندان کہلان سے تھا۔ وہ عرب جو ان سے پہلے شام میں رہتے تھے۔ ضجاعمہ کہلاتے تھے۔ ضجاعمہ نے مدت دراز تک مستعدی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا۔ مگر بالآخر شکست اُٹھائی۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اسی طرح ایک عرصہ تک اختیارات شاہی یکے بعد دیگرے۔ الحارث جبلہ الحرث المنذر الاکبر۔ کے ہاتھ میں رہے۔ اس اخیر بادشاہ کے بعد اُسکا بھائی نعمان بادشاہ ہوا۔ اُسکا بھائی جبلہ پر اُسکا بھائی ایہم۔ اُس کے بعد اُسکا بھائی عمر تخت نشین ہوا۔ اُسکے بعد جفنہ الاصغر ابن المنذر الاکبر کی باری آئی اُسکے بعد نعمان الاصغر اور اُسکے بعد اُسکا بھتیجا نعمان ثالث ابن عمر بادشاہ ہوا۔ اُس کے بعد جبلہ ابن نعمان کے ہاتھ سلطنت لگی۔ یہ بادشاہ خاندان حیرہ کے بادشاہ مارالسماء کا ہمعصر تھا۔ وہ اس سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔ اُس کے بعد نعمان الرابع ابن الایہم اور اُسکے بعد الحرث الثانی اور اُسکے بعد اُسکا بیٹا نعمان الخامس اور اُسکے بعد اُسکا بیٹا المنذر تخت نشین ہوا۔ اُسکے بعد عمر برادر المنذر اور حجر برادر عمر یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے اُسکے بعد حارث ابن حجر اور جبلہ ابن الحارث اور الحارث ابن جبلہ باری باری سے حکمران ہوئے۔ پھر نعمان ابو کرب ابن الحارث اور ایہم عم نعمان تخت پر بیٹھے۔ اور ایہم کے بعد اُسکے تین بھائی۔ المنذر۔ شراحیل۔ اور عمر یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عمر کے بعد اُسکے بھائی جبلہ ابن الایہم بن جبلہ کو سلطنت ملی۔ یہ بادشاہ حضرت عمرؓ کی خلافت تک زندہ تھا پہلے مسلمان ہوا۔ پھر روم کو بھاگ کر عیسائی ہو گیا۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ تقریباً ۶۴۲ء میں ہو گیا۔

ملوک کندہ۔ عرب العاربہ کی ایک اور چھوٹی سی اور چند روزہ سلطنت کی بنیاد آل کندہ نے جو خاندان کہلان سے تھا۔ قایم کی تھی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ حجر ابن عمر ہوا۔ جس نے ملک حیرہ کے ایک حصہ کو دبا کر ایک نئی سلطنت حاصل کر لی۔ اُس کے بعد اُسکا بیٹا عمر اُسکے بعد اُس کا الحرث تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے کسریٰ قباد کا مذہب اختیار کر کے اُس کی اعانت سے سلطنت حیرہ کو دبا لیا تھا۔ مگر جب نوشیروان

نے اُس سے المنذر کو سلطنت دلوادی۔ تب الحارث دیار کلیب کو چلا گیا۔ مگر اُس کے بعد اُسکے بیٹے چندروز تک چند مقامات پر حکومت کرتے رہے۔ جو بنی اسد پر حکمران تھے۔ سراجیل بکر ابن وائل پر معدی کرب قیس عیلان پر سلمہ تغلب پر اور نمر پر حاکم تھا۔ حجر کے بعد جو مارا گیا تھا۔ اُس کے بیٹے امرؤالقیس نے از سرنو بنی اسد کو مطیع بنا لیا۔ یہ امرؤالقیس وہی بہت بڑا مشہور عرب کا شاعر ہے۔ جب منذر ماءالسماء از سرنو تخت حکومت پر بیٹھا۔ تو امرؤالقیس اُسکے خوف سے بھاگا۔ اور کہیں روپوش ہوگیا۔ ان سب بادشاہوں نے پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں حکومت کی تھی۔

ملوک حجاز۔ ایک اور سلطنت حجاز میں قایم ہوئی تھی۔ جس زمانے میں یمن اور حیرہ کی سلطنتیں اندرونی جھگڑوں سے ضعیف ہوگئی تھیں۔ اُسی زمانہ میں اولاد یعرب یا جرہم نے ایک نئی اور خود مختار سلطنت حجاز میں قایم کی تھی۔ اس سلطنت کا اول بادشاہ بقول ابوالفدا جرہم تھا۔ جس کا بھائی یعرب یمن میں حکمرانی کرتا تھا۔ ابوالفدا نے مندرجہ ذیل نام گنوائے ہیں۔ یالیل۔ جرہم ابن یالیل۔ عبدالمدان ابن جرہم ثعلبہ ابن عبدالمدان۔ عبدالمسیح ابن ثعلبہ۔ مضاض ابن عبدالمسیح۔ عمر ابن مضاض۔ الحرث برادر مضاض عمر ابن الحرث۔ مضاض ابن عمر ابن مضاض۔ اگر ابوالفدا کے نزدیک یہ بادشاہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام سے پیشتر گذرے ہیں۔ یا اُن کے ہم عصر گذرے ہیں۔ کیونکہ عبدالمسیح کے نام سے بلاریب ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ عیسائی تھا۔ اور اس لیے ممکن نہیں ہے۔ کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ سے پیشتر گذرے ہوں یا اُن کے ہمعصر ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یہ سلطنتیں اُسوقت قایم ہوئیں۔ جب یمن۔ حیرہ۔ اور کندہ کی سلطنتیں زوال کی حالت میں پہونچ گئی تھیں۔ اور اس بنا پر ہمکو یقین ہے۔ کہ ان کا زمانہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں تھا یہ بھی واضح رہے۔ کہ عمر ابن لاحی ۲۰۶ء کے آخر میں اس سلطنت پر حکمران تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے۔ کہ اسی شخص نے بت پرستی کو حجاز عرب میں رواج دیا۔ اور کعبہ میں تین بت ہول (ہبل) کعبہ کی چھت پر اور اساف و نائلہ دو اور مقاموں (صفا و مروہ) پر نصب کردیے۔

مثل دیگر عرب العاربہ کے جو حجاز میں متوطن ہوئے سادر قریش کے بادشاہ ہوئے۔ زہیر ابن حباب نے بھی لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ بات اُسوقت کی ہے۔ جبکہ ابرہۃ الاشرم نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ زہیر بھی ابرہہ اشرم کے ساتھ اُس مہم میں شریک تھا۔

اب ہم اپنے تالیفی دستور العمل کے مطابق عرب العاربہ کے تمام حالات و واقعات بیان کرکے سائن کے انساب و اعقاب کا شجرہ قلم بند کرتے ہیں۔ مگر یہ شجرہ صرف اُنہی لوگوں کا ہے۔ جنکا حال ہم نے اس کتاب میں بیان

کیا ہے۔ اِس شجرہ سے اُن مطالب کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ جو اوپر بیان ہوئے ہیں تا کہ عرب العاربہ جنکا ہم نے مفصل احوال، اوپر بیان کیا ہے۔ بنی جرہم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مگر وقتاً فوقتاً اپنے مورثوں کے متعدد قبیلوں میں منقسم ہوگئے ہیں۔ ان قبیلوں سے جو زیادہ مشہور اور صاحب نام ہیں۔ اور جن کا ذکر اکثر کتابوں میں آیا ہے۔ ہم ذیل میں اُنہی کو لکھتے ہیں۔ ان قبیلوں کی تقسیم قائم کرنے میں تاریخ ابوالفدا اور معارف ابن قتیبہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قبائل مشہورۂ عرب العاربہ

(۱) یعرب یا جرہم سے۔ بنو جرہم
(۲) عبد الشمس بن یشجب سے۔ بنو سبا۔
(۳) حمیر ابن سبا سے بنو حمیر
(۴) کہلان ابن سبا سے بنو کہلان
(۵) اشعر ابن سبا سے۔ اشعری
(۶) انمار ابن سبا سے۔ بنو انمار
(۷) عاملہ ابن سبا سے عاملی
(۸) عدی ابن انمار ابن سبا سے بنو عدی
(۹) لخم۔ ابن عدی سے۔ لخمی
(۱۰) جذام ابن عدی سے بنو جذام
(۱۱) عدس بن لخم سے۔ بنو عدس
(۱۲) غنم بن لخم سے۔ بنو غنم۔
(۱۳) بنو الدار بن ہانی بن لخم سے داری
(۱۴) غطفان ابن حیرام ابن جذام سے بنو غطفان

قبائل ذیل بنو غطفان کی نسل میں ہیں

(۱۵) بنو فضلہ (۱۶) بنو احمف (۱۷) بنو الضبیب (۱۸) بنو اہدالہ (۱۹) بنو انفاثہ (۲۰) بنو الضلیع (۲۱) بنو اعائرہ (۲۲) بنو شیرہ (۲۳) بنو الخضرہ (۲۴) بنو عبد اللہ (۲۵) بنو سلیم (۲۶) بنو بجالہ (۲۷) بنو غنم (۲۸) بنو القالہ (۲۹) بنو سعد (۳۰) بنو وائل۔

قبائل ذیل بنو سعد کی نسل میں ہیں

(۳۱) بنو عوف (۳۲) بنو اہیرہ (۳۳) بنو اصیحہ (۳۴) بنو الاحنس (۳۵) بنو حی (۳۶) حشمی (۳۷) بنو حطمہ (۳۸)

قبائل ذیل بنو انمار کی نسل میں ہیں

(۳۹) خثعمی (۴۰) بجیلی (۴۱) قسری (۴۲) بنواحمس (۴۳) دھمانی (۴۴) یحصبی (۴۵) سلفی
(۴۶) الہمی (۴۷) آل ذی رعین۔

قبائل ذیل قضاعہ کی نسل میں ہیں

(۴۸) بنوکلیب (۴۹) عدی ابن جناب سے بنوعدی (۵۰) بنوعلیم (۵۱) بنوالعبید (۵۲)
بنورفیدہ (۵۳) بنومصر (۵۴) بنوالقین (۵۵) بنوبلیع (۵۶) بنوتنوخ (۵۷) بنوجرم
(۵۸) راسبی (۵۹) بنوبہرام (۶۰) بنوالی (۶۱) بنومہرہ (۶۲) بنوعذرہ (۶۳) بنوسعدہ
(۶۴) بنوہذیم (۶۵) عبدجشی (۶۶) خسنی (۶۷) سلامانی (۶۸) بنوجہینہ (۶۹) بنوسعد
(۷۰) التابعہ

قبائل ذیل تابعہ کی نسل میں ہیں

(۷۱) ذوقلاع (۷۲) ذونواس (۷۳) ذواصبح (۷۴) ذوجدن (۷۵) ذورائش۔
(۷۶) ذویزن (۷۷) ذوجرش (۷۸) بنوشحول (۷۹) بنووائل (۸۰) بنوسکسک (۸۱)
بنوعوف (۸۲) بنوفاران (۸۳) طائی (۸۴) غوثی۔

قبائل ذیل طائی کی نسل میں ہیں

(۸۵) بنوابنہان (۸۶) بنوثعل (۸۷) بنوالبحتر (۸۸) حاتمی (۸۹) بنوتیم (۹۰) توزی
(۹۱) کندی (۹۲) سکونی (۹۳) اوسلی (۹۴) ہمدانی (۹۵) سبیعی (۹۶) وداعہ (۹۷)
مذحج (۹۸) مرادی (۹۹) سعدی (۱۰۰) بنواخالد (۱۰۱) عنسی (۱۰۲) مجعفی (۱۰۳) جنبی
(۱۰۴) حکمی (۱۰۵) عائذی (۱۰۶) گلی (۱۰۷) حریمی (۱۰۸) زبیدی (۱۰۹) جدیلی (۱۱۰) النخعی
(۱۱۱) نخعی (۱۱۲) بنوالنار (۱۱۳) خولانی (۱۱۴) بنوالحماس (۱۱۵) بنوقتبان (۱۱۶) ازدی
(۱۱۷) مازنی یاغسانی (۱۱۸) دوسی (۱۱۹) ہنوئی (۱۲۰) جفنی (۱۲۱) آل عنقاء (۱۲۲) آل محرق
(۱۲۳) جبلی۔ (۱۲۴) سلامانی (۱۲۵) دوس عدنی (۱۲۶) جذیمی (۱۲۷) جہاضمی (۱۲۸)
سلیمی (۱۲۹) بنوابناتہ (۱۳۰) یعینی (۱۳۱) بنویحمد (۱۳۲)

قبائل ذیل ازد کی نسل میں ہیں

(۱۳۳) الغطریف (۱۳۴) بنو یشکر (۱۳۵) بنو الجدرہ (۱۳۶) بنو لہب (۱۳۷) غامدی۔

قبائل ذیل عبد اللہ ازد کی نسل میں ہیں

(۱۳۸) قبائل (۱۳۹) بنو عیک (۱۴۰) بنو مارق (۱۴۱) بنو عوف (۱۴۲) ابن طاحیہ (۱۴۳) بنو ہداد (۱۴۴) خزاعی (۱۴۵) قمیری (۱۴۶) بنو جیل (۱۴۷) بنو المصطلق (۱۴۸) بنو الکعب (۱۴۹) بنو الملیح (۱۵۰) بنو عدی (۱۵۱) بنو سعد (۱۵۲) اسلمی (۱۵۳) بنو بیاضہ (۱۵۴) خشیمی (۱۵۵) خزرجی۔

قبائل ذیل خزرج کی نسل میں ہیں

(۱۵۶) خشمی (۱۵۷) بنو زید (۱۵۸) اسلمی (۱۵۹) بنو بیاضہ (۱۶۰) بنو سالم (۱۶۱) بنو الجیلی (۱۶۲) القراظل (۱۶۳) بنو النجار (۱۶۴) بنو ساعدہ (۱۶۵) یہی قبائل انصار ہیں۔

قبائل ذیل اوس کی نسل میں ہیں

(۱۶۶) اشہلی (۱۶۷) بنو ظفر (۱۶۸) بنو الحارثہ (۱۶۹) اہل قبا (۱۷۰) جحجی (۱۷۱) اجوارہ (۱۷۲) بنو واقف (۱۷۳) اسلمی (۱۷۴) بنو حطمہ۔ یہی قبائل انصار مدینہ ہیں۔

عرب المستعربہ
یا
عرب مُتوطنہ

عرب المستعربہ کا سلسلہ نسب تارح (تارخ) ابن ناحور ابن ساروغ ابن راعوان ابن فالغ ابن عبیر ابن شالخ ابن ارفخشد ابن سام ابن نوح علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔ اس لیے یہ خاندان بھی سلسلہ عرب العاربہ سے عبیر ابن شالخ پر پہونچکر ملجاتا ہے۔ اسی طرح عرب البائدہ کے شجرہ نسب سے ارفخشد اور عیلان پسران

شام ابن نوح پر پہنچکر ایک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شام کے دو بیٹے ارفخشد اور عیلان۔ ارفخشد سے عرب العاربہ کا سلسلہ قایم ہوتا ہے۔ اور عیلان سے عرب البائدہ کا۔ اس بنا پر ہر شخص صحیح طور سے سمجھ جائے گا۔ کہ سلسلۂ نسب میں عرب المستعربہ بمقابلہ عرب البائدہ کے عرب العاربہ سے زیادہ قریب ہیں۔

ترح (تارخ) کی اولاد جو عرب میں آباد ہوئی۔ وہ پانچ متفرق شاخوں اور مقاموں میں منقسم ہوئی۔ اُن میں سے ہر ایک تفصیل ذیل میں مندرج ہے۔

(۱) اسماعیلی۔ حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام بن ترح (تارخ) کی اولاد (توریت۔ سفر تکوین باب ۱۱۔ درس ۲۸ باب ۱۶ درس ۱۵)

(۲) ابراہیمی یا بنی قطورا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بن ترح کی اولاد۔ جو اُن کی تیسری بی بی قطورہ کے بطن سے تھی۔ (سفر تکوین باب ۱۱۔ درس ۲۸۔ وباب ۲۵ درس ۱)

(۳) ادومی[۱] جسے بنو عیسو بھی کہتے ہیں۔ وہ اَدوم ابن حضرت اسحاق ابن حضرت ابراہیم علیہما السلام ابن ترح کی اولاد سے تھے۔ (سفر تکوین باب ۱ درس ۲۸ وباب ۲۱ درس ۳ وباب ۲۵ درس ۲۵)

ادوم[۱] یا عیسو ابن حضرت اسحاقؑ۔ فاضل معاصر صاحب ارض القرآن عیسو کے حالات میں رقمطراز ہیں۔

حضرت یعقوبؑ اور عیسو دونوں سگے بھائی تھے۔ اور حضرت اسحاق[۲] کے بیٹے تھے۔ عیسو گو فرزند اول تھے۔ لیکن پہلوٹے ہونے کی برکت حضرت یعقوبؑ نے بلطائف الحیل حاصل[۳] کی عیسو روٹھ کر اپنے عم محترم حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس[۴] چلے گئے اور اُنکی صاحبزادی سے جنکا نام باسمہ[۵] یا محلات[۶] تھا۔ شادی کرلی پھر اور بھی شادیاں کیں۔ جن سے متعدد اولادیں اور اولادوں کی اولادیں (جن میں عمالق اور عوض مشہور ہیں) پیدا ہوئیں۔ اور ان سب کو لیکر کوہ سعیر[۷] (سراۃ) میں اپنا مسکن بنایا۔ جو ملک شام سے لے کر انتہائے یمن تک طولاً وسیع ہے۔ عیسو کا نام ادوم (سرخ) تھا۔ اسی لیے اس خاندان اور ملک کا نام اَدوم پڑ گیا جدید تحقیق جو یقینی نہیں ہے۔ یہ ہے کہ ادوم کا نام ملک کی زمین کے سرخ ہونے کی وجہ سے رکھا گیا ہے[۸]۔ ارض القرآن ج ۲ ص ۳۲۔

[۱] تکوین ۲۵۔ [۲] تکوین ۲۷۔ [۳] تکوین ۲۸۔ ۹ [۴] تکوین ۳۶۔ ۳ [۵] تکوین ۲۸۔ ۹ [۶] تکوین ۳۶۔ ۹ [۷] ۳۶۔ ۹ [۸] انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا طبع یازدہم جلد ۱۴ ص ۲۹۰۔

کس حیلہ سے اسحاق نے عیسو سے پہلوٹے ہونیکی عظمت حاصل کی۔ توراۃ میں اسکے متعلق قصہ قلمبند ہے۔ یعقوب نے لپسی پکائی۔ اور عیسو جنگل سے آیا۔ اور وہ ماندہ ہو گیا تھا۔ عیسو نے یعقوب سے کہا۔ کہ اس لال لال میں سے کچھ مجھے کھانے کو دے۔ کیونکہ میں ماندہ ہو گیا ہوں۔ اس لیئے اسکا نام ادوم ہوا۔ تب یعقوبؑ نے کہا۔ کہ آج ہی اپنے پہلوٹے ہونیکا حق میرے ہاتھ بیچ۔ عیسو نے کہا کہ دیکھ میں تو مر رہا ہوں۔ سو پہلوٹا میرا ہونا کس کام آئے گا۔ تب یعقوب نے کہا کہ آج

(۴) ناحوری یا بنی ناحور۔ اولاد ناحور برادر حضرت ابراہیم علیہ السلام ابن تارخ (ترح) سفر تکوین باب ۲۲ درس ۲۰ و ۲۹
(۵) ہارانی یا بنی ہاران یعنی موآب وعمان بن لوط بن ہاران بن ترح کی اولاد۔ اس قوم کے لوگ کبھی موآبی کبھی یوآبی اور کبھی عمانی کہے جاتے تھے۔ مگر ہارانی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ یہ دونوں متفرق شاخیں اپنے اصل ہاران پر جاکر جو ان دونوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ ایک ہو جاتی ہیں۔ سفر تکوین باب ۱۱ درس ۲۸-۲۹ و باب ۱۹ درس ۳۰ و ۲۹۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ: سو آج مجھ پاس قسم کھا۔ اس نے اُس پاس قسم کھائی۔ اور اُس نے اپنے پہلوٹے ہونے کا حق یعقوبؑ کے ہاتھ بیچ دیا۔ تب یعقوبؑ نے عیسو کو روٹی اور مسور کی دال دی۔ اُس نے کھایا۔ اور پیا۔ اور اُٹھ کر چلا گیا۔ اس طرح عیسو نے اپنے پہلوٹے ہونے کا حق ناچیز جانا۔ تکوین باب ۲۵ آیت ۲۹۔

ایسے ہی یعقوبؑ نے عیسو کے حصہ کی آسمانی برکت بھی لے لی۔ جب اسحاق بوڑھا ہوا۔ اور اُس کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔ ایسی کہ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کو بلایا۔ اور کہا کہ اے بیٹے۔ اُس نے کہا کہ دیکھ میں حاضر ہوں تب اُس نے کہا۔ کہ دیکھ میں بوڑھا ہوا۔ اور میں اپنے مرنے کا دن نہیں جانتا۔ سو اب میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ اپنا ہتیار اپنا ترکش اور اپنی کمان لے۔ اور جنگل کو جا اور میرے لیے شکار لے آ۔ اور میرے لیے لذیذ کھانا جیسا کہ میں چاہتا ہوں تیار کر۔ اور میرے آگے لا کہ میں کھاؤں۔ تاکہ میں جی سے مرنے کے آگے تجھے برکت بخشوں۔ اور جب اسحاقؑ اپنے بیٹے عیسو سے باتیں کرتا تھا۔ تب ربقہ (زوجہ اسحاق) نے سُنا۔ اور عیسو جنگل چلا گیا۔ کہ شکار مارے۔ اور لائے تکوین باب ۲۷-۱ ا تا ۵۔

تب ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوب سے ہمکلام ہو کر کہا۔ کہ دیکھ میں نے تیرے باپ کی باتیں سُنیں۔ کہ تیرے بھائی عیسو سے ہمکلام ہو کر کہا۔ کہ میرے لیے شکار لا۔ اور میرے واسطے لذیذ خوراک تیار کر تاکہ میں کھاؤں۔ اور اپنے مرنے سے پیشتر خداوند کے آگے تجھے برکت بخشوں۔ سو اب میرے بیٹے اُس حکم کے موافق جو میں تجھے دیتی ہوں۔ میری بات کو مان۔ اب گلہ میں جا کر وہاں سے بکری کے دو اچھے اچھے بچے میرے پاس لا۔ اور میں تیرے باپ کے لیے اُن سے لذیذ کھانا جیسا وہ چاہتا ہے۔ پکاؤں گی۔ اور تو اُسے اپنے باپ کے پاس لائیو۔ تاکہ وہ کھائے۔ اور اپنے مرنے سے پیشتر تجھے برکت بخشے۔ تب یعقوب نے اپنی ماں ربقہ سے کہا دیکھ میرے بھائی عیسو کے بدن پر بال ہیں۔ اور میرا بدن صاف ہے۔ شاید میرا باپ مجھے ٹٹولے۔ اور میں اُن پاس دغاباز سا ٹھہروں۔ اور برکت نہیں۔ بلکہ لعنت اپنے اوپر لاؤں۔ اُس کی ماں نے اُس سے کہا کہ تیری لعنت مجھ پر ہو اے میرے بیٹے۔ تو صرف میری بات مان۔ اور جا کے اُنھیں میرے لیے لا۔ تب وہ گیا اور اُنھیں اپنی ماں پاس لایا اور اُس کی ماں نے لذیذ کھانا جیسا کہ اُس کا باپ چاہتا تھا۔ پکایا۔ اور ربقہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کی نفیس پوشاکیں جو گھر میں اُس پاس تھیں۔ لیں۔ اور اپنے چھوٹے بیٹے یعقوب کو پہنائیں۔ اور بکری کے بچے کی کھال اُس کے ہاتھوں اور اُس کی گردن پر جہاں بال نہ تھے لپیٹی۔ اور وہ لذیذ کھانا اور روٹی جو اُس نے تیار کی تھی۔ اپنے بیٹے یعقوب کے ہاتھ میں دی۔ سفر تکوین باب ۲۷ آیت ۶-۱۷۔

تب اُس نے اپنے باپ کے پاس آکر کہا۔ کہ اے میرے باپ۔ وہ بولا دیکھ میں یہاں ہوں۔ تو کون ہے اے میرے بیٹے؟ یعقوب اپنے باپ سے بولا

اب ہم ان مندرجہ بالا اقوام عرب المستعربہ میں سے۔ ہر ایک قوم کے تفصیلی حالات و واقعات ذیل میں علیحدہ علیحدہ قلم بند کرتے ہیں۔ مگر قبل اسکے کہ ہم ان حالات کو آغاز کریں۔ ہم کو یہ تبلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ ہماری سلسلہ بیان میں وہ ترتیب جو ہم نے اُوپر قائم کی ہے۔ باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لیئے کہ ہماری تالیفی ضرورت ہم کو اس ترتیب کے قائم رکھنے سے مانع ہے۔ اِس مجبوری کی وجہ سے خلاف ترتیب مصدرہ بالا ہم سلسلہ اسمٰعیلی سے پہلے بنی قطورہ کے حالات لکھتے ہیں۔ جو ہمارے سلسلہ ترتیب میں نمبر (۲) ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ۔ کہ میں ہوں عیسو تیرا پہلوٹھا۔ جیسا تو نے مجھ سے کہا۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ اٹھ بیٹھئے اور میرے شکار میں سے کچھ کھایئے۔ تاکہ تو جی سے مجھے برکت بخشے۔ تب اسحاق نے اپنے بیٹے سے کہا۔ کہ یہ کیونکر ہوا ہے۔ کہ تو نے ایسا جلد پایا ہے۔ اے میرے بیٹے۔ وہ بولا اس لیئے کہ خداوند تیرا خدا میرے آگے لایا۔ تب اسحاق نے یعقوب کو کہا۔ کہ اے میرے بیٹے نزدیک آ کہ میں تجھے چھوؤں۔ کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے۔ کہ نہیں۔ اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے پاس گیا۔ اور اُس نے اُسے چھو کے کہا کہ آواز تو یعقوب کی ہے۔ پر ہاتھ عیسو کے ہیں۔ اور اُس نے اُسے نہ پہچانا۔ اس لیئے کہ اُس کے ہاتھوں پر اُس کے بھائی عیسو کے ہاتھوں کی طرح بال تھے۔ سو اُس نے اُسے برکت دی اور کہا کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے؟ وہ بولا کہ میں وہی ہوں۔ تب اُس نے کہا۔ کہ تو میرے پاس لا۔ کہ میں اپنے بیٹے کے شکار سے کچھ کھاؤں۔ تا کہ جی سے تجھے برکت دوں۔ سو وہ اُس پاس لایا۔ اور اُس نے کھایا۔ اور وہ اُس کے پینے کے لیئے لایا۔ اور اُس نے پی۔ پھر اُس کے باپ اسحاق نے کہا کہ اے بیٹے اب نزدیک آ۔ اور مجھے چوم۔ وہ نزدیک گیا۔ اور اُسے چوما۔ تب اُس نے اُسکے لباس کی باس پائی۔ اور اُسے برکت دی۔ اور کہا کہ دیکھ میرے بیٹے کی ریح اُس کھیت کی ریح کی مانند ہے۔ جس میں خداوند نے برکت بخشی ہے۔ خدا آسمان کی اوس اور زمین کی چکنائی اور اناج اور مے کی زیادتی تجھے بخشے۔ قومیں تیری خدمت کریں۔ گروہ تیرے آگے جھکیں۔ تو اپنے بھائیوں کا خداوند ہو۔ اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے خم ہوں۔ ہر ایک جو تجھ پر لعنت کرے ملعون ہو۔ گروہ جو تیرے لیئے برکت چاہے۔ مبارک ہو۔ تکوین باب ۲۷ از ۱۸-۱۹۔

اور یوں ہوا۔ کہ جو اسحاق یعقوب کو برکت دے چکا۔ اور یعقوب اپنے باپ اسحاقؑ کے حضور سے باہر چلا۔ ویسے ہی اُسکا بھائی عیسو اپنے شکار کو پھر وُہ اُس نے بھی لذیذ کھانا پکایا تھا۔ اور اُسے اپنے باپ پاس لایا۔ اور اپنے باپ سے کہا۔ کہ اے میرے باپ اُٹھیئے۔ اور اپنے بیٹے کا شکار کھایئے۔ کہ آپ جی سے مجھے برکت دیں۔ اُس کے باپ اسحاق نے اُس سے پوچھا۔ تو کون ہے۔ وہ بولا کہ میں عیسو ہوں۔ تیرا پہلوٹھا بیٹا ہوں۔ تب اسحاق شدت کانپا۔ اور بولا کہ وہ کون تھا۔ اور کہاں ہے جو شکار کر کے میرے پاس لایا اور میں نے تیرے آنے سے آگے سب میں سے کھایا۔ اور اُسے برکت دی۔ ہاں وہ مبارک ہوگا۔ عیسو اپنے باپ کی باتیں سُنتے ہوئے شدت سے چلا چلا کر اور پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اور اپنے باپ سے کہا۔ کہ اے میرے باپ مجھے بھی برکت دیجئے۔ وہ بولا کہ تیرا بھائی دغا سے آیا۔ اور تیری برکت لے گیا۔ تب اُس نے کہا۔ کہ کیا اُسکا نام یعقوب ٹھیک نہیں ہے۔ کہ اُس نے دوبارہ مجھے اڑنگا مارا۔ اُس نے میرے پہلوٹھے ہونے کا حق لے لیا۔ اور اب دیکھو اُس نے میری برکت لے لی پھر اُس نے کہا۔ کیا تو نے میرے لیئے کوئی برکت نہیں رکھ چھوڑی۔ اسحاق نے عیسو کو جواب دیا۔ اور کہا دیکھ میں نے اُسے تیرا خداوند کیا اور اُس کے سب بھائیوں کو اُس کی چاکری میں دیا۔ اور اناج اور مے اُسے بخشی۔ اب اے میرے بیٹے میں تیرے لیئے کیا کروں۔ تب عیسو

بنو قطورہ

یا

اہل مدین

حضرت شعیب علیہ السّلام کی اُمّت اور اُنکی تبلیغ رسالت

(وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا)

از

۲۰۰۰ ق م تا ۱۶۰۰ ق م

اس اصول کا کئی بار بتکرار ذکر گذرچکا ہے۔ کہ سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگان نسل کے نام

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ ۔ مرے کہا۔ کہ اے باپ کیا آپ کے پاس ایک ہی برکت ہے؟ اے میرے باپ مجھے بھی برکت دیجیے۔ اور عیسو چلا چلا کر رُویا۔ تب اُس کے باپ اسحاق نے جواب دیا۔ اور اُس سے کہا کہ دیکھ زمین کی چکنائی سے اور اُوپر کے آسمان کی اُوس سے تیرا قیام ہوگا۔ اور تو اپنی تلوار سے زندگانی بسر کرے گا۔ اور اپنے بھائی کی خدمت کرے گا۔ اور یوں ہوگا کہ جب تو تردّد میں پڑے گا۔ تو اُس کا جُوا اپنی گردن پر سے توڑ پھینکدیگا۔ سفر تکوین باب ۲۷ درس ۱۸ تا ۴۰۔
متذکرۂ بالا عبارت توراۃ بیہودہ لطائف الحیل جن کے ذریعہ سے بقول صاحب ارض القرآن کے یعقوبؑ نے عیسو المدعو بادوم سے اُس کے فرزند اوّل ہونے کے حقوق حاصل کیے۔ اور اس حق کے ساتھ آسمانی برکت بھی لے لی۔ پورے طور سے ظاہر ہوگئے۔ ظاہر بین نگاہوں میں اگرچہ یہ طول طویل تفصیل ضرورت سے زائد معلوم ہوگی۔ مگر حقیقت بیں اور مدعا شناس حضرات میری غرض و مدعا اور اُن کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں۔ جن میں سے چند حسب ذیل ہیں۔
اوّل یہ واقعہ صاف صاف اُس امتیاز اور افتراق کو بتلا رہا ہے۔ جو کتب قدیمہ سماویہ اور قرآن مجید کی عبارت اور مطالب و معانی میں پایا جاتا ہے۔ جس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ بخلاف اور کتب الٰہیہ کے قرآن مجید نے انبیاء و مرسلین کے طبقۂ اعلیٰ کی معاشرت۔ اُن کا اعلیٰ اخلاق اور یکتا تمدن۔ کس شان اور عظمت سے دکھلایا ہے۔ یہی باعث ہے۔ کہ قرآن مجید نے کتب قدیمہ و سماویہ کے ان لغویات و حشویات کو۔ جو نہ کبھی الفاظ الہامی کہلانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور نہ انداز وحی ربانی ہونے کی عظمت۔ معارض اخلاق انبیائے کرام کیا مخالف عادات عوام ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنے صفحات میں جگہ نہ دی اور اُن کے ذکر و تفصیل کو قطعاً ساقط کر دیا۔ اور یہی قرآن مجید کی خصوصیت۔ اُس کے خالص کلام الٰہی ہونے کی ندرت ہے کہ اُس میں اُن بے جوڑ اور بے لگاؤ افسانوں اور داستانوں کی بھرتی نہیں ہے جو کلام الٰہی کی تقدیس کو انسانی تدلیس و

سے موسوم کرتی ہیں۔

مدین جن کے حالات اس فصل میں بیان ہونگے۔ اپنے بانی و موسس خاندان مدین بن ابراہیم (از بطن قطورہ) علیہ السلام کیطرف منسوب ہیں۔ مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسماعیل کے پہلو میں قایم کی۔

ارض مدین یہ ملک طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر و ارض ثمود و حجاز تک جہاں ثمود و جرہم اور عرب اسماعیلی آباد تھے۔ واقع تھا۔

بقیہ حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ :۔ زمین سے ناپاک کرتی ہو۔ توراۃ مقدس کے ان لغویات کو پڑھکر کبھی کوئی عقل والا کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ ایک مقدس پیغمبر اور اُس کے بعد ایک ہونے والے متبرک پیغمبر کے اخلاق ہیں۔ دیانت ہیں اور اطوار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

دوسرے یہ کہ مخالفین اسلام عام اس سے کہ یہود ہوں۔ یا نصارٰی۔ اپنی عالم فریبی۔ خود غرضی۔ اور تعصب مذہبی سے حضرت ہاجرہ اور اُن کی اولاد کو حضرت سارہ اور اُن کی اولاد کے مقابلہ میں ہمیشہ حقیر اور ذلیل سمجھتے اور سمجھاتے آئے۔ اور باعتبار حسب اور نسب کے بنو ہاجرہ کو۔ بنو سارہ سے۔ شرافت و نجابت اور قدر و مرتبت میں گراتے آئے۔ اور اپنے زعم باطل میں کبھی آل اسمٰعیلؑ کو اولاد اسحاق کے ساتھ الحاق و پیوند کے قابل نہ سمجھے۔ اب وہ ان واقعات توراۃ کو۔ جو اُن کے خاص الخاص مرویات معتبرہ میں عبرت و غیرت کی نگاہوں سے دیکھیں۔ اور سمجھیں۔ کہ اُن کی معنویانہ عالم فریبی۔ اور تعصب مذہبی کے برخلاف آل اسماعیلؑ اور بنو اسحاقؑ میں فوراً ہی کیسا توسّل اور پیوند تمہاری ہی روایات و اعتقادات سے صاف صاف ثابت ہو رہا ہے۔ اسماعیلؑ کی صاحبزادی سے اسحاقؑ کا صاحبزادہ بیاہا جاتا ہے۔ بھائی بھائی ملتے ہیں۔ توحّدنی الاصل اور توحّدنی النسل کی حقیقی اور اصلی شان ظاہر ہوتی ہے۔ اور صلۂ رحم اور حقوق قرابت کی اداکاریوں کا پورا اعلان کیا جاتا ہے۔ جو من جانب اللہ۔ اخلاق اور معاشرت کے اُصول پر فرض کئے گئے ہیں۔ اور جن کی تعلیم و تلقین کا اپنی خاص شانوں کے ساتھ تمام انبیاؑ و مرسلین کو حکم تاکیدی تفویض فرمایا گیا ہے جس ناپاک خیال کو تم اپنے حسد و عداوت کی وجہ سے بنو ہاجرہ کی کسرشان کے لیئے ایک بے ادبانہ اور محض معنویانہ طریقہ سے پھیلانا چاہتے ہو۔ اسکا تو تمہاری ان روایات میں کہیں نام و نشان اور وہم و گمان بھی نہیں ہے۔ سارہ اور ہاجرہ کی اولاد و ذریات میں اس واقعہ سے تو کسی قسم کا کوئی اختلاف جو تمہارا خاص وضعی اور مصنوعی ثابت ہوتا ہے۔ ذرہ بھر بھی پایا نہیں جاتا۔ بجز یہ توافق اور اختلاف اور اسکی معنویانہ تشہیر و اشتعال سوائے تمہاری شرارت نفس، تعصب مذہبی اور عداوت قلبی نہیں یقین کی جائے گی۔ تو اور کیا۔ باقی رہا یہ امر کہ توراۃ میں حضرت ہاجرہ کو حضرت سارہ کی لونڈی بتلایا ہے۔ یہ بھی محض بہتان ہے۔ اور کذب و افترا کا طوفان جسکی کامل تردید تمہارے ہی مرویات سے جناب ہاجرہ کے خاص حالات میں بالتفصیل قلم بند ہے۔ المولف الاحقر بندہ اولاد حیدر فوق عفی عنہ

تاریخ مدین۔ چونکہ ارض مدین حضرت موسیٰ کا دار الہجرۃ ہے۔ اور اہل مدین و بنی اسرائیل میں ہمیشہ تعلقات جنگ و صلح جاری رہے ہیں۔ اس لیے توراۃ میں مدین کے ذکر نہایت کثرت سے آئے ہیں۔ ہم انہیں کا اقتباس کریں گے۔ اسکا سبب یہ ہے۔ کہ یونان و روم کے عہد میں اسپر نبط قابض تھے جنہوں نے مدین کو چھوڑ کر رقیم اور حجر کو آباد و مشہور کیا تھا۔

ہم مدین کا آغاز ۲۰۰۰ق م سے فرض کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ۲۱۰۰ یا ۲۲۰۰ ق م ہے۔ ایک خاندان کو قوم کی حیثیت پیدا کرنے کی کم از کم سو دو سو برس کی مدت ضرور ہوئی ہوگی۔ اس لیے مدین توراۃ میں سب سے پہلے عہد یعقوب میں (۲۰۰۰ق م) سوداگروں کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسف کو جو کاروان تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا۔ وہ بھی اہل مدین اور اسماعیلی عرب تھے۔ (تکوین ۲۷-۲۸-۳۶-۳۰)

اس لیے قرآن مجید کی اس آیت میں۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ	اتنے میں ایک کاروان آیا۔ جس نے اپنے پانی والے کو بھیجا۔ اُس نے اپنا ڈول نکالا تو چلایا۔ اے خوش نصیبی! یہ ایک لڑکا ہے۔ کاروان والوں نے ایک سرمایہ کی چیز سمجھکر یوسف کو مخفی رکھا۔ اور خدا اُن کے کاموں سے آگاہ تھا۔ (مصر پہونچکر)

اُن لوگوں نے معمولی قیمت پر (یوسف کو) چند درم میں بیچ ڈالا۔ کیونکہ وہ یوسف کی قدر نہیں جانتے تھے (یوسف) کاروان سے انھیں اہل مدین کو مراد لینا چاہیئے اور مسلمان مفسرین نے بھی ایسا ہی سمجھا ہے۔

(معالم التنزیل تفسیر سورۂ یوسف)

یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ۔ اور اسماعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر میں اُن کے تاجرانہ سفر کی منزل اولیں نظر آتی ہے۔ مسیح سے دو ہزار برس پہلے قدامت پرست عرب کے اس مدیانی اور اسماعیلی قافلہ کا سامان تجارت وہی تھا۔ جو عربوں کی تجارت کا ہمیشہ سامان رہا ہے۔ خوشبودار چیزیں بلسان۔ صنوبر۔ اور لُبان۔ تکوین ۲۷-۲۶-

اس واقعہ کے چار سو برس بعد تک مدین کی تاریخ پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سبب یہ ہے۔ کہ مدین کی سوانح نگار بنی اسرائیل ہیں۔ اور یہ زمانہ بنی اسرائیل کے قیام مصر کا ہے۔ چار سو برس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ اور دعوت حق اور حُبِّ قومی کے جرم میں اُن کو مصر سے ہجرت کرنی پڑی۔ تو اُن کا ملجا بھی اسی قافلہ کی سرزمین تھی۔ جو اُن کی قوم کو چار سو برس پہلے مصر پہونچا گئی تھی۔ یعنی مدین۔ خروج باب ۲ آیت ۱۵

مدین کی قوم عموماً اسوقت جس کاروبار میں نظر آتی ہے۔ وہ وہی ہے۔ جو تمام سامی قوموں کا پیشہ تھا۔ اور جو حضرت موسیٰ کو مصر کی تمدن زندگی میں میسر نہ آتا۔ بنو سام کے عظیم الشان پیغمبر کے لیے ضرور تھا۔ کہ وہ جہانبانی سے پہلے گلہ بانی کا سبق لے۔ اس لیے قضائے الٰہی نے موسیٰ کو مصر کے تمدن زار سے عرب کے بے تکلف اور سادہ ملک میں بھیجدیا۔ جہاں شرفاء شام نے ابتک اپنے آبائی عادات و اخلاق کو متروک نہیں کیا تھا۔

راعویل یا یترو یا حوباب یا شعیبؑ۔ تاہم مدین کے قبائل ایک منتظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین و محافظت کے لیے کاہن (مذہبی عہدہ دار) ہوتے تھے۔ اور اکثر حالات میں یہی کاہن شہر کے قانونی حاکم بھی قرار پاتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے عہد میں جو کاہن تھا۔ اسکا نام توراۃ میں کہیں راعویل[1] کہیں یترو[2] کہیں حوباب[3] مذکور ہے۔ لیکن اکثر مسلمان مفسرین کے نزدیک یہ شعیبؑ تھے۔ جو لفظاً حوباب سے بہت قریب ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر سے ہجرت کرکے شہر مدین میں آئے۔ تو انہیں حوباب یا شعیب کے یہاں مہمان ہوئے۔ اور اُن کے یہاں بکریاں چرانے کی خدمت قبول کی۔ اور اُس کے معاوضہ میں حضرت شعیبؑ نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰ کی زوجیت میں دی[4]۔

قرآن مجید میں مدین کا ذکر دو سبب سے آیا ہے۔ اوّل حضرت شعیبؑ اور دوم حضرت موسیٰ کے تعلق سے حضرت موسیٰ کے تعلق کی حسب ذیل آیتیں ہیں۔

(۱) فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (طٰہٰ)	اہل مدین میں چند سال رہا۔ پھر اے موسیٰ تو ایک اندازہ پر آیا۔ (سورۂ طٰہٰ)
(۲) وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ (القصص)	جب موسیٰ (مصر سے) مدین کی طرف چلا۔ اُس نے کہا شاید میرا پروردگار مجھے راہ راست دکھائے۔ اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہونچا۔ تو وہاں چند لوگوں کو پانی پلاتے ہوئے پایا (سورۂ قصص)
(۳) وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (القصص)	(اے محمدؐ) تو اہل مدین میں مقیم نہ تھا۔ اُنپر خدا کی آیتوں کو پڑھتے ہوئے لیکن ہم بھیجنے والے تھے (سورۂ قصص)

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیکر جب مصر سے حدود عرب میں آئے۔ تو مدین کے کاہن نے اُنکا استقبال کیا بنی اسرائیل غلامی کے عہد سے ابھی نکلے تھے۔ نظام و ترتیب سے آگاہ نہ تھے بھیڑ کی طرح شب و روز پیغمبر کو گھیرے رہتے تھے۔ اور ذرا ذرا سی بات کے لیے پیمبر کے پاس دوڑے آتے تھے۔ مدین کے کاہن

[1] خروج ۲ و ۱۶ و ۲۲

(شعیبؑ) نے تبلایا۔ کہ ایک قوم پر کیونکر حکومت کرنی چاہیئے۔ اور اُس کی ترتیب وتنظیم کے کیا اُصول ہیں۔ اول ہزار ہزار پر افسر ہوں۔ پھر ہر سو پر۔ اور پھر ہر دس پر۔ صرف افسروں کے اختلاف رائے کے موقع پر امیر (حضرت موسٰیؑ) کی عدالت کی طرف رجوع کی جائے[1]۔

سولہ سو یا سترہ سو ق م جو حضرت موسٰیؑ کا عہد ہے۔ مدین پانچ شیوخ قبائل یا توراۃ کی اصطلاح کے مطابق پانچ بادشاہوں کے ماتحت تھا۔ ان کے نام یہ تھے۔ عوی۔ رقیم۔ صور۔ حور اور ربع[2]۔ یوسیفوس یہودی جو پہلی صدی عیسوی میں تھا۔ اُسکا بیان ہے۔ کہ شہر رقیم اسی مدیانی بادشاہ رقیم کے نام سے آباد ہے۔ عرب اسکو رقیم اور یونانی پیٹرا کہتے ہیں[3]۔ اس بنا پر بیسویں صدی کے ایک مشہور مصری عیسائی مورخ کی یہ تحقیق کہ الرقیم اس شہر کے یونانی غیر مشہور نام آراکہ کی تعریب ہے۔ کسقدر مضحکہ انگیز ہے[4]۔ یوسیفوس خود اُس عہد کا شخص ہے۔ جب یہ رقیم یا پٹرا آباد تھا۔ اس لیئے اس سے زیادہ موثق ذریعہ تحقیق اور کیا ہو سکتا ہے؟

ان واقعات کے ذکر سے ہم کو یہ دکھلانا ہے۔ کہ اسوقت مدین کا تمدن کس حد تک ترقی کر چکا تھا۔ اور نیز یہ بھی کہ اُس عہد قدیم میں مدین کی شمالی حد کہاں تک وسیع تھی۔ پٹرا یا رقیم ملک شام کے قریب بحر میت اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے۔ اس لیئے مدین کے حدود شمالی کو یہاں تک وسیع سمجھنا چاہیئے۔

اس زمانہ کے تقریبًا ڈیڑھ سو برس بعد شہر مدین کے چار اور بادشاہوں کا توراۃ میں ذکر آیا ہے۔ زاماج۔ صلمناع۔ عوریب۔ اور زیب۔ ایک وقت میں چند بادشاہوں کا وجود اسبات کی دلیل ہے۔ کہ ملک متفرق قبائل یا ریاستوں پر منقسم تھا۔

اہل مدین کی اخلاقی اور مذہبی حالت اور بربادی

مدین کے قریب موآب آباد تھا۔ مذہب کے اعتبار سے اہل مدین اور اہل موآب دونوں قوموں کی بدترین حالت تھی۔ تمدن کے جراثیم جن امراض کو پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے پیدا ہو چکے تھے بتوں کی پرستش اور اُن کے لیئے قربانی چڑھانا۔ ان کا مذہب تھا۔ تمام بتوں کا سردار بعل فعور نامی دیوتا تھا[5]۔ اخلاقی حالت اس درجہ پست تھی کہ شرفائے خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں[6]۔ مردوں کا یہ حال تھا۔ کہ ظلم وستمگری اُن کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا[7]۔

---

[1] خروج ۱۸ [2] عدد ۳۱-۸ [3] یوسیفوس قدامت الیہود کتاب ۴ فصل ۷ [4] العرب قبل الاسلام جرجی زیدان
[5] سفر العدد ۲۵ و ۲۲ و ۳ [6] سفر القضاۃ ۶-۱ [7] سفر العدد ۲۵-۱-۲

بنی اسرائیل مصر سے آکر موآب میں خیمہ زن تھے۔ ان بدکاروں نے بنی اسرائیل کے لیئے شاز شوں کا دام پھیلانا شروع کیا۔ عورتوں نے جوانان بنی اسرائیل کو جو اصل میں اس فوج کے سپاہی تھے۔ اپنے قابو میں کر لیا۔ سرداروں سے باغی بنا دیا۔ بتوں کے سامنے اُن کا سر جھکوایا۔ بعل فغور کے لیئے اُن سے قربانیاں کروائیں۔[1] مردوں نے آس پاس کی قوموں سے سازباز کی۔ کہ بنی اسرائیل کو نیست و نابود کردیں بنی عمان کے ملک سے وہاں کے پیغمبر بلعام (بلعم باعور) کو بلوایا۔ کہ وہ اسرائیل کے لیئے بد دعا کرے اسوقت خدا نے موسیٰؑ سے کلام کیا۔ اور فرمایا۔ کہ بنی اسرائیل کے لیئے اہل مدین سے انتقام لے۔ اور اُس وقت تو اپنی قوم میں مجتمع ہوگا۔" (سفر العدد ۳۱-۱)

ان حالات کی بنا پر بنی اسرائیل کو پھر اپنے قابو میں لانے کیلئے اور مدین کی گنہگار آبادی کی سزادہی کیلئے ضروری ہوا۔ کہ حسب حکم الٰہی مدین اور معاونین مدین سے جہاد کیا جاوے۔ موآب۔ حشبون۔ اور مدین کی متفقہ قوت کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ نے دو ہزار آدمی بھیجے۔ دشمن اپنی کثرت اور سامان کے باوجود کامیاب نہ ہوئے۔ مدین کے پانچ سردار عوی۔ رقیم۔ صور۔ حور۔ اور ربع مارے گئے۔ تمام مرد بچے اور عورتیں قتل ہوئیں۔ لڑکیاں قید ہوئیں۔ اور اُن کا سامان غنیمت میں ہاتھ آیا۔[2]

قوم مدین کی اس تباہی کے بعد شہر مدین ہم اسماعیلی عربوں کے ہاتھ میں پاتے ہیں۔ اور اب اسکے بعد جن اہل مدین کا تورات میں ذکر ہے۔ وہ یہی اسماعیلی ہیں۔ قوم مدین کی تباہی کے تقریباً ۱۵۰ برس بعد عمالیق اور دیگر عرب قبائل اسماعیلی مدین کی سرکردگی میں بنی اسرائیل پر حملہ آور ہوئے۔ ہر سال جب غلہ پکنے کے قریب ہوتا۔ آندھی کی طرح بنی اسرائیل کے ملک میں آتے۔ اور غلہ گائے بیل اور گدھے جو کچھ پاتے۔ سب لوٹ لیتے۔ فرزندان اسماعیل آبادی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں روپوش ہو جاتے۔[3]

آخر جدعون نامی ایک سردار اُن میں پیدا ہوا۔ جس نے بنی اسرائیل کی قوت کو مجتمع کیا۔ اور صرف تین سو منتخب آدمیوں کو لے کر اُس نے اہل مدین پر شب خون مارا۔ رات کی تاریکی میں دوست دشمن کی تمیز نہ ہوئی ایک لاکھ بیس ہزار اہل مدین خود اپنوں اور دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔[4] عوریب اور ذیب جو مدین کے دو بادشاہ قید ہوئے۔ جن کو نہایت ذلت سے قتل کیا گیا۔[5] اور بادشاہ زاباح۔ اور صلمناح پندرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ بھاگ کر نکلے۔ اور اُنکو پناہ نہ ملی۔[6]

جو باب یا شعیبؑ۔ اُوپر گذر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے خسر کا نام توراۃ میں یثرو اور جو باب مذکور ہے

---

[1] سفر العدد ۲۵-۲ و ۳ [2] سفر العدد ۲۲-۳-لم-۵ [3] سفر العدد باب ۳۱ [4] سفر القضاۃ باب ۶ [5] سفر القضاۃ ۸-۱۱ [6] سفر القضاۃ ۷-۲۵-

توراۃ کے شروح عبرانی میں لکھا ہے۔ کہ یترو کے دس نام تھے۔" دس نام ہوں یا نہوں۔ دو نام تو خود توراۃ میں ہیں۔ ایک جرمن فاضل (Heinrich Ewald) کہتا ہے

اصلی نام حوباب تھا۔ اور یترو ایک اعزازی لقب تھا۔ جس کے لغوی معنی "کامل" کے ہیں۔ جس طرح یہودیوں کے ہاں کاہن اور مسلمانوں کے ہاں امام کا لفظ۔ تاریخ بنی اسرائیل۔ ترجمہ انگریزی ج ا ص ۲۵۔ حاشیہ مصنفہ ابو اللہ۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

حوبابؑ کا نام قرآن میں اور عموماً مسلمانوں میں شعیبؑ ہے۔ یہ نام حوباب کی تصحیف ہے۔

حضرت شعیب اور قرآن مجید۔ مدین اور حضرت شعیبؑ کا باہمی ذکر قرآن مجید کے تین سوروں میں آیا ہے۔ اعراف۔ ہود اور عنکبوت۔ اور وہ حسب ذیل ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُم بَعْدَ إِذْ نَجَّانَا اللَّهُ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَن نَّعُودَ فِيهَا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ

اور مدین کے پاس اُنکے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ شعیبؑ نے کہا کہ اے بھائیو۔ خدا کو پوجو۔ اسکے سوا کوئی خدا نہیں ہے خدا کی جانب سے گواہی آچکی۔ پیمانہ اور ترازو پوری کرو۔ اور لوگوں کو اُن کا حق کم نہ کرو۔ اور اصلاح کے بعد ملک میں فساد نہ ڈالو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو۔ اور ہر راست پر دھمکانے کو نہ بیٹھا کرو۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُنکو ت روکو۔ اور سیدھی راہ کو ٹیڑھی نہ کرو۔ یاد کرو۔ جب تم تھوڑے تھے۔ تو خدا نے تم کو بڑھایا۔ اور بغور دیکھو کہ مفسدین کا انجام کیا ہوا۔ تم میں کچھ لوگ تو جو پیغام دیکر میں بھیجا گیا ہوں۔ اُسپر ایمان لاچکے ہیں۔ اور بعض نہیں لائے تو اُس وقت تک صبر کرو۔ کہ خدا ہمارے درمیان فاصلہ کر دے۔ اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

سردار ان قوم میں جو مغرور تھے۔ بولے کہ شعیبؑ ہم تجھ کو اور جو تیرے ساتھ ایمان لائے۔ اُن کو اپنی آبادی سے باہر نکال دیں گے۔ یا ہمارے آبائی مذہب کو پھر قبول کرلیں گے۔ شعیبؑ نے کہا کیا ہم نہ چاہیں تب بھی۔ اگر تمہارے مذہب کو جس سے ہمکو خدا نے نجات دی۔ ہم پھر قبول کرلیں۔ تو ہم خدا

تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۔

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ ۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ

(اعراف)

پر افترا باندھتے ہیں۔ خدا کی مشیت بغیر ہم کو پھر تمہارے مذہب میں جانا سزاوار نہیں۔ ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر شے کو محیط ہے۔ ہم نے اُسی پر بھروسہ کیا ہے۔ ہمارا پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے لوگوں کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

کفر پیشہ سرداروں نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ اگر شعیبؑ کی تم نے پیروی کی۔ تو تم گھاٹے میں رہو گے۔ پس کپکپاہٹ نے آکر اُن کو پکڑ لیا۔ پھر تو وہ اپنی جگہ پر پڑے کے پڑے رہ گئے شعیبؑ کے جھٹلانے والے گویا کہ ان گھروں میں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے۔ اور وہی گھاٹے میں رہے۔

شعیبؑ اُن کو اُسی حال میں چھوڑ کر ہٹا اور بولا اے میرے بھائیو! میں تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہونچا چکا۔ اور اپنی خیرخواہی کا فرض بھی ادا کر چکا۔ اب کیونکر کفر پیشہ قوم کی تباہی کا غم کھاؤں۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ ہود میں ہے:۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ۔

مدین کی سمت ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے کہا بھائیو خدا کو پوجو۔ اُس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ پیمانہ اور ترازو کم نہ کرو میں تم کو بھلائی کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ اور ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب کو تم پر ڈرتا ہوں۔ بھائیو! پیمانہ اور ترازو انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ لوگوں کا حق کم نہ کرو۔ اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اگر ایمان والے ہو۔ تو خدا نے جو باقی چھوڑا ہے۔ وہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور میں تم پر کوئی نگراں نہیں مقرر ہوا۔

اس مصلح اور خیرخواہ قوم کو مغرور اور ناشنوا قوم کے لوگ جواب دیتے ہیں:۔

قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ۔

لوگوں نے جواب دیا۔ شعیبؑ کیا تمہاری یہ نماز تم کو کہتی ہے کہ ہمارے اسلاف جسکو ہم پوجتے تھے۔ اسکو چھوڑ دیں۔ یا ہم اپنے مال میں جو چاہیں وہ نہ کریں۔ تم بھی بڑے عقلمند اور نیک ہو۔

نبی اللہ برحق گمراہان قوم کو پھر تکرار سمجھاتا ہے:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۔

شعیبؑ نے کہا کہ، بھائیو، اگر میں اپنے پروردگار کی بتائی ہوئی دلیل پر قائم رہوں۔ اور جو کچھ اس نے حلال روزی دے رکھی ہے۔ اس پر قانع رہوں۔ تو تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کرکے وہ کروں۔ جس سے تمھیں روکتا ہوں۔ میں تو اپنی طاقت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں مجھکو توفیق خدا ہی کے زور سے ہے۔ اُسی پر بھروسہ ہے۔ اور اُسی کی جانب رجوع ہوتا ہوں۔ بھائیو، صرف میری دشمنی اسکا باعث نہو، کہ جس طرح نوحؑ اور ہودؑ کی قوموں پر عذاب پہونچا۔ تم پر بھی پہونچے۔ لوطؑ کی قوم تم سے دور نہیں۔ اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو۔ اُسکے سامنے توبہ کرو۔ خدا رحمت اور محبت والا ہے۔

کافران قوم اس دلسوزانہ موعظت کا یوں مغرورانہ جواب دیتے ہیں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۔

وہ بولے شعیبؑ۔ ہم تمہاری بہت سی باتیں نہیں سمجھتے اور ہم اپنے میں تم کو کمزور پاتے ہیں۔ اگر تمہارے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا۔ تو ہم تم کو سنگسار کر چکے ہوتے۔ اور کچھ تم ہم پر غالب بھی نہیں۔

زبانِ رسالت نہایت متانت سے انکشاف معرفت کرتی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۔

شعیب نے جواب دیا۔ بھائیو! کیا میرا خاندان خدا سے زیادہ تمہارے نزدیک لحاظ کے قابل ہے۔ جو تم نے اُسکو پس پشت ڈالدیا۔ میرا پروردگار تمہارے ہر کام سے واقف ہے۔ بھائیو۔ تم اپنے مقام پر کام کیے جاؤ۔ میں بھی اپنا کام کرتا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ کہ رسواکن عذاب کس پر آئے گا اور کون جھوٹا ہے۔ انتظار کرو۔ میں بھی منتظر ہوں

آخر ان بدکاروں کا نتیجہ یہ ہوا:۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (ھود)

جب ہمارا حکم آگیا۔ ہم نے شعیبؑ کو اور اُس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی۔ اور جو ظالم تھے۔ اُن کو چیخ نے آگھیرا۔ اور وہ اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے۔ گویا کہ وہ کبھی اُن میں رہے ہی نہیں۔ ثمود کی طرح مدین کے لیے بھی ہلاکت ہوئی (ہود)

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ۔ (عنکبوت)	مدین کے پاس ہم نے شعیب کو بھیجا۔ اُس نے کہا۔ کہ بھائیو۔ خدا کو پوجو اور روزِ آخرت کی توقع رکھو۔ اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو اُنہوں نے جھٹلایا۔ تو کپکپاہٹ نے آلیا۔ اور وہ اپنے اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔ (عنکبوت)

ان آیتوں میں مدین کے جن حالات کی طرف تلمیح و اشارت ہے۔ چونکہ مدین کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیش نظر نہ تھی۔ اس لیے اُن میں بہت سے عقدے ناکشودہ رہ گئے۔ سب سے اوّل یہ کہ وہ اہلِ مدین و بنی اسرائیل کے باہمی واقعات سے بجز واقعہ قرابت حضرت موسیٰؑ و شعیب علیہما السّلام کے ناواقف ہیں اس بنا پر ان آیات کی تفسیر میں ان واقعات کا کوئی وہ تعلق ظاہر نہیں کرتے۔ حالانکہ ہماری رائے میں یہ آیتیں تمام تر انھیں واقعات سے متعلق ہیں۔ پہلی آیت یہ ہے وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا۔ (مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا) اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اوّل یہ کہ یہاں مدین کی قوم مدین مراد ہے۔ ثانیاً یہ کہ شعیبؑ مدین کے خاندان سے تھے۔

مخاطبت شعیبؑ و مدین کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ۔ (اعراف و ھود)	اے قوم خدا کی پرستش کرو۔ اُس کے سوا تیرا کوئی معبود نہیں ہے۔

اُوپر معلوم ہو چکا ہے۔ کہ وہ بعل فعور وغیرہ دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اِسکے بعد ہے۔

فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَھُمْ (اعراف) وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْ اَرٰکُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَھُمْ۔ (ھود)	ناپ اور تول پوری رکھو۔ اور لوگوں کو اُن کی چیز کم نہ دو (اعراف) پیمانہ اور ترازو کم نہ کرو۔ میں تم کو اچھی حالت میں دیکھتا ہوں۔ اور ڈرتا ہوں۔ کہ گھیر لینے والے دن کا عذاب تم پر نہ آئے۔ لوگو! پیمانہ اور ترازو انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک رکھو۔ لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو۔ (سورۂ ہود)

آغاز فصل میں معلوم ہو چکا ہے۔ کہ مدین ایک تاجر قوم تھی۔ اور غالباً دُنیا کی تاریخ میں اس پیشہ کی سب سے پہلی قوم ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنا پر اُس میں یہ مذموم صفت ہو گی۔ جو حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے بنی اسرائیل جب مصر سے حدودِ عرب میں آئے۔ تو اُن کے ساتھ رسد کا سامان نہ تھا۔ قرب وجوار کی قوموں سے بقیمت خریدتے تھے۔ یا بجبر چھین[1] لیتے تھے۔ شاید مدین کے اِس وصفِ تجارت کا بنی اسرائیل

[1] سفر تثنیۃ الاشتراع ۲-۲۷-

لے اس واقعہ سے بھی تعلق ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ ان آیات سے مراد صرف خرید و فروخت کی کمی و بیشی بلکہ سود بٹہ اور دیگر اصناف تجارت ممنوعہ مراد ہیں۔ جن کے ذریعہ سے تاجر و صاحب معاملہ لوگوں کو اُن کے حق جائز سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں اسی بنا پر حضرت شعیب کی قوم کا جواب یہ ہے۔

اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود) کیا اس سے بھی کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں کریں۔ تمہاری نماز روکتی ہے۔

اس رائے کی تاکید و تائید مفسرین کی بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔

وقیل نهاهم عن قطع الدنانير والدراهم وزعم انه محرم عليهم فقالوا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء (معالم التنزیل بغوی)

کہتے ہیں۔ کہ شعیبؑ نے اُن کو درہم و دینار میں بٹہ لینے سے منع کیا تھا۔ اور کہا۔ کہ یہ حرام ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ کیا ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے موافق کام نہ کریں (تفسیر معالم التنزیل۔ بغوی۔ سود)

محدث طبری (ابن جریر) تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

عن زيد ابن اسلم فی قوله عز وجل اصلٰوتك تامرك ان نترك ما يعبد اٰبآؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء قال كان مما نهاهم عنه حذف الدراهم او قال قطع الدراهم۔

زید ابن اسلم سے اس آیت اصلوٰتک۔ الخ کے ذیل میں مروی ہے۔ کہ شعیبؑ اُن کو بٹہ سے منع کرتے تھے۔

عن محمد ابن كعب القرظی قال بلغنی ان قوم شعيب عذبوا فی قطع الدراهم ثم وجدت ذلك فی القراٰن اصلٰوتك تامرك ما يعبد اٰباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء

محمد ابن کعب القرظی سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا۔ کہ قوم شعیب کو بٹہ لینے کے باعث عذاب دیا گیا۔ پھر مجھے قرآن مجید میں یہ آیت ملی۔ (تاریخ طبری جلد اول ص ۳۷۰۔ یوروپ)

اس کے بعد ارشاد باری ہے:۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اعراف)

اصلاح کے بعد ملک میں فتنہ برپا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر ایماندار ہو۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (ھود)

ملک میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ۔

عموماً مفسرین تا آنکہ امام رازی بھی "فتنہ و فساد" سے کفر اور "اصلاح" سے بعثت شعیبؑ مراد لیتے ہیں حالانکہ اس سے مقصود بعد صلح و امان۔ بنی اسرائیل کے ساتھ مخالفت و منازعت اور سازش و خونریزی ہے اس لیے اس کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (ھود)

ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ خدا نے جو باقی رکھا ہے۔ وہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم ایماندار ہو۔ (ہود)

بقیۃ۔ کا مطلب ہمارے مفسرین یہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ حرام کے بعد جو حلال چیزیں باقی رہ گئی ہیں وہی تمہارے لئے کافی ہیں۔ حرام کی کیوں طلب کرتے ہو۔ لیکن اس حالت میں اول آیت کو آخر آیت سے کیا تعلق رہے گا۔ ملک میں فساد نہ کرو۔ کہ باقی حلال چیزیں کافی ہیں۔ ملک میں فساد اور حلال چیزوں پر قناعت۔ دونوں بے ربط باتیں ہو جاتی ہیں۔

ہمارے نزدیک مدین کی تاریخ کو پیش نظر رکھنے سے مطلب نہایت واضح ہو جاتا ہے۔ مدین چاہتے تھے۔ کہ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر جو ملک کا حصہ لے لیا ہے۔ واپس لے لیں۔ حضرت شعیبؑ فرماتے ہیں۔ کہ فتنہ و فساد سے فائدہ نہیں۔ خدا نے جو کچھ باقی رکھا ہے۔ اُسی پر قناعت کرو۔ اہل مدین اس کے جواب میں کہتے ہیں۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ۔ (ھود)	کیا اے شعیبؑ تمہاری یہ نماز کہتی ہے۔ کہ اسلام کے طریقہ پرستش کو ہم چھوڑ دیں۔ یا ہم اپنے مال میں جو چاہیں وہ کرنا چھوڑ دیں تم بھی بڑے عقلمند (بابُردبار) اور نیک ہو۔ (سورہ ہود)

اس جنگ کی غرض صرف دو تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے دیوتا بعل فور کی اہانت کا انتقام لینا تھا۔ اسرائیل کے خدا کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ جس طریقہ ممنوعہ کے ذریعہ سے بھی ہو۔ بنی اسرائیل سے ملک و دولت کی واپسی کر لیجائے۔ اہل مدین کہتے ہیں۔ کہ کیا ہم ان دونوں چیزوں سے باز آجائیں۔ اور طعناً کہتے ہیں۔ کہ تم بھی بڑے نیک اور عقلمند ہو۔ یا یہ کہ بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ملک و قوم کی مذہبی و مالی بربادی پر تمکو غصہ اور ملال نہیں آتا تم حقیقت میں بڑے بُردبار اور نیک آدمی ہو۔ حضرت شعیبؑ جواب میں فرماتے ہیں۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ رَزَقَنِیْ مِنْہُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَآ اَنْھٰکُمْ عَنْہُ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (ھود)	بھائیو۔ بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی دی ہوئی روشنی پر ہوں اور جو حلال روزی اُسنے دے رکھی ہے۔ اُسی پر قانع رہوں۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ تم سے مخالفت کر کے میں وہ کروں جس کو تمکو روکتا ہوں۔ میں تو تا حدِ امکان صرف اصلاح چاہتا ہوں اور اُسکی توفیق خدا کا وسیلہ ہے (ہود)

اصلاح سے مقصود اصلاح روحانی بھی ہو۔ لیکن مدین و بنی اسرائیل کے مابین اصلاح کی کوشش کیطرف زیادہ مناسبت ہے۔

لیکن باینہمہ ارشاد و ہدایت مفسدین اپنے فساد و تباہ کاری سے باز نہ آئے۔ حضرت موسیٰؑ کے حکم کے

مطابق قوم مدین کے تمام مرد بچے اور منکوحہ عورتیں قتل کی گئیں۔ اور ۳۲ ہزار کنواری لڑکیاں لونڈی بنائی گئیں۔ (سفر اعداد ۳۱ و ۱۵-۱۶-۱۷-۳۵-۴۰-۴۶) قوم مدین کی زندگی کی یہ آخر تاریخ تھی۔

صورت عذاب الٰہی اور مدین کی بربادی و تباہی کی تفصیل یہ ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ (اعراف)	اُن کو ایک کپکپی نے آلیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے۔ (اعراف)
وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ (هود)	جنہوں نے ظلم کیا۔ اُن کو چیخ نے آلیا۔ پس اپنے قیامگاہوں میں پڑے رہ گئے (ہود)
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ (عنکبوت)	ان کو ایک کپکپی نے آلیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے۔ (عنکبوت)

کپکپی اور چیخ سے مطلق عذاب مراد ہے:-

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (هود)	ہاں ہلاکت ہو ثمود کیلئے۔ جس طرح ہلاک ہوئے ثمود (ہود)

ثمود کی امثالی خصوصیت اس لیئے ہے۔ کہ پہلے اس مقام پر وہ آباد تھے۔

فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ (اعراف)	شعیبؑ اہل مدین سے علیحدہ ہوئے۔ اور کہا کہ لوگو میں اپنے خدا کے پیغام تم کو پہونچا چکا تھا۔ اور تمہاری خیر خواہی بھی کر چکا تھا پھر کس طرح میں کافر قوم پر غم کروں۔ (اعراف)
وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا (هود)	جب ہمارا حکم آیا۔ تو ہم نے شعیبؑ کو اور اُن کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اپنی رحمت سے نجات بخشی۔ (ہود)

حضرت شعیبؑ کے متبع کون تھے۔ صرف اُنکے اعزہ اور ہم خاندان۔ اس لیئے کافروں نے کہا۔

لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (هود)	اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا۔ تو ہم تجھکو سنگسار کر دیتے۔ حضرت شعیبؑ نے بکمال متانت فرمایا۔
اَرَهْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (هود)	کیا میرا خاندان خدا سے زیادہ تمہارے نزدیک قوی ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

کہ حضرت شعیبؑ کا خاندان حضرت شعیبؑ کا متبع تھا۔ اس لیئے حضرت شعیبؑ کے ساتھ جن لوگوں نے نجات پائی۔ وہ یہی لوگ تھے۔

اس واقعہ میں قرآن اور توراۃ کی مطابقت مذکورہ بالا سطروں میں ان دو باتوں کا دعوے

کیا گیا ہے۔ حضرت شعیبؑ اور اُن کا خاندان اہل مدین سے جدا ہو گیا۔ اُنہوں نے نجات پائی۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کی پہلی جنگ کے بعد جب کنعان کی طرف کوچ کا ارادہ کیا۔ (تو حضرت شعیبؑ کے ساتھ) اُس موقع کی گفتگو ہے۔

موسیٰؑ نے حوباب بن رعوئیل مدیانی اپنے خسر سے کہا۔ کہ ہم یہاں سے اُس مقام کو کوچ کرنے والے ہیں۔ جو خداوند ہم کو دینے والا ہے۔ ہمارے ساتھ آؤ۔ کہ ہم تمہارے ساتھ بھلائی کریں۔ کیونکہ خداوند نے اسرائیل سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔ حوباب نے جواب دیا۔ کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ بلکہ اپنے ملک و مولد کو واپس جاؤنگا۔ موسیٰؑ نے کہا کہ ہم کو نہ چھوڑ جاؤ۔ تم سے التجا کرتا ہوں۔ کیونکہ جیسا تم جانتے ہو۔ کس ویرانہ میں ہم خیمہ زن ہیں۔ تم ہمارے لیئے بجائے آنکھ کے ہو (اعداد ۱۰-۳۰)

دوسری جگہ ہے:۔

موسیٰؑ کے سسر قینیؔ کے بیٹے بنی یہودا کے ساتھ قریہ نخل سے چلے۔ اور یہودا کے ساتھ جو تیمن کا تھا۔ اُس کے حصہ کے ساتھ میدان میں سکونت کی (قضاۃ ۱-۱۶)

مدین کی جنگ سے ایک باب پہلے مذکور ہے۔

جابر قینی اپنے دوسرے قینی بھائیوں کے ساتھ۔ جو موسیٰؑ کے سسر حوباب کے بیٹے تھے۔ پہلے ہی علیحدہ ہو گیا تھا اس نے اپنا خیمہ اُس وادی میں کھڑا کیا۔ جسکا نام ضعینم ہے۔ قادس کے پاس (قضاۃ ۴-۱۱)

تالمود بابل میں ہے:۔

یترو (شعیبؑ) نے اُس کی مخالفت کی۔ اور جب اُس کی نصیحت رد کر دی گئی۔ تو اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔ اور چل دیا اس لیئے اُس کی اولاد سنہڈرم[۵۱] کی رکن مقرر ہوئی[۵۲]

یوسیفوس یہودی جس نے پہلی صدی عیسوی میں تاریخ یہود لکھی ہے۔ لکھتا ہے۔

اُنہوں نے موسیٰؑ کے خسر یترو مدیانی کے خاندان کو بھی زمین دی۔ جس نے اپنا ملک چھوڑ دیا تھا۔ اور صحرا میں اُن لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ (قدامت الیہود کتاب ۵ باب ۲)

قوم مدین کی تباہی عام جس کی قرآن نے خبر دی ہے۔ توراۃ سے اسکا ثبوت متعدد طور پر بہم پہونچ سکتا ہے اوّلاً یہ کہ قوم مدین کی تباہی کے موقع کے توراۃ میں حسب ذیل الفاظ ہیں۔

بنی اسرائیل نے مدین سے جنگ کی اور اُن پر غالب آئے۔ اور تمام مردوں کو۔ بچوں کو اور عورتوں کو قتل کیا۔ (اعداد ۳۱-۷-۱۸)

---

۵۱ یہودیوں کی اعلیٰ مذہبی عدالت۔ جس کا رئیس کاہن اعلیٰ ہوتا تھا۔ اور اس کے علاوہ اور ستّر ممبر ہوتے تھے۔

۵۲ برٹن گولڈ مائینس آف مدین ص ۱۸۸۔

ثانیاً یہ کہ اسکے بعد مدین کی تباہی عبرانی صحیفوں میں ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے۔ زبور داؤد میں ہے۔

باشندگان شہر مدین۔ اسماعیلی۔ اہل موآب۔ ہاجری۔ عمون اور عمالیق ...... خدایا ان کو (قوم) مدین کی طرح کر دے۔ (زبور۔ ۸۳-۶)

اشعیاہ نبی کہتے ہیں:۔

خدائے افواج اس پر ایک کوڑا بھیجے گا۔ مدین کی مار کی طرح۔ عوریب کی چٹان پر۔ (۱۰-۲۶)

شہر مدین کی پچھلی تاریخ لیکن باینہمہ شہر مدین کا وجود باقی تھا۔ جس کا نشان تاریخی زمانہ اسلام تک ملتا ہے۔ حضرت داؤد جن کا زمانہ تقریباً ۱۰۵۰ق م ہے زبور ۸۳-۶ میں باشندگان مدین کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان کے عہد میں ایک ادومی شہزادہ ہداد بھاگ کر مدین سے آیا تھا (سلاطین اول ۱۱-۱۸) اشعیاہ نبی جو تقریباً ۸۰۰ق م میں تھے۔ مدین کی اونٹنیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو یروشلم میں تجارت کا مال لائیں گی (۶۰-۶) حبقوق نبی ایک پرجلال پیغمبر کی آمد آمد کی خبر سناتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ زمین مدین کی کھال میں رعشہ پڑ جائے گا۔ (۳-۷)

یونانی اور رومی مصنفین نے مدین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس مقام کا نام وہ نباطیا (Nabatia) بتاتے ہیں۔ سبب یہ ہے۔ کہ اس عہد میں اس ملک میں نبط آباد تھے (Foresters Geog. P. 313) اور یہ امر بالکل ہماری تھیوری (تجویز) کے مطابق ہے۔ حضرت اسمٰعیل کی ایک اولاد کا نام نبط تھا۔ اور توراۃ کے حوالہ سے ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ کہ قوم مدین کی تباہی کے بعد اسمٰعیلی عرب مدین کے مالک تھے۔ بطلیموس نے البتہ عرب کے ایک مقام کا نام موڈیانہ (Modayana) لکھا ہے۔ جسے بعض لوگ مدین سمجھتے ہیں (Bortons gold mines 179)

مسلمان جغرافیہ نویسوں نے عموماً مدین کا ذکر کیا ہے۔ ابو الفدا نے جغرافیہ میں لکھا ہے۔ کہ یہاں قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے اپنے ترکی جغرافیہ جہاں نما میں بیان کیا ہے۔ کہ یہاں جو آثار و عمارات ہیں اُن پر کتبات ہیں۔ جن پر بادشاہوں کے نام مرقوم ہیں۔

مصنفین یورپ میں سے متعدد اشخاص نے خاص مدین کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے جن میں ایک شخص (Burton) برٹن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس نے ایک بار مکہ معظمہ و مدینہ منورہ تک سفر کیا اور دوسرے بار خدیو مصر اسماعیل پاشا کے حکم سے ۱۸۸۶ء میں سونے کی کان کی تلاش میں مدین تک گیا یہاں بہت سے کتبات بھی ملے۔ جن پر نبطی خط منقوش ہے۔ رومیوں کے عہد میں یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ مسلمان شعرا کے اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کثیر کہتا ہے

رھبان مدین والذین عھدتھم | یبکون من حذر العذاب قعودا
رھبان مدین لو رأوک تنزلوا | والعصم فی شعف الجبال لقادر

ودان
یا
اصحاب الایکہ

قرآن مجید میں عرب کی ایک قوم کا اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر ہے۔ ایکہ کے معنی جنگل کے ہیں۔ اس قوم کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ جنکا ذکر مدینؔ میں گذر چکا ہے۔ اِس اتحاد سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مدینؔ اور اصحاب الایکہ ایک ہی چیز ہیں۔ اُن کا قیاس ہے۔ کہ ملک مدین کے پاس جنگل تھا۔ جہاں مدینؔ کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی۔ اس لیئے اُن کو اصحاب الایکہ یعنی جنگل والوں کے نام سے خطاب کیا گیا۔

(معالم التنزیل بغوی۔ سورہ مجر شعراء۔ ق ص)

مسلمان جغرافیہ نویس ان اطراف میں کسی جنگل کے ذکر سے خاموش ہیں۔ اُن کی رائے ہے۔ کہ شہر تبوک جو مدین کے مقابل مدین سے ۶ مرحلہ پر واقع ہے۔ اُسی کا نام ایکہ تھا۔ اور خود اہل تبوک کو بھی اعتراف ہے۔ کہ اسکا پہلا نام ایکہ ہے۔ (معجم البلدان۔ ایکہ)

قرآن کی رو سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مدینؔ اور ایکہ دو چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیبؑ سے سوال وجواب۔ طرز خطاب اور پھر آخرؔ بربادی اور طریقہ بربادی بالکل مختلف ہے۔ اِس بنا پر کون دعوےٰ کرسکتا ہے۔ کہ مدینؔ اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ سب سے بڑی اشتباہ کی صورت یہ ہے۔ کہ عام معلومات کے لحاظ سے اِن اطراف میں جنگل کا نشان نہیں۔ ورنہ اہل تفسیر و روایت واہل جغرافیہ اسکا ذکر کرتے۔ اِس دشوار گذار راہ کے طے کرنے کے یہ طریقے ہیں۔

اتنا تو ظاہر ہے۔ کہ مدینؔ اور ایکہ میں کوئی شدید تعلق تھا۔ اور ان کا زمانہ بھی باہم ایک تھا۔ جس کی بناء پر دونوں آبادیوں کے لیئے ایک ہی پیغمبر کی بعثت ہوئی۔ نیز قرآن نے دونوں کے اخلاق کا نقشہ بھی ایک ہی کھینچا ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے۔ کہ مدین جو حضرت ابراہیمؑ کی بی بی قطورہ کے بطن سے تھا۔ اُس کے کئی بھائی اور بھی تھے

اور ان بھائیوں کی اولادیں تھیں۔ توراۃ میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

ابراہیمؑ نے قطورہ نام ایک دوسری بی بی کی۔ جو زمران۔ یقشان۔ اور مدان۔ مدیان۔ یشبوق۔ اور سوخ کو جنی۔ یقشان نے سبا اور ودان کو پیدا کیا۔ اور بنو ودان۔ اشوریم۔ لطوشیم اور لادیم تھے۔ مدیان کے بیٹے۔ عافا۔ عوفر۔ حنوخ۔ ابی داع اور دعا تھے۔ یہی لوگ بنی قطورہ ہیں۔ ابراہیمؑ نے جو کچھ تھا۔ وہ اسحاق کو دیا۔ اور ان کنیز زادوں کو بھی کچھ دیا۔ اور ان کو اپنے بیٹے اسحاق سے الگ کر دیا۔ اور ابراہیمؑ اسوقت پورب کی طرف پورب کے ملک میں تھا۔ (یعنی عرب)

(سفر خروج باب ۲۵)

توراۃ نے قطورا کی متعدد اولاد در اولاد میں سے صرف دو کی تفصیل کی ہے۔ بنو مدین اور بنو ودان۔ بنو مدین کے متعلق بہ تحقیق معلوم ہے۔ کہ بحر احمر پر خلیج عقبہ کے سامنے شہر مدین میں آباد تھے۔ اس لیئے تسلیم کرنا چاہیئے۔ کہ بنو ودان بھی انہی سواحل پر مدین کے قریب آباد ہونگے۔ توراۃ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ وہ انھیں اطراف میں آباد تھے۔

تیما۔ ددان۔ بوض۔ جو سر کے بال منڈاتے ہیں۔ اور تمام عرب کے بادشاہ۔ (ارمیاہ ۲۵-۲۳)

تیما شمالی عرب میں حجاز سے شام کے راستہ پر واقع ہے۔ اسی کے قریب ودان کو ہونا چاہیئے۔ یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارہ کنارہ حجاز و مدین سے گذر کر خلیج عقبہ کے کنارہ تیما روغیرہ کو قطع کرتی ہوئی۔ ایک نہایت قدیم و مشہور تجارتی سڑک واقع ہے۔ جو قدیم زمانہ میں ہندوستان میں اور مصر و شام کے کاروانوں کا تنہا راستہ تھا۔ اس راستہ کا ذکر تمام قدیم جغرافیوں میں موجود ہے۔ وادی القریٰ ثمود کا مسکن۔ مدین قوم شعیبؑ کی آبادی۔ سدوم قوم لوط کا مقام اور نیز تبوک۔ تیما۔ اور رقیم (یونانی پیٹرا) اسی سڑک پر مابین حجاز و شام واقع ہیں۔ توراۃ کے اعتبار سے ودان بھی یہیں تھا۔ اور قرآن کہتا ہے۔ کہ اصحاب الایکہ بھی اسی سڑک پر ہیں۔ قوم لوط جو سدوم میں آباد تھی۔ اُسی کے ذکر کے بعد ارشاد ہے

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ۔	اور جنگل والے یقیناً حد سے گذر جانے والے تھے۔ ہم نے ان سے انتقام لیا۔ اور یہ (سدوم و ایکہ والے) دونوں کھلے راستہ پر ہیں۔

یہ وہی راستہ ہے۔ جسکا ذکر ہم نے کیا۔ اور جسکو تاریخ قدیم میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ اس بیان سے قرآن مجید اور توراۃ مقدس دونوں کی روسے ودان یا اصحاب الایکہ کا مسکن متعین ہو گیا۔

اصحاب الایکہ جنگل والے ضرور تھے۔ قرآن نے ان کو اصحاب الایکہ جنگل والے کیوں کہا۔ کیا ان کا وطن جنگل میں تھا؟ ہاں جنگل میں تھا۔ اور آٹھ سو برس کے بعد بھی جنگل میں تھا اشعیاہ نبی بنوخذ نصر (بخت نصر) کے خروج سے تمام اقوام کو متنبہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عرب

کی طرف خطاب ہے۔

عرب پر بار (مصیبت) ہے۔ جبکہ جنگل میں ددان والوں کی راہ میں تم شام بسر کرو۔ اے تیمن کے باشندو! پیاسوں سے پانی لے کر ملو۔ اور شکست کھانے والوں کے لیے روٹی لیکر نکلو۔ (۲۱-۱۳)

مسیحؑ سے سو برس اور اسلام سے سات سو برس پہلے بھی یہاں جنگل موجود تھا۔ ایک یونانی جغرافیہ نویس مدین اور خلیج عقبہ کے آس پاس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اس جگہ سے متصل وہ جگہ ہے۔ جس کو لوگ نستا کہتے ہیں۔ یا نافۃ البحر کہ یہ جانور وہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ نستا قریب ایک راس (راس محمد۔ خلیج عقبہ) کے واقع ہے۔ جو نہایت پر از اشجار ہے۔ یہیں سے ایک سیدھی سڑک (شاید شمال کو) اُس شہر کو جاتی ہے۔ جس کا نام پترا (رقیم) ہے۔ اور فلسطین کو جاتی (شام) ہے جہاں اہل قریہ (یمامہ و بحرین) معین اور تمام عرب قریب میں رہتے ہیں۔ اور بالائی ملک سے بخورات اور کہا گیا ہے۔ کہ خوشبودار چیزوں کے تبادل لاتے ہیں۔

برٹن گولڈ مائنس آف مدین ص ۱۷۹-۱۸۰

اٹھاسی[۸۸] باب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

خلیج عیلانہ (عقبہ) کے پیچھے چاروں طرف نبطی عرب رہتے ہیں (ارض مدین یہ ہے) بو تیمانوس (بنو تیمن) کا ملک ہے۔ جو وسیع اور مسطح ہے۔ اور سیراب اور عمیق ہے۔ وہاں نباتات و اشجار کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ جو نا قابلِ آدم ہوتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے جنگلی اُونٹ۔ ہرنوں کے گلّے۔ بارہ سنگھے رہتے ہیں۔ اور نیز مویشی اور بھیڑ کے گلّے۔ لیکن ان مواہب قسمت کے ساتھ شیر اور بھیڑیوں کا وجود بھی ہے۔ جن سے یہاں کے باشندوں کی خوش قسمتی مبدل بہ بد قسمتی ہے۔

جب تیمن کا اس جنگل کے پاس ذکر ہے۔ بعینہٖ اُسی کا جغرافیہ یونانی میں بھی ہے۔ اِس سے بڑھکر توثیق یہ ہے کہ اصحاب الایکہ (جنگل والوں) کے ملک کا ایک شہور واضح شاہزادہ (امام مبین) پر ہونا قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ بعینہ یہی بیان ایک جغرافیہ میں بھی ہے:۔

اس جگہ سے متصل وہ جگہ ہے۔ جسکو لوگ نستا کہتے ہیں .... یہ ایک راس کے قریب ہے۔ جو نہایت پر از اشجار ہے یہیں سے ایک سیدھی سڑک رقیم اور فلسطین کو جاتی ہے۔

یہ جغرافیہ نزول قرآن سے سات سو برس پہلے لکھا گیا ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ قرآن کی صداقت کی کوئی دلیل مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں اصحاب الایکہ کا ذکر چار سوروں میں ہے۔ حجر۔ شعراء۔ صٓ۔ قٓ۔ سب سے مفصل ذکر شعراء میں ہے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ

جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی جبکہ شعیبؑ نے کہا کیا تم نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا پیغمبر امین ہوں۔ خدا سے ڈرو۔

اطِيعُونِ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۞ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ قَالَ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ

اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اسکی اُجرت نہیں مانگتا میری اُجرت صرف خدائے پروردگار عالم پر ہے ناپ اور تول پوری کرو۔ اور ٹوٹا دینے والوں میں سے نہو۔ اور ٹھیک ترازو سے تولو۔ لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو۔ اور نہ زمین (ملک) میں فساد پیدا کرو۔ اور اُس سے ڈرو۔ جس نے پہلی قوموں کو پیدا کیا۔

اُنہوں (اصحاب الایکہ) نے کہا کہ تم پر جادو کردیا گیا ہے۔ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو۔ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر سچے ہو۔ تو آسمان سے ہم پر بادل کا ایک ٹکڑا تو گرا دو۔

شعیبؑ نے کہا کہ میرا پروردگار تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے لوگوں نے اُنکو جھٹلایا پس سایہ کے دن عذاب نے اُنکو آلیا۔ بیشک وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا۔ اس میں عبرت کی نشانی ہے۔ اُن لوگوں میں سے اکثر مومن نہ تھے۔

ودان بھی مدین کی طرح ایک تاجر قوم تھی۔ حزقیال نبی یروشلم کو خطاب کرکے کہتے ہیں صحیفہ حزقیال (۲۷-۲۰-۲۱)

ودان تیرے تاجر ہیں۔ بیٹھنے کے فرش لاتے ہیں۔ اور عرب اور تمام رؤسائے قیدار تیرے تاجر ہیں۔ بھیڑ۔ بکری ......

مدین کے موقع پر خدا نے فرمایا۔ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا (ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا) اور یہاں فرمایا إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ (اُن سے شعیبؑ نے کہا۔) اس سے ظاہر ہوا۔ کہ حضرت شعیبؑ مدین کے خاندان سے تھے۔ دوسرے بھائی ودان کے خاندان سے نہ تھے۔

ہمارے لائق محقق صاحب ارض القرآن نے ودان (صاحب الایکہ) کے متعلق وہ تمام باتیں ثبوت تحقیق تک پہونچا دیں۔ جو قرآن مجید میں اُن کی نسبت مرقوم ہیں۔ مگر آغاز واقعہ میں جو آیت سرعبارت ہے اُس کی کوئی تشریح نہیں فرمائی۔ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ (جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی) ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت شعیبؑ سے پہلے بھی چند انبیا و مرسلینؑ نے اس قوم پر تبلیغ رسالت کی تھی۔ مگر یہ شنوا نہ ہوئے۔ بخلاف مدین کے کہ اُن کی نسبت تکذیب انبیاء کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے۔ اس بنا پر مدین سے ودان زیادہ گنہگار قوم ثابت ہوتی ہے۔

بنو سارہ

یا

بنو ادوم

ادوم جس قطعہ ملک میں آباد ہوئے تھے۔ یونانی اب تک اُسکو ایدومیا (Adomia) کہتے ہیں۔ بحر میت (بحر لوط) اور خلیج عقبہ (عیلانہ) کے بیچ میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحر میت اور فلسطین جنوب میں، شمالی خلیج عقبہ و مدین مغرب جزیرہ نمائے سیناء۔ مشرق میں ارض موآب اور جوف عرب شمال ہے ملک میں کوہ سعیر یا کوہ سراۃ طولاً شمال سے جنوب تک وسیع ہے۔ اسی لیے توراۃ میں ادوم کا مقام سعیر بتلایا گیا ہے۔

بنو ادوم یا بنو عیسو۔ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ حضرت یعقوب اور ادوم یا عیسو دونوں سگے بھائی تھے۔ حضرت اسحاق کے بیٹے ربقہ کے بطن سے۔ یہ دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ عیسو یعقوبؑ سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اسلیئے یہی اولاد اکبر قرار دیئے گئے۔ اِن کے حالات کسی قدر تفصیل سے ہم پہلے حاشیہ میں لکھ چکے ہیں اور مناسبت مقام کے اعتبار سے بار دیگر حسب ضرورت توراۃ کی عبارت سے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں

اور جب اُس کے (ربقہ) جننے کے دن پورے ہوئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ اُس کے پیٹ میں توام ہیں۔ اور پہلا لال رنگ گویا بالکل پشم کا لباس ہو نکلا۔ اور اُنہوں نے اُسکا نام عیسو رکھا۔ اُس کے بعد اُسکا بھائی نکلا۔ اور اُسکا ہاتھ عیسو کی ایڑی سے لگا ہوا تھا۔ اور اُسکا نام یعقوب رکھا گیا۔ جب (ربقہ) سے یہ پیدا ہوئے۔ تو اسوقت اسحاق ساٹھ برس کا تھا۔ یہ لڑکے بڑھے۔ اور عیسو شکار میں ماہر اور جنگل کا رہنے والا تھا۔ اور یعقوب نیک مرد خیموں کا رہنے والا تھا اور اسحاق عیسو کو پیار کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اُسے شکار کا گوشت کھلاتا تھا۔ اور ربقہ یعقوب کو چاہتی تھی۔

تکوین باب ۲۵ آیت ۲۴۔۲۸

پھر باب ۲۶ آیت ۳۴ و ۳۵ میں لکھا ہے۔

عیسو نے چالیس برس کے سن میں۔ بیری حتی کی بیٹی یہودتس اور ایلون حتی کی بیٹی بشامس سے بیاہ کیا۔ اور وہ اسحاق اور ربقہ کے لیے بجان کی تلخی کے باعث ہوئیں۔

مذکورہ بالا والدین کی ناراضی اُس پر یعقوب و ربقہ کی خلاف تدبیریں ادوم یا عیسو کے ترک وطن کی باعث ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ توراۃ۔ تکوین باب ۲۸ آیت ۵ تا ۹ میں مرقوم ہے۔

پس جب عیسو نے دیکھا۔ کہ اسحاق نے یعقوب کو برکت دی۔ اور اُسے فدان ارم میں بھیجا تاکہ وہاں سے اپنے لیے جورو کر لائے۔ اور کہ اُس نے اُسے برکت دیتے ہی تاکید کر دی تھی۔ کہ تم کنعانیوں کی بیٹیوں میں سے جورو مت کیجیو۔ اور کہ یعقوب اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری کر کے فدان ارم کو چلا گیا۔ اور عیسو نے یہ بھی دیکھا۔ کہ کنعان کی لڑکیاں میرے باپ اسحاق کی نظر میں منظور نہیں۔ تب عیسو اسماعیل کے پاس گیا۔ اور محلات کو جو اسمٰعیل ابن ابراہیم کی بیٹی اور نبیت (نبط) کی بہن تھی۔ لی اور اُسے اپنی اور جوروؤں میں شامل کیا۔

اِس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ عیسو نے غیر قبیلہ میں اپنی شادی کر لینے کی غلطی کو۔ جو ان مفاسد کا اصلی باعث ہوئی تھی۔ اب قطعی طور سے سمجھ لیا۔ اور حضرت اسمٰعیل کی صاحبزادی سے شادی کر کے اُسکی تلافی کر لی۔ مگر جیسا کہ توریت باب ۲۷ آیت ۴۱-۴۶ میں مرقوم ہے۔ عیسو نے اپنی ماں ربقہ اور بھائی یعقوب سے سوء مزاجی واقع ہو جانے کے سبب کنعان میں رہنا پسند نہیں کیا۔ اِس لیے حضرت اسمٰعیلؑ کے مقام سکونت کے قریب جیسا کہ توراۃ اور تمام تاریخوں سے ظاہر ہے۔ کوہ سعیر یا سراۃ میں اپنے بال بچوں سمیت قیام کیا۔

بیس برسوں کے بعد بھائی بھائی ملتے ہیں

عیسو یہاں رہ گئے۔ ربقہ نے عیسو کی مخالفت سے ڈر کر اور نیز اِس خیال سے کہ شاید یعقوب بھی کسی کنعانی عورت سے بیاہ کرے۔ اور وہ عورت بھی غیر قبیلہ اور جنس دیگر ہونے کے باعث میرے لیے تکلیف دہ ثابت ہو۔ یعقوب کو یہ صلاح دی۔ کہ تو اپنے ماموں لابن کے پاس فدان ارم میں چلا جا۔ اور وہیں اُسوقت تک مقیم رہ۔ جب تک کہ عیسو کا غم و غصہ کم ہو جائے۔ اور اسی درمیان میں تو اپنے ماموں لابن کی بیٹیوں میں سے کسی کے ساتھ بیاہ کرلے۔ ربقہ نے اسحاقؑ سے یہ صلاح کہہ دی۔ اور اُس سے بھی یعقوب کو اجازت دلوا دی۔ یعقوبؑ اپنی ماں کی صلاح کے مطابق ماموں کے پاس چلے گئے۔ اور بیس برس تک اُنہی کے ساتھ رہے۔ اور اُن کی لڑکی سے شادی کر لی۔ بیس برس کے بعد خدا نے یعقوب کو پھر کنعان واپس آنے کا حکم فرمایا۔ یہ وہاں سے چلتے وقت سوچے۔ کہ راستہ میں کوہ سعیر پڑتا ہے۔ اور وہ بھائی کا مسکن ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ وہ ہم سے ناراض ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سابق مخالفت کا مجھ سے معاوضہ لیں اور میرے تمام قافلہ اور مال و متاع کو لوٹ لیں۔ یہ سوچ کر یعقوبؑ نے راستہ سے کچھ قاصد بطور سفارت بھائی کا استمزاج لینے کے لیے اُن کی خدمت میں بھیجے۔ اب یہ پورا واقعہ توراۃ کی اصلی عبارت میں حسب مفصلہ ذیل ملاحظہ ہو۔

اور یعقوبؑ نے کہا۔ کہ اے میرے باپ ابراہیمؑ کے خدا۔ اور میرے باپ اسحاقؑ کے خدا۔ اے خداوند تو نے مجھے فرمایا کہ تو اپنی

سرزمین اور اپنی زاد بوم میں پھر جا۔ اور میں تیرا بھلا کروں گا۔ اور میں تو ان سب رحمتوں اور ساری وفاداری کے ساتھ جو تو نے اپنے بندے سے کی ہے۔ کسی کے لائق نہیں۔ کہ میں اپنی لاٹھی لیئے۔ اس یردن (جماعت) کے پار گیا۔ اور اب دو غول بنا ہوں۔ میں تیری منت کرتا ہوں۔ کہ مجھے میرے بھائی عیسو کے ہاتھ سے بچالے۔ کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ وہ آکے مجھے اور میرے لڑکوں کو اُن کی ماؤں سمیت ہلاک کرے۔ تو نے تو کہا۔ کہ میں تجھ سے اچھا سلوک کرونگا۔ اور تیری نسل کو دریا کی ریت کے مانند کرونگا۔ جو کثرت سے ہرگز گننے کے قابل نہیں ہے۔ تکوین باب ۳۲ از آیت ۹ - ۱۲۔

اور وہ اُس رات وہیں رہا۔ اور جو اُس کے ہاتھ لگا۔ اپنے بھائی عیسو کے ہدیہ کے واسطے لیا۔ دو سو بکریاں۔ بیس بکرے۔ دو سو بھیڑیاں۔ بیس مینڈھے۔ اور تیس اونٹنیاں دودھ والی بچوں سمیت۔ چالیس گائیں۔ دس بیل۔ بیس گدھیاں اور دس گدھے۔ اور اُس نے اُنہیں اپنے نوکروں کے ہاتھ میں ہر غول کو جدا جدا سونپا۔ اور اپنے نوکروں کو کہا۔ کہ میرے آگے۔ (پہاڑ سے) پار اُترو۔ اور غول کو غول سے جدا رکھو۔ اور پہلے کو اُس نے یوں کہا۔ کہ جب میرا بھائی عیسو تجھ سے ملے۔ اور تجھ سے پوچھے۔ کہ تو کس کا ہے۔ اور کہاں جاتا ہے۔ اور یہ جو تیرے آگے ہیں۔ کس کے ہیں۔ کہیو تیرے نوکر یعقوب کے ہیں۔ اُس نے یہ اپنے خداوند یعقوبؑ کے لیئے ہدیہ بھیجا ہے۔ اور دیکھو وہ آپ بھی ہمارے پیچھے ہے۔ اور اُس نے دوسرے اور تیسرے کو اور اُن سب کو جو غول کے پیچھے ہو جاتے تھے۔ یہ کہہ کے حکم کیا۔ کہ جب تم عیسو کو پاؤ۔ اُسی طور سے کہیو۔ اور علاوہ اس کے یہ کہیو۔ کہ دیکھ تیرا چاکر یعقوب ہمارے پیچھے آتا ہے۔ کہ اُس نے کہا۔ کہ میں اس ہدیہ سے جو آگے جاتا ہے۔ اُس سے صلح کرونگا۔ تب میں اُسکا منہ دیکھوں گا۔ شاید کہ وہ مجھے قبول کرے چنانچہ وہ ہدیہ اُس کے آگے پار ہو گئے۔ پر وہ آپ اُس رات لشکر میں رہا۔ اور وہ اُسی رات کو اُٹھا۔ اور اپنی دو جوروں اور دو سہیلیوں اور گیارہ بیٹوں کو لیکے یبوق کے گھاٹ سے پار اُترا۔ اور اُن کو لے کے سرپار کرایا۔ اور اپنا سب کچھ پار بھیجا۔ از آیت ۱۳ تا ۱۹۔

یعقوب نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے۔ کہ عیسو اور اُس کے ساتھ چار سو آدمی آتے ہیں۔ تب اُس نے لیاہ اور راحل کو اور دو سہیلیوں کو اور اُن کے لڑکوں کو سب سے آگے رکھا۔ اور لیاہ اور اُسکے لڑکوں کو پیچھے اور راحل اور اُس کے بیٹے یوسف کو سب سے پیچھے۔ اور وہ آپ اُن کے آگے چلا۔ اور اپنے بھائی پاس پہونچتے پہونچتے سات بار زمین پر جھکا اور عیسو اُس کے ملنے کو دوڑا۔ اور اُسے گلے لگایا۔ اور اُس کی گردن سے لپٹا۔ اور اُس کو چوما۔ اور وہ دونوں روئے۔ پھر اُس نے (عیسو نے) آنکھیں اُٹھائیں۔ اور عورتوں اور لڑکوں کو دیکھا۔ اور کہا کہ یہ تیرے ساتھ کون ہیں۔ وہ (یعقوب) بولا۔ لڑکے جو خدا نے اپنی عنایت سے تیرے نوکر کو دیئے ہیں۔ تب سہیلیاں اور اُن کے لڑکے نزدیک آئے۔ اور اپنے کو جھکایا۔ پھر لیاہ اپنے لڑکوں سمیت سامنے آئی۔ اور جھکی۔ آخر کو یوسف اور راحل سامنے آئے۔ اور اُنہوں نے آپ کو جھکایا۔ اور اُس نے کہا۔ کہ اِس بڑے غول سے جو مجھے ملا تیرا کیا ارادہ ہے؟

وہ بولا۔ کہ اپنے خداوند کی نظر سے مورد لطف ہونا۔ تب عیسو بولا۔ مجھ پاس بہت ہے۔ بھائی میرے۔ جو تیرا ہے اپنے لئے رکھیئے یعقوب نے کہا سو نہیں۔ اگر میں تیری نظر میں منظور ہوں۔ تو میرا ہدیہ میرے ہاتھ سے قبول فرمایئے۔ کیونکہ میں نے تو تیرا منہ دیکھا۔ جیسا کہ خدا کا منہ دیکھتے ہیں۔ اور تو مجھ سے راضی ہوا۔ میری برکت کو جو تیرے حضور لائی گئی۔ قبول کیجئے کہ خدا نے مجھ پر شفقت کی ہے۔ اور میرے پاس سب کچھ ہے۔ غرض اُسنے اُسے یہاں تک تنگ کیا۔ کہ اُس نے لیا اور اُس نے کہا۔ کہ آؤ۔ کوچ کریں۔ اور چلیں اور میں تیرے آگے چلونگا۔ اُس (یعقوبؑ) نے کہا۔ کہ میرا خداوند جانتا ہے۔ کہ لڑکے نازک ہیں۔ اور بھیڑ بکریاں اور گائیں دودھ پلانے والیاں میرے پاس ہیں۔ اور اگر دن بھر وہ ہانکے جائیں تو سارے گلّے مر جائیں گے۔ سو میرے خداوند اپنے نوکر سے پیشتر روانہ ہو جایئے۔ اور میں آہستہ آہستہ جیسا کہ مواشی آگے چلے گی۔ اور لڑکے سہ سکیں گے چلونگا۔ یہاں تک کہ سعیر میں اپنے خداوند پاس آ پہونچوں۔ تب عیسو نے کہا۔ کہ مرضی ہو تو میں کئی ایک ان لوگوں میں سے جو اب میرے ساتھ ہیں۔ تیرے ساتھ چھوڑ دوں۔ وہ بولا کہ کیا ضرور ہے؟ کاش کہ میں اپنے خداوند کی نظر میں صرف تنہا منظور ہوتا۔ تب عیسو اُسی دن اپنی راہ لے کر سعیر کو پھر گیا

سفر تکوین باب ۳۳۔ از آیت ۱ تا ۱۶

اِس عبارت توراۃ سے حضرت یعقوبؑ کے اُس خوف و دہشت کا پورا حال معلوم ہو گیا۔ جو عیسو اپنے بڑے بھائی کی طرف سے۔ اُن کے دل میں گذشتہ سوء مزاجی کی بنا پر جاگزیں تھی۔ مگر خلاف امید یعقوب کی یہ سوء خیالی اُنکا حُسن ظن ہی ثابت ہوا۔ اور عیسو اُن کے ساتھ ویسا ہی پیش آیا۔ جو ایک سگے بھائی کے خلوص و محبت کا مقتضی تھا۔ اور اس میں بھی کلام نہیں کہ یعقوبؑ نے بھی اس خاص موقع پر عیسو کے ساتھ اُن آداب و تکریم کے محاسن کے اظہار کیئے۔ جو ایک چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کے ساتھ لازم اور مناسب ہوتے ہیں۔ اور حقیقت تو یوں ہے۔ کہ باوجودیکہ آپس میں ایک کو دوسرے کے ساتھ شکایت ضرور تھی۔ مگر جب اصلیت اور قلبی تعلقات کے عالم فیمابین پیش نظر آ گئے۔ تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ آناً فاناً ایک دوسری حالت ہی بدل گئی۔ عیسو جس کے خوف سے یعقوبؑ تھر تھر کانپتے تھے۔ یعقوبؑ کے گلے سے لپٹا ہوا زار زار رو رہا ہے۔ اور یعقوبؑ اُسکے قدم پر اپنا فرق ادب جھکائے ہوئے شدت گریہ سے ہچکیاں لے رہا ہے۔ اِس نیرنگ حال کا کیا باعث بتلایا جائے۔ سوائے اس کے اُس مقلب القلوب والاحوال کی قدرت کاملہ کا۔ وَاللّٰہُ قَادِرٌ عَلٰی کُلِّ حَالٍ۔

عیسو اور یعقوبؑ کے باہمی حالات و واقعات اس تفصیل سے لکھ کر میرا خاص مدعا یہ تھا کہ اُن کوتہ بین اور فاقد البصر علمائے یہود و نصاریٰ کی اس معویانہ عالم فریبی کی پوری قلعی کھل جائے۔ جو بنی اسمٰعیلؑ و بنی اسحاقؑ کے مابین افتراق نسبی کے باعث سے دائمی مفارقت اور قطعی بے تعلقی بتلاتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی متعصبین

اپنے عہد نامہ قدیم میں ان واقعات الہامی کو پڑھ کر عبرت اور غیرت کا سبق لیں۔ اور آئندہ سے ان مغویانہ اور عالم فریب کوششوں پر جرأت نہ کریں۔

ادوم کی حکومت۔ چند صدیوں کے بعد یہ خاندان بطور خاص ایک کثیر التعداد قوم بنگیا جسنے ۱۷۰۰ ق م سے پہلے ایک عظیم الشان حکومت قائم کی اسی عہد میں بنی اسرائیل جب مصر سے آئے۔ تو ادوم کی حکومت سعیر میں قائم تھی۔ (سفر عدد ۲۰-۱۴) ساؤل (طالوت) جو بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تھے۔ اور جنکا زمانہ ۱۱۰۰ ق م ہے۔ ان سے پہلے ادوم میں سعد بادشاہ یا شیخ گذر چکے تھے۔ (تکوین ۳۶-۳۱)

توریت میں ادوم کی حسب ذیل مختلف آبادیوں کے نام مذکور ہیں۔ دنہابہ۔ بصرٰی۔ تیمان۔ عویت۔ مشریقا۔ رحبوت۔ اور فاعو (تکوین ۳۶-۳۱) ادوم کے دار الحکومت کا نام بعد کو عبرانی میں سلاع ہے۔ اسکو یونانی پٹرا کہتے ہیں۔ (ان دونوں کے معنی پتھر کے ہیں) لیکن عرب اسکو رقیم کہتے ہیں۔ اصل میں یہ مدیان کا شہر تھا۔ مدین کے بعد ادوم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ سلاطین ادوم کے نام یہ ہیں۔ جو شاید پچھلے زمانہ کے ہیں۔ اور غیر مرتب ہیں لیکن توراۃ نے ان کو بترتیب و تسلسل ایک کے مرنیکے بعد دوسری کو بادشاہ ظاہر کیا ہے۔ (تکوین ۳۶-۳۱۔

تعداد	نام	مقام
۱	بالع ابن باعور	دنہابہ
۲	یوباب بن زارح	بصرٰی
۳	حوشام	تیمان
۴	ہدادبن ہداد	عویث
۵	کلا	مشریقا
۶	شاؤل	رحبوت
۷	بعل حنان بن عکبور	۰
۸	ہدار	فاعو

ادوم کی تاریخ۔ ادوم کی سب سے پہلی تاریخ یہ ہے۔ کہ ہدد شاہ ادوم نے۔ باشندگان مدین کو جنگ کی۔ اور ان کو شکست دی۔ تیرہویں صدی ق م میں۔ منیفطہ اور عمیس سوم۔ فراعنہ مصر نے ادوم پر حملہ کیا۔ مصری کتبہ میں اس ملک کا نام ادومہ بتایا گیا ہے۔ اور ادوم کو شاسو کا ہم قبیلہ کہا گیا ہے

(ریٹنیکا ج ۸ ص ۹۴۹ و ج ۱۴ ص ۱۹۱ ۲)

ساؤل شاہ اول اسرائیل نے جن کو قرآن مجید نے برعایت جالوت۔ طالوت کہا ہے۔ سب سے پہلے ادوم پر حملہ کیا (سموال ۱۴-۴۷) حضرت داؤد شاہ ثانی اسرائیل نے ادوم کو فتح کرکے مملکت اسرائیل میں شامل کرلیا۔ (۲ سموال ۸-۱۴) ہداد ادوم کا شاہزادہ بھاگ کر مدین آیا۔ اور یہاں سے مصر چلا گیا (سلاطین ۱۱-۱۶) حضرت داؤد کے مرنے کے بعد وہ اپنے ملک کو واپس آیا (سلاطین ۱۱-۲۲) اس کے بعد مختلف سلاطین بنی اسرائیل کے عہد میں بنو ادوم نے پرزور بغاوتیں کیں (سلاطین ۸-۲۰-۲۲) اموصیاہ شاہ یہودیہ نے بحیرت کے ساحلی میدان میں ادوم پر ایک زبردست حملہ کیا۔ دس ہزار آدمی مارے گئے۔ ادومیوں کے پایۂ تخت سلاع (بیٹرا) پر شاہ یہودیہ نے قبضہ کرلیا۔ اور اسکا نام بدلکر یقتائیل رکھا (۲ سلاطین ۱۴-۷)

اس کے بعد اسیریا کا دور شروع ہوتا ہے۔ تغلات پلاسر رابع شاہ۔ اسیریا کے عہد ۷۳۴ ق م میں اسیریا کے کتبات میں ادومی حکومت کا بحیثیت خراج گذار ریاست کے ذکر ہے۔ اسوقت اس کے بادشاہ کا نام قوزملک تھا۔ ساتویں صدی میں جو بادشاہ تھا۔ اس کا نام کوزگبری تھا۔ ساتویں صدی ق م کے وسط میں مواب اور ادوم۔ دونوں قبائل بادیہ کے نشانہ تھے۔ آخری تاریخ یہ ہے۔ کہ بنوخزنبصر (بخت نصر) اسیریا کے مقابلہ میں بغاوت کی (یرمیاہ ۲۷-۳) اور ناکام رہے۔ بخت نصر نے دیگر اقوام کے ساتھ ان کو بھی پامال کر ڈالا۔

چھٹی صدی ق م میں اسیریا (شام) میڈیا (فارس) کے ہاتھ سے تباہ ہوا۔ اسی عہد میں موقع پاکر بدوی اسمٰعیلی عربوں نے اسپر قبضہ کرلیا۔ جن کا نام تاریخ میں نبط ہے۔ اور ادومی مجبور ہوکر بحر میت کے پار چلے گئے یہی سبب ہے۔ کہ یوسیفوس اور بطلیموس اور نیز تالمود میں ادومیا اسی قطعہ کا نام بتایا گیا ہے۔

ب یا ایوب علیہ السلام

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ کہ ادوم کی ایک نسل کا نام عوض تھا حضرت ایوب علیہ السلام جن کا قرآن مجید اور اسفار یہود دونوں میں ذکر ہے۔ اور جن کے نام سے۔ سفر ایوب مجموعہ توراۃ کا ایک جزو ہے۔ اسی عوض ادوم کی نسل سے تھے (سفر ایوب) سفر ایوب عبری میں ان کا نام اَدَب ہے۔ لیکن عرب ان کو ایوب کہتے ہیں۔ ادوم کے شیوخ یا سلاطین کی جو فہرست اس سے پہلے نقل کی گئی ہے۔ اسکا تیسرا نام یوباب بن زارح ہے۔ قدیم وجدید۔ مسلم وغیر مسلم دونوں کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ یوباب۔ اَدَب۔ اور ایوب ایک ہی نام ہیں۔ اور یہ اختلاف محض تغیر لہجہ کا نتیجہ ہے

ایک قدیم مذہبی کتاب۔ جس کی اصل زبان عبری عربی ہے۔ جو ادوم کی زبان ہونی چاہیئے (کیونکہ ادوم عربی تھے اور وسط ملک میں آباد تھے) اس کتاب کا ایک جرمن فاضل میخائیل (Miehaili) نے

لاطینی میں ترجمہ کیا ہے۔ اسکا عنوان یہ ہے۔ (Colloauia) حواشی بر تاریخ گبن شائع کردہ ایوری مینس لائبریری ج ۵ ص ۲۴۰) لیکن اس کتاب کا ایک قدیم عربی ترجمہ بھی ہے۔ جس میں حسب ذیل عبارت ہے۔ جو قواعد عربی کے رو سے جابجا غلط ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کسی غیر عرب نے اِس کا ترجمہ کیا ہے۔

وکان ایوب ساکنا فی ارض عوص فی التخم ادوم وعربیا ومن قبل اسمہ یوباب۔ وایوب کان ابن زارا ابن بنی عیسو وھو کان الثالث من ابراھیم والملوک الذی ملکوا فی ادوم الذی کان ملک علی تلک الارض من قبل بالق بن باعور واسم مدینتہ دنابا ومن بعدہ یوباب ھذا الذی یسمی ایوب۔

ایوب۔ عوص کی سرزمین میں۔ ادوم کی سرحد پر رہتے تھے قوماً عرب تھے۔ اور پہلے یوباب نام تھا۔ ایوب زارا کے بیٹے اور خاندان عیسو سے تھے۔ اور حضرت ابراہیم سے تیسری پشت میں تھے۔ اور جو سلاطین پہلے ادوم پر حکمراں ہوئے تھے۔ وہ بالق بن باعور تھے۔ اور اُن کے پایہ تخت کا نام دنابہ تھا۔ اُن کے بعد یوباب بادشاہ ہوئے جو ایوب ہیں۔

ریونڈ فارسٹر نے اس بحث پر کئی صفحے سیاہ کئے ہیں۔ کہ ایوب عرب تھے۔ اور نسل ادوم سے تھے۔ یہاں تک تو صحیح ہے۔ آگے وہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ ایوب کا شہر دنابا تھا۔ اور یہ غلطی اس لیے ہوئی۔ کہ عربی عبارت مذکورہ میں واسم مدینتہ دنابا میں مدینتہ کی ضمیر یوباب کی طرف راجع کی ہے۔ حالانکہ اولاً تو یہ صریح غلطی ہے جسکو ہر عربی داں سمجھ سکتا ہے۔ ثانیاً یہ خود توراۃ کے مخالف ہے۔ (تکوین ۳۶-۳۲)

ایک دوسرے یوروپین فاضل (Calmet) نے ثابت کیا ہے۔ کہ یوباب اور ایوب ایک ہی شخص ہیں۔ مسٹر گبن (Gibbon) عرب و اسلام کی فصل میں جو اُن کی تاریخ کا چالیسواں باب ہے۔ قرآن مجید پر ایک غیر واقفانہ نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اُس عرب بشر (قرآن یا محمد صلعم) کے خیالات خدا کے متعلق گو اعلیٰ و لطیف ہیں۔ تاہم اسکا بلند سے بلند خیال سفر ایوب کے پُرجلال سادگی کے مقابلہ میں کم ہے۔ جو عہد قدیم میں اسی ملک اور اسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

ہمارے ہاں تفسیروں میں جو روایات اسرائیلیہ ہیں۔ وہ بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں۔ کہ یوباب اور ایوب ایک شخص ہیں۔

کان ایوب رجل من الروم (ادوم) وھو ایوب بن اموص (خطاء) بن زارح بن روم (ادوم) بن عیص (عیسو) بن اسحاق بن ابراھیم وکانت لہ ابنیۃ من ارض الشام کلھا سھلھا وجبلھا و

ایوب روم کا آدمی تھا۔ ایوب بن اموص (خطاء) بن زارح بن عیص (عیسو) بن روم (ادوم) بن اسحاق ابن ابراہیم اس کے قبضہ میں شام کے تمام میدان اور کوہستان تھے۔ اور ان میں ہر قسم کی دولت تھی۔

کان لہ فیہا من اصناف المال کلہ من البقر والا بل والغنم والخیل والحمر۔	یعنی گائے۔ بیل۔ اونٹ۔ بھیڑ۔ بکری۔ گھوڑے اور گدھے وغیرہ۔

ان تمام روایات میں ایک عجیب تصحیف لفظی ہے۔ ادوم کی جگہ روم بیان کیا گیا ہے۔ ادوم چونکہ غیر معروف اور روم مشہور لفظ تھا۔ اور تشابہ خط و لفظ بھی ہے۔ اس سبب سے راوی یا ناسخ (نویسندہ) نے ادوم کی جگہ روم لکھدیا۔ دوسری غلطی یہ ہے۔ کہ سلسلہ نسب میں ایوب اور زارح کے درمیان اموص کے نام کی زیادت ہے۔ مورخ ابن واضح یعقوبی۔ المتوفی ۲۸۰ھ کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ ملوک شام کے ذکر میں لکھا ہے۔

یوباب ھو ایوب بن زارح الصدیق یوباب ہی ایوب بن زارح الصدیق ہیں۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ حضرت ایوبؑ ایک ادومی عرب تھے۔ خود سفر ایوب سے ثابت ہے۔ عوص کی زمین میں ایک مرد صالح۔ راست گو۔ خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا۔ (۱-۱)

عوص توراۃ میں دو آدمیوں کا نام ہے۔ ایک تو نہایت قدیم عوص بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۱۰-۲۲) دوسرا عوص بن دیسان بن عیسو بن اسحاق بن ابراہیم (تکوین ۳۶-۲۹) باتفاق اہل کتاب اس سے عوص ثانی مراد ہے۔ عوص کی بنی ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ سفر ایوب میں جو مسکن رفقائے ایوبؑ کے بتائے ہیں۔ وہ تیمن۔ نعمان۔ اور شوحان ہیں (۳-۱۱) اوّل کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا۔ (تکوین ۳۶-۳۵) اس سے پہلے حضرت ایوبؑ کی تعریف میں ہے اس لیے وہ تمام فرزندان شرق میں سب سے زیادہ بڑا تھا (ایوب ۱-۳) یہ امر اس کتاب میں بتواتر ثابت ہوچکا ہے۔ کہ یہودیوں کی اصطلاح میں شرق سے ہمیشہ ارض عرب مراد ہے۔

حضرت ایوبؑ امیر یا شیخ قوم تھے ۔ حضرت ایوب بادشاہ یا شیخ قبیلہ تھے۔ خود سفر ایوب سے ثابت ہوتا ہے ہائے وہ جیساکہ میں گذشتہ مہینوں میں تھا۔ اُن دنوں میں جبکہ خدا میری حفاظت کرتا تھا جبکہ اُس کا چراغ میرے سر پر تھا۔ اور میں تاریکی میں اس کی روشنی پر چلتا تھا۔ میں اپنی نوجوانی کے دنوں میں جبکہ اسوقت تک خدا کا راز میرے مسکن میں تھا جبکہ قادر مطلق خدا میرے ساتھ تھا۔ اور میرے بچے میرے قریب تھے۔

جب میں اپنے پاؤں مکھن سے دھوتا تھا۔ اور جب چٹان میرے لیے تیل کے چشمے بہاتی تھی۔ جب میں شہر کے دروازے پر جاتا تھا۔ جب بازار میں اپنی نشست تیار کرتا۔ نوجوان مجکو دیکھ کر ٹل جاتے۔ اور بوڑھے میرے لیے کھڑے ہوجاتے بڑے بڑے لوگ مجھ سے بات کرنے میں جھجکتے۔ اور ہاتھ سے اپنا منہ بند کرلیتے۔ اور زبان تالو میں لگالیتے۔

کیونکہ جس کے کان نے مجھ کو سنا۔ میری تعریف کی۔ اور جس آنکھ نے مجھے دیکھا۔ میری گواہی دی۔ کیونکہ جس مسکین نے بھی فریاد کی۔ اور جو بھی بے یار و مددگار یتیم تھا میں نے اُنکی مدد کی۔ اور ہر قریب مرگ کی دعا مجکو ملی۔ اور ہر بیوہ کے دل کو خوشی کا گانا مجھ سے نصیب ہوا ہے۔

راستی میری پوشاک تھی۔ جو مجھکو پہنائی گئی۔ میرا فیصلہ خلعت اور تاج ہوتا تھا۔ میں اندھوں کی آنکھ تھا لنگڑوں کا پاؤں۔ اور غریبوں کا باپ تھا۔ اور وہ دلیل جسکو میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں جن کی تلاش میں تھا۔ میں نے بیان کی۔ اور شریروں کے دانت توڑ دیئے۔ اور اُن کے دانتوں کے بیچ سے غضب کی چیز چھینی۔

میری عظمت مجھ میں تازہ تھی۔ اور میری کمان میرے ہاتھ میں نئی کی گئی تھی۔ میری بات کو لوگوں نے سُنا۔ اور خاموشی سے میری نصیحت کا انتظار کرنے لگے۔ میری گفتگو کے بعد پھر وہ کچھ نہ بولے۔ میرے الفاظ کے قطرے اُن پر ٹپکتے تھے۔ اور وہ اُنکا ایسا انتظار کرتے تھے۔ جیسا بارش کا۔ اور وہ اِن کے لیئے اس طرح منہ کھولتے تھے۔ جیسے پچھلی منہ کو کھولے۔

میں اُن پر ہنسا۔ لیکن اُنھوں نے یقین نہ کیا۔ اور نہ میرے چہرے کی چمک زمین پر گری۔ میں نے اُن کے لیئے راستہ چُن دیا۔ اور میں سردار بنکر بیٹھا۔ اور اس طرح رہا۔ جس طرح بادشاہ اپنی فوج میں۔ اور اُس آدمی کی طرح جو غمزدوں کو تسلی دیتا ہے۔ (ماخوذ از سفر ایوب باب ۲۹)

حضرت ایوبؑ کا زمانہ اور وطن

جب ہم ثابت کر چکے۔ کہ ایوبؑ اور یوباب ایک ہی شخص ہیں تو ہم کو حضرت ایوبؑ کے مکان و مسکن کے متعلق زیادہ کاوش کی حاجت نہیں رہی۔ یوباب کا مسکن توراۃ میں مذکور ہے۔ کہ وہ بصرٰی تھا۔ جو اب تک شمال عرب میں فلسطین کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ آنحضرت صلعم نے بھی سفر شام میں وہاں قیام کیا تھا۔ یہی شہر حضرت ایوبؑ کی قیام گاہ تھا۔ بصرٰی قدیم زمانہ میں ایک تجارتی شہر تھا۔ توراۃ میں اسکا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اشعیاہ نبی بوخذ نصر (بخت نصر) کی خبر دیتے ہیں۔ خداوند کی تلوار خون آلود ہے ..... خداوند نے بصرے میں قربانی کی اور ادوم کے ملک میں قتل عام (۶-۳۴) پھر کہتے ہیں۔ وہ رنگے کپڑے کے ساتھ بصرے سے اور ادوم سے آ رہا ہے۔ (۶-۶۳) اس آیت میں بصرے سے کسی آنے والے کی بشارت ہے۔ مسکن ایوبؑ ظاہر ہو چکا ہے۔ زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اسلیئے آسان ہے کہ کلدان (ایوبؑ ۱-۱۷) اور سبا (ایوبؑ ۱-۱۵) کا اس میں ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا عروج سنہ ۱۰۰۰ ق م میں ہوا ہے۔ اور کلدانیوں کا اختتام سنہ ۶۰۰ ق م میں۔ ان دونوں کا مشترک عہد سنہ ۱۰۰۰ ق م سے سنہ ۶۰۰ ق م تک ہے۔ اس لیئے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوبؑ کا عہد قرار دینا چاہیے۔

ہمارے فاضل معاصر صاحب ارض القرآن اگر تعیین زمانہ ایوبؑ میں تھوڑی اور تحقیق فرماتے تو قیاسی تعیین زمانہ کی جگہ اُن کو زمانہ اصلی کا پورا پتہ چل جاتا۔ وہ اس طرح سے کہ حضرت ایوبؑ کی بی بی جن کے ذکر کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے وہ باتفاق مورخین و نسابین عرب یوسف ابن یعقوب کی پوتی تھیں۔ اور اُن کا نام رحمہ تھا۔ (حیاۃ القلوب مجلسی جلد اوّل) توراۃ سے حضرت یعقوب کا زمانہ

تقریباً ۲۰۰۰ ق م ہے۔ تو قاعدہ استدادنسل کی رو سے یہ خاتون رحمہ نامی حضرت یعقوبؑ سے سو برس بعد ہوں گی۔ جو ۱۹۰۰ ق م ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے یہی زمانہ حضرت ایوب کی رسالت کا اصلی قرار دیا جائے گا۔

حضرت ایوبؑ کا قصہ

قرآن مجید میں حضرت ایوبؑ کا ذکر ہے۔ لیکن چند مجمل اشارات کے سوا کوئی تفصیل نہیں ہے۔ مفسرین نے جو تفصیل نقل کی ہے۔ وہ وہب ابن منبہ اور دیگر اسرائیلی مسلمانوں سے جو قرن اوّل میں موجود تھے۔ منقول ہے۔ اور یہ اسرائیلی روایت بتغیر و اضافہ قلیل تمامتر سفر ایوب سے ماخوذ ہے۔ جسکا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت ایوبؑ ایک مالدار۔ کثیر الاولاد۔ صاحب عزت اور تندرست آدمی تھے۔ خدا کی رضا کے ہمیشہ طالب۔ اور ہر مصیبت کے وقت صابر رہتے۔ مساکین اور فقرا کی اعانت۔ یتیموں اور بیواؤں کی امداد اور مظلوموں کی فریاد رسی آپ کی عادت تھی۔ آخر خدا نے آپ کو ابتلا میں ڈالا۔ اور بروایت سفر ایوبؑ (توراۃ) شیطان کو اُن کی جان و مال پر استیلا دیا گیا۔ دولت جوُن دنوں۔ اونٹ بھیڑ۔ بکری۔ اور گدھوں سے عبارت تھی۔ کلدانی لوٹ کرلے گئے۔ غلاموں کے دستے پر سبائی قابض ہوگئے۔ اولادیں ایک چھت کے نیچے دب کر رہ گئیں۔ لیکن ان مصائب میں بھی کلمۂ شکر و رضا کے سوا زبان مبارک سے کچھ نہ نکلا۔ آخر تندرستی بھی زائل ہو گئی۔ اور تمام بدن فاسد ہو گیا۔ عزیز و اقارب نے کنارہ کشی کی۔ ایک بی بی رفیق حال تھی۔ اُس نے بھی بالآخر صلاح دی۔ کہ غیر خدا کے سامنے جھکو اور خدا کو برا کہو۔ اس حالت کی خبر حضرت کے تین دوستوں کو ہوئی۔ اور یہ تینوں حضرات حضرت ایوبؑ کی تعزیت[1] کو آئے پورا صحیفہ حضرت ایوبؑ اور ان تینوں مومنین صادقین کے باہم مناظرے و مکالمے پر شامل ہے۔ یہ تمام مناظرہ لطیف تمثیلات میں نہایت اعلیٰ فلسفیانہ اور شاعرانہ جذبات روحانی سے پر ہے۔ جن کا ماحصل یہ ہے۔ کہ ان مومنین ثلاثہ کا دعوےٰ ہے۔ کہ انسان پر کوئی مصیبت بغیر گناہ کے نہیں آتی۔ اس لیے جو مبتلائے مصیبت ہے۔ وہ گنہگار ہے۔ اور اُسکو اعتراف و توبہ کرنا چاہیئے۔ حضرت ایوبؑ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے کوئی معصیت نہیں کی ہے۔ جس کی خدا کی طرف سے یہ جزا ہے۔ بلکہ یہ عالم قضا و قدر ہے۔ جس کے لیئے کوئی سبب درکار نہیں۔ خدا کے اسرار و مصالح لامحدود ہیں۔ اور اُن کی معرفت سے انسان عاجز ہے۔ آخر وحی الٰہی نے فیصلہ کیا کہ۔ ایوبؑ گو توحق پر ہے۔ تاہم بندے کو کسی حال میں

[1] تعجب ہے۔ کہ ہمارے فاضل معاصر کو اس وقت تک۔ تعزیت اور عیادت کا فرق بارالامتیاز نہیں معلوم۔ تعزیت موت سے متعلق ہے۔ اور عیادت مرض سے

اعتراف وندامت میں قصور نہ کرنا چاہیے"۔ یہ سنتے ہی حضرت ایوب نے قربانی کی۔ اور تندرست ہوگئے۔ تمام اعزا واقارب بھی جمع ہوگئے۔ خدا نے از سر نو دوسری دوچند دولت اور اولاد عطا کی۔

قرآن مجید اور حضرت ایوبؑ قرآن مجید میں حضرت ایوبؑ کا نام چار سورتوں میں آیا ہے۔ نساء۔ انعام۔ انبیاء۔ اور ص۔ نساء اور انعام میں صرف نام ہے وعیسیٰ وایوب (نساء) وایوب ویوسف (انعام) سورۂ انبیاء اور سورۂ ص میں کسی قدر تفصیل سے ذکر ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص)

ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کرو جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا۔ کہ مجھکو شیطان نے تکلیف اور عذاب کے ساتھ چھوا ہے۔ (اے ایوبؑ) اپنا پاؤں مار۔ یہ غسل کرنے کی ٹھنڈی جگہ ہے۔ اور پینے کا پانی ہے۔ اور ہم نے اُسکو اُسکے اہل وعیال دیئے۔ اور اُنھیں کے برابر اور اپنی رحمت سے۔ اور عقلمندوں کی یادگاری کے لیے (ایوبؑ) اپنے ہاتھ میں تنکے کا مُٹھا لو۔ اور اُس سے مارو۔ اور اپنی قسم نہ توڑو۔ ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا۔ اچھا بندہ تو بہ کرنے والا ہے (ص)

اس موقع پر شیطان سے کیا مراد ہے۔ یہ صاف ہونا چاہیے۔ سورۂ انبیا کی آیت کریمہ نے اس کی تفصیل کے ساتھ صفائی کردی ہے۔

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ (انبیاء)

اور ایوبؑ کو جب اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا۔ کہ مجھ کو بیماری نے چھوا۔ اور تو مہربانوں میں سے سب سے بڑا مہربان ہے۔ ہم نے اُسکی دعا قبول کی۔ اور اُس کی بیماری دور کی۔ اور اُسکو اُسکے اہل وعیال دیئے اور اُنکے برابر اُن کے ساتھ۔ اور اپنی رحمت سے عبادت گذاروں کی یادگاری کے لیے

ان آیات مبارکہ کے متعلق تین اُمور قابل ذکر وبحث ہیں۔ اول خذ بیدک ضغثًا فاضرب بہ ولا تحنث "اپنے ہاتھ میں جھاڑو لو۔ اور اُس سے مارو۔ اور قسم نہ توڑو" اس آیت میں اسکا ذکر نہیں۔ کسکو مارو۔ اہل تفسیر بیان کرتے ہیں۔ کہ حضرت ایوبؑ کی بی بی نے جب خدا کی شان میں گستاخی کی۔ تو اُنہوں نے غضبناک ہوکر قسم کہائی تھی۔ کہ اگر اچھا ہوگیا۔ تو تمکو سو لکڑی ماروں گا۔ بی بی صادق الایمان تھی۔ اور یہ

لغزش ایک وسوسہ شیطانی تھا۔ اس لیے معاف کیا گیا۔

سفر ایوبؑ میں اس گستاخی اور کلمۂ کفر کا ذکر ہے (سفر ایوب ۲-۹) لیکن اس سزا کی نوعیت کا بیان رہگیا ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ کہ خدا کے نیک و صالح بندے اپنے اعزا سے کلمات کفر سُن کر مقیاب کیوں ہو جائیں۔ اور کیونکر سزا نہ دیں؟ نقص کی تکمیل قرآن نے کر دی۔ جو دُنیا میں صرف تکمیل ہی کے لیے آیا ہے۔

سوم اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ اپنے پاؤں سے مارو۔ یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور پینے کا پانی ہے" سفر ایوبؑ میں یہ مذکور نہیں۔ کہ حضرت ایوب کس طرح اور کس علاج سے صحتیاب ہوئے قرآن بتاتا ہے۔ کہ خدا نے اُن کو ایک چشمہ کا نشان بتایا جس میں نہانے اور اُس کے پانی پینے سے (اُن کی) بیماری جاتی رہی۔ یہ طریقہ علاج بالکل مطابق فطرت ہے۔ طبعی[1] چشمے جو طبقات ارضی یا پہاڑوں سے بعض اجزائے کیمیاوی کے مخزن سے گذر کر اُبلتے ہیں۔ مخصوص خواص رکھتے ہیں۔ اور دُنیا کے اکثر ممالک و اکناف میں اب بھی خدا نے اپنا یہ چشمۂ فیض جاری کر رکھا ہے۔ جس سے اُس کی ہزاروں مخلوق ہر موسم میں مستفید ہوتی ہے۔

حضرت ایوبؑ کے حالات میں۔ ہمارے فاضل محقق صاحب ارض القرآن نے جس تفصیلی تحقیق سے کام لیا ہے۔ وہ بہت ہی قابل قدر ہے۔ مگر با اینہمہ زوجہ حضرت ایوبؑ اور نوعیت صحت کے متعلق کسی قدر انکشاف کی ضرورت باقی رہ گئی جو حسب ذیل ہے

فاضل معاصر نے زوجہ حضرت ایوبؑ کی نسبت زیادہ غور و خوض سے کام نہیں لیا۔ بلکہ سفر ایوب اور شارحین یہود کے مرویات و اقوال پر اعتبار فرما لیا ہے۔ ہمارے معتقدات مشکل سے پیغمبر کی ایسی زوجہ جو بالنفس الیفس خاندان رسالت اور وودمان نبوت سے علی الصحت ثابت ہو چکی ہو۔ کافرہ یا شرکہ تسلیم کریں گے۔ حالانکہ آگے چلکر آپ نے بھی اس کے صادق الایمان بیوی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اُس کی کفر و شرک کی تعلیم و تحریص کے اعتراف کے بعد آپ کے موجودہ اعتراف و اختلاف نے اس مسئلہ کو جمع بین المتضاد کے مشکلات و محالات میں ڈالدیا ہے۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ توراۃ اور شارحین توراۃ کے اقوال و مختار کے مقابلہ میں اسلامی مفسرین کے بیانات کی طرف توجہ و التفات نہیں فرمائی گئی۔ مجموعہ توراۃ تو اِن اقسام کے

---

[1] تب ہو کر خلقی چشمہ کی جگہ طبعی لکھا گیا ہے۔ حالانکہ طبع ذی روح کے متعلق ہے غیر ذی روح کے لیے اسکا استعمال شاذ اور قریب الامتناع ہے اسلئے خلقت کے لفظ سے کام لیتے ہیں۔ جو ذی روح اور غیر ذی روح دونوں میں مشترک ہے۔ اور استعمال اسکا جائز ہے۔ اولاد حیدر

لغویات وحشویات کثیرہ کی کلیات ہے۔ اور حقیقت میں قرآن مجید۔ جیسا آپ خود اکثر مقامات پر ظاہر و ثابت کرتے آئے ہیں۔ اپنی قصص باطلہ کی تصحیح و توضیح کے لیے ضرورتاً نازل فرمایا گیا ہے۔ قرآن نے ضمناً و کنایتاً بھی جیسا آپ لکھ چکے ہیں۔ ذکر نہ فرمایا۔ پھر قرآن کے موجودہ سکوت کے مقابلہ میں مرویات توراۃ پر اعتبار کر لینا اسلامی اُصول و عقائد کے صریح منافی ہے۔ بہرحال جس طرح ہمارے فاضل معاصر نے حضرت ایوبؑ کے حالات و واقعات کو اسلامی مفسرین کے بیانات سے ملا کر لکھا ہے۔ اُسی طرح مسئلہ زیر بحث کی صورت حال کو بھی اُن کے اقوال و مختار کے ساتھ ملاحظہ فرما لینا ضروری تھا۔ حقیقت حال اور اصلی واقعہ کا مشاہدہ ہو جاتا۔ اسلامی مفسرین نے اس کے متعلق جو لکھا ہے۔ وہ یہ ہے۔

حضرت رحمہ زوجہ جناب ایوبؑ

ایام ابتلا میں حضرت ایوبؑ کے تمام اہل وعیال کے تباہ و برباد ہو جانے کے بعد خدائے سبحانہٗ تعالےٰ نے آپ کی صرف ایک بی بی کو جس کا نام رحمہ تھا۔ اور جو بقول بعض ابن حضرت یوسفؑ کی پوتی تھیں بچا رکھا تھا۔ جو آخر وقت ابتلا تک اپنے شوہر کی رفیق حال اور شریک مصیبت تھیں۔ امتحان و ابتلا میں جوں جوں ترقی ہوتی رہی۔ ویسے ویسے اُن کی وفا اور حسن رفاقت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ مفلوج الاعضا ہو گئے۔ جسم مبارک سے حس و حرکت کی قوت بھی زائل کر دی گئی۔ تمام قوم نے ان کے تفقد احوال سے روگردانی اختیار کی یہ قوت کا دستیاب ہونا بھی دشوار ہو گیا۔ فاقہ پر فاقے ہونے لگے۔ ایک بار اسی حالت میں اُس برگزیدۂ الٰہی کو بے آب و دانہ تین شبانہ روز کٹ گئے۔ جناب رحمہ نے ہرچند تجسس و تلاش کی ایک دانہ نہ ملا۔ وہ خاتون معظمہ اس پر بھی اپنی کوشش وسعی سے باز نہ آئی۔ چوتھے دن کسی دوسرے قریہ میں قوت کی تلاش کو نکلی۔ اُس دن کسی کے ہاں شادی تھی۔ مہمانوں کے لیے ضیافت کے کثیر سامان تھے۔ انواع اقسام کے طعام تیار تھے۔ یہ غریب حسرت آلود نگاہوں سے الوان نعمت کے خوانوں کی طرف دیکھنے لگی۔ صاحب خانہ کی بی بی کی نظر ان کی ضرورت کو پہچان گئی۔ وہ رحمدل تھی۔ اور نیک مزاج۔ انہیں اندر بلا لیا۔ استفسار حال کیا۔ غریب نے اپنی تمام مصیبت کہہ سنائی۔ باتوں باتوں میں اُس عورت نے ان کے سر کے بالوں کو حد سے زیادہ باریک۔ لطیف اور طویل پایا اتفاق سے اُس کی لڑکی کے جس کی شادی کی جا رہی تھی۔ نہایت کم اور چھوٹے بال تھے۔ اور بھدے بدنما معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بالوں کی لطافت کو دیکھکر اس نے یہ سوچا۔ کہ کسی طرح ان کے بال مجھے مل جائیں۔ تو میں ان بالوں کو اپنی لڑکی کے بالوں سے ملا کر گوندھ دوں کہ اُسکا عیب چھپ جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے اس خاتون مقدسہ سے کہا۔ کہ بہن۔ میں ایک شرط پر تمہیں اور تمہارے بھوکے شوہر کو کھانا دینے کے لیے راضی ہوں۔ اگر تم مان لو۔ یہ غریب زدہ بولی جو تم کہو مجھے منظور ہے۔ کسی طرح میرے گرسنہ شکم شوہر مریض کو جو بے آزار و کلفت کی وجہ سے قریب المرگ ہو رہا ہے۔ قوت تو پہنچے۔ اور مجھ کو اس کے زندہ رہ جانے کی اُمید تو بندھ جائے۔ وہ عورت بولی۔ کہ تم مجھے اپنے سر کے بال کاٹ لینے دو۔ کہ مجھے اپنی نو عروس لڑکی کے لیے درکار ہیں۔ کیونکہ اس کے سر میں بہت چھوٹے اور کم بال ہیں۔ میں ابھی ابھی تمہیں اور تمہارے شوہر کے لیے نفیس اور اعلیٰ کھانا دیتی ہوں۔ یہ مصیبت زدہ بی بی پہلے تو خاموش رہی۔ مگر بھوک تھی

کرکے حسن وعصمت اور اُسی کے تمام لوازم و مراتب اُس شوہر کی خدمت و راحت اور صحت پر ہزار بار نثار ہیں۔ جس کی مسرت و آرام کے لیے یہ تمام اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ جن کی بقا کے ساتھ میری بقا وابستہ ہے۔ اور جس کی فنا کے ساتھ میری فنا۔ یہ سوچ کر اُس آفت رسیدہ نے فوراً اپنا سر جھکا دیا۔ اُس عورت نے مقراض سے اُن کے گیسوہائے مبارک تراش لیے۔ اور اُن طعام لذیذ سے دو حصّے اُٹھا کر اُنھیں دے دیے۔ یہ نہایت خوش ہو کر اپنے مقام کو واپس آئیں۔ اور اپنے مقدس ناتوان اور نیم جان شوہر کے آگے دسترخوان بچھا کر وہ کھانے چُن دیے۔ چونکہ بے حسی اور زوالِ قوت کا پورا عالم تھا۔ یہانتک کہ خود ہاتھ سے کھانے کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے کھانا چُن دینے کے بعد وہ وفادار بی بی کھانا کھلانے بیٹھی۔ حضرت ایوبؑ کبھی حصولِ رزق پر اور کبھی ایسی رفیق حال اور شریک مصیبت زوجہ کے ملنے پر پروردگار عالم کا شکر پر شکر کر رہے تھے۔ کہ یکایک سر کے ہوئے گوشہ چادر سے اُس عفیفہ کے کٹے ہوئے بال دکھائی دیے۔ ایسے کامل اور عدیم المثال صابر کو جنگ حرمت ناموس کی ایسی غیرت آئی۔ کہ کھانا زہر ہو گیا۔ سبب پوچھا۔ تو مطیع و فرمانبردار بی بی نے صورت واقعہ بیان کر دی۔ اگرچہ اس واقعہ سے اُس پارسا بی بی کی انتہائے مجبوری ظاہر ہوتی تھی۔ مگر تاہم جناب ایوبؑ کی غیرتِ ناموس اس روح فرسا صدمہ کی متحمل نہ ہوئی۔ بی بی پر خفا ہوئے۔ اور عتاب انگیز لہجہ میں فرمایا۔ کہ اسوقت تو بیماری سے مجبور ہوں۔ مگر صحت پانے پر سو تازیانے کی سزا تمھیں صرف اس تقصیر کے لیے دونگا۔ کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ایک غیر جنس عورت کے سامنے اپنا سر عریاں کیا۔ یہ تو بی بی سے خطاب ہوا۔ اِس کے بعد پھر یہ سوچ کر کہ یہ تمام آفتیں اس موذی بیماری کے باعث ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں ان مضطربانہ الفاظ کے ساتھ مستدعی ہوئے۔

رب انی مسنی الضُّر و انت ارحم الرّاحمین۔ حیات القلوب جلد اوّل

واقعہ حقیقی تو یہ ہے۔ جو مرویات اسلامی سے ماخوذ ہے۔ اور قریب قریب تمامی کتب تفسیر میں مذکور۔ اِس کی صورت وقوع سے خاندان رسالت کے انداز اور برگزیدگان الٰہی کے محاسن و اوصاف پورے طور سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل سے نہ اُس خاتون معظمہ کی کفر شعاری معلوم ہوتی ہے۔ اور نہ بت پرستی۔ بلکہ اس میں تو اُس پاکدامن خاتون کی شوہر کے ساتھ کمال خلوص و محبت اور عقیدت و اطاعت کے اظہار ہوتے ہیں۔ اس کے کسی لفظ یا کسی حرف سے یہ نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ توراۃ کا بیان ہے۔ کہ اس عفیفہ نے نعوذ باللہ اپنے شوہر عالیمقدار کو جس کی رسالت کی یہ تصدیق کر چکی تھیں۔ اور ایک معتد بہ مدت تک خدمت میں رہ کر اُن کی تبلیغ رسالت اور تلقین و تعلیم ہدایت کے اصلی مدعا کو کماحقہ سمجھ چکی تھیں۔ کفر و شرک کے طریقے باطل اختیار کرنے کی ترغیب و تحریص کی تھی۔ یہ وہی لغویات و حشویات ہیں۔ جو ذاتیات انسانی اور اغراض نفسانی کی بدولت کتب قدیمہ سماویہ کے الہامات ربانی اور ارشادات روحانی میں مخلوط ہو کر اُس کی صحت و صداقت پر بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔ اور اُن کے منزل من اللہ ہونے میں شک و شبہ پیدا کرتے ہیں۔ اور حقیقت میں قرآن مجید اُنہی کی صحت و ترمیم کے لیے بارگاہ الٰہی سے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ کا عام اعلان

فرماتا ہوا نازل کیا گیا ہے۔ توراۃ میں شان رسالت کی عظمت نہ کوئی چیز قرار دی گئی ہے۔ اور نہ خاندان نبوت کی حرمت قابل لحاظ و پاس۔ یعقوبؑ کی دونوں بیبیاں۔ لابن کی بیٹیاں۔ رخصت ہونے کے وقت اپنے گھر سے سونے کے بت چرا لاتی ہیں۔ اور اُن کی پرستش کیا کرتی ہیں۔ ایسی ہی پیغمبر زمان کی بی بی اور آئندہ انبیا ومرسلین کی ماں بھی بلا عذر و تامل بنی رہتی ہیں۔ توراۃ کے یہی ارحام مطہرہ ہیں۔ اور یہی اصلاب شامخہ (سفر تکوین۔ باب ۳۱۔ آیت ۲۹۔ ۳۵۔) لطف تو یہ ہے کہ اُن بت چرانے والیوں میں خاص کر راحیل زوجہ یعقوبؑ کا نام لکھا ہوا ہے۔ اور یہ راحیل حضرت یوسف الصدیق کی ماں تسلیم کی جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ من ہذہ الہفوات۔

بہرحال اصل واقعہ یہ ہے۔ جو لکھا گیا۔ اس سے نہ اُس پیغمبر برحق پر کوئی الزام آتا ہے۔ اور نہ اُس کی صادق الایمان بی بی پر۔ چونکہ بمقتضائے بشریت اُس محترمہ سے ترک اولیٰ کا صدور واقع ہو گیا تھا۔ کہ بلا اذن شوہر انہوں نے اپنا سر عریاں کر دیا تھا۔ حضرت ایوب کو ہتک و ناموس کی بڑی غیرت آئی۔ اور اضطراب کے اسی عالم میں آپ نے قسم کھائی۔ کہ صحت یابی کے بعد میں تم پر حد شرع جاری کرونگا۔ چونکہ اس مخدرہ عظمیٰ کا مدعا خلوص حقیقی پر مبنی تھا۔ اس لیئے عادل حقیقی نے ان کے اجرائے سزا و تنبیہ میں وہ طریقہ معتدلہ اختیار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ کہ اُس پیغمبر برحق کی قسم بھی پوری ہو گئی۔ اور اُن کی زوجہ محترمہ کو کوئی تکلیف بھی نہ پہونچی۔ سبحانہ اعظم شانہ۔

دوم۔ نوعیت صحت کے متعلق فاضل معاصر نے بڑی کاوش سے حسب تصریح قرآن ترکیب غسل کو اصول فطرت کے مطابق ثابت کیا ہے۔ اور طبی مشاہدات علمیہ اور خاص وہ اثرات کیمیاویہ سے اس کی تصدیق و توثیق بہم پہونچائی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ آپ کی یہ تحقیق قابل تعریف ضرور ہے۔ مگر حقیقت میں نگاہوں کے سامنے قدرت کے بدیہات ایسے یقینی ثابت ہو چکے ہیں۔ کہ اب ان کے اثبات و اظہار میں زیادہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں۔ ہمارے قابل محقق کا طریقہ اثبات بالکلیہ خواص عرض سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ کہ جوہر سے۔ حالانکہ حقیقت شناس پہلے جوہر کو پرکھتا ہے۔ پھر اُس کے قضا و عرض کو۔ جوہر قدرت ہے۔ اور قضا و عرض اُس کے عطا کیئے ہوئے خواص اور اثر۔ اس مسئلہ سے کسی کو انکار نہیں۔ اس بنا پر اُس چشمہ اور اُس کے پانی کو باعتبار خواص کے حضرت ایوبؑ کی صحت کا جزو اعظم اور سبب اول قرار دینا اور مان لینا۔ تو قدرت کے اصلی فیوض سے صریح چشم پوشی کرنا ہے۔ اس احتیاط کو قائم رکھنے کی غرض سے جو ایک قوی الایمان مسلمان کا فرض ہے۔ تنہا اس طریقہ علاج کو سبب صحت قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ یوں کہنا ہوگا۔ کہ ایوبؑ نے جس ارحم الراحمین سے دعائے صحت کی تھی۔ اُس کی حکمت کاملہ اور رحمت عامہ نے

ظاہر طور پر ان کی صحت کے سامان اُس چشمہ کے پانی میں نہا لینے سے فراہم کر دیئے۔ جسکو حقیقی طور سے اُس حکیم مطلق نے شفا کے تمام اجزا و خواص کے ساتھ اُن کے لیئے پیدا فرمایا تھا۔

بنو ہاجرہ

حضرت اسماعیل علیہ السّلام

اصحابُ الرّس۔ اصحاب الحجر۔ اصحاب الایکہ۔ انصار اور قریش

ہاجرہ۔ اصل میں عبرانی لفظ۔ ہاغار ہے۔ جس کے معنی بیگانے اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں انکا وطن مصر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور سارہ جب مصر گئے۔ تو فرعون نے دیگر انعام و اکرام کے ساتھ یہ لڑکی (ہاجرہ) بھی اُنکے ساتھ کر دی۔ انہی ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ اور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے اصحابُ الرّس۔ اصحاب الحجر۔ اصحاب الایکہ۔ انصار اور قریش عرب کے ممتاز اور سرمایہ ناز قوم و قبائل پیدا ہوئے۔ سارہ کے بطن سے اسحاق پیدا ہوئے۔ جن سے بنی اسرآئیل کی نسل قایم ہوئی۔

شمس العلمائے نعمانی نے سیرۃ النبیؐ میں اور اُن کے شاگرد رشید مولانا سلیمان صاحب ندوی نے ارض القرآن میں بنو ہاجرہ کے حالات کا آغاز حضرت اسمٰعیلؑ کی تفصیل واقعات سے کیا ہے۔ اور جناب ابراہیمؑ کے تصریح احوال کی طرف غالباً اسوجہ سے توجہ نہیں فرمائی ہے۔ کہ عرب میں اُن کا قیام ثابت نہیں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حضرت ابراہیم کے تعلقات مذہبی ہوں یا قومی۔ ملک عرب سے اتنے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔ کہ اُن کی تفصیل و تشریح کے بغیر جناب ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی اولاد کے حالات و واقعات مبہم اور مجمل رہ جاتے ہیں۔ لائق مصنفین کو جناب ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعات ہجرت۔ تعمیر کعبہ اور دیگر واقعات کی تحریر کے وقت حضرت ابراہیمؑ کے جستہ جستہ حالات بیان کرنے کی بالآخر ضرورت واقع ہوئی ہے۔

اسکے علاوہ آیہ کریمہ مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ۔ تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے پہل تمہارا نام مسلمین رکھا۔ کے رو سے جس کو سیرت النبیؐ کے صفحہ ۹۰ میں بذیل ذکر سلسلہ اسماعیلی بڑی خصوصیت کے ساتھ زیب عنوان کیا گیا ہے۔ دین ابراہیمؑ اور اسلام (دین محمد صلعم) متحد بالذات و الحقیقت ہیں۔ جیسا کہ خود تحریر فرمایا گیا ہے۔ کہ پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی آخیر سلسلہ (سلسلہ اسماعیلیؑ)

سے وابستہ ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں۔ اور جو شریعت آنحضرت صلعم کو عنایت ہوئی ہے۔ وہی ہے۔ جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔

سیرۃ النبیؐ جلد اول صفحہ ۹۴۔

جب آپ کے اقرار و اعتراف سے اسقدر اتصال و اتحاد خود ثابت ہوتا ہے۔ تو اصل شرع کے بانی اور حال کے حالات کو مرفوع القلم کر دینا تو گویا اپنی شریعت کے ثبوت فرعیہ ہونے کو ناقص اور مشتبہ چھوڑ دینا ہے دعوے اتحاد کے ساتھ یہ ضرور تھا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کے تعلیم و ارشاد کے ساتھ آنحضرت صلعم کی تبلیغ رسالت کے احکام و اغراض کو بالکل متحد اور متصل ثابت کر دیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اور یہ نقص حالات جناب ابراہیمؑ کی فروگذاشت کے باعث باقی اور قائم رہ گیا۔ صاحب ارض القرآن تو اسکے لیئے یہ معذرت پیش کر بھی سکتے ہیں۔ اُن کے موضوع تالیف کو اس کی تفصیل سے اسقدر تعلق نہیں تھا۔ مگر شبلی صاحب اپنی کوتہ قلمی کی کوئی تلافی نہیں کر سکتے

اِس ضرورت خاص کو مدنظر رکھکر ہم نے اپنی کتاب میں جناب ابراہیم علیہ السلام کے تمام و کمال حالات پوری تفصیل سے قلم بند کیئے ہیں۔ اور ہم اس مقام پر اپنے معاصر مؤلفین کی ترتیب تالیف سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص طریقہ تدوین سے کام لیتے ہیں۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ وآلہ سلام اللہ

خلیل خدا۔ ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ علیہ التحیۃ والثنا تارخ ابن ناحور کے صاحبزادے تھے۔ یہ تارخ وہی ہیں۔ جن کو توراۃ میں تَرَح لکھا ہے۔ تارخ غالباً ترح کا معرب ہے ماں کا نام لونا بنت کرنیاہ ابن کوثی ہے (ابن سعد ج ا۔ ص ۲۱) سلسلہ نسب گیارہویں پشت میں اس تفصیل سے حضرت نوحؑ تک پہونچتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ بن تارخ ابن ناحور بن ساروغ بن راغو بن فالغ بن عبیر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔

مقام ولادت علاقہ بابل میں قریہ کوثی تبلایا جاتا ہے۔ حاکم وقت نمرود ابن کنعان ابن کوش تھا عرب کے علاقہ میں عوف ابن فاران حکمران تھا نمرود اور اُسکی ماتحتی رعایا کے حالات جہاں تک تاریخوں سے بقدر امکان دریافت کئے گئے ہیں۔ تبلا رہے ہیں۔ کہ اُس زمانہ میں علاقہ بابل کے تمام اقوام و قبائل انواع و اقسام کے اصنام و اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ خدا پرستی اور اس کی ذات واحد کی وجود کا کوئی خیال اُن میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے نفوس کو اپنے تمام مال و متاع کے ساتھ بتوں کا مطیع و

منقاد سمجھتے تھے۔ اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو رب العباد۔ بت پرستی کے ساتھ ستارہ پرستی اور شمس پرستی بھی اُن کے اجزائے ایمان میں داخل تھی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ولادت بھی خاص طور پر کرشمہ قدرت ثابت ہوتی ہے۔ ولادت باسعادت کے متعلق اُس زمانہ کے کاہنوں اور نجومیوں کا نمرود کو خبر کرنا۔ اور نمرود کا امتناع ولادت کے متعلق تمام انسانی اور امکانی کوششیں صرف کرنا۔ اور ناکامیاب رہنا عرب کی تمام چھوٹی بڑی تاریخوں میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ ہم اُن کو باعث طوالت اور زائد از ضرورت سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں۔ اور آپ کے حالات کو ایام طفولیت کے واقعات وحالات سے آغاز کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدشناسی اور معرفت کے ابتدائی حالات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا۔ کہ جس فکر جس تلاش اور جس تحقیق سے اس خاصہ خدانے۔ خدا کا وجود۔ اُسکی معرفت اور اُسکی ذات کی خالص وحدت حاصل فرمائی۔ وہ آفرنیش عالم کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک اپنی آپ مثال ثابت ہوتی ہے اخبار واسفار قدیمہ کے جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ حقیقتاً حضرت ابراہیمؑ کو اپنے زمانہ میں اس کی بڑی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ کیونکہ حضرت نوحؑ کی رسالت کے بعد۔ انبیائے اولی العزم کی مقدس فہرست میں کاتبین قدرت نے آپ ہی کا اسم گرامی لکھا تھا۔ حضرت نوحؑ کی رسالت باوجود اتنی طوالت کے وجود خدا۔ اور اُس کی وحدانیت کی تعلیم میں مشکل سے کامیاب ہوئی۔ ہزار سالہ تعلیم و مواعظ کے بعد مومنین اور خدا کے معتقدین کی تعداد اسی نفوس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حضرت نوحؑ کے بعد ان مومنین خالصین کی جماعت قوم کافرین پر اپنی تعلیم کا کوئی اثر نہ پہونچا سکی۔ اور کیونکر پہونچا سکتی تھی۔ جب حضرت نوحؑ کے ذاتی پند و نصائح خود اپنے اہل وعیال پر اپنی تعلیم کا اثر نہ ڈال سکے۔ تو ان غربائے مومنین کے ارشاد و ہدایت کو کون سنتا ہے۔ جو حقیقتاً خدا کی طرف سے درجہ نبوت یا منصب رسالت پر فائز بھی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ حضرت نوحؑ کی وفات سے جناب ابراہیمؑ کی ولادت تک کے درمیانی زمانہ میں دنیا پر کفر وفسق کی گھٹاٹوپ تیرگی چھا گئی۔ خدا کی وحدانیت کیسی۔ اُسکے وجود اُسکی معرفت کا خیال ہی نسیاً منسیاً ہوگیا تھا ایسی عالم تاریکی اور عالمگیر ظلمت کے زمانہ میں نظام مشیت نے سواد عالم کے مختلف حصوں میں اپنی وحدانیت کا نور اور اپنی معرفت کی عالمتاب شعاعیں اپنے ایک خالص اور کامل بندے کے ذریعہ سے پھیلائیں۔ اور دُور دُور تک پہونچائیں۔ جو اپنی ذاتی تلاش اپنی تنہا فکر اور اپنے خاص قلبی خلوص سے اُسکی کامل معرفت حاصل کرچکا تھا یُقَالُ لَهٗ اِبْرَاهِیْم۔ اُس کو ابراہیم (علیہ السلام) کہتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی تحقیق معرفت اور تحصیل علوم الٰہیات کے حالات پر اطلاع رکھنے والے

حضرات آپ کے استغراق فی المعرفت اور اُس ریاضت و مشقت کے واقعات کو پورے طور سے جانتے ہیں جو اس راہِ عرفان کے مجاہد اور کامل موحّد کو اپنے معبودِ حقیقی اور اُس کے وجود و وحدت کی تلاش میں پیش آیا کئے ہیں۔ اور اُن کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ فطرت انبیا کے اُصول معارف کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی مقدس طبیعت طفولیت کے وقت سے۔ خاموش۔ خلوت پسند۔ تارک العلائق اور غور و فکر میں ہمیشہ ڈوبے رہنے کی خوگر واقع ہوئی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کا خاندان ہمیشہ سے معزز تھا۔ اور مقرب شاہی۔ باپ (تارخ) خزانۂ شاہی کے کلید بردار تھے۔ اور نمرود کے دربار شاہی میں بڑے صاحب اقتدار (مواہب لدنیہ۔ حیات القلوب) آذر چچا تھے۔ بہت بڑے دستکار۔ اور شاہی بت تراش بدقسمتی سے ان کی صنعت و دستکاری بت تراشی اور صنم سازی ہی تک محدود تھی۔ اور کیونکہ نہ ہوتی۔ اس لیئے۔ کہ اُس زمانہ میں یہی ایک صنعت بہت بڑی صنعت تھی۔ اور اس کی تمام دنیا میں عالمگیر ضرورت تھی۔ آذر نے اپنے اس کام کے لیئے اپنے مکان کا ایک حصّہ خاص طور پر علیحدہ کر لیا تھا جس میں مختلف الانواع و اقسام کی مورتیں اور مصنوعی خداؤں کی مختلف الاوضاع صورتیں بنایا کرتے تھے۔

قدرت کے عجیب و غریب نظام نے اپنے خالص موحّد اور کامل مصدق کو اسی گھر میں پیدا کیا۔ جہاں فرزانت اُنکے عقائد فاسد کے مطابق ہزاروں خدا بنا کرتے تھے۔ معمول کے مطابق ضرور تھا۔ کہ اس بچّے کی طبیعت بھی اپنے گھر والوں کے اُصول عقائد پر نشو و نما پاتی۔ مگر نہیں۔ یہاں تو نظامِ مشیت کو یعرف الاشیاء باضدادھا (اشیاء عالم کی معرفت علی الاکثر اُن کی ضد سے حاصل ہوتی ہے۔) کے اُصول مسلّمہ کے مطابق۔ بت تراشی کی اس صنعت گاہ کو اپنی یکتائی اور وحدانیت کی جلوہ گاہ بنانا تھا۔ اور دُنیا کو اپنی جبروت قدرت کا ثبوت دکھلانا تھا۔ اس لیئے اُس نے اپنے اِس موحّد اور بت شکن پیغمبر کو خاص کر اسی گھر میں پیدا کیا جہاں بت اور بت پرستی کے اوزار بنا کرتے تھے۔

تمہیداً اِتنا لکھکر ہم اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اوپر بتلا چکا گیا ہے۔ کہ آغاز طفولیت سے خاموشی استغراق اور محویت کی حضرت ابراہیمؑ کو عادت تھی۔ اسی طرح آغاز عمر سے ان پتھروں کے ٹکڑوں سے نفرت۔ جس کی وجہ سوائے تصرّفِ قدرت اور ودیعتِ مشیت کے کچھ اور نہیں بتلائی جاسکتی اور اسی کی بنا پر جیسا کہ عرب کی تمام قدیم و جدید اخبار و آثار بتلاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے چچا اس صنعت و دستکاری کو ذلت و خواری کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اور جب کبھی موقع اور وقت پاتے تھے۔ تو اپنے چچا کے اس ریاض۔ مشقت اور صنعت کو خراب کر دیا کرتے تھے۔ اور مورتوں کی بنی بنائی صورتوں کو کسی کی آنکھ۔ کسی کی ناک۔ کسی کے کان توڑ کر۔ بگاڑ دیا کرتے تھے۔

حقیقت شناس حضرات عام وخاص طبیعتوں کی تفریق وتخصیص کے مسئلہ کو یہیں سے سمجھ جائیں۔ معمول کے مطابق عام بچے اور اُن کی طبیعتیں۔ فطرتاً جسقدر کھلونوں اور مورتوں کی شائق اور گرویدہ ہوتی ہیں۔ اُس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے مگر بخلاف اس کے یہ بچہ سہواً اور اتفاقاً نہیں۔ بلکہ عمداً اور قصداً اُن کھلونوں اور مورتوں کو توڑ دیتا ہے۔ گویا اُس کی طبیعت کو عام بچوں کی فطرت کے بالکل برعکس اِن اشیاء سے کوئی دلچسپی اور شغف ہی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی جگہ خاص نفرت ہے۔ اور کراہیت۔ اس سے ہر ممیز اور محقق شخص نتیجہ نکال لیگا۔ کہ خاصان الٰہی کی طبیعتیں بھی خاص ہوتی ہیں۔ اور عام کی عام۔

آذر نے پہلے اسکا کوئی خیال نہیں کیا۔ مگر دو ایک دن کے بعد اُنھیں حقیقت حال معلوم ہو گئی۔ کہ یہ ابراہیم کے ہاتھوں کی صفائی ہے۔ محبت کے تقاضے نے زیادہ زجر و توبیخ کی اجازت نہیں دی۔ مگر ہاں اتنی احتیاط احتیاط کرنے کی مجبوری البتہ ہو گئی۔ کہ باہر جانے کے وقت دروازہ بند کر دیتے تھے۔ مگر اس پر بھی جب کبھی عجلت میں باہر جاتے وقت دروازہ بند کرنا بھول جاتے تھے۔ تو یہ بچہ جس کی گھٹی میں دایہ فطرت نے بت شکنی کے اجزاء ودیعت فرمائے تھے۔ اُن تمام بتوں کو سمار و بیکار کر دیتا تھا۔ آذر دیکھتے تھے۔ کچھ اپنی محبت کچھ بھائی کی مروت اور کچھ اس بچے کی رعایت کی وجہ سے خاموش رہ جایا کرتے تھے۔ اور بچے کی ان حرکتوں کو اُس کی طفولیت کا تقاضا سمجھا کرتے تھے۔

تھوڑے دنوں کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ سن رشد و تمیز تک پہونچے۔ تو آذر نے۔ خدا کی شان۔ اس حقیقی بت شکن سے بت فروشی کی خدمت لینی چاہی۔ آذر اپنی شامت اعمالی سے اس کاروبار کا مدت سے بیوپار کرتے تھے۔ نفیس صنعتوں اور تحفہ دستکاریوں والے بُت تو آپ بیچنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور معمولی بتوں کی فروخت کے لیے اُنھیں بھیجدیا کرتے تھے۔ عرب کی قدیم تاریخوں میں اُسوقت کے بعض واقعات حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں آجتک محفوظ پائے جاتے ہیں۔ اور وہ اس طرح مذکور و مشہور ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ ان بتوں کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر اُن کو زمین پر گھسیٹتے لے جایا کرتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے۔ ایشتری من یشتری شیئًا لا ینفع ولا یضر کیا کوئی ایسی چیزوں کو مول لیگا۔ جو نہ نفع پہونچا سکتی ہیں نہ ضرر کبھی ان سنگین مجسموں کو گھسیٹ کے دریا یا چشمے کے قریب لاتے تھے۔ اور زمین پر رکھ کر اُن سے کہتے تھے۔ اشرب لو کان یعقل۔ اگر تم میں قدرت ہو تو پانی پی لو۔ روضۃ الاحباب باسناد مواہب وروضۃ الصفا۔ ج ۲ بانیاد حافظ دینوری اور حیات القلوب مجلسی ج اول۔

ان واقعات پر اکثر بزرگوار۔ معمولی اخبار۔ مقامی روایت اور اکثر افسانہ وداستان کا حکم لگا کر ان باتوں کو توجہ اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ وہ اگر ذرا سی غور و خوض سے کام لیں۔ تو اُن کی اصلیت کا اُن کے

قلوب پر پورا انکشاف ہو جائے۔ قدرت نے اس موحد الٰہی کی طبیعت میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ بت پرستی سے نفرت، معرفت و خدا شناسی سے خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ فطرت انسانی کے اصول ارتقا کے مطابق جیسے جیسے ان کے سن و سال میں ترقی ہوتی گئی۔ یہ جوہر بھی ویسے ویسے قوت پکڑتے گئے۔ اور بڑھتے گئے۔ ان کی طفولیت کا زمانہ رشد و تمیز کے حدود تک آ پہونچا تھا۔ اور اس خاصہ خدا کی محقق اور مبتلاشی طبیعت اپنے مدعائے تحقیق کو ہر پہلو اور ہر طریقہ سے اپنی خاص فکر و تلاش کے ساتھ آپ سمجھنا چاہتی تھی۔ اس ضرورت و امتحان کی بنا پر کبھی ان پتھروں کے لاوجود اور بے مقدار ٹکڑوں کو۔ جن میں ہر قسم کی قوت و قدرت مشہور کی جاتی تھی۔ اس ذلت و حقارت سے زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر آزمایا جاتا تھا کہ اگر واقعی وہ پتھر کے مجسمے کسی قوت یا قدرت کے پیکر ہیں۔ تو اپنی اہانت کرنے والوں سے اُٹھ کر دست و گریبان ہونگے۔ یا بدلہ لینگے یا کم سے کم انھیں کوئی جسمانی یا روحانی آزار پہونچائیں گے۔ اور کبھی اُن کے قوائے روحانی کی جگہ اُن کے مصنوعی اعضائے جسمانی کے احساس۔ اور اُن میں اُن کے وجود اور عملی قوت و امکان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ کہ پانی کے کنارے لاکر رکھے جاتے تھے۔ اور آزمایا جاتا تھا۔ کہ اُن کے ظاہری لب و دہان میں اگر اتنی قوت و امکان ہے۔ تو وہ پانی پی کر دکھلا دیں۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے یہ تمام افعال و احوال آپ کے اسی امتحان اور قلبی اطمینان کی غرض خاص پر مبنی تھے جو آپ کی تحصیل معرفت کا دیباچہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور جن کا ذکر قرآن مجید کے متواتر مقامات میں مذکور ہے۔ اور جو آپ کی حیات ستودہ آیات میں آپ کی تحصیل معرفت۔ تحقیق توحید کے اصلی اور حقیقی معیار قائم ہوتے ہیں۔ ہم اُن کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مقام پر اپنے سلسلہ بیان میں پوری تفصیل کے ساتھ بہت جلد بیان کریں گے۔ جب آپ کے ان ابتدائی حالات و واقعات کا پورا تعلق آپ کے ان اصلی اور حقیقی معیار سے ملحق ہے۔ جنکا ذکر قرآن مجید میں داخل ہے۔ تو باوجود اس کے کہ ان کے محالات عقلی یا عادی ہونے پر بھی کوئی وجہ یا دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔ تو پھر اُن کو معمولی اخبار۔ مقامی روایات اور افسانہ و داستان ٹھہرانا بے عقلی کا انکار اور ناحق کا اصرار ہے

اپنے گھر کی گلہ بانی قوم کے خداؤں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے یہ اہانت خیز حرکات عام شکایت کے باعث ہوئے۔ توگوں نے آذر کو حضرت ابراہیمؑ کی تنبیہ و تادیب کی طرف توجہ دلائی۔ آذر نے ابراہیمؑ سے یہ خدمت لینی موقوف کر دی۔ اور اس ترکیب سے عام شکایت کا دروازہ بند کر دیا۔ مگر آذر نے یہ تو کر دیا۔ اور گویا باہر کی توہین اصنام سے ابراہیمؑ کو روک دیا۔ مگر اس سے گھر کے اندر جو ان بتوں کی ذلت و خرابی ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے آئے گئے دن ہوا کرتی تھی۔ اُس کی اصلاح کیسے ہو سکتی

تھی۔ آذر نے بالآخر یہ تجویز ٹھہرائی۔ کہ ان کو گھر کی دُنبیاں چرانے کی خدمت سپرد کردی جائے۔ اور تارخ نے بھی یہ دیکھکر کہ ابراہیمؑ کا سن ان اقسام کے خانگی کاموں کے قابل ہو گیا ہے۔ اِس تجویز سے اتفاق کرلیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو گھر کی دُنبیاں سپرد کردیں۔ اسوقت سے گویا اِس ساعیِ میدان عرفان اور راعیِ قوم انسان نے تحصیل معرفت الٰہیہ اور تحقیق وجود لاانتہا میں اپنی علمی کوششوں کا پورا موقع پایا۔

چونکہ یہ خدمت خاص انبیاء و مرسلین کی سیرت کا جزو قدیم ثابت ہوتی ہے۔ اس لیئے حضرت ابراہیمؑ کے ایسے پیغمبر اولی العزم کی رسالت کا بھی اس کو دیباچہ تسلیم کرنا ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہایت مسرت سے اس خدمت کو قبول کرلیا۔ گھر کی دُنبیوں کے گلے کو لیکر آبادی سے دُور پہاڑ کے دامن اور صحرا کے کھلے میدانوں میں لے گئے۔ یہ مقامات گھر سے زیادہ آپ کی دلچسپی۔ دلبستگی اور روحانی فرحت کے باعث ہوئی کیونکہ آپ کی خلوت پسند طبیعت کو خدائے سبحانہ تعالےٰ کے وجود۔ اُس کی وحدت و قدرت کے متعلق پورے اطمینان و فراغت سے غور و خوض کرنے کے لیئے اس سے بہتر کوئی دوسرا مقام اور موقع نہیں ملسکتا تھا۔ ان حالات و واقعات پر غور کرنے سے اِن مشغلۂ خاص میں آپ کا یہ روزانہ دستورالعمل معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ سویرے سے دُنبیوں کو دامن کوہ یا بطن وادی میں لاکر چرنے کیلیئے چھوڑ دیتے تھے۔ اور خود کسی غار میں بیٹھکر یا کسی پتھر کی چٹان سے لگ کر یا اُس صحرائے ناپید الکنار کے کسی گوشہ میں جا کر معبود حقیقی کے وجود اور اُس کی وحدت کے مسئلہ میں دن دن بھر سوچتے۔ سمجھتے اور غور کرتے رہتے۔ وہ میدان ہوتا تھا اور یہ متلاشیِ عرفان اکثر اوقات پہاڑوں اور اُن کی گھاٹیوں میں اس معرفت الٰہی کے شیدائی کو اپنی فکر و تلاش میں پورے پورے دن گذر جاتے تھے۔ اور محویت کے اسی وجدانی عالم میں اِس سرگشتہ عرفان کو اپنے سر و پا کی مطلق خبر نہیں رہتی تھی۔ سر مبارک زانوئے فکر پر جھکا رہتا تھا۔ حق بین آنکھیں تصور اور استغراق کے عالم خاص میں کبھی کھلی کبھی جھپی تھیں۔ تحقیق وجود اور تصدیق توحید کے مسئلہ پیش نظر تھے۔ فطرت انسانی اور جذبات روحانی کے معارضے اور مجادلے سامنے تھے۔ یہ تنہا اور سنسان میدان۔ دشت و صحرا کا وسیع ریگستان پہاڑوں کے دامن۔ گھاٹیوں کے گوشہ عافیت۔ غاروں کی خلوت کے قدرتی منظر اِس مجاہد فی سبیل اللہ کی دلچسپیوں کیلئے کافی تھے۔ یہ وہی سامان تھے اور اسباب جیکو مسبب الارباب ازلی نے اِن کی تعلیم و ہدایت۔ تسکین و اطمینان اور تحقیق و امتحان کی غرض سے خاص طور پر فراہم فرما دیئے تھے۔ دُنبیوں کو اپنے اذوقہ اور چارے کی تلاش تھی اور ابراہیمؑ کو نور معرفت کے نظارے کی۔

دن بھر اسی عالم و کیفیت میں اِس شیفتۂ حقیقت کو گذرتا تھا۔ رات ہوتی تھی۔ تو دُنبیوں کو گھر لاتے تھے۔ مگر گھر آنے پر بھی دن بھر کی محویت۔ اُس کی کیفیت اور اُس کے جذبات آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے نہیں تھے۔

خوابگاہِ استراحت بھی اسی تلاش وسعی کی جولان گاہ بن جاتی تھی۔ اور تمام رات شاہدِ حقیقی کی جستجو اور خیال میں کٹ جاتی تھی۔

جناب ابراہیمؑ کے ایامِ طفولیت اسی مشق و ریاضت میں تمام ہوگئے۔ اور اب شباب کا زمانہ شروع ہوگیا۔ جیسے جیسے سن میں ترقی ہوتی تھی۔ اور قوائے جسمانی بڑھتے تھے۔ ویسے ویسے احساس و ادراک عرفانی قوی اور مستحکم ہوتے جاتے تھے۔ اور اصولِ نمو کے مطابق ان کی کیفیت اور اہمیت میں یومًا فیومًا بڑھتی جاتی تھی۔ منتظمانِ قدرت اور مدبرانِ مشیت نے ان قدرتی مناظر اور اُن کے سامانوں کو ان کی تعلیم و ہدایت تحقیق و تصدیق میں پوری کامیابی کے لیے ازحد مفید۔ اور ضروری قرار دے لیا تھا۔ اور یہ پُراثر دلچسپیاں بھی آپ کی فطرتِ صالح اور طبعِ مقدسہ کے مطابق اور بالکل موافق ثابت ہوئی تھیں۔ اس لیے اس خدا کے شیدائی اور اُس کی یکتائی کے عاشقِ صادق کو ان ویران مقامات اور سنسان خرابات کے مقابلہ میں نہ گھر کی راحت پسندی تھی اور نہ گھر والوں کی معاشرت۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پورے سنِ تمیز پر پہونچکر۔ شب کو گھر میں واپس آنے کا معمول بھی ترک کر دیا گیا۔ اور گھر میں کئی کئی دن تک آپ کی صورت پر کسی کی نظر بھی نہیں پڑتی تھی۔ جوان ہوہی چکے تھے۔ ہر قسم کی تمیز ہر قسم کی سمجھ آہی چکی تھی۔ اس لیے گھر والوں کو آپ کے آنے یا نہ آنے پر کسی خاص اضطراب و اندیشہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب تک سن کم تھا۔ تلاش و تحقیق کی مشق و ریاضت بھی کم تھی اور معلمانِ قدرت بھی سن کے اعتبار سے اس متعلمِ الٰہی پر تحصیلِ معرفت کا زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ جیوں جیوں سن بڑھتا گیا۔ مشق و ریاضت بھی بڑھتی گئی۔ سنِ شباب پر پہونچ گئے۔ تو تحصیلِ معرفت بھی حدودِ تکمیل تک پہونچ گئی۔ خدا کی یکتائی اور اُس کی شناسائی کے پیچیدہ اور اہم ترین مسائل پر غور و خوض کی ضرورت ہوئی ان کے رموز و غوامض ایسے نہیں تھے۔ جو گھنٹہ دو گھنٹے یا ایک شبانہ روزی تلاش و تحقیق میں حل ہوجاتے ان کے لیے بہت زیادہ اور وسیع وقت درکار تھا۔ اور بڑے غور کی ضرورت تھی۔ اور گہری فکر و خوض کی حاجت چونکہ اس جوانِ صالح کے تمام قوائے مدرکہ ان معلومات و محسوسات کے لیے کامل طور سے موزوں اور تیار ہوچکے تھے۔ اور تعلیمِ یزدانی اور جذباتِ روحانی کے ذریعوں سے تحریک و تائید پہونچانے کے لیے ہمہ دم معین و مددگار تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے گھر کا رہنا ترک کرکے زیادہ تر پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنا اختیار کیا۔ دُنبیوں کا چرانا اور گلہ بانی ان کے لیے نظامِ قدرت کا ایک ظاہری حیلہ تھی۔ جو آخر میں تحصیلِ معرفت اور تفویضِ رسالت کا اصلی وسیلہ ثابت ہوئی۔

شاہدِ معرفت کی پہلی جلوہ آرائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سنِ مبارک پچیس برس کا ہوچکا ہے۔ ایک بار اُسی محویت اور وجدانی کیفیت

کے خاص عالم میں مسائلِ معرفت میں غور فرما رہے ہیں۔ کئی دن ہو چکے ہیں۔ کہ گھر کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ خور و نوش بالکل فراموش۔ نہ سونے کا خیال نہ آرام لینے کا ہوش۔ بقائے روح کی ضرورت سے جنگل کے پھلوں اور چشموں کے پانی پر بسر ہوتی ہے۔ جس جگہ بیٹھتے ہیں وہیں بیٹھے ہیں۔ جس مقام پر محو فکر ہیں وہیں کے ہو رہے ہیں۔ ایسا عدیم المثال استقلال ہے۔ اور استحکام۔ ایسی قوی محویت ہے۔ اور استغراق۔ کہ دنیا کی کوئی خواہش کوئی تعلق اُسے جنبش اور لغزش میں نہیں لا سکتا۔ محویت کے اسی عالم کئی دن گذر چکے ہیں۔ اور آج کا دن بھی بلا تصفیہ تمام ہو رہا ہے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ آسمان کے بیشمار ستارے اُس کھلے میدان اور صاف و شفاف ریگستان میں اپنی روشنی پھیلاتے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر معرفت الٰہی کے اس شیدائی کو اپنی محویت میں کسی کی بھی خبر نہیں۔ وہ زانوے فکر پر سر غور جھکائے جہاں بیٹھا ہے۔ وہاں بیٹھا ہے۔ یہاں تک کہ رات کا حصہ زیادہ آگیا۔ مگر اُس کی محویت میں کمی نہ آئی۔ خدا خدا کر کے اُس متلاشی نورِ معرفت کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اوپر اُٹھیں۔ اُدھر سلطانِ قدرت اور منتظمانِ مشیت کو اس سرگشتہ معرفت کی ہدایت کا نہایت آسان اور سہل ذریعہ ہاتھ آگیا۔ نظر اُٹھاتے ہی خدا کے اس عاشقِ صادق نے ایک اخترِ تاباں اور کوکبِ درخشاں کو نہایت آب و تاب سے آسمان پر چمکتا دیکھا۔ اور شاہدِ معرفت کی جلوہ نمائیوں کی محویت اور کمال اشتیاق میں اُس کی ضیا نمائی کو انوارِ حقیقت کی جلوہ آرائی سمجھا اور بیساختگی کے غیر متحمل عالم میں ھٰذَا رَبِّی پکار اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کی چمک دمک مدہم پڑ گئی۔ اور اس متلاشی حقیقت کو اپنی اس بیساختگی کی مبادرت کا فوراً خیال آگیا۔ اور زوال زوال و انقلاب کو وجودِ ازلی اور نورِ ابدی کے منافی و مناقض پا کر اُسی وقت اپنی مبادرت بیجا یاد آئی۔ اور فوراً اِنِّی لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کہہ کر اُس جرمِ فلکی کی بے حقیقی کا اظہار اور وجودِ حقیقت کے غیر متغیر ازلیت اور ابدیت کا اقرار فرمایا۔

اس تدبیر سے ممتحنانِ قدرت نے اوّل بار اپنے وجودِ معرفت کے اِس متجسس کی اِس حیرت انگیز طریقے سے آزمائش کی اور اُس کو کامل پایا۔ ان سامانوں کو دیکھکر اُصولِ عرفان اور وجود یزدان کا یہ متلاشی اور محقق اپنے اس کلیّہ سے کہ زوال پذیر وجود ازلی اور ابدی نہیں ہو سکتا۔ اپنا قلبی اطمینان فرما کر پھر اپنی اُسی حالتِ محویت میں محو ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر نظر اُٹھاتا ہے۔ تو ماہتاب کو اپنے پورے کمال کے ساتھ چاروں طرف روشنی پھیلاتا ہوا پاتا ہے۔ اور اُس کی صاف و شفاف روشنی کے مقابلہ میں چھوٹے چھوٹے تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی بالکل مدہم نظر آتی ہے یہاں اور اُسکے سامان دیکھکر اُس مبتلائے شوق معرفت کے دل پر پھر وہی کیفیت طاری اور لب و زبان پر ھٰذَا رَبِّی کی پھر وہی عبارت جاری ہوتی ہے۔

چشم زدن میں ماہتاب بھی اپنے شرف کی منزلیں طے کرکے آہستہ آہستہ اپنی روشنی میں کمی پیدا کرنے لگا۔ یہ تغیر پر حالت دیکھکر پھر اُن کے دل میں معبود حقیقی کی معرفت جوش زن ہوئی۔ اور اب کی بار اُس محقق عرفان نے اُصول حجت کی جگہ درگاہ رب العزت میں اپنی ہدایت کی مسئلت ان الفاظ میں فرمائی لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۔ اگر میرا پروردگار مجھ کو راہ ہدایت نہ دکھلائے گا۔ تو (کہیں) میں بھی لوگ نہ گمراہوں کی قوم میں ہو جاؤں۔ بارگاہ الٰہی میں یہ استغاثہ پیش فرما کر آپ نے پھر اپنا اطمینان قلب فرمالیا اسی واقعہ سے انسان اپنے تمام کمالات عقلی کی بساط وحیثیت کا اندازہ کرلے۔ عام اس سے کہ اُس کی عقل کی جوہر اُس کی فکر وتلاش کے کمال ترقی کے انتہائی درجہ تک نہ پہونچے ہوں۔ مگر تاہم وہ قادر مطلق کی غیر مرئی تائید وتوفیق کا ہر حال میں محتاج بنا رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سالہا سال کی تحقیق اور شبانہ روز کی فکر وتلاش۔ قدرت کے امتحان کے وقت لغزشہائے بشری سے آمیز ہو جاتی تھی۔ مگر آپ کی فطرت صالحہ خدا کی توفیق وتائید اُن کی فوراً اصلاح کردیتی تھی جسکا اعتراف واقرار اُس پیغمبر برحق کی زبانی ابھی ابھی اُوپر لکھا جاچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بشریت کو اپنی تلاش حقیقت میں خطور کرتے ہوئے دیکھکر آخر میں ضلالت وگمراہی سے محفوظ رہنے کے لیے خدائے یکتا سے دعا کی۔ اور سوائے اس کے اپنی ہدایت اور تحصیل معرفت کا کوئی دوسرا وسیلہ اور ذریعہ نہیں پایا۔ یہ بھی اُس خاصہ ربانی کی کامل الایمانی ہے۔ اور کمال خدادانی۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس امتحان ثانی کے وقت بھی پوری کامرانی حاصل ہوئی۔ ماہتاب پر وجود رب الارباب کا کچھ یونہیں سا دھوکا ہو گیا تھا۔ وہ بھی آپ کے اُس قلبی اضطراب اور فوری جذبات کے باعث سے تھا۔ جو حصول معرفت کے لاانتہا اشتیاق وتمنا کی شدت میں آپ کے قلب نورانی پر مستولی ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ماہتاب بھی غروب ہو گیا۔ اور یہ عالم بھی آپ کے دل سے زائل ہو گیا۔ فضائے عالم میں ماہتاب کے ڈوب جانے کے بعد چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ ستاروں کی دھیمی روشنی اُس کی کوئی اصلاح نہ کرسکی۔ خدا کا وہ سچا متلاشی اور اُسکے وجود کا حقیقی جویا انقلاب وتغیرات کے یہ منظر۔ یخرج الظلمت من النور ویخرج النور الی الظلمت کے گوناگوں عالم دیکھتا رہا۔ سمجھتا اور اُن پر نہایت تحقیق سے غور کرتا رہا۔ اس محویت۔ خاموشی اور خود فراموشی کے عالم میں اتنا عرصہ ہو گیا۔ کہ رات کا باقی حصہ تمام ہو کر صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ تاروں کی رہی سہی روشنی اور بھی دھیمی پڑنے لگی۔ نسیم سحر کی سبک خیز موجہ جنبانی شروع ہو گئی۔ درختوں پر جانور بولنے لگے۔ صبح کا سپیدا پھیل چلا۔ اور رفتہ رفتہ تمام دنیا روشن ہو گئی۔ اسی عالم میں معرفت الٰہی کا یہ شب زندہ دار بھی اپنی محویت سے بیدار ہوا۔ سر اُٹھایا۔ تو آفتاب عالم تاب کو سامنے

بابا بشریت کا قیاس۔ فطرت انسانی کا وسواس آگے آیا۔ اور اس حد سے زیادہ روشن اور سب سے بڑے اور عظیم الشان جرم فلکی کی اہمیت و عظمت پر قیاس کر کے اُسکی زبان سے هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ کا فقرہ نکلا۔ مگر دوپہر ہوتے ہی اُس کی تیزی بھی مدہم پڑ گئی۔ وہ حرارت تمازت اور وہ آب و تاب بالکل جاتی رہی۔ اس محقق ربانی کو پھر اپنی تحقیق کی خامی اور حصول معرفت میں اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ اور یہ یقین کامل کہ دل سے وسواس و قیاس کے تمام خطور جاتے رہے۔ آنکھوں کے سامنے سے مجاز کے حجاب اُٹھ گئے۔ شاہد حقیقت کے نور نے اپنا جلوہ دکھلایا۔ معرفت کی تحقیق کامل ہو گئی۔ اور خدا کے وجود و وحدت کی تصدیق حاصل۔ چونکہ اس شیفتہ حقیقت کو اجرام فلکی کے عارضی اور مجازی انوار بار بار دھوکے میں ڈالتے تھے۔ اور پتھروں کے اصنام کے ساتھ ہی ساتھ ملک و قوم میں اجرام فلکی کی پرستش بھی بڑے زوروں سے جاری تھی۔ اس لیے خدائے واحد کے اس اصلی مصدق نے اپنی تصدیق و تحقیق کے کامل ہو جانے کے بعد اپنے بیجا قیاس کی تردید و تنسیخ میں جو پہلا کلمہ اپنی زبان سے نکالا۔ وہ حقیقت میں گمراہان قوم ہی کی طرف خطاب اصلی تھا۔ جو ان اوہام و قیاسات کے اعتبار پر ان اجرام کو اپنا معبود سمجھ کر پوج رہے تھے۔ جو کلمہ تمام قوم کی تعریض میں ارشاد ہوا تھا۔ وہ یہ ہے یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اے قوم کے لوگ! تم لوگ جو شرک کے کام کر رہے ہو۔ میں اُس سے بالکل بری الذمہ ہوں۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی فطرت صالحہ قوم کے ان ناپاک اعمال و افعال سے ہمیشہ سے متنفر تھی۔ مگر جیسا کہ ابھی مذکورۂ بالا صورت واقعہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ قوم و ملک کے اس گمراہانہ اور مشرکانہ رسم و رواج نے آپ کے عین تحقیق معرفت کے موقع پر بار بار حائل ہو کر اشتباہ و شکوک پیدا کرنا چاہا تھا۔ مگر آپ کی فطرت نہ کوئی معمولی فطرت تھی۔ اور نہ آپ کی طبیعت کوئی عامیانہ طبیعت۔ صانع عالم نے عالم وجود ہی سے آپ کی طبع مقدسہ کو فطرت صالحہ کے اُصول و اجزا سے مصنوع و مرتب فرمایا تھا۔ اور آپ کی طبیعت میں تقدیس۔ نیز زہد اتقا اور اصطفا کے تمام بیش بہا جوہر بدر خلقت کے وقت ہی سے ودیعت فرما دیئے تھے۔ اس بنا پر۔ بشریت کے اس ناگزیر اور عارضی اشتباہ اور قاصر عن الانفصال احوال و مواقع پر تائید ربانی اور توفیق یزدانی نے مختصر سے امتحان اور تھوڑی سی آزمائش کے بعد اپنے اس برگزیدۂ بارگاہ کی پوری رہنمائی کر دی۔ اور پھر چشم زدن میں اُس کے کمال تحقیق اور غایت تصدیق میں ایسا ابدی استقلال و استحکام عنایت فرمایا۔ کہ اُس کامل المعرفت نے بارگاہ رب العزت میں اُسکی عظمت و جلال کا اعتراف اور اپنی عبودیت کا اقرار ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ترجمہ۔ میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رخ

اُس ذات پاک کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمان وزمین کو بنایا ہے۔ اور میں تو مشرکوں میں سے (کبھی) نہیں ہوں۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کی معرفت اور خداشناسی کے واقعات دُنیا کے کارناموں میں اپنی آپ مثال ہیں۔ یہی وہ واقعات ہیں جن سے ہمارے مذکورۂ بالا دعوے کا ثبوت کامل ملتا ہے۔ اس خدارسیدہ بزرگ نے اپنے پروردگار کی یکتائی اور اُس کی بارگاہ تک اپنی رسائی پانے میں بار بار امتحان وآزمائش کی مصیبتیں اُٹھائیں۔ بشریت وروحانیت کے تمام دشوار گذار مراحل ومسالک طے فرمائے عقل سلیم اور نفس غیر مستقیم کے روزانہ مجادلات ومطالبات فیصل فرمائے قلب کے نورانی اقتباسات اور روحانی جذبات کو انسانی وساوس وقیاسات سے کبھی مغلوب نہونے دیا۔ اشتباہ واوہام کی تیرگی کو اپنے دل میں انوارِ حقیقت کے پاس آنے کی اجازت نہیں دی طبیعت کے معمولانہ انداز کو برابر روکا۔ فطرت صالحہ کی ہدایت وارشاد کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنایا۔ وجود الٰہی کی تصدیق کی۔ اور اُس کی وحدت کی تحقیق معبود حقیقی کی تلاش وجستجو اپنی حیات ووجود کا اصلی مُدعا سمجھا۔ آغاز طفولیت سے لیکر شباب کا پورا زمانہ آگیا۔ مگر اتنی مدت میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ تلاش وخیال کبھی اپنے قلب نورانی سے نہیں نکالا۔ بالآخر سبیل معارف کے اِس مجاہد کی روزانہ کوشش اور کدوکاوش نے اسکو ایسا کامل عارف باللہ اور حقیقت آگاہ بنایا جس نے تمام اقطاع میں اپنے فیضان ہدایت اور انوارارشاد سے معرفت الٰہی کی روشنی پہونچائی۔ ایسا قدسی نفس حقانیت کا متلاشی۔ وحدانیت کا جویا جو ابتلا وامتحان کے ہر موقع پر کامیاب وکامران رہ کر اپنی صادق الایمانی اور کامل الاعتقادی ثابت کرچکا ہو۔ کیونکر اپنی آپ مثال اور اپنی آپ نظیر نہیں تسلیم کیا جائے گا۔ جناب ابراہیمؑ علیہ السّلام کے واقعات حیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ آپ کی عمر کا تمام زمانہ ارض بابل سے ہجرت فرمانے اور شام ومصر وکنعان میں قیام رکھنے کی مُدّت تک خصوصًا تحقیق عرفاں اور تصدیق ایمان کے معارج امتحان میں صرف ہوگیا ہے۔ جسکو ہم اپنے سلسلہ بیان میں آگے اپنے اپنے مقام پر پوری تفصیل سے بیان کریں گے۔

مرقومۂ بالا حالات وواقعات معرفت ابراہیمی کے وہ مکاشفات ومشاہدات ہیں۔ جو قرآن مجید میں داخل ہیں۔ اسلامی مفسرین نے اسی ضمن میں آپ کے کمال معرفت کی ایک دوسری مثال قلم بند فرمائی ہے۔ جس کو ہم ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

انوارِ حقیقت کی دوسری جلوہ نمائی جناب ابراہیم علیہ السّلام حضرت باریتعالیٰ کی تلاش معرفت میں محو تھے۔ اور تحقیق وجود ووحدانیت میں سراپا غرق۔ اسی

محویت اور استغراق کے عالم میں دن بھر گذر گیا۔ رات ہو گئی۔ اور وہ بھی اسی غور و خوض کی کیفیت میں تمام ہونیکے قریب پہونچ گئی۔ متلاشی عرفان کو اُس میدان میں نہ دن کی خبر تھی۔ نہ رات کی اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ سپیدۂ سحر چلا۔ مرغان سحر کی خوش آیند آوازیں آنے لگیں۔ دفعتاً کسی خوش آہنگ طیر صحرائی نے عجیب پُر اثر اور دلکش آواز میں یوں نغمہ سرائی شروع کی سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوحِ تسبیح و تقدیس کے قابل وہی پروردگار ہے۔ جو ملائکہ اور تمام ذی روح اشیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ معرفت الٰہی کے اس گوش بر آواز متلاشی نے جیوں ہی اِس نغمہ سرائی کو اپنے کانوں سے سُنا۔ فوراً اپنے مقام سے اُٹھا۔ اور اُس آواز کے پیچھے ہو لیا۔ مگر وہ ایسے ناآشنا کی آواز نکلی۔ جو صرف اپنی خوشنما آواز سناتا تھا۔ اور اپنے حسن و جمال کا جلوہ نہ دکھاتا تھا۔ جو اس مشتاق جمال کا اصلی مدعا تھا۔ اور حقیقی تمنا بظاہر وہ طایر بھی ایسا شاطر نکلا۔ کہ قدم قدم پر اپنی آواز تو سُنا دیتا تھا۔ مگر صورت نہ دکھلاتا تھا۔ ابھی تھوڑے فاصلہ پر اس کی آواز سنائی دی۔ اور یہ اُس کی آواز پر وہیں جا پہونچا۔ تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ غرض اسی طرح جدھر جدھر وہ آواز آتی گئی۔ یہ اُدھر اُدھر پہونچتے گئے۔ یہاں تک کہ اپنی اِس سعی و تلاش میں اپنے مقام سے بہت دُور نکل آئے۔ اب اچھی خاصی صبح ہو گئی۔ اور تمام روشنی پھیل گئی۔ تو وہ سحر نما نغمہ سرا میدان سے نکلکر ایک قریب کے پہاڑ پر بولتا ہوا معلوم ہوا۔ یہ متلاشی حقیقت اپنی زحمت اُٹھا کر بھی تحقیق حال کی کوشش سے نہ تھکا۔ اور فوراً اُس پہاڑ کی چوٹی پر آیا۔ ادھر یہ پہاڑ پر پہونچے۔ اُدھر اُس نغمہ آرائے قدرت نے پہاڑ کے دوسری طرف والے دامن میں اپنے خوش آہنگ نغمے سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوحِ۔ سنائے۔ آواز سُنتے ہی یہ متلاشی حقیقت وہاں آیا۔ قدرت کی آزمائش بشریت کا امتحان ختم ہو گیا۔ ممتحنان الٰہی نے اُس کی حقیقی کوشش کے کمال و انتہا کا اندازہ کرکے اپنا اطمینان کلی کرلیا۔ تو نظام ہدایت کے اسرار کا اُسکی حقیقت بیں آنکھوں کے سامنے پورے طور سے انکشاف کر دیا۔ اور حقیقت کے اُس متلاشی نے دیکھ لیا کہ وہ ہوش ربا اور سحر نما آواز دینے والا نہ کوئی ایسا عجیب و غریب جانور ہے۔ جو اپنی ندرت میں عنقا ہو۔ یا قدر و قیمت میں ہما۔ بلکہ جنگل کا ایک معمولی سیاہ تیتر ہے۔ جو اِس خوش آوازی سے خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے۔

یہ دیکھکر جناب ابراہیم نے اُس کی لاوجودی اور بے مقداری کا یقین تو کر لیا۔ تاہم اُس کی خوش آوازی دل سے نہ بھولی چاہا۔ کہ اُس کو پکڑ لیں۔ مگر ان کے اس ارادے سے پہلے ہی وہ یہ کہتا ہوا اُڑ گیا کہ اے حقیقت کے متلاشی۔ اس سے زیادہ میرے پیچھے نہ پڑ میں خدا کا فرشتہ اُس کی مشیت کا فرستادہ تھا۔ جو تیری ہدایت اور امتحان و اطمینان کی خاص ضرورت سے بھیجا گیا تھا۔ حیات القلوب جلد اوّل۔

سیرت انبیا علیہم السلام کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ ایسے ہی آسان اور معمولی طریقوں اور ذریعوں سے انبیا و مرسلین سلام اللہ علیہم اجمعین کو معرفت ربانی کی تعلیم و ہدایت کی جاتی ہے۔ اور انہیں ترکیبوں اور تدبیروں سے اُن پر اثبات وجود۔ مصداق توحید۔ اور اذکار تسبیح و تحمید باریتعالےٰ کے اسرار کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ یہ واقعات تبلا رہے ہیں۔ کہ تعلیم معرفت کے ساتھ ہی ساتھ خدائے سبحانہٗ تعالےٰ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کو دینی عبادت کے آداب اور طریقے بھی تبلا دیئے تھے۔ جو حقیقت میں حصول معرفت کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

اِن واقعات میں ہم حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کی تحصیل معرفت اور تحقیق وحدانیت کی حقیقت پوری تفصیل سے بیان کر چکے۔ یہ مقدس پیغمبر قدرت کے امتحانوں اور مشیت کی آزمائشوں میں ایسا کامل اترا کہ ممتحانِ قدرت نے اس عارف اور کامل المعارف بزرگ کو وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ خدا نے ابراہیمؑ کو اپنی چند نشانیوں میں آزمایا۔ اور اس نے انکو پورا کیا۔ کے ایسے صاف اور روشن الفاظ میں تکمیل کی سند۔ اور اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (اور میں نے تجھکو لوگوں کا پیشوا بنایا) کی زریں عبارت میں قابلیت کا تمغا عنایت فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی رسالت

حضرت ابراہیم علیہ السّلام ان مشاہدات حقیقت اور تکمیل معرفت کے بعد منصب رسالت پر فائز فرمائے گئے۔ اور منعم حقیقی کی ان لازوال نعمتوں سے مالامال ہو کر گھر واپس آئے۔ اُس وقت آپ کا سن تیس اور چالیس برس کے درمیان تھا۔ تبلیغ رسالت نے اُصول الہٰیہ کے مطابق آپ نے اپنی دعوت کا اعلان اور تعلیم و ہدایت کا اظہار اپنے ہی خاندان اور گھر والوں سے شروع کیا۔ اسلامی مؤرخین و محققین کی تحقیق میں آپ نے اپنی ماں کی ہدایت سے اپنی دعوت کی ابتدا فرمائی۔

آذر کی بی بی سے احتجاج صحرا سے واپس آکر اور بارگاہ رب العزت سے رسالت کا منصب پاکر حضرت ابراہیم نے دو تین دن محض خاموشی اور سکوت میں کاٹے۔

یہ اس جلیل القدر منصب کی جبروتی تاثیر ہے۔ جو خالص خشیۃ اللہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ سیرت انبیاء و مرسلین پر نظر رکھنے والوں پر ظاہر ہے۔ کہ آپ کا یہ سکوت یہ خاموشی آپ کی تنہا ذات تک محدود و موقوف نہیں تھی۔ بلکہ آپ سے ماقبل اور مابعد جتنے خاصانِ الٰہی اس عہدہ جلیلہ پر مامور ہوئے ہیں اپنی تفویض رسالت کے وقت اُن کی ایسی ہی حالت ہوئی ہے۔ آپ کی یہ خاموشی طبیعت کی کدورت یا ناساز

کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اُس سے ترک تعلق گھر والوں کی صحبت اور اُن کے اطوار و کردار سے قطعی ناراضی اور بے سروکاری ثابت ہوتی ہے۔ قلبی تعلقات کی وجہ سے آپ کے اس سکوت اور ہمہ دم کی خاموشی سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آپ کی (مجازی) ماں (جو حقیقتاً آپ کے چچا آذر کی بی بی تھیں) متاثر ہوئیں۔ آپ کے پاس آئیں اور پوچھنے لگیں۔ چپ کیوں ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے اور وجہ خاموشی بتلانے سے پہلے استفسار فرمایا۔ کہ آپ پہلے مجھے یہ بتلادیں۔ کہ میرا پروردگار کون ہے۔ جواب ملا۔ تمہارا باپ (یعنی آذر) پوچھا گیا۔ کہ باپ کا پروردگار کون ہے۔ جواب دیا گیا۔ نمرود۔ استفسار کیا گیا۔ کہ نمرود کا پروردگار کون ہے۔ اب تو آذر کی بی بی کی تحقیق انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ کیونکہ اُس کے علم عقیدت میں نمرود کے بعد پھر نہ کسی میں یہ عظمت تھی اور نہ قدرت۔ جو پروردگار ہونے کی حیثیت رکھتا ہو۔ ابراہیمؑ سے قوم کے مسلمہ معبود نمرود کی نسبت یہ معترضانہ اور گستاخانہ استفسار سُن کر آذر کی بی بی جھلا اُٹھی۔ اور اُس سے صرف یہ کہہ کر چپ رہو۔ کیا بکتے ہو لپکر چلی آئی۔

آذر جو اُسوقت تمام خاندان کے افسر تھے۔ اور ابراہیمؑ کے مربی۔ اور تمام گھر بار کے مالک و مختار۔ اتفاق کر وہ بھی چلے آئے۔ اپنی بی بی سے ابراہیمؑ کے استبدادی خیالات معلوم کرکے نہایت طیش میں آئے۔ اور اُسی وقت ابراہیمؑ سے مستفسر حالات ہوئے۔ ابراہیمؑ نے اُن کے ساتھ بھی وہی مستفسرے شروع کیے۔ یہ بھی اپنے گمراہانہ عقیدے کے جوابات کو آخر سلسلہ تک پہونچا کر اُسی طرح عاجز آگئے۔ اور سخت ناراض ہوکر اُن کے پاس سے اُٹھ گئے۔ روضۃ الاحباب جلد اوّل یا نا دمواہب لدنیہ وغیرہما۔

اِن مستفسرات کا حال قرآن مجید میں داخل نہیں ہے۔ مگر اسلام کے قدیم و جدید مفسرین و محدثین انکا ذکر اپنی کتابوں میں لکھتے آئے ہیں۔ اس لیے زمانہ جدید کے محققین کی اصطلاح خاص میں یہ مرویات عرب مقامی روایات کہی جائیں گی۔ مگر بااینہمہ اِن کے وقوع میں مشکلات یا محالات کا کوئی سبب اور قرینہ نہیں پایا جائے گا۔ ہم نے اسی کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی اِس ابتدائی احتجاج سے اپنے سلسلہ کلام کو آغاز کیا ہے۔ اور مناسبت مقام اور سلسلہ کلام میں باہمی ربط و تسلسل قائم رکھنے کی ضرورت سے اِن کی نقل کو ضروری سمجھا ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ اور جناب ابراہیمؑ کے ابتدائی تبلیغ رسالت میں مساوت

تبلیغ رسالت کا پہلا فرض منصبی معرفت الٰہی کی دعوت اُس کے وجود اور وحدت کی تصدیق کرتا ہے۔ اور اُسکا آغاز قربت اور خصوصیت کی وجہ سے اپنے گھر والوں سے کیا جاتا ہے حضرت ابراہیمؑ نے تبلیغ رسالت میں بھی یہی اصول و طریقہ قائم رکھا اور اپنے

گھر اور خاندان والوں کی تعلیم و ہدایت شروع کر دی۔ گھر کے بزرگوں اور سرپرستوں سے جس طرح اس کی ابتدا کی گئی۔ اس کی صورت اوپر بتلادی گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ رسالت کی یہ تمہیدی مماثلت اور مطابقت غور و لحاظ کے قابل ہے۔ سلسلہ ابراہیمیؑ کے اشرف المرسلین اور خاتم النبیینؐ نے اسی تقلید و تاسّی میں نزول آیہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کے موقع پر۔ اسی طرح اپنے چچا ابولہب کی زجر و توبیخ اور گمراہانہ طعن و تشنیع سُنی تھی۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آغاز تبلیغ میں اپنے چچا آذر کے کلمات حقارت آمیز سُنے۔ آذر بھی ابولہب کی طرح مخالف رسالت اور منکر نبوت نہ رہا اور اس کے گمراہانہ انکار کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ آذر کے ساتھ جس احتجاج کا ذکر ہم نے اوپر قلم بند کیا ہے وہ محض ابتدائی تھا۔ اس احتجاج پر آذر نے اسوقت صرف اتنا خیال کر کے ٹال دیا۔ کہ کسی خاص وجہ سے ابراہیمؑ کے جوانانہ خیالات میں ایک قسم کی غیر متوقع تحریک اور جوش پیدا ہو گیا ہے۔ جو رفتہ رفتہ سِن کی طوالت اور قومی اور خاندانی معاشرت کے اثر سے زائل ہو جائے گا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسپر زیادہ اصرار کو ضروری نہ سمجھا۔ اور خاموش ہو رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ سکوت عارضی تھا۔ آپ کو بت پرستی سے فطرتاً جبلی نفرت تھی۔ اُنکی آذر کو عقیدت اور محبت۔ اجتماع ضدین ناممکن تھا۔ اس بنا پر جب کبھی باہم گفتگو کا موقع آجاتا تھا۔ تو یہ سکوت جاتا رہتا تھا۔ اور احتجاج کا وہی سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ آذر کو بت پرستی سے روکتے۔ اور اس ناپاک عقیدے اور طریقے سے منع فرماتے تھے۔ آذر اپنی جہالت اور ضلالت کی جھلاہٹ میں آپ کے مدعائے اصلی کو تفصیل سے کان لگا کر نہ سُنتا تھا۔ آذر نہ سمجھتا تھا۔ ابولہب کی طرح ہمیشہ جھلاتا ہوا۔ اور اول فول بکتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اس لیئے نہ حضرت ابراہیمؑ کو اطمینان سے آذر کو اپنے اصول ہدایت کے بتلانے کا کافی موقع ملتا تھا۔ اور نہ وہ کبھی ٹھنڈے دل سے آپکے ارشاد کو سُنتا تھا۔ اور نہ سمجھتا تھا۔

آذر سے احتجاج و انکشاف معرفت

اتفاق سے آذر ایک دن ابراہیمؑ کے پاس آیا۔ اُسوقت اُسکا مزاج کسی قدر اعتدال پر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اُس کے رُخ سے اعتدال و اطمینان کے آثار ہویدا و آشکارا پا کر گفتگو شروع کی۔ یہ مکالمہ پوری تفصیل سے قرآن مجید میں مرقوم ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا يٰاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ

(اور اے پیغمبر) قرآن میں ابراہیمؑ کا ذکر بھی (لوگوں سے) بیان کرو، کہ وہ بھی بڑے ہی سچے (صدیق) اور نبی تھے۔ جب اُنہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ (اباجان آپ کیوں ان

مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا۔

(بتوں) کی پوجا کرتے ہیں۔ جو نہ کچھ سنتے ہیں۔ اور نہ کچھ دیکھتے ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ اباجان مجھکو (خدا کی طرف سے) ایسے معلومات حاصل ہوئے ہیں۔ جو آپ کو نہیں حاصل ہوئے تو اب آپ میرے پیچھے ہو لیجئے۔ تو میں آپ کو سیدھا راستہ بتلادونگا۔ اباجان۔ شیطان (کے کہے میں آکر بتوں) کو نہ پوجئے۔ کیونکہ شیطان (خدائے) رحمان سے باغی ہے۔ اباجان مجھکو اس بات سے ڈر لگتا ہے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ (خدائے) رحمان کی طرف سے آپ پر کوئی عذاب آئے۔ اور آپ شیطان کے ساتھی بنیں۔

آذر اپنی شامت اعمالی سے حضرت ابراہیم کے اِس خیر خواہانہ مواعظ کا ان کا فرانہ انداز میں جواب دیتا ہے۔

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا

ابراہیم کے باپ نے کہا۔ کہ ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آئے گا۔ تو میں ضرور تجھے سنگسار کردونگا۔ اور اپنی خیر چاہتا ہے۔ تو میرے سامنے سے دور ہو جا۔

جناب ابراہیمؑ کمال معرفت کے اثر سے پُر جلال ہو کر جواب دیتے ہیں۔

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا۔ سورۂ مریمؑ۔ رکوع ۳

ابراہیم نے کہا (اچھا تو) میرا اسلام ہے۔ (ہاں میں بھی) میں اپنے پروردگار سے آپکی مغفرت کی دعا کرونگا (کیونکہ) وہ مجھپر حد درجہ مہربان ہے۔ اور میں نے تم (بت پرستوں) کو اور تمہارے اُن بتوں کو جنکو تم خدا کے سوا (حاجت پڑنے پر) پکارتے ہو۔ (سبکو) چھوڑا۔ اور اپنے پروردگار کو پکاروں گا۔ امید ہے۔ کہ میں اپنے پروردگار سے دعا مانگنے میں بے نصیب نہ ہونگا۔

مندرجہ بالا عبارت قرآنی سے احتجاج ابراہیمی کی پوری کیفیت معلوم ہوئی۔ اور یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہوگئی کہ اس داعی توحید نے آذر سے اب کی بار معرفت اور خداشناسی کے دلائل۔ کفر۔ شرک اور بت پرستی کے نقائص زاید تفصیل سے بیان کیئے تھے۔ اور اُمید کی تھی۔ کہ آذر ان کے سمجھنے میں غصہ وجہالت کی جگہ عقل و فراست سے کام لیگا۔ اور دونوں طریقوں کے نیک و بد پر غور کریگا۔ مگر آذر تھا سخت کافر خدا کا منکر۔ اور بتوں کا عاشق۔ اب کی بار بھی پیغمبر حق کی دعوت اور موعظت سے اثر پذیر نہ ہوا۔ اور اپنی ضلالت وجہالت کے طیش میں آکر اُٹھ گیا۔ اور جناب ابراہیم کے اُن اخلاق کریمانہ کی بھی کوئی قدر نہ کی جو باوجود ذاتی عصبیت کے آپ نے اُس کی مغفرت کے لیئے وعدوں کی صورت میں ظاہر فرمائے تھے اور جن سے اُس کے حقوق پرورش کی صرف ادا کاری مقصود تھی۔ مگر بتوں کی محبت اور بت پرستی کیساتھ

عقیدت رکھنے کے مقابلہ میں آذر کو جناب ابراہیمؑ کا کوئی درد تھا۔ اور نہ کوئی قدر ومنزلت۔ اُس پیغمبر حق اور موحد مطلق نے آذر کی شامت اعمالی کی صورت حال ملاحظہ فرما کر صاف صاف الفاظ میں کہدیا۔ کہ اگر تو مجھ سے اور میری تعلیم وہدایت سے ایسی نفرت ظاہر کرتا ہے۔ تو میں بھی تجھ سے اپنے تمام تعلقات موقوف ومتروک کرتا ہوں۔

قوم مشرکین وکافرین سے احتجاج

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے کمال معرفت پر اصرار و استقلال آپکے ساتھ آذر کی آزردگی۔ ناراضی اور نفرت کو برابر بڑھاتا رہا۔ قرآن مجید میں اِن احتجاج ومکالمات کا متواتر مقامات پر ذکر آیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم نے آذر کے ساتھ اُسکی ہدایت کیلئے ایسے احتجاج متواتر قائم فرمائے۔ پہلے تبلیغ رسالت کے اصول کے مطابق اُسکو۔ پھر اُسکے بعد ساری قوم کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور قرینہ بھی یہی بتلا رہا ہے۔ کہ آذر نے اپنی غایت درجہ کی ضلالت کی وجہ سے پہلے آپ پھر ساری قوم کے عمائد واکابر کے ذریعہ سے اِس داعی کلمۃ اللہ کی تعلیم وہدایت کے امتناع میں گمراہانہ کوششیں ضرور کی ہونگی کیونکہ اِن قوم حقیقت میں سخت سے سخت کافران قوم تھے۔ اِن سے احتجاج کے وقت جس اعلیٰ پیمانہ پر عقلی۔ اخلاقی۔ اور تمدنی دلائل سے اِن کی تعلیم وہدایت فرمائی گئی۔ اور خداپرستی کی سیدھی اور سچی راہ بتلائی گئی۔ وہ قرآن مجید کے سورۂ انعام رکوع ۵ میں درج ہے۔

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ۝ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝

سورۂ انعام رکوع ۵

(اے پیغمبر) ابراہیم کی قوم کے لوگ اُن سے (اسبات پر) آئے جھگڑنے۔ تو ابراہیم نے کہا۔ کہ تم مجھ سے خدا کی (وحدانیت کے بارے میں جھگڑتے ہو۔ حالانکہ وہ تو مجھکو (اپنی توحید کا) سیدھا رستہ دکھلا چکا ہے۔ جن (بتوں) کو تم اُسکا شریک مانتے ہو۔ تو میں کچھ اُن سے ڈرتا نہیں۔ (نہ مجھکو وہ کچھ نقصان پہونچا ئیں گے) مگر ہاں میرا پروردگار ہی (مجھکو کچھ نقصان پہونچانا چاہے) تو اُس کی مرضی۔ میرا پروردگار تو اپنے علم کی رو سے سب چیزوں پر حاوی ہے۔ کیا تم (اسبات کا) خیال نہیں کرتے۔ اور جن چیزوں کو تم شریک خدائی بتلاتے ہو میں اُس سے کیوں ڈرنے لگا۔ جبکہ تم اسبات سے (مطلق) نہیں ڈرتے۔ کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک خدائی بنا لیا جن کے (معبود ہونیکی)

سند خدا نے تمہارے لیے نہیں اُوتاری۔ تو ہم دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق امن کا (و اطمینان سے رہنے کا) حق دار ہے۔ اگر تم لوگ عقل رکھتے ہو (تو تم ہی آپ سمجھ لو) جو لوگ خدا پر ایمان لائے۔ اور اُنہوں نے اپنے ایمان میں نا انصافی (شرک) کی آمیزش نہیں کی۔ یہی لوگ ہیں۔ جو امن و اطمینان خاطر کے مستحق ہیں۔ اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔ یہ ہماری سکھلائی ہوئی دلیل تھی۔ جو ہم نے ابراہیمؑ کو اُن کے قائل معقول کرنے کے لیے بتلائی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں۔ رتبے بلند کرتے ہیں۔ اے پیغمبر! تمہارا خدا بیشک بڑا حکمت والا سب کچھ جانتا ہے۔

یہ تھے جناب ابراہیمؑ کے کمال معرفت۔ یہ تھی آپ کی خداشناسی۔ یہ تھے آپ کے اقرار عبودیت اور اُس کی معبودیت کے اعتراف۔ اس کے اظہار و اقرار میں کسی فانی ہستی۔ مٹ جانیوالے وجود کے ظاہری تعلق کا جز و "پایا کلا" کوئی لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ نہ کسی کی دولت و ثروت۔ قوت و سلطنت کا خوف و خیال کیا جاتا ہے۔ اور نہ کسی قرابت مند اور خاص اہل و عیال سے ترک تعلق کئے جانے پر کوئی رنج و ملال فرمایا جاتا ہے۔ صاف صاف الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ یہ تعلقات گو بطور ظاہر کیسے ہی گہرے اور ضروری ہوں۔ مگر خدائے واحد کی معرفت اور اُسکے تقرب و توسل کے آگے ان کا نہ کوئی وجود ہے۔ اور نہ ہستی۔ دُنیا کے فنا ہو جانیوالے وجود چاہے کیسے صاحب ثروت و قوت کیوں نہ ہو جائیں۔ مگر قادر مطلق کی وحدانیت پر سچے ایمان والے گو کیسے ہی نحیف الجثہ۔ اور ضعیف الاعضا ہوں۔ اُن سے ایک لحظہ کے لیے بھی مخوف اور مرعوب نہیں ہوتے۔ صرف اس لیے کہ خدائے قادر کی قوت کے مقابلہ میں وہ اُنکی قوت و طاقت کو خس بھر بھی نہیں سمجھتے۔ خدا کو ایک جاننے والا۔ تنہا اُسی کے مطیع رہ کر نہایت اطمینان و آزادی سے رہتا ہے۔ اور صرف ایک اُسی کی رضا و خوشنودی کی فکر رکھتا ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں خدا ماننے والے۔ ہمیشہ رد و بدل۔ ترجیح و تفضیل کی غیر مطمئن اور غیر مستقل حالتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور رات دن اپنے کثیر التعداد معبودوں کے راضی و خوشنود رکھنے میں گرفتار رہتے ہیں۔ اسلئے اُنکی زندگی کے ایام نہ امن و آرام کے ایام ہو سکتے ہیں۔ اور نہ اُنکا زمانہ اطمینان و آزادی کا زمانہ۔ گمراہان قوم آپ کے اس احتجاج و ارشاد کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور حقیقت میں عاجز اور قائل ہو کر دل ہی دل میں حضرت ابراہیمؑ کی عقل سلیم اور آپ کی خداداد ذہن و ذکا کی تعریفیں کرتے ہوئے آپ کی خدمت سے واپس آئے۔

اب ملک و قوم میں حضرت ابراہیمؑ کے عقائد اور ارشاد و ہدایت کے چرچے ہونے لگے۔ اور ہر شخص آذر کے سلسلہ سے جو قوم کے مذہب قدیم کا سب سے بڑا حامی۔ اور اُس کے خاص گھر سے۔ جہاں ملک و قوم کے دن رات خدا بنا کرتے تھے۔ ایسے مخالف مذہب شخص کا پیدا ہونا بہت بڑی تعجب کی بات سمجھتا

تھا اور سخت نفرت سے دیکھتا تھا۔ انہیں حالات کے ساتھ یہ بات بھی تمام قوم کے لوگوں کو تیقن ہو گئی کہ حضرت ابراہیمؑ باوجود اپنی بزرگان قوم کی فہمایش کے بھی اپنے عقائد کو نہ چھوڑیں گے۔ جیسا اُن لوگوں کے منہ پر بڑے استقلال و استحکام سے وہ کہہ چکے ہیں۔ ان تمام واقعات کی بنا پر جناب ابراہیمؑ کی دعوت اور تبلیغ رسالت کی نسبت قوم کافرین کا استعجاب ہی نہیں بڑھتا تھا۔ بلکہ اضطراب بھی۔ اور نتیجہ ان اُمور کے نتیجہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

خلیل اللہ کے وعظ و ارشاد اور کافرین قوم سے بار دیگر احتجاج

پیغمبر برحق۔ کوئی حالت ہو۔ خدمت رسالت کی انجام دہی سے باز نہیں رہ سکتا۔ کس بشنو دیا نشنود اُو گفتگوئے میکنند کا عالم ہوتا ہے۔ حقیقت میں کافرین قوم و ملک کے پاس آپکی دعوت کی تصدیق و تسلیم کے سوا تکذیب و تردید کا کوئی معقول طریقہ نہیں تھا۔ صرف نفسانیت خوف سلطنت اور جہالت اُن کو حصول ایمان کی سعادت سے رُوکتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کسی وقت بھی دعوت سے نہ رُکے۔ اور ہمیشہ نہایت آزادانہ اور دلیرانہ طور پر اُن کے عقائد فاسد کی تکذیب و تردید اور اُصول توحید کی ترویج و تاکید فرماتے رہے۔ ان واقعات کے متعلق آپ کے احتجاج و ارشاد۔ مواعظ وخطبات۔ زیادہ مطوّل۔ مفصّل اور مدلّل ہوتے تھے۔ قرآن مجید کے سورہ شعرٰی کی مفصلہ ذیل عبارت سے اُس کی پوری حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَ
قَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ
لَهَا عَاكِفِينَ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ
أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا
آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا
كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ
فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ الَّذِي خَلَقَنِي
فَهُوَ يَهْدِينِ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ
وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ وَالَّذِي يُمِيتُنِي
ثُمَّ يُحْيِينِ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي
يَوْمَ الدِّينِ رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا ۔۔۔ الخ ۔

اے پیغمبر ان لوگوں کو ابراہیمؑ کا حال پڑھ کر سناؤ۔ کہ جب اُنہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا۔ کہ (تم لوگ) کس چیز کو پوجتے ہو اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں۔ اور انہیں کی سیوا کرتے ہیں۔ (ابراہیمؑ نے) پوچھا کہ (بھلا) جب تم ان کو پکارتے ہو۔ تو یہ تمہاری سنتے ہیں۔ یا تم کو فائدہ یا نقصان پہونچا سکتے ہیں اُنہوں نے کہا۔ نہیں۔ مگر ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا (ابراہیمؑ) بولے۔ کہ کچھ خبر بھی ہے۔ جن چیزوں کو تم اور تمہارے اگلے باپ پوجتے آئے۔ یہ تو میرے دشمن ہیں۔ ہاں (میرا سچا دوست تو) پروردگار عالم ہے۔ جس نے مجھکو پیدا کیا۔ پھر وہی (دُنیا و دین کی مشکلات میں) میری رہنمائی کرتا ہے اور جو مجھ کو کھلاتا۔ اور جو مجھ کو (پانی) پلاتا ہے۔

الصّٰلِحِيْنَ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي
الْاٰخِرِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ
وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا
بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ وَاُزْلِفَتِ
الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ وَقِيْلَ
لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ
يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا
يَخْتَصِمُوْنَ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اِذْ
نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ
فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ
فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اور جب میں بیمار پڑتا ہوں۔ تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ اور جو مجھ کو مارے گا۔ اور مار سے پیچھے پھر (وہی) مجھکو جلائے گا۔ اور جو (بخشنے والا مہربان ہے اور اس سے) مجھ کو توقع ہے۔ کہ (یوم جزا) وہ میرے قصور معاف کریگا۔ اے میرے پروردگار مجھ کو (دین کی) سمجھ عنایت فرما۔ اور مجھ کو (اپنے) نیک بندوں میں لیجا۔ شامل کر۔ اور آنے والی نسلوں میں میرا ذکر خیر جاری کر اور آرامگاہ جنت کے وارثوں میں سے مجھ کو بھی (ایک وارث) بنا۔ اور مجھکو اور میرے باپ کو بخشدے۔ کہ وہ گمراہوں میں سے ہیں۔ اور جب لوگ (دوبارہ جلاکر) اٹھا کھڑے کیے جائیں مجھکو اس دن رسوا نہ کیجیو۔ کہ اس دن نہ مال ہی کام آئیں گے نہ بیٹا بیٹی (کام آئیں گے) مگر (ہاں اسی کی نجات ہو گی) جو پاک دل لے کر خدا کے حضور میں حاضر ہوگا۔ اور جنت پرہیزگاروں کے قریب لیجائے گی۔ اور دوزخ نکال کر گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی۔ اور ان سے کہا جائے گا۔ تم خدا کے سوا جن چیزوں کو پوجتے تھے۔ (اب) وہ کہاں ہیں۔ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں یا (تمہاری طرف سے) کچھ انتقام لے سکتے ہیں۔ پھر وہ (معبود) اور گمراہ لوگ (جو ان کی پرستش کرتے تھے) اور شیطان کے لشکر سب اوندھے منہ دوزخ میں ڈھکیل دیئے جائینگے اور گمراہ اور ان کے معبود وہاں (آپس میں) جھگڑنے لگیں گے۔ اور (جھگڑنے کے وقت) گمراہ لوگ (اپنے معبودوں سے) کہینگے کہ بخدا ہم تو صریح گمراہی میں تھے۔ کہ ہم تم کو پروردگار عالم کے برابر سمجھتے تھے۔ اور ہم کو تو بس (ان دوسرے) گنہگاروں نے گمراہ کیا۔ تو (اب) نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والا ہے۔ اور نہ کوئی دلسوز دوست ہے۔ کاش ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹ کر جانا ہو۔ کہ ایمان والوں میں (شامل ہو کر) رہیں۔ بیشک ابراہیمؑ کے اس قصہ میں (بھی) ایک بہت بڑی عبرت ہے۔ اور ابراہیمؑ کی امت میں اکثر ایمان لانے والے بھی نہیں تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اس مکمل اور مفصل ارشاد سے جہاں تک عالم ایجاد میں احکام و فرمان الٰہی کی تعلیم و ہدایت فرمائی گئی۔ اسی قدر عالم معاد میں بھی جو کچھ معتقدین شریعت خداوندی کو نیک اعمالی کی جزا اور مشرکین و منکرین کو ان کی بد اعمالی کی جیسی کچھ سزا و عقوبت اٹھانی ہو گی۔ اور پھر اس وقت انکی ندامت و انفعال ان کی زبان حال سے جو کچھ کہلوائے گا۔ وہ ایک ایک کرکے تمام حالتوں اور کیفیتوں کے

ساتھ معلوم ہو گیا۔ تبلیغ رسالت کے اِس طریقے سے پیغمبر برحق نے مسائل معرفت۔ وحدانیت و جبروت و قدرت الٰہیہ اور نیز سزا و عقوبت۔ رحمت و رافت لامتناہیہ کے تمام فضا و عالم دکھلا دیئے ہیں اور اُن ہی مواعظ کے ساتھ ہی ساتھ اپنی رسالت کی زبان سے اپنی اخلاق کریمانہ کی شان دکھلا کر خدائے قادر و توانا کے سامنے۔ منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد بھی اپنی لاوجودی۔ بے بساطی بے مقداری اور عجز و انکسار کے نہایت سنجیدگی و متانت سے اعتراف و اظہار فرما دیئے ہیں۔ اور پھر حقوق پرورش اور صلہ رحم کے اظہار میں اپنے چچا آزر کے لیے۔ جن کے کفر و شرک کا ذاتی علم تھا۔ مغفرت بارگاہِ رحمت سے طلب فرمائی گئی۔

سیرت انبیا علیہم السلام پر کافی نظر رکھنے والے حضرات ان تمام ارشادات کو اشرف الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ علیہ وآلہ التحیۃ والثنا کے مواعظ و خطبات سے آئیندہ چلکر ملائیں گے۔ تو دونوں کے مقاصد و مطالب کا ایک ہی مرکز اور مرجع پائیں گے۔

اسی مضمون کے مواعظ و ارشاداتِ ابراہیمی سورۂ عنکبوت میں بھی مذکور ہیں۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ

(اے پیغمبر) ابراہیم کے حالات (ان لوگوں سے) بیان کرو جب اُنھوں نے اپنی قوم (کے لوگوں سے) کہا کہ خدا کی عبادت کرو اگر تم عقل رکھتے ہو۔ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ (مگر) تم تو خدا کے سوا ایسے بتوں کی پرستش کرتے ہو۔ اور جھوٹی جھوٹی باتیں (دل سے) بناتے ہو۔ خدا کے سوا تم جن (معبودوں) کی پرستش کرتے ہو تمہیں روزی دینے کا ذرا اختیار نہیں رکھتے۔ تو روزی خدا ہی سے مانگو۔ اور اُسی کی عبادت (بھی) کرو۔ اور اُسی کی نعمتوں کا شکر بھی بجالاؤ۔ (کیونکہ) تم کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا بھی ہے۔ اگر تم مجھکو جھوٹا سمجھو۔ تو تم سے پہلے بھی اُمتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکی ہیں۔ اور رسول کے ذمے تو (حکم خدا کا صاف) پہونچا دینا ہے اور بس۔ کیا لوگوں نے (اِس بات پر) نظر نہیں کی۔ کہ خدا کس طرح مخلوقات کو اوّل بار پیدا کر کے پھر اُسی طرح کی مخلوقات کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو اللہ کے نزدیک سہل سی بات ہے۔ (اور ہم نے ابراہیم سے یہ بھی) ارشاد کیا کہ اُن لوگوں کو سمجھاؤ

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔

کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو۔ اور دیکھو کہ خدا نے کس طرح پر اول بار (مخلوق کو) پیدا کیا پھر (اُسی طرح وہی) اللہ (لوگوں کو قیامت کے دن) آخری اُٹھانا بھی اُٹھائے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے عذاب دے۔ اور جس پر چاہے رحم کرے۔ اور تم سب اُسی کی طرف لوٹا کر لائے جاؤگے۔ اور تم تو زمین میں (چھپکر) خدا کو ہرا سکتے ہو اور نہ آسمان میں (اُڑکر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔ اور جو لوگ خدا کی آیتوں کو اور (قیامت کے دن) اُسکے حضور میں حاضر ہونے کو نہیں مانتے۔ یہی لوگ ہماری رحمت سے مایوس ہو بیٹھے ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جن کو (آخرت میں) عذاب دردناک (ہونا) ہے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کا یہ خطبہ یا قوم سے احتجاج

خدا کی وحدانیت۔ اُسکی معرفت۔ اُس کی معبودیت اور اُسکے کمال قدرت کا تفصیلی دفتر ہے۔ آپ نے مسائل الٰہیہ کے متعلق ایسے قوی اور مستحکم دلائل اُن کے سامنے پیش کئے۔ کہ وہ آپکی عقل سلیم اور دلائل و براہین مستقیم کو سنکر حیران ہوگئے۔ اس احتجاج کے ابتدائی حصہ میں تو اُن کو اُنکے زمانہ حیات میں حصول عرفان اور قبول ایمان کی نسبت دعوت فرمائی گئی تھی۔ اس کے منافع اور مصالح اُن کو دکھلائے اور بتلائے گئے تھے۔ مگر اس کے آخری حصہ میں عالم معاد۔ اور آخرت کے متعلق خداپرستی، خداشناسی اور دنیا سے با ایمان اُٹھنے کے تمام راحت و آرام کو بیان فرمایا گیا۔ اور سمجھایا گیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ منکرین ذات الٰہی اور منکرین قدرت لامتناہی کی آخرت میں سزا و عقوبت۔ اور ہلاکت و تباہی بھی ثابت کردی گئی۔ مگر حقیقت میں پتھر پُوجنے والوں کے دل پتھر ہوگئے تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ قلب سیاہ اور عقل زائل اور اسی طرح تمام قوائے مدرکہ غائب ہوگئے تھے۔ ایسی حالت میں اُن کی ضلالت۔ جہالت اور شقاوت کے پاس سوائے اِس کے اور جواب ہی کیا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آئندہ عبارت سے ظاہر ہے

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ ۔

قوم کے پاس۔ ان کی باتوں کا اس کے سوا (اور کوئی) جواب ہی نہیں تھا کہ (آپس میں) لگے کہنے۔ کہ اس کو مار ڈالو۔ یا جلا ڈالو۔

اُن کی یہ شقاوت قلبی اور بے دردی بہت جلد سلسلہ بیان سے آئندہ معلوم ہوگی۔

قوم مشرکین کی اعظم ترین عید کے دن خلیل اللہ کی بت شکنی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس معجزنما احتجاج نے قوم مشرکین کے تمام افراد کو غیر متحمل اضطراب میں ڈال رکھا تھا۔ دعوت ابراہیمی کا تذکرہ زبان زد خاص و عام ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نمرود کے دربار سلطانی میں بھی جا پہونچا۔ اس نے آذر سے کئی بار اسکے متعلق استفسار بھی کیا تھا۔ مگر جہانتک اس کے متعلق اُسکو اطلاع پہونچی تھی۔ وہ ایسی دہشتناک اور خوف کا باعث نہیں تھی۔ اسی

اثنا میں اُنکی ایک بہت بڑی سالانہ عید کا دن قریب آگیا۔ آنے والی عید کے تذکرے میں دعوت ابراہیمی کا بھی ذکر آگیا۔ یہ تجویز ہوئی کہ اسی عید میں ابراہیمؑ کے تمام مخالف عقائد کا امتحان و انکشاف ہوجائے گا۔ قدیم دستور کے مطابق قوم کے ہر فرد کو عید کے دن حاضر صحبت ہونے اور مراسم عید بجالانے کی عام نوید دی گئی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو بھی خاص طور پر مدعو کیا گیا۔

عید کا دن ہوا۔ ہر خاص و عام چھوٹے بڑے اپنے دستور اور رواج کے مطابق اپنی قومی عید منانے کے لیے جمع ہوئے۔ آذر اور اُس کے احباب و خواص، اکابر و عمائد قوم نے حضرت ابراہیمؑ سے تشریف لے چلنے کے لیے عرض کی۔ آپ نے پہلے اخلاقاً۔ اور اُن کی ستارہ پرستی پر تعریضاً۔ آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھکر اِنِّی سَقِیْم یں کچھ ناساز ہوں۔ کہکر اپنی مجبوری ظاہر کی۔ اور اُن لوگوں کو ٹال دینا چاہا۔ مگر وہ آپ کے انکار پر جہالت سے خواہ مخواہ اصرار کرنے لگے۔ تو آپ سے نہ رہا گیا۔ اُس تمام مجمع کو مخاطب کرکے جس میں چچا آذر بھی تھے۔ احتجاج و استرشاد کا وہی سلسلہ اُٹھایا گیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

لَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ	اے پیغمبر ہم نے ابراہیمؑ کو شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔ اور ہم (اُن کی صلاحیت سے) (خوب) واقف تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم (کے لوگوں) سے کہا۔ کہ صورتیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو۔ یہ ہیں کیا چیز؟ وہ بولے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے (ابراہیمؑ نے) کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادے صریح گمراہی میں پڑے ہے وہ بولے۔ تو کیا ہمارے پاس سچی بات لیکر آیا ہے۔ یا دل لگی کرتا ہے (ابراہیمؑ نے کہا (دل لگی کی بات نہیں) بلکہ آسمان و زمین کا پروردگار جس نے ان کو پیدا کیا وہی تمہارا بھی پروردگار ہے۔ اور میں اسکا

گواہ ہوں۔ (اور آپ نے یہ بھی کہا) کہ خدا کی قسم تمہارے پیٹھ پھیرے اور گئے پیچھے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ایک چال کرونگا

اس مکالمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی بے وجودی، اور بت پرستی کی جہالت۔ اسلاف قدیم کی گمراہانہ اور کورانہ تقلید۔ خدائے واحد کی ربوبیت۔ عظمت و تقدیس۔ اُن پر پورے طور سے ظاہر کردی۔ مگر اُن سنگدلوں کو اپنے کفر و الحاد پر ویسا ہی مصر پاکر سکوت فرمایا۔

لہ کیا بحالت صحت جناب ابراہیمؑ کا اظہار بیماری کرنا اصول تقیہ یا توریہ کا ثبوت نہیں ہے۔ فافہم فتدبر۔

اتنی گفتگو کے بعد وہ عید منانے کے مقام مقررہ پر چلے گئے۔ زیادہ رات گئے تک تمام لوگ عید گاہ کی سیر و تماشہ میں مصروف رہے۔ حضرت ابراہیمؑ وقت کے منتظر تھے۔ موقع پاکر اپنی اُس عملی تدبیر کی تعمیل کیلئے اُٹھے۔ جس کا اشارہ عبارت قرآنی میں موجود ہے۔ اور ہم نے جس پر خطوط کھینچ دیئے ہیں۔ اُٹھے۔ شہر تو آدمیوں سے بالکل خالی ہوچکا تھا۔ اور رات گئے کا سناٹا تھا۔ اور سیدھے قوم کے اُس بڑے مندر پر جا پہونچے جس میں اُنکے قابل التعظیم اور عظیم الشان بت نصب تھے۔ وہ مقام بھی سنسان اور بالکل ہُو کا سیدان ہو رہا تھا۔ نہ کوئی محافظ تھا۔ نہ دربان۔ ابراہیمؑ نے مندر کے اندر جاکر چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا۔ اور سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اور چپکے سے اپنے گھر چلے آئے۔ عید کی صبح کو جب لوگ پوجا کرنے آئے تو حقیقت معلوم ہوئی۔ ابراہیمؑ تو سب کی نظروں میں چڑھے ہی تھے۔ تمام لوگوں نے بالاتفاق انہیں کو بت شکن ٹھہرایا۔ کیونکہ اِس مجاہد راہِ خدا کے سوا۔ اس صفائی کے ساتھ اور کون یہ خدمت کر سکتا تھا۔ سورۂ انبیاء میں یہ واقعہ اِن الفاظ الہامی کے ساتھ مذکور ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ‎﴿﴾‏ قَالُوا مَن فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ‎﴿﴾‏ قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ‎﴿﴾‏ قَالُوا فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ‎﴿﴾‏ قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ ‎﴿﴾‏ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ‎﴿﴾‏ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظَّالِمُونَ ‎﴿﴾‏ ثُمَّ نُكِسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هَٰؤُلَاءِ يَنطِقُونَ ‎﴿﴾‏ قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ‎﴿﴾‏ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ -

(سورۃ الانبیاء)

ابراہیمؑ نے بتوں کو (توڑ پھوڑ) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر اُن کے بڑے بت کو اس غرض سے (رہنے دیا) کہ اُس کی طرف رجوع کریں (جب لوگوں کو بتوں کے توڑے جانے کا حال معلوم ہوا) تو اُنہوں نے کہا (ارے) ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ گستاخی کس نے کی۔ اسمیں شک نہیں۔ کہ اُسنے بڑا ظلم کیا۔ (بعض) بولے کہ وہ نوجوان (آدمی) جس کو ابراہیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُسکو ہم نے بُرائی کیساتھ (ان بتوں کا) تذکرہ کرتے سُنا ہے (لوگوں نے) کہا تو اُس کو سب آدمیوں کے سامنے لاؤ تاکہ (جو کچھ وہ جواب دے) لوگ اُسپر گواہ رہیں (غرض ابراہیم بلائے گئے)۔ لوگوں نے (اُن سے) پوچھا کہ ابراہیمؑ کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ (حرکت) تو نے کی ہے۔ (ابراہیمؑ نے) کہا (نہیں) بلکہ (بُت) جو ان سب میں بڑا ہے۔ اُسی نے یہ حرکت کی (ہوگی) اور اگر یہ بول سکتے ہوں۔ تو اُن سے پوچھ دیکھو۔ اُسپر یہ لوگ اپنے جی ہی جی میں سوچے اور آپس میں کہنے لگے۔ کہ بلاشبہ ہم ہی بر سر ناحق ہیں۔ پھر اپنے سروں کے بل اُوندھے (اُسی گمراہی میں) ڈھکیل دیئے گئے (اور ابراہیمؑ سے بولے تو یہ بولے) کہ ہمکو تو یہ معلوم ہی نہیں۔ کہ یہ بت بولا نہیں کرتے (ابراہیمؑ نے) کہا کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز(وں)

کو پوجتے ہو۔ کہ جو نہ تم کو کوئی فائدہ پہونچائیں۔ اور نہ (کسی قسم کا) نقصان ہی پہونچائیں۔ تف ہے تم پر۔ اور اُن چیزوں پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو۔ تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

مشرکین کے اتنے بڑے اور بھرے مجمع میں حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے اہم ترین واقعات پر ایسا دلیرانہ احتجاج اور مستقلانہ مجاہدہ۔ آپ کے اُس دعوے کا کامل ثبوت ہے۔ جو ان سے پہلے آپ نے اپنی قوم کے آگے کیا تھا۔ کہ خدائے واحد کی راہ میں۔ نہ میں تم سے ڈرنے والا ہوں۔ اور نہ تمہارے اِن بتوں کو خیال میں لانے والا حقیقتاً آپ کا یہ ارشاد و احتجاج ایسا قوی اور کامل تھا۔ کہ قوم مشرکین کے تمام لوگ آپ کے استفسار کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور فرط ندامت سے معقول اور لاجواب ہو کر سر بزانو ہو گئے۔ مگر حُبُّ الشیئ اعمٰی و ابصر۔ (کسی شے کی محبت اندھا کر دیتی ہے) اتنے سمجھنے اور شرم اُٹھانے کے بعد بھی بتوں کی محبت اور بت پرستی کی عقیدت اُن کے دلوں سے نہ گئی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو کر حضرت ابراہیمؑ کی سزا و عقوبت کرنے پر اُن کو اور تاکید کرنے لگی۔ اور آپس کی مشورت سے یہ امر زیں طے پا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مرقوم ہے۔ قَالُوْا حَرِّقُوْہُ کہ ابراہیمؑ کو جلا ڈالو۔

نمرود کے دربار شاہی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طلبی۔

اس کے بعد نمرود کے دربار شاہی میں۔ حضرت ابراہیمؑ کے اِن معاملات و حرکات کی اطلاع ہوئی۔ اور اُنکی بت شکنی کی خاص شکایتوں کے ساتھ یہ استغاثہ بھی پیش کیا گیا۔ کہ ابراہیمؑ ایک ایسے خدا کی دعوت کی طرف تمام قوم کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ جسکو وہ اپنا اور سائر مخلوق اور نمرود کا بھی خالق و معبود بتلاتے ہیں۔ نمرود بتوں کی توہین کا واقعہ سُن کر جلا یا تو تھا ہی۔ اب اپنی خدائی میں بھی بٹا لگانے کا حال سُن کر اور بھی بھڑک اُٹھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بلا بھیجا۔ یہاں کیا عذر تھا۔ بلا خوف و ہراس فوراً چلے آئے۔ فیمابین یہ مکالمات شروع ہوئے۔

نمرود سے احتجاج۔ نمرود نے سب سے پہلے خدا کے صفات دریافت کیے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۔ میرا خدا مارتا بھی ہے۔ اور جلاتا بھی ہے۔ نمرود بولا یہ تو میں روز کیا کرتا ہوں تم ابھی دیکھ لو۔ یہ کہکر اُس نے شاہی قید خانے سے دو قیدی منگوائے۔ ایک کو تیغ بیداد کے حوالے کر دیا اور ایک کو آزاد۔ ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔ لو دیکھ لو۔ ایک مار ڈالا گیا۔ اور ایک زندہ کر دیا گیا۔ ابراہیمؑ نے فوراً تردید میں ارشاد کیا۔ اِنَّکَ اَحْیَیْتَ الْحَیَّ وَ لَمْ تُحْیِ الْمَیِّتَ اے تو نے تو زندہ کو زندہ چھوڑا مردہ کو تھوڑا ہی زندہ کیا۔ علاوہ بریں میرے پروردگار کی یہ قدرت ہے۔ کہ وہ ہمیشہ آفتاب کو پورب کر طلوع کرتا ہے۔ اگر تجھ میں کوئی قوت ہے۔ تو اُسکو مغرب سے نکال دکھلا۔

آتش نمرودی اور خلیل معبودی نمرود کو یہ دلائل سُن کر، کاٹو تو لہو نہیں (سکتہ) ہو گیا۔ وہ مجسّم بت بن گیا۔ خدائے قادر و توانا اس کے عاجزانہ اور مجبورانہ سکوت کے عالم کو صرف تین لفظوں میں دکھلاتا ہے فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ اسی غصہ، جھلاہٹ اور اپنی ندامت و خجالت کی بوکھلاہٹ میں۔ خدا کے اس خاص معترف اور مقدس موحّد کی سزا و عقوبت کی نسبت حاضرین دربار سے مشورہ کرنے لگا۔ سب نے یکزبان ہو کر ان الفاظ میں صلاح دی۔ حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ۔ اگر تم کو کچھ کرنا ہے۔ تو ابراہیم کو آگ میں جلا دو۔ اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ نمرود نے بھی اسی تجویز کو پسند کیا۔

اسلامی مؤرخین نے اس خدارسیدہ اور برگزیدہ پیغمبر کے زندہ آگ میں جلا دیئے جانیکے بڑے بڑے سامان لکھے ہیں۔ جنکا بیان خواہ مخواہ کی طوالت ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ آگ کے بہت بڑے الاؤ میں زندہ ڈالدیئے۔ مگر اس حافظ حقیقی کے کرم و افضال نے آپ کو ان شعلہائے سوزندہ سے بال بال بچالیا۔ اور اس آتشکدہ نمرودی کو گلزار ابراہیمی بنا دیا۔ اس کی نسبت قرآن مجید میں یہ الفاظ تلمیح ہے۔ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ

ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈک اور سلامتی (کا موجب) بنجا (اُن کو کسی طرح کی ایذا نہ پہنچا چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور جن لوگوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کرنی چاہی تھی، تو ہم نے اُنھیں کو ناکام کیا۔

پھر اس واقعہ کو سورۂ عنکبوت میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (عنکبوت)

(ابراہیم کی) قوم کے پاس اُس کے سوا (اُنکی باتوں کا) جواب ہی نہیں تھا۔ کہ یا تو اسکو مار ڈالو یا (آگ میں) جلا ڈالو (چنانچہ لوگوں نے اُنکو آگ میں ڈالدیا) مگر خدا نے اُن کو آگ سے نجات دی۔ بیشک اس (واقعہ) میں بھی لوگوں کے لیئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (قدرت خدا کی بہترین) نشانیاں ہیں۔

معرفت الٰہی میں حضرت ابراہیمؑ کا کمال استقلال حضرت ابراہیم علیہ السّلام ابتلاء و امتحان کے اس منتہائی درجہ میں بھی کامل اُترے۔ آپ کے اس امتحان کے متعلق اسلام کے معتبر مفسرین اور مستند محدثین نے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ جن کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے آپ کے کمال عرفان۔ ثبات ایمان۔ قلبی استقلال اور روحانی اطمینان کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ یہ روایات تبلاتی ہیں۔ کہ آگ میں ڈالدیئے جانے کے بعد حضرت جبرئیل بغرض امتحان اُن کے پاس آئے۔ اور دریافت کیا۔ هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ۔ آپ کو میری کوئی ضرورت ہے۔ کمال استقلال و آزادی سے جواب ملا أَمَّا إِلَيْكَ فَلَا۔ خاص تم سے تو کوئی حاجت وضرورت نہیں۔ جبرئیل نے عرض کی۔ اگر مجھ سے

آپ کی کوئی غرض و حاجت نہیں ہے۔ تو جس سے ہے۔ اُسی سے ایسے مشکل کے وقت میں طلب حاجت فرمائی جاوے۔ نہایت متانت سے ارشاد ہوا۔ حَسْبِیْ مِنْ سُوَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ مجھے اُس سے عرض کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ میرے حال سے خود واقف ہے۔

عرب کے بہت بڑے معقولی مفسر ابو منصور ثعالبی نے اِتنے اور اضافہ کے ساتھ اِس واقعہ کو لکھا ہے۔ کہ جبرئیل کے اِس استفسار کا کہ آپ اُسی سے طلب حاجت کیوں نہیں کرتے۔ جسکو آپ اپنی ضرورتوں کا پورا کرنیوالا سمجھتے ہیں۔ اُس موحد حقیقی نے یوں جواب دیا۔ کہ وفا و رضا کے خلاف ہوگا۔ شاید اُسکو میرا جلانا ہی دینا منظور ہو۔ پھر حضرت جبرئیل کے تمام مکالمہ کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ لَمَّا قَالَ جِبْرِیْلُ ھَلْ لَکَ مِنْ حَاجَۃٍ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ لَیْسَ مِنَ النَّفْسِ دَعْوٰی وَلَا مِنْ نَمْرُوْدَ شِکْوٰی وَلَا مِنَ النَّارِ بَلْوٰی وَلَا اَطْلُبُ سِوَی الْمَوْلٰی جبرئیل نے جب جناب ابراہیمؑ سے پوچھا۔ آپ کو کوئی حاجت ہے۔ تو فرمایا مجھکو نفس سے کوئی حاجت ہے۔ نہ نمرود سے شکایت اور نہ آگ کی حرارت سوزندہ سے ملال۔ سوائے خدا کے میرا کسی سے کوئی سوال نہیں۔

خطاب خلیل الٰہی سے سرفراز ہوئے۔ جناب ابراہیم علیہ السّلام آتش نمرودی کے ایسے قیامت ناک وقت میں بھی خدائے واحد کی معرفت اور اُس کی شرط محبت و اخلاص پر ایسے مستقل ثابت ہوئے۔ کہ ممتحنان قدرت بھی اُن کے انداز استقلال پر ناز کرنے لگے۔ ان کی صداقت مقبولیت کے درجہ پر اور اُن کا ایمان اجابت الٰہی کے مراتب اعلیٰ پر فائز فرمایا گیا اور وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا ہم نے ابراہیم کو اپنا خلیل (سچا دوست) بنایا۔ کا گرانمایہ خطاب دربار ایزدی سے عنایت فرمایا گیا۔ رسالت کے منصب کے ساتھ خُلّت (ہمنشین خلوت) کے مراتب کا بھی اضافہ ہوا۔

سیرۃ النبیؐ۔ خطبات احمدیہ۔ ارض القرآن۔ عصر جدید کے محققین نے اپنی اپنی تالیفات میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آگ میں جلائے جانے کے واقعات کا کوئی ذکر و مذکور نہیں کیا ہے۔ اور عموماً آپ کے واقعات کو ہجرت کے وقت سے آغاز کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ خاص حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی حالات کو مرفوع القلم فرما دیا ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ توراۃ میں واقعہ احراق کا چونکہ ذکر موجود نہیں ہے۔ اس لئے صرف اسلامی مرویات پر۔ جن کو یہ حضرات سماعی روایات کا خطاب دیتے ہیں۔ اعتبار نہیں کیا گیا۔ توراۃ سفر تکوین میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے حالات کی ابتدا ہجرت ہی کے زمانہ سے تقریباً ابتدا کی گئی ہے۔ اس سے قبل کے حالات کچھ بھی نہیں بتلائے گئے۔ (ملاحظہ ہو۔ توراۃ۔ تکوین۔ حالات ابراہام) قرآن مجید کا یہ اتنا بڑا احسان ہے۔ جس کی منّت گذاری سے دُنیا اور اہل دُنیا سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ حقیقتاً اگر قرآن اس عظیم الشان

پیغمبر کے تحصیل عرفان۔ تکمیل الایمان اور عدیم المثال استحکام و استقلال کو اس تفصیل و تشریح سے بیان کرتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ اوصاف و محامد صفحہ روزگار سے کب کے مٹ گئے ہوتے۔ قرآن چونکہ تمام کتب قدیمہ کا متمم اور مصحح ہے۔ اس بنا پر اُس نے جہاں کتب قدیمہ میں انسانی حشویات و لغویات کے اسقاط سے کام لیا ہے۔ وہاں فروگذاشت و ذہولات کے موقعوں پر صحیح اور اصلی حالات کی اطلاع و اعلان کے اضافات بھی کر دیئے ہیں۔ اور مصحح اور متمم ہونیکے اعتبار سے اُسکے فرائض مخصوصہ میں یہ اُمور داخل تھے۔

واقعہ احراق سے بعد کے حالات حضرت لوطؑ کا ایمان لانا

ان تمام مصائب کو برداشت کر کے یہ مجاہد فی سبیل اللہ ارشاد و ہدایت کے ان خدمات کو پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی اور مستعدی کیساتھ ادا فرمانے لگا۔ آپ کی دعوت کی صداقت اور کرامات قدرت کو منکرین معرفت الٰہی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرما چکے تھے۔ اور آپ کے دلائل و براہین کو مشرکین ایک بار نہیں۔ کئی بار آپ کی زبان صداقت ترجمان سے سُن چکے تھے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی کفر شعاری اور بُت پرستی سے باز نہ آئے۔ مگر اِس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت ابراہیمؑ بھی اُن کی تعلیم و ہدایت سے نہ رکے اور اب تو پہلے سے بھی زیادہ آزادانہ اور دلیرانہ طریقہ سے اُن کے عقاید فاسد کی تکذیب و تردید فرماتے رہے۔ اور اُصول توحید کی تعلیم و ترویج کرتے رہے۔ قرآن مجید میں مرقوم ہے۔

قَالَ اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ	(ابراہیمؑ نے قوم سے) کہا۔ کہ تم جو خدا کے سوا بتوں کو مانتے ہو۔ (تو) صرف دُنیا کی باہم دوستی و محبت کی وجہ سے (مانتے ہو) پھر قیامت کے دن تمہارا یہ حال ہوتا ہے۔ کہ تم میں سے ایک کو ایک منکر ہے کرے گا۔ اور ایک کو ایک لعنت کریگا۔ اور دوزخ آخر میں تم سب کا ٹھکانا ہوگا۔ (اور ان بتوں میں سے) کوئی بھی تمہارے مددگار نہیں ہونگے۔ اسپر صرف ایک (حضرت) لوطؑ ایمان لائے (ابراہیمؑ

نے) کہا کہ میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف (جہاں کہیں اُسکو منظور ہو) نکل جاؤنگا۔ بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ حضرت لوطؑ کے ایمان لانے کی خبر دے رہے۔ مگر عرب کے مورخین و محققین کے نزدیک۔ حضرت سارہ۔ جو رشتہ میں جناب ابراہیمؑ کی چچازاد بہن ہوتی تھیں۔ آپ پر ایمان لائیں ہم سابق الایمانی کے اختلاف پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ سلسلہ واقعات کے بیان و تفصیل کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ عربی مورخین اور اسلامی مفسرین نے جناب سارہ کے ایمان لانے اور عقد نکاح میں آنے کے واقعات یوں بیان کیے ہیں۔

حضرت سارہ کا شرفِ زوجیت اور قبولِ ایمان کی نعمت سے مشرف ہونا۔

جب حضرت ابراہیمؑ آتش نمرودی سے صحیح وسلامت بچکر گھر میں تشریف لائے۔ تو سب سے پہلے آپ کی عظمت اور صداقت کا اثر حضرت سارہ بنت ہاران کے قلب پر جاگزیں ہوا۔ اور پھر اس استحکام و استقلال کے ساتھ کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے اُسی وقت اِسکا اظہار و اقرار بھی کر دیا۔ اُسوقت حاضر خدمت ہوئیں۔ اور کہنے لگیں۔ اے ابن عم۔ میں اُسی وقت سے تیرے خدا پر ایمان لائی۔ جس نے ایسی آتشِ سوزندہ کے نقصان و ہلاکت سے تمکو بال بال بچالیا حضرت ابراہیمؑ نے بطریق امتحان و مزید اطمینان جوابدیا۔ کہ سارہ۔ تم ایسا کہتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتی۔ اگر گھر والے سُن لینگے۔ تو تمھیں مار ہی ڈالیں گے۔ سارہ نے فوراً جواب دیا۔ کہ جس خدا نے تمھیں بچایا۔ وہ میری جان بھی بچالے گا۔ پھر مجکو کس کا خوب ہوگا۔

جناب سارہ کی یہی صداقت اور حسنِ عقیدت حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اُنکی مزاوجت اور دائمی رفاقت کا باعث ہوئی۔ جناب سارہؑ حضرت ابراہیمؑ کی چچازاد اور بنا بر بعض روایات عمہ زاد بہن تھیں۔ اور سن رشد تک پہونچ چکی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کا سن بھی بیس برس سے زیادہ ہوچکا تھا۔ اسلیئے باہمی سن کی مساوات اور حقوق قرابت کے اعتبار سے بھی باہمی مزاوجت و مناکحت کا پورا وقت و موقع حاصل تھا۔ اِس بنا پر جناب ابراہیمؑ نے اُن سے عقد کر لیا۔

حضرت لوطؑ اور سارہؑ کے ایمان لانے سے حضرت ابراہیمؑ کے اُموز میں نوعے اطمینان اور قوت مل چلی۔ مگر مشرکین کی نفسانیت اور عداوت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اگرچہ تبلیغ رسالت کے ابتدائی اُصول کے مطابق حضرت لوط و سارہؑ کے ایمان لانے کی حقیقت بالکل مخفی رہی گئی۔ اور ایسی کہ باہر والے تو کیا گھر والے بھی مشکل سے اسپر علم و اطلاع پاسکے۔ مگر تاہم ابراہیمؑ کی دعوت ایمان اور رسالت کے اعلان کی امتناعی سامان مہیا کرنا۔ جیسا گھر والوں نے اپنا فرض قرار دے لیا تھا۔ ویسا ہی باہر والوں نے سب نے ملکر بڑی بڑی کوششیں کیں۔ اور اُس کی امتناعی تدبیروں میں اپنی عملی طریقوں سے کوئی طریقہ بھی اُٹھا نہیں رکھا۔ مگر کچھ بھی مفید کار نہ ہوا۔ جناب ابراہیمؑ تبلیغ رسالت میں ویسے ہی مستعد و سرگرم رہے۔

ارض بابل سے ہجرت

تمام قوم کافرین نے اپنی کوششوں میں ناکامیاب رہ کر اِس بیمعصوم کے خون ناحق کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا حضرت ابراہیمؑ کو حضرت لوطؑ کے

۵۱؎ روضۃ الاحباب باسناد مواہب لدنیہ۔ تاریخ کامل ابن اثیر اور حیات القلوب جلد اول۔

ذریعہ سے مخالفین کے ان ظالمانہ ارادوں کی خبر لگ گئی۔ اور حقیقتاً مشرکین کی مخالفانہ کارروائیوں کے معلوم ہونے اور اپنی جان کو محفوظ رکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ اُسوقت آپ کے لیے سخت دشوار تھا۔ مگر نظام قدرت کا مدعائے مشیت یہی ہے۔ اور اُس کے احکام تدبیر کی۔ قدرت انہیں اُمور مستورہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کسی کو لوطؑ پر افشائے راز کا گمان بھی نہیں تھا۔ اور وہی اُس کے اصلی ذریعہ اطلاع ثابت ہوئے۔ نظام قدرت نے حضرت لوطؑ کو ربقہ ایمان میں لاکر اُس داعی ایمان کی رفاقت وحفاظت کے پورے سامان اور کافی اطمینان فراہم کر دیئے۔ حضرت لوطؑ کی یہی خدمت تھی۔ کہ قوم مشرکین کے معاندانہ ارادوں کی خبر حضرت ابراہیمؑ کو پہونچایا کرتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ خبر پاکر اس کے ہر پہلو پر غور فرمایا۔ مگر سوائے ہجرت اور ترک وطن کے حفاظت جان کا کوئی دوسرا طریقہ نظر نہیں آیا۔ تو حضرت لوطؑ کو مخاطب کرکے اپنے اِس ارادہ کا جو حقیقت میں حکم الٰہی کا عین اشارہ تھا۔ ان الفاظ میں اظہار فرمایا۔ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ میں تو اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ اور وہ سب سے زبردست اور حکمت والا ہے۔

اِس برحق نبی اللہ کا قصد ہجرت سنکر حضرت لوطؑ نے فوراً لبیک کہی۔ اور ایسا ہی سارہ نے بھی رفاقت کیلئے اپنا قصد مصمم ظاہر فرمایا۔ اور ان دونوں بزرگواروں کی رفاقت معلوم کرکے جناب ابراہیمؑ کو پورا اطمینان ہوگیا۔

ہجرت ابراہیمی کو آنحضرت صلعم کی ہجرت سے خاص مماثلت تھی

دعوت ابراہیمی کے اِن ابتدائی واقعات کو حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ الاجمعین کی تبلیغ رسالت کے آغاز حالات سے جس وقت مقابل کیاجاتا ہے تو ان دونوں داعیان شریعت الٰہی کے واقعات میں ایک خاص مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ تھوڑے سے غور کرنے کے بعد معلوم ہوجائے گا۔ کہ جناب ابراہیم علیہ السّلام نے بھی اپنی دعوت اور تبلیغ رسالت کا آغاز اپنے گھر والوں سے شروع کیا۔ پہلے حضرت سارہ (آپ کی زوجہ) پھر حضرت لوطؑ (آپ پر ایمان لائے بالکل اسی طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تبلیغ رسالت کو بھی اپنے اہل بیت کی تعلیم و ہدایت سے آغاز کیا۔ سب سے پہلے جناب صدیقہ کبریٰ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا آپ کی رسالت پر ایمان لائیں۔ اور آپ کے بعد آپ کے ابن عم حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام۔ جیسا کہ ہمارے سلسلہ بیان میں آئندہ پوری تفصیل وتحقیق سے معلوم ہوجائے گا

بابل سے شہر حاران کیطرف ہجرت اور قیام

اِن واقعات سے ظاہر ہوا۔ کہ عادت الٰہی ہمیشہ سے ایسی ہی جاری ہوئی ہے۔ کہ انبیاء مرسلینؑ کی تعلیم وہدایت

پہلے اُن کے اعزہ و اقارب سے آغاز ہوتی ہے۔ اسلیئے کہ قرابت و یکجہتی کی بنا پر اُن کی تصدیق زیادہ اعتبار و اعتماد کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو مشرکین قوم کے ہاتھوں سے اپنی جان جانے کی جب کوئی اُمید نہیں دیکھی۔ تو ایک دن حضرت لوط سے۔ جیساکہ قرآن مجید میں اشارہ کیا گیاہے۔ اپنے ہجرت فرمانے کا قصد ظاہر فرمایا۔ اور جیساکہ معتبر تاریخوں سے ثابت ہے۔ کچھ رات رہے حضرت لوط اور سارہ کو ہمراہ لیکر حاران کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں پہونچکر حضرت ابراہیمؑ نے ایک معتدبہ زمانہ تک دلجمعی سے اپنی تبلیغ رسالت اور ترتیب معیشت کے ضرورتیں انجام دیں۔ اور اسمیں بھی کلام نہیں۔ جیساکہ واقعات بتلارہے ہیں۔ آپ کو آپ کے تمام اُمور میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔

کنعان میں قیام۔ تھوڑے زمانہ کے بعد یہاں کی حالت پہلے سے دگرگوں اور اہل زمانہ کی طبیعت بھی ناموزوں دیکھکر حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے شہر حاران کی اقامت ترک فرمائی۔ اور وہاں سے اُٹھکر کنعان میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہاں بھی نہایت دلجمعی اور پوری کامیابی کے ساتھ آپ کی رسالت کے اُمور انجام پاتے رہے۔ مگر ایک سال کنعان اور اُس کے قرب وجوار میں ایسا قحط عظیم پڑا۔ کہ آپ کو بالآخر مجبور ہو کر کنعان سے اپنے اہل وعیال کے ہمراہ ملک مصر کی طرف چلاجانا پڑا۔

مصر کیطرف روانگی اور فرعون کے ساتھ معاملات جناب ابراہیمؑ نے دیگر دیار و امصار کی اقامت اختیار کرنے کی جگہ مصر کو خاص طور پر کیوں اختیار فرمایا۔ اُس کی خاص وجہ یہی کہ فرعون مصر جو اُسوقت مصر پر حکمراں تھا۔ وہ آپ کا ہم قبیلہ اور ایک وقت میں ہموطن تھا۔ اس لیے قحط سالی میں اُس کی استمداد و اعانت کی زیادہ اُمید تھی۔ اس قرابت و یکجہتی کے مفصل حالات حضرت ہاجرہ کے احوال میں بہت جلد معلوم ہونگے۔

مصر پہونچکر حضرت ابراہیمؑ کو اس مسافرت اور غربت کے عالم میں ایک سخت مصیبت سے سامنا ہوا۔ فرعون مصر کو حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے ساتھ حضرت سارہ کی خوشجمالی کی بھی پوری کیفیت معلوم ہوئی۔ اُسنے مشتاق ہو کر حضرت ابراہیمؑ کو بلابھیجا۔ جب یہ فرعون کے دربار شاہی میں مع حضرت سارہ کے پہونچے۔ تو اُس نے سارہ کے حسن وجمال کو اُس سے بھی زیادہ تعریف کے قابل پایا۔ جیساکہ وہ سُن چکا تھا۔ بادشاہ مصر نے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا۔ کہ یہ عفیفہ تمہاری کون ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حفاظت جان اور سارہ کے حفظان آبرو کی مصلحتوں پر غور فرماکر ارشاد کیا۔ کہ یہ میری بہن[۵۱] ہیں۔

[۵۱] کیا وجود تقیہ کی قدامت اور شرائع و مذاہب قدیمہ میں اُسکے جائزالعمل ہونے کی نسبت کسی عقل سلیم رکھنے والے کو اب بھی کوئی عذر کلام باقی رہ جائیگا۔ المؤلف

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ عقد ازدواج سے پہلے وہ آپ کی عمزاد بہن تھیں۔ کیونکہ آپ کے باپ تارخ (ترح) کی ایک بہن اپنے قبیلہ میں جس سے بیاہی گئی تھیں۔ اُن کا نام بھی ہاران تھا۔ اور حضرت لوطؑ کے باپ جو حضرت ابراہیمؑ کے بھائی ہوتے تھے۔ اُن کا نام بھی ہاران تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حفاظت جان اور سارہ کی حفظان آبرو کے خیال سے اُن کی زوجیت کی موجودہ حیثیت کا کتمان اور اُسکی جگہ اپنی سابق قرابت کا اظہار و اعلان فرمایا۔ جو ایسی ناگزیر حالتوں میں خدا کی طرف سے تمام شریعتوں میں مجوّز اور مباح ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ توراۃ میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جب (ابراہیم) مصر کے نزدیک پہونچا۔ تو اُس نے اپنی جورو سرئی (سارہ) سے کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں۔ کہ تو دیکھنے میں بڑی خوبصورت عورت ہے۔ اور یوں ہوگا۔ کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے۔ کہ یہ اُس کی جورو ہے۔ سو مجھ کو مار ڈالیں گے۔ اور تجھے جیتا رکھیں گے۔ تو کہیو کہ میں اس کی بہن ہوں۔ تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو۔ اور میری جان تیرے وسیلہ سے سلامت رہے۔ (تکوین باب ۱۲۔ آیت ۱۰۔۱۳)

حضرت ابراہیمؑ کے خیال کے مطابق فرعون مصر کے دل میں سارا کی طرف سے نفسانیت و فساد کے آثار پیدا ہوئے۔ مگر کرشمہ قدرت نے ہر بار اُس کے ارادہ بد کے موقع پر اُسکی کافی تنبیہ فرمائی۔ اور بالآخر وہ اپنے ناہنجار کردار سے سخت پشیمان و نادم ہوا۔ اور پھر اُن دونوں بزرگواروں کی ذاتی عظمت و تقدیس کا قائل ہو کر اُن کو اپنے ملک سے بڑے اکرام و انعام کے ساتھ رخصت کر دیا۔ خصوصاً جناب سارہ کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کے اظہار میں اپنی لڑکی ہاجرہ نامی کو اُنکی خدمت کی غرض سے ہمراہ کر دیا۔ توراۃ میں ان واقعات کے متعلق یہ عبارت مرقوم ہے۔

جب ابراہیمؑ مصر میں پہونچا۔ مصریوں نے اُس عورت کو دیکھا۔ کہ وہ نہایت خوبصورت ہے۔ اور فرعون کے امیروں نے بھی اُسکو دیکھا۔ اور فرعون کے حضور میں اُسکی تعریف کی۔ اور اُس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے۔ اور اُس نے اُسکے سبب ابراہیمؑ پر احسان کیا۔ کہ اُس کو بھیڑ۔ بکری اور گائے۔ بیل۔ اور گدھے۔ غلام۔ اور لونڈی۔ اور گدھیاں اور اونٹ ملے۔ پر خداوند نے فرعون اور اُسکے خاندان کو ابراہیمؑ کی جورو سارہ کے سبب بڑی مار ماری۔ تب فرعون نے ابراہیمؑ کو بُلا کر کہا۔ کہ تو نے یہ مجھ سے کیا کیا۔ کیوں نہ کہدیا۔ کہ یہ میری جورو ہے۔ تو نے کیوں کہا کہ یہ میری بہن ہے۔ یہاں تک کہ میں اُسکو اپنی جورو بنانے کے لیے لیا۔ دیکھو یہ تیری جورو حاضر ہے۔ اُسکو لے اور چلا جا۔ (تکوین باب ۱۲۔ آیت از ۱۴ تا ۲۰)

توراۃ اور اسلامی تفاسیر قرآن فرعون کے ارادہ بد کرنے اور اُسکے بدلے میں بار بار عقوبت اُٹھانے پر متفق اللفظ ہیں۔ اور حقیقتاً قدرت الٰہی کے یہی تصرفات ہیں۔ اور اُس کی جبروت قدرت کے یہی واقعات۔ حضرت سارہ کے ساتھ فرعون کے کیا قصد تھے۔ اور کیا ارادے۔ اور چشم زدن میں

اُن بدارادوں کی جگہ کیسی عقیدت ہوگئی۔ اور کتنی ارادت۔ اب تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے مطیع اور فرمانبردار مخلص کے متعلق ایسے ارادوں کا وہم و گمان بھی سخت افترا ہے۔ اور صریح بہتان جس عقیدت مند نے اس خاتون مقدس کے ساتھ اتنی بڑی عقیدتمندانہ فیاضیوں کے سلوک کیے ہوں کثیر التعداد مال وجنس۔ اسباب و اثاثہ کے علاوہ اپنی پیاری لڑکی تک خدمت کی غرض سے ہمراہ کر دی ہو۔ وہ کبھی ایسی بیجا جرأت اور نازیبا حرکت کے اقدام کا مرتکب تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک تو حضرت ابراہیمؑ کی قرابت۔ دوسرے حضرت سارہ کی عظمت۔ اور تیسرے جناب ہاجرہ کی قلبی محبت کے سبب سے فرعون مصر نے اس غربت زدہ نبی اللہ کے تمام اسباب معاشرت کیا۔ اس چھوٹے سے قبیلہ وخاندان کے تمام آئندہ سامان معیشت کافی طور پر درست وفراہم کر دیئے۔ عربی توریت کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

وصعد ابرام من مصر ھو وزوجتہ وکل مالہ ولوط معہ الی القبیلۃ وابرام عظیم جدا بالماشیۃ والفضۃ والذھب۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی بی بی اور تمام اموال کے ساتھ مع حضرت لوطؑ کے اپنے قبیلہ (شمال) کی طرف روانہ ہوئے۔ اُسوقت ابراہیمؑ کے ساتھ بہت سا اسباب اور سیم وطلا تھا۔

(تکوین باب ۱۳۔ آیت ۳-۲)

قیام حبیرون۔ جناب ابراہیمؑ نے قحط کی شدت کی وجہ سے جب اپنے اہل وعیال کی گذران کی صورت کنعان قریب فلسطین نہیں دیکھی۔ تو مصر کا سفر اختیار فرمایا تھا۔ مگر خدائے مسبب الاسباب نے اُن کی خوشحالی اور معیشت کے خاطرخواہ اسباب بلکہ اُس سے المضاعف فراہم فرما دیئے۔ اور آپ کامیاب ہوکر پھر کنعان کے علاقہ میں واپس آئے۔ اور مقام حبیرون میں بودوباش اختیار کی۔ اور پھر اپنی تمام مقدس حیات کا زمانہ یہیں صرف فرما دیا۔ چنانچہ آجتک یہ مقام خلیل مشہور رہے۔ مقام حبیرون کی سکونت کے وقت سے آپ کی حالت بہت کچھ قابل اطمینان ہوگئی تھی۔

آپ نے سیرۃ انبیاء ومرسلین کے مطابق اپنی دولت کو تبلیغ رسالت۔ رفاہ عام۔ اکرام ضیف اور عام عطا و ایثار کے نیک کاموں میں صرف فرمانا شروع کیا۔ قرب وجوار کے ریگستان میں متعدد کنوئیں کھدوائے۔ جن میں سے بیرشبع بہت مشہور رہے۔ اور قادش اور اشور کے بیابان میں مسافرین کے آرام اُٹھانے اور پھل کھانے کی غرض سے ایک باغ بھی لگا دیا۔

سفر تکوین باب ۲۱ درس ۱۴ و ۱۵ و ۳۰ و ایضاً باب ۲۱ درس ۳۳۔

علاقہ حاران میں حضرت لوط کی رسالت

رفاہ عام کے اعلیٰ خدمات کے علاوہ آپ کی مہمان نوازی اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ کہ باوجود اتنے کثیر استداد ایام کے بھی۔ خوانِ خلیل کا نام آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ تبلیغ رسالت کے خدمات بھی خاطر خواہ کامیابی اور ترقی کے ساتھ جاری تھے۔ گرد و نواح کے لوگ آپ کی تشریف آوری کو حصول سعادت اور نزول برکت کا باعث سمجھنے لگے۔ اور آپ کے ارشاد و ہدایت سے مستفیض ہو کر خدائے واحد کی ربوبیت اور اس کی وحدانیت کے قائل ہو کر دین حنیف ابراہیمی میں داخل ہونے لگے۔ تبلیغ رسالت کا شہرہ اور عام اخلاق و ایثار کے آثار و اخبار چاروں طرف پھیل گئے۔ علاقہ حرآن کے لوگ بھی مدت سے متلاشی ایمان تھے اور وہ یہاں سے کسی قدر مسافت پر واقع تھا۔ اس لیے حضرت لوطؑ کو آپ نے وہاں کے لوگوں کی تعلیم و ہدایت کی غرض سے بھیجا۔ اور وہ ایک نبی متبع کی صورت و شان میں وہاں تشریف لے گئے۔ حضرت لوطؑ کی کوئی علیحدہ یا خاص شریعت نہیں سمجھنی چاہیے۔ بلکہ وہی شریعت ابراہیمی تھی جس کی تعلیم و تلقین کی ضرورت سے آپ اُس علاقہ میں بھیجے گئے تھے۔

مزاوجت حضرت ہاجرہ اور ولادت حضرت اسمٰعیل

حضرت ابراہیمؑ کا سن اُسوقت ستر برس کا ہو چکا تھا۔ مگر اسوقت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے گھر میں سب کچھ تھا۔ ہر طرح کی مقدرت ہر طرح کی آسودگی۔ اور فارغ البالی حاصل تھی۔ ایک اولاد نہ ہونے سے سارا گھر بے چراغ تھا۔ اور آنکھوں میں دُنیا تاریک تھی۔ فطرت انسانی کے اُصول پر بے اولادی کا اثر حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ جناب سارہ کے دل پر مستولی تھا۔ اور یہ دونوں بزرگوار معبود حقیقی کی بارگاہ میں اس حصول نعمت کے لیے۔ ہمیشہ دست بدعا رہا کرتے تھے۔ اور شب و روز اس مدعا کے لیے متمنّی۔

حقیقت میں مشیت الٰہی کو آپکی دُعا کی اجابت تو ضرور منظور تھی۔ مگر اس کے حصول کے ذریعہ کی نسبت جناب سارہ کے مقابلہ میں حضرت ہاجرہ کو اوّلیت اور سبقت کا امتیاز و اعزاز عنایت فرمانا منظور تھا۔ اسکی تفصیلی کیفیت یہ ہے کہ سن کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ بھی ضعیف ہو چکے تھے۔ اور جناب سارہ بھی سن رسیدہ۔ اس بنا پر دونوں حضرات کو حصول اولاد کی طرف سے گویا مایوسی ہو چلی تھی۔ اُصول فطرت کے مطابق سارہ کی مایوسی ابراہیمؑ کی ناامیدی سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے سارہ نے اپنی طرف سے بالکل قطع اُمید فرما کر اپنے شوہر عالیمقدار کے بے نام و نشان رہجانے پر کمال حسرت و افسوس کا اظہار فرمایا۔ اور ایسے برگزیدہ اور خدا رسیدہ بزرگ کی قطع نسل ہو جانے کے حسرتناک واقعہ کو ناقابل برداشت خیال کر کے اُنکے مقدّس نام و نشان کی بقا و قیام کے سامان اپنے امکان کے مطابق فراہم کرنا ضروری سمجھا حالانکہ اُصول فطرت کے مطابق نسوانی طبائع میں ایسے

خیال اور اعتدال کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ بخلاف اس کے ہم حضرت سارہ کے دل میں اُنکی ابتدا اور وجود کو خدا کے الہام اور نظام قدرت کے القاء و مکاشفات یقین کرتے ہیں۔ کیونکہ بغیر ان خیالات وجذبات کے نسل ابراہیمی کے اُس سرمایۂ ناز اور صاحب اعزاز سلسلہ کی نہ ابتدا قائم ہو سکتی تھی۔ اور نہ بقا جس سلسلۂ مقدسہ اور شجرۂ مبارکہ سے مشیت الٰہی کو جریدۂ نبوت کا خاتم اور سلسلۂ رسالت کا متمم پیدا کرنا تھا۔

چاہے کتب قدیمہ میں اسکی خبر نہ ہو چاہے اہل تاریخ وسیر کی اس پر نظر نہو۔ چاہے دور از قیاس ہو۔ اور خارج از عقل چاہے یہ جنبہ داری کہی جائے۔ یا مؤلف کی عقیدتمندانہ قلم کاری۔ مگر ہم پوچھیں گے۔ اور بکھر پوچھیں گے کہ جناب سارہ کو بمقابلہ حضرت ہاجرہ عطائے اولاد میں شرف اوّلیت اور اعزاز سبقت نہ تفویض فرمانا مشیت کی کس خاص مصلحت اور علّت پر مبنی تھا۔ باطن کا ہمکو علم نہیں۔ مگر ظاہر حقیقت اسکی یہی ہے اور ضروریہی ہے۔ کہ حضرت ہاجرہ کے سلسلۂ مقدس سے مشیت الٰہی کو۔ سید الانبیا خاتم المرسلین اور خاتم النبیین سلام اللہ علیہ وآلہ المعصومین کا وجود عالم موجود میں لانا مقصود تھا۔ جسکا مقابل اور مماثل حضرت سارہ کے اِتنے بڑے کثیر التعداد سلسلہ انبیاء میں ایک بھی نہیں تھا۔ اِس فضیلت اور شرف مراتب کے اعتبار سے حضرت واہب العطایا نے اوّلیت اور سبقت کا شرف مخصوصہ جناب ہاجرہ کو عنایت فرمایا۔ ھٰذا فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشآء

مشیت نے یہ سامان اور قدرت نے یہ اسباب پہلے سے مرتب کر لیئے۔ تو جناب سارہؑ نے اپنے کمال مایوسی کے عالم میں ایک دن حضرت ابراہیمؑ سے آپ کی بے اولادی کے متعلق کمال افسوس ظاہر کیا۔ اپنی ظاہری اور نسوانی ناقابلیتوں کے موجودہ عذر پیش کر کے اپنی ذات خاص کو حصول اولاد کا ذریعہ ہونا دشوار کیا قریب المحال ٹہرایا۔ جناب ابراہیمؑ کو پہلے تو اُن کی خاص مجبوریوں کے اظہار پر اور پھر اپنے آئیندہ لاوارثی پر بہت ہی افسوس آیا۔ مگر سارہ نے یہ کہکر اُن کے حزن وملال کو رفع کر دیا۔ کہ آپ میرے بے نام ونشان رہنے کا کوئی افسوس نہ فرمائیں۔ صرف اپنی بقائے نسل کی فکر کریں۔ اور وہ بالکل آپ کے امکان میں ہے۔ اور نہایت آسان۔ ہاجرہ موجود ہیں۔ اُن کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ افضال ایزدی کے منتظر رہیں۔ شاید وہ آپ کے لیئے ہاجرہ ہی کو حصول اولاد کا ذریعہ قرار دے۔

اب اس واقعہ کو توراۃ کی مفصلہ ذیل عبارت سے مقابلہ کر لینا بھی نہایت ضروری ہے۔

سارا ابراہیم کی جورو کوئی لڑکا نہ جنی۔ اور اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور سارا نے ابراہیم سے کہا۔ کہ دیکھ خداوند نے مجھے جننے سے باز رکھا۔ اب میری لونڈی کے پاس جائیے۔ شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابراہیم نے سارا کی بات مان لی (تکوین باب ۱۶۔ آیت ۱۔۲)

حضرت ابراہیمؑ نے سارا کی تجویز پسند کی۔ اور ہاجرہ کو شرف زوجیت عطا فرمایا۔ مشیت الٰہی کے اسباب درست

ہو چکے تھے۔ اور قدرت لامتناہی کے سامان مرتب اور تیار تھے۔ جناب ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ خدا کی قدرت اور رحمت نے۔ ابوالعرب عراق الثری۔ ذبیح اللہ اوّل۔ حضرت اسمٰعیل ابن خلیل اللہ کا وجود ذی جود قائم کر دیا۔

ولادت اسمٰعیل کے متعلق آسمانی بشارتیں

یوں تو جناب ابراہیم ہمیشہ نعمت اولاد سے اپنی محرومی اور ناکامیابی کا خیال کر کے خدائے سبحانہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عطائے اولاد اور بقائے نسل و نام کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اور خداوند عالم بھی آپ سے عطائے اولاد کے وعدے فرما کر آپکی خاطر خواہ تسکین و تشفی فرمایا کرتا تھا۔ جسکو ہم بہت جلد حضرت اسمٰعیلؑ کے خاص حالات میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ اِس مقام پر ہم صرف اُنہیں بشارتوں کو ذیل میں لکھتے ہیں۔ جو خدائے سبحانہٗ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اسمٰعیلؑ اور اُن کی اولاد کے متعلق پہونچائی تھیں۔

فطرت انسانی کا خاص تقاضہ ہے۔ کہ حصول شے کی اُمید ہو جانے پر۔ انسان پھر اُس شے مطلوبہ کی بہتری۔ سلامتی اور بقا کا متمنی ہوتا ہے ؎

برایں اُمید ہائے شاخ در شاخ　　کرمہائے تو مارا کرد گستاخ

اُنہیں موقعوں کے لیئے کہا گیا ہے۔ اِس بنا پر حضرت ابراہیم نے ہاجرہ کو حاملہ پاکر پروردگار عالم سے صاحب حمل کی سلامتی اور طولعمری کی پروردگار عالم سے دعا تو ضرور مانگی۔ اب چاہے اسے فطرت انسانی کا نتیجہ کہا جائے یا درد فرزندی کا تقاضہ۔ خدائے مستجاب الدعوات نے حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی نوید دی جن الفاظ میں ابراہیمؑ کے ان مستفسرات کا جواب آیا۔ وہ عربی توراۃ میں اِس طرح مرقوم ہیں۔

قد سمعت دعائک لاسمٰعیل وھانا بارکته واثمرته وفضّلته کثیرًا یولد اثنی عشر خلیفة واجعله جلیلًا کبیرًا میں نے تیری دعا اسمٰعیلؑ کے حق میں قبول کی۔ ہاں۔ میں نے اُسے برکت دی۔ اور اُسے بار آور کیا۔ اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اُس سے بارہ خلیفہ (امامؑ)[1] پیدا ہونگے۔ اور میں اُسکو بڑی قوم کرونگا۔ (پیدائش کتاب اوّل باب ۱۷۔ آیت ۲۰)

اسی طرح حضرت ہاجرہؑ کو بھی بشارت عطا فرمائی گئی۔ توریت۔ کتاب پیدائش میں مرقوم ہے۔

خدا کے فرشتے نے اُسے (ہاجرہ کو) بیابان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے۔ پایا۔ اور اُس نے کہا اے ہاجرہ تو کہاں سے آئی۔ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سارا کے سامنے سے بھاگ آئی ہوں۔ پھر خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا۔ کہ تو اپنی بی بی کے پاس چلی جا۔ اور اُسی کی تابع رہ۔ پھر خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا۔ کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا۔ کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی۔ اور خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا۔ کہ تو حاملہ ہے۔

[1] کیا وجود امامت آئمہ اثنا عشر علیہم السلام کے ثبوت قدامت میں اب بھی کسی قدیم سند کی ضرورت ہے۔ المؤلف۔

اور ایک بیٹا جنے گی۔ اُس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔ کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا۔ (تکوین باب ۱۶۔ آیت ۷۔ ۱۱)

ان بشارتہائے خداوندی اور تو یدہائے ایزدی سے حضرت اسمٰعیل کی ذاتی عظمت اور نیز آپ کی اولاد طاہرین کی قدر و منزلت پورے طور سے ظاہر ہوگئی۔ اور اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا۔ کہ اس بشارت سے حضرت ہاجرہ کی تقدیس و تکریم پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ نظام مشیت کے انتظام اپنے وقت مقررہ پر کامل ہوئے۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام رونق افروز جہستان عالم ہوئے۔ ایسی دعاؤں اور تمناؤں والے فرزند کی تولید سے حضرت ابراہیمؑ کو کیسی روحی مسرت اور قلبی فرحت حاصل ہوئی ہوگی۔ اُس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔ کہ خانہ ابراہیمی میں مدت مدید کی تاریکی کے بعد یہ پہلا چراغ تھا۔ جو خدا کے انوار رحمت سے روشن ہوا۔ اور واقعی زمانہ دراز کی ویرانی کے بعد۔ اس گوہر یکتا کے وجود سے خانہ خلیل الٰہی کی آبادی اور رونق قائم ہوئی۔

سارہ اور ہاجرہ میں مشاجرت ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ کہ حضرت سارہ کی جناب ہاجرہ کی طرف توجہ اور شفقت اصول فطرت نسوانی کے بالکل خلاف تھی۔ مگر قدرت کو اپنا کام نکالنا تھا۔ اور مشیت کو اپنی ضرورت پوری کرنی تھی۔ اُس نے ایک خاص وقت تک سارہ کے دل میں ہاجرہ کی طرف سے خیال مخالفت پیدا ہونے دیا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے سفارش و فرمائش کر کے خود ہاجرہ کو اُن کی زوجیت کا شرف دلوایا۔ جب اِس شرف خاص سے مشرف ہو کر حاملہ ہو چکیں۔ تو سارہ کے دل میں فطرت نسوانی کے اثر خطور کرنے لگے۔ اور ہاجرہ کی طرف سے چیں بجبیں رہنے لگیں۔ یہاں تک ایک بار غصہ میں آکر ہاجرہ کو گھر سے باہر نکال دیا۔ توریت کی مفصلہ ذیل عبارت میں اِس واقعہ کی حقیقت کھل جاتی ہے

جب اُس نے دیکھا کہ میں حاملہ ہوئی۔ تو اپنی بی بی (سارہ) کو حقیر جانا۔ تب سارہ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ نا انصافی جو مجھ پر ہوئی۔ تیرے ذمہ ہے۔ میں نے اپنی لونڈی تجھے دی۔ اور اب جو اُس نے اپنے آپ کو حاملہ پایا۔ تو میں اُس کی نظروں میں حقیر ہو گئی۔ میرا اور تیرا انصاف خدا کرے۔ ابراہیمؑ نے سارہ سے کہا۔ کہ تیری لونڈی تیرے ہاتھ میں ہے۔ جو تیری نگاہ میں اچھا ہو۔ سو اُس کے ساتھ کر۔ تب سارہ نے ہاجرہ پر سختی کی اور وہ اُس کے سامنے سے بھاگ گئی۔ (اُس کے آگے ہاجرہ پر فرشتہ رحمت کا نازل ہونا۔ اور ولادت اسمٰعیل کی بشارت۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوئی۔ یہ بجائی جا مذکور ہے) تکوین باب ۱۶۔ آیت ۴۔ ۶

توریت کی مرقومہ بالا عبارت نے پوری حقیقت کھولدی۔ ایسے موقعوں پر فطرت نسوانی کے ایسے ہی اثر اور توہمات پیدا ہوتے ہیں۔ بات میں بات اور شاخ میں شاخ نکالی جاتی ہے۔ ہاجرہ کے حقیر جاننے کا مسئلہ بھی انہیں توہمات کا اثر خاص سمجھا جائے گا۔ غرض **سے** قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے۔

حضرت ابراہیمؑ اس مشاجرت کا کوئی تصفیہ نہ کر سکے۔ اور حقیقتاً ایسے اوقات میں مرد فیصلہ کن رائے ظاہر کرنے

اور ایک طرفہ حکم لگانے سے بالکل مجبور رہ جاتا ہے۔ اصول معاشرت اور تاہل کے یہ روزانہ مشاہدہ ہیں۔

حضرت سارہ کے اختلاف کی بنیاد تو اسی وقت سے پڑی۔ فرشتہ رحمت کی بشارت اور حکم خداوندی کی ہدایت کے مطابق۔ جناب ہاجرہ پھر گھر میں واپس آئیں۔ حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ بڑے ناز و نعم سے پرورش پاتے رہے۔ تیرہ برس کے سن میں باپ نے بڑی کشادہ دلی سے بیٹے کا ختنہ کیا۔ تکوین باب ۱۷۔ آیت ۲۳۔ یہاں تک کہ اسمٰعیلؑ سولہ[16] برس کے ہو گئے۔ قدرت الٰہی نے اسی سال اپنی معجز نمائی کی قدرت دکھلا کر حضرت سارہ کے بطن سے جناب اسحاقؑ کو پیدا کیا۔ اسحاقؑ کی ولادت ہی سے سارہ کے دل میں ہاجرہ کی مخالفت قوت پکڑنے لگی۔ اور یوماً فیوماً اس میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ اور آخر کار ہاجرہ کے ساتھ سخت نفرت وحقارت قائم کر دینے کی باعث ہوئی۔ اس مشاجرت اور مخالفت کا اصلی سبب وہی ہے۔ جو توراۃ کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

سارہ نے دیکھا۔ کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیمؑ سے جنی تھی۔ ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہیم سے کہا۔ کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے۔ کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاقؑ کے ساتھ وارث نہیں ہوگا۔ پر اپنے بیٹے (اسمٰعیل) کی خاطر یہ بات ابراہیمؑ کی نظر میں نہایت بُری معلوم ہوئی (تکوین باب ۲۱۔ آیت ۹۔ ۱۱۔)

مرقومہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ کہ سارہ کو ابراہیمؑ واسحاقؑ کی باہمی مساوات نہایت ناگوار گذری۔ اس خیال مساوات کے بعد اُن کو آگے چلکر اسمٰعیل کے حقوق وراثت کے اندیشے بھی پیدا ہوئے۔ اور غایت مآل اندیشی سے انہوں نے اسمٰعیلؑ کا گھر میں رہنا اپنے لڑکے اسحاقؑ کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لیئے سخت مضر اور نقصان دہ ٹھہرایا۔ اور اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جناب ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کے اخراج کا بیکلم حکم دے دیا۔

یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ خاندان نبوت کا ہر شخص معصوم ہو۔ اور نفسانیت۔ حسد۔ رشک اور دیگر جزئیات طبع انسانی سے پاک وصاف ہو۔ اسی اصول کی بنا پر سارہ کی فہمائش کو سمجھنا چاہیئے۔ وہ اپنے بیٹے اور ہاجرہ کے بیٹے کے درمیان عدالت اور مساوات کے سلوک قائم نہ رکھ سکیں۔ ایسے سخت اور تکلیف دہ حکم صادر فرمانے کے وقت اگر سارہ کے دل میں اسمٰعیل کا درد نہیں آیا تھا۔ تو اُن کی ماں ہاجرہ کی رفاقت۔ خدمت اور ہر قسم کی راحت رسانیوں پر توجہ ولحاظ کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو چکا تھا۔ مزاج بدل گیا تھا۔ حالت دگرگون ہو گئی تھی۔ جس طرح ہاجرہ پر پہلے شفقت ومہربانی کی نظر تھی۔ اسی طرح اب اُن سے عداوت ہے۔ اور تنفر۔ پہلے سارہ نے بقائے نسل ابراہیمی کی تمنا میں پڑ کر خود ہاجرہ کو شرف زوجیت دلوایا۔ اور اُن کو اپنے برابر کی بیوی بنوایا تھا۔ اور اب اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد تغیر مزاج اور تلون طبع نے وہ رنگ دکھلایا۔ کہ

اب ایک دم کے لیے بھی ان ماں بیٹوں کی صورتیں گھر میں دیکھنا نہیں چاہتیں۔

حضرت سارہؑ کی ایک وقت میں اتنی توجہ اور مہربانی اور پھر دوسرے وقت ایسی ناتوجہی اور نامہربانی گو کسی سبب ظاہری پر مبنی بتلائی جائے۔ مگر سبب حقیقی کے متلاشی تو ان امور کو تصرفات قدرت کے مخفی راز یقین کریں گے۔ ضرورت کے اعتبار سے مشیت نے ان مخالف انداز طبیعت سے اپنے مدعا پورا کرنے کے نظام درست کر لیے۔ توجہ اور مہربانی سے سلسلہ اسماعیلی کا وجود قایم کر دیا۔ اور پھر ناتوجہی اور بے مروتی سے بنو اسمٰعیلؑ کی انقطاع عالم میں وسیع آبادی پھیلانے کی ترکیب نکال کر اس سلسلہ عالی کو اُمّت عظیم قرار دینے کی بشارت پوری کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ کو سارہؑ کی یہ بیجا فرمائش نہایت ناگوار گذری۔ مگر ان کے حزن وملال کی تسکین وتشفی فوراً بارگاہِ قدرت سے کر دی گئی۔ اور باتفاق جمہور دار النظام مشیت سے حضرت ابراہیمؑ کو سارہ کے کہنے پر عمل کرنے کا حکم ہوا۔ ہم اُس کو توریت کی عبارت سے ذیل میں لکھتے ہیں۔

خدا نے ابراہیم سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بُری نہ معلوم ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں جو سارہ نے تجھ سے کہی۔ اُس کی آواز پر کان رکھ۔ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے کہلائے گی۔ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ بھی تیری نسل ہے (تکوین باب ۲۱ آیت ۱۲-۱۳)

اب اس حکم الٰہی کی رُو سے حضرت ابراہیم مجبور ہو گئے۔ اور سارہ کی فرمائش پورا کرنے پر مستعد اس فرمان ایزدی کی تعمیل فرمائی۔ ہم اس کی کیفیت بھی توریت ہی کی عبارت سے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کی مقام جبرون سے علاقہ فاران (حجاز) کی طرف ہجرت

حضرت ابراہیم صبح سویرے اُٹھے۔ روٹی اور پانی کا مشکیزہ لے کر ہاجرہ کو دیا۔ اور اُن کے کاندھے پر رکھ دیا۔ اور لڑکے کو بھی اُنھیں دے کر روانہ کیا وہ رخصت ہو کر بیرسبع میں حیران وسرگردان رہے۔ یہاں تک کہ لوٹے یا مشکیزہ میں جتنا پانی تھا سب چک گیا۔ ہاجرہ نے لڑکے کو ایک درخت کی جڑ کے نیچے لٹا دیا۔ اور خود ایک تیر کے فاصلہ پر اُس کے سامنے جا بیٹھیں۔ اس غرض سے کہ اپنے بیٹے کا (پیاس کی شدت سے) مرنا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ اُس کے سامنے بیٹھ کر ہاجرہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگیں۔ خدا نے اُن کے بیٹے کی آواز سن لی۔ اور خدا کے فرشتہ نے ہاجرہ کو آواز دی۔ اور اُس سے کہا کہ اے ہاجرہ۔ تجھ کیا واقعہ گذرا ہے تو خوف نہ کر۔ کہ خدائے تعالےٰ نے تیرے بچے کی وہیں آواز سُن لی ہے۔ جہاں وہ پڑا ہوا ہے۔ تو اُٹھ۔ اور اپنے لڑکے کو اٹھا لے۔ اور اپنی گود میں لے لو۔ کیونکہ ہم اُس کو ایک اُمّت عظیم کرنے والے ہیں۔ اور خدا نے ہاجرہ کی آنکھوں کو کھول دیا۔ اور اُس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا۔ اور اُس کی طرف چلی۔ وہاں پہونچکر اپنا مشکیزہ بھر لیا۔ اور اپنے بیٹے کو پلایا۔ اور خدا

اُس لڑکے کے ساتھ (ہمیشہ) رہا۔ یہانتک کہ وہ جوان ہوگیا۔ اور بیابان میں ساکن ہوا۔ اور بہت بڑا تیر انداز ہوا۔ اور بیابان فاران میں آباد ہوا۔ اور اُس کی ماں نے ایک مصری لڑکی سے اُس کی شادی کردی (تکوین باب ۲۱۔ آیت ۲۱) توریت کی عبارت کو ہم نقل کر چکے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی زبانی صرف یہ فقرہ مذکور ہے۔ رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ پروردگار میں نے اپنی اولاد کو تیرے خانۂ مقدس کے پاس ایک ناقابل زراعت بیابان میں ساکن کیا ہے۔

قرآن کی مرقومۂ بالا عبارت سے صرف ہاجرہ اور اسمٰعیل کی جائے سکونت معلوم ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کا انکشاف نہیں ہوتا۔ لیکن مفسرین و محدثین نے اُس کی پوری تصریح کردی۔ اور عربی کی قدیم و جدید تاریخوں نے کامل شرح و بسط کے ساتھ اُسکو نقل کیا ہے۔ ہم ذیل میں تاریخ ابن اثیر۔ مواہب لدنیہ روضۃ الاحباب۔ اور تفسیر کشاف کے خلاصہ ترجمہ سے اِس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام اُٹھے۔ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو ساتھ لیا۔ اور اُس زمین پر آئے۔ جہاں اب حرم مکہ ہے۔ اُسوقت اُس قطعہ زمین پر نہ عمارت نہ زراعت نہ پانی اور نہ کسی قسم کی آبادی تھی۔ کیونکہ حضرت سارہ کی ایک فرمائش بجا یہ بھی تھی۔ کہ ان ماں بیٹوں کو ایسی جگہ لے جانا چاہیے۔ اور تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ کہ جہاں نہ پانی ہو۔ نہ آبادی۔ اور چونکہ خدا کی طرف سے سارا کی مطابقت اور دلجوئی کے لیے آپ مامور ہوچکے تھے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ اُن کو اُس مرتفع مقام پر لے گئے۔ جہاں خانۂ کعبہ کی موجودہ عمارت قائم ہے۔ اور وہاں لے جاکر اُن کو چھوڑ دیا۔ اور ایک تھیلی میں خرما اور ایک مشک میں پانی ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی ضرورت کے لیے چھوڑ دیا۔ اور خود وہاں سے چلے آئے۔ اور پھر اُن کی طرف کوئی التفات نہ فرمائی۔ ہاجرہ یہ دیکھکر ابراہیمؑ کے پیچھے چلیں۔ اور کہنے لگیں۔ کہ تم مجکو اور میرے بچے کو اس بیابان میں جہاں نہ کوئی رفیق۔ نظر آتا ہے۔ اور نہ ضرورت کی کوئی چیز۔ چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہو۔ مگر ابراہیمؑ اُن کے معروضہ اور استغاثہ کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ اور نہ پیٹھ پھیر کر اُن کی طرف دیکھتے تھے ان کلمات مایوسانہ کو ہاجرہ نے کئی بار کہا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ نے ایک بار بھی نہ اُس کا جواب دیا۔ اور نہ اُنکی طرف پھر کر دیکھا۔ آخر کار ہاجرہ نے پوچھا۔ کہ کیا خدا نے تمکو ایسا ہی حکم دیا۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا۔ ہاں۔ اب حضرت ہاجرہ سمجھ گئیں۔ کہ ابراہیمؑ مجبور ہیں۔ خدا کا حکم ایسا ہی ہے۔ یہ معلوم کرکے ہاجرہ نے رضائے الٰہی پر صبر کرلیا۔ اور یقین کرلیا۔ کہ خدا ہم کو کسی طرح تباہ و برباد نہ کرے گا۔ یہ یقین کرکے حضرت ابراہیمؑ کے تعقب سے واپس آئیں۔ اور اُس خرمے اور پانی کو اپنی اور اپنے صاحبزادے کی ضرورتوں میں صرف فرماتی رہیں۔ یہانتک کہ وہ خرمے اور پانی بالکل تمام ہوگیا۔ اور اب دونوں حضرات پر بھوک اور پیاس کا سخت

غلبہ ہوا۔ حضرت اسمٰعیلؑ بے تاب ہو کر زمین پر تڑپنے لگے۔ ماں سے یہ عالم نہ دیکھا گیا۔ وہاں سے اٹھیں۔ اور کوہ صفا کی طرف روانہ ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہیں۔ پہاڑ سے اُس وادی کے چاروں طرف دیکھتی رہیں۔ کہ شاید کوئی فریاد رس دکھلائی دے۔ مگر کسی کو نہ پایا۔ پھر کوہ صفا سے اُتریں۔ چادر زمین پر کھینچتی ہوئی جلدی جلدی دامن وادی کو طے کرتی ہوئیں کوہ مروا پر تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر تک ٹھہریں۔ کسی کو نہ پایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اسی طرح سات بار آپ نے سعی کی۔ یہ دستور اُسوقت سے لیکر اسوقت تک حاجیوں میں قائم ہے۔ حضرت ہاجرہ ہر بار حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس آکر اُن کا حال دیکھ جاتی تھیں۔ آخر بار جب بیٹے کے پاس آئیں۔ تو اُسکو قریب ہلاکت پایا۔ مایوس ہو کر گریاں و نالاں پھر کوہ مروا پر چڑھ گئیں۔ تو ایک آواز آپ کی بار ان کے کان میں آئی۔ اُس آواز سے ہاجرہ نے خطاب کرکے کہا کہ میں نے تیری آواز تو سُن لی۔ اگر تو حقیقت میں میرا فریاد رس ہے۔ تو میری فریاد کو بھی پہونچ اور میری خبر بھی لے۔ حالانکہ وہ آواز خدا کے فرشتہ جبرئیلؑ کی آواز تھی۔ اور وہ اُسوقت حضرت اسمٰعیلؑ کے پاس کھڑے تھے۔ ہاجرہ کی ندا سُن کر خدا کے فرشتہ نے پوچھا۔ کہ تو کون ہے۔ جو مجھے پکارتی ہے۔ ہاجرہ نے جواب دیا۔ میں ہوں ہاجرہ۔ ابراہیمؑ کی بی بی۔ اور اُن کے بیٹے اسمٰعیلؑ کی ماں۔ فرشتہ (جبرئیل) نے پوچھا۔ کہ ابراہیم نے اس بیاباں میں تم لوگوں کو کس پر چھوڑا ہے۔ ہاجرہ نے کہا کہ خدائے سبحانہ تعالیٰ پر۔ جبرئیل نے کہا بس وہی تمہارے لیئے کافی ہے۔ جس پر تمہیں چھوڑا ہے۔ یہ کہکر جبرئیلؑ نے اپنے پاؤں یا پروں سے اس زمین پر ضرب لگائی۔ وہاں سے پانی کا چشمہ جاری ہوا۔ اتنے میں ہاجرہ اسمٰعیلؑ کے پاس چلی آئیں۔ تو پانی کا ایک اُبلتا ہوا چشمہ نظر آیا۔ ہاجرہ خود بھی سیراب ہوئیں۔ اور اسمٰعیلؑ کو بھی سیراب کیا۔ پھر یہ خیال کرکے کہ یہ پانی بھی چک نہ جائے۔ اسوجہ سے اُسکے کناروں کو باندھ کر اُسکو ایک حوض کی شکل میں بنا دینا چاہا۔ کہ پانی اُس میں جمع رہا کرے۔ اور پانی کی مشک آسانی سے بھر لی جایا کرے جبرئیلؑ نے ہاجرہ کی تسکین کی۔ اور کہا کہ پانی کی کمی کا ذرا خیال نہ کرو۔ اور نہ ڈرو۔ کہ اس وادی کے رہنے والے پیاسے رہیں گے۔ کیونکہ وہ چشمہ ہے۔ جس سے خدائے سبحانہ تعالیٰ اپنے مہمانوں کو ہمیشہ سیراب فرمایا کرے گا۔ (ابن اثیر مطبوعہ مصر جلد اوّل۔ روضۃ الاحباب باسناد مواہب الدنیہ۔ ابن حجر عسقلانی۔ جلد اوّل ص ۸۔ حیات القلوب مجلسی جلد اوّل۔

حقیقت کی تلاش کرنے والے اصلیت کے ڈھونڈنے والے۔ مرقومہ بالا عبارتوں پر غور کرکے خود نتیجہ نکال لینگے۔ اور سمجھ جائیں گے۔ کہ اس واقعہ کے متعلق توراۃ میں جو کچھ تحریر ہے۔ تھوڑے ہی اختلاف کے ساتھ۔ وہی عربی تاریخ و حدیث کی کتابوں میں بھی مرقوم ہے۔ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی ہجرت پر سارا کا اصرار۔ حضرت ابراہیمؑ کا بے حد حزن و ملال۔ سارہ کی فرمائش پوری کر دیئے جانے کے لیئے خدا کا مصلحتانہ

حکم۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی ازدیاد اولاد۔ اور اُمت عظیم ہونے کی بشارت اور اُن کے بابرکت ہونے کی نوید۔ جلاوطنی میں ماں بیٹوں پر تشنگی کی سخت مصیبت۔ بیٹے پر قریب المرگ ہوجانے کی حالت۔ ماں کا لاانتہا اضطرار و اضطراب۔ ماں کی جستجوئے آب۔ خدا کے فرشتہ کی ندائے غیب۔ ہاجرہ کے اضطراب میں اُس کے تشفی بخش خطاب و کلمات۔ خدا کا ہمیشہ اسمٰعیلؑ کی امداد پر تیار رہنے کی بشارت۔ پھر ہاجرہ کو چشمہ آب دکھلانا۔ ہاجرہ کا اُس پانی سے بیٹے کو سیراب کرنا۔ اور پھر خدا کا اُس کے بیٹے کے ساتھ ہمیشہ رہنا۔ وغیرہ وغیرہ بالاتفاق درج ہے۔

اختلاف ہے تو دو اُمور میں۔ اوّل یہ کہ توراۃ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ابراہیم نے صرف ان ماں بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ نہ اُن کے ساتھ گئے۔ اور نہ پھر اُن کی کوئی فکر و تلاش کی۔ وہ مصیبت کے مارے پھرتے پھراتے بیرسبع سے دشت فاران میں آپ پہونچ گئے۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیمؑ کا مع ہاجرہؑ و اسمٰعیلؑ یکبارچلا آنا معلوم ہوتا ہے۔ توریت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ ماں بیٹے بیرسبع میں آئے۔ وہاں سے فاران میں۔ اور فاران کی اصلیت و ماہیت میں بہت اختلاف ہے۔

اوّل اختلاف کی نسبت ہم پوری تفصیل سے انکشاف حقیقت کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو اپنے ہمراہ لاکر بیابان فاران (حجاز) میں پہونچا گئے

سرسید مرحوم خطبات احمدیہ میں بھی توراۃ کی عبارت واقعہ پر اعتبار کرتے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ وہ ایسے صاف لفظوں میں اس واقعہ کو تحریر فرماتے ہیں۔ جسکو کوئی مسلمان پسند نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس انداز تحریر اور الفاظ بیان سے۔ جو متعصبین یہود کی خاص الخاص تقلید اور حاسدین نصاریٰ کی صاف صاف تائید ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایسے عظیم الشان۔ عمیم الاخلاق والاحسان پیغمبر اور ابوالانبیاء و المرسلین کے مکارم اخلاق اور محاسن عدل و انصاف کے پاک و صاف دامن پر۔ ناانصافی بے مروّتی۔ اور بدخلقی کے بدنما اور نازیبا دھبے پڑجاتے ہیں۔ اور نیز ان واقعات سے حضرت ہاجرہؑ اور جناب اسمٰعیلؑ کی کسرشان۔ استخفاف حقوق اور اقتصار عظمت و تقدیس ثابت ہوتی ہے۔ جن کی قدر و منزلت کو سیّد صاحب اپنے اکثر مباحث میں قوی دلائل سے۔ یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں اُنھیں کے اخبار و اسفار سے ایک بار نہیں کئی بار ثابت کر آئے ہیں۔

توراۃ کا یہ بیان اور سید صاحب کا اُسپر حیرت انگیز اعتبار و اقرار کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بی بی ہاجرہ اور اپنے نوجوان بیٹے اسمٰعیلؑ کو محض یکہ و تنہا گھر سے نکالدیا۔ قولاً اور فعلاً۔ خلاف عقل۔ خلاف قیاس اور خلاف واقع معلوم ہوتا ہے۔ ایک معمولی درجہ والے آدمی سے ایسے بد اخلاقانہ افعال کا سرزد ہونا جب اُس کی حد درجہ کی شکایت وملامت کا باعث ٹہرایا جاتا ہے۔ تو ایک ایسے برگزیدہ بزرگوار سے جو من جانب اللہ صاحب شریعت ہو۔ اور بندگان خدا کو تہذیب و اخلاق۔ تمدن و معاشرت کی تربیت وتعلیم کے لیے مبعوث کیا گیا ہو۔ ایسے افعال ذمیمہ اور اطوار قبیحہ کا عمل میں لایا جانا ہرگز صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ کیا جناب ابراہیمؑ کی عدالت۔ آپ کی شریعت۔ آپ کا اخلاق۔ آپ کی مروت اور عام انسانی ہمدردی جو عموماً ہر فرد بشر کی طبیعت میں قدرت کی طرف سے ودیعت فرمائی گئی ہے۔ اسی کی مقتضی تھی۔ کہ اپنے واجب النفقہ اہل وعیال کو بلا وجہ۔ بے سبب۔ صرف ایک دوسری بی بی کے کہنے سے۔ اس ذلت اور حقارت۔ اس بلا اور مصیبت کے ساتھ گھر سے باہر نکالدیا جاوے۔ پھر بی بی بھی وہ عفیفہ۔ جس کی اطاعت حسن خدمت اور رفاقت بیس برس کے زمانہ دراز تک ہر قسم کا آرام ہر طرح کی راحت پہونچا چکی ہو۔ اور سفر وحضر کے تمام مصائب و نوائب میں شریک و رفیق رہ چکی ہو۔ فرزند بھی وہ فرزند صالح۔ جس کی عظمت اور بزرگی توریت مقدس کی بشارت سے ایک جگہ نہیں۔ کئی جگہ ثابت ہو چکی ہو۔ خود جناب ابراہیمؑ کو وہ فرزند صالح ایک عظیم اُمت کا مورث۔ اور حضرت ہاجرہ کو بارہ خلفائے ارض کا باپ اور جد اعلیٰ بتلایا گیا ہو۔ کیا کوئی محض محدود اور ادنیٰ عقل رکھنے والا شخص بھی ایک ساعت کے لیے اُسکو مان سکتا ہے۔ کہ یہ دونوں بزرگوار (حضرت ہاجرہ اور جناب اسمٰعیل) حقیقتاً دُنیا میں ایسے لاوجود۔ بے کار اور محض بے سود ہستیاں سمجھ کر گھر سے نکال باہر کر دیئے گئے۔ سید صاحب کے اس بیجا اقرار و اعتراف پر جو اسلامی اخبار و آثار کے بالکل خلاف ہے۔ وقت تحریر سے لے کر آج تک برابر تعریض و تنقید ہوتی چلی آئی ہے۔ صاحب ارض القرآن نے بھی (اگرچہ یہ بحث اُن کے موضوع تالیف سے بالکل علیحدہ تھی۔) جناب ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کے ضمنی تذکرے میں اپنی غیرت اسلامی اور حمایت دینی سے اُس کی تنقید و تردید فرمادی ہے۔ ذیل میں اُن کی عبارت ملاحظہ ہو۔

توراۃ میں یہ مذکور نہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ بھی ساتھ آئے تھے۔ لیکن کون شقی ہوگا۔ جو اپنے عزیز بچہ کو جس کی پیدائش کی اُس نے خود دُعا کی ہو۔ جس کی زندگی کے لیے اُس نے خدا سے دُعا مانگی ہو۔ اُسکو تنہا بے آب وگیاہ مقام میں ہمیشہ کے لیے جانے دے۔

صحیح بخاری میں جو روایات اسلام میں صحیح تر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ کہ ابراہیمؑ اور اُن کی بیوی (سارہ) کے درمیان جو

واقع ہوا۔ اُس کے بعد ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ۔ اور اسماعیلؑ کی ماں کو لے کر نکلے۔ ساتھ پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ اُمّ اسمٰعیل پانی مشکیزہ سے پی لیتیں۔ اور اُس سے دودھ بچہ کے لیئے ہوتا تھا۔[ف] یہاں تک کہ ابراہیمؑ مکہ پہونچے۔ اور ایک جھاڑی کے نیچے اُسکو رکھ دیا۔ پھر ابراہیمؑ اپنے گھر واپس آنے لگے۔ اُمّ اسمٰعیلؑ اُن کے پیچھے پیچھے کداء (مکہ کا ایک مقام) تک آئیں۔ اُمّ اسماعیلؑ نے پکار کر کہا۔ ابراہیمؑ تم مجھے اس وادی میں جہاں نہ کوئی آدمی ہے اور نہ کوئی چیز ہے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟ (اختلاف روایت) کیا تم خدا کے حکم سے مجھے یہاں چھوڑتے ہو۔ ابراہیمؑ نے کہا ہاں۔ اُمّ اسمٰعیلؑ نے کہا۔ تو پھر خدا ہم کو ضائع نہ کرے گا

ارض القرآن ج ۱ ص ۵۱۔

ہم نہیں سمجھتے۔ کہ عربی تفسیر حدیث اور تاریخ کی کتابیں اور اُن کی مقامی اور آبائی روایتیں۔ جو عہد ابراہیمی اور دور اسماعیلی سے اہل عرب میں سلسلہ بسلسلہ اور سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ اور جن کے لیئے وہ تمام قوموں میں خاص کر ممتاز سمجھے گئے ہیں۔ اور خود سید صاحب مرحوم جن کی حقیقت اور صداقت پر اپنے خطبات کے اکثر مقامات پر صاد فرما چکے ہیں۔ صرف توراۃ کے مخالف ہونے کی تنہا جرم میں کیسے ساقط الاعتبار سمجھی جائیں گی اور پھر اس شدت کے ساتھ کہ اُس کی رُو سے اگرچہ مقدس رسولؐ کی تقدیس و تنزیہ مکارم و مسالک میں تعریض و تنقیص صریح لازم بھی آتی ہو۔ مگر تاہم اُنھیں کی صحت کو ترجیح دی جائے گی۔ حالانکہ واقعہ۔ واقعہ کی صورت اور واقعہ کی عبارت صاف صاف تبلا رہی ہے۔ کہ ایسی سنگدلی۔ بیدردی۔ اور شقاوت نہ کبھی اخلاق الٰہی کی شان کہی جا سکتی ہے۔ اور نہ محاسن خلیل اللٰہی کے شایان ہو سکتی ہے۔ اس لیئے نہ یہ الفاظ وحی و الہام کہے جا سکتے ہیں۔ اور نہ کسی رسول اور خاصۂ خدا کے کلام سمجھے جا سکتے ہیں۔ بلکہ تمام اسباب و قرائن صاف صاف تبلا رہے ہیں۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی ماں کی حقارت اور ذلت ثابت کرنے کے لیئے۔ ابراہیمؑ کے ساتھ جانے یا پہونچانے والی عبارت اور اُس کے تمام مضامین جیسا کہ اسلامی اور عربی اخبار و آثار میں اسوقت تک محفوظ و مرقوم ہیں۔ نفسانیت کے بندوں نے خدا کی اس کتاب سے نکالدیئے۔

اب رہا توراۃ کا فی نفسہا صحیح الاسناد ہونا۔ اسکا یہودی اور عیسائی تو دعوٰے کرہی نہیں سکتے قصیر الاطلاع مسلمان کہاں تک اسکو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی مسئلہ میں ایک مثال اطمینان کے لیئے کافی ہے توراۃ کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسمٰعیلؑ اسوقت بچے تھے۔ اور دودھ پیتے تھے۔ اور اُسی توراۃ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ولادت اسحاقؑ کے وقت ان کا دودھ چھوٹ چکا تھا۔ باپ ختنہ بھی کر چکا تھا۔ اور توراۃ میں ختنہ کیئے جانیکے وقت اسمٰعیلؑ کا سن تیرہ برس کا قطعی طور پر تبلایا گیا ہے۔ اور یہ تمام واقعات اخراج

[ف] یہ مرویات یہود کے نقل کا نتیجہ ہے۔ اس کی اکثر مثالیں اسلامی کتب تاریخ و حدیث میں ملتی ہیں۔ المؤلف

ہاجرہ اور ولادت اسحاقؑ کے قبل کے ہیں۔ ولادت اسحاقؑ کے تین برس بعد واقعہ اخراج ہاجرہ پیش آنا لکھا گیا ہے۔ تو اس بنا پر اسمٰعیل کا سن ترک وطن کے وقت سولہ اور سترہ برس کے درمیان میں ثابت ہوتا ہے۔ اسی سے توراۃ کے اختلاف بیانات کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوجاتا ہے۔ کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی مسئلہ کی نسبت اُس میں دو متضاد و مختلف مضامین پے در پے مندرج ہیں۔ ایک سے صاحب واقعہ کی شیر خوارگی۔ اور عالم گہوارگی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسرے سے اُس کے نوجوان اور صاحب ریش و ثروت ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے۔ بندوں کی کتاب جب ایسے مخالف اور مناقض کے باعث قابل اعتبار نہیں سمجھی جاتی۔ تو پھر خدا کی کتاب ایسے اختلاف و تضاد کو پہلو میں لے کر کیسے صحیح الاسناد اور واجب الاعتقاد تسلیم کی جائے گی۔

ایسے بیّن ثبوت اور صحیح مثالوں کے علاوہ۔ حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کی ذلت و حقارت کے متعلق جیسے جیسے نازیبا اور بے جا الفاظ عبارات توراۃ میں مستعمل اور مرقوم ہیں۔ وہ علی الاعلان بتلا رہے ہیں کہ یہ اُس سچے عادل اور غیر متبدل خدائے برحق کے الفاظ و کلمات ہرگز نہیں ہوسکتے۔ جو اس بی بی کے اوپر اپنا فرشتہ بھیج نازل فرما کر اُس کی تسکین و تشفی۔ اُس کے بچے کی نوید ولادت۔ اُس کے مورث اُمت عظیم ہونے کی بشارت اُس کے اور اُس کے بچہ کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا وعدہ فرما چکا ہو۔ اور جو مرقومہ بالا عبارات بشارت میں متواتر طور پر اس بی بی اور اُس کے لڑکے کی عظمت و تقدیس کا مُقر ہوچکا ہو۔ تو اس بنا پر ہمکو پورا یقین ہے۔ اور تنہا یقین ہی نہیں۔ ہمارا مسلّم اعتقاد ہے۔ کہ توراۃ کے یہ تمام الفاظ مخالف اور مضامین مناقض جنسے اخلاق خلیل الٰہی کی کثیر عصمت و منزلت ہاجرہؑ کی توہین۔ اور عظمت و اقتدار اسماعیلی کی تنقیص ظاہر ہوتی ہے ہرگز ملفوظات ربانی نہیں ہیں۔ بلکہ بالکل موضوعات انسانی۔ جب توراۃ میں اتنے اختلاف و تضاد کے سواد کا ذخیرہ موجود ہو۔ اور جس کی خود یہودی اور عیسائی اعتراف للواقع صحیح مانتے ہو۔ تو پھر ان موضوعات و مصنوعات پر ایک مسلمان محقق کا اعتبار کر لینا اور اُس کو اپنا مختار قرار دے لینا کس قدر شرمناک اور حیرت خیز ہے

ہمکو حضرت اسمٰعیلؑ کے سن مبارک کی نسبت علیحدہ بحث کرنی مقصود ہے۔ اس لیے کہ مرویات اسلامی اور خصوصاً بخاری شریف میں شیر خوارگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ جسپر حفظ ما تقدم کے خیال سے ہم اوپر نوٹ (نظریہ) دے آئے ہیں۔ ہم مسئلہ زیر بحث کو تمام کرکے اپنے آئندہ سلسلہ بیان میں اس مسئلہ کو بار دیگر بہت جلد صاف کرتے ہیں۔

دشت فاران سے ارض حجاز اور حوالی مکہ مراد ہے

اب ہم کو دوسرے امر۔ کی طرف رجوع علی التحقیق کرنا ہے اور وہ دشت فاران کی اصلیت۔ حقیقت

اور اس سے موقع و مقام کا انکشاف ہے۔

اہل عرب کے تمام مرویات قدیم اور اسلام کے تمام تالیفات و تصنیفات میں اس مسئلہ کے متعلق بالاتفاق بالجمہور مرقوم و مذکور ہے۔ کہ جناب ابراہیمؑ علی نبینا و آلہ وعلیہ السلام اپنی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ اور اپنے فرزند ارجمند جناب اسمٰعیلؑ کو۔ حکم الہٰی کے مطابق۔ مکہ معظمہ سے ملے ہوئے اُس بیابان میں۔ جو دشت فاران کے نام سے آجتک تمام کتب قدیم میں مرقوم ہے۔ پہونچا گئے۔

قرآن مجید میں نہ فاران ہے۔ نہ پاران۔ اُس میں مقام سکونت کی نسبت صرف بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (اپنے خانہ محترمہ کے پاس۔ ناقابل زراعت صحرا میں) لکھاہے۔ جس کی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جناب ابراہیمؑ نے ان لوگوں کو اُس ناقابل زراعت صحرا میں پہونچا دیا تھا جو مکہ سے ملا ہوا تھا۔ اس لیئے تاوقتیکہ یہ ناقابل زراعت صحرا حقیقت میں دشت فاران نہ ثابت کرلیا جائے۔ قرآن مجید کی عبارت توراۃ کی بشارت سے مطابق نہیں ہوتی۔ (سفر تکوین باب ۲۱۔ آیت ۲۱)

سفر تکوین باب ۲۱ درس ۶ میں فاران کی جگہ ایل فاران لکھا ہے۔ اُن دونوں سے لیکن ایک ہی مقام مراد ہے۔ اور جغرافیہ قدیم وحال کے مطابق اس سے وہی کوہستانی سلسلہ مراد ہے۔ جو صفا۔ مروہ۔ ابوقبیس وغیرہ مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ اور مکہ کے اردگرد واقع ہیں۔ توریت کے باب ۲۱ آیت ۶ میں۔ فاران کے پہلے لفظ ایل آیا ہے۔ جس کے معنی عبرانی زبان میں خدا کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ظہور قدرت کا کوئی واقعہ اس سے متعلق ہے۔ یا متعلق ہونے والا ہے۔ اسوجہ سے یہ پہاڑ خدائی پہاڑ کے نام سے خاص طور پر موسوم ہوئے۔ اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس عبرانی لفظ ایل کا عربی تالیفات میں بھی کہیں نشان ملتا ہے۔ یا نہیں۔ جب ہم اس کی نسبت تحقیق کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ مکہ معظمہ کے گردونواح میں جتنے پہاڑ ہیں وہ آج تک آلال مشہور ہیں۔ اور آلال صاف صاف لفظ ایل کی جمع ہے۔ جو اہل عرب نے اپنی زبان کے قاعدہ کے مطابق بنالی ہے۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث بالکل صاف ہوگیا۔ کہ ایل فاران مصرحہ توراۃ حقیقتاً اُسی کوہستانی سلسلہ کا نام ہے۔ جو مکہ کے آس پاس واقع ہیں۔ اور جن میں صفا۔ مروہ۔ ابوقبیس۔ ثور۔ حرا وغیرہ قدیم شعائر اللہ۔ داخل ہیں۔ اور جن میں سے ہرایک کسی نہ کسی برگزندہ بارگاہ الٰہی کے حالات و واقعات سے خاص طور پر تعلق رکھتا ہے۔

برا ہو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعصب اور نفسانیت کا۔ جو ایسے واضح اور روشن ثبوتوں کے مقابلہ اور موجودگی میں بھی محض اسلام کی مخالفت کی بناپر۔ وادی فاران اور وادی مکہ کی مطابقت میں خواہ مخواہ غلط تاویلیں کرتے ہیں۔ اور سراپا باطل اور بے اصل دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اس لیئے ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اُن کی

ان متعصبانہ اور گمراہانہ قیاسات اور غلط تاویلات کی تردید و تنقید بھی اُنھیں کے معتبر اسناد و استشہاد سے پیش کرکے اُنکا اور ساری دُنیا کا اطمینان کر دیں

اس میں شک نہیں۔ کہ دشت فاراؔن کو حجاز اور قریب مکّہ نہ ثابت ہونے دینے کی ابتدائی کوششیں یہودیوں کے حسد و تعصب کا ضمیمہ ہیں۔ لیکن اُنہوں نے اُس کے موقع کو کوہ سینا اور فلسطین تک محدود کر رکھا ہے۔ عیسائی ان سے بھی تیز اور شرارت انگیز نکلے۔ اُنہوں نے سرزمین حجاز اور حوالی مکّہ میں دشت فاراؔن کے واقع نہ ہونے کے متعلق اپنی مسلسل کوششوں سے آسمان و زمین کے قلابے ایک کر دیئے ہیں اور اسقدر دور از قیاس۔ گمراہانہ اور خودغرضانہ تاویلوں سے۔ اس کے اصلی موقع قائم کرنے میں۔ کثرت اقوال اور تعدد آراء کے انبار لگادیئے ہیں۔ جن سے دشت فاراؔن۔ جغرافیہ عالم میں۔ عنقائے مغرب بن گیا ہے۔ کہیں صحیح نشان ہی نہیں ملتا۔ مگر ہم ان تمام مراحل و منازل کو مفصلہ ذیل بحث میں طے کردیتے ہیں

سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے۔ کہ عبرانی لفظ مدبر۔ عربی لفظ وادی۔ اور قرآنی لفظ غیر ذی زرع متحد المعنی اور مساوی المفہوم ہیں۔ یہاں تک یہودی۔ عیسائی اور مسلم سب متفق ہیں۔ اور ان تینوں مختلف الفاظ سے ایک ہی معنی مراد لیتے ہیں۔ مگر خاص کر یہودیوں اور عیسائیوں کو جو کلام ہے۔ وہ یہ کہ اس وادی غیر مثمرہ کا اصلی موقع قریب مکّہ نہیں ہے۔ بلکہ جبل سینا اور اُس کے قرب و جوار سے کہ ارض بابل اور فلسطین تک۔ جو جناب ابراہیمؑ اور اُن کی قوم و قبیلہ کا قدیم اور اصلی موطن و مسکن ثابت ہوتا ہے۔ دشت فاراؔن میں شامل ہے۔ اُن کے اس اعتراض کی بنا پر تین اُمور کی مفصلہ ذیل تنقیح و تحقیق نہایت نہایت ضروری ہے۔

اوّل۔ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو کہاں چھوڑا۔

دوم یہ کہ حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ نے۔ اُس صحرائے غیر آباد کے کس مخصوص مقام پر سکونت اختیار کی۔

سوم یہ حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ نے۔ جہاں پہلے ٹھہرے تھے۔ وہیں سکونت اختیار کی۔ یا وہاں سے اُٹھ کر کسی اور جگہ آباد ہوگئے۔

تنقیح اوّل کے متعلق ہم اسلام سے قبل یا بعد عرب کی مشہور و معروف روایتوں کو جو اس امر کو ثابت کرتی ہیں اس باعث سے عمداً مرفوع القلم کرتے ہیں۔ کہ مخالف قوم و مذہب کے مقابل ایک متنازع فیہ مسئلہ میں اپنے بیان سے اپنے دعوے کی تصدیق اتنی قابل اعتبار نہیں ہوسکتی جتنی طرف مقابل کی تردید اُسی کے اقوال و تحریر سے۔ چونکہ اس مسئلہ خاص میں یہودیوں اور عیسائیوں نے ابتداہی سے محض اسلام کی بخالفت اور حضرت اسماعیلؑ کی کسر شان و منزلت کی بنا پر یہ بیجا تاویلیں پیدا کردی ہیں۔ اس لیے اُنھیں کی

کتابوں سے صحرائے فاران کا حقیقت میں مکہ کے آس پاس واقع ہونا ثابت کرنا چاہیئے۔ توریت میں ہے۔

اسمٰعیل بڑا ہوا۔ اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا۔ (سفر تکوین باب ۲۱۔ آیت ۲۵) پھر دوسری جگہ تحریر ہے۔ کہ اس نے یعنی اسمٰعیلؑ نے دشت فاران میں سکونت اختیار کی (سفر تکوین باب ۲۱۔ آیت ۲۱)

اب یہ تحقیق طلب ہے۔ کہ بیابان فاراں۔ جہاں جناب اسمٰعیلؑ سکونت پذیر ہوئے۔ کونسا مقام ہے۔ مشرقی جغرافیہ والوں نے تین مقامات کو بنام فاراں تحریر کیا ہے۔ اول وہ مقام اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ مقام صحرائے بے گیاہ تھا۔ دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو شرقی حصہ مصر یا عرب البحر میں واقع ہے۔ سوم ایک ضلع ہے۔ جو سمرقند کے نواح میں واقع ہے۔ شرقی جغرافیہ نویسوں کی تحقیق حسب ذیل ہے۔

فاران المذکور فی التوراۃ فی قوله جاء الله من سیناء و اشرف من ساعیر و استعلن من فاران فساعیر جبال فلسطین و هو انزاله الانجیل علی عیسی و فاران مکۃ و جبالها علی ما تشهد به التوراۃ و استعلانه منها انزاله القرآن علی رسوله محمد صلعم و فاران قریۃ من نواحی اسغد من عمال سمرقند و قیل فاران و الطور کورتان من کور مصر قبلیۃ (مراصد الاطلاع علی الاسماء الامکنۃ و البقاع و معجم البلدان یاقوت حموی)

فاران جیسا کہ توراۃ کی اس آیت میں آیا ہے۔ کہ خدا سینا سے آیا۔ اور ساعیر پر مشرف ہوا۔ اور فاران سے طلبند ہوا۔ ساعیر فلسطین کے پہاڑ ہیں اور وہ مقام ہیں۔ جہاں حضرت عیسیٰؑ پر نزول انجیل ہوا۔ اور فاران۔ مکہ اور اس سے ملے ہوئے پہاڑوں کا نام ہے۔ جس پر توریت کی شہادتیں موجود ہیں۔ اور اس کے طلبند کیے جانے سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول قرآن مراد ہے۔ اور فاران ایک قریہ کا نام ہے جو سمرقند کے علاقہ سغد میں واقع ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے۔ کہ فاران مصر مغربی کے دو شہر فاران و طور کے نام سے معروف ہیں (مراصد الاطلاع علی الاسماء الامکنۃ و البقاع و معجم البلدان یاقوت حموی۔

پھر یاقوت حموی اپنی دوسری کتاب مشترک میں لکھتا ہے

فاران ثلثۃ موضع۔ فاران اسم جبال مکۃ و قیل لها اسم جبال الحجاز و لها ذکر فی التوراۃ مجی فی الاعلام نبوۃ النبی صلعم قال الامیر ابونصر ابن ماکولا ابی بکر نصر ابن القاسم ابن القضاعۃ القضاعی الغفاری الاسکندری سمعت ان ذلک نسبتہ الی جبال فاران و هی الحجاز و فاران

فاران تین مقامات کے نام ہیں۔ مکہ کے پہاڑوں کا (فاران) نام ہے اور بعض کہتے ہیں۔ علاقہ حجاز کے تمام پہاڑوں کا نام فاران ہے ان کا ذکر توریت میں موجود ہے۔ اور ان سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اعلان ہوتا ہے۔ امیر ابو نصر ابن ماکولا کا بیان ہے۔ کہ ابو بکر نصر ابن القاسم ابن القضاعۃ القضاعی الغفاری الاسکندری کی نسبت انہی جبال فاران سے کرتے ہیں جو حجاز میں ہے

قال ابو عبد اللہ القضاعی فی کتاب خطط مصر فاران والطور کورتان من کور مصر القبلیۃ و فاران من قرای سمرقند (کتاب المشترک)	اور ابو عبد اللہ القضاعی اپنی کتاب خطط مصر میں لکھتے ہیں۔ کہ فاران اور طور مصر مغربی کے دو مشہور شہر ہیں۔ اور فاران سمرقند کے ایک قریہ کا بھی نام ہے (کتاب المشترک)

ہم نے عربی جغرافیہ نویسوں کے اقوال صرف اس غرض سے یہاں لکھدیئے ہیں۔ کہ محققین کو معلوم ہو جائے۔ کہ اسلامی مورخین ومولفین نے بمقابلہ یہودی اور عیسائی مصنفین کے پوری صفائی اور خوش نیتی سے۔ جبال مکہ وحجاز کے علاوہ اُن تمام مقامات کو بھی لکھدیا ہے۔ اور بتلا دیا ہے۔ جو فاران کے نام سے مشہور رہیں۔ اگر اُن کی تحقیق اور تحریریں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح خودغرضی اور تعصب پر مبنی ہوتی۔ تو وہ فاران کی تصدیق وتطبیق میں۔ صرف جبال مکہ وحجاز کو بتلاتے۔ اور دوسرے مقامات کی تصریح وتفصیل سے سکوت اختیار کرتے۔ مگر نفسانیت اور خودغرضی سے بالکل علیحدہ ہوکر اُنہوں نے اپنی تالیفات میں تمام مقامات کا ذکر کردیا۔ کیونکہ اُن کے ذکر کردینے سے اُن کے مدعا میں کسی طرح کا خلل نہیں ہوتا تھا۔ اسلیئے۔ کہ فاران کے اُسی ایک مقام اور اُسی ایک خاص نام میں خدائے سبحانہٗ تعالےٰ کی عظمت وتقدیس ودیعت ہے۔ جس کی نسبت توراۃ میں بشارت آئی ہے۔ اور اس تقدیس وبرکت کا اصلی مرکز وہی مقام اور وہی نام قرار پائیگا۔ جہاں سے نور ہدایت جلوہ آرائے عالم ہوا۔

چونکہ تمام شہود وثبوت اسیر جمع ہوچکے ہیں۔ کہ اس موعودہ ظہور قدرت کی جلوہ گاہ جبال مکہ اور حجاز ہیں نہ دیگر مقامات۔ اس لیئے یہودیوں کی کوشش ہے۔ اور عیسائیوں کو کاوش ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح اصلی مقام کی حقیقت چھپادی جائے۔ مگر انھیں کے اعتراف واقرار متواتر ومتکاثر کے مقابلہ میں اُن کی یہ عالم فریبی کارگر نہ ہوئی ہے۔ اور نہ ہوسکتی ہے۔ اُن کی ان گمراہانہ مغالطہ دہی سے ہمارے دعووں میں کسی طرح نقصان نہیں پہونچ سکتا ہے۔ وہ اقطاع عالم میں ایک نہیں ہزار مقام فاران کے نام سے بتلایا کریں تو اس سے کیا۔ اصلی فاران کی عظمت وتقدیس میں اس سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ فاران پر منحصر نہیں طور کے ایک نام سے دُنیا میں سات مختلف مقامات مشہور ہیں۔ یاقوت حموی مشترک میں لکھتے ہیں۔

الطور سابعۃ مواضع والطور ایضا علم بجبل بعینہ عند کورۃ تشتمل علی عدۃ قری بارض مصر من جہۃ القبلیہ بینہما وبین جبل فاران (مشترک)	طور سات مقامات کو کہتے ہیں۔ یعنی طور کے نام کا اطلاق۔ اُن پہاڑوں جنگلوں اور شہروں پر ہوتا ہے۔ اور وہ شہر اُن تمام چھوٹے چھوٹے قصبوں پر بھی حاوی ہیں۔ جو مغربی مصر پر واقع ہیں اور جو اُن کے اور جبل فاران کے درمیان حد فاصل ہیں (مشترک)

اب ان سات مختلف مقامات کی تفصیل۔ علامہ شریف الادریسی۔ کی کتاب نزہتہ المشتاق کی عبارت سے

ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) طریق اخر علی ساحل البحر القلزم (۲) من مصر الی عین شمس (۳) ثم الی بطن مغیرۃ (۴) ثم الی حزن فاران (۵) و بالقرب فاران موضع صعب اذا سلکت والریح ایضا مغربا والدیو شرقا (۶ و ۷) ویسمی جیلان من جیلان الی جبل الطور الی ایلۃ

(۱) وہ وادی یا راستہ جو بحر قلزم کے کنارے کنارے جاتا ہے (۲) جو مصر سے عین شمس کو جاتا ہے۔ (۳) جو بطن مغیرہ کو جاتا ہے (۴) جو بیابان فاران کو جاتا ہے (۵) جو فاران کے اس سنگلاخ مقامات سے قریب ہے۔ جس کے مغرب میں زیخ اور مشرق میں دلور واقع ہے۔ (۶) و (۷) ان دو پہاڑوں کے نام ہیں۔ جو جبل الطور کے سلسلہ میں ایلہ طرف واقع ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے۔ سات مقامات طور کے تنہا نام سے مشہور ہونا ثابت ہوگیا۔ مگر اصلی طور وہی طور ہے جہاں سے انوار قدرت کا ظہور ہوا۔ اور وہی ایک آجتک مشہور ہے۔ اور اس کے آگے دوسرے مقامات کی شہرت کوئی عظمت اور وقعت نہیں رکھتی۔ بالکل ایسی ہی فاران کی بھی حقیقت سمجھ لینی چاہیئے۔

اب ہم یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال و اسناد سے۔ بیابان فاران کا صحرائے مکہ اور علاقہ حجاز ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اسلام کی مخالفت ہو۔ یا بنو اسحاقؑ کے مقابلہ میں بنی اسماعیلؑ کی اظہارت ذلت کی ضرورت ہو۔ انہیں دو مفسدانہ اور خودغرضانہ ضرورتوں کی وجہ سے۔ یہودیوں سے زیادہ عیسائیوں نے فاران کے اصلی موقع اور موضع کی تحقیق و تعین میں جو عالم فریب اور گمراہ کُن اقوال لکھتے ہیں اور ان کے ثبوت و تصدیق میں جو وہمی اور قیاسی دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ عموماً تین جداگانہ صورتوں میں پائے جاتے ہیں

اوّل صورت یہ ہے۔ کہ عیسائی مورخین و محققین صحرائے فاران اس قطعہ زمین کو ٹھہراتے ہیں۔ جو بیرسبع کی شمالی حد سے لیکر کوہ سینا تک چلا گیا ہے۔ ان کے حدود یوں قائم کرتے ہیں۔ شمال میں کنعان جنوب میں کوہ سینا مغرب میں مصر۔ اور مشرق میں کوہ سعیر۔

اس کے متعلق جدید تحقیق اور مزید اطلاع یہ ہے۔ کہ اس قطعہ زمین میں صحرائے اشور۔ دشت بیرسبع۔ بادیہ ایتام۔ بیابان سین۔ ارض زین اور ریگستان عیدام (گویا سارے جہان) کو بھی داخل کرتے ہیں۔ ان تمام اظہار سے مطلب صرف اتنا ہے۔ کہ کسی طرح فاران جزیرہ نمائے عرب کے اس حصہ کی طرف نہ جانے پائے۔ جو حجاز بطحا۔ اور مکہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ جہاں سے شیوع اسلام اور ظہور بانئ اسلام علیہ السلام کی بشارتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قادش۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں موسوم بہ بیرسبع کھودا تھا۔ وہ اور فاران ایک ہی مقام ہے۔

تیسری صورت یہ نکالی گئی ہے۔ اور فاران اُس مقام کا نام رکھا گیا ہے۔ جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ کیطرف واقع ہے۔ یہی تین صورتیں جنکی آڑ میں فاران کی اصلی حقیقت کو یہودیوں سے زیادہ عیسائیوں نے چھپانا چاہا ہے اوّل صورت کے مٹانے کی نسبت۔ جس میں موضع فاران کا غلط نقشہ یوں دکھلایا گیا ہے۔ کہ اس میں دشت اشور اور سینا وغیرہ وغیرہ کو داخل کر دیا گیا ہے۔ توراۃ ہی کی چند آیتیں ذیل میں لکھدی جاتی ہیں۔ جن سے ان غلط بیانیوں کی ساری قلعی اُڑ جاتی ہے۔ توراۃ۔ سفر الاعداد باب ۱۰ آیت ۱۲ میں مرقوم ہے

(۱) بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا۔ اور بیابان فاران میں قیام کیا۔ اس عبارت توراۃ سے تو بیابان سینا اور بیابان فاران دو جُدا جُدا بیابان ثابت ہوتے ہیں۔ پھر بیابان سینا میں بیابان فاران کا داخل کرنا کرنا یا بیابان فاران میں بیابان سینا کا شامل ہونا کیسے تسلیم کیا جائے گا۔ یا بیابان سینا اور فاران کیسے ایک تے سمجھا جائے گا۔

توریت کی دوسری آیت۔ سفر تکوین باب ۱۴۔ آیت ۵ و ۶ میں مرقوم ہے۔

(۲) کدرلاعمر گیا۔ اور وہ بادشاہ جو اس کے ساتھ آئے تھے (اونکو) اور رفائیوں کو عستارات قرنیم میں۔ اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیوں کو سوے قریتیم میں۔ اور حوریوں کو اُن کے کوہ شعیر میں۔ ایل فاران تک جو بیابان کے کنارے پر ہے مارا اور وہ پھر کر (واپس آکر) عین مصفات یعنی قادس میں آئے۔

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب تک بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جاوے گا۔

اس آیت کے معنی بالکل مہمل رہ جائیں گے۔ اسی عبارت سے یہ بھی صاف ہو گیا۔ کہ قادس اور فاران ایک مقام نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس آیت کا یہ فقرہ کہ دشمنوں کو ایل فاران تک مارا۔ اور وہیں ہو کر قادس میں آئے۔ صاف ثابت کر رہا ہے۔ فاران جدا مقام ہے۔ اور قادس علیحدہ۔ پھر اس کے ایک مقام ہونے کا دعوےٰ بالکل لغو اور مہمل ہے۔ اس عبارت توراۃ سے عیسائیوں کی دوسری صورت بھی بگڑ گئی۔

توراۃ کی تیسری آیت۔ سفر اعداد باب ۱۳۔ آیت ۱-۲-۳ میں ہے۔

(۳) پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے کہا۔ کہ تو لوگوں کو بھیج تا کہ کنعان زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔ جاسوسی کریں۔ ایک ایک مرد اُن کے آبائی فرقہ میں سے۔ جو اُس میں سردار ہے۔ بھیجدے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران سے اُن کو بھیجا۔

اس آیت سے بھی وہی مطلب نکلتا ہے۔ اور تاوقتیکہ دشت فاران ایک مقام جداگانہ نہ تسلیم کر لیا جائے

اِس آیت کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔

توراۃ کی چوتھی آیت۔ سفر اعداد باب ۱۳۔ آیت ۲۶ میں درج ہے۔

(۴) اور پھر کے موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران سے قادش میں آئے۔ اور انہیں اور ساری جماعت کو آکے خبر دی۔ اور اُس سرزمین کا میوہ انہیں دکھایا۔

اِس آیت سے بھی فاران اور قادش دو علیحدہ مقامات ثابت ہوئے۔

توراۃ کی پانچویں آیت۔ سفر استثنا باب ۳۳ آیت ۲ میں مرقوم ہے۔

(۵) اور یہ وہ برکت ہے۔ جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی۔ اور اُس نے کہا۔ کہ خداوند سینا سے آیا۔ اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ ہزار ہزار فرشتوں کے ساتھ وہ وارد ہوا۔ اور اُس کے دست راست پر ایک آتشیں شریعت تھی

اِس سے بھی سینا۔ سعیر اور فاران تینوں علیحدہ علیحدہ مقامات ثابت ہوئے۔

توراۃ کی چھٹی آیت۔ کتاب حیقوق نبی باب ۳۔ آیت ۲ میں ہے۔

(۶) خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے۔ کوہ فاران سے آیا۔ اُس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا۔ اُس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی۔

اِس آیت سے بھی فاران ایک علیحدہ اور خاص مقام ثابت ہوا۔

توراۃ کی ساتویں آیت کتاب اوّل ملوک باب ۱۱۔ آیت ۱۸ میں مذکور ہے۔

(۷) پھر وہ مدیان سے نکل کے فاران میں آئے۔ اور فاران سے لوگ ساتھ لیکے شاہ مصر۔ فرعون کے پاس گئے۔

اِس سے بھی فاران ایک علیحدہ مقام ثابت ہوا۔ اور خاص کر وہ مقام جہاں سے مصر جانیکا راستہ ملتا ہے اور یہ سوائے حجاز کے اور عرب کے کسی قطعہ زمین کو خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ جو مصر کے عین محاذ میں واقع ہے۔

توراۃ کی مرقومہ بالا آیتیں صاف صاف بتلا رہی ہیں۔ کہ بیابان فاران ایک علیحدہ قطعہ زمین کا نام ہے جسکا شمول کسی دوسرے قطعہ زمین سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر اس میں نفسانیت و خود غرضی کے علاوہ اصلیت اور حقیقت کا ذرا بھی اثر ہوتا۔ تو توراۃ کے مقدس ابواب و آیات میں فاران کی تفریق و تخصیص کے بجائے اِس کی تعمیم کا ضرور ذکر ہوتا۔ نہیں معلوم کہ یہودی اور عیسائی اپنے ان تاویلات کی بنا میں کونسی سند پیش کرتے ہیں۔ اور اپنی کس کتاب کا اسکا اصلی ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس لیئے یہ امر قطعی طور پر ثابت کر دیا گیا کہ صحرائے فاران کی تفریق و تخصیص دوسرے مقامات کے ساتھ صرف اس غرض و مدعا سے خلط ملط

کر دی گئی ہے۔ کہ اصلی موقع اور رسالت محمدیہ کا حقیقی مطلع۔ اشتمال و اشتراک کی ناپاک خاک سے غبار آلود ہو جائے۔ اور بشارت ربانی کے انوار ہدایت دُنیا کی ظاہری آنکھوں سے پوشیدہ ہو جائیں۔

عیسائیوں کے اعتراض کی پہلی صورت تو یوں ظاہر ہوئی۔ کہ اُنکے اس قیاسی اور وہمی تحقیق کی تکذیب اُن کے عہد عتیق کے مندرجہ بالا متواتر عبارتوں نے پورے طور سے کر دی۔ اب دوسری صورت کے متعلق عرض کیا جاتا ہے۔ کہ قادش اور فاران ایک ہی مقام ہے۔ اس کی تردید اگرچہ مرقومہ بالا ایک آیت سے کر دی گئی ہے۔ مگر بار دیگر مزید اطمینان کے خیال سے۔ پھر توراۃ کی دوسری آیت سے سندرج کی جاتی ہے۔ سفر تکوین باب ۱۴۔ آیت ۶ و ۷ میں مرقوم ہے۔

حوریان کو بھی شکست دی۔ جو کوہ شعیر میں ایل فاران تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہاں سے لوٹ کر چشمہ مشپاط جو قادش ہے آئے۔

اِس عبارت نے ثابت کر دیا۔ کہ فاران اور قادیش ایک مقام نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صحیح طور پر مشپاط اور قادش ایک مقام ہیں۔

یہ صورت بھی بگڑ گئی۔ اب تیسری صورت کا یہ نقشہ ہے۔ اور اُس میں یہ رنگ بھرا گیا ہے۔ کہ فاران کوہ سینا کے اُس نشیب کا نام ہے۔ جو اُس کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس رنگ آمیزی میں ریورنڈ مسٹر فارسٹ REV.M R FORREST بہت ڈوبے ہوئے ہیں۔

خود غرضی ایک سخت بلا ہے۔ اور تعصب قہر خدا۔ ایسا فاضل محقق اور کامل مورّخ صرف مذہبی تائید و تقلید کی خود غرضی سے ایسی بے جا اور نا زیبا تاویلیں کرے۔ سخت تعجب اور حیرت کا مقام ہے۔ اسکے مان لینے میں کوئی کلام نہیں۔ کہ کوہ سینا کے مغربی نشیب میں ایک مقام ہے۔ جو فاران کے نام سے مشہور ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آیا یہ فاران وہی بیابان ہے۔ جہاں توراۃ مقدس کی بشارت کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ اپنی ماں کے ساتھ مقیم ہوئے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ وہ مقام نہیں ہے۔ تب تو تسلیم کر لینا ہوگا۔ کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے۔ جو توراۃ کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ کا دار الاقامت تھا۔

مسٹر فارسٹ کو خواہ مخواہ کا اصرار ہے۔ کہ یہی مقام فاران حضرت اسمٰعیلؑ کی فرودگاہ ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ توریت کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ جو سفر تکوین باب ۲۵۔ آیت ۱۸ میں مندرج ہے۔

وہ لوگ (ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ) (اے ابراہیمؑ) حویلاہ سے شور تک کہ مصر کے آمنے سامنے ہے۔ مقیم ہوئے۔ اور اسکا ملک اپنے بھائیوں کے مساکن کے پاس واقع ہوا۔

اوروہ فارسٹر صاحب اس کے یہ معنی لگاتے ہیں۔ کہ خدا کے وعدے کی ادائیگی آیت بشارت میں انتہا ہو گئی۔ جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں یعنی سرحد مصر سے لے کر دہانہ فرات تک پھیل گئی۔ فارسٹر صاحب کی ساری کوشش تو یہ ہے۔ کہ بنو اسمٰعیلؑ چاہے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ثابت ہو جائیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر علاقہ حجاز اور حوالی مکہ میں جو اصل فاران ہے۔ وہاں تک نہ پہونچنے پائیں۔ اور کسی طرح یہ امر نہ ثابت ہونے پائے۔ کہ بنو اسمٰعیلؑ کا اصلی موطن و مسکن بیابان فاران واقع حجاز تھا کیونکہ اس امر کے ثابت ہوتے ہی۔ جناب ختمی مرتبت علیہ وآلہ الثناء والتحیۃ کے ظہور رسالت کی مندرجہ بالا بشارت ثابت ہو جائے گی۔

مگر افسوس فارسٹر صاحب کی یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ فارسٹر صاحب سب کچھ کر لینگے۔ مگر عرب کے جغرافیہ کو اور اس کے نقشہ کو کیسے مٹا دیں گے۔ صاحب موصوف نے حویلاہ کو دہانہ فرات پر قرار دیا ہے۔ یہ صریح غلطی ہے۔ حویلاہ۔ جو اس شہر کا خاص بانی ہے۔ اور جسکا ذکر توراۃ۔ سفر تکوین باب ۱۰ آیت ۲۹ میں مذکور ہے۔ نواح یمن میں واقع ہے۔ اور اسکا موقع نقشہ عرب میں شمالی عرض بلد ۱۷ درجہ اور ۳۰ دقیقہ ہے۔ شرقی طول بلد ۴۲ درجہ ۲۶ دقیقہ ہے۔ اس کی تصدیق عرب کے اس نقشہ سے ہوتی ہے۔ جو عرب کے جغرافیہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اور واکر صاحب (Walker) کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے۔

اسکو بھی جانے دیجئے۔ فارسٹر صاحب نے جو دوسری غلطی کی ہے (غلطی کیوں کی بلکہ مغالطہ دہی کی ہے) وہ یہ ہے۔ کہ شور کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے۔ ایک نہ شد دو شد۔ اصل عبری توراۃ میں مختصر دو نام آئے ہیں۔ شور اور اشور (بزیادۃ الف) ان دونوں ناموں میں۔ شور سے شام اور اشور سے اسیریا۔ باتفاق جمہور مراد ہے۔

اب اس تصریح موقع مندرجہ توراۃ سے صاف طور پر واضح ہو گیا۔ کہ بنی اسماعیلؑ نے اسی وسیع قطعہ زمین پر سکونت اختیار کی۔ جو شمالی حدود یمن سے لیکر جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے۔ یہی جگہ اب حجاز کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اور یہی مقام فاران مبشرہ سے پوری اور صحیح مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہی خطہ زمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی طرف جاکر وہ معلوم کرے گا۔ کہ مصر کے سامنے جو قطعہ زمین ہے۔ وہی علاقہ حجاز ہے۔ اور اگر کرۂ عالم کے نقشہ سے مصر سے اسیریا تک ایک خط کھینچ دیا جاوے۔ تو وہ ٹھیک علاقہ حجاز کے سامنے پڑے گا۔

اب ہمارے اس بیان و ثبوت کو فارسٹر صاحب توراۃ کی مندرجہ ذیل عبارت ...

استدلال کے ثبوت میں پیش کر چکے ہیں۔ کہ تیرے جانے کے بعد وہ اشور میں۔ جو مصر کے مقابل میں ہے ساکن ہوئے ملالیں۔ تو ان کو قطعی طور پر ثابت ہو جائے گا۔ کہ اسوقت سے لے کر اسوقت تک مصر کے محاذ میں سوائے حجاز کے اور کوئی زمین کا دوسرا ٹکڑا نہیں پایا جاتا ہے۔ اور توراۃ میں بنو اسماعیلؑ کا بھی اصلی مرکز و مسکن بتلایا گیا ہے۔ اور عبادت تورات کے مطابق مصر کے برابر یعنی آمنے سامنے واقع ہے۔

فارسٹر صاحب خواہ مخواہ اسکو اصل موقع سے اٹھا کر دہانۂ فرات پر لیے جاتے ہیں۔ اور ساری دنیا کو ایک کھلی اور صاف بات کے سمجھنے میں اینچ پینچ کے مغالطے دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے غلط استدلال کے ثبوت میں ایک دوسرا حوالہ بھی دیا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ بھی انکے مفید مطلب نہیں۔ وہ کتاب اوّل تاریخ ایام باب ۵ آیت کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں۔

پورب کی طرف۔ اس بیابان کے مدخل تک کہ کنارہ نہر فرات پر ہے (بنو اسماعیلؑ) ساکن ہوئے۔ کیونکہ زمین گلعاد میں انکے گلوں کی فراوانی ہوئی تھی۔ اور شاول کے زمانہ میں ان لوگوں نے ہاجریوں پر دھاوا کیا۔ کہ وہ لوگ ان کے قبضہ میں آ گئے اور اس قرب و نواح کے چاروں طرف کی زمین میں۔ جو گلعاد سے متعلق ہے۔ وہ آباد ہو گئے۔

فارسٹر صاحب اسکی تفسیر میں بیان کرتے ہیں۔ یہ گلعاد جو نواح دریائے فرات اور خلیج فارس میں واقع ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی ابتدائی سکونت سے مطابق ہوتی ہے۔ ایک عرصہ کے بعد یہیں سے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد تمام اقطاع عرب میں پھیل گئی۔ مگر حقیقتاً توراۃ کی ان آیتوں سے بھی فارسٹر صاحب کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ کیونکہ اس عبارت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ بنو اسماعیلؑ یا بنو ہاجرہ نے خلیج فارس پر شکست کھائی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ شکست حضرت اسماعیلؑ کے آٹھ سو برس بعد ہوئی۔ تو ان آیتوں سے وہ بات۔ جیسا کہ فارسٹر صاحب نے دعویٰ کیا تھا۔ کہاں ثابت ہوئی۔ کہ یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں پہلے پہل خود اسمٰعیلؑ اور ان کی ماں تشریف لاکر سکونت پذیر ہوئی تھیں۔ واقعہ تو آٹھ سو برس قبل کا ہے۔ اور ثبوت دیا جاتا ہے آٹھ سو برس بعد کا۔ فارسٹر صاحب کا یہ طریقہ استدلال اعجوبہ روزگار ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد البتہ ہم کو بھی اقرار ہے۔ کہ بنو اسماعیلؑ دریائے فرات اور خلیج فارس پر کیا۔ تمام عرب میں دور دور تک پھیل گئے تھے۔ چنانچہ اسلامی اور عربی محققین اسپر متفق اور اسکے معترف ہیں۔ معارف ابن قتیبہ کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ولما كثر ولد اسمٰعيلؑ ضاقت عليهم مكة فانتشروا في البلاد ولا يدخلون بلدا الا اظهرهم الله على اهله وهم نفوا العماليق	جب حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد بہت کثرت سے ہو گئی۔ اور مکہ میں انکے رہنے کے لیے گنجائش باقی نہیں رہی۔ تو وہ مختلف شہروں میں جا کر بس گئے اور جس شہر میں وہ گئے۔ خداوند عالم نے ان کو وہاں کے باشندوں پر غلبہ

(معارف ابن قتیبہ)

عنایت فرمایا۔ اور انہوں نے قوم عمالیق کو نکالدیا۔ (معارف ابن قتیبہ)

علامہ ارزقی بھی۔ تاریخ مکہ میں ایسے ہی لکھتے ہیں۔

ان بنی اسمٰعیل من ساکنی مکۃ ضاقت مکۃ فتفسحوا البلاد والتمسوا المعاش

بنو اسماعیل۔ ساکنان مکہ۔ مکہ کی تنگی کی وجہ سے مجبور ہو کر مختلف شہروں میں بتلاش معاش نکلکر آباد ہو گئے۔

عرب کے تمام مورخین و محققین برابر تسلیم کرتے آئے ہیں۔ کہ بنو اسماعیلؑ استداد ایام کے بعد شہر مکہ میں اپنی رہائش کی گنجائش نہ پاکر تمام اقطاع عرب میں اپنی سکونت اور کسب معیشت کی ضرورت سے نکل نکلکر آباد ہو گئے۔ مگر فارسٹر صاحب کے ایسا کوئی مشرقی یا مغربی مورخ و محقق نہیں لکھتا کہ یہ خاص حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے اور اُن کی ماں۔ جنہوں نے ابتدا ہی سے حجاز اور حوالی مکہ کے علاوہ کسی دوسرے قطعہ زمین میں اپنی سکونت اختیار کی۔ مسٹر فارسٹر کا ایسا لکھنا۔ اور لکھکر بتلانا اُن کی اُسی خود غرضی۔ نفسانیت اور تعصب پر مبنی ہے۔ جسکو ہم مسئلہ زیر بحث کی ابتدا میں لکھ آئے ہیں۔

اتنا لکھکر ہم کو اس بحث کے متعلق ابھی کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے۔ اور وہ اضافہ یہ ہے۔ کہ فارسٹر صاحب کے اس غلط دعوے کی تردید انہیں کے ہم طریق اور ہم مذہب مؤلفین و محققین کے تحریر و اقوال سے کر دی جائے۔ اُن شہادتوں کے علاوہ۔ جو بیابان فاراں۔ حوالی مکہ اور علاقہ حجاز میں واقع ہونے کے ثبوت میں ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ ہم کو ارٹرلی ریویو ۱۸۶۹ء کا ایک ارٹکل An article (on quarterly Reviw of 1869) جو حقیقت اسلام پر لکھا گیا ہے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ جس سے مسئلہ زیر بحث پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ واضح رہے۔ کہ ایڈیٹر کوارٹرلی ریویو ایک زبردست عیسائی عالم ہے۔ اور زبان یہود کا کامل ماہر۔ وہ کوارٹرلی ریویو حقیقت اسلام کے صفحہ ۲۹۹ میں رقمطراز ہے۔

سائیفر (Cyphur) نے اُن خاص آیتوں کی جن میں۔ سینا۔ سعیر۔ اور فاران کی بشارت مذکور ہے۔ اس طرح پر تشریح کی ہے۔ کہ خدا سیناء سے نکلا۔ (یعنی عبرانی زبان میں شرح دی گئی۔ جس سے توریت مراد ہے۔) اور سعیر سے چمکا۔ (یعنی یونانی زبان میں بھی شرح دی گئی۔ جس سے انجیل مراد ہے) اور فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا۔ (یعنی عربی میں بھی شرح دی گئی۔ جس سے قرآن مجید ہے)

اس عیسائی عالم کے قول سے ثابت ہو گیا۔ کہ قرآن کی منزل اور فاران ایک جگہ ہے۔ ساری دُنیا جانتی ہے۔ کہ قرآن مکہ میں نازل ہوا۔ پھر فاران مکہ سے یا مکہ فاران سے کیسے جدا ہو سکتا ہے۔ چند سطروں کے بعد پھر ایڈیٹر موصوف لکھتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور یمنی مستعمل ہوتے ہیں۔ اور فاران تو صاف صاف عرب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

ان اسناد و اشہاد کو دیکھکر ہر انصاف پسند عیسائی بھی کہدیگا کہ ریورینڈ فارسٹر صاحب ایسی صاف صاف اور کھلی کھلی تطبیق و توثیق کو حق ناحق۔ تعصب کی خاک۔ نفسانیت کی گرد ڈالکر چھپانا چاہتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ فاران کو اینچ تان کر کبھی مصر لے جاتے ہیں۔ اور کبھی ارض بابل اور فلسطین تک پہونچاتے ہیں۔

اس سے صاف اور روشن تصدیق توراۃ سامری کے ترجمہ سے ملتی ہے۔ توراۃ سامری کا عربی ترجمہ آرکیونن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گلاؤ نیاورم چھپوایا ہے۔ جس میں بذیل ذکر بنی اسمٰعیلؑ یہ عبارت مرقوم ہے۔

وسکن (اسمعیل) بریۃ فاران (الحجاز) و اخذت لہ امہ امرۃ من ارض مصر	حضرت اسمٰعیل صحرائے فاران (الحجاز) میں ساکن ہوئے۔ اور اُن کی ماں نے ایک مصری خاتون سے اُنکی شادی کردی

ہم اس بحث کے خاتمہ میں ناظرین کتاب کے مزید اطمینان کے لیے اتنا اور لکھے دیتے ہیں۔ کہ اس بحث کے آغاز سے پہلے۔ ہر شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ عرب۔ حجاز۔ مکہ۔ کعبہ یہ جتنے الفاظ و اسماء ہیں۔ اُسوقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ لفظ عرب دسویں صدی ق۔م میں پیدا ہوا۔ حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ بعد کا موضوع ہے۔ مکہ کا نام دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے مکاربا کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسلیئے توراۃ نے اس مقام کا نام اولاً صرف مدبار یعنی "بادیہ" بتایا ہے۔ اور قرآن نے اسی کو غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) کہا۔ کیونکہ اسکے سوا اُسکا اُسوقت کوئی دوسرا نام نہ تھا اور مدت کے بعد لفظ بادیہ۔ صحرا اور وادی غیر ذی زرع اس ملک کا نام پڑگیا۔ لفظ عرب کے معنی بھی بادیہ اور صحرا کے ہیں۔ اسلیئے۔ مدبار۔ بادیہ اور وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ ہیں۔ اس لیئے توراۃ کا یہ کہنا۔ کہ اسمٰعیلؑ نے بادیہ میں سکونت کی۔ اس کے بالکل یہ معنی ہیں۔ کہ اُس نے عرب میں سکونت اختیار کی۔

حضرت اسمٰعیلؑ ترک وطن کرتے کے وقت سترہ برس کے ہوچکے تھے

اکثر احباب معاصر فرمائیں گے۔ کہ اس مضمون کو حضرت اسمٰعیلؑ کے خاص حالات میں لکھنا مناسب تھا۔ ایک حدتک یہ تجویز صحیح ہے۔ مگر شرقی و مغربی مؤلفین و محققین کی جتنی تالیفات و تصنیفات ہمارے پیش نظر ہیں۔ اُن میں حضرت اسمٰعیلؑ کی بحث عمر کو بھی عموماً حضرت ابراہیمؑ کے حالات کی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم نے بھی سلسلہ بیان کی علیحدگی کے خوف سے اُنھیں کے

طریقہ کو اختیار کیا۔
تمہیداً اتنا کہکر ہم اپنے قدیم سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ خدا کی تاکید اور اُس کے وعدے کی تائید کے مطابق حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ کر واپس گئے۔ خدائے مسبب الاسباب نے اُن کی رہائش و آسائش کے سامان فراہم کر دیئے۔ اس واقعہ سے حضرت ابراہیمؑ کے توکل۔ رضا۔ اور مطیع خدا رہنے کے کامل ثبوت ملتے ہیں۔ ورنہ اہل و عیال کی جدائی۔ اور خصوصاً ایسے ویران اور بے آب و گیاہ ریگستان اور خوفناک کوہستان کی تنہائی جہاں وہ خود ہی اِن بزرگواروں کو پہونچا گئے تھے۔ اور اُن کی مصیبت و غربت خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ مگر اُف نہ کرتے تھے۔ کیوں؟ صرف اسلیئے۔ کہ خدا کا حکم تھا۔ اُس کی رضا تھی۔ آپ کے یہ محاسن اعمال۔ معارف کے کمال کے معیار ثبوت ہیں۔ اور طبقہ انسان میں عام و خاص کا امتیاز قائم کرتے ہیں۔
جناب اسمٰعیل کا اُسوقت کیا سن تھا۔ مغربی و مشرقی مؤرخین و محققین نے اس امر میں بھی اختلاف کیا ہے۔ مگر تحقیق اور تلاش نے اسکو بھی صاف کر دیا۔ اور حد و د ثبوت تک پہونچا کر بتا دیا ہے۔ کہ حقیقتاً حضرت اسمٰعیلؑ سن مبارک اُسوقت سترہ برس کا ہو چکا تھا۔ کیونکہ توراۃ کی عبارتوں سے بظاہر نہایت کم سنی ظاہر ہوتی ہے مگر پھر اُسی توریت کی عبارتوں کے حقیقی معنیوں سے حضرت اسمٰعیل جوان ہفدہ سالہ ثابت ہوتے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔
توراۃ کا بیان ہے۔ کہ ہاجرہ و اسمٰعیلؑ کو سارہ نے علیحدہ کر دینے کا اُسوقت حکم دیا تھا۔ جب اسحاق کا دُودھ چھٹ چکا تھا۔ (تکوین باب ۲۱ آیت ۷ و ۱۰) اور پھر اُسی توریت میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اسماعیلؑ سے بارہ تیرہ برس بعد اسحاق پیدا ہوئے۔ (تکوین پیدائش اسحاقؑ) پھر اُسی توراۃ میں لکھا ہے۔ کہ اسماعیلؑ کا ختنہ تیرہ برس کے سن میں کیا گیا ہے۔ اُسوقت تک اسحاقؑ پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے۔ (تکوین باب ۱۷۔ آیت ۲۵)۔
ان تمام مرقومات توراۃ کو جمع کر کے صحیح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ترک وطن کرنے کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کا سن پندرہ ۱۵ برس سے کم اور سترہ ۱۷ برس سے زیادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ایک تو یوں ہی حضرت اسمٰعیل حضرت حضرت اسحاقؑ سے تیرہ برس سن میں بڑے ثابت ہوتے ہیں۔ پھر یہ واقعہ اسحاقؑ کے ایام رضاعت کے ختم ہو جانے کے بعد بتلایا جاتا ہے۔ تو کم سے کم دو برس یہ بھی رکھ لیئے جاویں۔ تو اس حساب سے حضرت اسمٰعیل جوان پانزدہ سالہ پا جاتے ہیں۔ اِس بنا پر توراۃ کی کم سنی اور شیر خوارگی کسی طرح ایک محقق کے لیئے قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔
یہودیوں اور عیسائیوں کو قدم قدم پر حضرت اسمٰعیلؑ کے حالات و واقعات میں دشواری پیدا کرنے

کی عادت پڑ گئی ہے۔ اُن کی صغرسنی اور نہایت صغیر سنی ثابت کرنے پر مٹے جاتے ہیں۔ بفرض محال اگر اُنکی صغرسنی ثابت بھی ہو جائے۔ تب بھی اُن کی عظمت و تقدیس میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ تیرہ[۱۳] برس کے نہیں۔ تیرہ[۱۳] مہینہ ہی کے ہوتے تو کیا۔ تاہم وہ نبی اللہ برحق تھے۔ اور ابن نبی اللہ۔ تیرہ مہینہ کا بچہ تو اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں تو گھڑی بھر پہلے کا پیدا ہوا بچہ۔ جو خدا کی طرف سے رسول بن کر آیا تھا۔ اپنے گہوارہ سے تمام قوم و قبیلہ کے عمائد و اکابر کے آگے معرفت الٰہی اور قدرت لامتناہی کے دریا بہا رہا تھا۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَّ بَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا

(وہ بچہ) بول اُٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُسنے مجھکو کتاب (انجیل) عنایت کی۔ اور مجھکو پیغمبر بنایا۔ اور کہیں بھی رہوں۔ مجھکو بابرکت کیا۔ اور مجھکو حکم دیا۔ کہ میں جبتک زندہ ہوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں۔ اور نیز مجھکو میری ماں کا خدمت گذار بنایا اور مجھکو سخت گیر اور بدراہ نہیں بنایا۔

پھر مسلمانوں کے مقابلہ میں ایسی نص صریح کی موجودگی پر۔ کسی نبی اللہ کی صغرسنی کو اُنکی بے سقداری اور ناقابلیت کی دلیل بتلانا محض بے کار اور غیر مفید ہے۔ مخالفین پہلے اسلام کے اس مسئلہ کو اپنی کتابوں میں دیکھ لیں۔ اور سمجھ لیں۔ اور ثابت کریں۔ تب اسلامی کتابوں میں اس کی فکر و تلاش کریں۔

توراۃ کے اِس اتنے فقرہ سے کہ "بچہ کو اُسے (ماں کو) دیکر" یہ اتنا طومار اُٹھایا گیا ہے۔ جس سے بظاہر سمجھا گیا ہے۔ کہ اگر اسماعیلؑ اُسوقت بچہ نہیں تھے۔ تو ہاجرہؑ کی گود میں کیوں دیئے گئے۔ سترہ برس کے بچہ کو ماں کی گود میں دیے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہم واقعات سے تو پیچھے بحث کریں گے ابھی ہم ظاہری اور قیاسی پیرایہ سے اُن کی تردید و تنقید استدلال کرتے ہیں۔

پہلے ہم یہ پوچھتے ہیں۔ کہ سترہ برس یا اُس سے کم و بیش سن و سال کے بچہ کا ماں کی گود میں دیا جانا تو خلاف قیاس بتلایا جاتا ہے۔ مگر آگے چلکر اسی سلسلہ کی تیسری پشت میں۔ پندرہ برس کا بچہ۔ حضرت یوسفؑ ابن یعقوب ابن اسحاقؑ جب دنبیاں چرانے کے لیے جنگل میں بھیجے جاتے ہیں۔ تو اُن کی محافظت کیلئے اُنکی کم سنی کے خیال سے گیارہ بھائیوں کی پوری جمعیت ساتھ کر دی جاتی ہے۔ اور پھر پندرہ[۱۵] برس کے بعد۔ جب تیس برس کا ہوتا ہے۔ تو دشوار سے دشوار اور اہم سے اہم رویا کی صحیح اور سچی تعبیریں بتلاتا ہے۔ اور خدا کی طرف سے یُوْسُفُ اَیُّہَا الصِّدِّیْقُ کا خطاب پاتا ہے۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عزیز مصر ہو جاتا ہے سبحان ما اعظم شانہ۔

حضرت اسمٰعیل کی کمسنی تو توراۃ کے اِس فقرے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اُس کتاب مقدسہ کے مندرجات پر ذرا بھی توجہ نہ فرمائی گئی۔ ریورنڈ فارسٹر کے ایسا مخالف اسلام محقق بھی اِس مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہمکلام اور ہمزبان ہے۔ وہ اس مسئلہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

کہ حضرت اسمٰعیل کی ٹھیک ٹھیک عمر یوں بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ کہ تیرہ برس کے سن میں انکا ختنہ ہوا تھا۔ اسحاق اُسوقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اُس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں۔ اور ہاجرہ اور اُن کے بیٹے کے بیابان بھیجے جانے سے پیشتر اسحاق کا دودھ چھوٹ چکا تھا۔ فارسٹر جغرافیہ عرب ص ۱۷۶۔

اِس حساب سے جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل کچھ کم سترہ برس کی عمر کے ثابت ہو گئے۔ فارسٹر صاحب کے علاوہ توراۃ و انجیل کے بہت بڑے مشہور و معروف عالم۔ جے۔ پی۔ کوک J. Pecoke اور ریورنڈ ملر Revu Muller صاف صاف لکھتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل کی عمر اُسوقت سترہ برس کی تھی۔ اسلئے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہاجرہ نے اُنہیں کاندھے پر لیا ہو۔

اِن دونوں یوروپین محققین کے مختار سے توراۃ کی یہ عبارت ہی ساقط از اعتبار ثابت ہوتی ہے جو یہ بتلاتی ہے۔ کہ ہاجرہ نے اُن کو اپنے کاندھے پر لے لیا۔ اور جسپر یہودیوں نے اور عیسائیوں نے یہ ہوائی قلعہ باندھے ہیں۔ انہیں دونوں سابق الذکر محققین کے ایسا ایک دوسرا یوروپین مصنف و محقق۔ اِس عبارت کو داخل توراۃ ہی نہ سمجھ کر اپنے رائے کا یوں اظہار کرتا ہے

کہ اِس جملہ کو (کندھے پر رکھ دیا) خطوط ہلالی کے اندر رکھ دینا چاہیے۔ جیسا کہ بشپ کڈر اور اسٹک ہاؤس Bishop Kidder. Steakhouse اور بابل نے کہا ہے۔ (جس سے اشارہ ہوتا ہے۔ کہ یہ الفاظ توریت میں نہیں ہیں۔) تو یہ آیت مشتبہ نہ ہوتی۔ (خطبات احمدیہ)

کیا اب بھی یہودیوں اور عیسائیوں کو اِس فقرہ توراۃ کے تدلیس و تلبیس کا یقین نہ آئے گا۔ کیا اب تک وہ اِس جملہ کو موضوعات انسانی کی جگہ ملفوظات ربانی سمجھیں گے۔ ایک اور منصف مزاج مصنف۔ یورپ کے کامل محقق۔ اِس مسئلہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل گو اُسوقت بچہ کہلاتے تھے۔ مگر سولہ۱۶ یا سترہ۱۷ برس سے کم کے نہ ہونگے۔ اور اس لیے وہ اپنی ماں کی مدد کے قابل ہونگے۔ جس طرح کہ اُنہوں نے بعد کو کی۔ (خطبات)

مندرجہ بالا شہود و ثبوت لکھکر ہم نے کافی طور پر۔ عیسائیوں کے غلط معنی لگانے اور غلط واقعہ دکھلانے کی کامل تردید و تکذیب اُنھیں کے مختار و اقرار سے تحریر کر دی۔ اور ثابت کر دیا کہ باپ کے مکہ میں پہونچانے کے وقت حضرت اسمٰعیل کا سن سترہ۱۷ برس کا ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم کو ہاجرہ کی طرف سے ایک

گو نہ یہ اطمینان تو ضرور ہو گیا تھا۔ کہ ضرورت اور تکلیف کے وقت ماں کے ساتھ جوان اور سن تمیز کو پہونچا ہوا لڑکا۔ اُس کی خدمت اور اعانت کو موجود ہے۔ میری اِس رائے کی تائید یورپین محقق کی اُس مختار سے کامل طور پر ہو جاتی ہے جس کو ہم نے ابھی اُوپر نقل کیا ہے۔ اور جو اِس امر کا مقر ہے۔ اور معترف کہ گو حضرت اسمٰعیلؑ بچہ کہلاتے ہوں۔ مگر وہ سولہ یا سترہ برس کے ہونگے۔ اس لیئے اپنی ماں کی مدد کرنے کے قابل ہوں گے۔

اسی کے ضمن میں ہم اعترافاً للواقع۔ یہ بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اسلامی مورخین و محدثین نے بھی حضرت اسمٰعیل کی طفولیت کا اظہار کیا ہے۔ اور صحیح بخاری تک میں اُنکی کمسنی کی حدیثیں مختلف طریقوں سے آئی ہیں۔ اِن اسلامی تاریخوں میں طفولیت کا اظہار پا کر عیسائیوں کو اپنے دعوے میں تازہ قوت مل گئی ہے۔ مگر اُن کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اسلامی مؤلفین و مصنفین نے خصوصاً اخبار قدیمہ اور حالات قبل از اسلام کے بیان و نقل میں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے مرویات و منقولات سے کام لیا ہے۔ اس لیئے اسلامی مورخین کے بیانات کے ماخذ اصلی پھر وہی یہود و نصاریٰ کے تالیفات ثابت ہونگے۔ اور صورت واقعہ یہ۔ ع اے صبا ایں ہمہ آوردۂ تست کا مضمون صادق آئے گا۔

اب رہی یہ بات کہ صحیح بخاری میں ایسا ہی مذکور ہے۔ تو یہ کوئی استدلال کا طریقہ نہیں ہے۔ اوّل تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اور امام بخاری صاحب کا جو تاریخ میں پایہ ہے۔ وہ اِس قابل نہیں ہے۔ جو اُنکو مورخین کے سب سے آخر والی صف میں بھی کھڑے ہونے کے قابل بنائے۔ اِس لیئے تمام مورخین و محققین کے آگے بخاری صاحب کا لکھنا کوئی اعتبار نہیں رکھتا۔ سرسید مرحوم نے خطبات احمدیہ میں اِس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے صحیح بخاری کی اُن تمام حدیثوں کو اُن کے مختلف طریقوں کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اور جمع کرنے کے بعد اُنپر جو تنقیدانہ رائے قائم کی ہے۔ وہ بلفظہ ذیل میں نقل ہے۔

مذکورہ بالا روایتوں سے ظاہر ہے۔ کہ وہ مستند نہیں ہیں یعنی حضرت ابن عباسؓ نے اُسکو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں سُنا۔ نہیں معلوم کہ ابن عباسؓ نے کس سے سُنا۔ اور کس بنیاد پر اُنہوں نے اُسکو بیان کیا۔ بخاری کا ادب[1] اس بات کا مقتضی ہے۔ کہ ہم تسلیم کر لیں۔ کہ ابن عباسؓ نے اُسکو سعید ابن جبیر سے سُنا۔ اور سعید ابن جبیر نے اور لوگوں سے جن سے بخاری تک یہ روایت پہونچی۔ مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی۔ کہ ابن عباسؓ نے اس روایت کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا تھا۔ (خطبات احمدیہ ۹۹-۱۰۳) مطبوعہ لاہور۔

[1] نہایت حیرت ہے۔ اور سخت تعجب کہ صحت صحیح بخاری کا ایک غلط خیال تمام مسلمانوں میں عالمگیر ہو رہا ہے۔ اور مرحوم سید صاحب

ہم نے اِس بحث میں سرسیّد صاحب کی تحقیق پر بس نہیں کی ہے۔ بلکہ عربی کے قدیم ماخذوں میں بھی اِس کی تلاش کی ہے جس سے ہم کو ثابت ہوا ہے۔ کہ عربی مورخین نے صغرسنی والی روایتوں کو ملکر۔ اُن روایتوں کو بھی لکھ دیا ہے جس سے حضرت اسمٰعیلؑ کا سن بلوغیت کے قریب پہونچا ہوا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد جلد اوّل ص ۲۸ مطبوعہ جرمن ہے۔ ہم اِس مقصد میں دو روایتیں حسب ذیل لکھتے ہیں جن سے ہمارے بیان کا پورا ثبوت ہوجائے گا۔

اخبرنا اسماعیل بن عبد اللہ ابن ابی اویس المدنی حدثنی ابی عن ابی الجارود الربیع بن نویع عن عقبۃ ابن بشر انہ سأل محمد ابن علی من اول تکلم بالعربیۃ قال اسمعیل ابن ابراھیم وھو ثلاث عشرۃ

اسمٰعیل بن عبد اللہ بن ابی اویس المدنی نے اپنے باپ سے اُس نے ابی الجارود الربیع ابن فریع سے اُس نے عقبہ ابن بشر سے روایت کی ہے۔ کہ بشر نے کہا۔ کہ میں نے محمد ابن علی (امام محمد باقرؑ) سے پوچھا کہ سب سے پہلے کس شخص نے زبان عربی میں کلام کیا۔ جواب میں ارشاد ہوا۔ کہ اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ اور وہ تیرہ ۱۳ برس کے تھے

اِس روایت نے ترک وطن اور عزم مکہ کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کا سن تیرہ برس کا ثابت ہوتا ہے۔ طبقات ابن سعد کی دوسری روایت۔

اخبرنا موسیٰ بن داود اخبرنا عبد اللہ ابن الھیعۃ عن حی ابن عبد اللہ قال بلغنی ان اسماعیل النبی صلعم اختتن وھو ابن ثلاث عشرۃ سنۃ ۔

موسیٰ ابن داؤد عبد اللہ ابن الھیعہ سے اور وہ حی ابن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حی کا یہ قول بیان کرتے ہیں۔ کہ میری تحقیق یہ ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیل نبی علیہ السلام کا ختنہ تیرہ ۱۳ برس کے سن میں کیا گیا تھا۔

یہ روایت بالکل توریت والی روایت کے مطابق ہے۔ جب ختنہ کے وقت اُن کی عمر تیرہ برس کی بالاتفاق بجمہور ثابت اور اسحاقؑ کے ولادت سے ایک سال کا واقعہ ہے۔ اور ہجرت وطن۔ ولادت اسحاق سے دو یا تین برس بعد واقع ہوئی۔ تو پھر اب ورود مکہ کے وقت سترہ ۱۷ برس کے سن کی تسلیم میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ طفولیت۔ کم سنی۔ اور شیر خوارگی کا عالم بیان کیسا لغو اور کتنا مہمل ثابت ہوتا ہے۔

بقیہ عبارت حاشیہ زیرین صفحہ گذشتہ۔ یہی باوجود اس کے کہ اُس کی ہم حدیثوں کو صحت کے درجہ سے اُتار کر مرسل کے زینہ تک لارہے ہیں۔ اور اُس کے صحیح و مرفوع ہونے کی جگہ اُن کے مراسیل ہونے پر اعتماد رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسی مشتبہ اور مشکوک الصحت کتاب اور اُسکے مصنف کو ادب کے قابل سمجھتے ہیں۔ المولف سید اولاد حیدر عفی عنہ

فاضل معاصر صاحب ارض القرآن۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی شیر خوارگی کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہوئے بخاری کی کتاب الرؤیا اور کتاب الانبیاء میں جو حدیث اسمٰعیلؑ کی شیر خوارگی کے متعلق ہے۔ وہ مرفوع نہیں ہے۔ یعنی اُسکا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہونچتا۔ بجز چند خاص ضمنی فقروں کے۔ اس لیئے وہ حضرت ابن عباس کے اسرائیلیات میں سے ہے

ارض القرآن ج ۲ ص ۹۔

مکہ میں قریب زمزم آباد ہونا اور قبیلہ جرہم کو بھی سکونت کی اجازت۔

اس بحث کو تمام کرکے ہم اپنے قدیم سلسلۂ بیان پر آجاتے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ اور جناب اسمٰعیلؑ کو راضی برضائے الٰہی چھوڑ کر مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور کرشمۂ قدرت نے ان دونوں نفوس مقدسہ کے آرام و آسائش کے سامان بھی اپنی خاص رحمت سے مہیا فرما دیئے۔ جیسا کہ سابق سلسلہ بیان سے ثابت ہو چکا۔ صاحب ارض القرآن بخاری۔ کتاب الانبیا سے اسکے آگے لکھتے ہیں۔

اتفاقاً جرہم کے کچھ آدمیوں کا اِدھر گذر ہوا۔ پرندوں کو منڈلاتے دیکھ کر بولے۔ کہ پانی یہاں ہے۔ ایک آدمی کو تحقیق کے لیئے بھیجا۔ تو پانی پایا۔ آکر خبر کی۔ وہ لوگ بھی آئے۔ اور ام اسمٰعیلؑ سے یہاں رہنے کی اجازت چاہی۔ اُم اسمٰعیلؑ نے کہا۔ رہو۔ لیکن پانی میں تمہارا کوئی حق نہیں۔ ابن عباس نے کہا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اُم اسمٰعیلؑ کو یہ بات پسند آئی۔ اس لیئے کہ وہ آبادی اور معیت چاہتی تھیں۔ وہ لوگ بھی رہنے لگے۔ لڑکا جب جوان ہوا۔ اور اُن سے عربی سیکھی۔ جب جوان ہوا۔ تو اُن لوگوں (جرہم) کو بہت پسند آیا۔ بالغ ہونے پر اپنی ایک لڑکی اُس سے بیاہ دی

ہم بخاری کی مجمل اور مختصر بیان واقعہ کو مواہب لدنیہ اور ابن اثیر کے مفصل روایات سے حسب ذیل قلم بند کرتے ہیں۔

بنی جرہم کا قبیلہ۔ جو عرب العاربہ کے سلسلہ میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اسطرف آگیا۔ ان لوگوں کے لیئے پانی سے بڑھ کر نہ کوئی دولت عزیز تھی۔ اور نہ دُنیا کی کوئی نعمت۔ اِن لوگوں نے چشمہ زمزم کے صاف اور سُتھرے پانی کو خصوصاً ایک حوض کی صورت میں جمع کیا ہوا دیکھا۔ تو اپنی بیحد مسرت میں فوراً اُسکی طرف دوڑ پڑے۔ یہاں آکر اُن کی نظر ایک عفیفہ مقدسہ (حضرت ہاجرہؑ) پر پڑی۔ وہ اُس حوض کے پاس ایک چھوٹے سے خیمہ کے در پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خیمہ بالکل اُس حوض پُر آب سے متصل کھڑا ہوا تھا حقیقت یہ ہے۔ کہ اُس چشمہ کو چاروں طرف سے حضرت ہاجرہؑ نے گھیر دیا تھا جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے اِس کے متعلق صحیح بخاری میں عبد اللہ ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے۔ کہ فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اگر اُم اسمٰعیلؑ اُسکو چاروں طرف سے گھیر نہ دیتیں۔ تو وہ چشمہ ہمیشہ کھلا ہوا بہتا رہتا حضرت

ہاجرہ اُس وقت در خیمہ پر بیٹھی ہوئی حضرت اسمٰعیلؑ کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور وہ شکار کے لیئے باہر گئے ہوئے تھے۔ بنی جرہم تھے تو جاہل۔ اور جرہم پر کیا منحصر ہے۔ عموماً تمام عرب کا عرب اُسوقت تک جاہل تھا۔ مگر پانی کے لیئے اُس کی ندرت۔ کمیابی اور قدر و عزت کی وجہ سے اُن میں زمانہ دراز سے یہ عہد یا دستور چلا آتا تھا کہ بغیر اُس کے مالک یا متصرف بالاختیار کے پوچھے یا اجازت حاصل کیئے وہ کسی غیر کے پانی کو صرف نہیں کر سکتے تھے۔ اور اُسکی وجہ یہ تھی۔ کہ پانی پر بے اذن و اجازت کے متصرف ہوجانے سے اکثر قوم و قبیلوں میں ایسی ایسی خونریزیاں واقع ہو چکی تھیں۔ جن سے قوم کی قوم قبیلے کے قبیلے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اسی احتیاط اور حفظ ماتقدم کی بنا پر آج تک عرب میں کسی چشمہ۔ حوض۔ تالاب۔ یا کنوئیں کو جو کسی شخص کی ملکیت خاص ہو۔ کوئی غیر شخص قوم یا قبیلہ بغیر اُس کی اذن و اجازت کے استعمال نہیں کر سکتا۔

اسی لیئے بنی جرہم نے حضرت ہاجرہؑ سے اُس حوض کے پانی لینے کی اجازت مانگی۔ خلیل الرحمان کی مہمان نواز بی بی نے بغیر کسی اعتراض و اغماض کے اہلاً و سہلاً کہہ کر پہلے اُن کو بلایا۔ اور پھر ھنیئاً لکم فرما کر اُن کو اُس چشمہ قدرت و رحمت کا پانی پلایا۔

ریگستان عرب کے پیاسوں کو جہاں پانی مل گیا۔ وہیں کے ہو رہے۔ یہ لوگ پانی پی کر اپنے مقام و مسکن کو لوٹے۔ تو اُس چشمہ کی کیفیت اپنی قوم و قبیلے کے لوگوں سے کہی۔ چونکہ اُن کے موطن و مسکن میں پانی کا ہمیشہ قحط شدید رہا کرتا تھا۔ اس لیئے وہ تمام لوگ اپنے مقام سکونت کو چھوڑ کر حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیل کے اذن و اجازت سے یہیں آباد ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام مکہ میں برابر آکر اہل و عیال کو دیکھ جاتے تھے۔

جناب ابراہیمؑ نے اپنے اہل و عیال کو مکہ پہونچا کر خدا کے حوالہ تو کر دیا تھا۔ مگر اُن کے ساتھ دائمی مفارقت نہیں اختیار کی تھی جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے سمجھا ہے۔ اور محض گمراہانہ اور معتوبانہ طریقہ سے ساری دُنیا کو سمجھانا چاہا ہے۔ وہ کون بے درد ہوگا جو اس شقاوت اور بے رحمی کے طریقہ کو ایک نبی اللہ برحق کا جزو اخلاق سمجھے گا۔ یہودیوں کو اور اُن کی تقلید میں عیسائیوں کو تو ہاجرہؑ اور اسماعیل سے قلبی عداوت ہے۔ اور اُن کی ذلت و حقارت کو وہ اپنا نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ عرب کے تمام اخبار و آثار قدیمہ ثابت کر رہے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ ایک بار نہیں تین بار۔ مکہ معظمہ میں تشریف لائے۔ بال بچوں کو دیکھا بھالا۔ پوچھا۔ بتلایا۔ اور چلے گئے۔ اوّل بار آپ اُسوقت تشریف لائے۔ جب حضرت اسمٰعیل کی شادی ہو چکی تھی۔ مگر آپ نے اس توصل و پیوند کو ناپسند

فرمایا۔ اور اِس کے قطع فرمانے کا حکم دے گئے۔ دوسری بار آئے۔ تو حضرت اسمٰعیلؑ کی نئی شادی اور تحویل کو مستحسن اور مبارک بتلایا۔ تیسری بار آئے تو خانہ کعبہ کی تعمیر۔ مناسکات حج کی تعلیم و تشہیر اور دیگر ارکان ارشاد و ہدایات کی تلقین فرمائی۔ ابن سعد کی روایت میں اِسکا اجمالاً یوں ذکر ہے۔

اخرج ابراھیم صلعم الی مکة ثلاث مرات ودعا الناس الی الحج فی اٰخرھن (طبقات)

حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تین بار تشریف لائے۔ اور آخر نوبت میں آپ نے لوگوں کو ادائے حج کے لیے دعوت کی۔ (طبقات)

اِس روایت سے کوئی تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔ سوائے اِس کے کہ حضرت ابراہیمؑ تین بار مکہ میں آئے اور آخر بار آپ نے حج کے لیے لوگوں کو بُلایا۔ اگرچہ تیسری بار تشریف لانے کی ایک گونہ وجہ و کیفیت معلوم بھی ہوئی۔ تو اِس سے قبل دو بار تشریف لانے کی حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی۔ اِس لیے ہمکو اوّل دو بار کی تصریح و تشریح ضروری ہے۔ ہم اوّل اور دوم بار آپ کے تشریف لانے کی کیفیت صحیح بخاری اور تاریخ طبری جلد اوّل سے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

فنکح (اسمٰعیل) امرأة منھم قال ثم بدا لابراھیم فقال لاھله انی مطلع ترکتی قال فجاء فسلم فقال این اسمٰعیل فقالت امرأته ذھب یصید قال قولی له اذا جاء غیر عتبة بیتك فلما جاء اخبرته فقال انت ذلك فاذھبی الی اھلك قال ثم انه بدا لابراھیم فقال لاھله انی مطلع ترکتی فجاء فقال این اسمٰعیل فقالت امرأته ذھب یصید فقالت الا تنزل فتطعم و تشرب فقال وما طعامکم و ما شرابکم فقالت اللحم طعامنا وشرابنا الماء قال اللھم بارك لھم فی طعامھم وشرابھم قال فقال ابو القاسم برکة بدعوة ابراھیم

پھر انھیں کے قبیلہ میں اسماعیلؑ کی شادی کر دی۔ ابن عباس کا بیان ہے۔ کہ جب جناب ابراہیمؑ آئے۔ تو پوچھا۔ کہ اسمٰعیل کہاں ہیں انکی بی بی نے جواب دیا کہ وہ شکار کو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ جب وہ آئیں۔ تو اُن سے کہدینا۔ کہ اپنے گھر کے کیواڑ بدل ڈالیں۔ جب اسمٰعیلؑ آئے۔ تو اُن کی بی بی نے اُن سے یہ واقعہ دُہرایا۔ حضرت اسمٰعیل نے کہا۔ کہ وہ (کیواڑ) تمہیں ہو۔ تم اسی وقت میرے گھر سے اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ پھر جب جناب ابراہیمؑ (دوسرے بار) تشریف لائے۔ تو پھر اسمٰعیلؑ کو پوچھا۔ کہ وہ کہاں ہیں۔ انکی (موجودہ) بی بی نے جواب دیا کہ شکار کو گئے ہیں۔ اِتنا کہہ کر اس خاتون نے عرض کی۔ کہ آپ گھر میں تشریف لائیں۔ تو ہم آپ کو کھلائیں پلائیں۔ ابراہیمؑ نے پوچھا۔ تمہارے یہاں کھانے پینے کو کیا ہے۔ اسماعیلؑ کی بی بی نے کہا۔ کہ کھانے کو گوشت ہے۔ اور پینے کو پانی۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ کہ خدا تمہارے کھانے پینے میں برکت عطا فرمائے۔ ابن عباس کا قول ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے لیے عام دعا مانگی تھی۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی جرہمی اور مصری بی بی ہونے کی تحقیق

مندرجہ بالا عبارت سے حضرت ابراہیمؑ کا دو بار کنعان سے مکہ معظمہ اپنے اہل و عیال کے تحقق احوال کی غرض سے تشریف لانا۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا اپنے پدر بزرگوار کی ہدایت کے مطابق پہلی بی بی کو طلاق دینا اور ایک دوسری بی بی سے نکاح کرنا ثابت ہوتا ہے اور وہ دونوں بیبیاں جرہم کی لڑکیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور یہ توراۃ کی روایت کے خلاف ہے۔ اُس میں اُن کی بی بی کا مصری ہونا صاف لکھا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ عربی مورخین نے اپنے مدعا سے زائد سمجھ کر اِس مسئلہ میں زیادہ تحقیق و تفتیش نہ کی ہو۔ اور سرسید مرحوم نے توراۃ والی روایت کی تائید میں جو اپنا مختار قائم کیا۔ اور جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ صحیح ہو۔

ہم کو اس بات کے یقین کر لینے کی پوری وجہ ہے۔ کہ مذکورہ بالا روایت میں جو پہلی بی بی کا جرہم سے ہونا بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ پہلی بی بی ایک مصری عورت تھی۔ اور یہی وجہ ہو گی۔ کہ اس عورت سے نکاح کرنا حضرت ابراہیم نے ناپسند کیا ہوگا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کہ ابتدا میں جرہم نے اپنی قوم کی لڑکی حضرت اسمٰعیل کے نکاح میں دینے سے انکار کیا ہو۔ کیونکہ وہ اسمٰعیل کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے۔ مگر پھر ایک معتدبہ زمانہ تک باہم سکونت پذیر ہونے سے یہ خیال جاتا رہا ہو۔ اس سے یقین ہوتا ہے۔ کہ ان کی دوسری بی بی جرہم کی قوم سے ضرور تھیں۔

ہمکو اِس بحث کے متعلق زیادہ تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے مدعائے تالیف کو حضرت اسمٰعیلؑ کی اُسی بی بی کے حالات سے تعلق ہے۔ جس سے سلسلہ بنو اسمٰعیلؑ کی ابتدا ہوئی۔ اور وہ بالاتفاق اُنھیں بی بی سے شروع ہوا۔ جو قبیلہ جرہم سے تھیں۔ اور جنکا نام محمد ابن اسحاق نے سیرت ابن ہشام میں رعلہ بنت مضاض بن عمر الجرہمی تبلایا ہے۔ اور کلبی نے رعلہ بنت یشجب ابن یعرب لکھا ہے۔ اِن دونوں روایتوں میں اِس خاتون معظمہ کا نام ایک ہے۔ فرق ہے۔ تو سلسلۂ نسب میں۔ اور وہ بھی عند التحقیق متحد الاصل ثابت ہوتا ہے۔ اِسی تحقیق کی تفصیل میں یہ بھی دریافت کر لینا ضروری ہے۔ کہ غیر جرہم بھی کوئی عورت اسمٰعیلؑ کے عقد میں جس کو توراۃ نے مصری لکھا ہے۔ آئی تھی۔ یا نہیں۔ اگر آئی تھی۔ تو عرب کی قدیم روایتوں میں اُسکا کہیں ذکر ہے۔ یا نہیں۔ ہم اِس کے متعلق طبقات ابن سعد کی مرقومۂ ذیل روایت پیش کرتے ہیں

قال الکلبی وکانت لاسمعیل امراۃ من العمالیق ابنۃ صیدی قبل الجرھمیۃ وھی التی کان جاءھا ابراھیم فجفتہ فی القول ففارقھا اسمعیل ولم تلد لہ شیئاً۔	کلبی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی ایک بی بی قوم عمالیق سے تھیں صیدی کی لڑکی۔ اور یہ وہی تھیں۔ جن کے جُدا کرنے کا ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو حکم دیا تھا۔ اور اسمٰعیلؑ نے جُدا کر دیا تھا۔ اس عورت سے اسمٰعیلؑ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس روایت سے اسماعیل کی ایک بی بی کا غیر جرہمیہ ہونا ضرور ثابت ہوتا ہے۔ مگر وہ عمالیق سے تھیں۔ نہ توراۃ کی تصریح کے مطابق زن مصریہ تھیں۔ توراۃ کے مفسرین و مترجمین کو غالباً عمالیق کے لفظ و نام نے شبہ میں ڈالا ہے۔ اور وہ عمالیق سے قوم عمالیق ساکن مصر سمجھے ہیں۔ اور اس بنا پر اس عورت کو مصری لکھتے ہیں۔ مگر یہ صریح غلط فہمی ہے۔ یہ عمالقہ مصر کی قوم سے نہیں۔ بلکہ عمالیق مکہ کے قبیلہ کی لڑکی تھی۔ کلبی نے اسکا سلسلہ اپنی روایت میں اس طرح لکھا ہے۔ دعلہ بنت یشجب ابن یعرب۔ یہ شخص یشجب ملک یمن کا بادشاہ تھا۔ اور وہاں کے مشہور و معروف بادشاہ سبا اکبر کا۔ مورث اعلیٰ۔ اسی کے سلسلہ میں ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے مشہور تھا۔ جو جرہم کے بعد مکہ میں آباد ہوا۔ (ابن ہشام و ابو الفدا اور ابن اثیر)

یشجب کی ماہیت معلوم ہوئی۔ اب یعرب کی اصلیت یہ ہے۔ کہ یعرب وہی شخص ہے۔ جسکا دوسرا نام جرہم ہے۔ امور بالاکو اکثر مقامات پر سرسید مرحوم نے خطبات میں تحریر کیا ہے۔ انکی مندرجہ عبارات تصدیق حسب ذیل ہیں۔

مغربی اور مشرقی موزخین کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ یعرب اور جرہم سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ اور اولاد یعرب کی بہت سی شاخیں بنی جرہم میں داخل ہیں۔ خطبات احمدیہ ص ۷۰ مطبوعہ لاہور۔

دوسرے مقام پر تحریر لکھا جاویگا۔

عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں۔ جنکی نسل یقطان اور قحطان سے چلی ہے۔ اور تمام قبائل عرب اسی نسل میں داخل ہیں۔ حمیری انھیں کا ایک قبیلہ ہے اور بنی حمیری میں ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے مشہور تھا۔ جو مکہ میں بستا تھا۔ خطبات ص ۱۰۵ مطبوعہ لاہور۔

ان اسناد و اشہادے عرب کی قدیم تاریخوں کا یہ لکھنا۔ کہ ان کی دونوں بی بیاں جرہمیہ تھیں۔ بے اصل اور دعوئے بے دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کلبی نے زوجہ اولیٰ اسماعیل کو عمالیقی بتلایا ہے۔ وہ بھی تو اصلاً جرہمیہ ثابت ہوتی ہے۔ توراۃ کے مصری عورت ہونے پر اگر زیادہ اصرار کیا جاوے گا۔ تو ہم اسکو بھی عربی الاصل ثابت کرنے پر تیار ہیں۔ صاحب ارض القرآن اس مسئلہ کے تحقیق میں عبارت ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل کی بی بی کا جرہمی یا مصری ہونا کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے اس عہد میں یہی عرب مصر کے حکمراں قبائل تھے۔ اس بنا پر وہ عورت جرہمی بھی ہو سکتی ہے۔ اور مصری بھی ارض القرآن ج ۲ ص ۵۲۔

ہمکو صاحب ارض القرآن کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔ اور سرسید مرحوم کے مختار سے بالکل اختلاف جنہوں نے زوجہ اول حضرت اسماعیلؑ کے کسی نوع سے جرہمیہ ہونے کو غلط مانا ہے۔ حالانکہ ہم انھیں کے اقرار و اعتراف سے ثابت کر آئے ہیں۔ کہ وہ عورت عام اس سے کہ مصری ہو۔ یا عمالیقی۔ عربی الاصل اور جرہمی النسل ضرور مانی جائے گی۔ یہ صرف سید صاحب کا ضرورت سے زیادہ مرویات توراۃ پر

اعتماد و اعتقاد رکھنے کا نتیجہ ہے۔ جو اُن کی تالیفات و تصنیفات کے اکثر مقامات سے ہویدا و آشکار ہے۔

تعمیر خانہ کعبہ مشرفہ

دو بار جناب ابراہیمؑ علیہ السلام کی مکہ میں تشریف لانے کے متعلق ہم تفصیل سے حالات و واقعات لکھ چکے۔ تیسری بار تشریف فرما ہونے کی ضرورت یہ ہے اب کی بار آپکی تشریف آوری کے واقعات بتلا رہے ہیں۔ کہ پہلے دو بار تو آپ اپنے روحی تعلقات اور قلبی جذبات کے زیر اثر ہو کر اپنے اہل و عیال کے تفقد احوال کی غرض و ضرورت سے تشریف لائے تھے مگر اب کی بار مکہ معظمہ میں آپکا نزول اجلال خدائے لایزال کے ایک واجب التعمیل حکم کی بجا آوری کے باعث سے تھا۔ اور اِس حکم الٰہی کی تعمیل سے عبادت و اطاعت خداوندی کی تعمیل و ترویج تمام اقطاع عالم میں قائم کرنی تھی۔ اور حقیقت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل آپ کی حیات ستودہ آیات کا وہ واقعہ ہے۔ جس سے آپ کے کمال معرفت۔ خلوص للّٰہ اور متابعت خداوندی کے بے مثال جوہر ثابت ہوتے ہیں۔ ہم اِس واقعہ کی تفصیل میں صحیح بخاری کی مندرجہ بالا روایت کے باقی حصہ کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ثم انہ جاء ابراہیم فقال لاھلہ انی مطلع ترکتی فجاء ھوا فوق اسمٰعیل من وراء زمزم یصلح بناء لہ فقال یا اسمٰعیل ان ربک امرنی ان ابنی لہ بیتا قال اطع ربک قال امرنی ان تعیننی علیہ قال اذا فعل او کما قال فقاما فجعل ابراہیم یبنی و اسمٰعیل یناولہ الحجارۃ و یقولان ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم قال حتی ارتفع البناء و ضعف الشیخ عن نقل الحجارۃ فقام علی حجر المقام فجاء یناولہ الحجارۃ و یقولان ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(بخاری کتاب الانبیاء)

خلاصہ ترجمہ یہ ہے۔ کہ جب پھر حضرت ابراہیمؑ آئے۔ اور اسمٰعیلؑ کو تلاش کیا۔ تو جناب اسمٰعیلؑ کو پشت زمزم پر۔ جہاں آب زمزم ہے۔ بنائے زمزم کی مرمت کرتے ہوئے پایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیل سے کہا۔ کہ میرے خدا نے مجھکو حکم کیا ہے۔ کہ میں اُسکے لیے گھر بناؤں۔ حضرت اسمٰعیل نے کہا کہ آپ حکم خدا کی تعمیل و اطاعت کیجئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ اُسنے یہ بھی کہا ہے۔ کہ اس کام میں تم میری مدد کرو۔ ابن عباس کا قول ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیل نے ویسا ہی کیا جیسا ان کے پدر بزرگوار نے ارشاد کیا۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ دونوں باپ بیٹے اسی وقت کھڑے ہوگئے۔ حضرت ابراہیمؑ گھر بناتے تھے۔ اور جناب اسمٰعیل پتھر ڈھو ڈھو کر دیتے جاتے تھے۔ اور دونوں بزرگوار فرماتے جاتے تھے۔ پروردگار تو ہم دونوں کی ان خدمات کو قبول فرما کیونکہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یہانتک کہ بنیادیں اتنی اونچی ہوگئیں۔ کہ ابراہیمؑ کھڑے ہو کر پتھر نہ رکھ سکے۔ تو ایک پتھر پر کھڑے ہو کر جسکو آجتک مقام ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ دیوار پر پتھر رکھنے لگے۔ اور اسمٰعیلؑ انکو اٹھا اٹھا کر پتھر دینے لگے۔ دونوں بزرگوار کام کرتے جاتے تھے) اور کہتے جاتے تھے۔ پروردگار تو ہم دونوں کے ان خدمات کو قبول فرما۔ کیونکہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسلامی مورخین نے انواع و اقسام کے طریقوں سے بنائے کعبہ کے متعلق روایات لکھکر اپنے خلوص وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہم اُن کو اپنے مدعائے تالیفی سے زائد اور غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں۔ اور ذیل میں خانہ کعبہ کی اُس سادی اور بلا تکلف عمارت کو۔ جو اُن دونوں برگزیدگان الٰہی نے اپنے مقدس اور مبارک ہاتھوں سے بنائی تھی۔ اور اُسکو جس شکل وحیثیت میں اُسوقت قائم کیا تھا۔ علامہ ازرقی اُکی عبارت سے نقل کرتے ہیں۔

بنا البيت وجعل طوله في السماء تسعة اذرع وعرضه في الارض اثنين وثلاثين ذراعًا من الركن الاسود الى الركن الشامي الذي عند الحجر من وجهه وجعل عرض ما بين الركن الشامي الى ركن اليماني الذي فيه الحجر اثنين وعشرين ذراعا وجعل طول ظهرها من الركن الغربي الى ركن اليماني احد وثلاثين ذراعا وجعل عرض شقها اليماني من الركن الاسود الى الركن اليماني عشرين ذراعًا۔

(كتاب اخبار مكة ازرقی ص۳۱)

خانہ کعبہ بنا شروع ہوگیا۔ اونچائی اُس کی ۹ گز تھی۔ اور چوڑائی ایک طرف کی ۳۲ گز کی۔ رکن اسود سے لیکر رکن شامی تک اور یہ مقام حجر سے ملا ہوا ہے۔ اور چوڑائی دوسری طرف کی رکن شامی سے رکن مغربی تک ۲۲ گز ہے۔ اور اس سے بھی حجر ملا ہوا ہے۔ اور چوڑائی پشت کی رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ گز اور دوسری طرف رکن یمانی سے لیکر رکن الاسود تک ۲۰ گز تھی۔

(کتاب اخبار مکہ علامہ ازرقی ص ۳۱)

مندرجہ ذیل نقشہ جو مرقومہ بالا پیمائش کے حساب سے مطابق کرکے تیار کیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ کی عمارت ابراہیمی کے آسانی سے سمجھ جانے کے لیئے کافی ہوگا۔

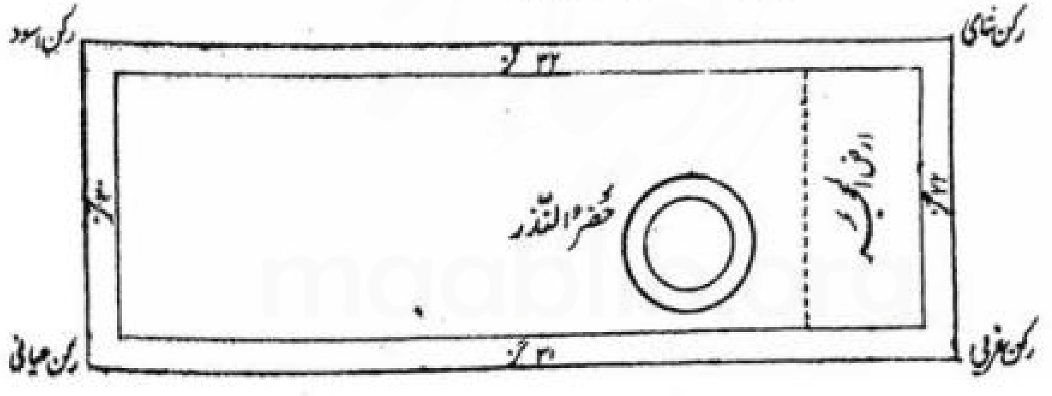

حرم محترم کی عمارت بس اتنی ہی تھی۔ جسکی نہ چھت پاٹی گئی تھی۔ اور نہ اُس میں چوکھٹ بازو۔ کواڑ اور کنڈی وغیرہ کی شرکت ضروری سمجھی گئی۔ خدائے واحد کا یہ پاک وصاف گھر انتہا درجہ کی سادگی کے ساتھ بنایا

گیا تھا۔ جس کا معمار خلیل اللہ تھا۔ اور مزدور ذبیح اللہ۔ خانہ کعبہ کے اندر ایک مدور گڑھا کھود دیا گیا تھا
جس میں نذر و نیاز اور دوسرے چڑھاوے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ اسی کو میہ کعبہ کہتے تھے۔
چونکہ یہ عمارت باوجود اس کے کہ چوگوشہ ضرور تھی مگر ساخت کے اصول سے اس کے چاروں ضلع برابر نہیں
تھے۔ اس لیے مربع نہیں کہلا سکتی تھی۔ مربع کی جگہ مکعب کہی گئی۔ اور کعبہ کی وجہ تسمیہ یہی ہوئی۔

ارکان حج کی تعلیم و اعلان

جب یہ عمارت قریب تیاری کے پہونچی۔ تو جیسا کہ تاریخ ازرقی میں
لکھا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ سے فرمایا۔ اِئْتِنِیْ بِحَجَرٍ حَسَنَۃٍ حَتّٰی
اَکُوْنَ عِلْمًا لِلنَّاسِ یَبْتَدِئُوْنَ مِنْہُ الطَّوَافَ اے اسمٰعیلؑ۔ ایک ایسا پتھر لاکر مجھے دو۔ کہ
میں اسکو اس غرض سے نصب کر دوں۔ کہ وہیں سے لوگ کعبہ کا طواف شروع کریں۔ (اخبار مکہ ص ۲۹۔)

تقدس حجر الاسود

کی یہی تاریخی حیثیت قائم ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ جتنی روایتیں حجر الاسود
کے متعلق اسلامی کتب و تفاسیر میں منقول ہیں۔ وہ اعتقاداً کتنی ہی صحیح اور
قوی ہوں۔ مگر تاریخی حیثیت کے اعتبار سے قابل الذکر نہیں ہو سکتیں۔

جب خانہ خدا کی یہ عمارت بن چکی۔ تو مصدر قدرت سے خلیل اللہ کو یہ حکم صادر ہوا۔

وَطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْقَائِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔

میرا گھر طواف کرنیوالوں۔ قیام کرنیوالوں۔ اور رکوع و سجود کرنیوالوں کیلئے پاک کرو۔ اور تمام لوگوں کو حکم کرو۔ کہ میرے گھر کا طواف کریں۔ پیدل بھی اور لاغر اونٹوں پر بھی۔ وہ ہر دور دراز گوشہ ملک سے آئینگے۔

یہ حکم پاتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے لبیک کہی۔ اور اُسی وقت سے آجتک عرب میں لبیک کہنے کا۔ جب وہ
خانہ کعبہ کے سامنے یا قریب پہونچ جائیں۔ دستور قائم ہو گیا۔ اسی کو تلبیہ کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اعلان
حج کا یوں انتظام کیا۔ کہ مقام ابراہیمؑ پر (اور بنا بر بعض روایات کوہ عرفات پر چڑھ کر) کھڑے ہو کر تمام
لوگوں کو خانہ کعبہ کے طواف کے لیے بُلایا۔ سب سے پہلے جس قوم و قبیلے کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو
قبول فرمایا۔ وہ بنی جرہم تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے۔ فَاَوَّلُ مَنْ اَجَابَہٗ جُرْھُمُ اُن کی قبول
دعوت کے بعد قوم عمالیق ایمان لائی۔ قِیْلَ الْعَمَالِیْقُ ثُمَّ اَسْلَمُوْا اُن کے بعد قوم عمالیق اسلام لائی۔ اِن کے
اسلام لانے کے بعد۔ حضرت ابراہیمؑ نے اُن تمام قوم و قبیلے کے لوگوں کو جو حوالی مکہ میں آباد تھے۔ دین
ابراہیمی کی تلقین اور مناسکات حج اور طواف بیت الحرام وغیرہ کی کامل تعلیم فرمائی۔

یہ دین حنیف کی ابتدائی تعلیم تھی۔ اور اسکی تعلیم کے حالات و واقعات جو اُوپر قلم بند کئے گئے ہیں۔ اسی
ضمن میں ہم کو یہ بھی لکھدینا ضروری ہے۔ کہ یہ عبادت گاہ الٰہی بہت جلد قربان گاہ قرار پا گئی۔ پھر اب

استقرار اور استمرار کے ساتھ کہ اُسوقت سے لے کر آجتک اور آج سے ابدالآباد تک۔ نسل ابراہیمی کے ایثار و انداز اور دین حنیف کا سچا معیار قایم ہوگیا۔

اپنے پہلوٹے اور سب سے بڑے بیٹے اسمٰعیلؑ کی راہ خدا میں قربانی

قرآن مجید میں اسواقعہ کی کیفیت یوں مذکور ہے

قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ وَ نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ وَ فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔

(ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ چلونگا کہ وہ مجھکو ہدایت فرمائے۔ پروردگار مجھکو ایک نیکوکار فرزند عطا فرما۔ تو ہم نے اسکو ایک سمجھدار لڑکے کی بشارت دی۔ پھر جب وہ لڑکا اُسکے ساتھ چلنے پھرنے (کام کرنے) لگا۔ تو ابراہیمؑ نے اس سے کہا کہ میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں تیری اس معاملہ میں کیا رائے ہے۔ اُس لڑکے نے جواب دیا۔ ابا جان جو آپ کو حکم ہوا ہے (بے تامل) آپ اُسکی تعمیل کیجیے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابری پائیں گے۔ پھر جب دونوں (باپ بیٹے) تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے۔ اور باپ نے (حلال کرنے کے لیے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ہمکو اُن کی فرمانبرداری نہایت ہی پسند آئی) ہم نے ابراہیمؑ سے پکار کر کہا اے ابراہیمؑ تم نے اپنے خواب کو خوب سچ کر دکھلایا۔ اب ہم تمکو بڑے بڑے مرتبے دینگے۔ اور ہم نیک بندوں کو ایسا ہی بدلا دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ کھلی آزمایش تھی۔ اور ہم نے عظیم قربانی کو اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنایا۔

تفسیر بیضاوی اور ربیع الابرار زمخشری سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ یہ رویاء صادقہ جسدن حضرت ابراہیمؑ کو دکھلایا گیا۔ وہ ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تھی۔ اسلئے آٹھویں ذی الحجہ کو مصطلحات فقہیہ علیہ میں یوم الترویہ کہتے ہیں۔ جو رویتہ سے مشتق ہے۔ نویں ذی الحجہ کی رات کو مقام عرفات میں پھر ایسا ہی خواب دکھلایا گیا۔ اور اُسی دن آپ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے اپنے خواب کو دُہرایا۔ اکثر علما کی رائے میں نویں تاریخ کو احکام عملیات میں یوم العرفہ کہے جانے کی یہی وجہ تسمیہ ہوئی۔ اُس رات کو بھی جناب ابراہیمؑ غالباً مناسکات عرفات بجالانے اور قوم و قبایل کے تمام لوگوں کو خدائے واحد کی معرفت اسکی عبادت کے طریقہ۔ اُس خانہ مقدس کے آداب اور مناسکات حج بجالانے کی مشغولیت کے سبب سے اس امر جلیل کی تعمیل نہ فرما سکے۔ دسویں کی رات کو سوئے تو پھر وہی خواب دیکھا۔ اب تو خدا کے اِس خالص شیدائی کی عقیدت ایسی جوش میں آئی۔ کہ اپنے پہلوٹے اور بڑی منّت والے بیٹے کو قربان گاہ منیٰ

میں لے جاکر چھری کے نیچے رکھ ہی تو دیا۔ اور آفرینش عالم کے وقت سے لے کر اسوقت تک خدا کے نام پر۔ خدا کی راہ میں۔ ایک ایسی نذر۔ ایسی قربانی۔ اور ایسے ایثار نفسی کی تعمیل کا پورا قصد کر لیا۔ جس کی مثال پھر دنیا کے کارنامہ میں نہ قایم ہو سکی۔ حضرت ابراہیمؑ کے صبر و رضا کے کمال اور راہ رضائے الٰہی میں آپ کی استقامت اور استقلال کا اس سے پہلے کئی بار امتحان ہو چکا تھا۔ اور ہر موقع پر آملجگاہ مصیبت میں یہ خاصہ الٰہی کامل اور کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی معرفت اور حسن اطاعت کا یہ آخری امتحان تھا۔ اور آزمائش و ابتلاء کا سخت ترین معرکہ۔ اور حقیقتاً ایسا قیامت خیز عالم اور عبرتناک عالم تھا۔ کہ آخر ممتحنان قدرت بھی اس کے مشاہدے اور نظارے کی تاب نہ لا سکے۔ اور قربان گاہ منیٰ سے چلا اُٹھے۔ اَنْ یَّا اِبْرَاهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ اے ابراہیمؑ بیشک تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔ اور ہم نیک بندوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اور ہم نے بڑی قربانی کو اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنایا۔

تبلیغ رسالت کے متعلق ایسے پر اثر۔ مقتدر اور مافوق البشر خدمات انجام دے کر حضرت ابراہیمؑ نے نظام مشیت اور احکام قدرت کے تمام مقاصد پورے کر دیے۔

مکہ معظمہ سے مراجعت اور جناب ابراہیمؑ علیہ السلام کی رحلت

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کا سن مبارک سو برس سے متجاوز ہو چکا تھا حضرت اسمٰعیلؑ کا سن اُسوقت تیس برس کا بتلایا جاتا ہے۔ تعمیر کعبہ تعلیم شریعت اعلان و تلقین مراسم حج۔ اور دیگر اُمور تبلیغ رسالت کو انجام تک پہونچا کر حضرت ابراہیمؑ نے مکہ سے شام کی طرف مراجعت فرمائی۔ اور وہاں پہونچکر تھوڑے دنوں کے بعد داعی اجل کو لبیک کہی۔ اور دفعتاً انتقال فرمایا۔ آپ کی وفات کے متعلق اکابرین محدثین اسلامی یہ تفصیلی واقعہ بیان کرتے ہیں۔

ایک بار حسب العادت حضرت ابراہیمؑ نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی جب مہمانوں کی کثیر التعداد جماعت خوان خلیل اللہ پر جمع ہو گئی۔ اور حلقہ باندھ کر کھانا کھانے لگی۔ تو حضرت ابراہیمؑ کی نظر۔ اُن مہمانوں میں ایک نہایت کبیر السن شخص پر پڑی۔ اور آپ نے اُسکو ایسی بے دست و پائی کی حالت میں مشاہدہ فرمایا۔ کہ اُس کے تمام بدن میں رعشہ ہے۔ اور وہ اپنے رعشہ دار ہاتھ سے لقمہ اُٹھا کر کھانا چاہتا ہے۔ تو خلاف عادت حرکت رعشہ کی وجہ سے لقمہ اُس کے مُنہ تک نہیں پہونچتا۔ بلکہ کبھی اُس کی پیشانی۔ کبھی رخسار اور کبھی چہرے کے دوسرے مقاموں پر جا لگتا ہے۔ اسکے ساتھ ایک

اور آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اُسی ضرورت اور خدمت کے لیئے ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ بالآخر اُس کے رفیق نے اپنے ہاتھ سے اُسکو کھلانا شروع کر دیا۔ تب وہ عزیب کبیرالسن کھانا کھا سکا۔

اِس شاہدے سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دل میں طول عمری کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہوئی۔ اور آپ نے فوراً بارگاہِ مجیب الدعواۃ میں شیوخیت اور کہولیت کے ان گئی گذری حالتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہے جانے کی دعا مانگی۔ چونکہ وہی وقت آپکی اجل موعود کا تھا۔ اِس لیئے اِدھر آپ کی دعا کے لیئے حکم اجابت آیا۔ اُدھر فرمان قضا ورحلت کل شئی ھالک الا وجھہ

ہم نے حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کی حیات وستودہ آیات کے متعلق جستہ جستہ تمام واقعات وحالات بیان کردیئے۔ پڑھنے والے اور اِن پر غور کرنیوالے آسانی کے ساتھ نتیجہ نکال لینگے۔ کہ اِس اصلی اور حقیقی موحّد اور دین حنیف کے مُوجد نے جس خلوص اور عقیدت کا وعدہ اپنے معبودِ حقیقی کے ساتھ اِن الفاظ میں کیا تھا۔ کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ میری نماز۔ میرے تمام مناسکات۔ میری حیات اور میری ممات۔ (سب کچھ) خالص خدا کے واسطے ہے۔ جو دو عالم کا پروردگار ہے۔ اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ان اُمور کے لیئے مجھے حکم دے چُکا ہے۔ اور میں (بیشک ان اُمور کے) تسلیم کرنے والوں میں ہوں۔ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً پورا فرما دیا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا واقعات سے ثابت ہو چکا۔ اور قدرشناسان قدرت نے بھی وَاِبْرَاھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی کے الفاظ مصدقانہ نازل فرماکر آپ کے محاسن خدمات کی ایجاب و اعتراف کا اظہار کر دیا۔

سب سے پہلے دین ابراہیمؑ اسلام کے نام سے موسوم ہوا ہے

اسلام کی قدامت اور اصلیت قرآن مجید کی اِس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ ھُوَ الَّذِیْ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ۔	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔ اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان رکھا ہے۔

یہ آیۃ بتلا رہا ہے۔ کہ اسلام پر منحصر نہیں۔ تمام مذاہب جو رسالت ابراہیمیؑ کے بعد دیگر کتب سماویہ کے ذریعہ سے نازل فرمائے گئے۔ وہ سب ملتِ ابراہیمیؑ کے متبع سمجھے جائیں گے۔ اور دائرہ اسلام میں آنے اور مسلمان کہلانے کے مستحق کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُسکی خصوصیت کیسی؟

اصلیت کے اعتبار سے تو یہود۔ نصاریٰ اور مسلم سب کے سب ملتِ ابراہیمی کی شاخیں اور متبع قومیں

کہی جائیں گی۔ مگر اتباع وعقیدت اور عملی اطاعت ومطابقت کے اصول پر جب اِن امم مختلفہ کے مراسم عبادت اور اخلاقی۔ تمدنی اور قومی مرسومات ودستورات پر نظر ڈالی جائے گی۔ اور تحقیق سے کام لیا جائے گا۔ تو اِن تمام مختلف فرقوں میں سوائے ایک اسلام کے پھر کوئی دوسرا فرقہ نہیں پایا جائیگا۔ جس کے مذہبی۔ قومی۔ تمدنی۔ اور اخلاقی طریقوں میں شریعت ابراہیمیؑ کا کوئی جزو یا شعبہ پایا جاتا ہو۔

اسلام کو ملت ابراہیمیؑ کے ساتھ جو خصوصیت ہے۔ وہ اِس بنا پر ہے۔ کہ شریعت اسلامی میں اِس وقت تک۔ شریعت ابراہیمی کے احکام اُن کے عملیات واجبات ومستحبات میں داخل ہیں۔ اور اُن کو آجتک ہر مسلمان اُسی عظمت وتقدیس اور احترام واکرام کے ساتھ ادا کرتا ہے جس طرح خلیل اللہ نے تعلیم فرمائے تھے۔ جیسے تحریم کعبہ۔ مناسکات حج۔ ختنہ۔ وضوء۔ حجامت۔ غسل۔ جنابت۔ عقد نکاح۔ وغیرہ وغیرہ۔

شریعت ابراہیمی اور دین حنیف خلیل الٰہی کے متلاشی دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی کو اور تنہا اسلام ہی کو ایک ایسا مذہب پائیں گے۔ جس میں شریعت ابراہیمی کے آثار واحکام ابتک قائم ہیں اور وہی اسکے اتباع کا تنہا دعویٰ کرسکتا ہے۔

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے غلط تسمیہ "اسلام" کی تصحیح وترمیم

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی۔ اسکی توجیہ میں۔ کہ شریعت محمدی کا نام اسلام اور اُسکے متبعین کا نام مسلمان کیوں مشہور ہوا۔ رقم طراز ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم ورضا ہے۔ یعنی جب قربانی کا حکم ہوا۔ تو باپ بیٹے دونوں نے بلاعذر گردنیں جھکادیں۔ یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا۔ اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۰۶)

یہ آپ کی ذہانت کا ایک نکتہ ہے۔ اور جودت طبع کا نمونہ۔ مولوی شبلی نے بہت مابعد کے واقعہ سے اس کی وجہ تسمیہ قائم کی ہے۔ اور آیہ ذبح میں الفاظ فلما اسلما کو اسکا اصل ماخذ ومرجع بتلایا ہے۔ جو حیات ابراہیمی کا آخری واقعہ ہے۔ یہ شمس العلماء صاحب کی کوتہ نظری ہے۔ اگر قرآن مجید میں اس مسئلہ کی تحقیق میں دیگر آیات وواقعات پر محققانہ طریقہ سے غور فرمایا گیا ہوتا۔ تو شمس العلماء صاحب کو معلوم ہوجاتا۔ کہ اِس واقعہ سے بہت پہلے حضرت ابراہیمؑ کے صبر ورضا کا کارنامہ دار النظام قدرت میں پیش ہوکر قبولیت واجابت الٰہی کا اعزاز حاصل کرچکا تھا۔ قرآن مجید کے سورۂ بقر کی مفصلہ ذیل آیت سے اس کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔	جب اُس (ابراہیم) سے خدا نے کہا۔ کہ ہماری فرمانبرداری کرو تو اُس نے کہا کہ میں پروردگار دو عالم کا فرمانبردار ہوا۔

اِس سے ثابت ہو گیا۔ کہ معرفت اور تصدیق الٰہی جس طریقہ اور جن الفاظ سے حضرت ابراہیمؑ نے کی۔ اُسی کا نام اُسی وقت سے اسلام رکھا گیا۔ خدائے سبحانہٗ تعالےٰ نے اپنی معرفت و تصدیق کا حکم بھی ابراہیمؑ کو اُسی لفظ کے ساتھ دیا۔ اور ابراہیمؑ نے اُس کی تعمیل بھی اُنہیں الفاظ میں کی۔ پھر ایسے نصِّ صریح کی موجودگی میں ہم اسلام کا مبتدا اسی آیہ کو ضرور قرار دیں گے۔ اور سورۂ حج کے آیہ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب۔ اسی نے پہلے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا) کو اِس مبتدا کی خبر ٹہرائیں گے۔ جس سے مدعائے حقیقت پورے طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے کہ آیہ اوّل میں اسلام کی اوّلیت قدامت اور ابتدا۔ اس کی وجہ و سبب کے ساتھ تبلائی گئی ہے۔ پھر آیہ دوم میں مسلمانوں کو اُن کے طریقہ کا نام اسلام رکھے جانے اور اُن کو مسلمان کہے جانے کی بھی خاص وجہ تسمیہ تبلائی گئی ہے۔ کہ بمقابلہ دیگر مذاہب کے۔ چونکہ پیروان شریعت محمدیہ کو طریقہ ابراہیمی کے صحیح اور حقیقی اتباع کا شرف حاصل ہے۔ اِس بنا پر اُن کی شریعت اور اُنکا نام بھی وہی رکھا گیا۔ جو پہلے سے اِن کے مورث اعلیٰ کے طریقہ کا نام رکھا گیا تھا۔

اسلام کی حقیقت تو اتنی قدیم ثابت ہوتی ہے۔ مگر شمس العلماء صاحب اسلام ابراہیمی میں تاخیر کا نقص پیدا کر رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ آپ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی تجویز سے اپنی شریعت کا نام اسلام رکھا۔ اور اپنے پیروان ملت کا نام مسلم۔ مگر قرآن مجید کی بشارت خبر دیتی ہے۔ کہ خدائے سبحانہٗ تعالےٰ نے اس مبارک نام سے آپ کو اور آپ کے پیروان و متبعان ملت کو یاد و مخاطب فرمایا ہے۔ ذیل کا آیہ وافی ہدایہ اس کے ثبوت کو کافی ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۔	ابراہیم (حقیقتاً) نہ یہودی تھے۔ نہ نصاریٰ۔ بلکہ وہ تو خالص مسلمان تھے۔

مندرجہ بالا نصوص قرآنیہ کے رو سے مولوی شبلی صاحب کے یہ دونوں قیاس اور تجاویز (۱) کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل کے الفاظ اَسْلَمْنَا کہنے کے باعث سے۔ اور پھر (۲) شعار تسلیم و رضا پر قائم و مستقل رہنے کی وجہ سے ابراہیمؑ کے پیرو اور متبع مسلم کہلائے بے اصل ثابت ہوئیں۔ اور ثابت ہو گیا۔ کہ حقیقت میں خداوند عالم نے سب سے پہلے آپ کو مسلم اور آپ کے متبعین کو مسلمین کے مبارک نام سے موسوم کیا۔

شریعت اسلامی میں ملت ابراہیمی کے مراسم اسوقت تک محفوظ وموجود ہیں۔

ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں۔ کہ دنیا کے موجودہ مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو باوجود اس کے کہ سب سے آخر میں آیا۔ لیکن اُس کے تمام مذہبی اخلاقی، قومی اور تمدنی احکام میں ابھی تک شریعت خلیل الٰہی کی اتباع اُسی خلوص وعقیدت کیساتھ کی جاتی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اس کے انجام دہی اور تعمیل کے اُصول تعلیم فرما گئے۔ اور اسکے نصاب بتلا گئے تھے۔ علاوہ واجبات حج اور ادائے قربانی کے جو اب صرف اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ومحدود رہ گئی ہے۔ ہم ذیل میں آپ کے احکام اور اسلام کے فرمان نقل کرتے ہیں۔ جو شریعت اسلامی میں اسوقت تک اگر واجبات کا حکم نہیں رکھتے۔ تو استحباب کی اہمیت توضرور رکھتے ہیں۔

(۱) حجامت بنوانا۔ (۲) موچھوں کے لب کٹوانا۔ (۳) مُنہ دھونے کے وقت مسواک کرنا (۴) کھانے کے بعد دانتوں میں خلال کرنا۔ (۵) زیر بغل اور زیر ناف کے بالوں کو مونڈنا۔ (۶) ختنہ کرنا (۷) ناخن ترشوانا۔ اور (۸) غسل جنابت کرنا۔ آجتک اسلام کے مستحبات اور عملیات یومیہ میں داخل ہیں۔ اور آخر طہارت کا حکم (غسل جنابت) تو وجوب کی اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ جس کے بغیر کوئی مسلمان نماز ہی نہیں پڑھ سکتا۔

ان مرقومہ بالا احکام ابراہیمی میں باستثنائے چند۔ ایسے احکام ہیں۔ کہ صرف اہل اسلام ہی اُن عمل پیرا نہیں ہیں۔ بلکہ دُنیا کے تمام قوم وملت کے لوگ۔ اگر اہل اسلام کی طرح مذہبی نقطہ خیال سے نہیں تو اخلاق۔ تہذیب۔ اور حفظان صحت کے لحاظ سے اُن کو ضروری سمجھ کر اُن پر عامل ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ تمدن اخلاق اور تہذیب انسانی کے اوّل موجد اور معلم تھے

حضرت ابراہیم علیہ السلام دین حنیف۔ اور شریعت اسلامی ہی کے صرف موجد اور معلم نہیں ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ تاریخوں سے طبقہ انسانی میں تمدن اخلاق اور تہذیب کے ابتدائی اُصول قائم کرنے والے اور اُن کے طریقہ بتلانے والے بھی آپ ہی پائے جاتے ہیں۔ مراسم اخلاق، اور آئین معاشرت سب سے پہلے آپ ہی نے جاری فرمائے۔ اور تمام دُنیا کی قوموں میں مہمانی۔ ضیافت۔ ذوالقربیٰ ہمسایہ اور دیگر مستحقین کی دعوت کے نیکوترین اور فیاضانہ مراسم کی آپ سے ہی ایجاد ہوئی۔ اکرام ضیف اور ضیافت کے احکام وآداب آپ ہی نے بتلائے سب سے پہلے آپ ہی نے اپنے مال سے زکوٰۃ کی رقم نکالی۔ اور خدا۔ خدا کے رسول اور رسول کے ذوی القربیٰ کے حقوق ہمسایہ۔ فقرء۔ اور مساکین کے استحقاق اور اُنکے مراتب نصاب قائم فرمائے

سب سے پہلے راہ خدا میں ہجرت اختیار فرمائی۔ قوم عملیق مصر سے جہاد فی سبیل اللہ کیا اور ترتیب فوج وتعین منصب تو ابھی آپ کے اولیات میں داخل ہے۔ لباس میں پیراہن اور تہ بند کی ایجاد بھی آپ ہی سے ہوئی۔ اور عبادت الہی کی حالت میں ستر پوشی کے آداب نہایت شدت سے واجب قرار دیئے۔ توحید خالص کی تعلیم آپ ہی سے شروع ہوئی۔ اور اخیر میں انسانی بدعنوانیوں سے ایسی خراب وبرباد ہوگئی۔ کہ آخر اسلام اسی تمام اور انھیں احکام کے ساتھ توحید خالص کی تجدید واحیا کے لئے نازل فرمایا گیا جس سے ملت ابراہیمی کی تصدیق وتوثیق قرآن مجید کے اس آیہ سے کامل طور پر ہوتی ہے

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے۔ مگر وہی جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اور بیشک ہم نے اُن کو دُنیا میں بھی انتخاب کر لیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکار بندوں کے زمرے میں ہوں گے۔

عہد ابراہیمی میں عرب کا بے نظیر تمدن

ان تمام احکام پر غور وتعمق کی نظر ڈالنے سے ہر شخص کو بآسانی معلوم ہوجائے گا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وقت میں تنہا دین الہی ہی کی تعلیم نہیں فرمائی۔ بلکہ اقطاع عالم کے مختلف قوم وقبائل میں اخلاق تہذیب اور معاشرت کے اصول قائم کئے۔ اور آداب وطریقہ تبلائے۔ عہد ابراہیمی کے تاریخی حالات اخبار وآثار عرب سے جہاں تک معلوم ہوئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُسوقت اہل عرب تمدن کے اعتبار سے دوسری قوموں سے کہیں آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ عرب کی تاریخ میں اُن کی ترقی اور فروغ تمدن کا زمانہ خاندان سبا اور سلاطین حمیر کے عہد میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور تاریخ عالم کے مطالعے سے سلسلۂ آل سبا اور بنو حمیر کا زمانہ عہد ابراہیم سے قریب اور متصل پایا جاتا ہے چنانچہ مرحوم سرسید نے ان دونوں سلسلوں کے معاصرین کی مطابقت اور اُس کی تفصیل پوری وضاحت کے ساتھ خطبات احمدیہ میں کی ہے۔ جس کی نقل ذیل میں مندرج کی جاتی ہے۔

جرہم کے بعد اُس کا بیٹا یشجب ابن یعرب تخت پر بیٹھا۔ اُسکے بعد اُسکا بیٹا عبد الشمس ملقب بہ سبائے اکبر تخت نشین ہوا یہی شاہزادہ سلطنت سبا کا بانی ہوا۔ اور اُسی نے شہر سبا اور مارب بسائے اُس کے بعد اُس کے بیٹے حمیر نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

اب چونکہ حمیر قحطان سے چوتھی پشت میں تھا۔ اور ترح (تارخ۔ پدر ابراہیم) بھی قانع سے چوتھی پشت میں تھے اسلئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں۔ کہ حمیر کی اولاد ترح کی پیدائش سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔ یعنی ۱۹۹۶ء دنیوی یا ۲۰۱۲ء ق م میں اُس کی ولادت ہوئی ہوگی۔ ترح کے تین بیٹے تھے۔ (ناحور۔ لوط اور ہاران (پدر لوط) اور

حمیر کے بھی تین بیٹے تھے۔ وائل عوف اور مالک۔ اس لیئے ترح اور حمیر کی اولاد کو ہمعصر ماننا چاہیئے۔ یعنی کہ وہ ۱۹۱۸ دنیوی یا ۲۲۱۵ ق م میں تھے۔ وائل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔ اب اوّل اُس مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً قرار دی گئی ہے۔ لحاظ کرکے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط پسر ہاران پر غور کرکے سکسک اور فاران کی ولادت کی تاریخ قرار دی جانی چاہیئے۔ جو ۱۸۶۷ دنیوی یا ۲۱۲۰ ق م یا تیس برس قبل ولادت حضرت ابراہیمؑ قرار پاتی ہے

خطبات مطبوعہ لاہور ص ۱۷۔

اس مقام پر یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ یہی فاران ابن عوف وہ شخص ہے۔ جو یمن سے علاقہ حجاز میں آیا۔ اور اُس کے گرد و نواح میں آباد ہو کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور جبل فاران اور بیابان فاران جو قدیم آسمانی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اور جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ آلہ الطاہرین کی بشارت نبوت اور تبلیغ رسالت کے خاص مقامات بتلائے گئے ہیں۔ وہ اسی شخص کی طرف منسوب ہیں۔ اور اسی کے نام سے موسوم ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہو گیا۔ کہ بنی حمیر کی سلطنت اور جناب ابراہیمؑ کی تبلیغ رسالت کا زمانہ بالکل قریب تھا۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی کہنا چاہیئے۔ بنی حمیر کی سلطنت میں عرب کی تمدنی حالت دُنیا کے اور ملکوں سے بڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس سے کسی تاریخ بین کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اِس بنا پر عرب میں رسالت ابراہیمی کی تبلیغ کے وقت عموماً اور عرب کے علاقہ یمن میں اُسوقت خصوصاً ملک کی تمدنی حالت پوری ترقی پر تھی۔ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ ذیل میں اُن کی تفصیل نقل کی جاتی ہے۔

تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصّے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسولیبان مرنساوی نے اصول عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک پہونچا ہوا تھا۔ کیونکہ اُصول ارتقا کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہونچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے۔ تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ عرب کے بعض حصّے۔ مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہونچ چکے تھے۔ یورپ کے محققین آثار قدیمہ جنہوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے۔ اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے۔ وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔ (یمن کے شہر قلعوں اور دیگر آثار تمدن و امارت کا ذکر ہے۔ جن کو ہم تفصیل سے اِس کتاب میں اُوپر لکھ آئے ہیں۔)

ان تفاصیل کے بعد تحریر ہے۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے۔ اُن کے لیے عربی زبان میں خاص الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں۔ سکّہ کے لیے ایک لفظ بھی نہیں۔ درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے۔ اور یہ وہی لفظ ہے۔ جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا۔ چراغ ایک معمولی چیز ہے۔ تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا۔ چراغ کو سراج کر لیا۔ پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا۔ مصباح۔ یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنائی جاتی ہے۔ کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ کوزہ کو کوز کر لیا۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں۔ جو آب ریز کا معرب ہے۔ تشت فارسی لفظ تھا۔ اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے۔ پیالہ کو کاس کہتے ہیں۔ یہ وہی کاسہ فارسی لفظ ہے۔ کُرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں یہ بھی فارسی ہے۔ پاجامہ کو سروال کہتے ہیں۔ جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جب ایسے ایسے چھوٹے چھوٹے اشیاء کے لیے لفظ نہ تھے۔ تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی۔ آس پاس کے ممالک کے تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی۔ اس لیے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے۔ اُن ہی اصلی حالت پر تھے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کے زمانہ تک عیش و عشرت کے سامان بہت کم تھے۔ آیۂ حجاب کی شان نزول میں بخاری وغیرہ میں منقول ہے۔ کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور نہ تھی۔ مستورات رفع حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے۔ کہ اسوقت تک چھلنیاں نہ تھیں۔ بھوسی کو پھونک کر اڑاتے تھے بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہ جلتے تھے۔ ابو داؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے۔ کہ میں آنحضرت صلعم کی صحبت میں تھا۔ لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض کا حرام ہونا نہیں سُنا اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں۔ کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ نہیں لازم آتا۔ کہ واقع میں آنحضرت صلعم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی۔ لیکن اس سے اسقدر ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں ہے۔ کہ عرب کھنکھجورا۔ گوہ۔ گرگٹ۔ سیہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔ سیرۃ النبی جلد اوّل ص ۸۵ تا ص ۸۶۔

ملکی زبان میں الفاظ خاص کی کمی ملک و قوم میں عدم تمدن کی دلیل نہیں ہو سکتی

مولوی شبلی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے ثابت ہو گیا کہ یمن اور دیگر اقطاع عرب جو حدود شام و ایران سے قریب واقع ہیں۔ تہذیب و تمدن میں پایۂ کمال حاصل کر چکے تھے۔ اور باعتبار زمانہ کے اُن کی تہذیب و کمال کے ایام عہد ابراہیمی سے بالکل ملے ہوئے تھے۔ جیسا کہ تاریخی اسناد سے اُوپر لکھ آئے ہیں۔ مولوی شبلی صاحب کی اس معترفانہ تحریر سے۔ کہ عرب کے وہ مقامات بھی جو ایران

وشام سے متصل تھے۔ تہذیب و تمدن سے خالی نہیں تھے" میرے مدعا کی پوری تصدیق ہوجاتی ہے۔ کیونکہ جناب ابراہیمؑ کی سکونت کا صدر مقام زیادہ تر ملک شام اور علاقہ فلسطین پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہمارا یہ دعوےٰ کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں کم سے کم عرب کے اُن حصوں میں جو علاقہ شام سے قریب تھے۔ تمدن اور تہذیب ترقی پر تھی جو ملک و قوم کے اخبار و آثار کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے احکام و ارشادات سے بھی ہویدا و آشکارا ہے۔

باقی رہا شبلی صاحب کا عرب کے قدیم تمدن و تہذیب کو خاص مقامات تک محدود کر دینا۔ اور چند الفاظ خاص نہ ہونے کی وجہ سے عربی زبان کی تنگی اور کوتاہی کو تمام عرب کے غیر متمدن قوم ہونے کا باعث بتلانا۔ جیسا کہ وہ اپنی اس بحث کے نتیجہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے۔ تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے۔ ہمارے نزدیک ذرا بھی قابل توجہ نہیں۔

شبلی صاحب کا یہ قیاس اُن کی تاریخی واقفیت کی کمی پر مبنی ہے۔ دُنیا کے تمدن۔ تہذیب اور ترقی کی تاریخیں بتلا رہی ہیں۔ کہ اقطاع عالم میں تہذیب و تمدن کی ابتدا پہلے ایک خاص مقام سے شروع ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ ملک و قوم کے ہر حصہ اور طبقے میں پھیل جاتی ہے۔ اس بنا پر یہ صحیح ہوسکتا ہے۔ کہ شام و ایران سے ملے ہوئے عرب کے حصہ۔ یا یمن اور اُس کے حوالی و مضافات جس طرح اُس زمانہ میں اپنی تہذیب و تمدن میں مشہور تھے۔ ویسے عرب کے اور حصے نہیں۔ مگر یہ بھی مسلّم ہے۔ کہ وہ حصے متمدن اور مہذب علاقوں کے زیر اثر آچکے تھے۔ جس کا باعث آمد و رفت اور کاروبار کے باہمانہ تعلقات ثابت ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ایک حد تک اُن میں بھی تہذیب و تمدن ضرور موجود تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی۔ فرزندان اسماعیلؑ کے وقت میں فتوحات و ملک داری کے ابواب کھل گئے۔ اور مضافات و قیدار۔ ابنائے اسمٰعیلؑ کی نموداریوں نے تمام عرب میں سلسلۂ ابراہیمی اور نسل اسماعیلیؑ کی تہذیب و تمدن کے کمال کا ڈنکا بجا دیا۔ جیسا کہ بہت جلد ہمارے آئندہ سلسلہ بیان سے ظاہر ہوگا۔ اس بنا پر شبلی صاحب کی اس تجویز و قیاس سے کہ عرب میں چند مقامات کے علاوہ۔ کہیں اور تمدن و تہذیب کا نام ہی نہیں تھا۔ تاریخ ملکی و قومی سے اُن کی بے خبری اور عدم واقفیت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اُن کا قیاس کہ زبان عرب میں چند الفاظ خاص نہیں۔ اس لئے اُن کے ملک میں نہ تمدن تھا نہ تہذیب۔ دور از قیاس سمجھا جائے گا۔

اگر تھوڑی دیر تک شبلی صاحب کے اس قیاس اور حسن ظن کو ہم مان بھی لیں۔ تو ہم دیکھیں گے۔ کہ یہ الفاظ عرب کے اُن مقامات میں بھی تو مستعمل نہیں تھے۔ جہاں آپ کے اقرار و اعتراف کے مطابق تہذیب

تمدن پورے کمال تک پہونچا ہوا تھا۔ یعنی قریب شام و ایران رہنے والے عرب بھی تو چراغ کو سراج وغیرہ بولتے تھے۔ تو اِس بنا پر آپ کو اُن کے تمدن و تہذیب سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اِس عبارت تصدیقی نے کہ "جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیئے لفظ نہ تھے۔ تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیئے کہاں سے لفظ آتے" آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ کہ الفاظ تمدن رکھنے پر کسی ملک کے حصول تمدن کے اُصول قایم ہوتے ہیں اور جب یہی اُصول آپ کے مسلمہ ہیں۔ تو دُور دُور والے عربوں کو تو ابھی دور رکھیئے۔ آپ کے تسلیم کردہ متمدن عرب شام و یمن بھی اس اُصول سے بالکل غیر مہذب اور غیر متمدن ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی چراغ کو سراج۔ کاسہ کو کاس۔ شلوار کو سروال وغیر اشالہا کہتے تھے۔ اور اگر آپ کی تحقیق میں اُن کی زبان میں اُن کے لیئے۔ دوسرے الفاظ تھے۔ تو تاریخ و لغت کی کتابوں سے حوالہ دیجیئے۔

علامہ فیروز آبادی کی قاموس اللغات عربی کی تمام کتب لغت میں نہایت مشہور و معروف ہے۔ اُس کے صفحہ ۲۳۹ (مطبوعہ کلکتہ) میں لکھا ہے اَلسِّرَاجُ م (معروف) والشَّمْسُ وَعَلَمٌ اُس کے لغوی معنی آفتاب کے ہوئے۔ لفظ معروف ہے۔ اور اِسم عَلَم ہے۔" شمس العلماء صاحب اب خود تبلائیں۔ کہ آپ کا قیاس کسقدر مضحکہ انگیز ہے۔ عربی لغت سے تو اُس کے اصل زبان کا لفظ معروف (جسکو ہر شخص بلا تامل و تکلف جانتا ہے) ہونا۔ اور اُصول قواعد کروسے اسم عَلَم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر آپ خواہ مخواہ اِسے فارسی کے لفظ چراغ کا مُعرّب تبلاتے ہیں۔ شاید قاموس میں لفظ سراج کے آگے م لکھا ہوا دیکھکر تو اُس کے مُعرّب ہونیکا وہم آپ کو پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیئے قاموس کا مقدمہ پڑھا جاوے۔ اور دیکھ لیا جاوے کہ حرف (م) معروف کی علامت قرار دی گئی ہے۔ یا لفظ مُعرّب کی فاضل فیروز آبادی مقدمہ قاموس کے صفحہ ۴ میں (مطبوعہ کلکتہ) اِن علامات حرفیہ کی تفصیل و توضیح کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

وما سوی ذلك فاقتنيته بصريح الكلام غير مقتنع بتوشيح القلام مكتفيا بكتابة ع د ة ج م عن قولي موضع وبلدة وقرية والجمع ومعروف فتلخص۔

اس کے ماسوا میں نے تصریح کلام کو پیش نظر رکھ کر قلمی تحریر کی خوبی پر قناعت کر کے اپنے اقوال میں حروف ع۔ د۔ ة۔ ج اور میم کی صرف اشارہ و کتابت پر کفایت کی ہے۔ (اس لیئے ع سے) موضع (د سے) بلدہ (ة سے) قریہ (ج سے) جمع (اور میم سے) معروف میرے اقوال میں مراد مخصہ ہے۔"

افسوس ہے۔ کہ شمس العلماء کے ایسا مشہور عالم اور محقق ایسے لفظ معروف کی حقیقت سے بھی واقف نہ ہو اور ادب و لغت کی کتابوں کے خلاف اپنے وہم و قیاس سے کام لے۔

ہم کہتے ہیں۔ کہ الفاظ کی کمی اور زیادتی کو کسی ملک و قوم میں تمدن و تہذیب کے ہونے یا نہونے سے واسطہ

نہیں ہے۔ لٹریچر اور کمال زباندانی کی تاریخ اور تمام اخبار و آثار ادبیات بتلارہے ہیں۔ کہ زبان کی ترقی درستی۔ وسعت اور ترکیب کے مختلف ذریعے ہوتے ہیں۔ انہیں ذریعوں میں سے کسی زبان خاص کا غلبہ و استیلا پا جانا بھی ایک بہت بڑا قوی سبب ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ اس غالب زبان کو مغلوب زبانوں میں داخل ہوجانے کی بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ۔ دو مختلف ملک و قوم کے ساتھ تعلقات۔ کاروبار اور سلسلۂ آمد و رفت بھی اسکا باعث ہوتا ہے۔ ان تمام ذریعوں کو تاریخی واقعات کے علاوہ روزمرہ کے مشاہدات بھی ثابت کر رہے ہیں۔ مثال کے لیئے دیکھا جاوے۔ ممالک مشرقیہ میں زبان سنسکرت تمام زبانوں پر غالب تھی۔ اس کے بولنے والے (ارین) دور و دراز ملکوں میں اپنے فتوحات۔ کاروبار اور آمد و رفت کے مختلف ذرائع رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ زبان قریب قریب تمام اقطاع عالم کی زبانوں میں مل جل گئی تھی۔ یہاں تک یوروپین زبانوں میں بھی خلط ملط ہو گئی۔ اور ایسی کہ آجتک لاٹن۔ گریک۔ اور جرمن زبانوں میں اس کے صدہا الفاظ زبان زد خاص و عام ہیں۔ اور اپنی مادی۔ غیر مادی۔ اصلی اور مصنوعی ترکیبوں اور تلفظ کی مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کے لیئے آجتک علمائے یورپ نے اپنی زبان میں مترادف الفاظ موضوع نہیں کیئے ہیں۔ تو کیا اس باعث سے اُن کی مشہور و معروف تہذیب و تمدن سے بھی انکار کیا جائے گا۔

اسی طرح آجکل یوروپین زبانیں تمام دُنیا کی زبانوں میں داخل ہیں۔ اور قریب قریب دُنیا کے تمام ملکوں میں بولی جاتی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ اول تو یورپ والوں کو فی زماننا بمقابلہ دیگر ممالک و اقوام کے ملک داری میں غلبہ حاصل ہے۔ دوم اُن کو دُنیا کی تمام قوم و ملک کے ساتھ کاروبار اور آمد و رفت کے ذریعہ سے پورا تعلق حاصل ہے۔ یہی دو اصلی اور قوی ذریعہ ہیں۔ جن کے سبب سے یوروپین زبانیں دوسری زبانوں میں مل جل گئی ہیں۔ اس وجہ سے دوسری زبانوں کی تنگی اور ناقابلیت کے معنی لگانا بالکل مہمل ہے۔

پھر زبان عربی پر خاص کر مولوی شبلی کا یہ الزام لگانا تو اور بھی لغو ہے۔ جو اپنی کتاب کے آغاز میں تسمیۂ عرب کے متعلق زبان عرب کی خوبیوں کو بمقابلہ اور السنہ متداولہ کے تسلیم فرما چکے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیئے مولوی صاحب کے کمی الفاظ والے استدلال قیاسی کو مان بھی لیں۔ تو پھر ہم عرض کریں گے۔ کہ زمانہ موجودہ میں تو فی الحال عرب اور اہل عرب کی تہذیب۔ اُن کا تمدن۔ قدیم زمانہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اور فروغ یافتہ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ ٹیلیگراف۔ پوسٹ اور کالسکہ وغیرہ وغیرہ۔ غیر زبانوں کے الفاظ کے لیئے آجتک اپنی زبان کے خاص الفاظ نہ پیدا کیئے گئے۔ بلکہ تلیغراف۔ البوستہ۔ اور الکالسکہ محض تھوڑے سے

تغیر کے ساتھ ویسے ہی الفاظ قائم رہے گئے۔ دو ہزار برس پہلے عرب میں تہذیب و تمدن نہیں تھا۔ الفاظ کی بھی کمی تھی۔ اب تو خدا کے فضل سے کسی کی بھی کمی نہیں۔ پھر الفاظ کی کمی کیوں ہے۔ کیا مولوی صاحب سلطان حسین کے شاہ حجاز تسلیم کر لیے جانے کے واقعات کے بعد بھی عرب اور اہل عرب کو غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کہنے کی جرأت کریں گے۔

عرب سے قطع نظر فرما کر ترکی کی طرف جو فی الحال اسلامی دار المعارف قیاس کیا جاتا ہے۔ توجہ کی جائے تو عرب سے زیادہ یہاں کی ملکی زبان میں یورپ کی مختلف زبانیں جرمنی۔ فرنچ۔ انگریزی۔ یونانی۔ ملقانی اور رومانی مخلوط پائی جائیں گی۔ اس کے ثبوت کے لیے ہمیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ شبلی صاحب نے اپنی کتاب کے آخر میں جو ملک عرب کا نقشہ چھپوا کر لگایا ہے۔ وہ حکومت عثمانیہ کے دفتر نظامیہ سے۔ غالباً سفر قسطنطنیہ کے دوران میں مولف کو ملا ہے۔ اس میں تمام مقامات کے ناموں کے وہی تلفظ ہیں۔ جو یورپین زبانوں سے اُن کے لیے نکلے ہیں۔ بلکہ اکثر مقامات کے قدیم نام جو سابق میں مشہور تھے۔ اُن کی جگہ بھی اپنے نام جو یورپ والوں نے رکھ لیے ہیں۔ مندرج کیے گئے ہیں۔

ترکی سے ایران میں آیئے۔ تو یہاں آتش در کاس۔ اللہ اللہ کبھی اس کے عروج و اقتدار کا وہ زمانہ تھا کہ عراق۔ ماوراء النہر۔ اور وسط ایشیا سے لے کر کابل و ہندوستان تک اور پھر ہندوستان سے لیکر جزائر بحر ہند۔ جاوا اور بخارا تک فارسی ہی فارسی تھی۔ اور آج اس کے زوال و ادبار کی یہ عبرتناک صورت ہو رہی ہے۔ پھر دیگر ممالک کا کیا ذکر۔ خاص ایران اور تمام علاقہ فارس کی زبان میں نصف سے زائد ترکی اور روسی الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔

کیا شبلی صاحب ترکی اور ایران میں غیر زبانوں کے مخلوط ہو جانے کو اب بھی اُن کے تمدن اور تہذیب کی کمی پر محمول فرمائیں گے۔ شبلی صاحب یہ اُن زبانوں کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی کوتہ فہمی۔

کعبہ معظمہ بالتحقیق بیت العتیق ہے

اسلام کی کوئی ادا نہ یہودیوں کو پسند ہے۔ نہ عیسائیوں کو یہودیوں کو تو اُن کی کمزوری اور زمانہ کی پامالی گلوگیر ہو رہی ہے۔ مگر عیسائیوں کا عروج ہے۔ اور اقتدار۔ وہ کیوں چپ رہیں۔ قرآن مجید نے کعبہ کو بیت العتیق بتلایا ہے۔ دونوں اعتبار سے کہ اس میں جس نے پناہ لی۔ وہ مامون و محفوظ ہو گیا۔ اور نیز اس وجہ سے کہ خدا کا سب سے پہلا گھر دنیا میں یہی بنایا گیا اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا پہلا گھر جو بندوں کی عبادت خدا کرنے کے لیے مکہ مبارکہ میں بنایا گیا۔

حالانکہ نزول قرآن سے پہلے کی رومی اور یونانی تالیفات و تصنیفات اس کی قدامت کی تصدیق

کر چکی ہیں۔ اور اُن کی تصدیقی عبارتوں کو ایک بار نہیں ہزار بار یہ حضرات بر آۃ العین مشاہدہ بھی فرما چکے ہیں۔ مگر تاہم اِس معویانہ اور متعصبانہ کوششوں میں کہ اُس کی قدامت کسی طرح بیت المقدس سے زیادہ قدیم نہ ثابت ہونے پائے۔ وہ طرح کی بے اصل تاویلیں اور لغو دلیلیں پیش کیا کرتے ہیں صاحب ارض القرآن۔ مسٹر ڈوزی (M. R. Doze) کے ایسے فاضل مستشرق اور محقق جو جرمن پروفیسرز میں جامع علوم و فنون مانا جاتا ہے۔ ایک عجیب و غریب اور مضحکہ انگیز رائے جو اُس نے کعبہ کے متعلق تحریر کی ہے۔ نقل فرما کر نہایت متانت اور سنجیدگی سے اُن کی غلط فہمی کی ترمیم و تصحیح فرماتے ہیں۔ اُن کی عبارت حسب ذیل ہے۔

مسٹر ڈوزی جو عربی کا بہت بڑا عالم جرمنی میں گذرا ہے۔ اُس نے مکہ میں بنی اسرائیل کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے۔ کہ بنی اسرائیل شام سے بھاگ کر حجاز کے شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اور کعبہ انہیں کا بنایا ہوا معبد ہے۔ جسکو انہوں نے ہبل (بعل) دیوتا کے نام سے جس کو وہ اکثر گمراہی کے زمانہ میں پوجا کرتے تھے تعمیر کیا تھا۔

عربوں میں اسی دیوتا کا نام ہبل مشہور تھا۔ اور جو محمدؐ کے زمانہ تک خانہ کعبہ میں نصب تھا۔ پروفیسر ڈوزی کی تاریخ مسلمان اسپین کا مقدمہ ترجمہ انگریزی۔

صاحب ارض القرآن کی رائے۔

پروفیسر موصوف کے اس نظریہ سے گو جرمنی کے اکثر یہودی علما میں بر افروختگی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس رائے میں صرف جزوی ترمیم چاہتے ہیں۔ مکہ میں بنی اسرائیل نہیں۔ بلکہ اسرائیل کے عم زاد بھائی بنی اسمٰعیل آکر آباد ہوئے تھے۔ اس گھر کو اسرائیل نے نہیں۔ بلکہ اُن کے دادا ابراہیم نے تعمیر کیا تھا۔ وہ ہبل کے نام سے نہیں بلکہ خدائے عزوجل کے نام سے بنایا گیا تھا۔ ارض القرآن جلد دوم ص ۲۰۰۔

افسوس ہے۔ کہ پروفیسر ڈوزی کے تبحر علمی کی یہ شہرت اُن کی تاریخی واقفیت کی یہ حقیقت۔ کہ آج تک پروفیسر صاحب کو مکہ اور مدینہ کا فرق اور امتیاز بھی معلوم نہیں۔ عدم واقفیت کی یہ صورت ہے۔ کہ پروفیسر صاحب اتنا نہیں جانتے۔ کہ گریختگان بیت المقدس حملات بخت نصر سے عاجز آکر یثرب (مدینہ منورہ) پناہ گزیں ہوئے تھے۔ یا مکہ میں اقامت گزیں۔ نہیں معلوم کہ پروفیسر صاحب کی دُنیا سے یہ نرالی ترکیب کی تحقیق کہ کعبہ اُنہیں کا بنایا ہوا معبد ہے۔ کس تاریخ سے ماخوذ ہے۔ اگر سچے ہوتے تو پروفیسر صاحب اپنی تحقیق کی سند پیش کرتے۔ مگر اُنہوں نے کوئی سند پیش نہیں کی۔ اس لیئے یہ اُن کی ایک متعصبانہ اور محض گمراہانہ تحریر ہے۔ جس پر نہ کوئی توجہ کی جا سکتی ہے۔ اور نہ اُسکا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔

مسلمان تو بحمد اللہ اس سے کسی طرح متنبہ ہوہی نہیں سکتے۔ پروفیسر صاحب کے خلاف اُمید۔ یہود آن جرمن بھی جیسا کہ صاحب ارض القرآن کا بیان ہے۔ ان کی اس انوکھی تحقیق سے بحید خفا ہو کر ان کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی دانست میں تو کی اُن کی خیر خواہی۔ مگر وہ۔ افسوس کہ اُلٹ کر بد خواہی ثابت ہوگئی۔ پروفیسر صاحب سمجھ لیں۔ کہ یہ جھوٹ بولنے کا نتیجہ ہے

ایسی ہی سر ولیم میور صاحب کو بھی اولٹی سوجھی تھی۔ سرسید مرحوم نے اُنکی بھی اصلاح کردی خطبات احمدیہ کی مفصلۂ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مورخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مسٹر گبن (Mr: Gibbon) جیسا کہ وہ نہایت مشہور مورخ ہے۔ ویسا ہی نہایت بڑا عالم اور فلسفی ہے۔ اُس نے اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے۔ کعبہ کی صحیح قدامت سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے۔ ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس Diedratus یونانی مورخ نے تھموتت (ثمود) اور سبیین (صبائین) کے بیان میں ایک مشہور و معروف معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے۔ جس کے اعلےٰ درجہ کے تقدس کی تمام اہل عرب تنظیم کرتے تھے۔" (قدامت الیہود) اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں (یہ یونانی مورخ بہت قدیم ہے) کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلےٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تنظیم کرتے تھے۔ تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت ہی قدیم زمانہ (ابراہیمؑ کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیئے۔

سر ولیم میور صاحب (Sir. W. Muir) اس پر ایک معترضانہ تقریر لکھتے ہیں۔ کہ جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے۔ اُس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اُس کے تمام مراسم کی ابتدا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے ہے کیونکر قیاس ہو سکتا ہے۔ عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی۔ بلکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے بہت پہلے اہل مکہ کی عام رائے تھی۔ ورنہ قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اُسکا ذکر نہ ہوتا۔ اور نہ بعض مقامات کے نام جو تمام کعبہ کے گرد و نواح میں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے متعلق کیے جاتے۔ جیسا کہ وہ متعلق کئے گئے ہیں۔ (سورس لائف آف محمدؐ)۔

مگر ہم (مولف خطبات احمدیہ) سمجھتے ہیں۔ کہ سر ولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے۔ جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے۔ اُس سے عرب کی اُس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پیشتر اہل عرب تسلیم کرتے تھے۔ کہ کعبہ کو اور اُن تمام مراسم کو جو کعبہ سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ابراہیمؑ سے تعلق ہے۔ اُس کی صحت اور اصلیت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو کیا وجہ تھی۔ کہ اہل عرب نے اور بنی جرہم اور عرب کی تمام مختلف قوموں نے اسکو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے منسوب

لی تھا عرب ایک بت پرست قوم تھی۔ اور ابراہیمؑ بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھے۔ اس لیئے ضرور تھا۔ کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے نفرت کرتیں۔ اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیمؑ یا اسمٰعیلؑ سے منسوب نہ کرتیں۔ باوجود اس مغائرت اور منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرلینا کہ کعبہ اور اُس کے تمام مراسم کو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تعلق ہے۔ علانیہ اُس کی صحت و اصلیت کی دلیل ہے۔ نہ اُس کے برخلاف۔ جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے۔ اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے بیشتر بطور حقیقت مسلّمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا۔ ہمارے لیئے دلیل ہے۔ نہ ہمارے مخالف کے لیئے۔ خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور ص (۲۰۷)

حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ ابن حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ

جناب اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے صاحبزادے اور اولاد اکبر تھے۔ بڑی دعاؤں اور تمناؤں والے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ ایک مدت مدید تک حضرت سارہ کے بطن سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس محرومی سے دونوں بزرگوار از حد ملول رہتے تھے۔ اور اس نعمت کے حصول کے لیئے ہمیشہ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا رہتے تھے۔ چونکہ ظہور حکم قدرت اور صدور امور مشیت کے لیئے خاص وقت مقرر ہوتے ہیں۔ اس لیئے ان حضرات کی اجابت دعا اور حصول تمنا میں تاخیر تھی۔ اسی عالم میں سارا کو حصول اولاد کی طرف سے ایسی مایوسی ہوگئی۔ کہ آخر کار اُنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے کمال محبّت و الفت کے تقاضہ سے۔ جناب ہاجرہ کے ساتھ مزاوجت فرمانے کی اجازت دیدی۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ سارا کی یہ اجازت۔ خلاف فطرت نسوانی۔ بہت بڑا ایثار تھی۔ اجازت دینے کے وقت سارا کا ابراہیمؑ سے یہ کہنا شاید مجھ سے نہیں۔ اُنھیں (ہاجرہ) سے خدائے سبحانہ تعالیٰ تمہاری نسل کو جاری اور قایم فرمائے۔ اپنی طرف سے کمال مایوسی اور حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اُن کے مفرط درجہ کے اخلاص و محبّت ثابت کرتا ہے۔

حضرت ہاجرہ شرف مزاوجت پر فائز ہوئیں۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ اُن کے بطن سے پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیلؑ نام رکھا گیا۔

اسماعیلؑ کی وجہ تسمیّہ اسماعیلؑ کی وجہ تسمیّہ کے متعلق عربی مؤرخین اور عموماً تمام مستشرقین یوروپ متفق ہیں۔ کہ اسمٰعیلؑ ابراہیمؑ کی دُعا سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ تورات سفر تکوین۔ آیت ۱۷ و ۱۸ میں ہے۔

اسحاق خدا کے وعدے اور عہد کا مظہر ہے۔ اور اسماعیل ابراہیم کی دُعا کا یعنی باپ کی دُعا سے پیدا ہوئے۔ اس بنا پر اسمٰعیل نام ہوا۔ جو دو لفظوں سے مرکب ہے۔ سمع اور ایل سے۔ سمع کے معنی سُننے کے ہیں۔ اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی ابراہیم کی دُعا خدا نے سن لی۔

اسمٰعیلؑ کے متعلق توراۃ کی متواتر بشارتیں

توریت کتاب اوّل از آیت ۲۰ تا ۲۵ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عظمت و تقدیس کی نسبت مفصلہ ذیل بشارتیں مندرج ہیں۔

خدا نے ابراہیم سے کہا کہ اسمٰعیل کے بارے میں میں نے تیری دُعا سُن لی۔ ہاں میں نے اُسے برکت دی۔ اور اُسے بارآور کیا۔ اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اُس سے بارہ سردار (امام) پیدا ہوں گے۔ اور میں اُسکو ایک بڑی قوم کروں گا۔

مندرجہ بالا توراۃ کی عبارت والفاظ الہامی سے۔ جناب اسمٰعیل کی ولادت بشارت الٰہی کے متعلق ہونا پوری طور سے ثابت ہوگیا۔ اور آپ کا پاکیزہ وجود۔ پاکیزہ خلقت کی عظمت اور قدر و منزلت کماحقہ ظاہر ہوگئی۔ اور پھر ایسے صحیح اسناد اور قوی شہادت کے طریقہ سے۔ کہ عرب کے مورخین کا کوئی قول یا اُن کی کوئی قومی روایت اس کے متعلق نہیں لکھی گئی ہے۔ جو کچھ ہے۔ وہ توراۃ کے مقدس الفاظ و عبارت سے ہم اسی سلسلہ میں توراۃ سے ایک دوسری بشارت بھی نقل کرتے ہیں۔ کتاب اول (تکوین) آیت ۱۲-۱۳ و ۲۰ میں ہے۔

ابراہیم سے خدا نے کہا۔ کہ تیری نظروں میں بُرا نہ معلوم ہو۔ اِس لڑکے اور اِس لونڈی کی وجہ سے۔ جو کچھ تجھے سارا کہتی ہے۔ اُس کی بات مان لے۔ کیونکہ اسحاق سے تیری نسل کہلائے گی۔ اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی۔ میں ایک قوم کرونگا۔ کیونکہ وہ بھی تیری ایک نسل ہے۔

اسحاقؑ کی اسماعیلؑ پر ترجیح کا غلط مسئلہ

یہود تو یہود۔ عیسائی بھی اُن کے دیکھا دیکھی اور کچھ اپنی حسد و نفسانیت اور مخالفت اسلام کے باعث سے بھی ایسی صاف اور روشن بشارتوں کی موجودگی میں بھی۔ کہتے ہیں۔ کہ خدا نے اسماعیلؑ سے یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ اُس کی اولاد میں بارہ سردار ہونگے۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ ۱۲ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا بارہ سرداروں کے تھے۔ پیدا ہوئے۔ اور جس برکت دینے کا وعدہ اسمٰعیلؑ سے کیا گیا تھا۔ وہ دنیاوی برکت تھی۔ روحانی برکت نہیں مراد تھی۔ مگر یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں۔

ہر ایک منصف مزاج ان آیتوں کو پڑھکر معلوم کرلیگا۔ کہ ان میں جدا جدا تین لفظ استعمال ہوئے

ہیں۔ اوّل یہ کہ میں نے اس کو برکت دی۔ دوم یہ کہ میں نے اُسے بار آور کیا۔ اور بہت کچھ فضیلت دی سوم یہ کہ میں اُسکو بڑی قوم کروں گا۔ اب ہم پوچھتے ہیں۔ کہ ان آیتوں میں جدا جدا تین لفظوں اور فقروں کے ایک ہی معنی ہیں۔؟ یعنی اولاد کا زیادہ ہونا۔ اب مساوات کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

حضرت اسحاقؑ جب بیر شبع پر پہونچتے ہیں۔ تو خواب میں خدا اُن سے فرماتا ہے۔

اے اسحاقؑ میں تیرے باپ کا خدا ہوں۔ تو مت ڈر۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ میں تجھکو برکت دونگا۔ اور اپنے بندے ابراہیمؑ کے سبب سے تیری نسل کو بہت کرونگا۔ توراۃ۔ تکوین۔ ۲۰۔ ۲۴۔

جس مضمون کا وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا گیا۔ اور جو لفظ برکت کا اسمٰعیلؑ کے وعدے میں استعمال کیا گیا اسی مضمون کا وعدہ اسحاقؑ سے بھی کیا گیا۔ اور وہی لفظ برکت کا اسحاقؑ کے وعدے میں بھی کہا گیا۔ پھر یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے۔ کہ اسمٰعیلؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ دنیاوی تھا۔ اور اسحاقؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ روحانی تھا۔

اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے۔ کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ توراۃ میں ہے۔

جب ابراہیمؑ کنعان میں پہونچے۔ تو خدا نے اُن سے کہا۔ کہ یہ زمین جو تو دیکھتا ہے۔ میں تیری اولاد کو دوں گا۔

(تکوین باب ۱۲۔ آیت ۷)

پھر جب حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ سے جدا ہوئے۔ تو پھر خدا نے ابراہیمؑ سے کہا کہ:۔

اے ابراہیمؑ آنکھیں کھول۔ اور چاروں طرف دیکھ کہ یہ زمین جو تو دیکھتا ہے۔ تیری اولاد کو دونگا۔ اور تیری اولاد کو زمین کی ریت کے مانند کرونگا۔ جو کوئی ریت کو گن سکے۔ تو تیری اولاد کو بھی گن سکے گا۔ (تکوین باب ۱۳ آیت ۱۵)

پھر خدا نے ایک بار ابراہیمؑ سے کہا:۔

خدا نے ابراہیمؑ سے پختہ وعدہ کیا۔ کہ تیری اولاد اتنی ہوگی۔ جتنے آسمان کے تارے۔ جنکو کوئی گن نہیں سکتا۔ (تکوین باب ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔۔ ۲۰)

پھر خدا نے ابراہیمؑ سے ارشاد کیا:۔

خدا نے ابراہیمؑ سے وعدہ کیا۔ کہ یہ زمین۔ مصر کے دریا سے فرات کے دریا تک تیری اولاد کو دونگا (تکوین باب $\frac{15}{18}$)

جب ابراہیمؑ ننانوے ۹۹ برس کے ہوگئے۔ تو خدا نے اُن سے کہا:۔

مجھ میں اور تجھ میں وعدہ ہوتا ہے۔ کہ میں تجھ کو زیادہ سے زیادہ کرونگا۔ تو بہت سی قوموں کا باپ ہوگا۔ تجھ سے قومیں پیدا ہونگی۔ تجھ سے بادشاہ نکلینگے۔ اور تیری اولاد سے بھی یہ ہمیشہ کا عہد ہوگا۔ اور کنعان کی زمین تو تجھے وراثت دائمی میں دونگا۔ (تکوین باب ۱۷۔ آیت ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸)

یہ تو وہ وعدے تھے۔ جو خدا نے ابراہیمؑ سے کئے تھے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ خدا نے اسحاقؑ ویعقوبؑ سے کیا کیا وعدے کئے تھے۔

معراج یعقوبؑ کے ذکر میں توراۃ کا بیان ہے :-

جب یعقوبؑ بیر شبع سے حاراان کی طرف روانہ ہوئے۔ تو ایک مقام پر پتھر سرہانے رکھکر سو گئے۔ خواب میں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک سیڑھی آسمان تک لگی ہوئی ہے۔ اور خدا کے فرشتے اُس پر چڑھتے اُترتے ہیں۔ اُس (سیڑھی) پر خدا نے کھڑے ہوکر کہا۔ کہ میں تیرے باپ ابراہیمؑ و اسحاقؑ کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو سوتا ہے۔ تجھکو اور تیری اولاد کو دیتا ہوں تیری اولاد زمین کی ریت کی برابر ہوگی۔ اور چاروں طرف پھیلے گی۔ (تکوین باب ۲۸- آیت ۱۲-۱۳-۱۴)

زبور داودی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ خدا نے ابراہیمؑ سے جو وعدہ اور عہد کیا تھا۔ وہی بعد کو بھی قائم رہا۔ اور وہ صرف کنعان کی زمین دینے کا وعدہ تھا۔ چنانچہ زبور میں خدا کا کلام اسطرح لکھاہے جو عہد میں نے ابراہیمؑ سے کیا۔ اور اسحاقؑ سے اُسکی قسم کھائی۔ اور یعقوبؑ کے ساتھ بمنزلہ قانون مقرر کیا۔ اور اسرائیل سے عہد دائمی کیا۔ اور کہا۔ کہ زمین کنعان تجھے دیتا ہوں۔ تاکہ تیری میراث کا حصہ ہو۔ (زبور آیات ۱-۵-۹-۱۰-۱۱)

اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ اسی وعدے کا پورا کرنا خدا نے بتلایا تھا۔ اسکی نسبت توراۃ میں لکھاہے جب حضرت موسیٰ موآب کے جنگل میں۔ نبّو پہاڑ پر چڑھے۔ جو یریحو کے سامنے ہے۔ تو خدا نے موسیٰ سے کہا۔ کہ یہ وہ زمین ہے جس کی نسبت میں نے بقسمیہ ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ تمہاری اولاد کو دونگا۔ پس یہ زمین میں تجھے آنکھوں سے دکھلا دیتا ہوں۔ مگر تو وہاں نہیں جانے کا (کتاب پنجم باب ۳۴-۴)

الغرض۔ یہ تمام وعدہ جو خدا نے ابراہیمؑ۔ اسحاقؑ۔ اور یعقوب سے کئے تھے۔ ہم نے منتخب کرکے۔ ہر منصف مزاج پڑھنے والے کے سامنے رکھدیئے ہیں۔ اب اسکے ہم دو سوال کرتے ہیں۔

اوّل یہ کہ جو وعدے خدا نے ابراہیم کی اولاد کے لیئے کئے ہیں۔ وہ وعدے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کے حق میں کیوں نہیں سمجھے جائیں گے۔ حالانکہ خود خدا نے بھی کہاہے۔ کہ اسماعیلؑ بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہے۔ جیساکہ تکوین باب ۱۱-۱۲- میں مذکور ہے۔ اور بہت بڑی دلیل مشترک ہونے کی یہ ہے۔ کہ بشارات کے تمام الفاظ عموماً اولاد کا لفظ خاص بتلاتے ہیں۔ جس سے اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ بدرجہ اولا اور تمام اولاد ابراہیمی بمرتبہ اخریٰ مشترک اور شامل سمجھی جائے گی۔ ان بشارتوں سے خاص اولاد اسحاقؑ بتلانے والوں کو لازم ہے۔ کہ اپنی اس تخصیص کے لیئے وہ مرقومہ بالا عبارات توراۃ میں پہلے خاص اسحاقؑ یا آل اسحاقؑ کا نام لکھا ہوا ثابت کریں۔ بغیر اِس کے وہ ہرگز تخصیص ثابت نہیں کرسکیں گے۔ ہمیشہ اِس سے تعمیم ہی مراد ہوگی۔ جو عین مدعائے الہام ہے۔

دوم یہ کہ جو وعدہ خدا نے اسحاقؑ و یعقوبؑ سے کیا تھا یعنی ملک کنعان کا دینا۔ اور اولاد کا زیادہ کرنا ان میں وہ کیا ایسی چیز ہے۔ جس سے یہ روحانی قسم کا وعدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جو وعدہ اسمٰعیلؑ کی نسبت کی گیا ہے۔ اُس میں کس چیز کی کمی ہے۔ جس سے وہ دنیاوی سمجھا جاوے۔

جو لوگ انصاف سے ان باتوں پر نظر کرتے ہیں۔ وہ بہ یقین جانتے ہیں۔ کہ خدا نے اسحاقؑ سے بھی برکت کا وعدہ کیا۔ اُن کی اولاد میں انبیاء پیدا ہوئے۔ ملک فتح کئے۔ کنعان بھی فتح کیا۔ اسیطرح اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بھی۔ جیسا کہ خدا نے اُن سے بھی برکت کا وعدہ کیا تھا۔ پہلے شعیبؑ۔ پھر ایوبؑ اور سب سے آخر پیغمبر آخر الزمان (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پیدا ہوئے۔ تمام دنیا اُس کی برکت سے بھر گئی۔ اسمٰعیلؑ کی اولاد نے بھی ملک فتح کیے۔ کنعان کو جو غیر خدا پرستوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ پھر فتح کیا۔ اور پھر ابراہیمؑ ہی کی نسل میں اُس ورثہ کو لے آئے۔ اور جب تک خدا کی مرضی ہے۔ وہ ابراہیمؑ کا ورثہ اُن کے حصہ میں رہے گا۔ اگرچہ بقائے اصلی صرف خدا ہی کی ذات کو ہے۔ اِلَّا کُلُّ شَیْئٍ خَلَا اللّٰہِ زَائِلٌ۔

یہ بحث ہم نے مرحوم ڈاکٹر سر سیدؒ کی خطبات احمدیہ سے نقل کی ہے۔ سر سیدؒ کے اس مختار سے ہمیں وہیں تک اتفاق ہے۔ جہاں تک لائق مصنف نے حضرت اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ کی رُوحانی عظمت و اقتدار اور ذاتی شرف و افتخار میں باہمی مساوات ثابت کی ہے۔ اور مخالفین اسلام کی اُن تاویلات مہملہ اور توہمات باطلہ کی تردید فرمائی ہے۔ جو اپنے تعصب مذہبی اور نفسانیت ذاتی کی بنا پر خواہ مخواہ حضرت اسحاقؑ کو جناب اسمٰعیلؑ پر ترجیح دیے جانے کے لیئے دیئے جاتے ہیں۔ ہاں مجھکو سید صاحب کے موجودہ مختار میں اُن مطالب و مقاصد سے ہرگز اتفاق نہیں ہو سکتا۔ جن کو اُنہوں نے اپنی تحقیق کی کمی۔ محققین یورپ کی بیجا تقلید اور بے ضرورت عقیدت کی وجہ سے تحریر فرمائے ہیں۔ جن کی تنقید و تصحیح بہت جلد ہمارے سلسلہ بیان سے ظاہر ہو گی۔

مرحوم سید صاحب مخالفین اسلام کو اتنا بتلانا ضرور سہو فرما گئے ہیں۔ کہ شواہد مرقومہ بالا کچھ احکام ربانی اور الہام یزدانی ہونے کا تنہا شرف نہیں رکھتے۔ بلکہ اُس وقت سے لیکر اسوقت تک تاریخی واقعات میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ فی الحال اولاد اسحاقؑ و اسماعیلؑ سے کرۂ زمین کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ خالی نہیں بتلایا جا سکتا۔ اور اُن کی لاتعداد کثرت اولاد میں شمار کر کے کوئی یہ نہیں بتلا سکتا کہ اسحاقؑ کی اولاد زیادہ ہے۔ یا اسمٰعیلؑ کی۔ تو پھر اسمٰعیلؑ کی اولاد اسحاقؑ کی اولاد کے مقابلہ میں کیسے کم سمجھی جائیگی اور پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اسحاقؑ کے ساتھ جو وعدہ برکت تھا۔ وہ روحانی تھا۔ اور جو اسمٰعیلؑ کے ساتھ تھا۔ وہ دُنیاوی تھا۔

توراۃ کی مذکورۂ بالا بشارتیں۔ جو حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے صاحبزادوں کے متعلق ابواب و اسفار کے آیات میں متواتر مرقوم ہیں۔ صاف صاف بتلارہی ہیں۔ کہ باعتبار ذاتی اقتدار و عظمت اور افتخار و منزلت اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ دونوں حضرات مساوی فی الدرجات ہیں۔ اور ایسے کہ ایک چنے کی دو دال۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی پرورش

یہاں تک ہم اوپر لکھ کر بتلاتے ہیں۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ جناب ابراہیمؑ کی خاص دُعا سے پیدا ہوئے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اور بالکل اصول فطرت کے مطابق کہ جس ماں باپ کے ہاں ایسا ارمانوں والا بچہ ہو گا۔ وہ اُنکو کتنا عزیز ہو گا اور پھر وہ بچہ بھی کیسا۔ جس کی عظمت اور فضیلت کی خبر بشارت خداوندی پہلے سے دے چکی ہو۔ جس کی مقدس نسل سے بارہ سردار (امام) پیدا ہونے والے ہوں۔ جس کی مبارک صُلب سے عظیم ترین قوم وجود میں آنیوالی ہو۔ جس کی نمود اراولاد ارض اللہ کی وارث ہونے والی ہو۔ اور اقوام و ممالک مختلفہ پر حکمرانی کرنے والی ہو۔ اور جہانبانی۔ جس کے اعقاب و اخلاف سے مشاہیر اور اکابر، علماء و فضلا۔ صلحا اور عقلا وجود پذیر ہونے والے ہوں۔ اور ان سب کے علاوہ اُسی کی مقدس نسل اُسی کی مطہر صُلب سے۔ رسالت کا خضر آخر۔ نبوت کا ستم۔ اور دعوت الٰہی کا خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہور پذیر ہونے والا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ خدا کے برحق رسولؐ تھے۔ اور سچے پیغمبر۔ وہ اسمٰعیلؑ اور اُن کے اعقاب و اخلاف متعلق منجانب اللہ بشارت پا چکے تھے۔ ان تمام اُمور سے واقف ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے دل میں ایسے ذی قدر اور عالی منزلت صاحبزادے کی کیسی اور کتنی محبت ہو گی۔ اس کے بیان اور اندازہ کی ضرورت نہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ سترہ برس تک اپنے والد بزرگوار کے دامن عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ اور اپنی والدہ گرامی قدر کے آغوش مبارک میں آرام و آسائش ان کی خاطر داری اور اور ناز برداری کچھ ابراہیمؑ و ہاجرہ ہی تک موقوف نہیں تھیں۔ بلکہ ولادت اسحاقؑ کے پہلے حضرت سارہ کے اشفاق و توجہ بھی ایسی ہی تھی۔ مگر مشیت کو اسمٰعیلؑ سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اور اُسکے تامحدود نظام کو اُن کے ذریعہ سے اُس قطعۂ زمین کی آبادی منظور تھی۔ جہاں انسانی بود و باش کا تصور بھی گویا اُس وقت محالات و ناممکنات سے تھا۔ اس ضرورت سے خدائے مقلّب القلوب نے حضرت سارہ کے دل میں ولادت اسحاقؑ کے بعد ہی اسمٰعیلؑ کی طرف سے محبت کی جگہ نفرت پیدا کر دی۔ اور ان کے خصائص ذاتی کو اُسوقت بالکل معمولی طبیعت کے انداز و پیمانہ پر معطوف فرما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے حالات میں اُوپر قلم بند ہو چکا ہے۔ کہ بالآخر حضرت ابراہیمؑ نے سارہؑ کے

اصرار پر اصرار اور خدا کے ارشاد و استرضا کے مطابق اسمٰعیلؑ اور اُن کی ماں کو بادل گراں اور باچشم گریاں شہر کنعان سے مکہ معظمہ پہونچا دیا۔ مگر کس حال میں؟ حزن و ملال کے ایسے نامحدود اور غیر متحمل عالم میں کہ کسی طرح اپنی محترم بی بی اور مغتنم فرزند کی مفارقت کا صدمہ برداشت کے قابل نہیں تھا۔ مگر رضاً بقضائہٖ وتسلیماً لامرہٖ کے اصول مسلمہ پر قائم رہ کر اُن کی جاں گزا مفارقت پر صبر کر لینا تھا۔ چنانچہ آپ کے اس صبر و شکیبائی کی تصدیق توراۃ نے ان الفاظ میں فرمائی۔

سارہ کی یہ فرمائش بی بی اور بچہ کی خاطر سے ابراہیمؑ کو سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ اور خدا نے اُسی وقت یہ کہکر ابراہیمؑ کی تسکین وتسلی فرمائی۔ کہ سارہ کا کہنا۔ تم کو بی بی اور بچہ کی خاطر سے ناگوار نہ ہونا چاہیے۔

ذبح اسمٰعیلؑ کا واقعہ

مکہ میں سکونت فرما ہونے کے وقت سے لیکر واقعۂ قربانی تک کے سارے واقعات پوری تفصیل سے جناب ابراہیمؑ کے حالات میں اُوپر درج ہو چکے ہیں۔ اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ قربانی کا واقعہ جناب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے زمانہ کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ اور ان دونوں حضرات کے کمال معارف اور انتہائے صبر و رضا کا عدیم النظیر کارنامہ جس کی تفصیل بھی تمہید اعہد ابراہیمی میں اُوپر بیان ہو چکی ہے۔ مگر اُس کے متعلق ایک تحقیق تنقیح طلب ہے۔ اور وہ میرے لیئے نہایت ضروری ہے۔

قربانی کا مسئلہ قدیم سے اسلام اور غیر اسلامی مذاہب میں مختلف فیہ چلا آتا ہے۔ یہود اور اُن کی کورانہ تقلید اور متعصبانہ تائید میں عیسائی اسحاقؑ کو ذبیح قرار دیتے ہیں۔ اور اسلامی مورخین علی الاکثر اسمٰعیلؑ کو مخالفین اسلام تو واقعہ ذبح کے متعلق اسمٰعیلؑ کا ضمناً و کنایتاً نام بھی نہیں لیتے۔ مگر اسلامی مورخین ومحدثین میں اس کی نسبت دو فرقہ ہو گئے ہیں۔ ایک اسحاقؑ کو ذبیح اللہ بتلاتا ہے۔ دوسرا اسمٰعیلؑ کو ان باہمانہ اختلاف سے غیر اسلامی مورخین کے غلط استدلال میں قوت آگئی ہے۔

اسوجہ سے ڈاکٹر سر سید احمد خاں حضرت اسحاقؑ کو ذبیح اللہ لکھتے ہی نہیں۔ بلکہ ضرورت سے زائد مصر ہیں سید صاحب کے اس مختار پر جہاں تک نظر ڈالی گئی ہے۔ اور غور کیا گیا ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے غلط اصرار کے تقاضہ سے خطبات احمدیہ کے متواتر مقامات پر زیب قلم فرمایا ہے۔ یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ اُن کی اس رائے کی بنا اسلامی مورخین و محدثین کے مختلف مرویات پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام تر توراۃ کی عبارات اور یہود و نصاریٰ کی تحقیقات اور یکطرفہ فیصلہ جات پر قائم ہے۔ اور چونکہ سید صاحب کا استدلال ہمیشہ سے کتب قدیمہ اور غیر اسلامی مورخین و محققین کے اخبار و آثار سے مستنبط و مستخرج ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ سے اُنھیں کے اقوال و اسناد کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ اس لیئے انہوں نے واقعہ قربانی میں بھی

حضرت اسحاقؑ ہی کو ذبیح اللہ تسلیم کر لیا۔

سید صاحب کی اس غلط فہمی کی ہم پیچھے اصلاح و ترمیم کریں گے۔ ابھی ہم غیر اسلامی اقوام کے اس دعوے کی کہ اسحاقؑ ہی ذبیح اللہ حقیقی ہے۔ تردید و تنقید پیش کرتے ہیں۔ اس بحث پر مولوی شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ میں جو محققانہ رائے قائم کی ہے۔ اُس سے ہم کو پورا اتفاق ہے۔ اور ہم اُسی کی نقل کو اپنے دعوے کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ اُن کی عبارت منقول عنہ یہ ہے۔

ذبیح کون ہے

توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط۔ اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے۔ اور خصوصاً حضرت خاتمؐ کے متعلق اُس میں جو تصریحات یا تلمیحات تھیں۔ یہود کے دست تصرف نے اُن کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحاقؑ کا ذبیح ہونا لکھا ہے۔ لیکن سطا رے کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں۔ کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے۔ اور نہ ہو سکتے تھے۔ امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) شریعت سابقہ کی رو سے قربانی صرف اُسی جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی۔ جو پہلوٹا بچہ ہو۔ اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی — وہ سب پہلوٹے بچے تھے خدا نے حضرت موسیٰؑ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے۔ وہاں فرما دیا ہے۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبہائم کیونکہ بنی اسرائیل میں۔ آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لیے ہے۔ (توراۃ۔ کتاب الاعداد۔ آیت ۷ و ۸)

(۲) پہلوٹے بچہ کی فضیلت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی۔ توراۃ میں ہے۔ کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں ایک مرغوبہ ہو۔ اور ایک غیر مرغوبہ۔ تو فضیلت اُسی اولاد کو ہو گی۔ جو پہلوٹی ہو۔ گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو فانہ اول قدرتہ لہ حق البکوریۃ (سفر تثنیہ۔ اصحاح۔ باب ۲۱۔ آیت ۱۵-۱۷)

(۳) جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی۔ اُسکو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا۔ توراۃ میں ہے

فی ذالک الوقت افرز الرب سبط لاوی لیحملوا تابوت عہد الرب ولکی یقفوا امام الرب لیخدموہ ویبارکوا باسمہ الی ہذا الیوم لاجل ذالک لم یکن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوتہ الرب ھو نصیبہ۔

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لیے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اُٹھائے۔ اور تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو۔ تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں۔ اور اُس کے نام سے آج تک برکت لیں یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ اور ترکہ نہیں ملا کیونکہ اُن کا حصہ خدا ہے۔ (توراۃ تثنیہ اصحاح باب ۱۰-۸-۹)

(۴) جو شخص خدا کے نذر کیا جاتا تھا۔ وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا۔ اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا جیسے

آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال مُنڈاتے ہیں۔ توراۃ میں ہے۔

فھا انک تحملین و تلدین ابنا ولا یعلو موسی راسه لان الصبی یکون نذیر اللہ توراۃ قضاۃ اصحاح ۱۳	اب تو حاملہ ہوگی۔ اور بچہ جنے گی۔ اور اُس کے سر پر اُسترا نہ پھیرا جائے۔ کیونکہ یہ بچہ خدا کے لیے نذر کیا جائے گا

(۵) جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا۔ اُس کے لیے خدا کے سامنے کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ توراۃ سفر عدد ۶-۱۶ و ۲۰-سفر تکوین ۱۷-۱۔ و سفر تثنیہ-۱-۸)

(۶) حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اس میں قید تھی۔ کہ وہ بیٹا قربانی کیا جاوے۔ جو اکلوتا ہو۔ اور محبوب ہو۔ (توراۃ تکوین۔ اصحاح ۲۲ آیت ۲)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو۔ لیکن پہلے یہ بتلا دینا ضرور ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر چڑھانا۔ ایک بات تھی۔ یعنی دونوں کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو۔ تو اُس کے یہ معنی تھے۔ کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لیے لوگوں سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے۔ توراۃ میں خدا کی زبان سے مذکور ہے۔ لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبھائم کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پلوٹا بچہ میرے لیے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے۔ کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ کہ تم بنی اسرائیل میں سے بنی لاویوں کو لو۔ اور اُن کو خدا کے سامنے پیش کرو۔ کہ خدا کے لیے مُخاص کر دیے جائیں۔ اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھدیں۔ جو قربانی کی جائیں۔

حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کو خواب میں بیٹے کی جو قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اُس سے بھی یہی مراد تھی۔ کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا۔ اور اس لیے اُس کی بعینہٖ تعمیل کرنی چاہی۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا۔ کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اِس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانہ خدا کی خدمت کے لیے خاص کر دیا۔ اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیانِ مذکورۂ بالا کو ذہن نشین کرنے کے بعد۔ دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ہے۔ اِس بنا پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے نہیں۔ اور چونکہ قربانی کے لیے۔ اکلوتے بیٹے کی شرط ہے۔ اِس لیے حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحاقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا۔ بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کو اور اُن کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دیکر رخصت کیا۔ یہ اِس بات کی دلیل کا قطعی قرینہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ

نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔
(۳) حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی۔ کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے۔ حج میں احرام کے زمانہ تک سر نہیں منڈاتے۔ یہ اُسی سُنّت اسمٰعیلی کی یادگار ہے
(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لیئے ملّت ابراہیمی میں استعمال کیے جاتے تھے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیئے استعمال کیئے۔ نہ حضرت اسحاقؑ کے لیئے۔ توراۃ میں ہے۔ کہ جب خدا نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی ولادت کی خوش خبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔

لَیتَ اِسمٰعِیلَ یَعِیشُ اِمَامَکَ　||　کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ (سامنے زندہ رہنا) اسی معنوں میں ہوا ہے۔
(۵) حضرت اسمٰعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے محبوب ترین اولاد تھے۔ توراۃ جو تمامتر حضرت اسحاقؑ کی یکطرفہ داستان ہے۔ اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں۔ یہ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کے وعدے اور عہد کا مظہر ہیں۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ دعوت ابراہیمؑ ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اس بنا پر خدا نے انکا نام اسماعیلؑ رکھا۔ کیونکہ اسماعیلؑ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ سَمَعَ اور اِیل سے۔ سمع کے معنی سُننے کے اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی خدا نے ابراہیمؑ کی دُعا سُن لی۔ توراۃ میں ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ سے کہا۔ کہ اسماعیلؑ کے بارے میں میں نے تیری سُن لی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحاقؑ کی خوش خبری دی تو اس موقع پر بھی حضرت اسماعیلؑ کو یاد کیا۔ غرض چونکہ ابراہیمؑ کو قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اس میں قید تھی۔ کہ محبوب ترین بیٹا ہو۔ اسلیئے اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں۔ نہ حضرت اسحاقؑ۔
(۶) حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی۔ تو ساتھ یہ بھی بشارت دی۔ کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا۔ توراۃ میں ہے۔

پھر خدا نے کہا۔ بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لیئے ایک بیٹا جنے گی۔ اور تو اُسکا نام اسحاقؑ رکھے گا۔ اور میں ابدی عہد اُس کی نسل سے قائم کرونگا۔ (توراۃ۔ تکوین باب ۱۷۔ آیت ۱۸)

اس اجمال کی تفسیر یہ ہے۔ کہ توراۃ میں مذکور ہے۔ کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا۔ اور فرشتہ نے ندا دی۔ کہ ہاتھ کو رُوک لو۔ تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے۔

خدا کہتا ہے۔ کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا۔ اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا۔ میں تجھ کو برکت دونگا۔ اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔ (تکوین باب $\frac{22}{15}$)

اب غور کرو۔ کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہدیا تھا۔ کہ میں اس کی نسل قائم رکھونگا۔ تو یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اُن کی قربانی کا حکم ہوتا۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے۔ تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں حضرت اسماعیلؑ اکبر اولاد تھے۔ محبوب تر تھے۔ قربانی کے وقت بالغ یا قریب بلوغ تھے۔ قربانی سے پہلے ان کی کثرت نسل کی بشارت نہیں دی گئی۔ توراۃ میں تصریح ہے۔ کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا۔ اس لیے اس بیٹے کے کثرت نسل کا وعدہ کیا گیا۔ یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی۔ اس لیے ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ حضرت اسحاقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو اُن کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا۔ جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

(۷) **مقام قربانی مکہ معظمہ تھا۔** جب قربانی اسمٰعیلؑ کے واقعہ ہی سے انکار ہے۔ تو پھر اُس کے موقع اور موضع سے بھی انکار مخالفین اسماعیلؑ کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے توراۃ میں قربانی گاہ کا موقع بتلایا گیا ہے۔ وہ مریا ہے۔ یہودی کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا۔ عیسائی کہتے ہیں۔ اوس جگہ کا نام ہے۔ جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔

لیکن یوروپ ہی کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی Sir Stanley لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکلکر اُس مقام پر گئے۔ جہاں خدا نے ان کو حکم دیا تھا۔ لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے۔ جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔ نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق۔ قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے۔ یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ابعد۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے۔ کہ وہ جبل عرفات ہے۔ غالباً یہ مقام۔ جرزیم کے پہاڑ پر ہے۔ اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے۔

اوّل تو یہ غلط ہے۔ مسلمان عرفاۃ کو نہیں۔ بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں۔ خیر مرقومہ بالا عبارت سے اتنا تو ثابت ہوا۔ کہ موریا کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ مسلمانوں کا دعوے بھی غلط ہے۔ اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا۔ اُس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا۔ یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے۔ یا وصفی معنی رکھتا ہے۔ بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا ہے۔ اور اسلیے اسکا ترجمہ توراۃ کے بعض نسخوں میں بلوطات عالیہ اور بعض میں زمین بلند۔ اور بعض میں مقام الرویاء

۵۱ تکوین ۱۷-۱۸۔ ۵۲ تکوین باب ۱۵۔ ۵۳ تکوین باب ۱۷-۱۸۔

کیا ہے۔ لیکن زیادہ صاحب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا۔ اور اسی لیے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ بحال خود رہنے دیا۔ لیکن استداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی۔ یعنی مَرْوَا کا موَرہ ہو گیا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب ہے۔

موَرہ کی نسبت توراۃ میں تصریح ہے۔ کہ عرب میں واقع ہے۔ توراۃ میں ہے۔

وکان جیش المدیانین شمالیھم عند تل موَرۃ فی الوادی۔ (قضاۃ۔ باب ۷ آیت ۲)	اور مدیانیوں[سلہ] کی فوج۔ شمال کی جانب۔ موَرہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔ (مدیان عرب میں واقع ہے)

تمام قرائن اور واقعات کو پیش نظر رکھا جاوے۔ تو ثابت ہو جائے گا۔ کہ یہ لفظ موَرہ نہیں۔ بلکہ مَروہ ہے۔ جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے۔ اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات۔ قرآن مجید کی تصریح۔ احادیث کی تعیین۔ تمام چیزیں اس قیاس سے اسقدر مطابق ہوتی جاتی ہیں۔ کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں تفصیل اس کی یہ ہے۔

حدیث میں ہے۔ کہ آنحضرت صلعم نے مَروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ قربانی گاہ یہ ہے۔ اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربان گاہ ہیں (موطائے امام مالک)

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی۔ جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم آنحضرت صلعم نے مروہ ہی کو قربان گاہ اصلی فرمایا۔ یہ اسی بنا پر تھا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے۔

ثم محلھا الی البیت العتیق	پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے
ھدیا بالغ الکعبۃ	قربانی جو کہ کعبہ میں پہونچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے۔ منیٰ نہیں۔ لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی۔ تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

[سلہ] مدین عرب کی سرزمین ہے۔ اور عرب کو اکثر مدیانیوں بھی کہتے ہیں۔ اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے۔ اور یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ جو قطورا سے تھے۔ ضمیمہ بائبل صفحہ ۱۱۴۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں اس لیے۔ اگر حضرت اسحاقؑ ذبیح ہوتے۔ تو ان کی کوئی یادگار اُن کے ہاں موجود ہوتی۔ بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں۔ قربانی کی تمام رسمیں آجتک موجود ہیں اولاد اسمٰعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں۔ اور حج جو ایک بڑا فریضۂ اسلام ہے تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا۔ تو پکارا۔ اے ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا (لبیک) میں حاضر ہوں (تکوین باب ۲۲) حج میں مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے جاتے ہیں۔ یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں۔ جس کا ترجمہ وہی ہے۔ میں حاضر ہوں۔

(۲) شریعت ابراہیمی میں دستور تھا۔ کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے۔ یا خدا کے لیے نذر دیتے تھے۔ وہ بار بار معبد یا قربانی گاہ کے پھیرے کرتا تھا
حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں۔ یہ اُسی کی یادگار ہے۔

(۳) نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا۔ کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے۔ حج میں بھی یہی دستور ہے۔ جب احرام اُتارتے ہیں۔ تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں ہے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ	سروں کے بال منڈائے ہوئے یا کتروائے ہوئے۔

(۴) حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے۔ یہ وہی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

فَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ	حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی

یہ تو دلائل توراۃ کی تصریحات و کنایات کی بنا پر تھے۔ قرآن مجید کی رو سے قطعاً حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے۔ اگرچہ بہت سے مفسروں نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے۔ قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى	اور حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤنگا وہ مجھکو راہ راست دکھلائے گا۔ خدایا مجھ کو اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو۔ تو ہم نے اُس کو ایک سمجھدار لڑکے کی خوشخبری دی۔ پھر جب وہ لڑکا اُسکے ساتھ چلنے لگا۔ تو ابراہیمؑ نے کہا

کہ بیٹے۔ میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ میں تجھکو ذبح کر رہا ہوں۔ تیری کیا رائے ہے۔

آیات بالا میں مذکور ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لیے دعا مانگی۔ اور خدا نے قبول کی۔ اور وہی لڑکا قربانی کے لیے پیش کیا گیا۔

توراۃ سے ثابت ہے۔ کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا۔ وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ اور اسی لیے اُن کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔ کہ خدا نے اُن کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سُنی۔ اسی بنا پر اس آیت میں جسکا ذکر ہے۔ وہ حضرت اسماعیل ہیں۔ اسحاق نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاق کی ولادت کا ذکر ہے۔ اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے۔ کہ جسکا ذکر اوپر ہوا۔ وہ حضرت اسحاق نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت اسمٰعیل ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا۔ یہ وہ نام ہے۔ جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ الَّذِيْ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اُسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا اور اُن سے کہا۔ کہ خدا کا یہ حکم ہوا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ تو حضرت اسماعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی۔ کہ یہ سر حاضر ہے۔ اس موقع پر خدا نے۔ اَسْلَمَا کا لفظ استعمال کیا۔ کہ جو اسلام سے ماخوذ ہے۔ اور اُس کے معنی تسلیم اور حوالہ کر دینے کے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا	پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے۔ یعنی جب قربانی کا حکم ہوا۔ تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں۔ یہ وصف مقبول بارگاہ الٰہی ہوا۔ اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم[1] رکھا۔

قربانی۔ ایثار۔ اور اسلام در حقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں۔ یہ اسبات کی قطعی دلیل ہے۔ کہ حضرت

---

[1] مولوی شبلی صاحب کا یہ قیاس اور ذاتی تحاز ہے۔ ہم اس کی تحقیق و تنقید حضرت ابراہیمؑ کے خاص حالات میں قلم بند کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں۔ کہ اس واقعہ سے کہیں پہلے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے اسلم کا لفظ قرآن میں آچکا ہے۔ اس لیے قربانی کا واقعہ اس کا باعث تسمیہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا نام خدا نے رکھا ہے نہ حضرت ابراہیمؑ نے ھوالذی سمٰکم کا خطاب منسوبی ہے۔ جس کی علی الاکثر مثالیں ادب و قواعد کی متداول کتب موجود ہیں۔ المولف عفی عنہ۔

اسمٰعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا تھا۔ اگر حضرت اسحاقؑ قربانی ہوتے۔ تو یہ لقب اُن کی اولاد یا اُن کی اُمت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اُسوقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جب اس پر غور کیا جاوے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اُس سے اصل مقصود کیا تھا۔ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھایا کرتی تھیں یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی۔ مخالفین اسلام کا خیال ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابر صوفیہ نے لکھا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السّلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عینی اور تمثیلی۔ عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے۔ جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام کو جو خواب دکھلایا گیا تھا۔ اُس سے یہ مراد تھی۔ کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھادیں یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیئے جائیں۔ توراۃ میں جابجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام نے اِس خواب کو عینی خیال کیا۔ اور بعینہٖ اُس کی تعمیل کرنی چاہی۔ مگر یہ خیال اجتہادی غلطی تھی۔ جو انبیاء سے ہو سکتی ہے۔ مگر یہ غلطی قایم نہیں رہتی۔ بلکہ خدا اُس پر متنبہ کر دیتا ہے اِس بنا پر گویا حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام اِس فعل سے روک دیئے گئے۔ لیکن خدا نے اُن کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ | تو نے خواب کو سچا کر دکھلایا ہم اسیطرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔

بہرحال یہاں اِس تفصیل سے یہ مقصود ہے۔ کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لیے نذر چڑھانا تھا۔ نذر چڑھانے کے لیے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا۔ وہ "خدا کے سامنے" تھا۔ توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ علیہ السّلام کے حق میں حضرت ابراہیمؑ علیہ السّلام نے خدا سے جو دُعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔ لَيْتَ إِسْمٰعِيلَ يَعِيشُ إِمَامَكَ ۔ کاش اسمٰعیلؑ تیرے سامنے زندگی کرتا۔

اسی خواہش کے مطابق اُن کو خواب کے تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا۔ کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں۔ یہ اسبات کی قطعی دلیل ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا نہیں۔ بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اول از صفحہ ۹۸ تا صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ کانپور)۔

اُس حدیث کی تنقید جس کو سرسیدؒ نے ذبیح اسحاقؑ کی تائید میں لکھا ہے۔

مولوی شبلی صاحب نے مسئلہ زیر بحث میں اپنے مرقومہ بالا دلائل و براہین کو بڑی تحقیق و تفتیش سے حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہر شخص بآسانی سمجھ لیگا۔ کہ واقعہ قربانی حقیقت میں حضرت اسماعیلؑ سے متعلق ہے۔ اور جناب اسحاقؑ سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ یہ صرف یہودیوں۔ اور عیسائیوں کی نفسانیت اور تعصب ہے۔ جو خواہ مخواہ واقعہ قربانی اور اُسکے حقیقی موعود لہ اور اصلی مقام قربانی کو طرح طرح کی عالم فریب تاویلوں سے خلط ملط کرکے بدل رہے ہیں۔ شخص خاص کی شخصیت موقع کی اصلیت سب کی ادھر سے ادھر کر رہے ہیں۔ اُن مقامات کے ایسے نام و نشان بتاتے ہیں۔ جو نہ قدیم جغرافیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور نہ حال کے جغرافیہ میں۔ سر اسٹانلی۔ (Sir Stanley) کی رائے جو اصلی قربان گاہ کے متعلق مولوی شبلی نے نقل فرمائی ہے وہ میرے بیان کے ثبوت کے لیئے کافی ہے۔

سرسید مرحوم بیر شبیع۔ کوہ فاران وغیرہ کی نسبت یہودیوں اور عیسائیوں کے متعدد اور مختلف اقوال لکھکر اُن کے اغوا اور عالم فریبی کے طومار لکھ چکے ہیں۔ جن کو ہم اُوپر انھیں کی تحریر سے نقل کرچکے ہیں۔ تعجب ہے۔ کہ باوجود اتنی تردید و تنقید کے بھی سید صاحب کبھی کبھی اُن کی تصدیق و تائید فرما ہی دیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ مسئلہ قربانی سید صاحب کے موضوع تالیف میں نہیں تھا۔ تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ سید صاحب نے تو خطبات میں اُن تمام مسائل کا خاص طور پر انکشاف فرمایا ہے۔ جو اسلام اور غیر مذاہب میں متنازع بھی تھے۔

قربانی کا مسئلہ اعظم ترین واقعہ ہے۔ جو بارگاہ رب العزت میں حضرت اسماعیلؑ کی قربت منصوصہ اور عظمت مخصوصہ ثابت کرتا ہے۔ اور یہی وہ واقعہ ہے۔ جو ضبط ابراہیمیؑ و صبر اسماعیلیؑ کی عدیم النظیر یادگار قایم کرتا ہے۔ اور ثابت کرتا ہے۔ کہ مقدس باپ اگر التابع لامر اللہ تھا۔ تو اُسکا مبارک فرزند الراضی لمرضات اللہ۔ پھر ایسے عظیم ترین واقعہ کو جس کی عظمت نصوص قرآنیہ سے ثابت ہے سرسید صاحب سے ایسا اسلام کا شفیق محقق بغیر تحقیق کے چھوڑ دے۔ نہیں۔ سید صاحب نے اُس کی تحقیق بھی فرمائی۔ مگر سوء اتفاق سے اس مسئلہ خاص میں اُن کی توجہ اور خیالات زیادہ تر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی تقلید و تائید کی طرف منعطف ہوگئے۔ آپ نے مخالفین کی اس عالم فریبی اور اغوا میں پڑکر وہی طریقہ اختیار کیا۔ جو آپ سے پہلے اکثر اسلامی محدثین اور مورخین اختیار کرچکے تھے

سید صاحب نے حقیقتاً کوئی نئی بات نہیں کی۔ بلکہ وہی جو قبل میں اکثر علماء کر چکے ہیں۔ سید صاحب سے جو فروگذاشت ہوئی۔ وہ یہی اور اتنی ہی ہے۔ کہ آپ نے اپنے دستور و عادت کے خلاف اپنے محققانہ سعی و کوشش سے اس مسئلہ خاص میں کام نہیں لیا۔ صرف نقل ہی پر اکتفا فرمائی۔ اگر ذرا سے تعمق اور غور سے کام لیا جاتا۔ تو کتب قدیمہ کے اُنھیں اسفار و اخبار سے جیسے وہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ۔ اور حضرت اسماعیلؑ علیہم السلام کے متعلق خطبات میں قلم بند کر چکے ہیں۔ اصل حقیقت کا انکشاف ہو جاتا۔ اور اصل واقعہ کی حقیقی صورت صاف صاف جلوہ گر ہو جاتی۔

مخالفین اسلام کے علاوہ محدثین و مورخین اسلام کے مختلف آرا اور مختارات سے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی جاتی۔ تو ثابت ہو جاتا۔ کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر سید صاحب کے مختار پر۔ اس مسئلہ خاص میں جہانتک غور کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ سید صاحب نے ذبیح اسماعیلؑ کی نسبت مسلمانوں کے استدلال اگرچہ پوری تفصیل سے نہیں۔ تو بالاجمال ضرور لکھدیے ہیں۔ مگر نہ اُن کے اقوال کی تصدیق کی۔ اور نہ اُن کے مختار کی تائید۔ بلکہ اِن سے قطع نظر کی۔ وہی کتب قدیمہ کی تقلید اور ذبیح اسحاقؑ کے مویدین محدثین اور مورخین کی تائید کو اپنا مختار قرار دیا ہے۔ سید صاحب کے خلاف مولوی شبلی نے اس مسئلہ میں کسی قدر زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔ چونکہ روئے سخن اُن کا زیادہ تر مخالفین اسلام سے ہے۔ نہ متبعین اسلام سے اس بنا پر اُنہوں نے کتب سابقہ کے اُنہیں اخبار و آثار سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح اللہ ہونا ثابت کیا ہے۔ جن میں سے اکثر کو سید صاحب خطبات میں لکھ چکے ہیں۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ وہ مخالفین اسلام کے مغویانہ اور لغویانہ دلائل کی قطع و برید اور تردید کے لیے کافی ہیں اگر مخالفین کی کتابیں صحیح۔ اُن کے مرویات سچے اور اُن کی بشارتیں برحق ہیں۔ تو پھر اسماعیلؑ کی ذبیح اللہ تسلیم کرنے میں مسلمانوں سے یہودیوں اور عیسائیوں کو سرگرم اور پر جوش ہونا چاہیے۔ اور اگر حقیقت میں اُن کو واقعہ کی صحت سے نہیں۔ بلکہ انصاف پسندی اور حق فہمی سے انکار ہے۔ اور حسد و تعصب اور اسلاف کی کورانہ تقلید پر اصرار ہے تو پھر نہ آج اس مسئلہ میں اُن کی تشفی ممکن ہے۔ اور نہ پھر قیامت تک اُن کا اطمینان ہو سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک مخالفین اسلام کی غلط فہمیوں کی اصلاح مولوی شبلی صاحب کے مندرجہ بالا استدلال سے پورے طور پر ہو گئی۔ ہم کو اُس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلامی مورخین و محدثین کے باہمی اختلاف و انتزاع کی تفصیلی کیفیت اور حقیقت حال دکھلا دینی ہمارے لیے لازمی ہے۔ اس لیئے اِن حضرات کے مختلف مختارات سے اصل واقعہ کی پوری کیفیت ذیل میں قلمبند کرتا ہوں

افسوس ہے۔ کہ سید صاحب کے ایسا شبلی صاحب نے بھی اسلام کے اتنے بڑے اعظم ترین مسئلہ کو اپنے طریقہ استدلال میں صرف اشارہ اور کنایہ سے تبلایا ہے۔ اور اُس کے متعلق خصوصًا علمائے اسلام میں اختلاف وانتزاع واقع ہونے کی کوئی تفصیلی وجہ وکیفیت نہیں تبلائی۔ حالانکہ مولوی صاحب کا یہ فرض تھا کہ جس طرح مخالفین اسلام کے مختار کی تردید وتنقید انہیں کے اخبار واسفار سے کردی گئی تھی۔ اسی طرح علمائے اسلام کے اختلاف پر بھی تنقیدانہ نظر ڈالکر اس مسئلہ کی حقیقت کا انکشاف فرمادیا جاتا۔ اس سے عام اہل اسلام کو اطلاع وواقفیت حاصل ہونے کے علاوہ مخالفین اسلام کے معترضانہ استدلال میں بھی آئندہ کوئی تائیدی قوت نہ پیدا ہوتی۔

مگر با اینہمہ یہ ہم ضرور کہیں گے۔ کہ سید صاحب سے زیادہ شبلی صاحب نے مسلمانوں کے اظہار دعویٰ اور استقرار حقوق کی طرف اپنی توجہ منعطف فرمائی ہے۔ اور اس مسئلہ میں اپنا وہی مختار قائم کیا ہے۔ جس پر اسلام کے تمام طریقوں کے علمائے اعلام اور محدثین کرام کا اتفاق عام ہو چکا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کی تلاشی طبیعت صرف اس لکھدینے کو کافی نہیں سمجھتی۔ بلکہ اُس کی پوری تفصیل اور تحقیق کا کافی طور سے معلوم کرنا اُن کا اصلی مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے طالبان تحقیق کی خاطر خواہ تشفی واطمینان کے لیے اس واقعہ کی تفصیل اسباب تحقیق کا فرض منصبی قرار پا جاتی ہے۔

ہمنے جہاں تک اِن دونوں محققین کے اقوال ومختار کو اس بارے میں دیکھا ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اسلامی علماء ومحدثین کے مختلف اقوال وارشاد کو اس مسئلہ کے متعلق دیکھا ضرور ہے۔ بخلاف سید صاحب کے جن کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اس بحث کے اصل موضوع کو اپنے علماء ومحدثین کی تالیفات میں دیکھا بھی نہیں اور اگر دیکھا بھی تو کتب قدیمہ کی تائیدی روایتوں کو اور اپنی رائے میں انہیں کو ترجیح دیکر خاص کر انہیں علماء کی تقلید اختیار فرمائی ہے۔ جو آپ کے ہم خیال تھے یہ موقع تقلیدی تحقیق کا نہیں تھا۔ بلکہ تنقیدی تفتیش کا۔ سید صاحب نے اپنے استدلال میں پہلے ذبح اسمٰعیلؑ کو اسلام کا مختلف فیہ مسئلہ تبلایا ہے۔ اور اُسکے ثبوت میں۔ علامہ مسعودی کا یہ قول دکھلایا ہے

قد تنازع الناس فی الذبیح فمنهم من ذهب الی انه اسحٰق ومنهم من رای انه اسمٰعیل فان کان الامر وقع بمنیٰ فالذبیح اسمٰعیل لان اسحٰق لم یدخل حجاز وان کان الامر بالذبح وقع بالشام فالذبیح اسحاق لان اسمٰعیل لم یدخل

مسئلہ ذبیح میں لوگوں کو اختلاف ہے۔ بعض کی رائے ہے۔ کہ ذبیح اسمٰعیلؑ ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ اسحاقؑ۔ پس اگر واقعہ ذبح منیٰ میں واقع ہوا ہے۔ تو ذبیح اسمٰعیلؑ ہیں۔ کیونکہ اسحاقؑ کا حجاز میں آنا ثابت نہیں ہے۔ اور اگر واقعہ ذبح شام میں واقع ہوا ہے تو ذبیح اسحاقؑ ہیں۔ کیونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کا حجاز میں آکر پھر

الشام بعد ان حمل منه (مروج الذهب مسعودی)

شام میں جانا ثابت نہیں۔

سعودی کے اِس بیان سے یہ مسئلہ اختلافی تو ضرور ثابت ہوتا ہے۔ اور اِس سے سب کو اقرار ہے۔ مگر میرے نزدیک تو سعودی کا یہ بیان سید صاحب کی رائے سے زیادہ شبلی صاحب کے مختار کا موید ہے کیونکہ علامہ مسعودی صاف صاف کہتے ہیں۔ کہ اگر واقعہ قربانی مقام تمی علاقہ حجاز میں واقع ہوا ہے تو حضرت اسمٰعیل کے ذبیح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابھی ابھی مورِیا کے اصلی مقام قربانی ہونے کی تحقیق میں پورے طور سے ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ وہ مقام مروہ ہے۔ جو حوالی مکہ میں واقع ہے۔ اور جس کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اصلی قربان گاہ تبلایا ہے۔ تو پھر سعودی ہی کے شرط پر حضرت اسماعیلؑ ذبیح اصلی ثابت ہو گئے۔

افسوس ہے کہ سید صاحب نے موریاہ کی تحقیق کو اٹھایا بھی۔ اور اُس کی نسبت مسلمانوں کے دعوے بھی لکھدیے۔ مگر چونکہ موریاہ کا استقرار مقام سید صاحب کے مختار و مدعا کے خلاف ثابت ہوتا تھا اِس لیئے آپ نے اپنی تحقیق کو محض ناقص چھوڑ کر اس بحث خاص کو گومگو کی حالت میں چھوڑ دیا۔ سید صاحب کی ناتصفیہ کن عبارت یہ ہے۔

یہ اختلاف توریت مقدس کی اُس آیت کے مبہم اور غیر مصرح ہونے کی وجہ سے ہے جس میں اُس مقام کا ذکر ہے۔ جہاں مذکورہ بالا قربانی کا عمل میں آنا تجویز ہوا تھا۔ وہ آیت یہ ہے۔ توراۃ ترجمہ فارسی۔

خدا ابراہیمؑ را امتحان کرد وبا و گفت اے ابراہیمؑ وی گفت نیک حاضرم وخداوند گفت کہ حال پسر یگانۂ خود اسحاق راکہ دوست میداری بگیر و در زمین موریاہ برو۔ (عربی ترجمہ میں بجائے موریاہ کے ارض الرؤیا لکھا ہے۔ اور ترجمہ سامری عربی میں ارض المختارة والمرشدہ لکھا ہے)

وور انجا او را از کوہہائے کہ بتوی گویم از برائے قربانی وسوختنی تقرب نما۔

خدا نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ اور اُن سے کہا۔ اے ابراہیمؑ۔ اُس نے کہا میں حاضر ہوں۔ خدا نے کہا۔ کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کہ اسحاق ہے۔ اور تو اُس کو دوست رکھتا ہے۔ اپنے ساتھ لے۔ اور زمین موریاہ میں جا۔

اور اُنکو وہاں کے پہاڑوں میں سے جو میں تجھے تبلاتا ہوں قربانی کر اور جلا۔ (تکوین باب ۲۲ ۱-۲)

بعض مسلمانوں نے اِس گمنام جگہ کو بیت المقدس اور اُس کے پہاڑ تبلائے ہیں۔ اور بعض نے مکہ معظمہ کا پہاڑ قرار دیا ہے۔ اور وہ اپنی رائے کی تائید میں بیان کرتے ہیں۔ کہ لفظ عبری ہریم۔ جس کے معنی جبال کے ہیں۔ تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیئے وہ استدلال کرتے ہیں۔ کہ اِس سے مکہ معظمہ کے مشہور دو پہاڑوں صفا اور مروہ میں سے ایک مراد ہے۔

تعجب ہے۔ کہ سید صاحب کے ایسا محقق اس مقام کو آجتک گمنام سمجھے۔ حالانکہ اس کا تعین اسلامی مورخین کے علاوہ خود کتب توراۃ میں مرقوم ہے۔ جس کے وثوق پر آپ نے اپنی رائے قایم کی ہے۔ توراۃ قضاۃ باب ۷ آیت ۲ میں صاف طور سے لکھا ہے۔

وکان جیش المدیانین شمالیھم عند تل مورۃ فی الوادی۔ | مدیانیوں کی فوج شمال کی طرف مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی (ضمیمہ کتاب بابل ص ۱۱۴)

اس کے علاوہ ہمارے سید صاحب تو خود مدین کو عرب میں کیا خاص حجاز میں تسلیم کر چکے ہیں۔ خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۶۲۶ میں تحریر ہے۔

کتاب اول سلاطین باب ۱۱۔ آیت ۱۸ میں مرقوم ہے۔ ھدد اور اس کے ہمراہیوں کے مصر میں جانے کے حال میں لکھا ہے۔ کہ وہ مدیان سے نکلے۔ اور فاران میں آئے۔ اور وہاں سے آدمی ساتھ لیکر مصر کو گئے۔ مدیان وہ شہر ہے جس کو عرب میں مدین کہتے ہیں۔ اور ساحل بحر قلزم پر۔ جو حجاز کے جانب ہے۔ تبوک سے تخمیناً چھ منزل جانب جنوب واقع ہے۔ یہ شہر وادیٔ فاران میں واقع تھا۔ جو ٹھیک حجاز ہے۔ خطبات ص ۶۲۶۔

مندرجہ بالا شواہد توراۃ سے بھی ثابت ہو گیا۔ کہ جبل موریاہ۔ مریا۔ یا مورہ۔ جو حقیقی قربان گاہ تبلایا گیا ہے وہ مدین سے قریب تھا۔ اور مدین ٹھیک حجاز میں واقع تھا۔ جسکا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔ تو اب اس سے مسعودی والی شرط کہ اگر حجاز قربان گاہ ثابت ہو جائے۔ تو اسماعیل ذبیح اللہ حقیقی تسلیم کیے جاویں گے۔ پوری ہو گئی۔ کیونکہ حضرت اسمٰعیلؑ کا وہاں مع اپنی والدہ اور آئندہ اپنی اولاد و اعقاب کے ساتھ ہمیشہ کے لیئے آباد ہونا جمہور کا مسلمہ ہے۔ بخلاف اس کے حضرت اسحاقؑ کا حجاز کیا عرب کے کسی قطعہ زمین پر تشریف لانا کہیں ثابت نہیں ہے۔ پھر ان کا ذبیح ہونا کیسے صحیح مانا جائے گا۔ جب اُنہوں نے اصلی مذبح میں مادام الحیات قدم تک نہ رکھا۔ اور کبھی اُس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

حضرت اسحاقؑ کا عرب میں آنا۔ نہ کسی اسلامی مورخ نے لکھا ہے۔ اور نہ کسی یہودی یا عیسائی محقق نے۔ بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کا ہجرت کے بعد۔ عرب سے شام میں تشریف لے جانا۔ تو خود سید صاحب کے اعترافات کر ہے۔ خطبات احمدیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ انجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ جن کی عمر اسوقت نواسی ۸۹ برس کی تھی۔ بر وقت وفات حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے پاس موجود تھے۔ خطبات ص ۴۰۔

پھر حاشیہ زیرین صفحہ میں لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیلؑ کو حضرت اسحاقؑ کے چھٹنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔ اس حساب سے حضرت اسماعیلؑ جب جلاوطن ہوئے تھے۔ تو سولہ برس کے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا ایک سو پچھتر ۱۷۵ برس کے سن میں انتقال ہوا۔ اور حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں نے مکفیلاہ کے غار میں دفن کر دیا۔ (تکوین باب ۲۵-۱۹-)

سید صاحب کی اس عبارت سے تو حضرت اسماعیلؑ کا متواتر شام میں جانا ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر سعودی کی اس مختار کو وہ کیوں تسلیم کرتے ہیں۔ جو کہتا ہے۔ کہ ہجرت کے بعد سے اسمٰعیلؑ کا شام میں جانا ثابت نہیں ذبح کے مسئلہ میں آپ نے اسی سعودی کے قول کو۔ جو ذبیح اسحاقؑ کی نسبت اُسنے لکھا ہے۔ صحیح مانا ہے اور وہی آپ ہی کی تحقیق اور تحریر سے مقطوع الاسناد قصیر الاطلاع اور ناقابل اعتبار ثابت ہوتا ہے

سید صاحب کے مرقومۂ بالا عبارت توراۃ سے ایک اور بات بڑے فائدہ کی معلوم ہوئی۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ توراۃ کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان دونوں بھائیوں (اسحاقؑ و اسماعیلؑ) میں خلوص واتحاد کے باہم مراسم جاری تھے۔ اور ایسے کہ جانبین کے مسالک سے مختلف البطنی کے اختلاف وامتیاز کا کوئی اثر اور نشان نہیں معلوم ہوتا تھا حقیقت تو یوں ہے۔ کہ ان دونوں بھائیوں میں خلوص واتحاد کے تمام مراسم ہمیشہ قایم تھے۔ یہ تو مابعد کی نسلوں کے حسد ونفسانیت نے باہمی اختلاف ومغایرت کے نقشے جمائے ہیں۔ اور مخالفت اسلام اور بانی اسلام علیہ السلام کے باعث سے یہودیوں اور عیسائیوں نے خوب خوب گہرے رنگ بھرے ہیں۔

سعودی کی اصل حدیث کی تنقید

یہاں تک تو ہم نے اس مسئلہ میں جزئیات سے بحث کی تھی۔ اب ہم اس کے اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور زرقانی کی شرح مواہب لدنیہ سے اُن تمام حدیثوں اور ان کے طریقوں کے اسقام وابہام کو ذیل میں علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔ جو حضرت اسحاقؑ کو ذبیح بتلاتے ہیں۔

(۱) الدارقطنی عن ابن مسعود وابن مردویہ والبزار عن ابن عباس وفیہ المبارک بن فضالۃ ضعفہ الجمھور	دار قطنی نے ابن مسعود اور ابن مردویہ اور بزار سے عبد اللہ ابن عباس کے طریقہ سے روایت کی ہے۔ اس کے راویوں میں مبارک ابن فضالہ ایک راوی ہے۔ جسکو جمہور محدثین نے ضعیف کہا

(۲) پھر اس کو روایۃ الحاکم من طرق عن العباس وقال صحیح علی شرطھما حاکم نے اس کو عباس کے طریقہ سے لکھا ہے۔ اور کہا ہے۔ کہ یہ موجودہ (اور قبل (مبارک ابن فضالہ کے طریق) دونوں طریق سے صحیح ہے۔

(۳) قال مسعودی ذھبی صحیح	سعودی نے بھی اسی طریق سے لکھا ہے۔ اور صحیح کہا ہے۔

(۴) رواہ ابن حدقیہ عن ابی هریرۃ

ابن مردویہ نے اس کو ابوہریرہ سے بیان کیا ہے۔

لیکن ابن کثیر الشامی اِن تینوں طریقوں کی تنقید و تردید فرماتے ہوئے بتلاتے ہیں۔ فیه الحسن ابن دینار متروك وشیخه منکر اس کے رواۃ میں حسن ابن دینار متروک ہے (اُس سے حدیث نہیں لی جاتی) اور اُسکا شیخ منکر الحدیث۔ اُس کی حدیث سے سب کو انکار ہے۔

(۵) رواہ ابن ابی حاتم مرفوعًا ثم رواہ عن فضالہ بن مبارك موقوفا وھو اشبه واصح۔

ابن ابی حاتم نے پہلے اسکو بطریق مرفوع لکھا۔ پھر اسکو فضالہ ابن مبارک سے روایت بطریق موقوف کردی۔ اور اس طرح کس کو مشتبہ کہا جائے۔ اور کس کو صحیح۔

اِن تمام حدیثوں کو جمع کر کے علامہ زرقانی رقم طراز ہیں۔

وتعقبه السیوطی بان مبارکا قد رفعه مرة فلخرجه البزار عنه مرفوعا وله شواهد عنده وعند الدیلمی عن العباس مرفوعا فی حدیث بلفظ واما اسحق بذل نفسه للذبح والطبرانی وابن ابی حاتم عن ابی هریرۃ بسند ضعیف والطبرانی ایضا بسند ضعیف عن ابن مسعود واسناد صحیح موقوف۔

اس کی تعقیب سیوطی نے کی ہے۔ کہ مبارک سے یہ بطریق مرفوع مروی ہے۔ اور بزاز نے بھی اسکو بطریق مرفوع روایت کی ہے اور اس کے شواہد اُسکے پاس ہیں۔ اور دیلمی نے اس کو بطریق عباس سے اس لفظ کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ اسحق نے اپنے نفس کو واسطے ذبح کے دیدٔالا۔ اور ابن حاتم نے بھی ابوہریرہ سے اسکو بطریق مرفوع لکھا ہے۔ لیکن بروایت ضعیف لکھا ہے۔ اور امام طبرانی نے بھی اسکو بسند ضعیف ابن مسعود سے لکھا ہے۔ اور معجم کبیر میں اسی مضمون کو آخر میں ابی الاحوص سے لکھا ہے۔ اس کے اسناد صحیح ہیں۔ مگر موقوف۔ زرقانی ص۔

ہم نے ذبح اسحاقؑ کی حدیثوں اور اُنکے طریقوں کو جمع کر دیا۔ اور زرقانی کی زبانی اُن کی تنقیدی کیفیت دکھلادی جس سے ظاہر ہوگیا۔ کہ ان حدیثوں کا کوئی طریق بھی۔ خدشہ۔ شبہ۔ یا سُقم سے خالی نہیں۔ اس لیئے یہ حدیثیں صداقت کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔

اب اُن کے خلاف جو حدیثیں ذبح اسمٰعیلؑ کی نسبت مقبول ہیں۔ اُن کی حیثیت بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) روی علی ما عند الزمخشری فی الکشاف فی سورۃ والصافات استدلالا علی ان ذبیح اسمعیل انه صلی الله علیه واله وسلم قال ابن الذبیحین

(۲) وعند الحاکم فی المستدرك وابن جریر وابن مردویه والثعلبی فی تفاسیرهم عن معاویه

زمخشری نے اپنے اسناد سے اس کو اپنی تفسیر کشاف میں بذیل سورہ الصافات حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ ہونے کے ثبوت میں استدلالاً لکھا ہے۔ کہ فرمایا آنحضرت صلعم نے کہ میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔

مستدرک میں حاکم نے اور ابن جریر اور ابن مردویہ اور ثعلبی نے اپنی تفاسیر میں معاویہ ابن ابوسفیان سے منقول کیا ہے۔ کہ ہم ایک بار

ابن ابوسفیان قال کنا عند رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم فاتاہ اعرابی فقال یا رسول اللہ خلفت البلاد یابسۃ والماء یابسا وخلفت المال عابسا ہلکت العیال وضاع المال فعد علی ہما افاء اللہ علیک یابن الذبیحین قال المعاویۃ فتبسم رسول اللہ صلعم ولم ینکر علیہ ۔

خدمت رسول صلعم میں بیٹھے تھے۔ کہ ایک مرد اعرابی آیا۔ اور عرض کی کہ عام طور سے تمام شہروں میں قحط پڑا ہے۔ پانی بالکل کم ہوگیا ہے۔ اور لوگوں کی آمدنی موقوف ہوگئی۔ جائداد تباہ اور اہل و عیال خاک سیاہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہماری اُس مال سے امداد فرمائیں۔ جو خدا نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ اے دو ذبیحوں کے مبارک فرزند۔ یہ سُنکر آپ تبسم ہوئے۔ اور آپ نے اُس کے اس خطاب کا انکار نہیں کیا۔

زرقانی مرقومۂ بالا محدثین کی زبانی لکھتے ہیں۔ فافاد انہ اسمعیل اس میں صریح افادہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے۔ وھذا احتج بہ معاویہ علی من قال انہ اسحاق اور اسی سے معاویہ نے اُن لوگوں پر اپنا احتجاج قایم کیا ہے۔ جو اسحاقؑ کو ذبیح کہتے ہیں۔

(۳) عند الحاکم عن الصنابحی حضرنا مجلس معاویۃ فتذاکر القوم اسمعیل واسحاق فقال بعضہم اسمعیل الذبیح وقال بعضہم بل اسحاق فقال معاویۃ سقطتم علی الخبیر وذکرہ الحدیث حتی العرف بالذبیحین عبد اللہ واسمعیل ابن ابراہیم کما قالہ جماعۃ من الصحابۃ وتابعین ورجحہ جماعۃ وقال ابوحاتم انہ الصحیح والبیضاوی انہ الاظہر ۔

مستدرک نے امام حاکم نے اس کو صنابحی کے اسناد سے یوں لکھا ہے۔ کہ ہم معویہ کی مجلس میں حاضر تھے۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کا ذکر پیش آیا۔ بعض لوگ اسمٰعیلؑ کو ذبیح اللہ کہتے تھے۔ اور بعض اسحاقؑ کو۔ معاویہ نے کہا تم لوگوں کو ابھی خبر نہیں پہونچی ہے۔ اور پھر پوری حدیث بیان کی۔ اور کہا ذبیحین سے مراد عبد اللہ و اسمٰعیلؑ ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں۔ یہ وہ قول ہے۔ جسکو صحابہ اور تابعین کی ایک معتدبہ جماعت نے نقل کیا ہے۔ اور اسی کو ایک جماعت علما نے ترجیح دی ہے۔ ابوحاتم نے اسکو صحیح بتلایا ہے۔ اور بیضاوی نے اظہر قول شمار کیا ہے

علامہ ابن القیم نے مسئلہ زیر بحث پر مفصل اور مستحکم طریقہ سے بحث کی ہے۔ اُن کی پوری تفصیل کو موجب تطویل سمجھ کر ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ مگر اُس کے ضروری مقامات کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ومما یدل علی ان ذبیح اسمعیل انہ لاریب ان الذبح کان بمکۃ ولذلک جعلت القرابین یوم النحر کما جعل السعی بین الصفا والمروۃ و رمی الجمرۃ بہا تذکیرا لشان اسمعیل وابیہ وامہ

جو امور حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔ کہ وہ ذبح کا واقعہ بیشک مکے میں واقعہ ہوا۔ کیونکہ وہیں تمام مراسم قربانی مثل روز نحر اور سعی مابین مروہ اور صفا اور رمی الجمرات۔ صرف اس غرض خاص سے ادا کی جاتی ہیں۔ کہ

واقامه لذكر الله تعالى ومعلوم ان اسمعيل و امه هما اللذان كان بمكة دون اسحاق

حضرت اسماعیلؑ اور اُن کی مادر گرامی قدر کی شان و منزلت اُن کی شہرت اور ذکر و عبادت خدا میں اُنکا استقلال و استقامت ظاہر اور ثابت ہو۔ اور یہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ کہ حضرت اسماعیلؑ اور اُن کی ماں مکہ میں رہتی تھیں۔ نہ اسحاقؑ

پھر اُس کے آگے اُن کا سلسلہ احتجاج یہ ہے:۔

ولو كان الذبح بالشام كما يزعم اهل الكتاب و من تلقى عنهم لكانت القرابين والنحر بالشام لا بمكة

اگر واقعہ ذبح شام میں ہوتا۔ جیسا کہ اہل کتاب کا زعم ہے تو اُن سے جواب طلب ہوگا۔ کہ مراسم قربانی و نحر وغیرہ آجتک شام میں ہوا کرتے نہ کہ مکہ میں۔

پھر سلسلۂ استدلال یہ ہے:۔

وان الله سمى الذبيح حليما (فى القرآن) فانه لا احلم ممن سلم نفسه للذبح طاعة لربه ولما ذكر اسحق سماه عليما۔

خدا نے (قرآن میں) ذبیح اللہ کو حلم کے نام سے موسوم کیا ہے اس بنا پر کہ اُس نے پورے اعتراف و امتیاز سے محض طاعۃً للہ اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا تسلیم کر لیا۔ اور جہاں حضرت اسحاقؑ کا ذکر کیا ہے۔ وہاں اُن کو صرف جاننے والے کی صفت سے موصوف بتلایا ہے۔

پھر اسی طریقہ کلام میں رقم طراز ہیں۔

وان الله تعالى اجرى العادة البشرية ان بكر الاولاد احب الى الوالدين ممن بعده وابراهيم لما سأل ربه الولد ووهبه له تعلقت شعبة من قلبه بمحبته والله تعالى قد اتخذه خليلا والخلة منصب يقتضي توحيد المحبوب بالمحبة وان لا يشارك فيها فلما اخذ الولد شعبة من قلب الوالد جاءت غيرة الخلة تنزعها من قلب الخليل فامر بذبح المحبوب فلما اقدم على ذبحه وكانت محبة الله عنده اعظم من محبة الولد خلصت الخلة حينئذ من شوائب المشاركة فلم يبق فى الذبح مصلحة اذ كانت المصلحة انما هى العزم وتوطين النفس وقد حصل المقصود فنسخ الامر

اور نیز اس طور سے بھی کہ خدائے تعالٰے نے ہمیشہ سے عادت انسانی ایسی ہی جاری فرمائی ہے۔ کہ والدین اپنی اولاد اکبر کو بمقابلہ دوسری اولاد کے زیادہ چاہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب خدا سے عطائے اولاد کی دعا فرمائی۔ فطرت انسانی کے اعتبار سے اُنکے قلب میں اس بچّہ کی محبت ہوگئی۔ مگر خدا نے ابراہیمؑ کو مرتبۂ خلت عنایت فرمایا تھا۔ اور اپنا خلیل گردانا تھا۔ اور مراتب خلت کے معنی یہ ہیں۔ کہ محبوب کی محبت کے ساتھ پھر غیر کی محبت کا کوئی لوث نہ رکھا جائے۔ تو جب آپ کے دل میں لڑکے کی محبت پیدا ہوگئی۔ تو گویا محبت کی وحدت میں شرکت ہوگئی۔ اس بنا پر نظام قدرت نے امتحاناً حضرت ابراہیمؑ کو اپنے محبوب کے ذبح کا حکم دیا۔ لیکن جب آپ اس امر کے لیئے پورے آمادہ اور تیار ہوگئے۔ تو ثابت ہوگیا کہ خدائے تعالٰے کی محبت آپ کے دل میں آپ کے اُس فرزند

وفدی الذبح وصدق الخلیل الرؤیا۔ | کی محبت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اسی وقت آپ کی خلت کا بھی محبت غیر کی خلش شارکت سے تصفیہ کامل ہو گیا۔ اور اس واقعہ ذبح میں آپ کے ارادۂ دل کا امتحان۔ استقلال اور اطمینان نفس کی آزمائش مقصود تھی۔ اور وہ مقصود حاصل ہو گیا۔ تو وہ امر امتحان و آزمائش بھی فسخ قرار دیا گیا۔ اور اس ذبح کے لئے صدقہ اور بدلہ قبول کر لیا گیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب بھی سچا دکھلا دیا گیا۔

امام ابن القیم نے مندرجہ دلائل عقلی اور نقلی سے مسئلہ ذبح کو بالکل صاف کر دیا۔ اور ذبیح اسماعیلؑ کی حقیقت اور اصلیت اُن شاہد بدیہیات سے ثابت کر دیا ہے۔ جس کے مان لینے میں نہ پھر کسی اہل اسلام کو عذر ہو سکتا ہے نہ کسی اہل کتاب کے فرقہ کو عذر و اعتراض۔ یہ بالکل صحیح اور برواقع ہے۔ کہ اگر جناب اسحٰقؑ ذبیح اصلی ہوتے اور یہ واقعہ ملک شام یا بیت المقدس میں ظہور پذیر ہوا ہوتا۔ تو ضرور تھا۔ کہ اسحٰقؑ کی اولاد اور اُن کے قوم و ملک کے لوگوں میں اُن کے اتنے بڑے عظیم ترین ایثار نفس کی یادگار اگر پورے طور سے نہیں۔ تو تھوڑی بہت تو آج تک ضرور قایم رہتی۔ مگر اس کے خلاف۔ اُن کی اولاد۔ اُن کی قوم اور اُن کے ملک و وطن میں تو کہیں اُن کی اتنی بڑی مہتم بالشان یادگار کا آج کوئی نام و نشان بھی نہیں بتلاتا۔ اور سوائے اس کے کہ اُن کی مقدس کتابوں میں حضرت اسحاقؑ کی اس جانفروشی کا ذکر لکھا ہے۔ اُن لوگوں میں کہیں اسکا ذکر و مذکور بھی نہیں ہے۔ اور شاید اُن میں سے فیصدی ننانوے ۹۹ ایسے نکلیں گے۔ جو اس واقعہ سے واقف بھی نہیں ہونگے۔ بخلاف بنی اسحاقؑ کے نسل اسماعیل کا بچہ بچہ ہزاروں برس کی مدت مدید گذر جانے کے بعد بھی آجتک اس واقعہ کو ایسی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ گویا کہ وہ قربانی کے منظر قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔ اور اسی وجہ سے سلسلۂ اسماعیلی میں وہ تمام مراسم جو اس واقعہ عظیمہ کے متعلق حضرت ابراہیمؑ۔ اُن کی زوجہ مطہرہ۔ حضرت ہاجرہؑ اور اُن کے خلف الصالح جناب اسماعیلؑ نے خاص شہر مکہ معظمہ۔ حرم بیت اللہ۔ اور اُس کے متصل مقامات مختلف میں ادا فرمائے تھے۔ آج تک ہر سال بلاناغہ اُسی طریقہ سے بجا لائے جاتے ہیں۔ اور اُن کی تعمیل میں اتنی احتیاط برتی جاتی ہے۔ اور اتنی پابندی پیش نظر رکھی جاتی ہے۔ کہ کسی طریقہ ادائے مناسکات میں سرمو فرق نہ آنے پائے۔ اور ادائے مراسم کا کوئی شعبہ نہ چھوٹ جائے۔

نسل اسماعیلؑ میں اُسوقت سے لیکر اسوقت تک یہ شب و روز کے واقعات اور شاہد اس امر کے تسلیم کر لینے اور مان بیٹھ جانے کیلئے پورے طور سے کافی ہیں۔ کہ اگر حضرت ذبیح اللہ اسماعیلؑ نہ ہوتے۔ تو پھر اہل عرب کو یا اُن کے تمام قوموں کو جو اُن کی نسل سے ہونیکا شرف رکھتی ہیں۔ اِن مراسم اسماعیلی کو آجتک اِس پرجوشی۔ احتیاط اور اتنی پابندی سے قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر نہیں۔ یہ اُن کے نمایاں شرف کا سبب اور اُن کے فخر و مباہات کا مخصوص

باعث تھا۔ اور اُن کے لیئے اِس عظیم الشان اور واجب الاحترام واقعہ کی یادگار جاری اور قائم رکھنی ایسی ضروری تھی۔ کہ خدائے سبحانہ تعالےٰ نے اُس کے تمام مراسم و مناسک کی تعمیل اُن کے لیئے فرض کردی۔

اِتنا لکھکر ہم پھر اپنے سلسلۂ بیان پر آجاتے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ ڈاکٹر سر سید احمد خان نے اپنی تحقیق کو زیادہ تر اہل کتاب کے منقولات تک محدود رکھا۔ اور اسلامی محققین کے دائرے میں بھی اتفاق سے اُنھیں علماء کے استدلال معقولی سے آگے نہ بڑھے۔ جن کو سیّد صاحب سے ہزار ہا برس پہلے اہل کتاب کے یہی مغویانہ منقولات و معقولات دھوکہ میں ڈال چکے تھے۔ سیّد صاحب حقیقت واقعہ کی تفتیش میں تھوڑی زحمت اور گوارا فرماتے اور اہل کتاب کی کتب قدیمہ کی طرح محققین و متکلمین اسلامی کے مختلف مختارات و آرا کا ملاحظہ فرماتے تو اُن پر اصلیت اور حقیقت واقعہ کا پورا انکشاف ہوجاتا۔ اور معلوم ہوجاتا۔ کہ اِس مسئلہ پر دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں متکلمین اسلام علمائے یہود سے اِس مسئلہ خاص کی نسبت محاکمہ اور تبصرہ کر چکے ہیں علمائے اہلسنت میں ابن حجر عسقلانی نے مواہب لدنیہ میں۔ زرقانی نے اپنی شرح میں۔ اور علامہ ابن القیم نے استدلال مندرجۂ شرح زرقانی میں۔ اور علمائے شیعہ میں سے ملا محمد باقر مجلسی نے حیات القلوب جلد دوم میں اِس تبصرہ اور محاکمہ کی پوری کیفیت درج کی ہے۔ ہم مواہب لدنیہ کی اصل عبارت سے اِسکو ذیل نقل کرتے ہیں۔

وروی فیما ذکرہ المعافی[ف] بن ذکریا بن یحیی ان عمر ابن عبد العزیز سال رجلا اسلم من علماء الیھود ای ابن ابراھیم امر بذبحه فقال واللہ یا امیر المومنین ان الیھود لیعلمون انه اسمٰعیل ولکنھم یحسدونکم معشر العرب ان یکون اباکم للفضل الذی ذکرہ اللہ عنه فھم یجحدون ذلك ویزعمون انه اسحاق لان اسحاق ابوھم فانظر الیھا بخلیل ما فی ھذہ القصة من السر الجلیل وھو ان اللہ تعالیٰ بری عبادہ الجبر

معافی ابن ذکریا ابن یحییٰ نے لکھا ہے۔ کہ عمر ابن عبد العزیز نے ایک عالم یہودی سے جو حال میں مشرف باسلام ہوا تھا۔ دریافت کیا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بیٹوں میں سے کون تھا۔ جس کے لیئے ذبح کا حکم خدا نے دیا تھا۔ اُس نے کہا۔ کہ اے امیر المومنین یہود اسکو بخوبی جانتے تھے۔ کہ وہ آپ کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ لیکن اُنہوں نے قوم عرب کے ساتھ حسد کیا۔ کہ تمہارے جد اعلیٰ کے ساتھ وہ فضل و مراتب نہ مذکور و مشہور ہوں جو خدائے سبحانہ تعالےٰ نے انہیں عنایت فرمائے تھے۔ اس بنا پر اُنہوں نے انکار کیا۔ اور اپنے زعم میں ذبیح اسحاقؑ

[ف] **توثیق المعافی** المعافی بن ذکریا بن یحیی بن حمید الحافظ العلامة المفسر الثقة النهروانی الجریری کان علی مذهب ابن جریر مات سنة تسع وثلثمایه معافی بن ذکریا ابن یحییٰ ابن حمید۔ حافظ۔ عالم مفسر اور ثقہ تھے۔ نہروانی سکنا اللہ جریری مذہباً تھے۔ وہ علامہ جریر کے طریق پر تھے۔ اُن کی وفات ۳۹۰ھ میں واقع ہوئی۔ (زرقانی جلد اوّل ص ص ۔ ۱۲۰)

بعد الکسر واللطف بعد الشدۃ فانہ کان عاقبۃ صبرھاجر وابنہا علی البعد والوحدۃ و الغربۃ والتسلیم لذبح الولد الی ما آلت الیہ من جعل آثارھما ومواطئ اقدامھما مناسک لعبادۃ المؤمنین ومتعبدات لھم الی یوم الدین وھذہ سنۃ اللہ تعالی فیمن یرید رفعتہ من خلقہ بعد استضعافہ وذلتہ وانکسارہ وصبرہ وتلقیہ القضاء بالرضاء فضلا منہ قال اللہ تعالی ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم ائمۃ ۔

کو قرار دیا۔ اس لیے کہ وہ اُن کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ اس واقعہ میں خُلّت وخلوص خلیل قابلِ لحاظ ہے۔ اور ایک سرِّ جلیل لائقِ مشاہدہ اور وہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے خدائے سبحانہٗ تعالیٰ کا مدعا یہ تھا کہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے ضعف وناتوانی کے بعد اُسے قوت وتوانائی اور رنج وتکلیف کے بعد آرام واطمینان کے مناظر دُنیا کو دکھلائے اور حقیقتاً حضرت ہاجرہؑ اور اُن کے فرزند ارجمند جناب اسمٰعیلؑ کے صبر وتحمل کا یہی صلہ تھا۔ اور یہی اجر ان تمام تکالیف ومصائب کا جو ترکِ وطن۔ اختیارِ غربت۔ حصولِ بیکسی ونا داری کی مختلف صورتوں میں ان بزرگواروں کو پیش آئیں۔ اور اُن پر ان حضرات نے صبرِ کامل فرمایا۔ اور آخر میں ان کے صبر وتحمل کا درجہ اتنا رفیع کر دیا گیا کہ اُن کے مراسم ومناسک تمام مومنین کے لیے عبادت وطاعتِ الٰہی کے خاص معیار قرار دیے گئے۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ عادتِ الٰہی یہی رسی ہی جاری ہوئی تھی۔ کہ خداوند عالم اپنے بندوں کو اُن کے ضعف وانکسار۔ تکلیف ودقت کے بعد رفعت راحت اور اطمینان عطا فرماتا ہے۔ اور اُن کے صبر وسکوت کا یوں اجر عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ الخ کی عبارت سے ظاہر ہے۔ (ملخص از شرح زرقانی جلد اول مطبوعہ حیدرآباد دکن از صفحہ ۱۱۶ تا صفحہ ۱۲۱)

بہرحال حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے کے ثبوت میں اتنے متواتر شواہد تاریخی محققین ومورخین کے مختلف اسناد واشہاد سے مندرج کر دیے ہیں۔ کہ پھر کسی تصدیق وتوثیق کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ مگر اس کے ضمن میں ہم کو ابھی اتنا لکھنا اور باقی ہے۔ کہ صورتِ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حقیقتِ حال وہی ہے۔ جو اس نومسلم عالم یہودی نے عمر ابن عبدالعزیز کے دربار میں بیان کی ہے۔ ہمارے سید صاحب خود بھی خطبات کے اکثر مقامات پر یہودیوں اور عیسائیوں کی ایسی تحریفات وتلبیسات کو دکھلا چکے ہیں۔ چنانچہ خطبات میں بذیل تحقیق مرقع بیابان فاران اور مقام سکونت حضرت اسمٰعیلؑ۔ اور نیز تحقیق بشاراتہائے نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی توریت وانجیل کی اصل عبارات اور ترجموں میں ایک نہیں۔ کثیر التعداد۔ تحریفات۔ اور غلط معانی جس سے بشارت نبوت آنحضرت صلعم نہ ظاہر ہو سکے۔ یا کم سے کم اُنکے اصل مقاصد ومطالب مشتبہ اور مبہم ہو جائیں تبلا چکے ہیں۔ اور ثابت کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود اتنی معلومات کے بھی سید صاحب مرحوم نے اس مسئلہ خاص کے متعلق اُنھیں یہودیوں اور عیسائیوں کی تصدیق و توثیق فرمائی۔ اور تصدیق فرمانے کے وقت اُن کے ان خود غرضانہ اور مغویانہ تحریفات کا کوئی خیال نہ کیا

اِن دلائل سے قطع نظر کرکے اگر سید صاحب نے اہل عرب کے۔ اُسوقت سے لیکر اسوقت تک کے صرف اُن شعار و اخبار کی طرف اعتنا فرمائی ہوتی۔ جو ذبیح اسمٰعیل کے متعلق۔ اتنی کثرت۔ شہرت۔ قدامت اور عقیدت کے ساتھ اُن میں اور اُن کی نسل اور سلسلوں میں جو عرب کے ماسوا اور تمام اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ توہم کو یقین ہے۔ کہ پھر سید صاحب کو حضرت اسماعیل ؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

لطف تو یہ ہے۔ کہ مرحوم سید صاحب نے مناسکات حج وغیرہ کی نسبت۔ اُن کے ارشاد ابراہیمی اور آثار اسماعیلی ہونیکا پورا اعتراف فرمایا ہے۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے انکار کی تردید میں۔ اُنکی قدامت۔ شہرت اور کثرت ہی کی بنا پر استدلال کیا گیا ہے۔ مگر ان تمام مناسکات کے اشعار ابراہیمی اور آثار اسماعیلی مان لینے کے بعد بھی صرف اِس کے ایک شعبہ۔ یعنی واقعہ قربانی کے متعلق اِسکا تعلق حضرت اسماعیل سے تسلیم نہیں کیا جاتا ہمارے نزدیک سید صاحب کا یہ طریق استدلال بالکل ضعیف ہے۔ آپ نے جب اُصول شریعت شہرت اور قدامت سے تمام واقعات میں استدلال فرمایا ہے۔ اسی اُصول و طریقہ کو تمام بحث میں جاری و قائم رکھنا آپ کے لیئے ضروری اور لازمی تھا۔ نہ یہ کہ بعض طرق بحث میں تو ایک اُصول سے بحث کی جائے اور دوسرے طریق بحث اور جزو مسئلہ میں وہی اُصول ناکافی اور غیر معتبر سمجھے جاویں۔ یہی دَور ہے۔ جو علمائے منطق علم کلام میں سخت معیوب بتلاتے ہیں۔ ہم ذیل میں سید صاحب کے اِن تحریرات فی المختارات کی مثال لکھکر دکھلا دیتے ہیں۔ جسے دیکھکر اور پڑھ کر ہر شخص سمجھ لیگا۔ کہ سید صاحب نے عرب کے قدیم شعار اور رسم و رواج تک کو کس یقین۔ وثوق۔ اور اعتبار کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کے سکوت یا انکار کے مقابلہ میں اُن کو کیسا معتبر اور کتنا مستند تسلیم کیا ہے۔

جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے باب میں ہیں۔ وہ نہایت معتبر ہیں۔ کیونکہ عرب اپنے رسوم آبائی اور اوضاع و اطوار کے بدرجہ غایت پابند تھے۔ اور اُن کو کبھی ترک کرنا یا تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے نسب نامہ کو یاد رکھنا قریب قریب اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا جد اجد انام رکھتا تھا۔ اور اس ذریعہ سے ہر شخص اپنی قوم و قبیلہ کو خوب جانتا تھا۔ اور اپنے حسب و نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا

خطبات مطبوعہ لاہور ص ۳۵

پھر اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کی ہیں۔ اُن کے رسوم کا علم مندرجہ ذیل اُمور سے ہوتا ہے (۱) بعض اوقات جب کسی سے قوم کی رائے میں کوئی جرم سرزد ہوتا تھا۔ تو اُس کی یاداش میں

اس کی ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا ہوتا تھا۔ میدان جنگ میں کوئی جنگ اور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب نسب بآواز بلند نہ دریافت کرے۔ تنہا لڑائی میں مصروف نہیں ہوسکتا تھا (۲) کسی عام مہم میں ہر شخص اپنی ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا۔ عرب میں جرمانہ کا رسم نہایت قدیم ہے۔ اور آج تک اَلدِّیَۃُ عَلَی الْعَاقِلِ کی اصطلاح خاص سے مشہور و معروف ہے۔ خطبات ص ۳۷

پھر اسی سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر۔ جب کہ اُن کے باپ نے اُن کو گھر سے نکالدیا تھا۔ توریت کے مطابق سولہ[16] کی تھی۔ اور یہ عمر ایسی تھی۔ جو روایتیں انہوں نے اپنے والد سے سُنی تھیں۔ اُن کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد رکھنے کے قابل تھیں۔ اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیمؑ بھی اکثر اُن کے پاس آتے جاتے تھے۔ انجام کار سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اسوقت نواسی[89] برس کی تھی۔ بروقت وفات حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے اُن کے پاس موجود تھے یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہونگی۔ کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف عرب میں اسقدر شائع ہیں۔ لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے پہونچی ہیں۔ اور یہ امور ایسے بدیہی اور ذہن نشین ہونے کے لائق ہیں کہ اگر پھر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ اہل عرب کو یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہونچی ہیں۔ تو اس کو سُن کر کچھ کم تعجب نہ ہوگا۔ خطبات ص ۳۹۔

پھر آئندہ صفحہ میں مرقوم ہے۔

عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت سے اپنی اصلی روایتوں میں بھی کوئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے وہ بالکل علیحدہ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت اسمٰعیل اور اُن کے ہمراہی وہاں آکے آباد ہوئے تو قدیم عرب اُن کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور ذلیل لقب مستعربہ سے اُن کو ملقب کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہل عرب سے بنی اسمٰعیلؑ کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے تھے۔ اور قدیم عرب نے اپنی روایتوں کا اِن سے مبادلہ نہیں کیا۔ اور اسی لیئے بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیا کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہیں تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیائے بنی اسرائیل برحق تھے۔ اور اُنپر ایمان لانا چاہیے۔ اُسوقت سے بنی اسرائیل اور اُن کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہوگئیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہیں تھیں اس لیئے عرب کی روایتیں بجائے خود ہمیشہ برقرار رہیں۔ (خطبات ص ۔ ۴۰)

پھر دوسرے مقام مندرجہ ذیل عبارت قلم بند ہے:۔

کسی راوی نے یہودیوں کی روایتیں بیان کیں۔ اور سننے والے نے غلطی سے اُسے حدیث سمجھ لیا۔ اور اسی ذریعہ سے

یہودیوں کی روایات کا اختلاف مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوگیا۔ اگلے نبیوں اور بزرگوں کے قصے جن سے ہمارے ہاں کی تاریخیں اور تفسیریں سیاہ ہیں۔ سب انہیں ذریعوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ خطبات ص ۳۵۰

پھر آگے تحریر فرمایا جاتا ہے :۔

مخالفین اسلام نے جو اس زمانہ زیادہ تر یہودی اور مشرکین تھے۔ ان لوگوں نے بہت سی باتیں سچ اور جھوٹ آنحضرت صلعم کی نسبت مشہور کر رکھی تھیں۔ اور وہ عرب میں پھیل گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ بطور روایت کے بیان ہونے لگیں۔ اور لوگوں نے غلطی سے اُن کو حدیثوں میں شمار کر لیا۔ (خطبات ص ۳۵۳)

عبارات توراۃ اور انجیل کی غلطیوں کے اعتراف میں تحریر ہے

یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت کی عبارت اور الفاظ میں غلط طور سے تعبیر کیے۔ اور اس سبب سے وہ غلطیاں ہوئیں۔ کہ خود توریت کے قدیم نسخوں میں جو کوڈیسیں کہلاتے تھے۔ اور قلمی تھے۔ متعدد وجوہ سے غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور پھر جن لوگوں نے مقابلہ کر کے اُن کو صحیح کیا۔ اُن کی یہ تصحیح بھی غلطیوں سے خالی نہ تھی۔ اور سب سے بڑا سبب ان غلطیوں کا یہ ہوا کہ وہ تاریخی واقعات جو انسانوں نے بغرض تسلسل مطلب حضرت موسیٰؑ کے کلام کے ساتھ جُدا لکھے تھے۔ اور جن میں ایک بہت سی غلطیاں تھیں۔ اُن کو بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے مقدس تحریر سمجھا تھا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا۔ تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدائے پاک کے بندوں۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ۔ اور اُن کے بیٹوں۔ اور حضرت اسحاقؑ۔ حضرت یہودا اور حضرت یعقوبؑ کے پوتوں اور بیٹوں اور ہارونؑ۔ اور داؤدؑ۔ وسلیمانؑ کی دُنیا میں ایسی مٹی خراب رہتی۔ جیسے ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے۔ تمام دُنیا کی نظروں میں ویسے ہی حقیر ہوتے۔ جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں۔ یا اُن کو اُن کے گناہوں کی سزا کے لیے اُن کو سُولی پر چڑھاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی اس حد تک دُنیا میں پھیلائی۔ جس کے وہ مستحق تھے۔

(خطبات ص ۲۰۳)

سرسید کی مرقومہ بالا تحقیقات سے اہل عرب کی مرویات کا وثوق اور اعتماد کماحقہ ثابت ہو گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ اُن کی معلومات کا تسلسل اور نسلاً بعد نسلاً اس انتظام احتیاطی کے ساتھ مختلف قبائل و عشائر میں اُن کا محفوظ رکھنا۔ کہ اُن کی اصلیت اور حقیقت میں کوئی خود غرضانہ اضافہ ناممکن ہو۔ کافی تفصیل کے ساتھ معلوم ہو گیا۔ باوجود ان تحقیقات۔ اور اعترافات خاص کے بھی اس مسئلہ میں نہیں معلوم سید صاحب نے اہل عرب کی مرویات کو پھر کس وجہ سے ناقابل اعتبار سمجھا۔ اور اُن کے بیان پر کوئی توجہ نہ فرمائی۔ بخلاف اس کے یہودیوں اور عیسائیوں کی مغویانہ مرویات کو آمنّا و صدّقنا کہہ کر تسلیم کر لیا۔ جن کے لغویات اور مہملات کو خصوصاً انبیا علیہم السّلام کی پاک سیرتوں کے متعلق اس زور و شور سے اپنے تنقیدانہ

مضامین تحقیق میں ابھی ابھی خود تحریر فرما چکے ہیں۔ اسکا باعث جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں اوپر لکھ چکے ہیں۔ سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم ہوتا۔ کہ سید صاحب نے اہل کتاب کے اتفاق اور مفسرین و محدثین کے اختلاف کی بنا پر اپنی رائے قایم کی ہے۔ جن میں سے ہم دونوں شبھوں کی تردید و تنقید پورے طور سے اوپر مندرج کر چکے ہیں۔

اول تو ہم نے توراۃ کی اصلی عبارات سے جو ثبوت مستنبط کیے ہیں۔ وہی کافی طور سے حضرت اسمٰعیلؑ علیہ السلام کو ذبیح اللہ ثابت کرتے ہیں۔ گو اُن پر اغوا اور عالم فریبی کے غلاف ضرور چڑھائے گئے ہیں۔ مگر جب تحقیق کا متلاشی اُن قرائن کو واقعات اور اصلی حالات سے ملائیگا۔ تو توراۃ کی بشارتیں اور اُن کے تمام قرائن حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ منطبق پائے گا۔ نہ جناب اسحاقؑ کے ساتھ۔

دوسرے اُن اُصول کے مطابق جو سید صاحب نے علم تفسیر۔ حدیث۔ سیر۔ تاریخ وغیرہ وغیرہ کی تحقیق و تنقید کے متعلق اپنے خطبات میں بڑے بڑے علمائے متکلمین کے اقوال سے نقل فرمائے ہیں۔ اتفاق اہل کتاب کے مسئلہ خاص کی حیثیت انھیں علماء کے مختار سے خود سمجھ لیں کہ تمام علمائے محدثین کا مسئلہ ہے

کہ الاتفاق اھل الکتاب لیس لہ اعتبار اتفاق اہل کتاب قابل اعتبار نہیں (زرقانی جلد اول)

اب سید صاحب مرحوم۔ ایسے پکے مسلمان ہو کر اس اتفاق پر اعتبار فرمائیں تو اسکو اُن کی تحقیقات کی خامی اور حقیقت امری سے ناکامی کے سوا اور کیا کہا جاوے۔ اتفاق اہل کتاب کی تو یہ کیفیت تھی۔ علمائے اسلام کے اختلاف کا باعث ہم اوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں۔ جس شبہ میں سید صاحب پڑ گئے ہیں۔ اُسی مغالطہ میں وہ حضرات بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ اُنکے تمام مرویات کی تنقید پوری تفصیل کے ساتھ اوپر قلم بند ہو چکی ہے اور اُن کی رواۃ کی جدا جدا تضعیف بھی لکھی جا چکی ہے۔ اور مرحوم سید صاحب بھی اس کے اصلی باعث کو سمجھ چکے ہیں۔ اور لکھ چکے ہیں۔ کہ شیوع اسلام سے قبل یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال کا تو روایات عرب میں کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ہاں ظہور اسلام کے بعد جب سے بانی علیہ السلام نے نبیائے سابقین علیہم السلام کی تصدیق فرمائی۔ اُسوقت سے یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال اسلام میں نقل ہونے لگے۔

اسی ضمن میں حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا مصنوعی واقعہ بھی حضرت اسمٰعیلؑ کے صحیح اور اصلی واقعہ قربانی کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔ اور نقل کرنے والے نے بلا تحقیق اور عدم واقفیت کی وجہ سے اسکو بھی حدیث رسولؐ ہی سمجھ لیا۔ اور اپنی تصنیفات و تالیفات میں ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کر دیا۔ بعض علمائے اہل اسلام کو حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے میں جو شبہ واقع ہوا۔

اُس کی وجہ یہی تھی۔ جو اُوپر لکھی گئی۔

قربانی کی حقیقت میں مولوی شبلی صاحب کی نئی اور قیاسی تاویل

ہم سید صاحب کی غلط فہمی کی کامل تنقید و تصحیح ختم کرکے اب ہم شمس العلما مولوی شبلی صاحب کی ایک تازہ تخئیل اور جدید تاویل کی تفصیل و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مولوی شبلی صاحب (چار ہزار برس کے بعد تقریبًا) اِس واقعہ قربانی کو خدا کا امر تمثیلی قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے موجودہ مختار کو قربانی کی حقیقت کے خاص عنوان سے مفصلہ ذیل عبارت میں ظاہر فرماتے ہیں۔

اِس مسلہ کی حقیقت اُسوقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ جب اُس پر غور کیا جائے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے اصلی مقصود کیا تھا۔ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنی اولاد کو اپنے معبود پر بھینٹ چڑھایا کرتی تھیں۔ یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی مخالفین اسلام کا خیال ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ اکابر صوفیہ نے لکھا ہے۔ کہ انبیاعلیہم السلام کو جو خواب دکھلائے جاتے ہیں۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عینی اور تمثیلی۔ عینی میں بعینہٖ وہی چیز مقصود ہوتی ہے۔ جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھلایا گیا۔ اُس سے مراد یہ تھی۔ کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھادیں۔ یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں کعبہ کی خدمت کے لیئے وقف کردیئے جائیں۔ توراۃ میں جابجا قربانی کا لفظ انہیں معنیوں میں آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس خواب کو عینی خیال کیا۔ اور بعینہٖ اُس کی تعمیل کرنی چاہی۔ گویہ خیال اجتہادی غلطی تھی۔ جو انبیا سے ہوسکتی ہے۔[له] (گو یہ غلطی قایم نہیں رہتی۔ بلکہ خدا اس پر اُنھیں متنبہ کردیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیمؑ اس فعل سے روک دیئے گئے۔ لیکن خدا نے اُن کے حسن نیت کی قدر کی۔ اور فرمایا کہ قد صدقت الرؤیا انا کذالک نجزی المحسنین تو نے خواب کو سچا کر دکھلایا۔ ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔

بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے۔ کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لیئے نذر چڑھانا تھا۔ نذر چڑھانے کے لیئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل ہوئے تھے۔ خدا کے سامنے تھے۔ توراۃ میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے

له سخت افسوس ہے کہ شمس العلما مولوی شبلی صاحب کو۔ باوجود اتنی استعداد و جامعیت کے جو اُن کی نسبت مشہور کی جاتی ہے۔ قدرت نبوت اور قوت اجتہاد کا فرق مابہ الامتیاز ابھی تک معلوم نہیں۔ وہ اصول اسلامیہ اور معتقدات ایمانیہ کے بالکل خلاف نبیؑ کو مجتہد سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو حضرت ابراہیم کے اس حسن تعمیل کو معمولی علما کی طرح خطائے اجتہادی سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور اتنا نہیں جانتے ہیں۔ کہ نبی کے ذریعہ معلومات بالکل وہبی طریقہ سے ہوتے ہیں۔ اور مجتہد کے وسیلہ اطلاع تعلیم و تدریس کے کسبیہ طریقہ سے۔ فافہم و تدبر۔ المولف عفی عنہ

حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔ لیت اسمٰعیل یعیش امامک کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔ اسی خواہش کے مطابق اُن کو خواب تمثیلی کے پیرایہ میں حکم دیا گیا تھا۔ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کریں۔　(سیرۃ النبیؐ ص ۱۰۶ و ۱۰۷ جلد اول)

یہ ہمارے مولوی شبلی صاحب کی طبعزاد تخئیل۔ اور نو ایجاد تاویل جو اُن کے اس مورخانہ مختار و معیار سے بالکل خلاف ثابت ہوتی ہے۔ جس کو انہوں نے اُصول تاریخ و سیرۃ نویسی کی نسبت اپنے دیباچہ کتاب میں نہایت شد ومد اور بڑی جد وکد سے قائم فرمایا ہے۔ اور یہ التزام و انتظام صرف زبانی دعووں میں ظاہر طور پر اپنی کتاب میں قائم رکھے جانے کا اقرار فرمایا ہے۔ کہ کوئی واقعہ تاریخی۔ جب تک کسی حدیث سے نہ ملا لیا جاوے۔ اور حدیث بھی کون۔ صحیح و مرفوع۔ اور وہ صحیح و مرفوع بھی کون۔ وہ جو کتب صحاح میں وارد ہو۔ کتب صحاح میں کون کتاب۔ صحیحین شریفین میں بھی کون۔ صحیح بخاری (مطلب سعدی ہمیں بود) میں ہو تب تک وہ واقعہ اسلامی تاریخ میں درج کئے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

مگر جہاں تک آپ کے اس شرط و اقرار پر غور کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اتنی کپاس کہانی اُوٹھنے کے بعد بھی شبلی صاحب نے اپنے اسناد و اشہاد کے لئے کوئی حدود و قیود قائم نہیں رکھے۔ بلکہ اپنے اسلاف کی تقلید میں جہاں سے اور جس کسی سے بھی آپ کو اپنے مطلب کی بات مل گئی۔ آپ کے لئے بس وہی وحی آسمانی ہو گئی پھر اُسوقت نہ صحیح بخاری سے تحقیق کی ضرورت رہی۔ اور نہ صحیح مسلم سے تصدیق و تطبیق کی حاجت۔ مثال کے لئے اکابر صوفیہ کی بلا سند اور غیر مفید اقوال کو خاص کر ایک ایسے مبحث اور مقصد کا اصل الاصول قرار دیا گیا ہے۔ جو اُسوقت سے لیکر اسوقت تک تمام فرقہائے اسلامی میں سے کسی فرقہ اور مذہب کے عالم اور محدث نے کہیں بھی نقل نہیں کیا ہے۔ اور جو بالکل معانی و مطالب قرآنی کے مخالف اور ارشاد و اقوال رسول صلعم کے معارض ثابت ہوتا ہے۔

تعجب ہے۔ کہ فاضل محقق نے کہاں تو اپنی تحقیق و تفتیش کے حدود و احتیاط کو مقدمہ کتاب میں اسقدر تنگ و محدود کر دیا تھا۔ کہ وہ اپنے ماخذوں میں سوائے چند قدیم عربی تاریخوں اور چیدہ چیدہ کتب صحاح کے اور کسی اسلامی تاریخ۔ حدیث اور سیر کی کتابوں سے استنباط و استخاذ کو گویا حرام فرما دیا ہے۔ کہاں اپنی اتنی بڑی اعلیٰ اور یکتا تحقیق ہیں۔ اِدھر اُدھر کے بے نام و نشان اسناد کی بھرتی کرنے لگے۔ کہ اُنکا شمار یہ صحیح۔ موثق۔ اور حسن وغیرہ میں کہاں تک ہو گا۔ مرسل۔ غریب۔ ضعاف اور احادیث میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی کوئی سند ہے۔ کہ اکابر صوفیہ کا قول ہے۔" استغفر اللہ۔ یہ اُس پایہ کے شخص کی سند ہے۔ جو تمام مستندین کے مقابلہ میں اپنی تحقیق و تلاش کو سب سے زیادہ معتبر و مستند بتلاتا ہے۔ اور جو اپنے مقدمہ کتاب میں اپنی ظاہری

شوکت الفاظ سے اور صرف زبانی سخن آرائیوں سے کسی تاریخ واقعہ کو تاوقتیکہ احادیث مندرجہ صحیح سے منطبق نہ کرے۔ قابل اندراج نہیں سمجھتا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تابہ کجا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

بہرحال مولوی شبلی کو اپنے اختیار کردہ طریقہ استخراج و استنباط کے بدلتے وقت اپنے اصل مدعائے حقیقت کو اگر نصوص الٰہی اور منشور حضرت رسالت پناہی سے منطبق کر لینے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ تو کم سے کم اُن کو علمائے محدثین اکابر مفسرین اور عمائد مورخین ہی کے اقوال و آراء سے ملا لینا تو ضرور تھا اور اگر کسی تفسیر۔ مسند۔ سُنن اور صحیح میں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تو اپنے مدعا کی تلاش صرف صحیح بخاری ہی میں کر لی گئی ہوتی۔ کیونکہ آپ کی تمام کائنات تحقیقات و معلومات تو اُسی کتاب پر ختم ہے۔ مگر نہیں معلوم۔ مولوی صاحب کو اکابر صوفیہ کے اس بلا سند قول پر کیسا فوق البشری جوش عقیدت آ گیا۔ کہ اُس ملاطم خیز عالم وجد میں۔ قرآن حدیث۔ اور اصح الکتاب بعد کتاب المباری بھی بالکل نسیاً منسیاً ہو گئی۔

علمائے کرام اسلام میں فریقین کے تمام متقدمین مفسرین محدثین اور مورخین سے لیکر متاخرین تک کی کثیر التعداد۔ قوی الاسناد تالیفات و تصنیفات اسوقت میرے پیش نظر ہیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ ہم اُنہیں سے کسی ایک کو بھی مولوی شبلی کا ہم خیال نہیں پاتے۔ کسی مفسر۔ محدث۔ اور مورخ نے اسوقت سے لیکر اسوقت تک قربانی کے واقعہ میں عینی اور تمثیلی کی دو وجہ اگانہ شاخیں نہیں نکالیں۔ اور اُس نبی برحق۔ حکمت الٰہی کے مصدق پر۔ اصل مطالب و مقاصد وحی کے سمجھنے میں غلطی کا الزام نہیں لگایا۔ اور نہ اپنے کسی عقلی و نقلی بیان میں کسی ضعیف سے ضعیف اور احاد سے احاد طریقہ روایت سے بھی اشارتاً و کنایتاً ذکر نہیں فرمایا۔

تخطیۂ انبیا علیہم السلام کا مسئلہ مولوی صاحب کے ہاں کا ایک اختلافی مسئلہ ضرور ہے۔ مگر قاضی عیاض اور امام فخر الدین رازی اِس کو بہت کچھ صاف بھی کر چکے ہیں۔ اِس اختلاف اور اشباہ بین النفی والایجاب کی رو سے۔ اگر شبلی صاحب حضرت ابراہیمؑ کے خطا کرنے کے قائل ہیں۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور نہ مجھے اُن کے خاص عقائد میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مگر جو کچھ کلام ہے۔ اور جو کچھ افسوس ہے وہ مولوی شبلی صاحب کی اسلامی عقائد سے عدم واقفیت پر۔ جو آج تک انبیا اور مجتہد کا بھی فرق نہیں جانتے ہم اُن کی یاد دہانی کے لیے اُنھیں کی کتاب الکلام سے صرف دو شہادتیں جو صفات نبوت کی تحقیق میں لکھی گئی ہیں۔ ذیل میں نقل کیے دیتے ہیں۔ علم الکلام حصہ دوم میں شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ کہ امام غزالی نے احیاء العلوم کے شروع میں ایک ضمنی بحث میں لکھا ہے۔

وَكَيْفَ يُنْكِرُ تَفَاوُتَ الْغَرِيْزَةِ وَلَوْلَا كَمَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي فَهْمِ الْعُلُوْمِ وَلَمَا انْقَسَمُوْا إِلَى	فطرت کی تفاوت کا کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔ یہ تفاوت نہ ہوتی۔ تو علوم کے سمجھنے میں اختلاف مراتب کیوں ہوتا۔ اور یہ بات

بَلِيدٍ لَا يَفْهَمُ بِالتَّفْهِيمِ إِلَّا بَعْدَ تَعَبٍ طَوِيلٍ مِنَ الْمُعَلِّمِ وَإِلَى ذَكِيٍّ يَفْهَمُ بِأَدْنَى رَمْزٍ وَإِشَارَةٍ وَإِلَى كَامِلٍ يَنْبَعِثُ مِنْ نَفْسِهِ حَقَائِقُ الْأُمُورِ دُونَ التَّعَلُّمِ كَمَا قَالَ تَعَالَى يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ وَذَالِكَ مِثْلُ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ إِذْ يَتَّضِحُ لَهُمْ فِي بَوَاطِنِهِمْ أُمُورٌ غَامِضَةٌ مِنْ غَيْرِ تَعَلُّمٍ وَسَمَاعٍ وَيُعَبَّرُ ذَالِكَ بِالْإِلْهَامِ وَعَنْ مِثْلِهِ عَبَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ قَالَ إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي

کیوں ہوتی۔ کہ بعض آدمی ایسے کودن ہوتے ہیں۔ جو اُستاد کے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے بھی ہیں۔ تو مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اور بعضے ایسے ذہین ہوتے ہیں۔ کہ ذرا سے اشارہ میں سمجھ جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے کامل ہوتے ہیں۔ کہ خود اُنکی طبیعت سے حقائق امور پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ خدائے تعالےٰ نے کہا ہے یکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسہ نار اور انبیاء علیہم السلام کا یہی حال ہے۔ ان کے دل میں دقیق باتیں خود بخود بغیر سکھانے اور سُننے کے روشن اور ظاہر ہو جاتی ہیں اور اسی کو الہام کہتے ہیں۔ اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے۔ کہ روح القدس نے میری روح میں پھونکا۔ علم الکلام ص ۱۰۰

امام غزالی کے قول کے بعد تحریر کرتے ہیں۔ کہ محدث ابن حزم نے نبوت کی یہ حقیقت بیان کی ہے۔ کہ بغیر تعلم وتعلیم کے علم حاصل کرے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

نَعَمْ إِنَّ النُّبُوَّةَ فِي الْإِمْكَانِ وَهِيَ بِعْثَةُ قَوْمٍ قَدْ خَصَّهُمُ اللّٰهُ تَعَالَى بِالْفَضِيلَةِ لَا لِعِلَّةٍ إِلَّا أَنَّهُ شَاءَ ذَالِكَ فَعَلَّمَهُمُ اللّٰهُ الْعِلْمَ بِدُونِ تَعَلُّمٍ وَلَا تَنَقُّلٍ فِي مَرَاتِبِهِ وَلَا طَلَبٍ لَهُ وَمِنْ هٰذَا الْبَابِ مَا يَرَاهُ أَحَدُنَا فِي الرُّؤْيَا فَتَخْرُجُ صَحِيحًا

یہ بات ثابت ہوئی۔ کہ نبوت ممکن ہے۔ اور نبوت کے معنی یہ ہیں۔ کہ خدا ایک گروہ کو مبعوث کرتا ہے۔ اور ان کو فضیلت کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ نہ کسی علت کی وجہ سے۔ بلکہ صرف اپنی مرضی کی وجہ سے۔ خدا ان کو علم سکھلاتا ہے۔ بغیر سیکھنے کے۔ اور بغیر درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور بغیر طلب کے اور یہ اُسی طرح کی بات ہے۔ جس طرح ہم لوگ خواب میں کچھ دیکھتے ہیں۔ اور وہ صحیح نکل آتا ہے۔

پھر اُسی سلسلہ میں محدث ابن حزم کا بقیہ قول لکھا ہے۔

فَوَجَبَ بِالضَّرُورَةِ إِنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ إِنْسَانٍ وَاحِدٍ فَأَكْثَرَ عَلَّمَهُمُ اللّٰهُ ابْتِدَاءً كُلَّ هٰذَا دُونَ مُعَلِّمٍ لٰكِنْ بِوَحْيٍ حَقَّقَهُ عِنْدَهُ وَهٰذِهِ الصِّفَةُ النُّبُوَّةُ

تو یہ بات ضروری ٹھہری کہ ایک یا ایک سے زیادہ اس قسم کے لوگ پائے جائیں۔ جن کو خدا نے یہ علوم وصنائع ابتداءً بغیر کسی معلم کے خود اپنی وحی سے سکھلائے۔ اور یہی نبوت کی صفت ہے۔ علم الکلام ص ۱۰۲

لیکن شبلی صاحب کسی مجتہد کو ان اوصاف مخصوصہ اور کمالات مخصوصہ کے ساتھ موصوف ہونا۔ قیاست

تک ثابت کر سکتے ہیں۔ لا و اللہ۔

افسوس ہے۔ کہ ابھی تک شبلی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ انبیا علیہم السلام کی ان فروگذاشتوں کو اصطلاح شرعیہ میں کیا کہتے ہیں۔ اور معمولی علماء مجتہدین کی عام غلطیوں کا کیا نام ہے۔ یہانتک تو فریقین کا مسلم ہے۔ کہ انبیا علیہم السلام مجتہد نہیں۔ کیونکہ اُن پر بلا فصل و واسطہ وحی الہی اور ترقی ہے اور اُن کے تمام معلومات احکام و ارشاد۔ افعال و اقوال تعلیم وحی کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ سوائے روحانی اور آسمانی بشارتوں کے کسی انسانی ذریعہ و واسطہ کے متبع اور محتاج نہیں ہوتے۔ ان کے معلومات وہبی ہوتے ہیں۔ نہ کسبی مجتہد تو نبی اور اس کے بعد لگاتار تمام جائز الخطا انسانی ذریعوں اور بے شمار طریقوں کے نقل و اتباع کا متبع اور مقلد ہے۔ جس نے اپنے معلومات کو غیر مقید اور غیر محفوظ الخطا وسائل سے حاصل کیا ہے۔ اگر شبلی صاحب کے ایسے انبیا کو مجتہد تسلیم کر لیا جائے۔ تو تمام دُنیا کے علماء و مجتہدین کو گھر بیٹھے نبوت ملجائے۔ اور پھر نبی اور مجتہد کا فرق مابہ الامتیاز دشوار و محال ہوجائے۔

افسوس ہے۔ کہ مناسبت مقام ہم کو۔ مناصب نبوت۔ مدارج رسالت اور درجہ اجتہاد کے باہمی امتیاز و اختلاف اور اُن کی حقیقت و ماہیت جداگانہ کی تفصیلی کیفیت درج کرنے کی فی الحال اجازت نہیں دیتی۔ ورنہ ہم مولوی صاحب کو حقیقت حال کا پورا کشفہ اور مشاہدہ کرا دیتے

قبل اس کے کہ ہم شبلی صاحب کی اس غلط تاویل پر تنقید و تردید کا قلم اُٹھائیں ہمکو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم مولوی صاحب کے ایسے جدید محقق کے ایسی عامیانہ غلط فہمی کا اصلی سبب دریافت کریں ہم آپکی اس غلط تاویل کی جب پوری عبارت پڑھتے ہیں۔ تو معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ آپ کی اس غلط فہمی کا باعث بھی وہی اہل کتاب کی کورانہ تقلید اور علمائے تصوف کے ظنیات کی بے موقع تائید ہے۔

جب اہل کتاب کے متعلق تبدیلی واقعات اور تغیر حالات کی وجہ تحقیق کی جاتی ہے۔ تو پورے طور سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ چونکہ بیت المقدس پر چڑھانے۔ یا اُس کی خدمتوں کے لیئے وقف کر دیئے جانے کے رسم و رواج یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں جاری تھے۔ اور اُن کے اُنھیں اُصول موضوعہ سے تجرد و تجرد۔ اور حصور کے جداگانہ طبقے اور فرقے قائم ہوئے۔ اور آگے چلکر اِنہیں کی بنا پر۔ رُہبانیت۔ شریعت عیسوی میں جزو مذہبی قرار پاگئی۔ اِس لیئے یہودیوں اور عیسائیوں نے اِس قربانی کو عموماً اُنھیں معنیوں میں سمجھا۔ اور دُنیا کو سمجھایا۔ اور خصوصاً اپنے تعصب و نفسانیت کی وجہ سے خاص کر ایسی غلط تاویل کے لیئے وہ مجبور ہوئے کیونکہ حضرت اسحاقؑ کے متعلق کسی طرح واقعہ ذبح ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ اصل واقعہ قربانی کو اُن سے کوئی واسطہ تھا۔ اور نہ اُس کے متعلق سعی۔ طوف اور رمی الجمرات وغیرہ کے مناسکات کو اُن سے کوئی تعلق تھا۔

یہ دیکھکر یہودیوں اور عیسائیوں نے۔ کہ اصل واقعہ کو۔ جزواً یا کلیتاً۔ حضرت اسحاقؑ سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں ہے۔ اصل واقعہ کی عملی صورت سے انکار کر دیا۔ اور اُس کو ایک دوسری صورت خاص میں بدلدیا۔ مگر دروغگورا حافظہ نہ باشد۔ اس غلط تبدیلی واقعہ کے وقت اسکا خیال ہی نہیں رہا۔ کہ قربانی کی یہ صورت تو حضرت ابراہیمؑ سے ڈیڑھ ہزار برس بعد۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیانی زمانہ کی ایجاد ہے۔ اس سے قبل تو توراۃ میں بھی کہیں اس کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ پھر ایک ایسی صورت حال کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کے زمانہ کی طرف منسوب کرنا سوائے تعصب اور جہالت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

حقیقت حال سے ناواقف کاروں اور تعصب و نفسانیت کے قلم کاروں نے ذبح و قربانی کی اصلی اور عملی صورت کو۔ انداز اور احرار کی صورت و شکل میں تبدیل کر دیا۔ جو بمقابلہ ذبح۔ عام فہم اور بالکل قریب الامکان تھی۔ حسن اتفاق سے اہل تصوف نے بھی اپنی ظاہری ترک تعلق کی پرجوشیوں میں تجرد اور رہبانیت کے طریقوں کو اختیار کیا۔ اور لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ کی تاکید پر کوئی اعتنا نہ فرمائی۔ نہ خدا کے حکم و ہدایت پر کوئی توجہ کی۔ اور نہ رسولؐ کی خاص سیرت پر کوئی نظر

شبلی صاحب نے اہل کتاب اور اہل تصوف کے اس غلط اتحاد فی الخیال سے یہ دھوکا کھایا ہے۔ ورنہ اگر مولوی شبلی کورانہ تقلید چھوڑ کر آزادانہ تحقیق سے کام لیتے۔ تو وہ فوراً سمجھ جاتے۔ کہ حریت یا خدمت کعبہ کے لیئے وقف کر دیئے جانے کی خدمت اور عملی صورت نص الٰہی اور حکم رسالت پناہی سے مستنبط و مستخرج ہوتی۔ اور جواز کا حکم رکھتی۔ تو آپ کا رسول آپ کا نبی برحق۔ جو مذہب ابراہیمیؑ کا مروج اور شریعت اسمٰعیلیؑ کا اصلی مجدد تھا۔ اور جس نے اسلام کو مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (اسلام) تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب ہے۔ اُسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔) کی بشارت پہونچا کر شریعت ابراہیمیؑ اور اسلام کو فی اصلہ ایک ہی بتلایا تھا۔ تو اُس کے لیئے ضرور تھا۔ کہ اُس نے اپنے عہد رسالت میں جس طرح شریعت ابراہیمیؑ کے اور ارکان۔ قربانی مناسکات۔ حج اور دیگر اخلاقی اور مذہبی مراسم و عقائد کو از سر نو زندہ کرکے اسلامی شریعت میں داخل فرمایا تھا۔ اُسی طرح خدمت کعبہ کے لیئے وقف اولاد والے مسئلہ کی بھی تعلیم فرما دیتا۔ اور اپنے اقوال و ارشاد میں جناب ابراہیمؑ کی اس غلطی اور سوء فہمی (معاذ اللہ) کو اشارتاً و کنایتاً بیان کرکے واقعہ ذبح کی حقیقت الامری کا (شبلی صاحب کی طرح) پورا انکشاف کر دیتا۔ مگر نعوذ باللہ۔ رسول سے بھی اتنی رہ ہی گئی۔ جس کو شبلی صاحب اور اُن کے اکابر صوفیہ نے خیر پوری کر دی۔ مگر ہم کہتے ہیں۔ رسول سے کیا۔ معاذ اللہ خدا سے بھی رہ گئی۔ کہ اُس نے (نعوذ باللہ) یہ سمجھکر بھی کہ ہمارا محدود عقل والا

رسولؑ علم الرویا کے اقسام و اصناف اور اُن کے اختلاف کی تمیز و معرفت نہیں رکھتا۔ تاہم اُسکو مدعائے حقیقت اور منشائے قدرت سے مطلع اور آگاہ نہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کا شیدائی اپنی غلط فہمی اور لاعلمی سے اتنے بڑے خلاف فطرت انسانی زقتل اولاد کی شقاوت و بیرحمی پر جرأت کر بیٹھا۔ تب اُس وقت خدا کو رسولؑ کی فروگذاشت کے ساتھ اپنی خاموشی اور عدم اطلاع دہی کا خیال آیا۔ اور اُسکو قتل عمد کے ارتکاب سے روکدیا مگر روک دیئے جانے کے وقت بھی خدا کو اصل حقیقت کے انکشاف فرما دیئے جانے کا خیال نہ آیا۔ ارشاد ہوا۔ تو یہ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھلایا۔ اور ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اس سے بھی خواب عینی اور تمثیلی کی حقیقت بتلائی جانے کی کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی۔

خدا کا فرض تھا۔ کہ اس قیامت خیز منظر کے وقت یا بعد اپنے رسولؑ کو سمجھا دیتا۔ اور بتلا دیتا۔ اور رسولؑ پر واجب تھا۔ کہ اپنے نذر چڑھائے ہوئے بیٹے کو اُس دن سے کیا۔ اُسی وقت سے خدمت کعبہ کے لیئے وقف کر دیتا۔ اور اُس مقدس چار دیواری کے اندر لاکر بٹھلا دیتا۔ اور پھر اُس کو سوائے خدمت کعبہ کے اور کسی شغل میں مصروف نہ ہونے دیتا۔ جیسا کہ مولوی شبلی نے بمطابقت احکام توراۃ نذر یا قربانی چڑھائے ہوئے لوگوں کے اُصول و قواعد بتلائے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات و حالات میں سے ایک واقعہ بھی حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے احوال معاشرت کے متعلق اہل عرب کے کسی اخبار و آثار میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اور کسی محدث یا مورخ نے اشارتاً یا کنایتاً بھی ان لغویات و مہملات کا جو شبلی صاحب کی جدت و جودت کا تازہ نمونہ ہے۔ ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا۔ جیسا کہ مولوی شبلی صاحب نے اکابر صوفیہ کے کابوسانہ مکاشفات سے اقتباس فرمایا ہے۔ تو پھر حضرت اسماعیلؑ کے طرز معاشرت بھی ایسے ہی معلوم ہوتے۔ جیسے قوم بنی اسرائیل میں۔ محررین بیت المقدس کے طرز زندگی معلوم ہوتے ہیں۔

بخلاف اسکے جب ہم حضرت اسمٰعیلؑ کے حالات پر نظر کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ۔ استغفر اللہ۔ نہ محرر تھے۔ نہ مجرد۔ ایک چھوڑ دو دو بی بی والے تھے۔ چنانچہ اُن کی پہلی شادی تو بروایت توراۃ خود حضرت ہاجرہ نے کر دی تھی۔ دوسری بی بی حضرت ابراہیمؑ کے حکم و ایما سے کی تھی۔ چنانچہ ہم اس کا پورا واقعہ صحیح بخاری کی عبارت سے اُوپر لکھ چکے ہیں۔ اور خلاصہ ترجمہ اُسکا بقدر ضرورت پھر ذیل میں لکھے دیتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم حضرت اسماعیلؑ کی غیبت میں تشریف لائے۔ اور اُن کی پہلی بی بی کے اکرام ضعیف اور دیگر خوش اخلاقیوں میں کمی پائی۔ تو اُن کی بی بی سے فرما گئے۔ کہ جب اسمٰعیلؑ شکار سے واپس آئیں تو اُن سے کہدینا کہ اپنے گھر کے کواڑ

بدل ڈالو۔ حضرت اسماعیلؑ کی واپسی پر اُن کی بی بی نے حقیقت حال اُن سے بیان کر دی۔ حضرت اسماعیلؑ نے اُن سے کہا۔ کہ کواڑ کی تبدیلی کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ تمہاری تبدیلی کا فرمان ہے۔ اُسی وقت اُن کو جُدا کر دیا۔ اور بنی جرہم سے ایک معظمہ کو اپنے عقد ازدواج میں لائے۔

انہیں بی بی سے آپ کے بارہ۱۲ بیٹے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ توراۃ میں اُن کی یہی تعداد اُن کے ناموں کے ساتھ درج ہے۔ اِس کے علاوہ توراۃ میں خدا تو حضرت ابراہیمؑ کے پہلے ہی سے آپ کے کثیر الاولاد اور پھر اُنکے امت عظیم ہونے کی بشارت دے چکا تھا۔ پھر آپ کا محرر رہنا۔ جو نذر کردگانِ خانۂ مقدس کے شرائط میں ایک ضروری اور واجب التعمیل شرط تھی۔ حضرت اسمٰعیلؑ پر کیسے منطبق کی جائے گی۔ آپ کا یہ طریق معاشرت محرران بیت المقدس کی عادت و سیرت کے بالکل خلاف ثابت ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے۔ کہ اُس وقت تک مجرّد رہنے کی شرط اس کے لیئے خاص نہیں ہوئی تھی۔ اور یہ بعد میں لازمی قرار پائی۔ جیسے یحییٰ اور مریم علیہما السّلام کے لیئے۔ تو ہم اس کو بھی تھوڑی دیر کے لیئے مان کر یہ دکھلائیں گے۔ کہ جیسا کہ شبلی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں "کہ مراد یہ ہے۔ کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیئے نذر چڑھاویں۔ یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں۔ بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیئے وقف کر دیئے جائیں" حضرت اسماعیلؑ نے انکی بھی تو مطلق تعمیل نہیں کی۔ اور نہ کبھی ان قیود پر اعتنا فرمائی۔ واقعات تو یہ بتلا رہے ہیں۔ کہ وہ کعبہ اور کعبہ کی تمام خدمات کو چھوڑ کر دن دن بھر باہر شکار کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بار تشریف لانے کے وقت آپ صبح سے شکار کو گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کے الفاظ ذَهَبَ يَصْتَيِدُ سے ظاہر ہے۔ تو اب مولوی شبلی کی یہ مقررہ شرط و قید کہ وہ کسی اور شغل میں مصروف نہوں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت کہاں ثابت ہوتی ہے۔ شبلی صاحب کی قیاسی اقتباسات کے خلاف حضرت اسمٰعیلؑ تو ان حالات مندرجہ بخاری شریف سے۔ شکار کار بیکاراں است کے ایسے معمولی کاروبار اور لہو و لعب میں روزانہ مشغول پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے۔ یہ کیسے خادم کعبہ تھے۔ اور اُنکی خدمت کیسی خدمت کعبہ تھی۔ اِن سے زیادہ تعجب تو حضرت ابراہیمؑ کے تغافل و تساہل پر ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے قربان شدہ اور وقف کردہ لڑکے کو ایک بار نہیں کئی بار۔ خدمت کعبہ کو چھوڑ کر شکار کے ایسے لہو و لعب میں مصروف و مشغول سن کر اور پا کر بھی۔ اُن کے منع کرنے اور باز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور اُن کے ایسے صریح خلاف معاہدہ و شرائط احوال و افعال سُن کر تنبیہہ بھی فرمائی۔ تو یہ کہ تمہاری یہ بی بی اچھی نہیں۔ دوسری بدل ڈالو۔

حضرت اسماعیلؑ کے مشاغل صید و شکار میں مصروفیت۔ آپ کے طرز معاشرت کے ساتھ ایسی مخصوص

اور قدیم ہے۔ کہ توراۃ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کے حالات میں یہ عبارت مسطور ہے۔

خدا اس لڑکے (اسمٰعیلؑ) کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا ہوا۔ اور بیابان میں آباد و مقیم ہوا۔ اور (بہت بڑا) تیر انداز ہوا۔ سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۹ لغایۃ ۲۱۔

اِس کے علاوہ حضرت اسماعیلؑ کا ایک زمانہ دراز تک۔ دیگر انبیا علیہم السّلام کی طرح دُنبیاں چرانا تمام تاریخوں سے ثابت ہے۔ یہ مشاغل بھی شرائط انذار اور قواعد احرار کے سراسر مخالف ہیں۔

الغرض حضرت اسماعیلؑ کے حالات زندگی پر غور کرنے سے آپ کے طرز معاشرت بھی بالکل انبیاؑ و مرسلین کی عادت وسیرت سے مطابق اور موافق پائے جاتے ہیں۔ اور اُن میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور کوئی نوعیت سر مو پائی نہیں جاتی۔ عبادت الٰہی۔ تبلیغ رسالت۔ ہدایت اُمّت کے روزانہ اشغال کے ساتھ فکر معاش بھی ہے اور خبر گیری اہل وعیال بھی۔ اور یہ اُمور بھی انسانی فرائض میں دیگر واجبات کی طرح داخل ہیں۔ اِن تمام فرائض منصبی کے ساتھ بنائے کعبہ کے وقت سے۔ کعبہ کی خدمات مثل طواف۔ سعی۔ ہدیٰ اور رماۃ وغیرہ وغیرہ۔ جس کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ خود آپ کو دے چکے تھے۔ آپ سے متعلق تھیں۔ مگر یہ تمام خدمات ایام حج کے ساتھ مخصوص تھیں۔ کسی روزانہ خدمت کعبہ کا آپ سے متعلق ہونا۔ جس سے انذار و احرار کے انداز مترشح ہوں۔ اور اُس خدمت مخصوصہ کو آپ کا روزانہ بجالانا نہ کسی اسلامی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور نہ توراۃ سے ثابت۔ نہ اِس کی تخصیص کسی محدّث اور مورّخ کی تصنیفات و تالیفات میں پائی جاتی ہیں۔ اور نہ کسی اکابر صوفیہ اور نہ کسی شیخ الطائفہ کے ملفوظات سے۔ ایسی حالت میں شبلی صاحب کے اِس بے نام و نشان اور مفقود الاسناد قیاس واقتباس کا کیسے اعتبار ہو سکتا ہے۔

مولوی شبلی کی یہ تاویل اصریح مخالف قرآن اور معارض حدیث ثابت ہوتی ہے۔ خدا تو اپنے خاص لفظوں وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ کہہ کر۔ خاص ذبح کی صورت قائم کرے اور پھر اِس سارے واقعہ کو اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ظاہر ترین امتحان قرار دے۔ اور آپ اور آپ کے بزرگ صوفیہ ایسی تصریح کامل اور تنبیہ عینی کو تمثیلی صورت قرار دے کر ناقص کر دیں۔ اور (نعوذ باللہ) سکو رسول کی اجتہادی غلطی پر محمول فرمائیں۔

شمس العلمائے نعمانی نے۔ افسوس ہے۔ کہ عبارت قرآنی کو نظر انداز فرما کر الفاظ توراۃ کو اپنے استدلال کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ (توراۃ میں جابجا قربانی لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ سیرت النبیؐ ص ۱۰۶)

اِس سے معلوم ہوا۔ کہ آپ اپنے اِس دعوے کا ثبوت قرآن مجید کی عبارت سے نہیں دیکھتے۔ جب یہ صورت ہے۔ کہ آپ کیسے قرآن کو تمام کتب سابقہ کا ناسخ مانکر۔ منسوخ شدہ کتاب اور اُس کی عبارت کو اُسکے

ناسخ پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیا شبلی صاحب تفضیل مفضول کے محالات کے قائل نہیں ہیں۔ شبلی صاحب تو بہت بڑے اسلامی عالم تھے۔ اور عالم بھی کون۔ شمس العلماء مشہور و معروف محقق۔ بڑے پایہ کے مورخ۔ مگر اس بحث خاص میں تو آپ کے عقائد ایسے فاسد اور قرآن و حدیث کے مخالف پائے جاتے ہیں۔ کہ شاید کوئی جاہل سے جاہل اور بے پڑھا لکھا مسلمان بھی ایسے عقائد نہ رکھتا ہوگا۔ اور قرآن کی عبارت و منشاء کے مقابلہ میں توراۃ و انجیل کی منسوخ شدہ عبارتوں کو کبھی ترجیح نہ دیتا ہوگا۔

بہرحال اتنا لکھکر۔ ہم قرآن مجید کی اُس آیت کو۔ جسے شبلی صاحب نے اپنے مطلب نکالنے کی غرض خاص سے قطع و برید کرکے لکھا ہے ذیل میں لکھتے ہیں۔

قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی

(جب ابراہیمؑ کو بادشاہ بت پرست کے خوف سے باپ نے گھر سے نکالدیا) تو ابراہیمؑ نے کہا۔ کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ میں (کسی طرف کو) چلا جاؤنگا۔ وہ مجھے (کسی اچھے ہی ٹھکانے) لگا دے گا۔ اور (ابراہیمؑ نے یہ بھی دعا مانگی) اے میرے پروردگار مجھکو (نیک روحوں میں سے ایک نیک روح بطور فرزند) عطا فرمایا تو ہم نے اُسکو بُردبار لڑکے (اسمٰعیلؑ کے پیدا ہونے کی) بشارت دی۔ پھر جب لڑکا جوان ہوا۔ اور اُس کے (ابراہیمؑ کے) ساتھ چلنے پھرنے لگا۔ تو ابراہیمؑ نے کہا کہ خواب میں کیا دیکھتا ہوں۔ کہ (جیسے) میں تمکو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم (بھی تو اپنی جگہ) سوچو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ (ترجمہ مطابق ترجمہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب)

چونکہ مولوی صاحب اپنی خود غرضانہ ضرورت سے اس آیت کے یہیں تک لکھنے پر مجبور تھے۔ اسلئے یہیں تک لکھکر رہ گئے۔ مگر ہم ذیل میں یہ پورا آیہ کریمہ نقل کرکے حقیقت حال اور صورت واقعہ کا پورا انکشاف کر دیتے ہیں۔

قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ وَ

(جب ابراہیمؑ کو بادشاہ بت پرست کی خاطر سے باپ نے گھر سے نکالدیا) تو ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ میں (کسی طرف کو) چلا جاؤنگا۔ وہ مجھے (کسی اچھی ہی) ٹھکانے لگا دیگا۔ اور (ابراہیمؑ نے یہ بھی دعا مانگی۔) اے میرے پروردگار مجھکو نیک روحوں میں ایک نیک روح بطور فرزند) عطا فرما۔ تو ہم نے اُس کو ایک بردبار لڑکے (اسمٰعیلؑ کے پیدا ہونے کی) خوشخبری دی۔ پھر جب لڑکا جوان ہوا اور اُسکے (ابراہیمؑ کے) ساتھ چلنے پھرنے لگا۔ تو ابراہیمؑ نے کہا بیٹا کہ میں خواب میں (دیکھا) دیکھتا

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ | دیکھتا ہوں (جیسے کہ) میں تمکو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم (بھی) تو ہی بتاؤ سوچو کہ تمہاری کیا رائے ہے (بیٹے نے) کہا۔ ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے۔ (بلا تامل) اس کی تعمیل کیجئے۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر (ہی) پائیں گے۔ پھر جب دونوں باپ بیٹے تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے۔ اور باپ نے (حلال کرنے کے لیئے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا۔ تو (ہمکو ان کی فرمانبرداری نہایت ہی پسند آئی) اور ہم نے ابراہیم سے پکار کر کہا۔ کہ ابراہیم تم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھلایا۔ (اب ہم تم کو بڑے بڑے مراتب دیں گے) اور نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیں گے۔ بیشک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اور ہم نے بڑی قربانی کو اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنایا۔ اور (ابراہیم کے بعد) آنے والی امتوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔

(الصافات ترجمہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب مطبوعہ دہلی ص ۷۱۹)

اس آیہ قرآنی پر غور کرنے سے پہلے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ شبلی صاحب نے لفظ ذبح کے معنی۔ خدمت کعبہ کے لیئے وقف کر دیئے جانے کے۔ بتلائے ہیں۔ اور آپ کو لفظ ذبح کے یہی صحیح معنی۔ اصلی مراد اور حقیقی مدعائے وحی ہونے پر اتنا یقین کامل ہے۔ کہ (نعوذ باللہ) آپ کے نزدیک جناب ابراہیمؑ بھی اسکی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ اور آپ سمجھ گئے۔ تو اس بنا پر شبلی صاحب کے نزدیک کسی کو ذبح کر دینا۔ اور کسی کو کعبہ کی خدمت خاص کے لیئے علیحدہ کر دینا گویا ایک بات ہوئی۔ ؏ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔ کہاں کسی کا ذبح کیا جانا۔ کسی کی جان لی جانا گو وہ خدا ہی کے نام پر کیوں نہ ہو۔ کسی کی زندگی کو ہمیشہ کے لیئے تمام کر دینا۔ اور کہاں ایک شخص خاص کا ایک خدمت خاص کے لیئے مختص اور منفرد ہو کر محض بے تعلق بے لوث اور بالکل آزادانہ زندگی بسر کرنا۔

شبلی صاحب کی روح نہ شرمائے۔ وہ کون ایسا لاعقل انسان ہوگا۔ جو ان دونوں متضاد طریقوں کو مساوی اور برابر سمجھے گا۔ اور وہ کون ایسا فاتر العقل ہوگا۔ جو ان دونوں مختلف الفاظ کو مترادف اور متجانس بتلائے گا۔ اتنا تمہید لکھکر اس بحث کا آئندہ سلسلہ بیان ملاحظہ ہو۔

اس آیہ کریمہ کے دو مقامات پر ذبح کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ اِنِّیْٓ اَذْبَحُكَ کی صورت میں اور دوسری جگہ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی مطلق اور غیر مشتق صورت میں۔ پہلی جگہ۔ جیسا کہ شبلی صاحب کے ہمعصر شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے ثابت ہے۔ خدا کے بتلائے اور سمجھائے ہوئے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ میں تم کو (گویا) ذبح کر رہا ہوں۔ دوسری جگہ یہ معنی ہوئے۔ کہ ہم نے بڑے ذبح کو اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنایا۔

یہ تو خدا کے معنی ہوئے۔ مولوی شبلی صاحب کے یہ معنی ہوئے۔ پہلی جگہ پر کہ میں تمکو خدمت کعبہ کے لیئے نذر یا وقف کر رہا ہوں۔ دوسری جگہ یہ معنی ہوئے۔ کہ ہم نے بڑے وقف کو اسمٰعیلؑ کا فدیہ بنایا۔ اور پھر

آگے چلکر خدا کے ذبح عظیم اور مولوی صاحب کے وقف عظیم والے مبتدا کی خبر آخر فقرہ آیت
وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سے یہ نکلی کہ ہم نے آنے والی اُمتوں میں۔ اِسکا ذکر خیر باقی چھوڑا
اب نتیجہ ہے شبلی صاحب خود سمجھ لیں۔ کہ آنے والی اُمتوں یا قوموں میں اس واقعہ کی یاد اور اس ایثار ابراہیمی
کا احیا۔ آجتک ذبح کی عینی صورت میں کیا جاتا ہے یا وقف ونذر خدمت کعبہ کے تمثیلی پیرایہ میں کیا کوئی مسلمان
کہہ سکتا ہے۔ کہ کبھی اُس نے موسم حج میں جانوران قربانی کو ذبح کرنے کی جگہ اپنی اولاد واحفاد میں
سے کسی کو خدمت کعبہ کے لیئے وقف کرکے اپنے مناسکات حج کو تمام کردیا ہے۔ یا کوئی اسلامی عالم یا فقیہہ
یا اگر خود شبلی صاحب بقید حیات ہوتے۔ تو من حیث الفقیہہ والعالم۔ کسی مرد مسلم کو قربانی کے عوض
اپنی اولاد کو خدمت کعبہ کے لیئے وقف کردینے کا فتوی دیسکتے تھے۔

اب مرقومہ بالا آیہ کریمہ میں جو ذبح اسماعیلؑ کی تفصیل ہے۔ اور جس کو ہم نے ترجمہ کے ساتھ اوپر لکھدیا ہے
شبلی صاحب کے کہیں ان مطالب نو ایجاد اور مقاصد طبعزاد کا نام ونشان تک پایا جاتا ہے۔ اور اُسکے
کسی لفظ اور کسی حرف سے شبلی صاحب کے تبلائے ہوئے معنی منطبق ہوتے ہیں۔ بلکہ بخلاف اُن کے
بتلائے ہوئے معنی کے۔ اِس آیہ وافی ہدایہ کے الفاظ تو صاف صاف تبلا رہے ہیں۔ کہ خواب میں جناب
ابراہیم کو حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہی کا خاص حکم دیا گیا تھا۔ اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے خدا یا خانہ
خدا کے لیئے وقف یا تعین کیئے جانے کا۔

ہم تھوڑی دیر کے لیئے شبلی صاحب کے اِس قیاس کو مان لیتے ہیں۔ کہ اس آیہ کریمہ میں جو ذبح کا لفظ ہے
وہ ابراہیمؑ کی زبانی ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ (نعوذ باللہ) غلطی سے اسکو ذبح کی اصلی صورت سمجھے تھے
اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ وہ تمام اُمور عمل میں لائے
جو ایک ذابح ذبیحہ کے ساتھ عمل میں لاتا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ تعجب سے تعجب ہے۔ کہ
ابراہیمؑ سے زیادہ تو ابراہیمؑ کا خدا بے درد نکلا۔ جو باوجود اِس علم مطلق کے کہ ابراہیمؑ انسان ہے۔ انسان
کی سمجھ کتنی۔ اپنی غلط فہمی سے میرے حکم کے مدعائے اصلی کے خلاف۔ ذبح فرزند کی کیسی بے دردی کررہا ہے
مگر وہ خدا جو ارحم الراحمین ہے۔ خیر الحافظین ہے۔ جس کے اوصاف راحم الشیخ الکبیر تبلائے جاتے ہیں۔
اور رازق الطفل الصغیر وہ اِن تمام خونی منظروں کو آنکھ سے دیکھتا ہے۔ مگر تاہم نہ اِس کو اُس کی غلطی
پر ٹوکتا ہے۔ اور نہ اس کے ذبح کنندہ ہاتھ کو روکتا ہے۔

بہر حال۔ بفرض محال (نعوذ باللہ) اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جاوے۔ کہ نہ ابراہیم اسکی حقیقت کو سمجھے۔ اور نہ
ابراہیمؑ کا خدا۔ اُن کے سمجھا دینے کو اسوقت مصلحت سمجھا۔ تو پھر اُس خدا نے اِس واقعہ کی تفصیل فرمانے کے

کے بعد بصورت واقعہ کو اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ (کھلے ہوئے امتحان) سے کیوں تعبیر فرمائی۔ یہ تو حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ خدائے سبحانہ کے خاص الہامی الفاظ و مکالمات ہیں۔ جب شبلی صاحب کے قیاس کے مطابق یہ واقعہ صرف وقف اولاد کا معاملہ تھا۔ تو اِنَّ هٰذَا لَهُوَ کی تاکید اور البلاء المبین کی تخصیصی تعریف سے اسکی اہمیت اور عظمت کیوں بڑھائی گئی۔ ان الفاظ قرآنی نے ہم کو صاف صاف بتلا دیا کہ یہ واقعہ ذبح وقف اولاد کے معانی و مقاصد میں ہرگز نہیں تھا۔ اگر ہوتا۔ تو کبھی بلاء کے لفظ سے تعبیر نہ فرمایا جاتا۔ کیونکہ معمولی سے معمولی عقل والا شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ بیٹے کا ذبح کرنا باپ کے لیئے بلا و مصیبت کہلائے گا یا اسکے بیٹے کا کسی معبد کی خدمت کے لیئے علیحدہ کر دیا جانا اس کے لیئے اندوہ و آفت کہلائے گا۔ اگر بلاء کے معنی باعتبار ظاہر بلا و مصیبت کے نہ لیئے جاویں۔ اور جیسا کہ حافظ صاحب کے ترجمہ میں ہے۔ آزمائش و امتحان ہی کے معنی سمجھے جاویں۔ تب بھی تو بیٹے کے قتل پر ہمت کرنا بلائے مبین ہی کہلائے گا۔ یا اس کو خدمت کعبہ کے لیئے وقف کر دینا یا چڑھا دینا اعظم ترین امتحان تبلایا جائے گا۔ وہ کون ایسا سادہ لوح اور کوری عقل والا مسلمان ہوگا۔ جو قرآن مجید کے ایسے واضح الفاظ انی اذبحک اور وفدیناہ بذبح عظیم کے مقابلہ میں حلال کرنے۔ اور ذبح کیئے جانے کے صریح اور صحیح معنیوں کو چھوڑ کر آپ کے بتلائے ہوئے وقف خدمت کے مطلب لگائے گا۔ جو نہ قرآن کے الفاظ آیات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ کسی حدیث کی عبارت اور نہ اہل عرب کی کسی مقامی روایت سے ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اسکا جواب شبلی صاحب کے ذمہ ہے۔ وہ بتلائیں۔ کہ آپ کے اس غلط معنی۔ مہمل ترکیب اور بے جا اور نازیبا تاویل کو کون مانے اور کیسے مانے۔

آپ کو یا آپ کے اکابر صوفیہ کو ایسی غلط تاویل کرتے وقت یہ بھی خیال نہ آیا۔ کہ اس کے معارض قرآن اور مخالف حدیث ہونے کے علاوہ۔ کسی جاہل سے جاہل عرب نے بھی تو آجتک آپکی تعلیم کی مطابق قربانی کی تعمیل نہیں کی۔ آپ تو بڑے پایہ کے مورخ شمار ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ درجہ کے محقق۔ آپ تو خود اپنی اس غلط فہمی کی اصلاح حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کے واقعہ کو دیکھکر اور پڑھ کر کر سکتے تھے۔ جو معمولی سے معمولی اسلامی تاریخوں میں عام طور سے درج ہے۔ کہیئے۔ اگر آپ کی تحقیق کے مطابق حقیقت میں۔ واقعہ ایسا ہی تھا۔ تو جناب عبدالمطلب کو اپنے ایسے محبوب ترین اور حامل نور سید المرسلینؐ فرزند کو۔ اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاسی و تمثیل میں ذبح فرمانے۔ اور آپ کے تمام اعزہ و اقارب خصوصاً حضرت ابیطالب کو جو عبداللہ کے برادر عینی تھے۔ آپ سے منع کرنے اور باز رکھنے اور بالآخر۔ فدیہ کی قرعہ اندازی وغیرہ کی کوشش فرمانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ نہ معلوم کہ باعتبار قدامت اور خصوصیت کے حضرت عبدالمطلب

اور سارئ قوم قریش اور دیگر اقوام عرب کو اس موقعہ کی صحت کا زیادہ علم تھا۔ یا مولوی شبلی صاحب کو یا اُن کے شیوخ صوفیہ کو۔ وہ کون حقیقت سے ایسا نہ آشنا ہوگا۔ جو اُس زمانہ کے بزرگواروں کو۔ جو قرآن اولیٰ سے پہلے پہلے تھے۔ علم و اطلاع پر مولوی شبلی کی اِس جدت اور اختراع کو ترجیح دیگا۔

بہر حال ہمارے موجودہ استدلال عقلی اور نقلی سے شبلی صاحب کی طباعی کی حقیقت کا پورا انکشاف ہو گیا اِن کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اُن کی یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ یہ معنی بالکل مہمل اور بے کار ہیں۔ صحیح وہی ہے جو قرآن نے اپنے ظاہر اور صاف الفاظ میں تبلایا ہے۔ اور اُسی کی مطابقت میں بالکل اِسی طرح اُسکے سچے اور برحق رسول صلعم نے اور اُسکے بعد تمام علمائے اسلام نے ہم کو تبلایا ہے۔ شبلی صاحب کے اگر دیدۂ بصیرت وا اور گوش حقیقت شنوا ہوتے۔ تو وہ آپ دیکھ لیتے اور سمجھ لیتے۔ کہ علمائے اسلام نے باوجود اِس کے کہ حضرت اسحاق اور اسمٰعیل علیہما السلام کے ذبیح اللہ ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ کسی نے اسحاقؑ کو اور کسی نے اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ تبلایا ہے۔ جیسا کہ ہم اُوپر تبلا آئے ہیں۔ مگر ذبح کی صورت میں کسی نے آپ کی طرح تمثیلی اور عینی کی تفریق و تخصیص نہیں قائم کی۔ پھر شبلی صاحب کے اِس نرالی اور لاؤبالی ترکیب والی معنی و مطلب کو کون سمجھ سکتا ہے۔

اِس کے بعد ہم مولوی صاحب کو دکھلاتے ہیں۔ کہ وقف خدمت بیت اللہ کے ذکر سے آپ کا قرآن مجید بھی خالی نہیں ہے۔ بیت المقدس کی خدمت کے لیئے اولاد کا نذر کر دیا جاتا۔ جو ظہور اسلام سے پہلے شریعت موسیٰؑ کے زمانہ میں رائج تھا۔ سورۂ آلِ عمران رکوع ۱۱ میں موجود ہے۔ اگر تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے اُس کے الفاظ و معانی پر غور فرما لیا گیا ہوتا۔ تو شبلی صاحب کی تشفی ہو گئی ہوتی۔ مگر افسوس کہ اِس کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ جناب مریم علیہا السلام کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے

اذ قالت امرءات عمران انی نذرت لکَ ما فی بطنی محررا فتقبل منی۔

ایک وقت تھا۔ کہ عمران کی بی بی نے (خدا کی خدمت میں) عرض کی کہ اے پروردگار۔ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے۔ اُسکو میں (دنیا کے تمام کام کاج سے) آزاد کر کے تیرے نظر کرتی ہوں تو میری طرف سے یہ (نذر) قبول فرما۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ اِس واقعہ نذر اولاد کے ذکر میں جو الفاظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ وہی واقعہ قربانی اسمٰعیلؑ میں بھی آئے ہیں۔ یا نہیں۔ کیونکہ شبلی صاحب کے اعتقاد میں تو دونوں واقعہ کے مقاصد و مطالب ایک ہیں۔ تو اِس اُصول سے قرآن مجید کے الفاظ دونوں واقعات کے متعلق متحد المعنی یا کم سے کم قریب المعنی ہونے چاہیئے۔ مگر جب ہم دونوں واقعات کی آیات کے الفاظ پر غور کرتے ہیں۔ تو دونوں آیتوں کے الفاظ میں آسمان و زمین کا فرق پاتے۔ واقعہ قربانی کے متعلق ہم اُوپر لکھ آئے ہیں

کہ لفظ ذبح دو جدا گانہ مقامات پر آیا ہے۔ اور مذبوح کی توصیف تعریف من الصابرین بتلائی گئی ہے۔ اور واقعہ نذر اولاد میں۔ نذر کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اور اس نذر کردہ اولاد کی محرر بتلائی گئی ہے۔ موٹی سے موٹی سمجھ والے مسلمان بھی دونوں کے فرق کو فوراً سمجھ کر کہہ دینگے۔ کہ ذبح کے معنی حلال کرنے اور نذر کے معنی ہدیہ کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے بھی یہی معنی نکلتے ہیں۔ اسی طرح مذبوح کی تعریف جان کے ایسی بیش بہا چیز دینے پر صبر کرتا ہے۔ اور نذر کردہ اور موقوف کی تعریف ہے۔ کہ وہ دنیا کے تمام تعلقات سے آزاد اور محض بے سروکار ہو کر خدمت معبد کے لیے مخصوص ہو۔ چلیئے فرصت ہو گئی۔ حلال اور ذبح ہونے والا صابر کہلایا۔ اور وقف یا نذر کیا ہوا شخص آزاد۔ حقیقت معلوم ہو گئی۔ کہ صبر کرنے والا ذبح کر دیا گیا۔ یا کر دیا جانے والا تھا۔ مگر کسی طرح سے بچ گیا۔ اور وقف شدہ شخص دنیاوی تعلقات سے آزاد اور بے سروکار کہا گیا۔ اب شبلی صاحب کی تاویل کے خلاف ان دونوں واقعات میں قرآن مجید کے الفاظ سے اتحاد ثابت ہوتا ہے۔ یا اختلاف۔ پھر کیسے کوئی مسلمان آپ کی غلط تاویل پر ایمان لائے گا۔

ہاں مولوی شبلی صاحب ہیں تحقیق کے کامل۔ اور عربی کے بہت بڑے فاضل۔ ان الفاظ قرآنی کے ظاہری معانی کے علاوہ شاید اُس کے لغوی اور مادی معنیوں میں کوئی باریک اور رکیک معنی ایسے ہوں۔ جن سے آپ نے اپنی نو ایجاد تاویل کو مستخرج کیا ہے اور جو آج تک عام اہل اسلام کی موٹی نظر اور موٹی عقل میں نہ آئے ہوں۔ اس بنا پر ہمیں ضرور ہے۔ کہ ہم عربی کی لغت سے بھی ان الفاظ کے باہمی اختلاف پورے طور سے دکھلا دیں۔ کہ آئندہ پھر کسی کو شبلی صاحب کی اس تاویل کے غلط ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

قاموس میں بذیل لفظ ذبح تحریر ہے ذَبَحَ کَمَنَعَ۔ ذبحًا و ذباحًا۔ شق و فتق و نحر و خنق یعنی ذبح بروزن منع۔ ذبحًا یا ذباحًا۔ یا الف تنوین۔ اس سے مصادر مشتق ہوئے ہیں۔ جس کے معنی شگاف کرنا۔ پھاڑنا۔ یا پھٹنا۔ حلال کرنا۔ اور خون بہانا ہیں۔ پھر اس کے فاضل فیروز آبادی لکھتے ہیں۔

الذبیح المذبوح اسمٰعیل علیہ السلام وفی الحدیث انا ابن الذبیحین لان عبد المطلب لزمہ ذبح عبد اللہ لنذر ففداہ بمائۃ من الابل۔	ذبیح المذبوح سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ حدیث وارد ہوا ہے۔ کہ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں ہیں لیئے۔ کہ حضرت عبد المطلب نے حضرت عبد اللہ اپنے فرزند کو ذبح کرنے کی نذر کرلی تھی۔ اور پھر اُن کے عوض

میں سو اونٹ دیئے تھے۔ قاموس مطبوعہ کلکتہ ص ۲۷۲

اب النذر کی تحقیق لفظی ولغوی حسب ذیل ہے:۔

النّذیرہ ۔مایعطیہ وہ چیز جو کسی کو عطا کی جاوے والولد الذی یجعلہ ابوہ قیمًا اوخادمًا للکنیۃ ذکرا اوانثی۔اور وہ بچہ جسے اُس کے باپ نے کسی معبد میں ہمیشہ کے لیئے قیام کرنے یا اُس کی خدمت کرنے کے لیئے مقرر کر دیا ہو۔عام اس سے کہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔قاموس ص ۷۹۴۔

اب الاحرار کی لغوی تحقیق یہ ہے۔

اَلحُرُّ ۔بالضم۔خلاف العبد۔خیار کل شی۔الفرس العتیق غلام کا متضد ہے۔اس کے معنی نیک ترین اشیاء۔اور اسپ آزاد کے ہیں۔قاموس۔۷۹۴۔

ہم نے اپنے مندرجہ بالا بیان میں ان تینوں لفظوں کے علیحدہ علیحدہ معنی لکھدیئے ہیں۔جو آیات قرآنی متعلقۂ واقعہ قربانی حضرت اسماعیلؑ اور نذر جناب مریمؑ اپنے اپنے مقام پر آئے ہیں۔اب ان مختلف اور جداگانہ معنیوں کے الفاظ کو پڑھ کر ہر شخص آسانی سے سمجھ جائے گا۔کہ واقعہ قربانی اسماعیلؑ میں ذبح کا خاص لفظ آیا ہے۔اور وہ واقعہ نذر جناب مریم میں نہیں آیا ہے۔اسی طرح واقعہ نذر حضرت مریمؑ میں نذر کا خاص لفظ مستعمل ہوا ہے۔اور وہ واقعہ جناب اسماعیلؑ میں نہیں لایا گیا۔اس بنا پر ہر شخص بلا کسی تحریک کے خود سمجھ لے گا۔کہ ذبح کے معنی نذر کے نہیں ہو سکتے۔کیونکہ ذبح کے معنی سوائے حلال کرنے یا خون بہانے کے اور دوسرے نہیں ہوسکتے۔اسی طرح نذر کے معنی کسی لڑکے یا لڑکی کو کسی معبد کے لیئے نامزد کر کے علیحدہ کر دینے اور دیگر مشاغل وتعلقات سے آزاد کر دینے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے۔

جب یہ دونوں الفاظ آپس میں۔ایسے متغائر۔متخالف اور متضاد ثابت ہوتے ہیں تب شمس العلمائی نعمانی کا ذبح کے معنی کو نذر کے مطلب میں بتلانا۔اور نذر کے مقصد کو ذبح کے معنی میں سمجھانا۔اُن کی خاص منطق معکوسی اور اُن کے اکابر صوفیہ کی جرح کا لوہی سمجھی جائے گی۔اگر حقیقتًا یہ دونوں الفاظ متحد المعنی ہوتے تو ضرور تھا۔کہ واقعہ اسماعیلؑ کے متعلق قرآن مجید میں انی اذبحک کی جگہ انی انذرک اور فدیناہ بذبح عظیم کیجگہ فدیناہ بنذر عظیم نازل فرمایا جاتا۔اور اسی طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انا ابن الذبیحین کی عوض انا ابن المنذرین ارشاد فرمایا ہوتا۔اور علی ہذہ القیاس۔اہل لغت نے بھی ذبح کے معنی۔ذبح کیئے جانے کے عوض۔لڑکے کو خدمت معبد کے لیئے وقف کر دیا جانا لکھا ہوتا غرضیکہ شمس العلماء صاحب کی جدید تعلیم کے مطابق سلف سے خلف تک کے ادب۔تفسیر۔حدیث۔تاریخ لغت۔غرض تمام علوم وفنون کے دفتر کے دفتر اُلٹ دیئے جائیں۔ غلط کر دیئے جائیں۔اور مٹا دیئے جائیں۔تب کہیں آپ کی اس لطیف تاویل کا لطیفہ سمجھ میں آوے۔

بہر حال ہم نے اپنی مندرجۂ بالا طول طویل اور بالتفصیل بحث میں شبلی صاحب کی اِس غلط تاویل کی کامل تردید و تنقید کر دی ہے۔ جس کو اُنہوں نے بلا سند اور بلا نام و نشان اپنے چند اکابر صوفیہ کے غیر مقید اقوال سے بے ضرورت صرف اپنی جدّتِ طبع کا نمونہ بنا کر اپنی کتاب میں لکھی تھی۔ اور واقعہ قربانی کی اصل مدعا کو ایک ایسے غلط اور موضوع منشا کے ساتھ تبدیل کرنا چاہا تھا۔ جو قرآن کا مخالف حدیث کا معارض اور تمام روایت و درایت کے واقعات کے خلاف اور صریح متضاد تھا۔ ہم نے عمداً اس بحث میں طوالت کا ذرا بھی خوف و خیال نہیں کیا۔ اور اِس کے تمام جزئیات کو عقل اور نقل کے دونوں طریقہائے استدلال سے مختلف اور متواتر اسناد و استشہاد کے ساتھ اِس غرض خاص سے بیان کر دیا ہے۔ کہ آئندہ پھر کسی اہل اسلام کو حضرت اسماعیلؑ علیہ السلام کے واقعہ ذبح کو اُسی طرح جس طرح قرآن مجید کے الہامی الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اُن کے منصوصی پیرایہ میں مندرج ہے۔ وقوع پذیر ہونے کے متعلق کوئی عذر و کلام اور شکوک و اوہام باقی نہ رہیں۔

اِتنا لکھکر ہم پھر مولوی صاحب کے۔ اِس مخالف مختار پر اپنی خلاف رائے دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو آپنے اپنے اُس مختار تحقیق اور معیار تالیف کے خلاف اختیار فرمایا ہے۔ جس کو آپ نہایت سختی اور احتیاط کے ساتھ اپنی کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرما چکے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آپ تمام تاریخی واقعات کے اسناد کو اُسی طرح مرفوع۔ مصدق۔ اور صحیح اور اُن کے تمام رواۃ کو تمام تر معتبر اور ثقاۃ ہونا شرط فرماتے ہیں۔ جس طریق و اُصول پر تفسیر حدیث اور فقہ و کلام کی تدوین کی جاتی ہے۔ کہاں تو آپ کی یہ احتیاط یہ تاکید و تعقید اور کہاں یہ بے احتیاطی اور آزادی کو مسئلہ زیر بحث میں بلا سند اقوال سے استدلال کیا جاتا ہے۔ نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اور نہ قائل قول کا نام و نشان تبلایا جاتا ہے۔ کہ اُس کی حیثیت معلوم ہو سکے۔

اِس سے پورے طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کہ دیباچہ کی عبارت میں آپ نے اپنی نمائشی تحقیق اور ظاہری احتیاط کا جو کچھ طمطراق اور لام قاف باندھا ہے۔ وہ غریب مسلمانوں کو مرعوب بنانے کی غرض خاص سے ہے ورنہ اُس میں اصلیت اور حقیقت کا کوئی شائبہ نام کو بھی موجود نہیں ہے

فدیناہ بذبح عظیم کا حقیقی مقصود اور ترکنا علیہ فی الآخرین کا اصلی مفہوم

اب ہم شبلی صاحب کو یاد دلاتے ہیں۔ کہ آپنے واقعہ ذبح اسماعیلؑ کے متعلق تو دور از عقل اور خارج از قیاس تاویلات و معانی کا انبار لگا دیا۔ اور ان مہملات کے تبلانے اور سمجھانے میں بڑی کوشش اور کد و کاوش سے کام لیا۔ مگر کبھی آپ کو دقتِ اینا

بذبحٍ عظیم کے اصل مطالب و مقاصد کی تحقیق اور اُسکے اصلی مفہوم قایم کرنے۔ تبلانے اور سمجھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی طرف نہ کبھی آپ کا خیال گیا۔ اور نہ آپ کی نگاہ۔ استغفر اللہ حقیقتاً شبلی صاحب اور اُن کے اسلاف سے ایسے صاف اور با انصاف تحقیق و تفتیش کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ایسی محققانہ اور منصفانہ تاویل و معانی تو اُن کے اور اُن کے اسلاف کے اُصول عقاید میں گویا معصیت ہی تعصب اور خود غرضی کی بنا پر سواد اعظم کے مفسرین۔ محدثین اور مورخین کا اسکے سچے۔ صحیح اور در واقع معانی و مطالب تبلانے کے لیئے نہ توفیق کا قدم اُٹھا۔ اور نہ تحقیق و تفصیل کا قلم۔ کیونکہ ایسی تفسیر و تفصیل سے اُس ذات مقدس کے خصائص اور فضل و مناقب کا اظہار ہوتا تھا۔ جو ابتدا ہی سے آپ کی عقیدت و معرفت کے دفتر میں مرفوع القلم ہو چکا تھا۔ واعظین[۵] اور ذاکرین پر اُسکا ذکر کرنا اور سامعین پر اُسکے ذکر کو سُننا حرام کر دیا گیا تھا۔ جب شبلی صاحب کی شریعت کے احکام اور حکومت کے نظام دونوں شفقۃ قوتوں نے اس کے استخفاف و استیصال پر ابتدا ہی سے آمادہ اور کمربستہ ہوں۔ تو انکشاف حقیقت کی اُمید آپ سے کیا ہو سکتی ہے۔

مولوی شبلی صاحب اِس آیہ وافی ہدایہ کی اصلی معنی تبلائیں۔ اور حقیقی مفہوم سمجھائیں۔ محال ہے۔ اور خیال ہی خیال۔ مگر ہم اُن کو اور اُن کے ہمخیال حضرات کو تبلائے اور سمجھائے دیتے ہیں۔ کہ واقعیت اور حقیقت کسی شے کی نہ کسی کے چھپائے چھپ سکتی۔ اور نہ مٹائے مٹ سکتی ہے۔ اصلیت پر چاہے کتنی مدت تک سخت سے سخت پردے نہ ڈالے جائیں۔ مگر حقیقت چمک جاتی ہے۔ اور صداقت صاف جھلک جاتی ہے۔

مفسرین اہل بیت علیہم السلام نے۔ وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کے صحیح معنی اور اصلی مفہوم عام اہل اسلام کو ایک بار نہیں ہزار بار تبلایا اور سمجھایا۔ مگر سواد اعظم اسلام نے اپنے عقاید موضوعی اور مقاصد مصنوعی کے مخالف پاکر اِس حقیقت نمائی پر کوئی توجہ اور اعتنا نہ فرمائی۔ اور کیونکر اعتنا فرماتے۔ مفسرین اہلبیت کا اُن کی نگاہوں میں کوئی اقتدار ہی باقی نہیں رہا تھا۔ تو اُن کے ارشاد و ہدایات اور اخبار و آثار کا کیا اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ اُسوقت سے لیکر اِسوقت تک سواد اعظم میں اِن حضرات کے لیئے اعتباری اور غیر اعتمادی کی وہی صورت قایم ہے۔

مگر بایں ہمہ۔ باوجودیکہ ذبح عظیم کے اصلی مفہوم و مقصود سے سواد اعظم کی عدم واقفیت اور حق فراموشی کا وہی عالم ہے۔ مگر پھر بھی اِس واقعہ الہامی کی حقانیت اور اِس سچی قربانی کی روحانیت کی تاثیر نے بالآخر

---

۵ حرام علی الواعظین ذکر مقتل الحسین۔ سر العالمین امام غزالی۔

اُنھیں محدثین و محققین میں سے اکثر کو اُسکے اصلی مفہوم سمجھنے اور تسلیم کرنیکی بھی توفیق دی۔ اور ایک مدت کے بعد۔ جب اُن کے خیالات میں انصاف پسندی۔ حق گوئی۔ اور حقیقت جوئی۔ اور آزادی کے جوہر پیدا ہوئے۔ اور جب اُن کی نگاہوں کے سامنے سے۔ تعصب۔ نفسانیت۔ اور خود غرضی کے حجاب اُٹھا دیئے گئے۔ اور جب اُن کی گردنیں متعصب حکومتوں اور ظالم سلطنتوں کے زبردست پنجوں سے چھوٹ گئیں۔ تو اُنھیں اِن اسرار مخفیہ کے متعلق اپنے محققانہ انکشافات اور منصفانہ اقتباسات کا موقع ملا۔ اور اُنہوں نے جب اِس آیہ کریمہ کے اصلی مقصود پر تحقیق کی نظر ڈالی اور کامل غور وخوض سے کام لیا۔ تو اُن کو صورت واقعہ اور حقیقت حال پوری معلوم ہوگئی۔ اور وہ سمجھ گئے۔ کہ وَ فَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ سے حقیقی طور پر نہ وہ گوسفند بہشتی۔ جو بطور مشہور اُسوقت سے لیکر اسوقت تک برابر منقول و مذکور چلا آتا ہے۔ یہ صحیح طور سے مراد و مقصود ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُن بے شمار گوسفندوں اور لاتعداد لاتحصیٰ مختلف اقسام جانوران اونٹ۔ گائے وغیرہ کی قربانیاں تحقیقی طور پر تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ جو ایام حج میں اسواقعہ عظیمہ کے احیا و یادگار کے خیال سے ہر سال خدا کے نام پر کی جاتی ہیں۔ یہ کیوں؟

اِس لیئے کہ قرآن مجید میں لفظ فدا مستعمل ہوا ہے۔ اور فدا کی تعریف خاص یہ ہے۔ کہ اوّل وہ فدیہ مِنۡ تَمَامِ الۡوُجُوۡہِ وَالۡحَیۡثِیَّۃِ اپنے مبدل منہ سے بہتر ہو

دوم یہ کہ اگر مبدل منہ سے اُس فدیہ و بدل کا اولیٰ تر ہونا۔ معتذر و متعسر ہونا ممکن نہ ہو۔ تو بدل و بدل منہ میں مِنۡ تَمَامِ الۡوُجُوۡہِ وَالۡحَیۡثِیَّۃِ مساوات ضرور ہو۔

بدل و فدیہ کے اُصول مرقومہ بالا کے ثبوت ذیل کے الفاظ الہامی اور ارشاد قرآنی میں ملاحظہ ہوں۔

وَاِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡہَاۤ اَوۡ رُدُّوۡہَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَسِیۡبًا	اگر تم کو کوئی شخص) ہدیہ دے تو تم کو اُس سے بہتر ہدیہ دینا چاہیے اور اگر (اُس سے بہتر نہو) تو اُس کے ایسا ہی پس کرنا (اور بھیجنا)

لازم ہے۔ خدا تمام چیزوں کا حساب لینے والا ہے۔

یہ نہ کوئی ایسا باریک مسئلہ ہے۔ اور نہ کوئی ایسا دقیق نکتہ۔ جو سمجھ میں نہ آسکے۔ بلکہ یہ تو ایسا کھلا ہوا۔ اور سلجھا ہوا آسان اخلاقی مسئلہ ہے۔ جو عام طور سے ہر شخص کے روزمرّہ کی ضرورتوں میں برابر پیش آیا کرتا ہے

اب اِس اُصول و مقدارے سے اِسواقعہ کی عظمت اور اہمیت پر غور کیا جاوے۔ بصورت واقعہ صاف صاف بتلا رہی ہے۔ کہ خدائے عزوجل اور اُس کے ایک معتبر اور معتمد ترین نبی مرسل کے فیمابین وعدہ وعید کے معاملات پیش ہیں۔ مشیت الٰہی کو صبر خلیل اللہی کا امتحان منظور ہے۔ اگرچہ اِس کے قبل بھی اِن کی بڑی بڑی آزمائشیں ہوچکی ہیں۔ آگ میں زندہ جلا دیئے تک کی مصیبتیں اُٹھانی پڑی

ہیں۔ مگر ابھی قدرت کی تسکین اور مشیت کا اطمینان نہیں ہوا ہے۔ وہ اب ایک مافوق البشری طریقہ سے امتحان لینا چاہتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ وہ اپنے ارمان اور تمناؤں والے۔ نوجوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرکے اپنے صبر و استقلال اور معرفت کے کمال کا امتحان دے۔ یہ وہ طریقہ امتحان ہے۔ جو صبر و تحمل انسانی کے حدود امکان سے بالکل باہر ہے۔ اِس عدیم النظیر قیامت کے نظیر سے دُنیا کے تمام کارنامے خالی ہیں۔

باپ کون ہے؟ وہی بزرگ مقدس۔ جس نے اسی بیٹے کے عطا فرمائے جانے اور پیدا ہونے کی آرزو و تمنا میں مدت تک دن دن بھر رات رات بھر دعائیں مانگی ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں برابر الحاح و زاری کی ہے۔ یہاں تک کہ اسی حسرت و تمنا میں جوانی ختم ہو گئی ہے۔ شباب جاتا رہا ہے۔ بڑھاپا آچلا ہے۔ خدا خدا کرکے۔ خدا نے اب سُنی ہے۔ اور والدین کو یہ نعمت غیر مترقبہ عنایت فرمائی ہے۔ ماں باپ نے بڑے ناز و نعم سے پالا ہے۔ اور اب وہ کامل جوان ہونے والا ہے۔

باپ کو بیٹا بھی کیسا ملا ہے؟ الولد سر لابیہ کا کامل مصداق۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ مقدس باپ کی تقدیس و عظمت کا نمونہ۔ حسنات و برکات اور جملہ صفات پدری کا تیار مجسمہ جس کی قدر و منزلت کی نسبت مصدر قدرت سے ولادت ہی کے وقت نوید بشارت آچکی ہے۔ اور خطیب مشیت اِن الفاظ کے ساتھ کیا خطاب فرما چکا ہے۔ کہ خدا اس بچہ کے ساتھ ہے۔ یہ اُمت عظیمہ کا مورث اور بارہ سرداروں (اماموں) کا جدِ اعلیٰ ہے اسکو برکت دی گئی ہے۔ (اسفار توراۃ سے اِن بشارتوں کے حوالہ اُوپر نقل ہو چکے ہیں۔)

ایسے برگزیدہ بیٹے کو اُسکا عاشق اور گرویدہ باپ اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے والا ہے کیوں؟ کس لیے؟ اِس لیے کہ وہ رویائے صادقہ کے ذریعہ سے۔ جو وحی ربانی اور الہام یزدانی کا ایک جزو خاص ہے۔ اِس امر فوق البشری کے اقدام و ارتکاب پر مامور ہو چکا ہے۔ اِس غرض خاص سے کہ وہ امتحان گاہ دُنیا میں اپنی صبر و استقامت کا امتحان دے اور آماجگاہِ عالم میں اپنے تصفیہ قلب استقلال دل، اور تسلیم و رضا کے کمال دکھلا کر ثابت کر دے۔ کہ باوجود اسکے کہ جس فرزند کو اُس نے اپنی آرزو و تمنا سے پایا ہے۔ اور ایسی محنت۔ ریاضت اور الفت و محبت سے پالا ہے۔ مگر تاہم رضائے الٰہی اور اطاعت ایزدی کے مقابلہ میں وہ ایک معمولی جانور سے بھی زیادہ عزیز نہیں۔ باوجود اس کے کہ اُس کی صورت ہمیشہ آنکھوں میں۔ اُس کی یاد ہمیشہ دل میں۔ اُس کی خبر گیری۔ دلجوئی اور راحت رسانی کے تمام سامان نگاہوں میں رہا کرتے ہیں۔ مگر جب قدرت کا حکم۔ مشیت کا فرمان۔ اُس سے مفارقت اور

جدائی اختیار کرنے کے لیے صادر ہوتا ہے۔ تو اس سے ایسی بے تعلقی اور بے سروکاری ثابت کی جاتی ہے کہ گویا باپ بیٹوں میں گویا کوئی علاقہ اور واسطہ ہی نہیں تھا۔

صاحب مواہب لدنیہ نے اس مضمون کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم ان کی اصل عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

وابراهیم لما سئال ربه الولد ووهب له تعلقت شعبة من قلبه بمحبته والله تعالیٰ قد اتخذه خليلا والخلة منصب يقتضی توحید المحبوب بالمحبة وان لا يشارك فيها فلما اخذ الولد شعبة من قلب لوالد جاءت من غيره۔ الخلة تنزعها من قلب الخليل فامر بذبح المحبوب فلما اقدم على ذبحه وكانت محبة الله عنده اعظم من محبة الولد خلصت الخلة حينئذ من شوائب المشاركة فلم يبق فی الذبح مصلحة اذ كانت المصلحة انما هی العزم وتوطين النفس وقد حصل المقصود

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حصول فرزند کی دعا فرمائی۔ اور خدا نے اُن کو فرزند (اسماعیلؑ) عطا فرمایا تو حضرت ابراہیمؑ کے ایک گوشہ دل میں محبت فرزند بھی جاگزیں ہوئی۔ اور اس سے قبل ایزد سبحانہ تعالےٰ آپ کو مرتبہ خلّت پر فائز فرما چکا تھا اور خلّت وہ منصب عالی ہے۔ جو محبوب کی محبت بالکل خالص اور بلا شارکت رکھے جانے کا مقتضی ہوتا ہے۔ اور حقیقتاً اسکا اصلی مدعا اور غایت منتہا یہی ہوتا ہے۔ کہ محبوب کی محبت بلا شریک و سہیم قایم رکھی جاوے۔ مگر جب ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ سا بیٹا مل گیا تو آپ کا ایک گوشہ دل بیٹے کی محبت سے پُر اور مملو ہو گیا۔ اور گویا خلاف اصول خلّت باپ کے دل کا وہ گوشہ خدا کے سوا دوسرے کا ہو گیا۔ لہذا خلّت کی صفت قلب ابراہیمؑ میں مشترک ہو گئی۔ اس لیئے خدا نے آپ کو ذبح محبوب کا حکم دیا۔ اور جب آپ اُس کے اقدام پر کامل طور سے تیار ہو گئے۔ تو ظاہر ہو گیا۔ کہ آپ کے دل میں خدا کی محبت بیٹے کی محبت سے زیادہ ہے۔ اس سبب سے آپ کی خلّت اُسی وقت شائبہ شارکت سے پاک وصاف ہو گئی۔ اب کوئی مصلحت قربانی کی باقی نہیں رہی۔ اور اگر کوئی مصلحت الٰہیہ تھی۔ تو وہ جناب ابراہیمؑ کے استقلال قلب اور اطمینان نفس کا امتحان تھا۔ اور یہی حاصل مقصود تھا۔

ست رجہ بالا عبارت بتلا رہی ہے۔ کہ ذبح اسماعیلؑ کا یہ عظیم الشان اور عدیم المثال۔ واقعہ ایک طرف تو اسرار وحکمت ربانی کا مظہر تھا۔ اور دوسری طرف صبر واستقلال انسانی کا منظر۔ خدائے سبحانہ تعالےٰ امر ذبح کا (امتحاناً) آمر ہے۔ اور پیغمبر حاضر (ابراہیمؑ) ذابح تھا۔ اور پیغمبر لاحق (اسمٰعیلؑ) مذبوح۔ مقام ذبح۔ یا مذبح۔ پیش گاہ بیت اللہ ہے۔ یہ واقعہ اپنے قدرتی عظمت و اقتدار اور نیز اپنے نامورین کی ذاتی اور صفاتی قدر ومنزلت کے اعتبار سے جب ایسا مہتم بالشان ثابت ہوتا ہے۔ تو اسکا وہ فدیۂ خاص جو من جانب اللہ اُس وقت سے لیکر اسوقت تک اور اسوقت سے لیکر ابد الآباد تک تمام متبعین شریعت ابراہیمیہ اور سائر اُمت اسلامیہ

میں قائم فرمایا گیا ہے۔ وہ اُصول فدیہ اور قواعد اخلاق کے مطابق اپنے مبدل منہ سے من حیث الوجوہ اوّل تو بہتر ہو۔ نہیں تو برابر۔ مساوی اور ہم پایہ تو ضرور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ارشاد الٰہی کے بتلائے ہوئے نصاب فدیہ و ہدیہ کے علاوہ روزمرّہ کے اخلاقی مراسم ہم کو بتلا رہے ہیں۔ کہ اقوام انسان میں جب ارسال ہدیہ یا ادائے فدیہ کے لیئے۔ مِنْ اَفْضَلِ شَیْءٍ مَا یُعْطِیْہِ اَوْ یُہْدِیْہِ کی خاص شرط پائی جاتی ہے اور ہر شخص تقدر امکان اِس کی پیروی کرتا ہے۔ اور سالانہ تعمیل۔ تو ذات جناب باری عزّ اسمہ۔ جس کی استغنار کا کمال اِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ خدا کی ذات غنی اور قابل ستائش ہے۔ اور تم لوگ (بندے) غریب وفقیر ہیں سے ظاہر و ثابت ہے۔ اپنے بندہ بمقدار کے بدلہ دیئے اور اُس کے فدیہ عطا کرنے میں کیتی لاانتہا فیاضی اور بخشش سے کام لے گا۔ اور اِس بدلہ یا فدیہ دینے میں اپنے مبدل منہ سے احسن ہونے یا اُس کے ساتھ مساوی اور برابر ہونے کی کیسی احتیاط قائم رکھی ہوگی۔ کیونکہ عام فطرت انسانی اِسکی تعمیل پر اِس سختی اور احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ثابت ہوتی ہے۔ تو عادتِ الٰہی جو تمام مخلوق کی عادات و عملیات کی معلم ہے۔ کیونکر اس کی عامل اور آمر نہ سمجھی جاوے گی۔ یہ شاہد اور قرائن بتلا رہے ہیں۔ کہ آیۂ وافی ہدایہ وفدیناہُ بذبحٍ عَظِیمٍ میں وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ معمولی دُنبوں یا اور قسم کے حیوانوں اور لاکھوں قسم کے جانوروں کی قربانی نہیں ہے۔ جو اِس واقعۂ عظیم کی یادگار میں اُس وقت سے لیکر اِس وقت تک ہر سال خدا کے نام پر کی جاتی ہے۔ مگر حقیقت بیں آنکھیں بمعرفت آگیں خوب خوب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ کہ ایک نبی اللّٰہ کے کیا مراتب ہیں۔ اور ایک جانور یا بے شمار جانوروں کی جانوں کا اُس کے مقابلہ میں کیا وجود ہو سکتا ہے۔ خدا کی بارگاہ میں نبی اللّٰہ کے ایک قطرہ خون کی کیا قدر و عظمت ہے۔ اور ایک جانور یا بے شمار جانوروں کے دریائے خون کی کیا ہستی ہے۔ اور کیا مقدار۔

حقیقت میں جن لوگوں نے ذبحِ عظیم سے سالانہ دُنبوں کی قربانی مراد لی ہے۔ وہ حقیقتاً انبیاء و مرسلین سلام اللّٰہ علیہم اجمعین کے خون مطہر کی قدر و قیمت سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور اگر واقف ہیں اور اپنی کی خودغرضی سے اِس کے اظہار میں تغافل و تساہل اختیار کرتے ہیں۔ تو حقیقتاً ایسے لوگ ان مقدسین مرسلین کی تحقیر و ذلت اور استخفاف مراتب و مدارج کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تحقیق کی زیادہ نظر ڈالی جائے۔ تو اس خیال اور عقیدے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

عبداللّٰہ ابن عمر صحابی کی مجلس کا مندرجہ ذیل مستفسرہ۔ جس کو ہم صحیحین کے اسناد سے لکھتے ہیں۔ اِسکی حقیقت کا پورا انکشاف کرتا ہے۔ اور اِس خون مطہر کی عظمت کا کامل اعتراف۔ صحیح بخاری باب المناقب الحسن والحسینؑ میں مرقوم ہے

حدثنا محمد ابن بشار قال حدثنا شعبہ عن محمد ابن ابی یعقوب سمعت ابن ابی نعم قال سمعت عبد اللہ ابن عمر سئلہ رجل عن المحرم قال شعبہ احسبہ یقتل الذباب فقال اہل العراق یسئلون عن قتل الذباب وقد قتلوا ابن بنت رسول اللہ صلعم۔

عبد اللہ ابن عمر سے کسی عراق کے رہنے والے نے حالت احرام میں مچھر کے مار ڈالنے کا مسئلہ دریافت کیا۔ عبد اللہ عمر نے کہا۔ اہل عراق قتل ذباب کا مسئلہ تو مجھ سے دریافت کرتے ہیں۔ دورانحالیکہ انہیں لوگوں نے رسول خدا صلعم کے نواسے کو قتل کر ڈالا۔

(خلاصہ ترجمہ)

اس واقعہ اور فقرہ سے اگر اور کچھ نہیں۔ تو اتنا ضرور معلوم ہوا۔ کہ اِس خون مطہر کی نسبت عظمت اور حرمت کا خیال قرن اولیٰ ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ کیسا ہی زبانی اور ظاہری نہ ہو۔ کیونکہ دُنیا وی ضرورتیں اور تعلقات اور تحصیل مال و دولت اور فکر و تلاش معاش کی کشمکش کچھ ایسی مجبوریاں۔ پاؤں کی بیڑیاں اور زبان کی قفل بن جاتی تھیں۔ کہ آدمی کا اپنے ایک خیال اور اعتقاد پر قائم رہنا سخت دشوار تھا۔ یہی بزرگ (عبد اللہ عمر) جو حسینؑ (روحی لہ الفدا) کے خون مطہر کو اس عظمت و حرمت کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ وہی ذات شریف اُن کے قاتل یزید کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے ہیں۔ اور مدینہ کے مسلمانوں میں سب سے پہلے اُس کی بیعت فرماتے ہیں۔ اور جو اُس کی بیعت سے انکار کرتا ہے اُس پر بغاوت۔ غدر اور اور شق عصائے اُمت کا حکم لگاتے ہیں۔ (طبری ابن اثیر)

وہ حکم بھی عبد اللہ ابن عمر کا تھا۔ اور اب یہ فرمان بھی آپ ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ تو اب متبعین اور عام گروہ مسلمین اِن دونوں مخالف اور معارض میں سے کس حکم کو اختیار کریں بیّنوا و توجروا

بہر حال جب آغاز ہی سے متقدمین صحابہ اور تابعین کی۔ اِن معاملات میں۔ یہ مذبذب حالت پائی جاتی ہو۔ تو اِن کی زبان و قلم سے اہلبیت طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کے اصل معارف و شرف کی حقیقت نویسی کی کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔ اور اُن کے متعلق اصل واقعات کیسے معلوم ہو سکتے ہیں

اِتنا لکھکر ہم پھر اپنے سابق سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ ہم ابھی بحث میں اُوپر لکھ آئے ہیں۔ کہ ایک جانور کیا بے شمار جانور۔ عام اس سے کہ وہ زمین سے لائے جائیں۔ یا آسمان سے۔ اُن کی پرورش چمنستان عالم سے ہوئی ہو۔ یا گلستان ارم میں۔ کسی صحیح دماغ اور سلیم عقل والے کے نزدیک۔ ایک نبی زادے کے ہمسر اور برابر نہیں ہو سکتے۔ اِس بنا پر ضرور ہوا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا فدیہ اور بدل موعود بھی ایسا ہی عظیم المرتبہ ہو۔ جو اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے آپ کا ہمپایہ۔ ہمسر اور ہم شان ثابت ہوتا ہو۔

جب ہمارے استدلال کے تمام عقلی اور نقلی دلائل اور سارے قرائن اور اِن سب کے ساتھ اِس واقعہ عظیمہ کی صورت حال بھی۔ فدیہ اور بدل میں باہمی مساوت اور مماثلت کو ضروری اور لازمی قرار دیتی ہے۔ تو اب ہم پوچھتے ہیں۔ کہ تاریخ وسیر کے بالاستعیاب سیر کرنے والے اور ہر ہر واقعہ کو تحقیق وتفتیش کی نظر سے پڑھنے والے ہم کو تبلادیں۔ کہ اِس واقعہ عظیم الشان کے بعد خاندان ابراہیمیؑ اور دومان اسماعیلیؑ میں وہ کون ایسی قربانی۔ خدا کے نام۔ خدا کی راہ۔ اور خاص امر حق کے اظہار و استقرار کے لیے عمل میں لائی گئی ہے۔

اِس کی تلاش وجستجو میں متلاشین حقیقت کو کم سے کم دو ہزار برس تک کے تاریخی واقعات دیکھنے پڑینگے اور اِس مدت میں ایک واقعہ بھی اِس کی مثال میں نہیں ملے گا۔ مگر ہاں۔ اِس سلسلہ عالیہ میں حضرت عبدالمطلب کے عہد امارت میں۔ آپ کے صاحبزادے۔ حضرت عبد اللہ کا ایک واقعہ ملیگا۔ اور اُس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ حضرت عبد اللہ کی قربانی کے معاملہ کو فدیہ اسماعیلیؑ ہونے کا پورا حق حاصل تھا۔ کیونکہ بدل اور بدل منہ میں باہمی مساوت بھی موجود تھی۔ مگر جیساکہ تمام اسلامی مفسرین۔ محدثین اور مؤرخین کا متفق علیہ بیان ہے۔ اِس قربانی میں بھی۔ اِس مصلحت خاص سے۔ فدیہ اور بدل کا حکم آگیا۔ کہ جناب عبد اللہؑ کی ذات بابرکات سے جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذی جود قایم ہونے والا تھا۔ اِسلیئے حضرت عبدالمطلب نے جناب عبد اللہ کے بدلے میں سو اونٹوں کا فدیہ دیا۔

واقعات کی اصلی حقیقت جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ کہ جناب اسماعیلؑ کے واقعہ قربانی میں فدیہ اور بدل واقعہ ہونے کی جو مصلحت مضمر تھی۔ وہی مصلحت اور ضرورت حضرت عبد اللہ کے واقعہ ذبح میں بھی لاحق ہوئی اور مدبرین قدرت کو۔ دونوں معاملات میں ہم قالب ہونے کی وجہ سے ایک ہی طرح کا فیصلہ دینا پڑا۔

بہر حال۔ ہمارے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا۔ کہ واقعہ ذبح۔ حضرت عبد اللہؑ۔ جو حضرت اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح کی تنہا مثال تھا۔ وہ بھی فدیہ اور بدل واقع ہوجانے سے ناقص اور ناکامل ثابت ہوگیا۔ کیونکہ قرآن مجید میں جو الفاظ فدیہ اسمٰعیلؑ کی تعریف میں آئے ہیں۔ وہ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ کی تفصیلی صورت میں آئے ہیں۔ مراد یہ ہے۔ کہ اسماعیلؑ کا فدیہ ذبح عظیم کی صورت میں دینا چاہیے۔ چونکہ حضرت عبد اللہ کے واقعہ میں بھی ذبح واقع نہیں ہوا۔ اسلیئے وہ بھی فدیہ اسماعیلیؑ ہونیکا شرف حاصل نہیں کر سکا۔

اب تاریخ وسیر کے ماہرین اور محققین تبلادیں۔ کہ پھر اِس مبارک اور مقدس سلسلہ اسماعیلی میں کوئی متنفس کوئی فرد واحد۔ سوائے ذبیح کربلا۔ قتیل نینوا۔ سید الشہدا۔ خامس آل عبا۔ ابی عبد اللہ الحسین علیہ التحیۃ والثنا کے فدیہ اسماعیل ہونے کی مفاخرت اور مماثلت رکھنے کا مستحق اور دعویدار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ذبح اور

عظیم کے خاص دونوں الفاظ۔ جو فدیہ اسمٰعیلؑ کی تعریف میں بطور مخصوص آئے۔ وہ ہر پہلو اور ہر قرینہ سے واقعہ عظیمہ کربلا کے ساتھ پورے پورے منطبق ہوجاتے ہیں۔ اور ذبح اور عظیم۔ دونوں صفات مذکورہ کی اصلی اور حقیقی شکل وصورت پوری تفصیل وتکمیل کے ساتھ اس ایک واقعہ میں قایم ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس واقعہ کے بعد آجتک کسی دوسرے واقعہ کا ایسا عظیم اور شدید نہیں واقع ہونا ثابت کر رہا ہے۔ کہ سوائے اس ایک واقعہ کے کوئی دوسرا واقعہ ذبح عظیم کا نہ مقابل ہوا ہے۔ اور نہ مماثل۔ اور نہ سوائے اسکے ان الفاظ ربانی سے نہ کوئی دوسرا استفادہ ہوسکتا ہے اور نہ مراد۔

ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم ناظرین کتاب کو تبلادیں۔ کہ شبلی صاحب کی طرح میرا یہ بیان میری خاص طبائعی نہیں ہے ۔ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم۔ بلکہ اس کی صحت اور حقیقت کی سند میں ایک ایسے محقق اور قابل نقاد فن کا قول ومختار پیش کردیں۔ جو فی الحال سواد اعظم میں شریعت اور طریقت۔ دونوں طریقوں کی جامعیت اور اعلمیت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ نواب خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس پریانواں مولف تاریخ احمدی وغیرہ وغیرہ۔ اپنے رسالہ بلاء المبین میں رقم طراز ہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا واقعہ تو سب کو معلوم ہے۔ جس کی نسبت خداوند عالم فرماتا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ان ہذا لہو البلاء المبین کے معنی تو صاف ہیں۔ کہ فی الواقع یہ ایک روشن امتحان ہے۔ لیکن وفدیناہ بذبح عظیم کا مطلب سمجھنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے کس ذبح عظیم یعنی قربانی بزرگ کے بدلے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو بچالیا۔ فی الحقیقت وہ ذبح عظیم جسکا ذکر اس آیۂ کریمہ میں ہے۔ وہی تھا۔ جو عاشورہ محرم کو کربلا کے میدان قیامت خیز میں بروز جمعہ بوقت عصر واقع ہوا۔ اور ابراہیمؑ کے فرزند کی ناتمام قربانی کو علیؑ کے لخت جگر حسینؑ نے کامل کردیا۔ تھوڑا غور کرنے سے سمجھ میں آجاسکتا ہے کہ ذبح گوسفند کی یہ حقیقت نہیں تھی۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے مقابلہ میں ذبح عظیم کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے۔ اخبار صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب حسب منشا حکم باری عز اسمہ حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا۔ اور بعدہٗ بموجب ارشاد باری اس عمل سے باز رکھے گئے۔ تو آپ کو حزن وملال کے ساتھ یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ جس قربانی کے لیے کئی بار شدید تاکید کے ساتھ مامور کئے گئے۔ اس سے کیوں باز رکھے گئے۔ پس حق سبحانہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ یعنی واقعی یہ بہت ہی سخت امتحان ہے۔ اور ہم نے اسمٰعیلؑ کو ایک بہت بڑی قربانی سے بچالیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کو دریافت کیا۔ تو ارشاد ہوا کہ تیرا فرزند حامل نور ختم المرسلینؐ ہے۔ اسوجہ سے ہم نے تیرا امتحان لیکر اسمٰعیلؑ کو بچالیا۔ پھر حق سبحانہٗ تعالےٰ نے خلیل اللہ کی نظروں سے رفع حجاب فرمایا۔ کہ آپ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی آل باصفا کا رتبہ جلیلہ مشاہدہ فرمائیں۔ جب آپ نے یہ منظر عالی منزلت ملاحظہ فرمایا۔ تو بہت ہی محظوظ ہوئے۔ اور حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا۔ یہ کون ہیں۔ جواب آیا کہ یہ اسمٰعیلؑ کے فرزند ولخت جگر۔ یعنی دختر حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کا

بیا حسین ؑ ہے۔ اے ابراہیم ؑ اپنی ذریت کو دوست رکھتا ہے۔ یا محمدؐ کو۔ اپنے فرزند اسمٰعیل ؑ کو دوست رکھتا ہے۔ یا محمدؐ کے فرزند حسین ؑ کو۔ ابراہیم ؑ نے عرض کی کہ خداوندا میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات سے۔ اور امام حسین علیہ السلام کو حضرت اسماعیل ؑ کی ذات سے زیادہ دوست رکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا۔ اسمٰعیل ؑ کا فدیہ عظیم یہی ہے۔ اشقیائے اُمت اسکو مع اس کے اطفال خوردسال کے تین دن کا بھوکا پیاسا۔ غربت اور بیکسی کی حالت میں نہایت ظلم وستم کے ساتھ شہید کریں گے۔ جس کو دیکھکر شجر وحجر آسمان وزمین۔ اور وحش وطیور۔ روئیں گے۔ جب جناب خلیل اللہ نے یہ واقعہ سُنا۔ شدت قلق سے آپ پر عالم گریہ طاری ہوا۔ اور سرشک غم دیدہ ہائے مبارک سے جاری ہوئے۔ خطاب آیا۔ اے ابراہیم حسین ؑ پر رونا اُسی ثواب کے برابر ہے۔ جو اسماعیل ؑ کی قربانی سے حاصل ہے۔ مناہج الطالبین قزوینی۔ روضۃ الشہدا ملا حسین واعظ کاشفی صاحب تفسیر حسینی۔ حبیب السیر۔ معارج النبوۃ ملامعین ہروی۔

بات یہ ہے۔ کہ جب حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل ؑ کو گھر سے چلے۔ اور حضرت ہاجرہ نے چھری اور رسن لینے کا سبب دریافت کیا۔ تو فرمایا۔ کہ ایک گوسفند قربانی کرنا ہے۔ پس حق سبحانہٗ تعالےٰ نے ایک گوسفند قربانی بھیجکر اپنے برگزیدہ نبی کے قول کو پورا کر دیا۔

اس سر عجیب کو تو دیکھو۔ کہ باوجود صدہا زخموں کے جناب سید الشہدا روحی الہ الفدا کی روح مبارک نے جسد اطہر سے اسوقت تک مفارقت نہیں کی۔ جب تک کہ آپ کے گلوئے تشنہ پر خنجر جفا پھر کر لفظ ذبح کا مصداق نہ ہو لیا۔ اور اسی لفظ ذبح کی رعایت تھی۔ کہ آپ کے قاتل بھی اسلام کے مدعی تھے۔ کیونکہ ذابح کے لیے کلمہ گو ہونے کی شرط ہے۔ گو وہ زبانی ہی کیوں نہ ہو۔ اور چونکہ شہادت کبریٰ کی تعمیل بھی منظور الہٰی تھی۔ لہٰذا وہی اشرار وملاعین جو برائے نام اسلام کا دم بھرتے تھے بنجوائے کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم وشھدوا ان الرسول (خدائے سبحانہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کیا۔ اور رسولؐ پر شہادت دینے کے بعد پھر کافر ہوگئے۔ اُن کو خدا کیسے ہدایت فرماسکتا ہے۔ کفار نابکار سے بدتر اور نابکار ہو گئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتھم واولٓئک ھم الظٰلمون جیسا کہ خدائے سبحانہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے ایمان کے بعد پھر کفر اختیار کیا۔ تو انہوں نے اور زیادہ کفر کیا۔ اُن کی توبہ کبھی قبول نہیں۔ اور وہی لوگ ظالم ہیں) پس گویا قدرت نے ذبح اور شہادت کے دونوں پہلوؤں کو اسی واقعہ سے ثابت اور مکمل کر دیا۔ (رسالہ البلاء المبین مطبوعہ کانپور)

لائق ہمعصر نے سواد اعظم کے متذکرہ صدر علماء ومحدثین اور مورخین کے اقوال سے ہمارے اس مختار اور تحقیق کی پوری تائید اور کامل تصدیق ہوگئی۔ کہ آیہ وافی ہدایہ وفدیناہ بذبح عظیم کا اصلی مقصود اور حقیقی مفہوم سوائے جناب سید الشہدا شہید کربلا علیہ التحیۃ والثنا اور دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور مقتل اسماعیلی کی پوری اور کامل مماثلت اور مشاکلت سوائے مقتل کربلا کے اقطاع عالم میں کسی مقام کے

کسی تاریخی واقعہ اور شاہد سے۔ کوئی تاریخ۔ کوئی سیرت اور کوئی تذکرہ ثابت نہیں کر سکتا۔
ہمارے محقق معاصر نے لفظ ذبح کی تحقیق اور اس کی مطابقت نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت فرمائی ہے۔ لیکن اس کی عظمت۔ جو لفظ عظیم سے ظاہر ہوتی ہے۔ کسی قدر تصریح طلب ہے۔ منقولی طریقہ سے۔ جیسا کہ محدثین کے نقل اقوال سے اوپر نقل ہو چکا ہے۔ کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کو بمقابلہ حضرت اسماعیلؑ کے زیادہ دوست رکھنے کا اقرار کر لیا۔ تو حسینؑ کی شہادت اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح سے عظمت میں بڑھ گئی۔ اسی لیئے لفظ عظیم سے قرآن مجید کے الفاظ الہامی میں مخصوص و منصوص فرمائی گئی۔
معقولی طریقہ استدلال سے بھی دیکھا جاوے۔ تو بھی ہر قرینہ۔ ہر طریقہ اور ہر پہلو سے۔ قتل حسینؑ کا واقعہ نیز واقعہ ذبح عظیم تسلیم کیئے جانے کا پورا استحقاق رکھتا ہے۔ اور کیونکر نہ ہو۔ مفصلہ ذیل واقعات پیش نظر رکھے جائیں۔
(۱) حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے کو صرف ذبح کیئے جانے کا حکم ہوا تھا جو غیر تعمیل اور بلا تکمیل رہ گیا حضرت ابراہیمؑ کا منتوں والا فرزند چھری کے نیچے سے صحیح و سالم بچ آیا۔ مگر ہمارے رسول محمد احمد مصطفےٰؐ کا نور نظر۔ فاطمہ زہراؑ کا لخت جگر شمر کے خنجر بیداد کے نیچے سے نہ بچا۔ نہ بچا۔
(۲) حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو راہ خدا میں ذبح کرنے پر آمادہ اور مہیا ہو گئے حقیقت میں بڑی اور فوق البشری پاداری و استقامت دکھلائی۔ مگر جب اسکے مماثل واقعات۔ سلسلہ قتل حسینؑ میں دیکھے جاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے۔ کہ صابر باپ اسماعیلؑ کے ایسے۔ اپنے برابر والے نوجوان بیٹے کو اس پورے یقین کے ساتھ کہ یہ زندہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ بطیب خاطر راہ خدا میں برچھیاں کھانے اور سر کٹانے کے لیئے بھیجدیتا ہے۔ یہ ہجدہ سالہ جوان قتل ہو جاتا ہے۔ یہ خونین منظر آنکھوں سے دیکھکر صابر باپ فوراً اس قربانی کی منظوری کے شکریہ میں جھک کر سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اور اس پر حزن و ملال کا کوئی ظاہری عالم طاری نہیں ہوتا۔ اور رضائے الٰہی میں اس کی مستعدی۔ راہ خدا میں اس کی ایثار نفسی اور عالی ہمتی کم نہیں ہوتی۔ سجدہ سے اٹھتا ہے اور فوراً ایک طفل شیر خوار کو اپنے ہاتھوں پر گھر سے اٹھا لیتا ہے۔ اور تین بھالوں والا تیر کھلوا کر راہ خدا میں قربان کر دیتا ہے۔
(۳) حضرت اسماعیلؑ کے نازک گلے پر چھری پھیرنے والا ہاتھ بھی تھوڑی دیر کے لیئے اگرچہ قاتل ہی کا ہاتھ کہلائے گا۔ مگر پھر بھی حقیقتاً اسی باپ کا وہی ہاتھ تھا۔ جو اس سے قبل شفقت اور محبت کے غیر منتقل تقاضو سے اسماعیلؑ کے سر اور پشت پر بے شمار بار پھر چکا تھا۔ مگر حسینؑ اور ان کے جوان کمسن اور شیر خوار بچوں

پر اُن خونخوار ظالم وبے رحم قاتلوں کی تلواریں اور خنجر پھیر دیئے گئے۔ اور اُن ہاتھوں نے پھیرے جن کے قلب لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے۔ اور اُن سے رحم و مروت اور رعایت کی امید رکھنا قطعی محال تھا۔ مگر حضرت کے جوان بیٹے کو مرتے ہوئے دیکھا۔ اور شکر کا سجدہ اُنھیں کرتے ہوئے دیکھا۔ حسینؑ نے بالآخران فوق البشری مصائب پر کیا کیا صبر کیا۔ اور اپنے جوان صالح کے مارے جانے اور فائز شہادت ہونے پر خدا کا شکر کیا۔

(۴) اِن کے علاوہ۔ غربت۔ مسافرت کا عالم۔ تپش اور قیامت کی گرمی کا موسم۔ سیکڑوں کوسوں کا سفر۔ دن دن بھر کی دھوپ۔ رات رات بھر کی شبنم۔ ہر منزل پر کیا۔ ہر ہر قدم پر قتل و غارت کی دہشت بال بچوں کا ساتھ۔ پانی کی کمی۔ غلہ کا کال۔ پھر داخلہ کربلا کے بعد پانچ دن بعد آب و دانہ کی قطعی بندش چوبیس پہر کی پیاس۔ مجبور اور شکستہ پا خواتین اور بچوں کی بے تابی اور بے قراری۔ اور پھر روز عاشور صبح سے عصر تک اٹھارہ ۱۸ عزیز اور چونسٹھ رفقا کا سامنے قتل کیا جانا۔ وہ قیامت ناک منظر تھا جن میں سے ایک شائبہ بھی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے پیش نظر نہیں تھا۔ مگر حسینؑ اپنے کمال استقلال سے ایک ایک کرکے اِن تمام مصیبتوں کو اپنی تنہا جان پر کھیل گئے۔ یہ خونیں واقعات ہر قرینہ اور ہر طریقہ سے حسینؑ کے واقعہ ذبح کو اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح سے عظیم ترین ثابت کرتے ہیں۔ یہ وہ مقامات تھے جن میں ایک بھی نہ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور نہ اسماعیلؑ کی جان پر گذرے۔ اِسی بنا پر وحی الہیٰ نے اِس کو مخصوص طور پر لفظ عظیم سے تعبیر کیا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرے امر پر بھی غور کرنا چاہیے۔ آخر فقرہ آیہ مبارکہ جس پر واقع ذبح اسمٰعیلؑ کی بشارت تمام ہوتی ہے۔ یہ ہے۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ جس کے ظاہر معنی یہ ہوتے ہیں۔ ہم نے اسکا ذکر آیندہ نسلوں میں یادگار چھوڑا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ جس واقعہ کے ہمیشہ ذکر قایم رکھے جانے کی بشارت دیجاتی ہے۔ وہ ذبح اسماعیلؑ کے ذکر سے منطبق ہوتی ہے۔ یا ذکر شہادت حسینؑ سے۔ جب ہم اِس بشارت کی عملی صورت پر غور کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذبح اسماعیلؑ کے متعلق تمام دُنیا کے مسلمان سوائے اِسکے کہ قربانی والے دن۔ سال میں ایک دن (دسویں ذی الحجہ) قربانی کردیں۔ اور نہ کبھی آپ کا کوئی ذکر کرتا ہے۔ اور نہ آپ کے واقعات وحالات کا تذکرہ۔ میرے خیال میں اکثر کو تو اتنک اصل واقعات کی خبر بھی نہیں۔ بخلاف اِسکے۔ ذکر حسینؑ۔ آپ کے ابتلا و امتحان کے حالات و واقعات۔ باوجود اِسکے کہ وقت وقوع سے۔ اسکے موقوف کرنیکی بے شمار تدبیریں۔ چھپانے اور مٹانے کی لاکھ لاکھ ترکیبیں کی گئیں لیکن پھر بھی مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ غیر اقوام وملت کے لب وزباں پر کامل شرح و بسط کے ساتھ آجتک

جاری ہیں۔ اور اُسکے ذکر کے لیئے۔ ایام مخصوصہ اور وقت مقررہ کی بھی کوئی تخصیص اور شرط ضروری نہیں ہے۔ یہ وہ ذکر ہے۔ جو ہر وقت تازہ ہے۔ اور ہمیشہ جاری۔ مسلمانوں کے اُن کئی کروڑ نفوس کے علاوہ جو اس ذکر کے احیا کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اسلام کے تمام فرقے اور شعبے بھی اس کے ذکر و افکار سے غافل نہیں ہیں بلکہ اس کی حقیقت اور اصلیت کے خارجی اور ظاہری اثر سے متاثر ہو کر غیر اقوام و ملت کی کثیر التعداد جماعت اس کے ذکر و احیا سے خاص ہمدردی اور دلچسپی رکھتی ہے۔ اور اکثر اسکو ارادت و عقیدت میں داخل کرتی ہیں الغرض جہاں تک تحقیق اور غور سے کام لیا جاتا ہے۔ اور روزانہ مشاہدات سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ امر یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کہ ذبح اسماعیلؑ کے ذکر سے شہادت حسینؑ کا ذکر کہیں زیادہ ہوتا ہے تو ذبح عظیم و ترکنا علیہ فی الآخرین کا اصلی مدعا اور حقیقی منشا۔ ذکر حسینؑ سے پورا ہوتا ہے۔ نہ ذکر اسماعیلؑ سے۔ تو پھر اس بشارت کے مطابق۔ ایک اتنے بڑے ذکر مشہور کے ہوتے ہوئے۔ جو صحیحاً تمام اقطاع عالم اور ہر قوم و ملت میں ہمیشہ آجتک دائع اور شائع ہے۔ کیونکر عقل سلیم اُس واقعہ کے ذکر کو عظیم تسلیم کریگی۔ جو باعتبار ذکر و شہرت کے نہ اتنا مشہور ہے اور نہ اس کثرت سے مذکور۔

اگر زبانی ذکر سے یہاں مقصود نہیں ہے۔ بلکہ تحریر و نقل اور اتحفاظ بین الدفتین مراد ہے۔ تو ہم دکھلاتے ہیں۔ کہ جتنے کثیر التعداد دفتر کے دفتر اور بڑے بڑے کارنامے مقتل حسینؑ کے ذکر و تفصیل میں دُنیا اور دُنیا کے پیش نگاہ ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں عشر عشیر کتابیں بھی حضرت اسماعیلؑ کے تذکرہ و ذکر و واقعات میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ روزمرّہ کے مشاہدے ہیں اور اُمور مسلمہ جس سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے تحریری اور تقریری دونوں طریقوں سے اس بشارت ایزدی کے اُس ذکر موعود کا اصلی مقصود واقعہ کربلا ہی کا ذکر ثابت ہوتا ہے۔

عبارت قرآنی کی ترکیب بھی بتلا رہی ہے۔ کہ علیہ کی ضمیر واحد غائب قاعدہ قربت و اتصال کے مطابق ذبح عظیم کی طرف راجع سمجھی جاوے گی۔ نہ واقعات ذبح اسماعیلؑ کی طرف راجع۔ کیونکہ ضمیر متصل کی ضرورت صریح اور موقع مناسب کے ہوتے ہوئے۔ اسکو ضمیر منفصل سمجھنا دلیل مہمل ہے۔

فدیناہ بذبح عظیم کی بشارت قرآنی کا جو حقیقی مفہوم و مقصود تھا۔ وہ عقلی اور نقلی دلائل و قرائن سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا۔ اب نصوص الہیہ کے بعد احادیث و اقوال رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں اسکی اہمیت اور عظمت کی شان دیکھنی چاہیئے۔ اس امر کی تلاش و تحقیق میں ہم کو۔ صحاح۔ مسانید اور سنن میں۔ غرض تمام اقسام کتب حدیث سے۔ اتنی کثیر التعداد اور صحیح الاسناد حدیثیں ملتی ہیں۔ جن سے تنہا یہی نہیں معلوم ہوتا۔ کہ آنحضرت صلعم نے مقتل حسینؑ کی خبر اپنی زبان صداقت ترجمان سے تمام اہل اسلام کو پہنچائی

بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اِس واقعہ کی خبر کو منجانب اللہ ایک بار نہیں کئی بار ایک ملک مقرب کے ذریعہ سے نہیں۔ بلکہ مختلف فرشتوں کی وساطت سے پہونچایا گیا ہے۔ ہم اگر ان تمام حدیثوں کی تفصیل کیسی صرف نقل اجمالی کا قصد کریں۔ تو پھر یہ جزو تالیف ہمارا مستقل کی ایک تیار اور کامل جلد ہو جائے گی۔ جو ہمارے موضوع تالیف سے زائد ہے۔ اس لیئے ہم۔ شریعت کے مقتدا، طریقت کے رہنما مرحوم صاحبزادہ حسن میاں صاحب پھلواروی کی کتاب۔ شہادت حسینؑ۔ مطبوعہ لاہور سے صرف اُن راویوں کے نام۔ جنہوں نے آنحضرت صلعم سے اِس واقعہ عظیمہ کی پیشن گوئیوں کو منجانب اللہ ہونا بیان کیا ہے۔ اور انہیں بزرگوں کے ساتھ اُن مفسرین محدثین اور مورخین اور اُن کی کتابوں کے نام بھی ذیل میں درج کیئے دیتے ہیں۔ جنہوں نے اِس واقعہ کو اپنی اپنی تالیفات میں قلم بند فرمایا ہے۔

صحابہ کبار میں

حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؑ۔ (خود) حضرت امام حسینؑ۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس۔ حضرت انس۔ ابو الدرداء۔ اور زید ابن ارقم

امہات مومنین میں

حضرت عائشہ۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینب بنت جحش

خواتین صحابیہ

حضرت ام الفضل مادر حضرت عبد اللہ ابن عباس۔ اسماء بنت عمیس۔ اور سلمیٰ نے اس کی پیشن گوئی کی روایت کی ہے۔

مفسرین محدثین اور مورخین

ہر طبقہ کے علما و محدثین اسکو اپنی کتابوں میں مستند کرتے آئے ہیں۔
امام احمد ابن حنبل[1]۔ ابن ابی شیبہ[2]۔ عبد ابن حمید کشی[3]۔ ابو داؤد[4]۔ ترمذی[5]
ابن سعید[6]۔ طبری[7]۔ حاکم[8]۔ عبد الرزاق[9]۔ ابو نعیم[10]۔ ابو یعلیٰ[11]۔ ابن عساکر[12]۔ طبرانی[13]
خطیب بغدادی[14]۔ اور بیہقی[15] وغیرہم

متاخرین علما و محدثین

اور پھر ان سے اکابر محدثین و علمائے محققین نقل کرتے آئے ہیں۔
ابن تیمیہ[16]۔ ابن قیم[17]۔ لوذی[18]۔ ابن صلاح[19]۔ سبکی[20]۔ ابن سبکی[21]۔ قاضی عیاض[22]۔ بیضاوی[23]
غزالی[24]۔ ابن عربی[25]۔ قرطبی[26]۔ ذہبی[27]۔ مزی[28]۔ ابن اثیر[29]۔ ابن حجر عسقلانی[30]
ابن حجر مکی[31]۔ عینی[32]۔ سخاوی[33]۔ سمہودی[34]۔ شعرانی[35]۔ جلال الدین سیوطی[36]۔
شیخ علی متقی[37] شیخ عبد الحق[38]۔ شاہ ولی اللہ[39] اور شاہ عبد العزیز[40]

علمائے اُندلس۔ اکابر محدثین و علمائے اندلس مثل ابو عمر[41]۔ قرطبی[42]۔ ابن حزم[43]۔ حمیدی[44] ابن عربی مالکی[45]۔ ابن عربی صوفی[46]۔ ابن عبد ربہ[47]۔ اور مقری[48] وغیرہم بھی واقعہ شہادت کو اپنی کتاب میں درج کر چکے ہیں

شہادت حسین مطبوعہ امرتسر صفحہ ۴۰

جب اتنے صحابہ کبار اور اتنے کثیر التعداد محدثین۔ مفسرین اور مورخین کی جماعت اس واقعہ کی الہامی ہونے کی تصدیق و توثیق میں ہم کلام وہمزبان ہے۔ تب خود غرضی۔ تقلید اسلاف وغیرہ کو تھوڑی دیر علیحدہ رکھکر اس واقعہ عظیمہ کی نسبت وفدیناہ بذبح عظیم کے سچے مفہوم اور اصلی مقصود تسلیم کرنے میں کسی مسلمان کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اور کیا کلام۔

ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی۔ اس کے کسی پہلو کو ناتمام اور غیر منفعل بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اب ہم اسی کے ضمن میں شبلی صاحب کی اس غلط تاویل کو جو انہوں نے حقیقت قربانی کی تفصیل میں تمثیلی اور عینی کی اصلیت کھولنے کی غرض سے قلمبند فرمائی ہے۔ یاد دلاتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ مولوی صاحب کو اس خیالی تاویل کی جگہ ذبیح اسمٰعیلؑ کے تذکرہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی صحیح اور قریبی تمثیل یاد آئی ہوتی۔ مگر افسوس۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ایک زمانہ سے یہ حضرات اور ان کے واقعات۔ مصالح ملکی کی مخالف ہونے کے باعث۔ مرفوع القلم ہو چکے ہیں۔ اور بالکل نسیاً منسیا۔ ان کے کوئی محاسن۔ محامد اور مشارف نہ قابل ذکر ہیں۔ نہ لائق غور وفکر۔ منقولات۔ معقولات قرائن۔ قیاسات۔ اسناد و اشہاد صحیحہ سے اقتباسات ان کے فضائل ومناقب میں دکھلائے جائیں۔ بالکل موضوعات اور مجہولات ٹہرائے جائیں گے۔ پھر ایسی نفسانیت کے تیرہ وتار عالم میں ہم کو شبلی صاحب یا ان کے ہم عقیدہ حضرات سے اس واقعہ کی عظمت اور حرمت کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ جس کا سننا گناہ اور ذکر کرنا معصیت ہے

ہمارے مرقومہ بالا استدلال نے اس مسئلہ کو کامل طور سے ثابت کر دیا۔ کہ ذبح عظیم سے موجودہ رسم قربانی جانوران نہ عقلاً مراد ہو سکتی ہے۔ نہ نقلاً۔ اسی طرح ترکنا علیہ فی الآخرین سے ذکر واقعہ اسمٰعیلؑ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ذکر شہادت حسینؑ اور لفظ فدیٰ ہی۔ اور ذبح عظیم کا اصلی اور حقیقی مفہوم سوائے قتل حسینؑ کے کوئی اور دوسرا واقعہ نہیں ہو سکتا۔

توریت سے نقبائے اثنا عشر

ہم اپنے موجودہ استدلال کے ایک دوسرے پہلو پر نظر کرتے ہیں۔ کہ جناب اسمٰعیلؑ کے حالات و واقعات میں شبلی صاحب اور نیز سرسید مرحوم نے توریت مقدس کے حوالے اور اسناد پیش کئے ہیں۔ اول ان اسناد و اشہاد سے اس واقعہ کی قدامت ثابت کرنا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مخالفین کو اپنے شاہد دیکھ کر عذر کا پہلو باقی نہ رہے میں کہتا ہوں۔ دونوں حضرات کی توجیہات صحیح ہیں۔ اور بالکل مناسب۔ مگر اس کے ساتھ اتنی عرض ضروری ہے۔ کہ ان اسناد و اشہاد کے تمام کلیات وجزئیات سے مستفاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے

با صرف انھیں مندرجات سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ جن سے آپ حضرات کے مطلب نکلتے ہوں۔

سیدؔ صاحب اور شبلیؔ صاحب۔ دونوں صاحبوں نے توراۃ۔ کتاب اوّل باب ۱۷۔ آیت ۲۰ سے حضرت اسماعیلؑ کے متعلق یہ عبارت لکھی ہے۔

اے ابراہیم میں نے تیری دعا اسمٰعیلؑ کے حق میں قبول کی۔ ہاں میں نے اُسے برکت دی۔ اور اُسے بارآور کیا۔ اور اُسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اُس سے بارہ امام (سردار) پیدا ہونگے۔ اور میں اُنکو بڑی قوم بناؤں گا۔

دونوں حضرات نے بارہ امام یا سردار کے مفہوم کو باعتبار ظاہر اُن کے بارہ بیٹوں کی تعداد سے مطابق پاکر منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ حضرات اگر ذرا بھی حقیقت کی نگاہوں سے اِس مسئلہ کو دیکھتے تو اِن کو خود معلوم ہو جاتا۔ کہ جن الفاظ مخصوصہ سے خداوند عالم نے حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سے ایک بھی نہ اسوقت اِس نام و لقب سے مشہور ہوا۔ اور نہ اسوقت تک کوئی اِس نام و لقب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اور نہ خود توراۃ میں اِن کے امام۔ پیشوا۔ یا سردار ہونے کی کہیں تصریح ہے۔ یا اِن کی نسبت اِن القاب و آداب کا ذکر و مذکور ہے۔ اور نہ اِن مناصب و مراتب کے متعلق اُن کے کوئی احکام۔ اقوال۔ یا ارشاد کہیں پائے جاتے ہیں۔ پھر کیسے کوئی عقل سلیم رکھکر اِن لوگوں کو خطاب و القاب مندرجہ توراۃ کے صحیح معنیوں میں تسلیم کریگا۔ سیدؔ صاحب اولاد اسماعیلؑ کی بشارت کے متعلق لکھتے ہیں۔

جو لوگ ہمارے مخالف (یہود و نصارٰی) ہیں وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ خدا نے اسماعیلؑ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اُن کی اولاد میں بارہ سردار ہونگے۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا سرداروں کے تھے۔ پیدا ہوئے۔ اور جس برکت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ دُنیاوی تھی۔ نہ روحانی۔

اِس بحث کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

جس مضمون کا وعدہ کہ حضرت اسماعیلؑ سے کیا گیا تھا۔ اور جو لفظ برکت کا حضرت اسماعیلؑ کے وعدے کے متعلق استعمال ہوا۔ اُسی مضمون کا وعدہ حضرت اسحاقؑ سے بھی کیا گیا۔ اور وہی لفظ برکت کا اسحاقؑ کے وعدہ میں بھی لایا گیا۔ پھر یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے۔ کہ اسماعیلؑ سے جو وعدہ تھا۔ وہ تو دُنیاوی تھا۔ اور جو اسحاقؑ سے تھا۔ وہ روحانی تھا۔

خطبات مطبوعہ لاہور ص ۵۹۵۔

سیدؔ صاحب نے اپنے استدلال میں صرف لفظ برکت پر توجہ فرمائی ہے۔ اور اسی پر اپنی تمام استدلالی قوت صرف فرما دی ہے۔ صرف اتنا کیا ہے۔ کہ اولادِ اسماعیلؑ میں برکت روحانی کا عطا ہونا تسلیم کر لیا۔ پھر یہیں پر سیدؔ صاحب کو اپنا ضعف استدلال بھی سمجھ لینا لازم تھا۔ کیونکہ آگے چلکر جن لوگوں کی نسبت آپ

رُوحانی برکت سے مستفیض ہونا یقین کرتے ہیں۔ اُن کے حالات وواقعات سے اُن کے صفات رُوحانی ثابت نہیں کرتے۔ وہ دعوے جس کا ثبوت نہ موجود ہو۔ مہمل ہے۔ اور بیکار اولاد اسمٰعیلؑ میں صفات رُوحانی نہ ہونے کی وجہ سے توراۃ کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے۔ کہ اسمٰعیلؑ سے محض دُنیاوی وعدہ تھا وہ اِس طرح پورا ہوا۔ کہ اُن کے بیٹے اقوام وقبائل کے رئیس وسردار ہوئے۔ ریاست اور سرداری دُنیاوی نام ونمود ہیں۔ اُن کو رُوحانی عظمت واقتدار سے واسطہ نہیں۔ اِس لیئے اسمٰعیلؑ کے ساتھ دُنیاوی برکت کا وعدہ ہونا صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اور رُوحانی وعدہ ہونا غلط۔

بارہ۱۲ امام یا سردار کے متعلق سید صاحب نے کوئی تحقیق نہیں کی ہے۔ اِس سے سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس کی نسبت آپ نے مخالفت کے قول کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ تو اِس بنا پر گویا امام اور بادشاہ ایک ہی چیز ہے شبلی صاحب کے سکوت کا بھی یہی عالم ہے۔ اور کیونکر نہ ہو۔ ان دونوں صاحبوں کے اُصول عقائد یہی ہیں۔ بہر حال۔ امام وبادشاہ ایک شے سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ اور مخالف قرآن۔ جناب ابراہیمؑ کو کسی مسلم یا غیر مسلم محقق اور مورخ نے بادشاہ نہیں مانا۔ مگر قرآن اِنّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تجھ کو آدمیوں کا امام (پیشوا) بنایا) امام بتلاتا ہے۔ سید صاحب وغیرہ کے اُصول کے مطابق امام ہونے کی رعایت سے ماننا پڑے گا۔ کہ وہ بادشاہ وقت بھی تھے۔ جو رواتیاً اور درایتاً دونوں طریقوں سے خلاف ہے۔ اگر اولاد انبیاء ومرسلین کے لیئے عادت الٰہی کا یہی دستور اور قاعدہ خاص مان لیا جائے۔ تو پھر ہر رسولؐ اور نبی کے صاحبزادے کو حکمران زمانہ اور سلطان وقت ثابت کرنا ہوگا۔

حقیقت تو یوں ہے۔ کہ امام کو ملکی حکمران کے معنیوں میں تسلیم کرنا عقل کی خوبی ہے۔ جو اہل کتاب کو پہلے اور اہل اسلام کو پیچھے استحکام سلطنت کی غرض خاص سے ضروری معلوم ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ اسی نے امرا پرستی کا نقص وعیب اُن میں پیدا کر دیا۔ اور جس طرح کاہنین اور رابئین عہدنی اسرائیل میں سلاطین بنی اسرائیل کو واجب الاحترام اور واجب الاتباع سمجھتے تھے۔ اُسی طرح اسلام میں بھی علماء ومحدثین سلاطین اور فرمانروایان سلطنت کو امام مفترض الطاعت سمجھنے لگے۔

خدائے سبحانہ تعالےٰ نے جن معنیوں میں حضرت ابراہیم کی نسبت لفظ امام کا استعمال فرمایا ہے۔ وہ رُوحانی پیشوا۔ اور مقتدا کے ہیں۔ اور انہیں معنیوں کے ساتھ توراۃ میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ کیونکہ ابھی ابھی سید صاحب حضرات اسحاقؑ واسمٰعیلؑ کی مساوات فی المدارج کی بحث میں دعائے برکت کو روحانی ہونا۔ دونوں کے حق میں بمراتب مساوی ثابت کرآئے ہیں۔ پھر یہاں رُوحانی معنی کی جگہ دُنیاوی مراتب کیسے مراد لیئے جاویں گے۔

بہرحال لفظ امام کی حقیقت دکھلاکر ہم اُس کی اہمیت اور عظمت تبلاتے ہیں۔ کہ منصب امامت ایسا عظیم المنزلت تھا۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی اولاد و ذرّیت کے لیے اس کے عطا کیے جانے کی دُعا خداوند عالم سے کی تو منظور بالشرط ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سُلت وَمِنْ ذُرِّيَّتِي (اور میری اولاد کیا وہ امام ہونگی؟) اور خدائے تعالٰے کی اجابت مشروطہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (ہاں مگر میں اُن میں ظالموں کے ساتھ اپنا وعدہ پورا نہ کروں گا) قرآن مجید میں پوری تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ جس کو پڑھ کر ہر شخص بآسانی سمجھ لیگا۔ کہ ذرّیت ابراہیمی میں عموماً ہر فرد بشر خدا کے آگے منصب امامت کے قابل نہیں۔ مگر وہی جو بارگاہِ احدیت میں اسکا اہل ثابت ہوتا ہو۔ وہی لفظ ہم توراۃ میں بھی پاتے ہیں۔ تو پھر یہاں بھی اسکے معنیوں میں وہی تخصیص کیوں نہیں قایم کی جاتی اور تعمیم کو خواہ مخواہ کیوں داخل کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا عنوان بیان سے ثابت ہو گیا۔ کہ سلسلہ ابراہیمی میں منصب امامت کو عام کر دینا اور تمام ابناء اسماعیلؑ کو اسکا اہل قرار دیدینا مخالف قرآن ہے۔ اور جو امر مخالف قرآن ہے۔ اُسکو کوئی مسلمان تسلیم نہیں کرتا۔ جب سلسلہ اسماعیلی میں آپ کے بارہ بیٹوں کی امامت ثابت نہیں ہوتی۔ تو ہم کو آپ کی اولاد و اعقاب میں ان ذوات عالیہ اور نفوس قدسیہ کا سُراغ لگانا ضروری ہوا۔ کیونکہ الفاظ بشارت مندرجہ توراۃ و قرآن نے کوئی زمانہ خاص اُن کے لیے مقرر نہیں کیا ہے۔ جس کی مدت مقررہ اور زمانہ مخصوص کے اندر ہم اپنی تلاش و تحقیق کو محدود کر رکھیں۔ جب ہم اس کی تحقیق کرتے ہیں۔ تو ہم کو صاف صاف معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ جس طرح سلسلہ اسماعیلی میں دو ہزار برس کے بعد ہم کو منصب رسالت و نبوت کے متعلق توراۃ کی اُن متعدد اور متواتر آسمانی بشارتوں اور روحانی برکتوں کے کامل ثبوت اور صحیح نشان جناب ختم المرسلین صلعم کی ذات قدسی صفات میں ملتے ہیں۔ اُسی طرح اولاد اسماعیلؑ میں ان بارہ امام کی متبرک تعداد حضرات آئمہ اثنا عشر سلام اللہ علیہم اجمعین پر تمام ہوجاتی ہے۔ جو حکم خدا اور ارشاد رسولؐ کے مطابق پیشوایان اُمت تھے۔ اور حامیان شریعت۔

ہم کو اس مقام پر مناسبت کے اعتبار سے یہ بھی تبلادینا نہایت ضروری ہے۔ کہ توراۃ میں جس طرح جناب اسماعیلؑ کے بیٹوں کی نسبت بارہ (۱۲) امام ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ اُسی طرح حضرت موسٰیؑ کے زمانہ میں حضرت ہارونؑ کے بیٹوں کی نسبت بھی توراۃ و قرآن کی ایسے ہی بشارت مرقوم ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ بشارت یہ ہیں۔ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا (ہم نے اُن میں سے بارہ پیشوا نکالے)

ان حضرات کے حالات پر بھی غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان بارہ بزرگواروں سے کوئی بھی دُنیاوی فرماں روا یا حکمران وقت نہیں مانا گیا۔ سب کے سب خدا کی طرف سے روحانی پیشوائے اُمت تبلائے گئے

ہیں۔ اور مقتدائے شریعت۔ اب حضرات آئمہ اثناعشر سے اُن کی کامل مماثلت بھی ملاحظہ ہو۔

حدیث منزلت یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا نبی بعدی (اے علیؑ تیری مجھ سے تمہاری منزلت ایسی ہے۔ جیسی ہارون کی موسیٰؑ کے ساتھ۔ اگرچہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے) کی ایسی معتبر اور مستند حدیث ہے اسلام کا فرقہ فرقہ اور بچہ بچہ واقف ہے۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا مماثل اور حضرت علی مرتضےٰؑ کو حضرت ہارونؑ کا مقابل بنایا۔ تو ضرور ہوا۔ کہ حضرت علی مرتضےٰؑ کے صاحبزادے بھی حضرت ہارونؑ کے صاحب زادوں کے ہم رتبہ اور ہم شان ہوں۔ اس مماثلت اور شباہت کا بھی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خود اپنی زبان صداقت ترجمان سے اعلان فرما گئے ہیں مناقب امام احمد بن حنبل۔ سُنن ابوداؤد۔ صحیح ترمذی۔ سُنن دار قطنی۔ سُنن امام بیہقی۔ مستدرک امام حاکم۔ ذخائر عقبیٰ طبری۔ معجم طبرانی۔ اور تاریخ ابن عساکر میں مرقوم ہے۔

قال علی علیہ السلام لما ولد الحسن سمیتہ حربا فجاء رسول اللہ صلعم قال ارونی ابنی ماسمیتموہ قال حربا قال وھو حسن فلما ولد الحسین سمیتہ حربا فجاء رسول اللہ صلعم قال ارونی ابنی ماسمیتموہ قلنا حربا فقال ھو حسین وقال انما سمیتھم بولد ھارون شبر وشبیر۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ جب امام حسنؑ پیدا ہوئے تو میں نے اُنکا نام حرب رکھا۔ آنحضرت صلعم تشریف لائے۔ اور فرمایا میرے بیٹے کو مجھے دکھاؤ۔ تم نے میرے بیٹے کا کیا نام رکھا ہے۔ میں نے عرض کی حرب۔ ارشاد فرمایا اسکا نام حسنؑ ہے۔ پھر جب امام حسینؑ پیدا ہوئے۔ تو میں نے ان کا نام بھی حرب رکھا۔ پھر آنحضرت صلعم تشریف لائے۔ اور مجھ سے فرمایا۔ میرے بیٹے کو دکھاؤ تم نے اسکا کیا نام رکھا ہے۔ میں نے کہا۔ حرب۔ آپ نے کہا اسکا نام حسینؑ ہے۔ میں نے ان دونوں کے نام ہارونؑ کے بیٹوں کے نام پر رکھے ہیں۔

اب ان ناموں کی نسبت ہم تجویز رسالت پناہی صلعم کو عین تجویز الٰہی پاتے ہیں۔ فضائل الخلفاء میں علامہ وصابی ایک طولانی حدیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

فھبط جبرئیل فقال یا محمد صلعم ان ربک یقرئک السلام ویقال لک علیؑ منک بمنزلۃ ھارون من موسیٰ لکن لا نبی بعدک تسم ابنک ھذا باسم ولد ھارون فقال ما کان اسم ولد ھارون یا جبرئیل فقال شبر فقال ان لسانی عربی فقال سمہ الحسنؑ۔

پس جبرئیل آئے اور کہا اے محمد (صلعم) پروردگار آپ کا آپ کو سلام کہتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ کہ علیؑ تمہارے نزدیک ایسے ہیں۔ جیسے ہارون موسیٰؑ کے نزدیک۔ لیکن بعد تمہارے نبی نہیں ہے۔ آپ اپنے بیٹے کا نام ہارون کے بیٹوں کے نام پر رکھیں۔ حضرت نے کہا ہارون کے بیٹوں کا کیا نام تھا جبرئیل نے کہا۔ کہ شبر۔ حضرت نے فرمایا میری زبان عربی ہے جبرئیل کہنے لگے آپ انکا نام حسنؑ رکھیں

اس روایت کو مستدرک۔ شرف النبوۃ۔ اور مناقبات السادات میں بھی لکھا ہے۔

طبقات ابن سعد میں اس کی تصدیق و توثیق یوں مرقوم ہے۔

عن عمران بن سلیمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الحسن والحسین اسمان من اسماء الجنۃ ما سمیت العرب بہما فی الجاھلیۃ۔	عمران ابن سلیمان سے مروی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کہ حسنؑ اور حسینؑ (علیہما السلام) دو اسم ہیں اسمائے جنت سے۔ کبھی عرب نے یہ نام ایام جاہلیت میں نہیں رکھے تھے۔

آخر توثیق بھی ملاحظہ کرلی جائے۔ جس میں سبط کا لفظ۔ جو اسباط موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعینہ موجود ہے۔ امام ابو حاتم ایک طولانی حدیث کے خاتمہ میں آنحضرت صلعم کی زبانی لکھتے ہیں۔

وقال حسین منی وانا من الحسین احب اللہ من احب حسینا وحسین سبط من الاسباط	فرمایا آنحضرت صلعم نے کہ حسینؑ مجھ سے ہے۔ اور میں حسین سے ہوں۔ خدا اُسے دوست رکھتا ہے۔ جو حسینؑ کو دوست رکھتا ہے۔ حسینؑ اسباط میں سے ایک سبط ہے

میری دانست میں کیا کسی کی عقل میں بھی۔ توراۃ کے مندرجہ الفاظ۔ بارہ ۱۲ امام یا سردار بارہ ۱۲ نقبا اور اسباط کی شباہت اور مشاکلت کے ثبوت اس سے زیادہ مناسب۔ مطابق اور معتبر اور کیا ہوسکتے ہیں۔ ہم انہیں کو اپنے ثبوت مدعا کے لیے حد سے زیادہ کافی سمجھتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیہ کریمہ وبعثنا منھم اثنا عشر نقیبا کے استدلال کرنے سے جو میرا خاص مدعا تھا۔ وہ یہی کہ باوجود ایسے صریح اشہاد و اثبات فضائل و مدارج اہلبیت علیہم السلام کے جو صاف صاف قرآن مجید کی الہامی عبارتوں میں موجود ہیں۔ کسی صاحب کی نظر توجیہ اس کی نقل و تحریر کی طرف معطوف نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے۔ تو شبلی صاحب کی طرح۔ ایسی تاویل کی طرف جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایسے اولی العزم رسولؑ اور معصوم پیغمبر پر غلط فہمی اور خطاء اجتہادی کے نقص و الزام وارد ہوتے ہیں۔

افسوس ہے کہ سید صاحب نے خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور میں۔ صفحہ ۶۰۰ سے لیکر ۶۰۵ تک میں جناب موسیٰ اور جناب ختمی مرتبت علیہ السلام کے فی مابین مختلف دلیلوں اور طریقوں سے کامل مماثلت اور شباہت ثابت کی ہے۔ مگر اُن تمام دلائل میں نہ کہیں آیہ متذکرہ بالا وبعثنا منھم اثنا عشر نقیبا سے استدلال کیا ہے اور نہ حدیث رسولؐ اور خاص ارشاد پیغمبر۔ حدیث منزلت کی عبارت سے اُن دونوں صاحبان شریعت اور سلطان رسالت کی باہمی مساوات اور مماثلت دکھلائی ہے۔ ان حضرات کی عدم توجہی اور فروگذاشت کے ثبوت میں ایک یہی مثال بہت کافی ہے۔

اگر سید صاحب اسوجہ سے قرآن و حدیث کے استنباط کو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں ناقص سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے مخالف عیسائی جو اُن کے خاص مخاطب ہیں۔ وہ اسکو نہیں تسلیم کریں گے۔ تو ہم عرض کرتے ہیں کہ وہ لوگ آپ کے پیش کردہ قیاسی اور زبانی دلائل کو کب ماننے لگے۔ ہاں اگر آپ نے اپنے ثبوت استدلال میں مخالفین کے اقرار و اقوال سے کام لیا ہوتا۔ تو البتہ اُن کو عذر و کلام کی گنجائش نہ ہوتی۔ اور جب ایسا نہیں۔ اور صرف زبانی الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ تو کس کام کا۔ اِس سے تو نقل عبارات کلام الٰہیہ اور اور احادیث صحیحہ نبویہ کا قدیم طریقہ استدلال بدرجہا مستحسن تھا جس سے مخالفین اسلام چاہے فائدہ اُٹھاتے۔ یا نہ اُٹھاتے۔ لیکن عام مسلمان تو آپ کی تحقیق سے پورے طور پر مستفید و مستفیض ہو جاتے۔ مگر نہیں۔ سید صاحب کا قلم اِسوجہ سے تو تھوڑا ہی رُکا ہے۔ بلکہ اُن کے سکوت بیان اور سقوط تحریر کا اصلی باعث وہی ہے۔ جس کو ہم اِس بحث کے آغاز ہی میں اُوپر لکھ آئے ہیں۔
پر ہم کہتے ہیں۔ کہ غریب سید صاحب یا بیچارے شبلی صاحب کا کیا وجود اور کیا ہستی ہے۔ جو ان فروگذاشتوں اور استخفاف استحقاق کی شکایتوں کا اُن پر الزام لگایا جاوے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام اور تابعین ہی کے قدیم ایام سے اِن واقعات کے استیصال و استخفاف کی اِسوقت تک مسلسل کوشش جاری ہے۔

بہرحال۔ ہم اِن مستحقین کے مراتب و مدارج جن کا استخفاف و استیصال منظور ہے۔ ذیل میں امام قندوزی شیخ الاسلام قسطنطنیہ کے اُس مختار اور تحقیقی سعیار سے قلم بند کرتے ہیں۔ جو انہوں نے ائمہ اثنا عشر کی خاص تنقیح اور تخصیص کی بحث میں حدیث بعدی اثنا عشر خلیفۃ کے متعلق لکھی ہے

قال بعض المحققین ان الاحادیث الدالۃ علی کون بعدہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اثنا عشر قد اشتہرت من طرق کثیرۃ فبشرح الزمان وتعریف الکون والمکان اعلم ان مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم من حدیثہ ھذا الائمۃ اثنا عشر من اھل بیتہ وعترتہ اذ لا یمکن ان یحملہ علی الخلفاء بعدہ من اصحابہ عن اثنا عشر ولا یمکن ان یحمل ھذا لحدیث علی الملوک الامویۃ لزیادتہم علی اثنا

بعض محققین کا قول ہے۔ کہ یہ حدیث اِسکی دلیل ہے کہ بعد آنحضرت صلعم آپ کے بارہ[۱۲] خلفاء ہیں۔ پس طریقہ کثیرہ اور ہر اور ہر زمانہ اور وقت و مقام کی شرح و بیان سے یہ مشہور ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مراد بارہ خلفاء سے ائمہ اثنا عشر ہیں۔ جو آپ کے اہل بیت اور عترت طاہرہ سے ہیں۔ کیونکہ ان سے آپ کے صحابہ جو آپ کے بعد خلیفہ ہوئے مراد نہیں ہو سکتے۔ اِس لیئے کہ اُن کی تعداد بارہ[۱۲] سے کم تھی یہ حدیث کا ملوک امویہ پر بھی۔ اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اوّل تو اُن کی تعداد بارہ[۱۲] سے زیادہ تھی۔ دوسرے ظالم و فواحش اُن کے

عشر ولظلمهم الفاحش الا عمر ابن عبد العزيز ولكونهم غير بني هاشم لان النبي صلى الله عليه واله عن جابر اخفاصوته صلى الله عليه واله وسلم في هذه القول يرجح هذه الرواية لانهم لا يحسنون خلافة بني هاشم ولكن لا يمكن ان يحمله على الملوك العباسية لزيادتهم على العدد المذكور ولقلة رعايتهم الاية قل لا اسئلكم اجرا الا في المودة القربى وحديث الكساء فلا بد من ان يحمل هذ الحديث على الائمة الاثنا عشر من اهلبيته وعترته صلى الله عليه واله وسلم لانهم كانوا اعلم زمانهم واجلهم واورعهم واتقاهم واعلاهم نسبا وافضلهم حسبا واكرمهم عند الله وكان علومهم عن آبائهم متصلا بجدهم صلى الله عليه واله وسلم بالوراثة واللدنية كذا عرفهم اهل العلم والتحقيق واهل الكشف والتوفيق ويؤيد هذا المعنى اي ان مراد النبي صلى الله عليه واله وسلم الائمة الاثنا عشر من اهل بيته ويشهده ويرجحه حديث الثقلين والاحاديث المتكثرة المذكور في هذا الكتاب وغيرها۔

اس لیے مانع تھے۔ جن میں سے عمر ابن عبد العزیز مستثنیٰ ہیں۔ ان سے مراد بنی ہاشم ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ کہ فرمایا آنحضرت صلعم اور سب اُن میں سے بنی ہاشم ہیں۔ مگر عبد الملک نے جابر سے جو روایت کی ہے۔ اُس میں ہے۔ کہ آپ نے اِس موقع پر اپنی صدا کو روک لیا۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ اِس امر کے لیے تمام بنی ہاشم بھی مراد نہیں تھے۔ پھر ملوک عباسیہ بھی اس سے مراد نہیں ہو سکتے۔ اوّل اِس سبب سے کہ اُن کی تعداد بارہ سے زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے آیہ مودت قل لا اسئلکم اجرا الا فی المودۃ القربیٰ اور حدیث کسا کے حقوق کی رعایت نہیں کی۔ پس اب بجز اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ کہ اس حدیث سے آئمہ اثنا عشر مراد لیے جاویں۔ جو آپ کے اہلبیتؑ اور عترت طاہرین سے تھے۔ اور یہی حضرات اپنے اپنے زمانے کے سب سے زیادہ صاحب علم صاحب جلالت اور صاحب تقویٰ تھے۔ اور تمام اہل زمانہ سے باعتبار نسب کے عالی نسب اور باعتبار حسب کے افضل تھے اور سب لوگوں سے زیادہ خدا کے آگے صاحب عزت و اکرام تھے۔ اُن کے علوم اُن کے آبائے طاہرین کے ذریعہ سے بطریقہ متصل اُن کے جد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل تھے۔ اور وراثت اور لدنیہ دونوں طریقہ حصول علم اُن کو حصول تھے۔ انہیں صفات و کمالات سے اہل علم و تحقیق نے اِن حضرات کی معرفت پائی ہے۔ اور اہل کشف و توفیق نے انہیں صفات سے اُن کو پہچانا ہے۔ اور اِس معنی کی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد آئمہ اثنا عشر کی اپنے اہلبیتؑ میں سے تھی۔ تائید۔ تصدیق۔ اور ترجیح حدیث ثقلین اور کثیر التعداد حدیثوں سے جو اِس کتاب اور نیز دوسری کتابوں میں مذکور ہیں پورے طور سے ہوتی ہے۔ (ینابیع المودۃ فی القربیٰ امام سلیمان القندوزی مطبوعہ بمبئی۔ ص ۳۷۳)۔

اب اِس فاضل محقق اور کامل محدث کے مختار سے تو آئمہ اثنا عشر کی امامت و خلافت کی حقیقت پورے طور سے معلوم ہو گئی۔ باوجود کہ حقیقت پر اتنا پردہ ڈالا گیا۔ اصلیت اور واقعیت اتنی چھپائی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی

حقیقی اہلبیت رکھنے والوں کے نام۔ جن کو قرآن و توراۃ نے امام نقیب۔ اور اسباط کے الفاظ و القاب مبارک سے خطاب فرمایا ہے۔ متلاشیانِ حقیقت اور محققانِ معرفت کے لب و زبان پر آہی گئے۔

بہر حال۔ ہم ذبح اسماعیلؑ کے متعلق اپنے مرقومۂ بالا سلسلہ بیان میں فدیناہ بذبح عظیم و ترکناہ علیہ فی الاٰخرین کے حقیقی مقصود اور اصلی مفہوم کو ہر طریقہ اور ہر قرینہ سے ثابت کر چکے۔ اب ہم اپنے موجودہ استدلال میں۔ اِس سے کسی اور زائد اضافہ کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس مبحث کے خاتمہ پر اپنے ذی استعداد اور صاحب سواد معاصر نواب خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس کی وہ تحریر نقل کرتے ہیں۔ جس میں اُنہوں نے ذبح حسینؑ کو ذبح اسماعیلؑ کا تکملہ۔ منشائے قدرت اور انبیا و مرسلین سلام اللہ علیہم اجمعین کی خاص سیرت تبلایا ہے۔ عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ خداوند عالم نے اپنی مکرم مخلوق میں جسکو جیسا رتبہ عالی عطا فرمایا۔ اُسی قدر اُسکو انتظامی تکلیف کا مورد بھی بنایا۔ چنانچہ انبیائے عالیشان اور بانیاں ادیان نے اپنوں یا بیگانوں کے ہاتھوں سے جو جو مصیبتیں اُٹھائیں۔ اُن کا احصار تاریخی دُنیا کے سیر کرنے والے مشکل سے کر سکتے ہیں۔ ابوالبشر حضرت آدم علیٰ نبینا و آلہٖ و علیہ السّلام کی خلقت اور بعثت سے ہدایت اور دینِ الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف سے آدمؑ انسانی نسلوں کے موجب ہو کر ہمارے لیے قانونِ الٰہی لائے۔ دوسری جانب سے ستارہ ابتلا و امتحان طالع ہوا۔ گویا مذہب اور آزمائش دونوں ایک ہی روز جلوہ افروزِ عالم ہوئے۔ ضروری تھا کہ بانیاں دینِ الٰہی اور رہبرانِ ہدایتِ حق معرضِ امتحان و آزمائش میں لائے جائیں۔ کیونکہ سونا اگرچہ آگ میں جلنے سے پہلے بھی سونا ہے۔ مگر آگ میں پڑنے سے وہ ثابت کر دیتا ہے۔ کہ میں آزمائش میں کیا ہوں۔ اور کامل ہوں ؎

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں　۞　تا سیہ روئے شود آنکہ درغش باشد

گو ہمارے ناقص اور کمزور خیالات اِس ابتلا و آزمائش کو غیر ممدوح معنیوں سے تعبیر کریں۔ لیکن روحانی اخلاق کی بنا پر اِس قسم کی آزمائش افضالِ خداوندی اور برکاتِ لامتناہی ثابت ہوتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت نوحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت یوسفؑ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت یونسؑ حضرت یحییٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ حضرت جرجیسؑ وغیرہم صلوات اللہ علیٰ نبینا و آلہ و علیہم اجمعین کو مخالفین کے ہاتھوں جو ناقابلِ برداشت اذیتیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ وہ قطعی طور پر ثابت کر رہی ہیں۔ کہ مردانِ خدا کو خدا کی راہ میں کس کس قسم کے دشمنوں سے مجاہدہ اور مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ خود ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو ہدایتِ اُمت کی بدولت جن جن مصائب کے سامنے ہوئے اُن کی شرح و تفصیل کی حاجت نہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کل انبیاء و مرسلین کے سردار اور جمیع شرائع کے متمم تھے لہٰذا ضرور تھا۔ کہ اُن کا امتحان اور ابتلا بھی اُن کے مرتبہ اعلیٰ کے مطابق ہو چنانچہ وہ اُن کے پیارے فرزند کے ساتھ مخصوص ہوا جس کے ماتم کے لیے تمام عالم عزاخانہ مخلصین و وفادار بن گیا اگرچہ درجہ شہادت فی الاصل ابتلا رسول آخرالزمان صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

کا ایک تنہائی شعبہ تھا۔ لیکن اُس کی قرعہ اندازی حسین ابن علی علیہما السلام روحی فداہما کے نام گرامی پر ہوئی۔ یوں تو جس طرح حضرت نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخالفین کی بدولت تکلیفیں جھیلنی ہوئیں۔ اُسی طرح اُن کے خاندان عظیم الشان کا ہر ایک رُکن رکین شیاطین اُمت کے ہاتھوں مبتلائے مصیبت و آلام رہا۔ لیکن درحقیقت ایک تخصیصی ہما ہتی اور کامل ابتلاء کا مرتبہ خاص آل عبا کی ذات بابرکات پر ختم ہو گیا۔ علامہ اجل شاہ عبد العزیز دہلوی نے اپنی کتاب سر الشہادتین میں واقعہ شہادت کی جو تمہید زیب قلم فرمائی ہے۔ اُسکا خلاصہ مضمون یہ ہے۔

جتنے کمالات جُدا جُدا کل انبیاء میں تھے۔ وہ سب ذات سرور کائنات میں مجتمع ہو گئے۔ فقط ایک کمال شہادت باقی رہ گیا تھا جس کے حاصل ہونے کا سبب یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نفس نفیس شہید ہو جاتے۔ تو شوکت اسلام ٹوٹ جاتی اور عوام کے نزدیک دین میں خلل پڑتا۔ پس حکمت الٰہی نے چاہا۔ کہ یہ عظیم الشان منصب اور کمال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے اہلبیت میں سے ایسے عزیز و قریب تر کے ذریعے پہونچے۔ جو بمنزلہ فرزند حقیقی کے ہوتا۔ کہ اُس کا یہ کمک شہادت جناب رسول خدا کی ذات میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ عنایت ایزدی نے حسنین علیہما السلام کو اُنکے نائب اور قائم مقام بنایا۔ اور دونوں کو دو آئینہ پر تو کمال محمدی اور رخسارے جمال مصطفوی کے ٹھہرا کر ان دونوں صاحبزادوں کے توسط سے یہ کمال بھی ذات آنحضرت صلعم میں داخل کر دیا۔

فی الحقیقت جناب شاہ صاحب کی یہ تحقیق اور یہ ندرت ذکاوت اُن کے اتباع کے لیے سرمایہ فخر و ناز ہو سکتی ہے۔ لیکن اس قدر افسوس ضرور ہے۔ کہ شاہ صاحب نے حسینؑ ابن علی کی قائم مقامی اور نیابت مصطفوی کو فقط اُن کے قتل ہی تک محدود و مخصوص کر دیا۔ بمصداق قول شاعر ؎

از صحن کعبہ تا بسر بام ازان من ⁂ در سقف خانہ تا بہ ثریا ازان تو ۔ مؤلف

(صاحب رسالہ بلاد المبین) کہتا ہے۔ کہ کربلا کا معرکہ شہادت معنوی طور پر۔ وہ عظیم المرتبہ امانت تھی۔ جس کو قدرت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے حضرت اسماعیل کے خاندان میں سپرد کیا تھا۔ اور سنہ ۶۱ ہجری میں عاشورہ کے دن حضرت امام حسین علیہ السلام نے نہایت ہی استقلال اور ثابت قدمی سے ادا کر دیا۔ یہ وہی ودیعت تھی جو خاندان اسماعیل میں چلی آتی تھی۔ اور جس کے ادا کرنے اور بار اُٹھانے کا کوئی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر اس کے سچے امین نے نہایت خوشی سے تسلیم و رضا کے ساتھ ذبح عظیم کی پیشن گوئی پوری کر دی۔ اور بی بی ہاجرہ کی مبارک نسل کا وعدہ بی بی فاطمہ کی اقدس نسل نے کامل طور سے وفا کر دیا۔ یعنی دہم محرم کو حسینؑ ابن علی علیہ السلام نے اُس وعدہ کی تکمیل کر کے اپنے دادا اسماعیلؑ ابن ابراہیم علیہما السلام کو سبکدوش کر دیا۔ بمضمون احادیث متواترہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہادت حسینؑ علیہ السلام کا مکرر پیو بخانا ثابت کر رہا ہے۔ کہ خداوند عالم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ سے مطلع کرنا یونہی بے معنی نہیں تھا۔ بلکہ یہ وہی وعدہ تھا۔ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ علی نبینا وآلہ وعلیہما السلام سے لیا گیا تھا۔ اور گویا یہ ظاہر

کیا گیا تھا۔ کہ جس قربانی کی بنا حضرت اسماعیلؑ سے ہوئی۔ خاندان مصطفویؐ اور دومان مرتضویؑ کے چشم و چراغ جناب امام حسین علیہ السلام کی ذات پر ختم اور کامل ہو گئی۔ دیکھو اگر امام حسینؑ علیہ السلام چاہتے تو فقط یزید ملعون سے بیعت کر کے اپنی اور اپنے اہلبیت کی گلو خلاصی کرا لیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے وہ منحوس سماں اور نامبارک منظر پیش نظر تھا جس میں وہ بے خانماں ہو کر جام شہادت پئیں گے۔ وہ بخوبی جانتے تھے۔ کہ اُن کے بعد اُن کے اہل بیت اور ذریت کے ساتھ ظلم و ستم میں دشمنان دین کوئی کمی نہیں کریں گے۔ بچوں کی آہ و زاری۔ عورتوں کی بے قراری۔ ایسا مقام جہاں بجز ذات باری نہ کوئی مونس و معین۔ نہ ہمدم و ناصر اپنی جماعت قلیل اور اشقیا کی کثرت۔ آفتاب کی تمازت۔ پانی کا مطلق بند ہونا۔ یہ باتیں کیا اس امر کے لیے کافی نہیں تھیں۔ کہ ایک انسان کا دل ہلا کر اُسکو اُمور مخالف طبع کے قبول کرنے پر آمادہ کریں کیا کوئی آدمی اپنی بشری ہستی میں ایسی سختیوں اور بلاؤں کا متحمل ہو کر اپنی وجدانی صداقت اور ایمانی قوت پر قائم رہ سکتا ہے۔ مگر ہاں فاطمہ زہرا کے فرزند حسینؑ نے یہ ساری مصیبت اور صعوبت اپنے سر لے لی۔ اور آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے بچے اور عزیز قتل ہو گئے۔ جس دریا سے چرند و پرند سیراب ہوتے تھے۔ وہ اُس سے محروم رکھے گئے تھے۔ دھوپ کی تکلیف اٹھائی بھوک پیاس کے صدمے اٹھائے۔ خیمہ جلائے گئے۔ خود جسم پر بے شمار زخم کھائے۔ لیکن ودیعت اسماعیلی کے ضامن اور امانت ابراہیمی کے امین نے ؏ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے ؎

دم مارنا کیسا یہ بھی تو زبان سے نہ نکلا۔ کہ خدایا اس بلا سے مجھے نجات دے۔ یا یہ آزمائش مجھ سے ٹال دے۔ مگر باوجود ہزار مصائب کے ذرا بھی بے قرار نہ ہوا۔ اور تمام شب اس بار کے اُٹھا لینے اور امتحان میں پورا اُترنے کی دعاؤں میں مشغول رہا۔ واقعی امام حسین علیہ السلام کیوں بے قرار ہوتے۔ وہ ایسے نہ تھے۔ کہ اپنے دادا کی امانت کو ادا نہ کرتے اور اپنے نانا کی اُمت کی کشتی نجات کو گرداب ضلالت میں ڈوبنے دیتے۔ بلکہ اُنہوں نے اُس جوش کو پورا کر دیا جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس طوفان سے بچا دیا جس میں اُمت محمدیہ غرق ہو چلی تھی۔

(از رسالہ البلاغ المبین)

عرب میں اسماعیلؑ کی تبلیغ رسالت کی ضرورت

ذبح اسماعیلؑ کے عظیم الشان واقعہ کو اُس کی تمام تفصیلی جزئیات اور کلیات کے ساتھ بیان کر کے ہم اپنے قدیم سلسلہ بیان پہ آجاتے ہیں۔ اور جناب اسماعیل علیہ السلام کے بقیہ حالات کو قلم بند کرتے ہیں۔ جناب اسماعیلؑ کے طرز معاشرت اور آپ کے مقدس حالات کے متعلق جہانتک کتب معتبرہ سے تفحص کیا گیا ہے۔ یہ پایا جاتا ہے۔ کہ آپ اپنے تمام کمال و اوصاف میں اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ تھے۔ خلق و مروّت۔ محبت و شفقت۔ اکرام ضعیف۔ لطف و مدارا کے صفات سے خاص طور پر بڑا و معمور تھے۔ اور مشہور نزدیک و دور۔ اور یہ تمام اُمور اسی سے ثابت

ہیں۔ کہ قبیلہ جرہم اور عالقہ یمنی کے تمام قبائل و عشائر۔ جو ایک زمانہ دراز سے خانہ بدوشی اور پریشان حالی میں اِدھر اُدھر زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپ کے اخلاق و اشفاق کے گرویدہ اور زیر احسان ہو کر ہمیشہ کے لیے مکہ میں آ کر اسطرح بس گئے۔ کہ پھر اپنے اصلی موطن و مسکن کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں۔ کہ قبیلہ جرہم کی وجہ سے حضرت اسماعیلؑ کو بھی اپنی ضروریات میں بہت سی آسانیاں اور سہولیت حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ بہت جلد سلسلہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

جناب اسماعیلؑ بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانہ حیات سے تبلیغ رسالت کے درجہ پر فائز تھے۔ مگر حضرت لوطؑ کی طرح تا روز وفات حضرت ابراہیمؑ اپنے پدر بزرگوار کی شریعت کے تبع خاصکر قوم عرب کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جہاں حضرت صالحؑ کے بعد سے سلسلہ ہدایت و ارشاد اور ذریعہ تعلیم و تلقین معرفت الٰہی گویا مسدود و مفقود ہو چکا تھا۔ اور نظام مشیت کو اِن بادیہ نشین قوموں کو بھی اپنی معرفت و ہدایت کے فیوض پہونچانے منظور تھے۔ اور نہایت ضرور۔ اس لیے کہ یہی ذلیل اور حقیر ترین قوم ایک زمانہ میں بہت بڑی کامل المعرفت اور عظیم الشان قوم ہونے والی تھی۔ اور تمام اُمم سابقہ کے مقابلہ میں خیر الامتہ اور اُمت مرحومہ کے خاص خطاب و القاب پانے والی۔

جناب اسماعیلؑ علیہ السلام وہ پہلے مقدس بزرگوار ثابت ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اُمم ثمود کے بعد از سر نو عرب کے نیم وحشی قوموں کی تعلیم و ہدایت کا ذمہ اُٹھایا۔ اور اُن کو دینی۔ قومی۔ اور اخلاقی آداب و تمدن تبلائے۔

اُس وقت عرب کے کیا عقائد تھے

اُسوقت جاہل عرب کی قوموں کے کیا عقائد تھے۔ مشکل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر جو کچھ بھی جستہ جستہ حالات قدیم کتبات علمائے اثریات کی جدید تحقیقات اور اکتشافات یا ایام عرب کے قدیم اشعار سے پائے جاتے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عرب کی آوارہ اور سر بصحرا قومیں کسی خاص عقیدے کی پابند نہیں تھیں۔ جس طرح اُن کے جُدا جُدا قبیلے اور قومیں تھیں اُسی طرح اُنکے مرسومات اور معتقدات بھی جُدا جُدا تھے۔ مدینہ۔ وادی القریٰ اور علاقہ تیما کے قرب و جوار کی بادیہ نشین اور بدویوں کا کوئی خاص مذہب تحقیق نہیں ہوتا۔ صحرائی اور کوہستانی عرب اوہام پرست تھے۔ یمن کی قومیں اکثر ستارہ پرست تھیں۔ اور باقی بت پرست۔ ظہور اسلام تک اوہام پرستیوں کے اثر باقی تھے۔ غزوہ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ کے متعلق محدثین و محققین اسلام نے جہاں اور مختلف

اقوال لکھے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اِس مقام پر رقاع نامی ایک بہت بڑا قدیم درخت نہایت مشہور و معروف تھا۔ جس کو اہل عرب پوجتے تھے۔ اُس سے دعائیں مانگتے تھے۔ اور اُس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ زرقانی جلد دوم ص ۹۵

حضرت اسماعیل علیہ السّلام انہیں نیم وحشی عربوں اور صحرائی قوموں میں۔ خدا کا وجود۔ اُس کی وحدت محض۔ اور اُس کی عبادت کی تعلیم و ہدایت کے لیئے مبعوث ہوئے تھے۔ اور خداوند سبحانہ تعالےٰ نے تبلیغ رسالت کی انجام دہی میں اُن کے مساعی جمیلہ کو کامیاب فرمایا۔ اور اُنکے نبوت میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد عرب کے اُن صحرائی قوم و قبائل کا خدا کے وجود۔ اُس کی وحدت اور قدرت کا قائل ہو کر ایام حج میں اُس کے مقدس گھر کے قریب جمع ہونا۔ خانہ کعبہ کو بیت اللہ اور اپنا معبد سمجھنا اور حضرت اسماعیلؑ کے تبلائے ہوئے اُصول کے مطابق۔ اُس کی عظمت حرمت اور آداب کے اظہار میں۔ مناسکات حج کا ہر سال بجا لانا صاف صاف تبلا رہا ہے۔ کہ تعلیم و ہدایت اسماعیلیؑ کے فیضان نے اُن کے بھرپلے دلوں میں خدا کے وجود۔ عظمت اور معبودیت کے اثر قایم کر دیئے تھے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ رسالت میں۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ علیہم السّلام ایک شریعت ابراہیمی کے متبع۔ مبلغ۔ اور داعی ثابت ہوتے ہیں۔ اور دیگر انبیا و مرسلین کی آنے والی شریعتوں میں اس کی بہت کم مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اسی سے شریعت ابراہیمی کی عظمت اور اُس کے تبلیغی دائرے کی وسعت ثابت ہوتی ہے۔ اور کیونکر نہ ہوتی۔ ارض شام اور بابل سے لیکر مصر اور ممالک عمالیق تک ایک طرف۔ اور پھر عراق عرب سے لے کر حجاز و یمن تک کے تمام قطعات ملک میں اُنکی دعوت کے اعلان بلند تھے۔ ان ملکوں کے تمام قبائل و عشائر آپ کی نبوت کو تسلیم کر چکے تھے۔

حضرت لوطؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ سے پہلے علاقہ حاراں میں شریعت ابراہیمی پھیلا رہے تھے۔ حضرت اسحاقؑ فلسطین اور ممالک مصر سے ملے ہوئے مقامات میں رسالت ابراہیمی کی تبلیغی خدمات انجام کر رہے تھے۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ ملک عرب اور علاقہ یمن میں باپ کی طرف سے تعلیم و ہدایت پر مامور تھے۔

طرز معاشرت یہاں تک تو ہم نے نبوت اور ہدایت اُمت کے متعلق حضرت اسماعیلؑ کے حالات قلم بند کیے کہ اب آپ کے طرز معاشرت اور دیگر حالات کی نسبت جہاں تک تفحص کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ورود مکہ کے وقت سے آپ کی حیات کا ابتدائی حصہ شباب اور

گوسفندرانی میں صرف ہوا ہے۔ اسی کے ضمن میں صید و شکار کے مشاغل بھی داخل ہیں۔ اور یہ خدمت جمیع انبیاء و مرسلین کی مبارک سیرتوں کے متعلق اس کثرت سے پائی جاتی ہے۔ کہ اکثر محققین محدثین اور مورخین اسکو حصول نبوت اور رسالت کا مقدمہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اور عموماً سیرت انبیاء علیہم السلام پر ظاہری نظر ڈالنے سے ان مقدسین عظام کے دائرے میں کوئی فرد واحد اس خدمت اور شغلہ سے خالی معلوم نہیں ہوتا

اکثر محققین نے اس کے متعلق یہ مختار قائم کیا ہے۔ کہ اس خدمت میں ان بزرگواروں کو میدانوں ریگستانوں۔ اور کوہستانوں میں استغراق فی وجود اللہ کی نسبت۔ خلوت اور قدرت الٰہیہ کے علم و حکمت کے مشاہدہ فرمانے کا ہمیشہ اور آسان ذریعہ حاصل ہوا کرتا ہے۔ جو ہر نبی اور رسول کی سیرت کا جزو ضروری ہے۔ اور بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آغاز حالات میں پوری تفصیل سے بیان ہو چکا ہے

جناب اسمٰعیل علیہ السلام کے اس زمانے اور معرفت الٰہی کے مشق و ریاضت کے متعلق ایک قدیم روایت اس زمانہ کے بہت بڑے عابد مرتاض کی زبانی اسلام کی اکثر تاریخوں میں مذکور ہے۔ اس کو ہم حیات القلوب جلد اول کی اصل عبارت سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

روزے حضرت ابراہیم علیہ السلام رفت بیرون در شہر حامی گشت کہ از مخلوقات خدا عبرت گیرد۔ پس بگذشت بہ بیابانے ناگاہ دید شخصے را کہ استادہ است و نماز می گذارد و صدائش باسمان بلند شدہ است و جامہائش از مو است پس ابراہیم نزد او استاد و از نماز او تعجب کرد۔ پس نشست تا او از فارغ بشود چوں بسیار طول انجامید او را بدست خود حرکت داد و گفت کہ بسوئے تو حاجتے دارم سبک کن نماز خویش را پس او سبک کرد۔ نماز را و با ابراہیم نشست پس ابراہیم از او پرسید کہ برائے کہ نماز میکردی گفت برائے خدائے ابراہیم۔ ابراہیم گفت

ایک روز جناب ابراہیم علیہ السلام گھر سے باہر سفر پر تھے۔ اور مختلف شہروں میں مخلوقات خدا کے مشاہدات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے سیر فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک صحرا میں پہونچے۔ ایک شخص کو دیکھا۔ کہ کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ اس کی نماز پڑھنے کی آواز (گویا) آسمان تک جاتی تھی۔ وہ بالوں کے کپڑے جسم پر پہنے ہوئے تھا۔ ابراہیم اسکے پاس کھڑے ہو کر اس کی نماز پر تعجب کرنے لگے۔ اور پھر بیٹھ کر اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر جب زیادہ دیر ہو گئی۔ تو آپ نے ہاتھ بڑھا کر اسکے جسم کو حرکت دی اور ارشاد کیا کہ نماز کو کم کر دو۔ مجھ کو تم سے کچھ حاجت ہے۔ اس نے اپنی نماز کو کم کر دیا

خدائے ابراہیم کیست گفت آنکہ خلق کردہ است ترا و مرا ابراہیم گفت طریق تو مرا خوش آمدہ ومن دوست می دارم کہ با تو برادری کنم از برائے خدا پس بگو منزل تو کجا است کہ ہر گاہ بخواہم ترا ملاقات کنم و زیارت نمایم توانم کرد۔ گفت تو بانجا نمی توانی آمد۔ زیرا کہ درمیان دریائے است کہ ازانجا عبور نمی تواں کرد۔ ابراہیم گفت تو چگونہ میروی گفت من بروئے آب می روم ابراہیم گفت شاید آنکس کہ آب را برائے تو مسخر کردہ است برائے من نیز مسخر گرداند۔ برخیز برویم و امشب با تو دریک اُطاق باشیم پس چوں بآب رسید ندا مرد۔ بسم اللہ گفت و بروئے آب روانہ شد ابراہیم نیز بسم اللہ گفت و بروئے آب رواں شد۔ پس آں مرد تعجب کرد۔ چوں بمنزل رسیدند ابراہیم گفت تعیش تو از کجاست گفت میوۂ این درخت را جمع می کنم و در تمام سال باں معاش می کنم ابراہیم گفت کدام روز عظیم تر است از ہمہ روز ہا عابد گفت روزے کہ خدا جزا دہد خلائق را بر کردہائے ایشان۔ ابراہیمؑ گفت بیا دست بدعا برداریم و دُعا کنیم۔ کہ خدا مارا از شرّ آں روز نگہدار دمایاں را۔ و در روایت دیگر آمدہ کہ ابراہیمؑ گفت کہ دُعا کن تا من آمین گویم یا من دُعا می کنم و تو آمین بگو۔ عابد گفت از برائے چہ دُعا کنم ابراہیم گفت از برائے امرزش

اور ختم کرکے ابراہیم کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابراہیمؑ نے پوچھا۔ کہ تم نے کس کی نماز پڑھی ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ ابراہیم کے خدا کی۔ ابراہیم نے پوچھا۔ ابراہیم کا خدا کون ہے۔ کہا وہی ہے۔ جس نے مجھ کو اور تجھکو پیدا کیا ہے یہ سن کر ابراہیم نے کہا کہ تیرا طریقہ مجھے بہت پسند آیا۔ میری خواہش ہے۔ کہ راہ خدا میں۔ میں تیرے ساتھ اُخوت (بھائی چارہ) اختیار کروں۔ اب بتلاؤ تمہارا گھر کہاں ہے۔ کہ میں جب چاہوں۔ وہاں آکر تم سے ملاقات کروں۔ اُس نے جواب دیا۔ تم وہاں نہیں آسکتے۔ کیونکہ درمیاں میں دریا ہے۔ جسے تم عبور نہیں کر سکتے۔ ابراہیمؑ نے پوچھا۔ تم کیسے جاتے ہو جواب دیا۔ کہ میں تو پانی پر چلتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ جس نے پانی کو تمہارے اختیار میں کو دیا ہے۔ وہی پانی کو میرے اختیار میں بھی کر دے گا۔ یہ کہکر ابراہیمؑ نے کہا۔ کہ اُٹھو۔ اور آج کی رات ہم تم ایک جگہ ساتھ رہیں اِس کے بعد وہ اُٹھ کر چلے۔ جب دریا پر آئے تو اُس مرد عابد نے بسم اللہ کہی۔ اور پانی پر چلا گیا۔ ابراہیمؑ نے بھی بسم اللہ کہی۔ اور اُسی طرح پانی پر چلے گئے۔ اُس مرد عابد نے تعجب کیا۔ جب گھر میں پہونچ گئے۔ تو ابراہیمؑ نے پوچھا۔ کہ تم یہاں کھاتے پیتے کیا ہو۔ اُس نے کہا۔ اِس سامنے والے درخت کے میوے۔ اِس کے میوؤں کو ایک بار جمع کر لیتا ہوں۔ اور اُنھیں کو سال بھر کھایا کرتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ تمام روزوں سے عظیم تر کون روز ہے۔ اس نے جواب دیا۔ کہ وہ دن سب دنوں سے عظیم تر ہے جس دن خدا سب بندوں کو

کہ بان مومنان عابد گفت نہ ابراہیم پرسید چرا عابد گفت ازبرائے اینکہ سہ سال است کہ دعامی کنم وہنوز مستجاب نشدہ است و دیگر شرم می کنم کہ از خدا حاجتے بطلبم تا آں ہم مستجاب نشود ابراہیمؑ گفت خدا ہرگاہ بندہ را دوست میدارد دعایش را حبش میگرداند کہ از او مناجات کند وسوال کند و از او طلب کند وچوں بندہ را دشمن میدارد دعایش را زود مستجاب می کند کہ بعض صدایش بسمع قدرت نآید یا درویش چناں یاس می افگند کہ دعامی کند پس ابراہیم پرسید کہ چہ مطلب است کہ دریں مدت از خدا طلبیدہ عابد گفت روزے در آں جانماز میکردم ناگاہ طفلے در نہایت حسن وجمال گذشت کہ نور از جبینش ساطع بود و کاکلے از قفا انداختہ بود و گاوے چندمی چرانید گویا روغن انہا بر مالیدہ بودند و گوسفند چند نیز ہمراہ داشت در نہایت فربہی و خوش آیندگی مرا از انچہ دیدم بسیار خوش آمد و گفتم اے کودک زیبا از کیست ایں گاوہا و گوسفندہا گفت از من است گفتم تو کیستی گفت من اسماعیلؑ پسر ابراہیمؑ خلیل اللہ ہستم پس دعا کردم و از خدا سوال کردم کہ خلیل خود را بمن نماید پس ابراہیمؑ گفت منم ابراہیمؑ خلیل اللہ و آں پسرم اسماعیلؑ است عابد گفت الحمد للہ رب العالمین کہ دعائے او مستجاب شد پس آں

جزا و سزائے اعمال کے لیئے طلب فرماوے۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ کہ آؤ ہم تم ملکر تمام مومنین گناہگاران کے لیئے اس روز کے عذاب سے محفوظ رکھے جانے کی دعا مانگیں اور ایک روایت میں یوں آیا ہے۔ کہ ابراہیمؑ نے کہا کہ میں دعا کروں۔ اور تم آمین کہو۔ یا تم دعا کرو میں آمین کہوں۔ عابد نے پوچھا کیا دعا کروں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ عاصیاں مومنین کے لیئے۔ عابد نے کہا نہیں۔ میں نہ دعا کرونگا۔ ابراہیم نے کہا کیوں۔ عابد نے کہا اس لیئے۔ کہ تین برس ہوگئے ہیں میں نے خدا سے ایک امر کے لیئے دعا مانگی تھی۔ اور وہ ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے مجھے خدا سے اب دعا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہیں یہ بھی مستجاب نہ فرمائی جاوے۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا۔ کہ خداوند عالم جس بندے کو دوست رکھتا ہے۔ اس کی دعا کو اس لیئے تاخیر اجابت میں رکھتا ہے۔ کہ وہ بار بار دعا کرے۔ اور خدا بار بار اپنے دوست کی صدا کو سنے اور جس کو دشمن رکھتا ہے۔ اس کی دعا کو جلد مستجاب کر دیتا ہے۔ کہ اس کی بد آواز کو پھر نہ سنے۔ یا نہیں تو اس کے دل میں ایسی مایوسی پیدا کر دیتا ہے۔ کہ وہ طلب دعا کرتا ہی نہیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔ تو نے کس مطلب کے لیئے خدا سے دعا مانگی تھی۔ عابد بولا حال یہ ہے کہ ایک دن میں اسی جا اپنی نماز پڑھتا تھا۔ کہ اتنے میں نہایت قبول صورت اور وجیہہ ایک لڑکا نمایاں ہوا۔ جس کی پیشانی سے نور ہویدا و آشکار تھا۔ اور ایک کاکل بھی اسکے پیچھے پڑی تھی۔ اور چند گائیں چراتا تھا۔ فربہی سے گاؤں کا یہ عالم تھا۔ جیسے کہ ان کے بدن پر روغن مل دیا ہے

شخص ہر دو دست در روئے ابراہیم را بوسید دو دست در گردن او در آورد و گفت الحال دعا کن تا آمین بر دعائے تو گویم پس دعا کرد۔ ابراہیمؑ مومنین و مومنات را از آں روز تا بہ قیامت تا آنکہ گناہاں ایشاں را بیامرزد و از ایشاں راضی بشود و عابد آمین گفت بر دعائے ابراہیمؑ نام آں عابد ماریہ ابن ادیس بود و عمرش ششصد و شصت سال بود

اُس کے ساتھ چند بھیڑیاں بھی تھیں۔ اور وہ بھی نہایت خوش اور بحال تھیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ گائیں اور بھیڑیاں کس کی ہیں۔ اُس نے جواب دیا میری ہیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو۔ وہ بولا میں اسماعیلؑ پسر ابراہیمؑ خلیل اللہ ہوں۔ یہ سنکر میں نے اُسوقت خدا کی درگاہ میں دعا کی۔ کہ پروردگار تو اپنے خلیل کی زیارت مجھے کر دے یہ سنتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے ارشاد فرمایا۔ کہ میں ہی خلیل اللہ ابراہیمؑ ہوں۔ اور وہ میرا فرزند اسماعیلؑ تھا۔ یہ سنکر عابد بولا۔ الحمد للہ رب العالمین کہ میری دعا مستجاب ہوئی۔

یہ کہکر وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے دست و جبین کے بوسے لیئے۔ اور پھر اپنے ہاتھ اُن کی گردن میں ڈالکر عرض کی کہ اب آپ دعا فرمائیں۔ میں آمین کہونگا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے تمام مومنین و مومنات کی آمرزش گناہاں کے لیئے اُس وقت سے لے کر قیامت تک کے دن کے لیئے دُعا مانگی۔ اور اُن سے راضی و خوشنود رہنے کی سکت فرمائی۔ وہ عابد آپ کی دعا پر برابر آمین کہتا رہا۔ اُس عابد کا نام ماریہ ابن ادیس تھا۔ اور عمر اُس کی چھ سو ساٹھ (۶۶۰) برس کی تھی۔ (حیات القلوب جلد اوّل ص ۱۱۲)

واقعہ مذکورۂ بالا سے حضرت ابراہیمؑ کی عظمت کے ساتھ جناب اسماعیلؑ کی علو مرتبت۔ ذبیحوں کی گلہ بانی جو بقول شبلی صاحب حقیقت میں جہانبانی کا دیباچہ ہے۔ ثابت ہوگئی۔ اور یہ وہ منصب روحانی ہے۔ جو انبیاء و مرسلین کے طبقہ کرام میں ہر ہر بزرگوار کو عطا فرمایا گیا۔ اس بنا پر یہ امر کامل طور سے متحقق ہوگیا۔ کہ نزول مکہ معظمہ کے وقت سے آپ کا ابتدائی زمانہ پہلے معرفت الہٰی کے اسی مقدمہ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ روایت مذکورۂ بالا میں ماریہ ابن ادیس نے بکمال خصوصیت حضرت ابراہیمؑ سے اس خدمت کا ذکر کیا ہے۔ اور جناب ابراہیمؑ نے بھی اُسکو نہایت رضا و پسندیدگی تسلیم فرمایا۔

اسی شغلت کے بعد صید و شکار کا شغل بھی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے اُوپر نقل ہو چکا کتب قدیمہ کے اخبار و اسفار سے بھی جس کے حوالہ و اعتبار پر مغربی تحقیقات کے زیر اثر آئے ہوئے حضرت اسوقت بضرورت لبیک کہنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے ان مشاغل کا پورا پتا ملتا ہے۔ اور توراۃ کے نسخوں میں متواتر مقامات پر آپکی تیر اندازی اور آپ کا ایک مشہور تیر انداز ہونا مذکور ہے۔ اسلامی محققین کا بھی یہی مختار ہے۔ کیونکہ یہ فنون اور اُن کی مشق شجاعت و دلیری کا شعبہ خاص ہے۔ اور یہ دونوں اوصاف اجرائے

نبوت اور تبلیغ رسالت کے لیے ضروری ہے۔

معاشرت کے متعلق ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قبیلہ بنی جرہم نے آپ کو کافی مدد پہونچائی۔ اور حقیقتاً یہی لوگ آپ کی معاشرت کی درستی اور ترتیب کے باعث ہوئے اور کیونکر نہ ہوتے جناب اسمٰعیل نے ہی تو اونکو قحط آب کی سخت مصیبتوں سے بچایا تھا جس کیلئے وہ تمام دشت و بیاباں میں پریشان و حیران تھے اسی عالم پریشانی میں جناب اسمٰعیل اور ان کی مادر گرامی قدر کا انہو اس قدرتی چشمہ پر تشرف ہونیکی بلا عذر اجازت دیدینا۔ جو خدائے واہب لعطایانے انھیں مخصوص عطا فرمایا تھا پھر وہیں اون کے قیام کرنے اور ہمیشہ رہنے کیلئے بلا تامل راضی ہو جانا۔ وہ احسانات تھے جو بنی جرہم ہمیشہ کے لئے کبھی بھولنے والے نہیں تھے۔ اس بنا پر اُن لوگوں نے اپنے ایسے فیاض اور مہربان حال محسنین کی نصرت و حمایت کو اپنا فرض سمجھ لیا حیات القلوب کی مفصلہ ذیل عبارت سے اس کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

ہاجرہ جرہم را مرخص ساخت کہ نزدیک ایشاں فرود آمدند و خیمہائے خود زدند و ہاجرہ و اسمٰعیل بالیشاں اُنس گرفتند۔ و در مرتبہ سوم کہ ابراہیم بدیدن ایشاں آمد و کثرت مردم و آبادانی در دور ایشاں دید شاد شد پس اسمٰعیل نشو و نما کرد و در قبیلہ جرہم و ہر یک از ایشاں یک گوسفند با اسمٰعیل بخشیدند تا آنکہ گلہ بسیار شد و بآں تعیش میکرد

حضرت ہاجرہ نے بنی جرہم کو اجازت دی وہ قریب آکے آباد ہو گئے اور اپنے خیمے نصب کر دئے اور رہتے رہتے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ اون کو اونس ہو گیا تیسری بار جب حضرت ابراہیم پھر آئے تو آدمیوں کی جمعیت اور آبادی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل نے انہیں لوگوں میں نشو و نما پائی اور اُنہیں میں ہر ایک شخص نے ایک ایک دنبی اسمٰعیل کو دی۔ یہاں تک کہ بڑا گلہ ہو گیا۔ اور وہی باعث معاشرت و ذریعہ معاش ہوا۔ (ص ۱۲۹ ج ۱)

بنی جرہم میں شادی مذکورہ بالا اسناد سے حضرت اسمٰعیل کی درستی اور ترتیب معیشت میں جرہم کا پوری ہمدردی سے حصہ لینا ظاہر ہو گیا۔ آگے چلکر ان کے یہ محبت و اخلاص قرابت کے اختصاص سے تبدیل ہو گئے۔ حضرت اسمٰعیل نے قبیلہ جرہم کے رئیس مضاض ابن عمر الجرہمی کی لڑکی رعلہ نامی سے عقد کر لیا مگر ان کا یہ دوسرا عقد تھا۔ جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ ابن سعد۔ طبقات میں۔ اسلام کے امام الانساب۔ کلبی کے اسناد سے لکھتے ہیں۔

وکانت لاسمعیل امرءۃ من عمالیق ابنۃ صیدی قبل الجرھمیۃ وھی التی کان جاءھا

کلبی لکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی بی بی قوم عمالیق سے تھیں صیدی کی لڑکی۔ اور یہ انکی جرہمیہ بی بی سے پہلے تھیں۔ یہ ہی

ابراھیم فجفتہ فی القول ففارقھا اسمٰعیل ولم تلد لہ شیئًا۔

بی جبکے سامنے ابراہیمؑ آئے تھے۔ اور اس کی شکایت حضرت اسمٰعیلؑ سے کر گئے تھے اسی بنا پر اسمٰعیلؑ نے اُسے طلاق دیدی

اس سے اسمٰعیل کی کوئی اولاد نہیں ہوئی (طبقات ج ۱ ص ۲۵)

صحیح بخاری اور طبقات کی عبارتوں سے حضرت اسمٰعیلؑ کی دو بیبیوں کا ہونا ضرور ثابت ہوتا ہے۔ مگر بخاری سے دونوں بیبیوں کا جرہمیہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اور یہ خلاف مشہور وجمہور ہے۔ طبقات کی عبارت اوپر لکھی جا چکی ہے۔ کلبی کا قول نقل ہو چکا ہے تمام محققین و مورخین اسلام کا قریب قریب یہی مختار ہے۔ توراۃ کی عبارت سے یہی جو سر سید نے خطبات احمدیہ میں نقل فرمائی ہے۔ اور جس کو ہم حضرت ہاجرہ کی ہجرت کے بیان میں لکھ آئے ہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا پہلے ایک مصری لڑکی سے شادی کرنا ثابت ہوتا ہے۔

سید صاحب نے بلا تامل اسی کو صحیح تسلیم کر لیا ہے اور اپنی ذاتی رائے و قیاس کی اصابت پر اعتبار کرکے اسی کو استدلالاً پیش کیا ہے۔ جب آپکے استدلال پر نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے توراۃ کی تقلید کے کوئی اہمیت نہیں پائی جاتی۔ توراۃ کا فارسی ترجمہ جو نقل کیا گیا ہے۔ اسمیں مصری عورت کا لفظ ضرور ہے مگر نقل کے ساتھ سید صاحب کو عقل سے بھی تحقیق کر لینا ضرور تھا۔ کہ وہ مصری عورت اسوقت حجاز میں اور خاص کر مکہ میں آئی کہاں سے؟ کیونکہ کوئی تاریخ۔ اور کوئی سیر اسوقت تک حجاز اور مصر میں آمد و رفت جاری رہنے کا پتہ نہیں بتلاتیں۔ اور کیونکر بتلا سکتی ہیں۔ حجاز تو ذریت ابراہیمی کی تشریف آوری کے وقت ایسا غیر آباد اور ویران بیابان ثابت ہوتا ہے۔ جہاں انسانی آبادی کا ممکن ہونا ہی قریب لمحال ہے۔ اس بنا پر ایک محقق مشکل سے اِس عورت کا مصری ہونا تسلیم کر سکتا ہے۔ اِسلئے کلبی کا وہ قول جو طبقات ابن سعد کے حوالے سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ زیادہ تر اعتبار کے لائق ہے۔ کیونکہ وہ امرۃ من عمالیق قوم عمالیق کی ایک عورت لکھتے ہیں۔ اور یہ تاریخی مشاہدے سے بالکل مطابق ہے کیونکہ تمام تاریخوں کا اسپر اتفاق ہو چکا ہے کہ سب سے پہلے مکہ کی آبادی بنی جرہم سے ہوئی۔ اور اونکے بعد قبیلہ عمالیق کے لوگ یمن سے آکر آباد ہو گئے۔ حضرہ ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی جو اپنے زمانہ میں کی اور جو توراۃ میں بھی مذکور ہے۔ وہ اسی عمالیق یمن کی لڑکی تھی جس کے باپ کا نام کلبی نے صیدی بتلایا ہے۔

اب اس مقام پر سید صاحب کا قیاس بھی صحت تاریخی سے قریب ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ خطبات ص ۱۳۱ میں تحریر کرتے ہیں۔

یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بنی جرہم نے ابتدا میں اپنی قوم کی بیٹی کو حضرت اسماعیل کے نکاح میں دینے سے تامل کیا ہوگا کیونکہ وہ حضرت اسماعیل کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے مگر باہم سکونت پذیر ہونے سے وہ خیال جاتا رہا ہوگا اور

اسی سے یقین ہوتا ہے کہ انکی دوسری بی بی جرہم کی قوم سے تھیں۔"

اب مصری کی جگہ سید صاحب اگر عمالیقی لکھ دیں اور تسلیم کرلیں تو پھر ان کے اور جمیع محققین و محدثین اسلامی کے اقوال و مختار میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ شاید سید صاحب کو اسمیں تامل ہو تو ہم تبلا دیتے ہیں کہ مترجمان توراۃ کو ترجمہ کرتے وقت ضرور سہو ہوا ہے۔ وہ عمالیق سے عمالقہ مصر سمجھے ہیں اور اسی لئے اونہوں نے اس عورت کی قومیت کے اظہار کی جگہ صرف اوس کی سکونت تبلا دی ہے۔ اور قومیت کی حقیقت نہیں بیان کی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ عمالقہ مکہ میں سے ایک عورت تھی۔ اور یہ عمالقہ بھی وہی تھے۔ جو یمن سے آکر جرہم کے بعد مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے اگر اس تحقیق پر بھی اطمینان نہو اور یہ تعریف پیش کی جائے کہ عمالقہ یمن بھی عمالقہ مصری کی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ یہی ثبوت طلب ہے۔ مگر ہم اونکے تبلانے کو تیار ہیں۔ کہ مصر کی تمام قومیں بھی امم سامیہ کی ذریات اور اعقاب و اخلاف ثابت ہوتی ہیں۔ جو اصلاً اور نسلاً خاص الخاص عرب تھے جیساکہ امم سامیہ کے ذکر میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔

فاضل معاصر صاحب ارض القرآن نے اس کی بحث میں جو اپنا مختار قائم کیا ہے ہمکو اُس سے پورا اتفاق ہے۔ اور ذیل میں ہم اسکو نقل کر دیتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل کی بی بی کا جرہمی یا مصری ہونا کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ اس عہد میں بھی عرب مصر کے حکمران قبائل تھے اس بنا پر وہ عورت جرہمی بھی ہو سکتی ہے۔ اور مصری بھی نیز مسلمانوں (بخاری) اور یہودیوں (تالمود) کی روایات میں مذکور ہے۔ کہ اسمٰعیل نے دو بیویاں کیں تھیں ممکن ہے کہ ایک مصری ہو اور ایک جرہمی۔"

ارض القرآن ص ۵۲۔

وفات اسمٰعیل ؑ۔ حضرت اسمٰعیل کے تمام حالات قریب قریب اپنے مندرجہ بالا سلسلہ بیان میں قلمبند ہو چکے آخر میں ہمکو اتنا تبلا دینا بھی ضروری ہے۔ کہ آپ نے اپنی مقدس حیات کا تمام تبلیغ رسالت کی خدمات اور اوس کی انجام دہی میں صرف فرمایا۔ آپ کی تبلیغ و دعوت کا دائرہ علاقہ حجاز سے اوٹھ کر ممالک یمن و حضرموت تک پہونچا ہوا تھا۔ اِس بنا پر ظاہر ہوتا ہے کہ یمن اور اوس کے سرحدی اقوام و قبائل میں بھی شریعت ابراہیمی اور دعوت اسمٰعیلی جاری ہو چکی تھی۔ اور جناب اسمٰعیل جس طرح حجاز اور اس کے حوالی و اطراف کے بسنے والی قوموں کی ہدایت کے واسطے مبعوث ہوئے تھے اسی طرح یمن اور حضرموت کے رہنے والوں کی تعلیم و تلقین پر بھی منجانب اللہ مامور تھے۔

جناب اسمٰعیل نے ایکسو سینتیس (۱۳۷) برس کی عمر میں بمقام مکہ انتقال فرمایا۔ اور اپنی والدہ ماجدہ جناب حاجرہ

کے پہلو میں بمقام حجر مدفون ہوئے - طبقات ابن سعد میں ہے -

توفی اسمٰعیل بعد ابیہ فدفن داخل الحجر مما یلی الکعبہ مع امہ ھاجر - | حضرت اسمٰعیل نے اپنے پدر بزرگوار کے بعد انتقال فرمایا اور اپنی ماں کے پاس مقام حجر میں مدفون ہوئے (طبقات ج ا ص ۲۵)

ام اسمٰعیلؑ حضرت ہاجرہؑ

ہم اپنے سلسلہ بیان میں قبل اس کے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد و اعقاب کا ذکر آغاز کریں جناب ہاجرہؑ کے حالات کا بیان کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ جناب اسمٰعیل کیطرح ان خاتون مطہرہ کی طرف بھی متعصب یہودیوں اور عیسائیوں نے توہین و تحقیر کے غلط واقعات بیان کرکے ساری دُنیا کو گمراہ کررکھا ہے۔

عبری زبان میں حضرت ہاجرہ کا نام ہاغان تھا۔ اور عربی میں آجر بقول اجرؑ بغیرھا امؑ اسمٰعیل طبقات ج ا ص ۲۳ - مگر آگے چلکر بالتدریج - پہلے آجر سے ہاجر ہوا۔ پھر ہاجر سے ہاجرہ ہوگیا - ہاجرہ ہونیکی اصلی وجہ شام سے حجاز میں ہجرت فرمانے کی رعایت خاص ہے۔ اسلامی تاریخیں ہاجرہ کی ابتدائی حالات میں بالکل خاموش ہیں۔ اور کچھ نہیں بتلاتیں۔ اسلئے لامحالہ یہود و نصاریٰ کی کتب قدیمہ سے آپ کے آغاز احوال کا تفحص و تجسس ضروری ہوا۔ مگر اونکی حالت معلوم ہے۔ وہ شروع ہی سے اونکی توہین و تحقیر پر حلف اٹھائے بیٹھے ہیں سنگ آمد سخت آمد۔ لیکن حقیقت کے جویا اصلیت کے متلاشی اور حق کے طالب اپنی نیک نیتی کی کوششوں میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ ہم نے جناب ہاجرہ کے متعلق بہت سے مضامین پڑھے۔ اور قدیم و جدید محققین کی مختلف رائیں دیکھیں۔ مگر ان تمام عقلی اور نقلی مباحث و بیان میں وہ بحث جسکو سرسید مرحوم نے مولوی عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی کی استفادات سے اپنے خطبات کے ص ۲۶۳ میں تحریر فرمائی ہے۔ اور جسکو النصوص الباھرۃ فی حریۃ الھاجرہ عنوان سے مندرج فرمایا ہے سب سے زیادہ مفصل اور مکمل سمجھتے ہیں۔ ذیل میں اُسی کے اقتباسات کو بقدر ضرورت قلمبند کرتے ہیں

حضرت ہاجرہ کے ابتدائی حالات

سفر الشیار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے لکھا ہے کہ شہر بابل دار السلطنت نمرود میں۔ جہاں تارخ یعنی آذر اور ابراہیمؑ اور اون کے تمام خاندان کے لوگ بستے تھے ایک شخص نہایت ہنرمند۔ ذکی الطبع حکیم فطین جو اکثر علوم صنائع و بدائع میں کمال رکھتا تھا۔ رہتا تھا۔ اور اسکا نام رقیون تھا۔ مگر وہ بہت مفلس۔ محتاج اور مفلوک الحال تھا۔ تنگدستی اور سختی سے وطن میں رہنا نامناسب سمجھکر اس نے ملک مصر کی راہ لی جب وہاں پہونچا اور اسکی لیاقت - و

دانشمندی باشندگان مصر پر ظاہر ہوگئی - تو بادشاہ مصر نے اسکو براہ قدردانی اعیان سلطنت میں داخل کر لیا رفتہ رفتہ وہ بالکل کاروبار شاہی پر حاوی ہوگیا - بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا - یہ پہلا شخص ہے - جسکا لقب فرعون ہوا - اسی فرعون کے زمانہ بادشاہی میں بوجہ قحط سالی جناب ابراہیمؑ فلسطین سے مع اہلبیت کے مصر میں تشریف لے گئے - رقیون اور ہاغان دونوں عبری لفظ ہیں اور اس سے استدلال ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں عبرانی یعنی بنی عبر تھے اور کیا عجب ہے کہ اوسی قبیلہ کے ہوں جس قبیلہ کے حضرت ابراہیم ہوں اور ظاہراً اس خیال سے کہ بادشاہ مصر ان کا ہموطن یا ہم قبیلہ ہے اس قحط و مصیبت میں حضرت ابراہیم نے مصر میں جانیکا خیال و قصد کیا ہو - جیسا کہ ہر ایک انسان کو ایسے موقع پر اس قسم کا خیال ہو سکتا ہے غرض جب حضرت ابراہیم مصر میں پہونچے اور انھوں حضرت سارہ کا اپنی بی بی ہونا ظاہر نہ کیا - بلکہ بہن ہونیکا جو رشتہ تھا وہ ظاہر کیا - تو فرعون نے حضرت سارہ سے شادی کرنی چاہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت کچھ دیکر حضرت سارہ کو بقصد شادی کے اپنے گھر لے گیا اس واقعہ سے یہی استدلال ہو سکتا ہے - کہ فرعون بادشاہ مصر کو بہ سبب ہونے ہم قوم کے زیادہ تر حضرت سارہ سے شادی کرنیکی رغبت ہوئی تھی غرضکہ ابھی شادی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف قسم کے صدمات فرعون پر واقع ہوئے - اور اُن کے سبب سے فرعون نے حضرت سارہ کے حال کی زیادہ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم کی بی بی ہیں - اُسی وقت فرعون نے انکو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بھیجدیا اور ہاجرہ اپنی بیٹی کو بھی اون کے سپرد کر دیا -

یہودیوں کے ایک قدیم اور معتبر تاریخ سے - ہاجرہ کا جسکا اصلی نام ہاغان تھا - رقیون نامی بادشاہ مصر کی بیٹی ہونا ثابت ہوگیا - یہیں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے - کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اس گمراہانہ اور مغویانہ نقل و تحریر کی اصلیت جو وہ جناب ہاجرہ کی مجہول النسبی کی نسبت تمام دنیا میں پھیلائے ہوئی ہیں کہاں تک اعتبار کے قابل ہے - ہم ابھی کئی ایسے اُن کے اور اعتراضات آئندہ سلسلہ بیان میں نقل کرتے ہیں - لیکن ان واقعات کے بیان سے - پہلے خطبات احمدیہ کی مندرجہ بالا عبارت کے متعلق ہم چند مشتبہ امور کا فیصلہ کر لینا - مناسب سمجھتے ہیں - جو اسلامی شریعت اور انبیاء و مرسلین کی پاک سیرت کے خلاف ثابت ہوتے ہیں -

ناموس رسول کی توہین - واجب الاحترام رسول پر الزام

مرقومہ بالا عبارت میں دو امور مشتبہ اور تنقیح و تنقید طلب ہیں اول یہ کہ فرعون حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت کچھ دیکر حضرت سارا کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا - دوم یہ کہ ہنوز شادی نہ ہونے پائی تھی - کہ فرعون پر مختلف اقسام کے صدمات واقع ہوئے - اگر یہ اس یہودی مورخ کا قول

اور مختار تو یہ کیا اس سے اور بڑھ کر وہ اتہام حضرت ابراہیم پر لگائے۔ ہمیں نہ کوئی تعجب ہوگا اور نہ شکایت کیونکہ اوسکے علم و عقیدہ میں نبوت کی مقدار اور رسالت کی شان جس انداز پر پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ مخالفین اسلام کی جگہ سر سید کا قول ہے۔ یا مولوی عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی کا مختار۔ تو نہایت شرم اور افسوس کے قابل ہے۔ اور میرے خیال میں مخالفین اسلام کی تقلید و تائید میں بیجا افراط و تفریط اختیار کرنے کا یہی نتیجہ ہے۔ اگر اونکی تقلید و تائید کے خیال کے ساتھ ہی کم سے کم انکو اپنے اخبار و آثار سے مقابل کر لیا گیا ہوتا تاہم حقیقت حال کا بہت کچھ انکشاف ہو گیا ہوتا۔ مگر یا تو اپنے اخبار و آثار سے بالکل لاعلمی یا اونکی طرف سے کمال ناتوجہی کے باعث سے ایسے غلط اور فطرت انسانی اور اصول اخلاقی کے بالکل خلاف واقعات کی نقل و تحریر جرات کی گئی۔ اسلامی تاریخوں میں اس واقعہ کو اگرچہ مختلف طریقوں سے لکھا ہے مگر بالآخر مفہوم و مقصود سب کا ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرعون مصر کی زبردستیوں سے جان و آبرو کے بچنے کی کوئی دوسری صورت نہیں دیکھی تو اپنی ذاتی عظمت اور جناب سارہ کی عظمت کو حافظ حقیقی کی امانت و حفاظت میں دے کر سارہ کو فرعون کے پاس بھیجدیا اور خود نماز میں مشغول ہو کر حفظ ناموس کی دعائیں مانگنے لگے طبقات ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں۔

مرّ ابراهیم وسارة بجبّار من الجبابرة فاخبر الجبار بهما فارسل الی ابراهیم فقال من هذه معك قال اختی فلما خرج من عند الجبّار دخل علی سارة فقال لها ان هذا الجبار سالنی عنك فاخبرته انك اختی وانتِ اختی فی دین الله فان سئلك فاخبرته انك اختی فارسل الیها الجبّار۔

جب ابراہیم اور سارہ کا ایک بادشاہ جبار کے ملک میں گذر ہوا۔ تو اس کو ان لوگوں کے آنیکی خبر لگ گئی اسنے حضرت ابراہیم کو بلا بھیجا۔ اور اُنسے حضرت سارہ کی نسبت پوچھا کہ یہ تمہاری کون ہیں حضرت ابراہیم نے کہا میری بہن ہے۔ جب حضرت ابراہیم بادشاہ کے پاس سے لوٹ کر سارہ کے پاس آئے تو ان سے کہا کہ اس نے مجھ سے تمہاری نسبت پوچھا تو میں نے اس سے کہدیا کہ وہ میری بہن ہیں اور ظاہر ہے کہ دینی اعتبار سے تم میری بہن ہو اگر تم سے اسکے متعلق وہ پوچھے تو تم بھی کہدینا کہ میں انکی بہن ہوں یہ کہکر سارہ کو اسکے پاس بھیجدیا۔

بات اتنی ہی آئیں نہ تھوڑا سا مال لے کر حضرت ابراہیم کے راضی ہو جانیکا حال مرقوم ہے نہ بہت سا مال لیکر اور نہ اس روایت کے کسی ایک لفظ سے بھی حضرت ابراہیمؑ کی اس لین دین کی خبر ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین اسلام کے اخبار و آثار کے نقل کرتے وقت اپنی کتابوں میں ان واقعات

لے کیا اب بھی اس شعار و مختار ابراہیمی سے جواز تقیہ کی قدامت اور صحت ثابت نہیں سمجھی جائے گی (المولف عفی عنہ)

کے ملاحظہ کرنیکی توفیق ہی نہیں ہوئی اور کیونکر ہو سکتی تھی اسلئے کہ تحقیقات جدیدا اور یوروپین محققین کی تائید میں اسلامی محققین و مورخین کی تمام رائیں اور مختار بیکار اور بالکل ساقط الاعتبار ہیں مگر آخر میں اس بدعنوانی اور مطلق العنانی کا نتیجہ کیا ہو وہ یہ کہ ایسے عظیم المرتبت اور جلیل الشان رسول کے آداب و اخلاق پر ناموس فروشی کا بدنما دھبہ لگ گیا۔ اور آپ حضرات کے باغیرت بہت اور حیادار قلم نے آنکھ بند کرکے بلا تامل یہ فقرہ لکھدیا کہ فرعون حضرت ابراہیم کو بہت کچھ دیکر حضرت سارا کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا خطبات مطبع لاہور ص ١٦٤۔

حضرت ابراہیم تو بڑی عظمت اور منزلت کے بزرگ تھے یہ مسئلہ تو ایسا عام اور یہ واقعہ ایسا معمولی کہ ایک دنی طبقہ اور حیثیت کا آدمی۔ ایک منٹ کیلئے بھی اس ننگ و عار کو اختیار نہ کریگا۔ افسوس اپنے مقدس پیغمبر پر ایسا شرمناک اتہام لگانے سے پہلے آپ نے اس داد و ستد کے معاملہ کی حقیقت اپنے اخبار و آثار سے معلوم کرلی ہوتی تو آپکو ثابت ہو جاتا کہ حضرت ابراہیم کی خدمت میں فرعون نے جو کچھ مال و متاع ہدیتاً پیش کیا تھا۔ وہ ظہور قدرت کی اون جلوہ آرائیوں کے بعد تھا۔ جو اوسکے متنبہ کرنے کی غرض خاص سے مشاہدہ کرائی گئیں تھیں اور جو صدمات بقول سید صاحب فرعون پر گذرے تھے۔ وہ اسکی بے ادبی کی سزا تھی۔ اور اس سے مدعائے قدرت امتناع حرکت اور اطلاع معصیت تھا اس ظہور قدرت کے قبل حضرت ابراہیم کیساتھ کوئی داد و ستد معاملات پیش نہیں ہوئے تھے جسکو خود سید صاحب نے اپنی آئندہ عبارت میں اعتراف کیا ہے اور ہم بھی اسکو پوری وضاحت سے آئندہ بیان کرینگے۔

عقل سلیم رکھکر کوئی کیسے اس بیان کو صحیح مان سکتا ہے۔ کہ (نعوذ باللہ) فرعون مصر نے حضرت ابراہیم کو کچھ یا بہت کچھ دیکر حضرت سارہ سے اپنا عقد کرلینے پر راضی کرلیا۔ یا حضرت ابراہیم فرعون مصر سے تھوڑا یا بہت سامال لیکر اپنی بی بی سارہ کا عقد اوس سے کردئے جانے پر رضامند ہو گئے (استغفر اللہ) کیا اسلام نے رسالت کے اخلاق انبیاء و مرسلین کی معاشرت اور اونکی حیا و غیرت کے یہی طریقہ اور رویہ قائم کئے ہیں پھر نعوذ باللہ من ذالک جب یہ لغویات اور حشویات ان ذوات مقدسین و مطہرین کی عادات کے بالکل مخالف پائے۔ جاتے ہیں۔ تو افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے یہ الفاظ کیسے نکلے یا کم سے کم انکی نقل کرتے وقت وہ مخالف کے ایسے صریح اتہام کی تردید و تنقید سے کیوں رکا اور خاموش رہ گیا۔

اب اسکی حقیقت حال اسلامی مرویات میں ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد میں تحریر ہے۔

فرجعت الی ابراھیم صلعم و ھو یصلی و یدعو اللہ فقالت ابشر فقد کف اللہ ید الکافر الفاجر و اخد

جب سارا دشاہ مصر کے دربار سے لوٹ کر حضرت ابراہیم کے پاس آئیں تو یہ نماز پڑھ رہے تھے اور خدا سے حفظ ناموس کی دعا

منی ھاجر ۔ مانگ رہے تھے ۔ سارا نے فرمایا ابراہیم تمکو بشارت ہو کہ خدا نے اُس
کافر فاجر کے ہاتھ سے میری کفایت کی اور میری خدمت کے لئے ہاجرہ کو دیا ۔

اب اس عبارت کو پڑھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے ۔ کہ حضرت ابراہیم ۔ اگر اس وقوعہ قدرت سے پہلے سارا کے معاملات میں بہت سلسال لیکر (نقل کفر کفر نباشد) فرعون سے اُنکا عقد کر دئے جانے پر راضی ہو گئے تھے ۔ تو پھر آپ کو اضطرار و اضطراب کی جگہ پورا اطمینان ہونا چاہتا تھا ۔ نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے کی ضرورت کیا تھی ۔ رضا کا سودا تھا زبردستی تو تھی نہیں حضرت ابراہیم کا نماز پڑھنا اور دعا مانگنا بتلا رہا ہے ۔ کہ آپ کو اپنے حفظ ناموس کا خیال کیسا دل سے لگا تھا کہ حفظ حرمت کی جب کوئی صورت نہیں دیکھی تو فطرت انسانی کا جیسا ہمیشہ دستور ہوتا ہے ۔ آپنے بھی اُس بادشاہ جابر کی زبردستیوں کے مقابلہ میں اس حافظ حقیقی کی بارگاہ میں اپنے استحفاظ ناموس کی استدعا پیش کی اور اوسکی حمایت و کفایت کے مستدعی ہوئے

اسی طرح جناب سارا کا صحیح وسلامت اور باعصمت وعفت اُس ظالم کے دربار سے واپس آکر حضرت ابراہیم کو اس امر کی خاص بشارت پہونچانا کہ خدا نے اُن کو اُس کافر کے ظلم سے بچا لیا ۔ ثابت کر رہا ہے کہ یہ معاملات (نعوذ باللہ) جانبین کی رضامندی پر مبنی نہیں تھے ۔ بلکہ بخلاف اس کے غایت مجبوری اور نہایت معذوری اور بے انتہا بے کسی و بے بسی کی ایسی حالتوں میں جب آبرو و جان کے حفظان و امان کی نہ کوئی اُمید باقی تھی نہ کوئی عنوان تب حضرت ابراہیم نے خدا کی حمایت پر قناعت و توکل فرما کر حضرت سارہ کو بادشاہ مصر کے پاس بھیجدیا تھا ۔ لیکن باوجود اسکے کہ خدا کی تائید اور اسکی حمایت و حفظان پر پورا یقین و اطمینان تھا ۔ مگر تاہم دلی انتشار اور قلبی اضطراب کا یہ عالم تھا ۔ کہ آپ اپنی حیا و غیرت کے غیر متحمل جذبات کو نہ سنبھال سکے ۔ بالآخر نماز پڑھ کر حفظ حرمت کی دعائیں مانگنے لگے ۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں لکھ آئے ہیں پھر ایسا مقدس معصوم ۔ جو اسوقت ایک مظلوم کی سچی شان میں ایسے صریح ظلم و جور کا استغاثہ خدا کی درگاہ میں پیش کرے اور اس عادل حقیقی کی عدالت سے کچھ شنوائی نہو ۔ کیا معنی اس مظلوم کے استغاثہ پر استجابت کا فوری حکم ہوا اور پھر جبروت قدرت کو عملی طور پر جو مظاہر و مآثر کہلانے تھے ۔ وہ دکھلائے اور وہ اتنی مدت مدید گذر جانے کے بعد بھی آجتک دُنیا کے تمام کارناموں میں مذکور و محفوظ ہیں ۔ جل جلالہٗ و جل شانہٗ

حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب معجزات کے قائل نہیں معجزے کا جہاں نام آگیا ۔ آپکی روح تھرا گئی ۔ وہ انبیاء و مرسلین کے معجزات یا خوارق عادات کو خلاف معمول تصرفات سمجھکر محالات میں شمار کرتے ہیں حالانکہ ایک دیندار مسلمان ۔ اور قائل قرآن کبھی انبیاء و مرسلین سے صدور معجزات کا انکار کر ہی نہیں سکتا ۔ وہ معجزات اور عام تصرفات کے حدود و فاصل کو خوب پہچانتا ہے اور محالات اصلی یا مادی ۔ اور غیر ممکنات عادی اور بیّنی کی فرق و اقسام کو خوب جانتا ہے ۔ چونکہ ہمکو خاص معجزے کے متعلق بحث کرنا منظور نہیں ہے اس لئے اُس

سید صاحب اِن آثارِ قدرت کو مختلف قسم کے صدمات لکھ کر مخفی کرتے ہیں۔ آپ کی اِس ترکیب سے خدا کی تمام قدرتوں کے قائل۔ رسول کی عظمت اُسکے تقدس اور اُس کے مجیب الدعوت ہونے پر ایمان رکھنے والوں کی تشفی اور اطمینان کیا ہوگا۔ ہزارہا اقسام و انواع کے شکوک۔ اشتباہ اور اوہام دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس لیئے ضرور ہے۔ کہ ہم اسلام کی معتبر اور مستند اسناد سے ان صدمات کی تغیر و تفصیل قلم بند کر دیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جس یہودی تاریخ سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے۔ اُسکی عبارت میں کہیں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ مگر قرائن تبلا رہے ہیں۔ کہ اصلی عبارت میں ان معجزات الہٰیہ اور کرامات قدسیہ کا ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ اِس لیئے کہ ص ۱۶۶ میں توریت مقدس کے عربی ترجمہ میں یہ عبارت لکھی گئی کہ لما رای الایات التی اخرجت بسارہ خود اسکا ترجمہ کرتے ہیں۔ "(فرعون نے) جب دیکھا کرامات جو بوجہ سارا واقع ہوئی" اب نہیں معلوم کہ سید صاحب کا قلم اعتقاد اُسوقت کہاں تھا۔ جو کرامات کا لفظ بھی اِس تصریح کے ساتھ کہ بوجہ حضرت سارا واقع ہوا بے دیکھے بھالے اور بے سمجھے بوجھے لکھ گیا۔ یہی معجزہ ہے اور یہی کرامت۔ اب تو اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی اِن آیات و کرامات کا ذکر توراۃ کی عبارات میں ضرور داخل تھا۔ مگر آپ حضرات نے اپنی خاص مجبوری کی وجہ سے نہیں لکھا۔

بہرحال۔ جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہماری کتابوں میں اِن معجزات الہٰیہ کا پوری تفصیل سے ذکر موجود ہے تو ہم مخالفین کے ماخذوں سے اسکے لیئے خوشہ چینی کیوں کریں۔ اِس کی مفصل کیفیت طبقات ابن سعد کی عبارت سے حسب ذیل ہے۔

فلما ارسل الیها الجبار و دخلت علیه دعت الله یکفه عنها قال ایوب فضبث بیده و اخذ اخذة شدیدة فعاهدها لئن خلی عنه لا یقربها فدعت الله فخلی عنه ثم هم بها الثانیة فاخذ اخذة هی اشد من الاولی فعاهدها ایضا لئن خلی عنه لا یقربها فدعت الله فخلی عنه ثم هم بها الثالثه فاخذ اخذة هی اشد من الاولیین فعاهدها لئن خلی عنه لا یقربها فدعت الله تعالیٰ فخلی عنه فقال الذی ادخلها اخرجها عنی

سارہ کو جب اُس بادشاہ جابر نے بلا بھیجا۔ اور جب یہ اُسکے پاس پہونچیں تو آپ نے خدائے سبحانہٗ تعالےٰ سے اپنی حفاظت و حمایت کی دعا مانگی۔ ایُوبؔ راوی حدیث کا بیان ہے۔ کہ اُس بادشاہ جابر نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو پکڑنا چاہا۔ تو قدرت خدا سے اُسکا ہاتھ شل ہو گیا۔ یہ دیکھکر اُس نے سارا سے عہد کیا۔ کہ اگر اُسکا ہاتھ کھُل جائے گا۔ تو وہ پھر آپ کے ساتھ ایسی حرکت نہ کریگا۔ سارا نے دعا کی ہاتھ کھُل گیا۔ پھر اُسنے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ ہاتھ شل ہو گیا۔ پھر اُس نے ویسے ہی آپ کے ساتھ اقرار کیا۔ کہ اگر اُس کا ہاتھ کھُل جائے گا۔ تو وہ آپ کے ساتھ ایسی

فانك ادخلت علی شیطانا ولم یدخل علی انسانا واخدمها هاجر طبقات ابن سعد مجلد الاولی صفحہ ۲۳

حرکت نہ کرے گا۔ حضرت سارآ نے پھر دعا فرمائی ہاتھ کھل گیا۔ اب پھر تیسری بار پھر اُس نے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر تیسری بار اُسکا ہاتھ سابق دفعات سے کہیں زیادہ شل اور بے کار ہو گیا۔ تو پھر اُس نے آپ سے اقرار کیا کہ اگر اُسکا ہاتھ کھل جائے گا۔ تو پھر وہ ایسی حرکت اور قصد نہ کرے گا۔ حضرت سارآ نے پھر دُعا کی اُس کا ہاتھ کھل گیا۔ تو اُس نے اُس شخص سے جو آپکو لے آیا تھا۔ بلا کر کہا کہ اِن کو ہمارے پاس سے لے جاؤ۔ کہ تو نے مجھ پر تو شیطان کو داخل کر دیا ہے۔ نہ انسان کو۔ پھر سارہؑ کی خدمت کے لیے ہاجرہؑ کو ساتھ کر دیا۔

یہی وہ قدرت کے آیات اور جبروت مشیت کے تصرفات میں جنہوں نے اپنے اظہار و اختیار سے خدا کے جلیل القدر پیغمبر کے دامن ناموس پر دھبہ نہ آنے دیا۔ اور اُن کی حرمت کو بال بال بچا لیا۔ حقیقتاً یہ ایسے نازک موقع ہیں۔ جو انسان کو اُس کی بے انتہا درجہ کی بے کسی اور بے بسی کے خاص عالم میں پیش آجاتے ہیں اور جن سے وہ بغیر خدا کی تائید و توفیق کے کسی طرح بچ نہیں سکتا

آیات الٰہی تو ملاحظہ فرمائے گئے۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاق اہلبیت۔ جو اصلاً اور حقیقتاً اخلاق الٰہیہ کے خاص پرتو ثابت ہوتے ہیں۔ ضرور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ انبیاء و اہلبیت نبوت علیہم السّلام کے ساتھ یہ اخلاق کریمانہ مخصوص کئے گئے ہیں۔ کہ وہ ذوات مقدسہ باوجود متواتر ظلم و جور کے اظہار و وقوع کے بھی۔ ظالم کی دُعا اور قاتل کی بہی خواہی اور طلب آمرزش سے باز نہیں آتے۔ جس کی ابتدا آل ابراہیمؑ سے ہوتی ہے۔ اور انتہا آلِ محمدؐ پر ثابت ہوتی ہے۔ اللھم صل وسلم علی محمد و آل محمد کما صلیت وبارکت علی ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انك انت حمیدٌ مجید (خدایا درود بھیج محمدؐ و آلِ محمدؐ پر۔ جیسا کہ تو نے درود اور برکت بھیجی۔ ابراہیم اور آلِ ابراہیمؑ۔ کیونکہ تو ہی قابل ستائش ہے اور بزرگ و برتر)

مرقومہ بالا دونوں شبہات کو پورے طور سے رفع کر کے ہم اپنے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہیں۔

حضرت ہاجرہ پر کنیزی کا غلط الزام

سفر الپیدایش کی عبارت۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؑ کی سرگذشت جو اوپر لکھی گئی ہے۔ اُس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ حقیقتاً جناب ہاجرہؑ۔ رقیون نامی بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں۔ بادشاہ مصر حضرت سارہ کی وجہ سے اِن اسرارِ الٰہیہ اور اعجاز قدسیہ کو ایک بار نہیں۔ کئی بار مشاہدہ کر کے اپنے دل میں اِن کی عظمت و جلالت کی طرف سے ایسا مرعوب اور متاثر ہوا۔ کہ اُس نے اپنی لڑکی کو اِن کی خدمت

کے لیئے دے دیا۔
اِسی خدمت کے لفظ نے قیامت ڈھا دی۔ سلسلۂ اسماعیلؑ کے مخالفین کو۔ جناب ہاجرہؑ کے مجہول النسب مشہور کرنے پر تنہا تیار نہیں کر دیا۔ بلکہ اُن مقدسہ کو عام خادمہ اور معمولی لونڈی قرار دینے پر تلی اور مطلق العنان بنا دیا۔ مخالفین کو اپنے تعصب اور نفسانیت سے سلسلہ ابراہیمی میں جتنی حضرت اسحاقؑ کی مدح سرائی مقصود تھی۔ اُتنی ہی حضرت اسماعیلؑ کی تحقیر۔ ذلت اور رسوائی۔ جیسا کہ ابھی ابھی واقعہ ذبح میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی باہمی مماثلت اور مساوات کی بحث میں اِن کے متعصبانہ اقوال و مختار لکھے گئے ہیں۔
اِس بنا پر پہلے یہودیوں نے پھر عیسائیوں نے حضرت ہاجرہؑ پر کنیز اور حضرت اسمٰعیلؑ کو کنیز زادہ مشہور کر دیا۔ حالانکہ یہودیوں ہی کے اقرار و اظہار سے رقیونؔ کا عبری سلسلہ سے ہونا۔ اور ہاجرہ کا اُس کی لڑکی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر تاہم وہ اپنی بے ادبانہ تحریر اور گستاخانہ تحریک سے باز نہیں آتی اور اپنے کذب و افتراء سے توبہ نہیں کرتے۔ ہم کو اعتراف ہے۔ کہ اسلامی کتابوں میں بھی جناب ہاجرہ کی نسبت خدمت کا لفظ آیا ہے۔ اور اُسی روایت میں جسکو ہم نے طبقات ابن سعد سے نقل کیا ہے ولخذمنی ھاجر کا فقرہ موجود ہے۔ اس فقرے کا مفہوم۔ جب استفہام استعجابیہ کے معنوں میں لیا جاوے گا۔ تو ظاہر ہو جائے گا۔ کہ حضرت سارہ کس بشاشت سے کمال استعجاب کی حالت میں حضرت ابراہیمؑ کو خبر دیتی ہیں۔ کہ ہاجرہ (کی ایسی عالی مرتبہ اپنی بیٹی) میری خدمت کے لیئے دی۔
خدمت کے لیئے دیا جانا یا خدمت کرنا۔ یا محض خادمہ ہونا نہ اُسوقت عیب کی بات تھی۔ اور نہ اُسوقت ہے۔ اِس لیئے اسلام کی معتبر کتابوں میں خادمہ کا لفظ پایا جانا نہ اُن کی کنیز ہونے پر دلیل ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ اہل اسلام بھی اُن کی عام کنیز اور معمولی لونڈی ہونے کے ویسے ہی قائل ہیں۔ جیسے یہود۔ اور عیسائی۔ اسلامی کتابوں میں جہاں جہاں آپ کی نسبت خدمت یا خادمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اُن سے صرف خدمت میں رہنا آداب و ترتیب حاصل کرنا مراد ہے۔ اور صرف اِتباع مقصود ہے۔ مشرقی تہذیب و معاشرت اُسوقت سے لے کر اس وقت تک اسی اُصول پر قائم ہے۔ کہ گھر کا بڑا بوڑھا مرد۔ گھر کے اور مردوں کے لیئے واجب الاتباع ہوتا ہے۔ وہ مخدوم ہوتا ہے۔ اور سب اُس کے زیر فرمان اور محکوم۔ اسی طرح گھر میں بڑی بوڑھی عورت واجب الاتباع ہوتی ہے۔ اور سب بہو بیٹیاں اُسکے زیر حکم رہتی ہیں۔ صحیح بخاری میں خود آنحضرت صلعم سے مروی ہے ولخذمھا ھاجرہ اِس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے ہاجرہ سارا کی

مطیع تھیں۔ اور خدمت گذار۔

اگر رقیون نے جیسا کہ یہودی اور عیسائی قائل ہیں۔ اپنی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی ہاجرہ نامی کو سارہؑ کی خدمت اور انکا کام کاج کرنے کے لیئے ساتھ کر دیا تھا۔ تو پھر ہاجرہؑ کے ساتھ اِتنا مال جال۔ لاؤ لشکر اور سواریاں دے دے کر اُسکو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی کیا ضرورت تھی تمہاری ہی معتبر تاریخ سفر ایشیار میں اس قصہ کے سلسلہ میں تحریر ہے۔

جب وہ سب جب حضرت ابراہیم مع ہاجرہ فرعون کی بیٹی کے وہاں سے چلے۔ تو فرعون نے اُن کے ساتھ پیادے مامور کر دیئے۔ کہ بحفاظت تمام پہونچادیں۔ چنانچہ یہ لوگ مع احمال و اثقال اور لونڈی غلام وغیرہ کے جو بادشاہ مصر نے اُنکو دیئے تھے۔ اپنے ملک میں جہاں اُنہوں نے سکونت اختیار کی تھی۔ بخیر و خوبی پہونچ گئے۔

اب مخالفین اسلام سے سوال ہے۔ کہ تمہاری تحریر اور اقوال سے جب یہ سامان ظاہر ہوتے ہیں۔ تو تمہیں بتلا دو۔ کہ یہ گھر کی لونڈی دینے کی شان ہوتی ہے۔ یا گھر کی لڑکی دینے کے سامان اِس سوال کے جواب میں تم کو کہنا پڑے گا۔ کہ یہ تو گھر سے لڑکی کے رخصت کئے جانے کے سامان ہیں۔ پھر دیکھو تو تمہارا یا کسی اور کا اِس عالی مرتبت خاتون کو معمولی لونڈی سمجھنا۔ ترک ادب نہیں معصیت نہیں۔ تو اور کیا ہے ان تمام مشاہد و قرائن کو پیش نظر رکھکر اِس مسئلہ کے متعلق سر سید نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ ضرور ماننے کے قابل ہے۔ ہم ذیل میں اُسکو نقل کیئے دیتے ہیں۔

فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ کو سارہؑ کے ساتھ کر دیا۔ ظاہرا اسکے کئی سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ابراہیمؑ اور سارہؑ کی نیکی اور بزرگی اور انکا اور فرعون و ہاجرہ کا ہمقوم ہونا۔ اس باعث سے بڑی رغبت ہوئی ہوگی۔ کہ فرعون اپنی بیٹی کو اُن کی تعلیم اور تربیت اور صحبت میں سپرد کرے۔ کیونکہ مصری اُس کی قوم اور اُسکے قبیلے سے نہیں تھے۔ علاوہ اس کے اُس زمانہ میں اور اُس خاندان میں ہم کفو ہونے کا بہت خیال تھا مصر میں۔ رقیون۔ فرعون مصر کے خاندان کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اور یہ بہت بڑی رغبت اس بات کی تھی۔ کہ ہاجرہ سارہؑ کے سپرد کر دیجائے۔ تاکہ اُن کی تربیت میں رہے۔ اور کہیں کفو میں اُس کی شادی کر دیجائے۔ رخصت کے وقت فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ کو سمجھایا۔ کہ تیرا رہنا اُن کے ساتھ تیرے لیئے۔ میرے پاس رہنے سے بہتر ہے۔ اِس سمجھانے سے بھی ظاہر ہے۔ کہ کس خیال سے فرعون نے اپنی بیٹی اُن کے سپرد کی تھی

خطبات احمدیہ ص ۱۶۵

ہم سید صاحب کی مرقومہ بالا عبارت میں اتنا اضافہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ و سارہؑ کے ساتھ۔ خیال ہم وطنی اور ہم قومی کے علاوہ۔ فرعون کو ان بزرگواروں کی روحانی عظمت و اقتدار کا بھی تو براہ العین مشاہدہ ہو چکا تھا۔ اس لیئے ایسے باخدا اور نیکوکار ہم قوم و قبیلہ حضرات کی ہمراہی میں اپنی

لڑکی کو تعلیم و تربیت پانے آداب معاشرت سیکھنے اور اُن کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھانے کی غرض خاص سے دیدیا۔ اسی سفر الیشیا میں یہی یہودی مورخ۔ تھوڑی دور آگے چلکر اپنے سلسلہ بیان میں لکھتا ہے جس کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

هی کانت بنت فرعون لما رأی الآیات التی اخرجت بسارة قال ما اطیب ان یکون بنتی خادمة فی بیت ذا اولی ان یکون سیدة فی بیت اخر (عربی ترجمہ سفر الیشام)	(ہاجرہ) یہ فرعون کی بیٹی تھیں۔ فرعون نے جب وہ کرامات دیکھی۔ جو سارا کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ تو فرعون نے کہا کہ میری بیٹی کا اس گھر میں (ابراہیم کے گھر میں) خادمہ بنکر رہنا۔ اس سے بہتر ہے۔ کہ وہ اور گھر میں مالکہ اور سیدہ بنکر رہے۔"

اب متعصبین یہود و نصاریٰ کی جہالت و تعصب نفسانیت کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ کہ وہ صریح طور پر حضرت ہاجرہ کو فرعون مصر کی بیٹی ہونے کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اور پھر اقرار کے بعد انکار بھی۔ سرسید مرحوم خطبات میں لکھتے ہیں۔

۱۸۵۰ء میں بمقام کلکتہ اسی بات کا مباحثہ ہوا تھا۔ اور اکثر یہودیوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی نہیں تھیں۔ بلکہ بادشاہ مصر کی لڑکی تھیں۔

سرسید اس چشم دید مناظرہ کی حقیقت دیکھکر ایک معقول طریقہ سے یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ خاص توراۃ کے الفاظ سے بھی ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اُن کی عبارت یہ ہے۔

لفظ امۃ کی زبان عبری سے تحقیق و تنقید توریت مقدس سے بھی ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں۔ نہایت صاف اور روشن بات یہ ہے کہ اُسوقت کے حالات پر جب ہم غور کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جو خریدی سے یعنی بیع لے جاتے تھے۔ دوسرے وہ جو غنیمت سے حاصل ہوتے تھے۔ یعنی وہ لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے۔ پہلی قسم کی لونڈی غلام کو (جو خریدے جاتے تھے) ضَیف کہتے تھے۔ اور دوسری قسم کے لونڈی غلام جو لڑائیوں میں اسیر ہو کر آتے تھے۔ وہ شیبوت حرب یعنی غنیمت جنگ کہلاتے تھے۔ اُن کی اولاد بھی لونڈی غلام کہلاتی تھی۔ اور یلید بایت یعنی ولید البیت خانہ زاد۔ مگر حضرت ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں۔ پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں۔ اُن کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔ خطبات ص ۱۶۷

مندرجہ بالا عبارت میں اتنا اضافہ ضرور ہے۔ کہ اگر یہودی اور عیسائی حضرت ہاجرہ کی لونڈی بتلانے میں سچے ہیں۔ تو اُن کا فرض ہے۔ کہ پہلے وہ ہاجرہ کو مندرجہ بالا دونوں اقسام میں سے کسی ایک قسم

کی کنیز ہونا ثابت کرلیں۔ توراۃ اور اُس کے بعد کی تمام کتابوں میں سے کسی ایک کتاب سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ فرعون مصر نے جناب ہاجرۃ کی خریداری کی تھی۔ یا بطور غنیمت و بذریعہ جنگ لائی گئیں تھیں۔ جب ایسا نہیں ہے۔ تو ان لوگوں کا ایسا بیان سراپا افترا ہے۔ اور سراسر بہتان

اب اس بحث کے متعلق یہ امر تنقیح طلب ہے۔ کہ پھر یہودی اور اُن کی تقلید میں عیسائی حضرت ہاجرۃ کو کیوں لونڈی کہتے ہیں؟ اوّل تو اس کا سب سے بڑا اور قوی سبب یہی ہے۔ جیسا کہ آغاز بیان میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ یہودی حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں سوائے حضرت اسحاقؑ کے حضرت اسماعیلؑ کی تعظیم و حرمت نہیں کرتے۔ اُن کی تعظیم و حرمت نہ کرنے ہی تک اکتفا کی جاتی۔ تو ہم کو کسی شکایت کی مجبوری نہیں تھی۔ مگر حسد و نفسانیت کی بنا پر حضرت اسمٰعیلؑ کی تحقیر و ذلت شروع کر دی گئی اور پھر اس کد و ضد کے ساتھ کہ خود تو خود دوسروں کو بھی اپنے اس افترا اور اغوا میں شریک اور رفیق بنا لیا گیا۔ عیسائی باوجود اس کے۔ کہ عقائد میں یہودیوں سے بالکل مخالف ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اِس مسئلہ میں اُن کے ہم زبان ہیں۔ اور ہمداستان۔ ایک سبب قوی تو یہ ہے۔ جو سرتاپا اُن کی نفسانیت اور تعصب پر مبنی ہے۔

دوسرا سبب عبارت توریت کے خواہ مخواہ غلط معنی سمجھنے اور سمجھانے سے پیدا ہو گیا ہے۔ متعصبین یہودے الفاظ الہامی کے غلط معنی لگا کر مغویانہ خیالات پہلے خود پیدا کئے۔ اور پھر اور لوگوں میں یہ گمراہ عقائد پھیلائے۔ عبارت توریت کی سند و شہادت پر غلط استدلال قائم کیا گیا ہے۔ وہ بالکل ترجمہ توراۃ میں تحریف ہے۔ جسکو ہم سرسیّد کی اصلی عبارت سے ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

حضرت سارا ادھیڑ ہو گئی تھیں۔ اور اُنکے اولاد نہ ہوتی تھی۔ اِس لیے اُنہوں نے حضرت ہاجرۃ کو زوجہ بنانے کی (حضرت ابراہیمؑ کو) اجازت دیدی۔ کہ شاید اُنھیں سے کوئی اولاد پیدا ہو۔ چنانچہ ہاجرۃ سے اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارا بھی حاملہ ہوئیں۔ اور حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاقؑ کئی برس کے ہو گئے۔ اُنکا دودھ بھی چھٹ گیا۔ حضرت اسماعیلؑ اُن سے عمر میں بڑے تھے۔ دونوں میں ایک دن کچھ تکرار ہو گئی۔ جیسا کہ دو بچوں میں ہوا کرتی ہے۔ حضرت سارا کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ اور اُس لڑائی جھگڑے میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔ کہ اِس لونڈی اور اُسکے لڑکے کو نکال دو۔

اِس مقام پر حضرت سارۃ نے حضرت ہاجرۃ کو لونڈی کہا۔ تو اس سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ حقیقت میں لونڈی تھیں۔ بلکہ جسطرح عورتیں لڑائی اور غصہ میں خصوصاً جب اُن دونوں عورتوں بلکہ سوکنوں (سوتوں) میں بچہ پر تکرار ہوتی ہے۔ تو ایک دوسرے کو بہتک اور حقارت کے کلمات کہہ اُٹھتی ہیں۔ اسی طرح جب سارۃ نے یہ لفظ اُمتہ یعنی لونڈی کا حضرت ہاجرۃ کی نسبت کہا۔ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ درحقیقت لونڈی تھیں۔ مگر یہودیوں کو اور جو لوگ یہودیوں کی پیروی کرتے ہیں۔ (یعنی عیسائیوں کو) اُن کو ایک

موقع ہاجرہؑ کو لونڈی کہنے کا مل گیا۔ حضرت سارہؑ کی اس بات سے حضرت ابراہیمؑ بہت ناراض ہوئے۔ مگر خدا نے اُن کی تسلی کی اور کہا۔ کہ اس لونڈی اور بچے کی طرف سے رنج مت کرو۔ اُنکو نکالدو۔ میں اس لونڈی کے بچے سے ایک قوم پیدا کرونگا۔ اس مقام پر خدا نے لونڈی کہا۔ وہ بعینہٖ سارہؑ کے قول کی نقل ہے۔ یعنی سارہؑ نے جس کو حقارت سے لونڈی اور لونڈی کا بچہ کہا ہے۔ اُسی سے میں ایک قوم پیدا کرونگا۔ یہ ایک ایسی بات ہے۔ کہ جیسے کوئی شخص کسی لائق آدمی کو کہے۔ کہ یہ نالائق کیا کام کرتا ہے۔ پس اس دوسرے شخص کا بھی اُسکو نالائق کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ کہ درحقیقت وہ شخص نالائق ہے۔ اور جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ حضرت ہاجرہؑ بیٹی رُقیونؔ بادشاہ مصر کی تھیں۔ بلکہ ہم قوم و ہموطن ابراہیمؑ کی تھیں۔ اور جو وجوہ رقیت (کنیزی) کے اُس زمانہ میں تھیں۔ اُن سے بھی حضرت ہاجرہؑ بری تھیں۔ تو صرف ان الفاظ سے جو لڑائی اور جھگڑے اور غصہ میں بولے گئے ہیں۔ کسیطرح ان کا لونڈی ہونا۔ مراد نہیں ہوسکتا۔ خطبات ص ۱۰۷۔

سید صاحب کے اِس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سارہ نے اَمَتہ کا لفظ رنج اور غصہ کی خاص اور غیر متحمل حالتوں میں استعمال کیا ہے۔ اور توریت میں بالکل اُسی کی نقل سے کام لیا گیا ہے۔ اور یہ واقعات ارباب عقل و نقل کے روزمرہ مشاہدات اور بدیہات میں داخل ہیں۔ اور مشاہدات و بدیہات سے کسی کو انکار نہیں۔

اب لفظ اَمَتہ کی خاص حقیقت سید صاحب۔ توراۃ کے مفصل ذیل اسناد سے پیش کرتے ہیں۔

لفظ اَمَتہ مجازاً محاورے میں زوجہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہودیوں میں دستور تھا۔ کہ دختر کا باپ بوقت شادی دختر بعوض دختر کے پسر کے باپ سے کچھ روپیہ لیا کرتا تھا۔ تب بیٹی دیتا تھا۔ جیسا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بعض قوموں میں دستور ہے۔ اور اس دستور کو بیٹی کا بیچنا کہتے تھے۔ مگر وہ لونڈی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ زوجہ شرعی ہوتی تھی۔ اور حقوق زوجہ کے اُسکو بالکل حاصل ہوتے تھے۔ ایسی زوجہ پر بھی لونڈی کا مجازاً اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ توریت مقدس کی دوسری کتاب باب ۲۱ آیت ۷ میں لکھا ہے۔

خدا نے کہا۔ اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو بیچے۔ اَمَتہ ہونے کیلئے۔ تو وہ لونڈیوں کی طرح نکل نہ جائیگی۔ اگرچہ وہ اپنے مالک میں ناپسند ہو۔ جس سے اس نے زفاف نہیں کیا۔ تو فدیہ دیگا۔ بوجہ ناپسند ہونیکے تاہم کسی اجنبی قوم کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا۔ اور اگر پسر کی خلوت میں دیدیا ہو۔ تو لڑکیوں کی طرح برتاؤ ہوگا۔ اور اگر اُس کے اوپر دوسری کر لی۔ تو حقوق زوجیت۔ یعنی کھانا کپڑا اور خلوت کم نہ کریگا۔ اور اگر یہ تینوں امر اُسکے ساتھ نہ کئے جاویں۔ تو بلا زر وہ چھوٹ جائے گی۔

چونکہ ان آیتوں سے مسائل فقہیہ مستنبط ہوتے ہیں۔ اسلیئے علمائے یہود نے انمیں بہت غور کیا ہے۔ کل مباحثہ لکھنا طول ہے۔ مگر جسقدر کہ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مختصراً لکھا جاتا ہے۔ ان تینوں آیتوں میں لفظ اَمَتہ سے لونڈی مراد نہیں ہوسکتی۔ اول تو انہیں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں لونڈی سے زوجہ شرعی مراد ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سب آیتیں بنی اسرائیل کی شان میں ہیں۔ جیسا کہ سیاق عبارت دلالت کرتا ہے۔ اور بموجب توراۃ کے لونڈیاں کی طرح سے بنی اسرائیل کی بیع و شرا جائز نہیں۔ چنانچہ اسکی تفصیل توریت مقدس کی تیسری کتاب باب ۲۵ اور دوسری کتاب باب ۲۲ آیت ۳ میں مندرج ہے

بنی اسرائیل چوری کے جرم میں یا دشمن کے قید میں سے چھڑا لینے کے لیے خریدے جا سکتے تھے۔ اور صرف سات برس تک مالک کے بطور غلام کے خدمت کرتے تھے۔ حضرت یوسف کے بھائی بھی چوری کی علت میں بطور غلام رکھ لیے گئے تھے۔ مگر وہ غلام نہیں رہتے تھے۔ اور اگر فرض کریں کہ ا نہیں جو احکام ہیں۔ وہ غیر بنی اسرائیل کے لیے بھی ہیں۔ تو بھی آیت کے معنی درست نہ ہونگے۔ کیونکہ غیر بنی اسرائیل لونڈی اور غلام پچاسویں برس از خود آزاد ہو جاتے تھے۔ اور آیت میں حکم ہے وہ آزاد نہ ہونگے۔ یہ مقام پر تفسیر رحمٰی کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔ جس سے مطلب مذکور ثابت ہوتا ہے۔ اسکا عربی ترجمہ یہ ہے۔

وان قبحت یعین بعلها لانه لخلو تها ما هو الذی لم یزفها ولو کان لما ان یزفها ویتخلی بها للتزویج وثمن شرابها هو ثمن نکاحها وفی الآیۃ کنایۃ بام النکاح وبانه لایجوز مع الغیر مسها۔

اگر بُری ہے اسکی نگاہوں میں۔ یعنی خاوند کی نگاہوں میں۔ (تفسیر) کہ اُسے رغبت نہ ہوئی اُسکے ساتھ خلوت کی (توریت) جس نے زفاف نہ کیا۔ (تفسیر) کہ اس کو مناسب تھا۔ اس سے زفاف۔ اس کے ساتھ خلوت کرنا۔ جورو کرنے کے لیے۔ اور قیمت اس خرید کی قیمت ہے۔ اس کی شادی کی۔ اور یہاں کنایہ ہے۔ کہ آیت میں حکم شادی کا ہے۔ اور کنایہ ہے۔ کہ وہ دوسری سے شادی کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ بات کا بھی خیال۔ کہ جسطرح ایسی بی بی پر جس کی بابت بغرض شادی روپیہ دیا گیا ہو۔ مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا وہی طرح ایسی بی بی پر بھی جو بطور ڈولے کے آئی ہو۔ مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے۔ جیسا کہ ابی غائل حضرت داؤد کی بی بی پر لونڈی اور خادمہ دونوں کا اطلاق ہوا ہے۔ جسکا ذکر عنقریب آتا ہے۔ اور چونکہ یہ امر حضرت ہاجرہ کے حال سے بھی نہایت مناسب تھا۔ اس لیے مجازاً ان کی نسبت بھی اَمَتہ یعنی لونڈی بولا گیا۔ مگر جب کہ رقیت کسی طرح ثابت نہیں ہے۔ تو اس لفظ سے حقیقی لونڈی ہونا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ کہا جاوے۔ کہ ان مقاموں میں یہی بی بی مراد ہے۔ مگر سریہ تو یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کی لڑکیاں لونڈی ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ تو سریہ کیونکر ہو سکتی تھیں۔

اور اگر یہ شبہ کیا جاوے۔ کہ جن مقاموں کا بیان کیا گیا ہے۔ وہاں قرینہ ہے۔ جس سے لونڈی مراد نہیں ہو سکتی۔ مگر جہاں حضرت ہاجرہ کی نسبت اَمَتہ کا اطلاق ہوا ہے۔ وہاں کیا قرینہ ہے۔ جس سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لیے جاویں۔ تو اس شبہ کے رفع کرنے کو ناظرین کو ذرا توجہ کی تکلیف دیجاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بلکہ اُن کے بعد بھی یہ دستور تھا۔ کہ لونڈی میراث نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے لیا اور راحیل یعقوب علیہ السلام کی بیویوں نے ان سے کہا۔ کہ کیا اب ہمارے لیے اپنے باپ کے گھر میں کچھ حق میراث نہیں ہے۔ کیا ہم اجنبیہ نہیں شمار کی گئیں۔ کیونکہ بیچ ڈالا ہم کو۔ اور قیمت بھی کھا گیا۔

(پیدائش باب ۳۱-۱۴ و ۱۵)

اس سے بالکل قطع نظر کر کے ہم اپنے اصلی مدعا کیطرف آجاتے ہیں۔

اور لونڈی کی اولاد جو دوسرے سے ہو وہ بھی لونڈی غلام ہوتی تھی۔ ان کے لئے بھی میراث نہ تھی چنانچہ یہ حکم موسیٰ کو بھی دیا گیا۔ اور لونڈی کی اولاد جو مالک سے ہو وہ بی بی کی اولاد کے ساتھ میراث نہیں پاتی تھی۔ جو کچھ ان کو باپ اپنی زندگی میں دیدے وہی ان کو ملتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قطورہ کی اولاد کو اپنی زندگی میں کچھ دے کر الگ کر دیا جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۵ میں مندرج ہے۔

جب کہ قاعدہ سے یہ معلوم ہو گیا تو اب اصل مطلب کیطرف رجوع کرنا چاہئے۔ کہ جب سارا نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور بچہ کو نکال دو۔ تو اسکی وجہ یہ بیان کی کہ میراث نہ پاوے لونڈی بچہ میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سارا کو اندیشہ یہی تھا کہ اسمٰعیل اسحاق کے ساتھ میراث پاویں گے۔ پس اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں۔ یا اسمٰعیل لونڈی بچہ ہوتے۔ تو میراث پانے کا خیال کیوں کر ہوتا کیونکہ اسوقت کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ زوجہ مطلقہ میراث نہیں پاتی تھی۔ اور جس لڑکے کو عاق یعنی ساقط المیراث کر دیا جاتا تھا۔ وہ بھی میراث سے محروم ہو جاتا تھا۔ اس لئے حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے درخواست کی تھی۔ کہ ہاجرہ اور اس کے لڑکے کو نکال دو۔ یعنی ایک کو طلاق دو اور دوسرے کو عاق۔ تاکہ دونوں مستحق میراث نہ رہیں۔

یہی قرینہ ہیں کہ ان آیتوں میں اَمَۃ کا لفظ جو خلاف محل واقع ہوا ہے اس سے اس کے مجازی معنی مراد ہیں۔ اور حقیقی نہیں ہو سکتے۔ علاوہ اُن کے اور بھی قوی قرینے ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

لفظ عبری شفحہ کی تحقیق ان مقامات کے سوا حضرت ہاجرہ کی نسبت توراۃ میں اَمَۃ (لونڈی) کا لفظ اور کہیں نہیں آیا ہے بلکہ شفحہ کا لفظ آیا ہے اور شفحہ کے معنی لونڈی کے نہیں ہیں۔ انقلوس یہودی نے جس نے توریت کا ترجمہ کالڈی زبان کیا ہے۔ شفحہ کا ترجمہ اَمَۃ جو بمعنی اَمَۃ (عربی) کے ہیں۔ لکھ دیا ہے اور اس سبب سے اکثر مترجموں نے توریت کے اور ترجموں میں بھی جو اور زبانوں میں کئے ہیں۔ اوس لفظ کا لونڈی ترجمہ کر دیا ہے۔ حالانکہ لونڈی کو عبری زبان میں اَمَۃ کہتے ہیں جو عربی لفظ اَمَۃ کا مرادف ہے۔ اور شفحہ کے معنی خادمہ کے ہیں۔ ہم تفرقہ بتلانے کے لئے سموئیل باب ۲۵ آیت ۴۱ نقل کرتے ہیں۔ اسی سے شفحہ کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔ کتاب سموئیل کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

وقالت نعم انا امة لہ خادمة تغسل رجل عبید سیّدی - اور کہا- ہاں اسکی لونڈی خادمہ ہے- اپنے سردار کے خادموں کے پاؤں دہونے کے لئے-

یہ قول بی بی ابی غائیل حضرت داؤدؑ کی بی بی کا ہے جب کہ حضرت داؤد کے ہاں آئیں تہیں شفحہ کے اصلی معنی جیسا کہ اہل لغت کہتے ہیں- قبیلہ کی عورت کے ہیں- اور مادّہ اس لفظ کا اور مشاخہ کا جسکے معنی قبیلہ کے ہیں ایک ہی ہے- لیکن عرف میں اسکے معنی خادمہ کے ہیں- پھر اس سے لونڈی سمجھنا یا تعصب سے یا غلطی سے تیسرا مقام جہاں سے اونکی لونڈی ہونے پر استدلال کرتے ہیں- کتاب پیدائش باب ۲۵ آیت پہلی سے لیکر ۶ آیت تک جس کا ترجمہ یہ ہے- اور ابراہیم نے پھر عورت کی جسکا نام قطورہ تہا- اور اس سے زمران- یقشان- مدان- مدیان- یشباق- شوحہ پیدا ہوئے- یقشان کے شبا- اور ددان پیدا ہوئے- ددان کی اولاد اشوریم- لطوشیم- لاُمیم- مدیان کی اولاد- عیفا- عیفر حنوخ- ابی دع- اور الدعا- یہ سب قطورہ اور دیا ابراہیم نے جو کچھہ اونکے پاس تہا- اسحاق کو اور سریہ کی اولاد کو ابراہیم نے اپنی حیات میں کچھہ دیکر اسحاق کے پاس سے نکال دیا- پورب طرف شرقی عرب میں۔

یہاں چھٹی آیت میں واقع ہے- لبنی ہپلغشیم جس سے استدلال کرتے ہیں- پیلغش یا پلغش جسے کلدی زبان میں پیلقتا یا پلقتا کہتے ہیں- یالحینتا بولتے ہیں اسکے معنی بے شبہ سریہ میں اور اوس کی جمع موافق قاعدے کے پیلغشیم آتی ہے- ربی سلیمان- ابن اسحاق کہتا ہے- اس کے معنی یہ ہیں کہ جسکے لئے کتبہ صداق یعنی کابین نامہ ہوا- اوسے ناشیم کہتے ہیں- اور جس کے لئے کابین نامہ نہوا- اوسے پیلغشیم کہتے ہیں =

بہرنوع یہ امر ثابت ہے کہ پیلغش سریہ ہے- استدلال یہ ہے کہ آیت میں پیلغشیم یہ لفظ جمع ہے اور اس سے مراد ہاجرہ اور قطورہ ہیں- کیونکہ سارا کے سوا یہی دو بیویاں حضرت ابراہیم کی ثابت ہیں: اس لئے یہ سریہ ہونگی یہ شبہ فقط پیلغشیم- کی وجہ سے واقع ہوا ہے- حال یہ ہے کہ عبری میں جمع تے اور میم سے آتی ہے- لہذا جمع پیلغشتم- ہونا چاہئے- لیکن توریت میں اس مقام پر پیلغشیم .... بدون تے واقع ہوا ہے- پیلغشیم نہیں ہے- اس لفظ پر مفسرین نے بحث کی ہے- بعض نے اس کو جمع مانا ہے اور تے کے نہونیکی یہ توجیہ کی ہے- کہ ابراہیم کی ایک ہی سریہ تہی- اسلئے تے کو گرا دیا "دوشی" مقصود لکھا گیا ہے کیونکہ ایک ہی سریہ تہی- ساتہہ ہی اسکے مفسرین نے یہ بہی لکھدیا ہے کہ وہ سریہ ہاجرہ تہیں اور وہی قطورہ ہیں یعنی ہاجرہ اور قطورہ ایک ہی نام ہیں یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی جسکا بیان ہوگا انشاءاللہ تعالے اسی طرح اکثر مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ سریہ ابراہیم ایک ہی تہی- لہذا پیلغشیم سے جمع مقصود نہیں

اور نہ بصورت جمع ہے۔ تو اسی وجہ سے اونقلوس نے جو قدیم مترجم ہے۔ اس لفظ کے ترجمہ میں تحینا تا لفظ واحد اختیار کیا ہے۔ اس حالت میں اس سے استدلال کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مدار حجت جمعیت ہی اور وہ غیر مسلّم ہے "

حضرت ہاجرہ اور قطورہ کو ایک قرار دینا غلط اور مہمل تاویل ہے

باقی رہی یہ بات کہ وہ سریہ جس کی شان میں آیت وارد ہے۔ وہی ہاجرہ ہیں۔ اس بیان سے کہ ہاجرہ ہی کا نام قطورہ ہے۔ دعویٰ بے دلیل ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس باب میں صرف قطورہ اور انکی اولاد کا ذکر ہے اور آیت انہیں کو سریہ تبلاتی ہے۔ علاوہ اس کے سفر التواریخ اول باب کی ۳۲ آیت میں جہاں سب کے نسب نامے لکھے ہیں اور جو اہل کتاب میں بڑی معتبر ہے لکھا ہے۔ ترجمہ۔ اور بنی قطورہ سریہ ابراہیم فلاں اور فلاں یہ وہی شخص ہیں جنہیں پیدائش باب ۲۵ میں قطورہ کی اولاد گنایا ہے۔ اور فلسطین کی پورب سکونت کی اجازت دی ہے انسے قطورہ کا سریہ ہونا بخوبی ثابت ہے اور اسی مقام پر ۳۳ آیت میں لکھا ہے۔ یہی سب قطورہ کی اولاد ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قطورہ ہاجرہ نہیں ہیں۔ ورنہ اسمٰعیل بھی انہیں میں شمار ہوتے بلکہ اسی باب کی ۲۸ آیت میں لکھا ہے۔ اور گنایا ہے۔ ابراہیم کے بیٹے اسحاق اور اسمٰعیل اسوقت یہ دستور ہے۔ یعنی اکثر یہ محاورہ کہ بیان نسب میں سریہ کی اولاد کو ماں کیطرف نسبت کرتے تھے اور بی بی کی اولاد کو باپ کی طرف۔ اس لیئے نسب نامہ اسمٰعیل کو ابراہیم کیطرف منسوب کیا اور قطورہ کی اولاد کی نسبت ابراہیم کیطرف نہیں کی بلکہ قطورہ کی طرف۔

علاوہ اسکے ہاجرہ کی اولاد پاران میں بسی اور قطورہ کی اولاد فلسطین کے پورب جیسا کہ توریت میں واقع ہوا ہے باوجود ان سب تباین اور تغائر کے دونوں کو (ہاجرہ اور قطورہ) ایک کہنا عناد ہے۔ علاوہ اسکے ابراہیم نے ہاجرہ کو طلاق دی تھی۔ اور آئمہ کو زن مطلقہ سے نکاح جائز نہیں۔ چنانچہ موسیٰ کی شریعت میں یہ حکم منصوص ہے۔ تو اگر یہی حکم شریعت ابراہیم میں بھی تھا۔ جیسا کہ یہود دعوے کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ قطورہ اور ہاجرہ ایک ہیں۔ بالکل خلاف ہے اور اگر ابراہیم کیوقت یہ شریعت بھی رہی تو خلاف دستور انبیا کے ہے۔ سوائے نبی آخرالزماں علیہ السلام کے زن مطلقہ سے نکاح کرنا ثابت نہیں ہے۔

اب ہم رجوع کرتے ہیں پلیغشیم کے لفظ اور اس آیت کے معنی کیطرف اگر تسلیم کر لیا جاوے کہ یہ لفظ جمع ہے جیسا اب نسخہ موجودہ مطبوعہ لندن اور اسٹراڈم وغیرہ میں دیکھا گیا ہے۔ اونقلوس نے اور قدیم

کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ جو خلاف بیان مفسرین کے پایا جاتا ہے تو بھی مدعا مستدل کا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جائز ہے بیلغیشی یہ جمع اسم منسوب کی ہو۔ جیسا کہ جمع اسم منسوب کی اس وزن پر متعارف ہے بیلغیشی کے معنی سریہ زادے کے ہیں۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ ابراہیم نے سریہ زادوں کو کچھ دیکر وہاں سے رخصت کر دیا اور انکو فلسطین کے پورب لینے کی اجازت دی۔ لیکن ان میں اسمٰعیل تو نہ تھے بلکہ اسی باب کی نویں آیت میں لکھا ہے۔ کہ دفن کیا ابراہیم کو اسمٰعیل اور اسحاق ان کے لڑکوں نے غرض توریت اور اسکی تفسیر دیکھنے والوں پر بخوبی واضح ہو جائیگا۔ کہ حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا کتب مقدسہ سے کسی طرح ثابت نہیں۔"

(ملخص از خطبات احمدیہ از صفحہ ۱۷۳-۱۷۷)

اس طول طویل استدلال میں یہودیوں اور عیسائیوں کے جملہ اشکال و احتمال کا پامال علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اسمیں کوئی کلام نہیں کہ مرحوم سرسید اور انکے شیخ مولوی عنایت رسول صاحب نے جناب ہاجرہ کو ایک صحیح النسب اور شریف النسل اور آزاد خاتون ثابت کرنے میں پھر اس لطف کیساتھ کہ انکے استدلال کے تمام اسناد و شواہد معترضین ہی کی کتب مقدسہ سے مستنبط و مستخرج فرما گئے ہیں بہت بڑی عالمانہ تحقیق سے کام لیا ہے جسکے لئے تمام اہل اسلام کو انکا ممنون ہونا چاہئے۔

مرقومہ بالا مبحث کو دیکھکر اور پڑھکر ہر شخص یہودیوں اور عیسائیوں کے بیجا تعصب اور لا انتہا نفسانیت کی پوری حقیقت معلوم کریگا۔ اپنے اس ایک گمراہانہ خیال کے پیچھے کہ حضرت اسحاق پر حضرت اسمٰعیل کو ترجیح نہ دی جائے کتنا سہارا ہے اور ایک بات میں کتنی شاخیں اور ایک شاخ میں کتنے شوشے نکالے ہیں۔ پہلے تو جناب ہاجرہ کے کنیز ہونے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن جب اونہیں کی کتابوں سے اوس معظمہ کا شاہزادی ہونا ثابت ہوگیا تو اون کو اور قطورہ کو جو حقیقتاً حضرت ابراہیم کی سریہ تھیں ایک ہی عورت ٹھہرایا۔ ان متعصبین کو ایسے جہل اور سراپا غلط استدلال پیش کرتے وقت اسکا بھی خیال نہ رہا کہ اون کا موجودہ استدلال تو کتب مقدسہ توراۃ کی اون عبارتوں کو پامال کر ڈالیگا جنمیں ہاجرہ اور قطورہ کے واقعات علیحدہ بیان کئے گئے ہیں۔ ہاجرہ کی اولاد اور انکا موطن و مسکن علیحدہ تبلایا گیا ہے اور قطورہ اور اونکی اولاد کے مساکن و اماکن جدا دکھلائے گئے ہیں۔ اب ان بے بصیرتوں سے کوئی پوچھے۔ کہ تمہارا خدا۔ تمہارے خدا کی کتاب جسپر تم ایمان لائے ہو۔ وہ ہاجرہ اور قطورہ کو دو علیحدہ عورتیں اور دونوں کی اولادوں کو دو جداگانہ قومیں اور پھر ان دونوں کے مقام سکونت دو مختلف اور متفرق مقامات میں صحیح اور صاف طور سے تبلا رہی ہے مگر تم ہو کہ اپنی خود غرضی اور نفسانیت میں گرفتار ہو کر دونوں

کو ایک سمجھتے ہو اور سمجھاتے ہو۔ اب تمہیں کہو کہ تمہارے خدا اور اوسکی صحیح اور صریح بشارتوں کے مقابلہ میں تمہارے ان لغویات کو ایک منٹ کیلئے بھی کوئی مانے گا نہیں، کبھی نہیں۔

جب اس سے بھی انکا مطلب نہ نکلا تو جناب ہاجرہؑ کو زن مطلقہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو پسر عاق شدہ (نعوذ باللہ) ٹھہرایا مگر اونہیں کی کتب مقدسہ کے مندرجہ واقعات بتلاتے ہیں کہ یہ زن مطلقہ حضرت ابراہیم کی آنکھوں میں ایسی وقیع اور قابل قدر تھی اور یہ عاق کردہ فرزند اونکو اتنا پیارا تھا۔ کہ باوجود اس افتراق کے آغاز فرقت سے لیکر وقت وفات تک سال بھر میں ایکبار نہیں کئی بار۔ اون کے دیکھنے کو شام سے حجاز میں تشریف لیجایا کرتے تھے اور کافی طور سے اونکا تفقد حال فرمایا کرتے تھے ابراہیم کے وہی طلاق دادہ اور عاق کردہ اہل وعیال ہیں جنکی دلبستگی اور راحت وآرام کیلئے بنی جرہم اور بنی عمالیق قبیلہ ہائے یمن کو وہاں آباد ہونیکی اجازت دی۔ یہ ابراہیم کے وہی برگزیدہ اور خدا رسیدہ اہل وعیال ہیں جنپر توریت مقدس کی متعدد اور متواتر بشارتوں سے خدا اور خدا کے فرشتوں کا براۃ العین ظاہر ہونا۔ اور اونکو اونکے موجودہ اضطرار واضطراب میں تسکین وتشفی دینا ثابت ہے اور پھر اون کی ہجرت اور ترک وطن کے واقعات کے بعد بھی ان بزرگواروں کے لئے مختلف اور متعدد بشارت اور وصایائے ابراہیمی اونہیں کی کتب معتبرہ سے معلوم ہوتے ہیں ان اسناد واشہاد کے مقابلہ میں جو مخالفین کے خاص معترفات ہیں۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی عقل والا آدمی بھی کبھی ایسے محبوب ترین اہل وعیال کو کسی شریف مرد آدمی کی گھر سے نکالی ہوئی ذریت یا طلاق دی ہوئی عورت قرار دیگا حقیقتًا اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابراہیم کیوں اِن حضرات سے ترک تعلق فرمانیکے بعد اپنے تعلقات بڑہاتے اور ان سے ملنے جلنے کیلئے علاقہ شام سے ملک حجاز میں بار بار آتے جاتے۔ اور اگر بفرض محال خدا کے حکم سے نہیں محض سارہؑ اصرار ہی سے ان سے شرعی مفارقت اور دائمی جدائی اختیار فرمائی گئی تھی۔ تو پھر خلاف مرضی خدا اور بلا رضائے سارہ اِنکے پاس آپکا جانا اور برابر دیکھ بھال آنا کس غرض سے تھا اگر حکم خدا سے مفارقت کیگئی تھی۔ اور پھر آمد ورفت جاری رکھی تھی تو معاذ اللہ آپکا یہ فعل حکم خدا کے صریح خلاف تھا۔ اور اگر صرف سارہ ہی کے اصرار سے بقاعدہ شریعہ طلاق دی گئی۔ تاہم بعد طلاق اجرائے رسم وراہ اور بقائے تعلقات قطعی ممنوع ومعیوب تھا ان عیوب ونقائص کیلئے عام انسان قابل الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اتنا بڑا اولی العزم پیغمبر۔

اِن تمام دلائل وقرائن کو پیش نگاہ رکھکر بآسانی سمجھ لیا جائیگا۔ کہ حضرت ہاجرہ اور جناب اسمٰعیل کے سے قطع تعلق کئے جانے کی نسبت یہودیوں اور عیسائیوں نے عام گمراہی اور عالم فریبی کے جو طوفان

باندھے ہیں وہ بالکل اون کے تعصب اور نفسانیت پر مبنی ہیں۔ اونھوں نے صاف صاف لفظوں میں حضرت ابراہیم پر اتہام لگایا ہے جسکا کوئی وجود اور کوئی اثر اونکی کتب مقدسہ سے خود ثابت نہیں ہوتا حقیقت حال وہی ہے۔ جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ولادت اسمٰعیل کے بعد ہی سے ہاجرہ کیساتھ سارا کو رشک و حسد پیدا ہوا۔ پھر چند دنوں کے بعد حضرت اسحٰق کے ولادت نے اونکے خیال کو اور قوی کر دیا۔ اور وہ یہ تہا کہ معمولی عورتوں کے انداز میں اونکی طبیعت نے یہ بیجا اصرار پیدا کیا کہ اسحٰق کے ساتھ اسمٰعیل وراثت میں شریک و سہیم نہ ہونے پادے اس خیال نے اصرار کے ساتھ قوت پکڑی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم کیساتھ سخت تاکیدوں میں اسکا اظہار کیا گیا خداوند عالم نے بھی رفع فساد کی مصلحت خاص سے حضرت ابراہیم کو سارہ کی ہٹ رکھ لینے جانیکا حکم فرما دیا۔ ورحقیقتاً حضرت ابراہیم کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ ان تمام مصالح پر نظر فرما کر جیسا کہ آجتک ایسے موقعوں پر ایسی ہی انتظام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت ہاجرہ کو حضرت سارہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اور ہاجرہ کو حکم الٰہی کے مطابق مع اونکے فرزند اسمٰعیل کے اوس مقدس مقام پر پہنچا دیا گیا جو بارگاہ مشیت سے ان حضرات کیلئے عظمت و جلالت اور تقدیس و تعظیم کا مرکز قرار پا چکا تھا۔

لفظ سارا سین کی تحقیق

Saracene. یہودیوں کی تقلید میں عیسائی متعصبین نے بھی حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کی صرف توہین و تحقیر کے قصد و خیال سے ان کی اولاد و ذریات کو سارقین کے حقیر نام سے موسوم کیا ہے اونکی عصبیت اور نفسانیت کی یہ کیفیت ہے کہ زمانہ موجودہ کی کامل تاریخی تحقیقات اور کافی اطلاعات حاصل ہو جانے پر بھی انکو اپنی اس غلط بیانی پر یقین نہیں آتا۔ چنانچہ یورپین قومیں آجتک اہل عرب کو جو بالکل صحیح طور سے آل اسمٰعیل ہونیکا شرف رکھتے ہیں۔ سارقین کہتی ہیں متعصبین یہود و نصاریٰ کا عرب کے تمام اقوام و قبائل کو اس نام سے موسوم و مشہور کرنا اونکی کہلی عالمفریبی ہے اور مغالطہ وہی ہم اس لفظ کی تنقید و تحقیق ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔

اس مغویانہ اور متعصبانہ تسمیہ کی ابتدا تو یونانیوں سے ہوئی جنہوں نے پہلے پہلے چند عرب کے خاص قبائل کو اس نام سے موسوم و مخصوص کیا پھر غایت تعصب و نفسانیت کی وجہ سے یہود و عیسائی جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندوں کو عام طور سے اسی نام سے پکارنے لگے اس غلط تسمیہ کی اصلیت اور حقیقت تو اتنی ہے اب کثرت اور وسعت اشاعت کا سبب تو صرف حسد و عداوت

معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ ریورنڈ مسٹر پوکاک Revd. Mr. Pecoke. جو گذشتہ صدی کے بہت بڑے عیسائی پیشوا صحائف وکتب قدیمہ کے مشہور عالم اقوام وقبائل عالم کے بہت بڑے محقق اور مستند مورخ ہیں اپنی کتاب موسومہ تاریخ عرب میں لفظ سارا سینس کی خاص تحقیق کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

اس مضمون پر ہمارے مصنفین نے اسوقت تک جو کچھ شائع کیا ہے اون میں ہم کسیجگہ اس امر کی قابل اطمینان دلیل نہیں پاتے کہ وہ لوگ جو پہلے عرب کہلاتے تھے آخر میں سارا سینس کیوں موسوم ہوئے۔ جن لوگوں نے اس نام کو سرح سے مشتق سمجھا ہے۔ اونکی کامل تردید کردی گئی ہے اب عموماً یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ نام سارق (چوری) سے نکلا ہے جس سے ایک وحشی اور لٹیری قوم صریح مراد ہے۔ مگر یہ نام ان کو کہاں سے ملا ہے اسمیں کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ نام خود انہیں (عرب) کے ہاں سے شروع نہیں ہوا ہوگا۔ بلکہ کسی اور قوم کی زبان سے یہ لفظ لیا گیا ہے کیونکہ عرب ایسے نام کو جو موجب رسوائی اور ذلت کا ہے اپنے لئے کیوں گوارا کرتے اب محققین کو یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ آیا ان لوگوں کے نام جو عام طور پر اور علانیہ قزاقی اور رہزنی کے لئے مشہور ہیں۔ لفظ سرق سے مشتق کرنا جائز ہوگا یا نہیں۔ جس کے معنی خفیہ چوری کرنیکے ہیں۔

اب اگر کوئی سراسینس کی تحقیق میں میری تبعیت کرنا چاہے تو اوسکو اپنی آنکھیں شرقین کیجانب کھولنی چاہئیں کسواسطے کہ سارا سینس اور سراسینی نائے۔ کی آواز میں شرقی اور اوسکے جمع شرقیوں اور شرقین کی نسبت کیا فرق ہوگا جسکے معنی اہل شرق یعنی باشندگان مشرق کے ہیں جسطرح کے سابق میں عربوں کو خصوصاً یہودی خیال کرتے تھے کیونکہ اوس زمین کا شرقی حصہ حسب قول طاسیطوس عرب سے محدود ہے۔ اسی طرح توریت مقدس (سفر تکوین باب ۱۰ میں) یقطان کی اولاد کو جو عرب تھے۔ مشرق میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی ساحل کے اوس حصہ پر جو مابین بلشام اور سفار کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے۔ واقع ہے۔ اگر ارساڈیاس قابل اعتبار ہو من مکۃ الی تجیئ مدینۃ الجبل الشرقی یعنی مکہ سے وہاں تک کہ تم اوس شرقی پہاڑ کے شہر تک آؤ۔ جیساکہ مسودہ کو ڈکمین میں مرقوم ہے۔ الی مدینۃ الشرقی یعنی شرقی شہر تک (جس سے میری دانست میں مدینہ منورہ مراد ہے۔ سرسید مرحوم) جو جانب شرق واقع ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی عقل تمام اہل شرق کی عقل سے بڑھکر خیال کیگئی ہے۔ یعنی حسب بیان اون یہودی کے۔ گو وہ کوئی ہو جس نے صحف ملوک کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔) سراسین یا عربی کی عقل ہے اسی طرح یرمیاہ نبی (باب ۴۹ ۲۸) میں اعراب بنی قیدار کو اہل الشرق کہتے ہیں علامہ گروگردشش بیان کرتا ہے کہ علیایمان سابق کی یہ رائے تھی کہ وہ عقلا جو حسب بیان متی حواری (باب ۲) پرستش کو آئے تھے۔ ملک عرب سے آئے تھے۔ اور اسکا خود بھی عقیدہ تھا (ناسوس (ذوبیس میں) لکھتا ہے کہ میں نے اپنی سفارت کیخدمت جو بجانب بنی عشوقیہ۔ بنی حمیر اور سارا سینس اور دیگر اقوام پرستش کنندہ کے تھی یعنی کردی اس لئے سارا سینس کا اور مشرقی اقوام کے زمرے میں شامل ہونا صرف اسی وجہ سے تھا،

کہ وہ شرق میں آباد تھے۔

مجدالدین فیروزآبادی صفی الدین اور دیگر لوگوں کا بیان ہے کہ مشرق کے چند اور مقامات بھی پائے جاتے ہیں وجہ کہ وہ مشرق کے اور حصوں میں واقع تھے۔ بنام الشرقہ یا المشرقیہ موسوم تھے۔ اور یہی انکا بیان ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ ان مقامات کے باشندے اہل الشرق کہلاتے ہیں۔ ایسی ہی دلیلوں سے اون دیگو نکو بھی جو ایسے ملک میں بستے ہوں کہ بہ لحاظ اور ملکوں کے الشرق یعنی پورب کہلاتا ہو۔ اس نام سے ملقب کیوں نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ اپنے اور لوگوں کے درمیان جو اپنی بولی میں اپنے آپکو مغربی باشندے (جزیرہ سودی تانیا) کہتے ہیں کسطرح پوری تمیز کر سکتے ہیں اسی طرح سے جیسے کہ باشندہائے ملک مغرب لغاریہ کہلاتے ہیں وہ لوگ بھی جو عرب میں متوطن ہیں۔ المشارقہ یا سارآسین کہے جاسکتے ہیں۔ اور یہ نام اونکے عادات و اوضاع کے لحاظ سے نہیں رکھا گیا ہے۔ اسیطرح تم اوس مشہور معروف حکیم بوعلی سینا کی اوس نامی کتاب کا نام ساراسنیک فلاسفی۔ یعنی الفلسفۃ الشرقیہ کچھ اوسکی جہالت کی وجہ سے نہیں کہتے ہو۔ بلکہ اوسکے مشرقی ہونیکی وجہ سے رہی۔ یہ بات کہ عربی حرف شین "ش" کا یونانی کے مانند تلفظ ہوا ہے اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ وہ یونانی) عبرانی حروف کا بھی اسی طرح تلفظ کرتے ہیں!

ماخوذ از خطبات احمدیہ از صفحہ ۱۶۱-۱۴۶)

تعصب کا مقتضا ہے کہ حقیقت چھپائی جائے۔ حسد اور نفسانیت کا مدعا ہے کہ اصلیت پر پردہ ڈالا جائے یا کم سے کم واقعیت پر غلط بیانی کے حاشیے چڑھا کر اصلی مضامین کو تبدیل کر دیا جاوے اس انگریزی محقق کی تحریر سے کامل طور پر متعصبین یہود و نصاریٰ کی مغویانہ ظلمکاریوں کی قلعی کھل گئی۔ اور ثابت ہوگیا کہ ان خودغرض حاسد اور کینہ پرور فرقے کو اپنی نفسانیت اور خودغرضی کے مقابلہ میں استخفاف حق تحریف تبدیل لفظ و معانی اور غلط بیانی کی بداخلاقیوں سے نہ کوئی غیرت ہے اور نہ کوئی شرم ایک محض معمولی لفظ کے اصل معانی اور مدعا میں تو حسد و نفسانیت سے اتنے مفاسد پیدا کئے گئے اور گمراہ فطرت کے تقاضہ سے تمام دنیا کے لوگ سخت مغالطہ میں ڈالدے گئے۔ تو پھر کتب الٰہیہ سے اہم ترین دفاتر و ذخائر کے اصلی ترجموں اور ان کے دقیق مسائل کی تشریح و تحقیق میں ان سے راستبازی یا صداقت شعاری کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

قدامت کعبہ کے متعلق مخالفین اسلام کے اعتراضات کی تردید مع دیگر حالات

ہم اپنے سلسلہ بیان میں جناب ابراہیم جناب اسمعیل اور حضرت ہاجرہ علیہ السلام کے حالات تفصیل کیساتھ قلمبند کر چکے حضرت ہاجرہ نے مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ اور مقام حجر میں جو خانہ کعبہ سے ملحق ہے مدفون ہوئیں اسی ضمن میں مناسبت مقام کیضرورت

ہم کو شہر مکہ اور عمارت مکہ کی قدامت اور اِس معبد مقدس کی اولیت کے مسئلہ کی انکشاف حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے اور ہم اِسکو اپنے تالیف کے موضوع کا جزو ضروری خیال کرتے ہیں اِس لئے کہ مخالفین اسلام نے اسکی قدامت کے مسئلہ پر بھی اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔

تعمیر کعبہ کے حالات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم جناب ابراہیم کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ اسلئے اُس کے متعلق ہم اعادہ اور اضافہ کی ضرورت نہیں۔ اِس کی قدامت کے مسئلہ کو ہم نے وہاں طوالت اور اصل مدعائے بیان سے دور جا پڑنے کے خوف سے بیان نہیں کیا مگر اب چونکہ ان تمام مقدس حضرات کے حالات کو ہم تمام کر رہے ہیں جو اس بنائے ربانی کے اصلی بانی ہوئے اِس ضرورت سے اِس کے متعلق تمام حالات و واقعات کو بھی تمام کر دینا ہمارے لئے ضروری ہے۔

قرآن مجید میں کعبہ معظمہ کی قدامت کے متعلق یہ عبارت مندرج ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ۔	آدمیوں کی عبادت اور عالم کی ہدایت کی غرض سے پہلا گھر جو دنیا میں بنایا گیا وہ شہر مکہ میں ہے۔

علمائے اسلام اسکی قدامت کو حضرت آدم کے وقت سے بتلاتے ہیں۔ اونکا بیان ہے کہ اسکی پہلی عمارت حضرت آدمؑ کے عہد میں تیار ہوئی تھی۔ مگر امتداد ایام کیوجہ سے وہ گر کر بالکل منہدم ہوگئی۔ تعمیر ابراہیمی اوس مقدس عمارت کی تعمیر ثانی ہے۔

اونیسویں صدی کے اسلامی جدید محقق اور مورخ۔ مغربی تحقیق و تعلیم کے مقلد اور موید۔ اِس بیان کو دور از قیاس سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کی خوش عقیدگی کا محض اضافہ ٹہراتے ہیں۔

میرے خیالمیں ہبوط آدم کے مسلمہ اور متفقہ واقعہ سے تو دنیا بھر میں کسی قوم کسی فرقہ کو کیا کسی نبی آدم کو بھی انکار نہوگا۔ پھر اگر دنیا میں حضرت آدم آئے اور وہ دنیا کی ہدایت و نظم کیلئے منجانب اللہ آسمان سے زمین پر بھیجے گئے۔ اور اُنھوں نے خدا کی عبادت کے لئے ایک گھر بنایا۔ اور وہ گھر ایک مدت گزر الیسا منہدم اور نسیاً منسیا و نابود ہوگیا۔ کہ ایک زمانہ دراز تک کسیکو اوسکے نشان و آثار کا کوئی علم باقی نہیں رہا پھر ایک عرصہ بعید کے بعد اُنھیں کی مبارک نسل میں ایک نبی برحق نے خداوند عالم کے حکم سے اوس معبد اعظم اور یادگار آدم کی بار ثانی تعمیر کی۔ تو یہ تمام واقعات۔ افسانجات و قیاسات اور محالات و ناممکنات کیسے سمجھے جائیں گے۔

محالات و ممکنات کیسے ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ امور تو روزمرہ کے حالات اور آئے گئے دن کے معاملات ہیں جو ہر شخص کے شبانہ روز کے مشاہدات میں داخل ہیں تمام شہروں۔ قصبوں اور دیہاتوں میں عموماً

یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے کہ پرانی عمارتوں کے افتادہ قطعات زمین - کئی پشتوں تک خاندانوں کی مالی کمزوریوں اور دیگر مجبوریوں کیوجہ سے ایسے ویران اور غیر آباد حالتوں میں پڑے رہتے ہیں کہ دیکھنے والے مشکل سے وہاں کسی مکان یا عمارت کا قیاس کر سکتے ہیں پھر ایک عرصہ کے بعد اسی مقام پر ایک خوشنما عمارت اور محلسرا تیار ہو جاتی ہے - تو کیا حقیقت میں وہاں موجودہ عمارت سے قبل کسی مکان کا وجود بیان کیا جانا محال اور ناممکن تسلیم کیا جاوے گا - ہمکو انہیں مشاہدات روزمرہ کے اصول متداولہ پر عمارت مکہ مشرفہ کو حضرت آدم کیوقت بنایا جانا تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہوگا ہم اس سے زیادہ اس بحث کیمتعلق لکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم کو اپنے موجودہ سلسلہ بیان میں خانہ کعبہ کیمتعلق اس سے زیادہ تفصیلی حالات و واقعات قلمبند کرنے ہیں اور مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کی تنقید و تردید کرنا ہے جو خواہ مخواہ اسکی قدامت اور عظمت سے انکار کرتے ہیں۔

ہمکو انکے اعتراضات کی کوئی شکایت نہیں تعجب ہے اور حیرت ہے تو ان کے اقرار کرنے اور پھر مکر جانے پر اور با اینہمہ - تمام دنیا سے اپنی کامل اور سچی تحقیق کا دعویٰ بھی اور تحقیق کی یہ حالت کہ ابھی ایک امر کی تحقیق کی اور ابھی آپ ہی اس کی تردید پر تیار ہو بیٹھے۔

بہر حال علماء اسلام حضرت آدم اور حضرت ابراہیم کے وقت سے اسکی قدامت تبلاتے ہیں - آخرالذکر زمانہ پر جمہور کا اتفاق ہے یہود و نصاریٰ کو اسکی قدامت و عظمت سے انکار ہے۔ عظمت و حرمت سے اونکا انکار تو ہمارے لئے قابل شکایت ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ اہل اسلام کیطرح اونکا معبد نہیں پھر وہ اسکی حرمت و عظمت کے لئے مجبور نہیں کئے جا سکتے باقی رہا اسکی قدامت سے انکار تو یہ اونکا صریح تعصب ہے

ہم کو یہ سمجھکر اپنا اطمینان کر لینا چاہئے - کہ اسلام کے معتقدات اور محرمات میں سے وہ کونسی ایسی چیز ہے جنکے ساتھ یہ مخالف اسلام فرقے اپنی حد درجہ کی نفرت اور توہین و حقارت کا اظہار نہیں کرتے پھر کعبہ معظمہ کی نسبت اونکا انکار یا کسی بے ادبی کا اظہار ہمارے لئے کیوں تعجب خیز ہوگا - مخالفین اسلام اسکو آدم کی عمارت کہاں تک تسلیم کریں گے - اسکو عمارت ابراہیمی بھی تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی اتنی قدیم عبارت نہیں - مولوی شبلی صاحب سیرۃ النبی میں مارگیولوس (Margoliouth) جرمن مستشرق کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

اگرچہ مذہبی خیال کیوجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البناء قرار دیا ہے لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی۔ مولوی شبلی صاحب اس قول کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرگیولوس نے اسکے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ہم کو اسکے صحت سے انکار نہیں ہے۔ اصابہ میں جو تصریح ہے وہ یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید یا سعد بن عمر نے تعمیر کی لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین عرب نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارت بنانا کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے۔ اس لئے عمارتیں نہیں بنواتے تھے بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے۔ اور اسی طرح ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۱۱)

شبلی صاحب سے مجھکو پورا اتفاق ہے صاحب اصابہ کا لکھنا بھی صحیح مگر مارگیولیوس کو نہ اسلام کی مذہبی تہذیب اور نہ اوسکے دینی آداب کی اطلاع ہے۔ اور نہ وہ اس کے تعظیم شعائر اللہ کی اہمیت سے واقف ہے اسلئے اصابہ کی تحریر بطور ظاہر اپنے مدعا کے مطابق پاکر اوس نے آنکھ بند کر کے نقل کر دی۔ نہ وہ واقع کی اصلیت تک پہنچ سکا۔ اور نہ صاحب اصابہ کے مدعائے حقیقت کو سمجھ سکا مخالفین کا یہ اعتراض اور دعوی کہ شہر مکہ اور عمارات کعبہ کی قدامت کا دعوی مسلمانوں کا خاص دعوی ہے قدیم اخبار و اسفار سے اسکا سراغ نہیں ملتا۔ اونکا انکار بعد الاعتراف ہے باوجود اتنی کامل اور وسیع تحقیق کے بھی محققین یورپ کے واقعات سے اتنی کوتہ نظری اور بیخبری پر سخت تعجب ہوتا ہے۔ اور بڑی عبرت آتی ہے۔ لیکن اسپر بھی ہم کہنے کو تیار ہیں۔ کہ نہ وہ کوتاہ نظر ہیں۔ اور نہ لاعلم و بیخبر۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علمائے متقدمین کی تحریر اور اونکی تقلید کی قدیم لکیر کو پیٹ رہے ہیں اور تقلید اسلاف کے اسی غلط اور کورانہ طریقہ نے اونکی چشم حقیقت کو کوتاہ کر دیا ہے۔

ان کا پہلا اعتراض کہ کعبہ کی قدامت کا مسئلہ مسلمانوں کی خاص ایجاد ہے کبھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمہاری ہی کتب مقدسہ اور اخبار و اسفار قدیمہ سے اوسکا وجود پورے طور سے ثابت ہوتا ہے۔ اہل اسلام اس معبد الٰہی کی اولیت اور صداقت کہ اس بنا پر مدعی ہیں کہ قرآن مجید میں حق سبحانہ تعالےٰ نے اسکے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

اوّل بیت وضع للناس ببکۃ مبارکا وھدی للعلمین۔	یہ پہلا گھر ہے جو آدمیوں کے لئے عبادت خدا اور ہدایت عالمین کی غرض سے مکہ مبارک میں بنایا گیا"

اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ شہر مکہ (مکہ) کا وجود قرآن کے سوا اور دیگر کتب قدیمہ میں بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کتب قدیمہ پر ایمان رکھنے والوں کو اس شہر مبارک کی قدامت کا ضرور قائل ہونا پڑے گا اور قرآن مجید کی یہ عبارت اونکی کتابوں کی بشارت سے بالکل مطابق ہو جائے گی اس مدعا کی تحقیق اور اس دعوی کی تصدیق ہم مولوی شبلی کی سیرۃ النبی سے ذیل کے ثبوت نقل کرتے ہیں"

کتاب زبور باب ۸۴۔ آیت ۶ میں ہے کہ۔ وہ مکہ کے وادی میں گذرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے۔ برکتوں سے موڈ۔

ذہک یعنے قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔

اس عبارت میں جو بکّہ کا لفظ آیا ہے وہی مکہ معظمہ ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے اسم مشتق قرار دیں تو اُسکے معنی رونے کے ہونگے اور یہ وہی لفظ عربی بکاء ہے جسکے معنی رونے کے ہیں چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے اس لئے اونکے مترجمین نے عبارت مذکورہ حسب دخاحکر، بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکّا کے کیا معنی ہونگے؟

زبور کی عبارت مذکورہ میں اوپر کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی تشبیہ میں حضرت داؤد نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربانگاہ اسمٰعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے حضرت داؤد خدا سے کہتے ہیں اے فوجوں کے خدا تیرے مسکن کسقدر شیریں ہیں۔ میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے۔ اے خدا تیری قربانگاہ میری مالک اور خدا ہیں مبارک ہیں وہ لوگ جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں اسکے بعد بکہ والی آیتیں ہیں۔ اب غور کرو حضرت داؤد جس مقام کے پہونچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اسی مقام پر صادق آسکتا ہے جسمیں ذیل کی باتیں پائی جاتی ہیں (۱) قربان گاہ ہو۔ (۲) حضرت داؤد کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کرکے جائیں (۳) وادی بکہ کہلاتا ہو۔ (۴) وہاں مقام مورۃ بھی ہو ان باتوں کو پیش نظر رکھو۔ تو قطعاً یقین ہو جائیگا۔ کہ "بکہ" وہی مکہ معظمہ اور "مورۃ" وہی "مروہ" اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہو جائیگا کہ یہودی کسطرح الفاظ کو ادل بدلکر دیتے ہیں۔ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ڈاکٹر ہسٹنگس (Dr Hastings.) نے ڈکشنری آف دی بائبل (Dictionary of the Bibles. میں وادی بکا پر جو آرٹکل (Article. لکھا ہے اوسکا خلاصہ یہ ہے۔

اس لفظ سے اگر واقعی وادی مراد ہے۔ تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک وادی ہے جس سے ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں

(۲) وادی آخور ہے۔ جو یشوعا باب ۷، آیات ۲۴-۲۶- وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۳) وادی رفائیون ہے جو سامویل دوم- باب ۵- آیات ۱۸-۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۴) کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے۔ اس راستہ کی آخری منزل ہے۔

(دیکھو رینان (Reynon.) کی کتاب- حیات عیسٰی باب ۴)

لیکن عجیب بات ہے ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا۔

مصرع - ہمان ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست۔

حیرت پر حیرت تو یہ ہے کہ جن جن وادیوں کے نام لئے ہیں۔ اون میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں۔ بخلاف اسکے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں فرق اسی قدر ہے کہ جسقدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

جدید انسائیکلو پیڈیا (New Encyclopaedia) میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگیولوس کا لکھا ہے اسمیں مکہ معظمہ کی نسبت تحریر ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا بجز اس کے کہ زبور (۶۰۸۴) میں وادی بکہ کا نام مذکور ہے۔

لیکن مارگیولوس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں؟

پروفیسر ڈوزی (Professor Dozie) جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی داں عالم ہے لکھتا ہے کہ

بکہ وہی مقام ہے جسکو یونانی جغرافیہ داں ماکروبہ کہتے ہیں۔

لیکن کارلائل صاحب نے اپنی کتاب ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ (Caralayals. Heroes and Heroes Worship.) میں لکھا ہے کہ

رومن مورخ سیلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے اور یہ ولادت مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔ اگر کعبہ حضرت عیسٰی سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اوسی زمانہ کا ہوگا۔ کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اسی کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔ (ملخص از سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۲-۱۱۰)

اس عیسائی محقق (کارلائل) نے تو صاف صاف لفظوں میں کعبہ مشرفہ کی قدامت اور شرافت بالتصریح وترجیح کا اظہار و اقرار کر دیا اگرچہ اس سے پہلے پروفیسر ڈوزی اور کسی قدر مارگیولیس نے بھی اسکا اقرار کیا تھا۔ وہ بزبان دیگران کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے اس کو قطعی اور واقعی نہیں کر سکتے تھے۔

کارلائل نے سائیلس کے ایسے قدیم مورخ کے مختار تحقیق سے یہود و نصاریٰ کے اتنے استخفاف حقیقت کا پورا انکشاف کر دیا۔ اور بتلا دیا کہ مستشرقین یورپ کا یہ استخفاف اور انکار بعید الاعتراف کسقدر مضحکہ خیز اور شرمناک ہے۔

سقف کعبہ اور غلاف کعبہ۔ اس مضمون کی نسبت ہم اس سے زیادہ تفصیل کو مناسب نہیں سمجھتے اور کعبہ مشرفہ کے دوسرے حالات و واقعات کی تصریح و بیان کو آغاز کرتے ہیں ہم اس معبد مقدسہ اول

عقبہ بشر قہ کے تعمیر ہونے کے تمام و کمال حالات اوپر لکھہ آئے ہیں اونکے یہاں اعادہ یا اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مورخین و محدثین اسلام کا امر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے سعد ابن تبع حمیری بادشاہ یمن نے عمارت کعبہ پر غلاف چڑہایا۔ اور قصی ابن کلاب نے اسکو مسقف اور مقفل کر دیا۔ قدیم محققین و محدثین کے علاوہ حال کے مورخین کا بھی یہی مختار ہے۔ لیکن علمائے اہلبیت علیہم السلام کے اخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کی عمارت حضرت اسمعیل ہی کے زمانہ میں مسقف ہوگئی تہی۔ اور اوسپر غلاف بھی چڑہا دیا گیا تہا اور جس عقیدت اور اخلاص شعار خاتون معظمہ نے تعظیم شعائر اللہ کی یہ اول اول رسم ایجاد کی اور پوشش کعبہ نذر کی وہ جناب اسمعیل کی زوجہ مطہرہ تہیں۔ حیات القلوب کی مفصلہ ذیل عبارت سے اسکے پورے حالات محقق ہوتے ہیں:۔

آن زن عاقلہ با اسمعیل گفت کہ آیا برائے دو در دو پردہ بیاویزیم یکے از انیجانب و یکے از انجانب گفت بلے دو پردہ ساختند کہ طول آں دوازدہ ذراع بود و بر آں درہا آویختند۔ پس آں زن را خوش آمد آں پردہ ہا و گفت آیا برائے کعبہ جامہ بیابم کہ ہمہ کعبہ را بپو شانم کہ ایں سنگہا بد نما است اسمعیل گفت بلے پس بسرعت متوجہ کار شد و پشم فرستادو میاں قبیلۂ خود ریسمان کہ اینہا را برائے او برسید و ازاں روز ایں سنت درمیان زنان جاری شد کہ از یکدیگر مدد می طلبند دریں باب پس بسرعت میکردند یاری از قبیلۂ خویشان خود می طلبید و از ہر طرفے کہ فارغ میشدی آویخت پس چوں موسم حج رسید یکطرف ماند کہ جامہ اش تمام نشدہ بود۔ با سمعیل گفت چہ کنیم اینجانب را کہ جامہ اش تمام نشدہ است پس برائے آں طرف از برگ خرمہ جامۂ ترتیب دادہ بیاویخت عرب بسیار آمدند بر وجہے کہ پیشتر چناں نمی آمدند و امر چند مشاہدہ کردند کہ ایشاں را خوش

زوجہ حضرت اسمٰعیل نے کہا کہ کعبہ کے دروازے کے دونوں جانب ہم دو پردے لٹکا دیں۔ اسمعیل نے کہا ہاں لٹکا دئے جائیں۔ دو پردہ بارہ گز لمبے بنائے گئے۔ اور لٹکائے گئے زوجہ اسمعیل کو یہ آرائشی پردے بہت خوشنما معلوم ہوئے۔ تو پھر اسمعیل سے پوچھا کہ اگر آپ کہیں تو پورے خانہ کعبہ کے لئے ہم ایک کپڑا یا پوشش تیار کر دیں۔ کہ یہ پتھر جو بدنما معلوم ہوتے ہیں چھپ جائیں۔ حضرت اسمعیل نے اجازت دیدی۔ وہ خاتون اسی وقت سے بعجلت تمام اوسکی طرف متوجہ ہوئیں اور بہت سا اون لیکر اپنے قبیلہ میں بھیجدیا۔ کہ اسکو کات کر جلد بہیجدیں۔ اسی وقت سے غلاف کعبہ کے لئے عورتوں میں اون کاتنے کا رواج ہوا۔ اِس کام میں اون معظمہ نے بہت جلدی کی اور آپ اور اپنے عزیز و اقارب سے اسمیں مدد لی اور جس سمت کا غلاف یا پوشش تیار ہو جاتی تہی وہ اُس سمت کی دیوار پر چڑہائی جاتی تہی۔ ہر طرف کا غلاف تیار ہو کر چڑہ گیا صرف ایکطرف کا رہ گیا۔ اور حج کا موسم آگیا۔ تب اونہوں نے اسمعیل سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایکطرف کی پوشش تیار

آمد پس گفتند سزاوار نیست کہ برائے عمارت کنندہ این خانہ ہدیہ بیاوریم۔ پس از آں روز ہدیہ برائے خانہ کعبہ مقرر شد۔ پس ہر قبیلہ از قبیلہائے عرب ہدیہ برائے خانہ کعبہ آوردند از زر و چیزہائے دیگر تا آنکہ مال بسیار جمع شد پس ل لیف خرما را برداشتند و خانہ کعبہ را اتمام کردند و در دور کعبہ آویختند و کعبہ سقف نداشت اسمٰعیل ستونہا گذاشت مانند ایں ستونہا کہ می بینید از چوب سقف آنرا بچوبہا و جریدہا راست کرد و گل برآں مالید پس چوں سال دیگر عرب آمدند و داخل کعبہ شدند۔ دیدند کہ عمارت کعبہ زیادہ شدہ است۔ گفتند سزاواران است کہ برائے عمارت کنندہ۔ ہدیہ را زیادہ کنیم پس سال آئندہ ہدیہ بسیار آوردند و اسمعیل ندانست کہ کہ آں ہدی را چہ کند پس حق تعالےٰ باو وحی نمود کہ بکش اینہا را و طعام کن حاجیاں را۔

(حیات القلوب ملا مجلسی جلد اول ۱۳۱ لکھنو)

نہیں اور حج کے دن آگئے۔ اسلئے خرمے کی چھال اُس طرف کی پوشش مرتب کردیجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اُس سال ہر برس سے زائد عرب حج کعبہ بجالانیکی غرض سے آئے اور پوشش کعبہ کی دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ آپس میں ملکر کہنے لگے کہ اسکے بنوانیوالے کیلئے ہم لوگونکو ہدیہ لانے چاہئیں۔ اسی زمانہ سے خانہ کعبہ کیواسطے ہدیہ لانے کا دستور قائم ہوا یہ ہدیہ نقد و جنس سب اقسام کے ہوتے تھے یہانتک تک کہ بہت سا مال اس رقم میں جمع ہوگیا۔ وہ لیف خرما کا غلاف اتار دیا گیا۔ اور پوشش کعبہ اونی کپڑے سے مرتب کردیگئی اُسوقت تک کعبہ کی چھت نہیں تھی حضرت اسمٰعیل نے ستون کھڑے کئے اور انپر شہتیر اور کڑیاں رکھیں۔ اور انپر مٹی ڈالدی آئندہ سال عرب آئے اور خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ عمارت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے سب ملکر کہنے لگے کہ ہم لوگوں کو اس عمارت کے تعمیر کنندہ کیلئے پہلے سے بھی زیادہ ہدیہ لانے چاہئیں دوسرے سال وہ لوگ بہت زیادہ ہدیے (بھیڑ دنبے) لائے حضرت اسمٰعیل نہیں جانتے تھے کہ ان کا کیا کیا جائے خداوند عالم نے ان کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ انکو ذبح کرکے حاجیوں کی ضیافت کردو یہی رفادہ ہے)

مندرجہ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی زوجہ مطہرہ نے آپکی استرضاء امتزاج سے پوشش کعبہ ایجاد کی اور اسکے نذر کئے جانیکی ابتدا فرمائی اسی طرح جناب اسمعیل نے خانہ کعبہ کی عمارت کو اپنے دست مبارک سے اپنے ہی وقت میں مسقف فرمادیا ہے۔ اس بنا پر جیسا کہ اقوال و ارشاد ائمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین سے مستفاد ہوتا ہے۔ بیت اللہ زاد اللہ شرفہا کی یہ ضرورتیں اوسیوقت پوری ہوچکی ہیں اور اس کی اولیت اور ایجاد بھی اوسوقت کے موجودہ اہلبیت علیہم السلام سے آغاز ہوئی تھی اور نہ کسی دوسرے لوگوں سے بالکل ممکن اور قریب العقل ہے۔ کہ قصی نے اپنے وقت میں بار دیگر اسکی چھت بنوائی ہو اور اسطرح سعد ابن تبع حمیری نے اس کے بعد خواب دیکھا۔ ہو اور اوسکی تعمیل میں پردہ کعبہ نذر چڑھایا ہو۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اگر سعد ابن تبع کا زمانہ حضرت اسمٰعیل سے قبل تھا تو البتہ سعد کے اول غلاف چڑھانیوالا واقعہ ماننے میں کوئی تامل نہوگا اور اگر مابعد ہے تو قرینہ غالب یہ ہے کہ سعد نے حضرت اسمٰعیل کے بعد یہ خدمت ادا کی ہو

سلسلہ سلاطین حمیریہ کی تفصیل جو ہم نے تاریخ ابوالفدا اور دیگر عربی ماخذوں سے آغاز کتاب میں لکھی ہے اوسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد ابن تبع کا زمانہ حضرت اسمعیل سے بہت پیچھے ہے حضرت اسمعیل کیا وہ تو ملکہ بلقیس سے بھی کئی پشتوں بعد کا آدمی سلسلہ حمیری میں ثابت ہوتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہم السلام سبا اکبر عبد الشمس اول کے زمانہ کے بزرگوار ہیں۔ جو تمام قبائل و ملوک یمن کا جد القبیلہ اور سلاطین حمیری کا مورث اعلےٰ پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار و شمار سے حضرت اسمعیل کے متعلق اِس خدمت کی شہادت موجود ہوتے ہوئے اسکی ایجاد اور اولیت کو کثیر التعداد پشتوں کے بعد ایک محض غیر تعلق اور بیواسطہ شخص کے ساتھ منسوب کرنا سیاق تحقیق اور معیار تصدیق کے بالکل خلاف ہے۔

اسی طرح عمارت کعبہ کے مسقف کئے جانیکے واقعات کو بھی سمجھنا چاہئیے ممکن ہے کہ حضرت اسمعیل کے بعد قصی ابن کلاب نے ایک بار دیگر چھت بنوائی۔ ہو اور کامل مرمت کرائی ہو۔ اسیطرح مرقومہ بالا روایت سے نذر و ہدیٰ کے مراسم کی اولیت بھی حضرت اسمعیل ہی کے زمانہ سے معلوم ہوتی ہے سرسید نے کعبہ کو حال میں اتنا تسلیم کیا ہے۔ کہ تعمیر ہی کے وقت سے کچھہ نذر و نیاز کعبہ پر چڑہائے جانیکی خدمت شروع ہوگئی تھی اُن کی عبارت یہ ہے۔

اس چار دیواری کے اندر ایک کنواں کہودا تہا۔ جسکو خزانہ کعبہ کہتے تہے۔ اور جو کچھہ نذر و نیاز کعبہ میں آتی تہی وہ اُسی میں رکھدیتے تہے۔ تاکہ چوری سے محفوظ رہے۔

سید صاحب پر موقوف نہیں۔ نذر و ہدیٰ اور اطعام حجاج کعبہ کے خدمات کی ایجاد ابراہیمی ہونے پر جمہور کا اتفاق ہے اور ویسا ہی مندرجہ بالا روایت اہل بیتؑ سے بھی ثابت ہوتا ہے جو کچھہ اختلاف ہے وہ حضرت اسمعیل کیوقت میں خانہ کعبہ کے مسقف کئے جانے اور اسپر غلاف پوشش چڑہائے جانیکی ایجاد و اولیت کی نسبت۔

سرسید نے عمارت کعبہ کے ذکر میں ایک نظری نقشہ بنا کر عمارت ابراہیمی اور موجودہ عمارت کے فرق مابہ الامتیاز کو اپنی مندرجہ ذیل عبارت کیساتھ دکھلایا ہے۔ ہم نقشہ اور عبارت کو بجنسہٖ بلفظہٖ نقل کرتے ہیں

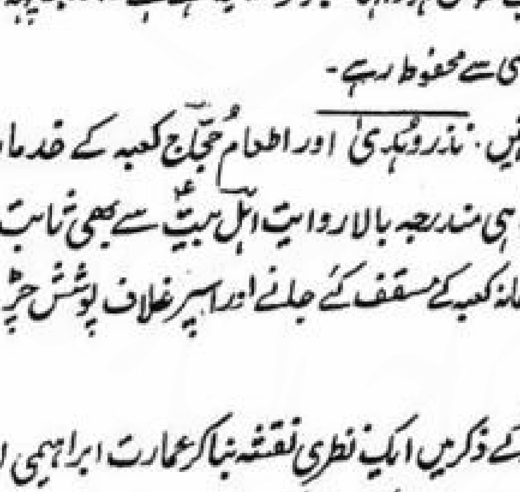

نوٹ۔ خطوط سیاہ کے تمام علامات عمارات ابراہیمی ہے۔ اور نقطہ دار نشانات اضافات قریش اور موجودہ ہیئت عمارت کو بتلاتے ہیں۔ بائیں طرف جو حصہ نقطوں سے گھرا ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں وہ بھی کعبہ میں داخل تھا۔ قریش نے تعمیر کے وقت اسقدر چھوڑ دیا تھا۔ کعبہ کے اندر جو نقطہ دار نشان ہیں۔ وہ اُن ستونوں کے ہیں۔ جو قریش نے بنائے تھے۔ وہ اب نہیں ہیں۔ بعوض اُس کے عبد اللہ ابن زبیر نے تین ستون بنائے ہیں۔ جن کے سیاہ نشان بیچ میں ہیں۔

سید صاحب کی عبارت متعلقہ کعبہ جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے یہ ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ اور دروازہ میں سے ملا ہوا تھا۔ اور اُس میں نہ کواڑ چڑھے تھے۔ اور نہ کُنڈی لگی تھی۔ اور بلاشبہ اُس زمانہ کی حالت ایسی ہی تھی۔ کہ جس سے زیادہ تعمیر مکان میں گو وہ خدا ہی کا گھر بنایا گیا ہو۔ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ خطبات ۵۱۹۔

بہر حال سید صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا۔ کہ تعمیر ابراہیمی اور تعمیر قریش کے درمیان۔ جس سے تمام تر تعمیر قصیٰ ابن کلاب مراد ہے۔ اور کوئی دوسری تعمیر نہیں ہوئی۔ سید صاحب پر منحصر نہیں اکثر اسلامی مورخین کو بھی شبہ ہوا ہے۔ حالانکہ ان دونوں تعمیرات کے درمیان دو اور تعمیروں کا ذکر اکثر تاریخوں میں موجود ہے لطف یہ ہے۔ کہ سید صاحب نے خود ان دونوں تعمیروں کا ذکر علامہ عبد الرزاق کی تاریخ مکہ سے لکھا ہے جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ایک فرانسیسی مورخ نے اپنی کتاب متعلقہ احوال مکہ میں حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے۔ کہ پہلے بنی جرہم نے اور اُنکے بعد عمالیق (عمالیق ثانی) نے کعبہ کی تعمیر کی۔ خطبات ۵۲۳

مرحوم سید صاحب کی عادت تھی خواہ مخواہ یوروپین ماخذوں کے حوالہ دینے کی حالانکہ بنی جرہم اور عمالیق دونوں کی تعمیرات کا ذکر عام طور سے عربی کی تمام تاریخوں میں موجود ہے۔ اور خود آپ ہی نے تاریخ مکہ کے حوالہ سے خطبات میں درج فرمایا ہے۔ دونوں تعمیرات کے متعلق آپ کی بلفظہ عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

قالوا و توفی اسمٰعیل و دفن فی الحجر کانت امہ قد دفنت فی الحجر ایضا و ترک ولد اسمٰعیل من رعلہ ابنۃ مضاض لما ولد اسمٰعیل و کلفھم لانھم بنو ابنتہ فلم یزل امر جرھم یعظم بمکۃ و یستفحل حتی ولوا البیت کانوا اولاتہ لا احکام بمکۃ فجاء سیل فدخل البیت فانھدم فاعادتہ جرھم علی بناء ابراھیم و کان

کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ اُسکے محافظ رہے۔ جب انکا انتقال ہوا۔ تو بنی جرہم کو اسمیں مداخلت ہوئی کیونکہ وہ انکے قریبی رشتہ دار تھے۔ اور بنی اسماعیلؑ کے خیر خواہ و محافظ تھے مضاض ابن عمر جرہمی جو نانا اسمٰعیلؑ کے بیٹوں کے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں سب اختیار لے لیئے۔ بنی جرہم کے اختیار کے زمانہ میں پہاڑی نالہ آیا۔ اور کعبہ میں پانی چڑھ گیا۔ اور کعبہ ڈھہ گیا۔ جس کو بنی جرہم نے اُنھیں بنیادوں پر۔ جو ابراہیمؑ

طوله في السماء تسعة اذرع (از کتاب اخبار مکة صفحہ ۴۸)	نے بنائی تھیں۔ اور اُوسی صورت پر پھر بنایا۔ اُسکی بلندی زمین سے نو ذرعہ تھی۔ (کتاب اخبار مکہ ص ۴۸)

(منقول از خطبات احمدیہ ص ۵۲۱)

سید صاحب تاریخ مکہ مندرجہ بالا اقتباس کو لکھکر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ہم کو کسی تاریخ سے اِس تعمیر کا زمانہ نہیں معلوم ہوا۔ اور اُسی سبب سے ہم کوئی زمانہ اُس کی تعمیر کا قرار نہیں دیسکتے۔

سید صاحب کے ایسے کامل محقق سے ایسا عاجزانہ عذر کتنا تعجب انگیز ہے۔ اس کے ایسے لامعلوم الایام اور غیر معلوم الوقت واقعات کے صحیح ایام وقوع تو اسی خطبات میں آپ نے مختلف قرائن و دلائل عقلیہ سے معلوم کرکے لکھ دیئے ہیں۔ اور حقیقتًا وہ قابل قبول بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مگر اس ایک واقعہ کی نسبت۔ جسکا زمانہ وقوع قریب قریب بالکل معلوم ہے۔ آپ اپنا عجز اور مجبوری ظاہر فرماتے ہیں۔ علامہ ارزقی اصل عبارت میں توفی اسمٰعیل لکھکر اور آپ اس کے ترجمہ میں۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد تحریر فرما کر اسکے وقوع کا زمانہ گویا تبلا چکے۔ اور قائم فرما چکے۔ یوں سمجھ لیا جاوے۔ کہ اِس عبارت مذکورہ بالا سے۔ تعمیر جرہم کا زمانہ بعد وفات اسمٰعیلؑ ظاہر ہوتا ہے۔ آپ ہی کی تحریر سے اس کے سن وقوع کا بھی اندازہ ہم تبلا دیتے ہیں۔ خطبات ص ۵۶۳ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اسمٰعیلؑ سنہ ۲۰۹۴ دنیوی مطابق سنہ ۱۹۱۰ قبل مسیح کے پیدا ہوئے۔ پھر خطبات ص ۔۴ میں لکھتے ہیں کہ "حضرت ابراہیمؑ کا ایک سو پچھترویں (۱۷۵) برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں نے مکفیلاہ کے غار میں دفن کیا تھا۔ (توریت سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۹) اِس لیے حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اُسوقت نواسی (۸۹) برس کی تھی۔ اب اسی سے حساب لگا لیا جاوے۔ اسمٰعیلؑ کی عمر بالاتفاق ایک سو تیس (۱۳۷) برس کی تبلائی جاتی ہے۔ تو اس حساب سے سن وفات سنہ ۱۷۹ قبل مسیح ہوتا ہے۔ اسی کے بعد سے مکہ میں عہد جرہمی شروع ہوتا ہے۔ تو قرینہ غالب ہے۔ کہ سولھویں صدی اور سترھویں صدی کے زمانہ میں تعمیر جرہمی عمل میں لائی گئی۔ یہ تو بالکل کھلا ہوا اور صاف حساب ہے۔ پھر سید صاحب اس کے علم و تعین زمانہ سے اپنی مجبوری اور عجز کیوں ظاہر فرماتے ہیں۔

یہ تو تعمیر جرہمیہ کی نسبت۔ سید صاحب کے اقتباسات تھے۔ تعمیر عمالیقی کے متعلق آپکے حسب ذیل مکاشفات ہیں

عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں۔ جن کی نسل یقطان یا قحطان سے چلی ہے۔ اور تمام قبائل عرب اسی نسل میں ہیں حمیر بھی انہی کا ایک قبیلہ ہے۔ اور بنی حمیر میں بھی ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے تھا۔ جو مکہ میں بستا تھا۔ اس پچھلی قوم نے بنی جرہم پر غلبہ پالیا تھا۔ اور کعبہ کی مختار ہوگئی تھی۔ اُس زمانہ میں اِس قوم عمالیق نے کعبہ کو پھر بنایا۔ جو غالبًا پہاڑوں کے نالے چڑھ آنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

بعض مورخوں نے اِن دونوں قوموں میں تمیز نہیں کی۔ اور عرب البائدہ میں جو قوم عمالیق تھی۔ اُس کی نسبت تعمیر کعبہ کو خیال کیا۔ اور چونکہ وہ قوم بنی جرہم سے پہلے تھی۔ اِس لیے لکھ دیا۔ کہ عمالیق نے قبل بنی جرہم کے تعمیر کعبہ کی تھی۔ حالانکہ اُس نہ ابراہیمؑ تھے نہ کعبہ تھا۔

اِس کے بعد سید صاحب عمالیق ثانی کی تعمیر کا واقعہ ایک فرانسیسی مورخ کی کتاب سے حضرت علی کی زبانی لکھکر جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں۔ اپنا یہ مختار قائم فرماتے ہیں۔

عمالیق ثانی کی تعمیر کا زمانہ یقینی نہیں معلوم ہوسکتا لیکن اسقدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنہ عیسوی سے ایک صدی بیشتر وہ لوگ مکہ پر قابض ہوگئے تھے۔ اِس لیے کہ جزیمہ بادشاہ دوم خاندان حیرہ کی ایک نہایت سخت لڑائی عمالیق سے ہوئی تھی جس میں عمالیق نے شکست فاش کھائی تھی۔ اور یہ واقعہ سنہ عیسوی سے تخمیناً سو برس بیشتر ہوا تھا۔

بہر حال۔ ہم کو تعمیر عمالیقی سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہمکو تو تعمیر جرہمی سے علاقہ ہے۔ اور وہی ہمارا موضوع بحث ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ کہ جس طرح غلاف کعبہ کے متعلق اسکی ایجاد و اولیت کا شبہ سعد ابن تبع حمیری کیطرف ہوا ہے۔ حالانکہ روایت مندرجہ اور دیگر قرائن و دلائل قویہ سے اُس کی اوّلیت حضرت اسمٰعیلؑ کی زوجہ مطہرہ کی نسبت ثابت کی گئی۔ جو جرہمی الاصل تھیں۔ اُسی طرح ہمارے قدیم مورخین کو سقف کعبہ کی اوّلیت کی اصل حقیقت نہیں معلوم ہوسکی۔ اور اُنھوں نے قصیّ بن کلاب کو جو بقول سر سید جناب ختمی مرتبت علیہ السلام والتحیۃ سے کل دو سو برس پہلے تھے۔ کعبہ کا پہلے پہل سقف اور دیگر مراسم و مناسک حج وغیرہ کا مقرر کرنیوالا بتلایا ہے۔ حالانکہ وہی حضرات۔ باستثنائے سقف کعبہ۔ نذر۔ ہدی۔ اور رفادہ وغیرہ خدمات کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل علیہم السلام کے زمانہ کے مرسوم و دستور لکھتے اور بتلاتے آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر دکھلا آئے ہیں۔ اِس بنا پر یہ کہنا اور تسلیم کرلینا کتنا قریب العقل بلکہ صحیح ہوجائے گا۔ کہ اسواقعہ میں بھی اصل حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے متقدمین نے سقف اسمٰعیلی کے جزوی حالات تعمیر جرہمی کے واقعات کلی کے ساتھ ضم کرکے دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ سقف کعبہ پر کیا منحصر ہے۔ پوری عمارت کعبہ سیلاب آب کے باعث سے جرہمیوں کے عہد میں گرگئی ہو۔ جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ بنی جرہم نے پھر از سر نو اسکو مع سقف کے اُٹھایا ہو۔

سید صاحب کا یہ بیان کہ چار دیواری کے اندر ایک گڈھا اِس غرض سے کھودا تھا۔ اور اُس میں نذر کعبہ کے رقوم اِس لحاظ سے رکھے جاتے تھے۔ کہ چوری سے محفوظ رہیں صاف صاف اُس عمارت۔ کے مسقف کرنے کی ضرورت بتلا رہا ہے۔ ورنہ محض چار دیواری کھڑی کرکے۔ مالی رقوم کو اگرچہ ایک گڈھے ہی میں کیوں نہ ہو۔ چھوڑ دینا۔ اور پھر اُس کے چوری سے محفوظ رہنے کا خیال بھی ساتھ ساتھ رکھنا ایک جگہ جمع نہیں

ہو سکتے۔ اور نہ کوئی عقل والا اُسے قبول کر سکتا ہے۔ یہ قرینہ تبلا رہا ہے۔ کہ وہ عمارت اُسی وقت یا اُس کے بہت بہت قریب زمانہ میں چھت پاٹ کر محفوظ کر دی گئی ہو گی۔

اب رہا سید صاحب کا یہ عذر کہ اُسوقت کا موجودہ تمدن ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں دیواریں دیواریں تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا۔ اس میں کواڑ چڑھے تھے۔ نہ کنڈی لگی تھی۔ اور بلاشبہ اُس زمانہ کی حالت ہی ایسی تھی۔ کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں۔ گو وہ خدا ہی کے لیئے گھر بنایا گیا ہو۔ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا" بالکل خلاف واقع ہے۔ اُسوقت عرب کا تمدن یقینی اس سے کہیں زیادہ تھا۔ ہم اُسوقت کے تمدن کو پوری تفصیل سے سید صاحب کے ہمعصر وہم نوا شبلی صاحب کے اسی اعتراض کے متعلق اوپر لکھ آئے ہیں۔ جس سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے زمانہ میں خصوصاً حجاز کے اہل عرب کا تمدن۔ اگرچہ یمن کے تمدن کے برابر نہیں تھا۔ تاہم وہ اتنا پیچھے اور خراب حالت میں بھی نہیں تھا۔ جیسا کہ ان حضرات نے صرف اپنے قیاس کی بنا پر خیال کر لیا ہے۔ حالانکہ یوروپین محققین جو اُن کی تحقیقات کے سرمایۂ ناز ہیں ان کے خلاف اُسوقت میں عربوں کے متمدن قوم ہونے کا اعتراف ظاہر کرتے ہیں۔

(دیکھو تمدن عرب)

ان دلائل و قرائن کے علاوہ اگر زمانہ کے اعتبار سے بھی اس کی اولیت پر غور کیا جاوے تاہم یہ واقعہ صحیح اور بر واقع مانا جاتا ہے۔ تمام تاریخوں کا اسپر اتفاق ہے۔ کہ تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کا سن سو برس کا تھا۔ سرسید نے حضرت ابراہیمؑ کا سن وفات کے وقت ایک سو پچھتر برس کا تبلایا ہے۔ تعمیر کعبہ کے وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر وہ تیس برس کی تبلاتے ہیں۔ وفات ابراہیمی کے وقت اُن کا سن (۸۹) نواسی برس کا لکھتے ہیں۔ اور مجموع عمر آپ کی بالاتفاق ایک سو پچاس برس کی تبلائی جاتی ہے۔ (طبقات ابن سعد۔ طبری۔ ابن اثیر) اس حساب سے حضرت اسماعیلؑ اپنے والد ماجد کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے۔ اس بنا پر ہر شخص بآسانی سمجھ لیگا۔ کہ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں عمارت کعبہ مسقف نہیں ہوئی تھی۔ تو جناب اسمٰعیلؑ کے شصت سالہ مدت میں۔ جیسا کہ روایت مندرجہ سے مستفاد ہوتا ہے۔ اُسکو مسقف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور آپ نے اپنے زمانہ میں عمارت کی موجودہ ضرورت کو کامل فرما دیا۔

یہ تمام واقعات۔ یہ تمام قرائن اور یہ تمام دلائل۔ جو اوپر لکھے گئے ہیں۔ مرقومہ بالا روایت کی کامل تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔ اور صاف صاف تبلاتے ہیں۔ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانہ میں کعبہ کا مسقف کر دیا جانا کبھی خلاف واقع اور بے سند نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب اس روایت کی دیگر خدمات کعبہ کی تفصیل

قدیم اور جدید محققین اُسی زمانہ کی ایجاد تسلیم کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ شبہ اور اُسکا جواب کہ قدیم محدثین و مورخین عرب نے اِس روایت کو کیوں نظر انداز کیا۔ تو اسکا نہایت واضح اور صاف صاف باعث اصلی یہی ہے۔ کہ اِس روایت کے رُواۃ اور اِسکے تمام ماخذوں پر شروع ہی سے اہل اسلام نے نہ اعتبار رکھا۔ اور نہ کوئی علاقہ۔ اور نہ سروکار۔ حالانکہ اھل البیت ادری مافی البیت (گھر والے اپنے گھر کی اندرونی حالت جانتے ہیں) کے مسلمہ کی بنا پر ان مقدسین سے زیادہ اِن اُمور کا جاننے والا تمام ملک عرب میں اور کون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سلسلہ ابراہیمیؑ اور خانوادۂ اسمٰعیلیؑ میں یہی وہ نفوس برگزیدہ ہیں۔ جن پر اسوقت سے لیکر اسوقت تک اہل بیتؑ کا الہامی اور روحانی خطاب اپنے حقیقی معنیوں کے ساتھ صادق اور مطابق آتا ہے۔ جس طرح پہلے پہلے یہ خطاب خاص کر آل ابراہیمؑ کے لیئے الہام خداوندی اور احکام ایزدی کے مطابق مستعمل ہوا تھا۔ اور اسی باہمی مشابہت و مماثلت کے ثبوت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اہل اسلام کو تعلیم درود کی ترکیب میں یہ کلمات تلقین فرمائے تھے۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ وَسَلَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

تولیّت خانہ کعبہ خانہ کعبہ زاد اللہ شرفہا کے متعلق مندرجہ بالا خدمات کے علاوہ ایک مہتم بالشان اور عظیم المراتب خدمت اِس معبد مقدسہ اور عتبہ مطہرہ کی تولیت تھی۔ اور جس کا جلیل القدر عہدہ اور گرانمایہ منصب منجانب اللہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے بعد بقاعدۂ توریت حضرت اسمٰعیلؑ کو تفویض فرمایا گیا۔ اور چونکہ اِس معبد مشرفہ کو خدا نے بیت اوّل بیت وضع للناس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اِس رعایت سے۔ اِس کے محافظین اور متوالیین کو اہل البیت کے القاب مخصوص اور خطاب منصوص سے مخاطب فرمایا۔ اور اِسوقت سے لیکر اسوقت تک ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں اِن حضرات کی تکریم، عظمت اور تعظیم تسلیم کی گئی۔ اور یہ وہی وعدۂ الٰہی ہے۔ اور بشارت خلیل الٰہی جو نسل حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کے متعلق خداوندعالم نے اِن حضرات کی ہجرت فرمانے کے وقت حضرت ابراہیمؑ سے کیا تھا۔ اور جو متواتر مقامات پر کتب قدیمہ اور نیز قرآن مجید میں موجود ہے۔

تولیّت کعبہ کا مسئلہ بہت بڑا قدیم اور عظیم مسئلہ ہے۔ جو نہ تنہا مذہب اسلام میں عظمت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ تمام ادیان و مذاہب قدیمہ میں اِس کی تکریم و تعظیم کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ تولیّت کے جلیل القدر منصب کی تفویض بھی تجویز انسانی کے متعلق نہیں ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ قطعی طور پر تجویز و تدبیر مشیت ربانی پر منحصر ہے۔ جن لوگوں کو مذاہب سابقہ کے اخبار و آثار کے مطالعہ کی توفیق ہوئی ہے۔ وہ مسئلہ تولیت کی اہمیت اور اُس کی اصلی حقیقت سے خوب واقف ہیں۔

بشاہد تاریخی اور کتب سماویہ کے متواتر اخبار و آثار صاف صاف تبلا رہے ہیں۔ کہ کعبہ شرفہ اور اُسکے بعد کے اور عتبات مطہرہ کی تولیت اور خدمت کا عہدہ جلیلہ امم سابقہ میں بڑی عظمت و حرمت سے دیکھا جاتا تھا اور ہر زمانہ اور ہر اُمت میں اِسکا تعین اور تقرر من جانب اللہ ہوتا تھا۔

تولیت کعبہ کی خاص عظمت کی تفصیل سے تھوڑی دیر کے لیئے قطع نظر کرکے ہم اِس کے بعد والے معبد اعظم بیت المقدس اور اُس کی تولیت کے احترام و اکرام کو بیان کرتے ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے۔ کہ بیت المقدس کی بنا کعبہ ابراہیمی سے تقریبًا دو ہزار برس بعد حضرت داؤد کے زمانہ نبوت و امارت میں قائم ہوئی۔ اور تکمیل تعمیرات کے وصی و وارث حضرت سلیمانؑ کے عہد نبوت و رسالت میں کی گئی۔ اور پھر اُسوقت سے لیکر بخت نصر کی غارت گری کے وقت تک ہمیشہ اور برابر ایک پیغمبر دوسرے پیمبر کے بعد تولیت بیت المقدس کے گرانمایہ منصب پر ممتاز ہوتا چلا آیا۔ اور وہی اسکا محافظ بھی تھا۔ اور وہی اِسکا ملازم و خادم بھی۔ اسفار توراۃ کے مطالعہ سے حضرت عیسیٰؑ تک یہ سلسلہ مسلسل اور مکمل ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ولادت حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں حضرت ذکریا کی تولیت تھی۔ وکفلها زکریا شاہد ہے۔ یہ ایسے واقعات مسلم ہیں اور تاریخی شاہدات محکم اور مشہور بین الجمہور۔ کہ اِن کی تصدیق و توثیق کے لیئے ہم کو کسی ثبوت یا شہود پیش کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس زمانہ میں خانوادۂ نبوت و رسالت میں ایک ایسا ستودہ صفات بزرگ اِس منصب اعلیٰ کے لیئے۔ منجانب خدا انتخاب کیا جاتا تھا۔ جو اوصاف رسالت و نبوت سے بھی آراستہ و پیراستہ ہوا کرتا تھا۔ دستور الٰہی صاف صاف تبلا رہا ہے۔ کہ یہ منصب اور خدمت بھی جزو رسالت و امامت قرار پاجاتی ہے۔ اور اِس کے لیئے مشیت ایزدی انھیں چیدہ افراد اور برگزیدہ اشخاص کو منتخب کرتی ہے۔ جو اُس کے نزدیک اِس جلیل القدر اور مہتم بالشان خدمت کی صلاحیت رکھتے ہیں

بیت المقدس کی تولیت کی عظمت و شان کو بیان کرکے ہم جناب موسیٰ ابن عمران اور اُن کے وقت کے معبد قبۃ الزمان۔ اُس کی تولیت اور خدمت کے خاص احترام و اہتمام کو اپنے سلسلہ بیانیں قلم بند کرتے ہیں

جن لوگوں نے توریت کے کتاب الاعمال کو بالاستعیاب پڑھا ہوگا وہ قبۃ الزمان کی حقیقت سے خوب واقف ہونگے۔ قبۃ الزمان۔ حضرت موسیٰؑ کی اُس عبادت گاہ اور قربان گاہ کا نام ہے۔ جو آپ نے دوران سفر میں عبادت الٰہی بجالانے کے لیئے بنا فرمائی تھی۔ یہ اصل میں ایک خیمہ نہایت وسیع اور تمام قوم کے خیموں سے رفیع تھا۔ یہ ہمیشہ سفر میں ساتھ رہتا تھا۔ اور منزل پر جہاں تمام قوم کے خیمہ ڈیرے کھڑے کیے جاتے تھے۔ وہاں یہ خیمہ مقدس ایک اچھی و پاک و پاکیزہ جگہ پر نصب کیا جاتا تھا۔ اس میں شریعت موسوی کی قرارداد تمام اشیاؤ اور سامان عبادت بڑے سلیقہ اور قرینہ سے رکھے جاتے تھے۔ اور اِس کی زیب و زینت

اور حُسن و آرائش بھی بڑی عقیدت اور ادب سے کی جاتی تھی۔ اِس میں سونے اور چاندی کی متعدد شمعیں طلائی اور نقرئی بڑے بڑے کاسہ اور طرح طرح کے خوشبودان اور دیگر قیمتی اور بیش بہا ظروف اپنے اپنے مقامات مقررہ پر سجے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کے تمام اقوام و قبائل یہیں آکر خدا کی عبادت اور اُس کے مراسم بجالایا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ قوم عمالقہ اور فلسطین سے زمانہ دراز تک جنگ کرنی پڑی۔ اور اِس ضرورت سے سالہا سال سفر میں رہنا ہوا۔ اس لیئے اِس عبادت گاہ کی بنا قائم کی گئی۔ اور ایک خیمہ مراسم عبادت بجالانے کی غرض سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اور اُسکا نام قبۃ الزمان رکھا گیا۔ اِس معبد کی خدمت اور تولیت کے لیئے اولاد ہارونؑ مخصوص کر دی گئی۔ عبادت، نذر اور قربانی کے تمام مراسم و ارکان کی بجاآوری اور انجام دہی خاص طور پر انہیں حضرات سے متعلق کر دی گئی۔ اور اُنکی اِس تخصیص میں کسی طریقہ یا ذریعہ سے کسی شائبہ تعمیم کی کوئی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی۔ (سفر اخبار باب ۱۶)

قبۃ الزمان کے سب یا اکثر سامان عبادت اور صندوق الواح وغیرہ یہی چیزیں تھیں۔ جو اولاد ہارونؑ اور دیگر بنی لاویوں سے حاصل کر کے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کے معبد میں سابق ترتیب اور ترکیب کے مطابق رکھی تھیں۔

ہم نے معبد ابراہیمی کے مابعد معبدوں کی تولیت اور اُن کی خصوصیت کو یہاں اسوجہ سے لکھدیا ہے کہ اِس جلیل القدر منصب کا تعین انتخاب قدرت پر منحصر ہونا پہلے ہی سے یقین کر لیا جاوے۔ نہ جناب ابراہیمؑ کی محبت اولاد پر جسکا ثبوت ذیل کے آیہ قرآنی سے پورے طور پر ملتا ہے۔

واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما قال ومن ذریتی قال لاینال عھدی الظالمین۔	جب ابراہیمؑ کو اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا۔ اور اُن میں اُن کو پورا پایا۔ تو خدا نے فرمایا کہ ہم تم کو لوگوں کا امام بنانے والے ہیں۔ عرض کی۔ اور میری اولاد میں سے؟ ارشاد ہوا

(ہاں مگر) ہمارے اس) اقرار میں وہ داخل نہیں۔ جو برسر ناحق ہیں۔

اِس آیت سے ثابت ہوگیا۔ کہ عوام الناس کو چھوڑ کر سلسلہ ابراہیمی کے خواص میں بھی علی الاکثر ایسے حضرات ہیں جنھیں تولیت اور دیگر خدمت معبد الہٰی کی جو اصل امامت کے فروع ہیں۔ صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے۔ اور اس لیئے خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا و مدعا کو بطور تعمیم مستجاب نہیں فرمایا۔ اور اُس میں تخصیص کی ترمیم کر دی۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ جب عام حضرات میں پیشوائی اُمّت اور منصب امامت کی صلاحیت نہ ہوگی۔ تو وہ عبادت الہٰی اور دیگر جوامر و مناہی دینیات کی تعلیم و تلقین کیسے پوری کر سکیں گے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس منصب کو اپنی اولاد کے ساتھ محدود و مخصوص کرنا چاہا تھا۔ اور یہ اُصول فطرت کے بالکل مطابق ہے۔ مگر مشیت نے اس تخصیص کو بھی اُنکے عام سلسلہ میں عام

کر دینا مصلحت کے خلاف پایا۔ اور اُس میں بھی اپنے انتخاب و تعین کی قید لگا دی۔ اور یہی اُصول خانہ کعبہ کی آغاز تولیت سے لیکر مابعد کے معبدوں کی تعیین تولیت اور انتخاب امام و امامت کے متعلق مشیت الٰہی کی طرف سے ہمیشہ قائم رہا۔ ابھی ابھی قبۃ الزمان اور بیت المقدس کے خدمات کے متعلق لکھکر بتلا دیا گیا ہے۔ کہ اِس عہدہ جلیلہ کی انجام دہی میں تعلیم و ہدایت اُمت بھی خاص طور پر شامل تھی۔ اور تمام لوگوں کی عبادت عملیات اور اوامر و نواہی کی خبر گیری داخل۔ اِس لیئے اِس کی ذمہ داری اور ادا کاری کی بھی اُنھیں نفوس مخصوص سے خاص طور پر تعلق کی گئی جو امام اور پیشوائے اُمت ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ خانوادہ ابراہیمیؑ سے لیکر آل ہارونؑ تک آل داوٗدؑ اور آل عمرانؑ تک اِن تمام مبارک سلسلوں میں تولیت کعبہ کی عظیم الشان خدمت اُنھیں خاص بزرگوں سے متعلق کر دی گئی جو اُمت کے امام و پیشوا اور عوام الناس کے رہنما ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

اسلام نے بھی اِس منصب گرانمایہ کے حفظان مراتب کا شروع سے لحاظ رکھا۔ بلکہ اگر ذرا تحقیق و غور سے دیکھا جائے تو اُنکی قدر و منزلت میں شریعت سابقہ سے زیادہ اضافہ کیا۔ اگرچہ اِن برگزیدہ اور پسندیدہ حضرات کے ناموں میں اپنی طرف سے کوئی نوعیت اور تبدیلی نہیں کی گئی۔ اور اہل بیت کے مبارک اور مقدس القاب سے جیسا کہ زمانہ ابراہیمیؑ میں مخاطب کیئے جاتے تھے۔ اُسی القاب و خطاب ہی سے اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ السلام نے بھی اِن حضرات کو ملقب اور مخاطب فرمایا۔ اور کتب قدیمہ کے اُصول بشارت کے مطابق۔ الہام و احکام قرآنی نے بھی اِن مقدسین کے فضائل و مراتب سے تمام اہل اسلام اور کافہ انام کو واقف و مطلع فرما کر۔ اُن کی نسبت تعلیم و ارشاد ابراہیمیؑ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ انہیں احکام ربانی کی تعمیل و اجرا میں بانیٔ اسلام علیہ السلام نے یہاں تک اصرار فرمایا۔ کہ اِن برگزیدگان الٰہی کے ساتھ محبت و مودت رکھنے کو اپنی تبلیغ رسالت کا اجر و معاوضہ قرار فرما دیا۔

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔ | میں تم سے اجر تبلیغ رسالت کچھ نہیں مانگتا بجز اسکے کہ تم میرے قرابت داروں سے محبت رکھو

اللّٰھم صل و بارک علیٰ محمدؐ و آل محمدؐ کما صلیت و بارکت علیٰ ابراہیم انک حمید مجید۔

انہیں شواہد تاریخی سے پورے طور پر ثابت ہو گیا۔ کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس طرح عہدہ جلیلہ امامت آپکے اہلبیتؑ کے ساتھ مخصوص و منصوص تھا۔ اُسی طرح امامت کے متعلق تمام جزوی اور کلی خدمات بھی انہیں حضرات سے مخصوص تعلق رکھتے تھے۔ اور منصب امامت کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر اپنے سلسلہ بیان میں ثابت کر آئے ہیں۔ تولیت کعبہ کی خدمت بھی اسی جلیل القدر عہدہ کا جزو ضروری تھی۔ مگر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے اہل بیتؑ طاہرینؑ سے جہاں تمام اختیارات و حقوق منتزع کر دیئے گئے۔ انھیں کے ساتھ یہ حقوق اور منصب بھی ضبط ہو گئے۔ اور تخت سلطنت کے پایہ کے نیچے دبا دیئے گئے۔

حجر الاسود - اسلامی کتابوں میں صحاح - وغیرہ سے تاریخ و سیر تک کی تمام مشہور و معروف کتابوں میں اس حجر مقدس کی قدامت اور عظمت کی نسبت انواع و اقسام کے روایات قلمبند ہیں جو مشاہد تاریخی میں اگر نہ داخل ہوسکیں تو عقائد اسلامی میں شامل ہونیکے تو ضرور قابل ہیں۔

مرویات اسلامی اور روایات عرب عموماً اس پتھر کا حضرت آدم کیساتھ نزول من اللہ ہونا بتلاتے ہیں جدید محققین سو بھ آتے ہیں اور اسکو متقدمین کی قدامت پرستی ٹہراتے ہیں مگر مسٹر برٹن (Mr. Burton) اپنے مشاہدات میں اتنا ضرور بتلاتے ہیں کہ اس پتھر کے اجزا معمولی حجریت سے مشابہ نہیں ہیں بلکہ اسمیں شہاب ثاقب کے ایسے اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں برٹس گولڈ مائن آف مدین (Burton's Gold Mines) اب جدید محققین خود تصفیہ فرمالیں کہ شہاب ثاقب یا دیگر اجرام فلکی حرکت نقلی کے ذریعے سے آسمان سے زمین پر نازل ہونا ثابت ہے کہ نہیں۔

تاریخی حیثیت سے اس مقدس پتھر کی عظمت و حرمت یہاں تک ثابت ہے۔ کہ تعمیر کعبہ کے وقت اسی پتھر کے ذریعہ سے حضرت ابراہیم نے استادہ ہو کر کعبہ کی اونچی دیواروں کا کام پورا فرمایا تھا۔ اور اختتام تعمیر کے بعد پھر اپنے مبارک ہاتھ سے اسکو دیوار کعبہ میں نصب فرمادیا۔ اہل اسلام آجتک اس کے استیلام کو ارکان حج میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور اس کا یہ احترام حقیقتاً اس شعر کا پورا مصداق معلوم ہوتا ہے ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

خانہ کعبہ زاد اللہ شرفاً کے تمام متعلقات کو کافی اور کامل تفصیل سے بیان کر کے ہم اپنے آیندہ سلسلہ بیان میں حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کے حالات۔ اور اونکی سکونت کے مختلف مقامات کو بیان کرتے ہیں

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے اور اُن کے نام یہ ہیں۔

نبایوت[1]۔ قیدار[2]۔ ادبئیل[3]۔ مبسام[4]۔ مشماع[5]۔ دومہ[6]۔ مسا[7]۔ حدد[8]۔ تیما[9]۔ یطور[10]۔ نافیش[11]۔ قیدمہ[12]۔

انمیں سب سے بڑے بیٹے نبایوط اور ان سے چھوٹے قیدار تھے۔ اور یہی دونوں آیندہ تاریخ عرب میں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں یہ تمام بھائی باپ کے زمانے میں اور ایک عرصہ بعد تک حجاز ہی میں آباد رہے اور چچازاد بھائی کے بیٹوں یعنی فرزندان مدائن کے ساتھ ملکر یمن و حجاز سے شام و مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبو

چیزوں کی تجارت کرتے تھے (تکوین باب ۳۷ آیت ۲۶)

خوشبو کی چیزیں یمن سے حجاز کی راہ سے مصر و شام کو جاتی تھیں شام اور یمن کے بیچ میں درمیانی منزل شہر مکہ تھا۔ اس لئے بنو اسمٰعیل تجارت میں بہت جلد فروغ حاصل کرسکے ہونگے۔ بنو اسرائیل اسماعیلیوں کو کبھی اسماعیلی اور کبھی ماں کی نسبت سے ہاجری کہتے ہیں اور توراۃ میں اپنی ناموں سے انکا ذکر ہے۔ بنو اسمٰعیل کا توراۃ میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم کے پوتے یعقوب علیہ السلام کے زمانہ میں (تقریباً ۲۰۰۰ ق م) تجارت کی حیثیت سے نام آیا ہے۔ حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف کو بھائیوں نے ایک کنوئیں میں ڈالدیا تھا۔ اتفاقاً ایک کارواں کا گذر ہوا جس نے یوسف کو کنوئیں میں سے نکالا۔ اور مصر میں ایک امیر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ کارواں اسمٰعیلی اور مدیانی تھے تاریخ میں تجارت کا یہ سب سے پہلا قافلہ نظر آتا ہے (تکوین باب ۳۷)۔

حضرت موسیٰ کے عہد میں (تقریباً ۱۵۰۰ ق م) بنی اسمٰعیل تمام حجاز میں یمن (حویلہ) سے شام (شور) تک پھیل گئے تھے (تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸) حضرت موسیٰ کے بعد قضاۃ بنی اسرائیل کے زمانہ میں (تقریباً ۱۳۰۰ ق م) وہ عمالیق و مدین کے پہلو بہ پہلو بیابانہ جوہر کے ساتھ بنی اسرائیل پر چھاپہ مارتے ہوئے نظر آتے ہیں سات برس کامل تک متصل بنی اسرائیل اسماعیلیوں کے پنجہ میں گرفتار رہے سالمیں جب فصل تیار ہوتی۔ اسمٰعیلی برق و باد کی طرح آتے اور سب کاٹ کرلیجاتے آٹھویں برس بنی اسرائیل میں جدعون نامی ایک پہلوان پیدا ہوا۔ اُسنے اسمٰعیلیوں کو شکست فاش پہنچائی (قضاۃ ۷-۸)

اس زمانہ میں بنی اسمٰعیل کا نہایت دولتمند قوموں میں شمار تھا۔ کانوں میں مرد سونیکے زیور پہنتے تھے۔ اونٹوں کے گلے میں سونے کے قلادے ڈالتے تھے اس جنگ میں بنی اسرائیل کو جو مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اسمیں صرف کان کے زیوروں کے سونیکا وزن ایکسو ستر۱۱ سو مثقال تھا (قضاۃ باب ۸- آیت ۲۶)

شاؤل (طالوت) کے عہد میں (غالباً ۱۰۵۰ ق م) بنو اسمٰعیل حجاز سے نکلکر بادیۂ شام اور بادیۂ عراق میں پھیل گئے تھے۔ عموماً مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مکہ اور حجاز میں جب اسمٰعیل کی اولاد بہت زیادہ ہوگئی تو نجد و حدود عراق وغیرہ ممالک پھیل گئی (معارف ابن قتیبہ و سیرت ابن ہشام) اسکی تائید روایات یہود سے بھی ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں بنی اسرائیل کا ایک ٹکڑا بھی نہر فرات کے قریب بادیہ عراق میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ آخر بنو ہاجرہ سے سامنا ہوگیا۔ بنی اسرائیل نے لڑکر بنو ہاجرہ کو نکال دیا اور اون کے خیموں میں جاکر خود آباد ہوگئے۔ (ایام باب ۵- آیت ۱۰)

سو اقعہ کو چالیس برس بعد بنو اسمٰعیل و بنو ہاجرہ شمالی عرب و حدود شام کے قبائل سے متحد ہو کر حضرت داؤدؑ کے عہد میں (غالباً ۱۰۰۰ ق م) بنی اسرائیل پر حملہ کی تیاریاں اور مشورے کر رہے ہیں۔ (زبور باب ۸۳ آیت ۵ و ۶) ۱۰۰۰ ق م میں جلعاد اور حدود شام میں جنگ آزما اسرائیلی دوبارہ بنو ہاجرہ سے برسر مقابلہ ہوتے ہیں اور ان کو شکست دیتے ہیں۔ مال غنیمت میں انکو پچاس ہزار اونٹ۔ ڈہائی لاکھ بکریاں۔ دو ہزار گدھے اور ایک لاکھ قیدی ہاتھ آئے (۲۔ ایام باب ۵ آیت ۲۰-۲۱) اسکے بعد ۶۰۰ ق م میں وہ زمانہ آتا ہے۔ جب بنو خذ نذر (بخت نصر) آندھی کیطرح اسیریا سے اوٹھتا ہے۔ اور تمام شام و عرب کی خاک اڑا دیتا ہے۔

اور پھر ہمیشہ کیلئے بنو اسرائیل اور آل اسمٰعیل کی مخاصمانہ حوصلہ مندیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ بنو اسمٰعیل کی اجتماعی تاریخ تھی اب تفرق و انتشار کے بعد ہر ایک کی اولاد و نسل کی تاریخ کے متعلق ہمکو جو کچھ معلوم ہے علیحدہ علیحدہ ترتیب سے بہت و اختیار لکھتے ہیں

(ملخص از کتاب ارض القرآن جلد دوم ص ۵۷-۵۸)

(۱) **ادبیام ابن اسمٰعیل** انکے اور انکے خاندان کے متعلق کوئی حالات نہیں معلوم ہوتے۔ محققین یورپ بھی تلاش و فکر سے تھک گئے ریورنڈ مسٹر فارسٹر (REVD MR FORESTOR) لکھتے ہیں اس اسمٰعیلی شخص کے نام و نسل کے آثار بہ نسبت اسکے اور بھائیوں کے کمتر اور بالکل ضعیف ہیں۔ پورا نام نہ قدیم جغرافیہ عرب ملتا ہے اور نہ جدید جغرافیہ میں (فارسٹر جغرافیہ عرب ج ۱ ص ۶۸)

(۲) **اوبایل ابن اسمٰعیل** عرب مورخین کو اسکے متعلق کوئی واقفیت نہیں توراۃ میں اسکا کہیں ذکر نہیں ہے فارسٹر کا بیان ہے کہ یہودی مورخ یوسیفوس نے لکھا ہے کہ یہ اسمٰعیلی آبادیوں یعنی (نیل و فرات) کے درمیان خاندان آباد تھا۔ (جغرافیہ عرب ج ۱ ص ۲۷۴)

(۳) **مشماع ابن اسمٰعیل** عبرانی اسکو شماع لکھتے ہیں۔ یونانی ترجمہ توریت میں تسما لکھا ہے یوسیفوس نے مسماؤس لکھا ہے۔ اور بطلیموس نے مسمانیس قرار دیا ہے۔ عرب اسکی اولاد کو بنی تسما کہتے ہیں۔ اور یہ امر محقق ہے کہ یہ قبیلہ نجد کے قریب آباد تھا (فارسٹر جغرافیہ عرب ج ۱ ص ۲۸۵)

(۴) **مسا ابن اسمٰعیل** یونانی اور عرب جغرافیہ نویسوں کی شہادت کی بنا پر حدود عراق میں اس خاندان کے آثار نظر آتے ہیں۔ پلینی (رومن مورخ نے میسائی (MiSAiE) اور بطلیموس نے میسانی (MASANi) کے نام سے ان اطراف میں بعض قبائل کا ذکر کیا ہے۔ (فارسٹر ج ۱ ص ۲۸۵)

عرب جغرافیہ نویسوں میں سے ذکریا قزوینی بیشان نام ایک مختصر آبادی کا کہیں پتہ دیتا ہے (آثار البلاد قزوینی صفحہ ۳۰۸) یاقوت حموی اسی مقام پر واسطہ و بصرہ کے مابین میسان نام ایک شہر کا ذکر کرتا ہے۔ یہودی اس شہر کا

نہایت احترام کرتے ہیں اور اسکو حضرت عزیزؑ کا مدفن قرار دیتے ہیں عہد اسلام میں بھی زیادہ تر یہاں یہودیوں کی آبادی تھی۔ (معجم البلدان ج ۸ ص ۴۴۲ مصر) سفر ایام حن مینو ہاجرہ کا بادیہ عراق میں ذکر کیا ہے شاید وہ یہی خاندان ہو۔ (۲ ایام باب ۵ آیت ۱۲)

تسما کے متعلق سید صاحب خطبات میں تحریر کرتے ہیں کہ مسٹر فارسٹر نے غلطی سے انکی سکونت عرب کے حصہ الجزائر میں بتلائی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً یہ اور انکی اولاد علاقہ یمن میں جاکر آباد ہوئی اور یمن کا مشہور و معروف مقام موسا انہیں کے آثار قدیمہ کا یادگار ہے۔ لیکن اسانید مذکرہ بالا کے رُو سے تو مسٹر فارسٹر صاحب نے نہیں غلطی کی ہے۔ بلکہ سید صاحب کو خود دھوکا ہو گیا ہے۔

(۵) حدر یا حدد ابن اسمٰعیل سفر تکوین میں اسکا املا حدر اور سفر ایام میں حدد ہے حدر کے آثار عرب میں متعدد جگہ پائے جاتے ہیں۔ تیما کے پاس حدد نام ایک پہاڑی ہے نجد میں بھی ایک قطعہ زمین کا نام حدد ہے۔ معجم البلدان ج ۳ ص ۲۳۲ جوہری نے بحوالہ ایک قبیلہ کا نام بھی حدد بتلاتا ہے نیو بھر (Niebuhr) او منسوب حدی کا ایک یورپین سیاح عرب شہر حدیدہ واقع یمن کو بھی اسی حدد سے متعلق سمجھتا ہے۔ لیکن مشرقی نگاہ میں حدد اور حدیدہ میں نہایت عظیم فرق ہے لیکن اسکا کیا جواب ہے کہ عربی مورخ زبیری اور مسٹر فارسٹر دونوں اس قول پر متفق ہیں کہ شہر حدیدہ آجتک اوسکی یادگار ہے۔ (خطبات احمدیہ)

(۶) یطور ابن اسمٰعیل یطور۔ ساؤل کے زمانے میں (۱۰۵۰ ق م) حدود شام کے صوبہ حوران میں نظر آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی جماعت سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں (سفر ایام باب ۵ آیت ۱۲) لیکن یونانی جغرافیہ نویس اسٹرابو (۲۴ء ق م) تک انکی یادقائم رہتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

وہ تمام سلسلہ کوہ جو لبنان اور بحر کے درمیان نظر آتا ہے عربوں اور یطوریوں سے آباد تھا (فارسٹر ج ا ص ۲۱) یونانی میں یطور جسیطور ہوگیا ہے اس بنا پر برکھارڈ (Buskhard) ایک یورپین سیاح شام کے شہر جیدور کو اسی جسیطور سے نسبت دیتا ہے (فارسٹر ج ا ص ۳۱۰) یہ شہر مشرقی جغرافیہ نویسوں سے بھی مخفی نہیں (معجم البلدان ج ۳ ص ۴۶) لیکن اگر جیدور ہی کو یطور کا مسکن قرار دینا ہے تو یہی نام ہمکو حجاز میں مدینہ منورہ کے چھ میل کی مسافت پر نظر آتا ہے۔ لیکن ایک عام فہم مشرقی بھی جانتا ہے کہ یطور کی شکل کسی صورت میں جدور نہیں ہو سکتی

(۷) یافیش ابن اسمٰعیل سفر ایام ثانی باب ۵ آیت ۱۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ یطور کے ساتھ یہ خاندان بھی حوران ہی میں آباد تھا۔ اور بنی اسرائیل کے مقابلہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شریک تھا۔

(۸) **دوماہ ابن اسمٰعیلؑ** - اِس خاندان کا مسکن اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ دومۃ الجندل شمالی عرب میں مدینہ و شام کے درمیان ایک مشہور مقام ہے عرب جغرافیہ نویسوں نے تصریح کی ہے کہ دومۃ الجندل اسی دوما کی طرف منسوب ہے۔ پچھلے زمانہ میں یہاں نصاریٰ آباد تھے (معجم ج ۴ ص ۱۰۶)

(۹) **تیما ابن اسمٰعیل** حدود عرب و شام میں اِس خاندان کے انتساب سے ایک قدیم آبادی ہے ایوبؑ نبی کے زمانہ میں اِس خاندان کو کسیقدر فوجی اہمیت حاصل تھی (سفر ایوب ۶-۱۹) میں تیما کے سواروں کا ذکر ہے اشعیاہ نبیؑ نے بھی (رشتہ قوم میں) سرزمین تیماء کا نام لیا ہے (۲۱-۱۴) زمانہ اسلام میں یہاں یہود آباد تھے۔

---

(۱۰) **قیدماہ ابن اسمٰعیل** فارسٹر صاحب نے قیدماہ کو کاظمہ (واقع خلیج فارس) کا مرادف سمجھا ہے اور اسلئے اوسکو خلیج فارس پر جگہ دیتے ہیں کاظمہ یقیناً انگریزی لب و لہجہ میں "کیڈما" ہو جائیگا لیکن ہر شرقی لب و لہجہ کا واقفکار اسپر ہنس دیگا کہ قیدماہ اور کاظمہ ایک چیز ہے قرآن مجید میں ایک قبیلہ کا نام اصحاب الرس مذکور ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ قیدماہ ہی کا نام اصحاب الرس تھا۔ ہمارے ہاں مفسرین اصحاب الرس کی تعیین میں نہایت مشکوک الرائے ہیں۔ امام طبری نے ارباب روایت کی تین رائیں نقل کی ہیں۔

(۱) رس کنوئیں کو کہتے ہیں ایک اُمت نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں ڈالدیا تھا۔ اسلئے اوسکو اصحاب الرس کہتے ہیں

(۲) رس ملک آذربائیجان کی پار ایک آبادی کا نام ہے (شاید روس سے مقصد ہو) (۳) رس غار کو کہتے ہیں اِس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں لیکن مورخ مسعودی بلاتزلزل رائے لکھتے ہیں۔

اصحاب الرس کانوا من ولد اسمٰعیل وھم قبیلتان یقال لاحدھما قدمان والاخری یامین و قیل دعویل وذلک بالیمن (مروج الذھب)

اصحاب الرس بنو اسمٰعیلؑ تھے اور اونکے دو قبیلے تھے۔ ایک قدمان کہلاتا تھا اور دوسرا یامین بعضوں نے اسکو رعویل بھی لکھا ہے اور یہ یمن میں تھے

قدمان قیدماہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اصحاب الرس کا اسکے علاوہ کوئی اور حال نہیں معلوم قرآن مجید نے دو مقام پر اصحاب الرس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کوئی حال بیان نہیں کیا صرف گنہگار قوموں کی فہرست میں اُنکا نام آیا ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ (فرقان)

عاد ثمود اور اصحاب الرس کو

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ

انسے پہلے نوحؑ کی قوم اصحاب الرس اور ثمود نے جھٹلایا۔

اصحاب الرس کا بنو اسمٰعیل ہونا ثابت ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ ان کا اُمت مذموم ہونا بھی ظاہر ہو گیا ان اسناد و اشہاد سے ہمارے اُس استدلال کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے جسکو ہم ابھی ابھی حضرت ابراہیم

علیہ السلام کے حالات میں آپکی اس دعا کے متعلق لکھ آئے ہیں۔ کہ اونکی تمام اولاد و ذریات میں امامت اور پیشوائی امت کا منصب تفویض فرمایا جاوے جسکے جواب میں خداوند عالم نے وَاللّٰهُ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ارشاد فرماکر۔ اہل نااہل۔ عادل او ظالم کی تفریق و تخصیص ظاہر فرمادی اور حضرت ابراہیم پر حقیقت حال کا صاف صاف انکشاف فرمادیا گیا۔ کہ آپ کی دعا آپ کی اولاد و ذریات میں فرق وات عادلین کیلئے مستجاب کیجاتی ہے۔ غیر عادلین اور ظالمین کے لئے نہیں۔ اسی سے سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس منصب عظیم میں تعمیم کا معمول قائم ہوتا۔ تو اصحاب الرس جو بلا شبہ و کلام ذریات و اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ قوم ظالمین اور گروہ کافرین میں نہ شمار کئے جاتے۔

(۱۱) بنا یوط یا نبط یا نابت ابن اسمعیل ع (اصحاب الحجر)

نبایوط کو اہل عرب عموماً نابت کہتے ہیں ان کی روایتوں کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسمعیل کے بعد سب سے بڑے بیٹے نابت کے حصے میں آئی (اخبار الدول ابوحنیفہ دینوری حیات القلوب ملا مجلسی) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبایوط نے حجاز ہی میں قیام کیا لیکن بعض حوالوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فرزندان نبایوط عراق میں موجود تھے لیکن اصل یہ ہے کہ بدو مانہ زندگی کے ساتھ وہ حجاز سے عراق تک خانہ بدوشانہ پھیلے ہوں گے"

تحریری حیثیت سے نبایوط کا نام ساتویں صدی ق م میں نظر آتا ہے۔ خرقیال نبی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ نبایوط کی بھیڑیں نذر لیجائینگی۔ (۶۰-۷) اشور بانیپال اسیریا کا بادشاہ جسکا یہی تقریباً یہی زمانہ ہے اپنے مفتوحین کی فہرست میں نباطی قوم کا نام لیتا ہے۔ یوسیفوس یہودی جو پہلی صدی مسیحی میں تھا لکھتا ہے۔

ملک بحر احمر (حجاز) سے نہر فرات (عراق) تک اسمعیل کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے اس کا نام ملک نباطینہ پڑ گیا ہے (حوالہ آتا ہے)

اسی زمانہ میں جب رومی شام پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو نبطی عربوں سے اونکی مڈبھیڑ ہوتی ہے اور شام و عرب کے حدود پر اون کی ایک عظیم الشان حکومت نظر آتی ہے۔ اہل عرب بھی ان نبطیوں سے واقف تھے اسی لفظ نبط کی جمع عربی میں انباط ہے۔

انباط اور روایات عرب۔ مورخین عرب فرزندان نبایوط یا انباط سے واقف نہیں ہیں۔ وہ صرف انباط کے نام اور اون کے مسکن تخمینی سے البتہ واقف ہیں۔ انکا نام کبھی نبط اور کبھی ارامی بتلاتے ہیں اور انکا مسکن شام و عراق ظاہر کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے لکھا ہے "

واول ملك العرب بالشام فيما علمناه للعمالقه ثم لبنى ارم بن سام ويعرفون بالارمانيين	جہانتک ہمکو معلوم ہی عربونکی پہلی حکومت شام میں عمالقہ کی تھی۔ پھر ارم بن شام کی جو ارمانی کے نام سے زیادہ ترمشہور ہیں

اس عبارت کے ساتھ حمزہ اصفہانی کی عبارت ذیل ضم کرو۔

الارمانيون نبط الشام والاردوانيون نبط العراق	ارمانی شام کے نبطیوں کا نام ہی اور اردوانی عراق کی نبطیوں کا

انباط نے چونکہ ایک متمدن وغیر بدوی زندگی اختیار کرلی تھی اسلئے عربوں کے محاورہ میں

اما النبط فكل من لم يكن راعيا او جنديا عند العرب من ساكني الارضين (ياقوت ع ۱۴۳ ج ۲۳)	نبط عرب کے نزدیک ہر وہ شخص ہے جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو۔

اہل عرب عموماً نبط کو اصلاً وقوماً غیر عرب سمجھتے ہیں انکے نزدیک عرب وعجم جسطرح دو متقابل نام ہیں اوسیطرح نبطی وعربی کو بھی باہم متقابل سمجھتے ہیں۔ اوسکا سبب صرف معاشرت۔ طرز زندگی اور زبان کا اختلاف ہے۔ ورنہ درحقیقت نبط بھی اسمٰعیلی عرب ہیں۔ لیکن چونکہ اونھوں نے عموماً حدود عرب اور حدود عرب سے باہر غیر قوموں میں اپنا مسکن اختیار کیا۔ اسلئے وہ اپنا نسب نامہ محفوظ نہ رکھ سکے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں

تعلموا النسب لا تكونوا كنبط السواد اذا سئل احدهم عن اصله قال من قرية كذا (عقد الفريد ج ۳ ص ۳۷)	نسب نامہ سیکھو۔ عراق کی نبط کیطرح نہ بنجاؤ کہ جب اونمیں سے کسی سے پوچھا جائے تم کس خاندان کے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں"

ہمارے مورخین کے معلومات انباط کیمتعلق صرف اسی قدر ہیں لیکن انباط کی خود معاصر قوموں نے ان کے حالات کو سیاسی تعلقات کی بنا پر بہت کچھ محفوظ رکھا ہے اور اب اکتشافات اثریہ نے بھی ان معلومات میں کسی قدر اضافہ کردیا ہے۔

انباط اور نبایوط اور نابت کا ترادف

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ انباط جنکی تاریخ کا مفصل تذکرہ یونانی اور مورخین نے کیا ہے اور نبایوط پسر اسمٰعیل جنکا توراۃ میں ذکر ہے اور نابت بن اسمٰعیل جنسے عربوں کو ہم نسبی کا دعویٰ ہے۔ کیا درحقیقت ان مختلف الفاظ سے ایک ہی مفہوم مراد ہے۔ ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ اہل عرب نباط کو عربوں سے الگ الگ بیرونی قوم سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت ایک مدت تک کے تباعد اور تفرق کا نتیجہ ہے جن یونانی اور رومی مورخین نے انباط کا ذکر کیا ہے۔ اونھوں نے متفقاً ان کو عرب لکھا ہے سب سے بڑی معتبر شہادت یہودی مورخ یوسیفوس کی ہے جو انباط کا معاصر اور نسل وطن کے اعتبار سے بھی

اونکے قریب تھا اسلئے یقین ہے کہ اونکے متعلق اونکی شہادت پایۂ اعتبار سے ساقط نہوگی وہ تصریح تمام لکھتا ہے کہ انباط اسمٰعیلی عرب از نسل نبایوط ہیں (حوالہ آتا ہے) مورخ طبری بھی لکھتے ہیں۔

ومن نابت وقیدار نشر اللہ العرب۔ قوم عرب کے نابت اور قیدار کی نسل سے خدا نے پھیلایا (ج ا ص ۳۵۲)

یاقوت حموی نے (لفظ عربیہ کے تحت میں ایک نئی بات لکھی ہے کہ عرب ہر اوس قوم کو نبط کہتے ہیں جو کلہ بان اور سپاہی نہو دوسرے الفاظ میں اسکا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو غیر بدوی زندگی بسر کرتی ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نبطا نے اعراق کے تاثر سے متمدن زندگی اختیار کر لی تھی۔ اسلئے بادیہ نشینان عرب نے ہر غیر بدوی قوم کو نبط کا مرادف سمجھ لیا۔

حضرت علی ع سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اونکا نسب نامہ پوچھا تو اونھوں نے کہا کہ ہم کوثی (واقع عراق) کے نبط ہیں۔ اور بالاتفاق معلوم ہے کہ وہ اسمٰعیلی قرشی (ہاشمی) عرب تھے اس سے ثابت ہوگا کہ نبط اسمٰعیلی عرب ہیں۔ جو عراق تک پھیلے تھے۔

نابت کی بقیہ اولادیں خود اندرون ملک میں بھی تھیں۔ اور متعدد وجوہ سے ہماری یہ رائے ہے کہ عرب شمال کی وہ اکثر قومیں جو غلطی سے قحطانی کہلاتی ہیں وہ دراصل نبطی ہیں منجملہ دیگر قبائل کے غسان اور اوس وخزرج کے متعلق تو بتصریح ثابت ہے کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ نابتی ہیں بتفصیل آتی ہے

انباط کا عہد حکومت انباط ایک مدت تک دیگر قبائل عرب کیطرح بحر احمر سے لیکر فرات تک مستقل واودیوں میں بدویانہ زندگی کیساتھ آوارہ پھرتے رہے اس بدویت کا زمانہ ۲۰۰۰ ق م میں (عہد اسمٰعیل) سے ۸۰۰ ق م تک قرار پاتا ہے۔ توراۃ نے نبایوط کا فرزندان اسمٰعیل کے ۱۸۰۰ ق م میں پہلی بار نام لیا ہے۔ اور آخر آخر قیال نبی نے جو کم وبیش ۶۰۰ ق م میں تھے۔ نبایوط کا ذکر کیا ہے کہ نبط (نبایوط) کی بھیڑیں نذر لیجائیں گی (۶۰-۷)

کتبات میں نبط کا نام اشور بانیبال۔ شاہ اسیریا کے کتبہ میں تقریبًا اسی عہد یعنی ۶۰۰ ق م میں نظر آتا ہے وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں نامان۔ شاہ نبط کا ذکر کرتا ہے (تاریخ بابل) راجرس امریکانی جلد دوم صفحہ ۶۷) خرقیال کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبط اوسوقت چوپانی یعنی بدوی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن یہ اسیری کتبہ ایک نبطی حکومت کی اس عہد میں خبر دیتا ہے ممکن ہے کہ بادشاہ مقصود کوئی نبطی بدوی شیخ ہو بہر حال نبطی کی تاریخ از روئے تاریخ یونانی وکتبات نبطی سے ۳۰۰ ق م سے پہلے روشن نظر نہیں آتی۔ آخری تاریخ ۱۰۶ء ق م ہے۔ جبکہ رومی حکومت ان کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

انباط کا رقبہ وحکومت۔ انباط کی حکومت کے حدود اولاً وہ قطعہ ملک تھا جس کو یونانی عرب

سنگستان (ARABIA PATERIA) کہتے ہیں۔ اور عبرانی ادوم اور سعیر (سراۃ) یعنی خلیج عقبہ سے بحیرت تک ڈائیڈورس (DIEDORIUS ۸۰ ق م) بیان کرتا ہے۔ کہ انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں۔ اسٹرابو (STRABO ۲۴ء) ایک ضمنی تذکرے میں کہتا ہے۔ کہ اہل ادوم انباط میں (گولڈ مائنس آف مدین ص ۲۲۵)۔ لیکن ادوم سے آگے بڑھ کر اب وہ عرب آبادان پر بھی قابض ہوگئے تھے۔ مصنف مذکور لکھتا ہے۔ کہ اہل ادوم وسبائی جو شام کے اوپر واقع ہیں جنہوں نے عرب آبادان (ARABIA FLEX) پر قبضہ کیا ہے۔ یوسیفوس جو پہلی صدی مسیحی میں تھا۔ بیان کرتا ہے۔ کہ اس عہد میں وہ عربستان ریگستان (ARABIA DESERT) تک پھیل گئے تھے۔ اس کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

ملک بحر احمر سے نہر فرات تک اسماعیل کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں تھا۔ جن کے سبب سے اسکا نام ملک نباطینہ (NABATINA) پڑ گیا ہے۔ اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان PETRIA سے مل گئی ہے۔ اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے۔ جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہوتی ہے عموماً اس ملک کے باشندوں کا نبایوط (NEBAJATH) عرب ہے۔ (انٹی کوئٹی ج ۱ ص ۱۲)

ان شہادتوں سے ظاہر ہوگا۔ کہ انباط کا ملک مغرب میں بحر احمر اور مشرق میں خلیج فارس تک وسیع تھا۔ اور اس کے درمیان تمام ممالک یعنی عرب سنگستان و عرب ریگستان و بعض قطعہ عرب آبادان پر قابض تھے۔ لیکن اس طویل و عریض ملک میں انباط کی اصل آبادی خلیج عقبہ (ایلہ) کی اطراف میں تھی۔ ڈائیڈورس کا بیان ہے۔

اوپر گذرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) (LAINAITIES GULF) میں داخل ہوگے۔ جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط (NABATAISI) کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف سواحل کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ بلکہ وہ اندرون ملک میں بھی دور تک پھیل گئے ہیں۔ کیونکہ زمین آباد اور نہایت سرسبز ہے۔

(گولڈ مائنس آف مدین ص ۱۸۲)

تفصیل کے ساتھ ملک انباط کے دس شہروں کے نام یوسیفوس (انٹی کوئٹی ۱۴ باب ۱ سیکشن ۴) میں مذکور ہے۔ لیکن یونانی تلفظ نے عربی رنگ و روغن ان کے چہروں سے بالکل اڑا دیا ہے۔ وہ شہر یہ ہیں۔ میدآبہ۔ نبالو لبیس۔ ترابسہ۔ اغالہ۔ اثوان۔ صوری۔ اوروان۔ مریسہ۔ رودہ۔ لوتسہ۔ عروبہ۔ ان کے علاوہ رقیم (پیٹرا) اور حجر مشہور شہر تھے

انباط کا دار الحکومت۔ انباط کا ملک جن حدود پر مشتمل تھا۔ وہ حقیقت میں تین قدیم ممالک کا مجموعہ

تھا۔ ملک ثمود (وادی القریٰ) جسکا دار الحکومت حجر تھا۔ ملک مدین جسکا پایہ تخت خاص شہر مدین تھا اور ملک ادوم جسکی حکومت کا مرکز شہر رقیم تھا۔ (پٹرا) انباط کا پایہ تخت پہلے شہر رقیم تھا۔ (پٹرا) جہاں اب تک اُن کے آثار باقی ہیں۔ لیکن پہلی صدی ق م میں جب رومیوں نے مصر و شام پر قبضہ کیا۔ تو رفتہ رفتہ وہ پٹرا (رقیم) پر بھی قابض ہوگئے۔ اسٹرابو (سنہ ۲۴ء) بیان کرتا ہے۔ کہ اب (سنہ ۲۴ء) انباط اور شامی دونوں رومیوں کی رعایا ہیں۔ (گولڈ مائنس آف مدین ص ۱۸۲) اِس مفتوحی سے مقصود پٹرا یعنی رقیم کی فتح ہے۔ ورنہ نفسِ حکومت تو سنہ ۱۰۶ء تک باقی تھی۔ پٹرا (رقیم) سے ہٹ کر انباط نے اب حجر کو اپنا مرکز قرار دیا تھا۔ جو ملک ثمود میں واقع تھا۔ اسی لیے قرآن میں ان کو اصحاب الحجر سے یاد کیا ہے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

حجر جس صوبہ ملک میں واقع ہے۔ عربوں کے ہاں اُسکا نام وادی القریٰ ہے۔ اِس کے لفظی معنی آبادیوں کی وادی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ میدان عہد قدیم میں نہایت کثرت سے آباد تھا۔ اِس کی تصدیق اب معاصر مؤرخین کی روایتوں سے بھی ہوتی ہے۔ ابھی ڈائیڈورس کا بیان گذر چکا ہے۔ جو کہتا ہے۔ کہ حدود ایلیہ پر انباط کی بہت سی آبادیاں ہیں۔ اور وہ نہایت کثرت سے آباد ہیں۔ اسٹرابو بھی انباط کی نہایت گنجان آبادی کا ذکر کرتا ہے۔ (کتاب مذکور ص ۱۸۴)

شاہانِ انباط۔ اشوری کتبہ کی شہادت کی بنا پر گو شاہانِ نبط کا ابتدائی سلسلہ سنہ ۷۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ ناتان۔ شاہ انباط۔ بادشاہِ اسیریا۔ اشوربانیپال کی خدمت میں نذر پیش کرتا ہے۔ (تاریخ بابل راجرس ج ۲ ص ۲۷۶) لیکن یونانی تاریخ اور موجودہ نبطی آثار اور سکے سنہ ۳۰۰ ق م سے پہلے کسی نبطی بادشاہ کا ذکر نہیں کرتے۔ اِس کے اسباب بھی واضح ہیں۔ یونانیوں کو اِس سے پہلے انباط سے سروکار نہ تھا۔ اور نہ خود انباط اِس سے پہلے متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔

بہرحال۔ تاریخ و آثار نے اب تک جو انکشاف حال کیا ہے۔ اُس کی اعانت سے اب تک ڈوسے DASSAU نام ایک فرنچ مستشرق نے ان بادشاہوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی ہے (فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل سنہ ۱۹۰۷ء) یہ فہرست سنہ ۱۶۹ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۱۰۶ء میں ختم ہوجاتی ہے اِس میں ایک نام مالک اوّل کا اضافہ ہم خود یوسیفوس کے حوالے کرتے ہیں۔ (قدامت یہود کتاب ۱۳ باب ۵ بند)

نمبر	نام بادشاہ	سال حکومت	
۱	حارث اوّل	سنہ ۱۶۹ ق م	مالک چہارم سنہ ۷۰ء سنہ ۱۰۶ء
۲	زید بابل	سنہ ۱۴۶ ق م	

۳	مالک اوّل	سنہ ق م	
۴	حارث ثانی	سنہ ۱۱۰ ق م سنہ ۹۶ ق م	
۵	عبادۂ اوّل	سنہ ۹۰ ق م	
۶	ربیال اوّل بن عبادۂ اوّل	سنہ ۸۷ ق م	
۷	حارث ثالث بن ربیال	سنہ ۸۷ ق م سنہ ۶۲ ق م	
۸	عبادۂ ثانی بن حارث ثالث	سنہ ۶۱ ق م سنہ ۴۷ ق م	
۹	مالک دوم بن عبادۂ ثانی	سنہ ۴۷ ق م سنہ ۳۰ ق م	
۱۰	عبادۂ ثالث بن مالک دوم	سنہ ۳۰ ق م سنہ ۹ ق م	
۱۱	حارث رابع بن مالک دوم	سنہ ۹ ق م سنہ ۴۰ ع	
۱۲	خلدو (خالدہ) زوجہ حارث		
۱۳	شقیلہ زوجہ حارث		
۱۴	مالک سوم بن حارث	سنہ ۴۰ ع سنہ ۷۵ ع	
۱۵	شقیلہ زوجہ مالک		
۱۶	ربیال ثانی بن مالک ثانی	سنہ ۷۵ ع سنہ ۱۰۱ ع	
۱۷	جمیلہ زوجہ ربیال		

انباط کے تمدنی حالات۔ ہر شائستگی کی ابتدا عہد بداوت ہے۔ انباط کی ابتدائی زندگی عام قبائل عرب کی سادہ اور غیر مصنوع زندگی تھی۔ جن کی دولت کا تنہا خزانہ مواشی تھی۔ (حزقیال۔ ۴۰-۷) لیکن جب غربی قوموں نے انہیں اپنے تمدن و شائستگی کے بل پر شکست دینی چاہی۔ تو ان کو مجبوراً متمدن بننا پڑا۔ مورخین یونان میں سے ڈائیڈورس (سنہ ۸۰ ق م) اور اسٹرابو (سنہ ۲۴ ع) نے انباط کے آداب معیشت و تمدن کو سب سے بہتر بیان کیا ہے۔

وہ یعنی انباط کھلی ہوا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ناقابل سکونت صحرا میں رہتے ہیں۔ اُنکے ملک میں نہ کوئی دریا ہے۔ اور نہ چشمہ جس سے حملہ آور دشمن فائدہ اٹھا سکیں۔ اُنکا قومی آئین یہ ہے۔ کہ وہ نہ غلہ کی زراعت کریں۔ اور نہ درخت لگائیں نہ شراب پئیں اور نہ گھر بنائیں۔ جو شخص اسکے خلاف کرتا ہے۔ اُسکو سزائے موت دیجاتی ہے۔

بعض لوگ اونٹ کے گوشت پر بسر کرتے ہیں۔ اور بعض بھیڑ اور بکری کے گوشت پر۔ صحرا میں بہت سے قبائل رہتے

ہیں۔ لیکن دولت میں انباط سب سے زیادہ ہیں۔ اور اپنے ہمسایوں کا اُن کو امتیاز حاصل ہے۔ گو کہ اُن کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اُن کا ملک پانی سے بالکل خالی ہے۔ اپنے لیے پہاڑوں میں بڑے بڑے حوض کھود کر بناتے ہیں۔ جنکا منہ باہر سے تنگ اور اندر چوڑا رہتا ہے۔ اور اُن کی لمبائی ۲۵ فیٹ تقریبًا ہوتی ہے۔ ان حوضوں میں بارش کا پانی جمع کر کے اُن کو چھپا دیتے ہیں۔ اور اُن پر کوئی نشانی بنا دیتے ہیں۔ جب سفر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جانوروں کو تین روز کا پانی پلاتے ہیں۔ انباط گوشت دودھ اور بعض جنگلی سبزی کھاتے ہیں۔ جنگلی شہد (من) بھی اُنکو ملتا ہے۔ جس کو پانی میں گھول کر پیتے ہیں۔ ان میں عرب کے غیر نبطی قبائل بھی شامل ہیں۔ جن میں سے بعض شامیوں کے ساتھ گھر میں رہنے کے علاوہ اور تمام عادات میں مماثل ہیں۔ (فارسٹر جغرافیہ عرب ج ۱ ص ۲۲۶)

یہی مصنف پھر لکھتا ہے۔

آگے بڑھکر ہم خلیج ایلانۃ (عقبہ) میں داخل ہو گئے۔ جو اُن عربوں کے بہت سے گاؤں سے محدود ہے۔ جن کو لوگ نبطیہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف ساحلی مقامات کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ بلکہ وہ اندرون ملک میں بھی دور تک پھیلے ہیں کیونکہ یہ زمین آباد اور نہایت شاداب ہے۔

زمانہ سابق میں اپنے قوانین انصاف کے مطابق اپنے گلوں اور جانوروں پر مطمئن رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب اسکندریہ (مصر) کے یونانی بادشاہوں نے خلیج کو تجارت کے لیے جہاز رانی کے قابل بنایا۔ تو ان نبطیوں نے شکستہ جہازوں کے ملاحوں کو جمع کیا۔ اور چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر بحری ڈاکہ زنی کرنے لگے۔ آخرکار اُن پر حملہ کیا گیا۔ اور ان کے استحقاق کے مطابق اُن کو سزا دی گئی۔ (گولڈ مائینس ص ۱۸۳)

اسٹرابو (سنہ ۲۴ء) جو ڈائیڈورس کی طرح انباط کا معاصر تھا۔ ان کے متعلق دلچسپ واقعات بیان کرتا ہے۔

شہر پیٹرا (رقیم) جو عمدہ قوانین رکھتا ہے۔ اسپر شاہی خاندان میں سے ہمیشہ ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ وزیر ہمیشہ ہیں بادشاہ کے ساتھیوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کو بھائی کہکر پکارتے ہیں۔ انباط کفایت شعارانہ ذخیرہ ملکیت کے شائق ہیں۔ جماعت اُن پر جرمانہ کرتی ہے۔ جو اپنی دولت ضائع کرتے ہیں۔ اور جو اپنی دولت بڑھاتا ہے اُس کو انعام دیتی ہے۔ انباط کے پاس غلام کم ہیں۔ اکثر اُن کی خدمت اُن کے متعلقین کرتے ہیں۔ یا ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ یا ہر شخص اپنا نوکر آپ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بادشاہوں تک جاری ہے۔ جو جمہور کی رضامندی کے اسقدر آرزومند ہیں۔ کہ وہ اپنی رعایا کی خدمت کرتے ہیں۔ بادشاہ کو انتظام ملکی کے متعلق بیانات لوگوں کو دینے ہوتے ہیں۔ اور وہ اکثر اپنے بادشاہ کے ذاتی حالات و عادات بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔

لوگ غیر سرکاری صحبتوں میں تیرہ تیرہ آدمی ملکر کھاتے ہیں۔ بادشاہ بھی لوگوں کو بڑی بڑی دعوتیں دیتا ہے۔ اور شاہی

عمارتوں میں جشن دعوت بپا کرتا ہے۔ مہمانوں کی ہر جماعت میں دو مغنی رہتے ہیں۔ ہر مہمان کو گیارہ جام سے زیادہ شراب پینی ہوتی ہے۔ یہ جام سونے کے ہوتے ہیں۔ جُبّہ یا کرتہ پہنا یہ لوگ نہیں جانتے۔ کمر میں تہ بند لپیٹتے ہیں۔ پاؤں میں کھڑاؤں پہنتے ہیں۔ مکانات عالی شان اور سنگین ہیں۔ آبادیوں میں شہر پناہیں نہیں ہوتیں۔ ملک کا بڑا حصہ سرسبز ہے۔ تاہم وہاں زیتون نہیں۔ (جانوروں کی پیداوار کا بیان ہے)

گھوڑے نہیں ہوتے۔ اُن کے بجائے اُونٹ مصرف میں لائے جاتے ہیں۔ بعض اشیائے تجارتی کی درآمد بھی یہاں ہے اور بعض چیزیں خود ملک میں ہوتی ہیں۔ جیسے سُونا۔ چاندی اور بہت سے خوشبو سالے۔ لیکن لوہا۔ تانبا۔ ارغوانی کپڑے زعفرانی۔ عود۔ قسط۔ سنگ تراشی۔ نقاشی۔ اور تصویروں کی چیزیں۔ جیسے ملک میں نہیں پائے جاتے۔ انباط مردوں کی لاش کھاد کے لیئے بہتر سمجھتے ہیں۔ اسی لیئے وہ بادشاہوں تک کی لاشوں کو بھی زمین میں دفن کرتے ہیں۔ مذہبًا یہ سبائی دیوتا آفتاب کی پوجا کرتے ہیں۔ اس دیوتا کا ہیکل یا قربان گاہ مکانات کی چھتوں پر بناتے ہیں۔ اور اُس پر شراب چڑھاتے ہیں۔ اور اندر روز بخور جلاتے ہیں۔) گولڈ مائینس ص ۲۲۸)

سیاسی حالات۔ انباط ہم کو سب سے پہلے ۶۴۵ ق م میں سیاسی میدان میں نظر آتے ہیں۔ اسیریا اور بنی قیدار (برادران انباط) کے درمیان اس عہد میں جنگ برپا ہوتی ہے۔ بنی قیدار کا شیخ شکست کھا کر انباط کی چھوٹی سی ریاست میں پناہ لیتا ہے۔ پھر انباط اور بنی قیدار کی متحدہ فوج اسیریا کے مقابلہ میں آتی ہے۔ لیکن سوئے قسمت سے ناتان شاہ انباط گرفتار ہو جاتا ہے (راجرس تاریخ بابل جلد ۲ صفحہ ۲۷۶)

بابل کے بعد ایران و یونان کی قوت دُنیا کی تاریخ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انباط جہاں آباد تھے۔ یہ وہ مقامات تھے۔ جو اہل فارس اور یونانی کی دائمی جنگ کے طبعی راستے تھے۔ اس بنا پر دو فریق ان بطی عربوں کی دوستی اور ہمدردی کے طالب تھے۔ جن کی اعانت کے بغیر ان خشک و بے آب ریگستانوں کا طے کرنا ناممکن تھا۔

سکندر سے پہلے جو چوتھی صدی ق م کے اواسط میں تھا عمومًا اہل فارس کا پلہ یونانیوں سے بھاری تھا اس بنا پر شمالی عرب (جو اس عہد بنی لحیان میں تھے) میدان جنگ میں اہل فارس کے دوش بدوش تھے ۳۳۲ ق م میں سکندر نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ اور عراق سے لیکر مصر و شام تک اُس کے فتوحات کا جولان گاہ بن گیا۔ ہندوستان سے واپس آکر عرب کی فتح کا عزم تھا۔ کہ وہ خود موت کے ہاتھ مفتوح تھا۔ سکندر کے بعد ممالک مفتوحہ سکندر کے مختلف سرداروں میں منقسم ہوگئے۔ بطلیموس نے مصر و شام پر قبضہ کیا۔ انٹی گونس نے ایشیائے کوچک لیا۔ سیلوکس (سلاقس) نے بابل و فارس و ترکستان پر استیلا حاصل کیا۔ یہ تینوں بادشاہیاں بیچ میں حدود عرب پر آکر ملتی تھیں۔ انٹی گونس ایک بہادر تھا۔

بلند حوصلہ۔ اُس سے اپنی قسمت پر قناعت نہ ہو سکی۔ سب سے زرخیز اور قریب تر شام کا ملک تھا۔ اُس نے شام پر حملہ کرنا چاہا لیکن درمیان میں نبطی حائل تھے۔ اُن کو اپنا شریک بنانا ضرور تھا۔ لیکن وہ بطلیموس کے طرفدار پہلے ہی بن چکے تھے۔ نتیجہ جنگ و محاربہ تک پہونچ گیا۔

انٹی گونس نے ۳۱۲ ق م میں اپنے ایک سردار اتھیناوس ATHENAEUS کی سرکردگی میں ایک مہم روانہ کی جس نے گوے خبری میں رقیم (بٹرا) کو برباد کیا۔ لیکن اُسکا ایک سپاہی بھی دشمنوں کے ہاتھ سے بچکر واپس نہ آیا۔ ناچار انٹی گونس نے اپنے بیٹے ڈمیٹریوس DEMMITRIUS کی زیر قیادت ایک دوسری جماعت روانہ کی۔ بے سروسامان نبطی عرب میدان میں مقابلہ نہ کر سکے۔ اور قلعہ بند ہو گئے یونانیوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اِس قید سے تنگ آکر ایک دن ایک نبطی عرب نے ڈیمیٹریوس کو اِن الفاظ میں مخاطب کیا۔

اے بادشاہ ڈیمیٹریوس تم کس غرض سے اور کس کے حکم سے مجھ سے لڑتے ہو۔ ہم صحرا میں رہتے ہیں۔ جہاں پانی ہے نہ غلہ ہے۔ نہ شراب ہے۔ اور نہ ضرورت کی کوئی چیز ہے۔ صرف ہم نے اپنی آزادی کی خاطر اِس صحرا کی سکونت اختیار کی ہے اور تمام آسائش کی چیزیں دوسروں کے لیے چھوڑ دی ہیں۔ اور ہم نے اِس حیوانی زندگی پر قناعت کی ہے۔ تمھیں ہم نے ستایا نہیں۔ تم ہمیں کیوں ستاتے ہو خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ ہمارے تحائف قبول کرو۔ اور واپس جاؤ اور آج سے ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ ورنہ یاد رکھو۔ کہ تم طرح یہاں زیادہ دن نہیں ٹہر سکتے۔ تم کو پانی اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ اور تم ہم کو اپنے طرز زندگی کے بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے قلعہ پر قبضہ بھی پا لیا۔ تو تڑپتی لاشوں اور چند غمزدہ قیدیوں کے سوا جو کبھی دوسروں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ تم کچھ نہیں پاؤ گے۔

ڈیمیٹریوس اِس گفتگو سے بیحد متاثر ہوا۔ اور صلح قبول کر لی۔ اِس اچانک حملہ نے ان نبطی عربوں کو ایک منتظم سیاسی جمعیت کے قالب میں بدلجانے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اِس انقلاب نے اِس بدوی قوم کو وہ اہمیت بخشی کہ یونان عظمیٰ اور رومۃ الکبریٰ اور خاندان اسرائیل کی گردنیں بھی اسکے آگے کبھی کبھی جھک جاتی تھیں آگے کے واقعات سمجھنے کے لیئے یونان۔ روم اور یہود کی تاریخ کے بعض چند فقرے پڑھ لینے چاہئیں۔

انٹی گونس کی حوصلہ مندی کی اِس شکست سے کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔ اِس نے رفتہ رفتہ بطلیموس سے شام سلوکیوس سے بابل (عراق) لڑکر چھین لیا۔ ناچار سلوکیوس اور بطلیموس دونوں نے متحدہ طاقت سے ۳۰۱ ق م میں انٹی گونس کی مملکت مقبوضہ کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لیئے۔ اس تقسیم کی رو سے شام سلوکیوس کو اور مصر و قبرص بطلیموس کو ملا۔ مورخین عرب خاندان سلوکیوس کو سلوقیین اور خانوادۂ بطلیموس کو بطالسہ یا بطالمہ (جمع بطلیموس) کہتے ہیں۔ سلوقیین اور بطالمہ نے اِن ممالک پر ایک مدت تک حکومت کی

شام میں بنی اسرائیل کی پہلی حکومت کو شاہان بابل نے برباد کر دیا۔ بابل پر فارس کی حکومت نے جب غلبہ حاصل کیا۔ تو اُن کو سنہ ۵۵۰ ق م میں پھر آزادی نصیب ہوئی۔ اور فارس کے زیر اقتدار بنی اسرائیل کے ایک خاندان یہودا نے جن سے یہود کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایک نیم آزاد حکومت پھر قائم کی لیکن سنہ ۳۳۲ ق م میں سکندر نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اِس کے بعد مملکت یہود (بیت المقدس) بطلیموس انٹی گونس اور آخر سلوقیین کی ماتحت ہو کر فنا ہو گئی۔ دوسری صدی ق م میں جب یونانیوں کی پیرسال قوتیں نوجوان رومی خون سے ہر جگہ شکست کھا کر اُس کے لیے جگہ خالی کر رہی تھیں۔ یہودیہ کی ابدی الموت زندگی نے آخر بار بدن کو جنبش دی اور مکابیین کے نام رومیوں کے بل پر سنہ ۱۶۶ ق م میں ایک حکومت یہودیہ میں قائم ہوئی۔

مکابیین اولاً مذہبی کاہن کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن آخر بادشاہ بن بیٹھے حصول سلطنت کے لیے ہمیشہ اِس خاندان کے ارکان باہم نبرد آزما رہے۔ رومی آہستہ آہستہ اِن کی آزادی سلب کرتے جاتے تھے پہلے یہودیہ سے ادوم میں حکومت منتقل کر دی اور اس کے بعد بالآخر رومی سنہ ۴۴ء میں ہمیشہ کے لیے اِس تماشگاہ پر پردہ ڈال دیا۔

یہ تاریخ تمام تر نبطی عربوں سے گوناگوں تعلق رکھتی ہے۔ ملک یہودیہ۔ نباطیہ سے ہم سرحد تھا۔ دونوں صوبوں میں تقریباً ایک ہی قسم کے سیاسی حالات رونما ہوتے تھے۔ سلوقی خاندان ابھی صرف سو برس شام پر حکومت کرنے پایا تھا۔ کہ سنہ ۱۶۷ ق م میں یہودا۔ اسکابی۔ بانئ خاندان نے بغاوت کی۔ یہود خود عرب گئے اور نبطی عربوں سے شرکت و اعانت کی درخواست کی۔ کہ ہم لوگ متحدہ طاقت سے اِن بیرونی قوموں کو نکال دیں (قدامت الیہود ج ۲ کتاب ۱۲ باب ۸ فقرہ ۳) سلوقیوں نے جب یہ دیکھا۔ تو اُنھوں نے بھی اِن عربوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فقرہ ۴) اُسوقت غالباً حارث اوّل انباط کا بادشاہ تھا جس کا زمانہ سنہ ۱۶۹ ق م ہے۔

زید بابل نبطی کے عہد میں سکندر سلوقی اور ڈیمیٹریوس سلوقی کے درمیان دعوے تخت کی بنا پر منازعت پیدا ہوئی۔ ڈیمیٹریوس کے طرفدار نبط تھے۔ اور یہود سکندر کے حامی تھے۔ سکندر نے شکست فاش کھائی۔ اُس وقت عرب کی آزاد زمین کے سوا اسکو کوئی مامن نظر نہ آیا۔ لیکن درحقیقت اُس کی روح اُس وقت حقیقی مامن کی تلاش میں نکلی تھی۔ زید بابل نے سکندر کا سر کاٹ کر بطلیموس کے پاس بھیجدیا (قدامت الیہود ج ۲-۱۳-۴-۸)

زید بابل کے بعد مالک اوّل تخت نشین ہوا۔ سکندر سلوقی کا بیٹا انطباخوس اسی معرکہ میں انباط کے ہاں قید ہو کر پرورش پا رہا تھا۔ یونانیوں نے جو سکندر کے طرفدار تھے۔ مالک سے درخواست کی۔ کہ انطباخوس کو باپ کی جگہ حکومت کے لیے آزاد کر دیا جائے۔ شدائد اصرار کے بعد......

مالک نے یہ درخواست قبول کی (قدامت ج ۲-۱۳-۵-۱)

یونانیوں کی اس کشمکش نے یہود وانباط میں منازعت پیدا کردی۔ یاناتانی مکابی رئیس یہود جس کی قوت یونانیوں کے ضعف ونشو ونما پا رہی تھی۔اُس نے اچانک نبطیوں پر حملہ کیا۔ اور اُن کو نقصان پہونچایا۔ (قدامت ج ۲-۱۳-۵-۱)

حارث دوم کے زمانہ میں یونانیوں نے غزّہ کے یہودیوں پر حملہ کیا۔ حارث اسوقت انباطؔ کی قوت کا مالک تھا۔ اپنے عہد کا ممتاز بادشاہ تھا۔ اِس نے یونانیوں سے اعانت کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عربوں کی کمک پہونچے۔ یونانی خود خانگی منازعات میں مبتلا ہوگئے (ق-ج ۲-۱۳-۱۳-۳)

حارثؔ دوم کے بعد عبادۂ اوّل مملکت انباط پر تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں سکندر مکابی جو یہودیہ کا ایک مجنون رئیس تھا۔ انباطؔ پر حملہ آور ہوا۔ اور گو وہ جنگ میں نبطیوں کے ہاتھ سے بمشکل جانبر ہو سکا تاہم صوبہ مواؔب اور جلعاؔد کے بارہ شہر اُن سے چھین لے گیا۔ (۱۳-۱۳-۵-۱۴-۱-۱/۴) لیکن یہود اِس فتح سے خوش نہ ہوئے۔ اور اُنہوں نے سکندر کو مجبور کیا۔ کہ وہ مواؔب اور جلعاؔد کے علاقے عربوں کو واپس کر دیے۔ کہ وہ دشمنوں کے شریک نہ بن سکیں (۱۳-۱۴-۱-۲)۔

حارث سوم (سنہ ۸۶ تا سنہ ۶۲ ق م) حکومت انباط کا سلطان اعظم تھا۔ انطباخوس اورڈیانیسیس سلوقی اس وقت ملک عرب پر حملہ آور تھا حارث کی فوج خالص عرب شجاعت کے ساتھ یونانیوں کے مقابل تھی۔ پہلے حملہ میں وہ پسپا ہو رہی تھی۔ کہ دفعتاً حارث دس ہزار سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں نمودار ہوا۔ انطیاخوس بہادری سے لڑتا رہا۔ اور عین اُسوقت میں جبکہ جلوہ فتح اُس کے سامنے تھا۔ لڑائی میں کام آیا۔ اُس کے مرنے کے ساتھ فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ حارث کے لیے اب یہاں سے دمشق تک جو سلوقیین کا پایہ تخت تھا۔ کوئی روک نہ تھی۔ اور خود بطلیموس و سلوقی خاندان باہم خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ خود اہل دمشق کی دعوت پر حارث دمشق پہونچا۔ اور سکندر اعظم کے جانشینوں (سلوکیوس) کا تخت اُس کے پاؤں کے نیچے تھا۔ (۱۳-۱۵-۱)

پہلی صدی ق م کے اواسط میں سکندر مکابی کے دو بیٹوں میں تخت یہودیہ کے لیے منازعت ہوئی۔ ایک نے بھاگ کر حارثؔ کے دامن میں پناہ لی۔ اور وعدہ کیا۔ کہ اگر وہ تخت نشین کر دیا گیا۔ تو جن بارہ نبطی شہروں پر اُسکا باپ قابض ہوگیا تھا۔ واپس کر دیگا۔ (قدامت ج ۲-۱۴-۱-۱/۴) حارث پچاس ہزار سپاہ کے ساتھ رقیم

(دیڑا) سے نکلا۔ یہودیوں نے میدان میں شکست کھائی اور یروشلیم میں قلعہ بند ہوگئے۔ یروشلیم کا محاصرہ کئے ہوئے حارث پڑا تھا۔ کہ نوشیاب رومیوں کی فوج سامنے سے نمودار ہوئی جس نے ۳۰۰ ٹالنٹ (۲۵ لاکھ روپیے) پر یہودیوں سے جنگ خریدلی ناچار حارث کو پیچھے ہٹ آنا پڑا (بحوالہ سابق باب ۲ فقرہ ۱-۲)

اور اسی کے سپہ سالار سکاروس (Sacarious) نے پہلی صدی ق م کے اوسط میں بار بار رقیم (پٹرا) پر حملہ کیا۔ لیکن راستہ کی دشوارگذاری ہمیشہ کیلئے قلعہ ثابت ہوا کی ناچار سکاروس نے ادہر ادہر شہروں کو جلانا اور برباد کرنا شروع کر دیا۔ آخر ۴۰۰ ٹالنٹ یعنی تقریباً ۲ لاکھ روپے ایک ادومی سردار انٹی پٹر کی دلالی سے اپنے وحشیانہ اعمال کی قیمت لے کر واپس گیا۔

یہ واپسی رومیوں کی تخیل میں عظیم الشان فتح تھی۔ اسکی یادگار میں ایک سکہ جاری کیا گیا جسمیں دکھایا گیا کہ حارث سرنگوں ہے ایک ہاتھ میں اونٹ کی مہار اور دوسرے میں ایک خوشبودار درخت کی ٹہنی۔ (جو ملک عرب سے شاید عبارت ہے۔) لٹو کٹر لکھتا ہے سکاروس کے بعد گبنیوس (Gabinieus.) اسکی جگہ پر آیا۔ اوس نے یہودیہ رومیوں کی خیرخواہی کے معاوضہ میں انٹی پٹر ادومی کے حوالہ کیا اور خود فتح انباط کے ارادہ سے نکلا اور کہتے ہیں کہ غالب آیا (برٹینکا طبع یازدہم ج ۲۴ ص ۳۰۵)

عبادہ ثانی کے عہد کا کوئی واقعہ نہیں معلوم ہوا۔

مالک ثانی (۵۰ تا ۲۸ ق م) کا زمانہ بعض حیرت انگیز واقعات کا سلسلہ ہے۔ انٹی پٹر مرچکا تھا اوس کی بجائے ہیرود۔ یہودیہ کا رئیس تھا۔ روم میں سیزر اعظم (قیصر) کے قتل کا معاملہ درپیش تھا۔ اور انٹونی اپنے حریف (ر قائمین قیصر) پر غالب آرہا تھا۔ مصر میں خاندان بطلیموسی کی آخری شہزادی کلیوپٹرا تخت نشین تھی ہیرود رومیوں کی ہتھیلی دیکر رومیوں سے بادشاہ یہود کا لقب خریدنا چاہتا تھا۔ اور اسی ضرورت سے مالک کے پاس جانا چاہا کہ اوس سے کچھ رقم بطور قرض یا دوستانہ حاصل کرے لیکن مالک نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ کہ فارس کی ہمسایہ حکومت اسکو پسند نہیں کرتی ہیرود رنجیدہ ہوکر روم واپس گیا۔ (قدیمہ ۱۴-۱۴-۱-۱۴-۱) لیکن عرب میں کیفر دارت ہر قدم پر ہمسایہ حکومتوں کو ہوتی ہے۔ اونسے کب تک اعراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد ایک فوج کشی میں ہیرود کو نبطی عربوں کی اعانت کی حاجت محسوس ہوئی۔ روم سے چلکر انٹونی اب مصر و شام کا فرمانروا تھا۔ عرب گو میدان میں مفتوح نہیں ہوئے تھے۔ تاہم رومیوں کی سیاسی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے انٹونی سب کچھ جو دے سکتا تھا۔ کلوپٹرا کو نذر کرچکا تھا۔ وہی ان ممالک سے خراج وصول کرتی تھی۔ یہودیہ اس کے لئے تیار تھا لیکن عرب نبط اسکی محکومی کے لئے تیار نہیں تھے۔ شاہ یہود کے توسط کے بعد بھی مالک خراج دینے پر آمادہ نہوا۔ آخرالامر ہیرود نے رومیوں کی محبت اور کلوپٹرا کی نازبرداری میں عرب نبط پر حملہ شروع کیا۔ بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں

جنمیں طرفین سے ہزاروں آدمی کام آئے۔ اور یہودی مورخ یوسیفوس کے مطابق اکثر عربوں کو شکست ہوتی رہی (قدامت ۱۵۔ باب ۴۔ ۵۔۶)

عبادہ ثالث (۳۰ تا ۹ ق م) گو ایک سست طبع اور ناکارہ تھا۔ لیکن اوسکا وزیر نہایت ہوشمند اور چالاک تھا۔ یونانی تلفظ میں اوسکا نام سالیوس (Syllaeus) تھا (اصل شاید سائل یا سائیل ہو) سالیوس ہمیشہ اپنی دانشمندانہ سازشوں سے یہودیوں اور رومیوں کو زک دیتا رہا (قدامت ۱۶، ۷، ۶ و باب ۹، ۱۱، ۴، ۲۴، ۶) ۲۵ ق م میں رومیوں کو جو فتح عرب کے خواب دیکھ رہے تھے۔ عرب کے بے آب صحرا میں جسطرح اونکی ہمت کو شکست دے کر واپس پھیرا یہ اوہ ابتک ہر رومی اور یورپین مورخ کے قلم کے لئے سرمایہ غم و ندامت ہے۔ واقعہ کی تفصیل "حمیر" کے ذکر میں اس سے پہلے گذر چکی ہے۔

حارث رابع (۹ ق م تا ۴۰ ع) حضرت یحیٰی ابن زکریا۔ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام کا معاصر تھا۔ اسکا پہلا نام انیس تھا۔ عبادہ کی وفات کے بعد جب یہ بادشاہ ہوا تو اپنے لئے شاہی نام حارث اختیار کیا۔

ہیرو ڈشاہ یہودیہ حارث کا داماد تھا۔ یہ شخص نہایت بدکار اور ستم دوست تھا۔ اپنے بھائی کے حرم کی بھاوج سے جو اسکی علاتی بھتیجی بھی ہوتی تھی، شادی کر لی۔ حضرت یحیٰی اندنوں پند و موعظت کے پیغمبرانہ اثر سے قلوب کو مسخر کر رہے تھے۔ انکی محبوبیت یہودیہ میں جتنی ترقی کرتی جاتی تھی ہیرو ڈ اوسی قدر کانپتا جاتا تھا۔ حضرت یحیٰی نے ہیرو ڈکو اس شادی پر ملامت کی خون آشام بادشاہ سے ضبط نہو سکا حضرت یحیٰی کا سر کاٹ کر منگوایا۔ ہیرو ڈکی پہلی بی بی عرب اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ عرب کا بادشاہ حارث اپنی اس خاندانی اہانت پر غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ فوراً یہودیہ پر فوج کشی کی تیاری کر دی اور اس زور و شور سے حملہ آور ہوا کہ ہیرو ڈتاب نہ لاسکا۔ اور سخت ہزیمت اوٹھا کر بھاگا۔ یہودی معتقد تھے کہ یہ شکست حضرت یحیٰی کے قتل کا پاداش عمل تھا۔ (قدامت ۱۸۔ ۵) حارث سیدھا دمشق پر قابض ہوگیا۔ پولوس سینٹ پال (St. Paul) موجودہ عیسائیت کا بانی اسی حارث کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا تھا۔ آخری ڈوری لٹکا کر اسکے سہارے قیدخانہ سے نکلکر بھاگا (نامہ پال بنام قرنتیون ۱۲ و ۲۳) رومی ہیرو ڈکی مدد کے لئے آئے۔ لیکن اتفاقاً اسی اثنا میں ۳۷ء میں خود قیصر مرگیا۔ حارث کئی برسوں تک دمشق پر قابض رہا۔

حارث کے بعد دولت انباط رومی اقتدار کے پردے میں بالکل چھپ گئی۔ گویا حارث کا وجود اس چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔

انباط کے مٹنے کے بعد بہت سے عرب قبائل اندرون ملک سے خالی جگہ کو بھرنے کے لئے نکل آئے جنمیں زیادہ مشہور آل غسان ہیں، جو انباط کے ہم نسب تھے۔

تقریباً ۵۳۰ برس کے بعد جب اسلام آیا تب بھی انباط دُنیا سے معدوم نہ تھے۔ ملک شام میں اِنکا پیشہ غلہ و روغن فروشی رہگیا تھا۔ (زرقانی ج ۱ و صحیح بخاری غزوہ تبوک) اوپر کے شہر۔ تدمر۔ معان۔ بصریٰ وغیرہ آلِ غسان کے ہاتھ میں - اور حجر تیماء۔ خیبر وغیرہ جو نبطیوں کے گھر اور قلعے تھے اِن سب پر یہود قابض تھے نبطیوں کی بقیہ آبادی قومی حیثیت کھوکر یہودیوں۔ یونانیوں اور رومیوں میں اِسطرح گھل مل گئی تھی کہ عہد اسلام میں اِن اطراف میں جب عرب پھیلے تو کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکا عربوں نے ہمیشہ انکو ایک اجنبی قوم سمجھا۔ اور یہ خود بھی اپنے کو نبطی کہتے تھے۔ اِنھیں میں سے حسّان نبطی ہے۔ جو ہشام ابن عبد الملک کا درباری تہا۔ (ابن خلکان تذکرہ خالد القسری)

اصحاب الحجر اس عظیم الشان قوم کا عروج و زوال حیات و موت زندگی وفنا ہم قوم عرب کے لئے کسقدر سبق آموز ہو سکتی ہے۔ تعجب ہوتا اگر قرآنمجید اِس عبرتناک تاریخ سے خالی ہوتا۔

تم نے اُوپر پڑہا - کہ انباط کے مرکز حکومت دو تھے۔ رقیم (پٹرا) متصل شام اور حجر (الجرا) امارونِ عرب قرآن مجید نے ان کو اسی قریب تر شہر کے مالک کہہ کر پکارا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِينَ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ -	اہل حجر نے پیغمبروں کو جھٹلایا - (یعنی گذشتہ اور معاصر پیغمبروں کی ہدایت قبول کیں)، ہم نے اُن کو اپنی نشانیاں دیں اُن سے مُنہ پھیر لیا - یہ پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بناتے تھے جنمیں امن و آرام کے ساتھ رہتے تھے انکو عذاب نے صبح ہوتے ہی ڈلیا پھر اُنکے کارناموں نے ان کو کوئی فائدہ نہ بخشا

تمام مفسرین نے اصحاب الحجر سے ثمود مراد لیا ہے۔ اِسمیں شک نہیں کہ ثمود کا دار الحکومت بھی یہی شہر تہا۔ لیکن قرآن مجید کا عام طرز ادا بتاتا ہے کہ اصحاب الحجر سے ثمود کے علاوہ اِن کے بعد کی آبادی مراد ہے۔ قرآن مجید نے ثمود کا ۲۶ جگہ ذکر کیا ہے لیکن ہر جگہ اُن کا نام لیا ہے۔ اِس جمال کے ساتھ یعنی "حجر والے" کہکر کہیں نہیں بیان کیا ہے ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے ثمود کی تعمیر و سنگتراشی کا قرآن میں جہاں ذکر ہے۔ وہاں مقام کا نام بھی بتا دیا ہے یعنی وادی القریٰ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ " ثمود جنہوں نے وادی القریٰ میں پتھر تراشے اور یہاں حجر والے کہکر اونکی تعمیر و سنگتراشی کا ذکر کیا ہے۔ اِس میں اشارہ یہ ہے کہ اونکی سنگین عمارتیں حجر میں واقع ہیں۔ اِن کے نشان اور آثار ابتک موجود ہیں۔ اِنپر جو کتبات منقوش ہیں اونمیں بانی اپنا نام نبطیو بتاتا ہے۔ جس کو ہر نبطی خط و زبان کا عالم ہر وقت پڑھ کر تصدیق کر سکتا ہے۔ اِس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ اصحاب الحجر انہیں انباط کا لقب تہا۔ صحیح بخاری اور احادیث و سیر کی دوسری کتابوں

میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم تبوک کو تشریف لیجاتے ہوئے مقام حجر سے گذر رہے تھے۔ اس موقع پر بھی اکثر رواتوں میں ثمود کا نام نہیں۔ یہ فقرہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لَا تَدْخُلُوا مَسَاكِنَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ أَلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَهُمْ۔

ان اپنی جانوں پر آپ ظلم کرنیوالوں کے گھروں میں روتے ہوئے چلو ایسا نہو کہ جو مصیبت انپر آئی تمپر بھی آئے۔

یہ روایت امام بخاری نے باب غزوہ تبوک۔ تفسیر سورۂ حجر اور ثمود کے ذکر میں درج کی ہے اسمیں ثمود کا مطلق نام نہیں۔ ایک روایت میں بھی حدیث بروایات الفاظ اسطرح مروی ہے۔ ان الناس مع رسول اللہ نزلوا ارض ثمود الحجر اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حجر ثمود کا بھی ملک تھا۔ اور اس سے ہم کو انکار نہیں اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ کم از کم۔ ۳۱۲ ق م ۱۰۶ء تک انباط ان مقام پر قابض تھے۔ اب ڈائیڈورس اور پلینی کی شہادتوں کو باہم پیش نظر رکھو۔ ڈائڈورس (۳۰ ق م) کہتا ہے۔

اوپر گذرتے ہوئے۔ ہم خلیج ایلہ (عقبہ) میں داخل ہوگئے۔ جسکے حدود پر اون عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جنکو لوگ نبط کہتے ہیں یہ نہ صرف سواحل کے بڑے حصۂ ملک پر بلکہ اندرون ملک میں بھی وہ دور تک پھیل گئے ہیں (دیکھو فصل "انباط کا رقبۂ حکومت")

مورخ پلینی (۷۹ء) اسی خلیج ایلہ کے ذکر میں کہتا ہے۔

خلیج کے اندرونی گوشے میں جہاں ایلانی لوگ بستے ہیں۔ جن کے سبب سے اس خلیج کا نام ایلہ ہوا (یہ تحقیق بالکل غلط ہے بلکہ واقعہ برعکس ہے یعنی سکونت خلیج ایلہ کی خصوصیت سے انکو ایلی کہتے ہیں۔) اور جو اگر (حجر) اپنے شاہی شہر میں بھی رہتے ہیں۔ (طلائے مدین۔ یعنی گولڈ مائنس آف مدین ص ۳۱۲)

قرآن مجید نے انکی سنگی عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ گو ان کے آثار ابتک حجر۔ تیما اور علا وغیرہ میں موجود ہیں۔ لیکن انباط کی معاصر تاریخ بھی انکے ذکر سے خالی نہیں۔ اسٹرابو لکھتا ہے۔

ان کے مکانات عالیشان اور پتھر کے ہوتے ہیں۔ (معادن طلائے مدین ص ۲۲۸)

مسلمان جغرافیہ نویسوں نے ان عمارتوں کو تیسری۔ چوتھی صدی میں دیکھا تھا۔ اصطخری بیان کرتا ہے۔

الحجر قرية صغيرة قليل السكان وهو من وادي القرى على يوم بين جبال وبها كانت منازل ثمود ورأيت المساكن مثل بيوتنا في اضعاف الجبال (ياقوت۔ الحجر)

حجر وادی القری سے ایک دن کی راہ پر پہاڑوں کی بیچ میں ایک کم آباد گاؤں ہے یہیں ثمود کے گھر تھے ہم نے اپنے گھروں کے برابر ان گھروں کو پہاڑونکے سلسلوں میں دیکھا ہے۔ (یاقوت الحجر)

حجر میں اب تک یہ عمارتیں موجود ہیں ان میں اکثر مقبرے ہیں جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان عمارتوں پر نبطی خط اور ارامی زبان میں مذہبی کتبے لکھے ہیں۔ ان میں انباط کے بتوں کے نام بھی ہیں۔ جن میں ونیتن۔ ذوی الشری مناۃ۔ مشہور دیوتا ہیں موجودہ عمارات میں ایک عمارت قصر البنت کے نام سے آجتک مشہور ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ مضمون عرب)

۱۲ قیدار ابن اسمٰعیلؑ

مِلَّةَ اَبِیکُمْ اِبْرَاھِیْمَ

قیدار حضرت اسمٰعیلؑ کا دوسرا بیٹا تھا۔ شہرت اور اعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز تھا لفظ قیدار کے عبری میں معنی سیاہی اور غم کے ہیں۔ عربی میں بھی لفظ کدر" وکدورت" موجود ہے شاید حضرت اسمٰعیل نے یہ نام باپ سے جدائی اور صحرانوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو قیدار بر بنائے روایات توراۃ عرب حجاز میں آباد ہوا تھا۔ فارسٹر صاحب جن کی موافقانہ شہادت نہایت مشکل سے میسر آسکتی ہے لکھتے ہیں"

اشعیا نبی نے قیدار کے جس ملک کا اقرار وذکر کیا ہے۔ اوس کو ہر شخص جو جغرافیہ عرب سے واقف ہے فوراً کہدے گا۔ کہ وہ عرب کے صوبہ حجاز کا صحیح نقشہ ہے۔ جسمیں مکہ۔ اور مدینہ کے مشہور شہر واقع ہیں عربوں کی قومی روایت بھی تاریخی رتبہ حاصل کرلیتی ہے جب ایک طرف اوسکی تصدیق کتب مقدسہ سے بھی ملتی ہے۔ جس سے قیدار کا اسی حصۂ ملک میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف اریانوس۔ بطلیموس۔ اور پلینی کے بیان سے ملتی ہے۔ جو کیداری (قیداری) قوم کی اسی صوبہ میں موجودگی کی غیر مشتبہ شہادت دیتے ہیں"۔ (فارسٹر۔ جغرافیہ عرب ج ا ص ۲۴۸ (ملخصاً)

قیدار کی اہمیت اور عظمت کے لئے یہ دلائل کافی ہیں۔ کہ اوسکا نام توراۃ کے صفحات میں اسیریا کے کتبات میں اور یونان کے جغرافیات میں ہر جگہ موجود ہے لیکن اس سے بھی عظیم الشان عزت اسکو یہ حاصل ہے کہ وہ نور الٰہی جو آدم و ابراہیم کو ودیعت ہوا تھا وہ اسمٰعیل کے بیٹے قیدار کے پشت سے جلوہ افروز عالم ہوا۔ یعنی پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ نسل قیدار کی شاخ عدنان سے پیدا ہوئے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے قیدار کا نام سب سے پہلے ۷۱۵ ق م میں حضرت داؤدؑ کی زبور میں

نظر آتا ہے بنو قیدار اس زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے۔ حضرت داؤدؑ شاہی سے پہلے بہت دنوں تک بنی قیدار کے خیموں میں رہے تھے (زبور ۱۲۰-۵)

۱۰۰۰ق م میں حضرت سلیمانؑ بھی اپنی غزل میں قیدار کے خیموں کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ وہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور میں قیدار کے خیموں کیطرح سیاہ ہوں یہ سیاہ خیمہ کالے کملوں کے ہوتے تھے جو ابتک بدوی عربوں کے لئے صحرا میں قصر و کاشانہ ہیں۔ خود مکہ آنحضرت صلعم سے چند پشت پیشتر صرف خیموں کا شہر تھا۔ کوئی پتھر یا مٹی کی عمارت موجود نہ تھی۔

تحریری حیثیت سے دو سو برس کے بعد پھر قیدار کا نام اسیریا کے کتبات میں ملتا ہے ملک عرب کا نام ان کتبات میں عربی ہے۔ اول زبیبی۔ اور سمسی دو شہزادیوں کا ذکر ہے زبیبی کی اصل شاید زبابہ اور سمسی کی حقیقت شمسیہ ہو ذیل کی عبارت میں ہم ان کتبات کا اقتباس ایک نہایت معتبر کتاب سے کرتے ہیں۔"

ملکہ زبیبی (زبابہ) تغلات پلاسر سوم۔ شاہ اسیریا (۷۴۵ تا ۷۲۷ ق م) کی معاصر تھی تغلات پلاسر سوم۔ ملکہ زبیبی سلطانہ عربی کو صرف مفتوحین اور باجگذاروں کی فہرست میں داخل کرتا ہے (ص ۱۲۱) اسکے بعد زبیبی ملکہ عربی کا دوبارہ ذکر آتا ہے۔ زبیبی نے ۷۳۸ ق م میں خراج ادا کیا تھا دیکھو بعد سے پھر عرب خراج وصول نہیں ہوا۔ اب بجائے زبیبی کے ملکہ سمسی (شمسیہ) تخت نشین تھی۔ شمسیہ نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور اسیری سپاہ کو ناکامیاب واپس کر دیا۔ ناچار وہ لڑنے پر مجبور کی گئی اسیری غالب آئے اور شمسیہ کے ملک کے اونٹ اور بیل لوٹ لئے گئے۔ ایک اسیری سردار تحصیل خراج کے لئے متعین ہوا اسکا یہ اثر ہوا کہ سبا نے بھی شاہ اسیریا کو بھی نذریں پیش کیں (ص ۱۲۴-۱۳۱)

۷۱۳ ق م میں سرجون ثانی شاہ اسیریا نے شمالی عرب پر فوج کشی کی خیفہ ایک قبیلہ تھا جس نے سرتابی کی تھی۔ ثمود عبادیدی (عبادی) اور مرسینی خیفہ کے طرفدار تھے خیفہ انتہائی شمال میں موجود شہر مدینہ کے متصل اور بقیہ قبائل مکہ کیطرف سے نیچے آباد تھے شمر سبا اور شمسیہ ملکہ عرب جسکا ملک انتہائے شمال میں واقع ہوا تھا۔ نذریں پیش کیں۔ ص ۱۶۴۔

اشور بنی پال شاہ اسیریا کے عہد حکومت (۶۶۸ تا ۶۲۶ ق م) یوقع بن ہزائیل عربی کا بادشاہ تھا اور عادیہ اسکی بادشاہ بیگم تھی۔ یوقع (یوشع) نے اپنے حدود مملکت میں عرب ادوم پرود بیت عموں حوران۔ مواب سیعر دخل کر لئے تھے اور ان مقامات کے حدود پر عربوں کی چوکیاں مقرر کیں۔ یوقع نے بنی قیدار کی ایک فوج دو عرب شیخ ابی تیغ اور ابا مو کے ماتحت روانہ کی۔ بنی قیدار کی فوج بابل سے پیچھے ہٹا دی گئی۔ اور ادکم ادکم

ان میں سے ایک شیخ گرفتار کر لیا گیا۔ عرب جو اسیریا میں آباد تھے جبراً اس فوج کی شرکت سے باز رکھے گئے تھے اس لئے متوقع کمک عربوں کو نہ پہنچ سکی۔ یوتع نبطیوں (نابلیتوں) کی چھوٹی سی ریاست میں پناہ گزین ہوا۔ یوتیطار (Uaiteri) یوتع کا بھتیجا تخت پر قابض ہو گیا اور بہادری کے ساتھ اسیری قوت کی مدافعت کرتا رہا آخر اہل اسیریا کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ اور پابزنجیر اسیریا لایا گیا۔ دروازہ پر نگہبان کتے کی طرح پاسبانی کی خدمت اسکے لئے مقرر ہوئی۔ اسی سلسلہ میں قیدار کا ایک دوسرا سردار عم الدی بھی قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ وہ فلسطین جاکر پناہ گزین ہوا۔ لیکن وہاں بھی اسکو امان نہ ملی فلسطین فتح کر لیا گیا۔ ملکہ عادیہ بھی گرفتار ہوئی اور اب ابی شیع کی مدت حکومت بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اور یکایک تخت سے عویلیط بن بیرود تاریخ سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک زمانہ کے بعد شیخ بنی قیدار کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اب نتنو (ناتان) رئیس انباط یوتع رئیس عرب اور ابی تبع شیخ قیدار متفقاً اسیریا کے مقابلہ میں اٹھتے ہیں۔ لیکن سوء قسمت سے ناتان گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور سب بچ کر نکل آتے ہیں۔ (ص ۵۷۵-۵۷۶)

کتبات مذکورہ کے بیانات سے یہ صاف صاف نہیں واضح ہوتا۔ کہ زبی۔ سمسی (شمسیہ) خاندان بنی قیدار سے تھیں یا نہیں۔ لیکن آخری فقروں سے قیاس غالب یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ خاندان قیدار ہی تھا۔ ان کتبات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ نابت اور قیدار کی اولادیں اس وقت الگ الگ ہو گئیں تھیں۔ اور شمالی عرب کے مختلف گوشوں میں ان کی متفرق ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔

اشعیا نبی۔ جو تقریباً اسی زمانہ میں تھے۔ یعنی آٹھویں صدی ق م میں وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ قیدار ایک شاندار اور بہادر قوم ہے۔ (۲۱-۱۶) گاؤں میں ان کی بہت سی آبادیاں ہیں۔ (۴۲-۱۱) بھیڑ بکری۔ ان کی اصلی دولت ہے۔ اسی کی وہ تجارت کرتے ہیں۔ (۶۰-۷)

قیدار کے متفرق رؤسا میں سے عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے۔ قیدار کی نسل کی تمام شاخیں شجرۂ انساب میں اسی عدنان تک منتہی ہوتی ہیں۔ چھٹی صدی ق م میں بنوخذنذر (بخت نصر ۶۱۵-۵۶۲ ق م) جس کو عرب بخت نصر کہتے ہیں۔ اسیریا کے تخت پر جلوہ نما ہوتا ہے۔ اور عراق سے لے کر شام۔ مصر اور عرب تک کی خاک اڑا دیتا ہے۔ اہل عرب کا بیان ہے کہ اسوقت عربوں کا رئیس کل معد بن عدنان تھا۔

اشعیا (۷۰۵ ق م) حزقیال (۵۹۷ ق م) اور یرمیاہ (۵۸۶ ق م) نبیوں نے خانوادہ قیدار کو اس خونخوار اور سفاک بادشاہ کے خروج سے ہشیار کیا ہے۔ سب سے

پہلے اشعیاہ نبی کہتے ہیں۔

قیدار کا تمام جاہ و جلال مٹ جائے گا۔ تیر انداز اور بہادر فرزندان قیدار کی تعداد گھٹ جائے گی (اشعیا ۲۱-۱۶-۱۷)

باب ۴۲۔ آیت ۱۱ میں ہے:۔

اُنہیں دیہاتیوں میں آواز دو۔ جن میں قیدار رہتے ہیں۔

باب ۶۰ درس سات میں ہے:۔

قیدار کے گلّے اور بنایوط کی بھیڑیں اکٹھی کی جائیں گی۔

یرمیاہ نبی نے کہا (۴۹-۲۸)

قیدار اور حصور کی حکومتوں پر افسوس ہے۔ جن کو بابل کا بادشاہ بنوخذ نذر (بخت نصر) تباہ کرے گا۔ خدا کہتا ہے۔ اٹھو اور قیدار کے پاس جاؤ۔ اور اہل مشرق کو برباد کرو۔

اہل عرب نے روایت کی ہے۔ کہ بخت نصر حملہ کرتا ہوا۔ حجاز تک پہونچگیا تھا۔ معد بن عدنان برسر مقابلہ ہوا۔ اور ایک غیر منفصل جنگ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یرمیاہ نبی نے معد کو بچالیا۔ اور شاید اس شکست سے بنو قیدار کو کچھ زیادہ صدمہ نہیں پہونچا۔ حزقیال نبی جو بخت نصر کی ان جہاں سوزیوں کے زمانہ میں موجود تھے۔ اور فلسطین سے قید ہو کر (۵۹۶ ق م) بابل گئے تھے۔ قیدار کے شہزادوں کا ذکر کرتے ہیں۔

عرب اور قیدار کے تمام شہزادوں نے بھیڑ بکری کا تجھ سے بیوپار کیا۔ (۲۷-۲۱)

ان انبیا کی معاصرانہ شہادتوں سے بنو قیدار کی معاشرت یہ ظاہر ہوتی ہے۔ کہ وہ خیموں اور گاؤں میں آباد تھے۔ بہادر اور شجاع تھے۔ قبائل کے سردار تھے۔ بدویانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ اُن کو حاصل تھا۔ تجارت انکا پیشہ تھا۔ اور بعینہٖ یہی نقشہ اُنکا زمانہ اسلام تک موجود تھا۔ (ملخص از کتاب ارض القرآن جلد دوم تذکرہ انباط و قیدار ؔ)

مشرقی مورخین نے بالاتفاق لکھا ہے۔ کہ عدنان کے دو بیٹے تھے۔ معد اور عک۔ عک کی نسبت وہ صرف اتنا ہی لکھتے ہیں۔ کہ وہ علاقجات یمن کی طرف جاکر سکونت پذیر ہوا۔ باقی حالات پر پردہ ہے۔ لیکن زمانہ حال کی تحقیقات علم القدامت کے افادات۔ خصوصًا ان کتبوں کی عبارات سے جو علاقہ حضرموت کے مقام حصن غراب میں پائے گئے ہیں۔ اور جنکو مسٹر فارسٹر قوم عاد کے اخبار و آثار سے شمار کرتے ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عک نے کچھ عرصہ تک اُسی علاقہ میں شاہی کی تھی۔ مذکورالصدر کتبوں کو حضرموت کے علاقہ

میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازی افسروں نے ۱۸۳۶ء میں پایا تھا۔ اِن کتبوں کا پورا بیان مع نقشوں کے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل جلد سوم میں مندرج ہے۔ مسٹر فارسٹر نے اِس کی نسبت جو کچھ لکھا ہے۔ اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُس زمانہ میں عاد وہاں کا حاکم تھا۔

معد۔ عدنان کے بعد قبائل عرب کے سرداری اور حکومت معد سے تعلق رکھتی تھی۔ معدّ اور حضرت یرمیاہ اُسوقت کے پیغمبر زمانہ دونو ہمعصر تھے۔ اور اُن دونوں میں باہمانہ مراسم اتحاد قایم تھے۔ مورخ مسعودی نے مروج الذہب میں صرف اتنا لکھا ہے۔ وقد کان لارمیا مع معد ابن عدنان اخبار یطول ذکرھا حضرت ارمیاہ کے ساتھ معد ابن عدنان رہتے تھے۔ اور یہ ایسے واقعات ہیں۔ کہ اُنکا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ تاریخوں سے مسعودی کے اِس مجمل بیان اور معذرت کی حقیقت اس طرح پائی جاتی ہے۔

معد ابن عدنان اور حضرت ارمیاہ کے حالات اور باہمانہ تعلقات جو گذرے ہیں۔ وہ حقیقتاً بہت طول طویل ہیں۔ جنکا خلاصہ یہ ہے۔ کہ جب بخت نصر نے حملہ کیا۔ اور عرب میں بنی عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور شہر مکہ کو بالکل لوٹ لیا۔ اور وہاں کے صدہا باشندوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ تو اُس وقت خدائے تعالےٰ نے معد ابن عدنان کی جان کو بال بال بچالیا۔ حضرت ارمیاہ اور اُن کے وصی وجانشین برخیا (کاتب الوحی) کو معد ابن عدنان کی حمایت میں بھیجدیا۔ یہ دونوں حضرات مکہ میں آئے۔ اور معد نان کو بھی اپنے ساتھ حرّان یا جیروان میں جو علاقہ شام میں ہے۔ اور اُن کو ایک معتد بہ زمانہ تک بحفاظت و آرام رکھا۔ وائل۔ ملقب بہ ابن کلیب ابن ربیعہ بھی معد ابن عدنان کی اولاد میں تھا۔ عرب کا بادشاہ ہوا۔ اور یمن والوں سے چند لڑائیاں لڑا۔ زہیر ابن خدیمہ اور قیس ابن زہیر بھی باری باری سے حجاز پر حکمرانی کرتے رہے۔ اور یہ سب سلاطین صحیح طور پر معد ابن عدنان کی اولاد میں تھا۔

مگر بات یہ ہے۔ کہ اِن متذکرہ بالا۔ عدنانی سلسلہ حکمرانی کا زمانہ حکومت صحت کے ساتھ قایم کرنا اور بتلانا سخت دشوار ہے۔ اور حقیقتاً ان حکومتوں کا یقینی طور پر ہم کوئی خاص زمانہ بتلانے سے بالکل مجبور ہیں۔ کیونکہ انکی معلومات کا کوئی قوی اور معتبر ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ لیکن غور و خیال کرنے کے بعد ہم اِتنا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ ان اسماعیلی الاصل فرمانروایان عرب کا زمانہ حکومت اُسی وقت ہوگا۔ جب یمن کی سلطنتیں اور دیگر ہمسایہ حکومتیں اپنے عروج و ارتقا کے زمانہ کو تمام کرکے اضمحلال اور ادبار کی حالتوں میں مبتلا ہو چکی تھیں (خطبات احمدیہ ص ۵۶)

معد ابن عدنان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام نزار تھا۔ نزار کے پانچ بیٹے تھے۔ پانچوں بیٹوں سے پانچ مشہور شاخیں قایم ہوئیں۔ ۱ انمار۔ ۲ ایاد۔ ۳ ربیعہ۔ ۴ قضاعہ۔ ۵ مضر۔ عرب کے تمام قیداری قبائل انہیں کے فروغ

میں میلاد مسیح کے بیس و بیش زمانہ میں۔ طولاً یمن سے شام تک اور عرضاً حجاز و نجد سے بحرین و عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور زمانہ اسلام تک انکا یہی نقشہ تھا۔

یہ پانچوں شاخیں پھر چھوٹے چھوٹے مختلف خاندانوں پر منقسم ہوگئیں۔ ان کا مجموعی نام اپنے اپنے مورث اعلیٰ کی نسبت سے بنو عدنان۔ بنو معد اور بنو نزار قائم ہوا۔ نزار کے پانچ خاندانوں میں سے۔ انمار اور ایاد نے کوئی بڑی وقعت حاصل نہیں کی۔ ربیعہ قضاعہ اور مضر نے کثرت تعداد۔ دنیاوی اعزاز اور سیاسی اقتدار میں بڑی ناموری حاصل کی۔ اور حجاز و نجد و عراق میں ان کی عظیم الشان حکومتیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں بنو عبد القیس کے بحرین میں۔ بکر و تغلب اور کندہ کے نجد میں اور آل منذر کے عراق و حیرہ میں نظام حکمرانی جاری ہوئے۔

قبیلہ قریش

سلسلہ نسب۔ مضر کی شاخ متعدد اور وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ جن میں سے ایک قریش کا خاندان ہے سلسلہ نسب یہ ہے۔

فہر[1] ابن مالک[2] ابن نضر[3] ابن کنانہ[4] ابن خزیمہ[5] ابن مدرکہ[6] ابن الیاس[7] ابن مضر[8] ابن نزار[9] ابن معد[10] ابن عدنان[11]۔

عدنان تک سلسلہ نسب حرف بحرف صحیح ہے۔ اور نا قابل شک۔ صحیح روایات سے ثابت ہے۔ احادیث صحیحہ سے مروی ہے۔ اشجار عرب میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سلسلہ نسب بھی انہیں واسطوں سے عدنان تک پہونچتا ہے۔

وجہ تسمیہ قریش فہر کا لقب قریش تھا۔ اس بنا پر اُس کی نسل نے "قریش" اپنا خاندانی عَلَم قرار دیا لفظ قریش کے عربی میں متعدد معنی ہیں۔ اسکا ماخذ "قرش"، "تقرش" ہے۔ جس کے معنی اکتساب و تحصیل ہیں خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت ہے۔ اس لیئے قریش کے نام سے موسوم ہے۔ مورخین و محققین عرب اس اتخراج اور اشتقاق کو ذکر نہیں کرتے۔ اور نہ تقرش کے معنی تحصیل و اکتساب کے تبلاتے ہیں۔ بلکہ تقرش سے تجمع و اجماع کے مفہوم لیتے ہیں۔ جیسا کہ بہت جلد سلسلہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ قریش ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے۔ جو دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے۔ فہر نے اپنے استیلاء و قوت کے اظہار کے لیئے یہ لقب اختیار کیا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس نے اسی دوسری تاویل کو اختیار کیا ہے۔

مستشرقین یورپ نے جنکو ہماری تاریخ سے خود غرضانہ محبت ہے۔ اسی دوسری رائے کو پسند کیا ہے۔ لیکن اسلیئے نہیں۔ کہ وہ روایتاً صحیح تر ہے۔ بلکہ اس لیئے کہ توتمزم (طوطمیت) کے ثبوت کے لیئے ایک سند ہاتھ لگتی ہے حالانکہ اس کی تردید کے لیئے اتنا ہی کافی ہے۔ کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ پوجا ہوتی تھی اور نہ اس نام کا کوئی

دلوایا تھا۔

قریش کی شاخیں۔ قریش بھی کوئی ایک قبیلہ نہ تھا۔ چھوٹے بڑے دس مختلف خاندانوں پر منقسم تھا۔ ہاشم[1] اُمیّہ[2] نوفل[3]۔ عبدالدار[4]۔ اسد[5]۔ تیم[6]۔ مخزوم[7]۔ عدی[8]۔ جمح[9]۔ سہم[10]۔ اِن کا سلسلہ نسب حسب ذیل ہے۔

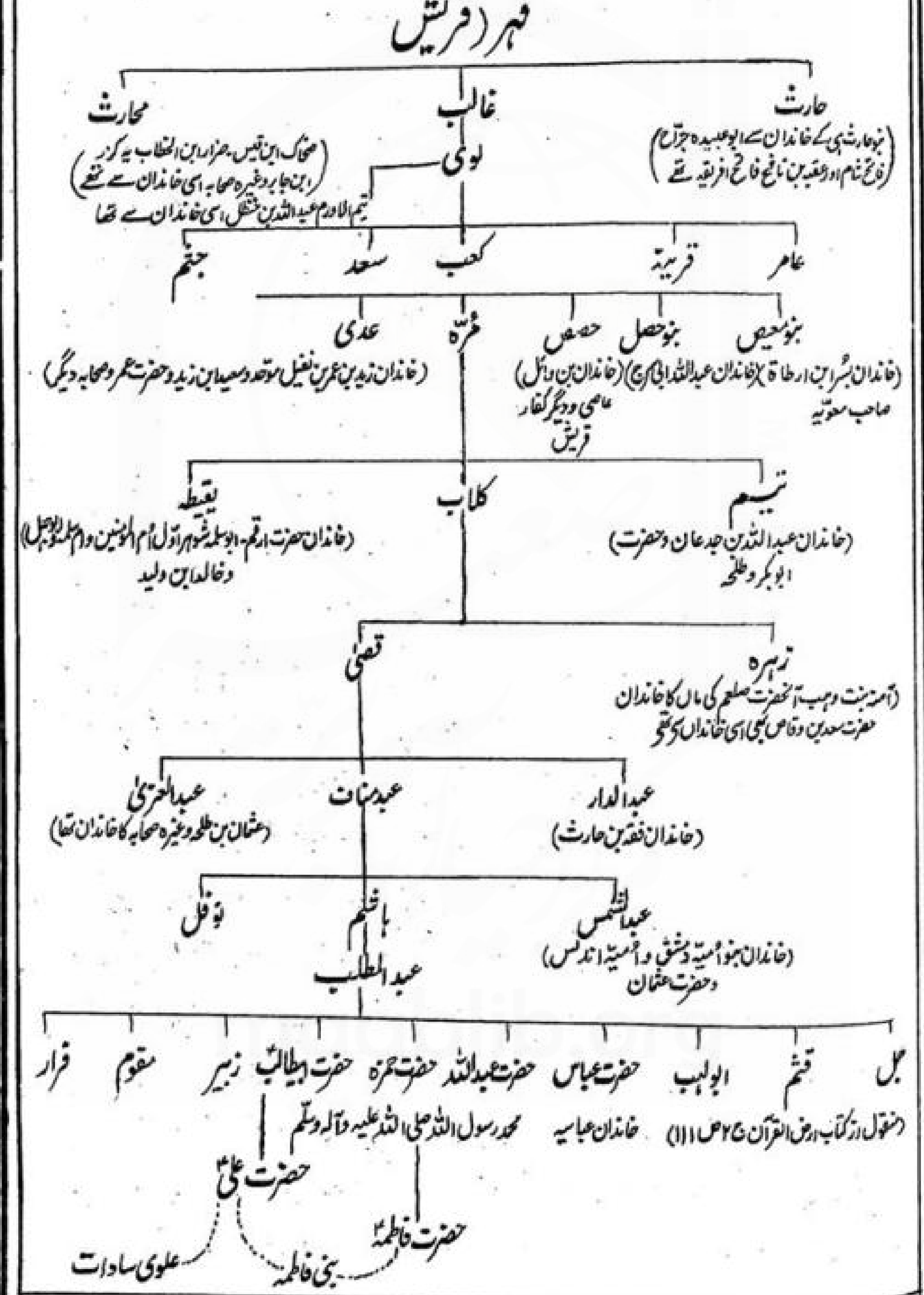

سب سے پہلے قریش کون کہلایا۔ معد ابن عدنان کے بعد اِس خاندان میں مدت تک کوئی شخص قابل الذکر نہیں گذرا۔ اِن سے آئندہ چودھویں پشت میں خزیمہ بن مدرکہ ایک ایسا شخص معلوم ہوتا ہے۔ جس کے بیٹے زہیر نے حجاز میں حکومت کی اور اُسی کے بعد اُس کے بیٹے قیس نے بھی حکمرانی کی۔ مگر افسوس کہ یہ دونوں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے شجرہ نسب میں داخل نہیں ہے۔ اِس لیے ہم نے ان کے تفحص حالات کی زیادہ فکر نہیں کی۔

خزیمہ کی ایک پشت بعد نضر کے وقت سے اِس سلسلہ کے کسی قدر مسلسل حالات و واقعات تاریخوں میں پائے جاتے ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو اور انگریزی کے قدیم وجدید مورخین ومحققین نے اِس سلسلہ کے حالات کو نضر ابن کنانہ ابن خزیمہ کے عہد سے ایک سلسلہ اور ترتیب کے ساتھ لکھا ہے۔ اکثر محققین کا اِسی بنا پر یہ مختار معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِس خانوادہ میں پہلا شخص جو قریش کہلایا۔ وہ نضر ابن کنانہ تھا۔ بعض فہر ابن مالک ابن نضر (نضر کے پوتے) کو اوّل قریش تبلاتے ہیں۔ حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں۔

اما قریش فالاصح فھم جاعھا والاکثرون النضر	قریش صحیح یہ ہے کہ وہ فہر ابن مالک تھا جس نے اُن کو جمع کیا اور اکثروں نے نضر کو تبلایا ہے۔

اِس شعر قدیم عرب سے فہر کی صحت تخصیص تو ضرور معلوم ہوئی۔ مگر اِس کے ساتھ ہی ساتھ نضر کا شمول بھی اِسکے تسمیہ میں ظاہر ہوگیا۔ قول اوّل کے مطابق ممکن ہو کہ قریش کی خصوصیت نضر ہی کے وقت سے پیدا ہوئی ہو مگر اِس نے اِس خصوصیت اور اُس کی شہرت کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ لیکن اُس کی دوسری ہی پشت میں اُسکے پوتے۔ فہر ابن مالک نے اِس کی شہرت کا خاص اہتمام کیا۔ اور تمام بنی نضر کو جمع کرکے اُن کا قریشی ہونا تبلایا۔ نضر اور فہر پر موقوف نہیں۔ اِن سے دو تین پشت بعد قصیٔ ابن کلاب کی نسبت بھی اکثر مورخین کی رائے ہے۔ کہ پہلے یہی شخص قریش کے لقب سے مشہور ہوا۔ کیونکہ قریش کے قومی وجود آثار و اقتدار کا قیام اور اُن کا اجماع اُسی شخص کے وقت سے اور اُسی کے اہتمام و انتظام سے قایم ہوا ہے۔ اور حقیقتاً تمام شاہد۔ قرائن اور دلائل سے یہی وہ شخص تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ جس نے قریشیوں کو عربوں کے قبائل و اقوام سے ایک جدا گانہ اور مشہور زمانہ قوم بنایا۔ اور پھر ایسے اعزاز اور امتیاز کے ساتھ کہ کچھ اہل عرب ہی نے اُسکے اِس قومی القاب اور نام کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ غیر قوموں اور دوسرے قبیلوں نے بھی۔ ان اوصاف اور خصائص کے اعتبار سے نہ نضر ابن کنانہ اصل قریش اور اوّل قریش کہلانے کا اتنا مستحق ہوسکتا ہے۔ اور نہ فہر ابن مالک ابن سعد نے طبقات میں اپنا یہی مختار قائم کیا ہے۔ اِس کے ثبوت میں وہ حسب ذیل شاہد پیش کرتے ہیں۔

قال حذافہ بن غانم العدوی لابی لھب حذافہ ابن غانم العدوی نے ابو الوہب ابن عبد مناف کی تعریف

بن عبد مناف سے ابو کم قصی کان یدعی مجمعا به جمع الله القبائل من فهر۔

یں کہا کرتے تہارے باپ قُصیٰ و مُجمِع ہیں۔ اس لیئے کہ خدانے قبائل بنو فہر کو اُسی کے وقت میں جمع فرمایا ہے اس کے بعد ابن سعد لکھتے ہیں۔

فدعی قصی مجمعا یجمعه قریشا و نقصی سمیت قریش قریشا و کان یقال لهم قبل ذلك بنو النضر۔

قُصیٰ کا لقب مُجمِّع (جمع کنندہ) قرار پایا۔ اسوجہ سے کہ ان کے وقت میں قریش کا اجماع (بہ حیثیت القوم) واقع ہوا۔ قُصیٰ ہی کے وقت سے قریش کا لقب قریش ہوا۔ اس سے پہلے وہ لوگ بنو نضر کہلاتے

ایک دوسری شہادت پیش کرتے ہیں۔

عن سعید ابن محمد ان عبد الملك ابن مروان سئل محمد ابن جبیر متی سمیت قریش قریشا قال حین اجتمعت الی الحرم من تفرقها فذلك التجمع التقرش فقال عبد الملك ما سمعت هذا ولكن سمعت ان قصیا كان یقال له القرشی ولم تسم قریش قبله

سعید ابن محمد کا بیان ہے۔ کہ محمد ابن جبیر سے عبد الملک ابن مروان نے پوچھا کس وقت میں قریش کا لقب قریش قایم ہوا۔ محمد نے جواب دیا۔ اسوقت سے جب اُنہوں نے اپنی مدت کے اختلاف کے بعد آپس میں پھر اتفاق اختیار کیا۔ کیونکہ تقرش کے لغوی معنی تجمع کے ہیں۔ عبد الملک نے کہا کہ میں نے آجتک یہ نہیں سنا تھا۔ لیکن میں نے تو یہ سُنا تھا کہ قصیٰ کا نام قریش پڑا اور اس سے قبل اس قبیلہ کا نام قریش نہیں تھا۔

قصیٰ کے اوّل قریش ہونے کی تیسری شہادت یہ ہے:۔

عن عبد الرحمان ابن عوف قال لما نزل قصی الحرم وغلب علیه فعل افعالا جمیلة فقیل له القرشی فهو اوّل من سمی به

(طبقات ج ا ص۔ ۴۴)

عبد الرحمٰن ابن عوف کا قول ہے۔ کہ جب قصیٰ مکہ میں آئے۔ اور اُنکو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اور اُن سے افعال حسنہ ظاہر ہوئے۔ تو اُن کا لقب قریش مقرر ہوا۔ اور وہ پہلے شخص ہیں جو اس لقب سے موسوم ہوئے۔

عیسائی بلا کے متعصب ہیں۔ ارض القرآن کے حوالے سے اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ وہ بنو اسمٰعیلؑ سے ٹوٹو رزم۔ (طوطمیت) ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بنو اسمٰعیلؑ کی۔ جو اسلام کی اصل ہیں۔ ایک گونہ ذلت منظور ہے (مارگیولوس۔ حیات محمدؐ) فاضل معاصر صاحب ارض القرآن نے ایک دھیما سا جواب بھی دیدیا ہے۔ اور بتلا دیا ہے۔ کہ اگر قریش کے لغوی معنی جانور۔ درندۂ دریا کے سبب سے یہ خیال پیدا کیا ہے۔ تمام خلاف واقع ہے۔ کیونکہ قریش میں کسی وقت جانور پرستی (طوطمیت) ثابت نہیں۔

ہم عرض کرتے ہیں۔ کہ اگر مخالفین اسلام کو اِسی کی وجہ تسمیہ کی خصوصیت پر اصرار ہے۔ جسکا قدیم وجدید عربی تاریخوں میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ تو ہم اُن سے استفسار کرتے ہیں۔ کہ عرب کے اِن قبائل نے ایام جاہلیت

میں جانوروں پر اپنے نام رکھ کر اپنی طوطمیت (جانور پرستی) کا اظہار کیا تھا۔ مگر آپ حضرات تو اِس چکا چوند والی روشنی اور تہذیب کے زمانہ میں بھی مسٹر اَولف (بھیڑیا) مسٹر پی کاک (مور) مسٹر پیرٹ (طوطا) مسٹر ڈکسن (بطخ کا بچہ) وغیرہ اسمائیہم نام رکھ رکھ کر آجتک اپنے ٹوٹو زم کا پورا ثبوت پہونچا رہے ہیں۔

تسمیہ قریش کی اوّلیت کی نسبت ہم نے ابن سعد کی شہادتیں جو اوپر پیش کی ہیں۔ اُن کو اور اُن سے پہلے جو اقوال لکھے گئے ہیں۔ ڈیس اُن کو ایک جا جمع کر کے ایک تحقیق طلب شخص بآسانی حقیقت حال کو سمجھ کر اپنا یوں اطمینان کرے گا۔ کہ اہل عرب (بنو اسمٰعیلؑ) میں قبائل اور عشائر کو ایک خاص قوم بنانے اور اپنے ایک خاص امتیازی نام سے شہرت دیئے جانے کا خیال سب سے پہلے نضر ابن کنانہ کو پیدا ہوا۔ اور اُس نے اِس بنا پر اپنے قبیلہ اور عشیرے والوں کو۔ جتنے بھی اُسوقت جمع ہو سکے۔ پہلے اِسی شخص نے اکٹھا کیا۔ اور اِس تجمع کی رو سے وہ قریش کہلایا۔ اور اُسکے بعد مالک بن نضر نے اِس امر کی طرف توجہ نہیں کی۔ مالک کے بیٹے فہر نے پھر اِس خیال کو زندہ کیا۔ اور قومی مجموعہ کی ترتیب دی۔ مگر وہ بھی خاطر خواہ کامیاب نہ ہوا وجہ یہ تھی۔ کہ غیر قبائل پر حاکمانہ غلبہ نہ نضر ہی کو حاصل ہو سکا۔ اور نہ فہر کو۔ لیکن کسی کا ریاض کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی۔ کوشش ملتوی ہو جاتی تھی۔ ارادہ اور نیت تو دل سے مٹتا نہیں تھا۔ اِس اصول کی بنا پر قریش کی ترتیب قومیت کی نسبت فہر ابن مالک کی سعی و محنت بھی ایک حد تک عرب کے جریدہ میں یادگار رہ گئی۔ اور مورخین اخبار اور محققین انساب نے اُن کو بھی موجد انِ تسمیہ قریش کے ذیل میں تسلیم کر لیا۔

مگر تاریخ و انساب کی کامل اور پر غور ورق گردانی کے بعد محقق ہو جاتا ہے۔ کہ اِن تمام کوششوں کی تکمیل قصیٰ ابن کلاب کے زمانہ میں ہوئی۔ اور قریش کے اِن تمام مجوزہ قومی اصلاح و اتحاد کی بنیاد کا تکملہ اِسی شخص کی ذات خاص سے ہوا۔ اور قبیلہ قریش کی قومی یکجہتی اُن کا خاندانی وقار و اقتدار اور حکومت و آثار غرض سب کچھ اِسی کے زمانہ میں قایم ہوئے۔ اور پھر ایسے استقرار و استحکام کے ساتھ کہ ظہور اسلام تک حکومت حجاز اور امارت کعبہ اِسی خانوادہ میں برقرار رہی۔ جیسا کہ مفصل ذیل سلسلہ بیان سے ظاہر ہے۔

قصیٰ ابن کلاب سے پہلے تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے حالات

قبل اِس کے کہ ہم خانوادہ ابراہیمی کے اِس جلیل القدر اور نامآور بزرگ کے تاریخی حالات شروع کریں مناسبت مقام اور سلسلہ کلام قائم رکھنے کی ضرورت سے ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے متعلق وہ حالات و واقعات جن کو ہم نے حضرت اسمٰعیلؑ کے وقت تک لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ بطور اجمال بیان کر کے قصیٰ ابن کلاب تک اُسکا سلسلہ پورا اور تمام کر دیں

یا تک اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے نابت ابن اسماعیلؑ پر امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کے منصب تفویض ہوئے۔ مگر جیسا کہ علامہ ازرقی اور قریب قریب تمام مورخین و محققین نے لکھا ہے۔ یہ تمام اختیارات قرابت قریبہ کی وجہ سے بنی جرہم کے دست اقتدار میں دیدیئے گئے۔ علامہ ازرقی کی عبارت یہ ہے۔

وترك (اسمٰعيل) ولدا من رعلة بنت مضاض بن عمرو الجرهمي فقام مضاض ابو ولد اسمٰعيل وكفلهم لانه بنوا ابنته فلم يزل امر جرهم يعظم بمكة ويستفحل حتى ولوا البيت وكانوا ولاته وحجابه وولاة الاحكام بمكة۔

حضرت اسماعیلؑ نے رعلہ بنت مضاض بن عمر جرہمی کے بطن سے اولاد عقب چھوڑی۔ مضاض نے وفات اسمٰعیلؑ کے بعد اُن کی اولاد کو اپنے ساتھ رکھا اور اُن کی کفالت کی کیونکہ وہ سب اُن کے حقیقی نواسے ہوتے تھے۔ اُسی وقت سے بنی جرہم کی مکہ میں عظمت قایم ہو گئی۔ یہاں تک تولیت خانہ کعبہ خدمت حجاج اور شہر مکہ کی امارت و حکومت بھی اُن کے قبضۂ اختیار میں آ گئی۔

علامہ ازرقی نے خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی امارت کے متعلق اتنے ہی بیان پر اکتفا فرمائی۔ مگر ہم اُسکو کسی قدر زیادہ تفصیل سے لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تاریخ طبری ابن اثیر زرقانی کے مفصلہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہو۔

حضرت اسماعیلؑ کے بیٹوں میں نابت سب سے بڑے تھے۔ اپنے پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اپنے آبائی منصب پر فائز ہوئے۔ قبیلہ جرہم جو حضرت ابراہیمؑ کی اجازت سے مکہ میں آباد ہوا تھا۔ نابت اور اُن کے تمام معاملات کا نگراں ہوا۔ اِس لیئے کہ حضرت اسماعیلؑ نے رعلہ بنت مضاض ابن عمر جرہمی سے شادی کر لی تھی۔ اور تمام بنو اسماعیلؑ اُنھیں کی اولاد تھے۔ اِس قرابت قریبہ کے رو سے قبیلہ جرہم نابت اور تمام بنو اسماعیلؑ کا ولی اور قریب تر خیر خواہ مقرر ہوا۔ اور مضاض بن عمر رئیس جرہم کو اسی ذریعہ سے تولیت کعبہ اور امارت مکہ حاصل ہوئی۔

مکہ میں اُسوقت دو قبیلے آباد تھے۔ ایک تو بنی جرہم۔ دوسرے بنی قطورہ (عمالیق) بنی قطورہ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بی بی کی اولاد تھے۔ جو یمن سے آ کر مکہ میں بس گئے۔ اُسوقت مضاض بن عمر قبیلہ جرہم کے رئیس تھے۔ اور سمیدع بن قطورہ کا امیر۔ مکہ کے حصہ اعلیٰ میں جرہم مع بنو اسماعیلؑ آباد تھے۔ اور وہاں کی حکومت بنی جرہم سے متعلق تھی۔ شہر کے حصہ پائیں میں بنی قطورہ بستے تھے۔ اور وہاں کی امارت اُن سے تعلق رکھتی تھی۔ حصول ترجیح اور تفضیل کی بنا پر اِن دونوں مختلف قبائل میں بڑی بڑی خونریزیاں واقع ہوئیں۔ اور بالآخر یہ نتیجہ ہوا۔ کہ مضاض نے سمیدع کو قتل کر ڈالا۔ اور

اُنکے قبیلہ کو سخت شکست پہونچائی۔ اور ہمیشہ کے لیئے ایسا کمزور کردیا۔ کہ پھر اُنہوں نے جرہمیوں کے مقابلہ میں سر نہ اُٹھایا۔ اس فتحیابی کے بعد مضاض ابن عمر جرہمی تمام مکہ کا امیر اور حاکم تسلیم کرلیا گیا۔ اور خانہ کعبہ کی تمام خدمات و اختیارات تو اُس کے قبضۂ اقتدار میں پہلے سے تھے ہی۔

مضاض کے بعد اُس کی اولاد میں مدت تک نسلاً بعد نسلاً امارت کعبہ اور حکومت مکہ کے تمام اختیارات باقی اور قائم رہے۔ اور بنی اسمٰعیل کچھ تو قرابت قریبہ اور زیادہ تر اپنی مالی اور قومی ضعف اضمحلال کی وجہ سے اپنے موروثی اختیار و اقتدار کے واپس لینے کے لیئے جرہمیوں سے برسر مقابلہ نہ ہوسکے۔ یہانتک کہ بنی جرہم کے اطوار و رفتار میں بمقابلہ قدیم روش اور حسن سلوک کے بہت بڑا اختلاف اور فرق گیا۔ اور اُن میں ریاست کی شان اور امارت کی تمکنت آگئی۔ اور اُن کی موجودہ شان و سطوت اور امیرانہ شوکت۔ بنو اسمٰعیل کے ساتھ قرابت سدانہ اور عزیز دارانہ محبت اور ہمدردی کی جگہ بیدردی اور نفرت کا اظہار کرنے لگی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بنو اسمٰعیل اور بنو نابت کے کثیر التعداد قبائل۔ و عشائر مختلف اقطاع و حصص ملکی میں جلاوطن ہوہو کر بدویانہ زندگی بسر کرنے لگے جیساکہ تاریخ آل نابت کی تفصیل میں ہم اُوپر لکھکر بتلا آئے ہیں۔ بنو اسمٰعیل و بنو نابت کے معدودے چند قبائل وہیں رہ گئے۔

بنو جرہم کے ظلم و تعدی کی خبریں جب تمام دُنیا میں عالمگیر ہوئیں۔ تو آس پاس کے تمام علاقوں کے قبائل اُنکے خلاف برانگیختہ ہوگئے۔ یمن کے قبیلہ بنی قحطان کی ایک شاخ جو بنی خزاعہ مشہور تھی۔ بنی جرہم پر حملہ آور ہوئی اور اُن کو شکست دے کر تمام شہر اور اُس کے حوالی پر قابض ہوگئی۔

بنی جرہم نے بنی خزاعہ سے شکست پاکر مکہ سے نکل جانے کے وقت یہ حرکت کی کہ عمر ابن حارث جو اُس وقت بنی جرہم کا رئیس تھا۔ اُس نے اپنی قوم و قبیلہ کی صلاح و مشورت سے حجر اسود کو اُس کے مقام سے اُکھاڑ لیا اور اُن دونوں سونے کے ہرنوں کو جو اسفندیار شہریار فارس نے خانہ کعبہ کے نذر کئے تھے۔ اور وہ بیش بہا زرہیں جو خانہ کعبہ کے خزانہ میں مدت سے محفوظ و مخزون چلی آتی تھیں۔ نکالکر چاہ زمزم میں پوشیدہ کردیں اور اس کنوئیں کو مٹی ڈالکر ایسا چھپا دیا کہ چاہ زمزم کا کوئی اثر اور نشان باقی نہیں تھا۔

عدنان ثانی بنی جرہم کی امارت و حکومت تیسری صدی ق م تک قائم رہی۔ اسی طرح بنی خزاعہ کی حکومت و امارت کا سلسلہ سن عیسوی کے سو برس پہلے تک باقی رہا۔ اس اثنا میں بنی اسمٰعیل کی قوت روز بروز ضعیف اور کمزور ہوتی گئی۔ ظالم بخت نصر کے حملوں نے جنکی مدافعت کے لیئے بنی جرہم اور بنی خزاعہ نے حب وطن اور حفاظت بیت اللہ کے تقاضوں اور جذبات سے باہم اتفاق کرلیا تھا۔ مگر ناکامیاب رہے۔ اِن کے معاون و محافظ قبیلہ جرہم کی رہی سہی قوتوں کو بالکل زائل کردیا تھا۔ مگر نظام مشیت نے عدنان دوم کے زمانہ سے بنی اسمٰعیل کی درستی کیطرف توجہ فرمائی۔ اور وہ اس طرح کہ عدنان دوم نے جرہم کے ایک رئیس اور متمول شخص کی لڑکی سے شادی کرلی اور مکہ میں

اسی ذریعہ سے آہستہ آہستہ اپنا اقتدار اثر بڑھایا۔ اور اتنا کہ ان کے صاحبزادہ معد ثانی کی اولاد واعقاب اور اعیان واصحاب حجاز سے نکلکر علاقہ نجد تک پھیل گئے۔

پھر بنی عدنان موجودہ اقتدار کی ترقیوں میں چند پشت تک خلاف اُمید رکاوٹ پیدا ہوگئی اور عدنانی سے لے کر کنانہ ابن خزیمہ تک کوئی ذی اثر اور مقتدر شخص نہیں پیدا ہوسکا۔ مگر باوجود ان لوگوں میں اگر کوئی ایسی ترقی بھی نمایاں نہیں ہوئی۔ تو کچھ ایسا ضعف بھی نہیں پیدا ہوا .... ۔ ایک سکونی حالت برابر قائم رہی

پھر قصی ابن کلاب کے زمانہ میں انھوں نے پورا عروج واقتدار حاصل کرلیا۔

قصی ابن کلاب

قصی ابن کلاب کے حالات زندگی بالکل حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً ایسے ہی ہیں۔ جیسا کہ تاریخوں سے بڑے بڑے نموداران اور سرداران ملکی کے حالات وواقعات پائے جاتے ہیں۔ یوں تو اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے امارت مکہ اور تولیت کعبہ کی خدمات کو انجام دیا ہے۔ مگر حقیقتاً امارت مکہ اور تولیت کعبہ اصول وقواعد کے مطابق قصی کے وقت اور حکم سے قائم ہوئی۔ اسی طرح ملکی رفاہ اور قومی اصلاح کی جو تدبیریں اور ترکیبیں قصی نے جاری کیں اور اون سے اپنے تمام ملک وقوم کو فائدہ پہونچایا وہ میرے سلسلہ بیان سے آئندہ ظاہر ہونگی۔

ابتدائی حالات۔

قصی ابن کلاب کے باپ کلاب بن مُرہ نے خاندان ازدمیں۔ فاطمہ بنت سعد سے شادی کی تھی۔ قبیلہ ازد کے لوگ بھی شہر مارب علاقہ یمن سے آکر مکہ میں بس گئے تھے۔ اور قبیلہ بنی الدیل بن بکر سے شادی بیاہ کرکے اونھیں میں مل جل گئے تھے اسی قبیلہ میں فاطمہ بنت سعد ازدی سے۔ کلاب ابن مُرہ کی شادی ہوئی جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ فاطمہ کے بطن سے پہلے زہرہ ابن کلاب پیدا ہوئے۔ اور پھر ایک عرصے کے بعد قصی ابن کلاب کی ولادت ہوئی۔ مگر قصی کے دودھ چھٹنے کے بعد ہی کلاب کا انتقال ہوگیا۔ اور فاطمہ نے ربیعہ ابن خرام قضاعی سے شادی کرلی ربیعہ نے چند دن کے بعد فاطمہ کو اپنے مسکن وموطن شہر عذرہ علاقہ شام میں ساتھ چلنے کے لئے مجبور کیا اور فاطمہ کو آخرکار جانا ہی پڑا۔ زہرہ ابن کلاب کو۔ چونکہ سن تمیز تک پہونچ چکے تھے۔ اون کے قبیلہ والوں میں چھوڑ دیا۔ اور قصی کو کمسن ہونے کے باعث ہمراہ لے لیا۔ اور ربیعہ اپنے موجودہ شوہر کے ساتھ فاطمہ علاقہ شام میں چلی گئیں۔

علامہ ابن سعد طبقات میں قصی کی وجہ تسمیہ کی نسبت حجاز سے علاقہ شام تک کی مسافت طے کرکے نکلو

انکے قصی نام رکھے جانیکا خاص سبب قرار دیتے ہیں۔ بہرحال قصی نے شہر عذرہ اور قبیلہ بنی قضاعہ میں پرورش پائی اور ہمیشہ اپنے آپ کو ربیعہ کا بیٹا خیال کیا۔ فاطمہ کے بطن اور ربیعہ کے صُلب سے ایک لڑکا پیدا ہوا جسکا نام زراح رکھا گیا۔ ربیعہ نے باوجود اسکے کہ فاطمہ سے اب اسکی صُلبی اولاد بھی پیدا ہوچکی تھی۔ قصی پر اپنے اشفاق و اکرام کم نہیں کئے بلکہ سلسلہ ابراہیمی اور خانوادہ اسمٰعیلی ہونیکے باعث سے انکی عظمت و حرمت ویسی ہی قائم اور برقرار رکھی

قصی کو اپنی حقیقت کی اطلاع

قصی جب سن تمیز کو پہونچے تو ایکدن بنی قضاعہ کے ایک شخص اور ان میں تیراندازی میں ان بن ہوگئی۔ اور فیمابین بات بڑھتے بڑھتے مقابلہ اور مقاتلہ کی نوبت پہونچ گئی۔ اوس مرد قضاعی نے باہمی مکالمہ میں تعریضًا یہ بھی کہدیا کہ تم ہمارے قبیلہ اور موطن سے چلے جاؤ۔ اور اپنے بطن و وطن کیطرف واپس جاؤ۔ ہمارا تمہارا اسیل جول مناسب نہیں۔ کیونکہ تم ہماری قوم و قبیلہ سے نہیں ہو۔ قصی کو جو اسوقت تک اپنے آپکو بنی قضاعہ کا ایک فرد خالص سمجھتے تھے۔ اسکی یہ تعریض بہت بُری معلوم ہوئی۔ قصہ کو رفع دفع کر کے فورًا اپنی ماں کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے میرے باپ کا کیا نام ہے۔ ماں نے کہا ربیعہ قصی بولے اگر یہ سچ ہوتا تو لوگ اس سے انکار نہیں کرتے۔ اب تو ماں سمجھ گئی کہ آج کسی نے حقیقت حال اس سے کہدی۔ ماں نے جواب دیا کہ یہ تم سے کسنے کہدیا۔ اور جس نے بھی کہا ہو تو میں تم سے کہتی ہوں کہ تم اپنی قوم و وطن کے اعتبار سے اس کہنے والے شخص سے بدرجہا بہتر ہو۔ تم ذاتی شرافت نسبی نجابت اور وطنی مفاخرت میں معترض سے بمراتب اعلیٰ ترجیح و تفضیل کے مستحق ہو۔ تمہارا باپ کلاب ابن مُرہ ابن کعب قرشی ہے۔ اور تیرے قبیلے کے لوگ مکہ معظمہ میں بیت اللہ الحرام اور اوسکے چاروں گرد آباد ہیں۔ اتنا سُننا تھا کہ قصی کے دل میں قومی غیرت کا وہ غیر متحمل جوش آیا۔ کہ فورًا ماں کے پاس سے یہ کہتے ہوئے۔ اوٹھ کھڑے ہوئے کہ قسم خدا کی میں اب یہاں ہرگز نہیں رہونگا۔ ماں نے کہا کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ حجاج کے قافلے یہاں سے روانہ ہوں تو میں تمکو اونکے ساتھ کردوں کیونکہ تمہارے تنہا جانے سے مجھکو تمہاری نقصان جان کا اندیشہ ہے؟

مکہ میں قصی کی بازگشت و بچھڑے بھائیوں کی مدت پر ملاقات!

جب بنی قضاعہ کے لوگ حج کرنیکو مکہ جانے لگے۔ تو اونہیں کیساتھ قصی بھی ایک مدت مدید کے بعد مکہ واپس آئے اسوقت تک زہرہ ابن کلاب ان کے بڑے بھائی زندہ تھے قصی مکہ میں کہیں نہیں ٹھہرے۔ بلکہ اپنی ہمراہی جماعت بنی قضاعہ کو ساتھ لئے ہوئے اور تلاش کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی زہرہ ابن کلاب کے مکان پر پہونچے۔ بھائی بہت ہی کبیر السن ہوچکے تھے۔ اور اونکی آنکھوں سے بصارت کی قوت بھی زائل ہوچکی تھی۔ اور وہ بینائی سے ایسے مجبور و معذور ہوچکے تھے۔ کہ زہرہ قصی کو مطلق دیکھ نہ سکے بالآخر قصی نے اپنی معرفت آپ کرائی۔ اور کہا کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی قصی ابن کلاب ہوں۔ زہرہ مرحبا کہکر

اوٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور کہا قریب آجاؤ۔ قصی جب قریب پہنچے تو زہرہ نے انکا بدن ٹٹول کر پہچان لیا اور کہا کہ تم بیشک میرے بھائی ہو۔ زہرہ کے بدن پر تمام بال تھے۔ اور ایسے ہی قصی کے بھی اور تمام جسم پر بال کا ہونا قدیم سے اس خاندان کا معیار تہا۔ زہرہ نے انکا بدن ٹٹولکر اپنے اسی معیار خاندانی کی تلاش کی تھی۔ اور جب وہ مل گئے تو تصدیق کردی

مکہ میں قیام اور بنی خزاعہ میں شادی

بھائی نے پھر تو اپنے مدت سے چھوٹے ہوئے بھائی کو گلے لگا لیا اور بھر بڑی مسرت سے قصی اور اسکی ہمراہی جماعت کو اپنا مہمان کیا جب حج سے فراغت ہوگئی۔ تو جماعت قضاعہ نے معاودت وطن کے لئے عجلت کی اور قصی سے واپسی کے لئے اصرار پر اصرار کیا۔ بالآخر قصی نے واپسی سے قطعی انکار کردیا۔ اور خود بھائی کے پاس مکہ میں رہ گئے۔ اور اونکے تمام ہمراہی اپنے اپنے مقام کو واپس گئے۔

قیام مکہ کے تھوڑے دنوں کے بعد قصی نے اپنی شادی حبی بنت حلیل سے کرلی حلیل اُس زمانہ میں امیر مکہ تھے۔ اور متولی کعبہ معظمہ۔ حوالی مکہ سے لے کر تمام علاقہ حجاز میں بہت بڑے صاحب اقتدار و اختیار مشہور تھے۔ قبائل خزاعیہ کے علاوہ گرد و نواح کے دیگر قبائل و عشایر بھی انکو اپنا سردار اور حکمران تسلیم کرتے تھے۔ اسمیں کوئی کلام نہیں کہ اس قرابت و پیوند سے قصی کی آیندہ کامیابیوں میں بڑی قوت آگئی مگر قصی نے کبھی اس قرابت پر مفاخرت نہیں کی .... اور نہ اسکو کبھی اپنے شارف نسبی پر ترجیح و تفضیل دی۔

حلیل کا انتقال ہوگیا۔ اُسکا بیٹا المحترش اُسکا قائمقام ہوا مگر وہ سراپا نا اہل تہا۔ اور بقول ابن سعد مکہ کے تمام لوگ اُسکے اطوار و کردار سے ناخوش تہے۔ وہ سخت شرابی تھے ہمیشہ مخمور اور نشہ میں چور رہتا تھا۔ قصی نے اوسے شراب پلاکر بیت اللہ کی کنجیاں اوس سے لے لیں۔ آخر زمانہ کے اکثر اسلامی مؤرخین نے اس قول کو اپنی تصنیفات و تعلیقات میں نقل کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی کلید برداری

مکہ کی امارت کعبہ کی تولیت

مغربی محققین کا کیا کہنا۔ اونھوں نے صرف اس وجہ سے کہ مکہ کے اکابر و عمائد میں شرابخواری کی عادت ثابت ہو اس قول کو اتنا معتبر سمجھا ہے کہ گویا اسی کو اپنا مختار اور اپنی تحقیق کا معیار قرار دے رکھا ہے حالانکہ اس روایت کے بعد ہی دوسری روایت بھی طبقات ابن سعد میں موجود ہے جو اس سے زیادہ قوی اور قریب الامکان اور سریع الفہم ہے مگر اسپر نظر نہیں جاتی۔ ہم اونکے ملاحظہ کیلئے اسکی اصلی عبارت ذیل میں قلمبند کرتے ہیں

حدثنی فاطمہ بنت مسلم الاسلمیہ عن فاطمہ بنت مسلم الاسلمیہ فاطمہ الخزاعیہ سے روایت کرتی ہیں جنہوں نے

فاطمة الخزاعية وكانت قد ادركت اصحاب الرسول الله صلعم قالا لما تزوج قصي الى حليل ابن حبشيه ابنته حبي وولدت له اولاده قال حليل انما ولد قصي ولدي هم بنوا ابنتي فاوصى بولاية البيت والقيام بامر مكة الى قصي وقال انت احق به۔

اصحاب رسول صلعم کا زمانہ دیکھا تھا کہ جب قصی نے حلیل ابن حبشیہ کی لڑکی حُبی نامی سے شادی کی اور اس سے قصی کے بال بچے ہوگئے تو حلیل نے کہا کہ قصی کی اولاد میری ہی اولاد ہے کیونکہ وہ میری بیٹی کے اولاد اعقاب ہیں پس مرتے وقت تولیت بیت اللہ اور امارت شہر مکہ کا منصب قصی کے لیے وصیت کر گیا اور کہہ گیا کہ وہی انکا سب سے زیادہ مستحق ہے

ایسے صاف و پاک طریقہ اتصال امارت مکہ اور تولیت کعبہ کی موجودگی میں اُس ناپاک ذریعہ کو کسی کی عقل سلیم قبول نہیں کرے گی

تولیت کعبہ اور امارت مکہ قصی کا موروثی اور جائز حق تھا۔

قبل اسکے کہ ہم اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھائیں ہمکو اس مقام پر اتنا لکھکر دکھلا دینا نہایت ضروری ہے کہ تولیت کعبہ اور امارت مکہ کا منصب جیسا کہ ہم کامل تفصیل اور قوی دلیل سے اوپر لکھ آئے ہیں ذریت اسمٰعیل کا موروثی اور جائز حق تو ضرور تھا لیکن یہ استحقاق اور یہ مناصب منجانب اللہ اونہیں سے اونھیں نفوس کے ساتھ بطور منصوص مخصوص کیا گیا تھا جو اس عہد جلیلہ کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے اور اونکی یہ اہلیت اور صلاحیت بھی ودیعت الٰہی کے خاص انتخاب و عنایات پر موقوف تھے۔ مشاہدات کثیرہ بتلا رہے ہیں کہ باوجود اس کے کہ یہ استحقاق اور یہ مناصب دوسروں کے قبضہ و اختیار میں چلے بھی جائیں اور غیر مستحقین اونپر غصب۔ جبر۔ غلبہ۔ استیلا یا اور کسی تدبیر اور حکمت عملی سے متصرف بھی ہو جائیں۔ مگر وہ ایک نہ ایک دن اونھیں غیر مستحقین سے اپنے اصلی مستحقین کی حقیقت اور اصلیت کے اقرار و اعتراف کرا ہی چھوڑتے ہیں ثبوت کے لئے حُلیل خزاعی کا واقعہ جو ابھی ابھی لکھا گیا ہے موجود ہے حُلیل خزاعی باوجود اسکے کہ سالہا سال اور پشتہا پشت سے تولیت کعبہ اور امارت مکہ پر متصرف اور متقابض چلا آتا تھا۔ عرب کے قریب قریب تمام قبائل و عشائر بلکہ خود بنی خزاعہ کو اس تولیت اور امارت کا جائز حقدار تسلیم کر چکے تھے۔ مگر تاہم جب اس حقیقی مستحق کا سامنا ہوگیا۔ تو آخر حلیل خزاعی کو اتنی مدت مدید کے قبضہ و تصرف کا اقرار و اعتراف کرنا ہی پڑا۔ اور خود دست بردار ہو کر اپنے بعد قصی کے قبضہ و اختیار میں واپس کرنا پڑا۔

بنی خزاعہ اور بنی بکر سے مقابلہ اور قصی کی فتح مکہ۔

حلیل نے واگذاشت حقوق قصی کی وصیت تو کر دی مگر اوسکی وصیت پر عملدرآمد نہیں ہوا۔ اور بنی خزاعہ اور بنی بکر نے ملکر قصی کو امارت و تولیت کے منصب پر قابض نہیں ہونے دیا۔ قصی نے اونسے فوری منازعت کو مصلحت نہ سمجھا تھوڑے دن اور صبر کیا۔ یہاں تک کہ چند روزوں میں قصی اور اونکی اولاد نے مکہ اور اوسکے اطراف و جوانب

میں اپنی کاروبار تجارت کے ذریعہ سے اپنی مالی حالت ایک حدتک درست کرلی۔ اسی اثنا میں قصی نے تمام قریش اور بنی کنانہ کو جو حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل کی صحیح النسل اولاد تھے ایک مجمع خاص میں مجتمع کر کے تولیت کعبہ اور امارت مکہ کیمتعلق ایک طولانی تقریر کی اور اوسمیں پوری تفصیل سے بیان کیا کہ قریش اور بنی کنانہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل کی صحیح اولاد ہیں۔ اور قبیلہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے مقابلہ میں امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کی خاص طور پر مستحق ہیں۔ تو اس بنا پر ہماری موجودگی میں کسی دوسرے کو اسپر قبضہ و تصرف کا کوئی حق حاصل نہیں ہے ان سے پہلے بالمسالمت اِن امور کے منتزع کرنیکی کوشش کی جائے۔ اگر وہ بالمسالمت اسکا تصفیہ نہ کرسکیں تو پھر یہ تمام اختیارات اونسے بالمنازعت واپس لئے جاویں

یہ سنکر تمام قریش اور بنی کنانہ نے قصی کی اِس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور اسکی اطاعت و متابعت اختیار کرلی اسی روز سے قریش کا نام اِس خصوصیت کے ساتھ شہرت پذیر ہوا۔ کیونکہ اونکا اتفاق و اتحاد اسی وقت سے مستحکم ہوگیا۔ اور یہی وہ قوی وجوہ ہیں۔ جو نظر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک وغیرہ کے مقابلہ میں قصی کو قریش کے اصلی باعث تسمیہ ہونیکا صحیح ثبوت پہنچاتے ہیں۔ ابن سعد محمد ابن عمر کے اسناد سے طبقات میں لکھتے ہیں

لما فرغ قصی و نفی خزاعہ و بنی بکر عن مکۃ تجمعت الیہ قریش فسمیت یومئذ قریشا لحال تجمعھا والتقرش التجمع۔

طبقات ج ا ص ۳۸

جب قصی کو کسی قدر فارغ البالی حاصل ہوئی تو بنی خزاعہ اور بنی بکر نے اونکو قیام مکہ سے منع کیا۔ تب قریشیوں نے اسکے پاس ملکر اجماع کیا۔ اور اسی دن سے انکا نام قریش مشہور ہوا کیونکہ قریش کے معنی جمع ہونیکے ہیں۔

تاریخوں کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ بنو اسمٰعیل کے دلیں تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے نکلنے یا کسی وجہ سے اُس سے نکلجانے یا باز رکھے جانیکا بہت بڑا خیال اور ملال پیدا ہوتا تھا۔ جسکو وہ اپنی مجبوری اور ضعف کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ مگر جب کبھی انکی حالتوں میں ذرا بھی درستی اور قوت آجاتی تھی تو وہ فوراً غیر قوموں کے قبضہ و اختیار سے اپنے اِن حقوق مخصوصہ کے واپس لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے نظر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک نے بھی اپنے اپنے وقتوں میں اسی امر خاص کے لئے۔ اپنے قوم و قبیلہ کو مجتمع کیا تھا۔ مگر اس اجماع سے اپنا کام نکال سکا۔ اور نہ فہر ابن مالک۔ انکا ارادہ میں کامیاب ہوسکا چونکہ مشیت ایزدی اِس کامیابی کا سہرا مخصوص طور پر قصی کے سر پر باندھ چکی تھی۔ اِس لئے فہر سے چھ پشتوں کے بعد قصی نے اپنی اِس آبائی تمنا و مدعا کو خاطر خواہ پورا کیا اتنا لکھ کر ہم اپنے سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ قصی نے جب مکہ میں اپنی قوم و قبیلہ کو اِس مہم کی انجام دہی پر پورے طور سے راضی اور آمادہ کرلیا تو اس نے اندرونی قوت کے ساتھ اپنی بیرونی طاقت کی درستی کا بھی سامان کیا اور اپنے بھائی رزاح ابن ربیعہ کو لکھ بھیجا۔ وہ بھائی کا خط پاتے ہی اپنی قبیلہ سے ایک معتد بہ جمعیت لیکر

مکہ میں پہنچ گیا۔ جب قصی اور بکر و بنی خزاعہ میں بالمسالمت کوئی تصفیہ ہو۔ اور بنی خزاعہ میں بالمسالمت کوئی ...... اور بنی بکر کسی طرح قصی کی تولیت اور امارت پر راضی نہ ہوئے۔ تو بالآخر جانبین سے مقابلہ کی نوبت پہونچی۔ مقام ابطح میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ طرفین سے کثیر التعداد لوگ مارے گئے۔ آخر جانبین سے مصالحت پیش ہوئی۔ یعمر ابن عوف حکم ہوئے۔ اور انھوں نے قصی کو تولیت کعبہ اور امارت مکہ معظمہ دلوا دی اور بنی بکر و خزاعہ کا خون بہا بھی قصی سے نہیں دلوایا بلکہ اس کے خلاف بنی بکر و بنی خزاعہ سے قصی کے مقتولین کی دیت دلوادی اور اسی وجہ خاص سے حجاز میں یعمر ابن عوف کا نام شداخ ہو گیا۔ کیونکہ اوس نے بہت خونوں کو رائگاں کر دیا۔ (طبری۔ ابن سعد)

قصی نے زور شمشیر سے مکہ کو فتح کیا ہے نہ کسی حیلہ و تدبیر سے

جب قصی کے تمام معاملات خاطر خواہ درست ہو گئے تو قصی نے اپنے علاتی بھائی زراح ابن ربیعہ اور اوس کی ہمراہی جمعیت کو اونکے وطن کیطرف رخصت کر دیا اور اسی وقت سے قریش اور بنی ربیعہ کے مابین باہمی تعلقات اتحاد اور زیادہ قوی اور مستحکم ہو گئے۔ قوم ربیعہ کے لوگ سالانہ ایام حج میں بلاناغہ آنے لگے اور قصی کے مہمان رہنے لگے قریش بھی قصی کے ساتھ اونکی قرابت کی رعایت سے بنو ربیعہ کی تعظیم و تکریم کرنے لگے اور جنگ خزاعہ کے وقت سے بنو ربیعہ کو اپنا شریک و معین یقین کرنے لگے۔

ہم نے قصی کے حالات کو اسوجہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ اکثر محققین و مورخین کا یہ خیال ہے کہ قصی ابن کلاب نے امارت مکہ و تولیت کعبہ بے محنت مشقت صرف اپنے حیلہ و حکمت سے المحرش ابن حلیل کو شراب پلاکر حاصل کر لی۔ محض بے اصل ہے مندکرہ بالا شواہد تاریخی ثابت کر رہے ہیں کہ اپنے آبائی قوت و اختیار اور امارت و اقتدار کے حاصل کرنے میں قصی کو کتنی زحمتیں اوٹھانی ہوئیں۔ اور کتنے سامان فراہم کرنے ہوئے۔ یہ ممکن ہے کہ المحرش کو شراب پلاکر کلید کعبہ حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر صرف کنجی ملجانے سے یا ایک المحرش کے تسلیم و رفیق ہوجانے سے قصی کو امارت مکہ اور تولیت کعبہ حاصل ہونیوالی نہیں تھی۔ بنی بکر اور بنو خزاعہ کب اسکو قبول کرتے جبکہ وہ خاتمہ جنگ باوجودیکہ حلیل کی وصیت اور المحرش کی نااہلیت اور قصی کے ساتھ اسکے سازباز سے بھی آگاہ ہو چکے تھے قصی کے استحقاق و مطالبات سے انکار ہی کرتے رہے۔

اِن شواہد کو پیش نگاہ رکھکر ایک محقق آسانی سے تصفیہ کریگا کہ قصی ابن کلاب نے اپنی آبائی حکومت و امارت اور خاندانی عظمت و اقتدار ایک سخت لڑائی کے بعد جیسی کہ عربی قبائل میں لڑائیاں ہوتی ہیں بہر انتہا حاصل کیا ہے حالات و واقعات مذکورۂ بالا سے کامل طور پر ثابت ہے۔ ان شواہد تاریخی کے مقابلہ میں فریب و شراب والی روایت اگر مان بھی لیجائے تو قول منفرد ثابت ہوتی ہے جس کی کوئی تفصیل و تصریح ثابت نہیں۔ اس بنا پر یہ

اس روایت کو تاریخی واقعہ سمجھنا غلطی ہے۔

قومی اصلاح اور دارالندوہ کی افتتاح

قصی نے اسی اثناء میں بنی نظر بنی کنانہ اور بنی فہر کے قبائل کو جو بنو بکر و بنو خزاعہ کی غلبہ و ظلم سے سکونت مکہ ترک کرکے مختلف مقامات میں آباد ہو گئے تھے پھر مکہ میں واپس بلالیا۔ شہر میں عموماً تمام اور بیت اللہ کے خصوصاً چاروں طرف دور دور تک خار دار درختوں کے جنگل کھڑے تھے۔ اور اون معبدالہی کی صفائی اور پاکیزگی کو بالکل بدنما بنا رہے تھے۔ قصی نے سب سے پہلے ان تمام مقامات کی صفائی کو مد نظر رکھکر ان تمام جنگلوں کے کٹوا دینے کا عزم کیا قبیلہ قریش کے اکثر اور عرب کے دیگر اقوام و قبائل نے اپنی قدامت پسندی اور اوہام پرستی کی بنا پر قصی کو اس امر سے روکنا چاہا۔ مگر قصی نہ ماننے اور اعوان و انصار کو ہمراہ لیکر اون جنگل جھاڑیوں کو خود کاٹنے لگا اور اسکی یہ تہدید اور آمادگی دیکھکر تمام عرب اُسکے شریک ہو گئے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ مقامات بالکل صاف و شفاف ہو گئے تو قصی نے ان تمام مقامات کو چار حصوں میں منقسم کیا۔ اور باہر سے آئے ہوئے قریشیوں کے مختلف قبائل و عشائر کو ان مقامات میں بسایا۔ ان انتظامات نے قبائل قریش ہی پر نہیں بلکہ تمام اقوام عرب پر قصی کی امارت و حکومت کو کامل اور مستحکم اثر پیدا کر دئے۔ اور اہل عرب دینی اور دُنیاوی حیثیت سے قصی ابن کلاب کو اپنا پیشوا اور سردار تسلیم کرنے لگے۔

قصی ابن کلاب کے دیگر انتظامات متعلقہ تولیت کعبہ امارت مکہ کی تفصیل میں ابن سعد لکھتے ہیں۔

عن ابی صالح عن ابن عباس قال کان قصی ابن کلاب اوّل ولد کعب بن لوی اصاب ملکا اطاع له قریش قومه فکان شریف اهل مکة لا ینازع فیها فابتنی دار الندوة و جعل بابها الی البیت ففیها کان یکون امر قریش کله وما ارادوا من نکاح او حرب ومشورة فیما ینوبهم حتی ان کانت الجاریة تبلغ ان تدرع فما یشق درعها الا فیها ثم ینطلق بها الی اهلها ولا یعقدون لواء حرب لهم ولا من قوم غیرهم الا فی دار الندوة یعقده لهم قصی ولا یعذر لهم غلاما الا فی دار الندوة ولا تخرج غیر من

ابی صالح ابن عباس سے ناقل ہیں کہ کعب بن لوی کی اولاد میں قصی ابن کلاب پہلا شخص ہے جس نے ملکی حکومت حاصل کی اور اسکی تمام قوم نے .... اُسکی اطاعت اختیار کی اور بلا منازعت احمد وہ پہلا شخص ثابت ہوتا ہے جو شریف مکہ تسلیم کیا گیا اسنے دار الندوہ کی بنیاد قائم کی اور اُسکے دروازہ کو حرم محترم کے اندر داخل کیا اسی مکان میں قریش کے تمام امور جنکی تھے جو تھے مثل نکاح حرب و ضرب مقابلہ و مقاتلہ اور دیگر تمام ضروریات کی نسبت اسی مکان میں جمع ہوکر مشورت کیجاتی تھی۔ یہانتک کہ عروس کا خلعت عروسی بھی یہیں قطع ہوتا تھا اور یہیں پہنایا جاتا تھا۔ اور یہیں وہ اپنے گھر رخصت کیجاتی تھی۔ اور قریش کی علاوہ عرب کے دوسرے قوم و قبیلے کے لوگ بھی سوائے اس جگہ کے اور کسی دوسری جگہ اپنا علم جنگ

قريش غير حلون الا منها ولا يقدمون الا
نزلوا فيها التشريفاله وتيمنا برايته ومعرفة بفضله
ويتبعون امره كالدين المتبع لا يعمل بغيره
في حياته وبعد موته وكانت اليه الحجابة و
السقاية والرفادة واللواء والندوة وحكم
مكة كله وكان يعشر من دخل مكة سوى اهلها

آراستہ کرنیکے مجاز نہیں تھے۔ اور اُس علم کو سوائے قصیٰ کے کوئی دوسرا
مرتب بھی نہیں کر سکتا تہا۔ اور ناکے غلام بھی اپنا غلام سوائے یہاں کے کہیں اور
نہیں پیش کر سکتا تہا۔ اور کوئی قافلہ سوائے اس مقام کے کسی دوسرے
مقام کو مرتب ہو کر اوٹھ لیا نہیں جا سکتا تہا۔ اور اسی طرح داخلہ کیوقت
بھی اسکو تحریم و تکریم کے خیال سے پہلے اسی مقام پر آنا ہوتا تہا اور
یہ تمام امور قصیٰ کے فضائل و معارف کی معرفت اور آنحضرت کے اختیار و اقتدار
کی متابعت پر مبنی تھے۔ اور تمام لوگ اسکے علم و احکام کو فرائض منصبی کیطرح واجب التعمیل سمجھتے تھے۔ اور کوئی شخص اپنی حیات یا وفات کے بعد
بھی اس کے خلاف ورزی نہیں کر سکتا تہا۔ اور قصیٰ کے قبضہ اختیار میں حجابۃ کعبہ سقایۃ الحاج۔ رفادہ ؛ اللواء دار الندوہ امارت مکہ
غرض تمام ملکی۔ قومی اور دینی مناصب قائم اور برقرار تھے۔ طبقات ج ۱ ص ۳۹

مذکورۃ بالا خدمات کعبہ میں سقایہ اور رفادہ کے ماسوا، اور بقیہ خدمات کی تفصیل کامل طور سے اوپر بیان ہو چکی ہے ذیل میں سقایہ اور رفادہ کی تفصیل بھی قلمبند ہوئی ہے۔

فرض قصي على قريش السقاية والرفادة
فقال يا معشر قريش انكم جيران الله
واهل بيته واهل الحرم وان الحاج
ضيفان الله وزوار بيته وهم احق الضيف
بالكرامة فاجعلوا لهم طعاما وشرابا
ايام الحج حتى يصدروا عنكم ففعلوا فكانوا
يخرجون لذلك كل عام من اموالهم خرجا
يترافدون ذلك فيدفعونه اليه فيصنع
الطعام للناس ايام منى وبمكة ويصنع
حياضا للماء من ادم فيسقي فيها بمكة ومنى
وعرفة فجرى ذلك من امره في الجاهلية على
قومه حتى قام الاسلام ثم جرى في الاسلام
على ذلك اليوم -

طبقات ج ۱ ص ۴۱

قصیٰ نے ایام حج میں قریش پر حجاج کی ضیافت اور پانی پلانے کی خدمت کو فرض کر دیا
اسکی تفصیلی کیفیت یہ ہے کہ قصیٰ نے تمام قریش کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ مقربان خدا ہو
اور اہلبیت خدا اور اہل حرم کہلاتے ہو۔ اور حجاج حقیقت میں خدا کے مہمان ہیں
اور خانۂ مقدس کے زائر۔ اور تکریم و اکرام ضیف کے متعلق وہ تمہارے
اور مہمانوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لئے تم لوگ اُن کی سقائی اور مہمانداری
کا اسوقت تک پورا انتظام تیار کر رکھو جب تک کہ وہ تم سے رخصت ہو کر
تمہارے شہر سے واپس جائیں۔ تمام لوگوں نے قصیٰ کے اس حکم کو مان لیا اور
اقرار کیا کہ ہم حجاج کو پانی پلائیں گے۔ اور کہانا کہلائیں گے۔ اُن لوگوں
نے اُسی وقت سے یہ قاعدہ اختیار کر لیا۔ کہ سال بھر میں ہر شخص ضیافت
حجاج کے لیئے اپنے مال سے کچھ خرچ نکال لیا کرتا تہا۔ اور سب اسکو قصیٰ
کے پاس جمع کراتے تھے۔ اسی رقم مجموعے سے قصیٰ حجاج کی ضیافت کا سامان
اُن کے قیام مکہ و منی کے ایام میں کیا کرتے تھے۔ قصیٰ نے اُس کے متعلق
بڑے بڑے متعدد حوض بنوائے تھے۔ اور مقامات مکہ۔ منی اور عرفات
میں انہیں حوضوں کے ذریعہ سے تمام حجاج کو پانی پلایا جاتا ہے۔

قصی نے ایام جاہلیت میں ان قومی انتظام کو رائج کیا تھا۔ اور فی نفسہ اور باصلہ یہ امور ایسے مفید تھے۔ کہ اسلام نے بھی آج تک انکو جاری رکھا۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۴۱۔

قصی ابن کلاب کے یہ حالات و واقعات تھے جنکو ہم نے مختلف ماخذوں سے مندرجہ بالا عبارت میں جمع کردیا ہے اور شبلی صاحب کے اختصار اور بالاجمال بیان سے قطع نظر کرکے ان واقعات کو حتی الامکان وسعت اور تفصیل کے ساتھ اس ضرورت خاص کیوجہ سے قلمبند کیا ہے کہ قبیلہ قریش پر تنہا موقوف و محدود نہیں بلکہ تمام اقوام عرب کی نام و نمود۔ انکا تمدن۔ انکی تہذیب و اخلاق و معاشرت۔ غرض عرب کے تمام دینی۔ دنیاوی ملکی اور قومی اقتدار اسی شخص کی تنہا قابلیت صلاحیت تدبیر اور تجویز سے وجود پذیر ہوئے۔ اور تاریخوں کی یہی شخص پہلا اور تنہا ثابت ہوتا ہے۔ جو قوم عرب کو ایک علیحدہ قومیت کی امتیازی صورت میں لایا۔ اور اون کو دوسرے اقوام و قبائل کی نگاہ ہوں میں۔ تعظیم و تکریم اور وقعت کے قابل ٹھیرایا۔

قصی کے جن ملکی اور قومی رفاہ و اصلاح کے کاموں کا ہم اوپر ذکر کرآئے ہیں۔ وہ کامل طور سے تمدن و تہذیب سیاست اور حسن معاشرت میں اوسکی اعلیٰ قابلیت و استعداد کو ثابت کررہے ہیں۔ علی الخصوص خانہ کعبہ اور حجاج کعبہ کی ضیافت کے انتظام و سامان اوسکو وارث خوان خلیل الٰہی اور خانوادہ اسمٰعیلی کا سرمایہ ناز بتلاتے ہیں۔ اس نمودار قوم اور افتخار قبیلہ نے ۴۸۰ء میں انتقال کیا۔

عبد مناف ابن قصی کی امارت

قصی ابن کلاب کے چار بیٹے تھے۔ ان میں عبد الدار سب سے بڑا تھا۔ لیکن بالکل ضعیف اور کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ قصی نے اگرچہ مرتے وقت حرم محترم کے تمام خدمات عبد الدار ہی کو دئے مگر اوسکی ناقابلیت اور ضعیف المزاجی کے باعث قصی کے بعد قریش کی دستار ریاست عبد مناف کو سرہ بندھی۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں

كان عبد الدار بكره واكبر ولده وكان ضعيف وكان اخوته قد شرفوا عليه۔

(طبقات ج ۱ ص ۴۱)

عبد الدار قصی کے پہلوٹے بیٹے اور اکبر اولاد تھے۔ مگر ضیف المزاج تھے اور اسی بنا پر اونکے بھائیوں کو اونپر فوقیت حاصل ہوگئی۔

عبد مناف کے زمانہ امارت مکہ میں کوئی قابل الذکر واقعہ تاریخوں میں پایا نہیں جاتا جس کو خصوصیت کیساتھ ہم اون کے ذکر میں نقل کرتے سب سے بڑا شرف جو عبد مناف کو حاصل ہوا یہ تھا کہ اونھیں کے نسل میں ہمسر کائنات شرف موجودات حضرت ختم الانبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذیجود قائم ہوا۔

مبارک آں صدف باشد　　کہ چوں تو گوہرے دارد

ہاشم ابن عبد مناف کی امارت مکہ

عبد مناف کے چھ بیٹے تھے۔ اِن میں حضرت ہاشم نہایت ہی مشہور و معروف اور قابل عظمت بزرگ تھے اور تمام قریش میں یہ وہ نمودار اور ذی اقتدار شخص گذرا ہے۔ جسکے ذاتی اوصاف و قابلیت نے تمام قوم قریش کی گذشتہ وجاہت اور اثر کو علاوہ حجاز اور حوالی مکہ ہی میں نہیں بلکہ عرب اور تمام ہمسایہ ممالک اور اقوام و قبائل میں باستقلال قایم کر دیا۔ اسمیں کوئی کلام نہیں بنو اسمٰعیل میں قریش کی نمود اریوں کی ابتدا، جیساکہ ہم اوپر لکھکر بتلا آئے ہیں۔ قصی ابن کلاب کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ مگر جب ان واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اونکی ترقی کا وہ وقت محض آغاز ہی آغاز تھا۔ قصی کی لیاقت اور قابلیت میں کوئی عذر نہیں۔ اوںھوں نے اپنی وقتیں اپنی گذشتہ قومی اور خاندانی عظمت و قوت واپس لینے میں اور اپنے ملک و قوم کی حالتوں کے درست کرنے میں۔ اور اُنکے نظام ترتیب کے درست و فراہم کرنے میں بہت ہی مفید اور کارآمد تدبیریں سوچیں اور اُنمیں سے اکثر کو عمل میں بھی لائے اور اونکے مفید نتیجے بھی دکھلائے۔ مگر اصول ارتقا کے مطابق چونکہ ہر شے کی تمہید اور تکمیل بیک وقت نہیں ہوسکتی تھی اسی لئے قصی کی مختلف تجاویز و تدابیر اونکے قومی اور ملکی عروج و ترقی کا مقدمہ تھا جنکی ترتیب و تکمیل حضرت ہاشم کے زمانہ میں عرش الکمال تک پہونچگئی۔ اور اسکے اختتام و اہتمام کا سہرا انھیں کے سر باندھا گیا جیساکہ ہمارے سلسلہ بیان سے آیندہ ظاہر ہوگیا۔

خانہ کعبہ کی خدمتیں حضرت ہاشم نے سب سے پہلے خدمات کعبہ کی درستی و ترتیب کیطرف توجہ فرمائی جنکی نسبت قصی کے زمانہ ہی سے چند قسم کے انتظامی شکایتیں چلی آرہی تھیں مگر عبد الدار قصی کیوقت ہی سے ان خدمات کے مختار و منتظم قرار پا چکے تھے۔ اسلئے اسمیں کسی قسم کی مداخلت سے آپس کی مشاجرت کا پورا خوف تھا۔ مگر بنی عبد الدار کی بے احتیاطی اور بے ترکیبی بڑھتے بڑھتے اس زمانہ میں ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ اسلئے حضرت ہاشم نے ان خدمات مبارک کی اصلاح و درستی کی ضرورت کو آپس کی مشاجرت اور مخالفت کے خوف پر ترجیح دی۔ ایکدن اپنے سب بھائیوں کو جمع کیا۔ اور اونکے مجمع میں ان امور کو پیش کیا۔ سبنے بنی عبد الدار سے ان خدمات کے واپس لینے کی تجویز میں ہاشم کی رائے سے اتفاق کیا۔ بنی عبد الدار کو ان خدمات کے واپس دینے کا پیغام بھیجا گیا۔ اونھوں نے قطعی انکار کر دیا۔ اس بنا پر فیمابین کشیدگی اور رنجیدگی واقع ہوگئی۔ اور پھر تھوڑے دنوں میں بڑھتے بڑھتے جانبین سے مقابلہ اور مقاتلہ کی تیاریاں ہونے لگیں بالآخر موجودہ مخالفت و مشاجرت اِس شرط مصالحت کے ساتھ ختم کر دیگئی کہ خدمات کعبہ کے متعلق سقایہ اور رفادہ کے خدمات بنی عبد الدار سے واپس لیکر بنی عبد مناف کو واپس کر دئے گئے۔ اور حجابہ۔ لوا۔ اور دار الندوہ کے خدمات

بنی عبد الدار کی تحویل میں چھوڑ دئے گئے۔ مگر ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔ کہ دار الندوہ کے اختیارات بنی عبد الدار کے ہاتھوں میں کبھی نہیں گئے۔ جب تک کہ عکرمہ ابن ہاشم ابن عبد مناف نے معاویہ ابن سفیان کے ہاتھ اوسکو بیچ نہ ڈالا۔ اس بنا پر سقایہ۔ رفادہ کیطرح دار الندوہ کا منصب بھی ہاشم ابن عبد مناف کے قبضہ میں آگیا"

مولوی شبلی صاحب کی یہ تحریر بالکل غلط ہے۔ کہ امارت مکہ اور تولیت کعبہ حضرت عبد المطلب کے عہد میں بنی ہاشم سے منتزع ہوگئی تھی۔ آپ کی یہ رائے شاید شرائط صلحنامہ مرقومہ بالا پر مبنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبقات کی عبارت پر نظر نہیں پڑی۔ بہر حال ہم اس مسئلہ کو حضرت عبد المطلب کے خاص حالات میں مفصل طور سے لکھکر بتلا دینگے کہ مولوی صاحب کا یہ قیاس اون کی تحقیق کی خامی ہے۔

ان تینوں خدمات (سقایہ۔ رفادہ۔ اور الندوہ) کو جس خوش اسلوبی سے ہاشم مرحوم نے اپنے زمانۂ حیات میں انجام دیا وہ آجتک تاریخ عرب میں اونکے حسن انتظامی اور خوش لیاقتی کی یادگار ہے۔ خانہ کعبہ کی مقدس خدمات کیخاطر خواہ اصلاح و ترمیم فرماکر ہاشم مرحوم ملکی اور قومی رفاہ و ارتقا کی طرف متوجہ ہوئے۔

ملکی اور قومی رفاہ و اصلاح

دنیا جانتی ہے کہ عرب چٹیل میدان اور تمام تر ریگستان ہے اور اہل عرب بالکل مفلس اور نادار قوم۔ اپنی کم سرمایگی۔ اور بے سروسامانی کی وجہ سے وہ کسیطرح اپنی حالتوں کو درست نہیں کر سکتے تھے۔ اونکی ناداری۔ انکا افلاس اونکی ترقی اور خوشحالی کا سخت مانع تھا۔ یہ ہاشم مرحوم کی قومی ہمدردی اور ملکی رفاہ کیخدمات تھی جسنے اپنے ملک و قوم کو ایک مدت مدید اور عرصہ دراز کی تنزلی مفلسی اور ناداری کو بعد ترقی اور مرفہ الحالی کے درجوں تک پہنچایا۔ اور رفتہ رفتہ اپنی مفلوک الحالی اور بے سرمایہ قوم و قبیلہ کو تجارت پیشہ قوم اور کاروباری فرقہ بنایا تمام مغربی اور مشرقی مورخین و محققین کا اسپر اتفاق ہے کہ قریش کے مشہور و معروف قبیلہ میں بیوپار اور کاروبار کرنے کا خیال شوق اور مذاق ہاشم مرحوم ہی نے پیدا کیا۔ اگرچہ علم آثار کے اکتشافات و تحقیقات جدیدہ سے عرب میں مشغلہ تجارت کا وجود ہاشم سے بہت قبل پایا جاتا ہے۔ مگر وہ بنی قطورہ۔ اور بنی سبارہ۔ (عرب اودمی) اور اصحاب مدین وغیرہ خاص اقوام و قبائل تک محدود تھا۔ اگر انہیں کہیں کہیں بنو ہاجرہ یا اسمٰعیلی عرب کا ذکر آجاتا ہے تو اونکا شمول کوئی خاص تعلق میں شمار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اونہیں غیر اقوامی تاجروں کے ذیل و ضمن میں تصور کرنا ہوگا:-

ہاشم مرحوم کے ایسے سچے اور خاص حامی قوم نے دو ہزار برس کی جہالت کے اوس تاریک زمانہ میں اپنی ملکی رفاہ اور قومی اصلاح و ترقی کے لئے۔ اپنی قوم و ملک کو سب سے پہلے وہی ذریعہ اور وسیلہ بتلایا جو فی زماننا۔ کمال تہذیب کمال تمدن۔ اور کمال ترقی کے موجودہ زمانہ میں بھی ہمارے ملکی اور قومی ریفارمر (مصلح) اپنی اپنی مختلف قوم اور جماعتوں کو اونکے عروج و ترقی حاصل کرنیکے لئے بتلایا۔ اور دکھلایا کرتے ہیں اسلئے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا

ہے کہ ملکی اور قومی رفاہ کے خدمات وخیالات کے متعلق ہاشم مرحوم کی حُسن تدبیر۔ آپکا اعلیٰ تمدن دوہزار برس پہلے بھی ترقی اور کمال کے اُوسی درجہ پر پہنچا ہوا تہا۔ جس درجہ اور مقدار تک زمانۂ موجودہ کے ہمدردان قوم ووطن کے خدمات وخیالات پہونچے ہوئے ہیں۔

قریش کی قومی تجارت میں ترقی

قومی ہمدردی اور مُلکی رفاہ کے خیالوں سے بیحد متاثر ہوکر ہاشم مرحوم نے اونکو تجارت کیطرف خاص طور پر رغبت دلائی۔ اور اپنے خاص سرمایہ سے ہمت بھی کیونکہ عرب کی جاہل قوموںکو اگر دُنیا کے کاروبار میں کسی شے سے دلچسپی تھی بھی تو وہ تجارت ہی تھی۔ عموماً تمام لوگ تو اپنی کم مائیگی اور ناداری کیوجہ سے تجارت کا شغل نہیں پیدا کر سکتے تھے مگر وہ لوگ جو کسی قدر سرمایہ والے تھے وہ تمامتر تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے۔ انھیں میں حضرت ہاشم ابن عبد مناف بھی تھے اس اصلی نباض قوم نے اونکے اصلی مرض اور اوسکے تیر بہدف علاج کو فوراً معلوم کرلیا۔ اور اوسی کے مطابق عملی تدابیر اختیار کی انسے قبل جو سرمایہ دار حضرات تھے۔ وہ کسی قدر خودغرضی اور ذاتی نفع اندوزی کو خیال سے جو اکثر اہل تجارت کی طبیعت کا لازمہ ہے وہ اپنی قوم کو ان امور کیطرف رغبت دلانیکے لئے۔ ایک حد تک مجبور تہے مگر ہاشم فیاض کی پر ہمت اصول عدالت حقوق مساوات پر قائم تہے۔ اور آپمیں ذاتی منفعت اور خودغرضی کو ذرا بھی مداخلت نہیں تھی۔ اسی وصف خاص کا نتیجہ تہا کہ ہاشم مرحوم نے اپنی تمام قوم وقبیلہ کو تجارت کی طرف لگایا۔ اور اونمیں سے نادار اور بے سرمایہ لوگونکو اپنے سرمایہ سے کافی مدد پہنچائی۔ اون کو ایک معتدبہ جماعت میں پہلے مجتمع کرکے ایک قافلہ اور تجارتی کارواں بنایا اور انکو سال بھر میں دومرتبہ دو مختلف اطراف میں تجارت کرنیکی غرض سے بہیجے جانیکا قاعدہ مقرر کیا جسطرح قصی کو اپنے زمانہ میں تجمیع کی رعایت سے قریش کا لقب دیا گیا تہا۔ اوسی طرح ہاشم مرحوم بھی اپنے وقت میں ایلاف قریش اور ابو القریش کہے جاتے تھے۔ جیسا کہ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں وکان رہاشم صاحب ایلاف قریش وایلاف قریش داب قریش ہاشم کو صاحب ایلاف قریش (کارواں سالار قریش) کہتے تہے۔ اور ایلاف قریش کے معنی حرکت کنندگان قریش کے ہیں قریش کے یہ تجارتی قافلے جاڑے کے موسم میں یمن اور حبشہ تک جاتے تہے۔ اور گرمیوں میں علاقہ شام کے شہر غزہ تک تہوڑے ہی دنوں کے بعد ہاشم مرحوم کی یہ حسن تدابیر اونکی قومی اور ملکی رفاہ وفلاح کے لئے۔ ایسی مفید اور پُرنفع ثابت ہوئی کہ دو تین بار کی آمد ورفت اور لوٹ پھیر کے بعد نادار قریش اور مفلوک الحال اہل عرب کی حالتوں میں ایک حد تک درستی اور ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے ان مشاہدات نے حضرت ہاشم ہی کو نہیں بلکہ ملک قوم کے تمام افلاس زدہ اور مفلوک الحال لوگونکو انکی غیر متقل ہمت دلائی اور وہ اب بلا تحریک وتحریص خود اسی کاروبار میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

ہاشم مرحوم اور قیصر روم

جب قریشیوں کی تجارت کو دوسری قوموں کی تجارت کے مقابلہ میں بین فروغ ہونے لگا تو شام و یمن کی مقامی تجارت پیشہ قومیں حسد و نفسانیت کی بنا پر اونکی کاروبار میں غیر متوقع رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں حضرت ہاشم اکثر اپنی کاروانوں کے ساتھ اپنا مال تجارت لیکر بھی جایا کرتے تھے۔ اور کبھی کسی ضرورت سے خود مکہ میں بھی رہجاتے تھے مگر اہل یمن و شام کی بے رخی اور ناتوجہی کی خبر جب اونکو معلوم ہوئی تو اوسکو اونہوں نے اسکی فوری اصلاح کو ضروری سمجھا اور بذات خاص قیصر کے پاس ان امور کی درستی اور اصلاح کیلئے چلے گئے۔ قیصر نے انکا بڑا اعزاز کیا۔ ہاشم نے قیصر سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اور اوسکی رعایا کے ہاتھوں قریش کے کارواں تجارت کو جو جو دشواریاں پیش آئی تھیں ایک ایک کرکے بیان کردیں قیصر نے بکمال رضا و رغبت قریش کے کارواں تجارت کی امن و امان اور حفاظت مال و جان کا پورا سامان کیا۔ منزلوں کے قیام اور سفر کے ایام و حالت میں عام شاہراہوں اور گذرگاہوں میں اپنی طرف سے معاہدہ لکھ کر ہاشم مرحوم کے حوالے کردیا۔ اور اوسکی نقل اپنی قلمرو میں خصوصاً اون علاقوں میں اور مقاموں میں جو مکہ سے شام آنیوالے راستوں کے قریب تھے یا ملحق تھے۔ وہاں کے عمال اور رئیسان قبائل کے پاس بھجوا دی۔ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۴۰۔

نجاشی شاہ حبشہ کو نام ہاشم کا خط

ملک شام کی تجارتی مشکلوں کو پوری کامیابی کا سا رفع دفع کرکے حضرت ہاشم علاقہ یمن و حبشہ کی درستی معاملات کیطرف متوجہ ہوئے مگر اسکے لئے بادشاہ حبشہ کے پاس بذات خاص حاضری کی ضرورت نہ دیکھکر ایک خط لکھ دیا گیا اور اوسی سے خاطر خواہ کام نکلگیا۔ جیسا کہ ابن سعد کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے

وکتب الی النجاشی ان یدخل قریشا ارضہ و کانوا تجاراً۔ ‖ نجاشی بادشاہ یمن و حبشہ کو پاس خط لکھکر بھیجا گیا وہ اپنے ملک میں قریش کو تجارت کرنے کی اجازت دے

خط بھیجنے کی دیر تھی۔ نجاشی کو کوئی عذر نہ ہوا قریش کو حبش کے ملک محروسہ میں آزادانہ تجارت کرنیکی اجازت ہوگئی۔ مولوی شبلی صاحب ان حالات کو ذیل کے مختصر الفاظ میں یوں لکھتے ہیں:۔

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھلاتے تھے۔ چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے۔ تجارت کو ترقی دی۔ قیصر روم سے خط و کتابت کرکے فرمان لکھوا دیا کہ قریش جب اسکے ملک میں اسباب تجارت لیکر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور انقرہ کو جو انگورہ (انقرہ) کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو الشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے۔ قیصر کا پایہ تخت

تہا تجار قریش انگورہ میں برابر جایا کرتے تھے۔ تو قیصر نہایت عزت و حرمت سے خیر مقدم کرتا تہا عرب کا راستہ محفوظ تہا۔ ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کرکے ان قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ یہ قریش کا کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائینگے جسکے صلہ میں کاروان قریش اُن قبائل میں اونکی ضرورت کی چیزیں خود لیکر جائیگا۔ اور اونسے خرید و فروخت کریگا یہ سبب تہا کہ عرب میں باوجود لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تہا۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲۰۔

الغرض۔ ہاشم مرحوم نے اون مشکلات کو جو قریشی کاروان تجارت کو اپنے کاروبار میں حائل ہتیں۔ نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے رفع کردیا۔ کہ پہر وہاں کی مقامی قوموں کی انکی مخالفت اور ضرر رسانی پر اجرت نہو سکی۔ اور اس طرح ہمیشہ کیلئے قریش کے کاروان تجارت کا راستہ مکہ سے یمن اور شام تک صاف ہوگیا۔ ملکی رفاہ اور قومی اصلاح و فلاح کے متعلق ہاشم مرحوم کی یہ اعلیٰ تدبیریں ہتیں۔ یہ محاسن خدمات تہے جو قریب قریب دو ہزار برس کے بعد بہی قوم و ملک کی بے شمار اور لا انتہا شکر گذاریوں کے ساتھ عربی دفاتر تاریخی ہی میں نہیں بلکہ تذکرات عالم کے مختلف صحائف و جرائد میں آجتک محفوظ و مرقوم ہیں۔

ہاشم مرحوم کی اِس ہمدردی اور دلسوزی نے تمام ملک قوم کو انکا مطیع و منقاد اور والہ و شیدا بنا رکھا تہا۔ اور ایسا کہ ہر شخص اُنکی متابعت کو اپنی مفاخرت سمجہا تھا۔ اور اپنے تمام مصائب حوائج ضروریہ کے وقتوں میں انہیں حامی معین اور متکفل یقین کرتا تہا۔ اور تہا بہی ایسا ہی۔

ہاشم مرحوم کی ثروت و اقتدار کا اثر اُس زمانہ میں ملک عرب اور قوم قریش ہی تک محدود نہیں تہا بلکہ اطراف و جوانب کے بیرونی اقوام و قبائل بہی پوری طرح سے انکی ذاتی وجاہت اور عظمت کے زیر اثر تہے۔ اور اسکی سب سے بڑی وجہ اور قوی سبب یہ تہا کہ بیرونی قوم و قبائل کے بیشمار لوگ سالانہ ایام حج میں آکر حضرت ہاشم کے ہاں تین شبانہ روز تک مہمان رہا کرتے تہے۔ اور رفادہ کی قدیم خدمت جو قصی ابن کلاب کے وقت کا دستور تہا۔ اور جو فی الحال انسے خاص طور پر تعلق رکھتا تہا۔ حضرت ہاشم کیطرف سے اس عالی ہمتی۔ فیاضی اور کشادہ دلی کیساتھ عمل میں لائی جاتی تہی اور بلا اختصاص و امتیاز اصول مساوات و عدالت کے تمام شرائط احتیاط کیساتھ تمام صادرین و واردین کی عام ضیافت کیجاتی تہی کہ وہ تمام اقوام و قبائل ہاشم مرحوم کی اعلیٰ فیاضی اور مہمان نوازی کے غلام بے دام بنجاتے تہے۔ اور اُنکی جود و سخا اور مہر و عطا کے واقعات میں بڑی بڑی نظمیں اور مطول و مفصل قصائد تصنیف کرکے یادگار چھوڑتے تھے ہم قصی ابن کلاب کے ذکر میں خدمت رفادہ کے متعلق اُن تمام انتظامات کو جو اونکے وقتیں کئے جاتے تفصیل سے اوپر لکھہ آئے ہیں اور اب ذیل میں اِسخدمت کے متعلق ہاشم مرحوم کی فیاضیوں نے جس وسعت اور ہمت سے کام کیا ہے اوسکو بالتفصیل قلم بند کرتے ہیں۔ ابن سعد طبقات میں لکہتے ہیں۔

ان ولی هاشم بن عبد مناف بن قصی السقایه	جب ہاشم ابن عبد مناف ابن قصی کو سقایہ کی خدمت اور

والرفادة وكان رجلا موسرا وكان اذا حضر الحج قام في قريش فقال يا معشر قريش انكم جيران الله واهل بيته فانه يأتيكم في هذا الموسم زوار الله يعظمون حرمة بيته فهم ضيف الله واحق الضيف بالكرامة ضيفه وقد خصكم الله بذلك واكرمكم به وحفظ منكم افضل ما حفظ جار من جاره فاكرموا ضيفه وزوره يأتون شعثا غبرا من كل بلد على ضوامر كانهن القداح قد ازحفوا وتفلوا وقملوا وارملوا فاقروهم واسقوهم فكانت قريش ترافد على ذلك حتى ان كان اهل البيت ليرسلون بالشيء اليسير على قدرهم وكان هاشم بن عبد مناف بن قصي يخرج في كل عام مالا كثيرا وكان قوم من قريش اهل يسارة يترافدون وكان كل انسان يرسل بمائة مثقال هرقلية وكان هاشم يأمر بحياض من ادم فتجعل في موضع زمزم ثم يستقى فيها الماء من الآبار التي بمكة فيشربه الحاج وكان يطعمهم اول ما يطعم قبل التروية بيوم بمكة وبمنى وجمع وعرفة وكان يثرد لهم الخبز واللحم والخبز والسمن والسويق والتمر ويجعل لهم الماء فيسقون بمنى والماء يومئذ قليل في حياض الادم الى ان يصدروا من منى فتنقطع الضيافة ويتفرق الناس في بلادهم۔ طبقات ج ا ص ۴۵

رفادہ حاج کی ہاشم ابن عبد مناف ابن قصی تمام قبیلہ قریش میں ایک مرفہ الحال بزرگ تھے۔ یہ جب عہدے انکے سپرد ہوئے اور موسم حج قریب آیا تو ہاشم نے تمام قبیلہ قریش کو جمع کرکے فرمایا کہ اے جماعت قریش تم خدا کی جماعت ہو اور اوسکے گھر والے ان ایام میں تمہارے پاس خانہ خدا کی زیارت کرنیوالے۔ اوسکے خانہ مقدس کی عظمت بڑہانیکے خیال سے آتے ہیں۔ پس وہ لوگ خدا کے مہمان ہیں۔ اور میزبان کا سب سے بڑا حق یہی ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی باحسن سلوک ضیافت کرے اور یہ ایک ایسا حق ہے کہ حق سبحانہ تعالی نے تمہیں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور تم میں ان حقوق کو اوسی طرح محفوظ کیا ہے جسطرح وہ اپنے عبد کی جماعت کو دوسری جماعت سے محفوظ رکھتا ہے پس تم اپنے ان مہمانوں اور زائروں کے ساتھ باکرام پیش آؤ۔ جو بالکل گرد و غبار میں اٹی ہوئی جماعتوں کی صورتیں دور دراز ملکوں سے تمہارے پاس آتے ہیں گویا وہ فوج مقابلہ کنندگان کی جماعت میں جو دوری مسافت اور تکالیف سفر کی وجہ سے ضعیف لاغر شکستہ۔ افتاں وخیزاں تمہارے پاس آتے ہیں پس تم بالطاف واکرام تام انکو اپنے پاس بلاؤ۔ اور انکو پانی پلاؤ۔ ہاشم کا یہ حکم سنکر تمام قریش نے رفادہ کی خدمت کا سامان کرنا شروع کیا۔ اور تمام قریش نے جو اہل بیت کے معزز لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مال کثیر اس خدمت کے لیے ہدیہ کرنا آغاز کردیا۔ اور خود ہاشم ابن عبد مناف بھی ہر سال بیت المال کثیر اپنے سرمایہ سے اس مصرف خاص کے لیے نذر کیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ کہ قریش میں متمول تھے۔ وہ طعام داری کا سامان کرتے تھے۔ اور اُن میں سے ہر شخص سو مثقال ہرقلیہ کعبہ کے لیے نذر نکالا کرتا تھا۔ ہاشم نے حجاج کے پانی پلانے کے لیے چمڑے کے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے۔ اور وہ زمزم کے پاس رکھدیے جاتے تھے۔ اور اُن میں مکہ کے کنوؤں سے لا لا کر پانی بھر دیا جاتا تھا۔ (کیونکہ چاہ زمزم تو مدت سے پٹا ہوا بے نام و نشان پڑا تھا) اور یہی تمام حجاج کو

پلایا جاتا تھا۔ اور حجاج کو پہلے یوم ترویّہ کے روز کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اور یہ اوّل ضیافت خاص شہر مکہ میں کی جاتی تھی۔ پھر دوسرے روز منیٰ میں یہی سلسلہ عرفہ تک برابر جاری رہتا تھا۔ اوّل روز اُن کی روٹی گوشت کھلایا جاتا تھا۔ دوسرے روز روٹی اور روغن۔ تیسرے روز سَتو اور خرمے اور پھر مکہ سے پانی لے جا کر منیٰ میں تمام حجاج کو پلایا جاتا تھا۔ اور اُس دن چمڑے کے حوضوں میں پانی قلیل المقدار رہ جاتا تھا۔ اِس لیے منیٰ سے لوٹنے والے دن سلسلہ ضیافت ختم ہو جاتا تھا۔ اور تمام لوگ اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس چلے جاتے تھے

بہرحال سقایہ اور رفادہ کی تعمیل خدمات کی یہ تفصیل تھی جو ہاشم مرحوم کی اِس عالی ہمتی اور کشادہ دلی کو اُن کے اسلاف کی قدیم فیاضی اور سخاوت سے کہیں بڑھی چڑھی ثابت کرتی ہے۔ یہ تو ہاشم مرحوم کے وہ محاسن اخلاق و اشفاق تھے۔ جو عموماً حجاج کعبہ کی آرام رسانی کے متعلق عرب کے تمام تاریخی کارناموں میں اُنکی ابدی یادگار ہیں۔ اب اِس کے بعد اُنکی اِس فیاضی اور ایثار کی تفصیل ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔ جو اُنہوں نے اپنے ہموطن اور ہمسایہ اقوام و قبائل کے ساتھ مکہ کی سہ سالہ قحط کے مصیبت ناک زمانہ میں دکھلائی ہیں۔ مولوی شبلی صاحب ہاشم مرحوم کے اِس مشہور و معروف ایثار نفسی اور فیاضی کو ان الفاظ مختصرہ میں بیانکرتے ہیں

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔ اب ہاشم نے اِس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چُورا کر کے کھلائیں۔ اُسوقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا عربی زبان میں چوُرا کرنے کو ہشم کہتے ہیں۔ جسکا اسم فاعل ہاشم ہے۔

اب اس مجمل اور مختصر بیان کی تفصیل طبقات کی اصلی عبارت سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مکہ میں سہ سالہ قحط سالی اور ہاشم مرحوم کی فیاضی

فاصابت قریشا سنوات ذھبن بالاموال فخرج الی الشام فامر الخبز کثیر فخبزلہ فحملہ الغرائر علی الابل حتی وافی مکۃ فھشم ذلک الخبز یعنی کسرہ و ثردہ ونحرتلک الابل ثم امر الطہاۃ فطبخوا ثم کفاء القدور علی الجفان فاشبع اھل مکۃ فکان اول الحیاء بعد السنۃ التی اصابتہم فسمی بذلک ھاشما وقال عبداللہ ابن الزبعری فی ذلک

عمر العلی ھشم الثرید لقومہ
ورجال مکۃ مسنتون عجاف

قوم قریش ایک بار متواتر قحط کی مصیبت میں مبتلا ہوئی۔ یہاں تک کہ جو کچھ اُنکے پاس سرمایہ موجود تھا۔ وہ بالکل اُٹھ گیا ہاشم سے اپنے قوم و ملک کی مصیبت نہیں دیکھی گئی۔ تو وہ شام کی طرف بذات خود چلے گئے اور وہاں سے کثیر التعداد روٹیاں پکوا کر۔ اور بڑی بڑی کھانوں میں بھر کر اُونٹوں پر مکہ میں لدوا لائے۔ مکہ پہونچکر اُن روٹیوں کو ٹکڑے کر دیا۔ اور شوربے میں ڈبوا کر ثرید تیار کروایا۔ پھر جن اُونٹوں پر وہ روٹیاں لاد کر لائے تھے۔ اُنکو ذبح کر دیا۔ اور پکوایا جب کھانا پک کر تیار ہو گیا۔ تو بڑے بڑے ظروف تمام جماعتوں کو کھلوایا۔ یہاں تک کہ تمام اہل مکہ سیر ہو گئے۔ گویا قحط کی مصیبتوں کے بعد مکہ کے غربت زدہ لوگ اوّل بار پھر از سر نو زندہ ہوئے۔ اِس ایثار عام کے لحاظ سے حضرت ہاشم اُسی دن سے ہاشم مشہور ہو گئے۔ کیونکہ ہاشم کے معنی توڑنے والے کے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن الزبعری نے ہاشم کے اِس ایثار عظیم کی یادگار میں ذیل کا شعر یادگار

چھوڑا ہے۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔ سہ عالی ہمت عمر (ہاشم کا اصلی نام) نے ثرید کا چُورا اپنی قوم کے لیئے تیار کرایا۔ ایسی حالت خاص میں کہ باشندگان مکّہ قحط زدگی کے باعث بالکل ضعیف و لاغر ہو چکے تھے۔

ابن ہشام نے ایک اور شعر اس کے علاوہ لکھا ہے۔ وہ یہ ہے

سنّ الیہ الرحلتّان کلاھما
سفر الشتآء و رحلۃ الاصیات

باشندگان مکّہ کے لیئے دو سفروں کا انتظام کیا
ایک گرمی اور ایک جاڑے کے ایّام میں

طبقات ابن سعد میں وہب بن عبد قصیٰ کے یہ اشعار درج ہیں جن میں یہ پورا واقعہ نظم کر دیا ہے۔

تحمل ھاشم ماضاق عنہ
واعیا ان یقوم بہ ابن بیض
اتاھم بالغرائر متاقات
من ارض الشام بالبر النفیض
فاوسع اھل مکۃ من ھشیم
وشاب الخبز باللحم الغریض
فظل القوم بین مکللات
من الشیزآء حائرھا یفیض
طبقات ص ۴۴

ہاشم نے اپنی قوم کی مصیبتوں پر تحمل کیا۔
اور اُن کی امداد کے لیئے ایک رئیس ابن رئیس کی شان میں آکر دو گھ
اور ارض شام سے جو کثرت سے میوہ خیز ہے۔
باشندگان مکّہ کے لیئے جو کھالوں میں بھر کر اذ وقہ لائے
تمام باشندگان مکّہ کو روٹی اور گوشت کے
ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھلائے۔
تمام قوم اس طرح اُن کے احاطہ فیض کے زیر سایہ
ان تمام تکالیف کے بعد آگئی۔
طبقات ص ۴۴

حقیقت میں ہاشم مرحوم کی تمام ملکی اور قومی خدمتیں۔ قوم و وطن کی ترقی اور مرفہ الحال اور درستی معاشرت کے لیئے۔ ایسی مفید اور کار آمد ثابت ہوئیں۔ جو اُسوقت سے آج تک اہل عرب کے دل سے بھولیں ہیں۔ اور نہ ابد الآباد تک بھول جانے کی امید کی جاتی ہے۔ قوم و ملک کے ساتھ اُن کی ایسی سچّی اور خالص اور بے لوث ہمدردی۔ کوشش اور سعی ایسی پر اثر ثابت ہوئی۔ کہ اُس نے باشندگان مکّہ اور قرب و جوار کے تمام ہمسایہ قوم و قبائل کے قلوب کو تسخیر کر لیا۔ اِس سے زیادہ ان فیاضانہ قومی ایثار کی عام قبولیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ فیاض کے مدح و اوصاف میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا قصیدے لکھے گئے اور اُنکی فیاضی کے اظہار و اعتراف میں طول و طویل اور پر تفصیل نظمیں تیار کی گئیں۔ اُس زمانہ میں ہاشم مرحوم کی

وجاہت عظمت اور حکومت وامارت کے تھے عرب کی تمام قوم و قبائل پر ایسے جم گئے تھے کہ انکے مقابلہ میں کسیکی روداری اور نموداری کچھہ کام نہ کر سکی۔

ہاشم کے ساتھ امیہ کی مخاصمانہ مخالفت

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

باوجود اس مقبولیت عام کے بھی۔ ہاشم مرحوم کے بیہ نظیر اور لاجواب خدمات۔ رشک حسد۔ اور نفسانیت کے اظہار سے خالی نہ رہی۔ اور اسی وقت سے انکی نموداری اور ذی اقتداری کو استیصال کی فکر کی گئی۔ مگر رشک و حسد کا نخل بیمانہ بارآور ہوا ہے۔ اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ انکے مخالفین کو اپنی مخالفانہ کارروائیوں میں ذرہ بھر بھی کامیابی نہیں ہوئی سارا سعی انتظام تمام اہتمام اور سب کوششیں ویسی کی ویسی ہی رہ گئیں انکا مخالف خیش بہم پہلو بکر انکے گھر ہی پیدا ہوا۔ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتے ہیں۔

ان عبد شمس وهاشما توامان وان احدهما ولد قبل الاخر واصبع له ملصقة بجبهة صاحبه فنحيت فسال الدم فقيل يكون بينهما دم وولى هاشم بعد ابيه عبد مناف ما كان اليه من السقاية والرفادة فحسده امية بن عبد شمس على رياسته فكانت اول عداوة وقعت بين هاشم وامية

كامل ابن اثير

عبدمناف کے دو بیٹے عبدشمس اور ہاشم توام پیدا ہوئے تھے اسطرح کہ ایک کی اونگلی دوسری کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ جب اوسکو جدا کیا گیا تو خون جاری ہوگیا۔ لوگ اسکو فال بد سمجھکر کہنے لگے کہ ان دونوں میں خونریزیاں ہونگی۔ جب ہاشم اپنے باپ عبدمناف کے بعد اونکی ریاست (سقایہ اور رفادۃ) کو رئیس اور ولی ہوئے تو امیہ ابن عبدشمس کو دلمیں ہاشم کیطرف سے رشک و حسد پیدا ہوا۔ اور وجہ عداوت پشتہا پشت خاندان ہاشم اور قبیلۂ بنی امیہ میں باقی اور قائم رہی انکی یہ ابتدا تھی۔

طبقات ابن سعد میں اسکی تفصیل یوں قلمبند ہے۔

فحسده امية بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصى وكان ذا مال فتكلف ان صنع هاشم فعجز عنه فشمت به ناس من قريش فغضب ونال من هاشم ودعاه الى المنافرة فكره هاشم ذلك لسنه وقدره فلم تدعه قريش واحفظوه قال فانى انافرك على خمسين ناقة

امیہ ابن عبدشمس ابن مناف ابن قصی کو ہاشم کیسا تھا بوجہ امارت وحکومت رشک وحسد پیدا ہوا اور یہ صاحب مال و دولت تھے۔ اور اپنی مالی قوت کے مقابلہ سے اونھوں نے ہاشم کو شان عظمت و وجاہت میں ہمیلا دی اور مقابل ہونیکی تمنا سے وہی امور بجالانیکی کوشش کی جو ہاشم کرتے تھے لیکن حقیقتاً امیہ کرسکا اور عاجز رہا۔ تمام لوگوں نے اسکی اس خفیف حرکات پر سخت طعن و تشنیع کی امیہ کو غصہ آگیا۔ اور اونھوں نے ہاشم سے اسکی شکایت کی اور اسکو ساتھ ہی

المنافرہ۔ داوری کردن اور حسب و نسب۔ صراح مطبوعہ کلکتہ۔ ج اص ۲۰۸ عرب میں دو فریق کو درمیان اظہار مفاخرت کیغرض سے جو مجلسیں منعقد ہوتے تھے اونکو منافرہ کہتے تھے اسلام کو اصول مساوات کی پاک تعلیم نے عرب سے ان واہیات کا نام و نشان بھی مٹادیا۔ مولف۔

سود الحق لنحرها بمكة والجلاء عن مكة
عشر سنين فرضى امية بذلك وجعل بينهما
الكاهن الخزاعي فنفر هاشما عليه فاخذ هاشم
الابل فنحرها واطعمها من حضره وخرج امية
الى الشام فاقام لها عشر سنين فكانت اول
عداوة وقعت بين هاشم وامية۔
طبقات ص ۴۵

ہاشم کو منافرہ کی دعوت دی - ہاشم نے منافرہ کو انعقاد کو اپنی شان و مراتب کے خلاف سمجھ کر انکار کر دیا۔ لیکن قوم و قبیلہ کے لوگوں نے انکو اسپر مجبور کیا - بالآخر ہاشم نے اُمیّہ کے ساتھ منافرہ کیا۔ یہ شرائط ٹھہرے کہ جانبین سے جو فریق مغلوب ہو وہ پچاس سیاہ آنکھوں والے اونٹ نحر کریگا - اور دس برس تک مکہ کی سکونت ترک کردیگا امیہ نے یہ شرائط قبول کرلئے - جانبین سے قبیلہ خزاعہ کا ایک کاہن حکم مقرر ہوا - جانبین سے منافرہ قائم ہوا - اور آخر میں ہاشم اُمیہ پر غالب آگئے اور ہاشم نے وہ اونٹ شرط منافرہ کے مطابق امیّہ سے لیکر ذبح کئے - اور اسی وقت سے سکونت مکہ چھوڑدی اور دس برس تک شام میں جاکر مقیم رہا - اور یہ پہلی عداوت تھی جو سلسلہ ہاشمیہ اور خانوادہ اُمیّہ کے فیمابین واقع ہوئی -

بہرحال یہ تھے ہاشم و اُمیّہ کے باہمی مفاخرت اور منافرت کے صحیح واقعات - جو فریقین میں باوجود رحم متصل ہونیکے کامل طور سے جانبین کے فطرتی فرق مابہ الامتیاز کو ثابت کررہے ہیں -

مولوی شبلی صاحب کی واقعات صحیح سے صریح چشم پوشی۔ افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس واقعہ تاریخی کو جو سیرۃ نبی ہاشمی کے لکھنے والے کو قلمبند کرنا ازحد ضروری تھا۔ بالکل مرفوع القلم فرمادیا ہے۔ حالانکہ قریب قریب تمام عربی ماخذوں میں بالتفصیل مندرج ہے۔ اور ہم نے اونھیں کے اصل ماخذ مستند طبقات ابن سعد سے اوپر نقل کیا ہے۔ اکثر حضرات بطور ظاہر اس فروگذاشت کو مولوی صاحب کی کوتہ قلمی اور اتفاقی سہو سے تعبیر فرمائینگے - مگر ہم اسکو مولوصاحب کی کمال عاقبت اندیشی اور غایت دوربینی تسلیم کریں گے شبلی صاحب نہ کوتاہ قلم ہیں۔ اور نہ سہو نسیان کے ملزم - وہ ان مضامین کے انتخاب اندراج کے غور و فکر کے متعلق امام بخاری اور ابن حجر و غیرہم کے ہموزن اور ہم سنگ ہیں - بلکہ ان امور کے اظہار و استشہار میں ان حضرات سے زیادہ محتاط اور محدود -

ہاشم و اُمیّہ کے واقعات ہی کو آپ نے مخالف و مقاصد پاکر نہیں چھپایا ہے۔ بلکہ قصی ابن کلاب اور ہاشم ابن عبد مناف کے اون خطبات کو بالکل قلم زد فرمادیا ہے - جو خدمت کعبہ اور ضیافت حجاج کے متعلق مجمع قریش میں بیان کئے گئے تھے - اور جسمیں **اہلبیت** کے قدیم مفاخر و مشارف کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور یہ دونوں خطبے طبقات ابن سعد میں جو شبلی صاحب کی تمام تحقیق کا اصل معیار ہے - موجود ہیں - مولوی صاحب نے مرقومہ بالا دونوں واقعات کو عمداً حفظ ماتقدم کے لحاظ سے اسلئے چھپایا۔ اور مرفوع القلم فرمایا ہے کہ ان واقعات سے سلاطین اُمیّہ کے معائب و مناقص اور بنی ہاشم کے فضائل و مناقب کا پورا پورا انکشاف ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں امر آپ کے مدعا

کے خلاف تھے۔ کیونکہ سلاطین امویہ کیساتھ آپکو دلی ارادت اور قلبی عقیدت کا شرف حاصل تھا۔ اور ولید بن عبد الملک آپکی مجوزہ تالیفات اسلامی ہیروز کی فہرست خاص میں داخل تھا۔ رسول صلعم کے انتقال فرمانیکے بعد بنی ہاشم اور بنی فاطمہ سے آپکو واسطہ اور تعلق رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی پھر ان امور کے اظہار و انکشاف کو اونکے مرکز اور مبدء سے مستاصل کرنا اور ان کے استخفاف کی کماحقہٗ کوشش کرنا جس سے اپنے ممدوحین کے معائب اور بیضرورت اور بیکار لوگوں کے مناقب نہ ظاہر ہونے پائیں۔ آپ کا فرض لازمی اور نصب العین قائمی تھا۔

مگر باین ہمہ یہ بھی سمجھ لینا ضرور ہے کہ شمس العلماء صاحب دُنیا میں اکیلے باریک بین پاروشنضمیر تو تھے ہی نہیں۔ انکے ایسے سیکڑوں اور ہزاروں دوربین۔ بالغ نظر حقیقت حال کا سراغ لگانے والے اور بال کی کھال نکالنے والے خدا کے بندے ایسے موجود ہیں۔ جو مولوی صاحب کے استخفاف کے پھندے دار جالوں کو توڑ کر حقیقت حال کا پورا پورا مشاہدہ اہل دُنیا کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

اہل بیت

بہتیرا اتنا لکھکر ہم اپنے مدعائے بیان پر آجاتے ہیں۔ چونکہ شبلی صاحب کی قلمزد واقعات سے ہمارے بہت سے موجودہ اور آئندہ مضامین کو پورا تعلق ہے اسلئے اونکی تحقیق اور تفصیل ہمارے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ ہمکو قُصی اور ہاشم کے خطبات سے اہلبیت اور اون کے خصائص فضائل و مناقب جن کو ہم دونوں خطبوں کے اصل عربی الفاظ میں ابن سعد کی عبارت سے۔ اوپر لکھ آئے ہیں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اہلبیت کا لقب خطاب اور منصب عرب میں نہایت قدیم اور ہمیشہ قابل تعظیم و تکریم تسلیم کیا گیا ہے اور اس مبارک لقب و خطاب سے اونھیں معززین کی مخصوص جماعت قرار دیجاتی تھی جو بیت اللہ کے منصب تولیت پر فائز ہوتے تھے۔ اور اپنے ذاتی اور صفاتی کمالات کے اعتبار سے تمام قوم و قبیلہ میں واجب الاحترام سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ مسلم ہے کہ حضرت ابراہیم۔ و اسمٰعیل سلام اللہ علیہما نے بیت اللہ کی عمارت مقدسہ کی بحکم خدا بنیاد رکھکر اوسکو تکمیل تک پہونچایا۔ سب سے پہلے خدائے سبحانہ تعالےٰ نے انھیں بزرگواروں کو اہلبیت کے معزز لقب سے بطور خاص مشرف فرمایا۔ اونکے بعد اونکی ذرّیت اور سلسلہ نے اپنے آپ کو اس خطاب سے مخاطب کئے جانیکو ہمیشہ اپنا خاص استحقاق اور خاندانی افتخار قرار دیا اور یہ لوگ اپنے اس حقانی مفاخرت و اعزاز اور اوس روحانی شرف و امتیاز کو کسی حال اور مقام میں نہ بھولے اگرچہ زمانہ کی نامساعدت اور اہل زمانہ کی ناموافقت نے ایک مدت مدید تک اونکا گریبان نہ چھوڑا اور دنیا کی انقلابات اور نامہربان قوم و قبیلہ کے باہمی اختلافات نے اونکے تمام آثار و اقتدار کو مٹا کر۔ اون کو ایسا کمزور اور ضعیف بنا دیا کہ بالآخر اونکو سکونت مکہ ترک کرکے اِدھر اُدھر جاکر آباد ہونا پڑا۔ جیسا کہ عربی تاریخیں

یکزبان ہوکر بتلا رہی ہیں۔ مگر اس درمیان میں جب کبھی اونکی حالتوں میں ذرا بھی قوت آئی اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے اہلبیت ہونیکی حقوق پر بیت اللہ مقدس کی تولیت کا مطالبہ کیا۔ ان کوششوں میں اون کو کبھی وقتی اور عارضی کامیابی بھی ہوئی۔ اور کبھی قطعی ناکامیابی جیسا کہ نضر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک کی حالات سے ظاہر ہے۔ مگر باوجود ان تمام مطالبات مشکلات اور مصائب کے وہ اپنے اصلی حقوق کے خواستگاری سے دست برداری نہ کرسکے یہانتک کہ قصیٰ ابن کلاب نے آخر اوسکو بزور بازو اپنے فریق مخالف سے واپس لیا۔ اسی لئے قصیٰ نے اپنی قوم و قبیلہ کی جماعت میں۔ اپنی فتح یابی کے بعد بیت اللہ مبارک کی خدمات اور اوسکی انتظامی ترتیب و ترمیم کے متعلق جو خطبہ دیا ہے۔ اور اونکو اسکی انجام دہی کی طرف مخاطب کیا ہے۔ اسمیں انکو اہلبیت کے خاص لفظ سے منسوب کرکے اُن کے فضائل و مناقب کو اونھیں یاد دلایا ہے۔

پھر قصیٰ ابن کلاب کے بعد عبد مناف نے بنی عبد الدار سے جو باقرار ابن سعد کان ضعیفا وکان اخوتہ قد شرفوا علیہ (عبد الدار ضعیف المزاج آدمی تہا۔ اور اسی وجہ سے اوسکے اور بھائیونکو اوسپر شرف اور غلبہ حاصل ہوگیا) اختیارات تولیت خانہ کعبہ اور امارت شہر مکہ منتزع کرلئے یہ کیوں؟ صرف اسلئے کہ عبد الدار حقیقتاً ان مناسب جلیل کے لئے شایاں و اہل نہ تہا۔ اسی طرح عبد مناف کے بعد ہاشم مرحوم نے اپنے وقت میں رفادہ کی خدمات جو بنی عبد الدار کے علاقہ رہ گئے تھے۔ واپس لے لیں صرف اس لئے کہ وہ فیاضی اور کشادہ دلی سے حجاج کے اتنے بڑے مجمع کی ضیافت اور سقایت نہیں کرسکتے تھے۔ لطف تو یہ ہے کہ ان عہدوں کی واپسی لئے جانے والے شورے میں عبد الشمس بنی اُمیّہ کے باپ بھی داخل تھے

جب بنی عبد الدار سے یہ اختیارات واپس مل گئے تو ہاشم نے اپنی حسن انتظامی اور خوش لیاقتی سے ان خدمات کو باحسن الوجوہ انجام دیا اور تمام قوم و قبیلہ کی ترقی اور مرفہ الحالی کا ایسا انتظام کیا جو آجتک نہیں ہوا تہا۔ اُمیّہ کو ہاشم کے ساتھ اتحاد نسبی اور اصلیت کی یکجہتی کے غلط قیاس پر مساوات برابری اور ہمسری کا خیال پیدا ہوا۔ انہیں خیالوں کے ساتھ رشک و حسد بھی اشتعال طبع کے باعث ہوئے۔ حالانکہ سلسلہ واقعات سے برابر ثابت ہوتا آیا ہے کہ اس منصب جلیل کے حصول کے اسباب کوشش انسانی سے زیادہ تدبیر ربانی اور تقدیر یزدانی سے مہیا اور فراہم ہوتے ہیں۔ اور ظاہری طور تمام قوم و ملک کا اُسی خوش نصیب و اقبالمند شخص واحد پر اتفاق و اتحاد بھی ہوجاتا ہے۔ جسکو مدبرین قدرت اس عہدہ جلیلہ کے لئے پہلے سے منتخب کرلیتی ہیں ورنہ اہل عرب اور اونکے قوم و قبائل کے دائمی اختلاف سے کبھی ایسے ایسے متحدہ اور متفقہ نظام قومی اور ملکی کی امید نہیں ہوسکتی ہے مگر حقیقت کے جوہر شناس خوب جانتے ہیں کہ یہ قدرت کی خاص تصرفات تہی۔ جو اپنی عملی صورتیں پیدا کرنیکی ضرورتوں سے انمیں فوراً اتفاق و اتحاد پیدا کردیتے تہے۔ جیسا کہ قصیٰ ابن کلاب عبد مناف اور ہاشم مرحوم

کے حالات وواقعات سے ثابت ہوتا ہے۔

یہ امر بھی ضروری اور لحاظ کے قابل ہے کہ اس منصب جلیل کے حصول کیوقت ہر بزرگ قوم نے خاصکر لقب اہل بیت کی خصوصیت کے ساتھ اپنے مفاخر کا اظہار کیا ہے۔ قصیٰ اور ہاشم کی تقریریں صاف صاف اِس دعوی کو بتلا رہی ہیں۔ ظاہر طور پر اِسمیں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اتحاد اصل اور نسل کی بنا پر قریش پر کیا منحصر ہے۔ تمام ذریت اسمٰعیلؑ اس لقب سے یاد کئے جانیکی مستحق ہے مگر اس تعمیم میں ایک روحانی تخصیص بھی صاف طور پر مضمر ہے جسکو مشاہدات تاریخی علیحدہ کرکے بتلا رہی ہیں۔ کہ وہ تخصیص عام طور سے ہر شخص کے اختیار و قابو میں نہیں تھی۔ کہ جسوقت جو چاہتا وہ حاصل کرلیتا یہ مخصوص اہلبیت اور قابلیت جبروت قدرت کے متعلق تھی۔ اور اسمیں انسانی تدبیر و تجویز کو بہت کم مداخلت تھی ورنہ بنی عبدالدار پر عبدمناف کو اور بنی عبدمناف پر ہاشم کو اور پھر اسی طرح امیہ بن عبدالشمس پر ہاشم کو باعتبار ہم حسبی اور ہم نسبی کے ترجیح و تفضیل کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

بنی عبدالدار اور بنی عبدمناف کی مخالفتیں نہ ایسی شدید تھیں اور نہ اتنی دیر پا اور نہ شیوع اسلام تک اُنکا کوئی اثر اسلام کی مضرت یا مخالفت کا باعث ہوا سوائے اسکے کہ بنی عبدالدار اور بنی عبدمناف نے مشرکین قریش کا فرین مکہ کا ساتھ دیا اور عام اہل عرب کیطرح اسلام کے مخالف بنے رہے اسلئے اُنکی مخالفت اتنی قابل الذکر نہیں بخلاف اسکے بنی اُمیّہ کی دائمی اور قائمی مخالفت اسوقت سے لیکر ہمیشہ بڑھتی گئی۔ جبتک کہ اونسے بنی ہاشم اور خاندان رسول صلی اللہ علیہ کو بالکُل خاک وسیاہ نکرلیا ہاشم کے مقابلہ میں اُمیّہ کا دعویٰ ہمسری امارت مکہ تولیت کعبہ۔ اور اہلبیت کہلانیکی آرزو نسلاً بعد نسلاً۔ اور بطناً بعد بطناً بنی اُمیّہ کے خاندان میں برابر قائم رہی ہاشم سے اُمیّہ کا مقابلہ عبدالمطلب سے حرب ابن اُمیّہ کا سامنا ہوا۔ ابوسفیان ابن حرب کا جناب رسالتمآب صلعم کے ساتھ مقابلہ معاویہ ابن ابوسفیان کا حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے ساتھ متواتر معرکہ تاریخ کے ایسے شاہدات ہیں جنسے کسیکو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ معٰویہ کو آخر وقت میں ہزاروں معٰویانہ اور مفسدانہ مکر و حیلہ اور جعل فریب سے امارت و حکومت عرب ملی بھی تو وہ صرف اُنکو امیر بنا کر تمام ہوگئی۔ اور باوجود سطوت و ثروت کے بھی کسی نے اُنکو اہلبیت کے معزز اور گرانمایہ القاب و خطاب سے کبھی مخاطب نہ کیا اِسی سے حقیقت بین آنکھیں دیکھ لیتی ہیں۔ اور اصلیت شناس قلوب پہچان لیتے ہیں کہ اتنی شدید اور مدت مدید کی مخالفت کے بعد بھی بنی اُمیّہ کو بنی ہاشم سے اُس روحانی مفاخرت اور عظمت و جلالت کو واپس لینے میں کبھی کامیابی نہوئی جس کے حصول کے لئے اُنہوں نے اُمیّہ کے وقت سے ابتدا کی تھی۔

بہر حال پہلے قصی نے اور قصی کے بعد ہاشم نے اہل بیت کی روحانی عظمت و جلالت پر کسی قدر روشنی ڈالی تھی اور اونکے اعزاز و امتیاز سے قوم و ملک کو آگاہ کیا تھا۔ مگر پھر انہیں ہاشم مرحوم کے زمانے سے یہ منصب جلیل جیسا کہ نظام الہیہ کی مشیت ظاہر ہوتی ہے۔ انہیں کی سلسلہ میں ایسا قائم اور مستقل ہو گیا کہ پھر ذریت اسمٰعیلی یا سلسلہ قریش کے کسی دوسرے شعبہ یا فرع میں نہ گیا اور نہ ان شاءاللہ المستعان ابد الاباد تک جائیگا۔

السلام اور بانی اسلام علیہ السلام نے عہدہ جلیلہ اہلبیت کی روحانی عظمت و جلالت کو نصوص۔

(۱) یرید اللہ لیذھب عنکم اھل البیت الرجس ویطھرکم تطھیرا۔	(۱) تحقیق کہ خداوند عالم نے ارادہ کر لیا ہے کہ اے اہلبیت تم سے تمام آلائشوں کو دور کر دے اور ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جو پاکیزہ کرنے کا حق ہے
(۲) فقالوا ندع ابنائنا وابنائکم ونسائنا ونسائکم وانفسنا وانفسکم جزو ۵	(۲) نصاریٰ سے کہدو کہ ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفس کو اور تم اپنے نفس کو مباہلہ کے لئے بلاؤ۔
(۳) قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ۔ جزو ۲۵	(۳) (اے پیغمبر مسلمانوں سے) کہدو کہ میں تبلیغ رسالت کا تم سے کوئی معاوضہ یا اجرت نہیں مانگتا ہوں سوائے اسکے قرابت مندان رسول کے ساتھ محبت رکھو۔

کے مطابق پورے طور سے بتلا دیا اور تمام دُنیا کو سمجھا دیا کہ اس لقب جلیل کی عطا و تفویض کا تعلق بالکل خدا کی مشیت سے ہے نہ بندے کی کوشش سے اسکے ساتھ ہی ساتھ بنی ہاشم کے فضائل و مناقب اور بنی اُمیہ کے مناقص و مخازی بھی بتلا دئے۔ اور ثابت کر دیا کہ فطرت اور خلقت کا اصول اخلاقی کے مطابق بنی اُمیہ کو بنی ہاشم سے کبھی ہمسری اور مساوات کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور قرابت و رشتہ مندی کے ظاہری اتحاد اُنکے روحانی اختلاف اور باطنی امتیاز کو زائل نہیں کر سکتے تھے۔ اسکے ثبوت و تصدیق میں حدیث و تاریخ کے اخبار و آثار کثرت سے موجود ہیں جنمیں سے چند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ صحیحین بخاری و مسلم اور ترمذی میں مرقوم ہے۔

عن عائشۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ان اللہ اصطفی من بنی کنانہ قریشا ثم اصطفی من قریش بنی ھاشم۔	عائشہ سے منقول ہے کہ فرمایا جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے کہ خدائے سبحانہ تعالیٰ نے بنی کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کر لیا۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفا میں لکھا ہے۔

عن واثلة ابن الاسقع قال قال رسول الله ﷺ
ان الله اصطفى من ولد ابراهيم اسمعيل و
اصطفى من ولد اسمعيل بنى كنانه قريشا
واصطفى من قريش بنى هاشم واصطفانى
من بنى هاشم۔
اخرجه ايضا فقال هذا حديث صحيح

واثلہ ابن سقع سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے
کہ برگزیدہ کیا اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں بنی اسمٰعیل کو اور
اولاد اسمٰعیل میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں قریش کو
اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنو ہاشم میں مجھکو۔

اس حدیث کو ترمذی نے بھی لکھکر بتلایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے

تاریخ ابو الفدا میں ہے۔

عن عائشه رض قالت قال رسول الله صلعم قال
لى جبريل قلبت الارض مشارقها ومغاربها
فلم اجد احدا افضل من محمد وقلبت الارض
مشارقها ومغاربها فلم اجد بنى اب افضل
من بنى هاشم۔

عائشہ سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے کہا کہ جبرئیل نے کہ میں نے روئے زمین میں مشرق سے مغرب
تک گشت کی کسی شخص کو محمد صلعم سے افضل نہ پایا اور پھر میں نے
روئے زمین کو مشرق سے مغرب تک گشت لگاکر دیکھا مگر کسی
باپ کے بیٹے کو بنی ہاشم سے افضل نہ پایا۔

تاریخ و حدیث کے مرقومہ بالا معتبر و مستند شاہد میرے مدعائے بیان کی تصدیق کیلئے کافی ہیں۔ کیونکہ اسنے بنی امیہ پر کیا منحصر ہے۔ تمام قریش اور جمیع سلسلۂ اسماعیلی اور جملہ ذریات ابراہیمی پر بنی ہاشم کی فضیلت اور ترجیح قطعی طور پر ثابت ہے ایسے مخصوص شرف متفاخر کے مقابلہ میں بنی امیہ کے ایسے بدنام مجروح اور مقدوح قبیلہ کی کیا ہستی اور کیا وجود ہے جو بنی ہاشم سے شرف و فضیلت میں مقابلہ کرے۔ انکی حقیقت اور وجود اسلام اور بانی اسلام علیہ السلام کی نگاہوں میں جتنا اور جیسا کچھ ثابت ہوا ہے وہ ذیل کی تفسیر حدیث کی متفقہ اور متعدد اسناد سے کا حقہ ظاہر ہے۔ امام جلال الدین سیوطی تفسیر درمنثور میں لکھتے ہیں۔

اخرج ابن جرير وابن المنذر وابن ابى حاتم
والطبرانى فى الاوسط وابن مردويه والحاكم
وصححه من طرق على ابن ابى طالب رضى الله
عنه فى قوله تعالى الم تر الى الذين بدلوا
نعمة الله كفرا قال هما الافجران من قريش
بنوامية وبنو المغيرة۔

ابن جریر۔ ابن المنذر۔ ابن ابی حاتم طبرانی ابن مردویہ
اور حاکم نے بطریق صحیح حضرت علی ابن ابیطالب رضی اللہ عنہ
سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے دین خدا کو کفر سے بدلا
وہ فاجر ترین قوم قریش بنی امیہ اور بنو مغیرہ ہیں۔
تفسیر درمنثور

عالم اسلام میں بنو امیہ کی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے اور یہ وجود ہے وہ کون لاعقل ہوگا جو انکو بنی ہاشم

کا ہموزن اور ہمپایہ خیال کرے گا بنو عبد مناف ہونیکی انجادکی تھا بنا پر نا ہموار ان بنی اُمیہ کو بزرگوار ان بنی ہاشم کا متقابل ٹھہرائے گا۔ بلکہ بخلاف اسکے۔ ان بدنام کنندگان خاندان دودمان کو اعیان قبیلہ ہاشم کا بالکل نقیض اور متضاد پائیگا

بہرحال مرقومہ بالا اسناد و استشہادسے بنی اُمیہ کے اون وہم و گمان کی پوری تردید کردی گئی ہے جو اونکے دلوں میں بنی ہاشم کے ساتھ مساوۃ فی المراتب حاصل ہونیکے متعلق خطور کر رہے تھے بنی اُمیہ پر بنی ہاشم کی فضیلت و شرف کو قرآن و حدیث تفسیر اور حدیث سے ثابت کر کے ہم اہلبیت کے اعزاز و امتیاز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہم اس اعزاز قدیم کی عظمت و حرمت مخصوصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قصی اور ہاشم کے زمانوں تک ثابت کرآئے ہیں۔ اور شواہد تاریخی سے بتلاآئے ہیں کہ وہ اپنے ان مراتب و مدارج پر اسوقت سے لیکر اسوقت تک دیگر اقوام کے مقابلہ میں برابر شرف و مفاخرت کا خاص طور پر اظہار کرتے آئے۔ یا وجودیکہ ایک مدت مدید تک اونکے یہ اقتدار و آثار اون کے قبضہ اختیار سے نکلگئے انکی حالتیں بالکل خراب ہوگئیں اور عرصہ دراز تک یہ گمنام اور بے نام و نشان رہے۔ لیکن اس ضعف و اضمحلال کی خاص حالتوں میں بھی اُنھوں نے اپنے اس خاندانی شرافت و عظمت کا دعویٰ اور مطالبہ نہ چھوڑا۔ یہانتک کہ قصی ابن کلاب اور ہاشم ابن عبد مناف نے اون تمام اختیار کو اغیار کے قبضہ و اختیار سے واپس لے لیا اور جیساکہ ابھی ابھی تاریخی اسناد سے اوپر لکھا گیا ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگواروں نے اپنی قوم و قبیلہ کو اسی لفظ اہل بیت سے اونکے قدیم اقتدار و عظمت کو یاد دلاکر درستی احوال اور ترقی اموال کی راہ پر لگایا۔ ہاشم مرحوم تک تو اسی سبب کو قریش اپنا موروثی اعزاز سمجھتے رہے۔ مگر ہاشم کے بعد جب بنی ہاشم کے ساتھ اسکا مخصوص تعلق قایم ہوگیا۔ تو اہل بیت سے صرف بنی ہاشم سمجھے جانے لگے۔ ہاشم کے وقت تک گو بنی عبد مناف۔ عبد الدار وغیرہ قبایل و عشایر کے جدا جدا تخصیصی نام رکھے گئے تھے۔ مگر حقیقتاً سب قریش کے ایک ہی نام سے مشہور تھے مگر ہاشم کے بعد بنو ہاشم سے مخصوص اور جداگانہ تفریق قایم ہوگئی۔ طبقات ابن سعد میں ہے۔

اوصی هاشم ابن عبد مناف الی اخیه مطلب بن عبد مناف فبنوا هاشم وبنوا مطلب ید واحدة الی الیوم وبنوا نوفل وبنوا عبد شمس وابناء عبد مناف ید واحدة الی الیوم ص ۴۶ ج ۱۔	ہاشم ابن عبد مناف نے اپنے بعد اپنے بھائی مطلب ابن عبد مناف کو اپنا وصی قرار دیا۔ اُسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہوگئے اور آجتک ایک ہیں۔ اسی طرح بنو نوفل اور بنو عبد شمس (بنو امیہ) ایک ہوگئے۔ اور آجتک ایک ہیں۔

اس بنا پر وہ تمام روحانی عظمت و اقتدار بنو ہاشم کی طرف ودیعت ہوگئے۔ اور انکی سیرت و عادت سائر قریش سے بالکل علیحدہ ہوگئی۔ اور اب اہلبیت کا مقدس و منزز لقب بھی کلیتاً اور قطعاً انہیں سے متعلق ہوگیا اصل میں تو اہلبیت

کا اعزازی خطاب اور امتیازی القاب سب سے پہلے حضرت ابراہیم اور اونکے اہل وعیال کو جنہوں نے بیت الٰہی کی تعمیر کو انجام دیا۔ اور سب سے پہلے اس کی خدمت پر مامور ہوئے۔ منجانب اللہ تفویض فرمایا گیا۔ جیسا کہ نص قرآنی سے ثابت ہے۔ حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے بعد سے حضرت ہاشم کے وقت تک اسی سلسلہ اور خانوادہ کے لوگ اصول توریت کی بنا پر اسکو اپنا جائز حق سمجھتے رہے۔ مگر جہاں تک تحقیق کی جاتی ہے اسکی حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ اس منصب کا تعلق اور اس گرانمایہ القاب و خطاب کی تفویض بھی حصول رسالت اور نزول نبوت کے ساتھ ساتھ تھی۔ چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام رسالت و نبوت کو عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز تھے۔ اسلئے خدمات کعبہ کی بھی انہیں مقدسین کے سپرد ہوئی۔ اور سب سے پہلے یہی گرانمایا القاب خطاب اہلبیت سے مخصوص و معروف فرمائے گئے۔ ہاشم مرحوم کے زمانے تک چونکہ اس سلسلہ میں کسی کو منصب رسالت اور عہدہ نبوت تفویض نہیں ہوا۔ مگر ہاں جو اس سلسلہ ابراہیمی اور خانوادہ اسماعیلی میں محامد اوصاف کریمہ اور افعال و اعمال حسنہ سے آراستہ و پیراستہ پایا گیا۔ وہ اس خطاب القاب کا خاص کر مستحق و سزاوار سمجھا گیا گو اونکے قبیلے اور عشیرے والے برائے نام اہلبیت ہونے کے دعویدار زبانی بنے رہے مگر یہ دعوٰی اونہیں کے خاص ہو کر رہ گئے عام لوگوں نے اسے منظور کیا۔ اور نہ مشہور جیسا کہ بنی ہاشم کے مقابلہ میں بنی امیہ کے بھائی جمع خرچ ہاشم ابن عبد مناف کے بعد اسکی تخصیص بنی ہاشم کے ساتھ ہو گئی۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی اوپر لکھ آئے ہیں۔ مگر بنی ہاشم کی تخصیص۔ انتخاب اور اصطفا۔ اگرچہ احادیث سے ثابت ہے مگر یہ اختصاص و انتخاب بھی انکے محامد و محاسن ذاتی پر مبنی تھا۔ اور اسکو اجزائے رسالت اور شعبائے نبوت سے تعلق نہیں تھا۔ مگر ہاشم مرحوم سے چوتھی ہی پشت میں جناب سید المرسلین اور خاتم النبیین سلام اللہ علیہ و آلہ کو قدرت نے مبعوث فرما کر آپکے انوار رسالت اور شعاع نبوت سے خاندان ہاشم اور دودمان عبد المطلب میں چار چاند لگا دئے واللہ یختص برحمتہٖ من یشاء۔ بارگاہ قدرت اور پایگاہ مشیت سے اس شرف مخصوص اور فضائل و مراتب کی سند منصوص اس خانوادہ مطہرہ کے لئے جدید اور مزید کر دی گئی۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ اور اہل بیت کا مقدس خطاب و القاب اس خاندان کے لئے مستقل اور ابدی کر دیا گیا۔ اور اس عہدہ جلیلہ نے تعمیم کے قدیم قیاسات و توہمات کو بالکلیہ مستاصل و نسیت و نابود کر کے صرف پانچ نفوس قدسیہ خمسۃ النجباء کو (پنجتن پاک علیہم السلام) اور اونکے بعد اونکی اولاد معصومین کو اس عظمت و جلالت کا اصلی مستحق قرار دیا۔ جو نصارائے نجران کے ساتھ مباہلہ کے موقع پر۔ منکرین مسیحی کے مقابلہ میں خدا کی وحدانیت اور اوسکے رسول برحق کی صداقت ثابت کرنے کے لئے خدا کے آگے کھڑے کئے گئے تھے۔ اوسوقت اہل اسلام کی اتنی کثیر جماعت میں بھی پانچ نفوس قدسیہ خدا کی توحید اور رسول کی نبوت کی تصدیق کے شاہد معتبر دستیاب ہوئے۔ اور انکے اسی تکملہ ایمانی اور مجاہدہ نفسی کی

جلد(۲) میں ان بزرگواروں کو آیتہ یداللہ الخ کی بشارت تفویض فرمائی گئی۔ جیسا کہ ان شاء اللہ بالتفصیل اپنے مقام پر بیان کی جائے گی۔

سیرۃ النبی جلد اول میں شبلی صاحب نے ہاشم و امیہ کی تفضیل و ترجیح اور مخالفت و مشاجرت باہمانہ کو خاص کر کے چھپایا۔ اور اتنے بڑے واقعات تاریخ کو مرفوع القلم فرمایا کہ نہ بنی ہاشم کے فضائل و مراتب ظاہر ہو سکیں اور نہ بنی امیہ کے مناقص و معائب۔ اور بنی قصی اور بنی عبد مناف ہونے کی یکجہتی کے مغالطہ میں پڑ کر ان دونوں متضد قبائل و عشائر میں ہمسری اور برابری سمجھی جاوے۔ اور آپس کی مخالفت و مخاصمت سے بالکل بے علم و اطلاع رہ کر جانبین میں مراسم و اتفاق و اتحاد اور ذرائع اخوت و محبت یقین کیجاوے و ان ہذا ضلال مبین۔

شبلی صاحب کی یہ ایجاد بھی طبعزاد نہیں ہے بلکہ تحقیق سے اسکی ابتدا بھی معاویہ کے مبتدعات و مخترعات پر منتہی ہوتی ہے۔ چنانچہ معاملات صفین میں پہلا خط جو معاویہ نے جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا ہے اوسکی عبارت عنوان یہ تھی۔

ہم بنی عبد مناف ایک چاہ سے پانی پیتے تھے۔ اور ایک ماں کی چھاتی سے دودھ ہم پیا کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں تھی۔ اور ہمارا کوئی قائم اپنے قاعد پر فخر و افتخار نہیں رکھتا۔ مجبور اور ممتاز ہمارے دونوں مساوی تھے۔ اور ہماری جماعت متفق تھی .... ترجمہ تاریخ اعثم کوفی۔

مولوی شبلی صاحب کی تنہا کوششوں سے حقیقت کا استخفاف نہیں ہو سکتا اون کے اختیار و قدرت میں بس اتنا ہی تھا کہ وہ اپنی کتاب میں لکھیں۔ جیسا اونھوں نے کیا۔ مگر اون بیشمار کارناموں کو کیا کریں گے جو دو ہزار برس متغیر سے ان واقعات کی حقیقت کا تمام دنیا کو مشاہدہ کرا رہے ہیں۔

سلمی بنت عمر سے عقد اور وفات

مرقومہ بالا مشاہدات تاریخی سے ثابت ہو گیا کہ امیہ ابن عبد شمس کی حسد و نفسانیت ہاشم کی عظمت اور اقتدار کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ بلکہ اس کے خلاف تمام اہل عرب نے۔ امیہ کو خفیف الحرکات حاسد اور ناقابل سمجھا۔ ہاشم مرحوم مادام الحیات بڑی ثروت۔ بڑے اقتدار اور بڑی شان و شوکت سے امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کو خدمات انجام دیتے رہے۔ اور تمام ملکی اور قومی رفاہ و اصلاح کی تدبیروں اور کوششوں کو کسی وقت نظر انداز یا فراموش نہ کر سکے حکومت و امارت کے ملکی نظام و تدبیر کے علاوہ قومی تجارت اور کاروبار کی ترقی و کامیابی کی تجویزیں ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور کبھی اوس سے نا توجہی اختیار نہیں کی کاروان تجارت کے ساتھ خود آتے جاتے رہے۔ راستوں۔ گذرگاہوں اور منزلوں میں اہل کاروان اور اون کے سامان کی حفاظت اور

امن وامان کے انتظام واہتمام فرماتے رہے۔ یہانتک کہ اس شیدائے ملک ووطن اور فدائے قوم نے انھیں امور انتظام میں اپنی جان نثار کردی۔ تفصیل یہ ہے ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

فخرج هاشم في عير لقريش فيها تجارات و كان طريقهم على المدينة فنزلوا السوق النبط فصادفوا سوقا تقوم بها في السنة يحشدون لها فباعوا واشتروا ونظروا الى امرأة على موضع مشرف من السوق فرأى امرأة تأمر بما يشترى ويباع لها فرأى امرأة حازمة جلدة مع جمال فسأل هاشم عنها أأيم هي أم ذات زوج فقيل له أيم كانت تحت احيحة بن الجلاح فولدت له عمرا ومعبدا ثم فارقها وكانت لا تنكح الرجال لشرفها في قومها حتى يشرطوا لها ان امرها بيدها فاذا كرهت رجلا فارقته وهي سلمى بنت عمرو بن زيد بن لبيد بن خداش بن عامر بن غنم ابن عدى النجار فخطبها هاشم فعرفت شرفه ونسبه فزوجته نفسها ودخل بها وصنع طعاما ودعا من هناك من اصحاب العير الذين كانوا معه وكانوا اربعين رجلا من قريش فيهم رجال من بني عبد مناف ومخزوم وسهم و دعا من الخزرج رجالا واقام باصحابه اياما وعلقت سلمى بعبد المطلب فولدته وفي راسه شيبة فسمى شيبة وخرج هاشم في اصحابه الى الشام حتى بلغ غزة فاشتكى فاقاموا عليه حتى مات فدفنوه بغزة۔ ص ٤٦.

ہاشم کاروان قریش کے ساتھ بغرض تجارت نکلے اور مدینہ کے راستہ پر بازار نبط میں پہونچے جہاں ہر سال بہت بڑا بازار لگا کرتا تھا۔ اور قرب وجوار سے لوگ جمع ہو کر خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور اُسوقت بھی لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ اور انکی نظر کیطرف متوجہ ہوئی۔ جو بازار کے ایک مقام بلند پر مقیم تھی۔ اور وہ خاتون اون لوگوں کو انکے اشیائے ضروری کی خرید و فروخت کیلئے حکم کرتی تھی۔ اور سب لوگ اُسکی طرف سے خرید و فروخت کر رہے تھے۔ وہ قبول صورت صاحب جمال خاتون تھی۔ ہاشم بھی اونکی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اونکی نسبت لوگوں سے پوچھا کہ یہ بیوہ ہے یا صاحب شوہر ہے تو معلوم ہوا کہ زن بیوہ ہے۔ یہ پہلے احیحہ بن جلاح کے حبالۂ نکاح میں تھیں اور اونسے انکے دو بیٹے عمرو اور معبد نامی پیدا ہوئے۔ انکے بعد احیحہ نے طلاق دیدی اور آپ بوجہ اپنی شرافت ونجابت ذاتی کے قوم سے کسی مرد سے اوسوقت نکاح کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تاوقتیکہ وہ مرد اس امر کا اقرار نہ کرے کہ نکاح کے بعد اُن کو اختیار رہیگا کہ اگر وہ اسکو ناپسندیدہ پائینگی تو اُس سے مفارقت اختیار کرلینگی۔ انکا نام سلمیٰ بنت عمرو بن زید بن لبید بن خداش بن عامر بن غنم بن عدی قبیلۂ بنی النجار سے ہیں۔ یہ سنکر ہاشم نے اونکے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔ کیونکہ وہ صاحب حسن جمال تھیں سلمیٰ کو جب ہاشم کی شرافت حسبی و نسبی کا حال معلوم ہوگیا تو ہاشم سے عقد کرلیا۔ ہاشم نے عقد سلمی کی ولیمہ کی تقریب کی کی کھانا پکوایا اور جتنے لوگ کاروان قریش میں اسوقت اونکے ساتھ تھے سب کی دعوت کی سب کو بلایا۔ اور کھلایا اور یہ سب

مجمع چالیس آدمی تہے۔ اور انہیں بنی عبد مناف بنی مخزوم۔ اور بنی سہم کے قبیلے والے موجود ہو سلمیٰ کیطرف سے خزرج کی قبیلے والے بہی بلائے گئے۔ شادی کے بعد ہاشم نے چندے وہاں قیام کیا۔ انہیں دنوں سلمیٰ کو عبد المطلب کا حمل رہگیا اسکے بعد ہاشم اپنے اصحاب کیساتہ شام کی طرف روانہ ہوئے مقام غزہ پہنچکر بیمار پڑ گئے۔ انکی علالت کی وجہ سے قافلہ والوں نے وہیں قیام کیا۔ ہاشم نے بالآخر وہیں وفات پائی۔ قافلہ والوں نے غزہ ہی میں اونکو دفن کردیا۔ طبقات ج ۱ ص ۴۶۔

ہاشم کی وفات تقریباً سنہ ۵۰۱ء میں واقع ہوئی۔ اور یہی عبد المطلب کا سال ولادت بہی ہے۔ مرقومہ بالا واقعات انہیں مضامین کے ساتھ سیرت ابن ہشام ص ۶۶ مطبوعہ مصر میں بہی مندرج ہیں۔ ہاشم مرحوم کے ایسے محسن سرپرست اور ممدوح ارقیم وملک کی وفات پر مرثیہ نہ لکہے جائیں۔ امکان سے باہر ہے اہل عرب نے انکی وفات پر بے شمار مراثی لکہے۔ ان تمام مراثی میں انکی دو صاحبزادیوں کو دو مرثیے خاص طور پر مشہور ہیں اور عرب کی تاریخ ادب کی کتابوں میں آجتک محفوظ و مسطور ہیں ابن سعد اور ابن ہشام کے جامعات سے اونکا ایک ایک شعر ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ خالدہ بنت ہاشم کا شعر۔

بکما لنعی بخیر من وطئ الحسی
ذی المکرمات وذی الفعال الفاضل

بہتر ہے گریہ وزاری اوس شخص کا رکیلئے شایاں ہے جو اپنے قبیلہ و جماعت میں سب سے بہتر تہا۔ صاحب مکارم تہا۔ اور صاحب اعمال حسنہ

شفا بنت ہاشم کے مرثیہ کا یہ شعر ہے۔

عین جودی بعبرۃ وسجوم
واسفحی الدمع للجواد الکریم

اے آنکہ اس غم ومصیبت میں اور اوس کریم وجواد مرد بزرگ کے لئے رو اور اپنے آنسو بہا۔

ہاشم مرحوم کا نام عمرو ابن مناف اور لقب ہاشم تو تمام تاریخ و سیر میں مندرج ہے مگر کنیت کم دیکھی گئی۔ صاحب صراح اللغات نے ابو نضلہ کنیت تبلائی ہے اور وجہ کنیت یہ ٹہرائی ہے کہ بنی ہاشم تمام عرب میں بہت بڑے تیر انداز مشہور تہے۔ اور اس فن کے کامل تہے۔ یہ کمال اونکو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام و راثتاً پہونچا تہا۔ اسی رعایت سے ہاشم کی کنیت **ابو نضلہ** مشہور تہی۔ صراح مطبوعہ کلکتہ ص ۹۸۶

مطلب ابن عبد مناف کی امارت

محمد ابن سائب الکلبی۔ امام الانساب کے اسناد سے اوپر لکہا گیا ہے۔ کہ ہاشم نے اپنی وفات کیوقت اپنے بہائی مطلب کی امارت کے لئے وصیت کردی تہی ابن سعد لکہتے ہیں۔

المطلب بن عبد مناف بن قصی اکبر من
ہاشم ومن عبد شمس ھو الذی عقد الحلف

یعنی مطلب ابن عبد مناف ابن قصی ہاشم اور عبد شمس دونوں سے بڑے تہے اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے قریش کے لئے

العراهیش من النجاشی فی متجرهاو کان شریفا فی قومه مطاعا سیدا وکانت قریش تسمیة الفیض لسماحة فولی بعد هاشم السقایه والرفادة۔

بادشاہ نجاشی سے معاہدہ قائم فرمائے وہ اپنی قوم و قبیلہ کے سید و سردار اور اشرف ترین مردم تھے۔ اور یہ وہی بزرگ ہیں جنکی فیاضی اور سخاوت کے اعتبار سے قریش نے انکا لقب الفیض رکھا تھا۔ ہاشم مرحوم کے بعد خدمت کعبہ میں سقایہ اور رفادہ کے متولی ہوئے۔ طبقات ص ۴۸ ہم۔

افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اِس بزرگ ہاشمی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید اِس کوتہ قلمی میں یہ مصلحت مضمر ہو کر بزرگان اور نمودارانِ بنی ہاشم کی تعداد میں جہاں تک کمی ہو۔ وہ آپکے مدعائے تالیفی کے مطابق اور مناسب ہوگی نہ انکی امارت کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اور نہ نجاشی کے ساتھ معاہدہ جدید کی قومی خدمت کا تذکرہ لکھا۔ یہی تو حضرت عبد المطلب کے حالات میں اتنا کہ مطلب۔ ہاشم۔ کے بھائی تھے ان کو (آپکے ننہال میں رہنے کے حالات) معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے وہاں پہنچکر بھتیجے کی جستجو شروع کی سلمٰی نے انکا حال سنا تو بلا بھیجا۔ تین دن مہمان رہے چوتھے دن شیبہ (عبد المطلب) کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۲۱۔

اِس عبارت سے غریب مطلب کی کیا معرفت ہوئی۔ اور آپ کے اس مختصرہ سے دنیا کو مطلب ابن عبد مناف کے ذاتی اوصاف۔ خدمات اور حالات کیا معلوم ہوئے کیا ایک محقق مؤرخ اور سیرت نگار کا معیار تالیف اور اشعار تصنیف یہی ہونا چاہئے۔ کہ وہ ہر شخص کے حالات اور ذکر و اذکار میں بلا ضرورت اتنا اختصار اختیار کرے کہ اوسکے نہ ذاتی حالات معلوم ہو سکیں اور نہ اوسکے خدمات۔

افسوس ہے کہ شبلی صاحب کے نزدیک یہ بزرگ ہاشمی اگر کسی توجہ اور التفات کے قابل نہیں تھا تو اس سے اوسکی عظمت و جلالت میں سرمو کمی نہیں آئی کیونکہ وہ یہ نمودار اور ذی اقتدار سردار قریش ہے جسکے لطف و ایثار کے زیر بار ہو کر تمام ملک و قوم نے اوسکو فیاض کا لقب مخصوص تفویض کیا ہے۔

حضرت مطلب کی وفات علاقہ یمن کے شہر قزوان میں واقع ہوئی۔ مطلب قریش کے کاروان تجارت کے ساتھ حسب المعمول یمن گئے تھے۔ قزوان میں پہنچکر علیل ہو گئے۔ اور اُسی علالت میں انتقال کر گئے۔ مطلب کی وفات ہاشم کے انتقال سے دس برس بعد تقریباً ۵۲۰ء میں واقع ہوئی۔

حضرت عبد المطلب ابن ہاشم کی امارت

حضرت عبد المطلب کا اصلی نام شیبہ تھا۔ شیبہ نام رکھے جانیکی وجہ ابن سعد اور ابن ہشام وغیرہم یہ بتلاتے ہیں "

علقت سلمی بعبد المطلب فولدته وفی راسه شیبه فسمی شیبه - ص ۴۶

ہاشم سے سلمی کو عبد المطلب کا حمل رہ گیا جب وہ پیدا ہوئے تو اونکے سر میں سفید دکھلوئی بال تھے اسسے انکا نام شیبہ ہوا

حضرت ہاشم کے انتقال کے بعد سے یہ برابر ننہال میں رہے سلمی نے بوجہ اپنی خوشحالی کے سسرال کی کوئی پروا نہیں کی اور نہ اون لوگوں سے کسی قسم کے تعلقات قائم رکھے ۔ اور معاملات تو رہے شیبہ (حضرت عبد المطلب) اپنے یتیم بچے کے جوان ہونیکے وقت تک اوٹھار کھا اور اس درمیان میں سلمی نے اپنی طرف سے اس بچہ کی خبرگیری یا اس کے وہاں طلب کرنے جانیکی تحریک کو اپنی غیرت اور شریفانہ ہمت کو خلاف سمجھا ۔ اور بالکل خاموشی اختیار کی اسلئے عبد المطلب کیطرف سے بنو ہاشم کو ایک عرصہ تک قطعی لاعلمی رہی یہانتک کہ مطلب کو یہ بھی معلوم نہیں تھا ۔ کہ اونکے برادر مرحوم کا کوئی یتیم معصوم دنیا میں یادگار موجود ہے

مطلب کو عبد المطلب کے حالات کی کیسے اطلاع ہوئی

شبلی صاحب ان اقسام کے حالات و واقعات کو زوائد میں شمار کرتے ہیں اور اپنی سیاق تحریر سے خلاف سمجھتے ہیں ۔ مگر ہم تاریخ تحقیق اور سیرت نگاری کی موجودہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے کسی خاص شخص کے حالات وواقعات پر جزوی اور کلی تفصیل کو جس سے اوس خاص شخص کی ذاتی اور صفاتی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہو اپنا فرض تالیفی سمجھتے ہیں اسلئے شبلی صاحب کے اون اختصارات سے جو اکثر مقامات پر صرف اشارات ہوکر رہجاتے ہیں قطع نظر کرکے ان حالات کو اسی تفصیل سے بیان کرتے ہیں جس تفصیل سے وہ اپنے اصلی ماخذ و ںمیں مندرج ہیں اسکے متعلق طبقات ابن سعد ۔ سیرت ابن ہشام اور تاریخ کبیر ابن جریر طبری میں مرقوم ہے ۔

وقدم بن المنذر بن حرام وهو ابو حسان ابن ثابت الشاعر مكة معتمرا فلقي المطلب وكان له خليلا فقال له لو رأيت ابن اخيك شيبه فينا لرأيت جمالا وهيبة وشرفا لقد نظرت اليه وهو يناضل فتيانا من اخواله فيدخل مرماتيه جميعا في مثل راحتي هذه ويقول كلما خسقي انا ابن عمرو العلى فقال المطلب يا ابا اوس لا امسی حتی اخرج اليه فاقدم به فقال ثابت ما ارى سلمى تدفعه اليك

ثابت ابن منذر ابن حرام ۔ حسان ابن ثابت شاعر کے باپ مکہ میں بقصد عمرہ آئے اور مطلب سے ملے انہیں اور ان سے مراسم اتحاد تھے ۔ باتوں بات میں کہنے لگے کہ اگر تم نے اپنے بھتیجے شیبہ سلمی کو جو فی الحال ہمارے قبیلہ کے ہمراہ ہے دیکھو تو اسکو خوش جمالی ہیبت اور شرافت کی سراپا تصویر پاؤ گے میں نے اسکو اوسکے ماموں کے لڑکوں کے ساتھ تیراندازی کرتے ہوئے دیکھا اور جب اسکا نشانہ برابر ٹھیک ٹھیک بیٹھتا تھا ۔ تو وہ آواز بلند پکار اٹھتا تھا ۔ کہ میں ہوں عمر اعلی کا بیٹا ! (عمر ہاشم کا نام تھا یہ سنکر مطلب نے کہا کہ میں تو اسکو اپنے ساتھ لائے بغیر اب نہیں

ولا اخواله حتى يكون هو الذي يقدم عليك
الى ما ههنا راغبا فيك فقال المطلب يا ابا اوس
ما كنت لادعه هناك ويترك ماثر قومه و
سطته ونسبه وشرفه فى قومه ما قد علمت
فخرج المطلب فورد المدينة فنزل فى ناحيه
وجعل يسال عنه حتى وجده يرمى فى فتيان
من اخواله فلما راه عرف شبه ابيه فيه
ففاضت عيناه وضمه اليه وكساه حلة
يمانية والشاء يقول ـ

عرفت شيبة والنجار قد حفلت
ابناءها حوله بالنبل تنتضل
عرفت اجلاده منا وشيمته
ففاض منى عليه وابل سبل

فارسلت سلمى الى المطلب فدعته الى النزول
عليها فقال شانى اخف من ذلك ما اريد ان
احل عقدة حتى اقبض ابن اخى والحقه
ببلده وقومه فقالت لست بمرسلته معك
وغلظت عليه فقال المطلب لا تفعلى فانى
غير منصرف حتى اخرج به معى ابن اخى قد
بلغ وهو غريب فى غير قومه ونحن اهل بيت
شرف قومنا والمقام ببلده خير له من المقام
ههنا وهو ابنك حيث كان فلما رأت انه غير
مقصر حتى يخرج به استنظرته ثلاثة ايام
وتحول اليهم فنزل عندهم فاقم ثلاثا ثم ضمه
وانطلقا جميعا فانشاء المطلب يقول كما

رہ سکتا۔ ثابت نے کہا کہ میں تو نہیں کہتا کہ سلمیٰ یا اوسکے
ماموں۔ جو اوسکے ہم بطن ہیں۔ اُسکو تمہارے ساتھ
آنے دینگے۔ اور آپکو بھی ابھی اُسکو یہاں نہ لانا چاہئے
کیونکہ وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہے۔ کسی غیر کے گھر تو نہیں ہے اور یہ
ایسی حالت میں کہ تم کو اُسکے لانیکی اور شاید کہ ہونیکی خود رغبت
ہوئی ہے۔ مطلب نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ (اے ابا اوس
ثابت کی کنیت تھی۔) یہ مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُسی کا خیر
چھوڑ دوں اور اس آثار۔ اقتدار اور نسبی افتخار کو جو
میری قوم میں اُسکو حاصل ہے۔ اُس سے چھڑا دوں یا اون سے اُسکو محروم
رکھوں الحاصل مطلب مکہ سے روانہ ہوئے مدینہ پہونچے اور
بیرون شہر مقیم ہوئے۔ اور اپنے بھتیجے کی تلاش کرنے لگے اور
بالآخر اسکو پا گئے۔ اسی حالت میں جیسا کہ ثابت نے اوس سے بیان
کیا تھا۔ شیبہ اور بچوں کے ساتھ تیر اندازی میں مصروف تھے دیکھتے
ہی مطلب نے پہچان لیا۔ اور اونکو اپنے باپ ہاشم برادر مطلب کا
ہو بہو ہمصورت و ہمشبیہ پایا مطلب کی آنکھوں سے بے اختیار
آنسو جاری ہوگئے۔ فوراً اسکو لپٹا لیا اور ایک حلہ یمانی جو
مخصوص انکے لئے گھر سے لے گئے تھے۔ پہنا دیا اور یہ اشعار انکی
زبان پر جاری ہوگئے ۔ میں نے شیبہ کو ایسی حالت میں کہ نبی نجار
کے لڑکے تیر اندازی میں اسے گھیرے ہوئے تھے۔ پہچان لیا میں
نے اوسکی جسمانی ساخت کو بالکل اپنے لوگوں سی پائی اور
اوسکی اپنی خوشبو بھی پائی۔ پس میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو
جاری ہوگئے۔ اب سلمیٰ کو مطلب کے آنیکی خبر ملی انہوں نے مطلب کو
اپنے گھر بلا بھیجا مطلب گئے اور کہنے لگے کہ میرے لئے بڑی بدنامی کا
باعث ہوگا اگر تم میں سے اپنے بھتیجے کے لے لینے اور اپنے
شہر میں لیجانے کا عزم و ارادہ چھپاؤں یہ سنکر

انشد نی هشام بن محمد عن ابیه
ابلغ بنی النجار ان جئتهم
انی منهم وابنهم والخمیس
رائیتهم قوما اذا جئتهم
هووا لقائی واحبوا حسیسی
ودخل به المطلب مکة ظهرا فقالت قریش
هذا عبد المطلب فقال ویحکم انما هو ابن
اخی شیبه ابن عمر۔ طبقات ص ۴۸-۴۹

سلمی نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ اسکو بھیجنے جانے پر کبھی راضی نہونگی اور اسپر سلمی نے سخت قسمیں کھانی شروع کردیں مطلب نے کہا ہاں یہ نہ کرو کیونکہ میں تو اب بغیر اوسکو لئے گئے یہاں سے ٹلتا نہیں۔ ہوں کیونکہ تم خود سوچو کہ میرا بھتیجا بالغ کے قریب پہونچگیا اور وہ ابتک ایک غیر قوم و قبیلہ میں یکہ و تنہا ہے اور ہم لوگ اہلبیت ہیں جو اپنے تمام قوم و قبیلہ میں اشرف ترین افراد ہیں اور یہ بھی غور کرو کہ اوسکے لئے اس مقام میں بنسبت اپنے خاص شہر میں رہنا زیادہ مناسب ہے اور یوں تو وہ جہاں ہے گا تمہارا بیٹا ہے اور تمہارا فرزند۔ بالآخر جب سلمی کو یقین ہوگیا کہ مطلب اپنے ارادہ سے باز نہ آئینگے تو مطلب نے تین دن اور سلمی اور قبیلہ بنی النجار کے اظہار رائے کا انتظار کیا اور انہیں لوگوں نے اس امر کو قبول کر دیا اور تین دن تک بنی النجار کے مہمان رہے۔ آخرکار انکی رضا و امتزاج سے لڑکے کو ہمراہ لیچلے اور بنی نجار کے تمام لوگ رسم ترخیص کو اور مطلب کی مشایعت کی غرض سے اونکے ہمراہ ہوئے۔ اور مطلب نے انکے یہ اخلاق و اشفاق دیکھکر یہ اشعار انشاد کئے جس سے بطرف سے بنی نجار کو یہ پیغام پہنچا دو کہ میں نے انکے پاس آکر یہ سمجھ لیا ہے کہ اونکے اہل و عیال اور تمام گروہ گویا میرے لوگ ہیں اور گویا میں انہی لوگوں میں ہوں میں نے ان لوگوں کو ایک ایسی قوم پایا کہ میں جب ان لوگوں کے پاس پہونچا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری ملاقات کیا میری آواز تک کے مشتاق ہیں۔ بہرحال مطلب اپنے بھتیجے شیبہ کو ساتھ پشت ملکہ سے شہر میں داخل ہوئے۔ قریش نے اس لڑکے کو انکے پیچھے بیٹھا دیکھکر کہا کہ یہ تو عبدالمطلب ہے۔ غلام مطلب ہے۔ مطلب نے انکے اس غلط قیاس کی فوراً تردید کر دی اور کہا افسوس ہے تم پر یہ شیبہ ابن عمرو ہاشم میرا خاص بھتیجا ہے۔ طبقات از صفحہ ۴۸ و ۴۹۔

قبیلہ بنی النجار کے انھیں محاسن اخلاق کے اعتراف میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم داخلہ مدینہ کیوقت قبیلہ بنی نجار کو اپنی فرودگاہ بننے کے شرف خاص سے مشرف فرمایا جسکو ہم تفصیل سے اپنے مقام پر لکھیں گے بنی نجار کی نمو داری اور ذی اقتداری کے لئے یہی ثبوت کافی ہیں۔

آمدم بر سر مطلب۔ مندرجہ بالا واقعات کو شبلی صاحب کے موجودہ طریقہ اختصارات و اشارات کے خلاف ہم نے تفصیل و تطویل سے کیوں لکھا۔ صرف اسلئے کہ شبلی صاحب جن مختصر اور گنے ہوئے الفاظ میں اس تاریخی واقعہ کو لکھا ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔ عربی ماخذ کی اصلی عبارت بھی اس غرض سے نقل کر دیگئی ہے کہ دونوں عبارتوں کے مقابلہ اور موازنہ کے وقت بآسانی معلوم ہو جائے کہ مولوی صاحب کے مختصرہ سے اس بزرگ ہاشمی اور سید قریشی کے متعلق اون امور کی کوئی اطلاع۔ کوئی خبر اور کوئی علم نہیں ہو سکتا جن سے اس بزرگ کی ذاتی وجاہت اور ذی اثر ہونیکا ثبوت

بنوت خاص اوسی کے قوم و قبیلہ میں نہیں پایا جاتا بلکہ دوسری قوم و قبائل میں بھی اوسکی عظمت اور حرمت اسیطرح مسلّم اور مقدم سمجھی جاتی ہے۔

اسی تفصیل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بنی ہاشم میں اسوقت اپنی قومی حمیّت اور خاندانی شرف و مفاخرت کا کس حد اور کس درجہ تک کا پاس و لحاظ تھا۔ کہ مطلب اپنے گم گشتہ عزیز خاندان کے حالات ثابت کی زبانی سنکر جو نہایت آرام و راحت سے اپنے ننہال میں پرورش پاکر جوانی کے قریب پہنچگیا تھا۔ یعقوب وار بیتاب ہوگئے۔ اور پھر ایک منٹ تک اوسکے پرورش پانیکو قبیلہ غیر میں۔ گو وہ قرابت اور عزیز داری میں کتنا ہی قریب نہو گوارا نہ کرسکے۔ مدینہ پہونچے سلمیٰ اور تمام اکابر و عمائد بنی نجار لڑکے کے چھوڑ جانیکیلئے۔ اصرار پر اصرار کرتے رہے۔ مگر مطلب نے ایک نہ مانی۔ اور کسیطرح اپنی حمیّت خاندانی اور عظمت موروثی کے حقیقی افتخار اور اصلی اقتدار کو یہ کہکر کہ ہم اہلبیت میں اور اپنی قوم و قبیلہ میں اشرف ترین افراد۔ ان کے اخلاق و اشفاق کا زیر بار نہ ہونے دیا۔

کیا شبلی صاحب اِن واقعات کو جنکے لفظ لفظ اور حرف حرف سے مطلب اور خاندان ہاشم کے فضائل و خصائص ثابت ہوتے تھے۔ اپنے مدعائے تالیفی سے زائد سمجھتے تھے۔ کیا ان واقعات سے جناب سالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جد بزرگوار کے اعلیٰ محاسن اخلاق۔ طرز معاشرت۔ شریفانہ حمیّت اور شریفانہ شان و شوکت کا اظہار نہیں ہوتا؟ کیا اپنے بھتیجے کی تلاش میں مطلب کی یہ تمام سرگذشت واقعات تاریخی کی تعریف میں نہیں آتی؟ کیا یہ واقعات ایک تاریخ نویس اور سیرت نگار کے لئے قابل الذکر نہیں ہیں؟ نہیں واقعات تاریخی بھی ضرور ہیں۔ اس لئے کہ شبلی صاحب شیخ التحقیق۔ ابن سعد کے طبقات میں موجود ہیں۔ اور قابل الذکر بھی ضرور ہیں۔ اسلئے کہ اس سے مکہ و مدینہ کے وضعدار اور ذی اقتدار قبیلوں کے حسن معاشرت تہذیب اور تمدن کے حالات پورے طور سے معلوم ہوتے ہیں مگر یہاں مولوی شبلی کیلئے اس وجہ خاص سے قابل ذکر نہیں ہیں کہ اِنسے آپکو مجوزہ ہیروز آف اسلام کے فریق مخالف بنی ہاشم کی فضیلت شرافت۔ قومی عزت اور خاندانی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ آپ کی طبع نازک کے ناگوار ہے۔ مولوی صاحب کے مقلدین ہی اِس طریقۂ اختصار کو پسند کرینگے ورنہ ایک محقق اور مورخ تو ان حالات کی تفصیل کو اپنی تاریخ و سیر کے تالیفی مقاصد کے اجزائے لازمی تسلیم کریگا۔ اور اسی اصول کی بنا پر قدیم و جدید مورخین واہل سیرت نے اپنی تالیفات و تصنیفات میں ان واقعات و حالات کو مفصل طریقہ سے قلمبند کیا ہے۔

شیبہ کی وجہ تسمیہ ہم اوپر بیان کرآئے ہیں۔ مگر قوم قریش نے انکے تحمل و وقار اور شوکت و اقتدار کے اعتبار سے انکو **شیبۃ الحمد**۔ کا خطاب دیا تھا۔ مگر تمام لوگ عبد المطلب ہی کہتے تھے۔ اور بالآخر یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ مطلب نے اپنی وفات کے وقت انہیں کو اپنا وصی و وارث قرار دیا۔ طبقات میں ہے۔

فولی عبد المطلب بن هاشم بعد الرفادة و ... مطلب نے رفادہ اور سقایہ کو منصب اپنے عہد بعد مطلب کو سپرد کردئے

السقایۃ فلم یزل ذلک بیدہ یطعم الحاج و یسقیھم فی حیاض من ادم بمکۃ فلما سقی زمزم یترک السقی فی الحیاض بمکۃ وسقاھم من زمزم حین حفرھا وکان یحمل الماء من زمزم الی عرفۃ فیسقیھم۔

اور انھوں نے بھی حجاج کا کھانا کھلوانا اور چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں پانی بھر بھر کر اون کو پانی پلانا ترک نہیں کیا۔ لیکن جب اونھوں نے چاہ زمزم کو کھود کر پانی پلانا شروع کیا تو اسیوقت سے ان چمڑی حوضوں کے ذریعہ سے پانی پلانے کا طریقہ موقوف ہوگیا۔ طبقات ۹۴ ۔

شبلی صاحب نے اِس بزرگ کی نسبت بہی وہی کوتہ قلمی اور اختصار پسندی کا قدیم طریقہ اختیار کیا ہے چنانچہ تلاش و تیاری چاہ زمزم کے متعلق صرف اتنی ہی خامہ فرسائی گوارا فرمائی گئی ہے۔

عبد المطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم گیا تہا۔ اونھوں نے اسکا پتا لگایا۔ اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کرا دیا۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۲۱

یہ تو شبلی صاحب کی مختصرہ عبارت ہے۔ مگر آپ سے سیکڑوں برس پہلے کی عربی تاریخوں سے اسکے تفصیلی حالات جو تحقیق ہوتے ہیں۔ وہ ذیل میں مندرج کئے جاتے ہیں۔ سیرت ابن ہشام میں بنی جرہم کے اخراج مکہ و ترک و تولیت خانہ کعبہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

فخرج عمرو ابن الحارث بن مضاض الجرھمی بغزالی الکعبہ وبحجر الرکن فدفنھا فی زمزم وانطلق۔

عمرو ابن الحرث ابن مضاض الجرہمی نے کعبہ کو دونوں ہرنوں کے مجسّمے اور حجر الاسود کعبہ کے اندر سے نکال لئے۔ زمزم میں اونکو دفن کردیا اور چلے گئے۔

حافظ جمال الدین محدث شیرازی نے کامل ابن اثیر کے اسناد سے۔ اِس واقعہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب روضۃ الاحباب میں لکھا ہے۔ اون کی اصلی عبارت یہ ہے۔

چوں حال بایں منوال رسید قوم جرہم رالیقین گشت کہ ریاست مکہ از ایشاں زائل میشود۔ دل ازاں بر داشتند۔ و رئیس ایشاں دراں وقت عمرو ابن حارث بود حسد او رباعث شد بر آں کہ حجر الاسود را از رکن برکند۔ وصورت دو آہو تیر از طلا کہ اسفندیار فارسی بہدیہ بکعبہ فرستادہ بود و از اعزاز آل الکعبہ خوانندے باسلاحے چند کہ درخانہ کعبہ بود ہمہ برداشت و درچاہ زمزم پنہاں کردو آنرا انباشت و بازمیں ہموار نمود۔

جب اس طریقہ پر حال پہنچگیا تو قوم جرہم نے یقین کرلیا کہ مکہ کی ریاست ہم سے چلی جاتی ہے تو اونھوں نے اسکی طرف سے اپنا دل اوٹھالیا۔ اوسوقت اونکا سردار عمرو ابن حارث تہا۔ اسپر حسد نے غلبہ کیا اوس نے کعبہ سے حجر الاسود کو اکھاڑکر۔ اور اون دونوں ہرنوں کے طلائی مجسموں کو۔ جو اسفندیار شہریار فارس نے کعبہ میں نذر چڑہائے تہے۔ لیکر اور اون چند سلاحوں کو جو کعبہ میں تہے سبکو اوٹھاکر چاہ زمزم میں پوشیدہ کردیا۔ اور زمزم کو پاٹ کر زمین کے برابر کردیا۔ روضۃ الاحباب جلد اول ص ۶۲ مطبوعہ لکھنو۔

زمزم کی تلاش اور از سر نو مرمت
حضرت عبد المطلب کی بے نظیر ہمت

چاہ زمزم کے مفقود اور بے نام ونشان کی یہ وجہ ہوئی زمزم سلسلہ ابراہیمی اور خانوادہ اسمٰعیلی کی عظمت وتقدیس کا قدرتی اور نہایت قدیم یادگار رہتا۔ اسلئے بنو اسمٰعیل اُسکی یاد کبھی بھول نہیں سکتے تھے۔ اتنا لکھکر ہم اپنے سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔

باوجودیکہ بنی جرہم و بنی قضاعہ کے بعد امارت مکہ پھر بنو اسمٰعیلؑ کے قبضہ میں آگئی۔ مگر تاہم حضرت عبد المطلب کے وقت تک کسی بزرگ ہاشمی کو چاہ زمزم کے سراغ لگانے اور مرمت کرانے کیطرف نہ متوجہ ہوئی۔ اور نہ ہمت تمادی زمانہ کے سبب بنو اسمٰعیل کے اکثر افراد زمزم کے نام اور اوسکی حقیقت کو فراموش کر گئے۔ ساکنین عرب عموماً اور باشندگان مکہ خصوصاً پانی کو ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے جسکے مقابلہ میں وہ دُنیا کی کسی دولت کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ مکہ میں انسانی آبادی کا اصلی باعث بھی زمزم کا چشمہ ثابت ہوتا ہے جسکو پہلے حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیل علیہما السلام اور اونکے بعد بنو اسمٰعیلؑ نے گھیر کر ایک حوض مدور یا کنوئیں کیصورت میں بنالیا تھا وہ اتنی مدت مدید سے مفقود اور لا وجود ہو گیا تھا۔ مکہ والوں کی آب کی جیسی تکلیف ہو رہی تھی وہ بالکل اندازہ سے باہر ہے۔ خیریت تھی کہ شہر میں کچھ کنوئیں کھودلئے گئے تھے۔ جن سے پیاسوں کی پیاس بجھ جایا کرتی تھی۔ مگر تاہم سالہاسال مکہ میں پانی کا قحط نمودار رہتا تھا۔ حج کے ایام میں یہ تکلیف اور بڑھ جاتی تھی۔ اور منصب سقایہ کی گویا جان پر بن آتی تھی۔ سمجھ لینے کے لئے کافی ہے۔ کہ جس مقام پر وہاں کعبہ کیضرورت کے لئے پانی کافی نہو۔ وہاں باہر کے آنیوالی حجاج کی بے شمار جماعت کے لئے کافی طور پر پانی فراہم کرنا آسان بات نہیں تھی۔

قصی ابن کلاب کے ایام امارت سے لیکر مطلب ابن عبد مناف کے عہد حکومت تو جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے بڑے بڑے چرمی حوضوں میں۔ شہر کے کنوؤں سے پانی بھر کر خانہ کعبہ کے صحن میں رکھدیا جاتا تھا۔ اور وہی حجاج کو پلایا جاتا تھا۔ عرفات و منیٰ میں جانیوالے دن بھی یہی حوض اوٹھا کر وہاں لیجائے جاتے تھے۔ اور یہی ان دونوں مقاموں میں بھی حجاج کے کام آتے تھے۔

عبد المطلب نے بھی اپنی امارت کے ابتدائی ایام میں چندے خدمت سقایہ کی انجام دہی میں یہی قدیم طریقہ اختیار کئے وہ بھی انھیں حوضوں کے ذریعہ سے تمام حجاج کو پانی پلایا کئے۔ بالآخر اونھوں نے اسکو حد درجہ کی تکلیف کا باعث سمجھا اور اصلی چاہ زمزم کے سراغ لگانے اور وہاں پھر از سر نو ایک نیا کنواں بنانیکا ارادہ کیا۔ اور اپنے اس ارادہ و تجویز کو دینی اور قومی ضرورتوں کے اعتبار سے بہت بڑا کار خیر اور ثواب بیحساب کا باعث سمجھا۔ اور حقیقت میں تھا بھی ایسا ہی۔

ممکن تھا کہ حضرت عبد المطلب صحن کعبہ یا اور کسی مقام متصل میں ایک معمولی کنواں کھدوا دیتے اور

سقایہ کی موجودہ ضرورت پوری ہوجاتی۔ مگر نہیں ان کے دل میں اسی قدرتی چشمۂ رحمت کی تمنا تھی جو خدا کیطرف سے انکے خاندانی عظمت و تقدیس کا معیار قرار دیا گیا تھا انکا خلوص انکی ہمت خدا سے شرط کرچکی تھی کہ یہ کنواں وہیں کھودا جائیگا۔ جہاں اصلی زمزم واقع تھا۔ اور وہ صورت وہیئت میں چاروں طرف ہاتھوں سے بنائی ہوئی مینڈ سے گھرا ہوا حوض تھا۔ جسکو حضرت ہاجرہ و اسمٰعیلؑ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے بنایا تھا اور چشمۂ زمزم کے آب رحمت کو اسمیں جمع رکھا تھا۔ اسی شرط کیوجہ سے حضرت عبد المطلب کی تعمیل تعمیر میں تاخیر ہوگئی۔ ورنہ یہ عالی ہمت اپنی منیت کو کب کا پورا کرچکا تھا۔

ہمت مرداں مدد خدا۔ جناب عبد المطلب نے زمزم کے اصلی مقام کے پتہ لگانے میں اپنی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر کسی سے کوئی پتہ یا نشان نہیں ملا۔ بالآخر عبد المطلب نے اس کی اصلی مقام کے پتہ لگانے میں اس ہادی حقیقی کیطرف رجوع کی جس نے زلال رحمت بناکر اسکو اسمٰعیل کے لئے پیدا کیا تھا۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں :-

کانت زمزم سقیا من اللہ اتی فی المنام مرات فامر بحفرھا و وصف لہ موضعھا ‖ زمزم خاص خدا کی رحمت کی سقائی تھی عالم رویا میں متواتر طور پر یہ عبد المطلب کو بتلایا اور اسکو کھودنے جانیکا حکم ہوا۔

الغرض عبد المطلب کے ارادہ کو سایہ مشیت کا ارادہ بھی شامل حال ہوگیا۔ اور خدا کے بتلائے ہوئے مقام پر کھودنے کا کام شروع کردیا گیا۔ حضرت عبد المطلب کی سب سے زیادہ قدر کے قابل ہمت تو یہ تھی کہ آپ نے اپنے اس کام میں اپنی قوم و قبیلہ سے کسی قسم کی مدد و حمایت نہیں مانگی۔ اور خدا کی راہ میں اس کار عظیم کو۔ صرف دو باپ بیٹوں نے ملکر از آغاز تا انجام۔ تمام کیا۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

مرمت زمزم میں قریش کی مخالفانہ مما نعت

برا ہو۔ حسد۔ نفسانیت۔ اور برابری مساوات کے غلط انداز غرور و نخوت کا جسنے عبد المطلب کی ایسی ایثار نفسی اور رفاہ و فلاح کے کام میں بھی تمام قریش کو انکی مخالفت اور حفر زمزم کی ممانعت پر آمادہ کردیا۔ اول تو اونھوں نے یہ کہکر عبد المطلب کو کنوئیں کھودنے سے روکنا چاہا کہ ہم اپنی مسجدوں کو سامنے گڈھا کرنے نہیں دینگے۔ مگر حضرت عبد المطلب اور اونکے بیٹے حارث قریش سے مقابلہ و مقاتلہ پر فوراً تیار ہوگئے مزاحمین کی جماعت مرعوب ہوگئی۔ اور عبد المطلب کے تیور بُرے دیکھکر موقع سے ہٹ گئی۔ ابن سعد قریش کی اس اول مخالفت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ مگر ابن ہشام اپنی سیرت میں ذیل کی تفصیلی عبارت لکھتے ہیں

فغدا عبد المطلب و معہ ابنہ الحارث ولیس لہ یومئذ ولد غیرہ فوجد قریۃ النمل و وجل ‖ صبح سویرے عبد المطلب اپنے بیٹے حارث کو۔ اور اسوقت تک انکا یہی ایک بیٹا تھا۔ ساتھ لیکر کنواں کھودنے کیلئے

الغراب ینقر عند ھا بین الوثنین اساف و
نائلۃ اللذین کانت قریش تنحر عندھما ذبائحھا
فجاء بالمعول وقام لیحفر حیث امر فقامت الیہ
قریش حین اٰوا جدہ فقالوا واللہ لا نترکک
تحفر بین وثنینا ھذین اللذین تنحر عند ھما
فقال عبد المطلب لابنہ الحرث ذعنی حتی
احفر فواللہ لامضین لما امرت بہ فلما عرفوا
انہ غیر نازع خلوا بینہ و بین الحفر

ابن ہشام ص ۵۰ مطبوعہ مصر

خاص سے گئے ۔ اور قریۃ النمل و غراب کے علامات دیہات قدرت کیمطابق جو عالم رویا میں خدا کیطرف سے انکو بتلائے گئے تہے اور جو مابین اون دونوں بتوں کے واقع تہا جنکا نام اساف و نائلہ تہا ۔ اور جن کے آگے قریش اپنے جانوران قربانی کو نحر کیا کرتے تہے جب یہاں عبد المطلب کنواں کہودنے کیلئے تیار ہوکر اور کدال وغیرہ لیکر آئے ۔ تو اکیمرتبہ قریش انکی مخالفت پر آمادہ و استادہ ہوگئے اور کہا ہم تمکو اپنے ان دونوں بتوں کے درمیان کہیں کہودنے نہ دینگے ۔ عبد المطلب نے اپنے بیٹے حارث سے کہا کہ ان لوگوں کو ہمارے پاس سے ہٹا دو کہ ہم بغیر کنواں کہودے ہرگز نہیں رہینگے اور کبھی اس کام کو نہ چھوڑینگے جسکے انجام کرنیکا حکم مجکو مل چکا ہے ۔ انکی یہ تقریر سنکر قریش کو علم ہو گیا کہ یہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہیں آوینگے اسلئے وہ اونکے اور انکی کدال کرنے کے مقام کو چھوڑ کر ہٹ آئے ۔

یہ واقعہ صاف صاف بتلا رہا ہے کہ قریش نہیں جانتے تہے ۔ کہ بنی ہاشم اپنی کوئی نمود قائم کریں وہ اونکے کسی کام کو عام اس سے کہ وہ اونکے اور تمام عوام الناس کے لئے کیسا اور کتنا ہی مفید ہو ۔ صرف اس نفسانیت کے خاص خیال سے کہ وہ بنی ہاشم کر رہے ہیں ۔ اپنی ٹھنڈی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے تہے ۔ حسب نسب کی یکجہتی کو غلط قیاس پر اونکے سر و غیرہ بنی ہاشم کی برابری اور ہمسری کی جن سوار تہو جو عفریت خانۂ بنی امیہ سے نکل پڑے تہے ۔ حالانکہ وہ اپنے ان توہمات کی غلطی دیکھتے جاتے تہے ۔ اور مقابلہ کیوقت برابر خفت ندامت اور ذلت پر ذلت اوٹھاتے جاتے تہے ۔ مگر طبیعت کی ناہمواری سے باز نہیں آتے ،،

سـ۵ **غراب اور قریۃ النمل** ۔ صفحہ گذشتہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبد المطلب کو عالم رویا میں اصل زمزم کا نشان اور خاص مقام جہاں بتلایا گیا تہا ۔ اس جگہ دو ظاہری علامات بھی بتائے گئے تہے ۔ ایک تو چیونٹیوں کا پہاڑ (قریۃ النمل) دوسرے کوئے کا آشیانہ سے اوڑنا ۔ طبقات سیرت ابن ہشام ابن اثیر اور روضۃ الاحباب کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبد المطلب نے رویائے صادقہ کی ہدایت کے مطابق اس مقام خاص پر دیمک کا ٹیلہ پایا ۔ جو تمادی ایام کی وجہ سے وہاں پیدا ہو گیا تہا ۔ جب یہ کہدا تو سینکڑوں کوّے بھی جو اسکے اندر آشیانہ رکہتے تہے نکلکر اڑے اس بنا پر خدا کے بتلائے ہوئے علامات کی تصدیق ہو گئی ۔ وہو علی کل شئ قدیر

بہر حال ۔ چاہ زمزم کے کہودے جانے کے متعلق قریش کی عبد المطلب کے ساتھ یہ پہلی مخالفت تہی ۔ آگے چلکر اسکی صورت اور بھیانک معلوم ہوتی ہے ۔ اور اسکے آخر میں جو ذلت قریش کو بیر اموں حال ہوئی وہ سخت سے سخت

عبرتناک ثابت ہوتی ہے۔ ابن سعد اور ابن ہشام کی متفقہ عبارتوں سے اسکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فحفر ثلاثة ايام ثم بدا له الطوى فكبر وقال هذا الطوى اسمٰعيل فعرفت قريش انه قد ادرك الماء فاتوه فقالوا اشركنا فيه فقال ما انا بفاعل هذا امر خصصت به دونكم فاجعلوا بيننا وبينكم من شئتم احاكمكم اليه قالوا كاهنة بني سعد هذيم وكانت بمعان من اشراف الشام فخرجوا اليها۔

طبقات ص ۴۹۔

تین دن تک باپ بیٹو (عبدالمطلب اور حارث) نے ملکر وہ کنوں کھودا۔ تیسرے روز جاکر اصل چاہ زمزم کا نشان ملا۔ دونوں صاحبوں نے تکبیر کے نعرے بلند کیے اور کہا کہ یہی اسمٰعیلؑ کا اصلی کنواں ہے قریش نے جب دیکھا کہ بنی ہاشم یا عبدالمطلب پانی کو پاگئے۔ تو انکے پاس آئے۔ اور کہا کہ ہم کو بھی اسکام میں شریک کرلو۔ عبدالمطلب بولے ہم تو ایسا نہیں کرینگے کیونکہ تم لوگوں کو چھوڑکر یہ امر ہمارے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے مگر ہاں اگر تم چاہو تو ہمارے تمہارے باہمی تصفیہ کیلئے تم لوگ کسی کو حکم مقرر کرلو۔ قریش نے کہا کہ ہذیم نامی کاہنہ کو جو قبیلہ بنی سعد سے ہے اور شام کے بالائی حصہ مقام معان میں رہتی ہے اس امر کے تصفیہ کے لئے حکم مقرر کرتے ہیں۔ پس سب ملکر اسکی طرف چلے۔

ابن ہشام اسکو اور توضیح سے لکھتے ہیں۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

فلم يحفر (عبد المطلب) الا يسيرا حتى بدا له الطي فكبر وعرف انه قد صدق فلما تمادى به الحفر وجد فيها غزالين من ذهب هما الغزالان اللذان دفنت جرهم فيها حين خرجت من مكة ووجد فيها اسيافا قلعية وادراعا فقالت له قريش يا عبد المطلب لنا معك في هذا شرك وحق قال لا ولكن هلم الى امر نصف بيني وبينكم

سیرت ہشام جلد اول ص ۵۰ مطبوعہ مصر

عبدالمطلب نے تھوڑا کھودا تھا کہ قدیم آثار چاہ نکل آئے تو عبدالمطلب نے خوشی میں تکبیر کہی۔ اور یقین ہوگیا کہ خواب میں جو کچھ انکو بتلایا گیا ہے وہ صحیح ہے جب کچھ اور کھودا تو دونوں سونیکے ہرن نکلے جنکو بنی جرہم نے مکہ سے جاتے وقت چاہ زمزم میں دفن کردیا تھا۔ پھر انہیں عبدالمطلب کو قلعی کی ہوئی چند تلواریں اور زرہیں بھی دستیاب ہوئیں تب تو قریش پھر آئے اور آکر عبدالمطلب سے کہنے لگے کہ ان اشیاء برآمد شدہ میں ہمارا بھی حق و حصہ ہے۔ عبدالمطلب نے کہا نہیں۔ مگر ہاں اگر تم باخود با تصفیہ چاہو تو ہم نصفا نصف کردینگے۔

اب قریش کی اصل مخالفت اور علت مخاصمت معلوم ہوگئی۔ یہی مال و اسباب کی برآمدگی جو موجود مخاصمت کیوجہ تھی۔ اور انھیں کے برآمد ہونیکی خبر نے اون کو عبدالمطلب کیساتھ فساد و تکرار پر برانگیختہ کردیا۔ ورنہ صرف کھدجاتا اور کوئی چیز نہ برآمد ہوتی تو پھر قریش کچھ نہ بولتے ان چیزوں نے قریش

قریش کی حسد و نفسانیت اور حرص و طمع میں بار دیگر پرجوشی اور نئی آمادگی پیدا کردی اور وہ اُنکے ساتھ مخاصمت اور فتنہ انگیزی پر آمادہ اور مستعد ہوگئے - ابن سعد بقیہ حالات یوں لکھتے ہیں -

خرج مع عبد المطّلب عشرون رجلًا من بنی عبد مناف وخرجت قریش بعشرین رجلًا من قبائلها فلمّا کانوا بالفقیر من طریق الشّام او حذوه فنی ماء القوم جمیعا فعطشوا فقالوا لعبد المطّلب ما ترى فقال هو الموت فلیحفر کل رجل منکم حفرة لنفسه فکلّما مات رجل دفنه اصحابه حتّى یکون آخرهم رجلًا واحدًا فیموت ضیعة ایسر من ان تموتوا جمیعا فحفروا ثم قعدوا ینتظرون الموت فقال عبد المطّلب واللّٰه ان القائنا بایدینا هکذا العجز الّا نضرب فی الارض فعسى اللّٰه ان یرزقنا ماءً ببعض هذه البلاد فارتحلوا وقام عبد المطلب الى راحلته فرکبها فلمّا انبعثت به انفجر تحت خفّها عین ماءٍ عذب فکبّر عبد المطّلب وکبّر اصحابه وشربوا جمیعا ثم دعا القبائل من قریش فقالوا هلمّوا الى الماء الرواء فقد سقانا اللّٰه فشربوا واستقوا وقالوا قد قضى لك علینا الّذی سقاك هذا الماء بهذه الفلاة هو الذی سقاك زمزم فواللّٰه لا نخاصمك فیها ابدا فرجع ورجعوا معه ولم یصلوا الى الکاهنة وخلّوا بینه وبین زمزم

طبقات ج ۱ ص ۵۰

عبد المطلب کے ساتھ بیس آدمی عبد مناف کی اولاد میں سے اور قریش کے ساتھ تمام قبائل میں سے ایک ایک آدمی مکہ سے نکلے جب علاقہ شام کے مقام فقیر یا حذوہ میں پہونچے تو تمام لوگوں کا پانی تمام ہوگیا - اور سب پیاسے ہوگئے تو سب نے عبد المطلب سے کہا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے کہا کہ موت تم میں سے ہر آدمی اپنے لئے ایک گڈھا کھود رکھو جو آدمی مرے اوسکا ہمراہی اسکو دفن کردے یہاں تک کہ ایک آدمی تنہا باقی رہجائیگا - اور وہ البتہ جو پیا تمہارا دا اور محض بیکسی و بیچارگی کی سخت موت مریگا مگر اس سختی کے ساتھ ایک آدمی کا مرجانا اتنے آدمیوں کے سختی سے مرنے سے آسان تر ہوگا اون لوگوں نے گڈھے کھود کر اور اپنی اپنی موت کے منتظر ہوکر بیٹھ رہے جب حضرت عبد المطلب نے اونکی یہ حالت دیکھی تو کہا کہ یہ ہمارے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت کہی جائیگی - اور یہ ہمارے ضعف و کمزوری کا نتیجہ سمجھا جائے گا - اور اسی طریقہ سے ہماری جہالت اور ذلت کی دنیا میں ایک مثال قدیم ہو جائے گی - اگر خدا کو منظور ہے تو اس مقام سے کسی دوسرے مقام پر ہمکو پانی عنایت فرمائیگا یہ سنکر وہ لوگ وہاں سے چلنے پر تیار ہوگئے - اور حضرت عبد المطلب بھی سوار ہونے کیلئے اپنی سواری کے قریب آکر کھڑے ہوگئے اور جیوں ہی وہاں سے چلے ویسے ہی آپکے پیروں کے نیچے آب شیریں کا ایک چشمہ ریگ میں نظر آنے لگا - اوسکے دیکھتے ہی حضرت عبد المطلب اور اونکے ہمراہیوں نے جوش مسرت میں تکبیریں کہیں اور سب نے سیر ہوکر

اس پانی کو پیا اور پلایا پھر ان لوگوں نے قریش کے قبائل کو بھی آواز دی اور کہا کہ اس آب دان کی طرف دوڑ آؤ جو خداوند عالم نے ہمیں عنایت فرمایا ہے اور پلایا ہے پس وہ تمام لوگ بھی آئے اس پانی کو پیا اور پلایا اور کہنے لگے کہ اب ہماری موجودہ نزاع کا فیصلہ ہو گیا جس شخص نے ہمکو اس چشمہ سرزمین میں سے پانی پلایا ہے۔ بیشک وہی ہمکو چاہ زمزم کا بھی پانی پلائے گا۔ خدا کی قسم اب اس امر میں ہم انکے ساتھ کبھی مخاصمت نہ کرینگے۔ پس وہ لوگ حضرت عبد المطلب کیساتھ ہو کر اسیوقت لوٹ آئے اور اس کاہنہ شامیہ کے پاس نہیں گئے اور بیر زمزم اور حضرت عبد المطلب کے معاملات کو بلکل دستبردار ہو گئے

سیرت ابن ہشام کی عبارت بھی قریب قریب یہی ہے۔ مگر اسمیں جو امر خاص قابل ذکر ہے وہ قریش اور بنی ہاشم کے اخلاقی اوصاف کے اختلاف ہیں۔ ذیل کی عبارت سے اونکا پورا انکشاف ہوتا ہے۔

فخرجوا حتی اذا کانوا ببعض تلک المفاوزة بین الشام والحجاز فنی ماء عبد المطلب واصحابه فظمئوا حتی ایقنوا بالهلکة فاستسقوا من معهم من قبائل قریش فابوا علیهم فقالوا انا بمفازة ونحن نخشی علی انفسنا مثل ما اصابکم فلما رای عبد المطلب ما صنع القوم وما یتخوف علی نفسه واصحابه قال ماذا ترون قالوا ما رأینا الا تبع رایک فمرنا بما شئت

ابن ہشام ج ا ص ۶۹ مطبوعہ مصر

فریقین نکلے اور حجاز و شام کے مابین پہونچے۔ تو یہاں آکر حضرت عبد المطلب اور انکے ہمراہیوں کا پانی ختم ہو گیا اور وہ لوگ پیاسے رہ گئے اور جب پیاس سے ہلاکت کے قریب ہو گئے تو انہوں نے قریش کے قبائل سے پانی پلانیکی درخواست کی ان لوگوں نے قطعی انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنی جانوں کیلئے اسی مصیبت کا خوف و اندیشہ کرتے ہیں جو تمہاری جانو پر پڑی ہے۔ اور جسکو ہم خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں یہ جواب صاف پا کر حضرت عبد المطلب نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم دیکھتے ہو جو تمہاری قوم تمہارے ساتھ کر رہی ہے اور اسکو ہمارے اصحاب اور ہماری جان کا کوئی خوف و لحاظ نہیں ہے اب تمہاری کیا رائے ہے۔ اصحاب عبد المطلب نے جواب دیا ہماری کوئی رائے سوائے اسکے نہیں ہے کہ ہم آپکی رائے کی متابعت کریں جو آپ تجویز کریں وہ حکم ہمکو دیں

اس واقعہ سے پہلی جس چیز کا انکشاف ہوتا ہے وہ تعمیم و تخصیص کا مسئلہ ہے۔ معمول کے ظاہری اصول پر ہر شخص تخصیص کو اکثر حسن ارادت کا نتیجہ اور خلوص و عقیدت کا مقتضا سمجھتا ہے اسی بنا پر اکثر لوگ بنی ہاشم کی بنی امیہ یا سائر قریش پر تفضیل و ترجیح کو قابل ذکر نہیں سمجھتے اور اسکو عموماً مولفین کی خوش عقیدگی سمجھکر اکثر قلم انداز کر دیتے ہیں۔ شبلی صاحب بھی اسی مسلک کے بزرگ ہیں۔ ابن سعد ابن ہشام۔ ابن اثیر وغیرہم کی ایسی ایسی صدہا کتابیں اور عربی ماخذ یا یوں کہئے کہ مصر و قسطنطنیہ کے کتب خانے سیرۃ النبی کی تدوین کیوقت آپکے پیش نظر تھے جنمیں یہ واقعات تحریر تھے مگر آپ نے اپنے اصول طبعی کے مطابق مذکورہ بالا ماخذوں کی نقل واقعات سے صریح چشم پوشی اختیار فرمائی۔ اور بنو ہاشم کے ایسے لاجواب اور بے نظیر۔ اخلاق فیاضانہ اور قومی ہمدردی کو واقعات کو بالکل چھپا دیا۔ اور قطعاً لاجواب بنا دیا۔ حالانکہ یہی دو واقعات آپکی ہدایت و تنبیہ کے لئے۔ کافی تھے۔ جن سے آپ بخوبی سمجھ لیسکتے تھے کہ بنی امیہ اور تمام قوم قریش کو باوجود ہم اصلی اور ہم نسلی کے بنی ہاشم کے ساتھ۔ اخلاق

تہذیب۔ عام ہمدردی۔ فیاضی اور اشفاق کے تمام محاسن اوصاف میں کوئی مشابہت اور مماثلت نہیں ہے۔ اور انھیں واقعات سے آپ یہ نتیجہ نکال لیسکتے تھے کہ ان اوصاف و محامد کیلئے ہمقومی اور ہم لطنی کی ضرورت نہیں۔ اونکی تفویض قدرت کی تجویز اور مشیت کی تدبیر پر موقوف ہوتی ہے۔ ورنہ انسانی عالم میں ممکن نہیں ہے کہ ایک قوم ایک ملک اور ایک شہر کے لوگ اپنی جمعیت میں اتنے لوگوں کو گو وہ اونکے اُسوقت مخالف خیال ہی کیوں نہوں۔ پیاس سے مرتا ہوا آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے پاس کافی مقدار میں پانی رکھ کر بھی اون پیاس سے مرتے ہوئے انسانوں کو پانی دینے سے انکار صاف کر دیں۔ جیساکہ ابن ہشام کی مرقومہ بالا عبارت سے ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت عبد المطلب اور اونکے ہمراہیوں نے پھڑک پھڑک کر اور ہلاکت کے قریب پہونچکر اپنے ہمقوم اور ہموطن قریشی بھائیوں اور عزیزوں سے پانی مانگا۔ اور اون لوگوں نے ندیا۔ پر ندیا۔

اس واقعہ کا دوسرا رُخ بدلا جاتا ہے۔ تو طبقات اور ابن ہشام دونوں کی متفقہ عبارت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے جب لب تشنگان عبد المطلب کو آب شیریں کا چشمہ ملگیا۔ تو ان سیرچشموں نے اپنا تنہا پینا اور اس لا زلال رحمت سے خود سیراب ہونا اپنے فطرتی اخلاق کے خلاف سمجھا۔ درد مند اِن قوم ذی منکرین اور خشمگین جماعت قریش کو بلایا۔ اور اُس چشمۂ رحمت کا سب کو پانی پلایا۔

یہی دو واقعات جانبین کی فطرت اور مقتضائے طبیعت کو بخوبی بتلاتے ہیں۔ دونوں ہم اصل بھی ہیں اور ہموطن بھی۔ مگر ایک کی طبیعت میں قساوت و عداوت کے اتنے اجزا و عناصر بھرے پڑے ہیں کہ انکی ظاہری تصویر انسانی بالکل ترکیب حیوانی معلوم ہوتی ہے۔ بخلاف انکے دوسرے کے مزاج و فطرت۔ ہمدردی۔ رحم۔ مروت اور اخلاق کے بے انتہا اور بیش بہا جوہروں سے پُر اور مملو ہے کہ باوجود ایسی شدید مخاصمت و مخالفت کے بھی وہ اپنے ایسے مخالف اور دشمن کو بھی اس نعمت میں شریک کرنے اور حصہ دینے میں ذرا بھی تامل نہ کر سکے جو خدائے سبحانہٗ تعالیٰ کیطرف سے اونکو خاص طور پر تفویض فرمائی گئی تھی۔

یہی دو واقعات بنی امیہ اور عام قریش کی طبائع حیوانی اور بنی ہاشم کے اعلیٰ الاکثر خصائص روحانی۔ اور تعمیم و تخصیص کی حقیقت کا پورا انکشاف کرتے ہیں۔ یہ اختلاف اور تضاد۔ نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ فریقین کے سلسلہ میں برابر قائم اور برقرار رہا۔ جو **فتح مکہ** کے دن تمام قریش کے اتنے مظالم کے بعد۔ لا تثریب علیکم الیوم کے الفاظ میں لبہائے رسالت سے مترشح ہوئے۔ پھر معارک **صفین** کے ابتدائی ایام میں بار دیگر قبضہ آب فرات کیوقت زبان ولایت سے کلمہ واللہ لا افعل کما فعل اتباعہ وظلمہ مترنم ہوا۔ پھر بار دیگر شہادت کے بعد وفات۔ سے بالکل قریب اپنے قاتل کو شربت پلانے کے موقع پر اشربہ یا قبل ان تسقیہ۔ کی تقریر میں جلوہ پذیر ہوا۔ پھر یہی اختصاص قدرت اور امتیاز فطرت واقعہ صفین سے اکیس (۲۱) برس بعد کربلا کے قیامت ناک تعلق

میں یوں ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک فریق قاتل کی صورت اپنے دوسرے فریق مقتول کے سینہ پر سوار ہے۔ فریق مقتول ذبیحہ کی شکل وصورت میں اوسکے زانو کے نیچے دبا پیاس سے دم توڑ نا چاہتا ہے ایک قطرہ آب کا قاتل سے سوال کرتا ہے۔ اور وہ بے دردی باوجودیکہ ایک جام یا ایک کوزہ آب کیا پورے دریائے فرات پر قابض ہے مگر اُسکو ایک قطرہ آب نہیں دیتا۔ اور جلد جلد ذبح کر رہا ہے۔ مقتول مایوس ہوکر قاتل کی اس بیدردی کے جواب میں اپنے قاتل کو دعائیں دیتا ہوا دُنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا ہے۔ اور سلسلہ ہاشمیہ کی پاک سیرت اور نیک اخلاق کی عدیم المثال دُنیا میں یادگار چھوڑتا ہے۔

بہر حال جیسا ہم اوپر بیان کر گئے ہیں یہ دونوں واقعات تاریخی جسطرح بنو ہاشم کے قبائل میں تخصیص روحانی ثابت کرتے ہیں اُسی طرح انمیں خاص خاص بزرگواروں کا مؤید من اللہ ہونا بھی بتلا رہے ہیں۔ کیونکہ تخصیص روحانی کا منصب تائید رسانی کے بغیر دشوار ہی۔ اور محال۔ یہی شاہد تاریخی یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ امارت وحکومت قومی مفاخرت اور اخلاقی محاسن ومکرمت بھی اسی سلسلہ میں قدیم ہے اور یہ استحقاق اور یہ عہدے حضرت ابراہیم کے وقت سے لیکر اسوقت تک خدائے سبحانہ تعالیٰ کیطرف سے ان حضرات کے لئے وراثت میں ودیعت فرمائے گئے تھے۔

واقعہ چاہ زمزم۔ جو بقول شبلی صاحب حضرت عبد المطلب کی حیات کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس رئیس بنی ہاشم کے مؤید من اللہ ہونیکا اعلیٰ معیار۔ عرب کے دو معتبر اور مستند تاریخوں سے اوپر لکھدیا گیا ان میں حضرت عبد المطلب کے استقلال اور پائداری کیمثال بالکل بےنظیر اور لاجواب ثابت ہوئی ہی چاہ زمزم کا کام اس ہاشمی فیاض نے محض ملکی اور قومی رفاہ وفلاح کے خیال کے علاوہ کعبہ اور حجاج کعبہ کی آرام رسانی کے لحاظ سے اپنا فرض سمجھکر آغاز کیا تھا جسمیں انکی ذاتی منفعت اور فائدہ کا کوئی تعلق اور لوث نہیں تھا۔ مگر قریش صرف اپنی عداوت اور نفسانیت کے تقاضوں سے انکے اس کار خیر اور رفاہ عام کی عالی انتیاز کو بھی ٹھنڈی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ آغاز ہی سے ان کو روکا اور اپنی قوم وقبائل کی کثرت پر ان سے سخت مخالفت کا اظہار کیا۔ ممکن تھا۔ کہ حضرت عبد المطلب انکی قوت وکثرت سے مرعوب ہوکر اپنے اس ارادے سے باز آجاتے۔ مگر نہیں یہ خدا کا کام تھا۔ اور خدا کیطرف سے یہ اسکے لئے مامور ہو چکے تھے۔ اسلئے ان کے ارادے میں ایک روحانی قوت تھی۔ جو انسانی قوت سے مغلوب اور مرعوب نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے اس باعث سے قریش کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے ارادہ میں اُسی طرح مستقل رہے۔ تاریخیں بتلا رہی ہیں کہ عبد المطلب نے قریش کی متفقہ عداوت ومخاصمت کا عین اسوقت میں مقابلہ کیا ہے جب انکے ساتھ سوائے حارث کے اُس موقع پر دوسرا حامی اور مددگار نہیں تھا۔ آخر قریش بھی انکے عزم بالجزم کی قوت اور اپنی جہالت

کے قائل ہوگئے۔ اور اپنی مفسدوں سے باز آئے۔ یہ پہلی مخالفت تھی۔

دوسری مخالفت پہلی سے کہیں زیادہ شدید تھی۔ یہ اصول فطرت سے مطابق تھی۔ کیونکہ اسمیں مال ومتاع اور قیمتی اشیاء کی دستیابی کی امید وطمع شامل تھی۔ حالانکہ عبد المطلب نے اونکے مطالبہ کے وقت ہی ان اموال کے ساتھ اپنے قبضہ وتصرف کی خصوصیت اور قریش کی غیر سروکاری صاف صاف لفظوں میں بیان کردی تھی مگر چونکہ اس امر میں ایکی بار طمع وآز کا زیادہ دست دراز تھا۔ اس لئے قریش کسی طرح نہ رک سکے بالآخر محاکمہ کی نوبت آئی۔ اور اسکے نتیجہ میں نظام قدرت نے قریش کی دوں طبعی کا منظر اور بنی ہاشم کی خوش اخلاقی اور فیاضی کا محضر اونکی آنکھوں کے سامنے رکھدیا۔ تو پھر محرومان قریش کو توبہ وانابت اور خجالت وندامت کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ یہ تاریخی واقعات انہیں حالات ومشاہدات کے آئینہ ہیں۔ جنمیں حقیقت کے پورے انکشاف ہوتے ہیں۔

تمام تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چاہ زمزم کی تکمیل تعمیر تک قریش نے بالکل خموشی اختیار کی۔ مگر تکمیل زمزم کے بعد۔ مخالفت قریش کی ایک اور مذبوحی حرکت تاریخوں سے پائی جاتی ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

عبد المطلب کی مخالفت میں قریش کی ایک آخری حرکت مذبوحی

جب زمزم کی تعمیر تمام ہوگئی تو حضرت عبد المطلب نے چاہ زمزم کو تمام اقوام مکہ کے لئے وقف کردیا ایک تو ایسے متبرک اور مقدس کنوئیں کی قدامت اور پھر حرم محترم کے اندر واقع ہونیکی خصوصیت اور برکت نے تمام لوگونکو اسکے استعمال کیطرف خاص توجہ اور رغبت دلائی۔ مکہ میں اسوقت بارہ کنوئیں اور بھی قبل سے نبے موجود تھے۔ اسطرح کے ہر قبیلہ کیلئے ایک کنواں علیحدہ تھا۔ انکی تفصیل پوری تصریح کے ساتھ سیرت ابن ہشام میں مندرج ہے۔ ص۔ ۵۔

زمزم کی تعمیر کے بعد جیساکہ مواہب لدنیہ کے اسناد سے صاحب روضۃ الاحباب کا مختار ہے مکہ کے یہ تمام کنوئیں بیکار ہوگئے۔ اونکا مصرف محض اتفاقی ضرورتوں کے وقت تک محدود ہوگیا۔ زمزم کے مرجوعہ عام نے جسکی بنا وتعمیر کو حضرت عبد المطلب کیخاص فیاضی اور عالی ہمتی سے تعلق تہا آپ کی عظمت اور قدر ومنزلت اہل عرب کی نگاہوں میں پہلے سے ہی زیادہ کردی حضرت عبد المطلب نے جس خلوص وعقیدت سے اس کار خیر کی ابتدا کی تھی۔ اسی نیک نیتی اور پاک نفسی کے ساتھ اسکو انجام تک پہنچا بھی دیا۔ تجدید وترمیم زمزم کو حضرت عبد المطلب نے خدا کی طرف سے سمجھ کر اپنا فرض عینی یقین کرلیا تھا۔ اسی لئے اسکی انجام دہی میں جیساکہ ہم اوپر دکھلا آئے ہیں۔ بڑے حزم واحتیاط سے کام لیتے تھے۔ چاہ زمزم سے جو اشیاء برآمد ہوئے تھے۔ اور جو قریش کے تمام مفسدوں کے اصلی باعث تھے۔ اونکو آپ نے جیسا قریش کا گمان تھا اپنی

ضرورتوں کے لئے کبھی ہاتھ نہ لگایا ویسا کا ویسا ہی محفوظ رکھا۔

جب چاہ زمزم تیار ہوگیا تو قریش نے اسمیں حصہ پانیکا پہر مطالبہ پیش کیا۔ عبد المطلب نے پہر دینے سے انکار کیا۔ بالآخر قرعہ اندازی کیگئی۔ سونے کے ہرنوں اور قلعی وار تلوار و زرہ پر تو کعبہ کا نام نکلا۔ اور وہ اسی وقت سے کعبکی نذر کر دی گئیں۔ باقی رہیں زرہیں۔ اونپر عبد المطلب کا نام نکلا۔ وہ انکو ملگئیں۔ قریش کا نام کسی پر نہ نکلا۔ یہ بالکل محروم رہ گئے وہ طمع راسہ حرفت و سرتہی۔ سیرۃ ابن ہشام ص۔ ۵ ج ا مصر۔

ان اشیاء کعبہ کے متعلق دو قسم کی روائتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ حضرت عبد المطلب نے سونے کے ہرنوں کو توڑ کر اُسی سے درہائے کعبہ کے کوکبہ دیکھنیں قفل اور کنجیاں بنوائیں۔ اور تلواروں کو باب کعبہ پر عظمت وجاہت کے اظہار کے لئے آویزاں کر دیا۔ طبقات ابن سعد ص۔ ۵ ج ا جز من۔

دوسری روایت یہ ہے کہ انمیں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ اُن اشیاء کو اسیطرح در کعبہ پر آویزاں کر دیا ایک مدت تک یہ دونوں چیزیں آویزاں رہیں پہر قریش انکو چرالے گئے۔ طبقات ابن سعد صفحہ ایضاً

ابن سعد نے مختصر الفاظ میں اسکی کیفیت یوں لکھی ہے۔

فلما حفر عبد المطلب زمزم استخرج الغزال وسيوفا قلعية فضرب عليها القداح فخرجت الكعبة فجعل صفائح الذهب على باب الكعبة فعدا عليه ثلاثة نفر من قريش فسرقوه

جب عبد المطلب نے زمزم کو کہودا تو اسمیں سے سونے کے دو ہرن قلعی کی تین تلواریں اور زرہیں برآمد ہوئیں انپر قرعہ اندازی کیگئی۔ یہ اشیاء خانہ کعبہ کے نام نکلے۔ دو سونیکے اشیاء باب کعبہ پر آویزاں کر دئے گئے۔ وہ آویزاں تھے یہانتک کہ قریش کے تین آدمی اُسے چرالے گئے۔

محدث شیرازی نے روضۃ الاحباب میں اس واقعہ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے اصل عبارت حسب ذیل ہے

قریش نزد عبد المطلب آمدند و گفتند ترا نصیبے ازیں مال بما باید داد و آغاز مخاصمت کردند۔ عبد المطلب گفت اگرچہ شمارا دریں حق نیست زیرا کہ مرا دریں امر اعانت نگردید بلکہ مانع شدید لیکن من انصاف دہم و با شما قرعہ برآرم۔ ایشاں راضی شدند عبد المطلب مال را دو قسم کردند۔ آہو برہا را قسمتے ساخت و اسلحہ جات را قسمتے۔ و قرعہ را بنام کعبہ تعین ساخت۔ دیگرے بنام قریش و دیگرے بنام خود چوں قرعہ زد

قریش عبد المطلب کے پاس آئے۔ اور کہا کہ تم کو اس مال میں ہم لوگونکو بھی حصہ دینا چاہئے۔ اور مخاصمت شروع کر دی۔ عبد المطلب نے کہا کہ اگرچہ اس مال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ اس کام میں تم لوگوں نے مجھے کوئی مدد نہیں پہنچائی ہے بلکہ مجھکو تو تم نے اس سے باز رکھنا چاہا تھا مگر تاہم میں تمہارے ساتھ انصاف سے کام لونگا۔ اور اس کام کو قرعہ سے انجام دونگا وہ راضی ہوگئے عبد المطلب نے مال کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ میں سونیکے ہرنوں کو تیار کھا اور دوسرے میں

بتر ہا بنام کعبہ بر آمد و اسلحہ بنام عبدالمطلب و قریش را چیزے نرسید عبدالمطلب آں اسلحہ را کہ بنام وے بر آمدند در مصالح خانہ کعبہ صرف کرد فرمود تا در آہنین برائے خانہ کعبہ ساختند و از آں در آہنین برائے خانہ کعبہ بساختند و آں دو آہو برہ زریں کہ نصیب خانہ کعبہ بود بداد تا کوبہائے از آں بساختند و برآں در آہنین نشاندند و در روایتے آنست کہ ایشاں را ہماں صورت بر در کعبہ آویختند و ہمچناں آویختہ بود تا شبے جماعت از قریش بخوردن خمر مشغول بودند۔ و ابولہب درمیان ایشاں بود کنیزگان مغنیہ ہم بودند چوں اسباب طرب ایشاں ختم شد۔ متوجہ خانہ کعبہ شدند و آں دو آہو برہ طلا کہ آنجا آویختہ بودند۔ بدزدیدند و ہم درہماں شب باہل قافلہ فروختند کہ خمر بمکہ آوردہ بودند و ہرچہ آں قافلہ بود یکبار در بہائے آں بستدند و یک ماہ بطرب و لہو مشغول بودند و در آں یکماہ ہیچکس را معلوم نبود کہ اینکار از کہ صادر شدہ تا شبے عباس ابن عبدالمطلب را اتفاق مرور بر در سرائے کہ جماعت در آنجا بودند واقع شد کنیزگان مغنیہ سرود می گفتند و در اثنائے سرود گفتن بیانے کہ مشتمل بود بر سرقہ آں دو آہو برہ از در خانہ کعبہ و فروختن باہل قافلہ میخواندند عباس بشنید و قریش را ازیں مطلع ساخت آنجماعت را گرفتند و تادیب بلیغ کردند و بعضے را قطع ید کردند۔

روضۃ الاحباب جلد اول ص ۴۲ طبع لکھنؤ۔

زرہوں کو۔ ایک قرعہ کعبہ کے نام۔ ایک قریش کے نام اور ایک بے نام ڈالا جانا تجویز کیا اسی کے مطابق قرعہ ڈالا گیا جب قرعہ ڈالا گیا تو سونے کے ہرنوں پر کعبہ کا نام نکلا۔ اور زرہوں پر عبدالمطلب کا نام نکلا۔ اور قریش کا نام کسی چیز پر نہیں نکلا۔ عبدالمطلب نے اُن زرہوں کو جو اُنکے نام سے نکلی تھیں خانہ کعبہ کی اصلاح کے کاموں میں صرف کیں اور اُن سے کعبہ کے آہنی دروازے بنائے جانیکا حکم کیا۔ اور وہ بنائے گئے۔ اور اُن سونے کے ہرنوں کو دیکر خانہ کعبہ کے کیواڑوں کی تختیاں تیار کرائیں اور کواڑوں پر پھیلائیں۔ دوسری روایت میں وارد ہے کہ انکو اسی صورت میں دروازہ کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا اور یہ آویزاں تھے ایک جماعت قریش جس میں ابولہب بھی شامل تھا بیٹھی ہوئی شراب پیتی تھی۔ گانیوالی لونڈیاں بھی ہمراہ تھیں جب انکا سامان عیش تمام ہو گیا تو وہ لوگ خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ سونے کے دونوں ہرنوں کو جو لٹکے ہوئے تھے چرا لیا۔ اور اسی رات کو شراب فروشوں کے قافلہ کے ساتھ جو مکہ میں فروکش تھا۔ ان کو بیچ ڈالا اور جتنی شراب انکے پاس تھی سب ایک بار خرید لی اور ایک مہینے تک شراب پیتے رہے۔ یہ کسی کو نہ معلوم ہوا۔ کہ یہ فعل کس سے صادر ہوا۔ یہاں تک کہ ایک شب کو عباس ابن مطلب کا قریش کی اس صحبت عیش و طرب کی طرف سے گذر ہوا کنیزان مغنیہ گا رہی تھیں اور اپنے گیتوں میں ان دونوں طلائی ہرنوں کی چوری کرنے اور قافلہ کے ہاتھ بیچ دینے کے پورے حالات گویا گلے پھاڑ پھاڑ بیان کر رہی تھیں عباس نے ان گیتوں کو سُنا اور قریش کو تمام حالات کی اطلاع کی جماعت کی جماعت پکڑی گئی۔ اور انکی سخت تنبیہ و تادیب

اور بعلت جرم سرقہ بعضوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔ | روضۃ الاحباب ص ۴۱۔

ابن سعد کی اجمالی تفصیل تھی۔ اور روضۃ الاحباب نے قریش کے حرکات ناشائستہ کی کامل تشریح کردی۔ ان تمام تفصیلوں کے بعد بھی قریش کو بنی ہاشم یا بنی مطلب کیا تھا ہم بطنی اور ہم نسبی کو غلط قیاس پر مساوات کے دعوے بنتے تھے۔ اور اپنے تعیم کے زعم میں تخصیص کے نظام ربانی میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو داخل و شامل سمجھنے پر مرے مٹتے تھے۔ اور باوجود متواتر ناکامیابیوں کے بھی اپنے زعم حماقت سے باز نہیں آتے تھے۔ ہم انکے ناہنجار کردار و رفتار کو بہت جلد اپنے آیندہ بیانیں قلم بند کرتے ہیں ہاشم مرحوم کے حالات میں امیہ ابن عبدشمس کے زعم باطل اور اس عظیم منافرہ کی پوری کیفیت جو انھوں نے ہاشم کے مقابلہ میں قائم کیا تھا۔ اور بالآخر خود ذلت ورسوائی اٹھائی تھی۔ بالتفصیل لکھ آئے ہیں۔ امیہ کے بعد اون کے بیٹے حرب ابن امیہ نے بھی حضرت عبدالمطلب کے ساتھ وہی خیال باطل پیدا کیا۔ اور خواہ مخواہ عرب کی قدیم رسم جہالت منافرت کی پھر بنیاد ڈالی۔ ؎ اگر بدر نتوانا بسر تمام کند۔

بہر حال تعمیر چاہ زمزم کے متعلق ہم مفصل حالات لکھ چکے۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاوے تو حضرت عبدالمطلب کی ہمت یہ فیاضی اور احسان اپنے خاص ملک و احسان کے لئے محدود نہیں تھا۔ بلکہ اون تمام بے شمار اور لاانتہا قوم و قبائل کے لئے بھی جو حج کے موسم میں دُور دُور سے زیارت بیت اللہ کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا کار نمایاں تھا اور احسان فراواں جو حضرت عبدالمطلب کی فیاضی اور عالی ہمتی کی لاجواب مثال بنکر ابدالاباد تک قائم رہا۔

حضرت عبداللہ ذبیح ثانی کی قربانی

چاہ زمزم کی تکمیل کے بعد آپ کی حیات گرامی صفات کا واقعہ حضرت عبداللہ ذبیح ثانی کی قربانی ہے اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔

چاہ زمزم کی ترمیم حقیقتاً ایک کار عظیم تھی۔ اول تو اس قدیم آثار ابراہیمی کا احیاء اوسکی تجدید۔ خلف الصالح ہونیکی حیثیت سے حضرت عبدالمطلب کی سعادت و رشادت کا فرض منصبی تھا۔ دوسرے حجاج کعبہ اور رفاہ عام کی خالصتاً للہ خدمت آپ کی اس فیاضانہ اور دلیرانہ ہمت کی محرک ہی تھی ان سب پر عرب سنگلاخ زمین پر عموماً اور حجاز کی سطح آہنی پر خصوصاً کنواں کھودنا اور پانی نکالنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ بلکہ بڑے کلیجے والے کا کام تھا۔ حضرت عبدالمطلب بھی اپنی ذمہ داری۔ اس امر مہتم بالشان کی دشواری اور اس بار عظیم کی گرانباری کو خوب سمجھتے تھے۔ اوسپر اپنے ہم قوم اور

تضرب فی ابلك التہا آئم التی فی الحرم

سب سے زیادہ اونکی صاحبزادیاں بھائی کی محبت میں بیقرار اور زار زار روتی تہیں۔ بالآخر ان میں سے ایک نے باپ سے عرض کی کہ عبداللہؑ اور اون اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی کیوں نہیں کیجاتی جو حرم میں چرتے ہیں (ابن سعد)

سیرت ابن ہشام میں بنات عبدالمطلب کے ساتھ حضرت عبداللہ کے ننہال اعزّہ و اقارب بھی اِس قرعہ اندازی کی تجویز میں شریک پائے جاتے ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے۔

وقال له المغیرۃ بن عبدالله بن عمر بن مخزوم وکان عبدالله ابن اخت القوم والله لا تذبحه ابدا حتی تعذر فیه فان کان فداؤہ باموالنا فدیناہ

مغیرہ ابن عبداللہ ابن عمر بن مخذوم نے جو رشتہ میں حضرت عبداللہؑ کے ماموں ہوتے تہے عبدالمطلب سے کہا ہم عبداللہ کو ہرگز ذبح نہ ہونے دینگے۔ تاوقتیکہ ان کیلئے بھی قرعہ اندازی کی جائے۔ اور ان کا جو فدیہ ہوگا وہ ہم اپنے مال سے ادا کر دینگے۔ سیرت ابن ہشام ص ۵۲ مصر۔

حضرت عبدالمطلب نے بالآخر قرعہ اندازی کی تجویز اختیار کی۔ چونکہ شریعت ابراہیمی میں رقم دیت کے نصاب مقررہ کی نسبت عُشر مقابل کا طریقہ جاری تہا۔ اسلئے حضرت عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کے بدلے دس اونٹوں کی تعداد پر قرعہ ڈالا۔ قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ عبدالمطلب نے پہر دس کی تعداد پر قرعہ ڈالا۔ قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ عبدالمطلب نے پہر دس کی تعداد بڑہا کر دس کے بیس کر دئے۔ پہر بھی عبداللہؑ ہی کا نام نکلا۔ حضرت عبدالمطلب بقاعدہ عشر دس دس اونٹ برابر بڑہاتے گئے۔ یہاں تک کہ سو اونٹوں کی تعداد پوری ہوگئی۔ تو قرعہ اونٹوں کے نام برآمد ہوا۔ حضرت عبداللہ قربانی سے بچ گئے۔

حضرت عبدالمطلب کو اپنی نذر کے نامکمل رہجانے سے ایک گونہ ویسے ہی ملال ہوا۔ جیسا آپکے مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت ابراہیمؑ کو فدیہ اسمٰعیل کے نازل ہونے سے مستولی ہوا تہا۔ انکو حضرت عبدالمطلب نے خاص کر اپنے اطمینان کلی حاصل اور فرمان ایزدی کے کامل کرلینے کی اس حکم کے آجانے پر بھی تین بار پہر قرعہ اندازی فرمائی اِس مستقل مزاج اور مستقیم الارادہ بزرگ ہاشمی کی اِس حزم و احتیاط کا منظر ابن ہشام نے ذیل کی عبارتیں دکہلایا ہے۔

فخرج القدح علی الابل فقالت قریش ومن حضر قد انتهی رضا ربك یا عبد المطلب قال لا والله حتی اضرب علیها ثلاث مرات

جب اونٹوں پر قرعہ نکل آیا تو قریش اور جملہ حاضرین نے حضرت عبدالمطلب سے کہا کہ اب تو خداوند عالم عبداللہ کے فدیہ پر راضی ہوگیا عبدالمطلب نے جواب دیا میں اسکو

فضربوا على عبد الله وعلى الابل وقام عبد المطلب يدعو الله فخرج القدح على الابل ثم عاد والثانية وعبد المطلب قائم يدعو الله فضربوا فخرج القدح على الابل ثم عاد والثالثة وعبد المطلب قائم يدعو الله فضربوا فخرج القدح على الابل فنحرت

ابن ہشام ۵۲

نہیں مانے گا۔ جب تک کہ تین بار قرعہ اندازی کرکے اس حکم کو محکم نہ کرلوں۔ چنانچہ پھر قرعہ ڈالا گیا۔ حضرت عبدالمطلب اب کی بار بھی سابق کی طرح خدا سے دعا مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ پھر اونٹوں ہی کے نام قرعہ نکلا۔ دوسری بار پھر دہرایا۔ اور عبدالمطلب اسی طرح دست بدعا رہے۔ مگر اب کی بار بھی قرعہ اونٹوں ہی کے نام نکلا تیسری بار پھر قرعہ ڈالا گیا۔ اور عبدالمطلب کھڑے ہو کر دست بدعا رہے۔ مگر قرعہ اونٹوں ہی کے نام نکلا۔ یہ شاہدہ فرما کر عبدالمطلب نے اونٹوں کو نحر فرمایا۔

اس واقعہ سے حضرت عبدالمطلب کے کمال استقلال و پاداری کے پورے ثبوت ہوتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپکو خدا کے کاموں کے بجالانے اور تعمیل فرمانے میں کسقدر حزم و احتیاط۔ استحکام و استقلال لاحق رہتا ہے۔ ان سب امور کیساتھ اس رازِ عظیم کا بھی پورا انکشاف ہو گیا کہ سلسلۂ ابراہیمی میں یہ دوسری قربانی بھی فدیہ سے بدل گئی اور انی اذبحک کی نیت و ارادہ اپنی اصلی صورت میں اسوقت تک جلوہ آرا نہیں ہوا جبتک اکیسو بارہ برس کے بعد (تقریباً) اس متقدس خاندان کے مایۂ افتخار ابی عبداللہ الحسین ابن علی علیہما السلام نے اپنے عدیم المثال استقلال و پاداری سے خدا کی راہ میں جان دیکر اس کمی کو پورا نہ کر لیا۔

یہ واقعہ بھی حضرت عبدالملک کے کمال و استقلال ہمت اور ایثار نفسی کا عظیم ترین واقعہ ہے جو تعمیر و ترمیم چاہِ زمزم کی خاص فیاضی سے کبھی کم نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ قلبی تعلقات و جذبات کے اعتبار سے تو ہر شخص اسواقعہ کو اوس سے بھی زیادہ دشوار و غیر متحمل قرار دیگا۔ حقیقت میں یہ ایثار و انداز ایسا کامل۔ ایسا خالص اور ایسا بے مثال تھا کہ اونکے بعد اونکی اولاد و احفاد نے اس شرف مخصوصہ پر برابر مفاخرت کا خاص اظہار کیا۔ یہاں تک کہ مفخر موجودات مفصل کائنات اشرف المرسلین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ الطاہرین نے انا ابن الذبیحین کا اعتراف فرما کر اسکی روحانی عظمت و تقدیس کا اقرار فرمایا۔

عرب کی تمام قدیم و جدید مورخین بڑی شرح و بسیط سے حضرت عبدالمطلب کو اس بےنظیر ایثار و انداز کے واقعہ کو اسوقت سے لیکر اسوقت تک برابر لکھتے آئے ہیں مگر سر سید صاحب نے بڑی دلیری سے اس

اس متفق العام اور مشہور بین الجمہور واقعہ کی تردید و تکذیب کی ہے۔ ان کے انکار کا اصلی اور حقیقی سبب وہی۔ قربانی اسمٰعیل و اسحاق کے متعلق ان کے عیسائیوں اور یہودیوں کی کورانہ تقلید و تصدیق ہے جسکی پوری تنقید اوپر کردی گئی ہے۔ سید صاحب کا یہ انکار عربی تاریخ دسیر سے انکی بیخبری اور کوتہ نظری ثابت کرتا ہے۔

حرب ابن اُمیہ (پدر ابوسفیان) کی حاسدانہ مخالفت

ہاشم مرحوم کے حالات میں اُمیہ ابن عبد شمس کے زعم باطل اور اُس عظیم الشان معرکہ کو منافرہ کی داستان کامل جو اُمیہ نے ہاشم کے مقابلہ میں قائم کیا تھا۔ اور بالآخر جو ذلت و رسوائی اوٹھائی تھی ہم پوری تفصیل سے اوپر لکھہ آئے ہیں اُمیہ کے بعد حرب ابن اُمیہ نے بقول لیکہ بیٹا وہی قدم بقدم ہو جا بچے حضرت عبد المطلب کے ساتھ وہی خیال باطل پیدا کیا۔ اور خواہ مخواہ عرب کی قدیم رسم جہالت۔ معرکہ منافرت کی بنیاد ڈالی۔

قبل اسکے کہ ہم اِس جاہلانہ رسم منافرت کا جو حقیقتاً باہمانہ مفاخرت کی زبانی رجز خوانی ہے مفصل حالات قلمبند کریں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اسکی تفصیل سے پہلے اسکا اسباب وقوع کو بیان کردیں حقیقت یوں ہے کہ حضرت عبد المطلب کی نیک نفسی۔ فیاضی حسن اخلاق۔ محاسن تہذیب اور ذاتی اعزاز و وجاہت کے اوصاف نے آپکو اپنے بزرگوار ونکے اقتدار و عظمت کا کامل نمونہ بنا رکھا تھا۔ خصوصاً زمزم کی تعمیر نے قریش اور عام باشندگان مکہ پر کیا۔ مسخر ہے گرد و نواح کے تمام قبائل و اقوام کو آپکا مطیع و منقاد بنا دیا تھا۔ معاملات زمزم میں قریش کو شکست فاحش پہنچ ہی چکی تھی۔ عبد المطلب کی اس تازہ نام و نمود نے اونکے حسد و کینہ کو پہلے سے بھی زیادہ مشتعل اور برانگیختہ کردیا نذر و قربانیکے معاملہ نے یہ قیامت کی نوعیت کردی کہ عبد المطلب کی روحانی عظمت و تقدیس کا تمام عرب کو براۃ العین مشاہدہ کرا دیا۔ اور اِس واقعہ عظیم سے وہ آپکو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا اصلی وارث اور قائم مقام یقین کرنیلگے اور آپکی عمارت و حکومت کو ساتھ عقیدت و ارادات کے تعلقات بھی اہلعرب کے قلوب میں پیدا ہوگئے۔ اسکے بعد ہی بنی ثقیف کی منافرت کا واقعہ پیش ہوا۔ اگرچہ وہ غیر مقام تھا۔ اور غیر لوگ تھے۔ مگر حسد و نفسانیت کیوجہ سے قریش میں سے کسی نے بھی عبد المطلب کا ساتھ اِس مُنافرہ میں نہیں دیا۔ لیکن ایسی تنہائی اور غربت کے عالم میں بھی خدا نے عبد المطلب کی بات رکھہ لی۔ معرکہ منافرہ میں بنی ثقیف۔ ہارے اور بنو ہاشم و بنی عبد المطلب جیتے اس واقعہ

نے حرب ابن امیہ کو خواہ مخواہ سب سے زیادہ پرجوش بنا دیا اور ایسا کہ پھر وہ قرابت و اتحاد سب کو بالائے طاق رکھ کر فوراً مقابلہ پر تیار ہو گئے۔

ہم پہلے بنی ثقیف کے معاملات کو ابن سعد کی عبارت سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

كان لعبد المطلب بن هاشم ماء بالطائف
يقال له ذو الهرم وكان في يدي ثقيف
دهراً ثم طلبه عبد المطلب منهم فابوا
عليه وكان صاحب امر ثقيف جندب بن
الحارث فابى عليه وخاصمه فيه فدعا
هما ذلك الى المنافرة الى الكاهن العذري و
كان يقال له عزى سلمه وكان بالشام فتنافرا
على ابل سموها فخرج عبد المطلب في نفر من
قريش ومعه ابنه الحارث ولا ولد له يومئذ
غيره وخرج جندب في نفر من ثقيف فنفد
ماء عبد المطلب واصحابه فطلبوا الى
الثقيفيين ان يسقوهم فابوا ففجر الله لهم
عينا من تحت جران بعير عبد المطلب
فحمد الله عز وجل وعلموا ان ذلك منه فشربوا
ريهم وحملوا حاجتهم ونفد ماء الثقيفيين
فبعثوا الى عبد المطلب يستسقونه فسقاهم
واتوا الكاهن فنفر عبد المطلب عليهم فاخذ
عبد المطلب الابل فنحرها واخذ ذو الهرم
ورجع وقد فضله عليه وفضل قومه على قومه

سیرت ابن ہشام ۵۳

عبد المطلب بن ہاشم کا طائف میں ایک چشمہ آب تھا۔ جسکا نام ذو الہرم تھا۔ اور وہ مدت سے بنی ثقیف کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ عبد المطلب نے اسکا مطالبہ کیا۔ قبیلہ ثقیف نے انکار کر دیا جندب بن الحارث انکا امیر تھا۔ اسنے چشمہ کے دینے سے انکار کیا اور مخاصمت پر آمادہ ہو گیا۔ جانبین سے منافرہ کی شرائط مقرر ہوئے۔ اور قبیلہ عذرا کا کاہن جو عزی سلمی کے نام سے مشہور تھا طرفین سے حکم مقرر ہوا۔ اور معاوضہ میں دونوں فریق نے ایک ایک اونٹ علیحدہ کیا گیا۔ اسلئے کہ جسکا حق ثابت ہو وہ ناحق والے سے ایک اونٹ تاوان لے۔ عبد المطلب قریش کی جماعت کو لیکر نکلے۔ اور آپکے ساتھ حارث آپکے بیٹے بھی تھے اور آپکے اسوقت بھی ایک لڑکے تھے۔ اسطرف سے جندب بھی بنی ثقیف کی جماعت لیکر باہر نکلا دونو جماعتیں حکم کے آنیکی منتظر رہیں حکم کے آنے میں غیر امید دیر ہوئی۔ اسی اثنا میں عبد المطلب کا ہمری پانی ختم ہو گیا۔ انہوں نے ثقیف سے پانی مانگا ان سب نے پانی دینے سے قطعی انکار کر دیا قدرت خدا نے عبد المطلب کے اونٹ کے پاؤں کے نیچے ایک چشمہ رواں پانی کا پیدا کر دیا عبد المطلب اور انکے ہمراہیوں نے خداوند عالم کے اسکا شکر ادا کر کے وہ پانی پیا اپنی تمام جماعت کو وہ پانی پلایا اور بقدر ضرورت بار کر لیا۔ اب بنی ثقیف کا پانی بھی چُک گیا تو سب کے سب عبد المطلب کے پاس آئے اور پانی کے خواستگار ہوئے۔ آپ نے ان سبکو بھی پانی پلایا۔ پھر دونوں فریق ملکر کاہن کے پاس گئے۔ اسنے عبد المطلب کے حقوق کو ترجیح دی اور شرط منافرہ کے مطابق عبد المطلب نے اون اونٹوں کو لیلیا اور ذبح کیا اور چشمہ آب موسومہ ذی الہرم کو۔

جو جانبین میں باعث تنازع تھا بنی ثقیف سے واپس دلوا دیا۔ عبد المطلب پھر وہاں سے واپس آئے۔ اور اُسکے انکو اور انکی قوم کو بنی ثقیف اور اون کی قوم پر فضیلت و ترجیح حاصل ہوگئی۔ سیرت ابن ہشام ص ۵۳

بنی ثقیف پر حضرت عبد المطلب اور بنی ہاشم کی فتحیابی نے حرب ابن امیہ کے دلمیں خواہ مخواہ نفسانیت پیدا کر دی اور پھر ایسی کہ وہ اسے ایکدم کیلئے بھی سنبھال نہ سکا اور باوجودیکہ حضرت عبد المطلب کیساتھ مراسم تھے اور فیمابین کوئی مشاجرت بھی نہیں تھی۔ مگر سب سے قطع نظر کرکے۔ حضرت عبد المطلب سے منافرت اور مخاصمت پر آمادہ ہوگیا۔ طبقات میں ابن سعد لکھتے ہیں۔

تنافر عبد المطلب بن هاشم وحرب بن امية الى النجاشي الحبشي فابى ان ينفر بينهما فجعل بينهما نفيل ابن عبد العزى فقال لحرب يا ابا عمرو اتنافر رجلا هو اطول منك قامة واعظم منك هامة واوسم منك وسامة واقل منك لامة واكثر منك ولدا واجزل منك صفدا واطول منك مذودا فنفره عليه فقال حرب ان من انتكاث الزمان ان جعلناك حكما

طبقات ص ۵۲۔

عبد المطلب بن ہاشم اور حرب ابن اُمیہ کے درمیان منافرہ قرار پایا۔ اور نجاشی حاکم حبش کو حکم ہونیکے لئے لکھا گیا اُنھوں نے اون دونوں کے درمیان حکم مقرر ہونے سے انکار کر دیا تب طرفین سے نفیل ابن عبد العزیٰ حکم مقرر ہوا۔ نفیل نے حرب کو مخاطب کرکے کہا تم کیونکر ایسے شخص سے منافرہ کر سکتے ہو۔ جو قد و قامت میں تم سے زیادہ طویل ہمت میں تم سے زیادہ وسیع حسن و جمال میں تم سے زیادہ وجیہ عیوب و نقائص میں تم سے بہت ہی کم۔ اولاد و اعقاب میں تم سے بہت زیادہ۔ جود و سخا میں تم سے زیادہ فیاض اور تقریر و بیان میں تم سے زیادہ لسّان یہ کہکر نفیل نے عبد المطلب کو حرب پر فضیلت دی حرب نے کہا یہ بھی ہماری شومی ایام تھی۔ کہ ہم نے تجھکو اپنا حکم قرار دیا۔

یہ تھے بنی اُمیہ حضرات کے حرکات۔ جو آبا سے بنی ہاشم کی مخالفت میں انواع و اقسام کی خوفناک صورتیں پیدا کیا کرتے تھے۔ اس سے قبل حرب کے باپ اُمیہ اور خود عبد شمس کی مخالفتیں تکو ہم اوپر بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ مرقومہ بالا واقعات میں اونکے صاحبزادے حرب کے منافرہ کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ہر شخص ان حالات و واقعات کو دیکھکر سمجھ لیگا۔ کہ جسطرح تمام اہل عرب میں قریش کی اور تمام قریش میں بنی ہاشم کی فضیلت اور قدر و منزلت قائم ہے اُسیطرح بنی اُمیہ کے مقابل میں کامل طور پر بنی ہاشم کی مفاخرت بھی اور اوسی کے ساتھ جس طرح بنی ہاشم کے قریش ہمیشہ مخالف بنے رہے اوسیطرح بنی ہاشم کے بنی اُمیہ بھی جانی اور لاگو دشمن۔

اصول اضداد کے اعتبار سے۔ قریش و امیہ کی مخالفت بنی ہاشم کی وجاہت کو صدمہ پہنچانیکی جگہ کل شیٔ یعرف باضدادها (تمام اشیاء اپنے اضداد سے پہچانے جاتے ہیں) کے مطابق۔ تمام دیار و امصار میں اُنکے آثار و اقتدار کو بڑہاتی گئی افسوس ہے کہ جسطرح ہاشم اور اُمیہ کے باہمی مخاصمت و منافرت کو مولوی شبلی نے چھپایا ہے اوسیطرح حرب اور

عبد المطلب کی شاجرت کو بھی حالانکہ دونوں واقعات اونکے اصلی ماخذ طبقات ابن سعد میں موجود ہیں اور ہمنے خاصکر اُسی سے نقل کئے ہیں۔

ہم شبلی صاحبکے اس استخفاف کے لئے بہر دہی لکھیں گے۔ جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ کہ اسکے لئے مولوی صاحب سخت مجبور ہیں۔ کیونکہ اِن حالات کا لکھنا۔ عام اس سے کہ یہ کیسی ہی معتبر تاریخی ماخذوں میں مندرج نہوں اونکے موجودہ مدعائے تالیف کے لئے بیحد مضر تھے۔ اس استجاب واستخفاف سے وہ جو کام لینا چاہتے تھے۔ وہ یہی تھا کہ بنی ہاشم کے ذاتی اقتدار۔ ثروت واختیار میں وہ تخصیص وتائید ربانی ہمیتب نہ ظاہر ہونے دیں بلکہ عام ملکی عروج وزوال اور قومی ترقی وادبار کی معمولی صورت میں اصول تعمیم کے مطابق۔ انکے معلامات کو بھی غلبہ اور استیلاء وغیرہ کا نتیجہ قرار دیں۔ مگر حقیقت کا متلاشی جسطرح حقیقت کی باریکیوں کو پا لیتا ہے۔ اسی طرح خود غرضی اور نفسانیت کی تاریکیونکو بھی۔ جیسا کہ اِن واقعات نے اصل حقیقت کی چہرہ کشائی کر دی۔ تعمیر زمزم۔ نذر عبد اللہ۔ منافرہ قریش۔ منافرہ بنی ثقیف۔ اور منافرہ بنی امیہ۔ حیات عبد المطلب کے قابل الذکر واقعات تھے جنکو شبلی صاحب نے یا تو سرے سے مرفوع القلم فرما دیا انہیں سے بعض کو (زمزم کی مرمت۔ عبد اللہ کی نذر) لکھا بھی تو اس اختصار کے ساتھ جو تلخیص التحلیص کا جوہر مقطر کہا جائے۔ تو بیجا نہوگا۔ انہیں واقعات کیطرح اہدام کعبہ کے قصد سے اصحاب فیل کی فوجکشی کے حالات ہیں۔ جو عبد المطلب کی زندگی کے مشہور ترین واقعات ہیں۔ ہم اونکو ابن ہشام اور زرقانی کے اصلی عبارتوں سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ابرہہ بن الصبّاح (اصحاب فیل) کی خانہ کعبہ پر ناکامیاب فوج کشی

ابرهة بن الصبّاح الاشرم لانه لما غلب علی الیمن وملکها من قبل نجاشی رای الناس یتجهزون ایام الموسم للحج فقال این تذهبون فقیل لحجون بیت الله بمکة قال من هو قیل من الحجارة قال وما کسوته قیل ما یاتی من هنا من الوصائل فقال والمسیح لابنین لکم خیر منه فبنی لهم کنیسة بصنعاء بالرخام الابیض والاحمر والاصفر والاسود وحلاها بالذهب والفضة وانواع الجواهر واذل اهل

جب ابراہہ ابن الصباح الاشرم نے غلبہ کر کے نجاشی کیطرف (بادشاہ حبش) سے علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا۔ تو اونسے لوگوں کو ایام حج میں حج کیلئے سفر کرتے ہوئے دیکھا۔ تو پوچھا کہ تم لوگ کہاں جاتے ہو اُن لوگوں نے جواب دیا۔ کہ ہم خانہ خدا کا حج کرنے جاتے ہیں۔ پوچھا وہ کہاں ہے۔ کہا مکہ علاقہ حجاز میں۔ دریافت کیا یہ کپڑے کیسے ہیں۔ جواب دیا یہ اُس خانہ خدا کو ہدیہ میں جو وہاں جاتا ہے۔ یہ لیکر جاتا ہے اُس نے کہا مسیح کی قسم میں اُس سے بہتر تمہارے لیے بھی بنا دیتا ہوں پھر اُس نے شہر صنعاء۔ دار السلطنت یمن میں۔ سفید، سرخ۔ زرد اور سیاہ قسموں کے سنگ رخام سے ایک کنیسہ بنایا اور اُس پر سونے چاندی کی پچے

الیمن علی بنائها و کلفهم فیها انواعا من السخر
ونقل لها الرخام المجزّع والحجارة المنقشة بالذهب والفضة من قصر بلقیس وکان علی فرسخ
من موضعها ونصب فیها صلبانا من ذهب وفضة ومنابر من عاج وابنوس وغیره وکان
تشرف منها علی عدن لارتفاع بنائها وعلوها
ولذا سماها القلیس فلما اراد الحج الیها
کتب للنجاشی انی بنیت کنیسة باسم الملك
لم یکن مثلها قبلها ارید صرف حج العرب الیها
وامنع الناس من الذهاب الی المکة فلما
اشتهر الخبر عند العرب خرج رجل من کنانه
مغضب فتغوط فیها ثم خرج فلحق بارضه
فاغضبه ذلك شدید وحلف لینقض
الکعبة حجرا حجرا وکتب الی النجاشی یخبره ذلك
وسئاله ان یبعث الیه فیله محمودا فلما
قدم الفیل لیخرج فی ستین الفاحتی اذا
بلغ المغمس بطریق الطائف ثم ارسل ابراهه
خیلا له الی مکة فاخذت بلا لعبد المطلب
فذهب له وبلغ عبد المطلب ذلك فقال یا
معشر قریش لا تفزعوا الا انه لا یصل الی هدم
البیت لان هذ البیت ربا یحمیه ویحفظه
وعن ابی اسحاق بعث بر منحاطة الحمیری
الی مکة وقال له اسئال عن سید اهل البلد و

کاری کرائی۔ اور انواع و اقسام کے جواہرات۔ جڑوائے اہل یمن کو اسکے بنانے اور تعمیر کرنے کیلئے طرح طرح کی تکلیفیں اور ذلت پہنچائی اور جلا دئے ہوئے سنگ رخام اور سونے چاندی سے نقش و نگار کئے ہوئے پتھر قصر بلقیس کی کہنہ عمارت سے جو ایک فرسخ (۳ ۱/۲ میل) کے فاصلے پر تھا۔ نکال لائے تھے۔ اس کلیسا پر دو صلیبیں سونے اور چاندی کی نصب کی تھیں۔ اور اسمیں متعدد منبر۔ عاج کی لکڑی اور آبنوس وغیرہ کی رکھے تھے۔ اور چونکہ وہ شہر کی تمام عمارتوں سے بلند تر تھا اس رعایت سے اسکا نام قلّیس رکھا۔ جب ابرہہ نے اسمیں مراسم حج بجالانیکا ارادہ کیا تو نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ہم نے بادشاہ کے نام سے اس شہر میں ایک کنیسہ بنایا ہے جیسے ایسا کوئی کنیسہ پہلے نہیں بنا تھا۔ میں نے قصد کیا ہے کہ تمام عرب کے لوگ یہیں جمع ہو کر حج کیا کریں۔ اور مکہ کا حج کیا جانا روک دیا جائے جب یہ خبر تمام مشہور ہو گئی۔ تو اہل عرب (حجاز) کو بھی معلوم ہوئی۔ تو بنی کنانہ میں سے ایک شخص کو ابرہہ کی اس حرکت پر سخت طیش آیا اور اس کنیسہ میں جاکر پاخانہ پھر آیا۔ اور پھر وہاں سے بھاگ کر اپنے مقام پر چلا آیا۔ اس حرکت نے ابرہہ کو بہت غصہ دلایا اور اس نے قسم کھائی کہ اب جبتک وہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ نہ اوجاڑیگا۔ دم نہ لیگا۔ اس نے اسیوقت نجاشی کو اس واقعہ کی خبر بھیجی اور اس سے درخواست کی کہ اسکا مشہور و معروف اور عظیم الشان ہاتھی۔ محمود نامی بھیجدیا جاوے بہرحال نجاشی کے ہاتھی جب پہنچ گئے تو ابرہہ نے ساٹھ ہزار کی جمعیت کے ساتھ مکہ کا قصد کیا جب اپنی ہمراہی جمعیت کیساتھ وہ طائف کی راہ سے مکہ کو قریب مغمّس [1] (ایک مقام کا نام ہے) تک پہونچ گیا۔

[1] اَلْمُغَمَّس بضم المیم وفتح العین المعجمة وفتح المیم الثانیه مشددة وبکسرها وهو محل قریب من مکة۔ مغمس بضم میم وفتح عین معجمہ وفتح میم ثانی مشددہ۔ مکہ سے تین فرسخ پر ایک مقام ہے۔ زرقانی ص ۱۰۵۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

شریفھم ثم قال ان الملک یقول لک انی لم آت لحربکم
انما جئت لھدم ھذا البیت فان لم تعرضوا
دونہ بحرب فلا حاجۃ لی بدمائکم فان ھو لم
یرد حربا فاتنی بہ فدخل فسأل فقیل لہ عبد المطلب
واللہ ما نرید حربہ وما لنا بذلک من طاقۃ ھذا
بیت اللہ الحرام وبیت خلیلہ ابراھیم فان یمنعہ
فھو بیتہ وحرمہ وان یخل بینہ وبینہ
فواللہ ما عندنا دفع عنہ قال حناطۃ فانطلق
الیہ فانہ امرنی ان آتیہ بک فانطلق
بہ عبد المطلب ومعہ بعض ابنائہ فتکلم
انیس سائس فیل ابرھہ فقال ایھا
الملک ھذا سید قریش ببابک یستاذن
علیک وھو صاحب عیر مکۃ ویطعم الناس
فی السھال والوحوش والطیر فی رؤس الجبال
فاذن لہ ابراھہ وکان عبد المطلب اوسم
الناس اجملھم واعظمھم فعظم فی عین
ابرھہ فاجلہ واکرمہ عن ان یجلس تحتہ
وکرہ ان تراہ الحبشۃ یجلس معہ علی
سریر ملکہ فنزل عن سریرہ فجلس علی بساطہ
اجلسہ معہ الی جنبیہ ثم قال لترجمانہ قل لہ ما
حاجتک فقال لہ حاجتی ان یرد الملک علی مائتی
بعیر اصابھا فقال لترجمانہ قل لہ کنت اعجبتنی
حین رایتک ثم قد زھدت فیک اتکلمنی فی مائتی
بعیر وتترک بیتا ھو دینک ودین آبائک قد جئت
لھدمہ لا تکلمنی فیہ فقال عبد المطلب انی انا رب الابل

تو ابرہہ نے اپنی فوج کا ایک دستہ وہاں سے مکہ میں بھیجا اور اس دستہ فوج نے مکہ میں آکر حضرت عبد المطلب کے اونٹ پکڑ لئے اور اپنے ساتھ لے گئے ۔ جب اس لوٹ کھسوٹ کی خبر حضرت عبد المطلب کو پہونچی تو آپ نے تمام قریش کو جمع کرکے کہا ۔ کہ تم لوگ انہدام کعبہ کی خبر پاکر گریہ و زاری نہ کرو ۔ کیونکہ یہ خدا کا گھر ہے اور وہ اسکی ضرور حفاظت وحمایت کریگا ۔ اور ابن اسحاق کے مطابق ابرہہ نے حناطہ الحمیری نامی ایک افسر کو جسکو اس غرض سے مکہ بھیجا کہ وہ امیر شہر اور سردار اہل مکہ سے یہ پیغام شاہی پہنچا دے کہ وہ اہل شہر کے ساتھ لڑنے کی نیت سے کبھی نہیں آیا ہے بلکہ کعبہ کے انہدام کے تنہا ارادے ۔ پس وہ لوگ اگر انہدام کعبہ کے متعلق اس سے متعرض نہونگے تو اسکو اہل شہر کی مفت خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ لوگ جنگ پر آمادہ ہو جائینگے تو پھر مجھکو وہاں آکر لڑنا پڑیگا ۔

ابرہہ کا فرستادہ افسر آیا ۔ اور اوسنے سید قوم اور امیر شہر کو دریافت کیا ۔ تو لوگوں نے حضرت عبد المطلب کو بتلایا امیر فوج نے ابرہہ کا پیام عبد المطلب سے دوہرایا تو انہوں نے جواب دیا قسم خدا کی ہمکو بھی اس سے جنگ مقصود نہیں ہے اور حقیقتاً ہم میں اس سے لڑنیکی طاقت نہیں ہے یہ خدا کا گھر ہے اور اسکے خلیل ابراہیم کا وہی اسکو اسکے انہدام سے باز رکھیگا ۔ کیونکہ یہ گھر اسی کا گھر ہے اور یہ حرم اسی کا حرم ہے اور وہی اپنے گھر کو اس سے خالی کرا سکتا ہے ۔ ہمارے بازو اسکے دفاع کی قوت نہیں ہے ۔ حناطہ ۔ امیر فوج ابرہہ نے یہ سنکر کہا کہ تو آپ میرے ساتھ چلیں کیونکہ ابرہہ نے کہا تھا کہ اس سردار قوم کو میرے پاس لیتے آنا یہ سنکر حضرت عبد المطلب

للبیت ربًا سیمنعہ قال ما کان لیمنع منی قال انت وذلك فرد علیہ ابلہ وزاد عن کلبی فقلدھا واشعرھا وجللھا وجعلھا ھدیۃ للبیت وبثھا فی الحرم

زرقانی ج ۱ ص ۱۰

چلے اور آپ کے بعض لڑکے بھی آپ کے ہمراہ ہوئے۔ ابرہہ کا دروغہ فیلخانہ انیس عربی النسل تھا۔ اُسی کے وسیلہ سے یہ لوگ خیمہ شاہی تک پہونچے۔ اور انیس نے خیمہ کے اندر جا کر ابرہہ کو اطلاع کی۔ کہ قریشیوں کے سید و سردار دروازے پر کھڑے ہیں۔ اُن کو اندر آنے کی اجازت دیجائے۔ وہ معزز ترین اہل مکہ ہیں۔ اور یہ وہ فیاض بزرگ ہیں۔ جو لوگوں کو عام گذرگاہوں پر کھانا کھلاتا ہے۔ اور وحش و طیور کے لیئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوان کرم رکھوا دیتا ہے۔ یہ سن کر ابرہہ نے فوراً اجازت دیدی۔ اور حضرت مطلب کو اندر بلالیا۔ چونکہ عبد المطلبؑ تمام قریش میں سب سے زیادہ معزز اور معظم تھے۔ اس لیئے ابرہہ کی نگاہوں میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اس نے یہ نہ چاہا۔ کہ یہ ہم سے نیچے بیٹھیں۔ اور نیز اُسکو یہ بھی شبہ ہوا۔ کہ اہل حبشہ مجھ کو اور عبد المطلب کو ایک ساتھ تخت شاہی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر پسند نہ کریں۔ ان وجوہ سے ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اُتر آیا۔ اور عبد المطلبؑ کو اپنے ساتھ فرش پر بٹھالیا۔ پھر اپنے ترجمان سے کہلوایا۔ کہ آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ عبد المطلبؑ نے کہا۔ کہ میری یہی حاجت ہے۔ کہ میرے دو سو اونٹ جو تمہاری فوج کے لوگ لوٹ لائے ہیں۔ وہ مجھے واپس مل جائیں۔ یہ سُن کر ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہلوایا۔ کہ مجھے آپکے اس بیان پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ کہ آپ مجھ سے اپنے اونٹوں کے لیئے تو استدعا کرتے ہیں۔ اور اُس گھر کے انہدام کے متعلق۔ جو آپ کے اور آپ کے آبائے کرام کا دین ہے۔ کوئی عرض و معروض نہیں کرتے۔ عبد المطلبؑ نے جواب دیا کہ میں اُونٹوں کا مالک ہوں۔ اور اُس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔ اور وہی تم کو اسکے انہدام سے باز رکھے گا۔ اُس نے کہا۔ کہ وہ کون ایسا ہے۔ جو مجھے اس ارادے سے باز رکھے گا۔ حضرت عبد المطلبؑ نے کہا کہ یہ تم جانو۔ اور وہ۔ پھر ابرہہ نے عبد المطلب کے اُونٹ واپس دیدیئے۔ امام کلبی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے۔ کہ عبد المطلب نے اُن اونٹوں کو آراستہ کر کے خانہ کعبہ پر نذر چڑھادیا اور حرم میں لاکر چھوڑ دیا۔

فوج ابرہہ کی مکہ پر چڑھائی۔ انہدام کعبہ کے اسباب۔ وجوہ اور اُس کے ابتدائی حالات ہم نے عربی کے دو معتبر اور قدیم ماخذوں سے پوری تفصیل کے ساتھ نقل کردیئے۔ مفصلہ بالا حالات و واقعات سے حضرت عبد المطلب کی ذاتی وجاہت۔ قدر و منزلت اور اعزاز و اکرام جو قوم و قریش اور تمام اہل عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے اکابر و عمائد کی نگاہوں میں بھی قائم تھے۔ اور آپ کا صبر و تحمل اور تائید الٰہی کی اُمید پر توکل کامل طور پر ثابت ہوگیا۔

ابرہہ کے پاس سے واپس آکر حضرت عبد المطلبؑ نے موجودہ فتنہ و فساد کے لحاظ سے مکہ کا قیام ترک فرمادیا اور جماعت قریش کو ساتھ لے کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ زرقانی لکھتے ہیں۔

وانصرف الی قریش واخبرھم الخبر وامرھم بالخروج من مکۃ والتحرز فی شعف الجبال والشعاب تخوّفا علیھم من معرۃ الحبشۃ

حضرت عبد المطلبؓ نے ابرہہ کے پاس سے واپس آکر قریش سے یہ تمام واقعات دھرا دیئے۔ اور اُن کو قیام مکّے کے ترک کر دینے اور پہاڑوں کے شگاف اور درّوں میں پناہ لینے کے لیئے حکم دیا۔ حضرت عبد المطلب کے اِس مفید اور ضروری حکم کو سب نے مان لیا۔
تمام قریش فوج ابرہہ کے قتل وغارت کے خوف سے شہر چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ اور مکّہ کی آبادی بالکل خالی ہوگئی۔ حضرت عبد المطلب نے اُسوقت تک شہر کو نہ چھوڑا۔ جب تک کہ تمام قوم کے لوگ پہاڑوں کی طرف نہ نکل گئے۔
خانہ کعبہ سے وداع ہونے کی خاص کیفیت زرقانی کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔

ثم قام عبد المطلب فاخذ بحلقۃ الکعبۃ و معہ نفر من قریش یدعون اللّٰہ ویستنصرونہ علی ابرھۃ وجندہ ثم ارسل حلقۃ الباب وانطلق ھو ومن معہ من قریش الی الجبال ینظرون ما ابرھۃ فاعل بمکۃ

حضرت عبد المطلبؓ زنجیر خانہ کعبہ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ آپ کیساتھ ایک جماعت قریش بھی تھی۔ آپ نے اُن کے ساتھ ملکر ابرہہ اور فوج ابرہہ پر نصرت وحمایت فرمائی جانے کی درگاہ رب العزت سے دعا مانگی اور پھر دروازہ کعبہ کی زنجیر چڑھا دی۔ اور اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لیکر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ اور ابرہہ کی کارروائیوں کا انتظار کرنے لگے

بہرحال۔ مرقومۂ بالا عبارت سے ثابت ہوا۔ کہ حضرت عبد المطلب خدا کا گھر خدا پر چھوڑ کر پہاڑوں کے درّوں میں اپنے اہل وعیال کو لے کر چلے آئے۔ اور نصرت وحمایت الٰہی کے مشاہدہ قدرت کا انتظار فرمانے لگے۔

انہدام کعبہ کے متعلق اصحاب الفیل کی ناکامی

ابرہہ ابن الصبّاح علی الصّباح اپنی تمام جمعیت کے ساتھ مصلائے ابراہیمی کے انہدام کے مصمم ارادے سے شہر مکہ میں آداخل ہوا۔ اور اپنے ہمراہی ہاتھیوں کی فلک نما قطاروں سے خانہ الٰہی کے انہدام وتباہی کا جوش میں قصد کیا۔ ویسے ہی سے پل مارنے کی ہوئی جو دیری :. سبحان اللّٰہ شان تیری۔ جبروت قدرت نے محض بے مقدار اور ادنے مخلوق کی فوج تیار کر کے ابرہہ کے ایسے اعلیٰ درجہ کی باقاعدہ اور تربیت یافتہ لشکر کو ان طویل القامت ہاتھیوں کے ساتھ دم کے دم میں تباہ وبرباد کر ڈالا۔ زرقانی اور ابن ہشام کی عبارت تفصیل حسب ذیل ہے

فارسل اللّٰہ تعالیٰ علیھم طیرا من البحر امثال الخطاطیف والبلسان مع کل طائر منھا ثلاثۃ احجار یحملھا حجر فی منقارہ و

خدائے تعالےٰ نے سمندر (بحرِ عرب) کی طرف سے ایک قسم کے جانوروں کے جھنڈ اور فوج کی فوج نازل فرمائی۔ ان میں سے ہر طائر کی چونچ میں ایک اور دونوں چنگلوں میں دو پتھروں کے

حجران فی رجلیہ امثال الحمص والعدس لا تصیب احداً الا ھلک ولیس کلھم اصابت وخرجوا ھاربین یبتدرون الطریق الذی منہ جاؤ فخرجوا یتساقطون بکل طریق و یھلکون بکل مھلک علی کل منھل واصیب ابرھۃ فی جسدہ وخرجوا بہ معھم یسقط انملۃ انملۃ کما سقطت منہ انملۃ اتبعتھا منہ مدۃ تمت قیح ودم حتی قدموا بہ صنعاء۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹ مصر

مونگ اور ماش کے برابر برابر کنکریاں تھیں۔ پرندوں کے اِس بے شمار جُھنڈنے جبروت قدرت کے اشارے سے ابرہہ کی فوج شاہی پر اِس زور سے سنگباری کی۔ کہ اُس کے کثیر التعداد لشکر میں سے کوئی ایسا نہ بچا۔ جو نہ مرگیا ہو۔ یا کم سے کم بے انتہا زخمی ہوا ہو۔ اور اگر وہ سب کے سب اگر وہیں ہلاک نہیں ہوگئے۔ تو بھاگ نکلے۔ اور یہ حال ہوا۔ کہ وہ اِتنا بھی نہیں جانتے تھے کس راستے سے بھاگیں۔ اور بھاگنے پر بھی تمام راستوں میں اُن کے اعضا کٹ کٹ کر گرتے جاتے تھے۔ اور تمام راستوں میں مرتے جاتے تھے۔ ابرہہ خود بھی اِس عذاب میں مبتلا ہوا۔ اور وہ بھی لشکر کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اور اُس کی اُونگلیاں بھی پُور پُور سے جدا ہو ہو کر گر گئیں۔ اور اُسی کے ایسا اور لوگوں کی اُونگلیوں کا بھی حال ہوا اور مقامات اُفتادہ سے خون اور ریم جاری ہوا۔ اور وہ اِس خراب حالت سے شہر صنعار (دار الحکومت یمن) میں پہونچے

خانہ کعبہ کے ساتھ ابرہہ کی بے ادبی اور ہتک حرمت کی سزا و تنبیہہ دُنیا میں ابد الآباد تک خوف الٰہی کے لیئے کافی ہوگئی۔ اور پھر اُسوقت سے لیکر اسوقت تک کسی غیر عرب اور غیر مسلم قوم کو اِس بیت معظم کے انہدام و غارت کی جرأت نہ ہوئی۔ اور نہ انشار اللہ قیامت تک ہوگی۔ کرشمۂ قدرت نے ایک چشم زدن میں ابرہہ اور نجاشی کے ایسے دو بڑے سلاطین کی جبروت وسطوت کو خاک میں ملا دیا۔ اور اُن کے تمام سامانوں کو جو اُنہوں نے نظام شاہی کے اعلیٰ پیمانہ پر مہیا کیا تھا۔ ایک آن واحد میں محض معمولی اور بیوجود مخلوق سے تباہ و برباد کر ڈالا

مولوی شبلی نے اِس واقعہ قدیم کو نہیں لکھا۔

عرب کی تمام قدیم اور جدید مورخین نے اصحاب فیل کے واقعہ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اصحاب فیل اور نزول ابابیل کے حالات و واقعات درج ہیں۔ مگر مولوی شبلی صاحب نے اِتنے بڑے واقعہ تاریخی کو جس سے خانہ کعبہ کی تقدیس اور عظمت پورے طور پر ثابت ہوتی تھی۔ بالکل نسیًا منسیًا کر دیا۔ مرقومۂ بالا جدید واقعات کی نسبت آپ کے استخفاف کی وجہ اور مجبوری معلوم بھی ہوتی تھی۔ مگر اِس کے مرفوع القلم فرما دیئے جانے کا کوئی خاص سبب ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر بنو ہاشم یا عبد المطلب کے خصائص ثابت ہونے کا وہی عذر یہاں بھی آپ کو لاحق ہوا تھا۔ تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ خانہ کعبہ زاد اللہ شرفا کی عظمت وحرمت کا اظہار و انکشاف بھی تو ہوا تھا۔ مگر نہیں۔ حقیقتًا آپ کے لیئے وہی وجہ اوّل مانع ہوئی۔ اور اُس کی بنا پر اُسکا استخفاف بھی ایسا ہی ضروری اور لازمی ٹھہرا۔ کہ پھر اُس کے مقابلہ میں اِس واقعہ کی اہمیت قابل توجہ اور لائق التفات نہیں

سمجھی گئی۔ حالانکہ تاریخ عرب کا یہ ایسا عظیم الشان واقعہ ہے۔ کہ اِس کے وقوع سے ایک جدید سن کی ایجاد قائم ہوئی۔ اور سن عام الفیل کی بنیاد پڑی۔ اس کی مدت اور شہرت مشرقی ممالک سے ہوتی ہوئی مغربی اقالیم تک پہونچ گئی۔ اور تمام مغربی محققین و مورخین نے اسواقعہ کو اور اِس کے باعث سے عرب میں ایک نئے سن کے قائم ہونے کو شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔

زمانہ حال کے مغربی مورخین نے گذشتہ صدی سے تاریخ کو اُصول فلسفہ پر ترتیب کرنے کی تعلیم شروع کی ہے اور معمول و مشاہدات روزمرہ کے اُصول پر اُن تمام تاریخی واقعات کو خارج از عقل اور بیرون قیاس ٹہرایا ہے۔ جو قدرت کے تصرفات اور حیثیت کے کرامات تھے۔ ممکن ہے۔ کہ شبلی صاحب نے بھی اپنی سیرۃ النبیؐ کو فلسفہ تاریخی کے پیمانہ پر صحیح اُتارنے کے لیئے اسواقعہ کو غلط اور مضحکہ خیز سمجھ کر قلم انداز کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہی تھا۔ تو بھی سرسید احمد خاں کے اِتنا اسواقعہ کو لکھکر اور اہل عرب کی رواۃ پرستی کا مقتضا سمجھکر غلط اور خلاف عقل ٹہرادیا ہوتا۔ اور نزول ابابیل کے واقعہ کو شیوع مرض آبلہ (چیچک) سے ظاہری طور پر مطابق فرمادیا ہوتا۔ تاہم غنیمت تھا۔ کیونکہ اِس سے اصل واقعہ فوج کشی۔ ابرہہ قصد انہدام خانہ کعبہ شیوع وبائے آبلہ (چیچک) اور ہزیمت جنود حبشہ اور حفاظت بیت اللہ کے صحیح واقعات تو دُنیا کو معلوم ہو جاتے۔ اور تاریخ عرب کا اتنا بڑا قدیم و عظیم واقعہ مرفوع القلم اور کالعدم ہونے سے بچ جاتا ہے

تعجب ہے۔ کہ مولوی شبلی صاحب کے ایسا محقق اور فلسفی مورخ ایکی ضرورت کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا۔ اسکے اصلی اور خارجی باتوں میں امتیاز نہ کر سکا۔

اچھا یہ تسلیم کر لیا۔ کہ ابابیلوں کا عذاب نہیں آیا تھا۔ بلکہ مکہ میں چیچک کی وبا پھیل گئی تھی۔ اور یہی ابرہہ اور اُس کے لشکر کی تباہی و غارت کا اصلی باعث ہوئی۔ تو اِس سے کیا۔ ابرہہ کا انہدام کعبہ کی نیت سے اپنے لشکر جرار کے ساتھ آنا۔ اُس کی فوج کشی۔ محاصرے۔ ہزیمت اور فتح عزیمت کے تمام حالات و واقعات جو نہ قدرت کے تصرفات ہیں۔ نہ کسی کے معجزہ و کرامات۔ جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ یہ سب غلط ہو جائیں گے؟ یہ تو نہ کسی مشرقی مورخ کی جدید تحقیقات کا نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ کسی مغربی محقق کے اقتباسات مزید کا مدعا۔ دیکھیئے با وجود انکار معجزات اور خوارق عادات۔ آپ کے محسن و معاون۔ ڈاکٹر سرسید احمد خاں صاحب اِس واقعہ کی حقیقت کا کس تفصیل سے انکشاف فرماتے ہیں۔

میں اپنے اِس خطبہ میں اُس لغو اور بیہودہ روایتوں اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اِسواقعہ کی بابت بیان کی ہے۔ بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ایک لمبا مباحثہ ہے۔ مگر جو واقعہ کہ گذرا اسکو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔

کتابوں میں مذکور ہے۔ کہ اصحاب فیل سے پہلے تبعؔ نے تین دفعہ کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا۔ مگر ظلمت و آفت میں گرفتار ہوئے۔ (کیا یہ قدرت کا اظہار اور اعجاز و کرامت کا اقرار نہیں ہے؟)
وہ قصے چنداں مشہور نہیں ہیں۔ مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے۔ ابرہۃ الاشرم جو ایک عیسائی حاکم یمن تھا۔ اس نے صنعاء یمن میں قریب غمدان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا۔ اور قلیس اسکا نام رکھا تھا۔ اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑ دیں۔ اور اس کنیسہ کا حج کیا کریں۔ اور اس لیے اس کے ڈھانے کا ارادہ کیا۔ اور مع فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا۔ اور مغمس میں اترا۔ اسوقت قریش۔ کنانہ۔ خزاعہ۔ اور ہذیل سب لڑنے کو تیار ہوگئے۔ مگر انہوں نے ابرہۃ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پائی۔ ابرہۃ الاشرم نے کہلا بھیجا۔ کہ مجھے تم سے جدال و قتال منظور نہیں ہے بلکہ کعبہ کا ڈھانا صرف مقصود ہے اس گفتگو میں چند روز گذر گئے اور اسی درمیان میں ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ پھر تمام لشکر برباد ہوگیا۔ بہت سے مر گئے۔ خدائے تعالیٰ نے ان پر ایسی آفت ڈالی۔ کہ جو بد ارادہ انہوں نے کیا تھا۔ اس پر کامیاب نہ ہوئے۔ (کیا یہ معجزہ کا اعتراف اور اقرار صاف نہیں ہے) مفسرین نے اس قصہ کو عجب طرح سے رنگا ہے۔ قرآن مجید میں دو لفظ طیرؔ اور الحجارۃ آئے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کی مناسبت سے جو مفسرین اور وضاعین نے جا بجا بنا لیا ہے۔ جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ خطبات ص ۳۵۵۔ لاہور۔

مرقومہ بالا عبارت میں سید صاحب نے باوجود تردید و تنقید معانی اصل مطالب کو بالکل ویسا ہی لکھ دیا ہے۔ جیسا کہ ہم عربی کے معتبر اور مستند ماخذوں سے اوپر لکھ آئے ہیں۔ اصل واقعہ سے نہ سید صاحب کو انکار ہو سکتا ہے۔ نہ دنیا بھر میں کسی کو بھی۔ مگر تمام دنیا کے خلاف۔ شبلی صاحب تنہا اسکو مرفوع القلم فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ حالانکہ سیرۃ النبیؐ کے لکھنے والے اسکو آپ کی ولادت سے کل دو مہینے قبل کا واقعہ تمام تاریخوں میں بتلاتے ہیں۔ اور تمام مشاہدۂ تاریخی سے یہ امر صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کہ واقعہ اصحاب فیل کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذیجود قائم ہو چکا تھا۔ اور یہ ودیعت الٰہی سات مہینوں سے جناب آمنہ بنت وہب سلام اللہ علیہما کے بطن مطہر میں امانت تھی۔ ابن سعد لکھتے ہیں۔

ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم الاثنین لعشر لیال خلون من شہر ربیع الاول وکان قدوم اصحاب الفیل للنصف من المحرم فبین الفیل وبین مولد رسول اللہ صلعم خمس وخمسون لیلۃ۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دسویں ربیع الاول کی رات کو۔ دو شنبہ کے دن۔ پیدا ہوئے۔ اور نصف (۱۵) محرم میں اصحاب الفیل مکہ میں آچکے تھے۔ تو اس حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور واقعہ اصحاب فیل کے درمیان کل پچپن (۵۵) راتوں کی مدت گذری تھی۔"

ص ۶۲ مطبوعہ جرمن۔ طبقات ص ۶۲ مطبوعہ جرمن۔

سلامی بنا پر ابن ہشام نے بھی ص ۵۶ ج ا میں آنحضرت صلعم کی ولادت اور مکہ میں اصحاب فیل کی آمد ایک ہی سال کے اندر تحریر کی ہے۔

پھر ایک مورّخ ایک سیرت نویس اور ایک محقق۔ اتنے قریب کے گذرے ہوئے۔ ایسے مشہور و معروف واقعہ کو جس سے اُس ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ قایم ہوتا ہو۔ کیسے قلم انداز ہو سکتا ہے۔ مگر مولوی شبلی تمام سیر و تواریخ کے خلاف اِس کو مرفوع القلم فرما گئے۔ اگر اِس کے استخفاف و استقصار کی مصلحت آپ نے ایک فلسفی مورّخ ہونے کی حیثیت سے اختیار کی ہے۔ تو یہ بھی آپ کی عقل کی خوبی ہے۔ آپ کی مختصرات۔ یا سیرۃ النبیؐ کو لی فلسفہ تاریخ عرب نہیں کہہ سکتا۔ نہ کم سے کم ابن خلدون کا نمونہ سمجھ سکتا۔ آپ کو جو کچھ فلسفہ یا منطق کے اُصول دلائل تاریخ و حدیث کی تحقیق و تنقید میں بیان کرتے تھے۔ وہ آپ مقدمۃ الکتاب میں بیان کر چکے۔ مولوی شبلی صاحب کو یقین کر لینا چاہیئے۔ کہ جب تک آپ خدا کی قدرت اور اُس کی بیشمار اور لاانتہا تصرفات سے قطعی انکار نہ کریں گے۔ اُسوقت تک آپ اِن جبروت الٰہیہ کے کسی مشاہدہ کو خارج از عقل اور ناممکن نہیں کہہ سکتے۔ اور شبلی صاحب پر کیا منحصر ہے۔ تمام بنی نوع انسان کو۔ عام اِس سے کہ وہ فیلسفی ہوں یا ہیئت داں۔ مورّخ ہوں۔ یا محدّث۔ شاعر ہوں۔ یا ادیب۔ جب تک کہ وہ خدا اور اُس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کو۔ ان تمام خارج از عقل۔ محالات اور ناممکنات کو بالکل مطابق عقل معمولی قدرت اور ممکن الوقوع ماننا ہی پڑے گا۔

اگر شبلی صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ اور اِسی خیال کی بنا پر۔ موجودہ عام تاریکی کے زمانہ میں۔ صرف نئی روشنی والوں کے خوف تشنیع سے۔ آپ نے اِس واقعہ کو مرفوع القلم فرمایا ہے۔ تو وہ اپنی اِسی کتاب میں دیکھیں کہ آپنے حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لیکر آنحضرت صلعم کی وفات تک خدا کی جبروت قدرت کے کتنے واقعات مندرج کئے ہیں۔ اور صرف نقل و اندراج ہی نہیں۔ بلکہ اُنھیں کے استنباط پر اپنے استدلال قائم فرمائے ہیں۔ پھر اپنے ہی اختیار کردہ مختار و معیار سے خلاف ورزی شعار دانشمندی نہیں۔

ہم اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ شبلی صاحب سے اچھے تو اُن کے تلمیذ رشید مولوی سلیمان صاحب ندوی نکلے جنہوں نے باوجود اِس کے کہ یہ واقعہ اُن کا موضوع تالیف بھی نہیں تھا۔ اپنی کتاب ارض القرآن میں اِس واقعہ کو من حیث الوقوع پوری تفصیل سے لکھ کر جدید مفسرین کے بعض مخترعات کی تنقید بھی کر دی ہے۔ افسوس کہ آپ تو اتنا بھی نہ کر سکے۔

سیّد صاحب کے تغیرات فی اللفظ اور تصرفات فی المعنی کی تنقید و تردید

اب رہا یہ امر کہ سیّد صاحب نے بھی اس سے انکار کیا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ سید صاحب نے اصل واقعہ سے ذرا بھی انکار نہیں کیا ہے۔ اور سید صاحب کیا کوئی بھی اسکی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ سیّد صاحب نے اِس واقعہ کے متعلق صرف ابابیلوں کے ذریعہ سنگباری پر اعتراض کیا ہے۔ اور اِس کو معمولی افسانہ اور محض کہانی ٹھہرایا ہے۔ شبلی صاحب نے تو واقعہ کا واقعہ ہی مرفوع ومقطوع فرما دیا ہے۔ گویا اسکا وجود و وقوع آپ کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔ ایسی حالت میں آپ کا مختار اور سیّد صاحب کی رائے کیسے مساوی ہو سکتی ہے۔ ہر ذی فہم آسانی سے سمجھ لیگا۔ کہ تحقیق و تلاش واقعات میں آپ کا کیا سرمایہ ہے۔ اور سیّد صاحب کا کیا پایہ۔

سیّد کو اسپر اعتراض کی کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ سیّد صاحب نے لندن میں بیٹھکر اور ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی ڈگری کے اُمیدوار بنکر۔ اپنے خیالات کے اقتباسات کو اپنی کتاب خطبات میں اتحاد بین المذاہب کے اصول پر جمع کیا۔ اتحاد کا خیال تو اسلام میں بہت قدیم ہے۔ تمام مذاہب کے خلاف اسلام ہی نے سب سے پہلے اتحاد فی المذاہب کی حقیقت کا انکشاف کیا۔ اور اِس مسئلہ کو صاف کرکے بتلا دیا۔ کہ ہمارا وہی مذہب ہے۔ جو آدمؑ کا مذہب ہے ہمارا وہی دین ہے۔ جو ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ہمارا وہی طریق ہے۔ جو عیسیٰؑ کا طریق ہے کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام "تمام انسان فطرت اسلام پر مخلوق کیے گئے ہیں:" اِسی کی پہلی تعلیم ہے۔ اِس لیئے یہ مسئلہ گویا اسلام کی ایجاد ہے۔ اور اِسلام ہی اِسکا موجد ہے۔ اِس بنا پر یہ اتحاد تو ہمارا خاص اعتقاد ہے۔ اُس سے ہم کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ اختلاف بین المذاہب ہے۔ وہ بعد کے معتقدات اور عملیات ہیں۔ جن کے لاانتہا اور بے شمار اختلاف رائے و العمل نے رشتہ اتحاد کو پارہ پارہ کرکے ہر مذہب و ملّت کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر دیا۔ بلکہ ایک کو دوسرے کا سخت مخالف بنا کر مقابلہ اور مقاتلہ پر آجتک تیار کر رکھا ہے۔

چونکہ اختلاف مذاہب پر بحث کرنا میرا مقصود نہیں ہے۔ اسلیئے اِس سے قطع نظر کرکے ہم اپنے مدعائے بیان پر آجاتے ہیں۔ سیّد صاحب نے اوّل تو اسی اتحاد کے اُصول کو اپنے خطبات کی ترتیب و تدوین کے وقت پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے اِسی ضرورت سے اُنہوں نے ماہرین فلسفہ مغربی اور محققین علم ہیئت کی تحقیقات کے بہانے پر علم الٰہیات کے خاص مسائل کا بھی موازنہ کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس موازنہ میں مغربی تحقیقات کی حسن و قبح رطب و یابس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ سیّد صاحب کی تنقیدی قوت سر ولیم میور۔ اور اُن متعصب عیسائیوں کے لغویات کی تردید و تکذیب تک تمام ہوگئی ہے۔ جنہوں نے بیجا طور سے آنحضرت صلعم کی سیاست نظام حکومت اور احکام شریعت پر اعتراض کیے ہیں۔ مگر ان اُمور کی نسبت ہمیشہ کوتہ قلمی اور قصیر النظری سے

کام لیا گیا ہے۔ یوروپین محققین کے مقابلہ میں عربی مورخین کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ اور یوروپین محققین کی ایسی شدید تقلید اختیار کی گئی ہے۔ کہ قرآن مجید کے ایسے سہل اور عام فہم الفاظ کے وقت خیز غیر مرسوم۔ خلاف محاورات اور غیر مصطلحات معانی بتلانے میں اور دور از قیاس و واقع تاویل فرمانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ کھلے کھلے الفاظ میں قدرت الٰہیہ کے جبروت اُسکے اظہار کی غیر محتمل ضرورت۔ خانہ کعبہ کی حفاظت وغیرہ کے تمام حالات و واقعات سے بالکل انکار کر کے۔ اِن مشاہدات قدیمہ اور کرامات عظیمہ کو جھوٹے افسانہ اور اُن کے سلسلہ رواۃ کو جنمیں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے اسلامی محدثین و مفسرین شامل ہیں۔ ایک سرے سے (نعوذ باللہ) وضاع اور کذاب ٹہرا دیئے گئے ہیں۔ مگر قیاسین یورپ کے قیاسات پر تنقید و تحقیق کی نگاہ سرسری بھی نہیں ڈالی گئی۔ حالانکہ اہل یورپ والوں کے کتب قدیمہ کے اخبار و آثار پر اگر محض سطحی نظر بھی ڈالی جاتی۔ تو غالباً اُن کے خاص مرویات و معتقدات میں اتنے مہملات اور محالات۔ جو اصل میں اُن کے توہمات کے طومار اور انبار ہیں۔ مشاہدہ کئے جاتے۔ جو کسی کے عقل میں کیا وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے ستھے۔ عبرت ہے۔ اور افسوس ہے کہ سید صاحب کے خطبات میں نہ اُن کی کوئی تفصیل قلم بند ہے۔ اور نہ تنقید۔

بہر حال۔ اگر سید صاحب کی یہ خاص رائے ہے۔ تو بہتر ہے۔ وہ اپنے ہی معتقدات تک اِسکو محدود و موقوف رکھیں۔ عام مسلمانوں کو اِس کے تسلیم کی تکلیف نہ دیں۔ اور یقین کرلیں۔ کہ آپ کی اِس تعلیم سے تمام مسلمانوں کو جبروت قدرت کے تصرفات اور ضرورت کے وقت اُنکے عجائب و غرائب مشاہدات سے انکار کرنا پڑے گا جو اُن کے عقائد کو باطل اور اُنکے قلوب سے نور ایمان و عرفان کو زائل کر دے گا۔

یہاں تو ابلہ سے ابابیل بصیغہ جمع عام قیاس کیا گیا ہے۔ اور طیراً کو تطیر کے مادہ سے بقاعدہ استخراج۔ مستخرج بتلایا گیا ہے۔ اور اِس کے معنی فال بد کے مراد لیے گئے ہیں۔ مگر القمل والجراد ع۔ الخ کے صاف و صریح الفاظ قرآنی میں قوم فراعنہ پر عذاب الٰہی کی جو مختلف صورتیں بتلائی گئی ہیں۔ اُنکی معنویت مسلمانوں کو کونسی تاویل بتلائی جائیگی ابابیل تو عقل صحیح کے سامنے کسی مقدار کا جانور تسلیم بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر قمل جسے آپ پسّو کہتے ہیں۔ اُسکی تو ابابیل کے مقابلہ میں کوئی مقدار ہی نہیں قائم کی جاسکتی۔ پھر قوم فراعنہ کے ایسے توانا اور قوی ہیکل انسانوں کو ایسے بیمقدار اور لا وجود حشرات الارض کا تباہ و برباد کر دینا۔ جو نصوص قرآنی سے ثابت ہے۔ کیونکر خلاف عقل اور ناممکن نہ ٹہرایا جائے گا۔ اب کوئی بتلائے۔ کہ سید صاحب کی اِس تعلیم سے غریب مسلمانوں کو قرآن سے انکار صریح کرنا ہو گا۔ یا نہیں۔ اور انکار قرآن کے بعد پھر نہ وہ مسلمان مسلمان رہے گا۔ اور نہ اُسکا ایمان ایمان۔

قرآن پر موقوف نہیں۔ قرآن سے پہلے کی تمام کتب مقدسہ میں اِن مشاہدات قدرت کی اِس سے زیادہ تصریح و تفصیل مندرج ہے۔ مگر اسوقت سے لے کر اسوقت تک اُنکے متبعین اور معتقدین اقوام کو جن میں زیادہ تر یورپ

کے محققین شامل ہیں۔ ذرا بھی انکار نہیں ہے۔ نہ وہ ان کو اپنے مقامات میں غلط ٹھہراتے ہیں۔ نہ ان کو مصنوع و موضوع بتلاتے ہیں۔ یورپ کے تمام ممالک میں بچہ بچہ اسوقت فلسفہ و ہیئت کا پتلا دکھلائی دیتا ہے۔ مگر جب اُس کے معتقدات اس کے سامنے پیش کیئے جاتے ہیں۔ یا جسوقت اُسکا کوئی مذہبی پیشوا کسی مذہبی جلسہ میں یا خاص طور پر۔ اُن مشاہدات قدرت کو جو جناب عیسیٰ مریمؑ کی تصدیق رسالت اور ترکیب ولادت کی ضرورت سے مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوئے۔ اور نیز آپ کے مابعد بھی عیسائیت کے اثبات و استدلال میں حواریوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے۔ اُن سے بیان کیئے جاتے ہیں۔ تو وہ سمعاً اور اطاعتاً گو کہ اُنہیں مان لیتا ہے۔ اور اُن کے محال عقل اور بیرون قیاس ہونے پر اپنے فلسفہ و ہیئت کی ذرا بھی روشنی نہیں ڈالتا۔ کیونکہ وہ ان اُمور کو ابتدا ہی میں سمجھ چکا ہے۔ اور یقین کر چکا ہے۔ کہ جب قدرت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تو اُس کے عمل سے انکار صریح جہالت ہے۔ اکثر محققین یورپ کی احتیاط کی اب تک یہی حالت ہے۔ ہم اُن میں سے چند مختار ذیل میں لکھدیتے ہیں۔

فرانس کا مشہور فاضل کیمل فلامریان (Camel Flameran) جو فزیکل سائنس کا اُستاد مانا جاتا ہے۔ اپنی کتاب اسپریچوزلیزم (Spritualism) میں لکھتا ہے۔

انسان کی فطری عادت ہے کہ جو چیز بظاہر مشکوک ہوتی ہے۔ یا جس کو وہ نہیں جانتا۔ اور سمجھ نہیں سکتا۔ اُسکے وجود سے انکار کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس یا پلینی کی تحریروں میں اگر ہم یہ پڑھتے۔ کہ ایک عورت کی ران میں چھاتی تھی۔ اور اُسی سے اپنے بچہ کو وہ دودھ پلاتی تھی۔ تو ہم کو بے اختیار ہنسی آتی۔ اور ہم استہزا کرتے۔ لیکن پیرس کی علمی کانفرنس منعقدہ ۲۵ رجون ۱۸۲۷ء میں یہ واقعہ براۃ العین مشاہدہ کیا گیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص ہم سے یہ کہتا۔ کہ ایک شخص مر گیا۔ اور جب اُسکی تشریح کی گئی تو اُس کے پیٹ میں ایک بچہ پایا گیا۔ جو اُس شخص کا توأم تھا۔ اور اُسکے جسم میں پرورش پا رہا تھا۔ تو ہم اس واقعہ کو محض خرافات سمجھتے۔ لیکن چند روز ہوئے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ ایک بچہ چھپن (۵۶) برس تک بدن ہی میں پرورش پاتا رہا۔ اور پھر ظاہر ہوا۔ ہیروڈوٹس کے ایک مترجم نے لکھا ہے۔ کہ لوگوں کا یہ بیان کہ سکندر کی بیوی روکسان نے ایک ایسا بچہ دیا تھا جس کے سر نہ تھا۔ خلاف عقل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج تمام طبی ڈکشنریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ بہت سے بچے بغیر سر کے پیدا ہوتے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہم سے کہتے ہیں۔ کہ ہم کو احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ جو لوگ بغیر بصیرت کے انکار کر دیا کرتے ہیں وہ جاہل اور کودن ہیں۔ (کامل فلامریان کی کتاب ص ۲۴۲ بحوالہ الکلام شبلی ص ۱۱۸ ج ۲)

مولوی شبلی صاحب الکلام جلد دوم میں خرق عادت اور روحانی فیوضات کی نسبت خود تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

چونکہ ہمارے ملک میں عام خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ یورپ عام طور پر خرق عادات کا منکر ہے۔ اور اسی بنا پر جدید تعلیم کا

ایک ایک بچہ ہر قسم کے ایک ایسے واقعہ پر جو محسوسات عام کے خلاف ہو۔ استہزا اور انکار کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں۔ کہ خرق عادات کے متعلق یورپ کے مشہور و مستند حکما و فضلا کے اقوال و آرا اس موقع پر نقل کریں۔

۱۸۶۹ء میں بمقام لندن ایک بہت بڑی مجلس ان امور کی تحقیقات کے لیے منعقد ہوئی۔ اس مجلس کے ارکان یہ تھے۔

سرجان لیک	(Sir Jhon Lake)	ممبر پارلیمنٹ	صدر انجمن
پروفیسر ہکسلی	(Pro: Haxely)	علم طبعیات کا سب سے بڑا عالم	وکیل
لوئیس	(Louis)	فزیکل سائنس کا بہت بڑا عالم	״
الفرڈ ویلز	(Alfred Wales)	جو ڈارون کا معاصر اور مسئلہ ارتقا میں برابر کا شریک تھا	ممبر
مارگن	(Morgen)	مجلس علوم ریاضیہ کا صدر انجمن	ممبر
جان کاکس	(Jhon Cox)		״

ان کے سوا اور بہت سے فضلا شریک مجلس تھے۔ ۱۸ اٹھارہ مہینے تک یہ مجلس برابر تحقیقات کرتی رہی اخیر میں مجلس نے جو رپورٹ تیار کی۔ اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

مجلس نے اپنی تحقیقات کا مدار صرف اُن تجربوں پر رکھا جو مجلس نے برائے العین مشاہدہ کیے۔ اور جن میں کسی کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجلس میں چار ممبر ایسے تھے۔ جو شروع میں اس قسم کے واقعات کے سخت منکر تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یا تو ان واقعات میں فریب اور شعبدہ بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ یا خود انسان کے عصبی نظام کا اثر ہے۔ لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد اُن کو یہ اقرار کرنا پڑا۔ کہ یہ خرق عادات حقیقی اور واقعی ہیں۔

اس کے بعد انگلستان اور امریکا میں اسکی تحقیقات کے لیے ایک مجلس قایم ہوئی۔ جس کے صدر انجمن ہیزلوپ اور ہوڈسن تھے۔ یہ مجلس قریبًا بارہ ۱۲ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی۔ اور بالآخر ۱۸۹۹ء میں اُسنے اپنی تحقیقات ختم کی۔ اور ان واقعات (خرق عادات اور روحانی اثرات) کی صحت کا اعتراف کیا۔ ہیزلوپ نے جو رائے لکھی۔ اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

مجھکو امید ہے۔ کہ میں برس دن بعد تمام دنیا کے سامنے دلائل قطعیہ سے ثابت کر دوں گا۔ کہ اس عالم فانی کے بعد ایک اور عالم ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرق عادات دیکھے۔ جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہو سکتا۔

ہوڈسن کی رپورٹ کے بعض جملے یہ ہیں۔

دنیا کو بہت جلد عظیم الشان جدید اطلاعیں حاصل ہونے والی ہیں۔ مجھ کو امید ہے۔ کہ ایک برس میں دنیا کے لیے انسانی زندگی

کے لیے قوانین فطرت کی نئی تفسیر پیش کروں گا۔ اگر پروفیسر ہیز لوپ نے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اُس نے مُردوں کی روحوں سے باتیں کیں۔ تو اُس نے بالکل سچ دعوےٰ کیا ہے۔

پروفیسر کاکس۔ جو امپریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن ہے۔ اُس نے مجمع عام میں کہا۔

میں صرف یہی نہیں کہتا کہ یہ (خرق عادات اور روحانی اثرات) ممکن ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل حقیقت واقعی ہے۔

اپنی کتاب اسپریچو لیزم میں لکھتا ہے:۔

چونکہ مجھ کو ان واقعات کا قطعی یقین ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ اخلاقی نامردی ہے۔ کہ میں اُن کے ظاہر کرنے میں اس بنا پر پچکچاؤں کہ نکتہ چیں میری ہنسی اڑائیں گے۔

جرمن کا مشہور ہیئیت داں زولز۔ Zolner بھی اُسکی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے ساتھ چند فضلا شریک ہوئے۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

ویبر (Veber)

فیشنر Fashioner فزیکل سائنس کا اُستاد اور یونیورسٹی کا پروفیسر

ونڈٹ Vendette نہایت مشہور فاضل اور یونیورسٹی کا پروفیسر

بالآخر بہت ہی تحقیقات کے بعد ان تمام فاضلوں نے روح کے عجیب و غریب کرشموں کا اعتراف کیا۔ زولز بہت بڑا عالم تھا۔ اس کے اعتراف پر لوگوں کو خیال ہوا۔ کہ شاید اُس نے دھوکا کھایا۔ چنانچہ چند مشہور پروفیسروں نے یہ خیال اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیا۔ اسپر زولکر نے ایک رسالہ لکھا۔ جسکا نام اوراق علمیہ ہے۔ اس میں نہایت زور شور سے اپنے مشاہدات کا حوالہ دیا۔ اور ان کی صحت پر دلائل قائم کیے۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اُس کے ایک جلسہ میں۔ پروفیسر لودج (Lodge) نے جو بہت بڑا ریاضی داں ہے، ایک لکچر دیا۔ اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا۔

اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ مادی اور روحانی عالم میں اب تک جو حدّ فاصل تھی۔ وہ ٹوٹ جائے۔ جس طرح اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اس طریقہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ممکنات کی کچھ حد و انتہا نہیں۔ اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں۔ وہ مقابلہ اُن چیزوں کے جو ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔

۲۲ جون سنہ ۱۸۹۶ء کو جو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پروفیسر ڈو ڈروشیہ (Du Dutrochete) نے اپنی اسپیچ میں کہا۔

یہ خرق عادات جو اسوقت ہم نے مشاہدے کئے۔ اور جن کے ذکر سے ان لوگوں کو طیش آجاتا ہے جو اپنے آپ کو عالم خیال کرتے ہیں۔ اور جزئی مسئلہ و مباحث علمیہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ بھی متواتر مشاہدات کے سلسلہ میں داخل ہیں۔ جو ایک مدت سے

ہمارے تجربہ میں آرہے ہیں۔ اور جن کی نسبت شک کرنا اب غیر ممکن ہوگیا ہے۔"

۱۸۹۲ء میں بمقام میلان ایک بہت بڑی کمیٹی منعقد ہوئی۔ جس کے ممبر حسب ذیل تھے۔

الگزنڈر گزاکوف	Alexender Kozokoff
جیوفانی	میلان کے رصدخانہ کا سکریٹری۔
کارل دوپرل	جرمن کا مشہور ڈاکٹر
جیوروب جیرورا	فزیکل سائینس کا پروفیسر
لمبروزو	(Lombroso)

ان علماء نے ۱۷ اجلاس میں ان امور کی تحقیقات کی۔ اور بالآخر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:۔

جو خوارق عادات ہم نے مشاہدہ کئے۔ ان میں کسی قسم کی شعبدہ بازی یا چالاکی نہیں تھی۔ اور یہ مشاہدات یہ درجہ رکھتے ہیں۔ کہ مسائل علمیہ میں داخل کیے جائیں۔

(منقول از کتاب الکلام جلد دوم مؤلفہ مولوی شبلی از صفحہ ۱۲۰-۱۲۵)

ہم نے مولوی شبلی صاحب کے خاص استفادات کلامیہ سے خرق عادات اور معجزات کے وجود و ثبوت میں محققین یورپ کے اتنے اعترافات پیش کر دیئے۔ اور ہماری موجودہ ضرورت تنقیدی کے لیئے اتنی ہی کافی ہے۔ حیف ہے مسلمانوں پر اور عبرت ہے۔ ان نادانوں پر۔ جو بلا تحقیق و تفتیش، اور بلا تامل و تکلف ایک ذرا سے شبہ پر نصوص الٰہی اور اس کے تمام مفسرین۔ محدثین اور مؤرخین کو بے دھڑک وضاعین اور کذابین کہدیتے ہیں۔

سید صاحب اور علی الاکثر انگریزی تعلیم یافتہ مجددین اور مجتہدین کو معانی قرآن میں ایسے لغو اور مہمل تاویل کی جس وجہ سے جرأت ہوئی ہے۔ وہ سیرت ابن ہشام کی یہ عبارت ہے۔

قال ابن اسحٰق حدثنی یعقوب ابن عتبہ انہ حدث ان اول ما رؤیت الحصبۃ والجدری بارض العرب ذلک العام وانہ اول ما روی لھا مرائر الشجر الحرمل والحنظل والعشر ذلک العام۔	ابن اسحاق کہتے ہیں۔ کہ یعقوب ابن عتبہ نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ اسی سال ملک عرب میں جسم پر دانے نکلے۔ اور آبلہ والی بیماری نمودار ہوئی۔ اور اسی سال عرب کی سرزمین پر سپند (کالے دانے) ناگ پھنی اور عشر (ایک قسم کا گوند پیدا کرنے والا درخت) کے پیڑ بھی نکلنا شروع ہوئے۔ مطبوعہ مصر ص ۱۹ ج ۱

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ابن ہشام اپنے اس بیان میں بالکل منفرد ہے۔ واقدی اور ابن سعد اسکا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اس بنا پر ہر شخص کہہ سکتا ہے۔ کہ مؤرخین و محدثین میں سے کسی نے اس کے وقوع کا اقرار نہیں کیا ہے اور

شبلی صاحب کے اُصول تحقیق و تنقید کے اعتبار پر جب تک یہ واقعہ تاریخی علمائے حدیث کا خصوصًا صحیحین کا مختار نہ ثابت ہووے۔ مانا نہ جائے گا۔ اور کسی صحیح الاعتقاد مسلمان کے نزدیک قابل اعتبار و اعتماد سمجھا نہ جائیگا۔ اور اگر شبلی صاحب کی زبانی جزم و احتیاط کے خلاف ابن ہشام کو اُسکی قدامت کی وجہ سے قابل اعتبار سمجھ بھی لیں۔ تو بھی یہ کہا جائے گا۔ کہ ابن ہشام نے اسکو قصۂ ابابیل کی کامل تصریح و تفصیل کے بعد لکھا ہے۔ اس بنا پر یہ بخوبی ثابت ہے۔ کہ اِس روایت پر نہ ابن اسحاق نے اپنا مختار قایم کیا ہے۔ اور نہ ابن ہشام نے۔ کیونکہ سیاق عبارت سے اِس کے لیئے کوئی زمانہ نہیں مقرر کیا گیا ہے۔ جس سے یہ سمجھا جاوے۔ یا یقین کر لیا جاوے کہ چیچک کی وباعیں اُسی روز اور اُسی وقت پھوٹ نکلی۔ جب ابرہۃ الاشرم اپنی فوج گران لیکر خانہ کعبہ کے انہدام کے لیئے مکّہ میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یعقوب ابن عتبہ کا بیان ہے۔ کہ اُسی سال عرب میں جسم میں دانے اور آبلہ پڑنے والی بیماری کا آغاز ہوا۔ اور اس سے پہلے نہیں تھی۔

اِس عبارت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُسی سال کے اندر اِس وبا کا شیوع ہوا۔ ابن سعد اور ابن ہشام کے متفقہ اقوال کے مطابق۔ اصحاب فیل کا واقعہ نصف ماہ محرم میں وقوع پذیر ہوا۔ اس لیئے ممکن ہے۔ کہ سال بھر کے اندر محرم سے لیکر آئندہ ذالحجہ تک کے بارہ مہینوں کی مدت میں یہ امراض وبائی نمایاں ہوئے۔

پھر جب اِس روایت سے اِس وبا کا آمد اصحاب فیل یا اُن کے حملات کے عین وقت میں پھوٹ پڑنا ثابت نہیں ہوتا۔ تو قرآن مجید کی ایسی صاف اور کھلی معنیوں میں تاویلات مہملہ کا انبار لگانا محض بے سود اور بے کار ہے۔

ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ تمام مسلمان بھی۔ کہ ابن ہشام نے بہی صحیح لکھا ہے۔ اور ابن اسحاق سے ابن ہشام نے بھی صحیح روایت کی ہے۔ کہ اُسی عام الفیل کے اندر اندر اُس قادر مطلق نے قوم عرب کی تنبیہ و عبرت کے لیئے اُس عارضی اور وقتی عذاب (احجار ابابیل) کے ساتھ ہی ساتھ اِس دائمی اور قائمی بلا و مصیبت (وبائے چیچک) کو بھی نازل فرمایا۔ تو اس سے واقعہ ابابیل کے ظہور و وقوع میں کیا نقصان و فتور پیدا ہوتا ہے ہاں اگر ابن ہشام نے ابابیل کے واقعہ کو نہ لکھا ہوتا۔ اور صرف وبائے چیچک کے شیوع کو قلم بند کیا ہوتا تو کسی قدر اِن حضرات کے تاویلات مہملہ کے لیئے گنجائش ہو سکتی تھی۔

ابابیل کو آبلہ کی جمع تبلانا ابلہ فریبی ہے

ابن ہشام اور ابن اسحاق دونوں بزرگوار عربی النسل تھے عربی اُن کی خاص زبان تھی۔ ادب و لغت کے ماہر کامل تھے۔ اور عالم و فاضل۔ وہ ہندی نژاد خام عربی داں لونڈوں کی طرح ابابیل کو آبلہ کی جمع تبلادینے کی ابلہ فریبی نہیں کر سکتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات نے آبلہ کو ابابیل کی جمع سمجھکر اپنی عربی دانی اور

ایجادِ طبعی کا نمونہ دکھلایا ہے۔ اُن کی اِس قیاسی لفظ شناسی کی حقیقت کا انکشاف صراح اللغات کی مفصلہ ذیل عبارت سے ہو جاتا ہے۔

وکن اطیرؐ ابابیل قال وھکذا یجئی فی معنی التکثیر وھو من الجمع الذی لا واحد له وقال بعضھم واحدہ ابول مثل عجول و قال بعضھم ابیل وقال ولم احد العرب تعرف له واحدًا۔ صراح مطبوعہ کلکتہ ص ۷۸۲	اسی طرح لفظ ابابیل ہے۔ (مشتق لفظ ابل سے) اور جماعت و کثرت سے اسکو ابابیل کہتے ہیں۔ اور یہ ایسی جمع ہے جسکا واحد نہیں ہے۔ بعضوں نے ابوّل کو مثل عجوّل کو اسکا واحد قرار دیا ہے اور بعض ابیّل کو اسکا واحد بتلاتے ہیں۔ مگر آخر قول یہ ہے۔ کہ اہل عرب میں سے کسی ایک نے بھی اِس جمع کا واحد نہیں بتلایا ہے۔ صراح اللغت

اب یہ قیاس کہ ابابیل آبلہ کی جمع ہے۔ یا اسی کے مشتقات سے ہے۔ کیسی صریح غلطی ہے۔ اور کھلی کھلی ابلہ فریبی وہ محدود علم و اطلاع والے مسلمان جو اِس لفظ کے لغوی تحقیق سے قاصر ہیں۔ وہ اِس عالم فریبی میں پڑ کر عبارت قرآنی کے صحیح مطالب و معنی کے سمجھنے میں ضرور تامل کریں گے۔ اُن کی نیت میں فساد۔ عقیدت میں ارتداد اور معرفت میں اشتباہ۔ کے سیاہ داغ لگ جائیں گے۔ مگر وہ طبقہ جو اِن مطالب و مقاصد کی حقیقت پر کافی علم و اطلاع رکھتا ہے۔ وہ نہ کبھی ان وساوسِ شیطانی پر متوجہ ہوتا ہے۔ اور نہ اِن مفاسد نیابانی کو کبھی خیال میں لاتا ہے

آبلہ عربی کا کوئی لفظ نہیں

لغت عرب میں آبلہ کوئی لفظ نہیں۔۔ ابلہ۔ تبرک۔ حرف الف ایک لفظ ہے۔ جس کے معنی بیوقوف کے ہیں۔ فارسی کے اَبلہہ بزیادت حرف الف غالباً اِسی سے مشتق ہے۔ آبلہ خالص فارسی کا لفظ ہے۔ جس کے معنی پھوٹے۔ یا پھپھولے کے ہیں۔ جو کہ جل جانے کی وجہ سے انسان کے جسم پر پڑجاتا ہے۔ اور آبلہ سے مرض چیچک کی مناسبت بالکل صحیح اور فی الواقع ہے۔ مگر آبلہ سے ابابیل کا تناسب بالکل جہالت ہے۔

اب رہا اِس واقعہ کا محال عقلی ہونا۔ اِس کی نسبت سید صاحب نے جو اپنی طرف سے یہ لکھکر کہ ان لغو اور بیہودہ روایتوں پر اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اِس قصہ کی نسبت بیان کی ہیں۔ میں بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ایک لمبا جداگانہ مباحثہ ہے۔ خطبات ص ۵۵۲۔ جو مجبوری دکھلائی ہے۔ وہی مجبوری مجکو بھی لاحق ہے۔ کیونکہ میری موجودہ تالیف تاریخ و سیر کے مضامین پر حاوی ہے۔ جس کو منقولات سے تعلق ہے۔ نہ معقولات سے۔ مگر تاہم۔ ہم نے خرقِ عادات اور قدرت کے تصرفات کے متعلق محققین یورپ اور مجددین مغرب کے اعترافات اُوپر لکھ دیے ہیں۔ جن سے معترضین اور متشبہین حضرات کی پوری تسکین ہو جائے گی وما توفیقی الّا باللّٰہ۔

مگر تاہم ناظرین کتاب کی مزید تشفی کے لیئے اتنا اور لکھ دینا میرے لیئے ضروری ہے۔ جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں لکھا گیا ہے۔ کہ جب خدائے واجب الوجود کے وجود اور اُس کے تمام صفات کو عین ذات سمجھ کر ہم تسلیم کر چکے ہیں۔ اور صرف اسکو تسلیم ہی نہیں۔ بلکہ اُن کو عین مشاہدات یقین کر کے اُن کی شہادت دے چکے ہیں۔ اور یہ اُمور بحکم ظاہر ہم سے پوشیدہ اور مخفی ہیں۔ اور پھر ایسے۔ کہ ہم کو کسی وقت اپنے کسی حواس اور قوت کے ذریعہ سے اُنہیں معلوم و محسوس کرنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ نہ اُن کے احساس کے لیئے ہمارے اعضائے جسمانی کام آتے ہیں۔ نہ قوائے ادراکی۔ تو جب ایک ذات خاص کی نسبت باوجود اتنے محالات کے اُسکے واحد۔ قادر۔ حاضر اور ناظر ہونے کا ہم زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہیں۔ تو پھر اُس قادر مطلق کے اظہار قدرت کی مختلف صورتوں کو عام اس سے کہ ہماری ظاہری نگاہوں میں کتنی ہی عجیب و غریب نہ معلوم ہوتی ہوں۔ کیسے محال اور ناممکن کہہ سکتے ہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب قدرت یزدانیہ اور جبروت ربانیہ کی ان جلوہ آرائیوں کا سلسلہ تاریخی دُنیا میں آفرینش عالم کے زمانہ سے لیکر اِس دم تک ہر زمانہ اور ہر وقت میں جاری و ساری ثابت ہوتا ہو تو اب غرض منقول اور معقول دونوں طریقوں سے کرشمہائے قدرت کی جلوہ نمائیوں کی تصدیق و اقرار اُسی طرح لازم ہو گیا جس طرح اُس قادر مطلق کے وجود اور جبروت کا یقین و اعتراف اور یہ اُصول اسلام کا ایسا مسلم مسئلہ اعتقادی ہے جو اصحاب حقیقت اور ارباب معرفت کی نگاہوں سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔ تمام علمائے اعلام اور فضلائے کرام حق سبحانہ تعالےٰ کے تمام صفات کو عین ذات اور اُس کی مقدس و منزہ ذات کو عین صفات یقین کرتے ہیں۔ اور یہی کی تعلیم کرتے ہیں۔ اِس بنا پر اُس کے افعال قدرت کو اُس کی قدرت سے جُدا یا اُس کی قدرت کو اُس قادر مطلق سے علیحدہ تصور کرنا۔ اور اُس کی حقیقت معرفت کو ادراک ظاہریہ اور قوائے حسیہ کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا صریح کوتہ عقلی ہے۔ اور صحیح قصیر النظری۔ قدرت ہی کی یہ قدرت ہے اور اُس کے جبروت ہی کی یہ قوت۔ کہ باوجود اِن تمام تعریض و تکذیب کے بھی غافل سے غافل انسان کو بھی پھر ایک خاص نتیجہ اور حالت پر پہونچکر اُس کی جبروت قدرت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

سید صاحب نے بھی باوجود ایسے سخت و تشدید اعتراض و انکار کے بھی۔ اصحاب فیل اور عذاب ابابیل کے واقعہ میں بالآخر یہ لکھکر کہ "وہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی۔ جو اس سے پہلے نہیں تھی۔ تمام لشکر برباد ہو گیا۔ بہت سے مر گئے۔ اور بہت سے اسی حالت میں پھر گئے۔ خدائے تعالےٰ نے اُن پر ایسی آفت ڈالی کہ جو ارادہ اُنہوں نے کیا تھا۔ اُس پر کامیاب نہ ہوئے۔" (خطبات ص ۲۵۵) اُس قادر مطلق کی قدرت کا پورا اقرار کر ہی دیا۔ یہی قدرت کے اصل تصرفات ہیں۔

ہم اس بحث کے تمام مقاصد کو ختم کر چکے۔ اِسی کے خاتمہ پر ہمکو صرف اِتنا لکھ دینا باقی رہ گیا ہے کہ تمام مسلمان اصحاب فیل

کے واقعات کو حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً اُسی طرح صحیح اور فی الواقع یقین کرتے ہیں۔ جیساکہ قرآن مجید کی فصیح اور عام فہم عبارت میں نازل ہوا ہے۔ ہم ایک قادر مطلق کا اقرار کر چکے ہیں۔ تو اب اُس کے ظہور قدرت سے انکار کرنا ہماری شانِ عبودیت کے خلاف ہے ؎ اپنی ہی ہے شان فدا اُس کی شان کے۔

موجودہ زمانہ کے روشن ضمیر محققین، فلسفہ جدید کی شیدائی، ہیئت اور طبعیات کے فدائی۔ اس واقعہ کو محض اتفاقات پر محمول کریں۔ یا معمولی حادثات سے تعبیر کریں۔ مرض بتلائیں یا وبا۔ مگر ہم تو نصوص قرآنی کے مطابق اس واقعہ کو عذاب الٰہی کی سخت بلا یقین کرتے ہیں۔ اور عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی سب سے قدیم اور عظیم فتح۔ جو عیسائیوں کے اِن لمگر ابانہ تحریک و ترعیب کی سزا و پاداش میں حق سبحانہ تعالےٰ کی طرف سے اُن پر نازل فرمائی گئی۔ جس کو انہوں نے اپنے تعصب و نفسانیت کی بنا پر۔ اُس قدیم اور واجب بیت الٰہی کی توہین و انہدام کے لیئے اختیار کیا تھا۔ جس کے معمار ابراہیمؑ تھے۔ اور مزدور اسمٰعیلؑ۔ سلام اللہ علیہما۔

اگر تاریخوں کے ورق گردانی کی خفیف سی زحمت گوارا فرمائی جائے۔ تو اربابِ تحقیق کی نگاہوں میں عیسائیوں کے لاانتہا تعصب اور بیحد نفسانیت کما حقہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہودیوں کی کورانہ تقلید میں عیسائیوں کی بنواسمٰعیل کے ساتھ قلبی نفرت کا یہ پورا زمانہ تھا۔ اِن کی بنو اسماعیلؑ اور بنو ہاجرہؑ کے ساتھ عداوت اِس شدت کے ساتھ بڑھی ہوئی تھی۔ کہ باوجود اخبار و آثار صحیحہ سے قدامت و عظمت کعبہ ثابت ہونے کے بھی وہ نہ اِس کو معبد الٰہی تسلیم کرنا گوارا کرتے تھے۔ اور نہ اُس کو صرف امارت ابراہیمی ماننا چاہتے تھے۔ حالانکہ عرب کے تمام اخبار و آثار قدیمہ کافی طور سے اِسکا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور روحی و یونانی کے غیر عرب محققین بھی۔ جنہوں نے یہود کی کتب قدیمہ کا ترجمہ کیا ہے۔ اُس کی شرحیں لکھی ہیں۔ اِسکا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ بخت نصر۔ اور شاہان بابل کی تاخت و تاراج کے بعد۔ جب یہودیوں نے عرب اور خصوصاً حوالی مکہ و مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ تو وہ بھی اہل عرب کی طرح اِس معبد الٰہی کی عظمت و تحریم کرتے تھے۔ اِسکو خالص عمارت ابراہیمی یقین کرتے تھے اور عربوں کے ساتھ سالانہ مراسم و ارکان حج بجالاتے تھے۔ مگر آگے چلکر جب گردو نواح کے ممالک میں عیسائیت کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور بنو اسماعیلؑ کی قوت و اختیار میں کمی آئی تو یہ (یہود) ابن الوقتی کرکے عربوں کے اتحاد و اتفاق سے دست بردار ہو کر عیسائیوں کے معین و مددگار بن گئے۔ اور بیت المقدس کی مسافت بعید دکھلاکر اپنا کعبہ الگ بنانے کی ترغیب دی۔ ابرہۃ الاشرم نے اِس تجویز میں مذہبی خیال کے ساتھ سیاسی نظم و تدبیر کو بھی شامل کر دیا۔ اور اِس تدبیر سے اُس نے اپنی تخت گاہ۔ شہر صنعاء کو مکہ کی طرح مرفہ الحالی۔ تجارت اور کاروباری شہرت کا مرکز بنانا چاہا۔ اور اِس طریقہ اور قاعدہ سے ملکی اور قومی رعایا کو اُن تمام منافع اور محاصل سے منتفع اور مالامال بنادینا چاہا۔ جن ذرایع اور وسائل سے مکہ اور تمام علاقہ حجاز کے اقوام و قبائل ہر سال

ایامِ حج میں مستفید و مستفیض ہوا کرتے تھے۔
مگر ابرہۃ الاشرم کو اپنی سیاسی تدبیر کی فکروں میں مشیت کے ارادے، اور تقدیر کے نیرنگ کی کیا خبر۔ اُس نے سوچنے کو تو سب کچھ سوچ لیا۔ اور کرنے کو حتی الامکان سب کچھ کر لیا۔ مگر جبروت کے ایک ہاتھ نے آن کی آن میں اُسکے سارے منصوبے۔ اُس کے سارے سامان خاک میں ملا دیئے۔ اور اُسکی فوجی، سیاسی اور تمدنی بغرض تمام قوتیں منہ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئیں۔ واللہ ما یفعل ما یشاء

حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کی شادی

ابن ہشام۔ ابن سعد۔ طبری۔ ابن اثیر اور ابوالفداء غرض قریب قریب تمام عربی تاریخوں نے حضرت عبداللہ ابن مطلب کی شادی کے واقعہ کو اصحاب فیل کے واقعہ کے بعد لکھا ہے۔ حالانکہ اُنھیں کے مختارے اصحاب فیل کا واقعہ ولادت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے کل پچپن[۵۵] روز پہلے کا ثابت ہوتا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ حضرات متقدمین کو سلسلہ و ترتیب سنین سے زیادہ واقعات کی اہمیت مدنظر رہتی ہے۔ اور اِس بنا پر وہ مطابقت سنین کا اسقدر خیال نہیں کرتے تھے۔

بہر حال۔ ابن سعد کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کا سِن شادی کے وقت سترہ[۱۷] برس کا ثابت ہوتا ہے۔ یوں تو آپ کی نسبت مکّہ کے تمام اشرف و اعلیٰ قبائل سے بھی برابر آیا کی۔ مگر نظام مشیت نے اِس ازدواج کا شرف مکّہ والوں کی خوش قسمتی کا نتیجہ نہیں ٹھرایا تھا۔ بلکہ اِس فخر و مباہات کو بنی زہرہ کا تمغائے شرافت قرار دے رکھا تھا۔ جو بیرون مکّہ آباد تھے۔ اسکی مثال مفصلۂ ذیل واقعہ سے بآسانی معلوم ہو جائیگی

قتیلہ ابن نوفل اخت ورقۃ ابن نوفل وکانت تنظر وتعتاف فمر بہا عبداللہ بن عبدالمطلب فدعتہ یستبضع منہا و لزمت طرف ثوبہ فابی وقال حتیٰ اٰیتک و خرج سریعاً حتیٰ دخل علی اٰمنۃ بنت وھب فوقع علیہا فحملت برسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم۔ طبقات ص

قتیلہ بنت نوفل۔ ورقہ ابن نوفل مشہور و معروف عالم قریش کی بہن جو اسوقت دوشیزہ بھی تھیں۔ اور بہت بڑی عفیفہ۔ ایک بار حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کے سامنے سے گذریں۔ قتیلہ نے دیکھتے ہی آپکو اپنی طرف بلایا۔ اور نکاح کی درخواست کی اور اُنکا گوشہ دامن پکڑ لیا حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب نے قطعی انکار کیا۔ اور اُس کے پاس سے بسرعت تمام چلے آئے۔ اسواقعہ کو عرصہ ہو گیا۔ اس درمیان میں آپ کی شادی حضرت آمنہ سے ہو گئی۔ اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حمل قائم ہو گیا

نتیجہ واقعہ ذیل کی تتمہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

ثم رجع عبداللہ بن عبدالمطلب الی المراءۃ

عبداللہ ابن عبدالمطلب نے ایکبار پھر اُس لڑکی کو دیکھا تو پوچھا۔ کہ اب

فوجرها فانتظرته فقال هل لك فی الذی عرضت علیّ فقالت لا مرت وفی وجهك نور ساطع ثم رجعت ولیس فیه ذلك النور

طبقات ص ۵۹

اس امر میں تمہاری کیا رائے ہے۔ جس کی نسبت تم نے ایکبار مجھ سے درخواست کی تھی۔ اُس نے جوابدیا کہ اب کچھ نہیں۔ کیونکہ جب اُس دفعہ تم میرے پاس کر ہوکر نکلے تھے۔ تو میں نے تمہارے چہرے سے ایک نور ساطع دیکھا تھا۔ اب جو تم لوٹ کر میرے پاس آئے۔ تو وہ نور تم میں نہیں باقی ہوں۔

ابن سعد نے اس واقعہ کو قتیلہ بنت ورقہ کے علاوہ فاطمہ بنت مرّہ خثعمیہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ بہرحال چونکہ مشیت کو اس ازدواج و اتحاد سے اپنی ودیعت خاص کی استبدار و ایجاد منظور تھی۔ جسکے لیئے عمائد و اشراف قریش میں بنی زہرہ زیادہ ترموزوں تجویز کیئے گئے تھے۔ گویا مشیت کی اسی تحریک پر حضرت عبدالمطلب اہل مکہ کی تمام نسبتوں کو نامنظور فرماتے گئے۔ اور بنی زہرہ کی آئی ہوئی نسبت کو قبول فرماکر حضرت عبداللہؓ کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب سے کردی۔ اور اپنی شادی ہالہ بنت وہیب سے کرلی وہیب۔ وہب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور وہب کے بعد اپنے قبیلہ کے سید و سردار اور اپنے زمانہ کے ذی اقتدار و صاحب اختیار۔ یہ دونوں صاحب عبدمناف ابن زہرہ ابن کلاب کے صاحبزادہ تھے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں:۔

كانت آمنة بنت وهب فی حجر عمها وهيب بن عبد مناف ابن زهرة فمشى اليه عبد المطلب ابن هاشم بابنه عبد الله ابی رسول الله صلعم فخطب عليه آمنة بنت وهب فزوجها عبد الله بن عبد المطلب وخطب اليه عبد المطلب ابن هاشم فی مجلسه نزلك ابنته هالة بنت وهيب على نفسه فزوجه اياها وكان تزوج عبد المطلب بن هاشم وتزوج عبد الله بن عبد المطلب فی مجلس واحد فولدت هالة بنت وهيب لعبد المطلب حمزة بن عبد المطلب فكان حمزة عم رسول الله صلعم فی النسب و اخاه من الرضاعة لما تزوج عبد الله بن عبد المطلب آمنة بنت وهب اقام عندها ثلاثا كانت تلك السنة عندهم اذا دخل الرجل على

آمنہ بنت وہب اپنے چچا وہیب ابن عبد مناف ابن زہرہ ابن کلاب کی کفالت میں تھیں۔ حضرت عبدالمطلب حضرت عبداللہ کو لیکر بنی زہرہ کے قیام گاہ پر گئے۔ اور حضرت آمنہ کا خطبہ نکاح اپنے صاحبزادہ عبداللہ پدر جناب رسالتمآب صلعم سے پڑھا اور آمنہ کو عبداللہ سے بیاہ دیا۔ اور وہیب کی ہالہ بنت وہیب سے خود خطبہ نکاح پڑھکر شادی کرلی۔ اور یہ دو نکاح ایک ہی مجلس میں بیک وقت واقع ہوئے۔ ہالہ کے بطن سے حضرت عبدالمطلب کے ہاں حضرت حمزہ پیدا ہوئے۔ ہالہ نے جناب رسالتمآب صلعم کو دودھ پلایا۔ اس بنا پر حضرت حمزہ سلسلہ نسب میں تو آنحضرت صلعم کے عم محترم تھے۔ مگر علاقہ رضاعت کے اعتبار سے وہ آپ کے رضاعی بھائی ہوتے تھے۔ جب حضرت عبداللہؓ کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب سے ہوگئی۔ تو آپ سسرال میں تین دن تک قیام فرمارہے۔ کیونکہ یہ دستور تھا کہ شادی کے بعد شوہر اپنی عروس کے ہاں تین دن تک قیام کرتا تھا۔

امراتہ فی اھلہا۔ طبقات ج ا ص ۵۸ || طبقات ابن سعد جلد اوّل ص ۵۸۔

حضرت عبدالمطلب پر اپنے بیٹے کے ساتھ بیک وقت اور بیک مجلس اپنی بھی شادی کر لینے کے لیے جوان طبع مولفین مخرضین دیدہ اعتراض نکالتے ہیں۔ اور عیسائی متعصبین تو کھل کھل کر استہزا کرتے ہیں مگر دونوں حقیقت شناسی سے علیحدہ ہیں۔ یہ حضرات اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کی طرح اُس زمانہ اور اُسکے اہل زمانہ کو بھی قیاس کرتے ہیں۔ اُن کا یہ موازنہ سراپا غلط ہے۔ مجکو اُن کے اس غلط قیاس کی تردید و تنقید کی مطلق ضرورت نہیں۔ مگر حقیقت امری کا بتلا دینا نہایت ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ حضرت عبدالمطلب کی اس شادی سے جو نتیجہ نکلا۔ اور حقیقتاً جو تدبیر الہی کا عین مقصود ثابت ہوتا ہے۔ وہ اسی سے ظاہر ہے۔ کہ اس اتحاد و مواصلت کی علت و غایت جناب حمزہ کی ولادت تھی۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ[12] چچا تھے۔ ان تمام حضرات میں اعانت اسلام اور رفاقت حضرت سید الانام میں بعد ابو طالب جس خلوص وعقیدت کے ساتھ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب نے اپنے خدمات کے جوہر دکھلائے۔ ویسے کسی نے بھی نہیں کما لایخفی علی المدبر۔

وقد تم بحمدہ وفضلہ المجلد الاوّل من الکتاب الاسوۃ الرسول فی

سیرۃ الرسول المقبول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ

ذوی الحکمۃ والعقول فی الرابع ربیع الاوّل

یوم الجمعۃ من شہور الاثنی والاربعین

وثلثمائۃ بعد الالف من

الہجرۃ المقدسہ

وآخر

دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سید المرسلین وآلہ المیامین۔ آمین

شریف العمارت

کواتھ

صانہا اللہ عن الآفات

المؤلف الاحقر

السید اولاد حیدر بلگرامی عفاہ اللہ الحامی

۱۳۴۲ھ

مکمل جدید تالیف

سلام

چونکہ [illegible] شائع ہوا ہے جسمیں حضرت آدم ع

کا [illegible] کو دکھلاتے ہوئے تمام انبیاء علیہم السلام کو

سلسلہ بسلسلہ [illegible] اد کو دکھلاتے ہوئے تمام عبد مناف کنیت ابو شمس

تک سلسلہ دکھلاتے ہوئے [illegible] سے حرب اور خاندان بنی اُمیہ اور ہاشم سے خاندان

بنی ہاشم بنی اسد کو دکھلایا ہے۔ اور [illegible] عبد المطلب اور تمام اولاد کو دکھلاتے ہوئے عباس عبد اللہ

پدر جناب سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ و [illegible] ران عرف ابوطالب اور اولاد کو دکھلاتے ہوئے عباس سے خاندان

بنی عباسی اور عبد اللہ سے جناب رسول مقبول بارگاہ رب العزت کو اور ابوطالب سے حضرت علی کی اولاد طاہرہ کو دکھلا کر حضرت

امام حسن ع حسین ع و تمام ائمہ اور انکی اولاد طاہرہ کو امام مہدی ہادی آخر الزماں تک دکھلایا ہے۔ اور ہر نسل و خاندان کو ایک ایسے

خوشنما شاخ اور پھولوں میں دکھلایا ہے۔ کہ جیسا کہ ایک خوش وضع پھولدان میں چمنستان کے طرح طرح کے رنگ برنگ کے پھول

چن کر گلدستہ بنایا ہو۔ اور ہر شجر میں اسماء لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ ماہ میں ستارہ جڑا ہوا ہے۔ کتابت کی یہ کیفیت ہے کہ

ہر شاخ بجائے خود سچے موتیوں کی لڑی ہے۔ طباعت کا یہ رنگ ہے کہ نظر ڈالنے سے آنکھ خیرہ ہوئی جاتی ہے۔ خوشنما ولائتی

چکنا ۳۰×۲۰ / ۶۶ پونڈ کا غذ پر سرخ سبز بلیو بلیک کی رنگین چھپائی مثل قوس و قزح کے ہے۔ درحقیقت سید ابن حسن صاحب

المتخلص بہ زائر لکھنوی نے ہندوستان میں ایک نئی تالیف فرما کر چار چاند لگادئے ہیں جس کا آج تک کسی کو گمان بھی نہیں

تھا۔

اس کار خیر اور ثواب عظیم میں جناب فخر الحاج والزوار۔ حاجی خواجہ شریف حسین صاحب کربلائی۔ مشہدی نے بڑے

انہماک اور کوشش سے حصہ لیا ہے۔ خداوند عالم حاجی صاحب کو اجر دے۔ مومنین ان کے لئے دعاء خیر سے یاد فرماویں۔

یہ مقدس شجرہ مکان کی زینت گھر کی برکت اور ہر انبیاء و ائمہ کی معلومات عزاخانوں کی زیب ہے۔ باوجود ان صفات

کے ہدیہ بہت کم رکھا ہے۔ تاکہ مومنین بآسانی خرید سکیں یعنی صرف عہ/ ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

مینیجر کاظم بکڈپو رجسٹرڈ دہلی

قانون میراث اسلامیہ

[illegible]

... ذوی الارحام اور ذوی الحقوق وارثوں کی تقسیم و ترتیب جب کا بیان۔ عصبات میراث کلالہ میں۔ میراث کلالہ کی تقسیم۔ تعصیب ایک غلط فہمی کی اصلاح۔ اسلام کا خالص تمدن اسلام کی تعلیم معاشرت۔ اقتصادیات کی تعلیم۔ مسٹر گوئی وارپین شاپ آف مین جسٹر کی تقریر نہایت بہتر کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گیا جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت صرف چار آنے (۴/)

ہر قسم کی مذہبی کتابیں بکفایت ہمارے یہاں ملتی ہیں حسب ذیل پتہ سے طلب فرمائیے

مینیجر کاظم بک ڈپو رجسٹرڈ شہر دہلی

اعلان

ناورب العزت،
تا آخر تک کے حالات حسن خلق
مفصل و مکمل حالات و اذکار

الحمد للہ کہ مومنین اور علم دوست حضرات کو خوشخبری دی جا
حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مقدس و معتبر سیرت۔ ولا
وخرق عادات اور
مہماں نوازی۔ علم و فضل۔ قابلیت و ذہانت۔ مع معجزات۔ وخرق عادات اور
اور آپ کے پاک و پاکیزہ فضائل اور بہت سی قیمتی و نایاب تاریخوں کا گرانبہا خلاصہ تمام دنیا کے لیے نادر الوجود اور
بہترین سبق ہے۔ اور ہر مسلمان کا اخلاقی فرض ہے۔ کہ اپنے سچے رسولؐ حبیب خدا کی سوانح عمری کا مطالعہ کریں۔ اور
نحی المفقود ہیں نایاب تحفہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ایسی نادر الوجود کتابیں جو عرصہ دراز سے مفقود تھیں۔ اور نہ اس
طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ ہم نے اس کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ہمارا ارادہ ہے۔ کہ اس سلسلہ کو اول
جلد سے کر جلد پنجم تک طبع اور تیار کر کے مومنین کی خدمت بابرکت میں پیش کریں
اور اس کار خیر اور ثواب عظیم میں عالیجناب فخر الحاج والزوار حاجی خواجہ شریف حسین صاحب کربلائی
مشہدی۔ بڑے انہماک اور کوشش سے حصہ لے رہے ہیں۔ اور ان کی دلی خواہش ہے۔ کہ اسوۃ الرسولؐ کی
بقیہ جلدیں جو چھپنے سے باقی ہیں۔ اعلیٰ پیمانہ پر چھپوا کر مومنین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔ خداوند عالم حاجی صاحب
کے اس ارادے میں کامیابی دے۔ اور مومنین و ناظرین سے التماس ہے۔ کہ جناب حاجی صاحب کو دعائے خیر میں یاد
فرماویں۔ اور جناب حاجی صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ
الحمد للہ کہ پہلی جلد اسوۃ الرسولؐ کی چھپ کر تیار ہو گئی۔ کاغذ نہایت نفیس ولائتی لگایا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی
دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ (ضخامت ۸۲۸ صفحات) قیمت صرف سات روپیہ علاوہ محصولڈاک

چونکہ اس کتاب کے ایک ایڈیشن کی ابھی اجازت ہے لہذا جب تک ہماری جلدیں تمام ہوں کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں ورنہ بجائے نفع کے نقصان ہوگا۔

ہمارے یہاں ہر قسم کی مذہبی کتابیں ارزاں قیمت پر ملسکتی ہیں حسب ذیل پتہ پر طلب فرمایئے

منیجر کتب ڈپو رجسٹرڈ شہر دھلی

مطبوعہ ادریس المطابع دہلی